

گرداب

ہمارے سماج میں قانون تو کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور ہائوس سماج کے روایتی نظام میں پرہتھی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم ہمارے اس نظام میں قانون کے بھی کئی رخ ہیں بالآخر طبقے کسی خوشنودی ہی قانون کی تعریف کی ایک نئی تشریح کرتی ہے ایسی تشریح جو کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ استند اور جال کا سا ہے جس میں طاقتور مچھلی جال کو تو زکروں اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا رہی ہے جو درمیانی طبقے سے ہو۔ محبت تو تو روایتوں کو مانتی ہے تو طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے دل نہ تو طیفوں کی پروا کرتا ہے، نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اس راہ میں اسے جن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، یہ بات تو دل جانے یا پھر خدا زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے... یہ سب قسمت کی باتیں اور مندر کی چالیں ہیں... کبھی کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے گزرا وقت تو لوٹ نہیں سکتا سگر کبھی کبھی مقدر ساتھ نہ جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے جرم، افسر شامی، جاکو، داری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا سلسلہ پر سلسلہ



سامان سے لدا ہوا ٹک اور ملور گتے مرید پر آگے پیچھے دوڑتے ہوئے دھول مٹی کے غبار سے گلے کر لیا۔ ہاتھ سے بچنے کے سامنے اٹھ کر۔ یہ ایک سرکاری بلکہ تھا لیکن دیگر سرکاری عمارتوں کے مقابلے میں اس کی ظاہری حالت اور رنگ و روغن نمایاں طور پر کافی بہتر نظر آ رہے تھے۔ لاہور کی جانب سے آنے والی یہ گاڑیاں جوں کی ہیٹھ کے گیٹ کے آگے دیکھیں، بچنے کا گتے ٹھٹھ سے دھو گیا۔ کھلے گیٹ کے دونوں اطراف کی افراط و تفرات نے اشتباہ انداز میں کھڑے تھے۔ ان افراد کو گاڑی میں بیٹھے افراد باہر سے نکال دیکھ سکتے تھے۔ مرید پر کی پہلی نشست پر موجود اسٹنٹ کٹر شہر کا راول سے بھی پر خونی اس منظر کو دیکھا اور وہ جو اپنے تئیں اس وقت تک کچھ کر دھروں کو جوت میں جتا کرنے کا ارادہ کئے بیٹھا تھا، اس منظر کو دیکھ کر جوت کی خدمت سے کچھ یوں ساکت ہوا کہ ڈرائیور کے مرید پر کا دروازہ کھول دینے کے باوجود بھی کسی کے سبک نہیں چھوڑا۔

”خوش آمد بخوش آمد یہ شہر یا صاحب ابڑی دیر سے ہم آپ کی حق راہ دیکھ رہے تھے۔“ شہر یار کے گاڑی سے برآمد ہوتے ہی ٹھٹھ کے ٹیلا اڑھیں میں بیٹھیں، سر پر سفیدی شل چھانے، بڑی بڑی موچھوں والا لک ٹھٹھ ٹیکس جینز سال ایک شخص آگے بھاڑا اور اپنے پیچھے کمرے کے گتے کے ساتھ سے گلاب اور سوچے سے پھولوں کا بھاری بھر کم ہار لے کر شہر یار کے گتے میں ڈال دیا۔

”دیکھو سر! پیٹ ٹرٹ میں ملیں، گتے میں مٹی اور آگھوں پر چٹک کارٹے سمجیدہ صورت شخص نے شہر یار کے ہاتھوں میں ایک کیکے تمایا۔

”میں آپ کا پی اے عبداللہ ہوں اور یہ اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار جناب چودھری افتخار عالم شاہ ہیں۔“ سمجیدہ صورت شخص نے اپنا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ ہی سے ہی روایتی چودھری نظر آنے والے شخص کا بھی تعارف کر دیا۔ شہر یار نے اس تعارف پر سر کو کھنٹ ایک ٹکلی جینٹ دینے پر اکتفا کیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ پی اے عبداللہ اور چودھری افتخار عالم شاہ اس کے پیچھے پیچھے کھلے گیٹ سے گزر کر اندرونی حصے کی طرف جاتے ہوئے دونوں اطراف کمرے سے افراد نے گلاب کی پتوں کی برسات اور تالیوں کے ساتھ شہر یار کا سوا گتے کیا۔ اس صورت حال پر شہر یار عادل نے شدید کوفت محسوس کی، یوں بھی وہ اچانک ٹھٹھ کر دوسروں کو حیران کر دینے کے اپنے منصوبے کے کام نہ ہونے پر پہلے ہی کافی جھجکا ہٹ محسوس

کرو رہا تھا۔

”مستمر منان امین فریش ہوتا جاتا ہوں۔“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنے ساتھ چھوٹے سے جلیوں کی شکل میں چلتے ہوئے افراد میں سے کسی ایک کی طرف بھی نظر ڈالے بغیر شہر یار نے ٹھٹھ لپٹے میں اپنے پی اے کو قہر طبع کرتے ہوئے اپنی خواہش ظاہر کی۔

اسٹنٹ کٹر کی حیثیت سے بے شک یہ اس کی پہلی باؤسٹنٹ تھی لیکن وہ خبرانی کے انداز سے بہر حال ہواقت نہیں تھا۔ لپٹے کی آکر، گردن کا کھٹ اور آگھوں کی بے نیازی ان سب چیزوں کی تربیت اسے اپنے کمرے کا محل سے ملتی تھی۔

وہ ایک ایسے غافلانہ سے تعلق رکھتا تھا جس کے بیشتر افراد پر دو رنگی یا سیاست کی لحاظ پر اہم ترین بہروں کی حیثیت سے پہلے ہوتے تھے۔ جو ابھی اس جیل میں شامل نہیں ہوئے تھے، وہ اپنے بڑا سے کھیل کے قوانین و اصول سمجھ رہے تھے۔ شہر یار بھی بہت کچھ کھیلے اور جانے کے بعد ہی اس میدان میں اترتا تھا۔ چنانچہ اس نے حیرت کے ابرائیل ٹھٹھ سے کھل کر خود کو سنبھالنے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ حیرت کا سبب بھی اپنے استقبال کا انداز نہیں بلکہ یہ بات تھی کہ کتنا اطلاع دے، کتنی اور وقت یہاں پہنچنے کے باوجود استقبال کا یہ اجتنام کیوں ممکن ہوا۔

”شہر یار!“ عبداللہ نے شہر یار کی فرمائش پر اپنے تئیں جیل میں جواب دیا اور لاؤنج سے آگے اس کی رہنمائی کرنے لگا۔

”اسے ہی صاحب کے بازو دم ہونے تک چائے تیار کر کے میز پر لگاؤ۔“ خبردار! انھیں کوئی کی نہیں دینی چاہیے۔“ عبداللہ کی رہنمائی میں لاؤنج سے ٹھٹھ ہونے شہر یار عادل نے اپنے پیچھے چودھری افتخار کی کھانڈا آواز سنی۔ یہ سرکاری بلکہ تھا جہاں موجود تمام افسان اور منتر کی پتیا سرکاری ملازم تھے لیکن چودھری افتخار کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس کے ذاتی ملازم ہیں۔

”یہ آپ کا بیلڈرم ہے سر اس کے ساتھ ہی انھیں ہاتھ بھی منہ دوسرے سے پر نہیں ہو جائیں تو تھمتی کا کٹن دیا کر مجھے انعام کر دیجیے گا۔ لاؤنج میں چودھری افتخار صاحب بھی آپ کے منتظر ہیں۔ آج تمام کی جانے کا اجتمام انہوں نے ذاتی طور پر کروایا ہے۔“ تمام ضروری سہولیات سے مزین ایک کمرے میں پہنچ کر عبداللہ نے شہر یار عادل کو ہاتھ دہم اور کھنٹ کے تئیں کی نشان دہی کروائے ہوئے چودھری افتخار کی

بابت یاد دہانی کروانے بھی ضروری سمجھا۔

شہر یار نے اس کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور چودھری افتخار کو پکارتا کیا اور وہ لاؤنج میں خٹکے سے اٹار کر ہاتھ میں لے چکا تھا، عبداللہ ان کا پیش کیا ہوا کیکے، بے پروائی سے بلڈ کی ماسٹیکل پر ڈال دیا۔

”باہر ٹوک پر میرا فریج، دیکھو آگے آگے اٹھا لو۔“ آپ اپنی کھنٹ میں سارا سامان اتر دیا کر ٹھٹھ میں سیٹ کروانا شروع کر دیں۔ کھنٹ تک یہ کام مکمل ہو جانا چاہیے۔“ سمجھاؤ انداز میں پی اے سے کہتے ہوئے شہر یار نے کافی کی باٹ ڈھکی۔

”لیکن سر وہ چودھری صاحب۔“ عبداللہ ان اس حتم پر کچھ متذہب سا نظر آیا۔

”وہاں چودھری صاحب!“ موجودہ صورت حال کی روشنی میں کچھ کچھ معاملے کو سمجھتے ہوئے شہر یار نے تیز لپٹے میں پڑ گیا۔

”مجھے اسٹبل تھا سر! چودھری صاحب نے آپ کے آنے سے کتنی خود اپنے ذاتی خرچے پر ٹھٹھ کی ساری تر کھیں و آرائش کروائی ہے۔“ آپ کا لایا ہوا سامان سیٹ کرنے کے لیے بھی چودھری صاحب کے ان حقائق کو بھانا ہے۔ گاؤر شاپلیہ بات انھیں ناگوار گزرتے۔ ”بیلڈرم میں موجود فریج اور دیگر اشیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبداللہ نے جلدی جلدی اپنی اصراری بات کا مہم بیان کیا۔

”سوا احاطہ! چودھری صاحب نے یہ سب کچھ مجھ سے پوچھ کر یا میری فرمائش پر تو نہیں کروایا۔ یہ بھگتی الحال میرے زیر استعمال ہے اور اسے کسی طرح اور کی چیزوں سے ڈیکوریت کروانا ہے۔ یہ طے کرنے کا حق چودھری افتخار صاحب کو نہیں بلکہ مجھے حاصل ہے۔“ شہر یار نے لکھائی سے جواب دیا تو عبداللہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ اس کے بشر سے بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔ دوسرا صاحب اختیار افراد کے درمیان بیٹھا اس وقت وہ یقیناً خود کو کافی مشکل میں محسوس کر رہا تھا۔

”اور آپ یہ تو بتائیں کہ میرے استقبال کا سامان ڈراما کس طرح ایکٹ کیا گیا؟“ فیصلی کو سمجھتے دو دن بعد یہاں آنا تھا۔ آپ کو اور باقی سب لوگوں کو میرے اس وقت یہاں پہنچنے کی اطلاع کیسے ملی؟“ اس نے اسے گویا دیکھ کر شہر یار نے بہت دیر سے ذہن میں چلتا سوال بھی کر ڈالا۔

”یہ چودھری صاحب نے! اور یوں کر کہ راہ صاحب سے معلوم کیا تھا۔ رات صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ آج کسی

وقت پہنچنے والے ہیں۔ وقت کا اندازہ چودھری صاحب نے لاہور سے آپ کی روانگی کا حساب کر کے خود بھی لگا لیا۔ آپ کے استقبال کے سارے انتظامات انہوں نے ہی کیے ہیں۔ وہ تو یہ منہ دیکھ کر بیٹھا ہے والے کھیلوں کے جانیں کھینچ میں نے سمجھا جھگڑا کر۔“ آج کے دور میں ان چیزوں کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا، انھیں ان کے اس ارادے کے باز رکھا۔ ”عبداللہ نے بتایا تو شہر یار نے ساختہ ہی ایک گیارہ ماٹس نے کر دیا۔ اسے اسے اندازہ نہیں تھا کہ رات کے نام سے بچنے کے جانے والے اس کے اہم اہل ان ماحول کے ایک دور دراز گاؤں کے چودھری سے اسے خبر میں مراد ہوں گے کہ وہ صرف ایک فون کال کے ذریعے بھی ان سے شہر یار کے ذاتی پروگرام کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکے۔ چودھری افتخار کا سوسر آف انفارمیشن پلانے کے بعد اس نے عبداللہ سے مزید کوئی سوال کیے بغیر کھل جانے کا رخ کر لیا۔ وہ مکمل خانے سے باہر لنگھ کر اس کا اسٹریٹ ٹھوسٹ سامنے والے پتھر پر لگا ہوا تھا۔ شہر یار کے ہونٹوں پر سوت دیکھ کر کمر کھٹ ڈو آئی۔ کچھ بہار لوگوں کی دلی ہوئی انفارمیشن درست ثابت ہو رہی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی براہیت تدبیرے جاننے کے باوجود اس کے سوٹ کس میں سے یہ سوت برآمد کرواں اسٹریٹ کروانے کا یہ کارنامہ یقیناً عبداللہ نے ہی سمجھا دیا تھا۔ عبداللہ کو اس بار کوئی پر دلی ہی دل میں سراپتے ہوئے شہر یار نے تیزی سے لپٹاں تھیل کیا اور عبداللہ کو ہاتھوں کا کٹن دیا دیا۔

چودھری افتخار کو اب مزید انتظار کی کوفت میں جتا کر مناسب کھنٹ تھا۔ شہر یار کا اندازہ تھا کہ وہ جس بے نیازی سے چودھری افتخار سے جتنی آیا ہے، وہ چودھری کے حوزہ پر کافی گراں گزری ہوگی۔ ہر وقت اپنے آگے ہاتھ پانہ سے کھڑے رہنے والے لوگوں میں گھبرانے والے چودھری افتخار کی یقیناً اس قسم کے رویے سے آشنائی نہیں ہوگی اور اس نے بہت مشکوک سے ہی شہر یار کے اس انداز کو محسوس کیا ہوگا۔

”لیں سر!“ کھنٹ کا کٹن وہاں ہی عبداللہ کی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

”پہلو بھی چل کر چودھری صاحب سے ملاقات کر لیں۔“ شہر یار نے قدم سے خوش گوار لپٹے میں کیا اور عبداللہ کی محبت میں کمرے سے باہر نکلیا۔

”مجھے افسوس ہے، چودھری صاحب کس آپ کا انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی لیکن آپ سمجھی تھیں کہ کھنٹ کی دوا لگتا بہت سزا کرنے کے بعد آدمی کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ میں

غریب عجیب سی تو لڑکیاں ہیں یہاں کی۔ کوئی کام کی بات نہ کہ کرنا نہیں جانتیں۔ ”ماہ بانو حقیقتاً قحطی خیز مٹی کی زمین کا دوسرا آتے وقت پیشہ سی گوشت کا مظاہرہ کرتی تھی۔

”جیسے کیا کرنا ہے یہاں کی لڑکیوں سے۔ جب تک دل چاہے بات کرنا دیر لپٹی کسبیں لے کر الگ بیٹھ جاتا۔ اتنی ڈھیر کڑائیں ساتھ لے کر تو آتی ہے۔ ان کتابوں میں تو خوب دل لگتا ہے مائیرا۔“

صفر پر چڑھا کہ ماہ بانو کو یہ سارا نظر نہیں اس کے سامنے موجود ہونے تک ہے، اس کے جاتے ہی وہ آہستہ آہستہ یہاں کے ماحول میں رچ بس جاتے گی کیونکہ وہ بظاہر غریبی لیکن حقیقت میں ایک مقابہت پسند لڑکی تھی۔ اس وقت بھی اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور صفر کے ساتھ دم اٹھاتی ان راستوں پر چلتی رہتی جہاں شاید اس کا بچپن گزرنا چاہیے تھا لیکن اب یہ راستے بھی کھسار ہی اس کے قدموں سے آشنا ہوتے تھے۔

بڑا بڑا

”ماموں جان! آپ نے یہ کس نصیحت کو میرے پیچھے لگا دیا ہے؟“ شہریار عادل نے ٹیلی فون پر اپنے ماموں لیاقت رانا سے شکوہ کیا۔

”کس کی بات کر رہے ہو بیٹا جی؟“ لیاقت رانا نے تعجب سے پوچھا۔

”وہی بڑا آدمی کے چودھری افکار عالم کی جو آپ سے معلومات حاصل کر کے میرے یہاں پہنچے سے تمہیں ہی سارے بچکے پر قابض ہوئے بیٹھے تھے۔ میرا خاموشی سے یہاں بیٹھ کر چھاپا مارنے کا پروگرام ان کی وجہ سے دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اپنی خاموشی، بیخبر بھاڑ لگائی تھی انہوں نے یہاں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا پس چلنا تو ہمیں قہوں کی سلائی کا بھی انتظام کر رکھتے مگر بس ہی نہیں چلا ہوگا اس لیے اس معاملے میں پیچھے رہ گئے۔“ شہریار نے جیسے اپنے انداز میں بتایا۔

لیاقت رانا اس کے انداز پر قہر مار کر کہیں پڑے۔

”آپ بس رہے ہیں اور یہاں میرا کھول کھول کر مجرا حال ہے۔ موصوفی کل سارا دن کچھ میرا دوسرے بچکے پر قبضہ کیے بیٹھے رہے۔ ملازمین کو احکامات تو بالکل اس طرح دے رہے تھے جیسے وہ میرے نہیں ان کے ملازمین ہوں۔ اس ملاقات میں انہوں نے مجھے اپنا اچھا خاصہ ادبیت نامہ بھی سنا دیا ہے۔ مجھے کس زمیندار سے اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں کس سے نہیں، کس مقامی اثر کو کھاس ڈالنی چاہیے، کن معاملات میں دخل دینا چاہیے اور کن میں نہ جھگڑانے سے

گریز کرنا چاہیے، یہ سب کچھ انہوں نے طے کر کے مجھے الفاظ میں سمجھا دیا ہے۔ ان کے احوال سے لگ رہا تھا کہ ضلع کے تمام کام مجھے اپنی سوا بے یا حکام بالا کی ہدایت کے بجائے ان کے مشورے کے مطابق کرنے ہوں گے۔ آپ سے ان کے تعلقات کتنا خیال کر کے مجھے یہ ساری بکواس ملنی پڑی۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے بڑی خشکی سے انہیں اپنے بیٹھے سے رخصت کیا ورنہ وہ جس اطمینان و فرصت سے بیٹھے تھے، اس سے گلتا تھا کہ شاید مجھے کورپاں بنا کر سلانے کا موڈ بھی رکھتے ہیں۔“

شہریار عادل کو اپنے ماموں لیاقت رانا کی فنی ایک آنکھ نہ بھائی سو وہ انہیں چودھری افکار سے متعلق مزید تفصیلات سنانے کا ہنسی من کر لیاقت رانا کے ضلع سے ایک اور بلند قہر یہ آدہ ہوا لیکن پھر وہ فوراً ہی غیور ہو کر شہریار کو کھانے لگے۔

”سمجھا کر رہو بیٹا جی! ان چودھریوں اور زمینداروں وغیرہ کو بھگتنا بھی تمہاری جاب کا ایک حصہ ہے۔ ان سے بنا کر رکھو گے تو ہی کامیاب رہو گے۔ کیٹھن کا امتحان پاس کر کے اسے ہی لگ جانا اتنا بڑا کارنامہ نہیں جتنا ان کو مجھ جیسے چودھریوں سے بنا کر رکھنا ضروری ہے۔ اور یہ چودھری افکار تو تمہارے علاقے کا سب سے بڑا اور طاقتور ترین سکرمچ ہے۔ نہیں اس کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔“

”میں کوئی کمزوری چھلی تو نہیں ہوں کہ چودھری افکار مجھے ٹھک جائے گا۔“ اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے زعم میں شہریار نے لیاقت رانا کی بات براہِ حق لیں۔

”بے شک، تمہارا شمار بھی مگر چھلوں کی ٹیکٹری میں ہی ہوتا ہے۔ لیکن سسٹم کو چلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ خود کٹر چھلوں میں آپس میں جھڑپ ہو۔ تمہاری تو پیسے بھی یہ چھلی پر پہنک رہے ہیں۔ بہت زیادہ احتیاط سے چھوٹک بھونٹ کر قدم اٹھاؤ۔ آگے تو خیر تجربے سے بہت کچھ خود ہی سیکھ لو گے مگر ابھی احتیاط لازم ہے۔ چودھری افکار کے معاملے میں خاص طور پر احتیاط کرنا ہے۔ میں خود بھی اس سے بھاگنے کے حق میں نہیں ہوں، جب ہی تو تمہارے پروگرام کا مقصد کھنڈے کے باوجود چودھری افکار کے فون آنے پر اسے ہال نہیں رکھا اور اسے تمہارے بارے میں اطلاع فراہم کر دی۔“ لیاقت رانا نے شہریار کو سمجھایا۔

”آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے معاملات میں کسی سے کنسلٹیشن لینا پسند نہیں کرتا۔ اگر چودھری افکار نے مجھے کنسلٹیشن دینے اور مجھ پر تسلط جمانے کی کوشش کی تو ہمارا اختلاف

”میں جانتا ہوں کہ تم کس حوائج کے ہو۔ تمہارے پیسا مزاج تمہاری ماں کا بھی تھا۔ ہم بھائیوں نے حادی زندگی اس کے غم سے اٹھائے تھے۔ اب بھی میں تمہارے غم سے اٹھانے کے لیے تیار ہوں بلکہ میں نے حادی سے بھی تمہارے کہہ دیا ہے کہ تمہارا خاص طور پر خیال رکھو۔ وہ خود انہیں بہت چاہتا ہے۔ انہیں اس کی سبوت حاصل رہے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی اس کے لیے دن سادے ملاقات ضرور کر لیتا۔ اس کے غم سے تمہیں کافی اورسانی مل سکتی ہے۔“ حادی لیاقت رانا کا اپنا بیٹا تھا جو ان دنوں ڈی آئی جی کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔

”مشورے کا شکریہ ماسوں جان! میں کوشش کروں گا کہ اس مشورے پر عمل کر سکوں لیکن یہ بہر حال ملے ہے کہ میں کسی کو خود پر مشاغل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اور پھر میری فکر جس پچھورے انداز میں پرورش کر رہا تھا وہ میرے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت ہے۔ آپ جانتے ہیں اس شخص نے میرے یہاں آنے سے کئی بجے ٹیکہ کا سارا فریج اور پورے وغیرہ تک ڈھونڈی سرشتی سے منہج کر دیا ہے۔ میں نے آج تک کسی اور کو اپنے پندے سے ایک ٹائی پن تک استعمال نہیں کی۔ یہ سب کیسے برداشت کروں؟ جس رنگ میں میں اپنا سامان لے گیا تھا اب یہ چودھری افکار صاحب کی ساری محتاجوں کو کھڑا کر آج ان کی توجہ کو دانا کر دیا ہے۔ اب یہ بات انہیں بری ہی کہہ دو بھی میں ان کی خوشنودی کے لیے وہ سب قبول نہیں کر سکتا تھا۔“ شہزاد عادل نے اپنا کارنامہ سنایا تو لیاقت رانا نے سانس نہ کر دیا۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے حوائج دار بھائی اور تیل پند چودھری افکار کے درمیان مشقیں میں تعصبات کس سطح پر پہنچ سکتے ہیں۔

”تم نے جو کچھ ایک شہزادہ! میں اسے تمہارے لیے اچھا تو نہیں کہوں گا لیکن اب جو کچھ ہو گیا۔ اصل میں چودھری افکار ضلع میں آنے والے اکثر اعلیٰ افسران کا کوئی محتاجوں کے زیر اثر لینے کا عادی ہے۔ عموماً مال کھاس سے ان پوسٹوں پر آنے والے لوگ چودھری کی ان خطبات کو پا کر خوش ہوتے ہیں۔ انہیں اس سے متعلق دیکھنے والے بھی معمول کا ایک حصہ سمجھ کر ان محتاجات کو قبول کر لیتے ہیں۔ تمہارے سامنے بھی کئی بار یہ قصے دہرائے تو تم نے جن نہیں تم پر تو ایک بالکل مختلف بیان ڈھن میں رکھ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس لیے تمہیں چودھری افکار کے رویے سے ایک دم ہی ہلکا سا لگا۔ بہر حال، جو بھی

ہو اب میری یہ بات کان کھول کر سن لو کہ کتنی الامکان تمہیں چودھری افکار اور ارد گرد کے دوسرے زمینداروں سے ہلکا کر دیتی ہے۔ بے شک سپورٹ کے لیے میں اور سارا خاندان تمہاری ایک پر سوچو ہے لیکن کوشش کرو کہ معاملات اس رخ پر نہ جائیں۔ یہ نہیں کسی کی قسم کی بدنامی کا سامنا کرنا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“ لیاقت رانا نے شہزادہ کو سمجھانے کے بعد خوش الحانی کیلئے کہے پر ہلکا۔

”تمی ہاں۔“ شہزادہ نے مختصر جواب دیا۔ جوش و ہول سے بھرے بھرے اس نے جو ان کے لیے اطمینان اور چھوٹوں کی یہ راہ ہلکا کر دیا وہ قابل قبول نہیں تھی۔

”ماہانہ نوے بھی اور شاید تھو سے ملے آتی ہیں۔“ ماہانہ نوے آج کل میں دھجی چار پالی پر پینچی سرکاری زمین صاحب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک کتاب کے مطالعے میں غرق تھی کہ اپنی بہن زہرہ کی آواز پر اسٹارٹ کر دیا۔ تقریباً زہرہ کی ہی عمر کی دو لڑکیاں اس کے سامنے ٹھہری تھیں۔ دونوں لڑکیوں نے شہزادہ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھریوں کے علاوہ کانوں اور ناک میں بھی سستا ماسکی فریڈ نظر آ رہا تھا۔

”ہم دونوں بڑی بے چین تھیں تھیں سے ملنے کے لیے۔ کتنا عرصہ ہو گیا تو گاؤں آئی ہی نہیں۔ ہم بس زہرہ سے ہی تیرے لمحات بات کے قصے سنتے رہے۔“ وہ دونوں نے ہلکی سی اس کے ساتھ ہی چار پالی پر بیٹھ گئیں اور ان میں سے ایک ماہانہ کو پوچھنے لگی۔ ماہانہ نے حوالہ نظر دے کر اپنی بہن زہرہ کو دیکھا۔ وہ ان دونوں لڑکیوں کو پچپان نہیں سکتی تھی۔

”یہ بھی ہے اور یہ شاید۔ ماما! تم نے کی بیٹیاں۔ وہی جن کے گھر کے سامنے قبیل کے زور و خروش بالکل ایک ساتھ گئے ہوئے ہیں۔“ زہرہ نے ماہانہ کی نظروں کا سوال سمجھتے ہوئے اسے یاد دایا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا تم یاد آ گیا۔ یہ سہیں اور شاداب ہیں۔ کسی ہوتی تو گف؟“ ماہانہ نے اپنی یادداشت کے تازہ ہوتے ہی خوش الحانی سے ان دونوں سے پوچھا۔

”تم تو ٹھیک ہیں تو سنا سکتے ہو اور اس وادی کے دونوں کے لیے آئے ہو؟“ چھٹی نے بھی نہ جانی خوش الحانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہانہ سے پوچھا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ رہی تھیں دن رہنے کی بات تو بس پچھترہ دن سے زیادہ نہیں دکھائی گی۔ آج سے میں نے کہہ

دیا ہے کہ آنے والے اس کے اقرار کو مجھے لینے آجائے۔“ ماہانہ نے اپنے پر وگرام کے بارے میں انہیں اطلاع دی۔

”صرف پچھترہ دن۔۔۔ دو برس بھر کی بات ہے، کم سے کم دو بیسے کے لیے تو آتی۔“ شادو نے اعتراض کیا۔

”اسے دنوں کے لیے کیسے آسکتی ہوں؟ مجھے کالج بھی تو جانا ہوتا ہے۔ اس کی سہریوں کی پچھتیاں سمجھتی تو میں آسکتی۔“ ماہانہ نے اسے سمجھا۔

”تو پچھتیاں کوئی صرف دن دن کی تو نہیں ہوں گی تو زیادہ بھی رکھ سکتی ہے۔“ شادو اب نے اسرار کیا۔

”پچھتیاں تو زیادہ ہیں مجھے اپنی پرستانی بھی کرنی ہے۔ اتنے وعدہ کیا ہے کہ اگر میرے گھر آجائے تو مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ دلاؤں گے۔“ ماہانہ نے سکڑ کر بتایا۔

”لے لے، ماہانہ! تو ڈاکٹر بننے کی فکر نہ کر۔ ڈاکٹری کی قسم (سٹیٹ) تو دینی بھی ہوتی ہے۔ جیسے ہائی سکولوں کی ریڈیو سے آتی ہو جاتی ہے کہ وہ تجھے ڈاکٹری پر مامور کرے گا۔“ چھٹی نے جواب کے اس میں کچھ زہرہ کو یاد دہرائی جانے میں جابجائی کی۔

اسے تو اس کی توجہ سے وہ ان کے کپڑوں کے لیے کھانے کا بندوبست کر رہا تھا۔

”کیوں نہیں۔“ بے اور آپا کبھی میری کوئی فرمائش نہیں جاتی۔ میری فرمائش پر ہی انہوں نے مجھے کالج میں داخلہ کر دیا ہے۔ بے کے کہہ رہی تھی کہ وہ سنبھال کر اسے پیسے جوڑے کی کمر اسٹینڈنگ کالج میں داخلہ ہو جائے۔

”میرے تو حوسے ہیں۔ زہرہ بتا رہی تھی کہ وہاں کالج میں تو نے بندوبست چاہی بھی سیکھتی ہے۔ کیا کالج تو بندوبست چلا سکتی ہے۔“ شادو نے کچھ اس انداز میں سوال کیا جیسے اسے زہرہ کی فرمائش کو مدد مل رہی ہو۔

”کچھ بتا رہی تھی کہ زہرہ۔۔۔ اصل میں کالج میں ایف ایس سی کے اسٹوڈنٹس کا این ایس سی کی فرینڈشپ وی جاتی ہے۔ اس قسم سے ملنے پہنچتی تو فرینڈنگ کیلئے اس فرینڈنگ میں پڑھ کرنا بھی سمجھتا ہے۔ اور اور اسٹوڈنٹس کو کہے چلا نا بھی۔ ہماری تو اس فرینڈنگ کے دوران شہزادہ کی بھی کھاس ہوئی تھی۔

اس میں نہیں زہریوں کی سر پرستی کرتا۔ انہیں لگا کہ وہ دوسری چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھتی تھی۔ اس فرینڈنگ کے بعد تو مجھے اور بھی شہزادہ کو یاد کرنے کا خیال تھا۔“

”ہائے! اللہ! یہ سب کتنا اچھا لگتا ہو گا۔“ یہاں گاؤں میں تو بڑی روٹی پھیل گئی تھی۔ روزانہ وہی ایک جیسے کام کر رہا ایک جیسے کوئوں سے ملو اور اسے کو پڑھ کر سواؤ۔

کچھ بھی تو اٹک سے نہیں ہوتا۔ مگر میں نے وہی تک نہیں ہے کہ چلو اس سے ہی دل بہلا لیں۔ پورے گاؤں میں چودھری کی توجہ کے سوا صرف تین ہی وہی ہیں۔ ایک تیرے چاہ کے مگر دوسرا ماسوں کیلئے کہہ کر جس کا پناہ فوج میں ہے اور تیسرا اسٹارٹ آپ کے پاس۔ ہم تینوں میں سے ایک بھی نہ کہ نہیں جاسکتے۔ اب یہ کی اجازت ہی نہیں ہے۔“ چھٹی نے ذی حسرت سے بتایا۔

”تو تو ایسے بول رہی ہے جیسے گاؤں کی باقی لڑکیوں کو اجازت ہو۔ مولوی صاحب نے کتنی سختی سے منع کیا تھا۔ ان دنوں دیکھتے سے۔۔۔ یاد نہیں۔ اب ایسے علاقوں کے چارے میں بتایا تھا کہ میں آج تک کالوں کو چاہتے تھی ہوں۔“ زہرہ نے اپنی جڑھا کر پناہ دینی چاہنے سے انکار کیا۔ چھٹی کی بات سن کر کالوں کو ہاتھ دگنے سے روک دی۔

”بس بس رہے۔ اب تیرے چاہ کا گھر تو تیرا ہے۔ والا اسرار ہے۔ تیرے مشق کرنے دینی کی مانی سے یہ وہی غریب کر بیٹھا ہے۔ جب تو جاہ کر اس گھر میں جاتے تو سارے عذاب و آفات قبول کر دینی دیکھا کرے گی۔“ چھٹی فوراً چپک کر بولی۔

”انہ بات میں تو نہیں ہی وہی دیکھنے والی۔ جس کوئوں سے وہ خود ہی اکیلا دیکھتا ہے۔“ زہرہ نے ایک بار پھر کان پکڑے۔

”جس میرے خیال میں تو تو ہی دیکھنے میں آتی ہوئی۔“ چھٹی نے ہندو اتنے سیدھے تاج کابل کے ہونٹوں دیکھنے کے بجائے معلوماتی پر وگرام دیکھنے تو ہی سے اپنا کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے ذریعے تو کھر چلے دو مقامات اور اجازت دیکھنے کوئوں جاتی ہیں جن تک ہمارے گاؤں میں نہیں ہوتی۔ دنیا جان کی خبریں مل جاتی ہیں ہی وہی۔ اب اسے تو جیسے حال ہی میں گمان کی ہوئی ہے۔

”تم آتا تو ڈاکٹر ہی نہیں کرو۔ تمہیں تو بہت کچھ حاصل ہے۔“ شادو حد بھرے انداز میں بولی۔

”ہاں! تو اللہ کا شکر ہے کہ تم لوگ بھی اسے لے بہت کچھ کر سکتی ہو۔ چھٹیوں تو کم از کم خصوصاً بہت پڑھنا لکھنا ہی سیکھتے ہیں۔ کتابوں کے ذریعے ہی آدمی دنیا جان کی سیر کر سکتا ہے لیکن تو لوگوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔“ گاؤں میں جیسا بھی کچھ ایک اسکول ہے تو۔۔۔ اگر کم لوگ وہاں ہی جاتی رہیں تو اس لائق تو ہو جائیں کہ اردو ہی لکھتے پڑھتے ہیں۔“ ماہانہ نے سوچے غیبت جان کالوں کوئوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"صاف بات ہے ہمیں تو پرے لکھے کا شوق ہی نہیں ہے۔ جنہیں تھا، وہ بھی دو چار ہفتوں سے آگے نہیں چل سکتا۔ اسکوئی میں کوئی استغناء تو ہے نہیں، اب تو کیا اس مرد استاد سے توڑ دینے سے ہیں۔" بھی نے جواب دیا۔
 "یہ مسئلہ تو ہے۔ کہ خدمت کو چاہتے کہ اس سلسلے میں کچھ کرے۔ اگر ایک ایسی ہی نیکر یہاں آجائے تو گاؤں کی بہت لڑکیوں کا بھلا ہو جائے گا۔" ماہ بانے پر خیال لگنے میں مبتلا رہا۔

"کہنے بھی لا۔" بڑھکھ کر ہم لڑکیوں نے کیا کرنا ہے؟ باڈی روٹی، سلائی، کڑھائی، چٹائی سارے کام بغیر کچھ کے بھی آرام سے ہو جاتے ہیں۔" بھی نے گویا ناک پر سے بھی اڑائی۔
 "ابنا کر ماہ بانو تو اصرار آجائے۔ تم ادھر ہمارے ساتھ رہنا اور اسکوئی میں لڑکیوں کو پڑھانا۔" زہرہ نے اپنا تک ہی یہ تجویز پیش کی۔

"میں... میں... کچھ تو ڈاکٹر بننا ہے۔" ماہ بانو پچھلے اس تجویز پر یہ نکالی پر پڑ خیال لگنے میں ہوئی۔

"بیمہ کے لیے تو تمیں پر ایسا ہو سکتا ہے کہ جب کریسوں میں گاؤں کی کسی کھلی پر ملے تو میں یہاں رہنے آ جاؤں اور جن لڑکیوں کو شوق ہو، انہیں پڑھانے لگتا ہوں۔"

"ہاں... ہاں... رہنے دو یہ شاہجی کے منسوب ہے۔ چودھری صاحب کو معلوم ہو گیا کہ کوئی ایسا سوچ رہا ہے تو وہ اس کے ٹوٹے ٹوٹے کپڑے دیکھ کر اس کے انہیں نہیں پہنچاؤ لڑکیوں کا اسکوئی میں پر مڑا۔" بھی نے اپنی گول گول آنکھوں کو کھاتے ہوئے تیر لگے میں ماہ بانو کو گونگا۔

ماہ بانو اس کے اسی انداز پر کچھ ہانگاری مٹھوں کرتی ہوئی دوبارہ اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئی جس کے مطالعے میں وہ ان دونوں بیٹیوں کی آہ سے مل سہی ہوئی تھی۔ اپنی اس مسروریت میں اسے معلوم بھی نہیں ہو سکا کہ بھی اور شاہو نے آنکھوں پر آنکھوں میں کیا تیار خیال کیا اور کب وہاں سے روانہ ہو گئی؟



"بڑی چودھرائی نے بھلا کیا ہے کہ کام پر آتے ہوئے ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ حویلی لے کر آئے۔" نوران مسکرتہ کے اٹھ کر جلدی جلدی گھر کا کام کاج مٹا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور آنے والی نے نوران کا منہ دیکھتے ہی اسے پیغام پہنچایا۔

"ماہ بانو کو بلایا ہے۔ پر کسی نے؟" نوران حیران ہوئی۔ خود اس کا تو جیسوں سے معمول تھا کہ سب سے پہلے نکلتی

کا وقت حویلی والوں کی خدمت کرتے ہوئے گزارتی تھی لیکن چاروں کی مہمان آتی ماہ بانو کو حویلی سے ملانے جانے کا مقصد اسے کچھ نہیں آ رہا تھا۔
 "مجھے تو خبر نہیں، تو جا کر آپ ہی سوال جواب کر لینا دوڑی چودھرائی سے کہ انہیں نے کیاں تیری دلی کو مارا ہے۔" پیغام لانے والی حویلی کی ملازمت نے طریقہ لکھ میں نوران کو جواب دیا۔

"نہ... میں بھلا کون ہوتی ہوں دوڑی چودھرائی سے سوال جواب کرنے والی۔ انہوں نے حکم دیا ہے تو ماہ بانو کو لے کر ہی آؤں گی۔" نوران نے گھبرا کر خوشامدی لہجہ اختیار کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس ملازمہ نے جانکر بڑی چودھرائی سے کچھ اٹا سیدھا کہہ دیا تو اس کی سمیت ہی آجائے گی۔ گاؤں کے بیشتر گھروں کی طرح اس کے گھر کا روٹی بھی حویلی سے ہی وابستہ تھا اور حویلی والے خفا ہوتے تو اسے بزم کی بیٹ پر لڑتے سب سے پہلے مارتے تھے۔

"کھٹک ہے۔ میں چلتی ہوں۔" تو ماہ بانو کو لے کر ہم پر پہنچ جاتا۔ ملازمت سخت سے کئی ہولت کی مگر نوران کے اندر ہول اٹھنے لگے۔ ماہ بانو پہلے بھی کئی بار گاؤں آ کر رہی تھی لیکن اس سے پہلے تو بھی چودھرائی کو اسے حویلی بلانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ نوران کے گھر ہے کہ روٹی میں بڑی چودھرائی کا خاص طور پر پیغام بھیج کر ماہ بانو کو حویلی میں طلب کرنا کی سمیت کا فتنی خیمہ قائم کر کے حویلی میں تیار کر رہی تھی۔ اپنی سوچوں میں گھری ہوئی وہ انداز سے اندر کی طرف چلتی۔ آٹھن میں فہرنگوں والی چھانڈ سے ہم پتہ فرش پر گھر سے ہم کے گھرے ہوئے بچوں کو سمیت کر ایک جگہ بیٹھ کر رہی تھی۔

"نئی زہرہ! جا کر زہرہ ماہ بانو کو گونگا۔" زہرہ کو کھم وے کر نوران خود یاد دہانی خائے کی طرف چلی گئی۔

"وہ نہیں اچھی اماں! لگتا ہے مردوں سے شرط ہانڈہ کر سکتی ہے۔" چودھری دیر بعد ہی زہرہ نے آ کر بے زاری سے اطلاع دی کہ

"اچھا تو ادھر آ کر یہ دو دو ہو۔ میں آپ ہی اسے دیکھتی ہوں۔" نوران اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ زہرہ نے خود اپنی اس کی جگہ مہال لی۔ زہرہ دیکھ کر اس کے ساتھ ہی جاگ جاتی تھی اور گھر کے کاموں میں دوڑ دوڑ کر نوران کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ آج بھی اس نے غایت کے کھتوں پر دوڑتی سے پہلے اس کا اور چھوٹے بھائی الین کا ہاتھ تیار کر کے دیا تھا اور اب گھر کی صفائی سہرائی میں مصروف تھی۔ نوران کی بڑی بیٹی لکڑی بھی

اپنے پیار سے نقل ای طرف اس کا ہاتھ بٹاتی تھی لیکن ماہ بانو اپنی بڑی دونوں بہنوں سے منسوب تھی۔ شہری زندگی اور گاؤں سے دوری نے اس کا حراج اور معمولات بدل دیے تھے۔ اب بھی نوران آٹھن سے گزرتے کرتے ہیں مگر اسے ماہ بانو کی طرف سے دیکھ دینا واقفیت سے خبر ہوئی ہوئی تھی۔ اس کی بے حد کڑی تنقید کو کچھ قطعاً نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کچھ دیر قبل کسی نے اسے بچے کی ہر پرورش کی تھی۔

"ماہ بانو! اچھا۔" دیکھتا دن قبل آیا ہے۔" نوران نے نرمی سے ماہ بانو کا ہاتھ پڑا دیا۔ اسے آواز دی لیکن وہ اس بار پر خوار سا کسم کسم دوسری طرف کر دیا۔ اسے دوسرا بار سوچی نوران کو انداز ہو گیا کہ روٹائی آسانی سے سبز چھوڑنے والی نہیں۔ خود اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کچھ بھی ماہ بانو کے بازو پر صفائی دیتی۔ اسے وقت پر حویلی پہنچنا تھا، وہ بھی ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے کر چنانچہ اس بار اس نے نرمی اور صروت سے کام لینے کے بجائے ماہ بانو کے اوپر سے لفٹ کھینچا اور اسے وہی طرح بھینچا ڈالا۔ ماہ بانو نے اس دہری افادے سے گھبرا کر آنکھیں کھولی دیں۔

"کیا ہے اس؟" انہوں نے سوچے پوچھ کر گئی ہو؟ ابھی تو سوچ میں پوری طرح نہیں نکلا۔ ماہ بانو نے ستر پر بیٹھ کر ان کی لینے ہوئے استغناء کیا۔

"گئی اتنی دیر نہیں ہے۔" اچھا صاحبان نے جڑا آیا ہے۔ اب سوچ کر کے اندر آ کر تو گھٹے سے رہا۔ تو باہر نکلی دیکھو۔ اچھا صاحبان! وہاں ہے۔ زہرہ نے گھٹنا پر پہلے اٹھ کر آدھا کام کاج بھی ختم کر لیا ہے لیکن تو ابھی تک پریشوں کی طرح کمر پر بیڑی ہے۔ نوران نے تیر انداز تو بڑی خراب کر دیا ہے۔ کچھ اتنی دیر تک پڑی ہوئی رہتی ہے۔" نوران نے خلاف تکرار کر گھر دیکھے ہوئے اسے پکارا۔

"تو نہیں کیا کرتی پرانا ہے اماں اور ہاتھ دیکھے سے ہے اس کے ساتھ ہی ہے۔" اگر نہیں میرا ہے چھانک کر رہتا بھی اچھا نہیں لگتا تو میں اپنا ہوا جاتی ہوں کہ آ کر مجھے دیکھ لے جائیں۔" ماہ بانو نے گھٹنا دیکھا۔

"اچھا۔ اب زیادہ دلی سیدھی باجس نہ کر۔" باہر نکلی کر منہ ہاتھ دھو۔ زہرہ نے تیر انداز تیار کر دیا ہو گا جا کر کھائے۔" نوران اچھی طرح جانتی تھی کہ ماہ بانو کے دل میں اس کے خلاف شہ ہے مگر اس کے پاس اپنی صفائی میں کھینچنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہ بانو کو گھر کا۔ ماہ بانو چھل چھل میں ڈال کر کمر سے باہر نکلی۔ باورچی خانے سے مدد مانگی کی گھر

گھر رستانی دے رہی تھی۔ وہ سوچی غسل خانے میں چلی گئی۔ وہاں سے اٹھ کر بڑا کدے میں بیچے پینک ہوا پھل آ کر تیشی لڑہرہ ڈالنے آئی۔
 "جلی چھین کھا۔" تجھے وہ بوری ہے۔ تجھے میرے ساتھ حویلی چلنا ہے۔" نوران نے اسے حکم دیا۔
 "کیوں؟ میں کیوں ہاں کیا ہمارے ساتھ حویلی؟" ماہ بانو بدی۔

"دوڑی چودھرائی نے پیغام بھیجا ہے کہ تجھے ساتھ لے کر آؤں۔ تو میرے ساتھ چل کر انہیں سلام کر لینا پھر وہاں آ جانا۔" نوران نے اسے بھانے کی کوشش کی۔
 "مجھے نہیں جاتا بیڑی چودھرائی کو سلام دلا کر کہے۔" ماہ بانو نے صاف انکار کیا۔

"دیکھ ماہ بانو! مجھے جگہ نہ۔ دوڑی چودھرائی نے خود سے تجھے بلوایا ہے۔ اگر تو نہیں کی تو دیر مانے کی اور پھر تجھے وہاں جا کر کرنا ہی کیا ہے۔ مرام کر کے ایک طرف بیٹھ جا۔ میں موقع دیکھ کر توڑی ہی پریشوں تجھے کسی کے ساتھ دیکھ کر بھگا دوں گی۔" نوران نے ماہ بانو کو بھانپا۔ ماہ بانو اس کے کھینانے بجائے کا تو فخر کیا اڑھتا لیکن ماں کی تجویز کا خیال کر کے چپ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ حویلی والے کتنے نازک مزاج لوگ ہیں۔ ماہ بانو کے انکار کو مانا کا مسئلہ بنا کر وہ لوگ اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں پر گاؤں کی زمین تنگ کر سکتے تھے۔ ماہ بانو نے اس چھوڑ دیا۔ قیام کو اپنے گھر والوں کے لیے سمیت کا باعث نہیں بننا چاہتی تھی چنانچہ دل میں ماہ بانو کی محسوس کرتے کے باوجود ٹوڑی ہی وہاں میں چادر اوڑھ کر نوران کے ساتھ حویلی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

"سلام کر کے ایک طرف چلی کھڑی ہو جانا۔ زیادہ چل پڑ کر کے کی ضرورت نہیں ہے۔" حویلی کی طرف جاتے ہوئے نوران اسے بھر ماہ بانو کو روک دیا۔ وہ تھری۔ وہاں سے وہ خود بڑی چودھرائی کے ماہ بانو کو بلوایا بیٹھے پر ہرمانی ہوئی تھی اور کسی انہونی کے ہونے کے واسطے پہلے سے فتنے بندیاں کر کے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

"سلام دوڑی چودھرائی۔" حویلی پہنچ کر نوران نے سب سے پہلے بڑی چودھرائی کے سامنے حاضر دی اور اس کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ ساتھ ہی اس نے ماہ بانو کو بھی گھنٹا مار کر سلام کرنے کا اشارہ کیا۔

"السلام علیکم ہی! انہوں نے دیکھی آواز میں سلام کیا۔" چودھرائی نے چودھری اچھی کی بے میں پہلے گھر پر اور پھر

میں سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے وہی چودھرائی کہلاتی تھی، سلام کا جواب دینے کے بجائے یہ غور نامہ بانو کا جانکدہ لینے لگی۔ ماہ بانو اپنی بیٹیوں کے مقابلے میں لاکھ کھلے ماحول میں اور آزادی سے ہل چڑھتی تھیں لیکن بڑی چودھرائی کی خود پر مبنی تقلید بھری کاٹ دار کا ہول سے کہنے لگی۔

”شہر کی گزریوں کی طرح ہنسی کٹی ہے۔ تو نے تو بہن کو اپنے گزری دے کر اس کا نام مار دیا ہے تو اس۔“ ماہ بانو کے سادہ سے کالین کے موٹ اور بڑی ہی چادر کے باوجود بڑی چودھرائی نے تو ہی سادہ کر لیا۔

”کیا کرتی تھی اماں جانی کے آنسو اور اکلیا پن بھی تو نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس نے جہولی پھیلائی تو منہ نہیں کر سکی۔“ نوران نے خوشامدی سے لہجہ میں ہی چودھرائی کے سامنے عذر پیش کیا۔ ماہ بانو اپنی جگہ گزری چپ چاپ ہونٹ چٹکتی رہی۔

”تاہم وہاں شہر میں رہ کر بڑی اونچی اڑان بھر دی ہے جہولی میں۔ شہری لڑکیوں کی طرح پڑنے کے لیے کالج بھی جاتی ہے۔“ بڑی چودھرائی نے قہر تو دیکھے مگر خود جرم مان کر اس کا ہونا دل سے کوئی عتاب نہیں بن پایا۔ وہ تو خواہ ماہ بانو کے کالج میں پڑنے سے زیادہ خوش نہیں تھی، چنانچہ بڑی چودھرائی کی بات سن کر چپ چاپ سر جھکا کر گزری رہی۔

”بھلے سے تم نے توئی اپنے بہن بھائی کو کوہ و سہی ہے لیکن ہے تو یہ چادری اپنی ڈی۔ بڑی ذات کے اس طرح آزاد بھر نے ہم لوگوں کو حقیر نہیں آئی؟“ انہیں چاہیے تھا کہ اس کے خالہ خالو کو اس کا بیٹے سے متح کر گئیں اور اگر وہ لوگ نہ ہاتے تو اسے واپس اپنے پاس یہاں گاؤں لے آتیں۔ جہاں ہم تمہارے سامنے کنبے کو پالی رہے ہیں، وہاں یہ ایک اور بھی پل جاتی۔“ بڑی چودھرائی نے تقریر کرتے ہوئے نوران پر کلمات کا احسان نہ کیا۔ حالانکہ یہ وہ احسان تھا جس کو تارے اتار تے نوران اور غیاث کی بڑیاں تک کہنے کی جگہ لیکن ظاہر ہے بڑی چودھرائی کو یہ بات جانی نہیں جاسکتی تھی۔ چنانچہ برسوں سے غلامی کی زنجیروں میں بکڑے ذہن اپنے کسی حق کو پہچانتے ہی کہاں تھے۔

اس وقت بھی بڑی چودھرائی کی کسی بات پر بردا ماننے کے بجائے نوران کا ذہن مسلسل اس فکر میں اٹکا ہوا تھا کہ جانتے جس بدخواہ نے چودھرائی کے کان بھر کر اسے نوران اور ماہ بانو کے خلاف بھڑکایا ہے، وہ نہ جانی کی بڑی چودھرائی کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوئی تھی کہ وہ برسوں پہلے فیصل آباد میں نوران اور مسعود کو کوہ و سہی جانے والی ماہ بانو کے

بار سے جس تہنیت سے آگاہ ہوئی۔

”مسعود سے لینے والے جوتے اس سے بات کر دیں گی مٹی۔ وہ میرے کہنے سے ماہ بانو کو کالج سے اٹھا لے گا۔“ بڑی چودھرائی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے نوران نے اسے تسلی دی لیکن ماہ بانو اس بات کو سن کر تڑپ اٹھی۔

”میں ہرگز نہیں کالج جانا چاہتی چھوڑوں گی۔“ جذبات میں آکر وہ نوران کی طرف سے عائد کردہ جرم زبان بند کی تو قراموش کر رہی تھی۔

”تو چپ کر۔“ نوران گھبرا کر ماہ بانو پر اٹھی۔

”بھائی، بھائی، اسے تو اس بات میں بھی تو معلوم چلے کر تعلیم (تعلیم) نے اس کی زبان کے کہنے کا کھنکھول دی ہے۔“ بڑی چودھرائی نے طنز کیا۔

”بھئی ہے مٹی اور ہر کے طور طریقوں کو نہیں جانتی۔ آپ معافی دے دیں۔“ نوران نے ہاتھ جوڑے۔

”تو پھر کھانا اسے طور طریقے بلکہ ایسا کہ جب تک یہ یہاں ہے اسے پابندی سے روز اپنے ساتھ چلی لے کر آ۔ یہاں دوسری مورتوں کے ساتھ اپنے بیٹے کی سب قیود کو کھانے کی اور دماغ میں بات دینے کی۔“ چودھرائی نے جلد باز انداز میں حکم سنایا۔ نوران اور ماہ بانو دونوں ہی اس اٹا چر ہر اسامی ہو گئیں۔

”اسے جانے دیں جی تو اور کھڑے دن کی مہمان ہے پھر تو فیصل آباد واپس چلی جائے گی۔ ویسے بھی اسے کوئی کام کاج کہاں آتا ہے۔ اس کے کوئی آئے سے کوئی قید و (قائد) نہیں ہو گا۔“ نوران نے عاجزی سے بڑی چودھرائی کو اس کا حکم واپس لینے پر اصرار کرنے کی کوشش کی۔

”یہ کھڑے دن کی مہمان ہے، یہ نہیں تو اور ہی رہتا رہتا ہے۔ یا تمہارا بھی ارادہ ہے وہی گئے ساتھ اس گاؤں کو بھڑو جانے کا؟“ چودھرائی نے تھکے لہجے میں جو دمکی پیدا ہوئی تھی اس نے نوران کے چہرے پر مکمل ڈال دیا۔ ماہ بانو بھی اپنی جگہ ہٹکا ہوا اور بھی ہوئی گزری رہی۔

”سرا چودھرائی اتھار کا کشتی اللہ رکھا آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔“ شہر پار حائل ایک فائل کے مطالعے میں مہمک تھا کہ اپنی عہد اللہ انان نے اتر کام پر اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر شہر پار کو شہر کا کھٹ کا احساس ہوا۔ پرانے اسے ہی سے جارت لینے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ ضلع کو درجن مسائل اور دیگر معاملات کو جلد از جلد سمجھ لے تاکہ فرائض کی ادائیگی میں آسانی رہے لیکن یہ وقت ہے وقت کے

ملاقاتی اسے ڈھنگ سے اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مہلت ہی نہیں دے رہے تھے۔ اول روز تو چودھرائی اتھار کا اس پر مکمل طور پر قبضہ ہوا اور صرف وہی لوگ شہر پار سے مل سکے جو چودھرائی اتھار کے ساتھ اس کے بیٹلے پر آئے تھے۔ یہ سارے لوگ کسی نہ کسی حوالے سے چودھرائی کے رشتے دار تھے اور شاید انی بوجہ سے چودھرائی اتھار کی موجودگی میں شہر پار سے ملاقات کی رعایت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ان افراد کے سوا کوئی اور شخص اس دن شہر پار کے قریب پرانے کی کوشش بھی نہیں کر سکا تھا۔ اب وہ سارے محروم رہ جاتے والے افراد کو فوج ملاقات کے لیے اس کے پاس آتے رہے تھے۔ ان افراد میں زیادہ تر اوراد کے دیوانوں میں رہنے والے جھوٹے زمیندار شامل تھے جو ملاقات کے لیے آتے ہوئے شہر پار کے لیے تھے تھک کر بھی ساتھ لاتے تھے۔

لیاقت رام کی دیہات کے بیٹے تھک شہر پار نے ان تمام کو واپس لوٹنے کی کوشش یا بل نہیں کی، البتہ وہ خود انہیں استعمال کر کے پندرہ تیس کر تھا۔ چنانچہ اس کے زیر نگرانی کام کرنے والے اشاف کے عزم سے آئے ہوئے تھے اور وہ سوشل اڈا رہے تھے۔ ملاقات کی دوسری قسم فیلڈ میں تہنیت مختلف سرکاری افسران کی بھی جوتے اسے ہی سے بنا کر کہنے کے خواہش میں نظر آتے تھے لیکن ان کے اعزاز میں تسنیم کا چھوڑا نہیں تھا۔ خود شہر پار بھی ان افراد سے ملاقات انکلیا نظر سے بہتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ جیلے روپ سے مسکراتے اور دوسرے روپ سے ضرورت ملاقات کا فریضہ انجام دیتا رہتا تھا۔ اس وقت چودھرائی اتھار کے قریب کی آبادی سے صرف تا کواد گزری تھی بلکہ اس کے کام میں عروج کا بھی سبب بنی تھی لیکن کھلے بندے نے مصلحت کے طوق سے اسے تا کواد کی کے انکبار کو موقع نہیں دیا اور بدلے کا خواہش اسے عبد اللہ انان کوئی کواد بھیجے کی اجازت دینی پڑی۔

”سلام اسے ہی صاحب؟“ مٹی نے اندر داخل ہوتے ہی زوردار آواز میں سلام بھجا دیا۔

”بھئی۔“ اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے شہر پار نے مٹی سے کہا تو وہ دینے سے سانسے پڑی کر رہی پر براہمان ہو گیا۔ وہ چودھرائی اتھار کا کشتی تھا۔ اسے چودھرائی کے دست راست، اور راز داراں ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ وہ اعزاز تھا جس نے مٹی کی گردن میں سر پافٹ کر کے اس کی گردن میں چودھرائی اتھار یعنی تو نہیں مگر بھی خاصی اثر پیدا کر دی تھی۔ سر پر کر کے اٹھنے والے مسند لطف لگے کرتے اور چوٹا فوٹی والے نہ ہند کے ساتھ وہ خود بھی کوئی چھوٹا موٹ

”بھئی۔“ اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے شہر پار نے مٹی سے کہا تو وہ دینے سے سانسے پڑی کر رہی پر براہمان ہو گیا۔ وہ چودھرائی اتھار کا کشتی تھا۔ اسے چودھرائی کے دست راست، اور راز داراں ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ وہ اعزاز تھا جس نے مٹی کی گردن میں سر پافٹ کر کے اس کی گردن میں چودھرائی اتھار یعنی تو نہیں مگر بھی خاصی اثر پیدا کر دی تھی۔ سر پر کر کے اٹھنے والے مسند لطف لگے کرتے اور چوٹا فوٹی والے نہ ہند کے ساتھ وہ خود بھی کوئی چھوٹا موٹ

زمیندار ہی دکھائی دیتا تھا۔

”کیسے آتا ہوا اللہ رکھا؟“ مٹی کو کسی طرح کی انگلی کا موقع دینے سے بچنے کے لیے شہر پار نے فوجی اس سے اس کی آمد کا مقدمہ روایت کیا۔

”اس بھٹے کو چودھرائی صاحب کے ادا حضور جناب مراد عالم شاہ صاحب کا سالانہ عرس مبارک منفقہ کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر بھٹے کے علاوہ لاہور، فیصل آباد، ساہیوال اور دوسرے شہروں سے بھی خاص خاص املاہ کو دعوت کیا جاتا ہے۔ آپ کے لیے بھی چودھرائی صاحب جناب نے اس موقع پر خصوصی دعوت نامہ ارسال کیا ہے۔ چودھرائی صاحب خود تشریف لائے لیکن گھوٹا گول مسر دہات کے باعث انہیں سکھ نہ رہا۔ انہوں نے مجھ سے آپ کی شرکت کے لیے خصوصی اصرار کر رکھا ہے۔ آپ کی عمر میں آمدان کے لیے باعث خوشی ہوگی۔“

اللہ زبان والی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مٹی اللہ رکھا نے دعوت نامہ شہر پار کی طرف بڑھایا۔ سر پر اٹھیں کپڑے پر شہر پار کی طرف سے قہر کر دیا۔ دعوت نامہ مظاہرہ کے ان بیانات کی یاد تازہ کر دیا تھا جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ چودھرائی اتھار کی حیثیت بھی اس علاقے میں کسی مطلق العنان بادشاہ سے کہیں بھی، چنانچہ اس کی طرف سے آنے والے دعوت نامے کو اتنا شان دار ہونا ضروری تھا۔

شہر پار نے دعوت نامے کا ایک سرری سا جائزہ لینے کے بعد اسے لپیٹ کر ایک جانب رکھ دیا۔

”آپ عرس شریف میں تشریف لائیں گے نہ جناب۔“ شہر پار کا انداز دیکھتے ہوئے مٹی اللہ رکھا نے اس کی شرکت سے متعلق یقین دہانی کرنا ضروری سمجھا۔

”میں پوری کوشش کروں گا۔“ شہر پار نے بے غمازی سے جواب دیا۔ جانتا تھا اسے پڑے گا، وہ بات ابھی طرح کہتا تھا لیکن چودھرائی اتھار یا اس کے کسی نمائندے کے سامنے بالکل ہی سیرال ہونے پر تیار نہیں تھا۔ اسے اپنی شخصیت کا بوجہ رادہ و تری بہر حال قائم بھی لگی۔ شہر پار کے اس انداز پر مٹی اللہ رکھا اپنا تازہ و تری بیان توجہ کر کے اس کی شرکت پر اصرار کرتا رہا لیکن شہر پار نے اس کی روانگی تک بھی اپنا اتنا زہم ہی رکھا۔

”یہ کیا سلسلہ ہے بھئی؟“ مٹی کے روانہ ہوجانے کے بعد شہر پار نے عبد اللہ انان کو طلب کیا اور اسے دعوت نامہ دکھاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”چودھری صاحب کے دادا منصور کا عرس مبارک۔ آپ اس عرس کے مسئلوں سے واقف نہیں ہیں؟“
عبداللہ ان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
”واقف ہوں لیکن یقین نہیں آتا کہ چودھری افتخار کے خاندان میں بھی ایسا کوئی مردوسن گزرا ہو گا جس سے لوگ اپنی عقیدت دھیں کہ باقاعدہ اس کا عرس منایا جائے۔“
شہزاد نے صاف کوئی سے ایسے شک کا اظہار کیا۔ اس بار عبداللہ ان کی مسکراہٹ بہت واضح تھی۔
”یقیناً اگر اسے اپنے اور شہزاد کے درمیان خط مراہب کا خیال نہ ہوتا تو یہ مسکراہٹ ایک زوردار تھپک مار پڑ جارتی۔ مسکراہٹ پر بھی اس نے غول میں قابو پایا اور باہریت محافت سے شہزاد کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتاتے لگا۔

”چودھری افتخار کے خاندان میں کافی عرصے سے بڑی سریدی کا یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ دسی لوگوں کی عقیدت کی بات تو یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں اور نہ ہی اس کے لیے بڑے صاحب کے مردوسن ہونے کی کوئی شرط ہے۔ جہالت اور غربت کے بارے یہ لوگ جن کے پاس وسائل کے مقابلے میں مسائل کا ذمہ لگ رہا ہے، ہمیشہ کی ایسے بھڑائی یا جاوڑائی سہارے کے ساتھ رہتے ہیں جس کے ذریعے وہ اپنے اصل ہونے والے مسائل و مصائب سے نجات حاصل کر سکیں۔ ان لوگوں کے لیے بڑے صاحب کی کرامات کے چند قصوں کے ساتھ انکار کرتے والوں کے ہیبت انگ انجام سے متعلق واقعات کا ذکر کیا کر دیتا جس کافی ہوتا ہے۔ بس یہی جھگڑنے والوں کے جو چودھری افتخار کے دادا منصور نے استعمال کیے ہوں گے، بعد میں تو سلسلہ پھل نکلا۔ اب یہ حال ہے کہ دور دور تک ان کے عقیدت مند پائے جاتے ہیں۔ دادا کی موت کے بعد چودھری افتخار کے والد نے بڑی ہی یہ گہری سنبھالی اور اب چودھری صاحب خود کو دیکھ کر پریشان ہیں۔ ایک طرف آپائی زمینیں ہیں تو دوسری طرف آپ کی قبروں پر بتائی گئی درگاہ زمینیں سونے جیسی نکلیں اس کی ہی اور قبروں پر سونے جیسی کے نذرانے چڑھائے جاتے ہیں۔ چودھری افتخار دونوں طرف سے مزے میں ہے۔

عبداللہ ان کی تجزیہ کارانہ بولنے پر مختصر عرصے میں ہی شہزاد کی شخصیت کی راست بازی کو بھانپ لیا تھا۔ اس لیے اس وقت وہ بہت کھل کر شہزاد کو کافی کچھ بتا گیا تھا۔ عبداللہ ان سے حاصل کردہ معلومات پر اندر ہی اندر حیرت میں چلا شہزاد نے ان معلومات پر بنا کوئی تبصرہ کیے عبداللہ ان سے مشورہ لینے ہوئے پ پچھا۔

”تجربہ راز کیا خیال ہے، مجھے چودھری افتخار کی دعوت پر عرس میں شرکت کے لیے جانا چاہیے یا نہیں؟“
”بالکل جانا چاہیے۔ سر! اختلاف کو بھرتے رکھو اور اگر دوسرے کے حالات سے ہنجر رہے کے لیے اس عرس کی دعوتوں میں شرکت کرنا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔“ عبداللہ ان نے فوراً جواب دیا۔

”چلو تمہیں ہے پھر یہ سواططے پا گیا۔ اب تم ایک کام یہ کرو کہ آئے والی درخواستوں میں سے ان افراد کی درخواستیں جو پہلے بھی اپنے مسائل کے لیے یہاں موجود کرتے رہے ہیں، انہیں کر کے اور ساتھ ہی دیکھا دیکھ کر موجود ہو سکی درخواستیں بھی لگوا کر لے دو۔ میں یہ بتا ہوں کہ ایسے معاملات جو برسوں سے اٹکے ہوئے ہیں انہیں ترجیح بنیادوں پر پہلے دیکھوں۔ پھر باقی چیزیں بھی انشاء اللہ ایک ایک کر کے دیکھیں اور میں تم کو آگاہ کروں گا۔“

”او کے سر۔“ شہزاد نے حکم پر عبداللہ ان سے مستعدی سے جواب دیا پھر دوسری کوئی خیال آنے پر کہنے سے باز رہا جاتے جاتے پچھا۔ ”سر! چودھری صاحب کا شیخ اپنے ساتھ چلوں اور مصلحتی کے لوگوں سے لاپرواہی کا کیا کرتا ہے؟“

”کسی قریبی رشتہ میں بھجوا کر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دو۔“ میر حے نے میری اور میرے باپ دادا کی کمائی کافی ہے۔ چودھری افتخار کے بزرگوں کی ”برکت“ سے فیض یاب ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔“ شہزاد نے جواب دیا تو عبداللہ ان سر کو بھی غصہ دیتا ہوا کہ اسے یہ باور لگ گیا۔ اس بار اس کا واسطہ ایک مختلف عرصہ پر آئے والے ہی سے بڑا تھا اور عبداللہ ان کا قبضہ بہت بڑا تھا کہ آئے والے وقت میں بہت کچھ مختلف ہونے والا ہے۔

بڑی چودھرائی کا حکم باگوار کرنے کے باوجود ماہانہ آگے صبح کو اس کے ساتھ حویلی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ پہلے چل کر اس نے بڑی چودھرائی کے عرس کو مانتے سے صاف انکار کر دیا تھا لیکن اس کے قائل کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی۔ نو ران کی ان کوششوں پر بے زار ہو کر ماہانہ کو نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ آج شام ہی وہاں فیصل آباد چلی جائے گی۔ اس کے اس اعلان پر نو ران باقاعدہ منت سماجت پر تیار آئی تھی۔ اس نے ماہانہ کو لے آگے ساتھ جوڑ کر اس کے ارادے سے چل رہے کی استدعا کی تھی۔ ماہانہ کو لے اپنے کے پاس باپ کے خلاف دل میں شکوہ دیتی تھی اور خوراک اور

منصور کو ان پر ترجیح دیتی تھی لیکن حویلی تو بہر حال نو ران کی سی اولاد اس سے ماں کے اپنے آگے بندھے تھا نہ دیکھے گئے اور وہ اپنے دل پر قبضہ کر کے اس کی بات مانتے پر آمادہ ہو گئی۔ نو ران خود بھی جانتی تھی کہ ماہانہ کو لے کے حویلی کی جاگزی ایک عجیب سی بزدلانہ کام نہایت ہو گا لیکن وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ اس کے بارے میں خاندان کی کہ کا مسئلہ تھا۔ ماہانہ کو کا انکار حویلی والوں کا مطالبہ بن کر ان سب پر نازل ہوتا۔ بڑی چودھرائی کی جھمکی سے صاف ظاہر تھا کہ اگر اس کی بات نہیں مانی تو جو کچھ اس کی زمین نو ران کے کھرانے کے لیے تنگ کر دی جائے گی۔ یہ زمین تنگ ہو جاتی تو وہ لوگ کہاں جاتے؟ اس زمین سے ان کا روزگار اور رشتے تھے تھے۔ یہاں ان کے بزرگوں کی بڑیاں کڑی تھیں۔ بڑی بڑی شاخیں مایہ گاہوں میں مایہ مستان کے بیٹے انور سے بچا تھا ہوئی تھی۔ وہ بڑے کارکن تھے اپنے چاچا کے بیٹے ب نواز سے ملے تھے۔ رے نواز کمانے کے لیے دفن کیا ہوا تھا۔ اگلے ماہ اس کی یاد متوجہ تھی۔ وہ مختصر بھی پرکھوں آکر وہاں دو ماہ دفن چلا جاتا۔ اس عرس میں انہیں زہری شادی کی تیاری کر کے اسے چاہتا تھا۔ شادی کے اتراجات کے لیے رقم چودھری تھا سب کچھ رقم کی یہ فراہمی پہلے ہی نو ران اور غیاث کے نزدیک مشکوک تھی۔ وہ لوگ ابھی تک نکاح کی شادی پر لیا جانے والا قریبی نہیں اٹا رہے تھے۔ ایسے میں زہری کی شادی کے لیے حویلی پر قرض طلب کرنا تو ایسا اچھا خاصا مشکل اور پریشان کن مصلحت تھا۔ ان حالات میں اگر ماہانہ کو بڑی چودھرائی کا حکم مانے سے انکار کر دیتا تو وہ لوگ کیا کرتے؟ چنانچہ نو ران نے اپنی بھجوریں اور مشکلوں کا واسطہ دے کر باآخرا ماہانہ کو کو رشتہ میں لے کر لیا اور اب حویلی جاتے ہوئے وہاں نو ران کے ساتھ تھی۔

”سلام دوڑی چودھرائی۔“ حسب معمول نو ران نے حویلی پہنچ کر سب سے پہلے بڑی چودھرائی کی خدمت میں حاضر ہو دی۔ کئے کو اس حویلی میں چودھری افتخار کی دوسری بیوی بھی رہتی تھی لیکن حویلی پر حکمرانی بڑی چودھرائی ہی کی تھی۔ حویلی کے اندرونی امور میں اسی کے احکامات کو سب سے زیادہ ترجیح دی جاتی تھی چنانچہ ملازمین بھی سب سے زیادہ اس کی جاگزی کرتی تھیں۔

”آئی تیری لاڈلہ سے ساتھ۔ چل یا چھا ہوا۔“ بڑی چودھرائی نے ماں کی تقلید میں دھیرے سے سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہو جانے والی ماہانہ کو کو تھیں نظر سے گھورا اور پھر اس کا پھر غور جائزہ لینے لگی۔ آج ماہانہ کو نے نو ران کی

ہدایت پر حویلی آنے کے لیے اپنے کپڑوں کے بجائے ترہر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ دھڑلہ لگے۔ یہ ہاتھ سے کپڑے بڑی چودھرائی کی آنکھوں میں اطمینان کے رنگ لے آئے۔

”اسے پچھلے والا دن میں چاہل صاف کرنے والی سورتوں کے ساتھ لگاؤ۔“ کسی اور کا جو کہنے تھے لیکن حویلی میں بڑی چودھرائی نے غصے سے نو ران کو حکم دیا تو فوراً ہی ماہانہ کو کا بازو دھام کر کے کھینک لے گئے تھے۔

”سن! بڑی چودھرائی نے پیچھے سے آواز دے کر دیا۔“
”تھک رہی چودھرائی۔“ نو ران رازاً متوجہ ہوئی۔
”کسی کو بھیج کر زہرہ کو بھی بلا لے۔ چاروں دھکے ہیں عرس میں۔ حویلی کھیا کرنے والے بہت کام پر ہے یہاں تک کہ حراسوں کو تو بھی خود سے اس بات کا خیال نہیں آتا کہ کام کے وقت آپ ہی اپنی مہارائی کو کھول لیے آؤ۔“ وہ اپنے مطلب کے لیے جب دھمکی دیتی تھی تو کچھ بڑکے بڑے جانتے ہو۔ اب بھی مجھے خبر ہے کہ اگر اس کے وقت سارا بھر سرنگوں کی طرح ٹوٹ پڑے گا لیکن کام کرنے سے تم لوگوں کو کوئی آتی ہے۔“

”معاف کر دیں دوڑی چودھرائی! بس میری مت ماری تھی کہ مانتے کی بات کا خیال نہیں آیا۔ میں ابھی کی کوشش کر رہا ہوں کہ لوگوں کی بات۔“ چودھرائی کے بے شکاٹانے پر نو ران کے سامنے پر ایک نیک بندہ اور نہیں ہوا اور اس نے بڑی عاجزی سے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے بڑی چودھرائی کو کھلی دسی کیلئے زہرہ بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ بڑی چودھرائی نے نو ران کی اس عاجزی کے جواب میں ایک ٹوٹ بھری ”اوبھہ“ کی اور کسی دوسری طرف متوجہ ہوئی۔ نو ران، ماہانہ کو کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ پچھلے والا دن کی طرف جاتے ہوئے اس نے راستے میں رگ کر حویلی میں ہی کام کرنے والے بارہ دھیرہ سال کے لڑکے کو زہرہ کو کو لے کر لے کر کی طرف روانہ کیا اور پھر ماہانہ کو کو کو لے کر پچھلے والا دن میں پہنچ گئی۔ یہاں گاؤں کی کئی عورتیں چاندنی کے ذمیر کے سامنے ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں بھجور کے پھل تھے۔ بے ہوش بے ہوش سب تھے جن میں چاہل ڈال کر وہ بڑی چودھرائی سے انہیں پھلک پھلک کر صاف کر رہی تھیں۔ نو ران نے ماہانہ کو کو کی قطار میں بڑھ کر ایک سوپ اس کے ہاتھ میں دیا اور خود بھی خانے کی طرف چلی گئی۔ اس کے آگے سے عروں کی دھڑلہ کا کام تھا۔ کئی افراد پر متکمل اس حویلی میں جہاں ہر وقت کی

مہمان داری بھی گی ریتی تھی، بڑی دھوم سے کام پڑے مسلسل سے چادری پڑھتا تھا۔ نوران کے علاوہ بھی کچھ دوسری عورتیں اس کام پر مامور تھیں۔

”جس چل بیٹھی کر اور شروع ہو جا۔ خالی بیٹھ کر صبح قراب کرنے کی نہیں ہو رہی اور۔“ نوران کے جاتے ہی وہاں کام کی بھرائی پر مامور ایک عورت نے ماہ بانو کو بلایا۔ ماہ بانو نے اس ذات پر فوراً سب اٹھایا اور دیگر عورتوں کی تقلید میں سوپ میں چال ڈال کر پھٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ حوران نے اسے ٹھہرے کام کا کچھ کی تریت اسے روکی تھی لیکن تین افراد پر مشتمل کنبے میں کام ہی کتنا وقت، دوسرے ماہ بانو کی تعلیم مصروفیت کی وجہ سے بھی حوران اس پر کام کا زیادہ دیر نہیں ڈالتی تھی۔ اس لیے ماہ بانو بہت زیادہ وقت اور کام کا کچھ کی عادی نہیں تھی۔ پھر یہاں جس اعتماد سے چاول صاف کیے جا رہے تھے، اس فن میں تو اسے قطعی مہارت نہیں تھی۔ نتیجتاً اسے اپنی کوشش میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

”اسے لڑکی ایہ کیا کر رہی ہے۔ سارے چاول بچے کر رہے ہیں۔“ بھرائی پر مامور عورت اس کے ہاتھوں میں کود کھ کر چلی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی ماہ بانو کچھ دے دے قبیلوں کی آواز بھی سنائی دیں۔ یقیناً وہاں موجود کچھ خواجہ اس کی اس طرح درگت بننے پر حراغہ اڑ رہی تھیں۔ ماہ بانو جو پہلے ہی دل پر پڑا چکر کر کے چھٹی آئی تھی، اس میں کل کوسہ نہ کی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جیسا ماہ بانو پر چلے سکی اس سے نہیں منبلا جا رہا تھا، بچے رکھ کر وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

”اوپر آکر آئے تو دیکھو۔ ایسے بن رہی ہے جیسے کسی مزار سے کی نہیں، ملاٹ صاحب کی دچی ہے۔“ کنبے سے یہ طرز فقہر آکر ماہ بانو کے کانوں سے ٹھہرایا۔ اسی کے رونے میں بھلا اور بھی شدت آگئی۔ اسے حوران اور منصور رحمت سے یاد آنے لگے جنہوں نے اسے واقعی کسی مہمان داری کی طرح دکھا ہوا تھا۔

”اچھا چل، بھڑے یہ کام اور وہاں بیٹھ کر چاولوں میں سے نگر جن۔“ مگر ان عورت کو اس کے رونے پر ترس آ گیا اور اس نے ماہ بانو کو اٹھا کر دوسری طرف بھیجی عورتوں کی جانب جانے کا حکم دیا۔ عورتیں پھٹے ہوئے چاولوں میں رو جانے والے چند ایک نگر اور دھان اعتیاد سے جن رہی تھیں۔ ماہ بانو دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کر کے ان عورتوں کے درمیان جا بیٹھی۔ یہ کام نہایت آسان تھا۔ پانی

عورتوں جیسی چھتری نہ ہونے کے باوجود وہ سہولت سے یہ کام کرنے لگی۔

”بھئی اور شاد ہیں ہی بڑی جل نکلتی۔ جہاں کسی کو ذرا خوش دیکھتی ہیں فوراً آگ لگا دیتا ہیں۔“ ماہ بانو کے برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے تر جیگی نظروں سے چاول پھٹتی ہوئی دیکھی اور شادوں کی طرف دیکھتے ہوئے سر کوئی کی۔ ماہ بانو کے اندازے کے مطابق اس پر ہنسنے والی بھی یہی عورت تھیں۔ ”میری اماں نے مجھے بتایا تھا کہ وہی عورت چورہاں کے کان بھرتے والی بھی تھی اور شادوں کی ماں ہے۔ اسی نے چورہاں کا ذہن اپنی تیری طرف لگا دیا ہے۔“ ماہ بانو کے چہرے پر پچھانے تھی کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے لڑکی نے ایک بار پھر سر کوئی شام بتایا۔

”مگر کیوں؟ میری بھلائی دونوں سے کیا دشمنی ہے؟ ابھی وہ دونیں پہلے تو یہ کچھ سے ملنے آئی تھیں۔ اس وقت تو یہ مجھ سے بڑا بڑا بھاری جھگڑا کر رہی تھیں پھر بعد میں کیا ہو کہ یہ میری دشمن بن گئیں؟“ ماہ بانو نے لڑکی کی جرات کا اظہار کیا۔

”پاگلے۔۔۔ ان کی بیٹھی زبان پر مت جا۔ یہ سامنے بیٹھ کر ایسے ہی چار بڑائی ہیں اور میرے بچے سے بندے کی کات کرتی ہیں۔“ کنبے سے تو ان کا برا بھلا جا رہا ہے۔ زہرا کی زبانی تیری بڑا مانی اور خفاں ہاٹ کے گھٹنے میں گرنا ان دونوں کو بڑی آگ لگا کر رہی تھی۔ ان کی ماں بھی ان جیسی ہی ہے۔ کہنے کو دیکھتے نام ہے ان کی ماں کا پر ہم سب اسے مائی سمجھتی ہی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کب کی پر معیت آجائے معلوم ہی نہیں پیتا۔ بیٹوں کے کہنے پر اس نے ہی وہی چورہاں کے خوب کاں بھرتے تھے۔ شاید تو نے بھی، شادوں کے سامنے کوئی بات کر دی تھی۔ مائی نے وہی چورہاں کو خوب بھڑکایا کر غیبات کی دبی ماہ بانو کو آواز آکر اس کو لے کر ارادہ رکھتی ہے۔ کنبے سے گاؤں کی لڑکیوں کو تعلیم دے کر کوئی کی چاکری سے بچاؤ کی ہیں۔ وہی چورہاں بڑا کنگ لگی۔ اس نے فوراً کنبے کوئی بولا بھیجا کہ کنبے تیری اذیت بتا سکے۔ اب دیکھو۔ ان ماں بیٹیوں کی سازش تھی کیا صواب رہی۔ تو بھی گاؤں کی اور عورتوں کی طرح کی کیتوں میں بیٹھی کوئی کے کام تیز رہی ہے۔ کنبے یہاں اپنے ساتھ دیکھ کر ان شادیوں کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔“ لڑکی کی مقلوب اور تجزیہ دونوں حیرت انگیز تھے۔ اس نے بہت دیر ہی آواز میں ماہ بانو کو ساری تفصیل کہ سنائی تھی۔ ماہ بانو نے عورت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دماغ نے دو سال پہلے دیکھے گئے سخت آشوروں میں پہلے جانے والے نقش کو دہرا کر شروع کر دیا۔

”تو رانی ہے ۶۴ تیرا مگر بھی اور شاد کے گھر کے سامنے ہی تھا۔“ ماہ بانو کی یادداشت کا مرنے لگی۔ دو سال کا عرصہ بہت زیادہ دیکھیں ہوتا لیکن ان کاؤں میں علم دیکھی کے باعث ان دونوں میں وہ بہت کچھ معمول بن چکی تھی۔

”کنبی بار میں آئی تھی تو اکثر مجھ سے کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لیے لے جاتی تھی۔ اب کی دفعہ تو نے پکڑتی نہیں لگایا۔“ چچا ان کا سر ملنے کرنے کے بعد ماہ بانو نے شکوہ کیا۔ ”اب کی داری وقت ہی کہاں ملا رہی کی وجہ سے۔ روز جو چلی آکر، دیر تک کام کرنا پڑتا ہے۔ میں سوچتی ہی رہ گئی کہ کنبے سے پاس آؤں۔ دے تو نے یہ بات خوب یاد رہی کہ میں بھی اور شادوں کے گھر سے پاس رہتی ہوں۔ ساری مشکل ہی یہ ہے۔ مگر پاس ہونے کی وجہ سے ان دونوں کو میرے پل میں کیا خیر دیتی ہے اور یہ جب چاہے میرے کاموں میں رولا ڈال دیتی ہیں۔ مائی سمجھتی کی کنبی بھائی کی وجہ سے تو وہی چورہاں کے مجھے بھی تیری جماعت کے بعد اسکول سے اٹھانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ کچھ میں ڈانٹ کر اڑا تو میں نے پانچ چھ تھیں تو پاس کر ہی گیا تھیں۔“ رانی نے ہنسنے اور افسردگی کی ملی کیفیت میں بتایا تو ماہ بانو کو خود سے اس کی جو رہی کی وجہ سمجھ آئے گئے۔ وہ دیکھی وہیں سے دیکھتی تھی جہاں سے ماہ بانو کو حملہ ہوا تھا۔

”کئی لڑکیوں! باتوں میں گنگ کر کام چوری نہ دکھاؤ ورنہ ابھی ایک ایک اپنے گھروں کی کر رہائی پڑ جائے گی۔“ ماہ بانو اور رانی کی سستل سر کوٹیاں بیٹھا گھراں عورت کی برداشت سے باہر ہو گئی تھیں چنانچہ وہ ان کے سر پر ٹھوڑی ہو کر چلائے گئے۔ ماہ بانو اور رانی کھرا کر جلدی جلدی چالوں میں باہر چلائے تھیں۔



شہر یا رہنے سامنے موجود در خواستوں میں سے اس وقت جس درخواست کو پڑھا رہا تھا، وہی مائتر آفتاب احمد نے بھی سمجھی۔ درخواست کو ارد کا لفظ پڑا ہے تھا۔ اس نے گھر منت سے استدعا کی تھی کہ چڑاؤ میں قائم رہا مگر برائری اسکول جو کہ تھا ایک کمرے پر مشتمل ہے، اس کی قیادت میں کم از کم ایک کمرے کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ طالب علموں کو کچھ سہولت مل سکے۔ مائتر آفتاب احمد کنبے دو سال سے تو اس سے یہ درخواست بھی کر رہا تھا۔ ریاکار میں اس کی طرف سے بھیجی گئی بات در خواستیں موجود تھیں۔ آخری درخواست شہر پار کی بھونٹک کے دو دن بعد ہی دی گئی تھی جس سے ظاہر تھا کہ مائتر آفتاب نے اسے ہی کی آمد کے ساتھ ہی امید باندھ کر

ایک بار پھر گھر منت کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ شہر پار نے اکثر کام پر عبداللہ کو اٹھانے کا حکم دیا۔

”کیسرا! عبداللہ ان کو اٹھانے کا حکم دیا۔“ یہ مائتر آفتاب نے ہی درخواستیں اٹھائی ہر موصول ہوئی ہیں اس کے باوجود اب تک اس سلسلے میں کوئی ایجن نہیں لیا گیا۔ ”کیوں؟“ شہر پار نے عبداللہ ان سے پوچھا۔ ”میں نے ذاتی طور پر کوشش کی تھی مگر اس سلسلے میں کچھ ہو سکے لیکن چھوٹی انکار عالم کے آگے میری ایک نہ چلی تھی۔ چورہی صاحب کا دعو ہے کہ میں زمین پر ہم اسکول کے لیے کمرے خیر کرانا چاہتے ہیں، ان کی ملکیت ہے۔ دیکھئے اسے ہی صاحب چورہی افکار، اس کے دعوے سے مشتعل تھے اس لیے میں باوجود چاہنے کے کوششیں کر سکا۔“ عبداللہ ان نے سادگی سے مسئلے کا خلاصہ پیش کر دیا۔

”چورہی صاحب کے دعوے سے مقابلہ میں سرکاری ریاکار کیا کہتا ہے؟“ شہر پار نے دیر پاقت کیا۔ ”ریاکار کے مطابق زمین سرکاری ہے۔ چورہی افکار کی خیر زمین کا۔ زمین کے ان کو سارے سے افعال شروع ہوتا ہے لیکن اس کی ملکیت گاؤں کی سراسر قطعہ ہے۔“ عبداللہ ان نے بتایا تو شہر پار سوچ میں پڑ گیا۔ وہ کچھ سمجھا کہ اگر چورہی افکار کی سرشتی کے خلاف اسکول کے لیے کمرے یا کمروں کی تعمیر کی کوشش کی تو چورہی اسے اپنی ادا کا مسئلہ بنا لے گا۔ لیکن اسکول کا مسئلہ ان بھی اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ آخر کار اس نے درخواست پر اپنی منظوری کا کوئی ٹھٹھ کر دیکھا کر دیے۔ متعلقہ کنبے سے بھی مشکوری آجانی تو خیر یہ کام شروع کیا جاسکتا تھا۔“ کنبے ایسا غصہ ہو رہا ہے عبداللہ ان کہ کوہوں کے مسائل پوری طور پر سمجھ چکے تھیں رہے ہیں۔ لوگ ہمارے تو کنبے سے ڈان ہو کر ہم سے رابطہ کرنا چھوڑ چکے ہیں بلکہ کوئی خوف ہے جو رکاوٹ بن کر آئیں ہم تک آئے نہیں آتے۔“ کنبے کو ہولناکیاں رکھتے ہوئے شہر پار نے اپنے دل میں بہت خیال عبداللہ ان سے ڈانڈا۔

”دونوں ہی باتیں ہی سراسر لوگ مامور ہیں اپنے مسائل کے لیے اس لیے کنبے آجے کر یہاں ان کی شہنائی نہیں ہوتی۔ غصہ سنا ایسے لیکن میں کا لفظ کسی جاخوہی سے ہو اس لیے سامنے نہیں لاتے جانتے کہ سنی تو تہذیب کی ہی جاتی ہے۔ اٹھا شکایت کرنے کے جرم میں آریب بے چارہ کتاب کا ذکر ہو جاتا ہے۔“ عبداللہ ان نے شہر پار کے خیال کی تصدیق کی۔

”پھر۔۔۔ جیسا راکا خیال ہے اس مسئلے کے حل کے لیے

ہیں کیا کرتے جا رہے؟" شہزادہ اور عبدالمنان میں باہمی اعتماد کی فضا قائم ہو چکی تھی اس لیے شہزادہ اس سے مشورہ کرتے میں حرج نہیں سمجھتا تھا۔

"اس سلسلے میں پہلی کچھ ہی کا طریقہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے تحریری درخواستیں وصول کرنے کے بجائے ہفتے میں ایک دن ایسا مقرر کر دیں جب ضرورت مند براہ راست آپ سے ملاقات کر کے اپنا مسئلہ بیان کر سکیں۔ اس طرح لوگوں کی جھجک ختم ہوگی اور ان کا آپ پر اعتماد قائم ہو گا۔" عبدالمنان نے تجویز پیش کی جو شہزادہ کو پسند آئی۔

"دوبئی گزرا بہت اچھا آئیڈیا ہے۔" اس نے عبدالمنان کو سراہا اور بولا۔ "میرا خیال ہے یہاں ملاقاتیں کرنے کے علاوہ لوگوں سے ان کے علاقے میں جا کر بھی ملے ہیں۔ ہفتے میں کسی بھی دن اپنا ایک کسی علاقے میں جا کر لوگوں کے اور ہاں تکپ لگا کر مساجد وغیرہ سے اعلان کروا دیں گے کہ آپ کے خطے کا ہے، یہی آپ کے مسائل سننے اور حل کرنے کے لیے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس طرح میرے اور لوگوں کے درمیان جو دوری ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی اور میں علاقے کی صحیح صورت حال کا جائزہ بھی لے سکوں گا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی سر" عبدالمنان جیسے اب تک شہزادہ جیسا کوئی اسے ہی میسر نہیں آیا تھا شہزادہ کی بات سن کر خوش ہو گیا۔

"یہ پروگرام تو جو فائنل ہو گیا۔ اب ایک کام اور کرو۔" شہزادہ اب کوئی سی پیغام بھجواؤ کہ وہ یہاں آکر مجھ سے ملاقات کرے۔ اس کی درخواست یوں تو میں نے منظور کر لی ہے لیکن آگے پیچھے سے پہلے صورت حال کو مزید اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"او کے سر" میں آج ہی یہ کام کروانا ہوں۔" عبدالمنان شہزادہ کا حکم سن کر مستعدی سے بولا۔ کئی سال کی ملازمت میں پہلی بار یہ موقع آیا تھا کہ اسے تک رہا تھا کہ وہ کچھ کوئی کام کر رہا ہے ورنہ اب سے پہلے تو صرف ڈیوٹی سمجھنے والی بات تھی۔ شہزادہ خود بھی خوش تھا کہ اسے ایک مستعد اور ذہین منیر پرانی اسے کا ساتھ ملا ہے جو اس کے کاموں میں حقیقی معاون ثابت ہو رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

"اس وادی میں نے بھی وڑے شاہ جی کی درگاہ پر نذر چڑھائی ہے۔" رات کا کھانا کھاتے ہوئے نورال نے غیاث کو اطلاع دی۔

"وہ کس لیے؟" غیاث نے شہزادہ کی چارہ کر پوچھا۔

"نور، جو رہو پھرو... پوچھتے ہو کس لیے؟ تمہیں نہیں خبر کہ کتنی جنگیں پڑی ہیں سر پرانہ زہر کا دوا کرنے اور پاس کوئی باقی بچا نہیں۔ اگر اس نگار کو وہاں کر بھی جمن نہیں۔ وہ یہ سن کر تو اسے بے باکی ابھی تک گوسونی ہے۔ ہمتا نے ملنے مار مار کر جان آجی کر دی ہے میری بیٹی کی۔ وہ انور بھی ماں کی بی بی لہان بولتا ہے۔ صاف دھمکی دے چکا ہے نگار کو کہ اگر ایک برس اور اس کے بچے نہیں ہوا تو اسے فارغ کر کے دوہرا دیا کرے گا۔ اب اسے ترے کر کے، اپنی جان پر ہزاروں کا قرض چڑھا کر اس لیے تو بھی نہیں باقی بھی کر سکے اسے دو بار دیکھنے میں دکھائے دیں۔ دھمکی کا کھڑے ہاتھ رکھنے کے لیے کچھ تو ہاتھ جو مادے ہوں گے۔ میری مت میں تو یہی آیا ہے کہ وڑے شاہ جی کی درگاہ پر جا کر کھجور پھیلاؤں۔ شاید ان کی برکت سے میں یہ مصیبت حل جائے۔"

"پھر تیرے پاس چڑھانے کو ہے کیا؟ وہاں تو لوگ بڑے بڑے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔" نورال کی بتائی ساری تفصیل سننے کے بعد غیاث نے تشویش سے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں اپنا یہ چھاپا چڑھاؤں۔ شاہ جی کی دعا سے زہرہ کے ویاہ کا بندوبست ہو گیا اور نگار کی گود بھر گئی تو سمجھو اس چھپنے کی قیمت وصول ہو جائے گی۔" نورال نے اپنی وانگی میں سوچوسوچنے کے لمحے سے بچنے کی طرف اشارہ کیا۔

"چل کر دیکھو یہ تدبیر بھی۔ بڑے لوگوں کی چھوہیاں بھری ہیں شاہ جی کی برکت سے۔" شاہزادہ ہم بھی ان کا گرم ہو جائے۔" غیاث نے گویا نورال کے فیصلے کی توثیق کی۔

"پر مشکل یہ ہے کہ میں عرس کے روز درگاہ پر منت ہانے جاؤں گی؟ اس روز تو جو میں میں اپنا کام ہوتا ہے کہ میں قدم بھی باہر نہیں نکال سکوں گی اور عرس میں نے عرس والے دن ہی باقی ہے۔ کہتے ہیں اس روز جو منت مانو وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔" نورال پوری طریق اپنی ضیافت الاقتاری کے بال میں پھنسی ہوئی تھی۔

"یہ تو ہے، خبر تو نے کیا حل سوچا؟" غیاث نے پرانی سنجیدگی سے نورال کی پریشانی میں شریک تشویش کا مظاہرہ کیا۔ "میرے دماغ میں تو دنیا کی سب سے بڑی میری جگہ تو جا کر نذر چڑھاوے اور منت ماننے کے کام تو اس روز چھپے بھی دیں ہوں گے تو پھر بھی کچھ میں سے موقع نکال سکتا ہے۔" نورال نے حل بتایا۔

"نہیک ہے۔" فیر میں ہی کرلوں گا یہ کام۔" غیاث محمد نے آمادگی ظاہر کی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو؟ کیسے کچھ عقیدے کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ سزاواروں پر نذر ویز پڑھانا سب سے کارہائیں ہیں۔ جو باوجود کھٹا کھٹا اللہ سے مانگیں۔ وہ سب کچھ دینے والا ہے۔“ ماہ نو جو بہت دیر سے خاموشی سے ساری گفتگوں میں رہی تھی وہ آخر کار ٹوٹ کر کہنے لگی۔

”تو کہ لڑائی تو بہ کر۔ بزرگوں کے لیے ایسی بات من سے نکال نکالنے۔ بولی بدست ہوتی ہے ان کی۔“ نوران نے فوراً جواب دیا تو نوران کو۔

”مان لیا کہ بزرگوں کی بدست ہوتی ہے لیکن یہ حوصلی والوں کے ہتھوں سے تو کسی کو کوئی شے نہیں مل سکتا۔ پیسے خاتم اور مغرور یہ لوگ ہیں۔ ویسے ہی ان کے بزرگ بھی ہوں گے۔ جو لوگ جیتے جا رہی اپنی ذات سے کسی کو ٹانہ نہ دیں۔ وہ مرنے کے بعد خاک کی کے کام آئیں گے۔“ ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

”بند کرانی یہ فنون ایک بک۔ تیری تعلیم نے تجھے یہ اگلے سبق پڑھائے ہوں گے۔ یہ ہم تیری ان انٹی سیدھی باتوں میں نہیں آتے والے۔“ نوران اچھی خاصی غضب ناک ہو چکی تھی۔

”نہرا کیا ہے دست ماہو تیری بات۔ میرا کام تو سمجھنا تھا۔ ماہ بانو نے جواب دیا میری سے شائے اچکا ہے تو بولے کہا۔“ تو چھوڑ دے اپنا یہ سمجھانے کا کام۔ چار ہفتائیں کیا بڑھتی ہے تو کوئی یاد دہی قابل سمجھنے کی ہے۔ اس بے لگام زبان کی وجہ سے تو مجھ پر وقت آیا ہے کہ اچھا بھلا آرام چھوڑ کر آج حوصلی والوں کی چاکری کرنی پڑ رہی ہے۔ ذرا زبان کو قابو میں رکھی اور میرے میرے آگے انٹی سیدھی کبیراں نہیں کرتی تو چار دنوں تک سے تیرا کردار دیکھ چکا جانی۔ اب سمجھتی رہی اپنے کبے کو۔“ نوران کا حوصلی روز کا آنا جانا تھا جتنا چاہتے تھے ہی ماہ بانو پر ٹوٹے والی لٹاؤ کی وجہ باخراہ معلوم ہوئی تھی اور اب وہ اسی حوالے سے اسے ملنے دے رہی تھی۔

”مجھے میری زبان نے نہیں بیٹھا مانا اچھے تو لوگوں کی بے نہانی سے پہنچا ہے۔ اگر تم لوگ اس طرح چپ چاپ حوصلی والوں کا ہر ظلم برداشت کرنے کے بجائے ان کے سامنے احتجاج کرنے کے عادی ہو جتے تو ان کے ظلم کرنے کی عادت اپنی پختہ نہیں ہوتی۔ انہیں تو عادت ہو چکی ہے انسانوں کے ساتھ بے زبان جانوروں کا سا سلوک کرنے کی۔ اب اگر ان بے زبان جانوروں کے جھگڑنے سے انہیں کوئی انسانی آواز جانی دیتی ہے تو ان سے برداشت نہیں

ہو پاتا کہ کون ہے جو ان کے مقابل ہول سکتا ہے؟ حوصلی والوں کو ظلم ہانے والے تم لوگ ہونا۔ تم لوگوں نے ان کی غارت گاہ لڑی ہے۔“ نوران کا طعنہ سن کر ماہ بانو کافی جذباتی ہو گئی تھی۔

”کیا بکواس کیے جا رہی ہے؟ ابھی دوں گا ایک اگلے ہاتھ کی تو بولی بند ہو جائے گی۔“ لڑکی ذات اور اتنا بولے یہ کیا ان کی ریت کی چٹا چٹا غیٹ محمد مہمان میں کراہتی جینی پر آنکھیں پکڑنے لگی۔

”جھل جھل۔ جانے دے اس کو۔ اس کا تو دماغ ہی خراب ہے۔ مستور آ کر اسے داپہی لے جائے گا تو ہماری مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔“ نوران نے غیٹ غیٹ کا غصہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو جو بیٹھے ہی کھانے سے ہاتھ روک چکی تھی، اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ زہرہ اور ان کا دھن سالار اچھو بھائی اس اس ساری بحث سے بے نیاز اپنی بیٹوں پر ہنسنے کھانے میں اسی طرح مصروف رہے۔

☆ ☆ ☆

”مجھے ماسٹر آفتاب احمد کہتے ہیں۔“ کندہ کے کمرے اور قدرے وسیع و عریض کچھ بیٹوں اور کچھ شہریار کے تصور سے کافی مختلف تھا۔ ماسٹر آفتاب کے نام کے ساتھ اس نے کسی عمر رسیدہ شخص کا تصور دیا تھا لیکن سامنے موجود شخص دوسرا جوان تھا بلکہ اپنے انداز سے صاف پہچان جاتا تھا کہ وہ کسی دیہات یا گاؤں کا یا شاید انہیں بلکاس کی ہی پرورش کسی شہری ماحول میں ہوئی ہے۔

”تشریف رکھیے۔“ شہریار نے ایک نفر جاننے کے بعد اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میں آج ایک پیشتر سے ملنے کے لیے لاہور روانہ ہو رہا تھا۔ پیغام ملا کہ اسے اب ہی صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کرنا چاہیوں۔“ ماسٹر آفتاب نے کرسی پر بیٹھنے ہی اٹھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

”میں ملنے میں ملاقات کرتی ہے آپ کو پیشتر سے؟“ شہریار مجھ ماسٹر آفتاب کو کچھ کرسی پر چھٹا سا کیا تھا، اس کی بات سن کر حیرت سے ہوا۔

”میرے کچھ کالوں کو کئی ہی محل میں شائع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں موصوف۔ میں انی ملے میں ہماری میٹنگ ہے۔“ شہریار نے دیکھا کہ یہ بات جانتے ہوئے ماسٹر آفتاب کی ذہانت سے بچھڑکوں میں شرملا رہی تھیں۔

”شاہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات کی خصوصیات

وہ دونوں کے سامنے بیان کرنے سے بھیکتے ہیں۔

”اچھا تو آپ کا نام کون ہے۔ بھی اتفاق نہیں ہوا آپ کا کتا کوئی کا لم پڑے گا۔“ حالانکہ میں مختلف اخبارات کا پڑی پڑا تھیں مگر یہ محاذ لڑتا ہوں۔“ شہریار نے ماسٹر آفتاب کو جس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے ملایا تھا اس وقت اس سے بہت ہٹ کر گفتگو ہونے لگی تھی۔

”میں اسے اسے شفا کے نام سے لکھتا ہوں۔ شاید یہ نام بھی آپ کی نظر سے گزرا ہو۔“

”اوہ آئی آئی۔ اسے اسے منافی آفتاب احمد منشا۔ آپ کے کا لم تو میں نے اکثر پڑھے ہیں اور مجھے پسند بھی آتے ہیں کیونکہ آپ کی پارٹی یا کہ آپ کے حسب منشا لکھنے کے بجائے اپنے حسب منشا لکھتے ہیں۔ مجھے بہت خوش محسوس ہو رہی ہے کہ میں ایک حق گو آدمی سے ملاقات کر رہا ہوں۔“ شہریار نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ماسٹر آفتاب سے یہ بطور خاص ایک بار پھر ہاتھ ملایا۔

”بہن سزا اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے حق پڑنے دینے کی توفیق عطا کی ہے ورنہ میری اوقات کیا ہے؟“ ماسٹر آفتاب کے لیے میں عاجزی تھی۔

”تو دماغی درست ہے کہ اللہ ہی اپنے بندوں سے کام لیتا ہے لیکن آپ یہ کیا کہیں؟ چور آپاؤں کیا کر رہے ہیں؟ اسے بوس اخبار میں لکھنے والا شخص اور ایک پائٹری اسکول میں ٹیچنگ کر رہا ہے، بات کچھ عجیب آئی۔“

”مجھے ایک داستان ہے۔ اصل میں بڑا مٹا، بڑا مٹا اور گھٹا مجھے اپنے والد کی طرف سے دینے میں ملا ہے۔ وہ لاہور کے ایک باغ میں پھرا رہے تھے۔ ساتھ ہی مختلف اخبارات کے لیے بھی لکھتے تھے۔ ان کو کچھ کرکے بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ زمانہ طالب علمی میں، میں نے لکھنے کا آغاز مجھے تیرے شیئروں سے کیا اور پھر کچھ انجمنوں وغیرہ میں لکھنے لگا۔ ماسٹر منشا لکھنے کے بعد مجھے شوق ہوا کہ تعلیم کے میدان میں کچھ کروں۔ میں نے ایک ایسے اشتہاری ادارے کو جہاں کر لیا جو ضابطہ کتب پیش کرتے تھے۔ میں نے اس ادارے کے لیے کئی کتابیں تحریر کیں۔ میرے آئیڈیاز کو کافی پسند کیا۔ سکری بھی بہت اچھی ضرورتوں کی بنیاد پر ایک پوائنٹ پر آ کر ہمارا اختلاف ہو گیا۔ میرا مؤقف تھا کہ ادارے کو اپنی کتابوں پر پرائز دینا چاہیے تاکہ انہیں گروہ لوگ صرف اپنے ادارے کی تعریف چاہتے ہیں۔ اصل محنت کرنے والوں کا کہیں کوئی بڑی نہیں تھا۔ میں پھر میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ پینٹنگ اتنی کے مالک کا خیال تھا کہ میں

جہاں کے جوش میں ایک جذباتی فیصلہ کر رہا ہوں اور جب دال روٹی کے حصول کے لیے نہانے کی ضرورت تھی تو خود ہی پلٹ کر آؤں گا۔ میرے نزدیک جو میرا اصولی موقف تھا وہ ان کے نزدیک بڑا ناگوار معاملہ تھا۔ یہ ماہ بانو سے چاب چھوڑنے کے بعد مجھ پر پنی دراپیں کھیں۔ اپنے ساتھ ہونے والے اس میلے اجتماع نے مجھے آسایا کہ معاشرتی مسائل پر غصوں اور کس پھر میں گھستا چلا گیا۔ جہاں جہاں جس کسی کے ساتھ تنقیدی اور انتہا پسند ہونے لگا، اپنے حکم کے ذریعے اس کی نشان دہی کر رہا رہا۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے عزت بھی دی اور شہرت بھی۔ پیسے کے پیچھے بھاگتے والوں میں سے ہم بھی رہے ہیں، اس لیے پراہت ملتا ہے وہ بہت ہے۔“

”نہرا اس قصے میں بڑا آدمی تھے کا تو میں ذکر نہیں۔“ ماسٹر آفتاب کی بیان کردہ قصیدات سننے کے بعد شہریار نے اپنا سوال دہرایا۔

”اس قصے کی طرف بھی آتا ہوں۔ اصل میں میرا ایک کتا اس فیلو تھا تو وہ جین اور تھوڑی دیر کا تھا۔ ماسٹر کے بعد اس نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا۔ کوئی ٹیڈل کان کچلی سے نکلتے دیکھنے والا شخص پوزیشن کے ساتھ یہ امتحان بیز کرے تو اس کی ذہانت پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ سوچو میری ایک ایسی دوڑ ہوتی ہے جس میں آپ جیسا بک کر اؤٹ کر کے والے لوگ پہلے ہی ساتھ ساتھ ٹوٹ کر اڑے گا کہ بولے ہیں۔ اپنے ایسے ترلوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل رہا اور میں بہت لپٹا آسان نہیں ہوتا۔ میرے دوست نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ صلی میں وہ چور کو کرسی کا لکھ دینا ڈیالک ایڈا اس اس میں بڑا جوش تھا۔ یہاں اس ملا تھے میں پینٹنگ ہوتی تو معلوم ہوا چچ آدمی چند سال پہلے ایک اسکول ہوا کرتا تھا جو اب ختم کر دیا گیا ہے۔ میرے دوست کو کئی ہوا کہ گاؤں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن کوئی نہیں یہاں آ کر کام کرتے پر اس کی ہی نہیں ہوتی تھی۔ میرے دوست نے ایک دن میرے سامنے ذکر کیا۔ میرے اندر کا بچہ اس ذکر کو سن کر جب اٹھا اور میں اپنا پورا ماسٹر سمیٹ کر ہی آدمی آ بیٹھا۔ اب مورست حال یہ ہے کہ میں اسے ساعدہ حالت کے باوجود جانا بیٹھا ہوں۔ البتہ میرے دوست کی چھ ماہ کے اندر اندر ہی کسی اور ذرا زحمت کے میں پینٹنگ کو دی گئی تھی۔ ماہ بانو وہ ”میرا“ گیارہ سو کھراں طبقے سے میرا ضرورتی چھٹے، لینے کی غلطی نہیں کرنا ضرورت تھی کیا ہے اسے پہنچنے کی۔ اس بے چارے نے اتنی محنت کر کے سی ایس ایس میں کا امتحان پاس

لئے بائیں کیا تھا کہ اپنے اور اپنے گھر کے حالات بد سے بوجھ کر حکمرانوں کی ناراضی کی وجہ سے اس کی "بولبولی" ہوتی رہی تو اس کا خیاب تو ادھر وہاں رہا۔ اب امید ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا۔ صاف اب اقتدار و اقتدار پر بھی خوش رہیں گے۔ مگر طرف سے کارکنانِ چپقلش اور مجتہدوں کے بجائے امن و امان اور بائیں تعاون کی فضا جانکر ہو گیا۔ اس سب سے بچ میں اگر عوام لیے جارہے ہیں تو پتہ ہے وہاں وہ تو عدالتی ہیں بل سب سے بڑے "جانساز" آفتاب بات اگرچہ لمبا کرتا تھا مگر تھمریاد کو اس سے شکستہ کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

”بہت خوب! آپ کافی دلچسپ آدمی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے آپ کی درخواست منظور کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ انشاء اللہ جلد اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ جلد بازی کے بجائے عرصہ سہمی سے کام لیا جائے۔ پچھری افکار کو ناراض کیے بغیر ان کی رضامندی سے بھی اسکول کی عمارت میں توسیع کا کام کیا جا سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اس سلسلے میں ان کو نہانے کی سہولت کروں تو کامیاب رہوں گا۔ یہ کچھ وقت لگے گا۔ کیا آپ تھوڑے عرصے کے لیے انتظار کر سکتے ہیں؟“

”اے اعلیٰ سر! جہاں وہ حال و احوال نظر کر گیا ہے، وہاں خود خواہی
مزید اصرار کرنے میں یقیناً کوئی قیامت نہیں۔ مجھے اصل خوشی
اس بات کی ہے کہ آپ نے کم از کم میری اس درخواست کا
منہ بند کرنے میں توفیق دیا۔ اس سے پہلے تو کسی کو اتنی بھی توفیق
نہیں ملتی تھی۔“ افسر آفتاب نے منہ سمجھتے جواب دیا۔

”اوپر کے آفتاب صاحب! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میری خواہش تو تھی کہ آپ سے کچھ اور اور گفتگو ہو سکتی لیکن آپ بھی لگا ہوا ہے۔ لیے لیٹ ہو رہے ہیں اور میرے پاس بھی چند ایک غلامانی اور بیٹھے ہیں تو بہتر ہے میں آپ کو اجازت دے دوں مگر اس امید کے ساتھ کہ انشاء اللہ ہماری بار بار بہت جلد ملاقات ہوگی۔“ شہر یار کے غفلتوں میں موجود شخص اس کے چہرے سے بھی جھٹک رہا تھا۔ ماسٹر آفتاب نے گرم جوشی کے ساتھ شہر یار سے ہاتھ ملایا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

”محققین سے برا حال ہو گیا ہے۔ جانتے بے شعری
 غور تھی اور اورادوں کا زار و مار میں کیے گزرا جاتی ہیں۔ ہم تو
 جس کوئی تھکنہ بھر بھی رہے ہوں گے وہاں، یہ سارا چلنا اس کی
 ایسی طرح دیکھ رہا ہے کہ اب رات کو بدن دباؤ لے کر نیند

فہمیں آئے گی۔" سیاہ جیشوں والی گاڑی کچی سڑک چھوڑ کر گاؤں کی طرف جانے والے کچے راستے پر آئی تو کھلی نشست پر بیٹھی تاجور نے اپنے ساتھ موجود کشوری طرف دیکھتے ہوئے تہیہ کیا۔

"شہنشاہی کو تو کوئی گاہااری طرح سچ خوکے گھروں سے نکال کر بازار کے لیے روانہ کیا ہوتا پتا۔ یہ جو جھوٹ چڑھی ہوئی ہے عمارت بدلتوں پر، یہ بازار میں خریداری کے لیے مٹھوٹے سے ٹھوس چڑھی۔ اس طرح کی جھوٹ چڑھی ہے جو ہم نے ابور سے خریداری کے شوق میں کیا ہے۔" کشور کا جواہر تہیہ بہت سچ میں تھا۔

۱۰ "اگر تو کوہر وقت کس انکار سے میں چلتی رہتی ہے۔ اگر
 صورتِ آفتاب کی دوسے میں سے نہ ہوتی تو کسے تجھے ساتھ لے
 لگا احسان نہیں اٹھاتا رہتا۔" "تو کدو کو شکر کے انداز پر فخر کیا۔
 ۱۱ "اے اٹھائیں، میں احسان۔ کیا ضروری تھا کہ لاہور جا کر
 لپٹنے سے یہ خبر اتر کر نہیں۔" "مگر فصلی آباد پہلی جا تھا۔ ۱۲
 قریب بھی رہتا اور اتنی محنت بھی نہیں جوتی۔" "شکر ہے دوبارہ
 جواب دیا۔

”اوشہ! یہ عمل آپاد میں جھلا کیا جاتا ہے؟“ عرض ہوا: ”جی ہاں! کتنے مہمان ملاتے ہیں شہر سے۔“ اضر وکی کی بیویوں نے ایسے نئے نوپے ڈیزائنوں والے کپڑے پہن رکھے ہوتے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ لاہور سے قس قریب ادنیٰ کر رہی تھیں۔ اب وہ کچھ، میں، ہم تینوں بہنوں کے لیے کیسے شان دار سٹے ملائے جوڑے کے کر آئی ہوں۔ گاؤں کی درزن کو تو اسکی مسکائی آنی ہی نہیں۔“

”آپ کو ضرورت کیا ہے افسر! کی بیوی اس سے
مقابلہ کرنے کی۔ وہ اپنی گدہ پیٹن اٹھانے لگی۔“ جواری بات
سن کر کھٹوٹے افترا میں کہتا جا رہا تھا کہ میں بولی۔ اس
کی وجہ سے کھٹوٹے ہنس کر کہنے لگے کہ میں نے یہ سب جھوٹ اور کھٹو
کے کرتے میں بیویوں کی طرف مبذول ہو کر ہی۔
”یہ بیوی منہ اٹھانے لگی ہے!“ اس نے اعلیٰ نفست پر
موجود ہمارے دستے کو کہا۔

”یہ تو ماشاء اللہ کتاب ہے، شاید مشورت واجب آ رہا ہے۔
 رومو جی صاحب طرب کے بعد اپنے گائے کو گھر بھیر آ نہیں گوا تا
 آئیے وچارے کو چلی آئے ہر باب ہے۔“ ملازمہ جواب تک
 ذرا تھک کے ساتھ اگلی نشست پر کوئی سیڑی کی ٹیٹھی تھما تا جو ر
 کو معلومات فراہم کرے تھی۔

”مجھ کو بھی یہی شک تھا۔ بڑے عرصے سے سن رہی ہوں کہ یہ شہر ہی منڈا گھاؤں کے اسکول میں جم کر ہٹتا ہوا

ہے۔ دیکھتے ہیں تو وہ چار چار کھٹا لگتا ہے۔ سوچ رہی ہوں منور کے آباء کے کھلوں کو منور کو کھچ کر پڑھانے کے لیے اسی ماسٹر کی فریضی کیا دیں۔ ابھی تو منور چھوٹا ہے۔ اسے پڑھنے کے لیے شریں کھینچ کر لیں۔ میرا ہاتھوں میں کتا اسے خود سے دھڑکے گا۔ ابھی وہ کتنے بڑا اچھری رہ رہ کر پڑھنا لگتا سیکھ لگے گا پھر بعد میں اسے شہر بھجوا دیں گے۔ تیرا کیا خیال ہے کشمور! میں بات کروں، منور کے آباء سے اسی ماسٹر آقا کو منور کو پڑھانے کے لگائے گی؟“ اپنا ارادہ خارج کرنے کے بعد تاجو نے کشمور کی رائے بھی جاننی چاہی۔ کشمور جو کچھ فونی کے بیک و فور میں لکھ رہا تھا وہ ہوتے ماسٹر آقا کو دیکھ رہی تھی، خود کو مخاطب کیے جانے پر بری طرح چسک گئی۔

”کیا کہا آپ نے مجھ سے؟“
”میں پوچھ رہی تھی کہ منور کو بڑھانے کے لیے اس
ماسٹر آف بے کورنگوا لوں، پر تو نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبی
ہوئی تھی کہ میری بات ہی نہیں سنی۔“ تاہم نے ٹکلی سے اپنی
بات دہرائی۔

”تو بہت اچھا خیال ہے آپ! آپ سرور بجا اشراف سے بات کر رہی۔“ مکتور نے تاجور کی بھرجی پر تکیہ کرتے ہوئے دوبارہ ہلکے پھر دہرے پر نظر ڈالی۔ وہاں ماسٹر آفتاب کا عکس غائب ہو چکا تھا مگر اب بھی اسی عکس کو دیکھ کر کئی کئی عکس ایک دوسرے سے ہٹ کر اس کی آنکھوں کی چتکیوں میں بچھکا تھا۔

ہر دلوں کا ایک دھڑکتا ہے استری کرتے کے لیے وہ
گھٹنا بھر سے استری اسٹنڈ کے آگے کھڑی تھی لیکن دھڑکتا
کہ ختم ہونے کا ہر سی ٹھنڈے رہا تھا۔ چودھری افتخار کی
بیوی وعلیقہ کوئی میں بے تھاں کھڑا کیاں اور دردناک سے
تھے۔ اسی حساب سے ہر دلوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔
عروس کے سونے پر جب کوئی میں بہت بڑی تعداد میں
جہان مہر کو لے جاتے تھے، اسی وقت کوئی کی سڑکیں
آرائش پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ شہر کے محل کے آگے
والے بے سندھ دے بھی اسی آرائش کا ایک حصہ تھے جنہیں
استری کرنے کی دے واری ماہ بانو کے سر کو لگی تھی۔
استری اسٹینڈ کے آگے کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شکل
ہوتے تھے جس اور کمر اور گھٹنے ہوتی تھی اس کا جس میں چل
رہا تھا کہ سارا کام ایک طرف کیلے اور دوسری راہ لے لیکن
ایسا کرنے کا وہ صرف سوچ ہی سکتی تھی۔ محل کی راہ میں ماں
بے اور بھائی بہن کی راہ کی راہ پر نظر رہا کہ جو ماں

تھیں۔ یہ نظر میں اس سے بہت تھیں کہ اگر تم نے دُعا
چاہو اور ان کے حکم سے مرے تالی کی کوشش کی تو ہماری زندگی جو
پہلے ہی ابھی خاصی سخت ہے اور یہی مشکل میں پڑ جائے گی۔
یہ کہوں گی اس کی انتہا نے ماہوں کے ساتھ بدنامی کے بعد
اس کی زبان پر پہنچا ہوا کہ وہی اب وہ خود کو اپنے والے پر
تکلیف کی خاموشی سے پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ البتہ پہلے
دن ضرور اس نے جوئی سے مہر واپس جانے کے بعد جوئی
میں خود سے ردا رکھے جانے والے تار و مالک کی شکایت
کرتے ہوئے دہر دہر چولی جانے سے انکار کی کوشش کی تھی
لیکن اس موقع پر نوران نے اچھی منت سماجت اور
جہور یوں کی داستان سے اسے خاموشی اجڑا کر اپنے پر مجبور
کر دیا تھا۔ ماہا خواہنے ماں باپ کی مجبور یوں کو سمجھتی تھی لیکن
اسے ان کی اس غلامانہ روش سے سخت اذیت تھا۔ ان کی
اس غلامانہ روش نے اسے جس مشکل میں پھنسا تھا اس
کے بعد وہ اپنے ماں باپ کی طرف سے ماہا کو بدلہ دہنی
تھی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ ان مسئلے میں مزید
زبان نہیں کھولے گی۔ وہ شہت کے یہ چند بھاری دن
خاموشی کے ساتھ گزرا کہ جوئی نے وہاں اپنی شہ کے لیے گاؤں
سے فیصل آباد واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
"ماہا تو اچھے باجوہر بی بی بار رہی ہیں۔" رانی کی آواز
نے ماہا کو کچھوں کے سمندر سے نکالا۔

”کون تاجور لی بی؟“ استری شہدہ ہوا ایک ملازمہ کو
 چھاتے ہوئے ماہوانے کے زارہی سے پہنچا۔ وہاں کام
 ایک جینس کی شکل میں ہوا تھا۔ ماہیاں تو ہر استری کر کے
 جیتی تو دوسری ملازمہ استری شہدہ پر دے میں ایک لگاؤ شروع
 کر دیتی۔ ایک لگانے کے بعد چار دے کو ان مقام پر پہنچا دیا
 جاتا جہاں اسے لگا جانا تھا۔ اس کام کے لیے کوئی ایک
 چھپرہ سے بدن والی ملازمہ کو نئے دے میں پہنچا کر بھیجی۔ وہ
 ملازمہ اونچے سے اسٹول پر بیٹھ کر چھپڑوں کو ہر ایک میں
 لگانے کا کام پر پھولی الجھا دے رہی تھی۔ استری کا کام چونکہ
 سب سے زیادہ وقت طلب تھا۔ اس لیے اسے کام پر ماہوانے
 کے علاوہ بھی ایک اور ملازمہ مقرر کر لی تھی۔ اس ملازمہ نے
 ایک دوسرا استری اسٹینڈ سنبل لگھا تھا۔ پوچھنے میں اس کی
 چٹائی پر سے زبردست طریقے سے ہوتی تھی۔ وہ اس کی کھانسی
 اصل استعمال ہوتی تھی جس میں تھا۔ گاؤں کے نوادہ بڑے
 گھروں میں تو ساتھ ساتھ دو وقت کے دو تین ٹکڑے ہوئے کھانوں
 اور ایک آدھ گھنٹے کے سماں کی کے استعمال کی کوئی اور شے
 موجود نہ تھی۔ وہاں سے اسے اپنی صوابی میں اس

2009.11.15

کسی غریب کسان یا حمار سے کی جاتی کا ہوا چودھری انھاری بیٹی کے سینے میں دھڑکتا ہوا۔ بس سمجھتا اور کوئی جھٹکتا ایسی ہوتی ہیں جوان ارماتوں، خواہوں اور خواہشوں کو پھینکتیں دیتیں۔ کشور کے ساتھ بھی یہی حالت تھا۔

”ڈرامہ سے ہاتھ پرچی ہوتا جو بھی مہندی لگا دے ماہ باتوا“ بڑی پودھرائی کی آواز سوچ میں غلطان، ماہ بات کو کھمبے کے مائل میں دابھ لگائی۔ بڑی چودھرائی کی فرمائش سن کر تاجو اور دوسروں کی بیاں منہ نیچے کر کے دی واپسی ہوتی تھیں۔ ان ہٹے والوں میں ایک کی سوت ہا ہی بھی شامل تھی لیکن اس نے اپنی بلی کو گناہ نہیں ہونے دیا تھا۔ حویلی کی کمرہ چڑھتا بڑی چودھرائی کا کل کرنا علاقہ اڑنے کی جرأت نہیں تھی اس میں۔ ایک تو وہ بڑی ہونے کی وجہ سے سہولت دیتی تھی وہ دوسرے اسے حویلی کے وارث کی ہاں ہونے کا فخر بھی حاصل تھا۔ ہاں اگر تاجو کے ہاں صوبہ اور کشور کے علاوہ ایک بیانی بھی ہو جاتا جسٹ کا بیڑا ہوا دیتی۔ چودھری کا شمار ہوتا تو صورت حال قدرے غلط ہو سکتی تھی۔ لیکن اب تو بڑی چودھرائی کے سامنے سر جھکاتے رہ گئے تھے سو کوئی چار نہیں تھا۔

ماہ باتوں ہاتھ میں لے پڑی پودھرائی کے قریب جا بیٹھی اور چودھرائی کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی حرکت میں لے کر اس پر پش و نگار ہونے کی کوشش شروع کر دی لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ پودھرائی جس کے ہارے میں سنا تھا کہ عمر میں چودھری انھاری سے کی برس بڑی ہے۔ تمام تر ہود جہد کے باوجود اس کے جسم پر عمر کے اثرات ظاہر تھے۔ وہ تاجو اور دوسروں کی طرح بھرا بھرا اور ہی جلد والا تھا نہیں۔ دھتھی تھی کہ ماہ باتو آسانی سے اس کے ہاتھ پڑتی کارگر کی کا ہتھ رکھا سکتی۔ چھریوں زور ہاتھ جس پر جا چکا تیس اٹھری ہوتی تھیں۔ ماہ باتو کے کلمات دے کر اسے تا کما بتا رہا لیکن وہ جانتی تھی کہ کبک چھری بڑی چودھرائی خود یہ بات ماننے اور سمجھنے پر ہرگز تیار نہیں ہوگی اس لیے پوری تھری سے کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس کوشش میں اسے اپنے من بد اور ادا کرنا بھی ہوش نہیں تھا۔ جب اپنی اپنی پشت پر سے سنا فی دینے والی آواز پر بڑی طرح چوٹ لگی۔

”اچھا کچھ ہو رہا ہے بھی“ ماہ باتو نے پلٹ کر سوال کرنے والے کو دیکھا۔ وہ چودھری انھاری تھا جو سوال تو جانتے کس سے کر رہا تھا لیکن نظریں ماہ باتو کے وجود پر لڑتی ہوئی تھیں۔ اس کی نظروں نے ماہ باتو کو احساس دلایا کہ اس کی اوڑھنی اور ادا بھی سامنے سے مرگ جانے کے باعث بدلی

ہے پروانی سے صرف دابھ سامنے پر بڑی ہوئی ہے۔ اس نے پھر ہی سے اوڑھنی کو اپنے گرد لپیٹا۔ وہ کم عمر اور تاجو کا بھی لیکن سونالی جہت اسے پودھری انھاری کی نظر کا زاویہ سمجھا سکتی تھی۔

”ہم لوگ مہندی لگا رہے تھے اپنی“ تاجو نے کھڑے ہو کر ادب سے پودھری انھاری کے سوال کا جواب دیا تو پودھری جبر ماہ باتو کے نوخیز و پرکشش حسن کی رعنائیاں اوڑھنی کے پیچھے چھپ جانے کے باعث خوبیت سے نکل آیا تھا۔ چودھری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ابھی بات ہے بنا، پر یہ بتاؤ کہ تمھاری ماں کو اس پر سے دینے پر کیوں دلالتی نہیں چلا رہا ہے؟“ چودھری انھاری نے بڑی چودھرائی کا استغناء کیا جس کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ خود بڑی چودھرائی کی کس برآمد ہونا کر رہی تھی۔ ”میں تم لوگوں کو یہ بات یاد دلانے آیا تھا کہ سارے انتظامات پر لڑتی رہا۔ دھتھی ہے۔ نہیں کوئی کئی نہیں دیتی چاہیے۔ مردانے میں تو میں خود ہوں گا اس لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں آپ ہی وہاں کے سارے معاملات دیکھ لوں گا، پر تم لوگ دھیان رکھا۔ پر یاد رکھ لو کہ کی ہے پروانی سے زمان خانے میں کوئی نہ کوئی کی رہ جائی ہے اور پھر زمان خانے اپنے گھروں کو واپس جا کر تمام چودھری ہیں۔ اس بار بھی کوئی شکایت نہیں ملے گی چاہے مجھے۔“ چودھری انھاری نے گفتگو کا موضوع بدل کر بحث کے لیے شروع کر دیا۔

”آپ گری نہ کریں پودھری صاحب اسب کچھ آپ کے حکم کے مطابق ہوگا۔ اس وادی میں نے پہلے سے ہی بڑی کتنی کر رہی ہے تو کرنا نہیں ہے۔ اس وادی وہ کوئی لکھی کرنے کی چرأت نہیں کر رہی۔“ بڑی چودھرائی کا سکھ ساری حویلی پر چلتا تھا لیکن چودھری انھاری کے سامنے وہ ہمیشہ آواز و باکر بات کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے دھتھی آواز میں چودھری کو اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی اس یقین دہانی پر چودھری انھاری نے جواب دے کوئی نہیں دیا لیکن ایک نظر و ثبوت بھری ”اوشہ“ کر کے کرے سے باہر نکلی گیا۔

”کل جہت ہے۔ لے کر میرے ہاتھ کا نام رہا۔“ بڑی چودھرائی نے پودھری انھاری کی ماہ بات پر ہانپنے والی نظریں بھی دھتھی تھیں اور اسے ایک حمار سے کی بیٹی کے سامنے اپنی بے عزتی کا بھی احساس تھا۔ اس لیے پودھری کے باہر نکلتے ہی ماہ باتو کو زور سے دھکا دے کر خود سے دور ہٹا دیا۔ ہٹا دینے والے انداز کا حمار کلا۔ دھکے دے کر دوسرے ایک طرف جا کر گئے۔ والی ماہ باتو چودھرائی کے غصے کا سبب اور اپنا

تھوڑی سی ہونجی رہ گئی۔

”صاحب! میری ہڈی کرو۔“ شہریار نے پانچ پانچ کے بعد اپنے آئین سے پار دکھائی تھا کہ ایک بوڑھا مفلوک الحال شخص اس کے راستے میں آٹھرا ہوا۔ شہریار نے دیکھ کر اسے ایک راستے میں آٹھرے ہونے والے اس بوڑھے کا ہاتھ لیا۔ بوڑھے نے چار خانوں والی دلی ہٹ پر ایک پٹنا ہوا پسینہ سا گرتہ پٹن دکھا تھا۔ یہ پسینہ گرتہ پٹن کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے غلطی ہوئی تھا اور شہریار بوڑھے کے جسم میں سو جھڑکوش کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن ہارڈش و سیکسیٹ صرف مروئی کی جگہ سے نہیں تھی، اس کے پیچھے بوڑھے کا مکمل گریہ بھی موجود تھا۔ وہ آٹھروں کے ساتھ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رہا تھا۔ آٹھروں کے چھروں زور چہرے سے بہتے ہوئے اس کے پسینہ گرتے میں جذب ہو رہے تھے۔

”صاحب! میری ہڈی کرو۔“ شہریار کی طرف سے فوری کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر بوڑھے نے اسے دو بار دہرایا۔

”اگر چلو یا پھر بات کرتے ہیں۔“ شہریار باہر جانے کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ اپنے آئین کی طرف پلٹ گیا۔ بوڑھا آدمی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

”ایک گال پائی لا۔“ بوڑھے کو اپنے آئین میں بٹھا کر شہریار نے پچاسی کو گھمرا دیا۔

”پائی پچھو یا پھر آرام سے ہٹاؤ کہ کیا مسئلہ ہے؟“ پچاسی نے کرنا پھر شہریار نے بوڑھے کو جواب دیا۔

پچاسی نے جب چاب شہریار کا یہ بات مان لی اور ایک سانس میں سارا پانی چھٹا گیا۔ پانی پانی اس کے کھاس کچھ نکال ہوئے اور وہ بائیں ہاتھ کی مدد سے اپنے رخساروں پر ٹھکڑے آٹھروں کے قطروں کو صاف کرنے لگا۔ چہرے پر آٹھروں کے قطرے صاف کرتے ہوئے ان ہاتھوں کا کھر دھلکا، اٹھری ہوئی تھیں اور سیاہ پانی کھال گواہی دے رہی تھی کہ بوڑھے کی صحت کی زندگی انتھک حالت اور مشقت میں گزری ہے۔ دھتھی بھری کی عین مشقت گویا اس کے ہاتھوں پر انتھک تھیں۔ عین کریش ہوئی تھی۔

”ہاں بابا! اب بالو کیا مسئلہ ہے؟ تمھیں مجھ سے کیا درد چاہیے؟“ بوڑھے کو سمجھنے کے لیے کہ شہریار دے رہی تھی اس کا مسئلہ پوچھا۔

”میں لٹ گیا صاحب! میں بوڑھا گیا۔ میری زندگی

بھری کمانی اور عزت لوٹ کر لے گئے عالم۔“ بوڑھے کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چلے آئے۔

”کس نے لوٹ لیا تمھیں؟“ گویا یہ یہ ظلم کرتے والا؟ ذرا آرام سے اور تفصیلی سے ساری بات بتاؤ۔“ شہریار تو غصوں کر سنا تھا کہ وہ شخص کسی نہایت اذیتناک حادثے سے گزرا ہے لیکن ان چند باتوں سے اپنی تفصیلی انھاری مشکل تھا اس لیے اس نے بوڑھے کو کمر لیا۔

”کیا بتاؤں صاحب! گدہ کو کون جہان کا کوئی نامور بنا تو ہے نہیں۔ وہ تو بس کی آمدنی کی طرح آتے ہیں اور ہم غریبوں کو بھوکے کے چلے جاتے ہیں۔ میں نے کئی مشکل سے اپنی دھتھی کے پیچھے کے لیے زیور، کچھ ادا تھا۔ جہت کو کھانا کھانے کے لیے رقم منی کی تھی۔ نام لب و کھولت کر لے گئے۔ ساتھ میری دھتھی کو بھی لے گئے۔ میں نے کئی مدت کی ان کی۔ سر ہجروں میں رکھ دیا، پر وہ میرے خلیفہ چوڑے کلائی کا کیے بغیر اس پر ٹھکر مار کر چلے گئے۔“ بوڑھے کی بات سن کر شہریار نے پچاسی پازوں کیا کہ اس کے ہاتھ پر بائیں جانب اچھا خاصا بڑا گھمرا ہوا ہے۔ یہ گھمرا بڑا بڑا بڑا لٹکائی جانے والی خوراک کی کاٹھیا تھا۔

”تم نے کھانے میں ریڈت کر رکھی اس واقعے کی؟“ بوڑھے کا خاندان واقعی ایک قیامت سے گزرا تھا۔ شہریار نے اپنے دل میں اس کے لیے حقیقی دکھائیں کرتے ہوئے دھتھی سے پوچھا۔

”پہلے ادھر ہی گیا تھا۔ کھانے دار رہا ہے، پہلے ۱۱۳۰ رو پیادو پھر پچھلے کالے گا۔ میں اس کو زور دیا تھا کہ دیتا؟ ڈاکو پانی پانی لوٹ کر لے گئے ہیں میرے گھر سے۔ میرے پاس تو یہاں آنے کے لیے تانے کا کپڑا بھی نہیں تھا۔ اپنے گاؤں سے پہلے یہاں تک آیا ہوں۔ کچھ جگہ کے ہو جا چکا ہوا ہوں۔ پہلے کھانے گیا تھا۔ وہیں کس نے نہیں جانی بھری کے کہنا اسے آئی ہے اور اچھا آدمی ہے اس سے جا کر شکایت کر دو۔ تمھاری مرض سے گوارا اس لیے میں یہاں دلا آیا۔“

بوڑھے کی بتائی گئی تعلیمات سن کر شہریار کے چہرے پر غصے کی سرخی دھڑکنے لگی۔ کیا ستم تھا کہ ایک شخص پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، وہ اپنی کس بچی کے ساتھ اپنی عزت سے بھی محروم ہو گیا تھا اور کوئی اس کے ساتھ ہو لے اس ظلم کی رپورٹ لکھنے والا بھی نہیں تھا کیونکہ وہ رپورٹ لکھنے کے لیے ۱۱۳۰ رو پیہ کھانے دار کو رش میں نہیں دے سکتا تھا۔

”تمھارے دار کو رش ہوتا ہے رپورٹ لکھ کے دے دو رو پے

ماکتھے والا؟ تم پر حکم ہوا ہے، تمہارا حق ہے کہ تم اس علم کی رپورٹ لکھو۔“

”تھانے دار یوں ہے تو نے اپنے پاس بڑا مال دیا رکھا ہے۔ میرے پاس مال تھا جب ہی تو ڈاکو میرے گھر آئے تھے۔ اب اس مال میں سے ٹھوڑا سا حصہ ہمیں بھی دے دے۔“ ٹوڈھے نے تھانے دار کا موقف بتایا۔

اس پارٹنر یار نے ٹوڈھے سے کہہ نہیں کہا اور انٹرکام پر عبداللہان کو اندر آنے کا حکم دیا۔

”عبداللہان! اجاڑی لکھو۔ ہمیں ابھی اس شخص کے ساتھ اس کے گھروں جانا ہے۔“ عبداللہان کے اندر آتے ہی شہر یار نے اسے ہدایت جاری کی۔

”اوکے سر! میں ابھی پانچ منٹ میں بندوبست کرتا ہوں۔“ عبداللہان نے جواب دیا اور واقعی ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ لوگ گاڑی میں سوار ہوئے۔

یوزر ہاگ گاڑی کی انجینیئرنگ برڈ رائیڈ مشاہیرم خان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ عبداللہان شہر یار کے ساتھ جیپ کی نشست پر تھا۔ راستے میں شہر یار نے عبداللہان کو بوڑھے کے ساتھ بیٹے جیسے معاملے کے بارے میں مختصر آیتا باور پھرائے۔

”کیا اس سے پہلے بھی اس قسم کے کیسز سامنے آئے ہیں؟“ یوزر نے پوچھا۔

”یقیناً ہے تو نہیں بتا سکتا سر لیکن بعض اوقات اڑتی اڑتی پر خیرم جاتی ہے کہ ڈاکوؤں کے گروہ نے کسی گاڑی پر حملہ کیا اور ان کا مال و اسباب لوٹنے کے ساتھ کوئی لڑکی بھی اٹھا کر لے گئے۔“ عبداللہان نے جتنا الفاظ میں شہر یار کے سوال کا جواب دیا۔

اس جواب کو سن کر شہر یار نے خاموشی اختیار کر لی۔ پانی کا راستہ اسی خاموشی میں گزر رہا۔

راستہ کچھ طویل تھا لیکن اس طوالت کو مستطوفا نڈوں اور طاقتور انجن والی گاڑی نے بہت جلدی سے طے کر لیا تھا۔ اس کے باوجود شہر یار بوڑھے شخص کی اس تکلیف کو محسوس کیے بنا نہیں رہا۔

جس نے ٹی ٹی ٹیوں کی مسافت پیدل کرنے میں اٹھائی ہوئی۔ ہال آف اسٹون پر وصول اڑتی گاڑی نے انہیں بوڑھے کے گاڑی پہنچا دیا۔ شہر یار جہاں تو اس دودھ دار گاڑی کے تک کا ستر کرنے کے بجائے براہ راست متعلقہ تھانے پہنچ کر

دہان کے تھانے دار سے باز پرس کر رہا تھا لیکن اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ پہلے خود معاملے کی تحقیق کر لے پھر تھانے دار کی کلاس لے۔ چنانچہ اب اس کا ڈرائیور مشاہیرم خان بوڑھے کی رہنمائی میں گاڑی کو اس کے گھر کی طرف

جاسے دے لے رہے ہیں۔ وہ گاڑی کا تھانہ اپنے کام سے کام نہ کھینچے والا یہ جتنی ڈرائیور بڑا مستعد اور فرض شناس تھا۔ جلد ہی اس

نے کہے کہ ایک اور اچھے نیچے راستوں پر مہارت سے چوڑی دوڑاتے ہوئے ان لوگوں کو بوڑھے کے گھر تک پہنچا دیا۔ گھر گیا تھا بس دو تین کمروں پر مشتمل ایک کچا سا گھر تھا جس کے سامنے اس وقت بھی چار پانچ افراد کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”کہاں چلا گیا تھا دین محمد! تیری بیوی کو فحشی کے دوسرے پڑ ہے ہیں اور چھوٹا لڑکا فحشے میں آئے ہے باہر ہوا جا رہا ہے۔“ اس کے فحشے سے ڈر کر ہم نے ابھی تک گھر سے

گڈی گڈی نہیں نکولی۔ ”بول ہی بوڑھے نے ان لوگوں کے ساتھ گاڑی سے باہر قدم رکھا۔ تقریباً اسی کی عمر اور علیلے والا ایک شخص ایک کمرے کے قریب آیا اور اسے بتانے لگا۔

”انصاف کی تلاش میں کیا تھا بھرا یہ سنے اے وہی صاحب ہیں۔ یہ میری عرض من کر خو یہاں تک مجھے اپنی گڈی میں بیٹھا کر لائے ہیں۔ اب یہی پوچھ کریں کہ میرے

لیے۔“ بوڑھے نے فحشے دین محمد کو مخاطب کیا گیا تھا۔ خود سے مخاطب ہونے والے کو بتایا کہ وہ شہر یار اور عبداللہان کو اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گیا۔ مشاہیرم خان باہر گاڑی میں بیٹھا ان لوگوں کا منتظر رہا۔ بوڑھے کے گھر کے دروازے پر وہ

پچھلے ہی تھی۔ اس دین فانی میں دین محمد کی بیوی کے رونے اور دوا لہا کرنے سے ڈر کر اور کوارکاش پیدا ہوا اور پھر دودھ بارہ فحشی میں چلی جاتی تو ماحول پر خاموشی بھا جاتی۔ گاڑی کی

دو چار روٹیں دین محمد کی بیوی کو سنبھالنے کے لیے وہاں موجود تھیں لیکن ان پر بھی موت کی ہی خاموشی طاری تھی۔ وہ گھر

جہاں سے ایک جوان لڑکی کو لوٹا کر لیا گیا تھا، وہ اس طرح موت کا منظر ہی پیش کر سکتا تھا۔

شہر یار نے اپنے پیچھے ہی گھر کے اندر آ جانے والے افراد سے واقف کے بارے میں تفصیلات پوچھنا شروع کر دیں۔

لوگوں سے اسے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دین محمد کی اٹھوئی بیوی کی شادی دوسرے بنگالوں کے ایک بڑے سے دواں بعد ہونے والی تھی۔ شادی کی تیاریاں مکمل تھیں

اور لڑکی کو مایوں بھایا جا چکا تھا۔ اٹھوئی بیوی ہونے کی وجہ سے دین محمد نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس کے لیے جہیز کا انتظام کیا تھا۔ لڑکی کے جہیز کے لیے نو لاکھ روپے، برتن اور

دوسری ضروری اشیاء تیار تھیں۔ تو دین محمد دوسرے بنگالوں سے آنے والی بڑے سے کسی پانی اور کھانے کے لیے بھی رقم جوڑ رکھی تھی۔ اس کام میں دین محمد کے دو نو نو لاکھ روپے ملے بھی

خوب ہاتھ بٹایا تھا۔ دوسری بکن کے جہیز کی تیاری کے لیے وہ دات محنت مزدوری کرتے رہے تھے۔ عرض شادی کا انتظام

مکمل تھا اور گھر میں خوشی کے شاد بانے بچ رہے تھے۔ لڑکی کی سہیلیاں اور گاؤں کی دوسری عورتیں پر شام دین محمد کے گھر پہ جمع ہو کر شادی بیاہ کے گیت گاتیں اور اپنی مذاق کرتیں۔ ان عورتوں کی بھی وہیں گھر میں حسب استعداد خوب تواضع کی جاتی۔ کل بھی اس کے گھر پر عورتوں اور لڑکیوں کی یہ تحفہ بھی تھا اور حسب معمول وہ لوگ رات کا نام چیرا پھیلنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے تھے۔ پھر چائے کیا ہوا کر ادا دیا رات کو دین محمد کے گھر سے اس کی اور اس کی بہوی کے چہنچے کی آوازیں آنے لگیں۔ گاؤں والے دن کو وہاں پہنچے تو خوشی کے گھر کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ دین محمد انہیں سہیلے رہا تھا اور اس کی بیوی بچاؤں کھا رہی تھی۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے اس کے بیٹوں کے چہنچے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگوں کے پوچھنے پر دین محمد یہ مشکل چوڑوں والوں کو بتایا کہ پانچ ڈاکو اگلے دن کے اس کے گھر میں گھر آئے تھے اور مال و املاک لوٹنے کے ساتھ اس کی بیوی کو بھی ساتھ لے گئے۔ دونوں لڑکے اس صورت حال پر بہت کرم ہو گئے تھے اور انہوں نے مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ جواب میں ڈاکوؤں نے اپنی رائفلوں کے بیٹ سے ان کی تواضع کی۔ دین محمد زور کیا کہ بیٹوں کا یہ جوش ان سے ان کی زندگی نہ لگینے لے۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں ایک کمرے میں پھینک کر باہر سے کڑی لگا دی۔ یہ کڑی ابھی تک لگی ہوئی تھی اور دین محمد اپنی کھانا کھا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا کہ اسے ہی گھر سے لے لیا گیا تھا کہ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کی رپورٹ لکھوا سکے لیکن قہار نے اس کی کوئی شواہد نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد دین محمد کی کشتورے پر شہر یار کے دفتر جا پہنچا تھا۔ ماری تفصیلات سن کر شہر یار کو شدید افسوس ہوا اس کے سامنے ہی کمرے کی کڑی کھول کر دین محمد کے بیٹوں کو باہر نکال دیا گیا۔ ان میں سے ایک لڑکا اٹھارہ سال کا اور دوسرا نو سال کا تھا۔ پندرہ سال کا تھا۔ لڑکوں کے چہرے پر محزون، دکھ اور غم صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

”مادر سے بے ایمان اور لالچی لوگ بیٹے ہیں حکومت کی بیٹیوں پر۔ ڈاکوؤں کے لوٹ کے مال میں افسروں کا بھی حصہ ہوتا ہے اسی لیے کوئی انہیں نہیں پکڑتا۔“ چھوٹے لڑکے نے شہر یار کو دیکھتے ہی چوڑا اور اترام لگانا شروع کر دیا۔ شہر یار نے گل سے اس کا یہ اترام سنا کر لڑکا بہت غصہ ناک ہو رہا تھا اور شاید ڈاکوؤں کے ہاتھوں اٹھائی جانے والی سکی کا بدلہ شہر یار کی انہیں طرح سے مرنے کی کڑی لگا دینا چاہتا تھا۔ لڑکے کے نزدیک کچھ کر گاؤں کے دو عین افراد نے اسے سنبھالا اور پھر

واپس اسی کمرے میں بند کر دیا۔

شہر یار نے اس صورت حال پر کوئی بھی رد عمل ظاہر کیے بغیر دین محمد کو ایک بار پھر لڑکیوں کی گھاٹی میں بٹھایا اور مشاہیرام خان کو قید خانہ میں داخلہ قہار نے اپنے گھر پر دیا۔ وہ لوگ قہار نے پہنچے تو قہار نے کاغذ کے حد مستحضر اور خیال نظر آیا۔ یقیناً کسی ذریعے سے انہیں شہر یار کے دین محمد کے ساتھ اس کے گاؤں جانے کی خبر ملی تھی اور ان کے لیے شہر یار کی قہار نے میں آمد سو فیصد یقین بھی تھا۔ اس لیے انہوں نے اس کے قہار نے پہنچنے سے پہلے سارا میٹ اپ تیار کر لیا تھا۔ قہار نے وارنے ان کے قہار نے پہنچنے پر بہت ادب اور جوش سے شہر یار کا استقبال کیا۔ اس کے اس جوش و خروش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہر یار نے اپنے اٹھارہ کمرے دی دیکھا اور دین محمد کے کمرے کے حلقے پانچ سو شروع کر دی۔

”تو یہ سہی قہار۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں رپورٹ درج کرنے کے لیے کسی سے دوسروں سے طلب کروں۔ میں تو رات قہار نے قہار نہیں لکھی۔ میرے پیٹ میں سخت کڑی بھی اس لیے اسے کارروائی میں آکر دم کر رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ میرے پیٹ کی کڑی بندے کو کیسا حال کر دیتی ہے۔ یہ میں آؤں تو آخر فرض شایاں آوں۔ وہی نے بہت دھکا کہ آج کوئی بڑا جادو نہ دیکھیں اور طبیعت ڈر اسی سکتے ہی قہار نے پہنچ گیا۔ جس پر ہے کہ مجھے پہنچے میں قہار ہی دیکھتی۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ بندو بھو پر اترام لگتا ہے کہ میں نے رپورٹ لکھنے کے اس سے دوسرے ہاتھ سے قہار نے جب میں مج سے بلکہ رات سے قہار نے میں قہار ہی نہیں تو رو پے کیسے مانگا۔ اس باپ کی قہار کوئی تلافی ہوئی ہے۔“

شہر یار کی بات سن کر قہار نے دارے فوراً اپنے گلے پہنچے شروع کر دیے اور باتیں بناتے گئے۔

”ممکن ہے تمہارے کسی کی مانت نے یہ حرکت کی ہو۔ فی الحال میں اس معاملے کی تحقیق میں دیکھ رہا ہوں۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ خود ہی لے کر لو کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے آج کے کوئی شکایت نہیں ملتی چاہیے وہ خدا اس قہار کا سارا املہ منظر ہو سکتا ہے۔“ شہر یار نے مجھ پر قہار کے قہار کے وارنری دارے بڑی کر دیا ہے لیکن فی الحال کوئی سخت ایکشن لینے کے بجائے زبانی حیرت کر رہی تھی۔

”میں خیال رکھوں گا کہ جس آپ یہ بتائیں کہ اس ہاتھ کا مسئلہ کیا ہے؟ ہم اپنی اپنی لگا کر اس کا مسئلہ حل کریں گے۔“ آخر میں یہاں پہنچے ہی عوام کی خدمت کے لیے

ہیں۔“ قہار نے دارے روت سے کچھ زیادہ ہی فرض شایاں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی اس معنوی فرض شایاں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہر یار نے دین محمد کو اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر دین محمد اپنے ساتھ بیٹے حادثے کی تفصیل قہار نے دارے کو سنائے۔ قہار نے دارے بڑی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تجلید کی سے اس کی بات سنی اور اپنے ہاتھ سے رپورٹ لکھنے لگا۔

”یہاں افسوس ہوا کہ سہی اس ہاتھ کے ساتھ ہونے والے قہار کا سن کر۔“ رات ہی بڑا کمرہ امداد پہنچا ہے اس لیے دارے کو۔ جوان بھی کا اٹھو ہوتا تھا اس کی موت سے بھی بڑی بات ہے۔ شاید اسی لیے اس باپ کی موت ماری کی اور یہ اسے خواں کھو کر اپنی سیدھی شکایت لگائے آپ کے پاس بھی گیا۔ مجھے تو یہاں پہنچیں ہو چاہے کہ یہ باپ میرے قہار میں آیا ہی نہیں اور بدحواسی میں سیدھا آپ کے پاس جا پہنچا۔ میں بھی خیر ان بوریاں کہ میرے گلے میں کون ایسا رشتہ خود گل آیا جو میری اپنی جتن کے باوجود اس باپ کی رشتہ باجک بیٹا۔ یہاں میں مجھ کا ہوں کہ گڑبڑ میرے گلے کی نہیں۔ باپ کی گے وہاں کی ہے۔“

قہار نے دارے رپورٹ لکھ کر فارغ ہوا تو ایک بار پھر اپنی زبان کے جوہر بکھانے لگا۔ شہر یار دیکھ سکتا تھا کہ دین محمد میں قہار کی مخالفت کرنے کی جرات نہیں۔ شاید یہ قہار نے دارے کی ان نظروں کا اثر تھا جو دین محمد کی طرف اٹھی تھیں تو ان میں قہار ہوتا تھا۔

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ بہر حال یہ اصل مسئلہ اس شخص کی ذاتی حالت کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہونے والے قہار کی تحقیق کرنے کا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس رپورٹ کو صرف قہار نے کے رد کا دیکھ کر طور پر جا کر نہیں رہیں گے بلکہ اس پر آپ کو ایکشن میں لینا ہوگا۔ آپ تو قہار طور پر ایکشن میں اور مرنے کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسے بازیافت کروانے کے مسئلہ میں پیش رفت کریں۔ چار دن کے اندر اندر اس کیس کی رپورٹ میرے سامنے پیش ہوئی چاہیے۔“ قہار نے دارے کے بیان پر کوئی اہمیت دینے بغیر شہر یار سے اسے تحمد یاد دہانی پر کچھ سے کھڑا ہونے لگا۔

”میلے سر اے چاہے تو چھپتے جاؤں۔ جلدی میں ہم سے فی الحال سبکی انتظام ہو گا۔ کسی روز آپ اعلان دے کر آئیں تو ہم آپ کی اپنی طرح خاطر تواضع کریں گے۔“

شہر یار کو کھڑے ہونے دیکر کہ قہار نے دارے نے میز پر جے جانے کے برتنوں اور دیگر لوازمات کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے خوشامد بھرے گلے میں درخواست کی۔ چائے اور اس کے ساتھ موجود یہ لوازمات ابھی ابھی دوسپا کی کریم پر چھا کر گئے تھے۔

”تو شکست۔ میں نے وقت کھانے بیٹے سے گریز کرتا ہوں۔ آپ بھی احتیاط کیا کریں۔ پولیس کی نوکری کرنے والے شخص کو چاق و پونڈ اور اساتذہ ہونا چاہیے۔ ورنہ پولیس والا اپنے نوکری پر چنٹ ہی سنبھال رہا جاتا ہے اور غم بھاگ جاتے ہیں۔“ شہر یار نے قہار نے دارے کی دعوت قبول کرنے سے قہار انکار کرتے ہوئے اس کی پہلی نوکری کی طرف اشارہ کر کے طعنیہ کیا۔ قہار نے دارے خود پر کی جانے والی اس چوٹ پر بھینپ گیا اور پھر شاید اسی لیے دوبارہ شہر یار سے چائے پینے پر اصرار نہیں کیا۔ قہار نے لکل کر شہر یار نے مشاہیرام خان کو جانے کی کہ پہلے ہی دین محمد کو اس کے گاؤں کے قریب اتار دیا جائے پھر وہاں چلا جائے۔ مشاہیرام خان نے اس ہدایت پر عمل کیا۔

”دین محمد! میں نے تمہارے گاؤں میں ایک چھوٹا سا مدرسہ کھانا تھا۔ وہ مدرسہ کس نے بنایا ہے وہاں؟“ گاؤں روانہ ہوئی تو شہر یار کو دین محمد کے گاؤں میں دیکھی گئی اس عمارت کا خیال آیا تو پھر باوجود کڑے دتے پر تیر کی گئی۔ عمارت چھوٹی تھی لیکن پسماندہ سے گاؤں کے کچے گھروں کے مقابلے میں اس کی تعمیر کافی اچھی تھی۔ شہر یار نے اس عمارت کے گیت پر کئی مدرسے کا پورا پورا اثر دیکھا تھا لیکن اس وقت دین محمد نے اس بارے میں اشتہار کرنے کا موقع نہیں تھا اس لیے کچھس کے باوجود چپ رہا تھا۔ اب اسے دوبارہ اس دور سے کا خیال آیا تو دین محمد سے اس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

”وہ مدرسہ شاہد لوازم صاحب نے بنوایا ہے صاحب اٹھ لوازم صاحب بڑا ٹھیک آدمی ہے۔ اس کے آتے سے ہمارے گاؤں کی قسمت جاگ گئی ہے۔ پہلے پہلے ہمارا گھر اور دارہ پھر نے میں اپنا وقت بے ہاد کرتے تھے۔ اب دارے صاحب جاگ کر ان کی باتیں لکھتے ہیں۔ شاہد لوازم صاحب انہیں اپنے پلے سے ایک وقت کی روٹی بھی کھاتے ہیں۔“ بڑے سی دی والے دین محمد ہیں شاہد لوازم صاحب۔“ شہر یار کے سوال کرتے ہی دین محمد نے کسی شاہد لوازم کی تعریفیں کے بلکہ ہاتھ شہر گرد کر دیے۔

”یہ شاہد لوازم صاحب اصل میں ہیں ان دنوں دین محمد۔ اور یہ آئے کہاں سے ہیں؟“ دین محمد کے جواب نے شہر یار کے اشتیاق کو بھڑکایا کہ وہ شہر یار کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔

"یہ سب تو ہمیں معلوم صاحب پرستہ معلوم ہے کہ شاہ نوہ صاحب بڑے اعلیٰ آدمی ہیں۔" وہیں محمد کے لہجے میں عقیدت تھی۔ شہر یار نے اعجاز الکاظمی کا کٹا کٹا ہوا لہجہ کوئی ماسٹر آف بک کی ٹیکری کا آدمی ہے جو نام اور آوازیں ماسٹر کی زندگی چھوڑ کر گاؤں کے ان پٹے بولے لوگوں کی بھلائی کے خیال سے ان کے درمیان آیا ہے۔ دوسروں کے لیے اپنی ذات کا آدمی بن جیتے والے ایسے لوگ شہر یار کو بہت اچھے لگتے تھے۔ شہر یار کی خود اشیائی کہ شاہ نوہ سے ملاقات کرے اور اس کے مدرسے کو دیکھے لیکن آج وہ چیلنجی طے شدہ شہر یار سے بہت ہٹ کر مصروف رہا تھا اور اب اس کے پاس تعلیمی وقت نہیں تھا کہ شاہ نوہ سے ملاقات کے لیے جا سکے۔ آج اسے چودھری افتخار کے دادا کے عرس میں شرکت کے لیے جہاز دہلی پہنچنا تھا۔ وہ کہ شاہ نوہ سے ملاقات کی کوشش کرتا تو چودھری افتخار کے گاؤں پہنچنے میں بہت تاخیر ہو جاتی۔ چار ماہ کی خواہش کو بد کر بھڑا رہا اور شاہ نوہ خان نے دین محمد کو اس کے گاؤں کی حدود کے قریب اتار دینے کے بعد گاڑی موڑ لی۔

☆ ☆ ☆

شہر یار وقت مقرر پر ہی آ کر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ گاؤں بھی اپنے راستوں اور مکانوں کی حالت کے اعتبار سے کافی پسماندہ لگتا تھا۔ دینا تھا حالت رہنے کے اعتبار سے یہ اس ضلع کا سب سے بڑا گاؤں تھا۔ گاؤں کی بیشتر زمین چودھری افتخار اور اس کے خاندان کے افراد کی ملکیت تھی۔ گاؤں کے نام کے بارے میں اسے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ پہلے اس گاؤں کا نام کچھ اور تھا لیکن چودھری افتخار کے دادا چیر مراد عالم شاہ کی وفات کے بعد پرانا نام بدل کر گاؤں کا نام کتاہر آباد رکھ دیا۔ اسی پر آبادی آج چودھری مراد عالم شاہ کے عرس منایا جا رہا تھا۔ درگاہ کا احاطہ عقیدت مندوں سے بھرا ہوا تھا۔ شہر یار کی گاڑی کھینچ رہا کرکری تو اس کے گاڑی سے اتارنے سے پہلے ہی منی اللہ رکھا استقبال کے لیے دوڑا آیا۔ اس نے شہر یار کے ذرا اندر بٹھا کر نام خان کو موع دے بغیر خود گاڑی کا دروازہ کھولا اور پھر لوگوں کے گروہ سے بہت قریب ایک صاف ستھرے اور کشادہ راستے سے شہر یار کو اس مقام تک لے گیا جہاں چودھری افتخار کے دروازے کے گھنٹے خاص خاص بھانان گواہی دے رہے تھے۔ یہ جگہ دراصل ایک طویل دھڑیل، بلند چوڑا تھا جس پر ایک طرف کرسیاں لگا کر مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا جبکہ دوسری طرف سفید رافتی چاندنیوں پر قوالوں کی ٹولی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس

ٹولی کے ہر فرد نے سفید مل کے کڑوں پہ آڑھے سے پا جاسے چہنہ لگے تھے اور ان کے سروں پر بڑے بڑے ٹکڑے لٹکائے ہوئے تھے۔ یہ قوال چودھری افتخار عالم کے دادا کی شان میں کسی مقصد کے لیے تھے۔ منقبت کے اشعار میں کتب لکھ کر صاحب کے علاوہ ان کی آلہ اور ان کی بھی تحریف و توصیف آج بھی لکھی۔ شہر یار نے فوراً منقبت کے الفاظ سنے۔ ان الفاظ کو سن کر کھٹک تھا کہ یہ مراد عالم شاہ سے بڑھ کر ٹیک و سار جیسا ہوتا ہے۔ رشتہ پر کوئی اور نہ گزری ہو۔ یقیناً قوالوں کے بے ہل بندہ اس کے لیے پیشہ و شغل کو بھاری قیمت ادا کی تھی۔

چوڑے چوڑے چوڑے سے نمایاں جگہ پر ایک بلند اور سہری گری دھکی گئی تھی۔ فی الحال یہ کرسی خالی تھی۔ شہر یار کی نظر ان ساقی سے پہنچی ہوئی چوڑے کے درمیان طرف موجود اسٹال پر پڑی۔ یہ اسٹال عزم میں جا رہا لگتی جانے والی بیٹوں سے مست رہا۔ اسٹال گورکھ پرستہ کاٹھی چھوٹوں سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا اور میزوں پر سرسبز پھل پھانسی کے پڑے پڑے پھل لگے تھے۔ ان پھلوں پر گلاب اور سوپے کے پھولوں کی لٹریاں لٹکی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی کئی کے چھوٹے چھوٹے کوزے بھی لگے تھے۔ عقیدت مندوں کی بڑی تعداد درمیان اسٹال کی طرف تھا۔ اسٹال پر موجود کارندہ منی کے کوزوں میں ٹھون سے پانی بھر کر عقیدت مندوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ بڑی عقیدت کے ساتھ پانی چاہ رہا تھا۔ اسٹال پر رکھوں کے ساتھ ہی ایک صندوق بھی دھکیا گیا تھا۔ اسٹال عقیدت مند پانی پینے سے پہلے اس صندوق میں دیکھ کر کچھ ڈال دیتے تھے۔ شہر یار نے تو یہ بھی محسوس کیا کہ منی کے کوزوں میں تقسیم ہونے والے پانی سے وہی لوگ نہیں پاب ہو رہے ہیں جو صندوق میں کچھ ڈالے ہیں۔ اس مشقے کو مکمل کرنے کے لیے اس نے اپنے ساتھ پیسے لائیں ہی لے کر نکلا۔

"بڑے بڑے صاحب چودھری مراد عالم شاہ کی قبر کوکل حق گلاب اور کیڑا لے پانی سے غسل دیا گیا تھا۔ یہ اس غسل کا پانی پانی سے بنے لوگ تھک کے طور پر پیتے ہیں۔" انہی نے جو کرشمہ کئی سالوں سے اس قریب میں شرکت کرتا رہا تھا شہر یار کی معلومات میں اضافہ کیا اور پھر آواز کو حرا دیا کہ اس کے پاس آئے۔ "تعمیر و ترمیم صاحب کی قبر پر جو خصوصی چار چڑھائی جانے کی جو اور گاہ کے زمیندار مل کر ہر سال کیا کر دیتے ہیں۔ اس چارہ کی تادی میں بہت قیمتی چیز استعمال ہوتی ہے۔ چارہ کو کسی عبارت اور تحوش کے

لے سونے چاندی کے تاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ قبر کو غسل دینے سے پہلے پانی چار چار کر محفوظ کر لی جاتی ہے اور عرس والے دن ہی چار چڑھائی پانی ہے۔" شہر یار انہی کی کی فراہم کر دیا ان معلومات کو سن کر اعجاز وہ سکا تھا کہ پانی چار چڑھائی پر سونے چاندی کے تاروں سے کام ہوتا تھا جس طرح اور کئی باتوں میں محفوظ ہوتی ہوگی۔ وہ چودھری افتخار اور اس کے باپ دادا کو ان کی جلائی پر داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لوگوں کو ان کی عقیدت سے مستی بنادوں پر فائدہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بڑی عیاری سے، بہت شان دار سیٹ اپ تیار کر رکھا تھا۔ اگلی شہر یار چودھری کی اس جلائی پر غور کر گیا وہ ہاتھ کر کھنسا پرستہ کی کسی کیفیت طاری ہوئی۔ (اور ادرہ پرستہ کی سے کھنچے لوگ موزے ہو کر مڑے ہوئے۔ پھر شہر یار نے وہ بھی ہوتی ڈولی دیکھی جسے کئی افراد نے اٹھا رکھا تھا۔ ڈولی چوڑے پر دھکی ہوئی شہری کرسی کے مقابلہ لاکر بھی گئی اور پھر اس میں سے چودھری افتخار عالم شاہ برآمد ہوا۔ آہستہ آہستہ چودھری کی چھب کی خرابی تھی۔ اس نے ایک ہزر گنگ کا قیمتی مہمان رکھا تھا۔ اس مہمان کی لمبائی اتنی زیادہ تھی کہ وہ پیچھے سے فرش کو چھو رہا تھا۔ عمار پر گیا شہری کام بھی بیٹھا سونے کے تاروں سے کیا گیا تھا۔ چودھری کے سر پر بھی وستار بھی مہر اور سہری رنگ کے احتیاج سے تیار کی گئی تھی۔ چودھری کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں پتھر جڑی جیتی انگلیاں تھیں۔ انہی انگلیوں کے درمیان اس نے ایک پتھری ہوئی مہمان کی کٹی پستہ بھی تھی۔ چودھری ڈولی سے اتر گیا تو ڈولی لے کر آنے والے اسے اٹھا کر واپس لے گئے۔ چودھری افتخار نے پتھریوں سے چتا کر لی تک پہنچا اور چار لے کر سفر سے اس پر براہیمان ہو گیا۔ پھر اسے واپس جانب کی نشستوں پر بیٹھے خاص مہمانوں کی طرف گھمرا کر دیکھا اور کچھ بولنا سنا

دینے کے بعد عقیدت مندوں کے اس گروہ کی طرف متوجہ ہو گیا چوڑے کے پیچھے سوں کے ایک ڈھیر کی صورت میں بالکل اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے کیت میں سو جو کسی کھڑی فصل کے پھول نظر آتے ہیں۔ چوڑے سے پیچھے جانے والی سیر جیوں چودھری کے کاوند کھڑے تھے جنہوں نے عقیدت اور نور بخشی سے بے حال ہوتے ہوئے زائرین کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔ چودھری نے اپنے گاہکوں کی طرف دیکھتے ہوئے سر کو ہلکی سی جھنجھکی دی۔ کارندوں نے زائرین میں سے ایک کو گاہک سیر حیاں چڑھ کر چوڑے پر آئے گی اجازت دینی شروع کر دی۔ اوپر آئے والا ہر زائر دونوں

ہاتھ ہاتھ کر، ادب سے اس گھڑی کے قریب پہنچتا جس پر چودھری افتخار عالم شاہ روٹی افزہ تھا۔ قریب پہنچنے کے بعد وہ دروازہ بیٹھا اور چودھری کے پیچھے والے ہاتھ کی پشت پر ایک عقیدت بھرا ہونے والے قدموں کا جھکاؤ تھا۔ ہارے کے ساتھ چوڑے سے اتر گیا۔ پتھری کو وہ ان کے پٹے پتھری کو لوگوں میں سے ہے جسے چودھری افتخار عالم شاہ کے ہاتھ کا پوسٹے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پھوٹی پڑی تھی۔

شہر یار ناموسی سے یہ قاشاد دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے اور لوگ بھی یہی کام کر رہے تھے۔ عقیدت مندوں کو اس سعادت سے محروم نہ ہونے کے بعد چودھری افتخار نے ہاتھ کے اشارے سے کارندوں کو پتھریاں اٹھا کر پیچھے سے روک دیا۔ اب یہ صاحب کی قبر پر پہنچ کر چار چڑھائی کے کام طے ہو چکا تھا۔ چودھری افتخار نے اپنے قلم خصوصی مہمانوں کے جنوں میں درگاہ کے اس حصے کا رخ کیا جہاں اس کے دادا حضور کی قبر تھی۔ قبر پر پہنچنے کے بعد زمینداروں کے ہاتھ تعاون سے تیار کی گئی ہزاروں چار ایک بڑے سے فعال میں رکھ کر چودھری افتخار کی خدمت میں پیش کی گئی۔ چودھری نے یہ چار بڑی عقیدت مند کا اظہار کرنے سے اپنے دادا کی قبر پر چڑھادی۔ اس موقع پر کئی افسران نے چودھری کی معاذت کی، خصوصاً ایس ایس کا م میں پیش پیش رہا۔ خود شہر یار نے اس موقع پر ذرا پیچھے رہنا مناسب سمجھا تھا۔ چار چڑھائی کے رسم کی ادائیگی کے بعد چودھری افتخار تمام خصوصی مہمانوں کو بے صدا ارادے ساتھ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔

طشتری میں رکھ کر چودھری افتخار کے کمرے کے سامنے پہنچا اور دروازے پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں اندر سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ ماہ بانو نے ایک بار پھر دستک دی لیکن اب بھی اندر خاموشی ہی رہی۔ ماہ بانو نے پائین ہاتھ سے کمرے کے دروازے کو جھکے سے دھکیلا۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ سامنے کمرہ خالی پڑا تھا اور وہاں چودھری افتخار کا نام و نشان نہیں تھا۔ ماہ بانو آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

حویلی میں آنے جانے کے اس عرصے میں یہ پہلا موقع تھا جو اسے چودھری افتخار کا عالم شاد کے کمرے میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر وہ کچھ لمبے کے لیے ساکت لی رو گئی۔ یوں تو پوری حویلی ہی بڑی خوب صورتی سے چھائی کی تھی لیکن چودھری افتخار کے کمرے کی تو بات ہی الگ تھی۔ اس کا کمرہ کوئی مسلم کدو تھا جہاں ماہ بانو اچانک آ گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہاں غلوں اور ڈراموں میں دکھائے جانے والے کسی شہزادے کے کمرے کا سیٹ لگا ہو بلکہ کمرہ ان ٹیکس کے مقابلے میں اور بھی زیادہ خوب صورتی سے سجایا ہوا تھا۔ کمرے میں الیکٹریک بڑی کی وجہ سے خوش گوادی گرمی تھی۔ ماہ بانو اس خوب صورتی میں کم ہو کر بھول گئی کہ یہ چودھری افتخار کا کمرہ ہے اور وہ وہاں چودھری افتخار کے لیے دو درجہ پہچانے آئی ہے۔ حیرت زدہ سی کیفیت میں اس نے اپنے ہاتھ میں موجود دو درجہ کا گلاس ایک تانی پر رکھا اور خود بڑے سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بیڈ پر بچھا کمرہ نرم اور آرام دہ تھا۔ ماہ بانو کو اس پر بیٹھ کر بہت الف آیا۔ اس نے اس الف کو مزید محسوس کرنے کے لیے اپنا سر پشت پر موجود نیچے پر رکھ دیا۔ نیچے بھی بے حد نرم لایم تھا۔ ماہ بانو کو یوں لگا جیسے وہ بالوں پر سر رکھ گئی ہو۔ اس خوشی کو اگر کیفیت میں کتنے لمبے گزرتے اسے اندازہ نہ ہو سکا۔ محسوس اور فینڈ سے بڑ حال جسم اتنا آرام پا کر خود کار فائلز میں خند کی آغوش میں چلا گیا۔ غفلت کے یہ لمحات کتنے طویل تھے، وہ ایمان و یقین کا کمرہ تھی۔ اس کی آنکھ دو بارہ اپنے جسم پر محسوس ہونے والے لمس کی وجہ سے کھلی۔ کمرے میں ہم تاریکی تھی مگر وہ اپنی غلوں کے بالوں کے سامنے موجود چودھری افتخار کی وجہ سے خوشی دیکھ سکتی تھی۔ اس نے کھیرا کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ چودھری نے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اس کی اس کوشش کو ناکام بنادیا اور اسے پکارا کرتے ہوئے بولا۔

”کہاں جاتی ہے، بھئی رو۔ بہت تھک گئی ہے نا۔ یہاں میرے بستر جیسا آرام نہیں اور نہیں ملے گا۔“

”مم۔“ سمجھ جاتا ہے۔“ ماہ بانو نے خوف زدہ سے اعجاز میں ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

”پہلی جانا۔ اسک بھی کیا جلدی ہے؟“ چودھری نے ایک بار پھر اس کی کوشش کو ناکام بنادیا۔

”معاف کروں، چودھری صاحب! میں غلطی سے اصرار سو گئی تھی۔ آپ مجھے جانے دیں۔“ خوف ماہ بانو کے غور سے جسم میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ اپنی ساری توجہ حرا نگاہ بھول کر چودھری کے سامنے لجا جت سے گزرتا نہ تھی۔

”تیری غلطی تو ہماری خوش نصیبی ہے۔ آج ہی تو ہم نے خواہش کی تھی تیری۔ ابھی تو سوچ ہی رہے تھے کہ کیسے تیرے حصول کو ممکن بنائیں۔ پر تیری غلطی نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم وہاں اپنے مہمانوں کے ساتھ پیٹھے شراب سے دل بہلا رہے ہیں اور یہاں تھوڑی سی غلطی شے ہمارے بستر پر پڑی ہے۔ ہمیں تو کمرے میں داخل ہونے کے بعد تجھے اپنے بستر پر دیکھ کر یقین ہی نہیں آیا۔ ہم سمجھے کہ شراب کا نشہ راز بادہ کی چڑھ گیا ہے لیکن پھر دیکھا تو توجہ پتہ چلا یہاں تھی۔ اب بتا ہم ہاتھ آئے اس انعام کو کیسے جانے دیں۔“ چودھری نے چلتا رہے لیٹے ہوئے ماہ بانو کو اپنی خوش نصیبی کی داستان سنائی۔

”مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میں تمہیں تمہارے دباؤ کا ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ ماہ بانو جواب تک بے حد خوف زدہ تھی، اچانک بھڑک اٹھی اور دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر چودھری کو دھکیلتے کی کوشش کی مگر اس کیسے ہارک لڑکی کی یہ کوشش چودھری کے طاقتور وجود کے سامنے کیا حیثیت رکھتی تھی۔ دو دیکھ ہی ماہ بانو پر چھا گیا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش میں ماہ بانو کا جسم پھڑک کر رہ گیا۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے زور سے چلائے کے لیے مڑ بھڑا لیکن چودھری نے اپنی طمع چرکتا تھا، وہ ہاتھ آئے اس دھکا کو آزاد کرنے کے لیے طبی تیار نہیں تھا۔ چھپنے کے لیے کھلے ماہ بانو کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس نے ماہ بانو کی جھنجھکی کا گھاموٹ ڈالا۔ اس کمرے میں اس سے قس بھیجی جانے لگی لڑکیوں کی بیٹیوں کا دم گھٹی گیا تھا۔ ماہ بانو کا آزادی کی کوشش میں پھر سما جسم اپنے انجام کے خوف سے سر پڑتا جا رہا تھا اور حلق سے آواز دے سکتے والی جھنجھ نے اپنی ہوئی آنکھوں میں ڈھیر ڈال لیا تھا۔ لیکن چودھری افتخار پر بات سے بے پروا تھا اپنی بوس کا پیٹ بھرے میں دھکیں رکھتا تھا۔ یہ بوس ماہ بانو کو بڑا دیکھے بغیر نہیں مٹ سکتی تھی۔

جاری ہے

حویلی کے سب سے شان دار کمرے میں موجود
 دونوں نفوس دو مختلف اہتیاؤں پر کھڑے تھے۔ ماہبانو کے
 لیے یہ قیامت کی گھڑیاں تھیں۔
 سترہ سال کی عمر میں وہ ایک ہیانگہ ترین تجربے سے
 گزرنے جا رہی تھی۔ خوف کی شدت نے اسے ہکھواں
 طرح مفلوج کر دیا تھا کہ اسے اپنے دفاع کے لیے ذرا سی
 حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اپنے بچ جانے کے لیے اس
 کے پاس اگر کوئی امید بھی تو صرف یہ کہ کوئی بیرونی امداد



کے حلقہ کا احساس ہونے پر کچھ مطمئن ہی ہو کر فطرت میں چلی گئی۔ نوران اور زہرہ البیت پریشان ہی اس کے قریب ہی بیٹھیں رہیں۔ ماہ بانو جو چلی میں بھی اور اب جس حال میں گھر واپس آئی تھی وہ اس کا ذمہ دار چلی سے وابستہ کوئی فرد ہی ہو سکتا تھا۔ وہ فرد کو تھا؟ اس کا جواب صرف ماہ بانو ہی دے سکتی تھی لیکن وہ اس وقت تقریباً بے ہوش تھی۔ اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ نوران کی توقع کے خلاف غیبت جمع ہو جیت دیر سے گھر واپس آئی۔ اس دوران زہرہ البیت کو ناشائستہ کروا کر مسجد کے لیے روانہ کر چکی تھی۔ البیت اس کو اسکول میں داخل کروانے کے بجائے مسجد میں مولوی صاحب کے پاس بڑھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ غیبت محمد کے خیال کے مطابق البیت کو بھی اس کی طرح کھینچوں میں بل جانے اور چلی کی خدمت کے کام پر انجام دینے سے نوران کا ہوس کے لیے اسکول کی تعلیم کی قطعی ضرورت نہیں تھی البتہ مولوی صاحب کے پاس جاتے کا معاملہ تھا۔ البیت اس کے دل جانے سے انہیں اس کی اور اپنی آخرت سونپ دینے کی امید تھی۔ پھر وہاں جانے میں چودھری افتخار کی ناراضی کا بھی کوئی خدشہ نہیں تھا۔ مولوی صاحب کو چودھری افتخار کی غیبت حاصل تھی۔ اسکول کی مخالفت بھی وہ بہت عمل کر چکی تھیں کہ تھا جس اس کے دوسری سے احوال مزاحموں کے کان میں پڑتے رہتے تھے جن کا کلب لاپاب بھی تھا کہ اسکول کی تعلیم کاؤں کے ان بچوں کی ویلایاد آخرت سونپانے میں کوئی ذمہ دہ نہیں دے سکتی تھی۔ کھینچوں میں بل چلانے کا کام دواغیر تعلیم کے بھی ہے۔ خیر و خیر انجام دے سکتے تھے جبکہ آخرت سونپانے کے لیے مولوی صاحب کے پاس جانا مناسب تھا چنانچہ البیت اس کو اسکول میں داخل نہیں کروایا گیا تھا۔

رات چوٹی میں جڑا رنگ رہا۔ جانے جیسے ایک مہمان کے کمرے میں آگ لگ گئی۔ ستارے وہ مہمان شہر کے ایک بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا۔ بے چارہ آگ میں ٹھس کر خاک ہو گیا۔ صبح سے پولیس کے بڑے بڑے افسر چوٹی پہنچے ہوئے ہیں۔ لڑکے کی لاش کو لوگوں نے شہر بھجوا دیا ہے۔

چودھری صاحب بڑے پریشان اور غصے میں ہیں۔ میں تو تیرے دوسرے لوگوں کے ساتھ درگاہ پر ہی تھا لیکن چوٹی سے خبر لے کر آنے والے تھے تاہم مہمان خانے کے عین چادر کمرے جل گئے ہیں۔ حالانکہ بے چارے ملازموں نے بڑی کوشش کی تھی آگ بجھانے کی۔ وہ تو نوران کو کوشش میں اچھے خاصے جل گئے ہیں لیکن پھر بھی اچھا خاصا نقصان ہو گیا ہے۔ سب سے بڑی بات بندہ جان سے چلا گیا ہے۔ چودھری صاحب کا

پریشان ہونا تو جانتا ہے کہ ان کی چوٹی میں ان کا مہمان جان سے گزر گیا۔ غیبت نے گھر آتے ہی نوران کو چوٹی میں ہونے والے حادثے کے بارے میں خبر دی۔

"پیر آگ لگی کیسے؟" نوران نے حیرت سے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم البتہ میں والے آئے ہوئے ہیں، وہی چھان بین کر کے کچھ بتا سکتے تھے۔ ابھی تو تو میں یہ کر رہی تھی جلدی سے ناشائستہ دے۔ رات بھی منت مانتے کے چکر میں تھی۔ میں لنگر سے اپنا خیر نہیں لے سکا تھا۔ اب بھی بڑی مشکلوں سے نظر بچا کر وہاں سے نکلا ہوں کچھ کچھ کی آگ بچر گرد و بار وادھر جاؤں۔ آج تو سارا دن ادھر ہی خدمت میں حاضر رہنا پڑے گا ورنہ چودھری صاحب کا کھڑے تو کسی پر بھی نکل سکتا ہے۔" کچھ دیر سے دن کی چٹکن اور رات کی چکا نے غیبت کا حال بھی برا کر رہا تھا لیکن ان دنوں کلمات میں وہ کہہ بیٹھ کر آرام کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ نوران نے جلدی جلدی اسے ناشائستہ کروا دیا اور اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے زہرہ کو ماہ بانو کے متعلق چند باتیں دے کر دھوکہ بھی چوٹی کے لیے روانہ ہوئی۔ اسے آج معمول سے بہت زیادہ دیر ہو چکی تھی اور وہ ڈر رہی تھی کہ نہیں اسے اس دیر کا خمیازہ نہ نہایت پڑے لیکن چوٹی کی ساری کرتا دھرتا ختم خود اپنی شہر پریشانی میں نہیں گرا نہیں نوران کے کمرے سے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ نوران خاموشی سے اپنے جیسے کا کھانا کھا کر واپس گھر آئی۔ ماہ بانو ابھی تک بستر پر ہی تھی البتہ زہرہ نے اس کی لباس تبدیل کروا دیا تھا۔ ماہ بانو کا پورا جسم بھارے سے جل رہا تھا۔ نوران زہرہ کو کھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کر کے خود کیم سے دوا لینے چلی گئی۔ دوا لاکر اس نے ماہ بانو کو کھائی۔ کھنڈے پانی کی پٹیاں اور دوا کے اثر سے ماہ بانو کے بخار کی شدت کم ہوئی۔ اگلے دن اور تھا۔ ماہ بانو سے لے شدہ معاندیہ کے مطابق صفر علی الصباح اسے واپس لے جانے کے لیے گاؤں پہنچ گیا۔ ماہ بانو کی اتنی بولی شکل دیکھ کر اسے سخت کھینچ ہوئی۔ نوران نے ماہ بانو کی بانی کا بہانہ بنا کر صفر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو البتہ خاموش رہی اور اپنی خاموشی کے عالم میں صفر کے ساتھ فعل آتا جا جانے کے لیے روانہ ہوئی۔ نوران کو موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ ماہ بانو سے اس کے ساتھ بیٹے حادثے کے بارے میں تفصیلات پوچھ سکے۔

☆ ☆ ☆

"ایکپرس نے حادثے سے حلقی اپنی بہنوئی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ ان کی رائے کے مطابق آگ لگ

ایک اتفاقی حادثہ تھا جو مرنے والے کی اپنی غفلت سے پیش آیا۔ حادثے سے پہلے اس نے شراب نوشی کرتے ہوئے شاپا کچھ شراب اپنے بستر پر بھی گرا دی تھی پھر دھوکے کے عالم میں اس نے بستر سے کودنا بھی ہوئی دیاسا کی بھی بستر پر ہی بیٹھ گئی، نتیجتاً آگ لگ کر اٹھی۔ اس آگ نے تیزی سے بستر سے کارپٹ اور پردوں تک کا سفر لے کر لیا۔ حلقہ کی لیم کی اس رائے کو پست رائے کی رپورٹ سے بھی توفیق مل رہی ہے۔ پہلے ایک ایک کمرے کے مطابق لڑکے سے یہ حقائق شراپہ کی رہی تھی۔ اس کے معذرت میں اس کی بڑی عقدا موجود تھی۔ اس کے ملاوہ ایک کمرے نے یہ بھی بتایا ہے کہ لڑکے نے شراب کے ساتھ ساتھ بچوں کا استعمال بھی کیا تھا۔ اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ شخص جو ایک وقت شراب اور چرس کے نشے میں دھنس رہا تھا پھر پھر کچھ سال میں ہو گیا ایسے شخص کے ساتھ کسی حادثے کا پیش آجاتا غلطی منتقلی کی بات ہے۔" چودھری افتخار عالم شاہ کے دلچسپ ڈرائنگ روم میں بیٹھا شہر یاد اسے حادثے کے بارے میں مایہ ناز کی رائے سے آگاہ کر رہا تھا جبکہ چودھری کے چہرے پر پچھلے عین دن سے چھایا تھا۔ اب بھی موجود تھا۔ شہر یاد کی فراہم کردہ معلومات کو ان کے کھنڈے پانے کے اور وہ غصے سے بولا۔

"گرفتار دیکھو لڑکے کے۔ کم بخت عادی لٹے باڑھا دار مولوی والا تھا۔ بے یارہ انکرا ہوا ہے جیسے میں نے اس کے بچہ کی جان لی ہو۔ لنگر ہے، مجھے بھی حادثے کا شوق ہے۔ میں خود شہر مند ہوں کہ اس کا پتہ میری چوٹی میں لی جان سے گیا لیکن اس کی جان جانے میں میری تو کوئی دخلی نہیں تھا۔ میرے نوکر کو نے اپنی جان پر کھیل کر آگ بجھائی۔ میں نے خود نوکر کو کہہ کر شہر سے فائر بریڈنگ والوں کو بلا دیا لیکن لڑکے کی موت آگ ہی تھی تو اسے کون بچا سکتا تھا۔ کسی کے مرنے سے پہلے تو میرا اعتقاد نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی کہ بچہ والوں کا کام بالشت سکون میں خود میت کے ساتھ تھا اس کے گھر گیا۔ افسوس بھی کیا کہ میری چوٹی میں اس کا پتہ کو ایسا جان لیا حادثہ پیش آ گیا لیکن اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ پھر میں نے لڑکے کے سوگر پائی طرف سے لکھنے کی دیکھیں جو اگر کھینچیں تو اس سے وہ بھی واپس گرا لیا۔ باتو شان وادگر نہ تھا۔ انکھ سے اڑ پڑا تو تھک گیا تھا۔ مجھے اس پر۔ سارا کا سارا جہیم خاؤں میں بھجوا دیا۔" چودھری افتخار کو اپنی رقم خالص ہونے کا شہدہ دیکھ تھا۔ وہ دم جو لے لے اپنے کا وہ باری مراسم کو مضبوط بنانے رکھنے کے لیے

مولوی والا کے بیٹے کے سوگر پائی کی تھی۔ جہیم خانے میں لگ چکی تھی تو یہ اس شخص کی ذہنیت رکھنے والے جیسے کے حساب سے تو اچھا خاصا نقصان تھا۔ مولوی والا اس کا بڑا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اس کے بھجوانے کے لیے کھانے کے سوگر میں آئے ہوئے لوگوں کو کھانا تو چودھری کو بھی کھانا کھانے والا اسے اس حادثے کے بعد بھی اس کے مراسم بگڑے نہیں ہیں۔ دوسرے سوگر میں آنے والے مہزین کو بھی جب یہ جہیم ہونا کہ سوگر کا نشان دار کھانا چودھری کی طرف سے آیا ہے تو وہ اس کی دریافت سے متاثر ہوئے لیکن مولوی والا کے لیے جہیم پائی کی جہ سے کھانا پہنچ گیا تھا جہیم خانے۔ اب جہیم خانے میں موجود بھوکے بچے بچوں کے اس دعوت شیراز سے فائدہ اٹھانے سے چودھری افتخار کو گواہی ملتا تھا۔ وہ بے چارے اپنے اس کھانے کو کھانے کے بعد زہرہ سے زیادہ چودھری افتخار کو دھمکیاں ہی دے سکتے تھے اور ان کی دعاؤں کی انتہا بھی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ بعد از مرگ چودھری افتخار کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ تو بھلا چودھری کو جنت کی کیا آرزو ہوگی وہ تو دنیا میں بھی جنت میں لایا رہا تھا۔

"جانے دیر چودھری صاحب آپ نے جو انارکس سمجھا وہ ادا کیا۔ اب مولوی والا رہے کہ وہ حقان کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں تو انی آئے صوبہ سے لے کر حقان کا تجویز کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ آخر ان کا انکھ پنا عراسے۔ وہ اپنے اس گم کی وجہ سے تقریباً جل ہو رہا ہے۔ تم میں اسے بچائی نہیں دے رہا کہ اس کو اس حادثے کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے۔ مجھ سے اور ہوں جان سے بھی کافی شکوے شکایات کر رہا تھا۔ اب دوا بے چارہ جس کیفیت میں تھا۔ ہم اس سے یہ توقعیں کھہر سکتے تھے کہ جتنا آپ کا بیٹا خود اپنی موت کا ذمہ دار ہے۔ انکھ نے اس کی موت نہ ماری ہوئی تو نوران اسے حادثے کا شکار ہی کیوں ہوتا۔ نہ ہی ہم اس سے کہہ سکتے تھے کہ آپ نے انکھ سے کوئی پناہاں کی مسما نہیں فراہم کر کے اسے عیاشی کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا۔ ٹھیک ہے انکھ بیٹا تھا۔ یہی کام میں نہیں چلا کر انکھ اولاد کے لیے کیا کچھ کر ڈا۔ اگر اولاد پہ چک تو رکھنا چاہیے۔ وہ جس ات میں جلا تھا اس کا انجام تو کسی کی حدی حادثے کی شکل میں ہی سامنے آتا تھا۔ وہ یہاں چوٹی میں آگ لگنے سے نہیں مرنے تو شہر میں ہی زیادہ دہشت والی سڑک پر کھینچتے تھے مرنے جاتا۔ مگر ذہن سے، میں اور ماموں جان مولوی والا سے اس کے دکھ پر تعجب کرنے کے تھے، ہم اس سے یہ سب نہیں کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ صرف افسوس کر کے

مستقل آمدورفت تھی۔ موتی والا اگر چہ دھری افتخار کے خلاف زبان کھولے گا تو اس کے اور اس کے بیٹے کے بھی سارے کپے ختم کر دیے جائیں گے۔ ابھی قوسب نے اس لیے خاموشی اختیار کر رکھی ہے کہ بے چارہ موتی والا صدقے کا شکار ہے، ابھی اسے چھوڑ دو۔" ایس بی کے خلاف ہنگامے صاف ظاہر تھا کہ وہ چوہدری افتخار کے حق میں ہے۔

"آپ کی بات میں وزن ہے۔ ویسے مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے اس کیس پر بڑی تیزی اور جانک دیکھی ہے کام کیا اور نہ لوگ پولیس کے گھنے سے پیشہ کی شکایت کرتے ہیں کہ یہاں کام بالو موٹا نہیں یا بہت سست دیتی ہے اوتا ہے۔" شہر یار نے تعریف کی آڑ میں ایس بی کی کھجالی کی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے سرائیہ اسلاف بہت تختی اور دیانت دار ہے اور آپ پر مت بھگے گا کہ کر کر دیکھو گا یہ مظاہرہ دو بڑی شخصیات کے انوا ہوئے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اس وقت میری آمد کا مقصد آپ کو ایک دوسرے کیس کے سلسلے میں بریف کرنا تھا۔ ابھی کچھ دن قبل آپ نے اپنی عمرانی میں دین محمد نام کے ایک شخص کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ اس شخص نے الزام لگایا تھا کہ وہ آپ کے پاس آنے سے پہلے تھانے گیا تھا لیکن تھانے دار نے رشوت طلب کی اور نہ دینے پر رپورٹ لکھنے سے انکار کر دیا۔ بے چارے تھانے دار نے اس وقت بھی آپ کے سامنے اپنی مہمانی پیش کی تھی لیکن اسے شدت ہے کہ آپ نے اس کی پیش کی تھی معافی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ بہر حال وہ آپ کے حکم کے مطابق اس نے سوائے کی تحقیق کر کے رپورٹ بجھا دتی ہے۔ آپ اپنی طور پر اس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اس لیے میں نے متاعب بھرا کہ یہ رپورٹ خروا آپ تک نہ پہنچے۔" ایس بی نے ایک بند لفاظی شہر یار کے سامنے رکھا۔ شہر یار لقاؤں کھول کر اس میں موجود رپورٹ پڑھنے لگا۔

اسی رپورٹ کے مندرجات کے مطابق درخواست گزار اور دین محمد کا بیان قطعی سمجھتا ہوا تھا۔ اس رات اس کے گھر پر کوئی ڈاکہ نہیں بڑا تھا اور نہ ہی اس کی بیٹی انوار کی کئی تھی۔ دین محمد نے بیٹی کے اغوا ہونے کی صرف کہانی بتائی تھی تا کہ کچھ توں واکوں کے سامنے بیٹی کے شادی سے پہلے اچانک غائب ہو جانے کا بیان بنا سکے۔ حقیقت میں اس کی بیٹی اپنے ماں باپ کے ملے کر بڑے رشتے سے خوش نہیں تھی اور اس جگہ شادی نہیں کرتا چاہتی تھی۔ لڑکی کے کسی دوسرے گاہک کے لڑکے سے مراسم تھے۔ لڑکا چونکہ دین محمد کی ذات پر ادنیٰ کا

نہیں تھا اس لیے دین محمد اس لڑکے سے بیٹی کا رشتہ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ لڑکی کے رنگ و جھک دیکھ کر اس نے بڑی بیٹی اپنے بچاؤ اور بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر دیا لیکن شادی ہونے سے پہلے ہی لڑکی اسے مل دے گئی۔ اس نے اپنے آشنا لڑکے کو گھر میں جایا بڑکے کے ساتھ اس کے دوست بھی تھے۔ ان لوگوں نے مل کر لڑکی کے بھائیوں کو ایک کمرے میں بند کیا اور دین محمد اور اس کی بیٹی کے ساتھ ججز کے سامان اور دو پولیس سمیت لڑکی کو لے کر گھرا رہ گئے۔ بعد میں دین محمد اور اس کی بیٹی نے واہی لیا بھائی کا کہ ان کے گھر لڑکی گھر آئے تھے اور لڑکی سمیت سب بچھوٹ کر گئے تھے۔ اس بیان میں بالکل بھی جالی نہیں ہے۔ خود درخواست گزار دین محمد کا کردار ماضی میں کافی مشکوک رہا ہے۔ دین محمد کی موجودہ بیوی اس کی دوسری بیوی ہے جو چھ سال پہلے اس کی دوسری بیوی کی موت ہوئی ہے۔ جس کا پچیس سال پہلے اس کی دوسری بیوی کی موت ہوئی ہے۔ وقت اس کی سہالی تھی، اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد لڑکی رہ جانے کے باعث اپنی بی بی بہن کے گھر رہنے آ گئی تھی۔ دین محمد اور اس کی بہن کی شادی کو کئی سال گزر جانے کے باوجود ان کے گھر والا نہیں تھی۔ دین محمد جو اولاد کے ہونے کی وجہ سے بیوی سے اچھا خاصا بے زار ہو چکا تھا، جوانی العمر سالی کو دیکھ کر جھلس گیا۔ اس نے جانے اپنی بیوی کو کیا کھلایا یا پائی کہ ابھی خاصی مٹی کی محنت مند عورت چند گھنٹوں میں ہی چٹ پٹ ہو گئی۔ دین محمد نے اپنی اور اپنی سالی کی تنہائی کا بہانہ کر کے فوراً اس سے تلاح کر لیا۔ اب وہ اپنے سے کئی برس چھوٹی بیوی کے ساتھ مزے سے رہتا ہے۔ اس کے بچے بھی ہیں لیکن ظاہر ہے، بچوں میں باپ کی خصلت تو آتی ہی تھی۔ چنانچہ بیٹی نے باپ کے کتے قدم پر چلتے ہوئے مقصد برآ رہی کے لیے دھوکا دی ہے کام لیا اور سب کچھ سہلے کر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب دین محمد خائف پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹی کہانی بنا رہا ہے۔

رپورٹ میں نو دی پولیس بات کرنے کے بجائے اپنی خیالات اور پڑے بچے پیش کیے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ شہر یار نے رپورٹ پڑھنے کے بعد اسے واپس اٹھانے میں رکھا اور ایس بی کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو بہت ہی خیرت انگیز اکتشافات ہیں۔ میں خود دین محمد کے ساتھ اس کے گاہکوں کیس کا تھانے کے دیگر لوگوں نے بھی تصدیق کی تھی کہ دین محمد کے گھر ڈاکہ بڑے لیکن اب یہ رپورٹ تو ان ساری باتوں کی قطعاً نفی کر رہی ہے۔"

کسی بدلتی ہوئی کیفیت چاہیے تو دوبارہ بھی یہ دہرایا جائے گا۔
چودھری انھار نے بڑی چودھری ان کو گھبرا دیا۔
"میرا نام مجھے چودھری صاحب آج تک نہیں آتا تو میں نے کیا کیا
میں ابھی انکی بات کہہ چکی تھی۔" بڑی چودھری انھار نے چودھری
انھار کا رخ خوب ہونے دیکھ کر فراموش کر دی۔
"اب کھوپڑی کے اندر لکھا نہیں ہے تو کیا میں
ماتے میں داخل ہوئی ہوں۔ منہ بند کر کے بول نہیں سہاؤں تاہم
تو۔" ویسے بھی عورت ذات کو کیا ضرورت ہے مردوں کے
ان معاملات میں جو غلطی کا ختم نہیں ہوتے کہ اندر کے
معلومات کو لکھا کر وہ غلط سے بے معاملات کی شکل چاہیں
بہت ہے۔ بڑی چودھری صاحب نے اسے کہہ کر اسے جو جودوں۔
بڑی چودھری انھار نے معذرت کے باوجود چودھری انھار نے اس
کی تحقیر خاک مٹائی کر دی۔
"جھٹکی ہوئی چودھری صاحب آندھو وہاں رکھوں
کی۔" بڑی چودھری انھار نے ایک بار چور مغلطی الفاظ ادا کیے۔
"خجیب ہے۔" آندھو نے ہان کو تھپوٹا دیا۔
"اب وہاں ہے۔"
چودھری انھار نے پورے غصے سے بڑی چودھری انھار
کو معذرت قبول کرتے ہوئے اس کو شکم دیا۔ بڑی چودھری انھار
اس غصے کو برداشت کرتے ہوئے گھبراہٹ میں وہاں سے
نکل گئیں۔
"اب کیا ہے؟" چودھری انھار نے اس کے وہاں
دکھ کر پہلے پریشان ہوئے پھر پوچھا۔
"آج بات اور کرنی تھی چودھری صاحب۔" بڑی
چودھری انھار نے بتائی۔
"کیا بات کرنی تھی؟" چودھری انھار نے پوچھا۔
"میرا پتہ ہے مجھے کہ تمہارا کس آپ سے شکرت ہے
اور جو نے کیا اعزاز ملے ہوں۔ یہ چارہ چارہ ہونے کے لیے
تو میرا اور تو کوئی دوسرا نہیں۔" بڑی چودھری انھار نے
ہاتھ کے لیے اور چل جائے گی تو اس کا دل بکھ جائے گا۔
"میرا پتہ ہے مجھے کہ تمہارا کس آپ سے شکرت ہے
اور جو نے کیا اعزاز ملے ہوں۔ یہ چارہ چارہ ہونے کے لیے
تو میرا اور تو کوئی دوسرا نہیں۔" بڑی چودھری انھار نے
ہاتھ کے لیے اور چل جائے گی تو اس کا دل بکھ جائے گا۔
"میرا پتہ ہے مجھے کہ تمہارا کس آپ سے شکرت ہے
اور جو نے کیا اعزاز ملے ہوں۔ یہ چارہ چارہ ہونے کے لیے
تو میرا اور تو کوئی دوسرا نہیں۔" بڑی چودھری انھار نے
ہاتھ کے لیے اور چل جائے گی تو اس کا دل بکھ جائے گا۔

[illegible][illegible][illegible]

اپنے فتنے میں جکڑے رکھنے کا بندوبست کر کے جاتا۔ اس کی اس عقلیت کا فائدہ اٹھا کر مادہ پور تو فرار ہوئے میں کامیاب ہو گئی۔ بعد میں بھی دو دو تین دن تو شہر میں ہی مصروف رہا اور اس مصروفیت میں اسے ماہ بانو کا حیدر نہیں آئے۔ ذرا فرصت کی تو ماہ بانو کا دل سے چاہی گئی۔ پھر دھری انکھ و تھکتا رہ گیا لیکن اسے معلوم تھا کہ ماہ بانو کا حصول اتنے مشکل نہیں۔ وہ چاہتا تو اسے فیصل آباد سے بھی اٹھا سکتا تھا مگر ابھی دوسرے معاملات زیادہ توجہ طلب تھے اس لیے اس نے وقتی طور پر ماہ بانو کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ اس وقت تو اس اور غیاث محمد کو اپنے سامنے پا کر اسے ماہ بانو کا ایک بار پھر یاد آگئی اور وہ ان کا ذکر بھڑبھڑاتا۔

”تیسری کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کو اس کے خالہ خالو نے پالا ہے، وہ ہی اس کے جیاد کی فکر کریں گے۔ میرے ذمے تو بس ان دو بلیوں کا ہی بوجھ تھا۔ ایک کو آپ کی مہربانی سے پکے جی نمانا چکا اور دوسری بھی آپ کے قیامِ کرم سے اپنے گھر باقی ہو جائے گی۔ اس کے بعد تو بس چنا ہے، وہ اپنے شرور باز دھرم آپ کی خدمت کر کے اپنے لیے خود بندوبست کر لے گا۔“ غیاث محمد نے غارتی سے جواب دیا۔

”تیسری سالی اور اس کا شہر پور تو شہر میں رہے ہیں۔ کیا ایسا نہ ہو کہ وہ تیری کڑی کو کسی شہری لڑکے سے بیاہ دیں۔“ پھر دھری انکھ نے کشمکش کا اظہار کیا۔

”ہم نے اپنی دلی تمیز سے وہی پھر دھری صاحب! اب چاہے وہ ان کے لیے جو بھی فیصلہ کریں۔“ تو اس نے پھر دھری انکھ کی بات کا اہم سا جواب دیا۔

”اچھے کیسے کوئی بھی فیصلہ کر لیں گے وہ لوگ؟ اس گاؤں کی کڑی وائیں نہیں آتی چاہے۔“ پھر دھری انکھ نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

”اگر یہ آپ کا حکم ہے تو کچھ تو سمجھ لیں ماہ بانو! آپس میں آتے گی۔ ہم آپ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں بولنے دیں گے۔“ پھر دھری انکھ کا موڈ کچھ کرغیاث محمد نے فوراً غصہ اٹھانے دیا۔

”اگر یہ ایسا نہ ہو کہ پھر دھری ایک بار جبریت سے اٹھ جائے۔“

شیطان پک پک کر دھڑک رہا تھا۔ اسے ایک دم ہی ماہ بانو کا عرس والی رات آخر حالت میں آخری پہر گھر لوٹنا یاد آیا۔ بہت دنوں سے جو سوال اس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا اس کو جواب اس نے پھر دھری انکھ کی آنکھوں میں پالیا۔ اس جواب کو پا کر وہ کھپ اٹھی۔ پھر دھری کا انداز ڈٹ رہا تھا کہ وہ ایک بار ہاتھ سے نکل جائے والے شکار کو روکا رہا اپنے جہاں میں وہ پھنسے کے لیے بے تاب ہے۔

”آپ مجھے پناہ دیتے ہیں۔“ غیاث کی نگاہ سے اس نے کہا تھا کہ میری کتابیں خیال سے گاڑی میں رکھوا دینا لیکن اس کام خود نے کتابیں رکھی ہی نہیں۔ کتابوں کے بغیر تو میرا گزارہ ہونا مشکل ہے۔ ویسے ہی یہاں اتنی بڑا ہٹ ہے۔“ رستوں ہاتھ میں لیے، رستہ پر دروازہ کی دی کے جھنڈ پر ٹھکن بدلتی صورت کے قریب پہنچتے ہوئے کشور نے اسے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”چھوڑو کتابوں کو۔ ہر وقت فصول کتابچا چاٹنے میں وقت برباد کرتی رہتی ہو۔“ غیاث نے دیکھو اٹھ کر اسے اس کے راکر نام آتے ہیں کی وی بی پر ادھر گاؤں میں تو اس سوتے ہوئے بی بی دی کے علاوہ کچھ دیکھنے کو ہی نہیں ملتا۔ سہارا دیکھتے دیکھتے دھری سارے جھنڈ آتے ہیں۔ ہمیں کوئی فلم دیکھنی ہو تو وی بی آ کر پرسیٹ لگا کر دیکھنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک وقت میں کچھ بوجھ ہے فلمیں آج ہی ہوتی ہیں۔ ذرا سے جی اٹھتے جڑے جڑے کے ہیں۔ میں تو ان ڈراموں کی کورتوں کے کپڑے اور زیورات اچھی طرح ذہن میں بٹھا رہی ہوں۔ ذرا کاغذ ہو جاؤں تو بعد میں یہاں آکر اپنی چند کی مادی چیزیں خریدوں گی۔ تم بھی ذرا میرے ساتھ بیٹھ کر کچھ دن کے ذرا بزنس وغیرہ اچھی طرح دیکھ لو تاکہ اگر میں کچھ بھول جی جاؤں تو تم ہی یاد دلادو۔“ کشور کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے صورت نے اس سے کہا۔

”آپ کو معلوم ہے آپا کہ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ مجھے کپڑوں اور زیور کا شوق ہے اور ہی مجھے یہ ذرا سے اور فلمیں کچھ خاص اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے مجھے تو آپ معاف ہی رہیں۔“ صورت کے مشورے پر کشور نے بے زاری کا اظہار کیا۔

”تمہارے نزدیک تو تمہاری کتابوں کے سوا دنیا میں سب کچھ بے کار ہے۔ ابھی کی شہری دبی مرے مرے نہیں اچھا مرض لگا کر لگتی ہے۔“ صورت اس کی بے زاری پر چڑی۔

”مرض نہیں لگایا انہوں نے مجھے۔ وہ تو مجھے پاگل

ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا انتظام کر کے گئی ہیں۔ میں تو اللہ سے
 بہت دعا مانگ کر گئی ہوں ان کی بخشش کے لیے۔ اگر آج
 میرے پاس ان کتابوں کا سہارا نہ ہوتا تو میں کیا کرتی؟
 ”چھاپا چل دیا وہ اداں نہ ہو۔ ڈرائیو کو گھج کر بازار
 سے جی تکیا میں منگوائے۔“ کشمور کی بات سن کر منور کو فورا
 یہی کی گئی کا خیال آیا اور وہ نرم ہو گئی۔
 ”ڈرائیو کو گھج بھیجنا۔ میں خود جا کر اپنی پسند سے
 کتابیں خرید لوں گی۔“ کشمور نے منور کی
 ”نہ تو گھج اپنی کو خریدانے آئے۔ یہ بیلے انہوں نے
 ختم کیا کی گئی سبیل کر پنے کی۔“ منور چھاپا چلی۔
 ”ابا ہی پسند کے پڑے سے لینے کے لیے بھی تو ہم
 لوگوں کو بازار جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ تو پھر میں
 اپنی پسند کی کتابیں خریدنے کے لیے انہیں جاسکتی ۱۲ اس سے پہلے
 بھی تو میں جب بھی آپ لوگوں کے ساتھ بازار گئی ہوں،
 ہر شے تکیا میں خرید کر لاتی ہوں۔ ابا ہی نے بھی کوئی اعتراض تو
 نہیں کیا اور اپنے بھی مجھے کون سا دوا دیا جاتا ہے۔ یہاں سے
 لائی مادہ کثرت دہری بھی ہے۔“ کشمور نے فوراً ہی دیکھ لی تو
 منور کو کھنگوٹا ہوا پڑا۔
 ”چھاپا چلی جا۔ ساتھ میں دانی کو بھی لے لینا۔ اور
 یاں جلدی آئے۔“
 ”ٹھیک ہے ابا آپ لکھیں نہ رہیں۔“ منور خوش خوش
 بازار گئی۔ منور کی دو ہندو دانی کے ساتھ ایک بڑی سی
 کتابوں کی دوکان پر گئی۔ شہادت میں ہی کتابوں کو گھج کر کے
 وہ دانی کو گھجائی رہی۔ اچھا خاصہ دھرم جمع ہونے کے بعد اس
 نے کاغذ پر کتابوں کی قیمت اور ان کی اور باہر لکھ لی۔
 ”جی لی! اس میں سے جو کتابیں آسان الفاظ میں لکھی
 ہوں، آپ وہ مجھے پڑھنے کے لیے ضرور دینیے گا۔ مجھے بڑا
 شوق ہے کتابیں پڑھنے کا۔“ کتابوں کا دھرم اٹھ کر اس کے
 پیچھے آئے۔ والی دانی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فرما لیں
 گی۔
 ”تمہارا بھول چاہے، وہ کتاب پڑھ لینا۔ آخر میں بھی
 تو پڑھیں ہوں۔ میں نے کون سا کتابی پڑھ کر کسی سے پڑھا ہوا
 ہے۔ بس مشکل پڑھتے پڑھتے خود ہی بہت کچھ آئے گا
 ہے۔“ کشمور فراموشی سے دانی نے بھی ڈرائیو کے ساتھ والی
 گاڑی میں بیٹھ لی۔ دانی نے بھی ڈرائیو کے ساتھ والی
 نشست سنبھال لی۔ ڈرائیو اس دوران گاڑی کی اساتذہ کو چکا
 تھا لیکن اس سے پہلے کہ گاڑی آگے بڑھتا، کشمور کی نظر
 ایک ٹھاسا چر سے پڑ گئی۔ منور کی بیٹن اور دھکا بکا کرتے پیتے

اپنے مخصوص طبقے میں وہ پتہ پتہ ماسٹر آف آف سی تھا۔
 ”نہ تو میرے سامنے ماسٹر آف آف سی گھڑا ہے؟“ بھونچا
 لینے کے باوجود کشمور نے ڈرائیو سے تصدیق کر لی۔
 ”تمہاری کیا؟“ تو اپنے گاڑی والا ماسٹر آف آف سی ہے۔
 شاید یہاں کس کا سامنے آتا ہو۔“
 ”جادو، اسے یہاں بلا کر لے آؤ۔ کہنا یہاں جاتا ہے
 وہاں پھونڈو دے۔“ کشمور نے ڈرائیو کو حکم دیا۔
 ”لیکن جی لی۔ آپ کے ساتھ۔“ ڈرائیو کشمور کا حکم سن
 کر تڑپا گیا۔
 ”جو کہا ہے اس پر تم گنا کرو۔ اور ہاں، ماسٹر صاحب کو
 بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گاڑی میں حویلی کا کوئی فرا
 موجود ہے۔“ کشمور، ڈرائیو کی جھجک کا سبب سمجھ چکی تھی
 چنانچہ ڈرائیو سے اسے حکم دیا۔ ساتھ ہی دوسری بیٹن بھی
 دے دی وہ نہ اسے حشر تھا کہ ماسٹر آف آف لٹ کی اس
 پیشکش کو قبول نہیں کرے گا۔
 ”تم پیچھے آ جاؤ دانی! اپنی نشست پر بیٹن رانی کو کھد
 رہے کہ کشمور، ڈرائیو کو ماسٹر آف آف سے بات کرتے ہوئے
 دیکھتی تھی۔ ماسٹر آف آف کے ڈرائیو میں اس کے بعد
 ڈرائیو کی پیشکش قبول کر لی تھی اور اب اس کے ساتھ گاڑی
 کی طرف آ رہا تھا۔ گاڑی کے نزدیک آ کر اس نے مجھے مل
 اگلی نشست پر بیٹھنے کے لیے دو دروازہ کھولا، یعنی نشست پر
 موجود کشمور اور دانی پر اس کی نظر پڑی۔ وہ ایک ام ٹھیک گیا۔
 ”عاف کیجئے گا۔“ مجھے معلوم نہیں تھا کہ گاڑی میں
 خراجی ہو جو وہیں درخت میں سے فریج لٹک رہی تھی۔ کشمور بھائی
 بھی کہہ رہا ہے۔ گاڑی کے سیاہ پیشوں کی وجہ سے وہ
 دوسرے ان لوگوں کی گاڑی میں موجودی کا اندازہ نہیں کر سکتا
 تھا اور ڈرائیو کو خود کشمور نے اپنی موجودگی ظاہر کرنے سے متنب
 کر دی تھا۔
 ”یہ جانے ماسٹر صاحب! آپ کو جاری ہو رہی
 کا طرح کی حالت میں لے خود ڈرائیو کو گھج کر آپ کو لٹ
 دینے کی فکر کی تھی۔ یہ سبہ چار اپنی مرضی سے تو آپ کو آخر
 نہیں کر سکتا تھا۔“
 ”آپ کی پیشکش کے لیے شکریہ۔“ لیکن کچھ دن سب
 نہیں لگتا آپ لوگوں کو نہ کہتے کہ ان چاہتے ہیں میری وجہ سے
 آپ کو بہت ہو گی۔“ ماسٹر آف آف سے شاکھی سے اجازت لیا۔
 ”آخرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اب ہمارے
 بھائی سے استاذ ہیں۔ آپ ٹاٹک مقام سے ان کی تعویذ
 بہت دقت ہوئی تھی تو میں ہمارا دھرم گزرا رہی۔“ کشمور کو

ماسٹر آف آف سے منکر کرنا اچھا لگتا رہا تھا اس لیے وہ مسلسل
 اصرار کر رہی تھی۔
 ”آخرت افزائی کے لیے شکر ہے۔ لیکن پلینز آپ لوگ
 جاسمیں، میں کی کشتہ وغیرہ سے چھا جاؤں گا۔“ ماسٹر آف آف
 نے اس بار بھی اظہار کیا۔
 ”بھئی ماسٹر صاحب! ہمارے ہاں پیشکش کر کے
 پیچھے ہٹنے کا رواج نہیں آپ کے اظہار کرتے رہنے سے ہمیں
 یہاں زیادہ پر ہوا ہے کی جن سیر مال، آپ کو یہاں پھونڈ
 کر جانے کا طعنہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اب آپ کی
 مرضی سے کہ آپ ہمیں لٹ کرواتے ہیں یا ہماری پیشکش قبول
 کرنے کا شرف بخشتے ہیں۔“ کشمور کے اہل انداز پر ماسٹر
 آف آف نے جیسا پار نظر اٹھا کر براہ راست اس کی طرف
 دیکھا۔ چادر نے اس کے چہرے کے پیش چہرے کو حجاب رکھا
 تھا لیکن وہ سیاہ آنکھیں باطل قنوں میں۔ ان آنکھوں میں
 اصرار اور ضد نہ تھی تھی۔ ماسٹر آف آف کو اندازہ ہوا کہ حویلی
 والوں میں شمار ہونے والی یہ لڑکی اپنے اپنے خاندانی حراج کے
 مطابق اچھی خاصیت جت دھرم ہے جو پھر اپنی بات منوائے
 پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس ضد سے بارہا منستے ہوئے بالآخر وہ
 گاڑی میں بیٹھ گیا۔
 ”مجھے اس کے اڑے پر چھوڑ دو۔ مجھے وہیں جتا آنا
 جانا ہے۔“ نشست سنبھالنے کے بعد ماسٹر آف آف نے
 ڈرائیو کو بتایا اور اس طرح سب ماحول کر بیٹھا کہ کروان کو
 ڈرائیو جنسی بھی نہ دی کہ سہارا کوئی خیال کرے کہ وہ پہلی
 نشست پر بیٹھی حویلی کی ایک خاتون کی طرف دیکھنے کی
 جرأت کر رہا ہے۔ خود کشمور بھی پورے راستے اسے دو دروازہ
 مخاطب نہیں کیا۔ اس کی یہ خاموشی ماسٹر آف آف کے لیے
 باعث سکون تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کشمور کے اندر جو
 طوفان کر رہی ہے وہاں ہے، وہ زیادہ غصے اس کے اس
 سکون کو تو برا دیکھ رہے ہوں گے۔

 ”سرا پڑھ رہی انکار لائن پر ہیں۔ وہ آپ سے بات
 کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے، بات کرو اور“ شہر یار نے عبد اللہ انان کی
 دلی ہوئی اظہار کے جواب میں کہا۔
 ”کیا حال ہے شہر یار صاحب۔ آپ کو تو فرصت ہی
 نہیں ملتی، ہم نے سوچا ہم آپ کی کچھ خبر لے لیں۔“ لے
 پھر بعد ہی پڑھ رہی انکار لائن کی آواز شہر یار کو گونجی رہی۔
 ”آپ کی مہربانی سے پڑھ رہی صاحب کہ آپ میرا انا

خیال کرتے ہیں۔ آپ کو غلط بھی پڑھیں گے جس میں
 کیا کرواں انکی معاملات میں انا لکھا ہوا ہوں کہ فرصت ہی
 نہیں ملتی جیسے ہی فرصت ملی، ضرور آپ کی خدمت میں حاضر
 ہوں گا۔“ شہر یار نے اپنی بے کردہ حکمت علی کے مطابق
 پڑھ رہی انکار کے شکوے کا بہت خوش اخلاقی سے جواب دیا۔
 ”فرصت ملنے کا انتظار پھوڑا لے اسی صاحب! اسے
 سی کی کرسی پر بیٹھنے والے کو کبھی بھی فرصت نہیں ملتی۔ اپنے
 بتوال کو اپنی غصہ و فتن میں سے نہ روکنی وقت نکالنا پڑتا ہے۔
 اور اس وقت میں نے آپ کو خدمت دی ہی اس لیے کہ
 آپ کے بے حد مصروف وقت میں سے کچھ وقت بائیں
 مگلوں۔“
 ”وہ کس سلسلے میں؟“ پڑھ رہی انکار کی بات سن کر
 شہر یار کا جیس جاگا۔
 ”ظہار ہے چاہنے کا پروگرام ہے۔ اس میں بی معظم ہارڈوار
 فار ایسٹ آف امریکا! باجہ کے علاوہ ایک آدھ اور دو سب بھی
 ہوگا۔ آپ ہمیں ہمارے ساتھ ظہار بہت لطف آئے گا۔“
 ”پروگرام واقعی دلچسپ ہے مگر ہاں چاک بٹالیا آپ
 نے۔ آپ پچھلے دنوں مجھے نہیں دے ہیں، اس کے بعد کسی
 کی اسٹیوٹی کو اسٹیک ہولڈ نہیں کر رہا تھا۔“ پڑھ رہی انکار کا
 پروگرام سن کر شہر یار نے ہنسنے لیا۔
 ”ہم ان پچھلی چھوٹی باتوں پر گھبراتے والے نہیں۔
 ایسے سسائی تو آتے ہی رہتے ہیں۔ ان سے گھبرا کر زندگی
 کے لطف کو توڑنا ہی کوئی جا سکتا ہے۔ اور جی کہوں، زندگی کا
 جو لطف ظہار میں ہے وہ اور کسی میں نہیں۔“ پڑھ رہی
 انکار ہاں لکھ لکھ کہہ رہا تھا کہنے کو ایک دو مایا چادر میں
 اور کاہر ہادی فرم تھا لیکن اس کے برابر کے پیچھے ایک
 شکاری جیسا بیٹھا جو صرف جنگی جانوروں کا شکار نہیں کرتا تھا
 بلکہ اس کے شکار کی فرصت میں انسانی جان مال و دولت اور
 لوگوں کی عزت سمیت سب کچھ شکار تھا۔ اپنے ہر شکار کے
 لیے وہ ہجر پر منصوبہ بندی کرتا تھا اور اسے بھی اپنے مقصد
 میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔
 ”پچیس، میں لاشیں کروں گا کہ زندگی کے اس سب
 سے بڑے لطف میں آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہو سکیں۔
 آپ دن اور وقت کو فریہ دیتا تو میں اپنا شیلڈوں چیک کر
 کے آپ کو کوئی بھی جواب دے سکوں۔“
 ”دن ہم نے ملنے کا ملے کیا ہے۔ بقیہ کی تمام کو لکھیں
 کے۔ رات بھلی میں ہی قیام ہوگا پھر آگے روزہ اور کو شام
 تک وہاں۔ لیکن آپ یہ مشروط قسم کی ہالی نہ لھریں۔ اگر

آپ کو اس روزانے میں مشغل چینی آتے تو ہم اپنے پرگرام میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔ اصل میں تو یہ پروگرام آپ کے لیے ہی ترتیب دیا گیا ہے، باقی افراد کو بھی بار پہلے بھی میرے ساتھ قرار دیا جائے گا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کی اس قدر خیال داری کے بعد تو انکار کی محاش ہی نہیں ملتی۔"

چودھری انقار کی بات سن کر شہر پارے نور اپنی رخصت مناسبتی کا عندیہ دے دیا۔

"بس تو پھر آپ اپنے کسی دوپڑ کو بھی جو آباد ہونے جانے گا۔ دوپڑ کا لکھا تاہی میں ساتھ لکھا میں گے اور پھر شام تک نکل پڑیں گے۔ آپ کو صرف وہاں پہنچنا ہے، باقی کے انتظامات ہماری طرف سے ہوں گے۔" شہر پارے کے ہاں کرتے ہی چودھری انقار کو مزاح اور بھی گوارا ہو گیا۔

"آپ غور نہ کریں میں باطل کی وقت پر پہنچ جاؤں گا۔" شہر پارے اسے تسلی دی۔

"بس تو پھر ہمیں انتظار رہے گا۔" چودھری انقار اب جھنجھکے سینے کے لیے پر قول رہا تھا۔ شہر پارے ذرا سا گناہ شکستہ اور آواز میں گری سمجھتی پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی چودھری صاحب! پہلے ارادہ تھا کہ یہ تمہیں آکر اس موضوع پر بات کروں گا لیکن اب جبکہ ہماری ایک بہت خوش گواری ملاقات ملے ہو گئی ہے تو پھر ہمیں لگا کر میں اس موقع پر کوئی بہت سنجیدہ نوعیت کا مسئلہ بھیجوں۔ اس لیے بھرتے کہ میں اس وقت فون پر ہی آپ سے بات کروں۔"

"بہت شوق سے اسے ہی صاحب! دیے مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیا معاملہ ہے جس پر آپ اسے سنجیدہ محسوس ہو رہے ہیں؟" چودھری انقار پوچھا۔

"یہ ظاہر بھی معاملہ اس سنجیدہ نہیں لگتا ہے کہ آتے والے وقت میں یہ معاملہ کافی گہیر ہو سکتا ہے۔ اصل میں کل کے اخبار میں ایک کالم چھپا ہے، کالم نگار نے براہ راست تو کسی گاؤں یا اس کے کسی خاصہ شخص کا نام نہیں لکھا لیکن اس نے وہیں علاقوں کی اعتبار حالت پر کافی تنقید کی ہے۔ اور اس تنقید کی خبر سے میں اس نے کئی ایسے جملے لکھے ہیں جو براہ راست تیرا پارے سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ کئی دینی آبادیوں میں بنیادی سہولیات کا فقدان ہے اور اگر کوئی حکومت موجود ہے تو بھی اس کے اثرات صرف بڑے لوگوں تک محدود ہیں۔ بڑے ڈیڑیوں اور زمینداروں نے حزاروں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ طرح طرح کے

جھگڑے اسے ان خرب حزاروں کا احتمال کر رہے ہیں۔ ایک طرف باقاعدہ جمنائی تنہا کیا جاتا ہے تو دوسری طرف حزاروں کو ان کی کم اجرت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے میں ناکام رہے ہیں۔ شادی بیاہ باری آزادی کے موقع پر خرب حزاروں اپنی ضروریات پوری کرتے کے لیے ڈیڑیوں اور زمینداروں سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان خرب افراد ان پڑھ لوگوں کو یہ قرض اپنی زیادہ مددی شرح پر دیا جاتا ہے کہ وہ ساری زندگی کے لیے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔"

"جانے دیں اسے ہی صاحب! یہ کون سی نئی باتیں ہیں۔ ایسا تو اکثر ہی لکھا جاتا رہتا ہے۔ میں اس کے متجہ بہت ہونے پر تبصرہ نہیں کرنا۔ اگر یہی ہے تو اس سے مجھ کیلئے کوئی ذات پر ضرب نہیں پڑتی۔ میرے ساتھ سارے ہی اس احترام کی ذرا پر آتے ہیں۔" چودھری انقار نے درمیان میں شہر پارے کی بات کاٹ کر کہن پر سے بھی اڑانے والے انداز میں تبصرہ کیا۔

"تو مجھے بھی معلوم ہے چودھری صاحب لیکن میں نے کہا کہ کالم نگار نے اپنا کالم یوں تو وہیں علاقوں کی مجموعی صورت حال کے بارے میں لکھا ہے لیکن کچھ پوچش ایسے آتے ہیں جن سے واضح طور پر پتہ چلا دے کہ ان کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔"

"اچھا، وہ کون سے پوائنٹ ہیں؟ کچھ ہم بھی سنیں۔"

چودھری انقار کے انداز میں اب بھی بے نیاز تھی۔

"کالم نگار نے لکھا ہے کہ کچھ ڈیڑے تو ایسے بھی ہیں جو اپنے علاقے کے خیرات کے علاوہ وہیں پشوا بھی بن بیٹھے ہیں۔ ان ڈیڑیوں نے بھری مریلی کی آڑ میں سادہ لوح عوام کے ڈیڑوں کو ہانف کر رکھا ہے۔ وہ ڈیڑے ہیں کہ ان ڈیڑیوں کی مرضی کے خلاف کچھ کریں گے تو ان پر کوئی آسانی سمیت آپڑے گی۔ یہ ڈیڑے اس جہلانہ سوچ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے علاقے میں قیوم کو عام نہیں ہونے دیتے کیونکہ جانتے ہیں کہ اگر حزار اس پڑھ کر کچھ وارہ دے دیا تو ان کی غلامی کے جھنجھے سے نکل جائے گا۔ انہوں نے طرح طرح کے جھگڑے دیں سے اپنے ملاوٹوں میں تعلیم کا راستہ روک رکھا ہے۔ پھر سب سے اہم اور کاری ضرب جو کالم نگار نے لگائی ہے۔ وہ آپ کے دادا صاحب کے عرس کے حوالے سے ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ تمام تہاؤں تہاؤں میں اور گدی جی حزاروں کے خون پیسے کی کمانی پڑپ کر کے اس سے اپنے بڑوں کا شان دار عرس منفقہ کرتے ہیں۔ ایک علاقے کے

باداے میں تو یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ وہاں چھوٹے زمینداروں سے زمین کی ہر سال عرس کے مٹنے پر سونے کے تاروں سے لٹس چادر وصول کی جاتی ہے۔ اس پادار کو غور و جہد کی قبر پر چڑھا جاتا ہے اور بعد میں زندہ ہی اس کے سونے کو بیچ کر دام کر کے کر لیتا ہے۔ کالم نگار نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک بار چھوٹے زمینداروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ یہ زمین کی بیعت نہیں پر حاکمیں گے۔ بیعت لینے والے کو بیٹے سے ان کے اس ارادے کی خبر مل گئی۔ اس نے کچھ بھی کے بغیر خاموشی سے ان زمینداروں کا دامغ ٹھیک کر کے ان کا انتظام کر دیا۔ اتفاق سے جس خیر کے پانی سے اورنگور کے چھوٹے گاؤں، دیہاتوں کو کھل کے لیے پانی چلائی گیا جاتا ہے، اس خیر کی لوٹیں کچھ بھائی ہے کہ چادہ زمینداروں کا اس پر تسلط ہے۔ پھر پھر انہاؤں پانچویں میں بھی اس کا جواب اس طرح دیا گیا کہ ان کے علاقے میں پانی کی چلائی بند ہو گئی۔ پانی نہ ملنے تو کسی فیصلے اور کہاں کے حکمت! چھوٹے زمینداروں نے کچھ لکھا کہ پانی روک کر کچھ لکھا جاتا ہے۔ اس پر غور و لائن پڑ گئے اور ان کو کسی سرکاری عرس کی جرات نہیں کی۔ یہ ساری وہ معلومات تھیں جو شہر پارے کو اسے عرس میں مختلف لوگوں سے ملاقاتوں میں حاصل ہوئی تھیں۔ معلومات فراہم کرنے والوں میں متاثرہ زمیندار بھی شامل تھے اور کچھ بھائی افراد بھی۔ شہر پارے اسے خود بخود نہیں کر کے ان معلومات کی تصدیق بھی کر لی تھی اور پھر یہی معلومات ماسٹر آفاب کے ذریعے اس کے بھائی دوست تک پہنچا کر کالم کی شکل میں چھپ گئی تھیں۔

"کون الیو کا بھائی؟ جس نے یہ ساری جو اس بھی ہے؟ میں انارٹ درست کرواؤں گا اس کا۔" چودھری انقار جواب تک نہ دیا بلکہ تھاد براہ راست خود پر پھٹ پڑی تو پھٹ پڑا۔

"کہنے والا کون بھی ہو چودھری صاحب! اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کچھ لکھ کر عرس سے جواب دیں کہ لے لے والے کا اعتراض ختم ہو جائے۔ کسی ایک کو ذرا دھک کر اس کا منہ بند کروا دیتے تو مسئلہ نہیں ہو گا۔ آپ ایک کام نہ بند کر لیں گے تو دوسرا ہی پڑے گا۔ آج کے دور میں بھائی اتنا سزاور نہیں رہا ہے۔ آپ تو غور کریں کہ یہ سب صرف ایک ہزار میں چھپا ہے۔ کل تو اگر کسی پانچویں میں چھپ کر ایک سو سو سو کے لئے لکھا تھا تو آپ کی کہیں گے۔ وہ تو سب کچھ ملکداروں کے دنیا کو۔ اسپتال، اسکول، سڑکیں سارے ہی تو

مسکے ہیں یہ آبادی۔" شہر پارے نے چودھری انقار کی رگڑائی کی۔

"ہر کو تو دیکھیں یہ بی بی والے میرے علاقے میں۔ قدم بھی نہیں رکھتے دوں گا میں انہیں یہاں۔ اپنا اور اپنے کیمروں کا نقصان ہی کر کے گائیں گے وہ یہاں سے۔" چودھری انقار سر ہلایں میں آیا۔

"وہاں بات کو یاد بھی زیادہ ایسا نہیں گے۔ آپ کا تمام نام ہو کر رہ جائے گا۔ ابھی جرات آپ کے حوالے ہیں، وہ بھی عوام میں اپنی مقبولیت قائم رکھنے کے لیے بی بی والے کے نقصانوں کے سامنے آپ کی مخالفت کریں گے۔ آپ کے فعل کو قبول نہ مت قرار دیں گے۔ اگر آپ میری بات مانتے تو ذرا کل اور سلطنت پسندی سے کام لیں۔ ایک دو ایسے کام کروا دیں آپ اپنے علاقے میں جن سے بڑے پانی میں آپ کی نیک نامی ہو۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر آپ ایسا کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو بی بی والے کو بیچ کا انتظام میں خود کرنا اڑن گا۔" شہر پارے کی کوشش بھی کہیں طرح پر چودھری انقار کو قبول کر لے۔

"آپ فرمائیے کہ میں کیا کروں؟" چودھری انقار نے پکارا بھرے ہوئے پر بھا۔

"ایک معاملہ تو کچھ ٹھیک کا ہے۔ آپ جائیں تو حکومت سے اس کے لیے منظوری اور فزادہ حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ دوسرا معاملہ اسکول کی توسیع کا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ایکارڈ میں کی درخواستیں موجود ہیں۔ آپ اگر اسکول کی ساتھ الٹی زمین پر اپنی ملکیت کے دوڑے سے دست بردار ہو جائیں تو ہم وہاں اسکول کے لیے چند چیزیں کمرے خرید کر سکتے ہیں۔ ایسے آپ جائیں تو میرے پاس ایک دوسرا آئیڈیا ہے یہ ہے کہ آپ خود اپنی طرف سے وہ زمین اسکول کے لیے وقف کر دیتے کا اعلان کر دیں۔ خبریں زمین سے، آپ کے کسی کام کی نہیں۔ لیکن آپ نے اگر اس کام کے لیے دے دی تو آپ کی نیک نامی کی شہرت ہو جائے گی اور آپ بڑے پانچواں میں ہٹ جائے گا کہ آپ خود اپنے علاقے کی ترقی کی راہ میں ہر کاوت ہیں۔" شہر پارے ہر دھڑکے دھڑکے دھڑکے سہاؤ سے چودھری انقار کو اس موضوع کی طرف لایا تھا اور اب کسی خاطر خواہ نتیجے کا منتظر تھا۔

"میں آپ کے ان مشوروں پر غور کروں گا۔ ویسے اپنی بہادری سے میرے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے شکر ہے۔" چودھری انقار نے جس لمحے میں یہ منظر کرکٹ کا سلسلہ منقطع کیا، شہر پارے فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ بی بی والے کے مشوروں پر غور کرنے کا ارادہ رکھتا ہے یا پھر اصل بات کو

”تو ٹھیک ہے بے بات چلی جاؤ اپنی پروری والوں سے رشتے نہ بھانے... میں تو ابھی رو کر اپنی پڑھائی کروں گی۔“ عورال کی بات سن کر ماہ بانو نے دھمکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”چلی ہوئی ہے کیا؟ یہاں اسی کیسے رہے گی؟ میں اور تیرے ادا دونوں ہی جاؤں گے بچہ میں شرکت کے لیے۔ دے دے تو زیادہ غم نہ کر، ہمارا دل کسی لپا چڑا کرنے کا ارادہ نہیں ہے وہاں۔ جتنے کو نماز کے بعد غصہ نہیں آئے، اسی دن زہر کا پانیوں ہے۔ بچے کو مہندی ہوگی اور ادا کو برات۔ پھر کے دن دو پہر کو لے کر کھانا کھا کر شام سے پہلے ہی واپس آجائیں گے۔ تو تیرے کیسے آج اپنے کالج کو آنا؟ ادا کو تو دے دے تو بخشنی ہوئی ہے۔ بس ایک بغٹا اورچ کے دن ہی تجھے کالج سے غصہ کرنا پڑے گا۔ اب غلی میمن کی شادی براتی قربانی تو دینی ہی پڑے گی تجھے اپنی پڑھائی کی۔“ عورال نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

کیونکہ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کوئی چور اپنا گناہ صاف کر جائے۔ "ان آخری دریاہات کے بعد راج تھا کہ ماہِ جنوری میں ہزارہہ کے یہاں میں شرکت کے لیے ہر آباد جانا تھا۔ ہر آباد جانا اس بار سے ہمیشہ سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا کہ وہاں چودھری انجور کا راج تھا۔ وہ تو یہاں فیصل آباد میں رہتے ہوئے بھی چودھری سے اُمّی خاصی خوف زدہ تھی۔ ہر آباد سے واپس آنے کے بعد اس نے اکیلے کان آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا کہ کہیں چودھری کوئی وارنڈہ نہ چالے۔ اس جیسی بچّے رکھنے والے بندے کے لیے فیصل آباد کوئی ایسا دورج نہیں تھا لیکن شاید باوجود اس کے ذہن سے اتنی کمی۔ اب وہ دوبارہ ہر آباد جاتی تو پر کیسے ممکن تھا کہ چودھری کو دوبارہ اس کا جھان نہیں آتا؟ مگر وہ سب باتیں عرواں کو نہیں سمجھا سکتی تھی اس لیے مرقی کیا نہ کرنی کے مصداق وہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔

”جنگل اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا منفرد ہے۔ یہاں صحرائی طائفے بھی ہیں، کچھ جنگل بھی اور آبی ذخائر بھی۔ صحرائے جوتھن گزرتی ہے وہ ہمیں سے تو ہو کر جاتی ہے۔ ماحول کے اس تنوع کی وجہ سے یہاں کا حیوانیہ اور نباتاتی بڑا متنوع ہے۔ یہاں کے شکاری قسم کے درخت، ہوسے اور بڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ جانوروں میں چکارہ، غزال، پاڑہ، شیل گائے، جنگلی سور، جنگلی لی، ریشی لی، میمڑ، بکڈر، موزی، بخلا، جنگل سب ملتے ہیں۔ آبی ذخائر میں جمیلوں کی بہت سی اقسام موجود ہیں۔ ساتھ ہی قسم کی طیلس، HERONS, EGRETS، تجر، ککڑ، شاہین، شکرے، ککڑ، سرخ زردین، عقاب، قلیل اور رنگ فشر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی ہم فکار شرونگری کے تو آپ کو سڑا آجائے گا۔ حیرت تو یہاں بہت ہے اور ہم زیادہ قریبی کا فکار کرتے ہیں۔ بڑے جانوروں جیسے چکارہ، غزال اور بانو کی آبادی تو کم ہے اس لیے ان کے فکار پر پابندی کا حکم کر رہی ہے حکومت نے۔ سال میں ایک یا دو شخص سے بھرت دیتے ہیں اس کے لیے۔ ویسے میں اس جنگل پر مزید دیرینہ کاروائی کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے سمجھے کہ یہاں جو پھرہ سا بیڑی سلسلہ ہے اس میں HOMONIDS جیسے مچھوڑی اور APES وغیرہ کے فاسلول ملکتے ہیں۔“

”اچھا، پھر تو اس جنگل کو نیشنل پارک کا درجہ ملنا چاہیے۔“ شہریدار کو اعزاز تھا کہ اقبال باجوہ جنگل کی خصوصیات بیان کرنے میں کچھ حد سے تجاوز کر گیا ہے خصوصاً وہ فاسلول ملکتے جانور والی بات تو کہیں سے سچ نہیں کہتی تھی۔ اس سلسلے میں جن میں نیشنل پارک کا نام سامنے آتا تھا اور اس کی ان خصوصیات کے قریبی نظر 1989ء میں اسے نیشنل پارک کا درجہ دیا جاتا تھا۔

لوہے زیادہ لگزدن نہیں تھے لیکن پھر بھی ارد گرد کے باجول سے باخبر رہنا ضروری تھا۔ نہیں اقبال باجوہ کی دلی کوئی اطلاع جتنی ہی جھیلوں کی بہتاں تھیں لیکن پھر بھی وقتے وقتے سے کوئی چلی کائنات میں پھنسی ہی جاتی تھی۔

”سرجی! اچھا دیکھیں۔“ شہر یار بہت دیر سے کوئی جھیل نہ دیکھنے کے باعث کچھ بے چین ہونے لگا تھا تب اس کے ساتھ سوج و گدھری افکار کے ملازم نے تقریباً سرکوشی میں اسے مخاطب کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ شہر یار نے اس کے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ ان لوگوں سے کافی فاصلے پر نہر کے پانی میں چھوٹے ہوتے بھاری جسم کا، عبوری رنگت والا جانور حرکت دہا گنا سے کی طرف آ رہا تھا۔ جانور کے پتھروں کی لمبائی بہت زیادہ تھی لیکن وہ شان و شوخ اور مضبوط نظر آتے تھے۔ شہر یار بہت سال سے دیکھتا رہا۔

”آپ تو کبہ رہے تھے کہ یہاں جھکا رہا اور بازو کے شکار پر ان دنوں پابندی ہے۔“ چودھری انکار کو نظر انداز کر کے شہر یارہ اقبال باجوہ سے مخاطب ہوا۔

”جی ہاں پابندی تو ہے لیکن چودھری صاحب دور سے اعجاز دیکھیں کہ پائے کیے بازو ہے۔ بس انہوں نے گھاس میں اس کی جھلک دیکھ کر فائر کر دیا۔“ اقبال باجوہ فار ایسٹ آفیسر ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے جانور کی ہلاکت پر جس کے شکار پر پابندی عائد تھی، بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

”یہ اچھا نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ شہر یار کو سخت ماتحت تھا۔

”آپ غرمت کریں شہر یار صاحب! بازو کوئی اتنی نایاب نسل کا جانور نہیں ہے۔ پاکستان کے تقریباً چاروں صوبوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ یہاں پابندی اس لیے ہے کہ یہاں بڑا دم تعداد میں ہے۔ لیکن بھر مال، ایک جانور کی ہلاکت سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔“ اقبال باجوہ مکمل طور پر مطمئن تھا۔

”فرق کیسے نہیں پڑتا باجوہ صاحب؟ آپ فار ایسٹ آفیسر ہیں۔ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہوں گے کہ اس ’فرق کیس پڑتا‘ کی گردانے نہیں ماضی میں کتنا نقصان پہنچا ہے۔ بلکہ بک (کالافرنال) کے گھسے سے کون واقف نہیں۔ کسی زمانے میں چوستان کے علاقے میں ان کی کثرت تھی۔ پھر کیا ہوا؟ ہم لوگوں نے انہیں اتنی کثرت سے شکار کیا کہ ہمارے ہاں سے ہرنوں کی یہ نسل ہی معدوم ہو گئی۔ وہ تو نواب آف بہاولپور کے امیر کا کوٹھے میں دیے گئے 35 کالے ہرنوں کی وجہ سے بات بھی۔ ہم نے اپنے جس قیمتی جانور کو ختم کر ڈالا تھا، اس کی امریکیوں نے اتنی اچھی طرح افزائش کی کہ بعد میں انہیں دی سن ہیرن مانا دیے۔ اب ہم انہیں سنبھالنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ نہ جانے دھاریا غیر شکاریہ رو بہ کیوں نہیں ہوتا کہ ہم پہلے اپنی چیزوں کی قدر نہیں کرتے، بعد میں ان کے حصول کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔“ شہر یار کو بازو کی ہلاکت اور اقبال باجوہ کے بڑا انداز پر اتنا افسوس ہوا کہ وہ ابھی خاصی غمزہ کر گیا۔

”اب جو ہو گیا سو ہو گیا اسے ہی صاحب! اشل اپنی اس غلطی کے لیے حکومت کو بھرمنا دیا کر دوں گا۔“ شہر یار خاموش ہوا تو چودھری انکار نے غصت سے کہتے ہوئے بات ختم کر دی۔ اس کے ماتھے پر پڑے ہوئے تھیں دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اسے شہر یار کی یہ تقریر بہت بری لگی ہے۔ شہر یار

نے زیادہ پردہ نہیں کی اور ان لوگوں کے ساتھ واپس اپنے بازو پر آ گیا۔ یہاں ملا زمین نے بازو کی کھال اتار کر اسے جھوٹے کے انتظامات شروع کر دیے۔ وہ چار پتھر اور شہر یار کی شکار کی کئی چھپلاں بھی وہ پتھر کے کھانے کے بیڑوں میں شامل تھیں۔ کھانا تیار ہونے کے بعد کھانا کھا کر شہر یار نے بجے ہوئے بازو پر کھانا لگا دیا۔ کھانے والی۔ اگرچہ معظم جڑ اور اقبال باجوہ کو کوشش کر رہے تھے کہ فضا خوش گوار ہے لیکن شہر یار اور چودھری انکار کے آف سو کی وجہ سے فضا ٹھنڈی سی تھی۔ شام سے قبل ان لوگوں نے اپنا سامان سمیٹ کر واپسی کی تیاری کر لی۔ شہر یار جس بیپ میں بیٹھا تھا اس میں چودھری انکار بھی بیٹھ کر بیٹھا تھا۔

”آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے اسے ہی صاحب! میں نے آپ کے مشورے پر خود کرتے ہوئے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے جو اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری ایک سو پانچ لکھی واپس سے بات ہوئی ہے۔ وہ جان میں وہ ہمارے علاقے میں اپنا دور پنا شروع کر دیں گے۔ آپ دیکھیں نا، یہاں اور گرد کے علاقے میں ابھی تک سو پانچ سروں شروع نہیں ہوئی ہے۔ ہماری کام کروانے والا پہلا بندہ ہوں گا۔“ بیپ جنگل کی حدود سے نکلنے والی تھی جب چودھری انکار نے شہر یار کو یہ اطلاع دی۔ شہر یار اس اطلاع پر اس کا منہ کھلتا رہ گیا۔ اسکول، اسپتال اور بڑے کھیتیں بنیادی ضروریات کو چھوڑ کر چودھری انکار کو ترقی کے نام پر اگرچہ کرتے کا خیال آ رہا تھا تو اپنے علاقے میں سو پانچ سروں شروع کروانے کا۔ اوہ واقعی ایک بے حد ہوشیار شخص تھا جو اپنے دامن پر گئے الزامات کے داغ ایک ایسے طریقے سے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے غلوم افراد اس کی غرمت سے ہرگز نہ نکلنے پائیں اور کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہوا بھی نظر آئے۔

خدا خدا کر کے ہر وہ کی شادی شہر کی۔ ماہ بانو نے بہت ڈرتے ڈرتے اس شادی میں شرکت کی تھی۔ سارا وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ حویلی سے بلاوا نہ آجائے۔ مگر خبر گزری تھی کہ اس موقع پر بڑی چودھرائی کو اپنی سحرانی جہانے کے لیے ماہ بانو کو بلائے کا خیال نہیں آ رہا تھا۔ شاید شادی والے مگر کاسوج کر کھانا لگا کر بیٹھی تھی۔ ماہ بانو ترقی کی کہ بڑی چودھرائی نے اگر بلاوا تو حویلی جانا پڑے گا وہ حویلی میں چودھری انکار بھی ہوتا تو سوچ دیکھتے ہی وہ دروازہ کھانے شکار کرنے کی کوشش کرتا۔ شادی والے دن ماہ بانو کو اطلاع

ملی کہ چودھری انکار شکار پر گیا ہوا ہے۔ اس اطلاع کو سن کر اس کا دل پر ہلکون ہو گیا۔ اس نے آرام سے شادی اور دلے کی تقریبات میں شرکت کی اور بے شدہ ہر گرام کے مطابق دلے کی غرمت سے واپس آنے کے بعد واپسی کے لیے اپنا سامان سمیٹ لیا۔

”ڈیے! اور آؤ رار۔“ چودھری ایک بات تو سن۔ ”سورال نے اس کی مصروفیات دیکھ کر کچھ شکوک کرتے ہوئے اسے آواز دی۔

”آئی ہوں ہے اب۔“ چودھری یہ آخری دو چوڑے بھی بیچ میں رکھ لیا۔ ”ماہ بانو نے مصروف سے انداز میں جواب دیا اور جلدی جلدی کپڑوں کی دھڑکائی میں بیچ میں رکھ کر بڑے بند کرنے کے بعد اس میں دو چھوٹا سا تالا بھی لگا دیا جو وہ گاؤں آتے وقت حیران کی ہدایت پر سامان کی حفاظت کے خیال سے لگا کر لائی تھی۔

”ماں بے بی! اب بولو کیا بات ہے؟ ایمانے کیا بتایا ہے۔ کب تک لکھنا ہے؟ اب تو ویسے بھی شام سر پر آئی ہے زیادہ دیر ہو گئی تو پھر بیس فی صد رکنا پڑے گا۔“ ماہ بانو حیران کے قریب آ کر بیٹھی۔ اس وقت کمرے میں وہ دونوں ہی موجود تھیں۔ حیران باہر آگئے تھے ویسے میں شرکت کرنے کے بعد ساتھ گھر آجائے۔ والے مہمانوں کے ساتھ مصروف تھی۔ حیران اور حیدر کے سوا وہاں گاؤں سے باہر کا کوئی فرد نہیں آیا۔ ہوا قرا اس لیے کسی کے وہاں شب بسر کی کوئی امکان نہیں تھا۔ بس حیران میں ہی رہنے والے برادر کی کے کچھ لوگ تھے جو اس وقت ساتھ آ گئے تھے اور آگئے تھے چھپ چھپا کر پائیس پر پیشے کب شب کب رہے تھے۔

”بات یہ ہے دیکھ کرش اور تیرے باپ تو ابھی تھوڑی دیر بعد فیصل آباد کے لیے نکلے والے ہیں لیکن تیرے ایمانے کیا ہے کہ ماہ بانو سے کوہو چا ردن تک انہیں کھم چائے۔ تیرے کالج میں وہ تیری چھٹی کی درخواست پیش کر گئے۔“

”مگر کیوں؟ میں کس لیے رکوں یہاں؟ میں تو نہیں مانوں گی۔“ بیٹھے واپس جانا ہے آج اور ابھی۔ ”ماہ بانو کو کچھ مل جودان کی قوت سے ملاتی تھا۔

”غرضت کہ میری ابھی وہی اہم قیادت نے خود تیرے ہاتھ سے کہا ہے کہ ماہ بانو کو کچھ چار دن کے لیے گاؤں چھوڑ جاؤ۔ سو چار دنوں کے بعد قیادت خود تھے واپس فیصل آباد آکر پھوڑے گا۔“ ابھی اصل میں ابھی لڑکی کی ضرورت ہے۔ مگر کچھ پچھلا ہوا ہے۔ اپنی تو اس نے چار دیوے سب لیے مجھنے کی؟ اسے حویلی کے کام سے بھی جاتا ہوتا ہے۔ یہاں

کے دنوں میں یہ تین دن کی چھٹی بھی بڑی مشکل سے سمجھتے کے بعد کی تھی۔ لیکن اسے کام پر جانا ہوگا۔ ایسے میں تیرا فرض بنتا ہے کہ ماں کا ساتھ دے۔ اگرچہ کچھ طبیعت ٹھیک ہوئی تو وہی رک جاتی وہ چار دن کے میں لیکن اس کا بھی اچھا نہیں ہے۔ بڑی مرادوں کے بعد تو اسے یہ وقت نکالے۔ اس کی ساس تو ایک دن بھی اسے یہاں دھکنے کے لیے نہیں بھیجے گی۔ دیکھیں نہیں کہ شادی کی تقریبات میں بھی اپنے ساتھ لائی لے جاتی رہی ہے۔ اب دے دے کہ ایک تو ہی ہے جو خوراک کا ساتھ دے سکتی ہے۔“ حیران ماہ بانو کو سمجھا رہی تھی۔

”مگر بے بی! امیر ایساں سمجھنے دل نہیں لگتا۔ تم بھی رک جانا یہاں میرے ساتھ۔“ ماہ بانو نے قہر مائل کی۔ ”امیر انا بول چاہتا ہے کہ رک جاؤں لیکن تیرے ہاں کچھ مشکل ہو جائے گی۔ وہ وہاں آ گیا ہوگا تو کون اس کے کھانے پینے کا خیال کرے گا۔ اور تو جانتی ہے کہ تیرا اپنا اب مزہ یہاں نہیں کر سکتا۔ جتنے دن کا فائدہ ہو گیا ہے اس سے ہی نکالو اور کوئی نقصان پہنچا ہے۔ نہ تو اسے کچھ بدلے دے دے گا کہ کوٹ لٹ جائے ہیں۔“ حیران بالکل سچ کہہ رہی تھی۔ حیدر بازار میں جہاں چلوں گی اور میری لگا تھا وہاں دوسرے بھی کچھ قروٹوں کی ریزیاں ہوتی تھیں۔ حیدر ان صوب میں سب سے زیادہ صاف ستھرا اور اچھا تھا۔ اور قیمت بھی من سب لگتا تھا اس لیے اس کا کام بڑا دلچسپا چلتا تھا۔ بڑی بڑی کاروبار میں آنے والے بھی حیدر کے چیلے پر سے چلنے فریڈ پائینڈ کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے یہ سارے لوگ حیدر کے انتظار میں کھلی خریدار کا تو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ حیدر نہ تو تو کوئی اور چیلے یا دکان سے خریداری کر لیتے۔ نقصان تو حیدر کی کا تھا اس لیے وہ جلد از جلد واپس جانا چاہتا تھا۔

”تم نے اور امانے تجھے دھوکا دیا ہے بے بی! اتم نے مجھ سے کہا تھا کہ دیکھنے والے دن مجھے اپنے ساتھ ہی واپس لے جاؤ کہ اگر اب تجھے بڑی بڑی یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔“ ماہ بانو کا منہ اور میں نے چلا تو حیران سے شکوہ کرتے ہوئے روئے گی۔

”میری بھوری کو کچھ میری لگا بھی ایش اور تیرا اہا بھو قیادت کو لگا نہیں کر سکتے۔ اگر تم نے اس کی بات نہیں مانی تو اس کا کچھ بھر دیکھیں کہ صاف بول دے کہ ماہ بانو میری بیٹی ہے اسے میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جانے دیتا۔

اب یہ بیٹھ بیٹھا رہے گی۔ دروازہ کھولا اگر بھاگتا ہے اسے کوئی بات کر دی تو ہم کیا کریں گے؟ "خود اسی خوف میں جتا کسی جس میں لے پانگہ بچوں کے ماں باپ ملنا جتا رہے ہیں۔

"ایسے کوئی کیسے بددستی روک سکتا ہے مجھے؟ میں تو نہیں روکوں گی۔" ماہ باوروا چھوڑ کر چل کر پڑی۔

"تو ابھی نادان ہے۔ تھی مجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں۔ پھر تو نے بھلائیات کو کب سے دیکھا بھی کہاں ہے۔" غصے میں اس کی آنکھ سے ساری مروت اور لڑائی ختم ہو جاتی ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ اس کی بات مان لی جائے۔ "خود اس نے ماہ باوروا کو جواب دیا۔ ماہ بانو نے مزید کچھ بولنے کے لیے لب کھولے لیکن خود اس نے اسے بولنے نہیں دیا۔

"میں میری دبی اب کچھ نہیں بولنا۔ بس جو میں نے کہہ دیا اسے مان لے۔" اب ماہ بانو بالکل مجبور تھی تھوڑی دیر بعد خوراس اور صفور سے چارہ کے رخصت ہو گئے۔ وہ بچے ہوئے دل کے ساتھ گھر میں چھپا بھرا داسٹیلے گی۔

مہمانوں کی اکثریت رخصت ہو چکی لیکن چند افراد ابھی تک بیٹھے چائیں ڈار رہے تھے۔ ادھر ادھر حرکت کرتی ماہ بانو کے قافوں میں بھی ان کی آواز پڑ رہی تھی۔

"بیرکداری کی برکت سے ہماری تو ساری مشکلیں دور ہو گئیں۔ نگار کی طرف سے قحطی، بیرکداری کی قبر پر ملت مانتے ہی اس کی طرف سے خوش خبری مل گئی۔ ادھر اپنی زہرہ کے بیاہ کے لیے کوئی تیاری بھی لیکن اس کے لیے بھی سلیب بن گیا۔ چودھری صاحب نے پچھلا قرض باقی ہونے کے باوجود زہرہ کے بیاہ کے لیے قرض دے دیا۔ میرا تو ایمان پاک ہو گیا ہے بیرکداری کی کرامت پر۔ اگلے برس مرنے دو گا تو خوب بڑے چڑھاؤں کی ان کی درگاہ پر جا کر۔" ماہ بانو یاد دہانی خانے میں بڑوں کے ڈیمر سے اچھڑی گئی جب اس نے خوراس کو نہایت عقیدت سے کہتے سنا۔ ماہ بانو کو اپنی قسم دینے والی ماس کی ضعیف العتیدی پر انہوں نے ہلکا سا ہنسنے کے کے دراپنی شکایت مل ہوئے پر اللہ کا شکر ادا کرتی۔ "بچہ بھی بیرکداری کے گن کار رہی تھی۔ اس کی یہ عقیدت مندی باقی بننے والوں کا ایمان مزید کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کر چکی تھی۔

"بیرکداری تو کیا ہی بات ہے۔ وہ ہم میں بوجا میں تو کالا چور بھی آدمی کا بھروسہ نہ جانتے۔ وہ قصہ سنا ہے تم لوگوں نے کہ ایک کھار بے چارے کا ہاتھ کسی کا دھانے میں ٹوٹ گیا۔ اب بولنے ہوئے کا ہاتھ سے بے چارہ کیا کام کرتا اور

کیسے کھانا۔ گھر میں قانون کی نوبت آگئی۔ اس پر اس کوئی ہنسی کچھ بیاہ سر پر آکر ادا ہوا۔ کھار کو کچھ مجھ میں نہیں آیا تو بیرکداری کی درگاہ پر آکر ان کے سامنے کڑکڑایا اور بڑا چلا گیا۔ اب آپ ہی بیرکداری کی مدد کریں۔ خدا کا کرنا۔ خدا اسی رات کھار کے گھر پر ایک مسافر آکر رہا۔ اس بے چارے کے پاس اپنے ادا رہنے والوں کا پیٹ بھرنے کے لیے دو ٹیکس تھا، مسافر کو کیا کھانا لیکن چارہ بے مہمان کو کھانا بھی نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ کھار جس نے بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا تھا مہمان کی خاطر اس پر بڑوں والوں کے پاس گیا اور تھوڑا تھوڑا کھانا مانگ لیا۔ رنگ پر لگا کھانا دیکھ کر مسافر کی کچھ میں سارا معاملہ آگیا۔ اس نے کھار سے تفصیل پوچھی۔ اس نے سارا راج بتا دیا۔ اس وقت تو مسافر خاموش ہو گیا لیکن صبح اذانوں سے بھی پہلے کھار کو چاکر بتایا کہ وہ جا رہا ہے۔ جاتے جاتے وہ کھار کو ایک چھوٹی سی پٹلی تھا کیا۔ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ ایک ان کی گرائی واکو ہے۔ اس کے جانے کے بعد کھار نے پٹلی کو مل کر دیکھی تو اس میں کہنے دو رہے تھے۔ بس اس کے قون میں پھر گئے۔ پٹلی کا بیاہ بھی خوب اچھی طرح ہوا اور آگے کی پریشانی بھی دور ہو گئی۔ کھار نے کچھ لیا کہ یہ ہماری بیرکداری کی کرامت سے ہیں انہوں نے دوسروں کو بولنے والے کے ہاتھ اس کا دامن پھیر دیا۔ "خوفاں کے عقیدت مندی کا اعتقاد کرنے کی دیر تھی، خوراسی وہاں موجود ایک بزرگ نے ایک قصہ بیرکداری کی کرامت کے بارے میں سنا دیا۔ ایسے اور بھی کئی قصے تھے جو لوگ سنا رہے تھے۔ ماہ بانو کو بھی ان واقعات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ قصے جان بوجھ کر اپنی طرف سے گھڑ کر پھیلائے گئے ہیں۔ لیکن عقیدت مندی کے چال میں پہنچے ہوئے لوگوں کو یہ بات سمجھنا بہت مشکل تھا۔

"ایسے چودھری صاحب پر بھی ان کے دادا حضور کی بڑی نظر کرم ہے۔ دیکھا نہیں ہے کہ کسی بھلی بھول رہے ہیں۔ خیر، کئی تو پہلے بھی کوئی نہیں تھی لیکن بیرکداری کے کرم سے ان کا نصیب اتنا بلند ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالے ہیں ناگہ ہی پاتے ہیں۔ اب شکار کا ہی قصہ سنو۔ چودھری صاحب اپنے دوستوں کو لے کر شکار پر گئے تھے۔ گھر سے نکلے تھے کہ بس ڈرا بھگن میں گھومتے پھرنے کی تفریح رہے گی اور تھروں وغیرہ کا شکار کر کے واپس آجائیں گے لیکن ادھر تو ان کے ہاتھ پاؤہ گیا۔ اب بتاؤ۔" ماہ بانو کی روشنی میں بھی باہر نکلتے ہیں لیکن چودھری صاحب کے ساتھ جاتے والوں نے بتایا کہ ایک موہ بڑا ہڈی پاؤہ دن دینا ہے

چودھری صاحب کے سامنے ایسے آگیا پیسے کیے ان سے ان کی خدمت میں بیجا ہو۔ کو اس سے اپنے مہمانوں کی دعوت کرو۔ رات بھر وہ لوگ واپس آئے ہیں شکار سے۔ ساتھ چانور کی کھال اور اس کی منڈی بھی تھی ہے۔ چودھری صاحب دونوں چیزوں کو محفوظ کر دیا اپنے ذرا رنگ روم میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ "یہ سارا قصہ سنانے والا تو عقیدت مندی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن ماہ بانو کے ہاتھ پاؤں سن پڑے۔ لگے۔ وہ جو ایک اطمینان تھا کہ چودھری افکار گاؤں میں موجود ہیں، اس قصے کو نہ رخصت ہو گیا اور وہ اپنے ارد گرد مڑنے لاسے خطرے کو محسوس کرنے لگی۔ چودھری افکار صفور کی قمار پر شکاری بھی تھی اپنے شکار کو چھتے سے نہیں جاتے دیتا۔ وہ دے قدموں سے اس کے تعاقب میں اس وقت تک لگا رہتا ہے جب تک اسے شکار نہ کر لے۔ ماہ بانو سمجھ سکتی تھی کہ چودھری افکار بچے سے کھاتے لگائے اسے شکار کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ اس کا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد بھی اس کا مکان کام مینے کے بعد جب سب گھر والے بستر پر لیٹے تو ماہ بانو نے رات کی خاموشی اور اندھیرے میں ہونے والی وہ آواز سنی۔ آواز اس کی بھی پیسے کوئی دیوار پھلانگ کر اندر گواہو۔ ماہ بانو کی بڑھتی بڑھتی میں سستا بہت دور تھی۔ خدشوں اور بدعیشوں نے اس کی سینہ پہلے ہی ازار کر دی تھی۔ شہید شکن کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہی تھی۔ اب جو اس نے دھمکائی تو پوری جان سے کانپ گئی لیکن وہ پہلے ہی لے کر چلی گئی کہ چودھری کے لیے تر تو الٹ ثابت نہیں ہوگی۔ سناٹی دینے والی آواز واقعی کسی انسان کے گونے کی ہے یا کسی کی وغیرہ بانو بچنے سے اپنے بستر سے کچھ رنج گئی۔ بستر چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنے گرد بڑی سی سیاہ پادر لپیٹ لی تھی۔ وہ رنجی ہوئی بنا آہٹ کے کمرے کے دروازے تک گئی اور اندھیرے میں ڈوبے آگئیں کو اکھیں مجاز پھاڑ کر دیکھا۔ پہلی نظر میں اسے کچھ دکھائی نہیں دیا مگر پھر اس نے قدموں کی آہٹ سے دیوار پھلانگنے والے کو پایا۔ وہ بے قصوں سے چٹا ہوا بھری دوازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ماہ بانو سمجھ گئی کہ باہر کچھ اور افراد بھی موجود ہیں جنہیں وہ اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ بلاتہ جاتا ہے۔ وہ تیزی سے حرکت کرتی آئی اور دکر کے کے دروازے سے نکل کر باوروا جانے کی طرف بڑھ گئی۔ سیاہ چادر کی وجہ سے اس کا وجود لکھنے سے کا جڑ دیتا ہوا تھا اور یوں بھی دیوار پھلانگ کر آئے

والے کا رخ اس کے بجائے دروازے کی طرف تھا اس لیے اسے باوروا جانے تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ بغیر دروازے کا یہ پادری خانہ اسے ہرگز پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہاں وہاں پناہ لینے آئی بھی نہیں گئی۔ چودھری افکار کے گاؤں میں موجود ہونے کا سن کر اس نے اس قسم کی صورت حال میں گھرنے کی صورت میں پہلے ایسے زمین میں ایک لائٹنل ملے کر لیا تھا اور اب وہ بہت خاموشی سے اس پر غور کر رہی تھی۔ اپنی اسی مصروفیت کے دوران اس کے کان باہر کی طرف بھی گئے ہوئے تھے۔ آنے والے اندر آچکے تھے اور ان کے قدموں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنے چار سے کم نہیں۔ دروازہ میں ماہ بانو نے قافوں وغایات اور اپنے چھوٹے بھائی الیاس کی گھبراہٹ ہوئی آواز میں نہیں۔ بھران آوازوں میں اس نے کچھ ابھی آواز میں بھی نہیں۔ بھران لوگ اکی کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ ماہ بانو جانتی تھی کہ انہیں اس تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اسے اب پروا بھی نہیں تھی۔ جو کچھ کر تھا، وہ کر چکی تھی اور اب اطمینان سے پادری جانے کی دیوار سے قہقہے لگائے کھڑی تھی۔ آخراں میں سے ایک وہاں پہنچ گیا۔

"یہ رہی۔ یہاں بھی ہوئی ہے۔" ماہ بانو کو دیکھتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔ وہ بندے بھاگتے ہوئے تھری سے وہاں آئے۔ ان سب نے اپنے چہروں کو ڈھانوں سے چھپا رکھا تھا۔ "اٹھا لو اسے اور جیب میں ڈالو۔" آنے والوں میں سے ایک نے حکم دیا اور دو بندے ماہ بانو کی طرف بڑھے۔

"وہیں رک جاؤ۔" خیردار جو کسی نے مجھے ہاتھ کیا۔ میں خود تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں۔" ماہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکے ہوئے سخت دیکھ کر کہا اور اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ آنے والے اس کے اس انداز پر حیران رہ گئے۔ مگر پھر وہ بھی چل پڑے۔ آگئیں میں نوران، غیاث اور وہی سالہ الیاس ہر اسان کھڑے تھے۔ بندہ دقت تانے ایک شخص ان کے سر پر ہوا تھا۔

"خیردار اگر اپنی بیٹی کی زندگی جا بے ہو تو منہ بند رکھنا۔" سچ نہیں تمہاری بیٹی زندہ مل جائے گی۔ اگر زبان کھولی تو پھر اس کی ادا ہی پائو گے۔" جس شخص نے ماہ بانو کو اٹھانے کا حکم دیا تھا اس نے ہی بارمب لہجے میں انہیں کو دھمکی دی اور وہ لوگ باہر نکل آئے۔ ماہ بانو کو انہوں نے جب اکی الیاس پر پٹھا تھا اور اس پر لڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ ایک لڑکی کو اتنا کیا جا رہا

تھا اور وہ بغیر کوئی دوا بھیجے ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی تھی۔

"غالبہ بیٹریول کی بوس کا دھکن ڈھلا ہو کر اس سے بیٹریول کر گیا ہے۔ مجھے جب میں بیٹریول بھیجی ہو آ رہی ہے۔" تھوڑا سا قاصد ملے کرنے کے بعد ہی چپ ڈرائیو کرتے والے نے خیال ظاہر کیا۔
 "یہ تو ہمیں بھی آ رہی ہے لیکن ابھی رے کے بغیر چلے رہو۔ بعد میں آرام سے دیکھیں گے۔" پچھلی نشست سے جواب دیا گیا۔ ماہ بانو ان سے بے نیاز بنی باہر کی طرف دیکھتی رہی۔ باہر اترتا ہوا تھا لیکن پھر بھی اسے اندازہ ہو گیا کہ جب کارخ کوئی کی طرف نہیں۔ وہ جوئی کے راستے سے بہت کرشمہ کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ یعنی اسے دوا کر دینے والا چودھری افتخار کے موافق کوئی اور ہو سکتا تھا۔
 ماہ بانو کے ذہن میں یہ خیال آیا اور پھر اس نے خود ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ چودھری افتخار کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں تھا جس کی اس پر نظر ہوئی۔ اس رات تو اتفاقاً اسے جوئی کے اندر رہی ماہ بانو سے دست درازئی کا موقع مل گیا تھا لیکن یقیناً عام حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ جوئی میں اپنی بیویوں اور دیگر اہل خانہ کی موجودگی میں ایک لڑکی کو اغوا کر دے اس کے ساتھ رات بھر رہے۔ اپنے اس قسم کے مذموم مقاصد کے لیے یقیناً اس نے کوئی دوسرا حکم کاربند رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوگ اپنی منزل پر پہنچے تو ماہ بانو کے خیال کی تصدیق ہوئی۔ ڈھانچوں نے اسے جس کمرے میں پہنچایا، وہاں چودھری افتخار اس کا منتظر تھا۔ ماہ بانو کو سامنے پا کر وہ کھل اٹھا۔

"بہت تر پایا تو نے نہیں۔ اس رات پہلی چھٹی کی طرح ہمارے ہاتھوں سے بچل گئی لیکن دیکھ ہم پھر تجھے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔" اپنے ہاتھ میں موجود شراب کا جام تھراتے ہوئے اس نے ایک خوش بھرا قبضہ لگا دیا۔ ماہ بانو کوئی جواب دیے بغیر خاموش کھڑی رہی۔ اس کے انداز میں جب ہی بے نیازی اور بے پروائی تھی۔ چودھری افتخار تھوڑے اور غور سے اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟ آج بڑی چپ ہے۔ نہ کوئی شورش گالی مگرج۔ میں تو سمجھا تھا میرے بندے تیرے ہاتھ پر باندھ کر تجھے میرے سامنے لاکر بھیجیں گے لیکن تو تو خود اپنے قدموں پر چل کر آئی ہے۔"

ماہ بانو اس بار بھی خاموش رہی۔
 "چل ابھی بات ہے کہ تجھے خود ہی عقل آگئی۔ خاموشی

سے میری بات مان لینے میں ہی حیرانگہ رہا ہے۔ پر یہ تو بتا کر اب اس چادر میں پٹیا ہمارے ضبط کو کیوں آزار رہی ہے۔ دور پھینک اس چادر کو اور یہاں میرے پاس آ۔" چودھری افتخار کی اس فرمائش پر ماہ بانو نے اپنے گرد مضبوطی سے پٹیا چادر کو سر کا یا۔ سامنے سے چادر ہٹتی تو اس کی گریبان سے دامن تک پانچ غم غم قیاس ظاہر ہو گئی لیکن چودھری افتخار کی نظر اس کی قیاس کے بجائے اس کے سامنے میں ڈٹے ہوئے جسم کو پھول رہی تھی۔ چادر سر کانٹے کے بعد ماہ بانو نے چودھری افتخار کے دوسرے عمر کی بے پروائی نہیں کی تھی۔

"اب آجیانا... کیوں تڑپاتی ہے؟" چودھری نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ ماہ بانو نے جس دھڑکتی اپنی جگہ کھڑی رہی۔

"چل اگر تو نہیں آتی تو ہم خود تیرے پاس آ جاتے ہیں۔ اتنا غرا دکھانا تو تیرا حق بنتا ہے۔" چودھری افتخار لڑکھاتے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔

"وہی رنگ جاؤ چودھری!" ماہ بانو نے کڑی ہوئی آواز میں اسے تنبیہ کی اور اپنی بند کھلی کھولی۔ اس بند کھلی میں ماچس کی ایک ڈیا صاف نظر آ رہی تھی۔

"اگر شراب نے تمہارے اندر کوئی حس پاتی چھوڑی ہے تو وہیں رنگ جاؤ اور اس بو کو سونگھو جو میرے بدن سے آ رہی ہے۔ میں اپنے بدن پر بھی کتا چھڑک کر یہاں آتی ہوں۔ اگر تم نے مجھے انکی بھی لگنے کی کوشش کی تو میں اس ماچس سے خود کو آگ لگا لوں گی۔ تمہیں مجھ سے کچھ نہیں ملے گا۔ اگر نہ رہتی میرے قریب آنے کی کوشش کرو گے تو خود بھی جل کر سمر دے گا۔" ماہ بانو کا لہجہ اتنا بھیاں تک تھا کہ چودھری کا سارا رنگ ہرن ہو گیا اور وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ پر جم سا گیا۔ جس کی طرف ماہ بانو نے اس کی توجہ دلائی تھی، وہ اس نے اس کی آمد کے ساتھ ہی محسوس کی تھی لیکن شراب کے نئے دور ماہ بانو کو پٹنے کی ترنگ میں نظر انداز کر گیا تھا شراب اس کی ہڈی حقیقت اسے سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ماہ بانو کا۔
 "یہ چادر ہٹا دیا۔ وہ اپنے اراوے میں نہایت غیر محترمانہ نظر آئی تھی۔ اس کا اور چودھری افتخار کا دور میانی فاصلہ اتنا خالص کہ جب تک اس کے قریب تھا کہ اس کی ڈیا چھینے کی کوشش کرتا۔ وہ خود کو آگ لگ چکی ہوئی۔ ماچس کی ڈیا اور اس سے لگائی ہوئی ایک تیلی اس کے ہاتھوں میں پانچ چیر رہی۔ چودھری افتخار اٹنے میں ہونے کے باوجود چاند تو کھڑا کر چکی تھی بلکہ تو ماہ بانو کا مٹی کے تیل میں ڈوب، وہ خود اپنی خودی سے آگ کی لپیٹ میں آئے گا کہ وہ لمحوں میں جل کر بسم ہو

جائے گی۔ وہ ہلکتے خود رو مایہ جیچے بنا۔
 "ٹھیک ہے، اس روز بھی ایک آگ لے بھڑک کر بجے
 بجالیا تھا اور آج بھی تو نے ایک آگ کی دھمکی کو درمیان میں
 لا کر ہمارے قدموں کو روک دیا ہے۔ لیکن تو کبھی جانتی کہ
 ایک آگ ہمارے اندر بھی بھڑک رہی ہے جو تجھے مائل کیے
 بغیر نہیں بجے گی۔ ابھی تو وہ دھماکا چلی جا رہی ہے یاد رکھ کہ تجھے
 صرف اور صرف چودھری افکار کا بی بی بننا ہے۔ اس بار میں اس
 راستے سے آؤں گا کہ تو مجھے روک نہیں سکے گی۔" کچھ دیر
 خاموشی سے بیٹھنے کے بعد اس نے ماہ بانو سے کہا اور پھر اپنے
 کسی ملازم کو بلا کر بلایا۔

"اسے واپس اس کے کمر چھوڑ آؤ۔" ملازم کے حاضر
 ہونے پر چودھری افکار نے اسے حکم دیا اور ساتھ ہی ماہ بانو کو
 بھی ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔ ماہ بانو تو غیر یقینی کی
 کیفیت میں اپنے گروہ بارہ چارہ و فیکٹری باہر کی طرف بڑھی
 لیکن اس کا انداز اس پر اسان بیری کیساتھ جو رہا ہی آہٹ
 پر بھی چونک اٹھتی ہے کہ جانے دکھاری اب کہاں سے حملہ
 کرے گا۔

☆ ☆ ☆

غیاث محمد اور نوران بھرت کی تصویر بنے ایک تک اپنے
 کمر کے آئین میں گھرے اس سامان کو دیکھ رہے تھے جس کی
 وجہ سے ان کے لیے اپنے آئین کا کھڑا آئین ہو گیا تھا۔ رات
 سے مسلسل وہ اسی طرح کی جڑوں کی زد میں تھے۔ پہلے ماہ
 بانو افواہ کی تھی۔ نوران نے کبھی بارہ بانو کے ہاتھ حالت میں
 حویلی سے واپس آئے والے واقعے کی روشنی میں جواب لیا
 کہ یہ کارروائی کس نے کی ہے۔ اس نے غیاث محمد کو بھی اپنے
 خیال میں شریک کر لیا۔ غیاث محمد پوری بات سن کر اس پر بے
 حد خفا ہوا تھا کہ نوران نے اسے اس واقعے سے بے خبر نہیں
 رکھا؟ گروہ اسے بتا دیتی تو وہ ماہ بانو کو بھی یہاں نہ رکھتا۔
 ابھی ان لوگوں میں اس موضوع پر بحث چل رہی تھی کہ ماہ بانو
 صبح سلامت واپس لوٹ آئی۔ نوران اور غیاث محمد کے
 سوالوں کے جواب میں کچھ بتاتے کے بجائے اس نے صرف
 ایک بات کہی کہ اسے فیصل آباد واپس بھیجا دیا جائے لیکن
 سچ ان کے لیے ایک اور حیرت شکر تھی۔ چودھری افکار کا فیکٹری
 اللہ رکھا چھل اور مصالحتی کے نوکران کے ساتھ صبح کی
 وہاں آدھ کا تھا اور اس نے ماہ بانو کے لیے چودھری افکار کے
 رشتے کا بیانیہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود ہی بے یقینی لے کر دیا تھا
 کہ آئے والے تھے کہ عصر کے بعد چودھری افکار اور ماہ بانو کا
 نکاح ہو گا۔ بے درپے فیکٹری آئے والے ان واقعات نے

نوران اور غیاث محمد کی سوچنے بکنے کی ملا جلی سلسلہ کر لی تھی
 اور وہ ایک تک آئین میں رکھے چھل اور مصالحتی کے نوکران
 کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اپنی ذہنی بیماری فیکٹری ایک ساتھ پہلے
 بھی ان کے آئین میں نہیں اترتی تھی۔
 "کیسے دباؤوں اپنی اپنی ہونٹری کوئی کو اس کے باپ
 سے بھی زیادہ مگر کے چودھری ہے۔ چودھری تو پہلے ہی فیکٹری
 میں بیاد چھڑکا کر بیٹھا ہے۔ ایک تو چلو اللہ کو بیاد ہوئی۔ پر
 وہ جو بدبختی ہیں اور تو ایک سے بڑھ کر ایک ظالم اور ماردار
 ہیں۔ وہ تو کھادی جا نہیں کی میری مصدوم دہی کو۔" آخر نوران
 کی مبتدای بلبائی تو اس نے لب لہو لے۔

"ہمت ہے تو انکار کھلا دے۔ دو جاہ بھی نہیں لینے
 دے گا چودھری ہم ساروں کو۔" غیاث محمد اس پر الٹا۔ نوران
 خود بھی یہ بات سمجھتی تھی جو جواب دے بنا دو دھمکی کا پلو آٹھوں
 پر رکھ کر کھینچے گی۔ غیاث محمد کو دیر خاموش بیٹھا اسے آفس
 بہاتا۔ بھٹکار باہر کھٹک کر اس کے قریب آیا اور سرکشی میں
 بولا۔ "ایک بات سن نوران! نوران اس کے اس انداز پر
 سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے متوجہ ہو کر غیاث محمد
 اسی ساہتہ انداز میں بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ چودھری کی
 بات تو ہمیں دانی ہی پڑے گی۔ کیوں نہ خوشی سے مان میں۔
 چودھری سے اپنی دہی چاہ کر ہم نقصان میں نہیں رہیں گے۔
 ہماری تو شان ہی الگ ہو جائے گی۔ چودھری کا رشتہ دار
 جان کر سارے ہماری عزت کریں گے۔" غیاث محمد کی
 آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس عزت اور مقام کے لیے جو ساری
 زندگی اسے ابھی بسر نہیں آئے تھے۔ نوران نے اس پر ایک
 ملاحتی نظر ڈالی۔

"مشرم کر غیاث محمد اجے کبھی باپ بن کر پالائیں۔ آج
 اس کے ارمانوں کا خون کر کے اپنی عزت کالے کا سوچ رہا
 ہے۔ تو کون ہوتا ہے ماہ بانو کے ہاتھ میں فیصلہ کرنے
 والا؟ اس کے ماں چوہدران اور مقدر ہیں۔ بیٹے ان سے
 بوجھ کر وہ چودھری سے اپنی دہی دیا ہے کہ کو اس کی جین یا
 نہیں پھر گاؤں میں اپنی نور بنانے کی سوچنا۔" نوران جوں
 سے پہلے اپنی مجید یوں کے تھے تاکہ ماہ بانو کو کوئی جین
 جا کر ہی پر مجبور کرنی دیتی تھی۔ غیاث محمد کو کس شخص کرنے کی
 لیکن غیاث محمد بھی دہتے والا نہیں تھا۔ نوران کی بات سن کر
 فوراً بھڑک اٹھا۔

"بالا کئی نے بھی ہو دہی تو وہ میری ہی ہے۔ حیرت
 بہن بہنوں کون ہوتے ہیں میری دہی کے بارے میں فیصلہ
 کرنے والے؟ میں نے اسان کیا تھا جو ان کی سوتی گورہ کچھ

کرانی دہی دے دے تھی۔ اب مرضی کہ میں جہاں جا ہوں
 اپنی دہی کو باہر ہوں۔ ویسے بھی چودھری کو انکار کرنے کا تو سوچا
 بھی نہیں جا سکتا۔ وہ چاہے تو کمرے سے کمرے میں گاؤں سے
 نکلا دے۔ پھر سوچ کہاں جاؤں گے ہم سارے۔ ہمارا تو بیٹا
 بھی ابھی کی لائق نہیں ہے۔ کہاں ڈالے پھر میں گے ہم اپنی
 سنی کو چھوڑ کر۔" غیاث محمد جو کچھ بول رہا تھا، نوران کی حقیقت
 تھا۔ اس حقیقت کو نوران بھی سمجھتی تھی چنانچہ ایک بار پھر اور دہی
 کا پلو آنکھوں پر رکھ کر روئے گی۔

"کیوں رو رو کر اپنی جان پکان کر رہی ہے۔ شہر کر کہ
 ہمارے دست پر کاک لٹے سے دہی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب
 بھر کا دیکر کر امت سے ہوا ہے۔ انہوں نے پہلے بھی ہمدانی
 بھڑکی دہی ہے۔ اب بھی ان کا ہی کرم ہوا ہو گا کہ ماہ بانو
 خیریت سے گھر آئی اور چودھری نے جیاد کا پیاس بجھ دیا۔
 ورنہ ہماری حیثیت ہی کیا ہے چودھری کے آگے۔ میری ماں،
 بھڑکی مت کر اور دہی خوشی راضی ہو جا۔ غشی اللہ رکھا جائے
 جانتے اشار دے گیاتے کہ اس بیاد کے بعد ہم پرچہ حاضر خیر
 بھی معاف ہو سکتا ہے۔" غیاث محمد نوران کو سمجھانے لگا۔
 سرکاری کر امت و عزت کا سمجھنا پڑتا اور قریب سے غیبت وہ
 حوالے تھے جنہیں سن کر نوران بھی تکان ہوئی اور جھٹ آفسو
 پر ہنچ ڈالے۔

"بات تو تیری ہی کو تھی ہے غیاث محمد۔ پر دیکھ، خود اس
 اور غند کو بھی اس ویاد پر بلایا۔ انہوں نے اپنی چاہ سے ماہ
 بانو کو بلایا ہے۔ ان کے دل میں بھی سو اور مان ہوں گے اس کے
 دوا کے لیے۔"

"ہاں ہاں، ان کو بھی بلائیں گے۔ تو فکری نہ کر۔ میں
 ایک دن پہلے کی کو بھیج کر ان دونوں کو بلواؤں گا۔ تو بس
 اب ماہ بانو کو سمجھانے کی فکر کر۔ اس کا مزاج دیرینہ صاب،
 آسانی سے نہیں مانے گی۔" نوران کے راضی ہوتے ہی
 غیاث محمد نے پر جوش انداز میں اسے یقین دہانی کر دانے
 کے ساتھ ساتھ اس کی قویہ سب سے اہم مسئلے کی طرف
 مہذبہ کی روانی۔

"قرنہ کہ میں اسے راضی کر لوں گی۔" نوران نے
 اطمینان سے جواب دیا جبکہ کمرے کے دروازے پر رکھری
 ماہ بانو اپنے گئے ماں باپ کے لیے اس پر حیرت فیکٹری کو سن
 کر ہر بات کی رو تھی۔ اپنے مفادات پر اسے بیعت
 چھانے کا فیصلہ کرنے والوں نے ایک بار بھی اس سے یہ
 بھڑکے کی ذمت نہیں کی تھی کہ وہ اس قریب ہی پر راضی بھی ہے
 نہیں۔

☆ ☆ ☆

شہر دار کو جانے کا سوچ بھی کہ اس نے اچانک ہی پڑ آیا
 کے دورے کا فیصلہ کر لیا۔ اسل میں اب تک اس کا جتنی بار
 بھی پڑ آیا تھا وہ تھا۔ وہ وہاں پر دھری افکار کے سہمان کی
 حیثیت سے گیا تھا۔ اس حیثیت میں اسے ایک بار بھی سوچ
 نہیں ملا تھا کہ وہ گاؤں کے حالات اور مسائل کا جائزہ لے
 پاتا۔ آج کے اس دورے کا مقصد گاؤں کا جائزہ لینا اور وہاں
 کے مسائل کو سمجھنا تھا۔ پھر وہ اسکول والے معاملے کو بھی اب
 جتنی طور پر غماز دینا چاہتا تھا۔ چودھری افکار کے رنگ و صفت
 دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دلاس سے قائل ہونے والا
 بندہ نہیں۔ اس کے سامنے اپنے اختیارات کا استعمال کرنا ہی
 پڑے گا۔ چنانچہ اب وہ پیر آباد کی حدود میں تھا۔ اس کے
 ساتھ حسب معمول صرف ڈرائیور مشاہد خان اور عبداللہ اللہ
 ہی موجود تھے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی شہر یار نے سب
 سے پہلے اسکول کا دورہ کر کے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ایک
 کسبان سے اسکول کی کوکیشن معلوم کر کے مشاہد خان نے
 گاڑی اسکول جانے والے راستے پر ڈال دی۔ اسکول کیا تھا،
 کس ساتھ ساتھ ہے وہ کمرے تھے جن پر پڑھری اسکول
 پیر آباد کا پورڈا لگا ہوا تھا۔ مشاہد خان نے گاڑی روکی تو
 شہر یار اور عبداللہ اللہ ان کمرے کی طرف بڑھ گئے جس کا
 دروازہ کھلا ہوا تھا اور کھلے دروازے سے بخوبی یاد رہے کہ
 ماسٹر آقا ب صاف نظر آ رہا تھا۔ گاڑی کی آواز پر ماسٹر آقا ب
 بھی متوجہ ہو گیا تھا چنانچہ پیچھے ہی اس نے شہر یار اور عبداللہ اللہ
 کو دیکھا، ایک کر باہر آیا۔

"السلام علیکم سر آقا ب یوں اچانک؟" وہ شہر یار کی آمد
 پر حیرت کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس کے سیکھے سے صاف ظاہر تھا
 کہ اسے شہر یار کو ہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔
 "اچانک آیا تو زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ آؤی کو وہ کچھ
 دیکھنے کو مل جاتا ہے جو اطلاع دے کر آنے کی صورت میں
 چھپا لے جانے کا خدشہ ہو۔" شہر یار نے ماسٹر آقا ب سے
 ہاتھ ملائے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

"موسم اب گھر سر۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میرے
 اسکول کی صورت حال پر وہ ہر صورت میں آپ کا ایک بھیجی ہی
 نظر آئے گی۔" ماسٹر آقا ب کے پُر امید جواب پر شہر یار
 کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ ماسٹر آقا ب
 ٹھیک کھڑ رہا ہے۔ وہ کوئی ذہنی نوکری نہیں تھکنے والا بندہ تو
 تھا نہیں کہ وہ دروں کو کھانے کے لیے اچھی کارکردگی کا
 مظاہرہ کرتا وہ نہ ساہل برتا۔ وہ تو مشنری جینے کے ساتھ

پیر آباد کے اس برائے نام اسکول میں لوہری کر رہا تھا۔ جگہ
لوہری بھی کیا پیر آباد کے لیے مشہور لوگوں میں آج بھی دے دیے
روشن کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ شہر یا ماسٹر آفتاب
کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہو گیا۔ اپنے اسٹیس پیچھے
تھے لیکن انہوں نے نہایت ادب سے اسے سلام کیا۔ بچوں
کے سلام کا جواب دے کر شہر یا ماسٹر کے گاہ بازو لینے لگا۔
اکڑے ہوئے فرش، چمکی ہوئی دیواریں اور اڑے ہوئے
رنگ والا پتھر اپنی بینک کی پست کے ساتھ بے حد مزہ دہر پا
تھا۔ دو دیواریں پر مختلف سٹیشن میں ٹھہرا ہوا موجود تھے جبکہ
کچھ ہاتھ سے بنے چاروں دیواریں بھی نقش آراہ تھیں۔ سچے
سچے دیواریں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دیواریں پر بیٹھ کر پڑھتے
تھے مختلف عمر کے ان بچوں کی تعداد گاؤں کی آبادی کے لحاظ سے
بہت کم تھی لیکن پورے اسکول کے ایک کمرے میں چلنے کی
جگہ سے جگہ کے اعتبار سے وہ تعداد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔
ماسٹر آفتاب کے کنبے پر دو دیواریں مگر کے کنبے پر ایک کے
کمرے سے ایک کمرے اٹھا لائے۔ دو کرسیاں چمکی سی دیواریں
موجود تھیں جو ماسٹر آفتاب نے شہر یا ماسٹر اور عبداللہ کے
بیٹے کے لیے بیٹھیں تھیں اور خود تیسری کرسی آتے پر اس پر
برائمان ہو گیا۔

”ابھی جا رہا اسکول صرف تیسری جماعت تک ہے۔
تمام بچے اس ایک کمرے میں ہی بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ ہم دیہی
میں تو گھر بھی گڑھ اور ہوتا ہے لیکن کمرے میں یوں پڑھ کر
ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں بچوں کو پڑھنا مشکل ہوتی ہے۔ اسی لیے
میں بار بار درخواست دیتا ہوں کہ اسکول کی عمارت میں اور
کچھ کھلیں تو کم از کم ایک دو کمرے کا اضافہ کر دو دیا جائے
تا کہ ہم کلاس آگے بڑھتے ہوئے بچوں کے بیٹھنے کے لیے
مختار کھلیں۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ نہ ہی کلاس میں بچوں
کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی پہلے سے موجود ایک کھنگ
سے پڑھ پاتے ہیں۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ الگ الگ سبق
پڑھنے والے بچوں کے ایک ہی جگہ کر پڑھتے سے کیا
موردہ حال ہیں آئی ہوگی۔ اکثر ان کے اسباق آج ہی میں
گڑھ ہوتے تھے جیسا کہ ہر حال میں فی الحال تو میں اور میرا
ساتھی بچہ کمرے پر سب کمرے میں ہیں آگے کی گئے بہت
فکر ہے۔ ابھی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے الگ
الگ بیٹھنے کا انتظام کیا جائے اور ایک آدھ سے اساتذہ کا بھی
تکرر ہونا کہ سیکھنا کو سہا ہے تو یہ نہیں سکتے۔“ شہر یا ماسٹر
پاکر ماسٹر آفتاب نے فوراً اسکول کے مسائل بیان کرنا شروع
کر دیے تھے۔ اس سے اس کے اسکول کے لیے غلوں کا

اعزاز ہوتا تھا۔ وہ اتنی اسکول کی ترقی کا دل سے خواہش
مند تھا۔
”آپ کے ساتھی استاد نظر نہیں آ رہے؟“ اساتذہ کے
ذکر پر شہر یا ماسٹر کو خیال آیا تو ماسٹر آفتاب سے اس کے ساتھی بچہ
کے بارے میں پوچھا۔
”اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے، وہ انہیں دیکھنے میں
ہوا ہے۔ وہ ہوتا ہے تو ہم دونوں مل کر آؤ گے آتے ہیں کو
دیکھ لیتے ہیں۔ یہ بڑا بڑا والا کمرہ ہے، وہ ہم دونوں کے ہی
ذرا استعمال ہے۔ ہم لڑکے رہا رہے ہیں۔“ ماسٹر آفتاب
نے شہر یا ماسٹر کو پوچھ کر بتایا۔
”گاؤں میں اسکول کے بارے میں کیا رائے ہے؟“
لوگوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے کا دھقان سے انہیں؟“
”ابھی یہاں کے لوگوں کے ذہن پوری طرح بیدار نہیں
ہوئے ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسکول کی تعلیم کو
اپنے بچوں کے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ خصوصاً لڑکیاں تو
بہت ہی کم داخل ہوتی ہیں یہاں۔ پھر بھی ہم لوگوں نے
کوشش کر کے والدین کو راضی کیا ہے کہ بچوں کو اسکول
بھیجیں۔ بچوں کو کاپیاں، کتابیں اور دیگر چیزیں میں اپنی
طرف سے فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ والدین کے ہاں
کم از کم اخراجات کے بوجھ سے گھبرا کر بچے اسکول بھیجے
سکھائیں۔“ بچے امید ہے کہ اللہ ایک دن ہمارا اسکول
بہت ترقی کرے گا اور گاؤں کے سارے بچے یہاں پڑھتے
آئیں گے۔“ ماسٹر آفتاب پر غور تھا۔
”حکومت نے تو بہت عرصہ ہوا تعلیم مفت کر دی ہے اور
اسکولوں میں بچوں کے لیے مفت کورس اور دوکانے وغیرہ بھی
بھیجے جاتے ہیں۔ کیا آپ کے اسکول کو یہ سب نہیں ملتا؟“
شہر یا ماسٹر آفتاب کی کاپیاں، کتابیں فراہم کرنے والی
یات پر ہونے لگا۔
”ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے اس سلسلے میں
بھی ایک دو درخواستیں بھیجیں تھیں مگر وہ آپ کی نظر سے نہیں
گزر رہی۔“ ماسٹر آفتاب نے جواب دیا تو شہر یا ماسٹر
عبداللہ ان کی طرف ہوا نظر پڑا۔
”بعض درخواستیں درمیان سے بھی غائب کر لی جاتی
ہیں۔ ہو سکتا ہے ماسٹر صاحب کی ان درخواستوں کے ساتھ
بھی ہوا ہو۔“ عبداللہ نے شرمندگی سے جواب دیا۔
”آپ اپنے پاس نوٹ کر لیجئے۔ ہمیں یہ معاملہ بھی
دیکھنا ہو گا۔“ شہر یا ماسٹر نے عبداللہ کو قسم دیا اور پھر دوبارہ
ماسٹر آفتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”گاؤں میں پہلے ہی تو اسکول چلتا تھا۔ اس وقت جن
گھنے نے یہاں سے بڑھنا تھا، کیا انہیں اسکول کے اطراف کے
بچے ان کی مدد نہیں کرتے؟“
”اس وقت تو صورت حال گنواں ہی اچھی تھی۔ دو چار
لڑکے ہی ان میں سے ایسے تھے جنہوں نے پانچویں جماعت
پاس کی۔“ ان میں سے ایک اپنے کسی رشتے دار کے پاس شہر
چلا گیا تھا اور وہاں وہ کریمک کر کے بعد فوج میں بھرتی
ہو گیا۔ باقی بقیں بھی لڑائی میں لگ گئے۔ میں نے کوشش کر
کے ان میں سے دو کو مشکل سے اس بات پر راضی کیا ہے کہ وہ
دل کا امتحان دے دیں۔ اب وہ دو لڑکے شام میں میرے
پاس الگ سے پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ انشاء اللہ اللہ کا
امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے پھر میں انہیں
میں کر رہا تھی کہ ان کی والدہ نے ہمیں باہر سے ہی کوئی
معلمہ بھرتی کرنا پڑے گا۔“ ماسٹر آفتاب نے تفصیل بتائی تو
شہر یا ماسٹر نے ان کے لیے اپنے دل میں پہلے سے زیادہ عزت
محسوس کی۔ اس شخص کی سب کوششیں اس کا کوئی صلہ نہیں دیا
جاسکتا تھا۔ شہر یا ماسٹر کا دل چاہا کہ باہر جا کر گاؤں کے ان
سارے لوگوں کو پکارے جو غریب والے روز پر چھری اٹھار
کے دادا کی قبر پر اپنی ساتھی پوری کر دے۔ اس کے لیے جمع
ہوئے تھے اور چھری اٹھار کے ہاتھ کو بوسا دینے کو کہتے
ہے باعث سعادت کہ وہ بیٹھے تھے۔ وہ ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا
کہ تم جو جیسی کے ہاتھ کو پوجتے ہو اور اپنا اخصا کرتے والے
کے ہاتھ پر بوسا دیتے ہو اس شخص کی عقیدت مند بن جاؤ
جو تمہارا سچا بھروسہ دہنے والا ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ
باتیں جہالت کی کوکھ سے جنم لینے والی اندھی عقیدت کا کچھ
نہیں کاؤ سکتیں۔ (پتہ اس خواہش کو دیکھ کر ماسٹر آفتاب سے
بارے غلوں سے ہوا۔
”میں نے آپ کی ہر بات اچھی طرح سن لی ہے۔ اب
میں کچھ وقت آپ کا ہے۔ آئندہ دو تین دنوں میں یہاں
کھڑے ہوں شہر یا ماسٹر کو جانے گی۔“ بچے اساتذہ کا بھی میں جلد
انتظام کر دوں گا۔ میں آپ اسی گن سے اپنا کام کرتے
رہوں۔“
”جھپک۔ جھپک۔“ جھپک یو دیوی کی سر آہ آپ کا بہت بڑا
امعان ہو گا۔“ ماسٹر آفتاب اس خبر کو نہ خوش ہو گیا۔
”احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ میرا فرض ہے جسے میں
پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ شہر یا ماسٹر نے سنجیدگی سے
ماسٹر آفتاب کی بات کا جواب دیا اور پھر عبداللہ کی طرف
جھپک ہو گیا۔

”عبداللہ ان اساتذہ خان کہاں ہے؟ اس سے کوئی
مہمہ سے پہری گاؤں میں آکر اعلان کر دے تا کہ لوگ
ملاقات کے لیے آسکیں۔“
”ماسٹر خان کو نہیں دیکھ رہا ہے سر تا کہ آپ کے بیٹے
کے لیے من سب جگہ کا انتظام ہو سکے۔“ عبداللہ نے
شہر یا ماسٹر بتایا۔
”کوئی اور جگہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسکول کی
پچھلی ہونے والی ہے۔ آپ لوگ یہاں بھی یہ کام کر سکتے
ہیں۔“ ماسٹر آفتاب نے عبداللہ کی بات سن کر فوراً ہی
پچھلی کی جو شہر یا ماسٹر آفتاب نے اس نے عبداللہ کو باہر بیٹھ
دیا کہ ماسٹر خان کو جگہ تلاش کرنے سے روک کر شہر یا ماسٹر
اسکول میں موجودگی کا اعلان کر دیا جائے تا کہ لوگ بڑا
راست اسے علاقے کے اسے مل کر اپنے مسائل پیش
کر سکیں۔ عبداللہ نے حکم کی بروی کے لیے باہر نکل گیا جبکہ
شہر یا ماسٹر وہیں بیٹھ کر ماسٹر آفتاب کو دیکھنے لگا۔ وہ اتنی دیر سے
سکون سے بیٹھ کر اپنے کام میں مصروف تھا کہ ایک
بندہ آکر اس کے بعد انہیں مشترکہ طور پر چند دعائیہ باتیں
پڑھا رہا تھا۔ پانچ جہت کی اس کا رد ہوا کے بعد اس نے
پچھلی کا ہاتھ دھوا اور اپنے تھکانے والے آواز بلند سلام
کرتے ہوئے باہر نکلے۔ بچوں کی ان آوازوں کے
درمیان شہر یا ماسٹر نے مسجد سے اسے کی آواز کے سلسلے میں
ہوئے والا اعلان بھی سنا۔ اعلان ہونے کے فوراً ہی وہ بعد
عبداللہ ان اور ماسٹر خان واپس لوٹ آئے۔ ماسٹر آفتاب
جو شہر یا ماسٹر سے اجازت لے کر بچوں کے ساتھ ساتھ ہی باہر نکل
گیا تھا ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد واپس آیا تو اس کے
ہاتھ میں ایک ٹرسے بھی جس میں چائے کی پیالیاں اور کھٹ
دے ہوئے تھے۔
”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟“ شہر یا ماسٹر اسے
ٹوکا۔
”آپ نے یہاں آنے کی جو تکلیف کی ہے اس کے
مقابلے میں یہ تکلف کچھ بھی نہیں۔“
”میں ایک بار پھر آپ کو بھی جواب دوں گا کہ یہ
میرے فرض کا حصہ ہے۔“ ماسٹر آفتاب کی بات کے جواب
میں شہر یا ماسٹر نے کہا اور پھر چائے کی پیالیاں اٹھا کر ہونٹوں سے
لائی۔ عبداللہ ان نوٹ کر پھر چائے کا شہر یا ماسٹر آفتاب
کے ساتھ قدرے تعلق ہے۔ وہ جو ایک لڑکی اس کے اندر
نظر آتی تھی، اس کا یہاں کوئی نام و نشان نہیں تھا اور وہ بہت
نرم و نظر آتا تھا۔ عبداللہ ان شہر یا ماسٹر اسے اس اماند کو بھیجنا لگا

تھا۔ وہ لوگ جو اسے پسند آتے تھے، ان کے ساتھ اکل کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا۔

”جائے بہت اچھی بنائی ہے آپ نے۔“

”شہر یار کی تعریف برا ماستر آفتاب بیٹا کہ۔“
ابھی ان لوگوں نے مشکل سے آدمی بیانی چائے ہی پی تھی کہ سر سے ہر تک چادر میں لپیٹ کر ایک لڑکی دھواڑے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ لڑکی کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور وہ گھبرائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے بی بی؟ آپ کو کس سے ملنا ہے؟“
عبداللہ ان فوراً لڑکی سے پوچھا۔

”مجھے اسی صاحب سے ملنا ہے۔“ لڑکی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”فرمائیے کھڑے میں ہوں اسے شہر یار عادل۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“ شہر یار فوراً لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔
لڑکی کسی مشکل میں جھٹلا نظر آئی تھی اور یقیناً شہر یار کی آمد کا اعلان سن کر وہاں آئی تھی۔

”سم۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے لیکن میں اکیلے میں آپ کو اپنا مسئلہ بتاؤں گا۔“ لڑکی نے جواب دیا اور اپنی نقاب سے چھائی ہوئی بڑی آنکھوں میں امید لیے شہر یار کی طرف دیکھنے لگی۔
شہر یار نے دیکھا کہ عبداللہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ شہر یار نے اپنے سر کی جنبش سے اشارہ کیا جسے سمجھتے ہوئے عبداللہ ان نے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔
مشایم خان اور ماستر آفتاب نے بھی اس کی پیروی کی اور سب کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلنے ہی لڑکی نے جھٹ کمرے کا دروازہ ہرایر کیا اور شہر یار کے سامنے اٹکھڑی ہوئی۔

”تقریر رکھیں۔“ شہر یار نے اس سے کہا تو وہ کمری پر بیٹھ گئی۔ اب وہ قدرے مطمئن لگ رہی تھی۔ اس نے چہرے پر سے چادر کا نقاب ہٹا دیا تھا۔ نقاب کے پیچھے سے نمودار ہونے والا اس کا بھولا بھالا اشفاق پھر چند لمحوں کے لیے اسے ہی شہر یار عادل کو سہجوت کر گیا۔ وہ اس چہرے کو اس سے قبل چودھری افتخار کی حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس وقت اس نے اسے صرف ایک نظر ہی دیکھا تھا لیکن پھر بھی اس کی یادداشت میں وہ چہرہ محفوظ تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس چہرے میں کشش محسوس کی تھی اور آج بھی وہ نہ کئے بغیر نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں لڑکے لڑکیوں کے آزادانہ میل ملاقات کو میوہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اس نے تعلیم بھی زیادہ تر مخلوط تعلیمی اداروں میں حاصل کی تھی جہاں ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور طرح واری نظر آتی تھی۔ شہر یار بھی کسی چہرے کو دیکھ کر یوں ساکت نہیں ہوا تھا لیکن اس کم عمر اور سادہ سی لڑکی کے حسن میں کچھ ایسا بات تھی جس نے شہر یار کی نظر کو ہانک دیا تھا۔ لڑکی اس کو خود پر یوں نظر کر جاتے دیکھ کر ڈرا سا کھسکی تو شہر یار کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔

”کی فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ لیکن پلیز پہلے آپ مجھے اپنا نام بتادیں۔“ وہ فوراً ہی اپنے فرض کی طرف پلٹ آیا۔

”میرا نام ماہ بانو ہے اور مجھے چودھری افتخار عالم شاہ کے چنگل سے بچنے کے لیے آپ کی مدد درکار ہے۔“ لڑکی کی بات سن کر شہر یار بری طرح چٹکا۔ ابھی وہ اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کر سکا تھا کہ دروازہ زور سے کھلا اور ماستر آفتاب تیزی سے اندر آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

”چودھری افتخار کی بیب اسی طرف آرہی ہے۔ یقیناً سمجھ سے ہونے والے اعلان کی اطلاع ان تک پہنچ گئی ہے اور اب وہ آپ سے ملنے یہاں آرہے ہیں۔“ ماستر آفتاب کی دی ہوئی اطلاع نے کسی خون آشام بلا کی طرح ماہ بانو کے چہرے کا سارا خون چس کر بل میں اسے تر و کر ڈالا۔ وہ جس سے بچنے کے لیے یہاں آئی تھی وہ خود یہاں آ رہا تھا۔ چند گریسیوں کے سوا ہر طرح کے فریجیج سے عاری اس خالی کمرے میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اوپر دیوار میں ایک روشن دان نظر آ رہا تھا لیکن اس میں بھی سلاخیں موجود تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتی تو چودھری سے سامنا لازمی تھا۔ اسے کچھ بھٹائی نہیں دے رہا تھا کہ اب کہاں جائے؟ خود شہر یار بھی پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس لڑکی ماہ بانو کی یہاں آمد کا مقصد سن چکا تھا۔ پوری بات تو اس کے علم میں نہیں آئی تھی لیکن یہ سب تھا کہ اسے چودھری سے کوئی شدید قسم کا خطرہ درپیش ہے اور اس صورت حال میں چودھری افتخار کا ماہ بانو کو یہاں دیکھنا اور بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ اسے یہاں دیکھتے ہی سمجھ جاتا کہ وہ اس کے خلاف مدد مانگنے شہر یار کے پاس آئی ہے۔ یعنی ماہ بانو اس وقت پوری طرح خطرے میں تھیں۔
”چودھری ہوتی تھی لیکن شہر یار بھی کیا کر سکتا تھا؟ نہ تو ماہ بانو کو چھپانے کی کوئی صورت تھی اور نہ ہی چودھری افتخار کو اندر آنے سے روکا جاسکتا تھا۔“

جاری ہے

گرداب

تیسری قسط

پیارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بالائی سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھر پور رخ ہیں۔ بالائی طبقہ کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح تہیہ کرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں۔ روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔۔۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پیسہ ہوتا ہے جو ہر مہمانے مشرے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرتے محبوب کا انتخاب کرتی ہے۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے۔۔۔ سب قسمت کی باتیں اور قدر کی چالیں ہیں۔۔۔ کہی بازی پلٹ بھی جاتی ہے گزرا وقت لوٹ تو نہیں سدا مگر مقرر ساتھ رہ جاتا ہے۔۔۔ اس وقت تک پیلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے جرم، فساد، شامی، جاگیرداری اور بیمار کے محور کے گرد گھومتا اور فاشیوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ



لکھے بہت تیزی سے بیت رہے تھے۔ چودھری افتخار حسنی بھی نے یہاں کچھ سکا تھا۔ وہ کچھ جاتا تو ماہ بانو کے لیے بہت برا ہوتا۔ وہ اپنے بھائی کی آخری امید کے طور پر اس نے اسے ہی تنگ پہنچا تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے ہی براؤ راست چودھری سے اس کے لیے ٹھہر گئی ہے۔ بہتر یہی تھا کہ اس کا چودھری سے سامان بیوہ کو کوئی پانے قرار بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

”ہائیز سرا جیو کریں اگر چہ چودھری نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو بہت برا ہو گا۔“ ماہ بانو کو اور کچھ بھائی نہیں دیا تو شہریار سے وعدہ مانگنے کی فکر شہریار خود ابھی طرح پورے کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔ یہاں کوئی بھی ایسی شے موجود نہیں تھی جس کے پیچھے ماہ بانو چھپا جاسکتا۔

”آپ ادھر آ جائیں۔“ ہائیز آفتاب جو چودھری افتخار

کے آئے کی اطلاع دینے کے بعد ماہ بانو کو لڑا ہوا تھا۔ ماہ بانو کا بھائی کو نورانی مستعد ہو گیا تھا اس نے خدے سیاہ کے قریب جا کر اس کو پچھلے سرے سے پکڑ کر اٹھایا۔ تنہا ماہ بانو شہریار کی طرف پر لپکی نہیں تھا۔ اس کے صرف اوپر ہی بڑے کوا سکر کی وہ سے دیوار میں فٹ کیا گیا تھا۔ اس لیے جب ہائیز آفتاب نے پچھلے سرے کو اٹھایا تو وہ اچھا غصا اوپر اٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہونے سے دیوار میں سو جو کھڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کھڑکی کو دیکھ کر ماہ بانو کے چہرے پر زلزلہ کی گہر زلزلہ۔ شہریار بھی کھڑکی دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا ہتھکڑیاں دیا۔ دوسری طرف ایک۔ ایک کھڑکی آ رہا تھا جو کھڑکی طور پر ہائیز آفتاب اور اس کے رانگی کچھ کے تعریف میں تھا۔ کھڑکی زمین سے قدر سے پلٹتی پر تھی۔ شہریار نے، وہاں کو سہارا دیا اور وہ اس کے سہارے سے دوسری طرف گزری۔ شہریار نے پھرتی سے کھڑکی دوبارہ دیکھ کر اس کے کانوں



نے باہر چپ رکھنے کی آواز سن لی تھی۔ ماسٹر آفتاب نے محمد سیاد کے منہ سے کچھ اسی طرح سے دوا دوا پر نکال دیا۔ باہر تو کوئلہ کار کا رات فراہم کرنے والی کوئلہ کا قلاب ہو گیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی، ماسٹر آفتاب نے اسے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی چودھری افتخار اپنے غشی اللہ رکھا کے ساتھ کھڑا تھا۔

”السلام علیکم چودھری صاحب!“ ماسٹر آفتاب نے چودھری کو سلام کیا جسے ان کی کمرے کے دو کمرے میں داخل ہو گیا۔ ماسٹر آفتاب نے مناسب کھانا اور خود باہر چلا جائے۔ ”آئیے آئیے چودھری صاحب! آپ نے کیوں زحمت کی، میں خود یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی حوصلی پر ملاقات کے لیے آتا۔“ شہریار نے تپاک سے چودھری افتخار کا استقبال کیا۔

”اصولاً تو آپ کو پہلے وہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ میرا بار آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے ہمارے یہاں میں مگر آپ نے نہ جانے کیوں ہماری حوصلی چھوڑ کر اس پیچھے اسکو کو حرات دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ مجھے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کارندہ سے اطلاع ملی کہ اسے ہی صاحب میرا بار آئے ہوئے ہیں اور سب سے پہلی آواز اعلان کر دیا ہے۔ میں فوراً دوڑا ہوا آیا کہ جانے ہم سے آپ کو کیا شکایت ہو گئی ہے جو آپ نے میرا بار آئے کے باوجود وہاں طرف آنے پر تہمتیں لگایا۔“ چودھری نے کھلی آواز سے جواب دیا۔

”اسکی تو کوئی بات نہیں ہے چودھری صاحب! آپ سے ہر ایک شکایت ہے میں نے تو صرف اس لیے حوصلی کا رخ نہیں کیا کہ پہلے گاؤں والوں سے مل کر ان کی شکایات سن لوں پھر بعد میں امتحان سے آپ سے ملاقات کروں گا لیکن یہ آپ کا ظلم ہے کہ گاؤں کے کسی فرد کے ہتھیارے سے کل ہی آپ یہاں بھی گئے۔“ چودھری افتخار کی شکایت کے جواب میں شہریار نے خوش گواری سے جواب دیا۔

”گاؤں کا کوئی بندہ اپنی شکایت لے کر آپ کے پاس آئے، یہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔ ان لوگوں کو ہریں سے عادت ہے کہ ہر اپنے مسئلے میں لے کر حوصلی آتے ہیں اور وہاں ان کے مسئلے حل ہی ہو جاتے ہیں لیکن یہ ماسٹر آفتاب باہر سے آیا ہوا بندہ ہے اس لیے حوصلی کا رخ نہیں کرتا۔ بڑے گھمے بھمے بندوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ کسی علاقے اور ماحول کی روایات کو سمجھ کر بغیر اپنی عقل کے مطابق کام کرتا زیادہ پتہ کرتے ہیں۔ اسی بندہ کمرے میں بھی وہ بغیر آپ سے میرے خلاف ہی شکایت کر رہا ہو گا۔“ ماسٹر

آفتاب کے لیے چودھری افتخار کے لہجے میں واضح ناراضگی محسوس ہو رہی تھی۔

”اسکی کوئی بات نہیں ہے چودھری صاحب! ماسٹر آفتاب کو میں نے خود یہاں روکھا تھا۔ اصل میں، میں اس ساتھ والی زمین پر اسکول کے لیے مزید کمرے تعمیر کروانا شروع کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ پہلے ماسٹر آفتاب سے اسکول میں بچوں کا امداد و مشاغل معلوم کر لوں پھر کام شروع کر دوں۔ میں اسی سلسلے میں میری اس سے گفتگو ہو رہی تھی۔“ شہریار نے نرمی سے ماسٹر آفتاب کی صفائی پیش کی۔

”میرے خیال میں تو اسکول کے لیے مزید کمرے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گاؤں میں بچوں کو تعلیم دلانے کا رجحان نہیں ہے۔ میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کے لیے تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ نسلوں سے کھیتی باڑی کرتے آ رہے ہیں۔ ان کی روزی اور روزگار کھیتی باڑی سے وابستہ ہے اور اس بھر کو کھیتنے کے لیے انہیں گاؤں کے اس اسکول میں آنے کے بجائے کھیتوں میں اپنے بڑوں کے ساتھ رہ کر کام کھیتنے کی ضرورت ہے۔“ چودھری نے ناگواری سے شہریار کی بات کا جواب دیا۔

”مجھے آپ کی بات سے زیادہ اختلاف نہیں چودھری صاحب! لیکن تعلیم کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ تعلیم صرف روزگار کے حصول کے لیے ہی نہیں، شعور کے لیے داری کے لیے بھی حاصل کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بچے اگر تعلیم حاصل کر لیں گے تو زیادہ بہتر طریقوں سے اپنے آباء اجداد کی زمینوں کو آباد کرنے کی سوجھیں گے۔ جدید دور کے تقاضے نبھانے کے لیے ہمارے کاشت کاروں کا بھی جدید تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زرعی پودے زمینوں کا قیام کیوں ممکن نہیں آتا؟ حکومت نے زرعی پودے زمینوں اسی لیے تو بنائے ہیں کہ لوگ وہاں سے پڑھ لکھ کر اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر بنیاد پر لوہا حاصل کریں۔“ شہریار نے چودھری افتخار کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”آپ اس بات کو نہیں سمجھتے اے ہی صاحب! پڑھ لکھ کر یہ لڑکے اپنی زمینوں پر کام نہ پتہ نہیں کرتے بلکہ میری دانی تو گری کی تلاش میں شہر چلے جاتے ہیں۔“ چودھری نے شہریار کی مخالفت کی۔

”میرا نہیں خیال کہ گاؤں کے تمام کے تمام لڑکے تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہاں سے شہروں کا رخ کریں گے۔ شہر آتی بڑی تعداد میں دیہاتوں سے آئے والے تمام افراد کو

ملا کر فراہم نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کو اپنی جگہ پر رہ کر اپنی ہی زمینوں سے روزی حاصل کرنی ہوگی۔ اگر چند فیصد لوگ شہروں میں منتقل ہو سکیں جاتے ہیں تو اس سے کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔“

”میں جانتا ہوں، آپ میری بات نہیں سمجھ سکتے گے کیونکہ آپ اس ماحول کو ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ بہر حال، میں آپ سے اسکول کے مسئلے پر بحث کرنے آیا ہوں میں ہوں مگر بات کھل ہی آتی ہے تو میں آپ کو یہ اطلاع دے دوں کہ اسکول کے ساتھ والی زمین پر میں نے سوچا کہ کھیتی باڑی والوں کو اپنا چودھری ٹھکانے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ جلد یہاں آکر اپنا کام شروع کر دیں گے۔“ چودھری افتخار کی بات سن کر شہریار کو احساس ہوا کہ اس نے کتنی گہری چال چلی تھی۔ وہ شہریار پر یہ احسان پہلے ہی جتنا تھا کہ وہ اس کے کہنے پر اپنے علاقے کی بہتری اور ترقی کے لیے یہاں ماحول میں سروس شروع کر دئے والا ہے۔ اب اس نے اپنا دھڑا کارڈ بھی شہر لے کر لیا۔ وہ اسکول کے ساتھ والی زمین پر سوچا کہ کھیتی باڑی کا یہ ٹھکانہ اس مسئلے کا مستقبل حل کھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسکول میں توسیع کی دوا دوا کوششیں نہ کی جاسکتے۔ چودھری افتخار کی اس عمارتی پر شہریار کے لیے اپنے منہ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

”نہیں چودھری صاحب! اسکول کے سلسلے میں، میں اوپر سے منتظر رہنے چکا ہوں۔ یہ زمین کو خیریت کی حکمت ہے اس لیے اسے کس کام میں لایا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا حکومت کا کام ہے۔ اور فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ زمین آپ کو یہ آؤ ضرور کر سکتا ہوں کہ اسکول کے لیے کمرے تعمیر ہوتے کے بعد جو جگہ باقی رہی جائے آپ وہاں سوچ سکتے ہیں والوں کو کام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔“

”نہیں جیسا آپ کہیں ایسا ہی ہو جائے گا۔ آؤ دونوں ہی کام میرے گاؤں کی بہتری کے لیے ہوتے ہیں۔ مجھے دونوں میں سے کسی پر بھی کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ شہریار کا خیال تھا کہ اس کا کہنا چودھری افتخار کو ناگوار نہ رہے گا لیکن اس نے تو ذرا ہی ہنسنے پر ہی اپنا حوالہ دینا شروع کر دیا۔ شہریار کی بات کی تائید کر رہا تھا جیسے اسے بھی اپنی اسکول کے معاملے میں کوئی اختلاف نہ رہا ہو۔ اس سے اتنا اذکی اس نے تہہ نہ کی بھر شہریار کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے امداد کو بددستور رکھ کر کھاتا۔ پھر وہ بھی ایک جوانی مگر اہمیت پتہ سے پرہیز کر چودھری افتخار کا شہر پہنچا۔ ادا کرتے تھے۔

”نہیں مجر بہ معاملہ تو ہے ہو گیا۔ اب آپ میرے

ساتھ حوصلی نہیں، اتنی دیر میں آپ یہ امداد تو کر ہی گئے ہوں گے گاؤں کا کوئی فرد اپنی شکایت لے کر آپ کے پاس نہیں آئے گا۔“

وہ اتنی دیر میں واقعی امداد کر چکا تھا کہ گاؤں کا کوئی فرد اس طرف کا رخ نہیں کرتا۔ شہریار ایسا چودھری کے دہانے کے ہوتے تھا۔ لوگ اس سے اتنا ڈرتے تھے کہ شہریار کے پاس آکر اپنی کوئی شکایت نوٹ کر دینے کی بات نہیں رکھتے تھے لیکن شہریار نے اسے کمرے میں ایک لڑکی سوہی جی جو نہ صرف یہاں آئی تھی بلکہ صاف طور پر یہ بھی کہا تھا کہ اسے چودھری سے خلع ہے۔ شہریار کے لیے اس لڑکی کی شکایت سننا ضروری تھا جس نے چودھری کو بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ یک دم میں اسے ایک درمیانی راہ ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آپ کا کھم سر آج بھی چودھری صاحب! میں آپ کو اگر میری میرا کرنی ہے تو ذرا دیر اور صبر کرنا پڑے گی۔ اصل میں، میں یہاں منتظر سے اور سے پہنچا تھا۔ دفتر میں اس وقت کی کام آئیے ہیں، ہمیں فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے یہاں رکھنے کی صورت میں میرا بی بی عبد اللہ ان دفتر چا کر وہ دم دھولے۔ اب ظاہر ہے عبد اللہ ان یہاں سے جاتے گا تو میں اپنی گاڑی اور ذرا دیر سے محروم ہو جاؤں گا اس لیے آپ کو یہ زحمت کرنی ہو گی کہ مجھے اپنی گاڑی سے میرے دفتر واپس چھوڑا دیں۔“

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ بے شک اپنی گاڑی واپس لے سکتے ہیں۔ یہاں ہم موجود ہیں آپ کی خدمت کے لیے۔“ چودھری افتخار کا جواب حسب توقع تھا۔ اس جواب کے بعد شہریار نے سڑ پر وہاں رکنا غیر ضروری سمجھا اور باہر آکر عبد اللہ ان کو سرگوشی میں ہدایت دیتے کے بعد چودھری کے ساتھ اس کی حوصلی روانہ ہو گیا۔ کوئی تھک کر دانی خاطر مارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

چودھری افتخار شہریار کو اپنے آباء اجداد کی برتری، بہادری اور تعلقات سے متعلق حکایتیں سناتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد انہیں کھانا کھنے کی اطلاع ملی تھی۔ شہریار چودھری افتخار کے ساتھ اس کے شاندار ڈائننگ روم میں آیا۔ صرف عرس والے دن حوصلی میں مہمانوں کو فوری دست خوان کی بڑی کھانا کا انتظام کیا گیا تھا اور اپنی شاید مہمانوں کی بڑی تعداد اور موقع کی مناسبت کے اعتبار سے جو اندازہ ہو رہی تھا ڈائننگ روم کا وہ دھڑ دھڑا چودھری افتخار کے ساتھ تھا۔ اس سے پہلے شہریار نے جانے کے موٹے پر بھی وہاں ڈائننگ

روم میں آچکا تھا۔ آج بھی ڈانگھ نعل پر لذت کام و دین کے لیے بہت سے لوازمات موجود تھے۔ چوہری کے ہمسار پر وہ اس کی وسطوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کھانا اسی اختتام کو نہیں پہنچا تھا کہ منی اللہ رکھا کچھ پریشان سا ڈانگھ روم میں داخل ہوا۔

”کیا بات ہے منی؟“ چوہری نے ہمواری سے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”چوہری صاحب اغیارٹھ آیا ہے۔“ منشی اللہ رکھا نے آہستہ سے بتایا۔

”کیوں؟“ منشی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ دواؤں کی گھر وال یہاں سے گئے تھے۔ اگر کوئی مسئلہ ہے، انہیں کوئی کمی لگ رہی ہے تو فرما سناے کو نفاذ ہو۔ منشی کیوں ڈانگھ کر رہے ہو؟“ چوہری کا کچھ بھرا دماغی سخت ہو گیا۔

”مسئلہ کچھ اور ہے چوہری صاحب۔“ منشی سہے ہوئے کچھ میں بیٹھا اور پھر چوہری افکار کے بالکل قریب جا کر اسے سرگوشی میں کہہ گیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم سب طرف اپنے بندے دوڑا دو۔ بس کے اڑے سے معلوم کرو اور اگر کچھ معلوم نہ ہو تو غیارٹھ سے فیصل آباد کا پتا لگا کر ڈھرائی بھیجوا۔“ اسے اگر یہاں سے نکلے میں کا پانی بوجھتی تو زیادہ سے زیادہ فیصل آباد تک جا سکتی ہے۔“ منشی کی سرگوشی کے جواب میں چوہری افکار غضب ناک ہو کر ہدایات دینے لگا۔ منشی اس کی ہدایات پر سر ہلاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ خود چوہری افکار کا یہ عالم تھا کہ پورا چہرہ فٹان کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنے ساتھ رکھے کھانے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

”خیریت تو ہے چوہری صاحب! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟“ شہر یار نے کچھ جھجھکے ہوئے منشی کو دیکھا۔

”خیریت ہی ہوگی۔ چوہری افکار کو دھوکا دے کر نکل جاتا اتنا آسان نہیں ہے۔“ اس کا بوجھ کسی ساپ کی پٹکار سے مشابہ تھا۔

”اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“ شہر یار نے پیشکش کی۔

”شہر یار! اسی صاحب! معاملہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے۔ بہر حال، میں اس سے سخت لوں گا۔“ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مشکل سے خود پر ضبط کر کے بیٹھا ہے۔ شہر یار نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور اپنی بیٹھ میں باقی رہ جانے والا کھانا جلدی جلدی ختم کر کے کھانے سے ہاتھ ہٹا دیا۔

لیا۔ ڈانگھ روم سے باہر نکلنے کے بعد اس نے چوہری افکار سے واپسی کی درخواست کی۔ چوہری شاید خود بھی سنی پڑتا تھا اس لیے اس نے شہر یار کے مزید کہنے پر اصرار نہیں کیا اور فوری طور پر اس کی واپسی کے لیے گاڑی مہیا کر دی۔

”ہاں عبداللہ! کیا بتایا اس لڑکی نے اپنے بارے میں؟“ شہر یار نے واپس پہنچنے کے بعد عبداللہ ان سے سب سے پہلے ماہ بانو کے متعلق ہی استفسار کیا۔

”اس نے مجھے زیادہ تفصیلات نہیں بتائیں۔“ اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے چوہری افکار کی طرف سے شدید خطرہ درپیش ہے اور وہ دار سے پاس اس لیے آئی ہے کہ کم گاڑی سے نکلے میں اس کی مدد کریں۔ وہ اپنا سفری بیگ بھی ساتھ لے کر آئی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ زیادہ اہم چیز آباد میں نہ کون اس لیے میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ یہاں لے کر آ گیا ہوں۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اسے فیصل آباد جانے والی کسی ٹرک میں مواد کر دوں لیکن میں آپ کی مرضی جانے بغیر اس کی پٹرول پمپ پر نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے روک لیا ہے۔“ عبداللہ ان نے شہر یار کو بتایا۔

”تم نے بہت اچھا کیا۔ چوہری افکار کو اپنی طرح اندازہ تھا کہ لڑکی چاہے دار سے نکلے کے بعد فیصل آباد کا کسی رخ کرنے کی کوشش کرے گی۔ کچھ دیر پہلے اس نے میرے سامنے ہی اپنے بندوں کو فیصل آباد جانے کا حکم دیا ہے۔“ شہر یار نے کچھ سوچا انداز میں عبداللہ ان سے کہا۔ چوہری افکار کی دھم پر غور کی جانے سے اسے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اللہ کا فیصلہ سہی، چوہری افکار کے خلاف یہ دھم آئے والی لڑکی کی اس بات کی تصدیق ضرور ہوئی تھی کہ وہ چوہری کی طرف سے خطرے کا شکار ہے۔

”لڑکی کہاں ہے عبداللہ؟“ میں اس سے مانا چاہتا ہوں۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہ اسے تمہارے ساتھ جہاں آتے ہوئے تو کسی سے نہیں دیکھا؟“

”نفسرا میرا آدمی ماسٹر آف آف اور یہاں میرے اور مشیر برم خان کے علاوہ کسی کو لڑکی کے بارے میں علم نہیں۔ گیت پر چوکیدار نے اگر دیکھا بھی ہو گا تو یہ اندازہ نہیں کر پایا ہو گا کہ وہ اسے ساتھ آئے والی لڑکی کون ہے۔“ شہر یار کے سوال پر عبداللہ ان نے اسے تسلی دی اور خود باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو ماہ بانو اس کے ساتھ تھی۔ وہ اب بھی سنی ہوئی لگ رہی تھی اور اس نے چادر کو بہت مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔

”جینمو۔“ شہر یار نے تیزی سے استہ اسے سامنے رکھی کرکے پرچنے کا حکم دیا۔ وہ دھچکتی ہوئی اس اعزاز سے کرکے پرچ گئی کہ گنگناتا گنگی کی گنگنات پر کھارہل جانے کی۔

”آرام سے جینمو اور مجھے تفصیل سے اپنا مسئلہ بتاؤ۔ تم جو کچھ بتاؤ گی، وہ میرے علاوہ کسی اور کے علم میں نہیں آئے گا اور میں کوشش کروں گا کہ تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے۔“ شہر یار نے اس کا اعزاز دیکھتے ہوئے تیزی سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ شہر یار کی بات سے اشارہ ہاتھ سے عبداللہ ان کمرے سے باہر نکل گیا۔

”ہاں اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ شہر یار نے ایک بار پھر اصرار کیا۔

”چوہری افکار بہت بڑی فطرت کا آدمی ہے۔ میں آپ سے بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ اس سے بچا کر مجھے فیصل آباد میرے گھر پہنچا دیں۔ یہ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔“

”تو کیا تم چاہو آدھی رات بے وفائی میں ہو؟“ شہر یار، ماہ بانو کی بات سن کر چونکا۔

”نہیں۔“ ماہ بانو نے منشی میں سر ملایا اور بولی۔ ”میں فیصل آباد میں رہتی ہوں۔ میرا پیشہ اپنی نہیں کی شادی میں حرکت کے لیے آئی تھی۔ میرے اپنے شادی کے بعد ذہنی مجھے روک لیا کہ وہ چادر تک رہاں کا ہاتھ بندھو پھر میں خود نہیں فیصل آباد واپس چھوڑ آؤں گا۔ میں چوہری افکار کے خوف سے کتنا نہیں چاہتی تھی لیکن سب کے اصرار پر دکاندار اور میرا خوف صحیح تھا۔ چوہری نے سوچ دیکھ کر مجھے اپنے کسی کوشش شروع کر دی اور اب تو میرے اپنے ماں باپ بھی مجھے اس بدینیت انسان کے حوالے کرنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ آپ بس مجھے فیصل آباد پہنچا دیں۔ وہاں سے آپ اور ماہ میرے ساتھ یہ علم نہیں ہوتے رہیں گے۔“ منشی ہوتی آواز میں اپنا مسئلہ بتاتے ہوئے ماہ بانو نے ایک بار پھر شہر یار سے اصرار کیا۔

”جینمو، تم بالکل شروع سے اور ذرا تفصیل سے مجھے ساری بات بتاؤ۔ تمہاری باتوں سے میں پوری طرح کچھ نہیں چارہا ہوں کہ فیصل آباد اور چھرا آدمی سے اصل میں کون سی جگہ تمہارے ماں باپ رہتے ہیں اور تم پہلے سے ہی چوہری افکار سے کیوں خوف زدہ تھیں؟“ شہر یار نے ماہ بانو کے مخاطب پر کچھ دھڑکتے ہوئے اور زبردستی کیا۔

”پوری طرح میری بات سمجھنے کے لیے آپ کو میرا ایک گرامر مختصر دے گا۔“ ماہ بانو نے اس کی طرف دیکھتے

ہوئے آہستہ آہستہ اسے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ ”آج چوہری نے میرے ماں باپ کو بھولی بھولی ہوا تھا۔ وہ لوگ میری بہن زہرا کو میری عمرانی پر چھوڑ کر گئے تھے۔ زہرا نے میری حالت دیکھی تو وہ بھی اور بھی گئی کہ کوئی مجھے قتل خانے میں بند کر کے یہاں سے نکل جائے۔ میں کہہ دوں گی کہ میں نہا نے گئی تھی، مجھے معلوم نہیں ہوا کہ کب ماہ بانو باہر سے قتل خانے کی کنڈی لگا کر گھر سے نکل گئی۔ میں نے کہن کے کہے پر عمل کیا۔ ابھی میں گھر سے نکلی ہی تھی کہ مسجد سے اعلان ہوتا تھا کہ اسی صاحب گاڑی میں موجود ہیں، اگر گاڑی کے کسی فرد کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو وہ اسکول آکر اسی صاحب سے مل سکتا ہے۔ اس اعلان سن کر مجھے خیال آیا کہ جو اسے ہی انڈر گاڑیوں آکر گاڑیوں والوں کے مسائل حل میں دیکھی رکھتا ہے وہ یقیناً اچھا انسان ہوگا۔ بس اسی لیے میں اسکول نکلی تھی۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہن کے اڑے پر پہنچنے سے پہلے ہی کوئی مجھے راستے میں ہی نہ بھر لے، اس لیے آپ کی مدد لینا مناسب معلوم ہوا۔ میں نے آپ کے بی بی اس سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے فیصل آباد جانے والی ٹرک میں، بغداد میں لیکن جانے کیوں انہوں نے میری بات نہیں سنی اور مجھے یہاں لے آئے۔“ ماہ بانو نے شہر یار کے کہنے پر ذرا تفصیل سے سارا معاملہ بیان کرتے ہوئے آخر میں شہو کیا۔ ”میرا بی بی اسے ایک مشکل مند اور تجربہ کار آدمی ہے۔ اس نے بہت اچھا کیا کہ کہن میں اسے نہیں لے گیا۔ چوہری افکار نے سب سے پہلے اپنے بندوں کو اس طرف دوڑایا تھا۔ اس نے فیصل آباد میری بی بی سے بے دروازہ کر دیے ہیں تاکہ تم بھی یہی وہاں پہنچو۔ ان کی گرفت میں آ جاؤ۔“

”آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“ ماہ بانو نے شہر یار کی فراہم کردہ معلومات پر متحیر ہو کر پوچھا۔

”اللہ ہی سے چوہری افکار نے سارے احکامات میرے سامنے ہی دیے تھے۔ اس کے منشی نے میری وہاں موجودگی کے دوران کسی غیارٹھ نہ تھی کے آنے کی اطلاع دے کر چیکے سے چوہری کو کچھ بتایا تھا۔ یقیناً اس نے تمہارے قاتل ہونے کی اطلاع ہی دی تھی کیونکہ چوہری ایک دم بہت فحش سے لگا تھا اور پھر اس نے منشی کو بس اڑے اور فیصل آباد کی طرف بندے دوڑانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اس وقت ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ سارے احکامات تمہارے تسلط میں دینے جارہے ہیں۔ اب تم سے بات کرنے کے بعد تو مجھے ایک فیصلہ بھی اپنے اندازے کی درستی پر شک نہیں رہا ہے۔“ شہر یار نے ماہ بانو کو جواب دیا۔

"اف خدا میں اب کہاں جاؤں گی؟ لیصل آباد کے سوا تو میرا دوسرا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں۔" مادہاؤ نے پریشان ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ وہ اپنے اس پریشان روپ میں بھی بہت دلکش لگتھ رہی تھی۔ شہریار نے اسے ہلکی ہانپو پھر ہی انکار کے دادا کے عرس کے مومنے پر دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر قدرے بے زاری کے باوجود تروتازگی اور شادابی تھی۔ وہ تروتازگی اور شادابی آج مجھ کو مانتھم آتی تھی۔ شاید مسلسل زہر پش اور خوف کی وجہ سے ایسا ہوا تھا اس کے باوجود شہریار خود سے اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ اب بھی بے حد قاطع قویہ ہے۔ چودھری انکار یوں باہر سے تو اس کے لیے پاگل نہیں ہوا تھا کہ اپنی ابتدائی کوششوں کی ناکامی کے بعد سید سے سید سے شادی کی بات پر آگیا تھا۔ حیثیت کے اعتبار سے تو مادہاؤ چودھری کے ہاں شک نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن اس کا سن اتنا بھر پر تھا کہ چودھری نے اپنے سے بے حد چنگی حیثیت کے خاندان میں رشتہ جوڑنا منظور کر لیا تھا۔ اس یس نے چودھری کی شخصیت کا ایک اور رنگ شہریار پر ظاہر کر دیا تھا۔ وہ شخص اپنے کھجیوں کے معاشی اور معاشرتی اجماع کے ساتھ ساتھ ان کی عزتوں کا بھی دشمن تھا۔ عسکرانی کے زعم و دولت کے نئے اور بوسے سے اسے اس بری طرح بکھر رہا تھا کہ وہ دو دو چان رکھنے کے باوجود اس پر خود سے بے حد چھوٹی اس بڑی کو حاصل کرنے کا جتن سوار ہو گیا تھا۔ شہریار دالیں سارے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مادہاؤ نے اس کی خاموشی پر گھبرا کر پاؤں کا تھوڑا سا شروع کر دیا۔ اس کی سسکیوں کی آواز سن کر شہریار اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمت رو۔ تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ اب تک تم نے سارے حالات کو بہت بہادری سے منہ کیا ہے۔ اب بھی بہت سے کام لو۔ شکایت کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو آٹھوں کی نہیں بلکہ بہت کی ضرورت ہوتی ہے۔" شہریار کو اس کا رویہ عجیب کر رہا تھا اس لیے وہ اسے تسلیم کرنے لگا۔

اس کی تسلیوں پر مادہاؤ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور چادر کے پلے سے زخموں پر دھمکے آنے والے آنسو صاف کرنے لگی۔ شہریار نے اپنی جھلی پر دھکا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ مادہاؤ نے گلاس تھام لیا اور وہ مچھوٹ پانی پینے کے بعد گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔ اب وہ خود کو مستحیل بنائی تھی لیکن غم کی آنسوؤں میں اتر آنے والے سرخ زوروں نے اس کی آنسوؤں کو اب بھی پرکشش بنا دیا تھا۔ شہریار نے اس کی آنسوؤں کی کشش سے نظریں جھانکے

ہوئے انہر کام پر عبد اللہ ان کو اندر آنے کا حکم دیا۔

"عبد اللہ ان! فوری طور پر اس ٹرکی کے کسی شخص کو مجھ رہنے کا بندوبست کرنا ہے۔ کسی ایسی جگہ جہاں یہ چند دن خاموشی سے رہ سکے پھر میں دیکھوں گا کہ اس مسئلے میں کیا کیا جاسکتے ہیں۔ فی الحال ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ اس کے لیے کسی محفوظ مقام کی فراہمی ہے۔"

عبد اللہ ان کے اندر آتے ہی شہریار نے اس سے کہا۔

"میں خود بھی اس معاملے پر سوچتا رہا ہوں سزا کر اس کہیں میں چودھری انکار ملوث نہیں ہونے کو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن چودھری کی وجہ سے میں بہت احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ میرے خیال میں تو ہمارے علاقے میں کوئی ایسا جہان کھڑا کے لیے مناسب نہیں رہے گی۔ اس پر سے مسئلے میں چودھری کا اصرار خاصا اثر مروج ہے۔ اس کے بندے آرام سے ان صاحب کو کاش کر لیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم انہیں فوری طور پر لاہور کے کسی دارالامان میں منتقل کر دیں۔ بعد میں ہی ان کی اور میری ک حد سے اس معاملے کو اٹھایا جاسکتا ہے۔"

عبد اللہ ان نے شہریار کو مشورہ دیا تو اسے مناسب معلوم ہوا۔

"تمک ہے عبد اللہ ان! ایسا ہی کر لیتے ہیں لیکن اسے لاہور گس کے ساتھ بھیجاؤ گے؟ اس کام کے لیے مجھے تو کسی اعتماد کے بندے کا انتخاب کرنا ہوگا۔"

"مشریہ خان ہے سزا اس پر آپ آگے نہیں بند کر کے اعتماد کر سکتے ہیں۔ میں اس کو صورت حال ابھی طرح سمجھا دوں گا۔ ساتھ ہی دارالامان کی انتظامیہ کے نام ایک خط بھی لکھ دوں گا کہ وہ لوگ ان محترمی کو جو دہلی کو میں لاؤں ہر ضیہ راز میں رہیں۔" شہریار کی تشویش کے جواب میں عبد اللہ ان نے اسے تسلی دی۔

"تمک ہے۔ تم جس طرح مناسب سمجھو اس میں وینڈل کرلو۔" شہریار نے عبد اللہ ان کو جواب دیا۔

"آئیے کھڑے۔" عبد اللہ ان نے مادہاؤ کو ہاتھ دیا اور چمکاتی ہوئی اس کے پیچھے گھر سے باہر نکلی۔ اس کے باہر نکلے ہی شہریار کو گھر سے کے بے حد غالی ہونے کا احساس ہوا لیکن اس نے فوراً ہی اس احساس کو اپنے دماغ سے جھٹکتے ہوئے ایک ٹاکس کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی۔

نہایت مجھ، چودھری انکار کے سامنے کھڑا مقرر کا پتہ رہا تھا۔ چودھری کے چہرے سے دور آنسوؤں سے بھلتا غضب اس کے احوال خط کیے دے رہا تھا۔

"تم نے میں سرکار! میرا کوئی قصور نہیں۔ میں او

دراں تو اسے گھر چھوڑ کر آپ کے گھر چوٹی آئے تھے۔ وہ مجھے سے کیسے ٹھک رہا تھی، میں جڑ نہیں۔ میں تو گھر جا کر ہی معلوم ہوا کہ میں اب سے پہلے آپ کو اطلاع کرنے والا ہوا آیا۔" سیکھائی آواز میں اس نے بڑی مشکل سے اپنی غالی پیش کی۔

"زیادہ معلوم نہ بن غیث محمد اتیرا کام تھا کہ کوئی ایسی جگہ میں ملے۔ میں وہاں تو اس میں اس کی غفلت سے پہچان لیا تھا تو اس کا پتہ ہو کر کیسے نہیں جان سکا کہ تیری دہلی کی آخری کھوڑی کی طرح ہے جسے گمراہ ڈال کر رکھنا ضروری ہے۔ تو نے اپنی دے داری پہچانی ہی نہیں۔ مجھے اس کے کہ چوٹی آتے ہوئے اس کا مجھ بندہ دست کر کے آتا تو الٹا مجھ پر احسان دینے بیٹھتا ہے کہ میرے علاوہ ہے تو دور چیری محمد! یہاں آئے تھے اور پیچھے چھوڑ کر انہیں تو اس کا دے دار نہیں۔" غیث محمد کی بات پر چودھری غضب ہک ہو کر بیٹھا۔

"حاف کر دیں سرکار! میری صلیں آپ پر قربان ہو جائیں۔ میں بھلا یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں کہ آپ پر کوئی اہرام رھوں۔" غیث محمد روایتی چودھری کے قدروں میں گر گیا۔

"تیرا جرم حاف کرنے کے لائق نہیں غیث محمد! مادہاؤ تیرے پاس ہماری امانت تھی۔ تو نے ہماری امانت کی حفاظت نہیں کی۔ کیسے اس نے تیرے گھر کی دہلیز پار کی؟ تو اسے گھر میں چھوڑ کر آتے وقت کوئی بندوبست کرنے کیوں نہیں آیا؟" چودھری، مادہاؤ کے اس طرح ہاتھ سے ٹھکراتے پر بری طرح تھملا ہوا تھا۔ اس معمولات کا اظہار کرنے کے لیے فی الحال اسے غیث محمد ہی میسر تھا۔

"میں اسے بہن کی گرائی پر چھوڑ کر آیا تھا سرکار! وہ بے جا دہی ہمارے کہنے پر اس کے پاس رکی ہوئی تھی، پر مادہاؤ نے اسے دھوکا دیا۔ زہر تو تیری ہی گمراہ مادہاؤ کو سوتا بھگ کر حمل خانے میں بیٹھی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مادہاؤ سولے کا کرکری ہے اور اسے حمل خانے میں بند کر کے بیٹھی ہے گی۔ اس بے جا دہی کو تو خود خبر نہیں ہوتی کہ کب مادہاؤ نے دھوکے حمل خانے کی کڑی چھ ماوی۔ وہ تو جب اس نے زہر لگنے کے لیے زہر اڑھوا ہوا پانی پلا کر دوا دیا وہاں سے بھر ہے۔ ہمارے گھر پیچھے تک وہ خود حمل خانے کا دروازہ اٹھ سے پینٹ پینٹ کر بلکان ہوئی تھی۔" غیث محمد نے ایک اندھا دہی مستانی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"مادہاؤ کو بے جا دہی ہو اس۔ مجھے تیرے یہ دھوکے نہیں

سننے ہیں۔ تیرا کیا ہے، تیری کوئی کی عزت ہے تو چوٹی کے اس طرح سے بھانگ جاتے ہے خراب ہوگی۔ مجھ تو صحتی اچھے کی تاکہ چودھری انکار کی ہونے والی بیوی کا رخ سے پکے ہی کر چھوڑ کر بھاگ گئی۔" چودھری نے غیث محمد کو ڈرا۔

"نذر کار! ایک اچھے آپ کے دشمنوں کی۔ ہم نے اسے ابھی تک کسی کو بات نہ تالی بھی نہیں تھی۔ مادہاؤ تھا کہ آپ کی طرف سے مادہاؤ جوڑا اور زہر داتے کے کر جائیں گے۔ سارے گاؤں کو اکٹھے کر دیں گے۔ ابھی تو بات صرف میری بیٹیوں اور دامادوں تک تھی۔ ابھی تو میں نے حوراس اور صفور کو بھی خبر نہیں بھجوائی تھی۔ آپ بے فکر ہیں سرکار! ہم میں سے جس جس کو یہ بات معلوم ہے وہ بھولے سے بھی الٹی زبان نہیں سولے گا۔ آپ کی عزت میں اپنی جان سے بڑھ کر قربان ہے۔ آپ روتے بہا نہیں سب بھول گئے کو تیرا ہیں۔ مادہاؤ یہاں سے نکل بھی گئی تو آپ کی ہنگام سے باہر کہاں جاتے گی؟ آپ اس کے ہاتھ آجاتے پر اگر اس کی کھال بھی کھجائیں گے تو اپنے اس تنک خوار کی زبان سے "ف" تک نہیں سنیں گے۔ میں نے دہلی آپ کو دینے کی ہاں مرنی تھی اب میرا اس پر سے حق ختم ہو گیا۔ وہ آپ کی چیخ ہے، آپ کو چاہیں اس کے ساتھ وہ سلوک کیجئے گا۔" غیث محمد اپنی چال چلیدوں سے اس بات کا کیا انتظام کر رہا تھا کہ مادہاؤ نے اٹھائے ہوئے قدم کا نتیجہ اسے خود نہ جھٹکتا پڑے اور وہ چودھری کے قہر سے محفوظ رہے۔

"میں اسے پر جانے والے آدمی واپس آئے ہیں چودھری صاحب! انہوں نے ابھی طرح معلوم کیا ہے۔ وہ کھینچے پہلے جو اس دہلی سے نکلی تھی، اس میں کوئی تھپا لٹی نہیں تھی۔ ابھی جو میں لیصل آباد جانے کے لیے تیار کھنچ رہا ہے، اس کی بہت ابھی طرح تلاش کی گئی ہے۔ اس میں بھی غیث محمد کی دہلی نہیں ہے۔" اسی وقت میں انڈر کھادہاں آگیا اور چودھری انکار کو اطلاع دی۔

"پھر کہاں جا سکتی ہے وہ؟ قمر اسے گاؤں میں چھائی کر دے، ہو سکتا ہے کسی رشتے دار کے گھر بھی بھیج دیں۔" شہریار اطلاع پر حیران ہوتے ہوئے چودھری نے اسے ہدایت دی۔

"میں نے یہ کام پہلے ہی شروع کر دیا ہے۔ غیث لڑکی دونوں بیٹیوں کے گھر کی تلاش کی جا چکی ہے۔ اب میں اس کی زبانی کے ساتھ اپنے اشاری کی دو ایک مجرموں کو گرفتار بھانے سے ان سارے مجرموں کی غالی کر دیا ہوں جن پر

جنگ کیا جاسکتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں اگر اس کی جی گاؤں
 میں ہی ہے تو یہاں سے کھڑے نہیں کیوں جاسکتی۔ دوسری
 صورت میں اس سے فیصلہ آبادی کی طرف تو بندے ڈرتا ہی
 دے ہیں۔ یہاں سے نہ سکی۔ وہاں سے اس کا پتہ لگ جائے
 گا۔ مفتی اللہ رکھانے جو دھری اختیار کو اپنی کارکردگی سے
 آگاہ کرتے ہوئے نقلی دی۔

حیات کے موقع پر اسے ایک جوڑا مل جاتا کہہ دے وہیں۔“
 حوریں ویسے مادیاں کو سمجھانی رہتی تھیں لیکن آج خود سارے
 گلہ لے لے کر جھنجھی ہوئی تھیں۔

”کوئی نئی سہیلی لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے تو میں نے
کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ کڑتا مری تھی۔“ صفحہ کے
وچھے رحوال نے اسے بتایا۔

دو پناہ گزینا اور اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

”آخر تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے صفدر نے اس بار قدرے بے بسی سے سوال کیا۔

”ہم یہاں تیری دہی کا پناہ معلوم کرنے آئے ہیں۔ اسے ہمارے محلے لے کر دے اور اپنی جان چھڑالے۔“ اس شخص نے ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔

”وہ یہاں نہیں ہے۔ اپنے گاؤں میں ہوئی ہے لیکن تم لوگ کون ہو اور تمہارا میری دہی سے کیا تعلق ہے؟“ صفدر نے اس شخص کے کڑے تیور دیکھتے ہوئے اس کے سوال کا جواب تو ضرور دینا پسند کیا لیکن خود کو استفسار کرنے سے بھی نہیں روک سکا۔

”جھوٹ بول رہے ہو۔ گاؤں سے تو وہ آج دوپہر کو ہی بھاگ نکلی تھی۔ وہاں سے بھاگنے کے بعد وہ تیرے علاوہ اور کسی کے پاس جا سکتی ہے؟ یقیناً وہ یہیں آئی ہوگی۔ تو سیدھی طرح تمہیں بتا دے کہ اسے کہاں چھپا ہے؟“ اس دفعہ اس شخص نے صفدر کے پیٹ میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے اس سے ماہ بانو کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ صفدر پیٹ میں تنگے والی اس لات کی تکلیف سے دہرا ہوا گیا۔ حور اس جس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں بھی ہاتھ دھوپے گئے تھے، صفدر کو تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہونے لگی۔

”بول، پتا لگتا ہے اپنی بیٹی کا نہیں؟ اگر تو نے سیدھی طرح سے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تیرے مقلعے میں ہاتھ ڈال کر بیٹھنے سے استغناء بھی کر لوں گا۔“ صفدر کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس شخص نے بے پروا پے اسے کی گئی اور لاشیں رسید کیں اور اپنا سوال دہرایا۔

”میں کچھ نہیں جانتا کہ میری دہی کہاں ہے۔ میں اسے گاؤں میں چھوڑ کر آیا تھا۔ تم لوگ کہتے ہو کہ وہ گاؤں سے بھاگ گئی ہے، یقیناً اس نے ایسا تمہاری وجہ سے ہی کیا ہو گا۔ اب کان کھول کر میرا جواب سن لو۔ اول تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے لیکن اگر مجھے معلوم بھی ہو جائے تو میں ہرگز تم جیسے خالوں کو اس کا پتا نہیں بتاتا۔“ صفدر جو ابتدا میں ذرا خوف زدہ ہو گیا تھا اس بار بے شکریہ سے بولا۔

”تو میری شری کی وجہ سے اتنا زور دیکھا رہا ہے تو فحیک ہے پھر میں بھی دیکھتا ہوں کہ تجھ میں کتنا زور ہے اور تو کب تک میرے سامنے جم سکتا ہے؟“ اس شخص کا لہجہ اچانک ہی بہت ہمایا تک ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے صفدر کو دبوچ لیا اور ایک چار بانگی دیوار کے

ساتھ کھڑی کر کے صفدر کو اس کے ساتھ باندھ دیا۔

”اس کا منہ بھی کپڑا ٹھونس کر بند کر دو۔ یہ اگر زبان بند رکھنا چاہتا ہے تو مجھے بھی شوق نہیں اس کی فوجوں سے نکلے والوں کو جمع کرنے کا۔“ صفدر کو چار بانگی کے ساتھ باندھنے والوں نے اس حکم کی بھی بھرتی سے تعمیل کی۔ اب کمرے میں نکل کر خاموشی مچی۔ اس خاموشی کو چاقو چھلنے کی کڑکڑاہٹ نے توڑا۔ یہ چاقو اس شخص نے اپنی جیب سے برآمد کیا تھا اور اب آنکھوں میں حد درجہ سفاکی لیے صفدر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صفدر ایک عام سا آدمی تھا، یہ منظر دیکھ کر اس کے جسم سے پیدائشی بیوقوفانہ حیران حیران بھی دم غیب نکل رہا تھا۔ اس شخص کی طرف دیکھنے کی نکتہ دیکھیں وہ تو جیسے اپنا کوئی سن پند مکمل شروع کرنے جا رہا تھا چنانچہ ان دونوں کی کیفیت کو نظر انداز کر کے صفدر کے قریب پہنچا اور چاقو ڈالا ہاتھ بندھ کر کے پوری قوت سے چاقو صفدر کے بازو میں ٹھونس دیا۔ تکلیف کی شدت کے باعث صفدر کا جسم بری طرح تڑپا اور بازو میں سے پھوٹنے خون کے دھارے کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی نکل آئے۔ اگر اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوتا تو یقیناً اس کے حلق سے بہت کرب تک کچھ پھلنے ہوتی۔ کچھ کاراست تو بندھا لیکن پھر بے پروا چھائے تاثرات اس کے کرب کی دامستان بنان کر رہے تھے۔ صفدر کی یہ حالت دیکھ کر حور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

”اس بڑھیا کا منہ کھولو۔ اگر یہ اپنے شوہر کو تکلیف سے بچاؤ چاہتی ہے تو پھر اسے اپنی دہی کا پتا بتانا ہو گا۔“ حور اس کی تکلیف نے اس کی صفدر سے محبت کو مٹا دیا تھا اس لیے اس سفاک انسان نے اپنے سوال کے جواب کے لیے اب اسے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس کی جرات پر حور اس کے سر پر کڑا آدمی اس کے منہ میں ٹھونس دینا چاہتا تھا۔

”خبردار جو منہ کھلے گے بعد اپنی آواز ذرا بھی بلند کی تو... اگر تمہاری آواز نکلی تو میں اس کی جان نکال دوں گا۔“ حور اس کا منہ کھلنے سے پہلے اسے دھمکی دی گئی۔

”یہ کچھ کہہ رہے ہیں نہیں معلوم کہ ماہ بانو کہاں ہے۔ ہم اسے گاؤں میں ہی چھوڑ کر آئے تھے۔“ منہ میں کپڑا ٹھونسے جانے کے باعث حور اس کا حلق بری طرح خشک ہو گیا تھا پھر بھی اس نے بہت کمرے کے آواز نہ نکالی اور اس شخص کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دھمکی میں اس شخص نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر بلند کیا۔ اس بار صفدر کا دوسرا بازو اس کا کٹا نہ بنا تھا۔ صفدر اس دوسرے بازو پر اس بری طرح تڑپا کہ چار بانگی اس کا بوجھ سہار کر کھڑی نہ رہ سکی۔ نتیجتاً صفدر اس حالت میں زمین

سے احتجاج بھی نہیں کر پاتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ چودھری کے سامنے گونگڑا کر اس سے چودھری درخواست کرتی تھیں۔ چودھری اس کی درخواست پر ہنسی کانٹیں دھرتا تھا اور ترکا دعوت ہمارا مانگتی تھی۔ پہلی بار اسے مادا تو بھی ان ہی محلوں میں سے ایک محلوں ہونی چاہی لیکن دوبارہ وہ اس سے کسی جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا، اس پر چودھری بھراں رہ گیا تھا۔ اس نے کچھ لڑائی چڑائی میں مادا کو تقریباً تھپتھپا کر ڈال دیا تو وہی صدمے کے باعث تھا۔

اسی رات وہ بہت کھری بیٹھ رہا تھا۔ چودھری ان کے سامنے ڈٹ کر کڑی باتیں ہو کر ہی لیکن جب بھی موقع ملتا تو اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور چودھری ان کے منہ پر پھینچ دے مارا تھا۔ دوسری بار وہ چودھری کی طرف سے ہوشیار رہی اور اس بات کا بندوبست کر کے آئی تھی کہ چودھری اس کے قریب بھی نہ آئے۔ چودھری اگلی بار کوشش کرتا تو وہ پھر کوئی ترکیب لائیں لیکن چودھری نے اگلی بار اس کی کوشش کرنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی کہ مادا کو اسے احتجاج کی محنت ہی نہیں رہے۔ دراصل چودھری کا دل چاہتا تھا کہ یہ عمر کمین اور بی ادب لڑکی ہمیشہ اس کے تصرف میں رہے۔ ہمیشہ کے اس ساتھ کے لیے شادی کا جال سب سے موزوں تھا لیکن مادا کو بہت بڑی کھلی تھی اور اس جال میں چھپنے سے پہلے ہی بھر سے اندر چکی۔ اب چودھری ایک غشب ناک شکاری کی طرح اسے کھونٹ نکالنے کے لیے ڈالا ہوا جا رہا تھا لیکن ابھی تک اسے اپنی کسی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

”چودھری صاحب! فیصل آباد سے بالہ واپس آ گیا ہے۔ اگر آپ تمہیں تو اسے آپ کی خدمت میں حاضر کروں؟“ چودھری ان کا اپنی سوچوں میں کھرا بیٹھا تھا کہ شکی اندر کھا دیکھ دے کہ اندر آیا اور اسے بالے کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے ادب سے پوچھا۔

چودھری شکی اندر کھانے کے انداز سے ہی جان چکا تھا کہ بالہ کام واپس آیا ہے پھر بھی وہ بالے کی کوششوں سے متعلق تفصیلات جاننے کا خواہش مند تھا چنانچہ شکی کو بالے کو اندر بھیجے کی اجازت دے دی۔

”اور میں شکی اور بالہ کے لیے گڈی تیار کروا دے۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہی اور چوہرا لائے گا اور کے لیے روانہ ہوں گی۔“ چودھری ان کی طرف سے اجازت ملنے پر شکی تیزی سے پلٹ کر باہر جا رہا تھا کہ

چودھری نے اسے روک کر فرمایا۔

”جی! پھر اس کا کہنا ہو گا ہر شکل گیا۔“ شکی نے کہا۔ بعد وہ بالے کے ساتھ اندر تھا۔ بالے نے ہاتھ جوڑ کر چودھری کو سلام کیا اور جب چاہے نظر چھپا کر کمرہ ہو گیا۔ اس کے اس قدر سادہ باندا انداز کو دیکھ کر کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی بالہ ہے جو جنوں میں لوگوں کی کھال ابا کر رکھ دیتا ہے۔ چودھری کے سامنے کمرے سے ہو کر اس کی ساری سفاکی عاجزی میں اصل کی تھی۔ شاید یہ بھی قدرتی کوئی اصول ہے کہ ہر بڑا اور آزاد عالم اپنے سے زیادہ دھڑا اور جنم کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔

”ہاں بول بالے! کیا کیا تو نے فیصل آباد میں؟“ چودھری ان کے ترش لہجے میں بالے سے دریافت کیا۔

”میں نے اپنی بوری کو کوشش کر کے دیکھ لی سرکار! شکی اندر کھانے کی طرف سے حکم ملے ہی میں اپنے چار بندوں کے ساتھ فوراً فیصل آباد چلا گیا۔ دو بندے میں نے ان کے آگے بڑھنے کے لیے گھبراہٹ مچائی تھی کسی سے اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ اسے تھپو کر کے واپس گاؤں پہنچا دیں۔ وہ بندوں کے ساتھ میں خود مصروف کمرے کی گھرائی کرتا رہا لیکن پورے دن کوئی نہیں آیا۔ شام کے وقت میں نے چاند پانی کے کوسے سے ایک لڑکی بڑا کر سیدھے مادے پکڑوں میں اسے مصروف کمرے کے اندر بھجوا کر دیا۔ یہاں سے اندر کی سہیل نے کر کے لڑکی غیبت کمرے کی دھڑکی آگئی ہونے کا بھانپ کر کے اندر چل گئی۔ واپس لوٹ کر اس نے بتایا کہ اندر ایک عورت کے سوا کوئی نہیں۔ رات کو مصروف کمرے کو لوٹنے کے بعد اندر میرے پاس، میں خود اپنے بندوں کو لے کر اندر جا کھسا۔ شکی ابھی طرح حواری کی اور مصروف اور حوران کا بھی ریشہ دیکھا کہ وہ دیکھ لیا لیکن لڑکی کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ مصروف سے اس نے اس کی کڑی کی سیٹیوں کے بچنے کے لیے حقہ آج سارا دن چاند پانی کے کوسے کی لڑکیاں چاہتے ہیں۔ ان کے گھروں میں جا کر کھوج کھاتی رہیں لیکن انہیں سے ذرا سی بھی سن کی نہیں تھی۔ اب بھی میں اپنے بندے فیصل آباد چھوڑ کر آئی ہوں کہ کڑی کی سیٹیوں پر نظر رہیں اور پیسے ہی کچھ معلوم ہو تو سارا حرکت میں آجائیں۔“ بالے نے اپنی ساری کارگزاری سنائی۔

”اور مصروف اور حوران کا کیا کیا۔ ان پر بہت سے ٹیکے لگے؟“ چودھری ان کے پوچھا۔

”بوسیدہ دارا بھی مار چکی جان سے کڑی تھی۔ چودھری نے بعد میں مصروف کا بھی کام تمام کرنا پڑا اور وہ وہی کی سوت پر

بعد میں شور مچا کر سب کے سامنے آپ کا اور میرا نام لے دیتا۔ آپ غصہ نہ کریں تو چودھری صاحب! میں نے بہت اچھی طرح دونوں کو چھان چنگ کر دیکھا تھا، انہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔“ بالے نے چودھری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔۔۔ کچھ معلوم نہیں کر سکا تو اب کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر ممبر کر کے بیٹھ جاؤں؟ تم مشغلوں کی اتنی بڑی فوج میں نے اس لیے ہالے پا رہی تھے کہ کام دکھانے کے وقت لوگ سدا دکھ کر اپنی ناکامی کی روایت سنائے میرے پاس چلے آؤ۔“ چودھری ان کے بالے کی تسلی پر ہنسنے سے باز رہا۔

”نہیں جی چودھری صاحب! ہم نے ابھی اپنی ہار نہیں مانی ہے۔ میرے بندے اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ میں نہیں اس لیے آگئی تھی کہ آپ کو اب تک کی رپورٹ دے دوں۔ ساتھ یہ تو بھی لے کر آیا ہوں۔ مصروف کے ٹھکر کی تلاش میں ملے تھے۔ میں نے سوچا یہ تو تلاش کے کام میں وہ دے سکتے ہیں۔“ بالے نے اپنے کمرے میں بیان میں ہاتھ ڈال کر کاٹھ کا ایک علاقہ باہر نکالا اور ادب سے چودھری ان کے کوشش کیا۔

چودھری ان کے لٹانے میں سے تصویریں نکالیں۔ یہ شکی چار بڑے تصویریں تھیں۔ دو تصویریں کسی فوٹو اسٹوڈیو میں جا کر چھائی گئی تھیں۔ ان میں مادا بنو، مصروف اور حوران کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ ایک تصویر کسی شادی کے موقع پر لی گئی تھی۔ مادا بنو پیر پیروں میں ڈھونڈ جاتے ہوئے بڑی پرچش کی نظر آ رہی تھی۔ ایک باسیورٹ سائز تصویر نیلے بیک گراؤڈ کے ساتھ صرف چہرے کی تھی۔ اس تصویر میں مادا بنو نے سر اور گردن کے گرد سفید اسکارف خوب اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ شاید یہ تصویر کونے کے قاصر وغیرہ کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے چھائی گئی تھی۔ آخری تصویر میں بھی مادا بنو کچھ نیلے پیرام میں ہی تھی۔ یہ تصویر کونے کے کان میں لی گئی تھی۔ جس منظر میں کونج کی غارت اور مصافحہ نظر آ رہا تھا۔ پھر کے درمیان سفید لباس میں کڑی کی شکل پر جمی ہوئی لہوا ہونے قدرے سے وہی سے دو چاند لہوا دکھا تھا۔ کونج کے آگے ادا تہ ماحول میں بے غری کے اثرات والی مادا بنو کی تصویر سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر چودھری ان کے بیٹے میں سے سر سے آگ بھڑک اٹھی۔

”وہاں اور تصویریں بھی تھیں سرکار! لیکن وہ ساری اتنی

صاف نہیں تھیں۔ میں جی کا کام کی تصویریں لے آیا ہوں۔“ بالے کی آواز سے چودھری ان کے تصور پر بے نظر اٹھانے پر مجبور کیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم باڈو اپنی کوشش جاری رکھو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تصویروں سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔“ چودھری ان کے بالے کو گھمسیلا۔ بالہ ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہوا بالے قدر موسی واپس ہل گیا۔ شکی اندر کھانے بھی اس کی بیٹھو کی تھی۔ اب چودھری اپنے کمرے میں تھا تھا۔ اسے جی بیٹھانے کے لیے مادا بنو کی تصویر میرا بھی لیکن بچہ تھا کہ تصویروں کو بیٹھانے کے بجائے اس کے کام زیادہ گزری تھی۔

☆ ☆ ☆

”ایک بری خبر ہے۔“

”خبر صحت کیا ہوئے؟“ عبداللہ ان کے لیے نظر چہرے کو دیکھتے ہوئے شکی کے لٹکھٹک سے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ جس لڑکی کو چودھری ان کے بچانے کے لیے ہم نے دارالامان میں بیٹا ڈال دیا ہے اس کے پاس باپ کو کوشش کرنا پڑا ہے۔“

”کس نے اطلاع دی ہے؟ کیا جی آباد سے کوئی آیا ہے؟“ عبداللہ ان کی دی ہوئی اطلاع پر شکی بڑھ چکا۔

”تو سر! اصل خبر آباد کے مال باپ کا نہیں، فیصل آباد میں تھوڑی سی چودھری کے والے مال باپ کا ہوا ہے۔ اصل میں لڑکی کو بہت قلمی کر اس کے اس طرح غائب ہو جانے سے اس کے پاس بہت پریشان ہوں گے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ فیصل آباد میں اطلاع کروادی جائے کہ وہ خیریت سے ہے اور چودھری ان کے بچنے کے لیے لاہور کے ایک دارالامان میں پناہ کر رہے ہیں۔ میں نے لڑکی سے وعدہ کر لیا تھا کہ یہ کام کروادوں گا لیکن فوری طور پر عمل نہیں کر سکا۔ اصل میں معاملہ ایسا ہے کہ اس کام کو کروانے کے لیے ہر ایک ہر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ مشافحہ خانان سادے معاملے سے واقف بھی ہے اور آدمی بھی اتنا کد ہے، اس لیے ہی سے فیصل آباد پیغام بھجوانے کا کام لوں گا۔ مشافحہ خانان جہاں بھی بہت معروف رہتا ہے اس لیے اسے میں فوری طور پر فیصل آباد نہیں بھیج سکا۔ آج تک میں نے اسے اس کام کے لیے بھیجا تھا اب وہ واپس آئے تو ان اطلاع کے ساتھ کہ اس لڑکی کے والدین حوران اور مصروف لگے جاتے ہیں۔“ عبداللہ ان کے بتا رہا تھا۔

”راجہ طور پر بھگت نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ قتل سے پہلے دونوں میاں بیوی پر بے گناہ شائد و کیا گیا تھا۔ کارروائی رات کے وقت کی گئی تھی۔ راجہ اہل محلہ میں سے کسی نے انہیں دیکھ کر پائیس کو اٹھانا نہ دیا۔ ہتھیاروں کے آس پاس والے شیعہ یہ عزت کا شکار ہیں کہ ان کی عین کارروائی کا انہیں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا۔ تو گنت پت کی آواز سن سنی دین اور نہ ہی تشدد کے نتیجے میں میاں بیوی کی بچیاں ان تک پہنچیں۔ پائیس کا اندازہ ہے کہ قاتل کوئی بہت گتھے ہوئے مجرم تھے جنہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس گناہ کی آبادی والے محلے میں کسی کو ان کی کارروائی کا علم نہ ہو سکے۔ عورت کی اہلی اس حالت میں ملی ہے کہ اس کے منہ میں سٹیک تک پکڑا تھا یا ہوا تھا، یعنی مجرموں نے تشدد کرنے سے پہلے ہی بیویوں کی روک تھام کا انتظام کر لیا تھا۔ جس کی ایک صورت یہ ہے کہ تباہی کے منتظر حرموں میں بیویوں کے پیچھے ایک لاکھ کی گنتی چلی گئی۔ حورائے بے گنتی کی اس گرم میں اپنی طرف سے کچھ اور گرم طاقت لپکائی گئی اور باؤ کے لیے زور خریدا تھا۔ محلے دار عورت کو یہ بات اس لیے معلوم ہے کہ گنتی اسی کے گھر لائی گئی تھی اور حورائے بے زور کی خریداری بھی اسی کے ساتھ جا کر گئی تھی۔ عورت کے اس بیان کے بعد پائیس نے رائے قائم کی ہے کہ یہ ڈاکو زنی کی واردات تھی۔ ڈاکوؤں کو گنتی سے اطلاع مل گئی تھی کہ اس گھر میں زور اور روپا ہے اس لیے انہوں نے موقع دیکھ کر واردات کر دی۔“ عبد اللہ اللہان نے تفصیل بتائی۔

”مجھے تو پائیس کا یہ اندازہ درست نہیں لگ رہا۔ زور اچھی بڑی ہات کھٹیں تھا کہ اس کے لیے اچھا منظم کارروائی کی جانی۔ پھر جس طرح کے تشدد کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ ذرا سے زور پر ہو جانے کے لیے اتنا تشدد کوئی نہیں برداشت کرتا۔ لوگ اپنا جان بچانے کے لیے عموماً خود ہی حور پر خودی سب کچھ ڈاکوؤں کے حوالے کر دیتے ہیں۔“ عبد اللہ اللہان کی بتائی ہوئی قصیدات سن کر شہر یار نے خیال تھرا لی کی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سرنگھن پائیس کی رائے کو اس وجہ سے تقریباً قس رہی ہے کہ جانے واردات سے کبھی حم کا زور اور روپا چاہا یا نہ تھا۔ نہیں ہوا ہے اور مگر کی حالت بھی ایسی ہے جیسے کسی نے وہاں کی کشائی لی ہو۔ اس صورت حال سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں میاں بیوی کو قتل کرنے والے واقعی ڈاکو تھے۔ ہو سکتا ہے میاں بیوی نے زور اور روپا جان کے حوالے کرنے میں حراحت سے کام لیا ہو جس

کے جواب میں ڈاکوؤں نے ان پر تشدد کیا اور آخر میں دونوں کو قتل کرنے کے بعد وہ چلاؤ زور پر لے کر فرار ہو گئے۔“

”پائیس کی رائے ٹھیک تھی ہو سکتی ہے لیکن میں اس کہیں میں چودھری کی انوکھی گفت کا خدشہ محسوس کر رہا ہوں۔ خاص طور پر منظم طریقے سے کیا جانے والا تشدد مجھے شک میں ڈال رہا ہے۔ واردات کا اندازہ ایسا ہے جیسے مجرم پہلے سے یہ سوچ کر آئے ہوں کہ انہیں دونوں میاں بیوی سے بڑھ کر کوئی اور اس طرح سے ہنگامتا ہے اور اس طرح سے ہنگامتا ہے کہ ضرورت کی تھی۔ انہوں نے اپنے تشدد کے جواب میں پیدا ہونے والی بیویوں کے روکنے کا خصوصی انتظام کیا۔ ڈاکوؤں کو عموماً آتا تشدد سے کام نہیں لیتا چاہے۔ وہ تشدد کرنے میں بھی ہیں تو اس میں خودی اشتعال کا قتل ہوتا ہے اور اس اشتعال کے اظہار میں بیٹنا اشتعالی ڈھیر اضافہ کر کے مشکل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر حورائے بے زور تشدد سے زبردات کا پتا بتانے میں حراحت سے کام لیا تھا تو ڈاکوؤں کے لیے سب سے آسان عمل یہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کو باندھ کر ڈال دے اور مگر کی تلاش کے لیے۔ آخر ایک چل فریٹ کر مکتہ پر جا سکتا ہے اور اس میں جتنے خفیہ مقامات ہو سکتے ہیں جنہیں موصوفہ ڈاکوؤں کے لیے مشکل ہو۔ میرے خیال میں تو اس بے پناہ تشدد کے پیچھے کوئی اور بات ہے۔ مجرم ان دونوں میاں بیوی سے کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے تھے جس کا جواب وہ نہیں دے سکتے اور شاید زور پر تشدد کو سنبھال رہے۔ وہ بات کیا ہو سکتی ہے، سبب وہ حالات میں آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شاید مجسکس و ہو کہ میں نے بتایا تھا کہ چودھری افکار نے وہ بانو کی تلاش میں اپنے بندوں کو فیصل آباد بھی روانہ کیا تھا۔ ان لوگوں کو یقین ہو گا کہ وہ آباد سے نکل کر وہاں فیصل آباد بھی جا سکتی ہے۔ پہلے انہوں نے مگر میں اسے تلاش کیا ہو گا اور جب وہ انہیں وہاں نہیں ملی ہوگی تو انہیں لگے ہو گا کہ حورائے بے زور تشدد سے اس کی دوسری جگہ چھا کر رکھا ہوا ہے اس دوسری جگہ کا پتا معلوم کرنے کے لیے انہیں نے دونوں پر اتنا تشدد کیا ہو گا۔ لیکن ظاہر ہے وہ بے جا پراسے کچھ جانتے ہی نہیں تھے تو انہیں کیا پتا سکتے تھے۔ میں اس سلسلے میں اس لیے بھی شک و شبہ کا اظہار کر رہا ہوں کہ ڈاکو عموماً پانچویں گھنٹے کے بعد بے اعتنا کرتے ہیں۔ ان سے کسی واردات کے دوران ان کو قتل ہونے سے تو اس کا تحریک خودی اشتعال اٹھانا چاہیو یا پھر واردات کے بعد اپنے بچکانے لیے جانے کا زور ہوتا ہے۔ خودی اشتعال تو اس واردات میں نہیں نظر میں آ رہا۔ سبب وہ اندازہ نظر یہ اس لیے غلط ہے کہ وہاں جہیز مرزاں بیوی میں سے کسی کی بھی امت

نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ڈاکوؤں کے لیے کوئی خطرہ بن کر رہے۔ آخری بات کا امکان ہے کہ مجرموں نے اپنی شناخت پر پردہ ڈالنے کے لیے میاں بیوی کو قتل کیا ہو لیکن یہاں ہم یہ بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ مجرموں نے یہ عمل اس لیے کیا کہ متعلقین اگر زور دے رہے ہوتے تو وہ پائیس کو اپنے ساتھ ہونے والی واردات کی اہلیت سے آگاہ کر سکتے تھے۔“ شہر یار نے بہت گہرائی میں جا کر پوری واردات کا تجزیہ کیا تھا۔ اس کے تجزیے کے بعد عبد اللہ اللہان کو بھی یقین ہو گیا کہ واقعی ہوتے ہو حورائے بے زور کے بھائی تھے۔ چودھری افکار کا بھائی ہے اور اس کا بھائی کوئی اور تشدد کرنے کے لیے واردات کو ڈاکو کے کارنگ دینے کی کوشش کی تھی ہے۔

”میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں سر۔ لیکن بات واقعی ہے کہ صرف تصویر کی بنیاد پر ہم چودھری افکار پر الزام عائد نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس کے خلاف ثبوت بھی درکار ہیں۔“

”یہی تو مسئلہ ہے۔ چودھری افکار جیسے لوگ بہت جاگ بھگتے ہیں۔ ہم ان کو قتل کر کے کوئی ثبوت تلاش بھی کر لیں تو زیادہ سے زیادہ چودھری کے کسی بندے تک ہی پہنچ سکیں گے اور وہ بندہ اتنا ملک خوار ہو گا کہ اپنی جان کے بدلے بھی چودھری کا نام کسی حالت میں نہیں لے گا۔ اب ہمارے پاس یہی صورت پڑتی ہے کہ وہاں کو کوساٹنے کے لیے آئیں اور کم چودھری کے ان کو تو قتل کو کوساٹنے کے لیے آئیں کہ ان کے دماغ پر حکم افروزی کی عزت کو کوساٹنا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ عبد اللہ اللہان کی بات کا جواب دیتے ہوئے شہر یار کا چہرہ دھیسے سے سر نہ ہو گیا۔

”اس سلسلے میں ہم نے ایک این این او کو اپر وٹا کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کہیں کے سامنے آنے سے چودھری افکار کو بہت زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ سبب یہ کہ حورائے بے زور تشدد سے بے جا دائر امت لگائے جا رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ تسلیم کرے گا تو ان کا اس نے وہاں کو لیے شادی کا بیٹا م بھیجا تھا۔ ظاہر ہے اس حم کا پیغام سمجھنا کوئی جرم نہیں۔ اگر عمر کے قنات کو بنایا دینا کہ چودھری کو قتل نہیں کیا جائے تو بھی وہ کہہ گا کہ میں نے تو صرف رشتہ بھیجا تھا تو قتل زور بردہ نہیں کی تھی۔ لڑکی کو اگر کوئی اعتراض تھا تو اپنے والدین کے سامنے احتجاج کرتی۔“ عبد اللہ اللہان نے شہر یار کو سنا ہے کہ ایک اور رشتہ دکھایا۔

”میں اس بات کو سمجھتا ہوں عبد اللہ اللہان! ہم وہاں کو کے

کہیں میں چودھری افکار کی طرح مجرم ثابت نہیں کر سکتے لیکن میری خواہش ہے کہ چودھری کے احتجاج پر ایک شریک تو ضرور لگائی جائے۔ دوسرے مجرم سے سامنے ہانوں کے خوف کا بھی مسئلہ ہے۔ میں سنا تھا کہ اسے فیصل آباد آئی لیکن جانے دیا تھا کہ مجھے تمام حق چودھری افکار دہاں پہنچ کر اسے آسانی سے دوبارہ لپک کر لے گا۔ میں اس لڑکی کی بیک مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی بڑی این این او اس کے پیچھے کمزری ہو جاتی تو چودھری افکار کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑتا لیکن انہوں نے اس بات کو اس بے جا پراسے سے اس کا ٹھکانا ہی ممکن کیا ہے۔ دارالامان میں اب تک روکتی ہے؟ خیر، مجھ کو کیا سو ہو گیا لیکن اب ہمیں اس عظیم لڑکی کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہو گا۔ اسے کیا ہے جس یا دارالامان کی سرپرستی مل جائے جو چودھری افکار کے مقابل قوت کر سکا ہو تو اس لڑکی کے حق میں بہتر ہوگا کہ این این او کے ذریعے میڈیا کی انوکھی گفت کا ایک قلم کار بھی ہو گا کہ چودھری افکار پر براہ راست لڑکی پر تشدد ڈالنے سے گریز کرے گا۔ وہ دھم جائے گا کہ اگر اس نے ایسی کی ایسی لڑکی کی تو الزام اس کے سر پر ہی آئے گا۔“ شہر یار کو حورائے بے زور ہانوں کا وہاں کو کے کہیں میں کیوں اتنی گولی لپچی لے رہا ہے اور کیوں اس کے خوف کے لیے احتجاج بنانے؟

”میں حد تک آپ کا عقیدہ سمجھ رہا ہوں سر۔ آپ بے فکر ہیں، میں جلد ہمارے سلسلے میں کارروائی شروع کر دیتا ہوں۔“ شہر یار کی لپکی کو دیکھتے ہوئے عبد اللہ اللہان نے اسے یقین دلایا۔

”بلڈز! تم اس معاملے کو میڈیا سے نمٹاؤ۔ ان دارالامانوں کا بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہاں راجاقت کے خیال سے سمجھی جانے والی خاتونیں معذور رہتی ہیں یا نہیں۔“ شہر یار نے ایک اور شخص کی طرف عبد اللہ اللہان کی توجہ دلائی۔

”اس طرف سے آپ بالکل بے فکر ہیں۔ میں نے بہت سوچ کچھ کر بہت اہم سا کچھ دیکھے والے دارالامان کا انتخاب کیا ہے۔ اول تو اب لڑکی کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اگر کوئی مسئلہ ہوگا تو میں تو اس کا ایک چوکیدار خیال رکھے گا۔ وہ چوکیدار مشاہیر خان کے علاقے سے منتقل رکھتا ہے۔ مشاہیر خان کی اس سے دوستی ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے دوست کو لڑکی کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے آئے ہے۔“ عبد اللہ اللہان نے اطلاع دے تو شہر یار نے کافی حد تک خود کو پرسکون محسوس کیا۔ یہ سب انہوں نے ہانوں کے خوف کے خیال



”شہر پارا تمہارا دل ہے۔“ وہ ڈاکٹنگ میبل سے اٹھا
ی تھا کہ اس کی مافیہ سر آفرین رہا تے اسے اطلاع دی۔
شہر پارا جو کھانے کے بعد پورے آرام کے خیال سے اپنے بیڈ
روم کی طرف جانے کو راہ دیکھتا تھا، اس اطلاع پر نیٹا فون
کی طرف بڑھ گیا۔

بھی تھوڑے عرصے میں وہ چل پھل لوں گا۔ یہاں تو بہاؤ کے بعد چار دن بھی سکھ کے دیکھنے نہیں ملے۔ پہلے سے خبر ہوئی تو میں اماں ابا کو مع کر دیا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں رشتہ چڑھنے کے لیے۔ اب دعویٰ دہلی جہاں کا بھی تو سہارا دیتے ہیں مگر حقاری سے کیا کر دیجئے۔ یہ جہاں ہونے جائے۔" ارب نواز نے مڑے ٹیوڈر کے ساتھ نہایت پر دلچاشی سے اعلان کرتے ہوئے کہا۔

”وَب نواز ٹھیک کہہ رہا ہے چاہا اس سمیت کو تم
 کیلئے ہی بھٹاتا۔ ہم میں جس حد تک ہے چودھری صاحب
 غضب کو برداشت کرنے کی۔ اگر چودھری صاحب نے
 تمہارے لیے ننگی دھاتی توں تو صاف اعلان کر دیں گے کہ
 میرا اور میرے گھر والوں کا تمہارے گھر سے کوئی تعلق نہیں
 ہے۔“ وہ نواز نے منگ بیٹھا جوتے پہنے جری بھنڈی کی دھکا
 دی مٹی تو انوکس بات کا لحاظ کرتا اس نے بھی صاف بتا دیا
 کہ مشکل وقت میں وہ خود راں اور غیبات محمد کا ساتھ دینے
 والوں میں سے نہیں ہوگا۔

”یہ نہیں باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔ اماں! اب کوئی ہم سے الگ تو نہیں ہیں جو مشکل وقت میں ہم انہیں اکیلے چھوڑ دیں گے۔“ زہرے نے شہر اور بہنوئی دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے احتجاج کیا۔

”جو حج تھا وہ میں نے بنا دیا۔ اگر مگر کو شوق ہو تو ہے
 ملک یہاں رک جائے، پر میں توبہ دیا وہ یہاں نہیں آئے
 والا“ انور نے اپنی بات کہہ کر خورما پر جگہ چھوڑ دی۔ رب
 نواد بھی اس کی تعریف میں کھڑا ہو گیا۔ یہ زوردار کارروائیوں
 ہر اماں و پریٹن اپنے اپنے شوہر پر کور کھینے لگیں۔ ان
 دونوں کے شوہر صاف بتا رہے تھے کہ کوڑا پی جان چائے کے
 لیے اپنی بیویوں سے قتل معنی کرنے میں ذرا لگاؤ نہ کریں
 گے۔

”نی کرکڑیں جاؤ، اپنے اپنے سواؤں کے ساتھ اپنے
گھر جاؤ۔ ہم اس سر پر پڑی تختیں گے، ہم دونوں کا جو
مشافہ گھر۔“ انہوں نے جو دامادوں کے تئیر دیکھے تو
ملٹی سے منبوں سے ہوئی۔ ہاں کاروبار دیکھ کر انکار اور ہر
نے جلدی سے اپنی اذیتیں اچھی طرح بخینیں اور اپنے
دو بروں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انورا اور ب
از بار نکلتے تو دونوں ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ اس جگہ کی
بیت میں رکنا بھی کہے جہاں انہیں صرف اور صرف وہ جگہ
بھاگتا تھا۔

☆☆☆

ملائی تھی وہ اس نے یہ بھی تو بتا دیا تھا کہ ماسی حوداں نے زہر کے بیاد سے پہلے ماہ نو کے لیے زہر خریدا تھا، پر وہ کڑا کا نام بانو کے یہاں سے بھاگنے کے بعد، کوئی میری ماں نے یاد دہانے پر مبینہ تو کہیں گا کہ کبھی کبھو ہوتی ہے۔ "انور نے ایک بار پھر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”ہاں ماما کے گھر سے تیرا دور دورہ چلا جاوے گا تو تمہارا
ماما اور پھر مسعود کو کوئی کرنے والے اور کوئی نہیں ہے تو انہوں نے
زیر و غیرہ کیوں بھینسا کیا؟“ فتور کی بات پر زبرد نے اعتراض
کیا۔ اس کا جواب ہے اسے اندر سے سہا دیا تھا۔ بے شک
اس نے سب کے سامنے یہ کہانی بنا دی تھی کہ ماہ کا نواس
دھوکے سے سہیل خانے میں بند کر کے فرار ہو چکی ہے لیکن
حقیقت تو وہ جانتی تھی کہ ماہ کو نوکر فرار کرانے میں اس نے
خود ہر کی تھی۔ وہ یہاں کی حالت کو دیکھ کر بیچ کی تھی مگر اب جو
حالات تھے۔ اس کو وہ جیسے ہوئے لگا تھا کہ شاید اس سے کوئی
غلطی ہو گئی ہے۔ خاص طور پر سوا اور مسعود کے کہل کا جو وہ
اپنے شانوں پر محسوس کر رہی تھی اور اس اخرام سے خود کو بری
دیکھنے کے لیے مسعود اور خود اس کے ساتھ چلنے آئے والے
واقعے کو اکانی کی کاروائی سے فرار وادعہ ہو چکی تھی۔

”تو چپ کر۔“ مجھے کیا معلوم کہ وہ فراموش کیا کیا ہوتا ہے۔
 کیا بھر و ما کہ مامی اور خاں مستور کو کوئل کرنے کے بعد تھرا اور
 روپا اسی لیے غائب کر دیا گیا ہو کہ کسی دوسری طرف شکیں نہ
 جائے اور کیا معلوم کہ جس محلے دار نے دونوں کی لاشیں
 دیکھیں، پہلے اس نے ہی سب تھوڑا لایا ہو پھر بعد میں پوئیں
 کو گڑدی ہو۔“ کب ٹوائے زہرہ کو فتنے کرنا چاہی لے لیں
 کیا۔

”میرے خیال میں تو ڈاکو کا کچھ نہیں چاہا۔ زور لڑنے نے زبرد کے عباد کے موٹے پراہ جانو کے پاس دیکھا تھا۔ رات والے روز اس نے کانوں میں سونے کے ٹنڈے پہنے بھی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں واپس جاتے وقت اسے سانپ کا زور لے کر ہی نہ مرنی ہو۔ ویسے بھی ماہو ہوا ہے ایک عجیبی حفاظت سے تالا لگا کر رکھی تھی۔ سامان میں کوئی قیمتی چیز ہو کی تھی تو وہ حفاظت کرتی تھی۔ نصیبوں چلی جاتے جاتے وہ کچھ بھی اپنے پیسے سے لگا کر لے گئی۔“ ایک نکتہ خاموش چمکی نوران سے ایک حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے دہائی دہی اور سر پر کھڑو تاشروں کو دیا۔

”خیر، جو بھی معاملہ ہے اور ماہ بانو نے جو بھی کچھ کیا، میں صاف بتا رہا ہوں کہ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر اس بات کی کوئی توہینہ داری نہیں۔ میں دینی حاکمہ نہ ہوں اور نہ کوئی داری توہینہ داری ہے۔“

ہے تھا۔ مگر سوال دی تھا کہ آخر اسے کسی شہر یا راجہ کا دل آپ کے
اشی کی لڑکی کے حلقہ کے لیے اتنا پریشان تھا ہی کیوں؟

”کیا کوئی چاہے یا چاہا جواب کیا کرو گے؟ اور کیا تو کہتا ہے کہ کوئی اپنا چاہ نہیں بنا۔ وہ تو جانتی تو اس کے جوہری کے ساتھ دو ہزار پندرہ سو تھہری جان پھوٹ جاتی، پر اب تو ہماری مبراہی مشکلی میں ہے۔ کوئی معلوم نہیں کہ کب چودھری کا ضبط جواب دے جائے اور وہ ہم پر قہر مینا کر توٹ کر ہے۔“ غیث محمد کے دونوں دادا اور بھائی اس کے گھر پر آئے تھے۔ دو سب سے اچھی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ انہی وقت بھی غیث محمد کے دادا دادا نے سوال اٹھاتے ہوئے اسے حالات کی گزارشات کا احساں دلایا۔

”کیا کرواں چتر... چھوٹے ٹیکس پر دبا کر لیا کرواں اور
 کہوں سے اس بیدت کو ڈھونڈوں؟ اسے طور پر پوشش کی کمی
 کی شکل آباد شدہ شخص اور حواس کے جان بچان اور ان سے
 مانا کو کا کا معلوم کر سکو، پر آدھ بھی معلوم نہیں ہوا۔
 میری جان تو دہری مشکل میں پھنسی ہے۔ اور چھ دھری کا
 خوف ہے تو دوسری طرف لڑکی ذات کے غائب ہونے سے
 عزت پر جن آتی ہے۔ ساری برادری میں کہیں سنا کر بات
 کرنے کے لائق نہیں رہا۔ جو وہاں اور صفد کے جتنے پر
 سب ہی پوچھ رہے تھے کہ ماہ کو بیٹا ہے؟ اس پر سب کوئی
 جواب دینا نہ ہوتا۔ سبھی اسی وقت پر سبھی اس طرح کی
 کوئی نہ کیا نہیں نہ ہوتی تھی۔ لوگ ملنے پر غریب کی بات
 رہے تھے۔ ایک دو کو تو سننے سے ایک کہتے تھے کہ ماہ کو سارا
 ہونا اور زور لے کر اسے مٹی پا کے ساتھ ہماگ مٹی ہے۔“

جائے جاتے اس نے اپنے باپ کے ساتھ لڑ کر مقصد اور حوصلہ کو کھل کر دیا ہے۔ اب بتاؤ، یہ سب سن کر میں کیا کہوں؟ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ بہ بنت میرے سامنے آجائے تو اپنے ہاتھوں سے اس کا ٹکڑا کھونٹ دوں۔ کیا فائدہ اسکی اداوار کہ جو جان بھی مشکل میں ڈالے اور عزت تو بھی منی میں دوں۔“ غیث محمد خود اچھا خاصا مجرا، بیٹا تھا، داماد کے بھتیجے ہی جیسا تھا۔

”تم اپنی جان کو دوسرے کو بچا چاہا، مجھے تو ساروں کی نظر پڑی ہے۔ چودھری کی خانو میں کو معصومی نہ جانو۔ اس کی خانو میں کسی بھی وقت غلامانِ بدن کرئیں تیار کر سکتی ہے بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ، مادی حوالہ اور بدخلصہ در کھل کے پیچھے بھی کوئی اور بات ہے۔ اگر زہر وغیرہ کے پیکر میں ڈاکٹر کا تھنا تو سبیلے پیوں کس ۱۲۵۰ جس صورت نے مٹنی اور زہر کی کبابی

اسے لاہوری آنہ تھا۔ البتہ شہر یار قیس میں جیلا ہو گیا تھا کہ موتی والا کو آخر اس سے ایسا کون سا کام آ رہا ہے جو وہ جگہ جگہ فون کھینک کر اسے نکالتی کرتی مگر وہ بڑا ہے۔

"مجھے احساس ہے شہر یار صاحب کہ آپ کو کافی عرصے بعد مگر آنے کا موقع مل جائے گا اور آپ کی خواہش ہوگی کہ اس مختصر وقت کو مکمل طور پر ہماری کے افراد کے ساتھ ہی گزاریں۔ لیکن مجھے آپ سے ملنا ہماری باتیں کرنی ہیں جن کے لیے میں آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ملاقات کے لیے رات باؤس آ جاؤں؟ اصل میں، میں چاہتا ہوں کہ آپ لاہور میں موجود ہیں تو اس موقع کا فائدہ اٹھا لیا جائے اور دوسری صورت میں بھی میں آپ سے ملنے میں درخواست کرتا کہ آپ کا جب بھی لاہور آئے ہو وہی فرصت میں مجھے ملاقات کا وقت دے دیں۔ آنے کو تو میں وہاں آپ کے دفتر میں بھی آ کر آپ سے ملاقات کر لیتا لیکن میری وہاں آمد کچھ تو کونوں کو چونکا دے گی اس لیے میں وہاں ملاقات سے گریز کرتا چاہتا ہوں۔"

موتی والا کے انداز گفتگو نے شہر یار کے قیس کو حیران کر دیا۔ اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ موتی والا سے ملاقات کے لیے انکار کرتا چنانچہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "اے مختلف سے کیوں کام لے رہے ہیں موتی والا صاحب۔ آپ کے لیے میں اتنا کہہ دیتا ہوں کہ آپ مجھ سے ملاقات کے لیے آنے کا چاہتے ہیں۔"

"فرصت اٹھانی کے لیے مگر یہ۔ یہ فرما بیٹے کہ کتنے بچے تک حاضر ہو جائیں؟" شہر یار کو جواب سن کر موتی والا نے پوچھا۔

"اگر فروری مقرر ہو رہا ہے تو مناسب رہے گا۔ اصل میں شام سے پہلے ہی میرا وہاں اس کے لیے روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔"

بھلا تھا۔ شہر یار کے ذرا تک روم میں داخل ہوئے یہ اس نے اپنی جگہ سے گھڑے ہو کر شہر یار سے ہاتھ ملایا۔ "پلیز شریف رکھیں۔" شہر یار نے خود بھی ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے اس سے کہا۔ موتی والا پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ شہر یار نے آخری بار اسے اس کے بیٹے کی موت کے ایک دن بعد دیکھا تھا اور اس کے بعد آج پھر وہ تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں ہی موتی والا کی صحت پر نمایاں فرق پڑا تھا۔ یقیناً انکو نے بیٹے کی موت کا کم اس نے اپنی جان سے لگا لیا تھا۔

"کیا لینا پیٹھ فرما نہیں گئے آپ... خضدا یا گرم؟" وہ اپنے میرے خیال میں مومن کی مناسبت سے کافی پانی چاہنے مناسب رہے گی۔" رقی ملیک۔ صاحب اور حال احوال کے بعد شہر یار نے موتی والا سے دریافت کیا۔

"مجھے مختلف کی ضرورت نہیں۔ میں میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا تھا۔ آپ میری وہ بات توجہ سے سن لیں، وہی مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔"

"باتیں بھی بولی رہیں گی موتی والا صاحب لیکن ساتھ میں کچھ لے لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ میرے خیال میں میں کافی مشکوفا ہوں۔" موتی والا کو جواب سن کر شہر یار نے اصرار کیا۔

"میں مختلف نہیں کروں گا شہر یار صاحب! واقعی مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔ اب خواہش ہوتی ہی نہیں ہے۔ بس سانسوں کے مسئلے کو جاری رکھنے کے لیے ضروری تھا تو ابیت زہر مار کر لیتا ہوں۔" بے کسی سے کہتے ہوئے موتی والا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چھینے لگی۔ اس کی کونچے میں چھلنے سے جانے کے لیے وہ مجھ پر بائیں خاموش بیٹھا۔ شہر یار نے بھی اسے پھیرنا مناسب نہیں سمجھا اور جب باپ اس کے سینے کا ہاتھ لگا کر تھکا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ انکو نے جہاں بیٹے کو کھانا لے والا باپ اپنی زندگی کے کس انتہائی تکلیف دہ دور سے گزر رہا ہوگا۔

"یہ دنیا عجیب جگہ ہے شہر یار صاحب! آؤی جاتا ہے کہ ایک روز اس دنیا کو چھوڑ کر جاتا ہے پھر بھی اس کی ہوس میں جتا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اپنی اولاد کے لیے آدمی کا بس نہیں چھوڑتا کہ کون کون سے خزانے جمع کر دے۔ میں بھی برسوں سے اسی ہوس میں جتا رہا لیکن اب یہ حال ہے کہ دولت کے انبار لگے ہیں لیکن جس کے لیے یہ سب جمع کیا تھا وہ دنیا سے جا چکا ہے۔ اس کے جانے کے بعد مجھے

احساس ہوا ہے کہ میں اپنی تعلیموں کو سودا گروں۔ اسی سلیب میں، میں نے آج آپ کو ملاقات کی زحمت دی ہے۔" موتی والا نے افسردہ سے لکھنے میں اتکا کیا اور ایک بار پھر چپ سا دھلی۔

"میں آپ کی بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں موتی والا صاحب! آپ کو کچھ کچھ بتانا ہے، یہ گفتگو کتنے جاہل۔" شہر یار نے اسے چپ ہونے کو کہہ کر بولنے پر اس کا تھوڑا ایک لمحہ کی سانس لیتے ہوئے دوبارہ بولایا۔

"آپ جانتے ہوں گے کہ میرے اور چودھری افتخار عالم کے درمیان کاروباری شراکت ہے۔ میرے بزنس کی نوعیت اور وسعت سے بھی آپ ناواقف نہیں ہوں گے۔ پہلے میں ایک چھوٹا سا بزنس میں تھا لیکن جب چودھری افتخار کے ساتھ بازنس میں شریک ہوئے، پچھلے تین سے تین سال تک چھوٹا بزنس تھا کہ میرے بزنس کی یہ ترقی چودھری افتخار کی بھاری سرمایہ کاری کی مرہون ملت ہے لیکن حقیقت سے مجھ سمیت چند ہی لوگ واقف ہیں۔ چودھری افتخار نے میرے ساتھ بازنس شپ کرنے کے بعد سرمائے سے زیادہ فکری فراہم کی۔ میرا ایک کے ساتھ جو دنگ لگتا ہے اس بنگل میں بڑی تعداد میں ٹیٹم کے درخت بائے جاتے ہیں۔ ان درختوں سے حاصل ہونے والی لکڑی بہت اچھی پائے کی ہوتی ہے اور پھر نجری سازی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چودھری افتخار اور اقبال باجو کے تھ جوڑنے کے نتیجے میں عرصے سے مجھے یہ لکڑی تقریباً مفت مل رہی ہے۔ بس مجھے برائے میں سے ان دووں کو حصہ دینا پڑتا ہے۔ خود بھی آپ نہیں گم چودھری افتخار پتا ہے، اقبال باجو کو تو ہم اس کی خاموشی اور کم پوچی کی قیمت ادا کرتے ہیں۔"

"آپ یہ سب کیوں بتا رہے ہیں؟" شہر یار نے موتی والا کو یہ غور دیکھتے ہوئے نہایت تنبیہ کی سے پوچھا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس بار جب جنگ سے لکڑی چھڑ کر نکلے گی پوری ہو تو آپ اپنی ٹیم کے ساتھ چھوٹا ماریں اور اس جرم میں ملوث افراد کو سزا قیام کریں۔"

"میں صورت میں تو آپ بھی زہن آگیاں گے۔ جب بات لگتی تو ظاہر ہے پھر دور تک جانے کی۔" موتی والا کے جواب پر شہر یار نے اسے نکالتی ہوئی نظروں سے دوڑھینے ہوئے احساس دلایا۔

"میں جانتا ہوں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔" موتی والا کو جواب پھر ان کی نظر سے گزرا۔ "کیا لینا آپ چودھری افتخار سے انتقام لینے کے پھر

میں کر رہے ہیں؟ چودھری صاحب شکوہ کرتے رہے ہیں کہ آپ کا اُن کے ساتھ ایسا رویہ ہے جیسے انہوں نے آپ کے بیٹے کو قتل کیا ہو۔"

"میں جانتا ہوں کہ چودھری افتخار نے میرے بیٹے کو قتل نہیں کیا۔ کم از کم یہ اراستہ تو اس نے ایسا نہیں کیا کہ میں اسے اپنے بیٹے کا قتل غیر ممکن لیکن میں حالات پر غور کرتا ہوں تو مجھے اپنے بیٹے کی موت میں اسی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ جب تک میری پڑھری افتخار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں ایک ایمان دار آدمی تھا۔ میرا کاروبار چھوٹا تھا لیکن اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ میں خوش حالی تھی۔ میں بیوی اور بچے کو اچھا خاصہ وقت دے رہا تھا۔ میرا بہت ذہین تھا۔ اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے میرے ابا جی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اسے حافظہ قرآن پڑاؤں۔ ابائی کے سرنے کے بعد بھی میں ان کی اس خواہش کو عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن پھر میری چودھری افتخار سے ملاقات ہوئی۔ بس پھر تو میں دولت جمع کرنے کی دھن میں ڈھکا ہو گیا۔ نہ مجھے اپنی کی خواہش یاد رہی نہ بیٹے کو اپنے کے لیے وقت بچا۔ ایک باپ کی حیثیت سے اپنے بیٹے کی تربیت اور نگرانی کی جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی کی اس کو میں اپنے طور پر فونوں کی گڈیاں لانا کر دیا اور کر دیا۔ بیٹے کی فراوانی اور تربیت کے فقدان نے اثر دکھایا۔ میرا بیٹا اپنے دادا کی خواہش کے مطابق حافظہ قرآن پڑھنے کے بجائے ایک بھرا کر میں زادہ بن گیا۔ اس کے کہ تو دل سے متعلق خبریں میرے کان میں پڑتی رہتی تھیں۔ ایک بار شاپ میں بیٹے کی فراوانی کے جرم میں گرفتار بھی ہوا تھا میں نے تھانے دار کو رشوت دے کر اسے پھڑا لیا۔ اس وقت میرے ذہن میں تھا کہ میرے بیٹے کو میری دولت پر ہمارے بیٹے کرنے کی آزادی ہے لیکن جب وہ مرا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کی بے جا آزادی کا یہی نتیجہ نکلیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کی پوسٹ مارم رپورٹ دیکھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کتنی حالات میں مرا کر میں یہ بھی کھتا ہوں کہ یہ حالات چودھری افتخار کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اگر وہیے رام ذرا مانع سے دولت کمانے کی دھن میں نہیں لگا تو شاید ایک چھوٹا سا بزنس میں ہوتا جس کے پاس اپنے بیٹے کی تربیت کرنے کی فرصت ہوتی۔ جس کی کمائی میں خراج کی اس قدر آمیزش نہیں ہوتی کہ اس کی اولاد حرام و حلال کی تمیز کرنے کی صلاحیت کو کھینچتی۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ہر حال کی ذمہ داری چودھری افتخار کے سرفال کو خود کو بری العزہ آرا دیا چاہتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں

ہے، میں اپنا حرم تسلیم کرتا ہوں اور اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ اگر میری درخواست پر غور کرتے ہوئے آپ کو کوئی کارروائی کرنے ہیں تو میں از خود اعتراض پر جرم کرلوں گا لیکن فی الحال میرا منظر پر رہنا ضروری ہے۔ میں بہت اب میں موجود ہوں گا جب ہی آپ کو بتا سکیں گا کہ اگلی کھپ کب اسمبلی کی جائے گی۔ اس مقدمہ کو سامنے رکھ کر میں نے ابتدائی جذباتی پن کو چھوڑ کر چودھری افتخار سے اپنے مراسم دوبارہ استوار کر لیے ہیں۔ اب وہ دوبارہ اس مقدمہ میں جتا ہے کہ میں اس کا کاروباری حلیف ہوں لیکن جو جے جے ۱۰ میں نے آپ کو بتا دیا۔ شہریار کے سوال کے جواب میں مولوی والا نے ایک جذباتی اور تفصیلی بیان دیا۔ شہریار مجھ پر ہاتھ کر ہاتھ کر مولوی والا کی یہ کیا پلٹ بیٹے کی موت کے شدید صدمے کا نتیجہ ہے۔ قدرت کے کارخانے میں ایسے واقعات کا جنم لینا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اولاد کے صدمے سے بڑے بڑوں کو ٹوٹا ہوا دیکھا گیا ہے۔ ہاں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایسے کاربی نظم کھا کر بھی اپنی غلط روش پر ڈٹے رہتے ہیں۔ شاید وہ لوگوں کی اس قسم سے تعلق رکھتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہو۔ مولوی والا کی کیا اس لیے پلٹ گئی تھی کہ وہ بنیادی طور پر ایک شریف انسان تھا جس نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ ایمان و ادبی سے کام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ بعد میں دولت کی چمک نے اس کی آنکھوں کو چمکا چمکا کر دیا ورنہ جو شخص اپنے آپ کی خواہش پر اپنے بیٹے کو حافظہ قرآن بنانے کا ارادہ رکھتا ہو، وہ غلط فہمی کا ایمان اور برائی نہیں ہو سکتا۔

”میں آپ کے تعاون کے لیے شکر گزار ہوں گا مولوی والا صاحب! آپ مجھ سے مسلسل رابطے میں رہیں گے آپ کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق میں ٹکڑی کے ان انکوائری کو جھانپنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ آپ کے تعاون کے سلسلے میں آپ پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نسبتاً اہل فرد و جرم عائد کی جائے۔“ شہریار غور سے تھا کہ ایک ایسے موقع پر جبکہ وہ چودھری افتخار کی شخصیت کا ایک بھیانک روپ لوگوں کے سامنے لانے والا تھا، قدرت نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ چودھری افتخار کا ایک دوسرا روپ بھی سامنے لا سکے۔ ماہ بانو والے معاملے کے ساتھ ساتھ یہ معاملہ بھی سامنے آجاتا تو چودھری افتخار کے لیے آزمائش سے اپنی جان بچا کر بھاگ نہیں رہتا۔ اسے یہ موقع مولوی والا فراہم کرنے والا تھا اس لیے جواباً اسے بھی کوئی ریلیف ملنا چاہیے تھا مگر مولوی والا کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ اس نے کہا۔

”آپ کا شہریہ شہریار صاحب لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کسی نرمی کا خواہش مند نہیں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اپنے جرم کا تقاریر کچھ کر رہا ہوں اور کفار و ادا کرنے کے خواہش مند نری اور آسانی تلاش نہیں کرتے۔“ اپنی اس بات کو کہنے کے بعد مولوی والا مزید وہاں رہا نہیں اور شہریار سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار بڑی اور تک بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ تعالیٰ آدمی کا دماغ لٹکانے پر لانے کے لیے کیا کچھ نہیں دکھاتا مگر مگر ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت پکڑیں۔ عموماً لوگوں کو کھل اسی وقت آتی ہے جب وہ خود ٹھوکر کھاتے ہیں اور بعض بد نصیب تو ٹھوکر کھا کر بھی نہیں سمجھتے۔

☆ ☆ ☆

”تم سو کس نہیں ابھی تک؟“ مرد اور عجم روشن برآمدے میں پہنچی ماہ بانو اپنے خیالات میں اتنی غرق تھی کہ اسے خبر نہیں ہو سکی کہ کب دارالامان کی منظر اس برآمدے میں داخل ہو کر اس کے قریب آچکی۔ منظرہ بیٹھتا ہے معمول کے مطابق رات کو سونے سے قبل دارالامان کا آخری چکر لگاتی رہی تھی۔ وہ انداز مگر ایک عامی شکل و صورت کی عورت تھی جو مزاجاً بہت دیرینے کے باوجود کافی اصول پرست تھی اور اس اصول پرستی کی وجہ سے اسے اکثر سختی سے بھی کام لینا پڑتا تھا مگر اس وقت ماہ بانو سے سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

”نہیں نہیں آری۔ طبیعت بہت بے چین ہے۔“ ماہ بانو نے بھی نظروں کے ساتھ منظرہ کے سوال کا جواب دیا۔ آج شام ہی تو اسے منظرہ سے سخت ڈانٹ سننے کوئی تھی۔

”میں سمجھتی ہوں کہ تم بہت پریشان ہو۔“ اسے مگر سے الگ کسی دارالامان بھی جگہ پر رہتا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب بلند جانتا ہو کہ اس کے گھر میں اس سے محبت کرنے والے لوگ اس کے منظرہ ہیں۔ مجھے تمہارے حالات کے بارے میں مکمل علم نہیں مگر مجھے تمہارے مسئلے میں بہت سختی سے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کسی کو بھی تمہاری یہاں موجودگی کے بارے میں خبر نہ ہو سکے۔ آج شام تم نے جو حرکت کی تھی، وہ بہت خطرناک تھی۔ جانتی ہو شام سے میرے پاس کئی دفعہ مختلف نمبروں سے فون آئے ہیں کہ ہماری ماہ بانو سے بات کروادیں۔ میں نے سختی سے کہہ دیا کہ یہاں کوئی ماہ بانو نہیں رہتی۔ یہ کسی کی باتش کاہ نہیں بلکہ ایک ایسا حال ہے۔ ایک لڑکی نے تو مجھ سے ابھی خاصی بحث کی کہ آپ جھوٹ بولی رہی ہیں۔ ماہ بانو یہاں

موجود ہے اس نے خود مجھے اس ٹبر سے فون کیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ ٹی بی ایبلیک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ماہ بانو نام کی کسی خاتون نے اسپتال کے فون سے آپ کو فون کیا ہو۔ وہ کسی کام سے یہاں آئی ہوں تو آپ کو فون کر لیا ہو گا لیکن اب وہ بیان نہیں ہیں۔ تو میں ان سے کسی طرح آپ کی بات گراؤں۔ بڑی مشکل ہے اس لڑکی نے میری بات پر یقین کیا۔" لہجہ نرم ہونے کے باوجود ماہ بانو نے محسوس کر سکی تھی کہ مشفقہ اس کی حرکت پر بددش ہے۔ مشفقہ بخوبی طور پر ایک اچھی عورت تھی اور ماہ بانو کو اس کی ناراضگی اچھی غلطی تھی لیکن لگ رہی تھی۔ چنانچہ فریڈی کے کہنے احساس کے ساتھ وہ بولی۔

"نوری میزم! مجھے احساس ہے کہ میں نے غلطی کی ہے۔ اصل میں میری طبیعت دھنیں والے سے آتی ہے لیکن مجھے کہیں رہیں سکی۔"

"مجھے خود بھی شہزادی کیفیت کا اندازہ ہے۔ اس وقت میں جھپٹتی تھی سے ڈانٹ کے اندر سونے کے لیے بیچنے کے بجائے میں شہزادے پاس رہی تھی اس لیے ہوں کہ کہیں کچھ سکون۔ میں برسوں سے اس دارالامان میں ملازمت کر رہی ہوں۔ یہاں رہنے والی عورتیں کسی نہ کسی بیجوری یا مشکل کا شکار ہوتی ہیں لیکن خود کچھ لوگ ان سب سے کسی طرح حالات کے ساتھ جھجھکا کر رکھا ہے۔ وہ آپس میں ہنسی بوٹی بھی ہیں اور لڑائی جھگڑائی بھی ہیں، ساتھ ساتھ وہ لیکن کے کام بھی چلتے رہتے ہیں۔ تم بھی اپنی کسی مشکل کی وجہ سے یہاں آئی ہو۔ امید ہو کہ شہزادی مشکل بند ہو جائے گی اور تم یہاں سے واپس اپنے گھر چلی جاؤ گی لیکن جب تک یہاں ہو، جب تک تو تمہیں بہت اور برداشت سے کام لیتا ہی ہوگا۔ اس طرح راتوں کو جاگ کر کھٹنے سے کیا حاصل ہوگا؟ چلو جاؤ شاہا! جا کر سو جاؤ۔"

ماہ بانو کی معذرت کے جواب میں مشفقہ نے اسے سمجھاتے ہوئے نرمی سے صبر کیا تو وہ اس قسم کی جھڑپوں میں اس کے لیے طرف بردھ گئی جہاں اس کا تپ تھا۔ اس کے سر سے میں اس کے ساتھ چند دوسری عورتیں بھی بیٹھ گئیں۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ تمام عورتیں سنانے سے کبھی خندہ سوری ہیں۔ اسے ان عورتوں کی اس قدر پر سکون خندہ پر خیرت ہوئی۔ دارالامان میں اپنے چند روزہ وقار کے عرصے میں سنی وادیتی ساری عورتوں کے حالات سے اچھی خاصی واقف ہو گئی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی افسوس، ناک واقفہ پیش آیا تھا۔ ایک عورت کچھلے پندرہ سال سے یہاں رہ

رہی تھی۔ اس عورت کے ماں باپ مریچک تھے۔ کسی مزاج نے کچھ عرصے اسے گھر بنا دیا اور پھر جان چھڑانے کے لیے بغیر دیکھ بھال کے شادی کر دی۔ سسرال والے نے نہایت مہلکوں کے جو بیٹے جنہ کے آنے والی ملازمت ہو کر ہر طرح کا ظلم کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ وہ بے پاری روزانہ کی مار پیٹتے اور گلی کوچے خانواری سے کتنی بدگلی۔ شکایت کرتی بھی کوئی نہیں ہے؟ سیکے کے نام پر کوئی آسرا نہیں تھا اور شوہر بھی اپنے گھر والوں کا ہم نوا تھا۔ اس عورت نے کچھ اپنا تھا کہ اب اس کا سر نہ جینا ہی ظالم سسرال میں ہے لیکن سر نہ گنتا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اسے اس وقت بچا چاہا جب اس کی سمان اور نندوں نے فانی کر کے اسے جلانے کی کوشش کی۔ وہ کسی طرح ان سے جان بچا کر گھر سے بھاگ نکلی اور اپنی لگی کر پھر پلٹ کر بھی واپس جانے کی ہمت نہیں کی۔ اب وہ پندرہ سال سے اس دارالامان میں بھی اور اپنے سسرال کے مقابلے میں یہاں بہت خوش تھی۔ غرض ہر عورت کے پیچھے اس طرح کی کہانی تھی جو وہ برتنے آئے والے کو شاید اپنے دل کا بوجھ بنا کر لے کے لیے سنا دیتی تھی۔ ماہ بانو سے بھی ان لوگوں نے اس کے حالات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن ماہ بانو کو اپنی اسے عبداللہ ان کی ہدایات یاد تھیں۔ اسے یہاں بچوانے سے قبل اس نے کتنی سے بات کی تھی کہ اپنے بارے میں کبھی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ ماہ بانو پوری طرح سے اس کی بات پر عمل کر رہی تھی۔ لیکن وہ دارالامان میں سترہ دوسری عورتوں کی طرح یہاں رہنے بیٹھنے میں ناکام تھی۔ اسے ہر وقت بے بے ادبیاں کی یاد آتی رہتی تھی اور آج کل تو کچھ زیادہ ہی بے قراری تھی۔ اس بے قراری کے باوجود ہی مجبور ہو کر اس سے ایک بھی بولی نہ تھی۔ یوں تو اس نے عبداللہ ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فیصل آباد میں اس کی بے ادبیاں کو اس کے بارے میں مطلع کرے گا لیکن پھر بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ خود ان دونوں سے بات کر کے مشفقہ سے اس سلسلے میں اس نے ایک بار ملازمت بھی دہلی تھی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج ماہ بانو بہت بے چین ہوئی تو اس نے دارالامان کی ایک ملازمہ کو چند روپے دے کر اس کی بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسے سوچ دیکھ کر فون پر گھر پر آ کر اسے ملے گی۔ ماہ بانو کے اپنے گھر میں تو فون نہیں تھا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹوں کے گھر فون کیا کہ بے بے کو ہاں بلوا کر بات کر لے گی لیکن ہوا یہ کہ کسی اس نے لائن ختم کر کے بدصرف اتنا ہی بتایا تھا کہ میں ماہ بانو بول رہی ہوں تو جا چکے مشفقہ وہاں پہنچ گئی۔ اس نے ماہ بانو کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر

لائن کاٹی اور پھر اسے ٹھیک ٹھاک ہاتھیں بھی سنا دیں۔ ماہ بانو کا ساتھ دینے والی ملازمہ کی تو اس نے گلی بنا کر شامت آگئی تھی۔ ابھی برآمدے میں ہوئے والی ملازمت میں مشفقہ نے اس فون کال کے حوالے سے اسے دوبارہ سمجھایا تھا۔ ماہ بانو کا یہ حد تک اس کی بات سمجھ گئی تھی لیکن دل کی بے قراری اپنی جگہ تھی۔ وہ کمرے میں موجود دوسری عورتوں کی طرح ایسے گھڑی سے سونے میں کام تھی۔ اسے رورور کر کے شہزادہ عادل اور اس کے بی بی اسے پر بھی غصہ آ رہا تھا جو اسے اس واقعہ والا مان میں پھنکا لے کے بعد بھول ہی گئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، اس وقت وہ ان پر آنے والے کو کسی صورت نہیں کال کیتی تھی چنانچہ بے بسی ہی ہو کر مشفقہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بہتر پریکٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

بہت دیر کی کوشش کے بعد بھی اسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ذہن کچھ کچھ غور کی میں چاہیہ۔ غور کی اس کیفیت میں اس نے باہر برآمدے میں قدموں کی آواز سنیں۔ قدموں کی آواز سنیں اس گھر کے دروازے پر آ کر تھیں جس میں ماہ بانو موجود تھیں۔ یک دم دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ ماہ بانو بڑا کر اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر اڑنے سے وہ ڈھٹا پوٹھی نمودار ہو گئی۔ ان کے ساتھ دارالامان کی خوف زدہ مشفقہ بھی تھی۔ مشفقہ کو ایک اچھا لاش نے اپنے رچا پور کی زبیر لے رکھا تھا۔ ماہ بانو کو یہ سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا کہ آئے والے اچھا لاش چودری شہزادہ کے گھر میں ہیں جو اس کی جاس میں یہاں تک آچکے ہیں۔ ماہ بانو پر کراہی بھرتے تھے کہ کسی طرح ان لوگوں کی گرفت میں آنے سے پہلے کتنی بھاگ جائے لیکن اس کے سر میں فراد کا واحد راستہ وہ دروازہ تھا جس پر دونوں اچھا لاش ڈنکے ہوئے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ شہزادہ اپنے بیڈروم میں گھری خندہ سوز تھا کہ اسے دروازے پر ہونے والی دستک ملانی دے۔ شہزادے چونک کر سر ہانے دیکھ بولی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر مزے جھرانے ہوئے "نیں کم ان" کہا۔ اگلے لمحوں اس کا کمر ساٹے سو چڑھا۔

"نوری سرا! اس وقت آپ کی خندہ خراب کرتے پر معذرت چاہتے ہوں۔ اصل میں عبداللہ ان صاحب آئے ہوئے ہیں اور آپ سے فوری ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاملہ بہت عجیبہ اور فوری نوعیت کا ہے۔" بڑے شہزادے سے معذرت کرتے ہوئے رات کے اس پہر

اسے ڈسٹرب کرنے کی وجہ بتائی۔ وہ کئی کمرے پر پٹیاں ہو گیا۔ عبداللہ ان ایک کچھ دار اور ڈنکے دار آدمی تھا جو بلاوجہ اس وقت اسے ڈسٹرب نہیں کر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے، ہم چلے آ رہے ہیں۔" عبداللہ ان کی آواز کی ہر کے بارے میں اندازہ لگنے کی کوشش کرتے ہوئے شہزادے نے کچھ کوشش کی اور پھر وہ سلیک سوٹ پر گزرا بیٹھے کے بعد انھوں نے بال اسٹار جاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ عبداللہ ان نے چلے آ رہے تھے اس کا منتظر تھا۔

"نوری سرا! معاملہ بہت اہم تھا اور میں اس وقت آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتا۔" شہزادہ کو دیکھتے ہی عبداللہ ان اس سے معذرت کی۔ خود اس کے چہرے سے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی کچھ کی خندہ سے بگاڑ گیا ہے۔

"کیا برا واقعہ ہے؟" عبداللہ ان کی معذرت کو نظر انداز کرتے ہوئے شہزادے نے تنبیہ کی ہے چھا۔

"لاہور کے دارالامان کی مشفقہ کو فون آیا تھا سرا! اس نے بتایا ہے کہ کچھ لوگوں نے ماہ بانو کو وہاں سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش تو ناکام ہو گئی لیکن ماہ بانو اس وقت ملانے کے قاتلے میں سے جہاں ایس ایچ اے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔" عبداللہ ان کی وہی ہوئی اطلاع نے شہزادہ کو ایک دم ہی مستغرب کر دیا لیکن اس نے کمال مضیاع سے کام لیتے ہوئے اپنے اضطراب کو قابو میں رکھا اور سچاتے کچھ عبداللہ ان سے بولا۔

"سب کیسے ہوا۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ؟"

"تو زیادہ تفصیلات تو مجھے خود بھی نہیں معلوم سراسر مشفقہ کے مطابق رات کے وقت دارالامان کے گیٹ پر دو چوکیدار موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک چوکیدار ضرورت کے تحت ہاتھ دھو کر ماہ بانو اور اس وقت کچھ لوگ دیوار چھٹا کر دارالامان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو بے ہوش کیا اور پھر مشفقہ کے کمرے میں گھس کر اسے اس کے زور پر بھجور کیا کہ اسے ماہ بانو تک پہنچا دیا جائے۔ ظاہر ہے، مشفقہ کو اپنی جان بچانے کے لیے ان کا حکم ماننا پڑا۔ وہ لوگ ماہ بانو کو زور دے کر اٹھا کر لے جا رہے تھے کہ وہ چوکیدار جو ہاتھ دھو کر ماہ بانو کو اٹھا کر لے آیا۔ اس نے دوسرے ہی صورت حال بھانپ لی اور اپنی راکٹل کے زور پر حملہ آور دہلی سے مقابلہ کرنے مڑا ہوا۔ وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے لیکن اس اچانک حملے کی وجہ سے مکمل نہیں سکے۔ چوکیدار نے سب سے پہلے اس شخص کی ٹانگ میں گولی ماری جس نے ماہ بانو کو اٹھایا ہوا تھا۔ ایک اندھ شخص بھی لڑکی ہوا۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ سے ملنے ہمارے رہائش گاہ کے۔
 ”وہ جو لڑکی نہیں مانتا، جس سے ہم نے غریبوں پر
 ہندی لگوائی تھی۔ اس پر مٹانے لگی لڑکی پر اپنا کیا کا دل لگایا
 ہے۔“ تاجور نے تھوڑے تھوڑے دنوں کی بیٹی ۱۲ سالہ تو بہت کم عمر ہے۔
 ”ماہ بانو۔ وہ نور اس کی بیٹی ۱۲ سالہ تو بہت کم عمر ہے۔
 اس کا اور اپنی کچھ بھائی بہنیں؟“ کشمیر پران ہوئی۔
 ”نکل تو گئی نہیں ہے۔ اہل کو تو سارا غصہ ہی اس
 بات کا ہے کہ ابھی تک کینوں کی ادا کو ان کی سوتیلے بھائی
 بڑا ہی پرانے پرانے ہیں۔“ ماہ بانو اور چودھری افکار کے
 باہن قرنی کا تاجور کو بھی احساس تھا لیکن اس کی سوچ مختلف
 تھی۔

”ماہ بانو تو شہر کی رہنے والی پریمی لکھی لڑکی ہے۔ وہ...
 راضی ہوئی اس کا ہوا؟“ تاجور کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر
 کشمیر نے دوسرا سوال پوچھا۔
 ”کیا؟“ دیکھا نہیں تھا تو نے اسے کہ کسی لڑکی سی
 تھی۔ بھانجی ساروں کو مل دے کر۔ آج کل اپنی اس کی
 تلاش میں بولتا ہے ہوتے ہیں۔“ تاجور کو کچھ خبریں تو بڑی
 چودھری ان سے دی تھیں اور وہ ان ملازموں کی مرہون منت
 تھیں جو چودھری افکار کی خوشی میں رہ رہ کر یہاں والوں کے
 لیے باقاعدہ جاسوسی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔
 ”اپنی کو یہ نہیں علم کرنا چاہیے تھا۔ بھلان کا اور ماہ بانو
 کا کیا میل تھا؟ اب ان سے ملنے کے لیے بے چاری لڑکی
 جانے کہاں کہاں پھرتی پھر رہی ہوگی؟“ کشمیر کو شدید افسوس
 تھا۔

”مجھے ماہ بانو کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ ادھر میں اور
 صوبہ پریشان ہیں کہ ابھی کہ ان خاتون کا ہمارے گھر پر کیا
 اثر پڑے گا؟ کل کو ہمارے شوہر بھی کھڑے ہو جائیں گے
 دوسرا لیاؤ کرے۔ جہاں رہا افسوس تو یہ ہے ہی آج کل ہر وقت
 جتنے جتنے ملازم رہتا ہے کہ کسی کو بھی بھدی صورت؟ اڑ پین
 غلوں کی پھیل چھٹی، مبالغہ کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی
 بیرونیوں کو دیکھ کر دماغ خراب ہوا جا رہا ہے اس کا۔“
 تاجور کی اپنی پریشانیوں تھیں۔ اسے ماہ بانو کا فہم کیا تاکہ
 سنا۔

”اس بات کے لیے تو آپ کو ہمیشہ تیار رہنا
 چاہیے۔ ہمارے ہاں کے مردوں کے بہت سے مشاغل ہیں
 سے ایک مسئلہ یہی تو ہے۔“
 ”تو اسے آرام سے اس لیے کہہ رہی ہے کہ مجھے معلوم
 نہیں کہ سوتیلے کا چلا یا کیا ہوتا ہے۔ اپنے شوہر کو کسی دوسری

عورت سے باہنے کا خیال ہی عورت کو آدھا کر دیتا ہے۔“
 کشمیر کی بات کے جواب میں تاجور نے اس قدر جھلکا کر کہا کہ
 کشمیر کے سارے چہرے پر کرب کے آثار چھانکے۔ تاجور کو
 اپنی بات کی سنجیدگی کا احساس ہوا کہ اب تو تیرکان سے نکل ہی
 چکا تھا۔ اس نے شرمندہ ہو کر کشمیر کے سامنے سے ہٹ جانا ہی
 مناسب سمجھا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔
 ”تو راجہ کو دیکھو تو کسی نے منور کو چھوڑ دیا کیا ہے کہ نہیں۔
 وہ ماسٹر سے پڑھانے کے لیے آئے ہیں والا ہوگا۔“
 ”منور تیار ہو گیا ہو یا اب تو اسے میرے پاس بھیجنا۔ مجھے
 ایک کتاب منگوانی ہے۔ ماسٹر صاحب شہر جاتے دے دیں اور
 انہیں نام لکھ کر دوں گی تو وہ داریں گے۔“ کشمیر نے فوراً ہی
 خود پر توجہ پالیا تھا اور اب بہت عام سے لہجے میں تاجور سے
 کہہ رہی تھی۔

”تو ہے کشمیر چودھری کتاب۔ ابھی تو شہر سے اتنی
 اچیر تک میں خرید کر لاتی ہے۔“ تاجور نہ چاہتے ہوئے بھی
 بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھی۔
 ”یہ کتاب جو مجھے منگوانی ہے اس وقت ہی نہیں تھی اس
 لیے اب ماسٹر صاحب سے منگوانے کی سوچ رہی ہوں۔“
 کشمیر نے بہت مل سے تاجور کے اعتراض کا جواب دیا تو وہ
 شائے اچانک سے ہونے لگا پھر نکل گئی۔

تاجور بعد تک منک سے تیار منور کشمیر کے سامنے کھڑا
 تھا۔ کشمیر نے ایک صاف منور سے کھڑے ہو کر لکھ کر اس کے
 حوالے کیا۔ اسی وقت ایک ملازم نے ماسٹر آفتاب کے پیچھے
 کی اطلاع دی۔ منور کا کاندہ ہاتھ میں پکڑے بھاگتا ہوا وہاں
 سے اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں ماسٹر آفتاب اس کا
 منتظر تھا۔ جاتے ہی اس نے کاندہ ماسٹر آفتاب کے ہاتھ میں
 پکڑا اور بولا۔ ”یہ چھوٹی خالہ نے دیا ہے۔ سچی جیٹھ سے
 ان کے لیے یہ کتاب لادیں گے۔“

منور کا پیغام سن کر ماسٹر آفتاب سمجھ گیا کہ دوس کا ذکر
 کر رہا ہے۔ شہر میں زبردستی سے لڑکی کا زوی میں لٹ دینے
 والی چودھری ان کے برابر نشست پر رہی اور وہیں کتابیں اس
 نے خود اپنی آنکھوں سے مطالعہ تھیں۔ کتابوں کی دیرپا اس
 حسی چودھری نے اس سے کون سی کتاب منگوانی ہے، یہ
 دیکھنے کے لیے ماسٹر آفتاب نے نہ کیا ہوا کاندہ کھولا۔
 تاکہ اڑتی ہے رات بھر مجھ میں
 کون ملتا ہے درد مجھ میں
 مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
 تو ہے سوجھو اس قدر مجھ میں

کاندہ پر کسی کتاب کے نام کے بجائے بہت صاف
 ستری لکھائی میں یہ چند اشعار لکھے تھے۔ ماسٹر آفتاب کے
 ہاتھوں کے طے لڑ گئے۔ چودھری افکار کی صاحب زادی
 نے جو پیغام لکھا تھا وہ اسے مشکل کا بہت خطرہ بن گیا تھا۔ اگلا
 رہا تھا۔ لیکن اب ماسٹر آفتاب نے خاموش رہنا ہی مناسب
 سمجھا اور کاندہ دوبارہ کئی ایک جیب میں رکھتے ہوئے منور
 کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن منور کو پڑھانے کے دوران بھی اس
 کا ذہن مسلسل الجھا رہا۔ اس نے شہر میں ہونے والی مختصر
 ملاقات میں کشمیر کی حسی فطرت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔
 اپنی روایات اور ماسٹر آفتاب کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے
 ہوئے وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ماسٹر آفتاب کو اپنی
 گاڑی میں لٹ دے کر رہی تھی۔ اپنی حسی طبیعت کی لڑکی
 اپنے جذبات کے اختیار پر اتنی آگے تھی کہ ماسٹر آفتاب کے
 خاموش رہنے کی حکمت عملی نہ جانے کس حد تک کامیاب ہو
 پاتی؟

”کچھ معلوم ہو امجد اللہ ان کے کل کا واقعہ کیسے پیش آیا؟“
 ”نہیں سرائیس سے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔
 میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں این جی او کے نمائندے کی
 کوئی مداخلت نہیں تھی، جو چوہدری ابوہامد کو اپنی ایک پھوپھی سی
 ظلمی کی وجہ سے ہوا۔“

”کیسی ظلمی؟“ امجد اللہ ان کا جواب سن کر شہر پر چلا۔
 ”دارالامان کی منتظر نے تیار ہونے کے کل شام ماہ بانو نے
 اس کی اجازت کے بغیر ایک ملازمہ کی مدد سے فون پر فیصل
 آباد اپنے والدین سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق
 سے منتظر میں سے فون پر وہاں پہنچ گئی اور اس نے اُن کی اس
 تکلیف کو دیکھ کر اپنی دوسری ماہ بانو کو تیار ہی بلکے تھی۔
 فون اس نے اپنے پردیسوں کے شہر پر کیا تھا۔ منتظر نے اُن کی
 منتظر کی تو فوری دیر بعد ہی شہر سے ایک لڑکی کا فون لگایا
 کہ ماہ بانو سے بات کرنے ہے۔ منتظر نے صاف کہہ دیا کہ
 اس شہر پر کوئی ماہ بانو نہیں ہوئی۔ ساتھ اس نے یہ بیان بھی کر
 دیا کہ یہ فون ٹیکہ لیکر اپنا ل کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس شہر سے
 کسی دیر خاتون نے جس کا نام ماہ بانو ہو سکتی ہو لیکن اب
 انکی کوئی خاتون یہاں موجود نہیں۔ منتظر کے اس انکار کے
 باوجود ایک دو فون اور آواز کے پھر مسلسل لگتا گیا۔ فون چونکہ ہر
 بار کسی لڑکی سے کیا تھا، اس لیے منتظر زیادہ خوش نہیں تھا
 نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے جس اس دے کی اطلاع دینا
 ضروری سمجھا لیکن رات کو جب ماہ بانو کو انوار کو رات کی کوشش

کی گئی تو اسے احساس ہوا کہ فون نمبر کے ذریعے دارالامان کا
 پتا معلوم کر کے ساری کارروائی کی گئی تھی۔“
 ”اس کا مطلب ہے ماہ بانو کے پردیسوں سے چودھری
 افکار کے لیے خبری کا کام انجام دیا۔“ امجد اللہ ان کی بتائی
 ہوئی تفصیلات سن کر کچھ دیر سے خیال غامض کیا۔

”تو سہ! ایسا نہیں ہے۔ میں نے اپنے پردیسوں کے
 ذریعے پوری تحقیقات کر دوائی ہیں۔ چودھری افکار کو ماہ بانو کی
 لاہور میں موجودگی کی خبر تو پہلے سے تھی۔ اس کے پردیسوں کی وجہ
 سے ہوئی لیکن ایسا نہ دیکھا تھا کہ وہ لوگ بے چارے ماہ
 بانو کے غائب ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ جب ماہ بانو
 نے فون کیا تو اس کی آواز میں کچھ بانی ہو گئے۔ ادھر منتظر
 نے کوئی بات ہوئے سے نہیں ہی اس کی اس کیفیت کو دیکھی تھی۔
 کال ریسیو کرنے والی خاتون نے ہی اس کی آواز پر آنے والا نمبر
 دیکھ کر خود کال مانی۔ پرانے پردیس ہونے کی وجہ سے انہیں ماہ
 بانو کی فکر تھی اور وہ اس سے بات کر کے اس کا حال احوال
 معلوم کرنا چاہتی تھیں لیکن ظاہر ہے منتظر نے سر سے ماہ
 بانو کی موجودگی سے ہی انکار کر دیا تو وہاں پر ہو گئیں۔ اب
 جیسا کہ چھوٹے خاتون کے غلوں کا راج ہوتا ہے کہ کوئی بھی
 بات خود تک محدود رکھنے کے بجائے سارے نکلے کو اس
 بارے میں اطلاع دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ویسا ہی ان
 خاتون نے کیا۔ جوش میں انہوں نے اپنے دروازے پر
 کھڑے کھڑے ہی سامنے والے گھر کی خاتون کو اس کال
 کے بارے میں بتا دیا۔ پھر نکلے کی چار اور خواتین کو بھی اطلاع
 دی۔ یوں پچیسوں ماہ بانو کی کال نے سارے محلے میں اچھل
 پھری جا دی۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے کہ چودھری
 افکار کے بندے ابھی تک ماہ بانو کے بارے میں سن میں نہیں لینے
 کے لیے اس کے محلے کے پکڑ کاٹ رہے تھے، چنانچہ انہیں
 بھی اس کال کی خبر ہو گئی۔ پردیس خاتون سے جو پوچھ گچھ کے
 نتیجے میں معلوم ہوا ہے کہ ماہ بانو کی کال کے ایک گھنٹے بعد ہی
 ایک لڑکی ان کے گھر آئی تھی اور خود کو ماہ بانو کی دوست اور
 کلاس کیو ظاہر کر کے اس سے رابطہ کو کوئی ذریعہ دریافت کیا
 تھا۔ اب جیسا کہ گلوٹا خواہش کی عادت ہوئی ہے کہ وہ ہر
 بات ہر ایک کو بتانا ضروری سمجھتی ہیں، چنانچہ پڑوسن صاحب نے
 بھی اپنے گھر آئے والی لڑکی کو ماہ بانو کی کال کی جان کر اس کے
 سامنے ماہ بانو کے محلے میں کافی غرور دیا کہ ابھی دیا۔ اس
 کے غائب ہونے کے محلے میں اسے قائم کردہ مغزوں کو
 افسوس کیا اور ساجھی سے یہی بتا دیا کہ آج ماہ بانو نے نہیں
 سے انہیں کال کی تھی لیکن بات نہیں ہو گئی۔ انہوں نے خود

بات کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ نیرنگی اسپتال کا ہے اور وہاں کوئی ماہر نوکوجائے والا نہیں۔ لڑکی نے ان سے کہا کہ آپ مجھے وہ نیرنگی دیں۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ انہیں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ سچ ہے یا غلط۔ لڑکی نے ان حاقون پر یہ عجب ہی ڈالا کہ اس کا ایک کزن پولیس میں ایف بی سی کے پر ہے اور وہ اپنے کزن کے ذریعے اس کال کے بارے میں مکمل تحقیقات کر دے گا۔ حاقون نے لڑکی کو نیرنگی دے دیا اور اب اس انتظار میں ہیں کہ ماہر نوکری کتنی جلد انہیں ماہر نوکری کے بارے میں کوئی خبر دے گی لیکن رات دارالامان میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد تو صاف ظاہر ہے کہ وہ لڑکی کوئی ماہر نوکری نہیں بلکہ چودھری افتخار کی کوئی آنکلا کا مریض جو بہت چالاکی سے ماہر نوکری کے بارے میں ایک امیر سراغ حاصل کرنے کی سعی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہم سب ہی جانتے ہیں۔

عبداللہ کی حاصل کردہ معلومات بہت غریب تھیں۔ وہ ایک تجربہ کار آدمی تھا جو دقت ضرورت اپنے تعلقات استعمال کرنا خوب جانتا تھا۔ رات کو وہ ماہر نوکروں کے ٹھکانے پر جا چلا تو خود بھی غصے سے بہت بے چارہ ہو چلا کہ یہ کام کر سکتا تھا لیکن شہر یار کی اس عین میں ذاتی دھچک بھٹک کر رہ گئے ہوتے اس نے خود سے کوئی اقدام اٹھانے کے بجائے اسے اطلاع دینا مناسب سمجھا تھا اور جس طرح شہر یار نے اس کی رات کے آدھے بجے کوئی اعتراض کیے بہت بڑی سی ماہر نوکری کے حلقہ کے لیے اقدامات کیے تھے، اس سے عبداللہ ان کو اپنے لینے کی دہائی کا بھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔

یہ تو واقعی ماہر نوکری بہت بڑی تھی۔ لڑکی کوئی تھی۔ اگر دارالامان کا چوکیدار جرات مندی سے کام نہ لیتا تو چودھری افتخار رہا تو کوہاں سے انفرنگ کے شے کا مایاب ہو جاتا۔ تم نے بتایا تھا کہ اس چوکیدار کو گولیوں لگی ہیں۔ کیا خبر ہے اس چوکیدار کے بارے میں؟ اس کی حالت اب کیسی ہے؟ عبداللہ کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے شہر یار کو اچانک چوکیدار کے بارے میں خیال آیا تو اس نے اس کی بات رد یافت کیا۔

”وہ بے چارہ تو صبح کے قریب چل رہا۔ اسل میں ایک کوئی دل کا قریب لگی تھی۔ اس نے کام دکھایا اور اس کے علاوہ خون بھی بہت زیادہ بہہ گیا تھا اس لیے ڈاکٹر اسے بجائے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“ عبداللہ نے قدروے انوش سے جواب دیا۔

”نیکس یہ چوکیدار وہی تو نہیں تھا جس کے بارے میں تم

نے بتایا تھا کہ وہ مشاہیر خان کا دوست ہے۔“

”نیکس سراب دہی تھا۔ مشاہیر خان خود بھی بہت بھاری اور وفادار آدمی ہے۔ اس کا دوست بھی اس کی طرح جاہل ہوا۔“ عبداللہ نے شہر یار کے انداز سے کی تصدیق کی۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔ چودھری افتخار کی ہوس نے ایک بے گناہ کی جان لے لی۔ چودھری افتخار کو پتا نہیں چاہیے عبداللہ ان انہیں اس نئے کوتم کرنے کے لیے کچھ نہ کرنا ہوگا۔ تم موتی والا سے رابطہ کر کے معلوم کرو کہ جھگل سے کوئی کی ڈیجیٹر کب ہو رہی ہے۔ اس کام میں شامل بندوں کو گرفتار کر کے ان سے چودھری افتخار کا نام اٹھانا ہے۔ چودھری کے جرائم تو جانتے تھے ہوں گے لیکن ہم کسی نہ کسی مقام پر تو اس کی چڑ کریں تاکہ کچھ تو اس کی ذمہ داری ہم ہو سکے۔“ چوکیدار کی ناحق موت نے شہر یار کو بہت افسردہ کر دیا تھا، چنانچہ اس نے شہر یار غصے کی کیفیت میں عبداللہ کو قلم دیا۔ عبداللہ نے اس کے حراج کی اس برمی کو محسوس کیا اور مستعدی سے ”نیکس سر“ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

چودھری افتخار اصرار سے اُٹھ کھڑا بری طرح بیچ و تاب کھاریا تھا۔ اس کے سامنے مذہب کوڑے بالے میں بہت نہیں تھی کہ اپنے ہنگے ہوئے سر کو اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھ سکے۔ خود چودھری بھی فی الحال بالے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت کسی جوت کھانے ہوئے ساہب کی طرح ہو رہی تھی جس کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر غصے سے غصے وہ ٹھیکس چار دیکھے تخت پر بیٹھا اور گاؤں سے لے لکڑی لگا کر اپنے دائیں ہاتھ کو پھیلا دیا۔ پشت پر موجود حراج آشنا ملازم نے مستعدی سے غصے کی نے اس کے ہاتھ میں جمادی۔ چودھری افتخار نے ہنگارنے کے انداز میں دو اور جھگڑا کر دیا اور پھر باگ اور منہ سے دھواں خارج کرنے لگا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر یہ کہ مشکل تھا کہ یہ سارا کارسار دھواں غصے کے شعلے کے نتیجے میں خارج ہو رہا ہے یا پھر اس کے اندر واقعی غصے کی آگ نے اس دھم دھم کو کھٹا ہے۔

”کیسے نکل کی وہ تم لوگوں کے ہاتھ سے؟ تم اسے مسئلہ سے مل کر بھی ایک سموری سی لڑکی کو اٹھا کر لانے میں ناکام رہے۔ اس کا کرشمی کے لیے تم لوگوں پر اپنا روپا لٹا ہوا؟“ آخر کار چودھری افتخار نے بالے کی طرف دیکھتے ہوئے غصہ ناک لہجے میں اس سے پوچھا۔

”میں نے سب کام بڑے طریقے سے کیا تھا مگر کارخانہ

نیرنگی کے اس دارالامان کا جہاں معلوم کرنے اور پھر لڑکی تک پہنچنے میں ہم سے کتنی کوئی چوک نہیں ہوئی تھی۔ میں وہاں میں اچانک وہ بندہ نہ جانتے کہاں سے لپک پڑا۔ اس کے پاس راتل بھی تھی جس سے فائدہ کرنے کے لیے وہ بندہ کو زخمی کر دیا۔ اس اچانک حملے سے ہم لوگ ہڑباز ہوئے اور پھر زخمی ساتھیوں کو لے کر فرار ہونا پڑا۔“ بالے نے اپنی صفائی بخشی۔

”بہت شان دار کیا مراد تھی دکھائی تم لوگوں نے۔“ ایک اکیلا آدمی راتل کے کمرے میں آتا تھا۔ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میں پوچھا ہوں اس کے پاس راتل بھی تو تم کیا باتوں میں پڑیاں پکڑ کر رہے تھے۔ شہر یار سے پاس اس اکیلے بندے سے متاثر کرنے کے لیے اس طرح تھا۔“ بالے کی وضاحت نے چودھری افتخار کو بڑے چارج کا ربا دیا۔

”نیکس بات نہیں سے سرکار! ہم بھی اپنا اسلحہ ہاتھ لے کر مجھے تھکے ہیں۔ میں انداز نہیں ہوا کہ گیت پر موجود چوکیدار کے علاوہ وہاں کوئی سنگی بندہ موجود ہے۔ اس بندے نے سب سے پہلے تاکہ کر قادی سے پھانسی لگا کر قادی سے ہی لڑکی کو اٹھا لیا ہوا تھا۔ یہ کچھ کاروبار خود کو سنبھال نہیں سکا اور لڑکی اس کی گرفت سے آزاد ہو کر پھر کی طرف بھاگ گئی۔ ہم یہ قادی کرنے والا بندہ دیکھ کر پوزیشن میں تھا۔ ہم سمجھتے، اس سے پہلے اس کے فائر نے سوراخ بھی کھینچا تھا۔“

نشان بتایا۔ ہم نے بھی جانی فائر کیے لیکن اس بندے کا چہ نہیں بڑھا۔ ملائے کا تھان دارالامان سے قریب ہی تھا۔ فائرنگ کی خبر میں کہ وہاں سے فوراً ہی پارتی فائر بھی تھا۔ ہمارے پاس سولہ نہیں تھا کہ ہم اندر جا کر دوبارہ سے لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کرتے۔ اس پکڑ میں ہم جھلس بھی سکتے تھے۔ اپنے جھسنے کی خبر پر یہ انہیں بھی نہیں اس بات کا خیال تھا کہ کتنی ہمارے پیچھے ہو چکے ہیں آپ تک نہ پہنچ جائے۔ ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے زخمی بندوں کو اٹھا کر بھاگ نکلیں۔ راتل والا بندہ انک پیچھے پڑا تھا۔ ہم وہاں سے نکلے گئے تو جوش میں ہمارے دو اپنی پوزیشن سے نکل کر ہمارے پیچھے بھاگا۔ اس وقت میں نے اس کو نشان بنایا۔ اس بندے کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ اسپتال میں گزر گیا ہے۔“ بالے نے ایک بار پھر راتل سے سارا واقعہ بتاتے ہوئے اپنی صفائی کرنے کی کوشش کی۔

”تو بس بندے پھر کارخانہ میں ہوا مارا۔ اسل کام تھا سے نہیں ہوتا ہے۔“ بالے کی صفائی تفصیل سے متاثر ہوئے کے بجائے چودھری افتخار دہانہ اس بار بالے نے چپ رہنا

مناسب سمجھا۔

”آگے کچھ معلوم کیا تو نہ۔“ لڑکی کے ہارے میں کیا خبر ہے۔ کہاں ہے وہ؟“ چودھری نے خود ہی پوچھا۔

”میں نے دارالامان سے معلومات حاصل کی ہیں۔“ لڑکی اب وہاں نہیں ہے۔ ملائے کے قہانے میں بھی اس واقعے کو غفلت گردی کی ایک اور بات تھی کہ اسے سر پورٹ نہیں کی ہے سر پورٹ میں خراب کیا گیا ہے کہ کچھ غفلت سے دارالامان میں شامیں کر وہاں سے عورتوں کو انفرنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دارالامان کے چوکیدار کی مداخلت کی وجہ سے انہیں ناکامی ہوئی۔ رپورٹ میں خاص طور پر ماہر نوکری کوئی ذکر نہیں۔ مجھے ایک کاغذ بھیج دیا گیا ہے کہ فائرنگ کے بعد قہانے کا اسلحہ ایچ او پولیس ہائیڈرو لے کر دارالامان گیا تھا اور وہاں میں اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ اسی لڑکی سے پوچھا جا کر یہ رپورٹ کی گئی تھی۔ اوپر سے فون پر سمجھایا گیا کہ لڑکی کو پھونک دو۔ پھر بارے کوئی بندہ آ کر لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکی ماہر نوکری کی اور قہانے سے وہاں دارالامان آنے کے بجائے کسی دوسری جگہ چل گئی۔ میں نے اس کا ٹھیکل سے انجی طرح سب معلوم کیا تھا لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے تو کیا خود اسلحہ اچھا اوصاف کو بھی میں معلوم کر لڑکی کو کیا لے جایا گیا ہے۔“

”آخر ایسا کون بھڑا ہوا گیا ہے قہانے کی دہائی کا؟“ وہ یہاں سے بھاگ کر قہانے آتا ہے۔ قہانے کے بارے میں ایک دارالامان میں پہنچ گیا ہے۔ میں نے یہ سنا تو حیرت نہیں ہوئی بلکہ یہی سوچا کہ لڑکی ہوشیار کسی اس لیے قہانے مندی سے کام لینے ہوئے قہانے آباد میں اپنے ہر کارخانہ کرنے کے بجائے لاہور کے ایک دارالامان میں جا بیٹھی لیکن جس طرح وہ قہانے سے قاب ہوئی ہے، اس سے تو قہانے کو کوئی حلق والا بندہ اس کے پیچھے ہے اور اس کی مدد کر رہا ہے۔“ بالے کی بتائی ہوئی تفصیل ان کی چودھری افتخار نے پھر نظر انداز نہیں فرما دیا۔

”آپ بائیں ٹیک فرما رہے ہیں چودھری صاحب! مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کا کوئی دشمن ہے جو اس لڑکی کا ساتھ دے رہا ہے۔“ بالے نے فوراً ہی چودھری افتخار کے خیال کی تائید کی۔ اس تائید کے پیچھے چودھری کی خوشامد کے علاوہ یہ سوچ بھی کارفرما تھی کہ چودھری کا دھیان اپنے کسی دشمن میں الجھ جائے تو وہاں سے دارالامان کے ساتھیوں کی ناقص کارکردگی بھول جائے۔

دارالامان سے کچھ مضمون ہوا کہ وہاں کس نے ماہ بانو کو بھجوا دیا تھا؟" بالے کی توقع کے مطابق اب پورمیری افکار ایسی لائیں پر سوچ رہا تھا کہ ماہ بانو کے جیسے اس کے کسی دشمن کا ہاتھ ہے اور اب وہ اس دشمن تک نہیں رسائی حاصل کرتے کے لیے بے چین تھا۔

"تھانے میں دارالامان کی منتظر تے جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق تو ماہ بانو خود ہے وہاں آئی تھی۔ اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنے گھر سے بھاگ بیوی ہے جس کے ساتھ بھاگتی تھی، اس نے جھکا دیا اور اب وہ اپنے گھر واپس نہیں جاتا جانتی اس لیے اسے دارالامان بھی آگئی ہے۔" بالے نے پورمیری افکار کو بتایا۔

"میرے خیال میں منظرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ لڑکی بڑی جالاک اور دہڑپن ہے۔ اس کے لیے اپنی مرضی کی بات بنانا کچھ مشکل نہیں۔" پورمیری افکار کو وہ رات یاد آئی تھی جب ماہ بانو اپنے آپ پر مٹی کا تیش چھڑک کر اس کے روبرو کھینچی تھی۔ اس وقت پورمیری افکار اس کی تہ داری سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس سے زبردستی کرنے کے بجائے اسے اپنی عزت بنانے پر مل گیا تھا لیکن اسے اب گف رہا تھا کہ ماہ بانو نے جیالاک کی اور مصوبہ بندی سے کام لیا تھا اور اپنی جالاک کے سپاہیوں سے وہ کسی کو بھی بے خوف بناتی تھی۔

"ٹھیک ہے تو چاہ۔ پر تھیں مٹی رکھا۔ مجھے لگتا ہے کہ ماہ بانو کو ابھی دوران اور صمد کی موت کی خبر نہیں ہوئی ہے۔ اپنے ان لاؤٹے میں ہو چکی ہے بات میں وہ لعل آباد اور بیڑی دو بار دو کوشش ضرور کرے گی، تم اس طرف اپنے بندے لگائے رکھنا تاکہ جیسے ہی کوئی ہلک ملے اسے پکڑ سکو۔ اور ہاں، یاد رکھنا اس بار کوئی ہلکی نہیں ہونی چاہیے ورنہ میں تم سب کی کھال اوجڑا دوں گا۔ مجھے ماہ بانو پر حال میں چاہیے۔" پورمیری افکار نے بالے کو حکم دیتے ہوئے ساتھ میں دھمکا بھی۔

"آپ گھر نہ کریں سرکار! اس داری ہم سے کوئی چوک نہیں ہوگی۔" بالے نے پورمیری افکار کو یقین دلایا اور اپنی اہل اپنی جست ہو جانے پر دل ہی دل میں شکر کرنا ہوا وہاں سے باہر نکلیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد پورمیری نے اپنے پیچھے کھڑے ملازم کو بھی ساتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ملازم باہر نکل گیا تو پورمیری افکار نے تخت پر مٹی کے نیچے ہاتھ ڈال کر وہاں سے ایک لٹاؤ برآمد کیا۔ اس لٹاؤ میں ماہ بانو کی وہ تصویر تھی جس میں وہ کاجی و پیغام میں ملبوس کاج کے لٹان میں کھڑی تھی۔ پورمیری افکار ہر تصویر کو بھارتی اور

پھر رات کچھ کر بولا۔

"بتنا بھاگ کتنی ہے بھاگ کر دیکھ لے۔ آخر ایک دن تجھے میرے پاس آنا ہی ہوگا۔ پورمیری افکار اپنی ہند کی کسی چیز کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پورمیری کی بلجائوٹ اور مضمون سے بے خبر ماہ بانو اپنی تصویر میں سحرانی رہی مگر یہ سمجھا بہت اب صرف تصویر تک ہی محدود رہی تھی۔ وہ خود تو حالات کی زد میں آکر اور دھڑپن پورمیری تھی۔

"یہ ان مٹھوک ٹوڈر کے ٹیبر میں تارڑ صاحب جن کے بارے میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ آج رات ان کے دربارے غیر قانونی طور پر کچھ مال علاقے سے باہر لے جایا جائے گا۔ اطلاع بہت قابل اعتماد رہی ہے مٹی ہے اس لیے مجھے کوئی شک تو نہیں ہے کہ جن ٹیبروں کے ٹوڈر کی میں نے نشان دہی کی ہے، وہ غلط بات ہوں گے لیکن احتیاطاً آپ اپنی تیش سے ناک بندی کیجئے گا کہ کوئی بھی گاڑی یا لوڈر وغیرہ غیر چٹنگ کے سڑک سے نہیں گزر سکے۔ اپنے علاقے سے کسی بھی قسم کی غیر قانونی نقل و حمل کو روکنے کے لیے ہمیں بہت تیش ہے اس میں لینا ہو ورنہ جرائم پیشہ افراد کے حوصلے بڑھتے جائیں گے۔"

"میں سارا انتظام کر لوں گا سڑک میں خود اس سارے پرمس کی گھرائی کروں گا مگر آپ یہ بتائیں کہ کون سا مال لے جایا جا رہا ہے اور آپ کو کون ذرائع سے اطلاع ملی ہے؟" منظم تارڑ نے شہر پر پورمیری افکار کی یقین دہانی کرواتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

"پورمیری تارڑ صاحب! اب سروس آف انٹاریشن تو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کی خبری کرنے والے مضمون کے اپنے بھی کچھ خطرات ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اس شخص سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں اس کا نام ایک آؤٹ نہیں ہونے دوں گا۔ رہی یہ بات کہ کون سی چیز غیر قانونی طور پر علاقے سے باہر لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو یہ تو جب آپ آ کابندی کریں گے تو آپ کو خود بھی معلوم ہو جائے گا۔ آپ کے جھگے کے افراد انیٹ تو رکھتے ہیں تاکہ قانونی اور غیر قانونی نقل و حمل کے درمیان فرق کر سکیں؟" شہر یار نے کچھ جھگے سے صاف انکار کرتے ہوئے آخر میں ملے سوال کیا۔

"اگر اسے سزا ہو آپ مناسب سمجھیں۔ میں تو صرف اس لیے آسکھ ہونے والے آٹم کے بارے میں جانتا چاہتا تھا کہ میرے لوگ ایک خاص خانہ کے نوڈن میں دیکھ کر چٹنگ کا

کام کریں لیکن اگر آپ کو ان کی ذہانت کا امتحان ہی لینا ضرور ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس حساب سے بھی مارا بیٹھتے کر دانتا ہوں۔" شہر یار کا جواب منظم تارڑ کو برا لگا تھا لیکن عہدے کا پاس رکھتے ہوئے اس نے برداشت سے کام لیا اور مضمون کے وجود پر اپنے لیے کوڑم ہی دیکھا۔

"ڈس پوسٹ آؤٹ لک" شہر یار کو بھی منظم تارڑ کی کیفیت کا اندازہ تھا لیکن وہ اس کے جذبات کو خاطر میں لانے بغیر المینا سے بولا۔ یہ جملہ اس بات کی بھی نشان دہی تھا کہ شہر یار، منظم تارڑ کے ساتھ اپنی انتھک محنت کر چکا ہے۔ منظم تارڑ نے بھی اس اشارے کو کھینچ لیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"اگر اس میں جا کر اپنے گلے کے لوگوں کو جاہات دیتا ہوں۔ آئی ہو پک میرا عہد آپ کو کھیت کا سونپ نہیں دے گا اور کل صبح آپ کو مکمل رپورٹ لی جائے گی۔" منظم تارڑ، شہر یار کے دفتر سے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد شہر یار نے عبد المنان کو اندر بلا دیا۔

"کیا خیال ہے تمہارا۔ منظم تارڑ ٹھیک طرح سے کارروائی کرے گا؟"

"کچھ کچھ نہیں سمجھتا۔ سارا منظم تارڑ کے پورمیری افکار سے قریبی مراسم تو ضرور ہیں لیکن یہ کینہ مشکل ہے کہ وہ اس معاملے میں پورمیری افکار کے ساتھ شریک ہے یا نہیں۔ عام طور پر اس قسم کے معاملات بڑے افسران کے ہاتھ سے چلے جاتے ہیں۔" عبد المنان نے شہر یار کے سوال پر جواب دیا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا اس لیے میں نے براہ راست منظم تارڑ سے اس کا رد واپس کے لیے بات کی ہے۔ احتیاطاً میں نے اس بات کی نشان دہی نہیں کی کہ ہم اس ناک بندی کے ذریعے اس چیز کو آسکھ ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اگر گلے میں پورمیری افکار کو کوئی چیز سے کچھ تو وہ اس کا رد واپس کا مقصد نہیں سمجھ سکے گا۔ ہماری بھجوری یہ ہے کہ ہم سو فیصد رازداری کے ساتھ یہ کام نہیں کر سکتے۔ جگہ جگہ ناک بندی کرنے کے لیے ہمیں ہر حال میں پولیس کے گلے سے عدو بننی ہوگی۔ پس یہ ہو سکتا ہے کہ میں غیر طور پر اس مادی کارروائی کو خود بائزر کروں۔ اگر گلے میں موجود کوئی کوئی میجر مضمون سے پرہیز ہو جاتا ہے تو اس کی اسی وقت جگہ ہو سکے۔"

"یہ آئیڈیا اچھا ہے سارا" عبد المنان نے شہر یار کے فیصلے کی تعریف کی اور پھر بولا۔ "میں آپ کے ساتھ رہوں گا مگر

آپ تادیبی کر آپ کس وقت تک کھتے رہیں گے کارداروں کے ہیں۔ میں اسی وقت آپ کی رہائش کو ہر عارضہ ہو جائیگا۔" منوی والا کی اطلاع کے مطابق لوڈر آدھی رات کے بعد گزریں گے۔ میرا خیال ہے کہ کم احتیاطاً آدھی رات سے پہلے ہی نکل چکی ہیں تاکہ اگر کچھ آٹم کے پیچھے ہو بھی جائے تو ہم وہاں موجود ہوں۔" شہر یار نے جواب دیا تو عبد المنان بولا۔

"اگر اسے سارا میں اسی حساب سے آپ کے پاس آجائوں گا۔" اس کے بعد شہر یار کا سارا دن دفتر میں "موسل" کے کاموں کو دیکھتا رہا۔ اس کے کام کے دوران اسے رات کو ہونے والی کارروائی کا خیال آتا تو سارے جسم میں کھینچی کی ایک لہری دوڑ جاتی۔ فلوڈ ہاؤس ایک میجر جو شخص تھا وہ یہ خیال کہ وہ پورمیری افکار جیسے زور و اور مطلق العنان شخص کو دیکھنا ہیچانے جا رہا ہے، اسے بہت زیادہ ایکساٹمنڈ میں مبتلا کر رہا تھا۔ شام کو دفتر سے اپنی رہائش گاہ پہنچنے کے بعد بھی اس کا ذہن اسی بات میں افکار رہا۔ اس نے ایک بار منظم تارڑ کو فون کر کے اس کے انتظامات کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں۔ رازداری کے خیال سے اس بات کا احترام کیا گیا تھا کہ پولیس فوس کے افراد اپنی جگہ تیار ہیں اور پھر رات کے ابتدائی حصے میں انہیں ایک ان مقام پر پہنچا دیا جائے جہاں چیک پکس بنائے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ منظم تارڑ نے شہر یار کو یقین دہانی کروائی تھی کہ سارے کام اس کی ہدایات کے عین مطابق انجام دیے گئے ہیں۔ منظم تارڑ کی اس یقین دہانی کو کچھ بھنا شہر یار کی بھجوری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عہدے کے حساب سے اسے کی اومٹ ہے شک بڑی ہے لیکن مطلع کی اصل تحریفی اپنی ہی کے ہاتھ میں ہی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ مضمون ہوتا ہے جو مطلع کے سارے اہم معاملات کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسسٹنٹ کمشنر کا اپنے آفس سے باہر نکل کر ان معاملات میں دخل دینا اسے اپنے اختیارات میں دخل دینے کے برابر محسوس ہوتا ہے۔ شہر یار کو منظم تارڑ کے اختیارات میں دخل اندازی کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن وہ اس شخص پر فیصلہ مند وہی نہیں کر سکتا تھا اس لیے آج کی کارروائی کو خود بائزر کرنے کے لیے اچانک ان لوگوں کے سروں پر کھینچے کارداروں کو کھتا۔

رات کا پکا چٹکا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی چٹاری شروع کر دی۔ اس وقت اس نے کوئی بہت بگھٹ لباس پہننے کے بجائے چھوڑی شرٹ کا انتخاب کیا تھا۔ اس عام کی چٹاری شرٹ میں وہ بہت اداوارت لگ رہا تھا۔ اس

سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد انہیں ایسی آواز میں سنائی دیں جیسے کوئی بڑی گاڑی آ رہی ہو پھر انہوں نے اس گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی دیکھ لیں۔ وہ ایک بڑا لوڈر تھا۔ شہر یا ریسیت وہ سب سیکھل کر بیٹھ گئے۔ چیک پوسٹ پر آکر لوڈر پولیس والوں کے اشارے پر برک کیا۔ لوڈر کو بڑی بڑی ترپالوں سے اس طرح گھور کیا گیا تھا کہ باہر سے اس پر قہرے ہوئے سامان کے بارے میں اندازہ قائم کرنا مشکل تھا۔ پولیس والے اس لوڈر کے گرد گھوم گئے۔ انہوں نے اسے چیک بھی کیا لیکن جس رخ سے انہوں نے ترپال بٹا کر لوڈر میں موجود سامان کا جائزہ لیا تھا، شہر یا رواد اس کے سامنے اس کی مخالف سمت میں تھے لہذا انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ لوڈر پر کیا سامان لوڈ ہے۔ پولیس والوں میں سے ایک نے لوڈر ڈرائیور سے اس کے کاندھوں پر قبضہ کر لیا کہ چیک کیے تھے۔ یہ سامان گاڑی والی مشکل سے بائیں منہ میں انجم پائی اور پھر پولیس والوں نے اس کے کاندھ پر ہاتھ رکھ کر اسے اس لوڈر کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ لوڈر چیک پوسٹ سے آگے نکلا اور جب وہ وقت تھا تب ایک پولیس والے کے ہاتھ میں موجود سرخ لائٹ کی تھمر روشنی اس کی کمر پلٹ پر پڑی۔ شہر یا رواد نے ایک اٹھا۔ یہ نمبر اس کے حافظے میں بہت اچھی طرح محفوظ تھا۔ موتی والا کی اطلاع کے مطابق اس لوڈر پر جنگل سے غیر قانونی طور پر کانے گئے دو خٹوں کے سٹے موجود ہونے چاہیے تھے لیکن پولیس والوں نے نہایت آسانی سے اسے آگے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یعنی شہر یا رواد غدر سے درست تھا۔ اسے انتظام کے باوجود بھی بہت آرام سے قیمتی لکڑی اسمگل کی جا رہی تھی۔

"خانان گاڑی اس لوڈر کے پیچھے لو۔" شہر یا رواد نے مشاہدہ خان کو حکم دیا۔ وہ تو خطرے میں تھا، فوراً گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر ڈال دی۔ چیک پوسٹ پر ان کی گاڑی گورنر کے کا "شاہدہ" گیا۔ مشاہدہ خان نے گاڑی روکنے کے بجائے رفتار ڈرامک کی اور یہ آواز بلند گاڑی میں اسے ہی صاحب کی موجودگی کا اعلان کیا۔ اس اعلان پر پولیس والے فوراً اٹھت ہو گئے اور گاڑی کو آگے جانے کا راستہ دے دیا۔ مگر اس ڈرامی دیر کے فرق میں وہ مشکوک لوڈر کافی آگے نکل چکا تھا۔ مشاہدہ خان نے اپنی گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی لیکن سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی کہ وہ صاف درمیان میں چلے لوڈر کی سائیڈ میں سے اپنی گاڑی آگے نکال لے جاتا۔ مشاہدہ خان نے کئی بار ہاتھ کی کیڑ دیا لیکن

اب اس نے اس کے درشنی جسم اور دراز قامت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ لباس کے ساتھ اس نے جو افغانی شے اپنے ساتھ لی تھی، وہ ایک جدید طرز کا پتل تھا۔ یہ پتل اس کی ذاتی ملکیت تھا جس کا اس کے پاس لائسنس بھی موجود تھا۔ عبداللہ ان اپنے مکے کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے طور پر تو مشاہدہ خان کے سوا کسی کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی کارکردگی شروع سے عیاں قابل ستائش اور قابل اعتماد تھی۔ اس کے دوست کی ماہ بانو کے تحفہ کے لیے دی جانے والی قربانی نے شہر یا رواد کے دل میں اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھا دی تھی۔ جس شخص کی بات کا پاس نہ رکھنے کے لیے اس کا دوست جان سے گزر گیا تھا، خود اس شخص کے اپنے کردار پر تو کسی قسم کا شک کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مشاہدہ خان کی معیت میں شہر یا رواد عبداللہ ان کے گھر سے روانہ ہوئے۔ منصوبے کے مطابق چیک پولیس اس سڑک پر پتلی کی ٹھکن جس پر سے ضلع سے باہر جانے والی ہر گاڑی کو اٹھا کر تڑپا تا تھا۔ شہر یا رواد کی ہدایت پر مشاہدہ خان نے جس چیک پوسٹ کی طرف گاڑی کا رخ کیا، اس کے بعد اس سڑک پر بس ایک ہی چیک پوسٹ دو جاتی تھی۔ یہ آخری چیک پوسٹ اس جگہ قائم کی تھی جہاں ضلع سے جانے والی سڑک کا اختتام ہو جاتا تھا اور مین ہائی وے شروع ہو جاتی تھی۔

"ابن بیٹیں روک دو۔" اپنی مطلوبہ چیک پوسٹ سے کافی فاصلے پر ہی شہر یا رواد نے مشاہدہ خان کو حکم دیا تو اس نے گاڑی روک لی اور پھر شہر یا رواد کے کہنے پر گاڑی کی لائٹیں بھی بند کر دیں۔ ترقیاتی کاموں کے اعتبار سے یہ علاقہ کافی پیچھے تھا اور ابھی تک ڈھنگ سے اسٹریٹ لائٹس کا بھی انتظام نہیں کیا گیا تھا اس لیے رات کے اس پیر ابھی خاصی تاریکی پھائی ہوئی تھی۔ شہر یا رواد اس کے سامنے اپنی گاڑی سمیت اس تاریکی کا حصہ بنے رہے۔ چیک پوسٹ پر الیٹ روشنی کا انتظام نظر آرہا تھا۔ اس روشنی میں وہاں موجود پولیس والوں کی فوج حرکت بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ مستعد نہیں تھے۔ اصل میں اس سڑک پر رات کے اس پیر گاڑیوں کا بہت ہی کم گزر ہوتا تھا اس لیے پولیس والوں کو بھی زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ شہر یا رواد خود کوٹ کیا تھا کہ پان تھن میں صرف ایک سوزو کی پک اپ گزرتی تھی اور اس پک اپ کی پولیس والوں نے بہت اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد اسے آگے جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اعتبار سے ان کی کارکردگی کو تا قس قرار نہیں دیا جا

لوڈر ڈرائیور کے کان پر جون تک نہ رہ سکتی۔ اب آخری چیک پوسٹ تک بھی۔ شہر یا کوئی گاڑی کے ایک دوپہر میں بچے سے آتی ایک پولیس بیپ سالانہ آری تھی۔ وہ پولیس بیپ کسی کی ہڈی کے لیے آری تھی، اس وقت شہر یا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے تو اس بات پر بھی شک تھا کہ لوڈر کو چیک پوسٹ پر روکا جائے گا مگر اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ چیک پوسٹ پر لوڈر کو روکنے کا اشارہ کیا گیا اور لوڈر ڈرائیور نے اس اشارے پر فوراً ایک لگا دیے۔ مظاہرین خانہ نے اپنی گاڑی بالکل لوڈر کے قریب لے جا کر روکی۔ ان کے پیچھے آنے والی پولیس بھی رک گئی۔ شہر یا اور عبداللہ ان اپنی گاڑی سے باہر نکلے تو انہوں نے اسے پیچھے رکھنے والی جیب سے وٹس پی پیٹنگ موزون لکھتے ہوئے دیکھا۔ ”نمر! آپ یہاں؟“ شہر یا کو دیکھ کر معصوم تارڑ نے حیرت کا اظہار کیا۔

”اس لوڈر کی چیکنگ کروائیں۔“ معصوم تارڑ کے حیرت بھرے سوال کا کوئی جواب دینے کے بجائے شہر یا نے اسے حکم دیا۔

”میں اس لوڈر کے پیچھے ہی یہاں آیا ہوں۔ آج میں خود سارا وقت لکھت پر رہا ہوں۔ ابھی پچھل چیک پوسٹ پر جب یہ لوڈر مڑا تھا تو میں نے اس کی ٹیبلر پلٹ دیکھی تھی۔ میں بائو فیلٹر پر تھا، میری جیب پیچھے سے پیچھے ہی لوڈر آگے بڑھ گیا۔ پھر درمیان میں آپ کی گاڑی آ گئی۔ بہر حال، آج کے آپ دیکھتے ہیں کہ اس لوڈر پر کیا موجود ہے؟“ معصوم تارڑ نے شہر یا کو جلدی جلدی بتاتے ہوئے لوڈر پر پڑے ترال بتائے کا اشارہ کیا۔ فوراً ہی وہاں موجود افراد حرکت میں آ گئے۔ لوڈر پر سے ترال اتار کر شہر یا کو حیرت کا شدید ہلکا ہلکا لوڈر صرف ہموار لدا ہوا تھا۔

”اس بھوسے کو بنا کر دیکھیں۔ ایک امید کے سارے شہر یا نے سمجھ دیا۔ اس کے جسم کی شکل کی جانے لگی لیکن لوڈر پر واقعی صرف ہموار لدا ہوا تھا۔ چار انکس اس لوڈر کو آگے جانے کی اجازت دینا پڑی۔

”میں تو کچھ نہیں لکھتا۔“ معصوم تارڑ نے شہر یا سے کہا۔ اس کا بچہ بہت عجیب و غریب شہر یا کو بیل محسوس ہوا جیسے وہ اس پر خطر کر رہا ہے۔

”نہیں ہے دوسرے لوڈر پر جاری مطلوبہ چیز موجود ہو اور اس لوڈر کو روکا دینے کے لیے بھوسے سے بھر کر بھیجا گیا ہو۔ میں دوسرے لوڈر کا انتظار کرتا ہوں گا۔“ شہر یا کی امید اب بھی برقرار تھی۔ اس امید کے سارے وہ لوگ جگ تک

انتظار کرتے رہے لیکن انتظار بالا حاصل نہ ہوا۔ ”میرے خیال میں آپ کے خبر سے کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔“ معصوم تارڑ جو سٹیل شہر یا کے ساتھ ہی موجود تھا، خطر سے بولا۔ اس بار اس نے اپنے بچے کے خطر کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

”شاید... ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ میرے لیے نظریہ کرنے والے کے مقابلے میں مجرموں کے لیے تجزیہ کرنے والے زیادہ مستعد ثابت ہوئے ہوں۔“ شہر یا نے بھی ایک جوابی خطر کا تجربہ کیا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ حقیقتاً اس نا کامی نے اسے کوئی یاقین کیا تھا۔ اس نا کامی سے رات بھر کی بھاگ دوڑ کی محنت پر پانی بھرا تھا۔ وہ الگ، دوسری طرف چو دھری انتظار کے جرائم کو منظر عام پر لانے کا منصوبہ بھی خاک میں مل گیا تھا۔

☆☆☆

”میں اسے سی کے بچے کو آخر کسی نے اطلاع دی تھی ہمارے مال کی سیلائی کی؟ اور اطلاع بھی واقعی کی کی کہ اسے ان لوڈر کے ٹیبلر میں معصوم تارڑ پر مال جانا تھا۔“ چو دھری انتظار بری طرح سچ واپس کھار تھا۔ اس کے سامنے بیٹھے اقبال باجوہ اور معصوم تارڑ کے چہروں پر بھی فریادی کے آثار تھے۔

”میں بات کی کوئی گمان نہ تھا تو بہت ضروری ہے چو دھری صاحب... کیونکہ تجربہ جیسی یہ وہ بہت قریبی بندہ ہے۔ مال کس سیلائی ہو رہا ہے اور کس ٹیبلر میں بات تو ہموار میرے علم میں بھی نہیں ہوتی۔ میرے بندے جانے پہچانے شخصوں کا نامہ ہوں گے کہ خود ہی انہیں گھسیٹ دے دیتے ہیں۔ کل کی سیلائی کے بارے میں تو مجھے تو بھی کوئی نہیں معلوم تھا۔ مجھے اسے ہی صاحب نے بلا کر کاندی کا کسم درجہ جیب بھی فوری طور پر میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ لوڈر کی سیلائی کے معاملے سے واقف ہو گئے ہیں۔ وہ تو جب انہوں نے مجھے لوڈر کے ٹیبلر ٹوٹ کرانے تو میرا دھیان کیا اور میں نے سوچا کہ احتیاطاً باجوہ صاحب سے معلوم کروں۔ ان سے بات ہوئی تو معصوم تارڑ کو ان ٹیبلر کے لوڈر پر تو سیلائی جانے والی ہے اور لوڈر بالکل ٹکڑے ہیں۔ میں نے اور باجوہ صاحب نے مل کر صورت حال پر غور کیا۔ پہلے سوچا کہ جانے دیتے ہیں لوڈر۔ چیلنگ ہوئی بھی تو چیلنگ پوٹیشن پر میرے اپنے ہی بندے ہوں گے لیکن پھر خیال آپ کو ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی اسے ہی صاحب کا تجربہ ہو اور اسے کسی جاگر بکڑا ہو جائے۔ باجوہ صاحب نے انکس میں کسی ایک لوڈر

کو ان لوڈر کو روکا کہ اس پر بھوسے کی ڈمیریاں لوڈ کروائیں۔ دوسرا لوڈر ویسے ہی کھڑا رہے دیا کہ جھپٹن دیکھ کہ اس کو ٹکائیں گے۔ میں اس احتیاط سے ہی بچت کرادی۔ مجھے تو صرف تجزیہ کا وقت تھا، دوسرا ہی صاحب خود گاہک میں بیٹھے تھے۔ خود اپنے سامنے لوڈر چیک کروایا۔ ہموار کچھ کر کے بائوں کو بٹے پھر بھی جگ تک دوسرے لوڈر کا انتظار کرتے رہے۔ صبح واپس بھی گئے تو اس ملک کے ساتھ کہ کسی نے تجزیہ کر دی تھی اس لیے مال نہیں بکڑ گیا۔ میں نے بہت اگلوں کی کوٹیشن کی کہ کون سا مال اسکی ہونے والا تھا لیکن کچھ نہیں بتا کر لوڈر کے ٹیبلر کی وجہ سے ہم پر تو بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ وہ جانتے تھے کہ یہاں سے کیا چیز لے جانی جائے والی ہے۔“ معصوم تارڑ نے تفصیل سے ساری صورت حال بیان کی۔ اس کے چہرے پر سوچ و غور مندی اس کے لیے بھی چیک رہی تھی۔

”میں نے اپنے بندوں کو ٹھنڈا باجوہ دیکھا ان بندوں میں سے تو کوئی اسے ہی تجزیہ نہیں بن گیا؟“ چو دھری انتظار نے روئے سخن اقبال باجوہ کی طرف کیا۔

”سارے بندے بہت اعتبار کے جیسے چو دھری صاحب! برووں سے ہم انکی بندوں سے کام لے رہے ہیں۔ یہی کسی کی طرف سے فکایت نہیں ملی۔ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں ان بندوں کے بارے میں... ان میں سے زیادہ تر آپ کے ہی ٹھک خوار ہیں اور آپ کے ٹھک خواروں کو میں نے جان سے گزرتے دیکھا ہے۔ ٹھک خوار کرتے ہیں۔“ اقبال باجوہ کے جواب پر چو دھری انتظار کے ہونٹوں پر غریبی کی سسترا بہتیل کی نہیں پھر وہ فوراً اپنی عجیب و غریب سمجھتی سی بولا۔

”ٹھیک ہے نہیں اپنے بندوں پر اعتبار ہے لیکن نہیں نہ کہیں سے تو تجزیہ ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان کوئی تو کالی بھڑ موجود ہے۔ ہمیں اس کا بیج کرنا ضروری ہے۔ ابھی تو تارڑ کی وجہ سے بچت ہو گئی لیکن ہو سکتا ہے آئندہ وہ اسے ہی تارڑ کو بھی ہوا نہ لگے دے اور خود ہی اچانک کارروائی کر ڈالے۔ تارڑ نے بتایا تو ہے کہ وہ ملک خاں کر گیا ہے کہ کسی نے تجزیہ کر دی اس وجہ سے اب نہیں بکڑا گیا۔“

”میرے ذہن میں ایک بندے کا نام آ رہا ہے چو دھری صاحب! میرا خیال ملک بھٹین ہے کہ یہ نظریہ ہی بندے نے کی ہے۔“ اقبال باجوہ کا انداز ہنسوٹ تھا۔

”وہ کون؟“ چو دھری انتظار نے بے چینی سے پوچھا۔ ”موٹی والا۔“ میرے اور آپ کے سوا کسی تیرے

بندے کو ساری تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، وہ موٹی والا ہے۔ آپ اور میں تو تجزیہ کرنے سے رہے اس لیے ایک موٹی والا ہی رہ جاتا ہے جس کے بارے میں کیا جانے کر وہ اسے ہی سے مل گیا ہے۔“

”ہمارے بھی کیا ضرورت ہے تجزیہ کرنے کی اور تو خود ٹریک ہے۔“ چو دھری انتظار ہانچا۔

”میرے خیال میں باجوہ صاحب کا اندازہ بالکل درست ہے چو دھری صاحب! ذرا سارے حالات پر غور تو کر کے دیکھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد پہلے پولیس موٹی والا آپ سے بالکل برک کیا تھا۔ اس کے انداز سے تو گمان تھا کہ اب وہ آپ سے تعلقات رکھنا ہی نہیں چاہتا لیکن پھر ہمیں اس نے اپنا رویہ ٹھیک کر لیا تو ہم کچھ کہہ سکتے کہ انکس ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ دوبارہ پولیس کی طرف دھمکانے لگا رہا ہے، ہر اب مجھ میں آ رہا ہے کہ وہ سامنے بن کر آپ کو بھڑوانے کے چکر میں تھا۔ ورتا سے پولیس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں یہ بات سچے وقتوں سے اس کے لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے معصوم ہوا ہے کہ موٹی والا بہت بڑی رقم کا کہنے کے بارے میں ایک غلامی اسپتال کھولنے والا ہے۔ یہ ساری باتیں کئی کئی نہیں ہیں۔ بہت بار دیکھتے ہیں آئیے کہ والا کی موت اس باب کو بالکل بدل کر رکھ دیتی ہے۔ موٹی والا کا بیٹا تو واقعی اکلوتہ۔ اگلے تے بیٹے کے مدد سے اس کا دامع بائوں کی دیا ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا کہ اب اس سارے مال و سچ اس کا کیا کرنا ہے، جو مجھ سے وہ لکھی کاموں میں لگائے تاکہ بیٹے کے لیے ایصال ثواب کا بھی کچھ بندہ نہ ہو اور جو اپنے دل کو بھی بھین لے۔ لیکن ہے اپنے گناہوں کا کفار وادار کرنے کے لیے ہی اس نے یہ راہ بھی وضو نہ کی ہو کہ وہ فحش کی غیر قانونی سیلائی کو روکنے کا بندوبست کرے۔ اب اسے تو کوئی فکر نہیں ہے کہ اسے بال بچوں کا مستقبل، بچانے اس لیے وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ اقبال باجوہ کی تائید کرتے ہوئے معصوم تارڑ نے دلائل دیے۔

”یہ سوچو ہے کہ اگر ملی کے بیچ پر جانے کا معاملہ ہے چو دھری صاحب! آپ بائیں ہاتھ میں لیکن مجھے تو پکا یقین ہے کہ اس سب کے پیچھے موٹی والا ہی ہے۔“ اقبال باجوہ نے ایک بار پھر چو دھری انتظار کو کانٹل کرنے کی کوشش کی۔

”نہ ماننے والی بھلا کیا بات ہے؟ مجھے تو بھی اب یہی کچھ میں آ رہا ہے کہ اس معاملے کے پیچھے موٹی والا ہی ہے۔“

چو دھری انتظار بری طرح قائل ہو چکا تھا۔ ”میں اس معاملے میں اس لیے بھی شہر یوں کہ موٹی

والا کو اس سارے سیٹ اپ میں میری انوائسٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ وہ جگہ تو رکھتا ہے کہ اس علاقے سے ہال لھتا ہے تو شاید یہ بھی آپ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گا لیکن کبھی ڈائریکٹ ہماری اس حوالے سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہو تو اسی صاحب مجھے رات ہونے والی کارروائی سے الگ کر کے کہہ دوں گے کہ نہ تو مجھے کچھ جگہ تو انہیں ہال بھی تھا اس لیے مجھے پورا معاملہ مکمل کرنا پڑا تھا لیکن شک کے بجائے اگر یقین ہو تو وہ کچھ اور ہی انتظام کرتے۔ چودھری اسحاق کو قاضی ہوتے دیکھ کر معظم ٹرڈنے ایک اور دلیل دی۔

”اسے سنی بہت پر پھیلانے شروع کر دیے ہیں۔ پہلے اسکول والے معاملے میں مجھ سے اڑا اور اب اس دوسرے معاملے میں بھی اپنی ٹانگ اڑا رہا ہے۔ سوئی والا نے تجزی کی ہے تو ساتھ ہی بھی جوتا ہوا کاکر میں بھی اس کام میں شریک ہوں۔“ چودھری کے بیچ میں غصہ تھا۔

”تو پھر کوئی احتیاط کر لیں تاہم اسے کسی چودھری صاحب...! اگر یہ پیچھے پر گیا تو ہم کہاں تک پہنچیں گے۔ ہر دفعہ ہمیں خبر مل جائے یہ ضرور کی تو نہیں۔“ اقبال با جھوٹے چودھری کا لہجہ لگا رہا۔

”اس اے کی کا انتقام کرنے انا آسان نہیں ہا جو صاحب۔ یہ ابھی کچھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم نے اپنے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے جس اے کی ہتھی کر دی تھی اس میں اور اے کی شریار عادل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ اے کی مل نکلا تھا جس کا کوئی آگم پچھتاہی نہیں تھا۔ شریار عادل کے پیچھے سپورٹ کرنے والوں کی چوری فوج تھی ہے۔ ہا میں اس کا ایم اے اسے، کرن اس کا ڈی آئی جی، کرن کا سالار آئی جی اور اس کے علاوہ بھی جانے کہاں کہاں اس کے خاندان کے افراد بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جو اس کو اتنا سرچ مارا ہوں تو یہ لاجواب ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ایسی تھ وہ کل کر میرے سامنے نہیں آیا ہے۔ ہمیشہ بڑے اچھے طریقے سے ملتا ہے۔ ہا ملتا ہے، جو کچھ کر رہا ہے جانی کے جو میں کر رہا ہوں اور اسے خیال بھی نہیں ہو کہ اس کے اقدامات سے راپورا دست مجھے نقصان پہنچ رہا ہے۔ لیاقت راج صاحب میرے بڑے اچھے جاننے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے بھانجے کو میرے ہا سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا کچھ بھگا کچھ بھگا۔“ چودھری انوار شریار کے اقدامات پر عاراض ہونے کے ہا جو راج بھی تو راجی بہت خوش تھی میں جڑا تھا۔

”بھیرے خیال میں تو چودھری صاحب آپ کو براہ صاحب سے بات کرنی چاہیے۔ اگر وہ اپنے بھائی کے کو بیگناہ بھول گئے ہیں تو اب بھجوا دیں گے۔“ اقبال باہر جانے چودھری افتخار کو مشورہ دیا۔

”ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ابھی معاملات اس حد تک نہیں آئے کہ میرے قابو سے باہر ہوں البتہ ہم ان وزارتیں شہر پارا عدالت کو منتقل جانے اور ایک طرف ہو جانے کا بیانیہ دے سکتے ہیں۔ بھیرے ذہن میں ایک تدبیر ہے جس کے ذریعے ہم خود سے بخاری کرنے والے کو قسطنطنیہ بھی سکھا دیں گے اور شہر پارا کو بھی بیانیہ مل جائے گا کہ ہم سے پہلے یہاں ٹھیک نہیں۔“

”دو کا چور چوری صاحب؟“ چور چوری انکار کے ذریعہ
انہماز پر اقبال جواد اور محکم ترہو دونوں چونک اٹھے۔
”ہاں دیکھتے جاؤ۔“ لالہ امجدی لاہور میں ہے، وہ ہمارا
کام کر دکھائے گا۔“ چور چوری انکار کی آنکھوں میں دھما چمک
تھی جو اپنے شکار پر کوئی چلانے سے پہلے کسی شکار کی
آنکھوں میں اترتی ہے۔

☆☆☆

ہوا تو ہنسنے پر لپٹی سے چٹپٹا سے کروٹیں بدل رہی تھی۔
چوہری افسانہ کی نظروں میں آئے کے بعد سے اس کی زندگی
سے سکون کی نیند خارج ہو گئی تھی۔ پہلے چوہری نے اپنی
حوالی میں اس پر دست درازگی کی کوشش کی۔ قسمت سے اس
رات دو وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے
بعد اس کا گاؤں میں جو ایک دن گزارا وہ شدید خوف میں گزارا
کہ کہیں چوہری اسے اس کے باپ کے گھر سے نہ انھالے
لیکن اس وقت چوہری کے اپنے معاملات میں الجھے ہونے
کی وجہ سے خبر غریب فیصل آباد لوٹ جانے کے بعد بھی ماہ
کاٹھکویر اندر ہی رہتا تھا کہ چوہری کے ہاتھ وہاں بھی پہنچ سکتے
ہیں۔ روز بروز کی شادی میں شرکت کے لیے گاؤں آنے سے
بھی صرف چوہری کی وجہ سے ہی گزرا یہاں تک کہ اس کی گاؤں
میں کسی موجودگی کی خبر وہاں سے چوہری کو اس کی یاد دلادے
کی اور اس کا یہ اندر بیلا بلاجست نہیں ہوا تھا۔ چوہری نے
اسے سوچ دیکھتے ہی انھرایا تھا۔ اگر اس روز ماہ بانوائی جانا
کی باڈی ملے گا تو چوہری کے گلشن سے پتی لکڑیاں آسمان
پر پھینکے گا۔ چوہری کی خود سے شادی کی خواہش نے بھی ماہ
کو کلرز کا رکھ دیا تھا۔ وہ رشتہ چورمان اور غیاث محمد کے
مزید کہ اب ان کی عزت میں اضافے کا باعث بننا، ماہ بانو کے
لیے خوشخبری کے حق ادیب تھا۔ ماہ بانو کو کچھ کچھ کہ کر چوہری

ان کے حصول کی شدہ خواہش میں اس سے اس کی پر رنجی ہو رہی ہے۔ شادی ہو جانی اور وہ اپنا گھر حاصل ہو جانی تو پھر وہ اسے اپنی عین جیہ سے کسی کو کونے میں ڈال دیتا۔ چودھری کی اس ہوس کو مٹانے میں مادہ بانو کے سامنے خواب گناہیت ہو جاتی ہے۔ چودھری کی یہی بین کہ رتنہ کو اس کے دل کو کوئی فتح اور فتحی اس کی ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری ہو جانی۔

ماہ بانو نے اپنی زندگی کے لیے جو خواب دیکھے تھے اس میں ادھر مرزا عالم اور عیاش چودھری کا تو کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ دو تو ہیئت خود کو ایک لہڑی ڈاکٹر کے روپ میں کسی چمے نکلے اور ایک غفلت شخص کی معیت میں دیکھتے تھے۔ پانچویں دروازے کا وہ دن ملتے ہی اس نے چودھری کی پہنچ سے نکل جانے کی کوشش کی۔ قسمت سے اسے شہر پار کی مدد ملی اور وہ لاہور کے ایک دارالامان پہنچا دی گئی۔ خود کو دارالامان پہنچانے جانے کا فیصلہ کتنا درست تھا، اس کا اندازہ ماہ بانو کو اس رات ہوا تھا جب اسے دارالامان سے انکار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دو لوگ جہی آخر دور لاہور کے ایک دارالامان میں پہنچ گئے تھے، ان کے لیے فیصل آباد پہنچ گیا مشکل تھا۔ دارالامان میں تو جیکب آباد کی وجہ سے ماہ بانو کی بچت ہو گئی تھی لیکن فیصل آباد میں اس کی صورت حال جیسا آتی تو پہلے چارے سے خوراک اور مضرہ کر کے پاتے، ماہ بانو تو ذی آسانی سے دوبارہ چودھری کے چنگل میں جا پکنتی۔ اب بھی وہ اس خوف سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ سوئی والا کے بڑے سے گھر کے آرام و ہوس پر چلنے کے باوجود وہی اس سکون کی نیند اس لیے نہیں آتی تھی کہ اسے بڑے سنبھ دھڑکا رہا تھا کہ

اس نے کئی غیر معمولی چیزیں کھوس کر کہاں۔ سوئی والا کی کھوس
میں محتاطت کے لیے تربیت یافتہ رات بھر کھوسے رہے
تھے۔ تو سوئی اور پہنچے باوا نے ان کو ان کے بھونکنے کی
سموئی کی آواز پر پہنچ کر اس کے عینک میں ہی غماوش
بھاگتی تھی۔ کہوں گا بھونکنے اور غماوش بھانے دونوں ہی باتیں
مستی خیز تھیں۔ سوئی والا کی بیوی نے باوا کو خوف کو دیکھنے
ہوئے جہاں اسے غماوش تھیں کہنے والے سے سہل دی گئی۔
وہاں تو سوئی کی یہ خصوصیت میں تھی کہ یہ کہنے کی بجائے جانا
نہیں بھونکتے۔ باوا تو نے ان چند دھوکوں میں سوئی والا کی بیوی
کی کہی ہوئی بات کی صداقت کو یہ کہا تھا۔ کہ وہ اپنی اس
عرسے میں ایک بار بھی نہیں بھونکتے تھے۔ ابھی تو سوئی اور
باوا تو نے جوان کے بھونکنے کی آواز سنی تھی اور صرف لمحہ
کے لیے تھی۔ اس کے بعد پھر غماوش بھاگتی تھی۔ کہ باوا تو
جاگ نہ رہی ہوتی تو اسے کہوں گے کہ بھونکنے کا قطعی احساس
نہیں ہو جاتا۔ اب بھی وہ وہی طور پر تھی جس نے پانی کھی
لیکن اس کی پہلی جس نے خطرے کا اہام بھاننا تھا۔ یہ اندر
اگر نہ والے خطرے کے اس احساس اور خود پرستی کے
کہ بھاننے کی کھوس گھر خانی کی کہ ہر کچھ کے کہوں گے
بھونکنے کی جو آواز میں نے سنی تھی۔ وہاں باوا سے گزرنے
والے کسی آواز دے کر آواز نہ کر سکی تھی توئی خطرہ ہوتا
تھے وہ درسا بھونک کر چپ ہوئے کہ بھانے آواز سر پر
اٹھا دیتے لیکن اس دلیل کے باوجود وہاں کی کئی باتیں ہو پاری
تھیں۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ لا نا ایک بھر کا کہوں
نظر ڈالے۔

وہ اپنے اس ارادے سے قتل کر کے کے لیے وہے پاؤں
 لان میں بیٹھے گا۔ لان میں تار لگائی۔ خود اس نے بھی
 کسی کی لٹنیں روشن نہیں کی تھیں اس لیے اگر کوئی دور سے
 کو دیکھ بھی رہا ہوتا تو فوراً غبر پڑے۔ ان میں ماہ بانو کی
 موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ دس دن بیٹھے کے بعد ہی ماہ
 بانو کو ٹھک کر رک جاتا پڑا۔ اس کے کئے کا سبب وہ بڑے
 بڑے سیاہ رنگ کے کتے تھے جن کو کبلیا بدو کہتے والا لارڈا
 پرست زہد ہو جاتا لیکن وہ بانو کے کتے کا سبب کتوں کی
 قتل۔ اس وقت وہ اس لیے لکھی تھی کہ اس نے دونوں کتوں کو
 ایک دوسرے کے قریب لان کا کھاس پڑا ہوا بچھا تھا۔ ماہ
 بانو نے جب کہ ان دونوں کا پتہ نہ لیا۔ اسے ان کے وجود
 کی خبر نہ تھی۔ دس محسوس ہوئی۔ کتوں کے قریب ہی ماہ
 بانو کو گولی کا۔

معاہدہ باہانوں کی سمجھ میں آگیا۔ کسی نے سرخ الاثر تر ہوا ہوا یہ گوشت کا ٹکڑا کوٹھی کے لان میں چھبک کر کوئی سے بچنے کا انتظام کیا تھا۔ تربیت یافتہ ہونے کوٹھی کے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کر کے ڈرا سا بھوکے توڑتے لیکن ہر گوشت کے اس ٹکڑے نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی تھی۔ گوشت کا یہ لالچ ان کی زندگی کا پرانے کل کر گیا تھا اور ساتھ ہی ان لوگوں کی زندگیوں میں بھی خطرے میں پڑ گئی تھیں جن کی चाहت پر وہ مامور تھے۔ ماہ بانو کے علم میں یہ بات تھی کہ ان کوٹوں کے علاوہ کوٹھی کی चाहت کے لیے صرف ایک چوکیدار اور تھا۔ باقی ماہزین رات گیارہ بجے یعنی کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ صرف ماہ بانو چائے کی ڈسٹ داری میں منہالنے والے ایک میاں بیوی تھے جن کا مستقل کوٹھی کے سردنٹ کوارٹر میں قیام تھا لیکن وہ بھی دو دن سے اپنے خاندان کی کسی شادی میں شرکت کے لیے یعنی لے کر اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ماہ بانو انہماز و کوشش تھی کہ جن لوگوں نے کوٹوں کو خاموش کیا ہے وہ کیمت پر موجود چوکیدار کو بھی خاموش کر چکے ہوں گے۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ خاموشی عارضی تھی یا

ابدی! ماہ بانو کا دل چاہا کہ وہ پلٹ کر بھاگتی ہوئی کوٹھی سے کسی دور بھاگ جائے لیکن اس نے بروسانی کے عالم میں وہ بھاگ کر جانی بھی کہاں؟ اس کا ایک ہی خیم خانے میں رو گیا تھا۔ فی الحال وہ موتی والا کی بیوی کے فروہم کردہ کپڑوں پر گزارہ کر رہی تھی پھر اس اجنبی شہر میں اس کے پاس کوئی لٹکا باندھی نہیں تھا۔ رات کے اس پہر وہ کوٹھی سے نکل کر باہر جاتی بھی تو جانے کس مصیبت میں پھنس جاتی۔ ایک دوسرا خیال اسے موتی والا اور اس کی بیوی کے بارے میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو لوگ موتی والا کی کوٹھی میں داخل ہوئے ہیں وہ اس کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ اپنی بیوی سے موتی والا اور اس کی بیوی کو مصیبت میں گرفتار پھونڈ کر کہیں بھیجیں جائیں گی چنانچہ اس نے کوٹھی سے بھاگ نکلنے کا ارادہ ترک کیا اور کوٹھی کے اس مرکزی حصے کی طرف بڑھ گئی جہاں موتی والا اور اس کی بیوی رہائش پذیر تھے۔ انیس اس رہائشی حصے کے مٹی کی جانب تھی۔ ماہ بانو نے ماسے کے حصے میں جانے کے بجائے مٹی سمت موجود اس کھڑکی کا رخ کیا جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ یہ موتی والا اور اس کی بیوی کے بیڈ روم میں ملتی ہے۔ کھڑکی کے قریب جا کر ماہ بانو کو مایوسی ہوئی۔ کھڑکی بند تھی اور اندر سے اس کے گرد پودے لٹخے ہوئے تھے۔ مایوسی کے اس عالم میں وہ پلٹنے کا ارادہ کر رہی رہی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ کھڑکی کی ایک جانب سے پرو ڈرا سا جھٹا

ہوا ہے۔ ماہ بانو اس حصے پر اپنی تاک چھک کر اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں ماہ بانو بہت واضح طور پر اس شخص کو دیکھ سکتی تھی جو پارے اتہماک میں مٹی بخوری ہے۔ یہ زیورہ اور وہ بے سمیٹ کر اپنے بیک میں بھر رہا تھا۔ اس شخص کی حرکت دیکھ کر ماہ بانو تجسس میں پڑ گئی۔ اگر وہ ماہ بانو کی تلاش میں یہاں تک آنے والا چودھری لٹکا کر کوئی بندہ تھا تو اسے مال سینے کے بجائے ماہ بانو کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ شخص اکیلا لوٹ مار میں لگا ہوا اور اس نے اپنے بانی ساتھیوں کو ماہ بانو کی تلاش پر مامور کر رکھا ہو اور وہ لوگ کوٹھی کے مختلف کمروں میں ماہ بانو کو تلاش کرتے ہوئے ہوں۔ اس خیال نے ماہ بانو کی ریزہ کی ہڈی میں سنسنی جھٹ سی دوڑا دی۔ اس نے ایک جھرجھری لے کر مال سینے میں مصروف شخص پر سے نظریں ہٹا کر موتی والا اور اس کی بیوی کو دیکھنے کی سعی کی لیکن وہ جس ڈاڑھے سے اندر جھانک رہی تھی اس ڈاڑھے سے اسے پراسرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نظریں جلد ہیٹھ کے ایک حصے پر جاتے رہ جاتی تھیں اور وہاں اسے موتی والا اور اس کی بیوی کے وجود نظر نہیں آتے تھے لیکن پھر کچھ اوجھڑتا جو اسے نظر آگیا۔ بیڈ کی چادر پر لٹھ پڑ پڑتا ہوا وہ دھنڈلے طوطے پر سرخ رنگ کا تھا اور ایسی سرخی صرف انسانی خون کی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ خون کس کا ہو سکتا تھا۔ یہ کچھ نہیں ماہ بانو کو ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ بیڈ کی چادر پھینک ان دو شخص کے خون سے سی رہی ہوئی تھی جو ہر رات اس بیڈ پر گونہ خواب ہوتے تھے۔ آج شاید انکس اپنے ہی بستر پر ایسی خیمہ ملا دیا گیا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد ماہ بانو کے لیے مزید دالہا کھڑے رہتے لیکن نہیں تھا۔ وہ خیال جس نے تموزی پر پہلے اس کے قدم کوٹھی سے باہر نہانے سے روک لیے تھے۔ ایک دم ہی اس کے ذہن سے نکل گیا تھا اور اب وہ ہر حال میں یہاں سے نکل جاتا جاتی تھی۔ اپنے نکل بھاگنے کی اس خواہش میں اس نے گھٹنے کے لیے اس کے گھٹنے کے گھٹنے پر چڑھا پانچ دہنا کر جیسے ہی پلٹنا چاہا اس نے ایک دم اس کے وجود کو محسوس کیا اپنے بازو اس میں دھونچ لیا۔ ماہ بانو نے اضطرابی طور پر چپکے کی کوشش کی لیکن اسے دبوچنے والے نے اس کے کھٹے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی کوشش کو ناکام بنادیا۔ وہاں پانی ہی ماہ بانو ایک مضبوط مردانہ گرفت میں جکڑ گئی وہاں پھر گئے کے اور کیا کر سکتی تھی؟

حادثت و سانحہ کسی شکر۔ بنادھی تلاش جس سے گودال
ماہ بانو کسی داستان حیات کے واقعات اگلے ہاتھ دھو

نقد برکری گری ہست کی چال بازی کا دستور کا مکمل... کے اندر چھڑ جائے والوں کی کہانی

اسما قادری

گراب

پانچویں قسط

پہلے سے سمجھا جس قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور چھپا کر اسے سامنے کی روایتی نظام میں پرچھی ہے تو اس کے معنی ہیں بدل کر رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کی بھی کلی رخ ہیں بالآخر طبقہ کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح تھوڑی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں روایتوں میں تحریر ہو چکی ہے۔ ایسی روایتوں جس میں قانون سنبھلے ہوئے ایک جیسے نہیں بلکہ نامعلوم اور حال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو تو زگر اور کمزور مچھلی بیچ کو نکل جاتی ہے۔ پتہ نہیں ہے جی مریجات مثلاً میں جو محنت نہ تو روایتوں کو ساتھی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشیہ کا تجزیہ کر کے معیوب کا انتخاب کر لی ہے نہ تو بس پوچھتی ہے۔ دل طبقوں کی پیوا کرتا ہے اور یہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بے گناہ اور وقت کے بھاری۔۔۔ سمجھنا سمجھنے کی باتیں اور قدر کی چالیں ہیں۔۔۔ کبھی ماری پلت بھی جاتی ہے گزرا وقت کو تو نہیں سکتا سگری مقدور ساتھ رہ جاتا ہے۔۔۔ اس وقت تھیلوں کے نیچے میں بہت سے پانی مہ چکا ہوتا ہے جہیز، انیس شامی، خاکیر داری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ دو سلسلہ



ماہ باقو پدا زور گری بھی کو کسی طرح غور کو بکھڑے والے کی گرفت سے آزاد کرانے کیلئے کثرت بہت منبوجھی۔۔۔ شش شہر حمت مجاہد آرام سے رہو، میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں۔۔۔ چپے سے اسے گرفت میں لینے والے شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹایا۔ اس نے پلٹ کر خروبو چڑھنے والے کو دیکھا۔ تار پنا کے یہ جو وہ اسے شہادت کرنے میں کوکباب ہوئی۔ وہ موٹا والا کا لڑا کر تھا لیکن رات کے اس چہرہ اس کی زبان کو بھی میں کو تو مٹی کی ایک کھوکھلی آ کر گئی۔۔۔ تم جیسا کیا کر رہے ہو؟" "ماہ باقو نے دھکی آواز

میں اس سے دریافت کیا۔۔۔ یہ وقت سوال جواب کا نہیں۔ میں پہلے یہاں سے نکلتا ہوں گا۔ اس نے ماہ باقو کا ہاتھ تھامنا اور اٹھانے سے آنے سے منع کیا۔ اس کا دل بھی وہی ریش کی جانب تھا۔ وہ ماہ باقو کے جوان موتی والا سے بڑھ کر محض دیکھنے کے بعد بھی سکر چکے تھے اس لیے وہ بنا کی مداخلت کے اس کے ساتھ بیوی بیوی باری گئی۔ ساری بڑی کو بھی یہ اس وقت چوکا عالم طاری تھا۔۔۔ اس وقت کو بھی میں جیسے وہ نے لوت مار رہے تھے، وہ بکھر اندر کی ہست میں سرور کی تھے۔ گیت پر پہلے اس کو جو نہیں تھا۔ وہ دونوں قریبی گیت سے گزرا کر آرام سے ہم کھل گئے۔



سمجھا۔ ہم وہاں پہنچ کر ضرورت حال دیکھنے کے بعد ہی اس کے سلسلے میں کوئی اقدام کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے ماہ بانو سوئی والا کے گھر پر موجود ہو اور اس نے پولیس کو وہاں اپنی موجودگی کے سلسلے میں کوئی بھی اطلاع دی ہو۔ بہر حال بلا دور پہنچنے سے پہلے کوئی بھی لائحہ عمل طے کرنا ممکن نہیں۔" عبداللہ ان کا جواب دہ لوگ تھا۔

"اوکے اچھا اب پورے ملے کی جاری کرو۔ ہم نے ماہ بانو کو موتی والا کے گھر بھی خبر دیا ہوتا تو بہر حال اس سے میرے فرعون ایسے تھے کہ اس موقع پر میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔" اس نے عبداللہ ان کو حکم دیا۔ "صوبہ کی دہر بعد دو لوگ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولیٰ راست بائیں خاموشی کے ساتھ آتا۔ جس وقت وہ لوگ موتی والا کی رہائش گاہ پر پہنچے، وہاں چٹاؤں پر دروازہ کھلنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ انکھلا موتی والا کے ایک کمرے کے استقبال رکھے تھے۔ موتی والا کا شمار بڑے کاروباری افراد میں ہونے کی وجہ سے اس کی رہائش گاہ پر شہر کے تقریباً ہر قافیہ ذکر حقیقت سے متعلق دیکھنے والے افراد موجود تھے۔ پراس کیونکی کے افراد کے علاوہ کئی شخصوں کے اہل انصران اور سیاست دان بھی وہاں آکر رہ رہے تھے۔ موتی والا کے کمرے سے تعزیت کرنے کے بعد شہر یار مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ اپنے ناموں کی لائٹ رائے اور کمرے میں حاد رائے سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ چودھری اختر بھی وہاں پر موجود تھا اور سب سے زیادہ گرم گرم نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جنازے کے انتظامات کرنے والا موتی والا کا کمرے سارے کام اسی کے مشورے پر کر رہا ہو۔ وہ بے چارہ ایسا شیعہ چودھری اختر کے دیر ہے اور اس کے موتی والا کے کاروباری شریک ہونے کی وجہ سے کر رہا تھا۔ شہر یار نے لاپز دوسرے لوگوں کے ساتھ مصروف تھا لیکن اس کی نظریں چودھری اختر کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے اس کے چہرے پر بچاؤے افردہ تاثرات بائیں معنوی لگ رہے تھے۔ یہاں لگتا تھا کہ چودھری اختر وہ ہونے کی اور کاری کر رہا ہو۔ جنازہ روانہ ہوا تو بھی چودھری ی سب سے آگے آگے تھا۔ مگر کی قرعہ میلو سے ملنے میلو گاہ میں لہار جنازہ کی اور انکی کے بعد زیادہ تر افراد رخصت ہونے لگے۔ وہ سب مصروف ترین لوگ تھے جنہوں نے نماز جنازہ میں شرکت کا وقت بھی یقیناً ہی مشکل سے نکالا تھا۔ مرتے والوں کی تحفہ کی کے قبرستان روانہ ہونے والوں میں موتی والا کے قریبی عزیز دوست اور چند ماہر میں شامل تھے۔

"میں اس میں کسی کے شہسبی اختر سے ملنا چاہتا ہوں حاد

بھائی! "سجاد شہر یار سے ہاتھ ملا کر وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ تب اس نے بھی آواز میں اس سے خرامش کی۔

"کیوں؟" سجاد چلا۔
 "ابھی کچھ دن قبل میں نے آپ کے ڈوریلے جس لڑکی کو پیٹنے سے چھڑا دیا تھا، وہ لڑکی موتی والا کے گھر پر ہی رہتی ہوئی تھی۔ مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی تھیں۔" شہر یار نے آواز مزید دہرائی کرتے ہوئے بتایا۔ وہاں ارور اور بھی لوگ موجود تھے اور وہ بھی جانتا تھا کہ کئی لوگ کے گاہ میں بھٹک پڑے۔
 "تم نے اس رات بھی مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ آخر کون سے وہ لڑکی جس کے لیے تم اسے پریشان ہوا؟" سجاد رانے لے چکا۔
 "میں بعد میں آپ کو ساری تفصیلات بتا دوں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لیں کہ وہ ایک معلوم لڑکی ہے جسے میری مدد کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں اس میں انکو آخری آفیسر سے مل کر اس کے تحفظ کے بارے میں ہی یقین دلانا چاہتا ہوں۔ فی الحال تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہو رہا ہے کہ وہ موتی والا کے گھر پر موجود بھی ہے یا نہیں۔"
 "اوکے ابھی انکو آخری آفیسر کو آواز دے کر کہہ دیا ہوں۔ وہ تم سے ملاقات کر لے گا۔ تم کو یہاں رہنا پڑے گا۔" سجاد شہر یار نے آفیسر کو اس وقت سے اس کی فرمائشیں پوری کرنے کی بات کی۔ اس وقت بھی اس نے زیادہ بحث نہیں کی اور اس کا حال یہ پورا کر دیا۔
 "حقیقت یہ سجاد بھائی! " شہر یار اس نے ایک دم جوش مصافحہ کرتے ہوئے بولا اور اپنی گاڑی سے اتر بیٹھے۔ بعد مشاہدہ خان کو راناہ آس چلنے کا قصد دیا۔ میرا احسان اس کے ساتھ تھا۔ راناہ اس میں سب مضمون صرف اس کی عمرانی آخری ہی موجود تھیں۔ راناہ کے رانا کی بیوی کی عمر کچھ سال تھی۔ سجاد اپنے بیوی بیٹوں کے ساتھ الگ رہتا تھا اس لیے آخر میں رانا کا بیٹہ گھر پر تھا ہی گزرتا تھا۔ بھی سجاد رانا کے رانا کے ساتھ کسی فکر کشی میں شرکت کرتے نہیں جاتے تھیں لیکن مزاجاً غلطی پسند نہ ہونے کے باعث وہ عموماً صرف بچے کو ہی لڑتا رہتا تھا۔
 "بھائی! فریڈنٹی ہوئی موتی والا کی بیٹی کے ساتھ پہلے جوان بنا جائے گا۔ کاروبار کر رہا کیا اور اب وہاں کیا کیا ہو رہی ہے۔ ذرا سے مجھے میں سارا حال دلائیں تم کو۔" سجاد نے راناہ سے حاد دانی کو پوچھا۔
 "میں اس قسم کے وعدوں کی حقیقت پوری ابھی طرح معلوم نہیں ہے۔ تمہارے ناموں کے ساتھ برسوں گزرا ہے جس لحاظ سے تمہارے معرکہ حقیقت کا نام بھی نہ دیتی رہتی ہوں۔ مجھے

"ہاں، واقعی بات تو یہی انکو سننا ہے۔" اس نے غصہ دہائی سے آخر میں راناہ کی بات کی تھی۔ اس نے اس کا ذکر کیا مگر وہاں نہیں آتا ہوا تھا۔ ابھی تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں سے اور کس حال میں ہے؟ موتی والا کے گھر میں جو جوم لگا ہوا تھا، اس جوم میں وہ بھی سے ماہ بانو کی بات اور بات نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں چودھری اختر کے ساتھ اس کے کسی کا ہونے بھی موجود ہوں گے، اگر وہ لوگ اس کی یا عبداللہ ان کی کوئی غیر معمولی مہر گئی دیکھ لیتے تو ضرور پرکھ پڑتے۔

"تمہارا کیا خیال ہے ابھی اس واردات کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ہرے تو کہا رہا ہے کہ وہاں ڈاکا پڑا ہے اور ڈاکو بہت سارا چلا اور زور لوٹنے کے ساتھ موتی والا اور اس کی بیوی کو لٹک کر گئے ہیں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ معاملہ کوئی اور ہے۔ پہلے بیٹے کی حادثی موت اور اب وہاں کیا کیا ہوئی کے لڑکی واردات سے تو اب ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی کی موتی والا سے دشمنی تھی۔ وہ سب سے سنا سنایا کہ کوئی لڑکا تو لڑا ہو۔ اکثر لوگ دلت حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے جھگڑے استعمال کرتے ہیں۔" آخر میں راناہ کو مشکل سے کوئی سانس دیتا ہوا تھا۔ شہر یار ہاتھ لگا کر حاد وہاں کھول کر چلا آ رہا تھا کہ وہاں کسی کی۔

"اچھا! تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے سجاد بھائی سے کہا تھا کہ اس میں کسی کے انکو آخری آفیسر سے میری ملاقات کروا دیں۔ تمہاری دیر میں وہ آفیسر یہاں آتا ہوا تھا۔ شہر یار نے انھیں جواب دیا۔ اس کی پردہ کی زیادہ تر دوسری دانی انھوں نے ہی بھائی بھی اس لیے وہاں کا بہت ادب و لحاظ کرتا تھا۔ اس وقت بھی کتنو کا مواظبت ہونے کے باوجود وہ ان کے مولوں کا جواب دے رہا تھا۔
 "یعنی تم اس آفیسر سے ملاقات کے لیے یہاں رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ملاقات کے فوراً بعد ہر لوگ غراہواں ہو جائیگا۔ اسل میں یہ فیصلہ بائیں اٹھائی جاوٹ ہے۔ وہاں مجھے وہاں اسے معاملات دیکھنے میں کوئی اٹھال نہیں آنے پہلے ہی فرصت میں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں، میں کسی دن انھیں اس سے صرف آپ سے ملنے کے لیے لاہور آؤں گا۔" شہر یار نے انھیں تسلی دی۔
 "مجھے اس قسم کے وعدوں کی حقیقت پوری ابھی طرح معلوم نہیں ہے۔ تمہارے ناموں کے ساتھ برسوں گزرا ہے جس لحاظ سے تمہارے معرکہ حقیقت کا نام بھی نہ دیتی رہتی ہوں۔ مجھے

ہوئے اس کو اپنا فیصلہ آیا وہ لاکھ بڑی طرح پاؤں تار بہا۔ وہ
 اچھی پہلی ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہی تھی۔ اس زندگی
 میں جو دھری انکار کیا تھا وہ ایک گرواب میں بیٹھ چکی تھی۔
 اسے لگا تھا کہ اسے اس گرواب سے نکل کر وہ چارو اپنے گھر
 جا کر رہتا بھی نصیب نہیں ہوگا۔ کبھی گھر نہ لوٹنے کا یہ خیال
 بہت دھت تک اور افسردہ کر دیتے والا تھا۔ اس افسردگی
 اور دھت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب جامعہ شام کا
 اخبار لے کر گھر آیا۔ اخبار میں موتی والا اور اس کی بیگم کے لگ
 کی خبر چھپی تھی۔ اس خبر کو بڑا حیرانہ و بہت پریشان کر رہی۔
 ان لوگوں نے اسے پتا نہ ہوئی تھی، خصوصاً موتی والا کی بیوی کا
 رہا اس کے ساتھ بہت گہرا بیگانہ تھا مگر وہ دونوں لگ کر
 دیے گئے تھے۔ اخباری الطالع کے مطابق قتل کی واردات
 دراصل ڈاکوؤں کی واردات کے ساتھ چلی ہوئی تھی لیکن
 جانے کیوں اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ چھپ چھپ کر رہتے
 اور گھر کے بیٹے کو مرنے کا شوق تھا۔ ہونے شام کا وقت گزر
 گیا۔ رات کے تقریباً آدھے بجے سرد ہواں پکچھا۔ وہ بہت تھکا
 ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔
 ”اب جلدی سے مجھے بتا دے کہ یہ سارا ہچکرا کیا ہے؟“
 میں پورا دل پریشان رہا ہوں۔ بڑی سے کوئی سوال کرنا اس
 لیے مناسب نہیں سمجھا کہ میرے چور کرنے پر بھی کسی لڑکے میں
 اسے یہاں پتا نہ ہو۔ پکچھوں اور اس پتا کو پتا نہ ہو، اس لیے
 مجھے گوارا نہیں تھا۔ ”عامر نے فوراً ہی اسے خبر لیا۔ وہ چور
 میں تھی، خود بھی جھٹک میں آگئی تاکہ اپنے ذہن میں موجود
 بہت سے باتوں کے جواب حاصل کر سکے۔
 ”مجھے خبری پریشان کن خیال تھا۔ یہ اسی ہے شہید
 حصن کے باوجود گھر جانے کے بجائے میرے پاس آیا
 ہوں۔ سارا دن گاڑی دوڑا دوڑا کر گھر نہ نہانے کے ساتھ
 ساتھ پولیس والوں کو بھی ہتھکڑیا ہے۔ ان کا سارا روز غریبوں
 پر ہی چلتا ہے اس لیے ہم سارے ملازمین کو گھر کو بھیج دے
 کسی طرح چھوڑا گیا۔ شاکر اور اس کی بیوی کو تو شادی
 والے گھر سے واپس بلایا گیا کہ کتنی وہ لوگ ڈاکوؤں کو سادی
 جبری کرتے کے بعد شادی میں شرکت کے جانے سے
 تو منہ پھرنے نہیں ہوتے گئے۔ ایک گھر انہیں یہاں لڑکی کی طرف
 سے بھی کڑی کر دیکھیں اور کہاں تک رہیں؟“ عامر اندر سے
 گھبراہٹ کے مارے گیا۔ حال تھا میں تپا تپا کر رہی۔ بس
 ہمت کر کے سب کے ساتھ جی پوتا رہا کہ مجھے نہیں معلوم۔
 اگر پولیس والوں کو یہ پتا دیا کہ لڑکی کو میں نے وہاں سے نکالا
 ہے تو وہ ڈاکے اور اس کا کٹک بھی مجھ پر ہی کرتے۔“

”خف تو نہیں کرتا ہی جا رہے تھے۔ میں خود پریشان
 ہوں کہ تو ڈاکے کے وقت وہاں کبھی میں گیا کہ ہاتھ بچہ
 خبری ڈیوٹی تو تو تھک گیا وہ بچے تم ہو جانی ہے۔“ عامر نے
 پریشانی کے جواب میں عامر نے اس سے پوچھا۔
 ”تو تو جانتے جا رہے تھے اور پھر کے معاملے کے
 بارے میں۔ میں قادیان کے گھر پرست ہوا چکا ہوں۔
 بارہویہ دکان پر دکان پر جاتا ہے۔ میری غیر سے بات ہوئی تو
 اس نے کہا میری ذرا تندرستی کا کام چھوڑ کر کوئی دوسرا عزت والا
 کام کرو تو میں اپنے گھر والوں کو مرنے کی کوشش کر دیتی۔
 اب عزت والے کام کے لیے آدمی کے پاس یا تو تعلیم ہو
 یا۔ وقت پر تعلیم حاصل کی ہوئی تو یہ ذرا تندرستی کا کام ہی
 کیوں کرتا پتا نہ ہو جیسا ہماری سات لکھوں میں سے بھی کبھی
 کسی کے پاس نہیں دیا تو میرے پاس کہاں سے آتا؟ لیکن
 میں تعلیم کو بھی نہیں خواہتا تھا۔ میرے ذہن نے مجھے راستہ
 دکھا دیا کہ کتنی سے آتا جیسا حاصل کر لوں کہ اپنا کوئی ذاتی
 کارہ پار کر سکوں۔ موتی والا صاحب کے پاس ملازمت کرتے
 ہوئے مجھے چار پانچ سال ہو چکے ہیں۔ مجھے ان کے بارے
 میں بہت سی باتوں کا علم ہے۔ گھر میں حفاظت کا کسا انتظام
 ہے اور وہ پتا نہ ہو، وغیرہ کہاں رکھا جاتا ہے۔ جب کچھ گھر
 بس بچہ میں ہے منصوبہ بنایا کہ ان کی موجودگی میں قتل ہو
 جائے۔ شاکر اور اس کی بیوی کے چھپنے پر جانے سے مجھے
 اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں اور بھی سمجھتا ہوئی۔ اپنے
 شے کر وہ منصوبے کے مطابق اس روز میں ڈیوٹی پر نہ گیا
 ہونے کے بعد کوئی سے روانہ ہونے کے بجائے شاکر کے
 گھر میں چھپ کر چھپ گیا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں نے
 ایک زمانے میں اپنے ایک دو عاشق چھپ کے دوست سے
 تیری مدد سے تالا وغیرہ چھوٹا لیا تھا۔ اس نے اس کے میری
 مدد کی۔ میں شاکر کے گھر کو لے گیا کہ آرام سے اندر چلا
 گیا۔ مجھے امید تھی کہ اسی کے ہمارے من کو بھی سے
 اندر دینی تھی میں بھی مس چلاں گا اور تھوڑی سی کھول لوں
 گا۔ تھوڑی سے نکلا ہوا میں شاکر کے گھر میں کتنی چھپا
 دیا اور بعد میں مناسب وقت پر نکال لیتا۔ بیٹھ صاحب اور
 ان کی بیگم کو واردات سے پہلے سے ہوش کرنے کے لیے میں
 نے سب کو ہوش کی وہ ایک ابھر سے من میں بھری تھی۔ چوری
 کے بعد میں رات کو باقی حصہ آرام سے شاکر کے گھر میں
 چھپ کر گزارا اور کتنی معمول کے مطابق ڈیوٹی پر حاضر ہو
 جاتا۔ کیٹ پر ڈیوٹی دیتے والا چوکیدار بڑا بد مشہور تھا اس
 لیے مجھے یقین تھا کہ وہ میرے رات کو کوئی سے نہ نہ جائے۔“

”مجھ اندر ہی نظر آئے پر کوئی لوٹ نہیں لے مجھ جگہ سے
 خیال گزرتے کہ کبھی آدمی دوست ان اوقات میں ہونی ہے
 جب وہ کیٹ سے غائب تھا۔ میں اسی طرف سے اپنے اس
 منصوبے کو بالکل مکمل بھر رہا تھا۔ پہلے مرے لے کا سامنے لے
 جبر سے اس یقین کو اور مضبوط کر دیا تھا کہ میں بھر سب کچھ
 ہوتا چلا گیا۔ میں آدمی رات کے بعد جب شاکر کے گھر
 سے نکلا تو میں اسی وقت کی سے باہر سے گوشت کے ٹکڑے
 کوئی کے لان میں اٹھا لیا۔ کتنے بڑا ہوش پر چوک گئے
 تھے، وہ گوشت کے ٹکڑوں کی طرف لپے اور سب تلی سے
 اسے اپنے انگوٹوں سے لوٹنے لگے۔ میرے لیے یہ سحر جرت
 گئی تھا کہ میری معلومات کے مطابق کتنے تربیت یافتہ تھے
 اور مخصوص خوراک کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھاتے تھے مگر باہر
 سے چھپنے جانے والے گوشت کے لیے ان کی بے چینی، بے چینی
 تھی۔ شاید اس گوشت میں کوئی ایسی خوشبو شامل کی تھی جو
 ان کو مہر و غیب تھی۔ سب چاہتے تھے اس گوشت کا ذرا مانا
 جس کا کھانے کی کر پڑے۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ باہر سے کوئی
 کوئی میں نصیب لگے گی کی کوشش کر رہا ہے اور اس نے سب
 سے پہلے کھانے پر مامور کون کا بندہ بہت کیا ہے۔ قتل تو میں
 ہی دیکھنے کا اور اور کتنے قاتلین کتنے مجھ سے ان لوں سے اس
 لیے مجھے ان کی طرف سے کوئی خطر نہیں تھا۔ ان لوں کے مرتے
 ہی میں کوئی کے کیٹ کی طرف ہوا گا۔ چوکیدار صاحب معمول
 کیٹ سے غائب تھا۔ میرے دیکھنے ہی دیکھتے ایک ایک لٹ
 ہوش کیٹ چلا گیا کہ اندر آیا اور اس نے ڈیوٹی کیٹ مکمل دی۔
 میرے کتنے اور لٹ پر شاکر اندر میں آئے۔ ان میں سے دو
 چوکیدار کے کینن کی طرف چلے گئے اور ایک نے کوئی کی
 حرکت کی حدت کے بارہا سے پہلے آگئی شروع کر دی۔ وہ
 چھپتا میرے اسے لے کر میں بڑھا۔ جب تک اس نے لاک
 کھولا، چوکیدار کے کینن میں چھپ جانے والے باہر نکل آئے۔
 انہوں نے ان لوں کی طرح اس کے بھی خاموش رہنے کا
 بندوبست کر دیا تھا۔ اب چونکہ انہیں اطمینان تھا کہ وہاں
 انہیں دیکھنے والا یا ان کے کام میں دکانڈ ڈالنے والا کوئی
 نہیں باقی نہیں ہے، اس لیے وہ چاروں کے چاروں اندر
 چلے گئے۔ مجھے جانے لیا کہ اس وقت ہی کوئی سے ہوگا
 جانے کے بجائے کبھی مجھ کی طرف چلا گیا۔ صاحب کے بیڑ
 وہ بھی کمر کی تھی ان میں تھی، اس بات کا مجھے علم تھا۔
 میں نے کوئی سے ان کے بیڑ میں چھپا دیا۔ کوئی میں چھپنے
 ڈالے ہی اس وقت وہاں پہنچے تھے۔ میری نظروں کے
 سامنے وہ افراد اپنے چاقو کھول کر بیڑ کی طرف لپے۔ میں

جس رخ سے دیکھ رہا تھا وہاں سے بیڑ پر سونے ہوئے لوگ
 مجھے نظر نہیں آ رہے تھے کتنے چاقو کے وار سے لگا کر لپٹے والا
 خون میں نے صاف دیکھا۔ ساتھ ہی مجھے اندر سے کچھ کی
 آوازیں بھی سنائی دیں۔ کتنی کی اس واردات کو کوئی نہ کرنا
 سمجھا گیا اور خود چرچا ہونے کے لیے کھڑکی سے بہت کڑوا
 فاصلے پر بیڑ گیا۔ اسی وقت میں نے کسی کو وہاں سے دیکھا۔
 پہلے میں ذرا کہ شاید کوئی میں کھتے والوں کو کوئی سامنے ہے
 لیکن پھر مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ سیاہ خال میں کئی وہ
 ایک لڑکی ہے۔ لڑکی نے بھی میری طرح ہی کوئی کیٹ سے
 سے مجھ تک کر اندر کا بازو دیا۔ اس دوران میں کچھ پکا تھا
 کہ یہ موتی والا صاحب کی مہمان تھی ہے۔ وہ بے چینی
 سے کئی تو اس کے چہرے پر ایک خوف تھا کہ کتنے کیٹ پر خوف
 سے کچھ مارنے لگی اور ظاہر ہے بیچتوں کی یا بڑا اندر
 بھی جاتی ہی لیے میں نے اس کی حفاظت کے خیال سے
 چھپنے سے جا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بعد ہم
 دونوں کوئی سے کھلے ہوئے۔ میں جب اسے اپنے ساتھ کوئی
 سے لے رہا تھا، جب میں مجھے احساس تھا کہ میں اپنے آپ کو
 مشکل میں ڈال رہا ہوں لیکن ایک لڑکی کو اسے بے خطر ہے
 میں گوارا چھوڑ کر فرار ہوتا ہوں میرے چھپنے سے گوارا نہ دیا۔ شاید تم
 دونوں سوچ کر اپنے مالک کے گھر میں نصیب لگنے کا بارہا
 رکھے والا کھل بھلا کہاں کا باغیچہ ہے۔ لیکن یہ تھی کہ
 میری اس تھک حیرانی کے اندر سے کے چھپنے میری بے خبری
 سے زیادہ میری بیخودی تھی۔ میں تسلیم کے لیے لپٹا ہوں اور
 اسے پالنے کی بجور مجھے بھائی دلی میں اس پر چل پڑا۔
 سر نہ لے ایک ہی سانس میں سارا ساتھ نہانے کے ساتھ ساتھ
 اپنی بے بسی کو بھی اجازت کیا۔
 ”عامر تیس تو فرمے بہت کی ہیں لیکن رات ان
 قاتلوں پر چھین برا ہو کر کتنے کا نہیں ہے۔ اب سب بات جو
 ہمیں سوچنی ہے وہ یہ کہ ان شخص کے سلسلے میں کیا کریں۔
 ظاہر ہے پولیس کے لیے ان کا پتا نہ ہو تاکہ ایک ملہو کار اور
 اس منے کے مل کے لیے وہ اوپر اوپر ہاتھ پائی لگی۔
 ایسی صورت میں میرے ساتھ ساتھ میرے چھپنے کا امکان
 ہے۔“ عامر نے سر دھوا کھسکا دیا۔
 ”میں سمجھتا ہوں یا لیکن اب جو کچھ ہوگا اس لڑکی کے
 مشورے کے بعد ہی ہوگا کیونکہ مجھے تو نہیں معلوم کہ کون
 ہے اور صاحب نے کیوں اسے اپنی کوئی نہیں دیکھا تھا؟“
 ”آپ نے سر دھوا بات میں کی کتنی سے آپ ہمیں
 اپنے بارے میں بتاتے ہیں تاکہ ہم کوئی فیصلہ کر سکیں۔“ عامر نے

ماہ بانو کی طرف رخ کیا۔ وہ اس جاری گفتگو کے دوران خاموش بیٹھی ابھی اٹھان مروتی رہی تھی۔ خود کو مخاطب کیے جانے پر اس نے۔ مشکل اپنے لب کھولے اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”مولیٰ والا صاحب سے میری کوئی رشتہ داری یا ذاتی جان بچان نہیں تھی۔ دوسرے کسی کے کہنے پر میری مدد کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی کوئی میں پناہ دے رکھی تھی۔ مجھے اپنی طرح یقین نہیں لیکن تمہارا سا رفیق ضرور ہے کہ مولیٰ والا صاحب کی کوئی میں سمجھنے والے لوگ میری ہی تلاش میں آئے تھے لیکن وقتی طور پر لاٹا کا شکار ہو کر لوٹ مار میں الجھ گئے اور میرے مدد سے وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اگرچہ مجھے یہاں نہ لاتے تو کوئی سے نکل جانے کے باوجود میں بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ لیکن لڑکی کے لیے یوں بھی خود کو محفوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے اور میرے ساتھ تو یہ بھی مسئلہ ہے کہ میرے وہ جن مسلسل میری یادو گتھی بھر رہے ہیں۔ آپ لوگوں سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ اس وقت تک مجھے پناہ دے دیں جب تک میں اپنے بعد وہاں سے راپڈ کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتی۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ مجھے مشکل میں دیکھیں گے تو ضرور میری مدد کریں گے۔ ان کے اثر رسوخ کی وجہ سے پولیس بھی آپ لوگوں پر کوئی الزام عائد کرنے سے گریز کرے گی۔ میں سیر الیکٹ بار ان سے رابطہ ہو جائے۔“

”اگر تمہارے وہ بعد وائے ہی اثر رسوخ والے ہیں تو چلو ابھی پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔ پولیس خود ہی تمہارا ان سے راپڈ کروا دے گی۔“ عاصم بھی سمجھا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”نہیں۔ میں پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔ مجھے پولیس والوں پر اختیار نہیں ہے۔“ وہ فوراً ہی بدی۔
 ”تو تم نہیں اپنے اس بعد وائے نام اور فون نمبر وغیرہ دنا دو کہ جہاں سے راپڈ کر کے تم سے اپنی جان بچا رہی۔“
 ”مگر کچھ چیزیں اہم تھیں۔ ایک تو اسے اپنے مقصد میں نہ لانی ہوئی تھی، دوسرے وہ ایک مصیبت بھی خود ہی اپنے گھر سے باہر کر کے لے گیا تھا۔“

”ان کا نام شہر یار ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر شہر یار۔ لیکن میرے پاس ان کا فون نمبر نہیں ہے۔ فون نمبر کے لیے آپ ایک دارالامان کی دفتر سے راپڈ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو دارالامان کا پتہ بھیجا دیتی ہوں۔“ وہ ان دونوں کو پتہ بھانسنے لگی۔ اگر وہ دونوں پڑے نہ لکھتے ہوتے تو دارالامان کی منتظر

سے فون نمبر حاصل کرنے کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے سید سے سید شہر یار کے اندر میں موجود ضلع کا نام پوچھ کر ڈائریکٹری سے اس کے دفتر کا فون نمبر حاصل کر سکتے تھے۔ مگر ماہ بانو کا دماغ بھی ان حالات میں درست سمت میں موپنے سے معذور تھا۔

ماہر آفتاب بڑے اشتیاق سے حراوروں کو دہار کھڑی کر رہا تھا۔ دہار میں جاتی جانے والی ایک ایک اینٹ اسے خوش فراہم کر رہی تھی کیونکہ وہ جتنی جانے والی اینٹ کے ساتھ وہ اپنے خواب کو گہیرے کر رہے تھے گزرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ شہر یار نے اس کے اسکول کی توسیع کا پورے بعد کیا تھا، اس پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ خلاف توقع ابھی تک چودری اختر کی طرف سے اس کام میں کوئی دیر نہ ہوئی تھی۔ اس کا کیا گیا تھا اور اسکول کے لیے کمرہ کی تعمیر کا کام سکون سے جاری تھا۔ دوسری طرف سو پل کی مینی والے بھی اپنا کام شروع کر چکے تھے۔ اسے وہ عمل مینی کے گاڑی تعمیر پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس علاقے میں سو پل سرور شروع ہو جاتی تو اسے کافی ہیئت ہو جاتی۔ ابھی تو دارالامان کے لیے ڈاک خانے تک جانا پڑتا تھا۔ سو پل تک کام کرنے لگتے تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا۔

”سلام ماہر صاحب!“ وہ اپنے خیالوں میں گم تھیر کے کام پر نظر ہمارے کھڑا تھا کہ عقب سے سنائی دینے والی نسواری آواز نے چونک کر پھٹے پر مجبور کر دی۔
 ”وہیکل اسلام۔ کسی ہو رانی؟“ سلام کا جواب دینے کے ساتھ اس نے رانی کا حال بھی پوچھا۔ رانی کا چہرہ بھری اسکول میں زیر تعلیم تھا اور وہ اس کی شکایتیں کرنے اکثر اسکول آتی راتی تھی اس لیے وہ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔
 ”زب کا شکر ہے۔ آپ اپنا حال پتہ کیا؟ آج کل تو بڑے خوش ہوں گے۔ آپ کا اسکول چوتھی کر رہا ہے۔“

”ہاں بھائی، میں تو بچہ چڑاؤ خوش ہوں۔“ وہ مسکرا رہا۔
 ”انشا مائیں آپ کو کتنا خوش رکھے۔ ہمارے پٹہ کے بچے پڑھ لکھ کر ترقی کر گئے تو اس میں سارا ہاتھ آپ کا ہو گا۔ کاش امیر نے ماہر میں بھی کوئی آپ جیسا استاد دیا۔ مجھے بڑا شوق تھا کہ پڑھنے کو لیں دو چار بھائیوں سے آگے پڑھ ہی نہیں سکی۔“ رانی نے کھجور اسی سے بتایا۔
 ”تو کیا ہوا، آپ پڑھ لیا۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“ اس نے پیشکش کی۔
 ”جی ماہر صاحب!“ وہ خوش ہوئی لیکن بھرا داسی سے

بولی۔ ”مجھے بھلا کون اسکول آکر آپ سے پڑھ دے گا؟“
 ”آہی بہت کرے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں بھی تو کچھ عرصے سے کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اسکول کی عمارت میں توسیع ہو جائے لیکن نہیں میری نسواری ہی نہیں ہوئی تھی۔۔۔ پر اب دیکھو میں نے بہت مشکل باری اور کوشش جاری رکھی تو کام شروع ہو ہی گیا۔“ امیرا دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ وہ پھر کو اسکول کی مینی کے بعد یہاں پر دستکاری کا کام شروع کر دیا جائے۔ چنڈ کی عورتیں آتی ہر مزدور ہیں ہم ان سے کیڑوں پر لڑنا چاہتا ہوں وغیرہ کر دیا ہو اور دوسرے بڑے شہروں میں لے جا کر بیچیں گے تو اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی۔ یہ تو عورت بہت گھناؤنا ہوتا اور حساب کتاب کرتا تو جانتی ہی ہو۔ میں ایسا کروں گا کہ اس کام کے لیے ہمیں انچارج بنا دیں گا۔ ہم کام کرنے والی عورتوں کی عمرانی بھی کرتی رہتا اور ساتھ میں اپنی پر حالی بھی شروع کر دینا۔ میں تو رہتا ہی نہیں ہوں، ہم جب ماہ بانو کی آسانی سے میری مدد لے سکیں۔“

”چوڑی دڑی میری ماہر صاحب! امیرا پڑھنے لکھنے کا خواب پورا ہو گیا تو میں آپ کو بڑی دیکھ میں دوں گی بلکہ آپ کی غلام بن جاؤں گی۔“ اس کی تجویز سن کر وہ بے حد چٹائی ہوئی تھی۔

”غلام دلا م نے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس جب تم چڑھ لکھ جانا تو گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی پڑھانا۔“
 ”بالکل جی! میں تو بڑے شوق سے یہ کام کروں گی۔“ اس نے فوراً وعدہ کیا پھر ایک کچھ یاد آئے پھر بے جا بھڑکے پڑا۔
 ”ماہر صاحب! میں نے اسے بھی اس لیے میں ہوں گی! جس کام سے آتی تھی، وہ تو بھول ہی گئی اور دوسری باتیں کر چھٹی گئی۔“

”کس کام سے آتی تھیں؟ کیا تمہارے بھائی نے بھر چھٹی ستا شروع کر دی ہے اور میرے پڑنے نہیں دیتا۔ لیکن ایک بات میں نہیں بتاؤں تمہارا بھائی پڑاؤ میں پچھلے ہے اور اسکول میں خوب دل لگا کر پڑھتا ہے۔“ اسے اپنے فقرے کی مدد میں رانی کی آمد کے مقصد کا اعجاز دلگتے ہوئے اس نے مسکرا کر لے لی دی۔

”مجھے معلوم ہے جی کہ میرا بھرا پڑاؤ اور پڑاؤ پچھلے ہے۔ وہ تو جس میں اس پر عرصہ خوب دیکھنے کے لیے آپ کے پاس اس کی شکایتیں کر رہا جاتی ہوں، پر اس وقت میں اپنے کام سے نہیں آتی، مجھے کوشش کرنی ہے۔“ یہ بات جانتے ہوئے رانی کی آواز بہت مدھم ہوئی تھی۔
 ”کیوں؟“ وہ بڑی طرح چڑکا۔

”انہوں نے آپ کے لیے یہ بھیجا ہے۔“ رانی نے اور محسوس میں چھپا ہوا تھا باہر نکال کر ایک کپے لے کر نکلا۔ لفظ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ لفظ تمام کلمہ اور کم صمدی کیفیت میں کھڑا رہا پھر اہستہ سے بولا۔

”اپنی بی بی کو کھڑا رانی کی یہ سب غلطی ہے۔ اس طرح تو وہ اپنے لیے بھی مصیبت مول لیں اور میرا بھی راستہ گھٹا ہو گا۔ میری زندگی کا مقصد کچھ اور ہے اور میں ان سارے مصلحتوں میں نہیں پھنستا جاؤں۔“

”میں بی بی کی کھانے کی کوشش کروں گا تو پھر چھوڑ دو۔ بڑی بات ہوئی ماہر صاحب! وہ بی بی ان سحلات میں کوئی کسی کے کھانے سے نہیں کھیت اور بی بی کو تو قریب لے آئے عرصے میں پہلی بار کسی میں دیکھی اپنے دیکھا ہے۔ وہ بہت اچھی ہیں ان کا دل۔ کئے کو تھوچے پڑاؤ کچھ سو گڑا رانی وہ بی لفظوں میں شوری دلالت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اچھے لوگوں کو تو دوسروں کی اور بھی غلطی لگ جاتی ہے۔ اگر چودری صاحب کو اس معاملے کی ذرا بھی غلطی مل سکتی تو وہ مجھ پر یہاں کی زمین تک کریں گے۔ میں یہاں رو کر لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں، ان کے کام آنا چاہتا ہوں۔ تم اپنی بی بی سے کہو کہ وہ میرے اس کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔“ اس نے ہاتھوں میں تھامنا لائی ہوں کا فون رانی کو لیا دیا اور رخ موڑ کر دواؤں و دواؤں کی طرف الجھنے لگا۔ اسے سب کام میں مشغول تھے اور ان دونوں کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔ رانی اس کا اعجاز دیکھ کر دلچسپ بن گئی، چہرہ کھلا سہلے پر آئی شاد اور سرخین کو کچھ کر پڑی غرا بھی۔
 ”خیر تو ہے رانی! اس وقت یہاں کیا کر رہی تھی تو؟“
 ”نسریں عرف بھیجی سے کتنی خیر امتداد میں پوچھا۔“

”ماہر صاحب سے سننے کی شکایت کر لے لی تھی۔“ اس نے بہانہ بنایا۔
 ”اچھا۔“ ہمیں ایسا کہ ماہر صاحب جہیں کچھ دے رہے ہیں۔“ شاد و دکان سے بولی۔

”تو اپنی انھیں بلا علاج کرنا۔ ہر وقت غلامی و بھگت رہتی ہے۔“ رانی اندر سے گھبرائی لیکن اس صبر اس کوئی ہر کچے بغیر خزانے سے جواب دے کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ چھٹی اور شاد و بھگت لگتی تھی اور پڑاؤ کو بانے والی لڑکیوں سے تو وہ یوں بھی بھٹ خاسلے پڑی رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس وقت تو پھر میرا مدد بھی شوری بی بی کا تھا جس کی اگر کسی کو کان کان بھی خبر ہو جاتی تو ایک طرف لکھنا ہوتا۔

لیکن وہ خوف زدہ ہو چکی تھی اور تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔
 ”اے دو کو۔“ اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی
 دی اور ساتھ ساتھ یہ پکار بھی۔ ”وہ رکنے کے بجائے تیز
 دوڑنے لگی۔“

”رنگ جاسالی اور نہ اٹھا نہیں ہوگا۔“ وہ پیچھے سے
 دھاڑا لیکن اور کے بغیر دوڑتی چلی گئی۔ وہ کوئی نو مہر لڑکی نہیں
 تھی، ابھی خاصی اوچھڑ مری عورت تھی لیکن ساری زندگی
 ملازمت کرنے اور خود کو مصروف رکھنے کی وجہ سے کافی انجینئر
 تھی اس لیے اپنی عمر کی دیگر عورتوں کے برخلاف کافی تیزی
 سے دوڑ رہی تھی۔ کچھ خود کو خطرے سے محفوظ رکھنے کی سبلی
 غراہش نے بھی اسے ہمیز کر دیا تھا۔ بغیر ہیل کے پاٹ کوسے
 والے جوئے بھی اس وقت اس کے لیے کافی معاون ثابت
 ہو رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک مچی پارکر کے
 دوسری گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے تقاب میں آتے
 والا شخص بھی مسلسل پیچھے تھا۔ وہ پہر کا وقت ہونے کی وجہ سے
 گلیوں میں سناٹا تھا اور کوئی چہ ہے لیکن اس دوڑ کو دیکھنے والا
 نہیں تھا۔ وہ چھوٹی سانسوں کے ساتھ دوڑتی اس کی کوشش میں
 تھی کہ جلد از جلد یہ گلی پار کر لے۔ اسے علم تھا کہ اس گلی کے
 اختتام پر تین روڈ سوجا ہے۔ وہ ایک پارکین روڈ پر پہنچی جہاں
 تو وہاں سے کوئی سواری حاصل کر سکتی تھی۔ دوسری امید اسے
 یہ بھی تھی کہ رش والی جگہ پر پہنچ کر وہیں کھلے عام اس پر ہاتھ
 ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکے گا مگر تعاقب کرنے والا بھی شاید
 یہ سب باتیں جانتا تھا۔ ابھی وہ گلی کے سرے پر پہنچی ہی تھی کہ
 پیچھے سے کوئی سنسنائی ہوئی چیز آئی اور اس کی بائیں ٹانگ
 میں کھب تھی۔ تحلف کی شدت سے اس کے منہ سے ایک
 بے اختیار سی چیخ نکلی اور اسے لگا کہ وہ ابھی کر جانے کی لپٹیں کر
 جانے میں موت تھی۔ اس نے ایک نظر اپنی ڈانگ کی طرف
 دیکھا۔ اس میں ایک لمبے بھل والا جانور کڑا ہوا تھا اور ذمہ سے
 تھون لگنے لگا تھا۔ اپنی تمام تر ہمتیں جمع کرتے ہوئے اس
 نے رے کے بغیر بھی کا اختتام کر دینے والا چند قدم کا فاصلہ لے
 کرنے کا فیصلہ کیا اور دھڑکی کھوٹی ہوئی انگلیف کے ساتھ
 بھاگی ہوئی گلی سے باہر نکل گئی۔ تعاقب میں آنے والا بھروسا
 دوران بے حد تریب نکلتا گیا تھا۔ اس کی اس جرأت و ہمت کی کو
 دیکھ کر ٹھنک گیا۔ دوسرے دو جانا تھا کہ اس گلی سے باہر نکلے
 کے بعد سڑک کے کنارے کے کنارے کی سڑک کیس کی دکانیں
 ہیں۔ اگر وہ لوگ اسے ایک زخمی عورت کے پیچھے آ کر دیکھنے تو
 شاید اسے پکڑنے کی کوشش کرتے اور اس وقت اس کے پاس
 اپنے بچاؤ کے لیے کوئی اٹھارہ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ آگے

گوریز آفس سے باہر نکلنے کے بعد اس نے سکون کا
 مکھڑا سانس لیا۔ ماہ بانو کا دارالامان میں رہ جانے والا بیک
 اس کے لیے ایک بوجھ بن گیا تھا۔ وہ ایک ایمان دار عورت
 تھی اس لیے اپنے پر فرض کو پوری ایمان داری اور دیانت
 سے انجام دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ماہ بانو کا بیک اس کے
 لیے ایک امانت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس امانت کے بوجھ کو
 اپنے سر سے اٹارنے کے لیے اس نے بیک عبد اللہ انان کے
 نام سے گوریز کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس رات دارالامان میں
 پیش آنے والے واقعے کے بعد وہ کچھ خوف زدہ ہی ہو گئی
 تھی۔ ماہ بانو کے دارالامان سے چلے جانے کے بعد بھی اس
 کے لیے فون آتے رہے تھے۔ اسے فون پر دھمکیاں بھی دی
 گئی تھیں کہ اگر وہ ماہ بانو کے بارے میں کچھ جانتی ہے تو
 شرافت سے بتا دے ورنہ اس کا بہت برا انجام ہوگا۔ ان
 دھمکیوں سے ڈر کر اس نے کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ
 جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آج ہی اس کی پڑھ ماہ کی رخصت
 منظر ہوئی تھی اور وہ یہ پڑھ ماہ اور لیتھری بھی اپنی بہن کے
 گھر گزارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ رونا بھی سے قبل اس نے ماہ
 بانو کی امانت کو مناسب جگہ بھجوا دیا ضروری سمجھا تھا۔ بیک کو
 گوریز کرنے کا بندوبست کر کے وہ خاصی مطمئن ہو گئی تھی اور
 اب اطمینان سے چلتی چرخی مارکیت کی طرف جا رہی تھی۔
 پٹری جانے سے قبل وہ بہن اور اس کے بچوں کے لیے کچھ
 خریداری کرنا چاہتی تھی۔ خود اس کی اپنی شادی تو ہوئی تھیں
 اور اس نے اپنی زندگی کے اتنے سال دارالامان کی منظم
 کے فرائض انجام دیے ہوئے گزار دیے تھے۔ ان فرائض کو
 انجام دیتے ہوئے آج وہ اس مقام پر پہنچی تھی کہ اس کی
 اپنی ذات کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس خطرے سے محفوظ
 رہنے کے لیے اس نے اپنے طور پر ایک منصوبہ بندی کر لی تھی
 اور اب کچھ مطمئن ہی خراں خراں بازار کی طرف بڑھ رہی
 تھی۔ گوریز آفس سے کافی آگے نکلنے کے بعد وہ ایک موڑ پر
 پہنچی تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا ہی بڑی
 مومچوں والا آدمی اسے دیکھ کر ٹھنکا۔ اس نے خود بھی اس
 آدمی کا ٹھنکا محسوس کر لیا اور کچھ خوف زدہ ہی ہو کر تیز تیز چلے
 گئی۔ خوف زدہ ہونے کی وجہ سے صرف اسی آدمی کا ٹھنکا
 نہیں تھا بلکہ وہ اس کی پھوٹی پھوٹی سرور پر چلتی آنکھیں
 دیکھ کر بھی ڈرتی تھی۔ یہ آنکھیں اس کے لیے آشنا تھیں اور
 پچھلے دنوں سے اس کے دماغ میں چمکی ہوئی تھیں۔ ماہ بانو کو
 انہما کر رہے کے لیے آتے والے ڈھانچا پوشی کے لیڈر کی
 آنکھیں بھی اسی عا تھیں۔ اب جانے یہ وہی شخص تھا یا نہیں

جانتے پانے جانے کی کوششیں، وہیں ٹھیک کر رہا لیکن وہ اس کے رکھنے کو کھوس نہیں کر سکی اور اندھا وند بھاگتی چلی گئی۔ خوف اور ہوش نے اس کے حواس کو آجھل کر دیا تھا۔

اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ بھی پار کرنے کے بعد بین روڈ پر آچکی ہے اور اب اسے اپنے قدم روک دینے چاہئیں وہاں طرح و دوڑتی رہی لیکن یہ دروز چند قدم سے زیادہ نہیں چلی۔ سوگ سرد آئیں، جانب سے آنے والی ٹیکسی کے ڈرائیور کی تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس کی ٹیکسی کی زد میں آکر بری طرح باجھلی اور بھر پور راکٹ چلی گئی۔ ٹیکسی کے ساتھ ہی ایک دوپٹہ تھک تھک چھوڑی پوری رفتار سے چلا رہا تھا جو سرگ پر لڑھکتے اس کے جسم کو پکڑتا ہوا آگے کل گیا۔ اس سھر کو دیکھ کر مڑک پر سے گرنے والی گاڑیوں نے پرہیزیں لگاتے شروع کر دیں اور دو گاڑیوں سے ٹیکسی بھی ٹھک کر سرگ کی طرف دوڑنے لگے۔ وہ جو بھی ٹھک گئی کے سر سے پر گزرا یہ سب دیکھ رہا تھا، کسی کے اپنی طرف متوجہ ہونے سے پہلے پناہ اور تیزی سے بھاگتا ہوا اس جگہ سے دور ہوتا چلا گیا۔

”ہاں بھی پالے آگیا خبر ہے؟“ اس نے دلوں سے تو یہاں پڑا اینڈر رہا ہے، ایک سوئی والا کو کھانے لگانے کے سوا تو نے کوئی بھی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اور اس کام میں بھی تو نے لاکھوں کمائے ہیں۔“ بھٹے لگنے سے اس لوٹ مار میں ہی بھٹے اس بات کی خبر نہیں ہو سکی کہ کوئی میں کوئی مہمان لڑکی بھی غمیری ہوئی ہے تو نے میں ان دونوں میاں بیوی کا کھانا اور مال سپت کر دیا ہے۔“ چودھری افتخار آج کل اپنی لاہور والی کوئی میں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سوئی والا سے اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے وہ دروز اس کی کوئی پر جا کر کچھ وقت اس کے عزیزوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ پولیس اسٹیشن سے بھی اس نے سوئی والا کے کانوں کو پکڑنے کا پوز دوڑا لیا تھا۔ اپنے اس آنے جانے اور ٹیکل ملاقاتوں میں اسے کوئی میں متیم مہمان لڑکی اور اس کے برسرِ انقباض کی خبر ہو گئی تھی۔ ملازموں سے پوچھتے چمے کے نتیجے میں لڑکی کا علیحدگی معلوم ہو گیا تھا اور یہ علیحدہ ہونا تو سے بہت مشابہ تھا۔ خصوصاً علیحدہ ہونے کے قریب پاتے پاتے جانے والے صلیب کی نشان دہی نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ مہمان لڑکی ہونا تو ہی تھی۔ اسے سوئی والا پر اور بھی شدت سے فکس آ رہا تھا۔ وہ بھی اس سے پوری طرح دشمنی بھارتا بھارتا میں مزید غصے کے انکبار کے لیے اسے سوئی والا دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر بالے کی جان کھانا شروع کر دی تھی کہ وہ وہاں کی عمارت

کے سلسلے میں سرگرمی رکھتا تھا اور اب اس کی عمر کی قسمیں میں کی گئی اپنی کارروائی کی رپورٹ پیش کرنے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

لیکن پہلے خود پر غامد گردہ الزامات کی تردید کرنے ضروری تھا اس لیے وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں نے کبھی سرگرمی میں نے باسیر سے آدھوں نے کوئی سب پروا ہی نہیں کی۔“ ”ہاں ہمیں آپ سے بھی بہت ملتا ہے۔“ پیسے کے پتھر میں ہم اپنے فرض کو بھول جاتے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم نے سوئی والا کی تجویز خالی کرنے سے پہلے پوری کوئی کا پکڑ لیا تھا۔ اگر وہاں کوئی لڑکی ہوتی تو ہمیں ضرورتاً میرے خیال میں تو وہ لکڑی رات جا رہے کھٹے سے پہلے ہی کھینچ لی گئی تھی۔ اگر وہ بعد میں بھاگتی تو اس کا کوئی سامان و غیرہ تو پولیس کو ملتا لیکن انہی میں سے پولیس والوں کو جو ایک دو روز سے پکڑے گئے وہ بھی سوئی والا کی بیوی کے تھے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوتا کہ لڑکی پہلے ہی اپنے سامان سمیت وہاں سے جا چکی تھی۔“ ”وہ جانتا تھا کہ چودھری کے پاس اس کا جھوٹ پکڑنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے اس سے دروازہ کوئی سے کام لے رہا تھا، ورنہ اس نے اس کے ماتحتیوں نے تو کوئی کی جیسی چیز سینے کے سوا وہاں کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔“

”میں میں نے مان لیا کہ تو جگہ کہہ رہا ہے، یہ بتاؤ تو نے اپنا کیا کاروبار منہ انجا رہا، لیکن کون سے کھونٹے لڑکی کی تلاش میں؟“ چودھری اس پر بکڑا۔

”وہی بتا ہے،“ اسے آج تھا سرکار! اتنے دنوں اور میں رو کر میں نے غیر متعلقہ نہیں کیا ہے۔ میں مسلسل لڑکی کو تلاش کر رہا ہوں۔“ آخری بار اس کے خاتے میں رہنے کی غیر ملکی میں اس لیے میں خاتے کے پھلے کے پیچھے لگا رہا کہ کئی طرح معلوم ہو جائے کہ اسے خاتے سے کس نے چھڑا دیا، یہ چودھری کو کوئی صحیح بات معلوم نہیں تھی۔ میں یہی کہتے تھے کہ اوپر سے میں نے تو ان آج تھا۔ میں نے سوچا میں اس کی کوئی ہتھیار ہاں ہے۔ اس کی تجویز پچھلی شیش لکڑی اور کچھ مال پانی کا لایا تو اس نے انکار کر لڑکی کو لڑکی آئی تھی حارہا کے فون پر چھوڑ دیا تھا۔ اب ان کے بندوں نے لڑکی کو کہاں پہنچایا، کوئی خبر نہیں۔ میں کوشش میں لگا رہا کہ کسی صراحت میں ان بندوں کی کوئی خبر مل جائے تو آپ کو خوش فہمی ہوگی لیکن کچھ معلوم ہی نہ چلا۔ پھر میں نے دارالامان کی تشکیل سے پوچھا تو کہنے کا سوچا۔ پہلے اسے فون پر دروازہ دیا کہ اگر اسے خبر ہے تو بتاؤ۔ وہ ڈائریکٹ اس تک پہنچ کر کچھ معلوم کرے اس لیے مشکل تھا کہ کوئی اخبار کی کوشش کے بعد

دارالامان کی عمراتی ختم کر دی تھی ہے۔ پولیس والے بھی پتھر پتھر پکڑتے رہتے ہیں۔ اس اتفاق سے وہ عورت مجھے باہر نظر آ گئی۔ میں نے جا کر اسے پکڑا لیکن وہ بھاگ کر لڑکی ہوئی اور بھاگتے بھاگتے ایک گاڑی کے سامنے آکر جان سے چلی گئی۔ مجھے گتے سے اتنے ضرور کچھ نہ کچھ معلوم تھا ہی لیے وہ اتنا غمراہ تھی۔“

”معاملاً کچھ بکھری مجھ میں آ رہا ہے۔ ہونے ہو، ماہر باؤ کو گاڑوں سے لگا لے میں اس سے کی بچے کا پتھ ہے۔ اپنے ماموں کی شہ پر بڑا اسٹارٹ بنتا ہے وہ۔ سامنے سے مجھ سے دوستی بنا کر پیچھے سے سارے ایسے کام کرتا ہے جس سے مجھے پریشانی ہو۔“ ماہر، فوٹو ایسے دارالامان بکھو یا ہو اور پھر خاتے سے بھڑا کر سوئی والا کے گھر رکھو اسے میں بھی اس کا ہی ہاتھ ہو گا۔ آج کل بڑی بڑی کھنچے گئی تھی اس کی اور سوئی والا کی۔ اسی کی خبر یوں یہ تو وہ ہمارے مال کو پکڑنے کے پتھر میں تھا۔ لیکن اب اسے معلوم ہو جائے گا کہ چودھری افتخار کو اس جیسا کل کا ٹوٹا پتھر نہیں دے سکتا۔“ سجادہ ان کا کام سامنے آتے ہی اس نے سارے حالات کا تجزیہ کر لیا تھا۔

”آپ کہیں تو ہم اس سے ایسی کوئی شے سرکار! آپ کے قدموں میں اس کا سر لڑکھ کر اس کی اسکی پستھنی لگا میں گے کہ خود لڑکی کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جانی بھرے گا۔“

”بھگتہ رو اسے اپنی بے خبر میں۔“ سیر سے جیسے بے اصل آدمی کے غموروں کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ شکل و بھی ہے تو نے اپنی جرات اٹھ کر لائے کی باتیں کر رہا ہے۔ اس کے خاندان والوں کو جاننا ہوتا تو ایسی گل مرستے نہ کرتا۔ تو اسے اٹھانے کا اور وہ سارے قیامت افواہیں گے۔ اس سے ہی پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تیرے جیسے افواہی کیرے کی ٹھیکر، مشکل کی ضرورت ہے۔ اب میں اپنی عقل سے ایسی تہذیب لڑاؤں گا کہ اس ہاتھ لکڑے کو ایک سسٹن تو مل ہی جائے گا۔“ ہالے کی بات پر اسے فٹے ہوئے چودھری نے اپنے غم کا اظہار کیا۔ شہر بار پہلے ہی اس کی تعمیر شروع کروانے اور سیانی کو پکڑنے کی کوشش کرنے کی وجہ سے اس کی نظروں میں ٹھیک رہا تھا۔ اب جو وہ باؤ والے معاملے کے ڈانٹے بھی اس سے ملنے نظر آئے تو وہ ہر جھڑک افواہیں اس سے بھر گئے میں بھی اس نے غصے کا دامن میں پھوڑا تھا اور دوست تصادم کے بجائے محنت ملتی سے کام لینے کی غامی تھی۔

”آج کا شہر دل کیا ہے عبد اللہ! آج ہمیں کس گاڑی کا ڈنٹ کر رہے؟“

”آج تو رپورہر جانتے سے سرادہاں کے زمیندار کی طرف سے درخواست کی تھی کہ اس کے گاڑیوں میں کبھی کی فراہمی کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا جائے۔“ شہر بار کے سوال پر عبد اللہ ان سے اپنے پتا یا تو اسے یاد آ گیا کہ اس نے فوٹو ایسے درخواست پر مجھنے کے بعد پورے دورے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس گاڑی جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ زمیندار سے ملی کر اس کے حوالے کی الزامہ کرنا چاہتا تھا۔ تقرری کے ابتدائی دنوں میں ارڈر کے بہت سے ویسٹا توں کے زمینداروں نے اس کے دفتر کو ملاقات کی تھی لیکن نور پور کا زمیندار ملاقات کے لیے نہیں آیا تھا۔

”اؤکے“ وہ وہاں جانے کا انتظام کر اٹھا۔ ویسے اٹھانے ہمیں وہاں جا کر وہاں آنے میں شکیات کہہ جائے گا۔“

”نور پور یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اس لیے ہم تو اچھا خاصا گے گا۔ ہم ابھی گھنٹے کے تو سر پیر کے بعد ہی نہیں جا کر وہاں پہنچے ہوگی۔“

”نور پور اچھا۔“ جب جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر چلے کہیں ہی وقت صرف ہو، جائے ضرور ہے۔“ اپنے سامنے رکھی فائل پر کوئی نوٹ لکھتے ہوئے اس نے بیٹھ کر دیا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں سوئی والا کے میل کو آج سر پیر کے بعد ملاقات کا بندھ دے دوں؟“ صبح سویرے اس کا فون آیا تھا کہ دو سوئی والا صاحب کی دل کے سلسلے میں آپ سے ملاقات کے لیے آنا چاہتا ہے۔“ عبد اللہ ان نے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ سوئی والا کی دل کے سلسلے میں اس کے ویلے کو اس کے پاس آنا غامی خبر تھا۔

”بائفل پتھم دے دو بلکہ ایسا کرنا کہ یہ ملاقات میرے بیٹھے پر رکھا۔“ وہ ویلے اتنی دور سے یہاں تک آگے کہ تو اس کی خاطر مدارات بھی تو ڈھنگ سے ہوتی چاہیے۔“ اجازت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے بدایت بھی چارٹی کی پھر کچھ کہ سرسری سا باتا ہوا بولے گئے۔

”ماہر! تو کی کوئی خبر ملی؟“

”نور! انکوڑی آج میری رفیق کھمکر سے میں مسلسل رابطے میں ہوں لیکن اس کے پاس ماہر کو کے سلسلے میں کوئی خبر نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر سوئی والا کے گھر کے میں میں چودھری افتخار تو اٹھو تو پھر جس بات کا بھی امکان ہے کہ ماہر یا تو وہاں سے اس کے بندے کو غمراہ کر کے لے گئے ہوں۔“ شہر بار کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عبد اللہ ان نے خیال آ رہی تھی۔

”تو پھر کسی ذریعے سے چودھری کی طرف کی سن کر

لوہ۔ ہم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ کر ایک مظلوم لڑکی کو برہادر ہونے کے لیے اس کے رمو کو گرم کر تو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس نے لیجے لیجے میں غم دیتے ہوئے ہاتھ میل پکا اٹھم کوک پر بٹھا۔

"میں راس میں کچھ کرتا ہوں۔" اس کا مزاج کج مزاج لکھا کر عبداللہ نے مستعدی سے یقین ڈالا۔ اسی وقت دروازے پر دھک ابھری اور ایک چڑائی اہانت لے کر اندر آیا۔

"یہ کوہیز والا ہے کہ کیا ہے جناب۔" اس نے ایک بیک اور لقاؤ عبداللہ کی طرف بڑھایا۔ ایک کچھ شامسا قراچین عبداللہ اور شہر پار دونوں ہی فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر پاتے۔ خانے پر چند عبداللہ کا نام تھا اس لیے اس نے لقاؤ سمجھ کر اس میں موجود کاندھ لال کہا۔ یہ دارالامان کی فتنہ کی طرف سے لکھا جانے والا ایک مختصر خط تھا جس میں اس نے اپنے دشمنوں سے ہتھیار چھین کر جانے کی اطلاع دینے کے ساتھ ماہ جانو کے جسک کی بابت بھی لکھا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے شہر پار کی طرف بلا عادی۔

چراہی اس دوران اس کے اشارے پر وہاں جا چکا تھا۔

"تم دارالامان فون کرو رہیں۔ یہ ابھی مختصر چھٹی پر تھی ہو۔" ایک بھیجے پر اس کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دشمنی آئینوں کی کٹھن کے بارے میں بھی تفصیلات معلوم کر لینا۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے تمام دنیا تو عبداللہ و دین اس کی چیز پر موجود فون سیٹ پر دارالامان کا نمبر لٹا دیا۔

تھوڑی دیر میں اس کا دیاں رابطہ ہو گیا۔ رابطے کے بعد اس نے مختصر سی گفتگو اور ریسپورڈاں کر پیل پر ڈالنے سے اس سے ہوا۔

"مختصر فون میں ملی۔ اس بے چاری کا کل دو چار ایک روڈ ایکٹیفٹ میں انتقال ہو گیا۔"

"تسبیب کیا ہو رہا ہے؟" وہ سارے لوگ جواہر کے بعد رہیں، کسی نے کسی طرح مارے جا رہے ہیں۔ پہلے خدا اور حضور، پھر شاہرم خان کا دوست دعویٰ والا اور ان کی سسر اور اب یہ دارالامان کی منتظر۔ اتنے سارے لوگوں کی ایک کے بعد ایک ہلاکت کو اتفاق نہیں کہا جاسکتا۔ تم تفصیلات معلوم کرو اور کسی منتظر کا ایکٹیفٹ کب اور کن حالات میں ہوا۔

مجھے لگتا ہے کہ ایکٹیفٹ کے پیچھے بھی یقیناً کوئی نہ کوئی سازش ہوگی۔" عبداللہ کی دہی اطلاع سن کر اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے سمجھ دیا۔ عبداللہ کو اس تشویش پر ایک بار پھر فراموشی برآمدی۔ "میں سر اسٹی کہنا تھا وہ اس نے کہا۔" مجھ پر بعد جب وہ لوگ سب پر گرام تو رپور کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ذہن میں فور پور کے دورے

سے زیادہ ماہانہ سے جڑے واقعات چکر رہے تھے۔

"میں شش۔" یہ بواہر ہو چکی خانے سے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ عقب سے سنائی دینے والی اس آواز پر تھک کر پٹی۔ اس کے پیچھے ہی کاندھ کی ایک گولی اس کے شانے سے ٹکرانی اور فرش پر گر گئی۔ اس نے جیسے جیسے کہنے کی اس گولی کو اٹھا یا اور واڈ کی سمت دیکھا۔ چپقلی جانب واقع مکان کی چھت پر ایک لمبے بالوں والا لڑکا ہاتھ میں گولہ سے کھڑا تھا۔ اسے مستحضر ہوا تو دیکھ کر اس نے فوراً انداز میں اپنی بائیں آنکھ کو ڈپا۔ وہ لڑکے کی اس حرکت پر بے چارے کی طرح سے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اندر مامری تھا۔ ان چار بالی پر بھی ہر دہائی تھی۔ اس نے اپنی مامری میں دلی کاندھ کی گولی بھجھ کر اس پر پڑا۔ پتہ لگائی میں خیر کر رہے تھیں۔ وہ جہاں نہ الفاظ پر مشتمل ایک ایسا فون جس کی چھت پر موجود کھڑک پر اسے امید کی جا سکتی تھی۔ اس نے کھڑک کا مکمل مضمون پڑھنے کے بعد کاندھ کے تختی پر ڈال دیا۔ اور کمرے کی کڑکی کھول کر ان پر زور کو باہر کی طرف پھینک دیا۔ کچھ میں پہلے سے موجود دھیروں گولہ کرکٹ میں کاندھ کے دو چار گولے فوراً ہی مغم ہو گئے۔ وہ کڑکی سے ہٹ کر وہاں اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور اپنے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔

سرور دارالامان گیا تھا کہ وہاں سے منتظر کے مرنے کی خبر ملے کہ مامری لوٹ آیا تھا۔ اس کے بعد میں ملے ہوا تھا کہ سرور جاگتا تھا۔ اس نے کوئی ایک جاگ رہا اور اسے شہر پار سے ملاقات کر کے اسے ماہانہ کے بارے میں اطلاع دے گا کہ وہاں کوئی فون کی طرح پر دونوں میں سے کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ سرور کو ہندھا تھا کہ پاپس والوں کی نظر میں اس پر ہوں گی جبکہ مامریں دفتر میں بچن کے فراموش انجام دیتا تھا۔ وہاں سے اسے آسانی سے نہیں ملنا مشکل تھا۔ اس صورت حال میں وہ فی الحال یہاں رہنے پر مجبور تھی۔ مامری والوں کی خدمت کر کے اسے اپنی سکون مٹا کر کہیں بے بے اور ایک یاد بھی ہے طرح آتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح معاملات الیاس اختیار کر لیں کہ وہ پہلے کی طرح یہ سکون زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔

حالات نے اسے اس طرح سے پکڑ لیا تھا، اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مختصر مستقبل میں لفظوں و جملوں پیچھے ابھی اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر زور دروازے پر دھک ابھری۔ وہ سپر کے ان اوقات میں غمناک کوئی بھائی امان کی خیر خیریت معلوم کرنے آ چکی تھی۔ اس نے کمرے سے نکل کر بے دھڑک بیرونی دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک

لڑکی تیزی سے اندر آئی اور خودی پلٹ کر دروازے کی کھڑکی پر حادی۔ وہ کچھ غمناک ہوئی کہ دہائی تھی۔

"کیا ہوا ابھی۔" کون ہو تم اور اتنی گھبراہٹی ہوئی کیوں ہو؟" اس نے لڑکی سے دریافت کیا۔

"میں جیل ہوں ابھی اس پیچھے والے کمرے میں رہتی ہوں۔ خالہ کی فیضیت پوچھتی تھی۔" لڑکی نے اس کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں سے اس کیوتہ پڑاڑ کے نے کچھ دیر قبل رقتہ پیکھا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور اپنی اذیتوں سے چہرے پر آیا پکھڑا پکھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غور مودھیرا ہوا تھا۔ کچھ کچھ نہیں ہوئی تھی۔ ماہیانے پر غور اس کا سناڑا دیا۔ وہ تقریباً اسی جیسے وقت قاتل کی اس کی ہم عمر لڑکی تھی لیکن اس میں اس قدر نفس پرانے تھا تھا تھا۔ چوڑے چوڑے ہاتھ کی عورت کے بجائے سرو کے معلوم ہوتے تھے۔ بالائی ہونٹ سے اوپر اور خودی اور دروازوں کی جلد پر گھروڑے پلٹ کا احساس ہوتا تھا۔ یہ گھر دہان چہرے پر جھانکی کی پادھوڑی کے سے جاہودھان تھا۔

"لے جا رہی تھی۔" لے جائیں گے دل والے دلینا لے جائیں گے۔ رو جائیں رو جائیں گے گھر والے دیکھتے رہ جائیں گے۔" ابھی اس کا جائزہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر سے تالیوں اور دھول کی تھاپ کے ساتھ بھونڈی آوازوں میں گانا گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس انداز میں گانے گانے والے کون لوگ ہوتے ہیں، وہ بے غولی جاتی تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ وہ لوگ اس دروازے پر رک کر کیوں گارہے ہیں۔ یہ کوئی خوشی کا لمحہ تو نہیں تھا جہاں پر اپنے کام مقابروہ کرنے کے بدلے میں انھیں روپے پیسے سے نوازا جاتا۔

"اللہ کے نام پر دے دے۔" گانے کی آواز کے درمیان ہی کسی نے دروازے پر دھک دے کر صمد اگلی۔

"دروازہ صحت کھول۔" جیلانی لڑکی نے اس کا ہاتھ قلم کر خوف زدہ انداز میں اسے روکا۔

"تم اندر چل کر خالہ کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے لڑکی سے اپنا ہاتھ بٹھا کر اس سے کہا اور خود باورچی خانے میں چلی گئی۔ آتے کے کچھ سے ایک پالہ آنا لے کر وہ دروازے پر آئی تو دھک اور صمد اس کا حلقہ جاری تھا۔ البتہ جیل اندر کمرے میں جا چکی تھی۔ اس نے دروازہ دھک دیا تو کھول کر باہر نکلا۔ ذرا دیر ہی پڑاڑوں میں پھریں یہ ایک آپ کی موٹی موٹی سے جمائے ہوئے تھیں تھوڑے تھوڑے جن کے ارد گرد گھٹنے کے نیچے بوجھ تھے۔ کچھ عورتیں بھی دروازوں کی آواز کو نہ کرکس سے باہر جا رہی تھیں قاتل دیکھ

دہی تھیں۔

"یہ لے لو۔" اس نے آتے سے بھرا ہوا آگے بڑھایا تو دھک دے والا تھکڑا ہٹ کر پیچھے ہٹا۔

"مجھے نہیں چاہیے یہ خیال کرنا۔"

"تو بھگتا جائے" صمد نے اس کو اس وقت دینے کے لیے کسی بھی ہے۔" اسے عجب ہی بے بسی کا احساس ہوا۔ خود اس کا سارا سامان تو دارالامان میں رہا تھا۔ وہ کسی دوسرے کے گھر میں بیٹھ کر اس سے بڑے کمرے کی کیا دیکھ سکتی تھی۔

"تیرے پاس تو بڑا قیمتی ہیرا ہے، پر جانے وے۔" آج جس دہائی تو کوئی بات نہیں میں پھر آکر لے جاؤں گی۔"

تھوڑے سے جواب دیا اور پھر وہ جیل گاتے بجاتے وہاں پلٹ گئی۔ وہاں کی بات کا معلوم کچھ بھرا بھری ہوئی وہاں اندر پلٹ گئی۔ کمرے میں جیل اور مامری کی اپنی باتیں کر رہی تھیں۔ شاید شہر کی آواز سے ان کی آنکھ کھلی گئی تھی۔

"اچھا ہوا خالہ کی آپ آئے تھیں۔ میں کھانے لے کر آتی ہوں۔" انہیں جانتے دیکھ کر اس نے کہا اور پھر جی سے جا کر ایک کمرے میں کھانے کے برتن اور دیگر چیزیں رکھ کر کمرے میں لے آئی۔ جیل کو بھی ان لوگوں نے امرار کے کھانے میں شامل کر لیا۔

"یہ جیل بڑی اچھی لڑکی ہے۔" برتیر سے چوتھے دن پکڑا کر کمرے کی کام کر رہی تھی۔ "کھانے کے دوران خالہ کی اس سے جیل کی کھربیں کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر ان پر دوبارہ خودی طاری ہونے کی تو وہ جیل کو ساتھ لے کر بیٹھ میں آ گئی۔ جیل کے سوالات کے جواب میں اس نے اپنے بارے میں وہی کچھ بتایا جو وہ لوگ پہلے سے طے کر چکے تھے۔ جیل بھردی سے اس کی مظلومیت بھری داستان نکلتی رہی۔ موقع دیکھ کر اس نے جیل سے اس کیوتہ پڑاڑ کے کی بھی شکایت کر دی تھی کہ اس نے یقین دلایا کہ وہاں سے شکایت کر کے اپنے بھائی کو سیدھا گھر وادے گی۔ گھر دہی جلد اور مردانہ کی ساخت رکھنے والے تھا جو بڑی دل مالک جیل طبعیت بڑی ہمدرد اور مظلوم لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

"اے جیل بھائی تو بتاؤ کہ تم جب آتی تھیں تو اتنی ذرا ہوتی کیوں تھیں؟ کیا ہر کوئی نہیں تنگ کر رہا تھا؟" انہیں کرتے کرتے اسے جیل کی آمد کے وقت کی گھبراہٹ یاد آئی تو اس نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں گھبراہٹی ہوئی تو نہیں تھی۔ بس پچھلی گلی سے یہاں تک تیرے چہرے میں گھبراہٹ تھی اس لیے سانس پھول گیا تھا۔" وہ صاف کھری اور پھر فراموشی گھڑے ہوتے ہوئے

ہوئی۔ ”صاحب میں چلتی ہوں، بڑی دیر ہو گئی ہے۔ تم میرے بھائی کی طرف سے خدمت کرو۔ اس کے میں اب اسے انہی طرح کا کچھ اداں کی۔“ انہی بات کہنے کے بعد دور کی جھپٹ اور تھوڑی سی بار بار کل گئی۔ ماہو جو تھوڑی سی اس کا یہ رد عمل دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

نور پوری حدود میں داخل ہوتے ہی انہیں خوش گوار سوا احساس ہوا۔ چھوٹے سے اس گاؤں کے مکانات دیکھ کر بے فکر کینوں کی نشہ حالی کا احساس ہوتا تھا لیکن اس احساس کے ساتھ ہی بچوں کی ترتیب اور منظمی بھی فوراً نظر میں آ جاتی تھی۔ ان ترتیب دار بچوں سے گزر کر زمیندار کے پختہ مکان تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مکان کے دروازے پر ایک نوکر نے ان کا استقبال کیا اور پھر انہیں ایک بیٹھک میں لے گیا۔ حمزوی دیر میں نوکر نے کسی اور دیکھ کر لوازمات ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں لفظوں کے نیچے بے جا بھی دبا دے زمیندار بھی وہیں آ گیا۔ ان بیٹھکوں کو دیکھ کر یہ بات سمجھ آ گئی کہ دیگر زمینداروں کی طرح وہ خود شہر یا رستے سے اس کے دفتر کیوں نہیں آیا تھا۔

”واہی میری بی بی اسے صاحب کو آپ ابھر آئے۔ میں تو بڑے دنوں سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ آپ کے دوسروں گاؤں میں جاتے کی خبریں تو سنتی رہی تھیں۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ زمیندار میرے گاؤں کا مقدور کب جا سکتا ہے۔ رب کا شکر ہے آج آپ کو ادھر آنے کا خیال بھی آ گیا۔“ زکی سلام دعا کے بعد اس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”میری کوشش تو یہی ہے کہ اپنے علاقے میں موجود ہر گاؤں کا کم از کم ایک دورہ تو کر لیوں لیکن کوئی بد کوئی ایسی مصروفیت آئے آ جاتی ہے کہ میں اپنے اس ارادے پر مکمل طور پر عمل نہیں کر پا رہا۔ آپ کے گاؤں کا دورہ بھی شہر سے ہی ہماری فہرست میں شامل تھا لیکن آج بڑی مشکل سے ہم اس میں کامیاب ہو پائے۔ آپ نے گاؤں میں کبھی کی سیلابی کے سلسلے میں جو درخواست دی تھی وہ میں نے دیکھ لی تھی۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد اس سلسلے میں کوئی فیصلہ فرم ہو سکے۔ آپ بتائیں کہ اس مسئلے کے علاوہ اور کون سے مسائل ہیں جن کے متعلق میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟“ نور پور کا میلہ اردو ادھان میں تھا جس نے اسے کئی ذاتی کام کے بھانے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے درخواست دیا تو کہی، اس لیے شہر یا رستہ میں اس سے بہت مختلف تھا اور وہ بچے گاؤں کے لوگوں کے پاس جانے کے برابر راستہ ہی

سے گاؤں کے مسائل پر چہرہ ہاتھا۔ ”میںال کامب سے برا مسئلہ تو غربت ہی ہے۔ زیادہ تر لوگ بھتی باز رہتے ہیں۔ کچھ گھبراہٹ اور جولا ہے ہیں۔ آبادی کے حساب سے روڈگار کے ذرائع بہت کم ہیں۔ میں جاہر ہاتھا گاؤں میں کبھی آ جاتا ہوں کسی پھولی موٹی کھریلو صنعت کی بنیاد ڈال دوں۔ لوگوں کو روٹ مارنے کے گاؤں کا کوئی خدشہ ترقی کرنے کے لیے نہ ہو گا۔“ زمیندار نے جواب دیا۔

”آپ کے خیالات سن کر مجھے بہت غمی ہو رہی ہے۔ مجھے تجھے والے افراد میں آپ واحد شخص ہیں جنہیں اپنے ذاتی مفادات کے بجائے اپنے گاؤں کی ترقی عزیمت ہے۔“ اس نے زمیندار کو سراہا۔

”ذاتی مفادات میں میں نے کسی سے بے پاس بھی نہیں ہی نہیں۔ میری پوری برسوں پہلے ایک عمارت میں سرکاری تھی۔ میں نے اپنی جائیں اسی عمارت میں کوئی نہیں والا دھارنی کوئی بھی ہی نہیں۔ اب مجھے جیسا حد دراز اور پھر کا توئی دولت میں کرے گا بھی تو اس کے کس کام آئے گی؟ میں ایک چھوٹی بھین ہے۔ اسے عزت ہے اس کے گھر کا کہ دونوں میری ساری فکریں غم پر ہو جاتی ہیں۔ مجھے جو کچھ چاہیے اسے گاؤں کے بارے میں ہی سوچنا ہے۔“ زمیندار نے سادگی سے اپنے رویے کی وضاحت کرتے ہوئے نوکر کو مزید لکھانے کے لیے آواز لگائی۔

”میرے کلنگ کی ضرورت نہیں زمیندار صاحب اس آپ یہ بتائیں کہ آپ کے گاؤں میں کیا تعلیم اور صحت کی کیا صورت حال ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے میں توجہ دیتے ہیں یا نہیں؟“ شہر یا رستے سے آدھ دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”صرف دیکھتا ہے کیا ہوتا ہے چناب ان بے چاروں کے پاس تو دو وقت چٹ چٹ کر روٹی کھانے کی لگی تھی انہیں کوئی حکومت نے بھی کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ یہی حال صحت کا بھی ہے۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں تو خود ہی کچھ ٹوٹے ٹوٹے کھانے کے طاق کر لیتے ہیں۔ کسی کی حالت بہت بگڑ جائے تو اسے ہی پڑاں کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اب ہندے کی قسمت کہ کر دیتے ہیں تو وہ ہاں جانے تک بچ جاتے ورنہ اسے دواں لاکر یہاں دفن دیتے ہیں۔“ زمیندار نے اس طرح کہا۔ وہاں بھی صورت حال بہت خراب تھی۔ ہمیں واحد حوصلہ افزائی یہ تھی کہ گاؤں کا کسب کے لیے ادھان شخص ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔

”آپ کے تعاون کے لیے شکریہ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے گاؤں کے مسائل کے عمل کے لیے میں

خوشی بنادوں یہ کام کرنے کی کوشش کروں گا۔ تعلیم صحت اور روڈگار ان تین اعلیٰ ترین امور ہیں۔ زمیندار کو یقین دہانی کر دیا کہ وہ لوگ ادھان کے ساتھ گھر کے گھر کے سے محض سے گزرتے ہوئے انہوں نے کیا ہی موجود بھول دار یوں ہر ایک لڑکی کو دیکھتے ہوئے دیکھا وہ یقیناً زمیندار کی چھوٹی بہن تھی جو ان لوگوں کو دیکھ کر فوراً بھاگ کر ایک کمرے میں چلی گئی تھی۔ زمیندار کے کمرے کے بعد انہوں نے گاؤں کا پتھر لگا کھال کا ایک عمارت ساز بنا دیا اور پھر ادھان کے لیے روانہ ہو گئے۔ آج شہر یا رستہ کی سوئی والا کے مکمل سے بھی ملاقات نہ تھی۔ گھر پہنچ کر اسے کئی سی مہلت مل گئی کہ وہ غسل کر کے اپنے چھوٹے سے دل بھر کر گھر واپس آ کر بیٹھے۔ غسل کے بعد وہ اپنے کے سامنے کھڑا اپنے بالوں کو سنوار رہا تھا کہ پتھر نے اسے عبداللہ کی موتی والا کے دہلیز کے ساتھ آدھ کی اطلاع دی۔

”اگے آتم انہیں شہادہ میں حمزوی در میں آتا ہوں۔“ پتھر کو جواب دے کر وہ تیار ہوئے گا۔ سات سے آٹھ منٹ میں اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ پیر حیاں اتر کر وہ چلی منزل پر موجود رات گھر دم میں پہنچا تو اس دوران تربیت یافتہ ملازمین لوازمات کے ساتھ چائے سرد کر رکھے تھے۔

”حفیظ شیرازی۔ سبز موتی والا کے قانونی مشیر۔“ اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچنے پر عبداللہ ان سے خداف کی دم بھائی۔ اس نے حفیظ شیرازی سے ہاتھ مل کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ابور سے یہاں تک پہنچنے میں آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں آ گاھی پڑی؟“ حفیظ شیرازی کی آمد کا مکمل منتظر ہو چھنے سے پہلے اس نے ایک دھکی سا سوال کیا۔

”تکلیف تھی؟ میں تو اپنی ایک ذمہ داری پوری کرتے آ جا ہوا۔ آج آپ موتی والا صاحب کی توجہ کے بعد لاہور میں ایک دو دن قیام کرتے تو میں آپ سے وہیں ملاقات کر لینا نہیں اب بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے تو بہر حال اپنا فرض پورا کرنا تھا قاسم بے میں یہاں تک چلا آیا۔“ شہر یا رستے کے سوال کا جواب دے کر وہ اپنا بریف کیس کھولنے لگا۔ بریف کیس میں سے اس نے ایک نئی لٹاؤنگال کر شہر یا رستہ کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”اپنے بیٹے کی وفات کے بعد وہ بعد ہی موتی والا صاحب نے اپنی ہی دل (وصیت نامہ) تیار کروائی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے آپ کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ بڑے جہاد پر آدمی تھے۔ رات صاحب کے حوالے سے شاید آپ کو پہلے سے جانتے تھے پھر یہاں کے اسٹنٹ

گھنٹہ بننے کے بعد بھی انہوں نے آپ کو دیکھا۔ آپ کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ آپ ایک اولوالعزم اور ایمان دار آدمی ہیں جو کم از کم اپنے پیڑھ کے بہتر انہی حصے میں جو ہر کچھ بھی کسی کرپشن میں ملوث نہیں ہو سکتے۔“ شہر یا رستہ خاصا سوئی سے حفیظ شیرازی کے لیے الفاظ تھے اور ان کی لٹاؤنگال کراس میں موجود کاغذات کالی کرمان کا جائزہ لینے کا ان کا غرضات کے مندرجات حفیظ شیرازی کے الفاظ کی تصدیق کر رہے تھے۔ موتی والا نے اپنے اس وصیت نامے میں اسے اپنی چاہیاد کا شرعی قراؤن دیتے ہوئے اپنے بیٹے کے ہم سے خدائی اسپتال کے قیام کی خواہش کے ساتھ یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ شہر یا رستہ اپنا اپنا علاقے میں تعمیر کروائے۔ شاید وہ اپنے اس جرم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا جو اس نے چودھری افتخار کے ساتھ مل کر دنگل سے نکڑی کی اسٹریٹ کی شکل میں کیا تھا۔ بھگل کے درختوں سے حاصل ہونے والی یہ دولت جس پر یقیناً اس علاقے کے لوگوں کا بے زیادہ حق تھا۔ اسی صورت میں وہ اپنی پوتی کا سکتی تھی۔ موتی والا نے ایک مختصر مدتی یہ بھی کی تھی کہ شہر یا رستہ کو دنگل میں نہا تھا بلکہ حفیظ شیرازی وصیت لکھا کہ ایک سردی چھوڑی مقرر کیا جا جو اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتا رہتا اور کسی طرح کی کرپشن کی صورت میں اس کی روک تھام کا بندوبست کرتا۔

”یہ میرے لیے بڑے آثر کی بات ہے کہ موتی والا صاحب نے مجھے اس لائق سمجھا۔ ان کی اس دل سے میرے ہاتھ بہت مضبوط کر دیے ہیں۔ اپنے علاقے کی ترقی کے لیے میرے ذہن میں بہت سے منصوبے ہیں لیکن ظاہر ہے میں فوری طور پر حکومت سے ان تمام منصوبوں کے لیے مراعات حاصل نہیں کر سکتا۔ موتی والا صاحب کی اس دل کے بعد میں کم از کم اس لائق ہو جاؤں گا کہ بیٹھنے کے مسائل کے حل کے لیے ہر گھر رکھوں۔ تحران خطبے میں میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے وہ موتی والا صاحب کی خواہش سے خود اسرا مختلف ہے۔ میں ایک بڑے اسپتال کے قیام کے بجائے صحت بچھونے چھونے گھر پر مراکز کے قیام میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اگر ہم یہ اسپتال بنائیں گے تو وہ یقیناً کئی ایک قصبے میں قائم کیا جائے گا اور لوگوں کے لیے اس اسپتال تک بروقت پہنچنے کا مسئلہ اپنی جگہ رہے گا۔ اس کے بخلاف اگر ہم مختلف دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے ہسپتال قائم کر دیتے ہیں تو لوگوں کو زیادہ آسانی رہے گی۔ ایک آپریشن کیمز، ادویات اور چھوٹی موٹی مشینوں کے ساتھ ایک لپنی ڈاکٹر، جنرل فزیشن اور پی ایم ڈی نائک اناف فزیشن ان پینس سے لوگوں

کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ خدا انہو است کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا تو ان پینس میں مریض کو فرسٹ اینڈ دے کر کسی جڑے شہر تک پہنچانے کی مہلت مل جائے گی۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ کہیں کہیں یہ حکومت کی قاتل کروہ ہسپتال نظر آتی ہیں اور وہاں بھی ڈاکٹروں اور دور دور میں دونوں نوار دیں۔ "لفافے میں کاغذات و ادب رکھنے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اسی وقت وہ بہت پر جوش نظر آ رہا تھا۔ وہ مختلف منصوبے جو مسلسل اس کے ذہن میں چلے رہے تھے، اس وقت اس میں سے ایک کی تکمیل کے لیے راہ نکلی تھی۔

"تجربہ تو آپ کی بہت ابھی ہے۔ مجھے اسی تجویز پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں ہارڈے کے ہائی دوہران سے بھی اس تجویز کو دیکھ کر کے آپ کو جتنی جواب دے دوں گا۔ میرے خیال میں تو وہ لوگ بھی اس تجویز کو پسند کریں گے۔" حلقہ شازدی کا جواب بڑا حوصلہ افزا تھا۔ اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کی چٹکتی نظر آئے گی، ورنہ مادہ انوکے غیاب کے بعد جو اندھیرا سا چھا گیا تھا اس سے وہ اپنے اندر بڑی کمزور محسوس کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

پروٹی دروازے پر دی جانے والی دروازہ دھک سے اس کی آنکھیں مل گئی۔ موجودہ حالات میں اسے بہت کمزوری نہیں آتی تھی اور وہ دروازے آہستہ سے ہی پوک کر اندر جاتی تھی۔ دروازے پر دی جانے والی یہ دھک تو بہت زوردار تھی اور مسلسل پس دینی جاری تھی کہ جیسے دروازہ تو کھولنے کی صورت میں توڑ دیا جائے گا۔ خوف اور اندیشوں نے گھرا اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے ساتھ سوئی ہوئی خالہ کی ایک نظر دیکھا۔ دھک کی اس آواز پر مضرب ہو کر وہ بھی کسمپرسی میں لیکن دواؤں کے زیر اثر ان کا ذہن غریب طور پر بے وار ہونے سے قاصر تھا۔ وہ مسرے سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران عامر کی جاگ چکا تھا اور بیٹک سے لٹک کر بیرونی دروازے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

"آ رہا ہوں بھائی، کون ہے؟ ذرا میرے تو کام لو۔" اس کے بالائی جسم پر کچڑے موجود نہیں تھے۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر موسم میں ایک جیسے پیلے میں سوتا پسند کرتے ہیں۔

"کیا بیٹک نے کمرہ پر ہاتھ جھانکی اور بعد آکھ کھلی ہے اور اب بھی دروازہ کھولنے کا نام نہیں لے رہا؟" باہر سے کسی کی بلند اور طعنی آواز سنائی دی۔

"انچھا! مجھ پر تو ہے۔" کے کھول دیا میں نے دروازہ نہ باہر سے بولنے والا یہ تھا اس کے لیے شکار تھا جو اس نے اطمینان سے بولتے ہوئے صحت دروازہ کھلی۔ دروازہ کھولنے ہی جا رہی تھی کہ اس کے کمرے کے اندر سے آئے۔

"کیا بات ہے یا راتر لوگ اس وقت اس طرح کیوں آتے ہو؟" وہ سب اس کے لیے آتے تھے لیکن اس کا اندازہ اور چہرے کا برقعہ مٹتی رہتی تھا۔

"دیکھو تو ذرا کیا معصوم بن رہا ہے۔ حالانکہ اس کا حلیہ دیکھ کر ہی سب سمجھ گئے ہیں کہ یہ کون ہے مگر پھر سے اڑا رہا تھا۔" کشیدہ لہجے میں یہ جملہ بولنے والے کا مادہ ہونے کا شائبہ کر لیا۔ وہ پچھلے کمرے میں رہنے والا جیلہ کا وہی کیڑا باز بھائی تھا جس نے اس کے لیے قہر مچا رکھا تھا۔

"کون ہے مگر چہروں کی بات کر رہے ہو تم؟ میں سارا دن کا تھکا ہارا مہری بندہ سو رہا تھا کہ تم لوگوں کی وجہ سے جاگنا پڑا اور اب تم اپنی سی سی جی بائیں کر رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے میں کوئی تم لوگوں کی طرح باپ بھائی کی گمانی نہیں چاہتا رہا کہ راتوں کو جاگ کر تھک رہے ساتھ مغراری کروں۔ سویرے مجھے اپنی ذہنی پر بھی مارتا ہے۔" عامر بھڑکا۔

"کو کھ رہے ہو یا راتر؟" اسے بھڑکا۔ "ہاں، سچی آدمی کے پیش میں قتل پر تو اسے برا ہی لگتا ہے۔" کیڑا باز نے ایک اور طعنے کا تیر چلایا۔ عامر کی طرح کمرے کے دروازے کی آوازیں کھڑی مادہ اونگی حیران تھا کہ وہ انکی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ اس کے انداز سے تو عاف لگتا تھا کہ وہ بھڑکا کر نے کی نیت سے ہی یہاں آیا ہے۔

"خیر! منہ بالی بات کر پڑا! تجھ جیسا آئے دار لڑکیوں کو پیچ کر ان کے باپ بھائیوں سے بچنے والا آخر کس برائے پر مجھ پر اثر مہم تر رہی کر رہا ہے؟" عامر نے سیدھے لہجے میں اسے ٹوکا۔

"میں تو صرف لڑکیوں کو پیچ رہی ہوں۔ یہ تو تو ویدہ دیر کی جگہ ہی کر دی۔ جو ان جہان لوہڑی کمرے میں آئی ہے اور اب جس سے تم عیاشی کرتا ہے۔"

"یعنی تو میں۔" پرویز کے اس الزام پر وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور سمجھ کر اس کا گرجاں بکھڑا لیا۔ پرویز کے ساتھ لے والے لڑکے فوراً اس کی مدد کو لپکے۔ عامر جان دار لڑکا تھا۔ اس نے پرویز کے حقیقوں میں سے ایک کے پہلو میں کھینی ماری اور دوسرے کی طرف دیکھے بغیر یوں ہی اپنی ٹانگ پیچھے کی جانب چلا دی۔ ٹانگ مقابل کے جسم کے بازو کے لیے پڑی اور وہ برقی طرح ہلایا۔ اس ماری

کا ردعمل ہی کے دوران پرویز کا گرجاں اس کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ صبح پانے کی اس نے گرجاں کو بھڑکا دے کر پرویز کو کچلی طرف دھکیل دیا۔ اس کا سر پیچھے موجود دیوار کے ساتھ جا کر لگا اور صبح سے زوردار لپک لپکائی۔ اس دوران عامر خود بھی زخمی آ گیا تھا۔ ایک لڑکے نے اسے پیچھے سے جھپٹ لیا تھا اور دوسرا اس کے پیٹ میں ہیکے جہاں ہاتھ آئیں انکوں کی یہ ضرب یقیناً بے حد تکلیف دہ تھی۔ عامر کا جانا ہوا دیر ہو گیا اور یوں لگا کہ کچھ فطرت پرست جیسے گم گمیں اگلے ہی لمحے اس نے اپنے ساتھی کے سرے سے ہو کر کے برسانے والے کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر اس میں جانب سے حملہ آور ہوتے ہوئے لڑکے پر سے مارا۔ پیچھے سے آتے بھڑکے والا اسے دیر ہوا پتھر پھینک کر بغیر ادائی خود پر اسے پھونکا تھا اس لیے اب وہ کسی کی گرفت میں نہیں تھا۔ اس نے لپک کر دیوار کے ساتھ کی چار پائی کی بنی اٹھائی اور ان چاروں کی سرسٹ کرنے لگا۔ اس ماری کا ردعمل ہی میں انچھا خاصا شور پیدا ہوا تھا اور قریب قریب واقع کمرے میں لوگ جاگنے لگے تھے۔

"کیا کدور ہے؟" خالہ کی بھی اس دوران جاگ گئی تھی اور سارے دھماکتے مادہ یا نو کے عقب میں کھڑی اس سے پوچھ رہی تھی۔

"معلوم نہیں۔" جانتے نہ کون لڑکے ہیں جو اب تک سی اندر کھیں کہ عامر بھائی سے لڑنے لگے ہیں۔ اس نے خالہ کی بات کا جواب سہمہ رو دیا لیکن اس کی نظریں اپنے ساتھی ہوتے مگر سے نکلیں تھیں۔ عامر کے ہاتھ میں کی آجائے کے بعد بہت ہوتے ہوئے لوگوں نے ایک بار پھر سنبھالنے لیا تھا۔ ان میں سے وہ نے لکڑی کو بکڑ لیا تھا اور وہ پیچھے سے آتے بھڑکے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ کیوں لڑ رہے ہو؟ میں کبھی بولوں رک جاؤ۔" مادہ باج کی طرح وہیں رک کر لڑائی دیکھنے کے بجائے خالہ کی باہر تھیں اور ان سب کو کارکن لڑائی کے جوش میں ان کی کمزوری آواز دہ کر رہی۔ اسی وقت آکس پاس کے کمرے کے چاک جانے والے لوگوں میں سے چند لوگ کھلے دروازے سے اندر بیٹھے آئے۔

"دو کون لوگوں کو۔" ورنہ یہ لڑکر ایک دوسرے کی جان لے لیں گے۔" پرویز کو کوسا نے گا خالہ کی کا حوصلہ دیا ہوا اور انہوں نے ان سے مدد کی درخواست کی۔ باقی چھ افراد مل کر لڑتے ہوئے لڑکوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر وہ لوگ پتھر دہ کی کوشش کے بعد لڑائی روکوانے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس دوران عامر سمیت تمام

خوشی

اکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء میں شادی ہو کر یہاں پہنچا تھا۔ ایک آپ اس طرح فٹ کے پیچھے تھا کہ وہ اپنے لیے ایک کمرہ تھا جس میں پتھر، پتھر، پتھر والی شہر دولت ایک آئین والا۔

حلی

نوروز کا پہلا دن ایک ایسے کا دروازہ پر پینس سے کمرہ چلا گیا تو اس نے دیکھ بھلا کے رات کی پہر فٹ ہاتھ پر کھڑکے گا۔ اسے کتا رہا کہ اسے کتا رہا ہے۔

"کیا آپ کا کدو گیا ہے؟" کتا رہا ہے۔

"نہیں۔" ایک اور کھٹک کچل کر تیر لڑکے آ کر بیٹھ کر رہے ہیں۔ اس کے سینے پر کھٹکے کے ہاتھ مقول سا پتھر لٹ رہا۔ ایک مرنے لگا۔

لڑکوں کا حلیہ انچھا سا کچڑ چمکا۔ عامر کی لڑائی میں آکر وہ لڑکوں کے سر پہنٹ گئے تھے ایک کی ٹانگ سے خون نکل رہا تھا اور ایک اسے بازوؤں پر سے دلی چوٹوں کا پہلا رہا تھا۔ خود عامر کا حلیہ بھی اچھا تھا۔ اس انچھا ہونٹ پر گیا تھا اور دائیں آنکھ کے نیچے کی زخم آتا تو جسم کے بالی کریاں جیسے پر بھی کی پونٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے کتا اور بہت سی جگر کی سے لڑا کھینچا تھا جو نے کتا وہ اس سے مار بھی سب سے زیادہ دکھائی تھی۔ کھٹکوں نے تمام لڑکوں کے زخم دھوئے اور پھر انہیں بیٹھک میں بٹھا کر کمرے کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

"ساری غلطی عامر کی ہے، ہم تو صرف ان کی غلطی کا احساس دلانے آئے تھے، اس نے ہاتھ نہیں ہاتھ پائی شروع کر دی۔" پرویز کے ساتھ آئے والے کتا قاسم لڑکے نے الزام لگایا۔

"لو کے بھئی ایک تو تم لوگوں نے کتا ہے کا رو کی الزام تراشی کی، اس پر سے غلطی کی میری حقارت ہے ہو۔" عامر اس کی بات سن کر بھڑکا۔ وہاں بھی کھٹکوں کی وجہ سے بھڑکے سے تب ہو گیا قرار نہ اس کا زخم غصہ اب بھی بھڑک رہا تھا۔

"دو مرنے پر آرام سے بات کرو۔ ہم سب کی بات آرام سے سنیں گے۔" ایک کمرہ سیدہ چانل نے عامر کے شانے کو کھینچا تھا۔ اسے کتا رہا ہے کتا رہا ہے۔

"آپ دیکھ رہے ہیں ہو پائی؟ یہ آپ لوگوں کے ماتھے کی کس طرح بھڑک رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے

والوں کا۔ بچے بہت خوش ہوئے۔ جب انہیں جینے کے لیے چھٹی پرانی دیریں کے بجائے نئی دھمکیاں ملیں گی۔ اس کی کیفیات سے بھر ماسٹر آفتاب جوش و خروش سے اپنے مستقبل کے چارن خاردار تھا۔

"دوبی ہنس۔ شہبازی ہی اسپرٹ وکچر کر رکھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں نے خود بھی فیصلہ کیا ہے کہ فوراً پارکوں میں اپنے خرچے پر ایک اسکل، سوائس گیم مختلف دیہاتوں میں صحت کے حوالہ قحہم کرنے کا ایک منصوبہ بھی زیرِ غور ہے۔ اس مسئلے میں جلد کام شروع ہو جائے گا۔" شہباز نے اسے سراجے ہوئے خوش خبری سنائی۔

"یہ تو بہت ہی زبردست فیصلہ ہے۔ سراجے جیسے لیٹن ہوئے گا ہے کہ اگر آپ اب ہی بیٹ پر موجود ہے تو یہ ضلع بہت ترقی کرے گا۔" اس نے ماسٹر آفتاب خوش ہو گیا۔

"میں نے تو ساری زبردست فیصلہ سنائیں۔ تم سباز شہباز سے اس مجھے شانے کے لیے کوئی فیصلہ نہ کرے۔" شہباز بہت سیلف سے گفتگو کو اس موضوع کی طرف لے گیا جس کے بارے میں جاننے کے لیے وہ دہریہ طرح سے جھین تھا۔

"مجھے مہراکمان صاحب کا پیغام ملا تھا۔ اتفاق سے حویلی میں کام کرنے والی ایک لڑکی دانی سے میری ابھی خاصی واقفیت ہے۔ میرے کہنے پر اس نے اس سے سخت پیار کی کوشش کی تھی لیکن اسے لیٹن ہے کہ ماہانہ چودھری انکار کے ہاتھ نہیں لگی۔"

"اسے یہ یقین کیوں ہے؟ ضروری تو نہیں کہ چودھری ماہانہ کو چھوٹی لے کر آئے اور اسے نہیں اور بھی تو رکھ سکتا ہے۔" اس نے ماسٹر آفتاب کی بات کھانے ہوئے لگیاں اٹھا کر کیا۔

"اگر یہ بے دانی کے معیئر کا آنا جانا کہ رہتا ہے۔ اسے معیئر کے ذریعے اس نے یہ بات کھم کر دوائی ہے کہ ماہانہ کو فوراً بے نہیں لایا گیا۔ ویسے بھی اس کے اس لیٹن کے پیچھے ایک دھری ہے۔ اس نے چودھری کی اس کے خاص بندوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو ہے۔ دانی کے مطابق چودھری اپنے بندوں پر سخت ظاہور ہاتھ کر رہا کہ وہ ابھی تک ماہانہ کو کوئی اوصاف نہ لگے۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اگر دو چار دن اور اس کے بندے ماہانہ کو قحہم سے میں نہ کام رہتے ہیں تو وہ انعام کے لالچ کے ساتھ ماہانہ کی تصویر اخباروں میں پھیلوانے کے لیے اسے آپ کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی اور کوئی نہ کوئی لالچ میں انکار اعلان ضرور دے دے گا۔"

"چودھری کے پاس ماہانہ کی تصویریں کہاں سے آئیں؟" ماسٹر آفتاب کی دبی ہوئی اظہار ہو چلا۔

"میں کی جان سکتا ہے۔ لیکن رانی نے خود چودھری کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اس کے کچے کے نیچے ماہانہ کی تین چار تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ رانی کی کہ تصویریں کالج کے ان نظام میں اور کچا تقریب و جمع میں شرکت کے موقع کی ہیں اور ان کی بھی تصویریں اس میں بھی ہوتی تھیں۔

شہباز چودھری نے نوران اور غیاث محمد کے ذریعے فیصل آباد سے یہ تصویریں منگوائی ہوں۔" ماسٹر آفتاب کے چشمہ کردہ اس خیال کو اس سے تردید نہیں کی لیکن اس کا ذہن نوران اور صفدر کے لگے کی واردات میں الجھا رہا۔ اسے ملنے والی اطلاعات کے مطابق صفدر کا گھر وادرات کے بعد دہریہ طرح پھرتی ہوئی حالت میں ملتا تھا۔ گھر کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کسی نے وہاں کی ساری ہی بو۔ اس واردات میں چودھری کے بندے ملوث تھے تو اس بات کا مواضع امکان تھا کہ انہوں نے ہی وہاں سے ماہانہ کی تصویریں حاصل کر کے چودھری کو پہنچائی ہوں۔" ماسٹر آفتاب کی فراہم کردہ معلومات نے جان اسے یہ سلی دہریہ کی کہ ماہانہ ابھی تک چودھری کے ہاتھ نہ لگی، وہ اس پریشانی میں بھی ہوئی ہے؟ آزاد ہونے کی کہاں ہے اور کس مشکل میں پھنسی ہوئی ہے؟ آزاد ہونے کی صورت میں اسے یہاں رانی کی کوشش کرنی چاہیے گی لیکن اس سوچ کے ساتھ اسے دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ ہو سکتا ہے

اس نے زار کر اس طرف کا رخ نہ کیا ہو۔ اس ملائے میں آنے کی صورت میں چودھری کی نظروں میں آجائے گا زیادہ ڈر تھا۔ لیکن اب چودھری اخبار میں اس کی تصویریں شائع کر دالے گا جو کام کرنے جا رہا تھا۔ اس سے ماہانہ کے لیے قحہم بہت زیادہ جاتا۔ اس قحہم کے پیش نظر تو اس نے ریش ہو کر کو اخبار میں اس کا لالچ بھانپنے سے روک دیا تھا کہ کتنی کوئی اسے پہچان نہ لے اور وہ اپنا دھمک دہریہ خیر محفوظ ہو جائے۔ اب چودھری انعام کے لالچ کے ساتھ باقاعدہ تصویر بھیجے گا تو قحہم کی کڑی زیادہ جاتا۔ کوئی دارالامان، لڑکی اور دہریہ ہمدرد کا گھر۔ کسی بھی جہاں وہ پھنسی ہوئی تھی وہاں کوئی فرد ہو سکتا تھا جو لالچ میں آکر چودھری کو اس کا

تھکا تھکا ہے۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئے سر؟" اس کی خاموشی کو محسوس کر کے ماسٹر آفتاب نے اسے ٹوکا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔ بس میں کچھ معاملات پر غور کر رہا تھا۔ شہباز بہت شکر یہ کہ تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔"

مجھے امید ہے کہ ابھی بھی شہباز تعاون ہمارے ساتھ رہے گا۔" اس بات کا تو آپ سو فیصد یقین دہن کیا۔ آپ اور میں ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں اس لیے یہ بھی نہیں کہ میں آپ کی مدد سے بھی انکار کروں۔" وہ شہباز کے مطوں سے ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اشارہ بھاب گیا تھا۔ اس نے خود بھی کھٹکھٹا اختیاری رخ دیتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور مصافحہ کرنے کے بعد روانہ ہو گیا۔

ہلا ہلا

"کچھ کمانے کو دو نا اس ایزی ہو کر ملک رہی ہے۔" نوران ایسا کام نہ ہاتھ دھار کر اسے ایسے ہی در سے کی طرف دھکیلنے کے چکر میں تھی لیکن وہ رات بھی بھر کے بیت سو رہا تھا اس لیے اس وقت کسی مجھوتے پر راضی نہیں تھا۔

"ابھی ایسے ہی چلا جا۔ دیر پوری ہے، وہاں آکر کھانا کھالیا۔ اگر در سے وہ سے پہنچے تو موٹو صاحب کی مار کھائی پڑے گی۔" نوران نے اسے کھانا کھا کر اور زوار دھمکا کر ایسے ہی در سے جانے پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

"میں کھانا کھا رہا ہوں تم مجھے کچھ کمانے کو۔" وہ بھی اپنی ضد پرائی ہو تھا۔

"کہاں سے دوں تجھے کھانے کو۔ گھر میں ابھی ایک ایک دانہ بھی نہیں ہے۔ جا۔ جا کر اپنے باپ سے بول دو کہ کسے کا تیرے اور زوار کا بندہ دست۔" وہ خود بھی بھوکی تھی اس لیے بچے کی مسلسل ضد پر چڑھی۔

"میں کیا اپنی بھانیاں کاٹ کر تیرے اوڑھے کو کھلاؤں۔ کتنی ہے تو کھلا دیتا ہوں۔ تیری جتنی ہوئی ایک اولاد میرا غصہ تو پہلے ہی کھائی ہے۔ اس دوسرے کو میں اپنا آپ کھلا دیتا ہوں۔" غیاث محمد میں بھی چار پانی پر سیدھا لیا تھا۔ نوران کی بات اس کے کان میں پڑی تو بلند آواز میں اپنے چہرے پر ہنس کا مظاہرہ کرتے لگے۔ وہاں تو کسے غائب ہو جاتے تھے اس کا خیرات اور اپنے کا خواب جو نونا سوٹا تھا، ساتھ ہی قانون کی لوبت بھی آگئی تھی۔ کئی دن سے چودھری نے اس کے کام پر آنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ نوران کا بھی حویلی میں داخلہ بند ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں ان کا دال دلی آخر کس طرح چلتا۔ چودھری کے عاب کا نشانہ بننے والے محسوس کے تو مانتے تھے بھی گاؤں کا یہ فرد بڑا کتنا تھا اس لیے کسی بار دوست سے بھی مدد کی کوئی توقع نہیں تھی۔ بار دوستوں کا کیا ذکر یہاں تو اپنے کے بھائی اور بھاری والوں نے یہ مف موزی تھا۔ بیٹیاں الگ اپنے اپنے گھروں میں مجبور بھی تھیں۔ غیاث محمد کے گھر میں فاسقے ڈالتے تو کیا ہوتا۔

اپنی کاتکا

بچیت رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر کمرات نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر اچھا جیسے جو ہوا بھی نہیں۔ صحت سے پرانی تھی۔ "جا۔ جا کر جھدر مر جا۔ تو بھی کئی دن جا توئے ات کی روٹی کیوں کھائی۔"

بچے نے مصیبت سے کہا۔ "ہاں کیا ان کے گھر کا ایک گھوٹا کھانہ میں کھاتی ہو گی؟"

"اور کتنی کھانا؟"

"جو کہ تو کتنی جادے۔ گھر میں جیسے دس برسوں سے روٹی کھا رہا ہے۔ وہ پلٹ کیوں نہیں ہو گیا؟" بچے نے پوچھا۔

ہاں کیا کھانا ہاتھ ہواں ہو کر اور کھانے کو کئی اپنے بچے کو دیکھی، ابھی اس کے ہاتھ میں چکر اور روٹی کا ٹکڑا تھی۔

(بندی بھائی اب۔ بھو چندر گلو)

(انتخاب۔ محمد ایسا چو بان، کرانی)

رات

مرکاری انفر کوشن چار انگوٹوں کے ساتھ اپنی دکان کی طرف آتا دیکھ کر اس نے اپنی حالت ٹھیک سے دیکھی تو گھر کو آ گیا۔ وہ جھڈ کر انہیں سلام کی اور بھانپنے کے لیے اپنی دھنکی کے چوٹے کرسیاں صاف کر کے لگا۔

دو لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے کمانے کے لیے تنگ منہ اور پسینے کے لیے بھولوں کا راس آ گیا۔ انفر نے کھانے پینے کے بعد اپنی موٹوں پر اڑکیاں بچھیں اور دکاندار سے حساب کتاب کار ہنر لے کر چلے پڑا۔ ان کے کان ایک صفحے پر اس کی نظر پڑی۔ وہ جراتی ہو اور سکران بھی۔ اس نے وہ صفحہ اپنے ہاتھوں کو دکھایا۔ وہ بھی پڑھ کر مسکراتے لگے۔

"کیسے لوگ ہیں؟" وہ کہنے لگیں۔ کمانے کے لیے کسے کوڑائی تھی، روٹی کے کھانے کا خرچ بھی رات گزرتے ہیں۔"

کھلے ہوئے صفحے پر لکھا تھا۔

"12-89۔ کمانے کا کمانہ 50 روپے۔"

دکاندار بھی جی کی کرتا ہوا ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔ تمہاری دیر بعد دو لوگ چلے گئے۔

دکاندار نے زہر دار پار دکھایا۔ خشک سونے سے لے کر جوں تک سارا خرچہ جو 100 روپے میں ایک ہی طرح تھی۔

29-8-89 کنوں کا کمانہ 150 روپے۔"

(بندی بھائی اب۔ روشن حواد)

(انتخاب۔ محمد ایسا چو بان، کرانی)

”جا میرا پتر! ابھی چپ کر کے بڑھنے چلا جا۔ بڑھتے
کے بعد اللہ سے دعا کرتا کہ وہ ہمارے کھانے کے لیے کچھ
بندوبست کر دے۔ اللہ تعالیٰ دعا ضرور سنے گا۔“ غیث محمد
کا زہد بکرا ہوا حرات دیکھ کر نوایاں نے ایک بار پھر بیٹے کو
سمجھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر قبل وہ لوگوں کے گھروں کے
باہر بڑے سبزوں اور پھلوں کے چھتکے چن کر لائی تھی اور رات
بھر سے میں، میں کرتی ہوئی بکری کے آگے وہ چھتکے ڈال کر
اس کی میں میں بند کرنے کا انتظام کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ
بکری کا پیٹ بھرے گا تو اس کے سونچے ہوئے تھن سے ایک
بار پھر دودھ کی دھار نکل کر ان کے پیٹ کی آگ بجھائے گا
بندوبست کرے گی۔ گھیتوں کی طرف ان میاں بیوی کا داخل
بالکل مملوع ہونے کی وجہ سے وہ اس مملوع جالور کے پیٹ
بھر نے کے لیے بھی کچھ کرنے سے قاصر رہے تھے۔ اور یہ تو
شاید ساری دنیا کا اصول ہے کہ کسی سے کچھ پاتے کے لیے
پیلے اسے کچھ دینا پڑتا ہے۔ وہ بکری کو اس کے پیٹ بھرنے کا
سامان مہیا نہیں کر پاتے تھے تو وہ اپنا کے پیٹ کی آگ
بجھانے کے لیے اپنا دودھ کیسے دان کرتی۔ پھلوں اور پتروں
کے چھتکے جمع کر کے اسے کھانے کو خیال نوراں کو کھانے کی میں
مچا کھنے کے بعد آیا تھا۔ لوگوں کے گھروں کے سامنے بڑے
چھتکے سینے کا یہ کام بہت ذلت آمیز تھا لیکن وہ پالیا پیٹ کی
غذا طرب سے نظر میں چہ کر یہ کام کر بڑی سی اور اب بکری
کی طرف سے امید باندھ کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن فی الحال تو اس
کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا کہ ایسا کھلا پڑ سکتی۔ بالآخر وہ
اسے پہلے پھل کر دے روانہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔

”چودھری صاحب نے صاف کہا ہے کہ جب تک ماہ
با نو زہد یا مرد نہیں مل جاتی، وہ ہرگز ہمیں معاف نہیں کریں
گے۔ اب تو رب سے دعا کر کہ وہ انھیوں ملی ہمیں سے سر پڑ
کر رہی سہی مل جائے تو ہماری جان اس غلاب سے
چھوٹے۔“ الیاس کے بیورے ہوئے گھر سے روانہ ہونے
کے بعد غیث محمد نے پیلے ہوئے انداز میں نوراں کو مشورہ
دیا۔ اس نے مشورہ سنا اور خاموشی سے گھر کے کام نٹانے
میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں کرنے کو کام ہی کیا رہ گیا تھا۔
صفائی سترائی کے بعد وہ بالکل فارغ تھی۔ کچھ پکانے کو تھا
نہیں جو ہانسی جہ طبع اور جب کچھ پکایا کھا پانی نہیں کیا تھا تو
دھنلے والے برتن بھی کہاں سے آئے۔ حویلی کی مشقت اور
مصرعہ فیت کی غلامی نوراں اندر باہر کے پھر کر کدورت کاٹنے
کی کوشش کرتے تھی۔ حالانکہ اسے مملوع تھا کہ یہ چند کھٹے
آگے سرکین کے تو الیاس کھانے کے مطالبے کے ساتھ ایک

بار پھر گھر آ چکے گا۔ دو مختلف کیفیات میں گھری دو بھگن اس
وقت غیث محمد کی طرح تکی تھا کر رہی تھی کہ نہ وہ دھارہ کی
بھی حال میں باہر تو مل جائے تو یہ غلاب ان پر سے نکلے۔
اس ایک کی قربانی دے کر وہ سب امن میں آ سکتے تھے اور اب
تو وہ سوچ رہی تھی کہ قربانی کی بھی کیا بات تھی۔ اگر ماہ با نو
نہ نہد حالت میں چودھری کو مل جاتی تو اس کی زندگی حویلی میں
جیش کرتے ہوئے ہی گزرتی۔ تم از گم فاقوں سے مر جاتے
کے مقابلے میں تو اس کے نزدیک ہر طرح کی زندگی بہتر تھی۔
انہی لاجبھی سوچوں کے درمیان بالآخر وقت گزر رہی گیا اور
الیاس مدد سے تے وہاں آ گیا۔ اسے غدار تھا کہ وہ آتے ہی
کھانے کے لیے تاک بگائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے
اپنا سارہ حاق پر رکھنے کے بعد آرام سے چند پیپ سے پانی
نکال کر منہ باخمہ دھویا اور بکری کے ساتھ چھتیاں کرنے لگا۔
”الیاس پتر! تجھے بھوک تو نہیں لگ رہی؟“ نوراں

نے آرتے آرتے اس کے قریب آ کر سوال کیا۔
”نہیں اماں! میں نے تو کھانا کھایا۔ مدد سے میں
سارہ پڑھتے کے بعد میں سے اللہ میاں سے دعا کی کہ مجھے
کھانے کے لیے کچھ دے دو۔ میں دعا مانگ کر آ رہا تھا تو
مولوی صاحب نے روک لیا کہ کھانا کھا رہا تھا۔ بڑا احسن ہے گا
گوشت کا سائن تھا ان کے پاس کھانے کے لیے۔“ الیاس
نے یوں بچکارو لیا جیسے انکی تکی زبان پر اس گوشت کا ذائقہ
محسوس کر رہا ہو۔ نوراں جانتی تھی کہ مولوی صاحب کے لیے
نوبلی سے کھانا آتا تھا۔ گاؤں کی اگلی سی مسجد کا مولوی غلام محمد،
چودھری کی ملکوتی نظر تھا اس لیے خوب مزے میں رہتا تھا۔

”اور بابا اماں! میں مدد سے تے وہاں آ رہا تھا تو
مجھے لگا رہا تھا کہ گھر کے باہر لوگوں کی بھیڑ بکھائی دی تھی۔ کوئی
گھبراہٹا تھا کہ پانی طبیعت خراب ہے، اسے شہر کے اسپتال
لے کر جا رہے ہیں۔“ الیاس کو کچھ دم پڑ آیا تو اس نے
نوراں کو اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر وہ بے چین ہوئی۔
بکری طرف سے خوش خبری سن کر جو اطمینان ہوا تھا، اب اس
کی طبیعت کی خرابی کان کان کر پڑی تھی میں دھنلے گیا تھا، نہ
چاہے ہوئے بھی وہ نگاہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ وہاں
اب بھی تین چار عورتیں کھڑی ہوئی تھیں البتہ بکرا کھانا ہستان
لے جایا جا چکا تھا۔

”دو دن سے بڑی بری حالت تھی بے چاری کی۔ اور
رک ہی نہیں رہا تھا۔ دانی بے چاری نے آ اپنے سارے
ٹونکے اور وہاں آ رہی تھیں، پھر تنک ہار کر کہہ دیا مای متا
سے کہ اپنی نوری کو شہر کے اسپتال لے جاؤ۔ بڑی مشکل سے بھا

تھیں کی۔ وہ صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھا اور کافی مستعد اور چمکنا نظر آتا تھا۔ مرید بڑے مہرے ہی چپے آئے والی پالیس بیپ بھی رک گئی۔

"خیریت ہے سر؟" غوراً ہی اسے ایس آئی بیپ سے اندر کر مرید بڑے قریب آیا۔

"ہاں، تم اندر آ کر بیٹھو مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" بہت چھپکری سے دے سکے اس قسم پر اسے ایس آئی کو جو ان نظر آتا تھا، ہم اس نے قسم کی قہقہے میں تاخیر نہیں کی اور دروازہ کھول کر گاڑی کی چابی اٹھست پر بیٹھ گیا۔ شہر یار نے جانچے والی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ جوان آدمی تھا اور اس کی ساخت کردہ شرط کے مطابق کافی چاق و چوبند بھی نظر آتا تھا۔ البتہ اس اچانک پیش آنے والی صورت حال کے باعث اس کی آنکھوں میں انھیں حیرت سی مگر وہ اپنے چہرے کو سہاگت رکھنے میں کامیاب تھا۔

"اگر تمہارے ٹولہ پر ایک پھول کا اضافہ ہو جائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟" اس کی ظاہری شخصیت سے اس کی فطرت کا کسی حد تک اندازہ لگانے کے بعد شہر یار نے اس سے سوال کیا۔

"ظاہر ہے سر... بہت اچھا۔" اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"میرے خیال میں میرے پاس تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک موقع ہے۔" جو وہ بعد اس قہقہے سے ایک مفید سوز کی کچھ اپ گزرتے گی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سوز کی کوہک کر جنھیں اس میں موجود ہندوؤں کو گرقاد کرنے سے۔ سوز کی میں سے جو مال برآمد ہوا اس کی پراہنگی پر جنھیں بہت سراہا جائے گا، ساتھ میں ترقی بھی ہوگی۔ سوز کی پلوڑوں کی نوعیت اور اس سے بیرونی اثرات کا حلق ظاہر کیے بغیر وہ عبد المنان سے ملے کیے ہوئے منصوبے کے پیچیدہ ڈیزائنات اسے سمجھا دیا گیا۔ اسے ایس آئی نے اس کی ساری بات بہت توجہ سے سنی۔

"میں سمجھ گیا ہوں سر، سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا۔" تعلیقات ملنے کے بعد اسے ایس آئی نے اسے اپنے گوشے کے ساتھ اسے مقین دہانی کروائی۔

"میں اب میرا ذرا تیر چھپے روہ کر ساری کارروائی پر نظر رکھیں گے۔ اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہوگی تو ہمارے طرف سے مدد ملے گی۔" وہ تم اور تمہارے ساتھیوں کی کمر بستہ رہنے میں اس کے۔ یہ وہ صورتوں میں کرپٹ نہیں ہی تھا۔ میرا بیان میں وہ گاگا کہ اتفاقاً طور پر مجرم نظر میں آئے اور غم کے

نکھر اڑ ہو اور دونوں اطراف میں سے کوئی بھی بندہ نہیں ہو تو اسے فوری طور پر پکڑ لیا اور اس کے۔ "عبد المنان کی پیشکش کو روک کر تے ہوئے اس نے اپنے ذہن میں موجود منصوبہ بتایا۔

"مجھے یہ معاملہ شہر یار لگ رہا ہے سر! اضافہ خواہش اس کا رد دانی میں آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو مجھے بہت سے لوگوں کے سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔" عبد المنان کچھ گھبرا رہا تھا۔ معاملہ بڑے حد تک تھا۔ شہر یار کی اس قسم کی کسی انکیتوں میں شمولیت کسی طور مناسب نہیں تھی اس لیے اپنے طور پر اس نے ایک بار پھر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"وہ زندگی بھی کیا جس میں خطرہ نہ ہو۔ آدمی کو جو بڑے سے بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، وہ اپنا جان جانے کا ہوتا ہے۔ جو جان بہر حال ایک نہ دن جانی ہے۔ کسی بھی کام کو کرتے ہوئے چھٹی جانے تو کیا بدلتی ہے۔ البتہ اگر تم گھبرا رہے ہو تو میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ تم اس سارے معاملے سے الگ ہو کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ سکتے ہو۔ جب کوئی تم سے سوال کرے گا تو تم صاف کہہ سکو گے کہ اسے ہی صاحب نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے کیا اور تمہیں اس معاملے کی کوئی خبر نہیں تھی۔"

"آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سر! میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں اپنی جان بچاؤ چاہتا ہوں۔ میں تو آپ کو معاملے کی نزاکت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں آپ کی اپنی فیملی کے لوگ بھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔" شہر یار کی بات پر وہ کچھ شرمندہ ہو گیا تھا اس لیے اپنی صفائی پیش کر رہے ہوئے ایک اور دلیل دی۔

"میری فیملی کے لوگ جانتے ہیں کہ میں سر پر ہوں۔ اگر تم ایک سر پر ہونے کا ساتھ دے سکتے ہو تو ٹھیک ہے، اگر نہیں دینا چاہتے تو کوئی زبردستی یا ٹھکانہ نہیں۔ میں تو بہر حال وہی کچھ کروں گا جو مجھے چاہیوں۔" شہر یار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"میں آپ کا ہر ممکن ساتھ دوں گا۔" اس بار عبد المنان کا لہجہ بھی اٹل اور مضبوط تھا۔

شہر یار کی مرید بڑے ایک رقیب سی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ مرید بڑے کے پیچھے پالیس بیپ بھی جس میں ایک اسے ایس آئی اور جاگ کر نہیں سوار تھے۔

"ہاں نہیں روک لو۔" ایک ایسے موڑ پر پہنچنے کے بعد جس سے گزرنے والے سے باہر جانے والی ہر گاڑی کے لیے باز نہ ہوتا تھا اس نے مشاہیرم خان کو حکم دیا۔ اس نے حکم کی

ایمانی ایم کے ساتھ بروقت کارروائی کرتے ہوئے انہیں گرفتار کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ ”شہر یار نے اسے حیدر ضیاء دہانی کر دئی تو ان کا چہرہ مکمل ٹھنڈا ہوا وہ جوش سے بولا۔

”آپ ٹھہری نہ کریں سراپا اللہ آپ لوگوں کو رخصت کر دئی تھی کیا پڑے۔“ میں اور میرے ساتھی سب سنبھل گئے۔

سیدنا علیؑ سے کہے۔
 "پیارا بھائی! تم کو کون سا گناہ گوار کر رہا ہے۔ ان کے
 ذریعے ہم اصل بندے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"
 "راہِ سحر! جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔" اے
 اہلس آفتی سے یقین دلایا۔

انہیں اس سے بچنے کے لیے ایک چار دیواری میں بند کر دیا گیا۔ ان کے پاس کوئی کھانا نہ تھا۔ ان کے پاس صرف وہی کچھ روٹی تھی جو ان کے ساتھ تھی۔ ان کے پاس کوئی کھانا نہ تھا۔ ان کے پاس صرف وہی کچھ روٹی تھی جو ان کے ساتھ تھی۔

ناکامی کی صورت میں اسے ایس آئی اور سپاہیوں کو تھوڑی بہت رقم دے کر خاموش رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ کچھ روز باقاعدہ آئی ڈی ریکارڈ تلاش کیے گئے تو نتیجہ برآمد ہوتا تو بھی بات چند لوگوں کے درمیان ہی ختم ہو جاتی۔ حسبِ خواہش نتیجہ تحقیق کی صورت میں حقائق والا اکھاڑ کھلا ہوا تھا۔ اس اکھاڑے میں مطلوب کا ردوائی ڈال کر کام بھی ہو چکا اور اسے ایس آئی کے بھی حوالے آ جاتے۔ انکار کے یو میں ملے مگر مزے نہیں ملے۔ آخر کار ایک سرگرم سوزوکی یکہ اپ کی سفیدی بھنگی، شہر باز کو اپنے جسم میں خون کی گردش تیز ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ باقی لوگ بھی اسی کیفیت سے گزر رہے ہوں گے، البتہ اس کی بے چینی اس لیے سوا بھی کہ چاہتے تھے وہ خود و خود انکیشن میں نہیں آسکا تھا۔ اسسٹنٹ منسٹری پوسٹ نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ وہ جاتا تھا کہ علی عبداللہ نے قاتلے بھی کی گرواب کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے کچھ جیسا آئی ان دیکھنے والوں میں فیہ حوئی ہے، باحیثیت ہو کر مکمل ہونے کی اذیت سے گزرتا رہتا ہے۔ اس وقت وہ اسی اذیت سے دوچار تھا۔ اس کی مہم جو فطرت تھی کہ اس میدانِ عمل میں اتنا کر ٹوہ کچھ گزرے لیکن مہم کے گدگدشا تھا کہ وہ خود برباد پانچھ رہ گئے۔ فی الحال اس نے یہی کام اور ہونے چاہیے سرگرم کا بندھن چھوڑ دیا۔ سوزوکی یکہ اپ کو دیکھ کر پولیس جیپ کا انجن ایک غرات کے ساتھ جاگ کھلیا تھا اور پولیس جیپ بہت تیزی سے حرکت کرتی ہوئی سرگرم کے وسط میں آئی تھی۔ پیچھے سے آنے والی سوزوکی یکہ اپ کو اٹھا کر نکال دیا۔ یکہ اپ کے رکے ہی اس میں سے ٹھوکر اٹھیں میں لوگوں قلع ڈرائیونگ کی طرف والا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اسے ایس آئی بھی جیپ سے اتر آیا۔ پھر اس کے اوپر سوزوکی ڈرائیور کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ ان دونوں کی آواز میں زیادہ بلند نہیں تھیں اس لیے وہ لوگ اس گفتگو کو صرف جھجھکاہٹ کا صورت میں سن سکتے تھے۔ تاہم گفتگو کی نوعیت کا شہر باز کو اندازہ تھا۔ اسے ایس آئی نے بقیہ سوزوکی ڈرائیور سے خاموشی کی بات کی تھی۔ ذرا سی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہوتا ہوا نظر آئے۔ اس کی رضامندی اور سکون نے شہر باز کو کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ ایک تو وہ نفس اکیلا تھا دوسرے اس بات پر مطمئن بھی نہیں آتا تھا کہ سوزوکی کی خاموشی کی صورت میں وہاں سے کوئی قاتل اسے نہیں بوسکتی ہے۔ اسے ایس آئی کے ساتھ موجود کاشمیشل اس کے اشارے پر خاموشی لینے کے لیے آگے بڑھ گئے تھے۔

واپس طرف موجود دونوں سپاہی بدستور اپنی پوزیشن پر
 ہوئے تھے۔ اس کی نگاہیں سپاہیوں اور سوزو کی یکساں کی
 طرف بھی ہوئی تھیں۔ خاموشی انجمن والی وہ جیب بھیجے سے
 سب نمودار ہوئی۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ جیب کی ہینڈ
 ٹائٹس آف تھیں اور ان لوگوں کی نگاہوں نے اسے اس وقت
 نوکس کیا تھا جب وہ بالکل قریب آگئی تھی۔ اس جیب کو مرگ
 پر سے گزرنے والے معمول کے ٹریفک کا حصہ قرار دے کر
 آسانی سے گزرنے کا راستہ دیا جاسکتا تھا لیکن جیب کے
 ڈرامائی انداز میں نمودار ہونے پر ہر قسم کی بے تکلف کیا تھا۔
 جیب یکساں کی اپنی پیچھے رگ ٹکی تھی۔ حواشی کے لیے
 آگے بڑھنے والے کا سنبھل بھی اپنی جگہ کر کے دیکھ رہے
 تھے۔ جیب میں اوار لوگوں کے بارے میں جانے بچھہ کوئی
 رد عمل نہیں ظاہر کیا جاسکتا تھا۔ اسے ایس آئی کے اشارے پر
 ایک کاسٹیل شاید یہی جاننے کے لیے اس طرف بڑھنے کا تھا
 لیکن زمین تھی وضع صورت حال یکساں بدل ہی گئی۔ جیب
 کی جھلک سنبھلنے پر سوار اٹھانے والے ادا میں دونوں
 جانب سے مصلحتاً دیکھ گئی اور جیب جس کا انجمن ابھی تک
 بند نہیں کیا گیا تھا تیزی سے متحرک ہو کر بڑگ پر اس انداز
 میں آگئی کہ قریب آگئی تھی کہ جیب سے چھٹا کے گزرتے
 والوں کو آڑ میں لے لی۔ ہر نفسا میں خوف و شگوف کا رست چلنے کی
 آواز گونجی اور جیب کی طرف بڑھنے والا سپاہی ایک جھٹکے سے
 الٹ کر پیچھے کی طرف لڑا۔ ہمدانی کا رد و اپنا کچھ نہیں ہوئی
 تھی اور کوئی شخص بھی جوتھ نہیں پان تھا کچھ میرے اس آئی
 نور اس کے ساتھ موجود کاسٹیل کی تیزی سے حرکت کرتے
 کئے خود ایک اپ کی آڑ میں کر لیا تھا۔ یکساں کا ڈراما
 بھی اس دوران تک پہنچا ہے چکا تھا۔ اپنا پسند والوں نے
 بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ دونوں طرف کے فائر
 بے سود جا رہے تھے اور کوئی بندہ ان فائرول کی زد میں نہیں
 آ رہا تھا۔

”میں آجے جا کر پولیس والوں کی مدد کرتا ہوں سزا“
 خادمہ خان کے پاس داخل ہوئی اور وہ اسے استعمال کرنے
 کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔ اپنی بات کہنے کے بعد وہ اس کا
 گلن دھاریاں جانب منوجو کا شیڈول کے قریب پہنچ کر اس کے
 ساتھ شریک ہو گیا۔ شہر بارہا بھی میدان گلن میں نہیں اترا
 تھا لیکن اس کی نظریں ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے
 اعزاء و بورہا کا حق جذبہ میں آکر وہ ایک خند قدم اٹھا دیا
 جب اسے ملے والے تمام خند اس کے کسی بعد رونے نہیں بلکہ
 دلی نے لکھا تھا۔ اسے باقاعدہ منصوبہ بندی بنا کر بھیجا گیا

تھا۔ وہ جو اپنے تئیں بہت اچانک غموں کے سر پر پہنچا کر انہیں دک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا وہ خود بھی چکا تھا اور ایک دار نقشان بھی اٹھایا تھا۔ مگر یہ پروپی کا کتبستان کی لاش اس کے نقصان کا ثبوت تھی۔ پھر ایک نقصان اور سامنے آیا۔ گولیوں کی ترقی وراثت کے بیچ اچھرنے والی انسانیت کی جہنم بھائی تھی۔ قاتل اور مقتول دونوں اس سے ہوشیار تھے۔ یہاں رہے تھے۔ گولی کا کرکڑے والا جواں سال اپنے اس آئی تھا۔ اس پر گولی پک اپ کے ذرا سیر نہ چلائی تھی۔ وہ جانے کس طرح پوشیم چپ کی آڑ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور پشت پر سے خاکہ کر کے اس نے اسے اس آئی گھنٹہ سے چھڑا تھا۔ اس دوسرے نقصان کے بعد عمر یاد کے لیے میدان تھی سے دور رہنا ممکن نہیں رہا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور رستہ کر اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے پک اپ ذرا سیر کی طرف رہا اور کارخانہ کر کے گولی چلائی۔ اس کی چلائی گئی شائع نہیں کی اور اب پک اپ ذرا سیر کی جمع فضائیں اسی ہیں لیکن وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ گولی سے صرف پک اپ ذرا سیر کے بازو کو نقصان پہنچا ہے۔ گولی کھا کر بھی پک اپ ذرا سیر نے اپنی حرکت نہیں بدلی تھی۔ غم اور فتنے سے بالکل شہر باز اسے نشانہ بنانے کے لیے جوش میں اندھا دھند آگے بڑھا، اپنے اس جوش میں وہ اس پوریشن میں آگیا تھا کہ اس کے اپنے ساتھیوں کو فائر ہو گا اور۔

”چھپے لیت جا میں سر“ اور ہاتھ سیدھا کر کے پکے
اب ڈرامیو پر دروسہ اٹھارتا جانا تھا کہ مشاہیرم نان کی کچھ
آواز ایک منظر سے اسے ہوش میں آئی۔ اس نے تیزی سے
ٹھوکر پیچ کر بائیں اس دوران میں سے وہ فائر پکا تھا
یقیناً اس کے جسم کے کسی حصے کو نشانہ بنا کر بھی کیا تھا لیکن
اس فوری حرکت کی وجہ سے کوئی جسم کسی حصے میں جو سوت
ہونے کے بجائے اس کے دائیں شانے کو درکنز ہونی کر
گئی۔ اس رگڑ کا نتیجہ میں ایک آتشیں زور کی صورت میں تھا۔
پایس اسے اعزاز دتا کہ طاقت کے باوجود ابھی نامی بچہ
ہو گئی ہے۔ اس پر ہونے والے اس فائر کے بعد سرت حال
تیزی سے بدلے گئی۔ ہوں لگا کر سامنے والی پار کا مقابلہ
کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے اس منظر والوں میں
یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ تجربوں کی پیچ کا انجن زور دار آواز
میں گزرا اور پھر نقصان کا غرول کی طرح آہستہ آہستہ اس
لوہوں کی طرف سے پیچ پر فائر کیے گئے لیکن ٹھکر جب
ڈرامیو بڑی مشافی سے سے ٹوڑا وہاں پیچے کی طرف لے
گیا۔ جب کچھ پانچ ان کی نظروں سے اوصل ہوئی جارہی تھی

رانا نے اسے تنبیہ کرنے کے ساتھ تسلی بھی دی اور ایک تجویز بھی پیش کی۔
 ”ہرگز نہیں۔ فرانفر تو میں کسی صورت میں کرواؤں گا۔ میرے بھائیوں کی تو سب سے بڑی خواہش یہ ہے ہوگی کہ مجھے نہیں اور فرانفر کر دیا جائے لیکن آپ سب اس بات کو دھیان میں رکھیے گا کہ میری مرضی کے خلاف میرا کہیں فرانفر نہ ہو سکے۔ میں واضح حد تک اپنی اہلیت پر جمار ہتا چاہتا ہوں۔“

”ابھی نہیں ہوگا فرانفر۔ لیکن جہیں بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ سبیل کرواؤ خود کو بچا کر کام کرو۔ شعلے کے باثر لوگوں سے براہ راست ٹکرائے سے بچنا چاہئے ہو، بچہ کی کوشش کرو۔ ورنہ وہ لوگ بھی اپنے تعلقات کی ذوریوں میں گرفتار رہنے لگے۔ مشکلات کھڑی کرنے کی کوشش میں لگ جائیں گے۔ طاقت اور اختیار کے اس گیم میں کب کس طرف کا پلڑا جک جائے، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔“ سجاد رانا نے اسے یقین دہانی کروائی لیکن اپنے تجربے کی روشنی میں نصیحت کرنے سے بھی باز نہیں آیا۔

”میں کوشش کروں گا۔“ شہزاد نے اسے جواب دیا۔
 تب ہم جب وہ اسپتال سے روانہ ہوا تو اسے یقین تھا کہ شہزاد نے کوشش بھی کی تو اپنے حوازی کی وجہ سے اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

باز باز

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔ وہ تو دن کا وقت ہے اس لیے کسی پریشانی کی بات نہیں پھر بھی تم دھیان سے دروازہ بند کر کے رہنا۔ آگن میں بھی زیادہ لکڑی کی ضرورت نہیں۔ وہ غیث پرویز سارا وقت اپنے گھر کی چھت پر چڑھا کر بازی کرتا رہتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر غواخواہ چیمبر خانی کی کوشش کرے گا۔ میں نے سرمد سے کہہ دیا ہے، اگر اسے موقع ملا تو اس طرف کا پتھر لگائے گا ورنہ میں تو انشاء اللہ دات تک تمہارا کام نہ تھا کرواؤں آجی جاؤں گا۔“ چیمبر سافری بیک شانے سے لپکے عامر، ماہ بانو کو بیادیاں اور شلیاں ساتھ ساتھ دے رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ اپنے دفتر سے بھٹی لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب ماہ بانو کے کام سے جا رہا تھا۔ پرویز کی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس دن کی جانے والی حرکت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ بے جھکی سے اس کا مقابلہ کرنے کے باوجود وہ جانتا تھا کہ پرویز اپنی اس سخت برآرام سے نہیں ہینے گا اور مسلسل اس کوشش میں لگا رہے گا کہ کسی نہ کسی طرح اسے یا ماہ بانو کو نوک پہنچائی جائے۔

پرویز کی ایسی کسی حرکت سے پہلے وہ ماہ بانو کو یہاں سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ماہ بانو کی حیثیت اس کے گھر میں ایک امانت کی سی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔ سرمد کو بھی وہ رات ہی اپنے پروگرام سے مطلع کر چکا تھا۔ اس نے بھی اس کے فیصلے کی تائید کی تھی بلکہ وہ عامر سے بھی زیادہ بے چین تھا کہ جلد از جلد غواخواہ مولیٰ ہوگی اس ذمے داری سے نجات حاصل کر لی جائے۔

”آپ میری طرف سے بالکل غلط کر رہے ہیں۔ میں خالہ بی کے ان کے کمرے میں ہی رہنے کی کوشش کروں گی۔ ویسے بھی دن دن عی کی تو بات ہے۔ دن بھر تو ویسے بھی تپ دفتر میں ہی رہتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ سارا دن آرام سے بغیر پریشانی کے گزار جاتا ہے۔“ اس نے عامر کو تسلی دی تو وہ اپنی ماں کے کمرے میں جا کر ان سے ملاقات کرتے لگا۔ انہیں اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے دفتر کے کچھ اہم کاغذات وغیرہ بیچنے کے لیے ایک دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ انہوں نے دھیموں دھاواؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

”دھیان رکھیے گا، وہاں جا کر اسے کسی شہر یا رصا حبیبہ ان کے پاس کے کسی سے کہہ دے کہ وہاں سے نہیں ملتا۔ ان دونوں سے ہٹ کر کسی تیسرے فرد کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائیے گا۔“ عامر کے پیچھے دروازے تک جاتے ہوئے اس نے کئی بار کی ہوئی نصیحت ایک بار پھر دہرائی۔ عامر یا سرمد کو اس نے اپنے تمام حالات تفصیل سے نہیں سنا تھے۔ ان لوگوں کو بس اتنا علم تھا کہ وہ اپنے کچھ دھنوں سے چھٹی پھر رہی ہے اور اس سلسلے میں اسے کسی شہر یا رصا وغیرہ کی سپورٹ حاصل ہے۔

”مجھے تمہاری حمایت ابھی طرہ زیادہ ہے۔ تم بے فکر ہو اور دروازہ بند کر کے اندر بیٹھنے کے بعد آرام سے میری واچنگ کا انتظار کرو۔“ وہ اسے جواب دے کر باہر نکلی گیا۔ اس کا رخ شہر سے باہر جانے والی سڑک کے اڈے کی طرف تھا۔ اڈے پر پہنچ کر اس نے پہلے ایک خریدار بھر ایک کہیں سے سکرین کا ٹکٹ خریدنے کے بعد اس کے سامنے گئے اسٹال سے آج کا اخبار بھی لے لیا۔ وہ باقاعدگی سے اخبار پڑھنے کا عادی نہیں تھا۔ کسی گھبراہٹ کی وجہ سے اسے اخبار پڑھ لینا تھا۔ اس وقت اس نے رات کی بوجھت سے بچنے کے لیے اخبار پڑھا تھا۔ بس میں بیٹھنے کے بعد اسے پورے دو سو فیصد کی امید تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا مسافر بے اعتناء باؤنی تھا جو بڑی بے نظمی سے اس سے باتیں کرتے ہوئے نقصان پر قہر ساٹھ جا رہا تھا۔ مسافر کا انداز گھٹکھٹکا سا وہ اور بدستہ تھا کہ اسے وقت

مڑنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ خود بھی اسے اپنے دفتر اور دوستوں کے متعلق ہی نہیں بتا رہا۔ اپنے خوش اخلاقی ہم سفر کی وجہ سے اسے احساس بھی نہیں ہوا اور سفر تمام ہو گیا۔ سامی سافر سے ایک گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد وہ جس سے اتر آیا اور اسے پر موجود رکشوں میں سے ایک میں سوار ہو کر اسے اس کی صاحب کے آگے پہنچانے کا کہا۔ لاہور کے بس اسے سے خراج ہوا اور اخبار رول کی صفحہ شہاب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ رکشے میں بیٹھنے پر اس نے اخبار کو کھولا اور اس کا یہ نئی سرسری سا جائزہ لینے کا سرسری جائزہ لیتی اس کی نظر پر ایک تصویر پر توجہ مرکب ہوئی۔ وہ ٹائٹل گمشدہ کا اشتہار تھا جس میں تصویر میں موجود لڑکی کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کے لیے ایک لاکھ روپے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اعلان کے ساتھ ایک موٹو لکھ کر بھی موجود تھا جس پر لڑکی کے متعلق جاننے والا رابطہ کر سکتا تھا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں ابھی طرح جانتا تھا کیونکہ وہ اس کے گھر میں ہی مقیم تھی۔

"بھائی! ذرا تیرا خیال دے۔ مجھے جلدی لگتا ہے۔" اشتہار پڑھ کر وہ خود لاٹھیاں میں جھلکنا شروع کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ سارے لوگ جنہوں نے ماہ بانگواس کے گھر میں دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی کی نظر اور اس اشتہار پر پڑتی تو ایک لاکھ کے اضافے میں اس فن کار نے ہر ضرورت اطلاع دی تھی۔ اشتہار میں گمشدگی کا اشتہار دینے والے لوگ اس کے خیر خواہ تھے یا دشمن؟ اس بارے میں کیا کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد ان لوگوں کے پاس پہنچ جائے جن کے بارے میں ماہ بانگواسی یقین تھا کہ وہ اس کے لیے ہر ضرورت فرمادے گی۔

پہول کی چوٹی سے بھرا تھا کہ لڑکی میں رکشے کے بعد اس نے گاڑی انارات کی اور کوئی کی طرف روانہ ہو گیا۔ موٹی والا کی موت کے بعد پھر ابھی اس کی ملازمت جاری تھی۔ موٹی والا کے کزن نے کسی طرح اس بات کی اجازت لے لی تھی کہ کوئی کے ایک دو کمرے اس کے چالیسویں تک کھلے رکھے جائیں اور اب وہ اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق وقتاً فوقتاً ان کمروں میں کوئی نہ کوئی ایسا کام کر دیتا رہتا تھا جو اس کے یقین کے مطابق موٹی والا اور اس کی بیوی کی مفرت کے لیے بجا کر ثابت ہو سکتا تھا۔ مرنے والا اپنے ساتھ اپنے اعمال تائے میں جو کچھ کر کے گیا ہے، اس کی بنیاد پر اللہ کے ہاں اس کا معاملہ ہوگا۔ اس حقیقت سے نظر چائے مرنے والوں کے لواحقین اپنے طور پر اس کو شش میں ہی دے رہے ہیں کہ کسی طرح جانے والے کے لیے ایسا

کوئی بندوبست کر دیں کہ وہ جہنم کے شعلوں سے بچ کر جنت کے باغات میں جا سکے۔ اس خواہش میں بعض لوگ اپنی جہ سے بھی توجہ کر جاتے ہیں اور ایسے ایسے کام کرتے ہیں جن سے جو صریحاً خلاف شرع ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان ساری رسوم کے پیچھے مرنے والے سے محبت یا بھاری کے بنائے دینا داری کے تقاضے بھانپا بھی مقصود ہوتا ہے۔ موٹی والا کا کزن اس دوسری ٹیکسٹری کا بندہ تھا۔ آج بھی اس نے ایصال ثواب کے نام پر جانے کنی کھانسیں اور صدقوں کے مولوں کو جمع کر کے ان کی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ لوگ قبرستان میں جانے والے تھے۔ پہول کی یہ چٹان قبر پر ڈالنے کے لیے ہی منگوائی تھی۔

"میں چٹان لے کر آ گیا ہوں۔ تو تاکہ اندر کا کیا حال ہے؟ کھانا دانا ہو گیا یا نہیں؟" کوئی پچھتے کے بعد شاکر سے مخاطب ہوئے پر اس نے اس سے پوچھا۔

"کھانا اتنی جلدی کیسے ختم ہو گا؟ انہی شان دار مرنے کی پرانی اور کڑھائی کب کر آئی کہ جب تک حلق تک نہیں ٹھوس میں سے کسی کا تھک نہیں رہے گا۔" شاکر نے جواب دیا اور اس کے تقریبی سی بیٹھ گیا۔

"پہل جو بھی ہے فی الحال تو ہماری نوکری چل رہی ہے۔ چالیسویں تک ہم بھی بھاگ دوڑ کر کے اپنے لیے کوئی نئی نوکری تلاش کر لیں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ یہاں سے قلعہ بھر کر ایک جگہ انٹرویو کے لیے جاؤں گا۔ ایک دوست نے بتا تھا کہ ایک سید صاحب کو اپنی بیوی کی گاڑی چلانے کے لیے ذرا انگریز ضرورت ہے۔"

"ہاں، جی۔ اب تو یہی کرنا ہے۔ کاش صاحب کی مہمان لڑکی کا بھی بیٹھ بہ معلوم ہو جا تو شش ہو جاتے۔"

"کسی مطلب؟ کیا فائدہ ہو گا؟ تمہارا صاحب کا بتا معلوم ہوئے سے؟" وہ شاکر کی بات میں پوچھا۔

"آج کے اخبار میں اس لڑکی کی درخواست ہے۔ لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے ایک لاکھ کا انعام ہے۔" کہاں بچہ اخبار؟ مجھے بھی دکھاؤ۔" وہ بے چین ہوا۔

"میں نے سنا ہے کہ گرل میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ یہاں اب اخبار پڑھنے والا ہے ہی کون؟ میں بھی بھیجی نظر۔" لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے ایک لاکھ کا انعام ہے۔

خبر پڑھنے والا ہے ہی کون؟ میں بھی بھیجی نظر۔ لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے ایک لاکھ کا انعام ہے۔

"میں نے سنا ہے کہ گرل میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ یہاں اب اخبار پڑھنے والا ہے ہی کون؟ میں بھی بھیجی نظر۔" لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے ایک لاکھ کا انعام ہے۔

"میں نے سنا ہے کہ گرل میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ یہاں اب اخبار پڑھنے والا ہے ہی کون؟ میں بھی بھیجی نظر۔" لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے ایک لاکھ کا انعام ہے۔

کو کڑی سے گرل میں آگئے ہوئے اخبار کی طرف بڑھ چکا تھا اور اب اخبار کھولے شاکر کی نظر اہم کر دہ اطلاع کی تصدیق کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلد ہی اس نے اشتہار تلاش کر لیا۔ انعام کی رقم اور فن کاروں کے لیے ایک رات کھانا نظر آ رہا تھا۔

"یار شاکر! یہ گاڑی کی چابی رکھ۔ پہول کی چٹان گاڑی میں ہی رہی ہیں۔ مجھے نوکری کے لیے انتظار دینے چاہیے۔ تو صاحب سے بھانپنا دینا کہ میری طبیعت بہت خراب ہو چکی تھی اس لیے میں جلدی گھر چلا گیا۔" اشتہار کا اشتہار والا مسخرہ رول کر کے اپنے قبضے میں کرتے ہوئے اس نے غلت میں گاڑی کی چابی تلاش کر گھر میں اور ٹھوس سے کھینچ کر طرف بڑھ گیا۔

"یار! کتنی صاحب اس طرح جانے پر ناراض نہ ہوں۔" شاکر نے اسے احسان دالنے کی کوشش کی۔

"ہوتے ہیں تو جو بھائی۔ میرا خیال ضرور ہے۔" وہ خڑے بغیر جواب دے کر کڑی سے باہر نکل گیا۔ خود اس کے پاس موٹر سائیکل تھا اور اس حالت میں کوئی بیوی ابھی نہیں تھا۔ بڑی بڑی کوئیں والے چلانے سے تیز تیز چل کر نکلے ہوئے اس نے قریب واقع کمرشل ایریا کا رخ کیا۔ اس طرے میں گاڑی ٹھیک سے پڑے ہوئے تھے۔ ان ٹھیکس کے سامنے مختلف شاہک اسٹور اور دیگر دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ اسے اندازہ تھا کہ وہاں کسی دکان پر سے پبلک کال کی سہولت مل جائے گی۔ اس کا بقیہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ ایک سیٹھ بیل اسٹور پر اسے پبلک فون مل گیا۔ اس نے انڈر کھول کر اشتہار نکالا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس میں ماہ بانگواسی کی تصویر دیکھی۔

"بیٹو! یہاں سے ایک کمرے کی آواز سنائی دی۔"

"آج کے اخبار میں ایک لڑکی کی گمشدگی کے متعلق جو اشتہار چھپا ہے۔ وہ آپ نے ہی بھیجا ہے؟" کسی بھی قسم کی اطلاع فراہم کرنے سے پہلے اس نے تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔

"ہاں ہاں، اشتہار ابھی ہی لے دیا ہے۔ تم بولو، سیکرٹری کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟" دوسری طرف سے بے چارے نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بہت کچھ معلوم ہے مگر کوئی بھی اطلاع دینے سے پہلے میں انعام کی رقم کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ موٹی والا کی کوشش سے یہاں تک کا صلاسلے کرنے تک مسلسل انتظار باغ دوڑا اور اب تھا اور اب ایک طے ہو گیا تھا کہ اس کے مطابق کھنگڑا کر رہا تھا۔

"انعام کا کوئی مسئلہ نہیں۔ انعام ہمیں ضرور دے گا مگر

پہلے تم کچھ بتاؤ۔" وہاں لگتا تھا کہ کمرے کا مشکل ہو رہا ہے۔

"انعام تو ہمیں دینا ہی ہو گا لیکن میری شرط یہ ہے کہ میں انعام میں ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ روپے لوں گا۔"

اس نے اپنا سوا بیان کیا۔

"او لاہور۔" تو بہت زیادہ ہے۔" گرفت آ رہی تھی۔

"وہ زیادہ ہے تو رہے۔ میں بھی اطلاع نہیں دوں گا۔"

"اچھا اچھا۔" ایسا کر دیا پانچ منٹ مہر کر دے۔ میں مشورہ کرتے کے بعد تمہیں جواب دیتا ہوں۔" اس کی دھمکی پر وہ گھر اور جلدی سے ہوا۔

"ٹھیک ہے، تم مشورہ کرلو۔ میں پانچ منٹ بعد دوبارہ فون کرتا ہوں۔" اس نے فون بند کر دیا اور بھٹکا ہوا آگے نکل گیا۔ پانچ منٹ کا وقت انتظار یاد نہیں ہوتا لیکن اسے زیادہ تک رہا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ پانچ منٹ کے اس وقفے میں کوئی دوسری کال آجائے جو ماہ بانگو کے بارے میں اطلاع دے دے۔ آخر سہ کے بجے میں کی افراد ماہ بانگو کے صورت آ سنا تھے۔ ان میں سے بھی تو کوئی نہ اشتہار دیکھ کر فون کر سکتا تھا۔ کسی اور کے اس مختصر وقفے میں فون کرنے کے خدشے کو وہ اس تسلی کے سہارے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب صبح سے اب تک کسی نے اشتہار دیکھ کر فون نہیں کیا تو اب کون اتنی دیر میں فون کرے گا۔ آخر خدا خدا کر کے پانچ منٹ گزرے۔ اس یار اس نے ایک ذرا مکمل اسٹور کا فون استعمال کیا۔ دوسری طرف سے کال اس پہلے والے بندے سے رہے۔

"بھائی! فیصلہ کیا تم لوگوں نے؟" اس کی آواز سننے ہی اس نے اپنے لکچر ڈیوار اب دیتا ہے ہوئے پوچھا۔

"مہر میں ہی، تم لڑکی کا پتا بتاؤ۔"

"پتا جاننے کے لیے تم پانچ منٹ بعد بھائی کیٹ فون کر مجھ سے ملو۔ ساتھ میں دو لاکھ کی رقم بھی لانا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن ہم تمہیں بھیجیں گے کیسے؟" اس کی بات سننے ہی دوسری طرف سے بے چارے نے پوچھا۔

"میں نے خاکی رنگ کی چٹون پر سفید ٹھوس ہین دیکھی ہوگی اور انگوٹوں پر صوب کا پتہ بھی ہوگا۔"

خبر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے اپنا فیصلہ بیان کیا اور فون بند کر کے کال کی ادائیگی کرنے کے بعد سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے بھائی کیٹ پچھنے کے لیے اس کا لگا ہوا وقت کا اندازہ بالکل درست تھا۔ ٹیکسی نے فون سمجھنے سے بس ایک آدھ منٹ اوپر ہی اسے وہاں پہنچایا۔ ٹیکسی کا کرایہ دے کر وہ جیسے ہی بیٹھ

اترا۔ وہ بندے لپک کر اس کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ساوچی بیک تھا۔

”قسم ہی ہوتا ہمیں فون کر کے اطلاع دینے والے۔ تمہاری فرمائش پر ہم دو لاکھ روپے لے کر آ گئے ہیں۔ اب تم ہمیں لڑکی کا چاہتاؤ۔“

”بیلے رقم۔“ اس نے مطالبہ کیا جو اب اس کے ہاتھ میں بیک تھا اور لپکا۔ اس نے بیک کی زب کھول کر اندر نکالا۔ اندر رقم موجود تھی اور خاصگی محسوس ہوتی تھی۔ رقم سمیٹنے کا موقع نہیں تھا اس لیے اسے اندر آگے سر پیٹھ کرنا تھا۔

”اب چلو۔ اور ہاں، یاد رکھنا کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمارے بندے ارد گرد موجود ہیں۔ تم نے ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو ہمیں پتا چلی نہیں چلے گا کہ تمہیں کتنے والی گولی کس طرف سے چلائی گئی ہے۔“ رقم سے بھر ایک دینے والے کا لہجہ بہت سرد تھا۔ اسے اپنی بڑھ کی بی بی میں سننا سناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوتی لیکن رقم کے لیے اتنا ریسک تو لیتا ہی تھا۔

”خود کو با اعتماد ظاہر کرتے ہوئے اس نے تجھ سے ساتھ آؤ۔“ خود کو با اعتماد ظاہر کرتے ہوئے اس نے تجھ کی سے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ذرا سا فاصلہ طے کرتے ہی اسے احساس ہونے لگا کہ علاقے میں کچھ کشیدگی سی ہے۔ جگہ جگہ لوگ تو لیاؤں کی صورت میں کھڑے آپس میں باتیں کرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ اس صورت حال کو نظر انداز کر گیا۔ اسے اس علاقے میں رہنے والوں کے مزاج کے بارے میں واقفیت تھی۔ ذرا دُور اسے مشکلوں پر وہ لوگ اپنی طرح تو لیاؤں بنا کر فٹنوں آپس میں تھہرے اور بحث کر سکتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ موجود بندوں کو لے کر آگے بڑھتا گیا۔ وہ چوکے سے اس کے پیچھے چلتے رہے۔ راستے میں انہوں نے ایک پولیس موٹر گاڑی کو بھی دیکھا۔

”کوئی ٹر بوج نہیں ہے؟“ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بندوں میں سے ایک نے غراہٹ آجیوس کوشی میں پوچھا۔

”بھیر کی طرف سے تو نہیں ہے۔ اگر تم پولیس موٹر گاڑی کو کہہ دو گے تو ہوشیاری ہو۔ پولیس تو نہیں بھی آجائیں گے۔ لیکن کم از کم میں پولیس کو اس معاملے میں انوکھ کر کے دلاؤ گا۔ تمہاری رقم سے محروم ہونا پسند نہیں کروں گا۔“ اس کا جواب اپنی بڑھیت تھا اس لیے وہ لوگ خاموشی اختیار کر گئے مگر عامر کی نگاہ کے کوئے پر تھی کہ وہ خود بری طرح ٹھنک گیا۔ وہاں پولیس والوں کی انجلی خاصگی تعداد نظر آ رہی تھی۔ لوگوں کا بھی کافی جھوم تھا اور ہر چہرے پر خوف کی گہری صاف پٹی جا رہی تھی۔

”کیا ہوا بھائی، کیا معاملہ ہے؟“ جھوم میں ٹھہرتے والے ایک شاسا چہرے کو دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔ عامر

کی نگاہ کے کوئے والے گھر میں رہنے والا ایک بھڑی فرد تھا۔

”تم عامر کے دوست ہو؟“ بچا نے اس کے سوال کا جواب دینے کے، اس شخص نے اس سے پوچھا۔

”ہاں ہاں، میں عامر کا دوست ہوں لیکن آپ بتاؤ کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ یہ اتنی پولیس کیوں جمع ہے اور لوگوں کی نگاہ کے اندر کیوں نہیں جانے دے رہے؟“ اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”بہت برا حادثہ ہوا ہے بھائی۔ جس میں شاید مسموم ہو کر عامر کے پردوس والے گھر میں پناہ، پھرتے ہیں، اندر اور دوسری بار دو والی چیزیں بھی تھیں۔ چنانچہ وہاں کس طرح آگ لگی اور سارا بارود دھپت میں اٹ گیا۔ دھماکے کی آواز اتنی زورور اڑی کہ ہمارے گھروں کی کھڑکیاں دروازے میں گر کر پھٹ گئیں۔ وہ کم بخت گھوڑو تار مار گیا، ساتھ میں دوسروں کو بھی لے ڈالا۔ بے جا رہے عامر کے گھر کی دیوار تو اس کے بارود والے کمرے سے بالکل ٹٹی ہوئی تھی۔ گھر کے گھر کے ہاتھ وہاں بھی جا ہی آگئی۔ عامر کی ماں اور اس کی رشتے دار بڑا بڑا فانی لاشیں بھی ابھی ابھی پولیس والوں نے لمبے سے نکال کر اسپتال بھجوائی ہیں۔ ہمیں اگر عامر کے بارے میں کچھ معلوم ہے تو اسے ہی قیامت کی خبر کر دو۔ بے جا رہے کی ایک ماں ہی تو تھی اب وہ بھی نہیں رہی۔ مگر بھی جاہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ معلوم ہو گا تو اسے بڑا صدمہ ہو گا۔ محمد قذافی ہمارے گھر کو ہے۔ اپنے تئیں بندے مر گئے ہیں۔ لوگوں کا جو ملی نقصان ہوا، وہاں لگ ہے۔ پیچھے پورے گھر کی دیوار بھی ٹٹی گئی ہے۔ برکت خاں کے بارو بھی خاں کے گھر میں اڑ گئی ہیں۔ کئی لوگوں کے گھروں میں شیشے کے برتن وغیرہ ٹوٹ کر گر گئے ہیں۔“ وہ جانے کون کون سے نقصانات گھوڑا ہاتھ لگائیں سر ہلکا ذہن تو اپنے ہی نقصان میں لگا ہوا تھا۔ عامر کی ماں اور اس کی رشتے دار لڑکی کی بے سے نکتے والی لاشوں کی اطلاع نے خود اس کے اپنے خوابوں کو توڑ پھوڑ کر رکھا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ ان کوئے ہوئے خوابوں کا ملہ اس پر دھرا اور ہرگز اسے کسی گہری قبر میں دفن کرنا ہر ہا ہے۔ بائیں ہاتھ میں تھا تو اب ایک جس میں دو لاکھ کی رقم موجود تھی اس کی گرفت سے کچھ سا ہار ہا تھا۔ وہ جس کا سودا کر کے اس دو لاکھ کی رقم کا مالک ہوا تھا اب وہی نہیں رہی تھی تو یہ دو لاکھ بھی کیسے اس کے رہ سکتے تھے اگر لم لے کر فرار ہونا نہ لے کا خیال بھی ہے کہ رہا کر دو دنوں میں ٹھیک رہنے سر پر سیوار تھے۔

حادثات و سانحات کے شکار۔ پناہ کئی تلاش میں سرگرداں
 مادہ بلو می داستان جہت کے و فطانت اللہ مادہ بلو

پسارے سماج میں قانونوں کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بالآخر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقہ کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشویع ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سما ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بیچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانہ طبقہ سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے۔ یہ تو بس پوچھتی ہے دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرتا پڑتا ہے زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سمیع قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی ہارے ہارے جاتی ہے گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر سناٹہ نہ جاتا ہے۔ اس وقت تک ہلکوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے جسم افسر شاہی، جاگیرداروں اور پیارے محوریہ گرد گھومنا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ

تدیر کی لہروں گری قسمت کی چال بازی یا مقدر کا میل ... لے اور مچھل جانے والوں کی کہانی



دو لاکھ کی رقم سے اس نے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس رقم سے کوئی چھوٹا سونا کاروبار شروع کر کے ٹیلم کے گھر والوں کو رشے کے لیے راضی کر لے گا۔ انہیں اس کے رشے پر سب سے بڑا اعتراض تھا یہ تھا کہ وہ ایک قرائع ہے جس کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اس نوکری کے مقابلے میں وہ اگر پرچون کی چھوٹی سی دکان بھی کھول لیتا تو روایتی سی سوچ رکھنے والے ٹیلم کے والدین کے لیے قابل قبول ہو جاتا لیکن اس ناگہانی حادثے نے اس کی ساری امیدیں توڑ دی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے وہاں ہوتے والی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ پولیس والوں کے علاوہ وہاں پر آمدنی کا ذکر بھی نظر آرہے تھے۔ ایک چھوٹا سا ٹیکسٹ میڈیا کے افراد کا بھی تھا جنہوں نے پولیس کے ایک آفیسر کو گھیر رکھا تھا۔ حادثے کو کسی بھی قسم کی دوشست گردی کی واردات کے بجائے اتفاقی حادثہ

ثابت کرنے میں زور و شور سے مصروف اس پولیس آفیسر کو اس نے آسانی سے ٹھانٹ کر لیا۔ وہ بڑی ٹھوکر تھا۔ موتی والا کے بیس کا تقشیشی افسر اگر وہ اسے یہاں دیکھ لیتا تو اس کے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ رشٹل ٹھوکر سے بچنے کے لیے وہ انجمن سے باہر نکلنے کے لیے پلانا۔ اس کے سر پر سوار مسٹر کثیر فرای ہوشیار رہ گئے۔

”کدھر...؟“ ان میں سے ایک نے غراہٹ آ میز سرگوشی میں پوچھا۔

”یہاں سے گھو پھر میں تم لوگوں کو ساری بات بتاؤں۔“ اس نے انہیں جواب دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ دونوں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ عامر کے گھر سے کافی دور آنے کے بعد وہ ایک چمک آ کر رک گیا۔ ان دونوں نے بھی اس کی ہی دی کی۔

”معاذ کیا ہے؟“ یکدم سے پھوٹو۔ تم تو نہیں لڑکا



تک پہنچانے والے تھے۔ لڑکی کہاں ہے؟ صاف صاف بتاؤ۔ "ان لوگوں کے صبر کا پیمانہ جتنا بڑا ہو چکا تھا دیکھنا چاہتا تھا میں سے ایک نے درشت کچھ میں پوچھا۔

"میں نہیں لڑکی کے پاس ہی پہنچا رہا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا ہے۔ اب میں نہیں اس کے بارے میں صرف خبر دے سکتا ہوں۔" تم نے اپنے اشتہار میں لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے وہ لاکھ کا اعلان کیا تھا۔ میں ان روپیوں میں سے تمہیں ایک لاکھ دلوں کر کے ایک لاکھ رکھ لیتا ہوں اور لڑکی کے بارے میں خبر دے دیتا ہوں۔" عاصم کی گلی کے کونے سے یہاں تک پہنچتے ہیں اس کے دامخ نے تیزی سے کام کیا تھا اور پوری کی پوری رقم سے محروم ہو جانے کے بجائے اس نے سوچا تھا کہ کچھ تو کچھ تو بچھ لگ ہی جائے اس لیے اب وہ ان لوگوں سے نیا سودا طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا تاکہ لگا رکھا ہے مالے! ہمیں تو نے کیا سمجھا ہے جو اپنے اشاروں پر پھانے کی کوشش کر رہا ہے؟" اس کے مقابل موجود لوگ کوئی شریف قسم کے کاروباری بندے تو تھے نہیں اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق سودے بازی کرتے چلے جاتے۔ وہ خوراکی تھے سے اکھڑ گئے اور ان میں سے ایک نے اس کی کدلی کو اپنے شانے میں لپیٹ لیا۔ "چل، سیدھی طرح نہیں لڑکی تک پہنچاؤ۔" وہ جہاں کھڑے تھے اس طرف لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی اس لیے سامنے کھڑے بندے نے پانچ گھنٹہ اس کے منہ پر اپنا منصوبہ جیسا ہاتھ دے مارا۔

"اب میں نہیں لڑکی تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں اپنا ایک لاکھ کا نقصان کیوں کرتا؟ میں مجبور ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے ایک لاکھ واپس لے لو اور ایک لاکھ چھوڑ دو۔ بدلے میں، میں تمہیں تمہارے کام کی بات بتا دیتا ہوں۔" اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ خطرناک لوگ ہیں لیکن پھر بھی ایک لاکھ کی خاطر خطرہ مول لے کر ان سے کسی نہ کسی طرح معاملہ چلانے کے چکر میں تھا۔

"مجھ سے کیا لیتا ہے اور کیا دیتا ہے۔ یہ فیصلہ ہم خود کریں گے۔ تو سیدھی طرح یہ بتا کہ لڑکی کہاں ہے؟" بڑی بڑی مونچھوں والے نے اپنی سر داٹھوں سے اسے ٹھوکتے ہوئے سوال کیا اور جب میں ہاتھ ڈال کر ایک چاقو باہر نکال کر اسے کھولنے لگا۔ کرکڑی انت کی بجلی کی آواز کے ساتھ چاقو کھل گیا اور اس کا چمک دار پھل اس کی نظروں کے سامنے لہراتے لگا۔ اس چاقو کے نگارے کے بعد سر کی ساری ہمت جواب

دے گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے مزید نہیں بک کے چاہتا ہے۔ ہونے لکھ میں بتانے لگا۔ "تمہیں جس لڑکی کی تلاش تھی، وہ میرے ایک دوست عاصم کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں تمہیں اپنے دوست کے گھر لے جا رہا تھا لیکن ابھی میرے ساتھ تم لوگوں نے بھی سنا ہوا کہ ہارورٹش پڑوسی کے گھر میں ہونے والے دھماکے سے میرے دوست کا گھر بھی تباہ ہو گیا ہے اور میرے دوست کی ماں کے ساتھ ساتھ وہ لڑکی بھی اس حادثے میں مر گئی ہے۔" اس کی دلی گہی اس اطلاع پر وہ لوگ ایک چمپے کے لیے دم پر خورہ گئے پھر بڑی مونچھوں والے نے خود کو سنبھالا اور چیخ سے پوچھا۔ "لڑکی وہاں کیسے پہنچی تھی؟"

"میں نے خود اسے وہاں پہنچایا تھا۔ میں موتی والا صاحب کا ڈرائیور ہوں، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہیں اپنے گھر میں لڑکی کی جان کے لیے خطرہ محسوس ہو رہا ہے اس لیے میں اسے کسی محفوظ جگہ رکھنے پر مجبور ہوں۔ ان کے گھر پر ہی میں نے اس رات جب ان کو مل ہوا، تب لڑکی کو اپنے دوست کے گھر پہنچا دیا تھا۔ اتنے دنوں سے ہم لوگ پریشان ہو رہے تھے کہ اب لڑکی کا کیا کر رہے ہیں؟ میں نے اشتہار میں اشتہار پڑھا تو پیسوں کے لالچ میں آ کر آپ کو فون کر بیٹھا لیکن اب وہ بے چاری ہی زندہ نہیں رہی تو آپ کو کہاں پہنچاؤں؟" حق میں بھوت کی آمیزش کرتے ہوئے اس نے ان لوگوں کو بتایا۔ یہ سب کہنے میں اسے اس لیے مشکل پیش نہیں آئی تھی کہ عاصم کے شہر یا رے ملاقات کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ لوگ یہ کہانی تیار کر چکے تھے۔ سہ۔ اس حقیقت کو کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ موتی والا اور اس کی بیوی کے کل والی رات وہ ان کی گھنٹی میں چوری کی نیت سے موجود تھا۔ اس لیے یہ کہانی تیار کی تھی۔ ماہ یا تو نے بھی اس کہانی کی منظوری دیتے ہوئے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کسی کو اصل حقیقت نہیں بتائے گی۔ چنانچہ اس وقت یہی کہانی اس کے کام آ رہی تھی۔

"تو ہمیں کہیں نہیں پہنچا سکتا۔ تو چل بھٹک کھا یہاں سے۔" ان روپیوں میں سے مجھے ایک ڈیڑھ بھی نہیں ملے گا۔" یہ جان لینے کے بعد کہ مرنے والی لڑکی واقعی ماہ یا تو ہے اور سرخاب مزید ان کے لیے کام نہیں آ سکتا، انہوں نے اس کی کمر پر ایک زوردار لٹ مار کر اسے پے دھکیلا اور دونوں سے پھرا ہوا ایک سنبھال کر وہاں سے چل پڑے۔ سرخاب کے اندر ہمت نہیں تھی کہ ان خوں خوار لوگوں کے پیچھے جا سکتا۔

۵۶ ۵۷ ۵۸

پہلے سے نکلنے والی دونوں عورتوں کی لاشیں بری طرح سبک ہو چکی تھیں۔ ایک تو بے جا اور جھٹ کے کرنے والے لیے لے دونوں کے جسم بری طرح توڑ پھوڑ ڈالے تھے، دوسرے بری لاشیں کھسک رہی تھیں۔ لگنے والی آگ سے پوری کر دی تھی۔ لاشیں تقریباً ناقابل شناخت ہو چکی تھیں۔ ان کی پہچان کے لیے وہ وقتا دم اور کبھی کبھیں لباس کے بچ جانے والے چھوڑوں سے مدد کی گئی تھی۔ شناخت کا مرحلہ اتنا زیادہ دشوار اس لیے نہیں تھا کہ یہ تو بھٹی طور پر معلوم تھا کہ گھر میں موجود خواتین کون تھیں۔ بس ان دونوں خواتین کی لاشوں میں سے ایک بوجھی عورت اور ایک جوان لڑکی کی لاش کو الگ الگ کرنا تھا۔ تو یہ کام بہ آسانی کر لیا گیا تھا۔ عاصم نے واپس لاہور پہنچنے کے بعد دونوں لاشوں کی شناخت کے سلسلے میں تعذر برقرار کر دی تھی۔ ماہ یا تو کی لاش کی سب سے بڑی پہچان اس کی سیاہ چادر کے وہ چھوڑے تھے جو وہ ہر وقت اوڑھتی رہتی تھی اور مرنے وقت بھی وہ اس کے جسم کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ اپنے گھر پر گزرنے والی اس قیامت کی اطلاع عاصم کو عبد اللہ انان سے ملی تھی۔ عبد اللہ انان سے مل کر اس نے ماہ یا تو کی اپنے گھر موجودگی کی اطلاع دی تھی تو وہ اس اطلاع پر فوراً متحرک ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے لاہور رانا ہاؤس میں میجر شہر بار کو اس بارے میں بتایا تھا اور پھر اس کے مشورے پر ریشم کھوکھر کو یہ فونے داری سونپی تھی کہ وہ عاصم کے گھر جا کر ماہ یا تو کو اپنی تحویل میں لے لے لیکن جواباً ان گھنٹے بعد ریشم کھوکھر نے جو اطلاع دی تھی، وہ بہت اندوہناک تھی۔ غیر قانونی طور پر آبادی کے مین درمیان میں بچے کر ہارودی اشیاء کا کاروبار کرنے والے گلوں کے بارودی ذخیرے میں نکلنے والی آگ نے کچھ سمیت عاصم کی ماں اور جواں سال ماہ یا تو کی زندگیوں بھی ختم کر دی تھیں۔

اس حادثے کے بارے میں اطلاع ملنے ہی عبد اللہ انان نے مشاہیرم خان کے ساتھ عاصم کو لاہور بھگانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ عاصم مشاہیرم خان کے ساتھ سید حامد دہ خاں پہنچا تھا اور دوپٹی پر موجود ایک پولیس مین کے سامنے اس نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ لاشیں اس کی ماں اور ماہ یا تو کی ہیں۔ شناخت کا مرحلہ طے ہونے کے بعد لاشیں دھوا کے گولے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اپنی ماں کی لاش کو عاصم اپنے ساتھ لے گیا تھا جبکہ ماہ یا تو کی لاش کو ایچو پلٹس میں چھپا دیا گیا تھا کہ وہاں کے سر جانے کے بعد اب اس بات کو چھپانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی کی کہ وہ گاؤں سے نکلنے کے بعد موتی والا کی گھنٹی میں

خواب

ایک اور شہر نے لئیالیالی معالج کو بتایا کہ وہ ہر رات کو یہی خواب دیکھتا ہے۔ وہ بارہ خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ ایک ایران جزیرے میں رہ رہا ہے اور اس خواب سے اس کی زندگی ابھرن ہو کر رہ گئی ہے۔ نفسیاتی معالج نے کہا۔ "نمیری کبھی نہیں آتا کہ ایسا برفلف خواب دیکھنے سے آپ کی زندگی کیسے ابھرن ہو سکتی ہے؟"

زن میرے شہر بولا۔ "برفلف کہاں خاک...! میں پوچھتا ہوں آپ نے بھی بارہ لڑکیوں کے لیے کھانا پکا یا ہے۔"

عملی مظاہرہ

ایک دوڑیں پھاؤں کا پڑی ایک شراب خانے میں آیا اور بارہ تینڈر سے کیتے لگا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہیں ایک کنگ کے معاملہ کی ضرورت ہے جو تیار ہو یا خیر اسے قتل کرے۔" ضرورت تو بڑی شدید ہے، تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ بھی ہے؟" بارہ تینڈر نے پوچھا۔

"تجربہ تو کوئی خاص نہیں لیکن میں ملی مظاہرہ کر کے دیکھا سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر کنگ کے یہ معاملہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مست شرابی کا آدی لون پر کسی کو گالیاں دے رہا تھا۔ کنگ کے لئے کمرے میں جا کر اس شخص کو دوپٹا اور اس احتجاج کی پرہیزگارے شراب خانے سے باہر پھینکا دیا اور قاتلات انداز سے حکومت ہوا لوٹ کر گئے لگا۔

"عملی مظاہرہ پھینکا گیا؟"

"بہت خوب۔" بارہ تینڈر نے کہا۔ "مگر تمہاری گنجائش نہیں پاس ہے لگتی پڑے گی۔"

"ہاں کہاں ہے؟" بد معاملہ نے پوچھا۔

"جتنے گھارے چھپکے آتے ہو وہی اس بار کا مالک ہے۔"

چمکی ہوئی تھی اور موتی والا نے ازخود اسے اپنے ڈرائیور سہرہ کی مدد سے کسی خطرے کے پیش نظر اس کے دوست کے گھر منتقل کر دیا تھا۔ موتی والا کی اسی رات موت سے اس بات کی تصدیق ہوئی تھی کہ واقعی اس کی گھنٹی میں کوئی خطرہ موجود تھا لیکن نہیں سے بہت سی کینیاں اور قس آریاں بھی جسم لے رہی تھیں۔ ماہ یا تو کا موتی والا نے کیا منتقل تھا؟ وہ اپنے گاؤں سے کیوں بھاگی تھی؟ وہ موتی والا کی گھنٹی تک کیسے پہنچی تھی؟ اس کی جان کو کس سے خطرہ درپیش تھا؟ موتی والا اس کی بیوی کو کس نے قتل کیا؟ ماہ یا تو کی اس حادثے میں موت ہوئی، وہ واقعی کوئی حادثہ تھا یا کسی نے اس کے قتل کے

لے یا قاعدہ منصوبہ بندی کی تھی؟ بے شمار سوالات تھے جو اٹھائے جا رہے تھے لیکن وہ تمام افراد جن کو اس معاملے کی ذمہ داری ٹھیک تھی، اپنے ہونٹ بپھٹے تھے۔ ان افراد میں شہر یا رہی شامل تھا۔ رقیق حکو کے کسی گہنی حقیقت کے نتیجے میں اسے اس بات کا تو یقین ہو گیا تھا کہ ماہ بانو کی موت کے پیچھے کسی دشمن کا ہاتھ نہیں اور اس کی موت یقینی طور پر ایک اتفاقی حادثے کے نتیجے میں واقع ہوئی ہے لیکن اس کی موت نے اسے بہت رنجیدہ کیا تھا۔ وہ اسپتال سے دس بجائے ہونے کے بعد ان دنوں رات باؤس میں کچھ عرصے آرام کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا۔ جیسے ہی اسے حادثے کی اطلاع ملی، اس نے اپنی ممانی سزا آفرین کے روکنے کے باوجود رات پس کا فیصلہ کر لیا اور اب ماہ بانو کی لاش کو لے جانے والی ایسیو بیس کے ساتھ ساتھ اس کی گاڑی بھی دوڑ رہی تھی۔ گاڑی کو مشاہدہ خان چلا رہا تھا۔ وہ خود اس حادثے پر بہت رنجیدہ تھا۔ وہ لڑکی جس کی زندگی بچانے کے لیے اس کے دوست نے اپنی جان کی قربانی دی تھی، وہ اس طرح سر کی تھی تو اس کے لیے بھی دکھ کا مقام تھا۔ شہر یار کے چہرے سے البتہ اس کی اندرونی کیفیت کا صحیح طرح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ بالکل چپ تھا اور اس کے پیچھے پر گہری تنہید کی پھانی بولی تھی۔ اس نے لاش کی شناخت ہانے والے نیلے پھولوں والی سیاہ چادر کے ٹکڑوں کو ضرور ملاحظہ کیا تھا لیکن لاش کا چہرہ دیکھنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ شاید وہ بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ یہ خواہش بے سود ہے۔ مرنے والی اینٹوں کی ضرب اور آگ کے شعلوں سے مس ہو جانے والے چہرے کو دیکھ کر سوائے تکلیف کے حاصل بھی کیا ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ چلتی اس کی گاڑی اور ایسیو بیس اس کے دفتر کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ وہ اپنے دفتر پر رک گیا تھا جبکہ ایسیو بیس کو ابھی چھڑا دیا کہ کاسٹرے کرنا تھا۔ دفتر میں عبداللہ انان نے اس کا استقبال کیا۔ وہ خود بھی اس حادثے سے متاثر لگ رہا تھا۔

”کیا حال ہے... سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟“

اپنے دفتر میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے عبداللہ انان سے دریافت کیا۔

”میں سراسر اچھی صحت از لائق۔ یہاں کے معاملات کے بارے میں، میں آپ کو فون پر مطلع کر رہی رہا ہوں۔ ایس بی کے نوٹس کی کمی کہ اسے ایس آئی اور کاسٹیل کے کل والے معاملے پر کوئی اٹھ کھڑا کر سکے لیکن دشمن سپاہیوں کے بیانات کی وجہ سے اسے موقع نہیں مل سکا۔ کچھ ڈی آئی کی صاحب کی مداخلت کی وجہ سے بھی اسے دینا پڑا۔ آپ

بتائیں، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ دفتر ٹھیک تو ہے نا؟“

عبداللہ انان نے بھانپ لیا تھا کہ شہر یار کی خاموشی کے پیچھے بہت بڑا طوفان چھپا ہوا ہے لیکن انہوں نے اسے چھپانے کے بجائے ٹھیکو کو اس کے سوال کا جواب دینے اور اس کی خیریت پوچھنے تک محدود رکھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اسی لیے پہلی ختم کر کے فوراً واپس آ گیا ہوں۔ اب ہمیں بہت تیزی سے اپنے سارے منصوبوں پر کام کرنا ہوگا۔ میں اس بات کا بندوبست کر کے آیا ہوں کہ کم از کم اسکول اور صحت کے مراکز کی تعمیر میں ہمیں کسی قسم کی مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پھر آباد والے اسکول کا کام تو کس تکمیل ہی ہونے والا ہوگا۔ اسکول مکمل ہو جائے تو اس کے افتتاح اور سرگزشت کا سبک بنیاد رکھنے کے کام ایک ساتھ انجام دے دیے جائیں گے۔“ اس نے تفصیل سے اپنے منصوبے کو بیان کیا۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے سراسر ان منصوبوں پر جتنی جلدی عمل درآمد کیا جائے اچھا ہوگا۔ اچھی حال ہی میں میرا پادش ایک لڑکی بد وقت میں امداد ملنے کی وجہ سے مری ہے۔ لڑکی کا نام گجرا تھا۔ وہ ماہ بانو کی بڑی بہن تھی۔ بے چارے غریب لوگوں پر آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ آگے پیچھے وہ جہان لڑکیاں اپنی جان سے بچتی ہیں۔“ روانی میں عبداللہ انان مٹھی سے ماہ بانو کا ذکر پھیر بیٹھا۔ یہ ذکر سن کر شہر یار ہل بھر کر چپ ہوا اور پھر میز کی دراڑ میں ہاتھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔

”اس طرف کی خبر خیر لے لیتا عبداللہ انان امداد لین کے سلسلے میں یا کسی اور معاملے میں ان لوگوں کو کوئی ضرورت ہو تو ان کی مدد کر دیتا۔“

”او کے سرا میں خیال رکھوں گا... اور کوئی حکم؟“

ہدایت کے جواب میں اس نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ میں نے سوچی والا ہے۔ دیکھیں، بات کر لی ہے۔ بورڈ کے تینوں وکلاء نے بڑے اسپتال کے بجائے چھوٹے ہیلتھ یونٹس کے قیام کی منظوری دے دی ہے۔ کل تم ہمارے منصوبے کی تمام تفصیلات کا افتتاح تیار کر لیتا۔ میں ایک آجہ دن میں بورڈ کے ممبران، انجینئر اور کنٹرکٹر وغیرہ کی ایک میٹنگ ارٹج کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ اختراعات کا نتیجہ لگا کر باقاعدہ کام کا آغاز کیا جاسکے۔“ وہ ایک ہار پھر ٹھیکو کا موضوع بدل گیا تھا۔

”ٹھیک ہے سراسر میں کل دوپہر تک یہ کام تمنا لوں گا۔“

اس بار عبداللہ انان نے بھی احتیاط سے کام لیا اور ایسا کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا جو اس موضوع کو چھپانے کا سبب بنے جس سے وہ واضح طور پر کر پڑ کر نہ ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

۲۶ ۲۷ ۲۸

چودھری افتخار الدینی ٹولی میں سرخاے بیٹھا تھا۔ ماہ بانو کی موت نے ساری بازی ہی اٹل دی تھی۔ وہ جس تکلیف بدن کو اپنی دسترس میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ اسے اس سے پہلے موت نے اپنے ٹھپنے میں دبوچ لیا تھا۔ وہ جو خدمت کا ہر کارہ بنا لوگوں میں موت بانٹا پھرتا تھا، جس کے حکم سے اس کے کارندے کوں میں اس کے دشمن کی زندگی کا چراغ گل کر دیتے تھے، خود موت کے ہاتھوں شکست کھا گیا تھا۔ اب چاہے وہ دنیا الٹ کر رکھ دیتا لیکن ماہ بانو اس کے ہاتھ نہیں آنے والی تھی۔ ماہ بانو کو حاصل کرنے کے اس کے سارے دھوے دھوے کے دھوے روکے تھے۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس صورت حال سے دوچار ہوگا۔ بالے کی طرف سے یہ اطلاع ملنے پر کہ اشتہار کے نتیجے میں ایک شخص کی طرف سے کال آئی ہے کہ وہ لڑکی کے ٹھکانے سے واقف ہے اور وہ شخص روا لکھ کے عوض انہیں اس ٹھکانے تک پہنچا سکتا ہے، وہ خوشی سے اٹھ پڑا تھا اور فوری طور پر روا لکھ کی اداکاری کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ روا لکھ اس کے لیے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس معمولی رقم کے بدلے اسے نہ صرف ماہ بانو مل جاتی بلکہ وہ شہر یار کو بھی شکست سے دوچار کر دیتا لیکن جب بالے کی طرف سے اگلی خبر آئی کہ ماہ بانو ایک حادثے کے نتیجے میں ہلاک ہو گئی ہے تو اس کا دماغ بھگ سے اڑ گیا۔ وہ فون پر ہی بہت دیر تک بالے پر کرتا اور اسے گالیاں دیتا رہا لیکن اس سب سے کیا حاصل ہوا تھا؟ حقیقت تو یہ حال، اچھا جگہ موجودگی جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”غیاٹے کی لڑکی کی لاش کتنی مٹی ہے سرکار! ابھی ابھی ایک بندہ خبر لے کر آیا ہے کہ لاہور سے ایسیو بیس لاش لے کر آئی ہے۔ کہتے ہیں لاش کی حالت بڑی خراب ہے۔ ایک آدھ بندے نے ہی چہرہ دیکھا ہے اور دیکھ کر کان بڑھ لیے ہیں۔ غیاٹے کی برادری کے بزرگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب کسی کو لاش کا چہرہ نہیں دیکھنے دیں گے۔ سنا ہے نوران بڑی ترپ رہی مٹی اپنی دھمی کے چہرے کو دیکھنے کے لیے لیکن گورنر نے اسے بڑھ کر قابو میں کر رکھا ہے اور اسے لاش کے قریب نہیں جانے دے رہے ہیں۔ لاش کو گھنٹن تو لاہور سے چھاپنا کر گیا گیا ہے، یہاں قبر تیار ہوتے ہی اسے دفن بھی

دیں گے۔ "مثنیٰ اللہ رکھا اجازت لے کر اندر آیا اور چودھری کو متصل رپورٹ سنائی۔

"تو تھیں کے بعد خوشی سے غیبت محمد کے گھر کھانا بھجوا دینا اور اس سے کہنا کہ مجھ سے آکر ملے۔" مثنیٰ کی ساری بات سننے کے بعد اس نے اسے حکم دیا۔

"بہتر چودھری صاحب امیں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ غیبت محمد تو خوش ہو جائے گا کہ آپ نے اسے معاف کر دیا ہے۔" مثنیٰ خوشامدی لے لیتے ہوئے ہوا۔

"میں نے غیبت سے کہا تھا کہ اس کی دینی زندہ یا مردہ کسی بھی صورت میں مجھے ملے گی، تب ہی اس کی خلاصی ہوگی۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنی بات پوری کروں۔ ویسے بھی اس معاملے میں مجھے اصل حساب غیبت محمد سے نہیں، دوسروں سے لینا ہے۔ غیبت محمد کی کیا حیثیت ہے کہ میرا اس سے کوئی حساب کتاب ہے۔ حساب تو ان کو دینا ہوگا جو دوست ہیں، مگر پیچھے سے مثنیٰ نبھاتے رہے ہیں۔ مولیٰ والا کا معاملہ تو بالکل چل کر سامنے آگیا ہے۔ جس بندے نے ہاتھ لگا دیا وہ ان کے بارے میں خبر دی تھی اس نے بھی یہی بتایا ہے کہ وہ اتنے دنوں سے مولیٰ والا کے گھر چھپی ہوئی تھی۔ وہاں اسے کس نے پکڑا یا میں اس کی طرح سمجھ گیا ہوں۔ مولیٰ والا تو پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے، اب میرے اس دوسرے دشمن کو بھی حساب دینا ہوگا۔ میں اسے چھوڑوں گا چرگز نہیں۔ اسے پتا چل جائے گا کہ اس نے چودھری افتخار عالم شاہ سے بھر لیا تھا۔" چودھری بہت غضب میں تھا۔ مثنیٰ جانتا تھا کہ اس کے غصے کا رخ کس کی طرف ہے۔ چنانچہ اپنی تنگ خواری جتانے کو بڑے جوش سے ہوا۔

"آپ گھر نہ کریں سرکار! آپ کی آن پر ہم سب اپنی جانیں بچاؤں گے۔ آپ بس صرف اشارہ کر دیں پھر دیکھیں گے کہ آپ کے دشمن کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

"ابھی کچھ نہیں کرنا۔ ابھی جو میں نے اس بچوگلے کو پہلا سبق دیا ہے، اس کا نتیجہ سامنے آنے دے۔ میرے خیال میں تو جس ماسے کی گود میں پینہ کر وہ مجھ سے کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ دانا خود ہی اسے بھجوا دے گا کہ چودھری افتخار سے کھیلنا بچوں گے بس کی بات نہیں۔ اگر وہ اپنے ماسے کی بات سمجھ گیا تو اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ میں تھوڑی بہت چوٹ دے کر اسے معاف کروں گا لیکن اگر وہ نہیں سمجھا تو پھر سامنے اگلے پچھلے حساب دینے ہوں گے۔" چودھری کا عجیب حال تھا۔ ایک طرف اس کا دل چاہتا تھا کہ ہاتھ بانو کو خود سے چھین لینے کے جرم میں شہر یار کے گھر سے گھرے کر ڈالے

مگر پھر اس غصے پر مصلحت پسندی حاوی ہو گئی اور وہ سوچتا کہ براہ راست تصادم کے بغیر ہی کسی طرح بات بین جائے تو اچھا ہے۔ شدید غصے کے ساتھ ساتھ اپنے مفادات کے تحفظ کا خیال اسے کسی ایک فیصلے پر نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔

"جیسا آپ حکم دیں گے ویسا ہی ہوگا سرکار! ہم تو آپ کے نیک خوار اور حکم کے غلام ہیں۔ آپ کی خوشی جس میں ہوگی، ہم وہی کریں گے۔" مزاح شاس مثنیٰ نے ایک بار پھر اسے مطمئن کیا۔

"ٹھیک ہے اے! مجھے معلوم ہے تم لوگوں کی وفاداری کا۔ اب چاہیوں سے اور جو میں نے کہا ہے وہ کر۔ میں بھی اب تھوڑی دیر آرام کروں گا۔" مثنیٰ کی خوشامدی کے جواب میں خوش ہونے کے بجائے اس نے اسے پھٹکار سے نوازا۔ اس کا موڈ اچھ کھ کھٹی چپ چاپ باہر نکل گیا۔

چودھری اپنے شان دار پیڑ پر آگیا۔ ٹھیکے کے نیچے اب بھی ماہ بانو کی تصویر بنی رہی تھی۔ اس نے تصویر میں نکالیں اور ایک نظر دیکھنے کے بعد کمرے سے نکلے۔ وہ کوئی اس کے حلق میں جھانک رہا تھا کہ تاہم ان تصویروں کو اپنے سینے سے لگا کر کھنڈی آجیں بھرتا رہتا۔ یہ تصویریں تو اس نے اپنا آتشیں شوق بھرا کے لیے منبھال دی تھیں۔ تصویروں کو دیکھ کر وہ اس تصویر سے ٹوہو بھگتا رہتا تھا کہ جب یہ برقی کی طرح قلابیں بھرتی، چاندی جیسی رحمت اور ترشے ہوئے بدن والی لڑکی اس کی خلوت میں آئے گی تو وہ کس طرح اسے برے کرے گا۔ اب جبکہ یہ امکان ہی سرے سے ختم ہو گیا تھا تو تصویر کی دنیا سارے کھینچنے کی کیا ضرورت تھی؟ دل بھلانے کے لیے اس کے پاس اور بھی بہت ذرائع تھے۔ تصویروں کے ٹکڑے کرنے کے بعد وہ ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی اٹھیاں حُسن کی دکان چلانے والی اس ہانکا کا نمبر ڈائل کر دی تھیں جو اس کے ذرا سے اشارے پر ایک سے زیادہ کر ایک ہیرا نقی کر اس کے قریب سے پر ہوا دیتی۔ ہاتھ بانو کا کم نالہ کرنے کے لیے اس کی عیاشی فطرت نے اسے یہی راہ دکھائی تھی۔

شہر یار نے طائرانہ نظروں سے مہر و فہم عمل مرادوں کا جائزہ لیا۔ وہ بہت تیز دلی سے اسکول کے قریب شدید کر دیں میں رنگ و روغن کا کام کر رہے تھے۔ کام کی رفتار بے حد سلی بخش تھی اور اسے امید تھی کہ وہ دوں بعد جب اسکول کی اختتامی تقریب منعقد کی جائے گی تو نہ صرف سارا کام مکمل ہو چکا ہوگا بلکہ کچھ کھانڈ سمیت کرماتی و غیرہ بھی کر دی

جائے گی۔ اپنے اسی خیال کا اظہار اس نے ساتھ کھڑے ماسٹر آفتاب سے بھی کیا۔

"کام تو بہت اچھے طریقے سے ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں دو دن تک سارا کام مکمل ہو جائے گا۔"

"دو دن نہیں سر! انشاء اللہ کل شام تک دیکھ اور من اور مٹائی کا کام مکمل ہو جائے گا۔ برسوں پہلے اسکول کے لیے ڈسٹینکشن اور میزبیں کرسیاں بھی پہنچ جائیں گی۔ بیچے کی کلاسوں اور فرنیچر وغیرہ کے خیال سے بڑے خوش ہیں۔ اس وقت ان میں اتنا جوش بھرا ہوا ہے کہ باقی کے سارے کام ہم ان کی مدد سے ہی مکمل کر دے گے۔" ماسٹر آفتاب کی اپنی آواز میں بڑا جوش تھا۔

"فرخ پھر؟" میں نے تو اس سلسلے میں کوئی آواز نہیں دیا تھا۔ کیا عبداللہ انان نے اسکول کے لیے فرنیچر کا انتظام کیا ہے؟

"نہیں سر! اصل میں، میں نے خود ہی فرنیچر کے لیے آرڈر دے دیا تھا۔ اپنی کتاب کی اشاعت کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتا ہی تھا، بس اسی کی راتیں کا چیک ملا تھا تو میں نے سوچا کہ اس رقم سے اسکول کے لیے فرنیچر کا انتظام کر دیا جائے۔" ماسٹر آفتاب نے شرماتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"آئی الیم براؤ آف یو آفتاب! اتنے سارے بے ایمانوں اور تیروں کے درمیان تم بیٹے غصے کو دیکھنا ہوں تو میرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور کچھ کر دکھانے کی انگلی سے سر سے جاگ اٹھتی ہے۔" اس نے بے ساختہ ہی آفتاب کے شانے کو کھینچتے ہوئے اس کی کار کردہ کی گوراما۔

"میں تو اپنے گھر کا قرض انجام دینے کی کوشش کرتا ہوں سر۔ بس خوشی اس بات کی ہے کہ آپ جیسے قدردان شخص کا ساتھ میسر آگیا ہے۔ اختتامی تقریب کے لیے میں نے اپنے ساتھی نیچر کے ساتھ مل کر کچھ منصوبہ بندی کی ہے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ اس پر آپ سے رائے لے لوں تاکہ کوئی کی کمی نہ ہو۔" آفتاب نے جاہزی سے جواب دیتے ہوئے کھٹکھٹا کا رخ دو دن بعد ہونے والی تقریب کی طرف موڑ دیا۔

"مجھے اس سلسلے میں تمہاری صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔ ظاہر ہے، ہر طرح کی تیار اور مشاہدہ بہت وسیع ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایسے مواقع پر کس قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں لیکن اپنی نسل کے لیے چاہو تو مجھے بتا سکتے ہو۔"

"میرا مشاہدہ اور تجربہ اپنی جگہ لیکن یہاں جو انتظامات کیے گئے ہیں، وہ اپنے جیت کو اپنی دستاویز سہولیات کو سامنے رکھتے ہوئے محدود دیکھنے پر کیے گئے ہیں۔ میں نے اس

بات کا انتظام کر لیا ہے کہ اسکول کی قیادت، ڈپٹی ہڈی کے اور گردے علاقے اور سچ بکے داخل راستے پر کھڑے رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جائیں۔ خاص خاص راستوں پر ہم چونا ڈال کر اسے صاف کرنے کا انتظام بھی کر لیں گے۔ بچوں کی مدد سے پھوٹا سارا نئی ٹوکی رانچ کر لیا جائے گا۔"

"اس طرف سے تم نے فکر نہ ہو، آخر یہ چودھری افتخار کس مرض کی دوا ہے؟ یہ مارا انتظام اس کے خربے پر ہوگا۔"

"چودھری صاحب اس سلسلے میں تعاون پر راضی ہو جائیں گے، وہ تو سخت خلاف ہیں اسکول کے۔" ماسٹر یار کی تسلی پر اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

"خالتہ اپنی جگہ ہم نہانے کا موقع اپنی جگہ اس طرف سے فارغ ہو کر میں چودھری کی طرف ہی جاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ انفرادی پیشگی کرے گا کہ آنے والے مہمانوں کی خاطر ملاقات اس کی دلی میں کی جائے۔ باقی درخواست کی طرف سے بھی تم فکر نہ مت ہو۔ آرام سے خرچ کرو اور سارا حساب کتاب چیک کر مجھے دے دو۔ اس خرچے کی وصولیابی میں اس موبائل فون کے مالکوں سے کروں گا۔ سرکاری فون میں پرانی کھیتی کا ہزار غصہ کرنے کے سلسلے میں ان پر جو حساب کتاب بنتا ہے وہ الگ ہے، میں ایک دوسرا گھنٹا اسٹیج پر ان کی کھیتی کا یہ لکھ کر رکھواؤں گا۔ انہیں معلوم ہی ہے کہ یہ کس اہم کام کا ذریعہ ہے۔ موبائل فون والے خوشی سے اس بات پر راضی ہو جائیں گے کہ انہیں ہنر کا گواہ بدلتے ہیں۔ ہمیں غل غل کر رہا کر دیں۔ آخر اس تقریب کی گورننگ پرسنٹ اور ایگزیکٹو انک وہوں طرح کے میڈیا پر ہوتی ہے۔ موبائل فون والے اپنی بیٹی کا یہ موبائل بزرگ بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔" ماسٹر یار کے غصے کا جواب سے اسے اندازہ ہوا کہ اس کا ہوم ورک بالکل مکمل ہے۔ کیوں نہ ہو۔ آخر گو وہ ایک ہیڈ کریم تھا جس کی ہر دوش پور کر لی اور سیاست کے دو آئینہ ماحول میں ہوئی گی۔

"یہ تو بہت اچھی خبر غانی آپ نے سنا اب آپ دیکھیں گے کہ تقریب کا کتنا اچھا انتظام کرانا ہوں میں۔" وہ حسب عادت پر جوش ہو گیا۔ پھر ایک طرف دیکھتے ہوئے ہوا۔ "لیجئے، وہ لوگ بھی ابلیس آگئے۔" ماسٹر یار نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی جانب ہی دوزخ ہوئی آنے والی گاڑی اس کے اپنے دفتر کی تھی۔ اس گاڑی میں عبداللہ انان، آفتاب کا ساتھی نیچر شیب اور وہ عجیبے دار سوار تھا جس سے ملازمت کی تقریر کے سلسلے میں ان لوگوں کا کثیر ذکر ہوا تھا۔ دواگ اس پرانی اچھتری کا جائزہ

لیے مجھے تھے جسے وسعت دے کر مرکز صحت کی نئی اور جدید قمارت تعمیر کی جانی تھی۔

”ڈاکٹر شکیل کی عمارت تو پوری خراب حالت میں ہے۔ ایک تو کچھ بھال بیچ طرح نہیں ہوئی، دوسرے عمارت میں بیٹر مل بھی اچھا نہیں لگا ہوا اس لیے ٹیکہ جگہ یادوں میں دراز میں پڑی ہوئی تھی۔ صحت کی حالت بھی ایسی ہے کہ مجھے یقین ہے بارشوں کے موسم میں صحت بری طرح چٹکتی ہوگی۔ اگر آپ میرا مشورہ مانتے تو اس پرانی عمارت کو بلڈ وکر کے مکمل نئی عمارت بنائی جائے تاکہ کام کام ہو۔“ گامزنی ان کے قریب آکر کڑی تو ہلکے دار کا زخمی سے اتارے ہی پولا شروع ہو گیا۔

”نچیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ میرا اپنا بھی یہی اندازہ تھا اسی لیے میں نے آپ کو قاضی طور پر وہاں ورت کے لیے بھیجا تھا۔ آپ نے اپنی نظروں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے، اب اس کے مطابق تیار ہی شروع کر دیں۔ جزل صاحب کے ہاتھوں سبک بنیاد رکھے جانے کے بعد کام کا باقاعدہ آغاز کرنا ہو گا اور تیزی سے اسے مکمل بھی کرنا ہو گا۔ اگر آپ کی کارکردگی اطمینان بخش ہوئی تو ہم اپنے اگلے کنٹرول بھی آپ کے ساتھ کرنے میں خوش محسوس کریں گے۔ یہ بات تو میں نے آپ پر پہلے ہی واضح کر دی ہے کہ یہ کوئی سرکاری پراجیکٹ نہیں ہے اس لیے سارے کام کا بہت جتنی سے جائزہ لیا جائے گا اور پورا حساب کتاب بھی دکھا جائے گا۔“

”بالکل جناب! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں اپنا کام ایمان داری سے کر کے حلال روزی کمانے والا بندہ ہوں۔ آپ کو کچھ سے کوئی شکایت ہو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ شہر یار کی حدے سنجیدگی سے کئی مہنی بات پر ہلکے وارے زورو شور سے یقین دلایا۔

”عبدالمنان! تم ان کی روانگی کا انتظام کرو۔ ہمیں تو یہاں ابھی کافی وقت گئے گا۔“ ہلکے وار صاحب مصروف آ رہی ہیں، انہیں واپسی کی جلدی ہوگی۔ ”ہلکے وار کی یقین دہانی پر کسی بھی قسم کا توکل ظاہر کیے بغیر اس نے عبدالمنان کو بدانتہا دی۔

”میں چائے تیار کرتا ہوں سر! آپ لوگ چائے پی کر جائے گا۔“ ان لوگوں کو جانے کے لیے پر تو لے دیکھ کر ماسٹر آفتاب نے جلدی سے چٹائی کش کی۔

”نہیں بھئی، فی الحال ان تکلفات میں پڑنے کا بالکل بھی وقت نہیں۔ ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ ہاں اگر ہلکے وار صاحب چاہیں تو ہم انہیں چائے پلا سکتے ہو۔“

”نہیں، میں بھی اب چلوں گا۔ بہت بہت شکریہ۔“ اس نے انکار کرتے ہوئے ہلکے وار کی طرف اشارہ کیا تو اس نے بھی جلدی سے معذرت کر لی اور وہاں موجود لوگوں سے ہاتھ مل کر رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہوتے ہی ان لوگوں نے بھی ماسٹر آفتاب اور غیب سے رخصت کی۔ غیب پر اگر ہم ان کا رخ خوبلی کی طرف تھا۔ چودھری سے لاکھ اخراجات اور عداوت کے باوجود اس موقع پر اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اس حالتے کا سب سے زیادہ اثر سوسخ رکھنے والا بندہ تھا۔ پیر آباد میں کچھ کیا جاتا اور اس میں چودھری کی شمولیت نہ ہوتی، لیکن نہیں تھا اس لیے انہیں روکن بعد ہونے والی تقریب کے سلسلے میں لازماً اسے باقاعدہ طور پر اطلاع دی جاتی تھی۔

”ذرا یہاں روک لو۔“ وہ لوگ اسکول سے خوبلی کی طرف جانے والے راستے پر گھڑن تھے کہ راستے میں دکھائی دینے والی گاؤں کی انگوٹھی مسجد کو دیکھتے ہوئے شہر یار نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ روانگی طرے سے اس بات کا خواہش مند تھا کہ مسجد کے پیش امام سے ملاقات کر سکے لیکن بیٹھ جیڑ آباد آنے پر دیگر معاملات میں اس طرح الجھ جاتا تھا کہ اس ملاقات کا موقع ہی نہیں نکال پاتا تھا۔ اپنے ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت اس وقت اس نے امام مسجد سے ملاقات کا موقع نکال ہی لیا۔ ڈرائیور نے گاڑی مسجد کے قریب لے جا کر روکی تو وہ اور عبدالمنان گاڑی سے نکل آئے۔ مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے جوتے اتارے اور اس سمت بڑھ گئے جہاں سے بچوں کے قرآن پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ مسجد بہت زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کی تعمیر ایسے طریقے سے کی گئی تھی۔ آوازوں کے تعاقب میں وہ جس دروازے تک پہنچے، وہ ایک ہال نما کمرے میں کھل رہا تھا۔ دروازے پر ہی رنگ کر انہوں نے اندر کا جائزہ لیا۔ فرش پر اپنے ایک ہاتھ میں بیٹھے بل بی کر اپنے سامنے دو گھٹے ساروں سے بنی چوڑے تھے۔ نیساوانی مند پر ایک صحت مند آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ آدمی کا رخ بچوں کی طرف تھا اور دروازے سے تھمتنے پر ان لوگوں کو اس کی صرف پشت نظر آ رہی تھی۔ اس آدمی کے بائیں جانب ایک بچہ کھڑا اس کا بازو دبا رہا تھا۔

”اے! میں آج بھی۔“ جا کر بول دینا اس کے ہاں بیو کو۔ اگر اب اس نے ایک دن بھی اور بچہ کی تو میں پھرتے اس کی دودھنی کروں گا کہ کمال اتر جائے گی سارے کی۔ جس دن سے بہن مری ہے اس نے دھڑکا رخ

ہی نہیں کیا۔ گلتا ہے بہن کے ساتھ خود بھی قبر میں جا کر دفن ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب اسے اپنے گھر میں ہی تر نوٹے لے کر رہے ہیں اس لیے ادھر کارخ نہیں کر رہا۔ جب گھر میں فائے پڑے تھے تو دو روز گریہ سے پاس آتا تھا۔ ”وہ بہت قریب تک لے جے میں بول رہا تھا کہ بھر شاید اس نے اپنے محاسن بیٹھے بچوں کی توجہ دو دروازے کی طرف محسوس کر لی اور خود بھی پلٹ کر اس طرف دیکھا۔ باقاعدہ ملاقات نہ ہونے کے باوجود شہر یار اور عبدالمنان کے چہرے اس کے لیے نامانوس نہیں تھے۔ عرس کے موقع پر وہ ان لوگوں کو کچھ چکا تھا، اب جو اس نے انہیں وہاں موجود پایا تو گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

”آئیے آئیے، تشریف لائیے۔ میری خوش قسمتی کہ آج آپ لوگوں نے اس جگہ کو رونق بخشی۔“ اس کا انداز اتنا فدویانہ تھا کہ لگتا تھا، اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ ان کے قدموں میں بچھ جائے۔ ہاتھ ملانے کے لیے اس نے شہر یار کا ہاتھ تھاما تو پھر چھوڑا ہی نہیں اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اپنی مسند تک لے گیا۔

”تشریف رکھیے۔“ شہر یار کا ہاتھ تھامے تھا سے ہی اس نے زبردستی اسے مسد پر بٹھانے کی کوشش کی۔

”نہیں مولوی صاحب! میں نیچے ہی بیٹھوں گا۔ بچے قرآن لے کر نیچے بیٹھے ہوئے ہیں، میرا اوپر بیٹھنا مناسب نہیں۔“ وہ مولوی سے اپنا ہاتھ بٹھا کر بچوں کے قریب ہی نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی اس حرکت پر کھاتے ہوئے مولوی نے بھی بیرونی کی اور خود اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”آپ کو کوئی کام تھا تو مجھے زمت دی ہوتی جناب! میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔“

”نہیں مولوی صاحب! آنا تو مجھے ہی تھا، بس وقت کی قلت کی وجہ سے اب تک انہیں بلا تھا لیکن اب بہت ضروری ہو گیا تھا کہ میں آپ سے ملاقات کر لوں۔“ مولوی کا خوشامد انداز اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اسے عزت سے گری بات کر رہا تھا۔ خاص طور پر یہاں آتے ہی اس نے مولوی کی جس طرح کی زبان سمیٹی اور اسے جس انداز میں بیٹھے دیکھا تھا کہ کچھ کچھ اس کا دل بہت خراب ہوا تھا لیکن وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ اس قسم کے دیکھی ماحول میں مولویوں وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لیے ان میں خود بہ خود ذرا سا تکبر پیدا ہوجاتا ہے۔

”آپ حکم کیجیے جناب! آپ کے حکم کی تعمیل کر کے مجھے دلی خوشی ہوگی۔“

”حکم نہیں بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔ دو دن بعد گاؤں میں اسکول کے افتتاح اور مرکز صحت کے سنگ بنیاد رکھنے کے سلسلے میں ایک قریب متعقدی جا رہی ہے۔ تقریب کا آغاز اللہ کے بارگاہ سے ہو گا اس لیے میں جا رہا ہوں مگر آپ تقریب میں تشریف لا کر تلاوت قرآن پاک کر دیجیے گا۔“ یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس کے لیے وہ خود چل کر مولوی کے پاس آجائیں مسجد کے مولوی کی گاؤں کے ماحول میں اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سے تفصیلات بہترین رکھنے کا خواہش مند تھا۔ دوسرے اسکول اور رستے کے درمیان پائی جاتے والی کھینچا تانی کوئی اس موقع پر ختم کرنا ضروری تھا اس لیے وہ خود سے چل کر یہاں آ پاتا۔

”آپ کہتے ہیں تو میں آ جاؤں گا، ویسے ذاتی طور پر میں اسکول کو بند نہیں کرتا۔ نہ جانے کون ہیں یہ ماسٹر لوگ جو اگر بڑی تعلیم کے ذریعے گاؤں کے سیدھے سارے لوگوں کو بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ مولوی صاحب نے خورانی اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے مولوی صاحب! اسکول میں ایسی کوئی تعلیم نہیں دی جاتی جس سے بچوں کے بگڑنے کا کوئی خطرہ ہو۔ آج کے دور میں بچوں کو دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ بگڑنے کے دور کی کیا بات ہے، سر ہر ہاد خان بھی لیڈر بنے تو بڑوں پہلے بھی اس بات پر زور دیتا کہ مسلمان کو اگر کڑی کرنی ہے تو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی فہم بھی حاصل کرنی ہوگی۔“ اس نے انہیں قائل کرنے کے لیے دیکھ دی لیکن مولوی اتنی آسانی سے قائل ہونے والا بندہ نہیں تھا، اس کی دلیل سن کر فوراً ہی بولا۔

”اس وقت کی بات چھوڑیں جناب، وہ وقت الگ تھا۔ تب ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے لیکن اب تو ہمیں حق حاصل ہے کہ اپنے ملک میں اپنی مرضی کی تعلیم اپنے بچوں کو دیں۔“

”وقت ابھی بھی نہیں بڑا مولوی صاحب! ابھی ہماری آزادی مکمل نہیں ہوئی۔ ابھی ہمیں اپنے لوگوں کے ذہنوں کو آزاد کروانا ہے لیکن اس وقت آپ اس ساری بحث کو جانے دیجیے اور مجھ سے اتنا تعاون کیجیے کہ ہمارے کے اوقات کچھ اس طرح نہ لڑیں کہ، رستے اور اسکول کے اوقات کے درمیان تقسیم نہ ہو اور بچے دونوں جگہ جا سکیں۔“ شہر یار نے بحث کے بجائے برسر مطلب آغاز زیادہ مناسب سمجھا۔

”ہمارے کے اوقات بدلنا تو بہت مشکل ہے، آپ

اسکول کے اوقات میں ہی کچھ تہہ لپی کر لیں۔" مولوی کے جواب سے ظاہر ہو گیا کہ وہ کتنی فرماں برداری اور تابع داری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور حقیقت اٹھانے لگا تھا۔ نتیجہ وہ ان کو گویا میں سے تھا جو ہیٹ میں اذی رہتے ہیں۔

"اس معاملے کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ فی الحال ہم چلتے ہیں۔ ابھی چودھری انکار صاحب سے بھی ملاقات کر لی ہے۔" مولوی کا الفاظ دیکھ کر اس نے مزید اسے منہ لگانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ عبدالمنان نے بھی اس کی پیروی کی۔

"ارے بھئی، ایسے کیسے جاسکتے ہیں آپ؟ کچھ چاہی تو پتہ کیا میں۔" مولوی ذریک آدی تھا۔ اس کے مزاج کی برائی کو بھانپ گیا اور اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"نہیں مولوی صاحب! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" وہ باوجود اصرار کے ایک منٹ بھی وہاں مزید ٹھہرنے پر راضی نہ ہوا۔

آپ نے تو بالائی بالا سارا پروگرام طے کر لیا۔ آخر میں اس ملاقات کا کیا نتیجہ ہوں۔ پھر آدھری ملکیت ہے۔ یہاں کچھ بھی کرنے سے پہلے آپ کو مجھے اطلاع تو دینا چاہیے تھی۔" چودھری انکار کی کوئی پینشن کے بعد اس نے اسے تقریب کے حوالے سے دعوت دی تو اس کا منہ نہ گیا اور وہ ٹھکڑا کر لگا۔

"ہم آپ کو اطلاع دینے ہی تو آئے ہیں چودھری صاحب! اصل میں سارا پروگرام بڑی جگت میں طے پایا اس لیے پہلے سے آپ سے باقاعدہ کوئی مینگ کرنے کی سہاوت نہیں مل سکی۔ بہر حال، ہمیں آپ کی اس علاقے میں اہمیت کا احساس ہے اس لیے تو میں خود آپ کو دعوت دینے کے لیے آیا ہوں۔ بے شک اسکول اور سرگزشت کی تعمیر سرکاری زمین پر ہو رہی ہے اور فنڈز بھی ہمیں تنگ اور سے ملے ہیں لیکن آپ کی اہمیت سے انکار تو ہڈی کیا جاسکتا ہے۔ آپ تشریف لائیں گے تو تقریب میں حیار چاند لگ جائیں گے۔ آپ کی حیثیت تقریب میں مہمان کے بجائے میزبان کی ہوگی۔ آخر آپ پیر آباد کے چودھری ہیں۔"

اس نے بہت نرم لہجے میں چودھری کی بات کا جواب دیا۔ اس کی اہمیت بھی تسلیم کی لیکن یہ سنا نہیں بھولا کہ بے شک پیر آباد کی پیشتر زمین اس کی ملکیت ہے لیکن جن مقامات پر وہ اپنے منصوبوں پر کام کر رہا ہے، وہ زمین سرکاری ملکیت ہے اور اسے اس سلسلے میں چودھری کی اجازت لینے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ چودھری ہاضی میں بد عنوانی افسروں کی مدد سے اسکول والی زمین پر اپنی ملکیت جما کر بہت عرصے تک اسکول کی توسیع کا کام روک رہا تھا لیکن وہ ابھی طرح واقف تھا کہ حقیقت میں زمین سرکاری ہی ہے اور شہر یار یہ بات بات کر سکتا ہے اس لیے اس نے زمین پر سے اپنی ملکیت کے اٹو سے سے چپ چاپ دست بردار ہو گیا تھا۔ اگر اسے ہاضی میں اس بات کا خیال آجائے کہ آنے والے وقت میں کوئی آفیسر اس کے خلاف بھی چل سکتا ہے تو وہ کسی طرح اس بات کا بندوبست کر لیتا کہ زمین اس کے نام منتقل ہو جائے مگر اب تو وہ صرف اندر ہی اندر تھمکا کر رہ گیا تھا۔

"اپنی جلد بازی کی عادت پر قابو پانے کی کوشش کیجیے۔ جوانی کے زور میں آپ نے ضرورت سے زیادہ ہی جوش سے کام لیتے ہیں لیکن جوش میں بھی کبھی آدمی کو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ ابھی چھپتے دلوں ہی آپ ابھی خاصے ہوئے ہیں۔ خدایا خواست اس واقعے میں آپ کو کوئی بڑا نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ چلیں خیر، آپ کی تو بہت ہوئی لیکن بے چارے غریب پولیس والے مارے گئے۔ مجھے تو بڑا افسوس ہوا ان بے چاروں کی موت کا سن کر۔" تھمکا بہت کو بھنکا کر چہرے پر سر پانہ سکراہٹ سجاتے ہوئے اس نے شہر پارکو چوک کا کمانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ بڑی مٹی خیر صی بیٹے و شہر پارکو چوک پارکو دیکھا چوک بڑے طرہ مان پنت تھے۔ کیسا بے وقوف بنایا میں نے نہیں۔

"پولیس والوں کے مارے جانے کا مجھے بھی افسوس ہے لیکن میرے نزدیک وہ لوگ قاتلی فخر ہیں کہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے بجائے اپنے قرض کی ادائیگی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کی اس قربانی کو بھالایا نہیں جائے گا اور قاتلوں کو ایک دن عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔" وہ خود پر بڑا جبر کر کے وہاں آیا تھا اور اس کی کوئی بات چھیڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا جس سے اس کی کوئی کیفیت کا اظہار ہو لیکن چودھری خود ہی بات کو اس رخ پر لے گیا تھا کہ آنکھوں میں مٹی کا غصہ در آیا تھا۔

"میرے خیال میں ہمیں کسی تکلیف دہ موضوع پر بات کرنے کے بجائے فی الحال تقریب کے حوالے سے بات کرنی چاہیے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ پیر آباد میں ایسی کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے اعلیٰ افسران میں شرکت کی غرض سے یہاں آتے رہے ہیں لیکن ان کی وہ آمد ذاتی نوعیت کی ہوتی تھی۔ اس بار ایک سرکاری مقصد سامنے ہے۔ جہز لوہیہ کو پہلور مہمان خصوصی مقرر کیا گیا ہے۔ بے

تک موجود حکومت میں ان کے پاس کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پچھلی حکومت میں وہ صوبائی وزیر اطلاعات و نشریات تھے۔ اب بھی ان کے حکومتی مطلقوں میں گہرے تعلقات دروہا ہیں۔ میڈیا والے بھی ہر اہم موقع پر ان کی رہائے لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ وزیر خزانہ سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ اگر وہ یہاں سے خوش ہو کر گئے تو ہم کو ازم چھڑا دے گے لیے تو کافی مراعات حاصل کر سکتے ہیں۔" معاملات کو کئی کی طرف جاتا دیکھ کر عبداللہ نے گفتگو میں مداخلت کی اور جلدی جلدی بولنے لگے "ہوئے ان دونوں کو موقع کی نزاکت کا احساس دلانے لگا۔

"ہم تو پہلے بھی کسی کی مہمان نوازی میں کوئی کی نہیں کرتے۔ جنرل صاحب بے شک سرکاری دعوت پر آئیں گے لیکن پیرا بادیانے کے بعد ان کی حیثیت سرکاری مہمان کے بجائے ہمارے ذاتی مہمان کی ہوگی۔" قریب کا آپ لوگ جیسے چاہے انتظام کریں لیکن مہمانوں کا کھانا حویلی میں ہی ہوگا۔ آپ بس مجھے مہمانوں کی تعداد بتا دیں، باقی انتظامات ہو جائیں گے۔" شہر یار کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اپنی اہمیت جتانے اور اعلیٰ مہدے والوں سے تعلقات بڑھانے کا یہ موقع چودھری کسی طرح ضائع نہیں کر سکتا تھا اس لیے فوراً دعوت کی ذمہ داری خود قبول کر لی۔

"میری چشم کش قبول کرنے کا شکریہ اے سی صاحب! اگر آپ اٹھارہ گرویتے تو مجھے بڑا افسوس ہوتا۔ اصل میں مہمان نوازی ہماری روایت ہے اور چاہے کوئی دشمن بھی چل کر ہمارے پاس آئے تو ہم اس کی خاطر ضرور کرتے ہیں۔" چودھری جس وقت بے نیلہ کہہ رہا تھا، عین اسی وقت ایک ملازم کواڑ مات سے گہری زانی دھکیلتا ہوا اور انگ روم میں داخل ہوا۔ اسی ملازم کو نظر انداز کرتا ہوا شہر یار ایک دم سے اپنی نگاہ سے گھڑا ہوا۔

"اچھا چودھری صاحب! اب اجازت دیجیے۔" شہر یار نے چودھری کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عبداللہ نے بھی اس کی جی دی میں اپنی تھک چھوڑ چکا تھا۔

کچھ پانی پیتے چاہیے۔" بہت فکر پر چودھری صاحب! آج بالکل فرصت نہیں آپ کی مہمان نوازی سے فیضیاب ہونے کی۔ اس لیے پلیز ہمیں اجازت دیجیے۔" چودھری کے روکنے کے باوجود وہ مزید وہاں بیٹھے پر راضی نہیں ہوا۔ یہ تو معلومت پسندی تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی ورنہ دل عطی راضی نہ ہوتا تھا اس شخص سے بات کرنے پر۔ چودھری کے باعث وہ یہاں آگیا تھا لیکن کچھ کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے چودھری کے روکنے روکنے بھی باہر نکل گیا۔ باہر مشاہیرم خان گاڑی لیے ان کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کے بیٹھنے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ حویلی سے نکل کر وہ لوگ گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف گامزن ہو گئے۔

"مشاہیرم خان! آقا گاڑی قبرستان کی طرف لے لو۔" اس نے اچانک ہی یہ حکم دیا جس کی عمل کی۔ قبرستان پہنچنے کے بعد وہ گاڑی سے اتر کر قبرستان میں داخل ہوا تو عبداللہ خان اور مشاہیرم خان بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیے۔ قبرستان بڑا بڑا بڑا تھا۔ چند بگ قبروں کے سوا وہاں زیادہ تر قبریں بیک بنی تھیں۔ ان قبروں کے درمیان ان لوگوں کو فوراً ہی قریب قریب بنی دو جی قبریں نظر آئیں۔ قبروں پر کتنے سو جو روکے تھے لیکن وہ لوگ اندازہ کر سکتے تھے کہ یہ قبریں ٹھوڑے دنوں کے وقفے سے مرنے والی ان دو سنگی قبروں کی ہیں جو زندگی سے اپنے ہمسے کی خوشیاں وصول کیے بغیر ہی دفن سے چلی گئی تھیں۔ دونوں میں سے ایک قبر کی مٹی زیادہ بڑھ چکی تھی جس سے چاچل رہا تھا کہ یہ ماہون کی قبر ہو گی۔ شہر یار نے اس قبر کے سر ہانے کھڑے ہو کر دعا مانے مشغرت کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ عبداللہ خان اور مشاہیرم خان نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ قریب پانچ منٹ تک وہ اسی طرح ہاتھ بلند کر کے بند آکھوں کے ساتھ دعا پڑھتا رہا۔ دعا کے اختتام پر اس نے منہ پر ہاتھ پھیر کر آنکھیں کھولیں تو پہلے گہڑوں میں ملبوس دلا پٹا اور سانوئی رنگت والا ایک شخص دوسری قبر کے پاس کھڑا اپنی طرف دیکھتا نظر آیا۔ اس شخص کے چہرے پر گہرے رنج اور دکھ کے تاثرات تھے۔ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ گھٹس گھٹاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

"آپ اس ضلع کے اے سی صاحب ہوں؟" اس کے چہرے کو غور دیکھتے ہوئے اس نے استفسار کیا جس کا جواب اس نے شخص سر ہلا کر دیا۔ اس وقت وہ خود گہرے دکھ کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے مدد کی درخواست لے کر اپنے پاس آنے والی نو عمر لڑکی کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر

اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے کا تجربہ بہت تکلیف دو تھا۔ ابھی تو وہ اس لڑکی کے لیے اپنے دل میں بیٹھتا ہوا تھا۔ اس نے تمام کی کشش کا تجربہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ گئی تھی۔ وہ ایک دم ہی بہت سرگرم ہو کر اس دکھ کے ازالے کی کوشش میں لگ گیا تھا اور سب سے پہلے پیر آہ میں اپنے منصوبوں پر کام کا آغاز کر دیا تھا۔

"نہا ہے کہ آپ ہمارے پنڈ میں اپنا دل بٹا رہے ہیں۔ یہ آپ کا ہم لوگوں پر بڑا احسان ہوگا۔" اس کی طرف سے تصدیق ہو جانے پر وہ شخص اس کا ہاتھ تھام کر بڑی عاجزی سے بولا اور پھر پیموٹ پیموٹ کر رونے لگا۔ شہر یار کے اشارے پر مشاہیرم خان نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔

"تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟" وہ شخص سنبھلتا تو اس نے اس سے پوچھا۔

"میں انور ہوں جی! یہ میری گھر والی کی قبر ہے۔ وہاں کے دو برس بعد میں خوشی کی خبر لی تھی، پر جانے بھر اچانک کیا ہوا کہ اس وجہ سے اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ اور پھر پنڈ میں کوئی ڈاکٹر تو ہے نہیں۔ وہاں ہی ٹوٹنے ٹوٹنے لگے آگے بڑھ رہی، پر جب کوئی فائدہ (فائدہ) نہیں ہوا تو اس نے کہہ دیا کہ اپنی گھر والی کو شہر کے اسپتال لے جاؤ۔ اسپتال لے جانے کے لیے میرے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے فکری کی بہت خوشامد کی کہ حویلی کی کئی گندی میں میری گھر والی کو اسپتال پہنچا دیں، پر غریبوں کی کون سنتا ہے۔ جی۔ میں نے ہاتھ دوڑ کر کے بڑی مشکل سے جب تک سواری کا بندوبست کیا، تب تک دیر ہو چکی تھی۔ وجہ میری میری گھر والی رستے میں ہی تڑپ تڑپ کر مر گئی۔" اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو جاری ہو گئے۔

"مجھے ان حالات کے بارے میں معلوم ہے انور! مجھے معلوم ہے کہ علاج کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے اکثر اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ آباد سمیت دوسرے دیہاتوں میں بھی جلداز جلد ایسے اسپتال بنائے جائیں جہاں لوگوں کا بروقت علاج ہو سکے۔ تمہاری بیوی کی موت کا من کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔ بس اب تم دعا کر کہ جلد یہاں اسپتال بن جائے تاکہ تمہاری جیسی تکلیف کسی دوسرے کو نہ اٹھانی پڑے۔" شہر یار نے اس کا شانہ بچھتے ہوئے کہا کہ تو اس نے خود پر قابو پا پاتے ہوئے عمل کی پشت سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور ڈاکوٹ سے بولا۔

"اگر میرے اپنی کوئی خدمت ہو تو بتائیں صاحب!"

"ابھی تو ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے تم یہ بتاؤ کہ

کام کیا کرتے ہو؟" اس نے پوچھ لیا۔

"کام مجھے سارے آتے ہیں۔ بڑا دم ہے میرے بازوؤں میں۔ کتنی بچھے جس کام پر چلی لگاؤں، میں آرام سے کر لیتا ہوں۔ آپ کو کبھی ضرورت ہو تو آکر کوہ لیاں۔" وہ سینہ چاں کر کھڑے سے بولا تو شہر یار نے پرخشیاں نہیں کیں اس کی طرف دیکھا۔ یہ دھکی آئی جو چودھری کے لٹی کے خلاف دل میں شکوہ بھی رکھتا تھا، اس کے لیے کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے انور! ابھی تو نہیں لیکن ضرورت پڑنے پر میں تمہیں ضرور آراؤں گا۔" وہ فکری طور پر تیار رہتا۔ "اگر نورا کا شائد شہیدیت ہوئے قبرستان سے نکلے والے راستے کی طرف چلی پڑا۔ بہت سے کاموں کا پوچھ سر پر ہونے کے باوجود اس کا ذہن انور کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اگر اپنے دعوے کے مطابق واقعی وہ بہت کارآمد آدمی تھا تو اس سے کی اہم کام لیے جاسکتے تھے۔

☆☆☆

آخری جلد تحریر کرنے کے بعد اس نے قلم بند کر کے قلم دان میں رکھا تو بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ آج کی قریب بہت شاندار دیر تھی۔ مرکز سمیت کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد جنرل نو حید اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول آئے تھے۔ انہوں نے اسکول کی چھوٹی سی عمارت کو دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا اور یقین دہانی کروائی تھی کہ مستقبل میں اس اسکول کی عمارت میں تو سبق کے سلسلے میں وہ بھرپور کردار ادا کریں گے اور ایک دن یہ چھوٹا سا اسکول ہائی اسکول اور کالج کے درجے تک پہنچ جائے گا۔ انہوں نے بہت مؤثر الفاظ میں گاؤں کے لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ تقریب میں شریک گاؤں والوں کے چڑھتی روٹوں نے ظاہر کیا تھا کہ وہ ان باتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ تقریب میں چودھری افتخار کے علاوہ اردو گرو کے دوسرے زمینداروں نے بھی شرکت کی تھی اور ناچار ہی اس اعلیٰ پرگرام کو سراہا تھا۔ مو باکس مٹی والے بھی اس قریب میں بڑے سرگرم رہے تھے۔ بنیاد کو رنج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی جگہیں بہر پر مدد دیتے ہوئے چلی گئی۔ لوگوں کو مو باکس کے استعمال کی طرف راغب کرنے کے لیے انہوں نے اپنی مو باکس سمیٹنی کی کم کے ساتھ چند مو باکس بیٹ مفت تقسیم کیے تھے۔ آفتاب اور نب کوئی ایک ایک بیٹ دیا گیا تھا۔ عمومی طور پر تقریب بہت کامیاب رہی تھی اور اس وقت آفتاب نے اس تقریب سے متعلق رپورٹ بھی لکھ کر

مکمل کی تھی۔ اس رپورٹ کو انوار کی اشاعت میں شامل ہونا تھا۔ یہ رپورٹ اس نے ایک بچہ کی شکل میں لکھی تھی جس میں بیڑ آباد کے ساتھ ساتھ ارد گرد کے دیگر رہائشیوں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے ان حالات میں فروغ تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے غیر حضرات کو اس کا بغیر میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اخبار بین طبقے میں اسے متناہی نام معتبر تھا اور وہ اسے ایک حق پرست قلم کار کی حیثیت سے پسند کرتے تھے اس لیے اس بات کا اچھا خاصا امکان تھا کہ وہ اس کی اپیل پر ضرور متوجہ ہوتے۔ وہ اس معاملے میں اتنا پُرجوش تھا کہ پچھلے دو دنوں کی مسلسل محنت اور آج کی تقریب کی مصروفیت کی وجہ سے ہونے والی ممکن کو قلعی نظر انداز کر کے قلم تمام کر بیٹھ گیا تھا۔ غیب کی تیند خراب نہ ہو، اس خیال سے اس نے کمرے کی ٹیبل لائٹ بند کر کے ٹیکل لیب کی روشنی میں اپنا کام مکمل کیا تھا۔ مسلسل بجتے بجتے گھٹتے رہنے کی وجہ سے اُڑ جائے والی گردن کا تناؤ و راکم ہوا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کھڑکی تک گیا جو باہر کی طرف کھلی تھی۔ کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ باہر رات کا قصہ صوملا صبر اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بس صرف چاند کی روشنی تھی جس میں وہ اسکول کا چھوٹا اور ارد گرد کا دستلا سا منظر دیکھ سکتا تھا۔ ارد گرد کے منظر سے تو اسے اتنی دلچسپی نہیں تھی لیکن اسکول اس لیے خوابوں کی شاہراہ تعمیر پر آنے والا پھیلا سبک میل تھا اس لیے وہ اسے بہت محبت پاش نظروں سے دیکھنے میں مشغول تھا۔ مشکل سے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ منظر میں جیش آنے والی ایک متحرک تبدیلی نے اسے چونکا دیا۔ وہ دو آدمی تھے جو اس پاس قنات نظروں سے دیکھتے ہوئے اسکول کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آفتاب نے کھڑکی تک آنے سے ٹل ٹیکل لیب بجھا دیا یہاں تو وہ کھلی کھڑکی سے آنے والی روشنی کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے لیکن اس وقت وہ اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ رات کے اس چہرے مشکوک انداز میں اسکول کی طرف بڑھنے والے ان دو افراد کو دیکھ کر اس کا ہاتھ ٹٹکا لیکن وہ انداز نہیں کر سکا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کیوں اس طرف آئے ہیں۔ ان دونوں افراد میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں کچھ ٹھاما ہوا تھا۔ اندھیرے میں ابھرنے والے اس شخص کے خاکے سے وہ اپنی اندازہ لگا کر کہ وہ کوئی کپن لٹا ہے۔ وہ دونوں افراد ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تعمیر شدہ اسکول کے کمروں میں سے ایک کے دروازے پر رے۔ دروازے کے قریب قنات کھڑکی میں کپن ٹھاما ہوا شخص زمین پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا کھڑا رہا۔ کھڑے ہونے والے شخص کی

پوزیشن ایسی تھی کہ زمین پر بیٹھنے والا شخص آفتاب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ نہیں دیکھ سکا کہ اس شخص نے کمرے کے دروازے کے قریب بیٹھ کر کیا کارروائی کی ہے۔ انہوں نے جو کچھ سمجھا تھا، وہ بس لوگوں کا کھیل تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اب آفتاب کے لیے اپنی جگہ کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں جو بھی تھے اور جس انداز میں بھی کارروائی کر رہے تھے لیکن یہ بات کچھ میں آتی تھی کہ ان کا مقصد ٹیک نہیں ہے۔ وہ اندھیرے میں ہی تھری سے کمرے کے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ان دونوں کو لٹکارا۔ "کون ہو تم لوگ اور کیا کر رہے ہو؟" اس کی لٹکار پر وہ دونوں تھری سے چلے۔ اسی وقت اس نے فضا میں پھیلی پینروں کی پوٹھوں کی۔ کچھ میں ہی اس پر ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ "رک جاؤ۔" چلتے کے انداز میں بولتا ہوا آفتاب تھری سے ان کی طرف لپکا لیکن اس سے تھوڑی سی تاخیر ہو گئی تھی۔ اس کے ان لوگوں تک پہنچنے سے قبل ہی فضا میں ایک شعلہ سا ابھرا۔ یہ تھا سناٹا شعلہ ہاتھس کی جلتی ہوئی تیلی کا تھا جس نے تیلی جلانے والے کے ہاتھ سے تھری سے نیچے کا سفر طے کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں خوفناک شعلے بھڑکنے لگے۔ ان شعلوں کو بھڑکانے کے لئے داروں نے وہاں رک کر آفتاب کا مقابلہ کرنے کے بجائے پھرتی سے راکھ فرار اختیار کر لی لیکن وہ اس سارے منظر کو دیکھ کر خود اس بری طرح بھڑک اٹھا کہ انہیں بھانسنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پوری قوت سے دوڑتا ہوا وہ ان لوگوں کی طرف لپکا اور بھاگنے والوں میں سے ایک کی گردن پیچھے سے دبوچ لی۔ اپنے ساتھی کو پکڑا جاتا دیکھ کر دوسرا شخص جوڑا آگے نکل گیا تھا، داہیں پلٹا اور آفتاب کے پیلو میں لات رسید کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو پکڑنے والے کی کوشش کی لیکن اس وقت اس پر جنون وار تھا اور وہ ایک لات سے گزر بھی گاؤں میں نہیں آ سکتا تھا۔ پہلے شخص کی گردن بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس نے خود پر حملہ کرنے والے دوسرے شخص کی ناک پر دائیں ہاتھ سے ایک زوردار مگ مارا اور پھر اسے پھٹنے کا موقع دینے بغیر اس پر اس کے ساتھی کو اس انداز میں دھکیلا کہ دونوں کے سر ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرائے اور ان کے حلق سے زوردار چیخیں نکلیں مگر پھر وہ دونوں سنبھل گئے اور نویں خوار انداز میں اس کی طرف لپکے۔ انہوں نے دونوں پہلوؤں سے اس پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک وقت ان دونوں کے لئے

اپنے چہرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ دم نیچے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کی کپنوں کا استعمال کرتے ہوئے ان کے جسم کے نیچے سے پر نازک مقامات پر ضرب لگائی۔ اس کے یک دم نیچے بیٹھ جانے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کے گھونٹوں کی زد پر آ گئے تھے۔ اس پر سے یہ ضرب کی تو ہلکا ملے اور نیچے بیٹھنے ہوئے آفتاب کو اچھٹے کا موقع دینے بغیر اس پر ہلکے پڑے۔ "کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے یہاں؟ آفتاب! کیا یہ تم ہوا؟" اسی وقت فضا میں غیب کی گھبراہٹ بولی آواز ابھری۔ بہت گہری نیند میں ہونے کے باعث اس کی آنکھ زوراً مشکل سے کھلی تھی اور ارد گرد کی صورت حال دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔ آگ کے بھڑکتے شعلوں نے ساری فضا پر ہیست ہیست طاری کر دی تھی اور ان شعلوں کی روشنی میں تین افراد ایک دوسرے سے برسر پیکار نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے دو کے چہروں پر سیاہ نقاب تھے اور انہوں نے جس تیسرے فرد کو اپنی زد پر لیا ہوا تھا وہ ان کے درمیان کھڑے ہونے کی وجہ سے واضح طور پر نظر نہیں آتا تھا لیکن پڑوں کی وجہ سے غیب نے انداز لگا لیا تھا کہ وہ آفتاب ہے۔ "خیردار! قریب مت آنا ورنہ گولی مار دوں گا۔" لڑنے والوں میں سے ایک نے اپنا ہتھوڑا گراپے کر تے کی جیب میں سے ریوالت نکالا اور اسے غیب کی طرف لہراتے ہوئے دھکیل دی۔ وہ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ "بس، اب تم بھی سیدھے ہو جاؤ۔ ہمیں خون خرابے کا حکم نہیں اس لیے اب تک نہیں بٹھا ہوا ہے لیکن اب جارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔" غیب کو آسانی سے پسپا ہونا دیکھ کر اس نے اپنے ریوالت کا رخ آفتاب کی طرف کیا۔ وہ اب بھی ہاتھ پیر چلاتا ہوا اپنے مقابل کو دھک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریوالت برداری دھکیل کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس کی طرف توجہ دیے بغیر اس نے ایک زوردار پیچ اپنے حریف کی گھٹنوں کے نیچے سے مارا۔ اس کی اس حرکت پر ریوالت بردار شخص بری طرح ٹھٹھا یا اور لات کھنا کر توڑ سے اس کی کپٹی پر ماری۔ یہ ضرب خاصی شدید تھی۔ آفتاب الٹ کر پیچھے جا کر۔ "چلی جاؤ انکل بھائی! کتا ہے گاؤں والے جاگ گئے ہیں اور اسی طرف آ رہے ہیں۔" فضا میں ابھرتے ہوئے ایک شوری آواز سن کر ریوالت بردار نے اپنے ساتھی سے کہا اور اس کا ہاتھ تمام کر اسے کھڑا کرتے ہوئے ایک سمت دوڑ لگانے کی کوشش کی۔ فضا میں ابھرتے شوری کی جھنڈا ہے

آفتاب نے بھی سن لی تھی۔ اسے اچھٹے کر اگر وہ گزرا اور ان دونوں کو روکنے میں کسباب ہو گا تو گاؤں والے ہاں قنات جائیں گے۔ وہ لوگ بچے جاتے زجران دو قنات ہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے۔ وقت کی بوجھنی ہی سہیت حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی تمام تر باتیں قنات کیس اور الٹ کر کرنے کے بعد گلی کیلے پھری گاؤں آ کر پھرت جانے والے اپنے سر کی تکلیف پر قابو پا تاہا ان دونوں کے پیچھے لپکا۔ آوازیں اب بہت قریب آ چکی تھیں، چنانچہ اس بار ریوالت بردار نے اپنے لیے کوئی خطرہ دہل لینا مناسب نہیں سمجھا اور ریوالت کا سر اس کی طرف کرتے ہوئے گولی چلا دی۔ جوش میں آگے بڑھتے ہوئے آفتاب کو ایک بھونکا اور اپنی دائیں ٹانگہ کی دان میں دھپے ہوئے انکڑے کی ازیت سسوس کرتا ہوا دو بچے گر گیا۔ حملہ آور اس کی طرف سے مطمئن ہو کر کھانسلے سے ہاتھ کھڑو کی پک پیچھے اور لپک کر ان پر سوار ہوتے ہوئے بڑی طرح کل بھاگے۔ ان کے یہ گھوڑے پہلے اس کی نظر میں نہیں آتے تھے۔ آج بھی جاتے تو وہ کیا کر لیتا؟ جتنی کوشش کہ کر سکتا تھا اپنی جان کی بانی لگا کے کر چکا تھا اور اب جاکسی سے زمین پر گرا پلٹتے پلٹتے ہوئے آگ کے شعلوں کی رقص کرنی روشنی میں ان کو بھڑکانے والوں کو فرار ہونا دیکھ رہا تھا۔ ان شعلوں میں کیا کچھ ہلا تھا، یہ حساب تو اند میں ہی ہوتا لیکن اپنے غریبوں کو یوں چھوڑنا دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کی جھلن اپنے دردم روم میں محسوس کرتا وہ دیک بوش وصال سے یہ بگاڑ ہو گیا، خود اسے بھی ٹپک نہیں ہو سکا۔

خفا کا بھرپور انتظام بھی کیا لیکن موقع ملنے ہی پہلا فرصت میں اپنی چال چل گیا تھا۔ آگ اب اتنی خوفناک بھی کہ اس نے نئے تعمیر شدہ کمروں کے ساتھ ساتھ پرانے کمروں کو بھی نقصان پہنچا دیا تھا۔ پٹرول کی آگ دہک رہی تھی خطرناک ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ اس جگہ تک کوئی بھی امداد پہنچنا بھی آسان نہیں تھا۔ ایندھن تو گاؤں والوں نے ہی پالیوں وغیرہ سے پانی ڈال کر آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش سے آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ ان حالات میں بس ایک ایسی بات رہی کہ غیب نے اپنے سواہل فوں سے ہنگامی امداد کے لیے کال کر دی۔ چودھری کی بدولت قائم ہونے والے موہاں کپنی کے نیٹ ورک نے اس بڑے وقت میں بڑا ساتھ دیا۔ فون کال پر آگ بجھانے والی گاڑیاں اور ایسی بیسی فوری طور پر پھر آ بار روانہ کر دی گئیں۔ ایسی بیسی پہنچنے تک رنجی آفتاب کو گاؤں کے لوگوں نے اپنے طور پر ایندھن کی طرح امداد دے دی تھی لیکن سر پر رکھنے والی پوٹ اور مان پر گولی کے باعث آنے والا دم بھٹک گیا تھا۔ ان رنجوں سے اس کا کافی خون بہہ رہا تھا۔ شہر یا کوئٹہ سے قبل ہی اس حادثے کی خبر ہو گئی تھی لیکن فوری طور پر پھر آ پانے کے بجائے اس نے فور کوٹ کے اس چھوٹے سے اسپتال جانا زیادہ مناسب سمجھا تھا جہاں آفتاب کو لے جایا گیا تھا۔ اس اسپتال میں طبی سہولیات بہت کم تھیں۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے جو کچھ بن چڑھا وہ اس نے اپنے طور پر کر دیا تھا اور پھر اس کے حکم پر آفتاب کو فوری طور پر لاہور کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا۔ آفتاب کی زندگی اس کے لیے بہت قیمتی تھی اس لیے اسے بچانے کے لیے وہ اپنے تمام تر اختیارات کو بروئے کار لے آیا تھا۔ فور کوٹ سے ایسی بیسی کی روایتی کے ساتھ ہی ایک ایسی بیسی لاہور سے بھی روانہ ہوئی تھی۔ اس ایسی بیسی میں جدید سہولیات کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور مکمل نرس بھی موجود تھا۔ یہ انتظام اس لیے تھا کہ یہاں سے جانے اور لاہور سے آنے والی ایسی بیسی جس مقام پر بھی آجیں وہیں آفتاب کو لاہور والی ایسی بیسی میں منتقل کر کے راستے میں ہی بہتر طبی امداد کی فراہمی شروع کر دی جائے۔ اس کی یہ حکمت عملی بہت کامیاب رہی تھی اور نتیجہ یہاں کے لیے روانہ ہونے سے قبل اسے اطلاع ملی تھی کہ آفتاب کی جان اب خطرے سے باہر ہے۔

”آگ نے اتنی فیصد عمارت کو نقصان پہنچا دیا ہے۔ دوبارہ سے اس عمارت کو مرمت کرنے اور قابل استعمال بنانے میں کافی وقت لگے گا۔ تحقیقاتی ٹیم کی رپورٹ کے

مطابق آگ پٹرول ڈال کر لگی تھی۔ آگ کس نے اور کیوں لگائی، اس حلقے میں ابھی حقائق سامنے نہیں آ سکے ہیں۔ واقعہ کے ایک گواہ ماسٹر نیب سے ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس کے مطابق رات کے آخری پیر اس کی آنکھ بچھو وغیرہ شور کی آوازوں سے بھٹی گئی۔ کمرے کی کڑکی اور دروازہ کھلا ہوا تھا اور ماسٹر آفتاب کمرے میں موجود نہیں تھا۔ نیب نے باہر آ کر دیکھا تو اسے ماسٹر آفتاب دو تھپ پٹوں سے لڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس لڑائی میں دل دینا چاہا تو حملہ آوروں میں سے ایک نے ریلواریو لگا کر اسے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔ ماسٹر آفتاب کو بھی اس نے گولی مارنے کی دھمکی دی تھی لیکن وہ چوہدری میں اس دھمکی کو خاطر میں نہیں لایا اور حملہ آوروں کے فرار کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش کی۔ پیش میں آ کر دھمکی دینے والے نے اس پر گولی چلا دی۔ لڑائی کے دوران وہ پہلے ہی اچھا خاصا زخمی ہو چکا تھا، گولی گرنے کے بعد بالکل ہی حواس کھو بیٹھا۔ حملہ آرواں نے گولی مارنے کے بعد اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر فرار ہو گئے تھے۔ کھوبی کے ذریعے گھوڑوں کے سونے کا ٹھونج لگانے کی کوشش بھی بے کار رہی۔ ان لوگوں نے فرار کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا کہ ٹھونج ٹل ہی نہیں سکا۔ اب ہمارے پاس واحد آپشن یہی ہے کہ ماسٹر آفتاب چوہدری میں آئے کے بعد کوئی ایسی بات بتا دے جس سے حملہ آوروں کے بارے میں کوئی گیل مل سکے۔ اس نے حملہ آوروں سے براہ راست مقابلہ کیا تھا، اس مقابلے کے دوران ہو سکتا ہے اس نے ان لوگوں کو شناخت کر لیا ہو۔ ان لوگوں سے اس کی کوئی وکلی دیکھی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ وہاں موجود ایس بی ایس والے اس کے بارے میں پتہ کر رہے ہیں۔ ہونے والی راتے بھی وے رہا تھا۔ اس کے آخری منٹے شہر یار کے تین بدن میں آگ لگا دی۔ وہ جانتا تھا کہ ایس بی ایس والے اس کے ذمے داروں سے واقف قوانین پر بھی معاملے کو ابھار دینے کی کوشش کر رہا تھا جس سے کسی حد تک واقعے کی ذمہ داری آفتاب پر تھوپی جا سکتی۔

”ماسٹر آفتاب شوق کوئی لٹیرا ہے، جب جاگیر داروں نے ہی کوئی اعلیٰ عہدے دار... اس لیے اس کی کسی سے اتنی شدید ذاتی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی واقعہ جس انداز میں پیش آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجرم اسکول کی عمارت کو نقصان پہنچانے آئے تھے۔ اگر انہیں آفتاب سے کوئی ذاتی دشمنی ہو تو وہ اتنا لبا کراہک پالنے کے بجائے سیدھے سیدھے اسے گولی مار کر ختم کر سکتے تھے۔ اس

لیے بلینز، آپ اپنی گفتیشی ٹیم سے کہیں کہ ماسٹر آفتاب کی ذات کو فوکس کرنے کے بجائے واقعے کی نوعیت کو فوکس کریں اور ان لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں جنہیں یہاں اسکول کے وجود پر اعتراض ہے۔“ جب عدل رکھائی سے ایس بی ایس کے جواب دے کر وہ اپنے ساتھ ہی موجود عیدالمنان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”عیدالمنان اسامہ کے نقصان کا تحقیر لکھوا اور ساتھ ہی فوری طور پر یہ بھی حساب لگا کر اسکول کی عمارت کو کم سے کم عرصے میں دوبارہ افتتاحی کرنے میں سکتے اخراجات آئیں گے۔ میں زیادہ دن تک اس اسکول کو بند نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور ہاں، اس بار سیکورٹی کے لیے بھی کوئی معقول انتظام کر لیتا۔ جنہوں نے ایک بار یہ حرکت کی ہے، دوبارہ بھی ایسی کوئی کوشش کر سکتے ہیں۔ ان سازش میں سرکاری کوئی اور کوشش دوبارہ برسر کار کیا جا نہیں ہوئی چاہے۔“ سخت لہجے میں احکامات جاری کر کے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

”پھر کیا کہتے ہو اور تم یہ کام کر لو گے؟“

”کیوں نہیں سر جی! میں نے خود آپ سے کہا تھا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مانتے گا۔ اب ہمارے انکار کیسے کر سکتا ہوں؟“

”کام ذرا خطرناک ہے۔ بات مکمل جانے کی صورت میں تم چودھری کے قاتل کا بھی شکار ہو سکتے ہو، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس مسئلے میں تم پر کوئی ذمہ داری کروں۔“

”میں سوچ بچھ کر ہی آپ کا کام کرنے پر راضی ہوا ہوں سر جی! میری کچھ میں یہ کل آگئی ہے کہ بندے کے نصیب میں اگر کوئی نقصان لکھا ہو تو پھر وہ حق نہیں سکتا۔ چودھری صاحب جب میرے سوال والوں سے شراض (ناراض) تھے تو میں نے اسی لیے ان لوگوں سے نا توڑ لیا تھا کہ کہیں چودھری کا غصہ مجھے اور میرے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے... پر کیا ہوا؟ مگر بیٹھے بیٹھے ہی اتنا بڑا نقصان ہو گیا۔ میری گھر والی بھی جان سے گئی اور میں اپنے بچے کی خوشی بھی نہیں دیکھ سکا۔ جب بھی اس نقصان کا خیال آتا ہے تو کسی جی کے بے سرو پی یاد آتی ہے۔ مگر وہ اس دن گولی دے دینے تو شاید میری گھر والی بچ جاتی۔ میرا دل کٹا ہو گیا ہے ان لوگوں کی طرف سے۔ جن کی خاطر ہم اپنا خیر خیر بھانجا ہے اس آئیں ہمارا کوئی خیال ہی نہیں۔ آپ تم ازم ہمارے گاؤں کی بھلائی کے لیے تو سوچ رہے ہیں۔ گاؤں میں اسکول اور اسپتال ہیں جنہیں کے تو گاؤں ترقی کرے

گیا۔ ہمارے لوگوں کے اور کچھ کا بندہ اب ہو گا۔“ انور نے بہت جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چودھری افکار کی دہشتہ اندیشوں پر ہونے والے ہنگامہ کو نہ کچھ ایسا انتظام کرانے کا جس کے ذریعے اس کی چالوں کا توڑ کیا جاسکے۔ اب تک اس نے چودھری کے خلاف جو بھی کارروائی کی تھی، اس کے نتیجے میں ہی ملی تھی۔ انور نے قبرستان میں ہونے والی واقعات کے بعد اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ چودھری کے کاندنوں میں سے ہی کسی کا استعمال کیا جائے تو کوئی ناکہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اسکول میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد اس خیال میں مزید مضبوطی آگئی تھی اور اس نے انور کو مجرم کی آخر کے ساتھ یہ قے داری سونپی گئی کہ وہ چودھری کے خلاف ثبوت فراہم کرنے میں ان کی مدد کرے۔ انور نے یہی ہی کی موت کے بعد اچھا خاصا دل بڑا اشتہ ہو گیا تھا، اس کام کے لیے فوراً ہی راضی ہو گیا۔

”ٹھیک ہے پھر تم ہمارے معاملات پر نظر رکھنا۔ خاص طور پر یہ جاننے کی ضرورت پیش کرنا کہ جنگل سے گزری یا کھائیں کس دن اور کس وقت ان کی جاگیر کی۔ تمہارے لیے موہاں فون کا انتظام ہو گیا ہے۔ قس عبدالمنان سے موہاں میٹ لے لینا اور اس کا استعمال بھی سیکھ لینا۔ موہاں سے یہ فائدہ ہو گا کہ تم فوری طور پر ہمیں ہر بات کی اطلاع دے سکو گے۔ مگر خیال رکھنا کہ تمہارا موہاں کسی کی نگاہوں میں نہ آئے اور یہ مشکل میں نہ جاؤ گے۔ میں تم سے کہیں گھر میں آئے سے بچانے کے لیے خاص طور پر دفتر کے بجائے یہاں اپنے گھر پر تم سے ملاقات رکھی گی۔ تم بھی احتیاط کرنا اور کسی کو معلوم نہ ہونے دینا کہ تم کہاں گئے تھے۔“ شہر یار اسے اس کا کام اچھی طرح سمجھا چکا تھا۔ یہ آخری ہدایات اس نے صرف حفظہ بالقدم کے طور پر دی تھیں۔

”آپ کا بہت بہتہ شریہ سر جی کو آپ نے اتنا خیال کیا۔ میں آپ کی یقینی برات یاد رکھوں گا۔“ انور نے عاجزی سے جواب دیا لیکن ہانسنے اسے بے جا تھا نہیں۔

”کیا بات ہے انور! کیا کچھ اور بھی ہوتا ہے؟“ اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے شہر یار نے پوچھا۔

”نہیں سر جی! ابھی چھوٹے بچہ کی پریکٹس کرتی ہے۔“

”گھو، کیا بات ہے؟“ اس کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے شہر یار نے حوصلہ دیا۔ ”کوئی مسئلہ ہے تو بتا دو... میں تمہاری مدد کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔“

”وہ ہی میرا سالا ہے، الیسا۔ وہ دونوں سے غائب

ہے۔ مگر سے تو دوسرے کے لیے نکلا تھا، پر مولوی صاحب کہتے ہیں کہ وہ دوسرے آیا ہی نہیں۔ ہر طرف اسے دھونڈ لیا ہے۔ پاس (پولیس) میں بھی بہت (پرہیز) لگھو والی ہے لیکن کچھ خبری نہیں مل رہی اس کی۔ آپ بڑے افسر ہیں، مگر پاس والوں پر زور دین سے تو وہ ایسا سے کونسی طرح سے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ابھی تو انہوں نے بہت لکھنے کے ساتھ بھی نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ چاہا جائیگی کی بڑی حالت ہے۔ پہلے ہی وہ دو جوان بیٹیوں کا صدمہ کھا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس پر ایسا بھی غیب (غائب) ہو گیا۔ ایک تو پتھر ہے وہ ان کا۔ آپ کبھی ہی سکتے ہیں کہ ان دو چاروں پر اس کی گم شدگی سے کیا گزر رہی ہوگی۔ ”انور کی دی ہوئی اطلاع نے اسے بڑی طرح چوکا دلایا۔ گاؤں سے کسی بچے کا یوں غائب ہو جانا معمولی بات نہیں تھی۔ شہروں میں تو بھر بھی امکان ہوتا ہے کہ بچے بھجور بھاڑ میں اٹھنا اچھر اچھر ہو جائیں لیکن گاؤں کے محدود ماحول میں جہاں ہر فرد دوسرے فرد سے انہی طرح واقف ہوتا ہے، کسی بچے کا یوں غائب ہو جانا بہت غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس واقعے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بچہ کسی حادثے سے دوچار ہوا ہے اس لیے وہ دن گزار جانے کے باوجود اس کو کوئی پتا نہیں چل سکا۔

”میں تمہارے فون کر کے ہدایت کر دوں گا۔ تم اس بار سے مل کر غریب نہ مت ہو۔“ انور پر اپنی پریشانی ظاہر کیے بغیر اس نے اسے تسلی دی تو وہ شکر یہ ادا کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ انور کے روانہ ہوتے ہی اس نے متعلقہ تھانے فون کر کے تھانے دار کو الیاس کے سلسلے میں سختی سے ہدایت دی اور فون کرتے کے بعد غیاث محمد کے خاندان کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان لوگوں نے خود کو کسی مصیبت سے بچانے کے لیے ماہ بانو کا بیہ چودھری افکار سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن چودھری تو انہیں کیا نقصان پہنچاتا، وہ ویسے ہی بے در پے نقصانات کی زد میں آتے جا رہے تھے۔ شاید ابھی کچھ دور پہلے انور نے صحیح کہا تھا کہ جو نقصان آدمی کے نصب میں لکھ دیا گیا ہو، آدمی اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ غیاث محمد بھی مسلسل ایسے ہی نقصانات کی زد پر تھا۔

۱۶ ۱۶ ۱۶

”آپ؟“ ہسپتال کے کمرے میں داخل ہوتی مشورہ دیکر کہ وہ بڑی طرح چوکا اور اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے منہ سے ایک زوردار کراہ لگی۔

”پلیز! آپ! لینے رہیں۔“ وہ تنہی سے آگے بڑھی اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

”آپ یہاں کیسے آئیں؟“

”مجھے آپ کے رختی ہوئے اور لاہور کے ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر ملی تھی۔ خبر ملتے ہی میرا دل بے چین ہو گیا کہ کسی طرح آپ کو دیکھ لوں۔ بڑی مشکل سے روکو کر ماں کو راضی کیا کہ جو می میں اٹھ کر جا رہا ہے، تھوڑے دنوں کے لیے لاہور چل کر رہیں۔ آپ کی پریشانی میں، ویسے ہی میرا روبرو کر کر حال ہو گیا تھا۔ کھانا پینا بھی پھوٹ گیا تھا۔ میری ایسی حالت دیکھ کر ماں نے ابھی کو راضی کر لیا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ ہم لوگوں کو لاہور بھیج دیں۔ کل رات ہی ہم لوگ یہاں پہنچے تھے۔ صبح صبح میں نے ماں سے بھانہ کیا کہ میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ انہوں نے ڈرائیور کو بھیج کر ڈاکٹر کو گھر بلوایا۔ ڈاکٹر نے کھانے کے لیے دوادی جو ظاہر ہے میں نے نہیں کھائی مگر ماں پر یہی ظاہر کیا کہ دو کھانے کے باوجود درد بڑھتا جا رہا ہے۔ رات ہی گاؤں سے میرے ساتھ یہاں آئی ہے۔ اس نے ماں کو مشورہ دیا کہ فی بی کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔ اب بے چاری ماں چلے انتظار گاؤں میں بیٹھی ہیں اور میں ڈاکٹر کو کھانے اور مختلف ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بھانے یہاں ہوں۔ رات ہی میرے ساتھ ہی ہے اور بارگزی ہے۔ ”وہ بیلے کے ساتھ رہی کوئی پرہیز کرنے کے بجائے ابھی تک گزری ہوئی تھی اور سڑے سے اپنا کارٹا منار تھی۔

”آپ کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس طرح آنے میں کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے آپ سے وعدہ دیا تھا کہ آپ اس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر مجھ سے ملنے نہیں آئیں گی۔“ ساری بات سن کر آفتاب نے اسے ٹوکا۔

”سوری آفتاب! مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن آپ کے زخمی ہونے کا من کر رہیں، رہ نہیں سکتی۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ جب مجھے آپ کے زخمی ہونے کی خبر ملی تو میرے دل پر کیا گزری۔ مجھے رات ہی بتایا تھا کہ آپ کو کہاں کہاں چھوٹی ہیں اور یقیناً جائیں میں نے اپنے جسم پر ان ساری جگہوں پر درد محسوس کیا ہے۔ مگر سب سے بڑھ کر آپ کو کوئی لگنے کی خبر نے میرے ہوش اڑا دیے تھے۔ پہلے سے ہنگام میں تھی ہو لیکن کوئی کوئی معمولی چیز تو نہیں ہوئی جو میں سن کر آرام سے بیٹھی رہتی۔ میرا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈاکٹر آپ کے پاس پہنچ جائوں مگر میں جن ان دھیمی زنجیروں میں تھک چکی ہوں ان سے نجات حاصل کرنا بھی تو آسان نہیں۔ اب بھی اتنی کوشش کے بعد یہ چند لمبی ہی حاصل کر پائی ہوں۔“ وہ نڈل تو بھی چاہتا ہے کہ سارا وقت یہاں آپ کے ساتھ رہوں، آپ کی

خدمت کروں اور آپ کے ہر درد کو جن لوگوں۔“ جذبات سے بھیگی آواز میں کہتی ہوئی وہ اپنی نرم انگلیوں سے اس کی آنکھ کے قریب بڑے ہوئے نکل کے نشان کو مہلارہی تھی۔ اس کے جذبات سے بھیگی آواز اور نرم آنکھیں دیکھ کر آفتاب کا دل مٹج گیا۔ اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔

”اب تو آپ نے مجھے دیکھ لیا۔ آپ کو تسلی ہوگئی ہو گی۔ دیکھیں، میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“

”ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اتنے امیروں زخمی تھے ہیں۔“ اس کی آنکھوں کی نمی تنہی سے آنسوؤں کی روانی میں بدل گئی۔

”زخمی تھے ہیں لیکن اب درد بالکل نہیں ہو رہا۔ آپ نے مجھے چھو کر میرا سہارا دیا، اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لیا ہے۔“ آفتاب کے اس جملے پر وہ جھوٹی سی محبت ہوگئی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی، سو کامیاب نہ ہو سکی۔

”یہ میرا سوا بالکل فون ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ میرا پیٹ والا لیسٹ تو اس دن کی لڑائی میں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ میں نے اپنے لیے یہ نیا سیٹ منگوایا ہے۔ اس کا نمبر ابھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آپ اسے رکھیں، میں اپنے لیے دوسرا نمبر اور ہم منگوا کر آپ کو اس پر کال کروں گا۔ آپ فون پر مجھ سے بات کر لیا کریں گی تو آپ کی تسلی بھی ہو جائے گی اور اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں ہوگا۔“ آفتاب نے اپنے سر ہانے رکھا مگر بالکل چار جہت میں اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے دونوں چیزیں اپنے ہاتھ میں تمام لیں۔ دایاں ہاتھ تو بے دستور آفتاب کی گرفت میں ہی تھا۔

”بس اب آپ جائیں۔“ آفتاب نے اس سے کہا اور اپنے ہاتھ کی گرفت میں سو بوندوں کے ہاتھ کی پشت پر آہستہ سے ہوسا دیا۔ عین اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور شہر یار کمرے میں داخل ہوا۔ آفتاب نے بھرتی سے کشور کا ہاتھ چموز دیا۔ دوسرے سرک جانے والی لڑکی چار دروست کرتی ہوئی تیزی سے دروازے کی طرف چلی۔ وہاں رانی اٹھان و خیراں کھڑی تھی۔ یقیناً شہر یار کو دیکھ کر وہ اتنی حواس باختہ ہوگئی تھی کہ بروقت اندر اطلاع نہیں کر سکی۔

”کیسی طبیعت ہے اب شہر یار؟ میں پریشاں و توت پر لاہور آیا تھا، سو چاہتا تھا کہ خبر بہت بھی پوچھتا ہوں چاہوں گا۔“ وہاں پہنچنے والی پہل کھائی تھی۔ کشور کے روانہ ہونے ہی کے کمرے میں سکون ہو گیا۔ شہر یار نے اس سارے منظر سے قطعی بے نیازی برتتے ہوئے کرسی سنبھال کر بیٹھے ہوئے

اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اللہ کا شکر ہے اب تو کافی بہتر ہوں۔ انشاء اللہ جلد یہاں سے نجات پا کر گاؤں چلی جاؤں گا۔“

”نہ پہنچو گے تو ہمیں سب کچھ غم ٹھاک لے گا۔“

میں نے آواز کر دیا ہے کہ مجھے اسکول بلا دے جلد درکنگ کنڈیشن میں چاہیے۔ وہاں کام جاری ہے۔ جلد سب کچھ ٹھیک ہو جانا گا۔ میں نے ایک نئے پتھر کا پانی اور نمٹ کر لیا ہے۔ اب اسکول شروع ہو گا تو وہ پتھر کی تہار سے ساتھ ہوگا۔ میں گاؤں کا ایک مکان تم لوگوں کے لیے ٹھیک کروا رہا ہوں۔ اب تمہارے استعفاء والا کمرہ بھی اسکول میں ہی شامل ہوگا۔ اسکول کے اوپر کے کام کا نصابی اور نگرانی کے لیے میں نے ایک چوکیدار کا انتظام کر دیا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ دشمنوں کی اس طرح کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی۔“ اس نے آفتاب کو خوش خبری سنائی۔

”ٹھیک ہو سنا مجھے اسکول کی طرف سے بہت فکر تھی۔“ اس خبر کو سن کر اس نے ممنونیت کا اظہار کیا۔

”آئی فکر مت کیا کرو۔ اسکول تہہ بہ تہہ کیسے کا مسئلہ نہیں، میں خود بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا سامانی نقصان برداشت کرنا بھی میرے لیے مشکل نہیں لیکن تم جیسے قیمتی اور اہم شخص کو کھونا میں بڑی ہمتی پسند نہیں کروں گا۔“

”میں خیال رکھوں گا سہرا۔“ شہر یار کی نصیحت کے جواب میں اس نے دم دیا۔

”میں مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے خود کو بڑے انداز سے سے بڑھ کر خطرہ میں ڈال رکھا ہے۔ باہر چوکی کھڑی تھی، میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ چودھری انار کی ملازمہ ہے اور میں نے کی بار بار اسے غوطی میں دیکھا ہے۔ اس ملازمہ کی سوچو گی سے مجھے ملکی لکھا ہے کہ کچھ دیر میں جانا توں یہاں موجود تھیں ماں کا حوصلے سے ہی کوئی تعلق ہے۔“

”وہ چودھری انار کی سب سے چھوٹی بیٹی کشور ہے۔“ شہر یار کے کھیر لچک کے جواب میں اس نے آگے بٹائی۔

”اور آئی کی۔“ اس نے ہونٹ ہلکے۔ ”مجھ تو واقعی معاملہ میرے انداز سے بہت زیادہ غمناک ہے۔ ویسے تو یہ تمہارا پرستل معاملہ ہے اور میں کسی کی ذاتیات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا لیکن تم سے میں بھر بھی بڑے رکھوں گا کہ تم نے اپنے آپ کو بہت زیادہ خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ یہ چودھری، ہنگام کے لوگ خود کو بے شک و ہراس کی عزتوں سے کھیلنے بھرتے ہیں لیکن اپنے گھر کی خواتین کے معاملے

میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔" اسے آفتاب سے اتنی زیادہ انسیت ہوگئی تھی کہ خلاف طبیعت اسے طبیعت کر بیٹھا۔

"میں جانتا ہوں سر! لیکن یہ بات آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ بعض معاملات میں انسان خود انہماکاً غصا مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے لیکن آپ یہ سمجھیں کہ میری اور شوگر کی دوا میں ملنا قائل ہوتی رہتی ہیں۔ وہ بے جاری میری حالت کا کن کن کرل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑی مشکوک سے یہاں پہنچ گئی تھی پھر بھی میں نے ان سے کبھی دیا ہے کہ آئندہ یہ غلطی نہ کریں۔" وہ وضاحت دیتے لگا۔

"اوکے! تم جیسے مناسب سمجھو یہ معاملہ چنل کرو۔ میں اب چلتا ہوں۔ میں نے اسپتال والوں کو تو ہدایت کر دی ہے لیکن اگر پھر بھی تمہیں کوئی ضرورت ہو تو فون پر مجھے اطلاع دے دینا۔" چیک کیتر " حسب عادت اس نے اچانک ہی بات ختم کر دی اور آفتاب سے ہاتھ ملا کر نصرت ہو گیا۔

☆☆☆☆

"میں کوشش کر رہا ہوں اختیار صاحب کہ آپ کے گاؤں کے مسائل جلد از جلد حل کر داسکوں۔ آج میں جن لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا، انہوں نے آپ کے ملانے کا سروے کر کے مرکز صحت کے لیے جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ اب اس کے مطابق یہ لوگ نقشہ و پیرہہ بنائیں گے تو پھر کام شروع ہو گا۔ میں نے سوچا ہے کہ اس مرکز صحت کا منگ بنیاد رکھنے کے لیے پانی و بجلی کے قاتی و زیر کو کوٹ دوں۔ وہ اگر یہاں آنے پر راضی ہو گئے تو پھر میڈیکل لوگوں کے سامنے ہی ام ان سے نوڈ پور میں بجلی کی سپلائی کے سلسلے میں درخواست کریں گے۔ میڈیکل والوں کی موجودگی میں وہ یہاں بجلی فراہم کرنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایک بار انہوں نے وعدہ کر لیا تو پھر میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ سیاسی نمائندے اپنا کردار بافک بھی ادا نہیں کر رہے۔" آج وہ سروے ٹیم کے ساتھ نور پور پہنچا ہوا تھا۔ عبداللہ ان کو اس نے پیر آباد میں اسکول کی سرمت کے کام کا جائزہ لینے کی ذمہ داری سونپی تھی اور خود یہاں آ گیا تھا۔ پھر انہیں روانہ کر کے خود نور پور کے چودھری بختیار سے ملاقات کے لیے چا آیا تھا۔ جی دن سے معدوم نظر کئے دل کا چودھری بختیار سے پسند آیا تھا۔

"سیاسی نمائندوں کی تو بات ہی نہ کریں۔ سارے کے سارے کٹھ چٹوں کی طرح ہیں۔ چودھری انوار جیسے لوگوں نے نڈل کاس کے پڑے تھے بندوں کو چکر لگائیں میں کھڑا کر دیا تھا۔ ان بندوں کو کوئی جانتا تھا، نہ پچھتا تھا

لیکن ہماری غوام کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان پر حکومت کرنے والے جس کی طرف اشارہ کر دیں، یہ ہمارے سمجھے اسے دوٹو دے دیتے ہیں۔ جو بندے یہاں سے اٹھیں اسے اور ایم پی اے بنے ہیں، وہ دوسرے سے یہاں ملتے ہی قہقہے، شہر میں جا کر انہوں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں اور عزت سے بڑی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہی وہی اصرار کا پتہ لگا لیتے ہیں اور اپنے آقاؤں کے حکم کے مطابق کام کرتے رہتے ہیں۔ حکومت خوش ہے کہ اس کی شرٹ کے مطابق پڑھے لکھے بندوں کے پاس سیاسی نمائندگی ہے۔ چودھری انوار جیسے مصلحتی ہیں کہ جگہ سے نام کسی کا بھی ہو لیکن اصل آقا وہی ہیں اور ان کے اشاروں پر ناپائے واسطے سیاسی نمائندوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں کہ نقصان انہیں بھی نہیں، وہ اپنی جگہ پیش کر رہے ہیں۔" چودھری بختیار نے اس کی بات کے جواب میں جو تبصرہ کیا، وہ سچ کسی بھی برحقیت تھا۔ وہ خود اپنی ملازمت کے مختصر عرصے میں یہ بات بھانپ گیا تھا اسی لیے اس نے ان نمائشی نمائندوں سے کچھ خاص نقل بھی نہیں رکھا تھا اور خود اپنی مرضی سے آزادانہ کام کر رہا تھا۔

"میں نے خود بھی یہ سارے حالات بھانپ لیے ہیں اختیار صاحب! مجھے پوری طرح سے احساس ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص غوام کے ساتھ کھل نہیں ہے اور جو کچھ کرتا ہے، مجھے خود ہی کرتا ہے اسی لیے میں سارا وقت بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ جلد اپنے گاؤں سمیت سارے ضلع میں بہت سی تبدیلیاں دیکھیں گے۔" چودھری بختیار کی بات سن کر اس نے اسے تسلی دی اور پھر نصرت کی اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ حسب معمول اس کی گاڑی مشاہیرم ٹان ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ چودھری بختیار کے گھر سے وہ لوگ نور پور سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی ان کی گاڑی گاؤں کی حدود سے باہر نہیں نکلی تھی کہ ایک منظر نے انہیں چکے دیا۔ ایک جیب بہت تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی آئی اور ان سے کافی فاصلے پر رک گئی۔ جیب میں چار باچ آدنی سوار تھے لیکن ان میں سے کسی کی بھی توجہ ان کی گاڑی کی طرف نہیں تھی۔ وہ سب ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چلا گئے۔ مار کر جیب سے اترے اور ایک طرف دوڑنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود فونڈے اور کپڑے زیاں بہت نمایاں تھے۔ جیب جس رخ سے آئی نظر آئی تھی، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ جیب سواروں کا حلق نور پور سے نہیں ہے، وہ کہیں باہر سے آئے ہیں۔ ان کے تیز رفتاری کی خاطر ناک ٹک رہے تھے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی کے

تعاقب میں ہیں۔ ان سے آگے ایک لڑکا اور لڑکی تھے جو جیڑی سے درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگ رہے تھے۔

"گاڑی روک لو مشاہیرم خان!" یہ محسوس کر کے کہ ان دونوں کی جان خطرے میں ہے، اس نے حکم دیا۔ اس عرصے میں ان کی گاڑی جیب کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مشاہیرم خان نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً گاڑی کو بریک لگا دی۔ وہ اور مشاہیرم بہ یک وقت گاڑی سے باہر نکلے۔ اس وقت اگر عبداللہ ان ساتھ ہوتا تو شاید انہیں اس معاملے میں ملوث ہونے سے روک لیتا لیکن مشاہیرم خان ایک تو حکم کا غلام تھا، دوسرے خود بھی ہم جو قدرت کا مالک تھا، سو فوراً اس کا ساتھ دینے چل پڑا۔ اب وہ لوگ بھی درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں انہوں نے پہلے لڑکا لڑکی اور بعد میں ان کا تعاقب کرنے والوں کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس جگہ کی زمین بہت نرم تھی اس لیے بھاگنے میں مشکل پیش آرہی تھی مگر اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ قدموں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ لوگ اس راستے پر گاڑی لانے کی کوشش کرتے تو گاڑی کے ہائر پریشر سنکے تھے۔ وہ دونوں محنت و قہار سے دوڑتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے تو کچھ آواز ہی ان کی سماعتوں سے ٹکرائیں۔ ان آوازوں کا تعاقب کرتے ہوئے وہ دے قدموں آگے بڑھے۔ جھنڈ میں زراعتی آگے انہیں لڑکا لڑکی اور جیب میں آنے والے افراد نظر آ گئے۔

"کچھ قریبان! میں کبہ رہا ہوں کہ تو سامنے سے ہٹ جا۔" تو اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا نہیں رہ سکا۔ میرے بندے تھے ایک جھنگل میں چلا سکتے ہیں لیکن میں صرف اس لیے لحاظ کر رہا ہوں کہ اپنے ہی نوکروں کے ہاتھوں تیری ہستی (بے عزتی) نہ ہو۔" قریبان کے نام سے پکارا جانے والا ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا جس نے ایک کھلی ہوئی لڑکی کو اپنی پشت کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ لڑکی کی پیچھے چوڑے تھے والے ایک درخت سے لگی ہوئی تھی اس لیے کسی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ نوجوان کو سامنے سے بٹانے بغیر لڑکی تک پہنچ سکے اور نوجوان کے پیچھے سے ظاہر تھا کہ وہ ہرگز بھی لڑکی کے سامنے سے نہیں بنے گا۔ شہر پار نے لڑکی کو شناخت کر لیا۔ وہ چودھری بختیار کی بیوی تھی۔ بختیار بار وہ لوگ نور پور آئے تھے تو انہوں نے اس لڑکی کو چودھری بختیار کے گھر میں دیکھا تھا۔

"تو سامنے سے ہٹ رہا ہے یا میں ان لوگوں سے کہوں کہ مجھے تھمت کر سامنے سے چلائیں اور پانڈہ کر

جیب میں ڈال دیں؟" نوجوان کو سامنے سے بٹنے نہ دیکھ کر اس شخص نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بھرا! میں نہیں ہنوں کہ فریڈ ہنگ دھنچے کے لیے تمہیں بڑی لاش ہے کہ گزرتا ہوا کہ میرے ہاتھ سے پر یہاں تک آئی تھی، اس کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔" قریبان کی توجہ ان نے مضبوطی سے جواب دیا۔ اس کے جواب سے شہر پار کا اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان اور اسے دھمکی دینے والا آپس میں بھائی ہیں لیکن وہ کسے بھائیوں میں سے ایک فریڈ کی جان کا دشمن اور دوسرا اس کا محافظ کیوں نہ تھا، یہ بات اسے گونجی آرہی تھی۔

"لاشیں ہم صرف اپنے دشمنوں کی مارتے ہیں۔ اس بے شرم کڑی تک پہنچنے کے لیے مجھے تیری لاش گرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے بندے ایسے ہی تھے قابو کر لیں گے۔" اس شخص نے اطمینان سے کہا اور اپنے بندوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ لوگ قریبان کی طرف بڑھنے لگے۔ فریڈ جو پہلے ہی بھی ہوئی تھی اور مگر زیادہ خوف زدہ ہو گئی اور پشت پر سے ہی لڑنے سے اس ہی طرح چٹ گئی جیسے اس کے وجود میں سارا کر تو کا اپنے دشمنوں کی نظر سے چھپا لینا چاہتی ہو۔

"محمود! شہر پار جواب تک ناموش قماشانی بنا ہوا تھا ایک دم ہی درخت کے پیچھے سے لڑکر ان لوگوں کے سامنے آ گیا۔ کسمپاسی کا قہقہہ پانی شہر پار نے سن کر اس نے مداحیت فروری بھیجی۔ اس کے ساتھ ساتھ مشاہیرم خان بھی منتظر رہا۔

"کون ہونے لوگ؟" وہ شخص چلا۔ اس کے ساتھی بھی بجز کے ہونے نظر آتے گئے۔

"میں شہر پار عادل ہوں۔ اس علاقے کا اسسٹنٹ کمشنر۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟" ان لوگوں کے تہوار کو خاطر میں لا کر بھرا نے اطمینان سے اپنا تعارف کر دیا اور ڈنٹ لہجے میں پوچھا۔

"دیکھیں سر جی! یہاں سے گھر کا معاملہ ہے۔ آپ اس معاملے میں داخل نہ دیں۔ ہم آپ اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔" وہ اس کا خلاف سن کر کچھ بات تو ضرور لیکن اپنے طور پر اپنی بازی کرنے کی بھی کوشش کی۔ یقیناً ان لوگوں کی اس پھر متوجع مداحیت نے اسے دمزدہ کر دیا تھا، الیٹ فریڈ اور نوجوان کے چہرے پر اپنے لیے مدد جانے پر روشنی دوڑ گئی تھی۔

"گھر کا مسئلہ تھا تو گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر حل

کرتے۔ اچھی باتوں کے زور پر ان دونوں کو اس دیرانے میں گھیر کر کھڑے ہوا اور کہتے ہوئے گھر کا مسئلہ ہے۔ میں ابھی فون کر کے پولیس کو بتاتا ہوں۔ تھانے میں رہ کر پولیس کے فنانس کھانڈے کے تو ساری بد عافی اٹھ جائے گی۔ اسے اس شخص کی فسلٹ کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اس سے اسی زبان میں بات کر رہا تھا جو اس کی کچھ میں آئے۔ اس کے پیچھے کھڑے مشاہیر خان نے حفظہ مقدم کے تحت اپنا رپورٹ بھی لکھ لیا تھا۔ اس صورت حال نے سنا ساداری کر دیا۔

”پولیس تک بات نہ پہنچائیں مگر یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ پیر سے ڈسے بھرا ہیں۔ پولیس تک بات پہنچی تو بڑی بدنامی ہوگی۔ آپ نے ابھی دیکھا ہی ہوگا کہ میں فریڈہ کی خاطر اپنی جان دینے کے لیے بھی جاتا تھا۔ اس کی عزت اور جان کی حفاظت میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں اس لیے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پولیس میں بات نہ جانے دیں، اس سے فریڈہ کی بدنامی ہو جائے گی۔“ شہریار کو موہاں پر غبر چڑھ کر دیکھ کر قربان نے آگے بڑھ کر اس سے درخواست کی۔

”ٹھیک ہے، دم کہتے ہو تو میں اس معاملے میں پولیس کو انوائس کرنا لیکن یہ بتاؤ کہ اب آگے کیا کرنا ہے؟“ اسے خود بھی اندازہ تھا کہ پولیس میں بات جانی تو بدنامی تو لازماً ہی ہوتی اور جو دھری بھنکار پیچھے ٹیک فطرت شخص کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوتی۔ اس لیے قربان کی درخواست پر اس نے فوراً موہاں جیب میں رکھ لیا۔ اس جگہ ویسے ہی سیکٹر بہت کم آ رہے تھے اور اسے امید تھیں کہ کسی تھانے سے رابطہ ہو سکے گا۔

”میں اپنے بھرا کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ آپ فریڈہ کو اس کے گھر تک حفاظت سے پہنچا دیں۔ بس پھر سمجھیں کہ بات ختم۔“ شہریار کے ساتھ مذاکرات کی ذمہ داری نوجوان قربان نے سنبھال لی تھی اور اس کا پھتے خان بھائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ چپ چاپ کھڑا تھا۔

”ٹھیک ہے، اس لڑکی کی عزت کی خاطر میں یہ بات مان لیتا ہوں ورنہ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا تھا، اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں تم سب کو قتل کرنے میں بندہ کروا کر تمہارے دماغ درست کروا دوں۔“ سخت لہجے میں کہتے ہوئے اس نے معاملہ ختم ہونے کا اشارہ دیا۔ درختوں کے مچھلے سے وہ لوگ اس طرح باہر نکلے کہ فریڈہ اس کے ساتھ قریبی اور قربان اپنے بھائی اور اس کے آدمیوں کے ساتھ جا رہا تھا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ جی! اگر آپ نہ پہنچتے تو جانے آج میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔“ وہ لوگ گاڑی میں آکر بیٹھے تو اب تک خاموش کردار بنی فریڈہ نے اپنے لب کھولے اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں تمہارا جان لڑکی کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے، یہ تو تمہیں اپنے گھر سے اتنی دور اس دیرانے میں آنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ اس نے ٹنگ لہجے میں کہا تو اس نے شرمندہ ہو کر نظریں ہٹا لیں البتہ رونے کا سلسلہ اب بھی کھلی آنکھوں کی صورت میں جاری تھا۔

”یہ کون لوگ تھے؟ اور کیا معاملہ تھا۔ کیا تم مجھے بتاؤ گی؟“ ذرا سے توقف کے بعد اس نے فریڈہ سے پوچھا۔ وہ لوگ ابھی تک اسی جگہ موجود تھے اور اس نے مشاہیر خان کو گاڑی چلانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گھر پہنچنے سے پہلے فریڈہ خود کو سنبھال لے۔

”قربان ساتھ والے گاؤں کے زمیندار کا بیٹا ہے۔ اس کے اور ہمارے خاندان کے بیچ ہمیشہ سے لڑائی رہی ہے۔ بھائی جی کی ٹانگیں جس حادثے میں تو نہیں، اس کے بارے میں بھی سبکی خیال کیا جاتا ہے کہ اس حادثے کے پیچھے قربان کے باپ کا ہاتھ ہے، پر بھائی جی کو تو آپ نے دیکھا ہے کہ کیسے فٹنڈے دماغ کے آدمی ہیں۔ انہوں نے کہی یہ بات کسی اور کے سامنے نہیں کہی۔ شاید اسکی ہونے کی وجہ سے وہ کمزور پڑ گئے ہیں۔ خیر جو بھی بات ہو، میں آپ کو اپنے اور قربان کے بارے میں بتا رہی تھی۔ قربان سے میری ملاقات ایک دیاہ ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر مڑا۔ مجھے بھی وہ اچھا لگا۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتا چلا کہ ہمارے خاندان ایک دوسرے کے حیرتی ہیں۔ دشمنی کی وجہ سے ملنا جلنا نہیں تھا تو ہم ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ چار کا بندھن بندھنے کے بعد خیر ہوئی تو دشمنی پیچھے چلی گئی، پر دوسرے لوگ تو ہماری طرح اس دشمنی کو نہیں بھول سکتے تھے۔ ابھی آپ نے جس آدمی کو دیکھا تھا، وہ قربان کا دادا بھرا بھان تھا۔ اسے ہمارے بارے میں خبر ہوئی تو وہ قربان کے پیچھے پڑ گیا کہ فریڈہ کا خیال دل سے نکال دو، پر قربان نہیں مانا۔ وہ بہانے سے چھپ چھپ کر جھگڑے لگنے لگا۔ یہاں تو اس کا پتا مل گیا اور اس نے دھمکی دی کہ اگر تو نے فریڈہ سے ملنا نہیں چھوڑا تو میں اسے اٹھا کر لے جاؤں گا اور اس کی عزت خراب کر کے لاش چو دھری بھنکار کے گھر کے سامنے پھینک دوں گا قربان پہلی داری بچھ سے ملنے آیا تھا تو اس نے مجھے یہ بات بتائی تھی لیکن ساتھ ہی

اسے یہ بھی یقین تھا کہ یہاں بھر صرف دھمکی دے رہا ہے، کرے گا کچھ نہیں اس لیے آج بھی وہ مجھ سے ملنے آگیا۔ جہاں آپ نے آج ہمیں دیکھا ہے، ہم بیٹھ ادھر ہی ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ شاید یہاں بھرا کچھ بھی یہ بات معلوم تھی جب ہی قرآن کے پڑھنے ہی وہ خود بھی بیچھے بیچھے آگیا۔ وہ تو رب کا کرم ہے کہ آپ آج آئے اور ہماری جان بچ گئی۔" اس کے پوچھنے پر فریاد نے سارا قصہ سنا دیا۔

"چودھری بھٹی کو اس معاملے کا کچھ علم ہے؟"

"نہی۔ انہیں کچھ بھی نہیں پتا۔ آپ بھی انہیں کچھ نہ بتانا۔" اس کا سوال سن کر وہ چل دی۔

"ٹھیک ہے، نہیں بتاؤں گا۔" شہیار نے اس سے وعدہ کیا اور مشاہیرم خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"گڈ مونی سو لو۔ پہلے ہم انہیں چودھری بھٹی کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔"

"نہی۔ گھر تک چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آپ ہی چلی جاؤں گی۔ جن سے خطرہ تھا وہ تو چلے گئے، اب مجھے کوئی ڈر نہیں۔ یہ میرا اپنا چہرہ ہے، یہاں کے سارے لوگ بھی میرے اپنے ہیں۔ یہاں والوں میں سے کوئی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا، پر اگر میں آپ کی گڈی میں گھر تک گئی تو بھائی جی کو کھوج لگ جائے گی کہ میں آپ کے ساتھ کیوں آئی ہوں۔"

فریاد نے اس کی پیش کش سے صاف انکار کر کے گاڑی سے اتر گئی۔ اس نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جاتا تھا کہ فریاد ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے واقعی یہاں سے اپنے گھر پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی البتہ اس کے ساتھ جانے پر وہ بات کھلنے کا اندیشہ تھا جسے وہ چھپانا چاہتی تھی۔ خود شہیار بار اس معاملے کو کھولے میں کوئی دھجکی نہیں رکھتا تھا۔ وہ جاتا تھا کہ اس طرح کی کئی کہانیاں اس کے اوپر درج ہوئی ہوں گی اور وہ انہی پر کہانی میں خود کو گھومت کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

"سلا میلم سرنی امیں ایس ایچ او بھر کا کڑا بات کر رہا ہوں گی۔"

"وہ میلم السلام۔ کہو کا کڑا۔ اس بچے الیاس کے سلسلے میں تم نے کیا کیا؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ جلد از جلد پتہ چلے گا پتا کر کے اسے اس کے ماں باپ تک پہنچاؤ، پر ابھی تک تم نے کوئی رپورٹ ہی نہیں دی۔" بھیر کا کڑی آواز سن کر اس نے فوراً اسے آٹھ ہاتھوں لیا۔

"اسی بارے میں تو رپورٹ دینے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے سرنی! آپ کے حکم پر ہم دن رات الیاس کو ڈھونڈنے میں ملے ہوئے تھے۔ سارا گاؤں جھان مارا تھا۔ بسوں کے اڈے پر بھی جا کر پوچھ چوچھ کی گئی کہ میں کون سا گاؤں سے باہر تو نہیں نکلا ہوں؟ معلوم ہی نہیں ہوا تھا لیکن آج دو پہر میں سب پتا چل گیا۔ بڑے سستی خیر انکشافات ہوئے ہیں جی۔ آٹھ سالوں کی سروس میں، میں نے اتنا گھناؤنا معاملہ بھی نہیں دیکھا۔ لوگوں کا کچھ پتا ہی نہیں پتا، سامنے سے اتنے ٹیک نظر آتے ہیں اور اندر سے پورے شیطان ہوتے ہیں۔ جو اللہ کے گھر میں بیٹھ کر بھی ایسی گھناؤنی حرکتیں کرے۔ اسے شیطان کیا شیطان سے بھی بڑھ کر نہیں تو کم ہے جی۔"

"تفصیل اور ترتیب سے ساری بات بتاؤ مگر اپنے ذاتی خیالات اور تبصرے کے بغیر۔ میرے پاس اتنا قاتل نام نہیں کہ تمہاری بے سرو پا باتیں سن رہا ہوں۔" اس نے کان کو ٹوک کر

"میں الیاس کے گیس کے سلسلے میں بتا رہا تھا جی۔ اس کے بارے میں خبر مل گئی ہے، پر ابھی خبر نہیں ہے۔ آج ۱۱ بجے سے پہلے گاؤں کا ایک لڑکا میرے پاس آیا تھا۔ لڑکے کا نام اور میں ہے۔ الیاس سے یہی کوئی سمن چار برس بڑا ہوگا۔ اور میں میرے پاس آیا اور زور دینے لگا کہ اگر مجھے الیاس کی تلاش ہے تو میں مسجد کی کافی لوں اور مولوی غلام محمد سے اس کے بارے میں پوچھ چوچھ کروں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لڑکا مولوی پر اثر کرانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟ میں نے اس سے اس کے اس ٹک کی وجہ پوچھی تو پہلے تو وہ کچھ تانے پر دھنسی نہیں ہوا پھر میں نے ڈرا ڈرایا دھمکایا اور تھا نے بند کرنے کی دھمکی دی تو اس نے زبان کھول دی۔ اس کی بتائی ہوئی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ مولوی کتنا گنہگار آدمی ہے۔ اور میں نے رورور کر مجھے مولوی کے اس ظلم کے بارے میں بتایا جو وہ اس کے ساتھ کرتا رہا تھا۔ الیاس کے بارے میں اس نے خیال ظاہر کیا کہ مجھے شک ہے کہ مولوی نے اسے بھی اپنی ہون پوری کرنے کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اسی وقت شک پڑ گیا تھا جب چودھری بھٹی کی تادمی کی وجہ سے غیبت محمد کے گھر میں لاسے ہوئے تھے اور الیاس وہاں سے میں مولوی کے پاس کھانا کھا کر آتا تھا، بھوک سے بے حال الیاس کو یقیناً اس نے اپنے مطلب کے لیے راضی کر لیا تھا لیکن جب غیبت محمد کے حالات سدھر گئے تو اس نے دوسرے کارٹ کرنا چھوڑ دیا۔ کئی بار مولوی غلام محمد نے مجھ سے پیغام بھیج کر الیاس کو بلایا، پر وہ دوسرے جانے

پر دھنسی نہیں ہوا۔ جس دن وہ غائب ہوا، اس روز غیبت محمد نے مار پیٹ کر اسے مدرسے بھیجا تھا۔ بس پھر اس کے بعد وہ جیس ملا۔ اور میں شک کے باوجود کسی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا لیکن آج جب اس نے پوراں کو روٹے پیٹے دیکھا تو اس سے اس کی حالت نہیں دیکھی گئی اور وہ میرے پاس تھا نے آگیا۔ اور میں کی رپورٹ پر میں فوراً اپنے بندے سے کہہ کر مسجد پہنچا، پر معلوم ہوا کہ مولوی غلام محمد آج صبح ہی اپنے کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا ہے اور اس وقت موجود نہیں۔ مسجد میں دو تین بچے موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مولوی صاحب کے حکم پر مسجد کی صفائی کر رہے ہیں۔ ان بچوں سے پوچھ چوچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ جس روز الیاس غائب ہوا، اس روز وہ مدرسے آیا تھا لیکن مولوی صاحب اسے دیکھ کر بہت غصہ ہوئے اور غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر مدرسے کے لیے استعمال ہونے والے کمرے سے باہر لے گئے کہ اب تجھے یہاں پڑنے آئے کی ضرورت نہیں۔ بچوں نے بتایا کہ مولوی صاحب نے الیاس کو مارا بھی تھا اور انہوں نے اس کے رونے کی آواز بھی سنی تھی لیکن پھر اس کی آواز آتا بند ہو گئی اور مولوی صاحب وہاں سے آکر انہیں پکھانے لگے۔ یہ سارا واقعہ ہمیں پہلے ہی معلوم تھا لیکن اور میں کے بیان کی روشنی میں وہ بارہ سوچا تو معاملہ مشکوک لگا۔ ہم نے مسجد کی کافی لینے کا فیصلہ کیا۔ ساری مسجد کھلی ہوئی تھی لیکن وہ کمرہ جس میں مولوی غلام محمد رہتا تھا، اس میں تالا پڑا تھا۔ ہم نے تالا توڑ کر کمرے کی کافی کی تو وہاں سے ایسی کئی چیزیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ مولوی واقعی مشکوک کردار کا بندہ تھا۔ انگریزی رسالوں سے کافی کئی گندی تصویریں، عجیب عجیب دوا میں اور گورو قادم کی پوٹ اس کے کپڑوں کے صندوق سے ملی، پر الیاس وہاں نہیں تھا۔ اسی وقت میرے دل میں ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا مولوی نے ساری مسجد کی صفائی کا کام بچوں کے ذمے لگا دیا تھا تو اپنے کمرے کی صفائی کیوں نہیں کروائی؟ اس پر کون تالا مار کر چلا گیا؟ ساری مشکوک چیزیں تو اس کے کپڑوں کے صندوق میں بند تھیں، اور صندوق پڑا لاگ تھا۔ اگر وہ صفائی کے لیے اپنا کمرہ کھلا چھوڑ کر بھی چلا جاتا تو کسی کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا۔ میں نے بچوں سے پوچھا کہ کیا بیٹھ مولوی صاحب اپنا کمرہ خود صاف کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ نہیں، بیٹھ تو ہم ہی صفائی کرتے ہیں بس آج ہی مولوی صاحب تالا لگا کر چلے گئے ہیں۔ اس بات کو سن کر میرا شک اور بھی پکا ہو گیا۔ میں نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ کمرے

کے فرش پر بھی چٹائی اٹھا دیں۔ سپاہیوں نے چٹائی اٹھانے کی کوشش کی تو وہ فرش سے چٹکی ہوئی تھی۔ انہوں نے زور لگا کر چٹائی کو فرش سے اٹھا ڈیا۔ چٹائی اتنی تھوڑی سی تھی کہ لیٹیں میں بدل گیا۔ کمرے کا فرش کھدا ہوا تھا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے کھودنے کے بعد دوبارہ مٹی ڈال کر پراہن کیا گیا ہے۔ میں نے کدال اور چھوڑا لکیرہ منگوا کر دو بار کھدائی کروائی تو ڈرامی درمیں مولوی کا جرم سامنے آگیا۔ الیاس کی لاش وہاں موجود تھی اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ لاش کو وہاں سے پندرہ سولہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ اپنے آگے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اسے گاموخت کر مارا گیا ہے۔ اصل بات پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد سامنے آجائے گی۔" بھیر کا کڑا اس کے حکم پر تفصیل سے سامری رپورٹ سنانا گیا اور وہ دم سادھے اس بھیا تک واردات کا قصہ سن رہا۔ اس ساری تفصیل کو سنتے ہوئے اس کا اپنا ذہن بھی واقعات کا تجزیہ کرتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ غلام محمد جب الیاس کا ہاتھ پکڑ کر پھاڑا ہے مسجد سے باہر نکال آیا تھا تو وہاں اس وقت وہاں سے باہر نہیں لے گیا تھا بلکہ اپنے ذاتی استعمال کے کمرے میں لے جا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد قوم لو لگا دو قاتلہ دہائی ہون پوری کرنا رہا لیکن انہیں دن گزر جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ الیاس کی اسے دن کی گم شدگی کے بعد اس کا مظہر پرانہ خضر تک بھی ہو سکتا ہے تو اس نے اس معصوم بچے کو قلم کر کے اسے ہی کمرے میں اس کی قبر کھود کر اسے دفن دیا۔ مولوی غلام محمد پہلی ملاقات میں ہی اسے اچھا نہیں لگا تھا لیکن پھر بھی اسے یہ اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ اسے کھادواتے مکرہ کردار کا مالک ہوگا۔ جو کچھ ایسے انجام دے اسے بتایا تھا، اسے سن کر تو اس کے اندر شعلے سے کھڑک اٹھے تھے اور میں نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح وہ غلطی آگیا سامنے آجائے تو اپنے ہاتھ سے اس کے گلوں سے کمرہ۔

"مولوی کے بارے میں کیا اطلاع ہے... وہ کہاں گیا ہے اور کب تک وہاں آئے گا؟" خوف کا سچھید گئی کے ساتھ اس نے انہیں انجانے سے پوچھا۔

"مولوی کسی کو کچھ بتا کر تو نہیں گیا، پر میں نے اس کے بارے میں جو پیش کر دیا ہے اس سے پتا چلا ہے کہ وہ اردگرد کے کسی گاؤں ہی گیا ہے۔ جس میں میں وہ بیٹھا تھا، اس کے کندہ کیلٹر نے بتایا ہے کہ اللہ آباد یا میر و میں سے کسی ایک گاؤں کے قریب اتر آھا۔ صبح جگہ سے یا دیکھیں گی۔ میں نے دونوں جگہ اپنے بندے بھیجے ہیں۔ وہ واپس آئیں تو پھر پتا چلے گا کہ مولوی کہاں ہے؟ وہ جہاں بھی ہوا،

میرے سپاہی اسے جھڑپاں لگ کر لے آئیں گے۔ اس کی گرفتاری کے بعد میں آپ کو بغیر کردوں گا۔ ابھی تو اس لیے فون کیا تھا کہ آپ کو اب تک کی رپورٹ دے دوں۔“ ایس ایچ اے نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یقین دہانی کر دلی۔

”تم تک ہے۔“ دو گرفتار ہو جانے تو مجھے خیر نہ ملا۔ میں اس شخص کو اس کے جرم کی کڑی سے کڑی سزا دلوانا چاہتا ہوں۔ سنو! کوکشن کرنا کہ ایسا اس کے ورثہ پر اس کی لاش کا رد دلی کے بعد بغیر کسی پریشانی کے جلد مل جائے۔ وہ بے چارے پہلے ہی دنگی ہوں گے، انہیں مزید تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔“ ایس ایچ اے کو بدایات دینے کے بعد اس نے فون بند کر دیا اور عبدالمنان کو اپنے کمرے میں بلا کر واقعے کے بارے میں آگاہ کیا اور تقریرت کے لیے جبراً یاد جانے کا فیصلہ بھی سنایا۔

جب وہ لوگ جبراً یاد پہنچے تو غیث محمد کے گھر میں کچھ آرام نیا ہوا تھا۔ ایک تو معصوم بچے کی بھیا تک موت پھر اس شخص کے بارے میں ہونے والا انکشاف جسے وہ بہت تک بھگتے تھے اور جس کی ہر بات پر عمل کرتے تھے۔ لوگوں میں سخت اشتعال اور نرم غصے کے جذبات پائے جاتے تھے۔ شہر یار کو دیکھ کر او لوگ ذرا دھور سے مطالبہ کرنے لگے کہ مجرم کو فوراً گرفتار کر کے اسے سخت سزا دی جائے۔ اس نے لوگوں کو تسلی دی اور انہیں یقین دلایا کہ مجرم کو کسی حال میں معاف نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ غیث محمد سے ملا۔ اگلوتے بیٹے کی موت نے اسے بالکل گم سم کر دیا تھا۔ شہیدیت م سے وہ رونے کے لائق بھی نہیں رہا تھا، البتہ نوران خوب بچھاؤ کے کمار ہی تھی اور بین کر کر کے رو رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ بھی افسردہ تھے اور اس کے ساتھ آئندہ ہمارے تھے۔ مختصر عرصے میں تیسری بار نوران کی کوکھا جڑی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جو تعزیت کے خیال سے وہاں گیا تھا، اسے اندازہ ہوا کہ وہ ان لوگوں کو کوئی تسلی نہیں دے سکتا۔ چند دمی جملے پر مشکل ادا کرنے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گیا، البتہ ایک خیال بہت شدت سے اس کے ساتھ تھا۔ خود کو تباہی سے بچانے کے لیے نوران اور غیث محمد نے ماہ بانو کو دواؤں پر لگانے کا سوچا تھا لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ چودھری افتخار کی ذات کے علاوہ بھی ایک ذات ہے جو طاقت رکھتی ہے۔ جو دشمن سے اور درجہ بھی لیکن جب لوگ اس کی دھمک پر مجبور ہوا کرنے کے بجائے قرعہ فداؤں کے خوف میں جھکا ہو کر ان کی اطاعت کرنے کتے ہیں تو وہ اپنے قہار اور جبار ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اب یہ بندوں پر منحصر

ہوتا ہے کہ وہ خود کو کی جانے والی اس شخص پر سنبھل کر اس ربت کا نکات سے تو یہ واستفادہ کر لیں یا سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلے کھولیں پراثر آئیں۔

”کیا خیال ہے باجوہ صاحب! اس بٹنے مال سپلائی کر دیا جائے؟“ پوچھنے کے کارخانے والے کا مسلسل فون آرہا ہے کہ مال کی شارج کی وجہ سے اسے مشکل ہو رہی ہے۔ جن پارٹیوں کے ساتھ وہ بزنس کرتا ہے، وہ پارٹیاں تھا تھا کمری ہیں۔ کٹری کے مسئلے میں بھی میری ایک نئی پارٹی سے بات ہو گئی ہے۔ مولی والا کی طرح اس پارٹی کے ساتھ شرکت کے بجائے صرف مال سپلائی کر کے رقم بکڑنے کا معاملہ ملے کیا ہے۔ میں نے شرارت داری میں لوگوں کو راز مل جاتے ہیں اور بندے کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کس کا دام بچ کر جائے۔ مولی والا بھی اتنے برسوں تک ہمارے ساتھ کام کرتا رہا اور آخر میں جاکر گرفتاری پراثر آیا۔ بے کار میں حب الوطنی کا جھوٹ چھ گیا تھا سالے پر اب بھی دکھ نہیں، کیسے اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اسے ہی کا بچہ اس کی جائیداد سے اسکول واسپتال بنواتا پھر رہا ہے۔“

”مال تو بالکل تیار ہے چودھری صاحب! جب سے شہر یار عادل اسے ہی بن کر رہا ہے، سپلائی ہوتی نہیں ملتی ہے۔ ضلع سے باہر جانے والی گاڑیوں کی دقت ہے۔ وقت چیکنگ ہونے لگی ہے، ایسے حالات میں مال سپلائی کرنے کا ریسک نہیں لیا جا سکتا۔ تارڑ صاحب کی موجودگی سے بھی ہمیں زیادہ فائدہ نہیں ہے۔ شہر یار اکثر ان کے علم میں لانے بغیر ہی کوئی بھی کارروائی کر دیتا ہے۔ ایسے میں مجھے تو مال سپلائی کرتے ہوئے بہت خطر محسوس ہوتا ہے۔ اگر مال بکڑ گیا تو میری ہی گردن بھینے کی۔ سب سے پہلے مجھ سے ہی سوال کیا جائے گا کہ جنگل سے غیر قانونی طور پر کٹری اور کھائیں نکلیں کیسے؟“ چودھری افتخار کی بات سن کر اقبال باجوہ نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

”آپ کے تحفظ کا مجھے پورا خیال ہے باجوہ صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم کام کرنے سے پہلے آپ کے بارے میں نہ سوچیں۔ میں نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی سپلائی کی بات کی ہے۔ میرے بندے اچھی طرح دیکھ بھال رکھتے ہیں کہ آج کل سڑک پر کبھی چیکنگ نہیں ہو رہی۔ شہر یار آج کل دفاعی کاموں میں مصروف ہے۔ اسپتالوں اور اسکولوں کی تعمیر کے پکڑ میں اسے دوسری باتوں کی طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں مل رہی اور اب وہ مولی غلام محمد

والے معاملے میں بھی الجھ گیا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ کیسے جلد مولی کے انٹکا والے کو پٹر لگا کر اسے گرفتار کروانے میں مدد دینے والے کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ مولی کو گرفتار کر دینے کے لیے شہر یار دیوانہ ہو رہا ہے۔ ان دنوں فٹنس پولیس اس پکڑ میں چھٹی جلد مولی کو تلاش کرنی پھر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے۔ ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنا مال سپلائی کر سکتے ہیں۔“ چودھری نے اسے حوصلہ دیا۔

”بات تو آپ کی حق ہے۔ واقعی ہم اس موٹے کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ایک بار مال یہاں سے باہر نکل گیا تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آگے تو پھر ہماری وہی پرانی سٹینک بنی ہوئی ہے۔ آگے کوئی ہمارے مال کو روکنے والا نہیں ہوگا۔“ وہ قائل ہونے لگا پھر اس کا دھیان مولی غلام محمد کی طرف گیا تو وہ سختی خیز لکچے میں بولا۔ ”ویسے یہ آپ کا مولی غلام محمد تو بڑی اونچی چیز نکلا۔ اس سے ایسے کام کی امید نہیں کی جیسے۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو کھینک خاک مشکل میں پڑ جاتا۔ اب بھی جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے کہ کس کے ہاتھ نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے علاوہ بھی اسے کسی کی سپورٹ حاصل تھی اور اب وہ اسی شخص کی پناہ میں پھنسا بیٹھا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ آدمی وہ نصیبت ہے۔ اس بات کو میں نے سمجھ لیا تھا اس لیے تعزیری دیم اور ہوتیں دے کر اس سے اپنے مطالب کے کام لیا تھا۔ اب اس کی وجہ سے مجھے بھاری آسانی تھی۔ گاؤں والے اس کی بات بہت مانتے تھے اس لیے مجھے لوگوں کو جس چیز سے دور رکھنا ہوتا، اس کے لیے مولی سے کہہ دیتا۔ مولی اللہ کے عذاب اور جہنم کے ڈر اور دے کر لوگوں کو تباہ کر دیتا تھا لیکن اب اس کا جو کارنامہ مکمل کر سائے آیا ہے، اس کے بعد تو مجھے ڈر ہے کہ لوگ اس کی سبکداری پر حالی ساری باتیں بھول کر اپنی من مانی کرنے لگیں گے۔“ چودھری نے بھی اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

”یہ تو زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے چودھری صاحب! غلام محمد کے بعد کوئی سبکدہیش خالی تو نہیں رہے گی۔ اس کی جگہ جو غلام مولی آئے گا، آپ اسے اپنا بیٹا لے لیں گے۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑے زائد ڈمکا جاتے ہیں۔“ باجوہ نے مشورہ دیا۔

”خیر، جانے دیں اس معاملے کو۔ یہ معاملہ تو میں وقت پر خود ہی دیکھ لوں گا۔ اس وقت جو اصل مسئلہ ہے وہ مال کی سپلائی کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کٹری اور کھائیں دونوں ایک ساتھ ہی سپلائی کر دی جائیں۔“

”یہ تو بہت زیادہ ریسک والی بات ہو جائے گی چودھری صاحب! ایک آپ کو اطمینان ہے کہ شہر یار کا آج کل اس معاملے کی طرف دھیان نہیں لیکن اگر اتفاق سے اسے کچھ بھٹکے ہوئے گا اور وہ بین دقت پر چھپا ہوا ہوگا تو بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا۔“ چودھری کی تجویز سن کر اس نے فوراً اعتراض کیا۔

”ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس بارے میں ساری منصوبہ بندی کر لی ہے۔ میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ وہ کہیں اور اس طرح سے مصروف ہو جائے کہ اسے ہوش ہی نہ رہے۔“ چودھری نے گہرے اطمینان کے ساتھ جواب دیا اور اسے اپنا منصوبہ بکھانے لگا۔ اس منصوبہ کو سن کر وہ بھی مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

”نور پور کی تقریب کے مسئلے میں کیا تیاری ہے عبدالمنان! اس موقع پر ہر کام بالکل پرفیکٹ ہونا چاہیے۔ میں نے وزیر صاحب سے بڑی مشکل سے اتفاق لیا ہے۔ کوکشن کرنا کہ تقریب کا انتظام ایسا ہو کہ وہ متروک نہ بنے بغیر نہ رہ سکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اس دورے کا پورا پورا فائدہ حاصل کیا جائے۔“

”آپ فکرمند کریں سر! میں سب انتظامات کا ذاتی طور پر جائزہ لے رہا ہوں۔ نور پور میں تقریب کے لیے سارے انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ مرکز صحت اور اسکول کے نقشے تیار ہیں۔ وزیر صاحب کے سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے انہیں یہ نقشے دکھا کر اپنے پریکٹ کے بارے میں براف کیا جائے گا۔ میڈیا والوں اور دوسری اہم شخصیات کو دعوت دے بھیج دیے گئے ہیں۔ اللہ اللہ اس تقریب کا بیج پڑا کی تقریب سے زیادہ اچھا رہائش سامنے آئے گا۔“ عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔

”خیر آبا و میں کام کیسا چل رہا ہے؟ ایسا کی لاش ڈسکور ہونے کے بعد میں وہاں وہاں کا چیکر لگا رہی ہوں۔ سکا۔ وزیر صاحب کو راضی کرنے، ان سے تقریب میں شرکت کا وقت لینے کے لیے اپنی بھانجی روڈ کو کرنی پڑی کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں دے گا۔“

”وہاں کام بالکل اچھے اور طریقے سے چل رہا ہے۔ اسکول کی مرمت کا کام تو تقریب تک مکمل ہو گیا ہے۔ میں دو چار دن اور انہیں کے ہجرات اشتعال کے قائل ہو جائے گی۔ بائزر آفتاب بھی اس دوران اسپتال سے فارغ ہو کر واپس پہنچ جائے گا۔ ایسے آدمی بڑے کام کا ہے۔ اسپتال

میں ہنسنے پر لپٹے لپٹے بھی اسے چھین نہیں ہے۔ کل کے اخبار میں اسکول والے حادثے پر اس کا ایسا کٹ دار کا کم شائع ہوا ہے کہ میں پڑھ کر آتش فشاں کراٹھا۔ اس نے کسی کا نام لے لیتے ہیں اس انداز میں حادثے کا ذکر کیا ہے کہ ڈسٹ داران سمجھ بھی جائیں کہ کسی کی طرف اشارہ ہے اور کوئی اسے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ تم نے میرا نام کیوں لیا؟ "پھر آباؤ کے بارے میں رپورٹ دیتے دیتے مہمانان نے ماسٹر آفتاب کے بارے میں بھی رپورٹ دی۔ ماسٹر آفتاب کے لیے اس کے لیے میں گہری سانس لیتی تھی۔

"آفتاب بہت ذہین آدمی ہے لیکن مسلسل خطروں سے بھیل رہا ہے۔ مجھے اس کی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے۔" وہ انہوں کے بھانجے کے باوجود کسی بھی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر وہی کچھ کرتا جو مناسب سمجھتا تھا لیکن آفتاب کی طرف سے اسے کچھ فکر رہنے لگی تھی۔ خصوصاً کشور والا معاملہ سامنے آنے کے بعد اسے سخت تشویش تھی کہ اگر کسی کو اس بات کی ہینک پڑتی تو آفتاب کی خیریت سو فیصد خطرے میں پڑ جائے گی اور وہ ایک مخلص اور کام کے آدمی کو مٹا لے گا۔

نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ "خطروں تو ہم سب کے لیے ہی ہے سراسر ہم جن لوگوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں وہ ہم سے زیادہ اہم و اشرار ہیں۔ شک نہیں ہیں لیکن اس لیے زیادہ خطرناک ہیں کہ ان میں انسانیت ہم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ انسانوں کی جان سے بھینا اور انہیں نقصان پہنچانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ آپ کو بھی ایک پیغام مل تو چکا ہے کہ جب چاہ رہا ہے اسے سے ہٹ جائیں ورنہ ان کی بار بار بات مزید بڑھ سکتی ہے۔" اس کا اشارہ اس حادثے کی طرف تھا جس میں شہر پارک کا قاعدہ و ترپ کر کے زخمی کیا گیا تھا۔

"میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور اچانک یاد آ جانے پر پوچھا۔ "تم نے اس اے ایس آئی اور کانگنیل کے گھروالوں کو بھی قہر میں آنے کی دعوت دے دی ہے نا؟ میں چاہتا ہوں کہ اس قہر میں ان دونوں خاندانوں کے لیے مالی مدد کا اعلان کیا جائے۔ ان لوگوں کا جو نقصان ہوا ہے اسے تو میرا جیسا کیا جاسکتا لیکن ان کی عزت افزائی اور مالی معاونت کے ذریعے دوسرے لوگوں کو یہ پیغام تو دیا جاسکتا ہے کہ فرض کے لیے جان قربان کرنے والوں کی قربانی راکٹا نہیں جاتی۔" "میں سراسر انہیں نے ان لوگوں کو دعوت بھیجا دی ہے۔ قہر جب والے دن دفتر کی گاڑی انہیں لینے جائے گی۔"

عبدالمنان نے اطلاع دی۔ اسی وقت میز پر رکھا فون بجنے لگا۔ اس نے ایک فائل کو کھولتے ہوئے عبدالمنان کو کال دی۔ یہی کرتے کا اشارہ کیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ایک منٹ کے لیے بات کی اور پھر ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں نے تارڑ صاحب لائن پر ہیں سراسر آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے اپنی فائلیں کو اس احساس کو چھپاتے ہوئے ریسیور ہاتھ میں لیا۔ اس شخص کو سخت تاپندہ کرنے کے باوجود وہ اس سے بات کرنے پر مجبور تھا۔ ایک ہی منٹ میں وہ کروہ دونوں ہی ایک دوسرے سے پیشہ ورانہ فون کے ذریعوں کی وجہ سے رابطے میں رہنے پر مجبور تھے۔ سجاد راہ کی یقین دہانی کے باوجود ابھی تک کوئی ایسی انتظامی چیز کی واضح نہیں ہوئی تھی کہ تارڑ سے سخت مل جاتی۔ اس شخص کی جڑیں بھی یقیناً مضبوط تھیں اس لیے سجاد اسے ابھی تک وہاں سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"السلام علیکم اے سی صاحب! کچھ کیسے حراج ہیں آپ کے؟" اس کے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف سے معتمد تارڑ کی پڑجوش آواز سنائی دی۔

"وعلیکم السلام۔" فرمایا۔ "کیسے یاد فرمایا آپ نے؟" ایسی ہی کی گرم جوشی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے براہ راست کال کرنے کا مقصد دریافت کیا۔ "آپ کو ایک اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔ ویسے تو یہ پولیس کا معاملہ ہے لیکن چونکہ آپ پہلے ہی اس معاملے میں دلچسپی ظاہر کر چکے ہیں، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے یہ معاملہ شیئر کر لیا جائے۔ آپ پر مجھے پورا اعتماد ہے کہ آپ اس ناپ سیکرٹ معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیں گے۔"

"کیسا معاملہ؟" معتمد تارڑ کی اوجھری باتوں نے اس کے تجسس کو بھڑکایا۔ "میں ڈاکوؤں والے معاملے کی بات کر رہا ہوں۔ آپ نے جب مجھ سے اس معاملے پر بات کی تھی، تب سے ہی میں نے اس پر خصوصی نظر رکھی ہوئی تھی۔ آج ہی ایک خبر یہ اطلاع لے کر آیا ہے کہ ڈاکوؤں کا قتل رات کارروائی کرنے والے ہیں۔ ان کا نشانہ بچہ آباد، میرا بھائی آباد میں سے کوئی ایک گاڑی ہو سکتا ہے۔ خبر کو گاڑوں کے بارے میں کفرام معلوم نہیں لیکن یہ طے ہے کہ کارروائی آج رات ہی کی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ آپ سے بھی مشورہ کر لوں۔ ویسے تو میں نے اپنے طور پر پولیس فورس کے جوانوں کو ہدایات دے دی ہیں۔ ان تینوں ہی مقامات پر پولیس فورس موجود رہے گی۔"

ڈاکوؤں نے جس طرف کا بھی رخ کیا، انہیں منہ کی کھائی پڑے گی لیکن آپ بھی اس سلسلے میں انہیں کوئی ہدایت دینا چاہتے ہیں تو مجھے دے دیں۔ میں اس سے قانع نہ اٹھانے کی کوشش کر دوں گا۔" معتمد تارڑ کی دی ہوئی اطلاع واقعی بڑی زوردار تھی۔ اگر ڈاکو اس اطلاع کے مطابق قتل کارروائی کرنے والے تھے تو یہ بہت اچھا موقع تھا کہ انہیں گھیر کر گرفتار کر لیا جائے۔

"آپ نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے ہیں ذرا مجھے اس کی تفصیل بتا دیں تارڑ صاحب! تب ہی میں آپ کو کوئی مشورہ دینے کے قابل ہو سکوں گا۔" معاملہ ایسا تھا کہ وہ سارے اختلافات بھلا کر عید کی سے ایس پی کے ساتھ گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بھی باتوں میں مختصر اپنے منصوبے کی وضاحت کر دی۔ اس کی طے کردہ حکمت عملی بہت اچھی تھی اور اس کے پیچھے اس کا برسوں کا تجربہ صاف نظر آ رہا تھا۔

"دیری باتیں تارڑ صاحب! شہر پارک فوراً اسے مراد۔" آپ کی حکمت عملی بہت اچھی ہے۔ بس آپ اس بات کا خاص خیال رکھیے گا کہ پولیس فورس کے لوگ سادہ لباس میں اور بہت خاموشی سے ان تینوں جگہوں پر اپنی پوزیشن سنبھالیں۔ جس طرح میں خبر ملی ہے اسی طرح کوئی ڈاکوؤں کے لیے بھی خبری کر سکتا ہے۔ اگر انہیں پولیس والوں کی موجودگی کی ہینک بھی مل گئی تو وہ پیچھے ہٹ جائیں گے اور ہمارے ہاتھ سے انہیں گرفتار کرنے کا سنہری موقع مل جائے گا۔"

"میں خیال رکھوں گا سراسر انہیں تھوڑی سی پریشانی سے یہ کہیں تین گاڑی کو کر کے کی وجہ سے ہمیں نظری کی تھوڑی سی کامیابی ہو سکتی ہے لیکن یہ ایسا اونچا بھی ہے ہمارے پاس کڑا کو بے خبری میں آئیں گے اس لیے ہمارے جوان ان پر کم تعداد کے باوجود بھی قابو پاتے ہیں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"یہ بہت بڑا ایڈوانس ہے تارڑ صاحب! بے خبری میں کم فورس کے ساتھ بھی آپ ڈاکوؤں کی بڑی تعداد پر قابو پا سکتے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ پوری کوشش کیجیے گا کہ کسی کو گاڑیوں کا ان آپ کی کارروائی کا علم نہ ہو سکے۔" شہر پارک کے زور دے کر کہا۔

"یہ بات تو میں ابھی طرح سمجھ گیا ہوں سراسر آپ دعا کیجیے گا کہ میں کامیابی ملے۔"

"وش ہو بیٹ آف تک تارڑ صاحب!" اس نے تارڑ کی جذباتی درخواست کے جواب میں کہا اور فون بند کر کے تجسس نظروں سے اپنی طرف دیکھتے عبدالمنان کی طرف

متوجہ ہو کر اسے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

"کیوں ان لوگوں نے آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی نیا پلان نہ بنایا ہو۔" ساری بات سن کر عبدالمنان نے شک کا اظہار کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہر پارک صاحب نے جوش ہو چکا ہے اور اس سے کچھ نہیں تھا کہ وہ خود ان کارروائی میں حصہ لینے کے لیے پرتو لڑتا ہو۔

"ہو سکتا ہے شہر پارک ایک نیا ہو۔ اسی لیے میں نے ایس پی کے سامنے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا جس سے اسے لگے کہ میں اس کارروائی میں شامل ہونا چاہتا ہوں، البتہ اس معاملے کی تصدیق کے لیے میں زور دے رہی کی لیکن ان لوگوں پر نظر ضرور رکھوں گا۔" وہی نقصان پہنچنے کی بات تو تم فکر مت کرو اس بار میں ہوشیار ہوں اور پہلے سے اسی حفاظت کے لیے ایسے انتظامات کر کے جاؤں گا کہ کسی نقصان پہنچانے کی خواہش رکھنے والے اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔" اس کے اس جواب پر عبدالمنان ایک کرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس جذباتی زبان کو اس کے ارادے سے باز نہیں رہ سکتا۔

☆ ☆ ☆

رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دوامی گاڑی میں سی ڈی ایس پلی مشن کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی گاڑی سب معمولی شامیر خان اراکے کر رہا تھا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے ایک پولیس جیب بھی موجود تھی۔ اس نے عین وقت پر اپنا بیٹل بدل دیا تھا کہ اس گاڑی میں اپنی انوائس کو امین نے تارڑ سے پوشیدہ رکھے گا۔ شام کے وقت خود فون کر کے اس نے ایس پی سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اس کے لیے ہونے انتظامات کا جائزہ لینے کیوں گاؤں کا دورہ کرنا چاہتا ہے۔ ایس پی نے اس کی اس خواہش پر کوئی ترحض نہیں کیا تھا، البتہ یہ احساس ضرور دلایا تھا کہ اس کا یہ اقدام خود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ حالات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ڈاکو کی بھی وقت تھیوں میں سے کسی بھی گاڑی پر دھاوا ہو سکتے تھے اور اگر وہ کسی ایسے گاڑی میں داخل ہو جاتے جہاں وہ موجود ہوتا تو اسے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ وہ ایس پی کے اس خدشے کو خاطر میں نہیں لایا تھا اور اپنی خواہش پر قائم رہتے ہوئے علاقہ ڈی ایس پی کو اپنے پاس بھیجے کے احکامات دے دیتے تھے۔ اب ڈی ایس پی اس کے ساتھ تھا اور وہ لوگ میرا آباد اور میرا کارورہ کر چکے تھے۔ ڈاکوؤں پر ایس پی مسلسل ان لوگوں سے رابطے میں تھا۔ سوا گن فائر ہر جگہ کام نہیں کرتے تھے اس لیے ڈاکو ایس میں موٹے پڑاؤ

کار آمد تھا۔ وہ لوگ میرے سے نکلے تو ایک بار پھر ایس بی نے ان لوگوں سے رابطہ کر لیا۔ وائرلیس سینٹ ڈی ایس بی منظور کے پاس تھا۔ پہلے اس نے ایس بی سے بات کی اور اسے بتایا کہ وہ لوگ میرے سے نکلے کر اب اللہ آباد کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایس بی کی خواہش یہ اس نے شہر یار سے بھی اس کی بات کر وادی۔ شہر یار نے اس سے بات کرتے ہوئے پھر آ بار اور میر میں اس کے کچھ نئے انتظامات پر عمل اطمینان ظاہر کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے اپنے اللہ آباد جانے کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بچے پر واپس چلا جائے گا۔ البتہ ایس بی جب چاہے دفتر فون کر کے اس کے پی اے عبداللہ سے رابطہ کر سکتا ہے۔ کسی بھی جگہ کی صورت حال کے پیش نظر عبداللہ ان آج کی رات دفتر میں ہی گزارنے والا تھا۔ ایس بی نے اس پیش کش پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اطمینان دلایا کہ پولیس فورس آرام سے اس معاملے کو ہنڈل کر لے گی۔ اس نے شہر یار کو یہ احساس بھی دلایا تھا کہ رات بہت زیادہ ہو چکی ہے اور اب اسے جلد از جلد دفتر کے ان ملاکوں سے نکل جانا چاہیے۔ جو اب اس نے ایس بی کو بتایا تھا کہ دورے کی اصل وجہ کو پھانپنے کے لیے اسے دونوں گاؤں میں علاقے کے مساکین سے بچھ وقت صرف کرنا پڑا تھا۔ اس لیے اندازہ سے زیادہ وقت لگ گیا تھا لیکن اب اللہ آباد میں وہ زیادہ وقت لگنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس ساری گفتگو کے بعد ایس بی اور ان کے درمیان رابطہ منقطع ہو گیا اور وہ تعمیر جیو کی کے ساتھ مشاہیر خان سے بولا۔ "اللہ آباد جانے کی کوئی ضرورت نہیں مشاہیر خان! گاڑی شمع سے باہر جانے والی سڑک پر لے لو۔" اس کے ساتھ بیٹھا ڈی ایس بی اس حکم پر چونکا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اللہ آباد میں پولیس فورس کے لوگ موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہائی وولوں کیجیوں کی طرح وہاں بھی بہت اچھا انتظام ہو گا۔ اس وقت ہم اللہ آباد کے بجائے وہاں جائیں گے جہاں ہماری زیادہ ضرورت ہے۔"

"تو پھر میں ایس بی صاحب کو پروگرام کی اس تبدیلی کے بارے میں اطلاع کر دیتا ہوں۔ انہیں آپ کی منتہی کی طرف سے بہت گھر میں اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی ساری مومنٹ سے انہیں باخبر رکھوں۔" ڈی ایس بی نے وائرلیس سینٹ کی طرف ہاتھ پڑھاے۔

"لیکن میں انہیں اپنی مومنٹ سے بے خبر رکھنا چاہتا

ہوں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو بہت فائدہ سے ملے رہیں گے۔ آخر آپ کوئی تو ایسے کسی کارٹا سے کی ضرورت ہوگی تا جس کے بعد آپ کا ڈی ایس بی سے ایس بی بننے کا سفر آسان ہو جائے۔ اگر آپ ایس بی صاحب کے امکانات کی قبیل میں گھرے تو آپ کا کارٹا ذرا ایسے کارٹا مومنٹ سے خالی ہی رہے گا، اس لیے بھرے کہ آپ میری بات مان لیں۔" ڈی ایس بی کا وائرلیس کی طرف بڑھتا ہاتھ تمام کردہ مٹی نیر لچکے میں اس سے بولا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا سکتا۔" وہ اس کی بات پر مزید الجھا ہوا نظر آنے لگا۔

"میرا مطلب بہت واضح ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو ڈراما آپ کے ایس بی صاحب نے رچایا ہوا ہے، میں اور آپ اس سے بے وقوف نہ بنیں اور اس جگہ تک جائیں جہاں اصل کھیل کھلے جا رہا ہے۔ اب تک جو ہم آپ کے ساتھ ادھر ادھر کھوئے ہیں وقت برباد کرتا رہا ہوں، وہ صرف اس لیے تھا کہ مجھے اس ڈرامے میں اتنا لوگرنے والوں کو یقین آجائے کہ میں ان کے جانے ہوئے جاؤں۔ اس لیے بے وقوف بن گیا ہوں لیکن یہ سچی نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کو جلد پتہ چل جائے گا۔ پس اس کے لیے آپ کے تھوڑے سے تعاون کی ضرورت ہے اور یقین چاہیے اس تعاون کے نتیجے میں آپ نقصان میں نہیں رہیں گے۔" وہ دھیرے دھیرے ڈی ایس بی کو سارا بیان سناتا ہی سمجھانے لگا۔

آج شام ہی انور نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ بڑے لوڈز کے ذریعے لکڑی اور کھالیں باہر بھیجی جاری ہیں۔ اپنے دعوے کے مطابق وہ آتی کارٹا مٹاوت ہوا تھا اور عین وقت پر ایک اہم اطلاع فراہم کر کے اسے ایس بی کی چال میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔ انور کی کال کے بعد وہ اچھی طرح سارا معاملہ سمجھ گیا تھا لیکن ایس بی کو بدستور یہ تاثر دیتا رہا تھا کہ وہ اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکا ہے، اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے باقاعدہ ہی اللہ آباد میر کا دورہ بھی کر ڈالا تھا لیکن اب اللہ آباد جانے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب رات کا وہ حصہ شراعت ہو چکا تھا جب اس کا اس مقام پر پہنچنا ضروری تھا جہاں لوڈز کو روکا جائے۔

"میں آپ کی ساری بات سمجھ گیا ہوں سراسر مجھے آپ ساتھ دینے پر ہی کوئی اعتراض نہیں لیکن اس کام کے لیے ہمارے پاس کئی بہت کم ہے۔ ان دونوں لوڈز کے ساتھ ہم افراد ہو سکتے ہیں۔ لوڈز کو روکنے اور ان افراد سے نکلنے کے لیے ہمیں ذرا دھڑکی کی ضرورت ہوگی۔" ساری بات سن کر ای

دعا مندی ظاہر کرنے کے ساتھ ڈی ایس بی نے ایک اہم مسئلے کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ اسے معلوم تھا کہ ڈی ایس بی راضی ہو جائے گا۔ حالانکہ اسے بھی اندازہ تھا کہ اب تک وہاں جو کچھ ہوتا رہا تھا اس سے ڈی ایس بی کی عمل طور پر تا وقت نہیں ہو گا۔ وہ چاہتا ہو گا کہ یہاں سے لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگل ہوئی رہتی ہے لیکن اپنا کچھ نہ کچھ حصہ لے کر کچھ پوٹی اختیار کر لیتا ہو گا، مگر اب اس نے اسے جو آفر دی تھی، وہ زیادہ پڑی تھی۔ اس کی پشت پناہی میں وہ یہ کارروائی کرتا تو خود اپنے اوپر والوں کے قصاب سے بھی محفوظ رہتا اور مفت میں ایک کارٹا بھی اس کے حصے میں لکھ دیا جاتا۔ مجھے کی طرف سے اس کارٹا سے کوہرا ہے جانے کے ساتھ میں نے باکی طرف سے جو پڑی تھی وہ اس کا کارروائی کا ایک اور پلس پوائنٹ ہوتی۔

"لکڑی کی طرف سے آپ فکر نہ کریں۔ نو روٹ کے قحطی کا کچھ عملی سنگی بھی صورت حال سے منہ بٹنے کے لیے میں نے قحطی میں رکھنے کی ہدایت دی تھی۔ وہاں ایک آدھ کاٹھیل کو پھونڈ کر ہم باقی بندوں کو اپنے ساتھ لے سکتے ہیں۔ پس اس انتظام کرنا ہو گا کہ کسی کو ان بندوں کے ہمارے ساتھ جانے کا فوری طور پر علم نہ ہو سکے۔ اس کے لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ وقتی طور پر قحطی کے فون کو کارٹا کرنا دہ کر دیا جائے گا۔ جب وہاں سے کسی کارٹا میں نہیں ہو گا تو یہ بھی نہیں پتا چلے گا کہ ہمارے ساتھ کوئی کیا ہے۔" وہ پورا لاٹھلے لے کر چکا تھا۔ ڈی ایس بی اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرتا چلا گیا۔ جلد وہ لوگ سارے انتظامات کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں انہیں لوڈز کو روکنا تھا۔ اس بار وہ پہلے کے علاقے میں زیادہ تر امید تھا اس لیے جوش بھی زیادہ تھا۔ ان کے ساتھ موجود پولیس کے جوانوں نے سڑک پر رکاوٹیں لکڑی کر دیں۔ اب کوئی بھی گاڑی بغیر چیکنگ کے وہاں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ اس سارے عمل کے دوران ایک بار پھر ایس بی کی کال آئی تھی اور ڈی ایس بی نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ اسے صاحب تھک گئے تھے اس لیے اللہ آباد کا دورہ کیے بغیر ہی اپنے بچے پر واپس چلے گئے۔ خود اپنے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اور گروے کسی قحطی میں موجود ہے گا اور جیسے ہی انہیں پڑاؤ کوئی کی آمد کی اطلاع ملے اسے ساتھ موجود سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔ ایک بات کے بعد وہ بارہ ایس بی نے رابطے کی زحمت نہیں کی تھی اور وہ لوگ پورے اطمینان سے اپنے کام کر رہے تھے۔ انہیں بہت زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور سڑک پر دو قریبی سیکل لوڈز آگئے پیچھے دوڑتے اس طرف

آتے نظر آئے۔ آگے والے لوڈز نے رکاوٹ کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد بریک لگائے۔ پتہ سڑک پر جو یہ رکاوٹ ان کے لیے بالکل شیریں منع تھی۔ انہیں کوئی کہہ کر بھیجا گیا ہو گا کہ وہاں راستہ بالکل صاف ہے۔ معمول کے مطابق ڈی بی پر رے والے بھی آج موجود نہیں کہ انہیں لکڑی کی کوئی کارٹا نہ کر کے آج رات کی کوئی جگہ کھپا دیا گیا ہے۔ ایسے میں اچانک راستے میں آنے والی یہ رکاوٹ ان کے لیے پریشان کن ثابت ہوئی ہوگی۔ آگے والے لوڈز کے رکنے کے بعد پچھلے لوڈ بھی خود بخود رکتا پڑا تھا۔

"کیا بات ہے سنو؟" انہیں بار بار راستہ کیوں نہ کر کے کھڑے ہو؟" ان کے لڑک ڈرامہ نے لکڑی سے جواب کر قریب آنے والے اجا سے پوچھا۔

"ہیں ان لوڈز کی سلائی لٹی ہے۔ تم لوگ پیچھو تاکہ ہم اپنا کام کر سکیں۔"

"او یا ر جڈا اس حلاشی ولائی کو... ہم لوگ جلدی میں ہیں۔ کچھ سے کمر مائد کر۔... کیوں بے کار میں رہا ہمارا وقت برباد کرتا ہے۔"

اس بار ڈرامہ کے ساتھ والی سینٹ پر بیٹھے آئی نے منظر میں داخل دیتے ہوئے سیاہی کو لگا دیا لیکن ظاہر ہے، وہ اس پیش کش کو ٹھکرانے کی پڑائی میں نہیں رہا تھا جو اب لٹی سے بولا۔ "کیوں بند کر اؤ۔... ہمیں خبری ہے کہ ان لوڈوں پر غیر قانونی مال جا رہا ہے۔ ہمیں ہر حال میں ان کی سلائی لٹی ہے۔"

"تیرے باب میں بھی وہ نہیں کہہ کر دوسری سلائی لے سکے۔ ہم ایس بی کی بھی کر کے رکاوٹیں سے تم لوگوں کی۔" وہ شخص چمکارتا ہوا ہاتھ میں رہے والوں کے نیچے اترا لیکن ذرا ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سامنے نظر آنے والے دو تین سپاہیوں کے علاوہ بھی پولیس کے بہت سے جوان ان کے گرد موجود ہیں جنہوں نے انہیں گھیر لیا ہے۔

"تم لوگ گھر سے جا چکے ہو بھرے کہ جتھہ اڑال دو اور خود کو قاتلوں کے دالے کر دو۔" انور ای پلندہ آواز میں کہا گیا اعلان بھی سنائی دیا جس کے بعد کی ٹلک کی گھنٹی گئی تھی یہی رہی کہ وہ لوگ پھنس چکے ہیں۔ انور ڈرامہ بروں سینٹ دو گھن چاہتے اور جس انداز میں پولیس والوں نے انہیں گھیرا تھا اس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ ان کے بارے میں باخبر تھے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ پولیس کی لکڑی کم ہوتی۔ انہیں اپنے پچھ جانے کا شہت سے احساس ہوا لیکن وہ جتھہ اڑال کر خود پولیس کے دالے بھی نہیں کر سکتے تھے،

اس لیے گھبراہٹ میں فوری طور پر فائرنگ شروع کر دی۔ فوراً ہی پولیس کی طرف سے بھی جوابی فائر ہوا لیکن وہ لوگ بہت محتاط فائرنگ کر رہے تھے۔ شہر پارے اس سلسلے میں خاص ہدایت دی تھی۔ وہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا تا کہ ان کے ذریعے اصل افراد تک پہنچا جاسکے۔ اس احتیاط پبندی نے مجرموں کو موقع دے دیا کہ وہ موقع سے فائدہ ہونے کی کوشش کریں۔ وہ افراد اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے۔ فائر کرتے ہوئے انہوں نے پہلے آہستہ آہستہ سڑک چھوڑی پھر کچے میں اتار کر اندر چلے گئے۔ تیسرے نے بھی اپنے ساتھیوں کی پیروی کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یہ موقع نہیں دیا گیا۔ دور انگلو سے یہ ایک وقت فائر ہوئے۔ ایک گولی اس کے پیچ میں لگی اور دوسری پشت میں گئی۔ گولیاں کھاروہ ایک جھٹکے سے گرا اور پھر حرکت نہیں کی۔ شاید پشت پر کتے والی گولی نے دل تک رسائی حاصل کر کے اس کی زندگی کا پران گل کر دیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر جو تھے بندے نے اتھار بھینک کر ہاتھ اٹھا دیے۔ فوراً ہی پولیس کے جوانوں نے اسے گھیر کر اس کے ہاتھوں میں جھکڑی ڈال دی۔ دہی قرض کا معاملہ کیا گیا تو وہ مرد چکا تھا۔ دونوں لوڈ روز کارسری سا جائزہ لینے کے بعد ہی یہ بات سامنے آئی کہ انور کی دہی قبی اطلاع بالکل درست تھی۔ لوڈ روز بروقی مالی لدا ہوا تھا جس کو اسے دنوں سے پکڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کامیابی پر شہر پار کا چہرہ ہنسنے لگا۔ ڈی ایس بی منظور بھی بہت خوش تھا۔ اس ساری کارروائی میں اسے بھانگ دوڑ دیکھ خاص نہیں کرنا بڑی تھی لیکن کریڈٹ پورا پورا اسے ہی ملا۔ شہر پار اس پورے عیس میں خود سامنے نہیں آسکتا تھا۔ ساری ستائش پولیس کے حصے میں ہی آئی تھی۔

”اسے کسی محفوظ جگہ رکھنا۔ یہ بڑے کام کا بندہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی مدد سے ہم اہم مجرموں تک پہنچ سکتے ہیں۔“ گرفتار شدہ شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے ہدایت دی جس کے جواب میں ڈی ایس بی نے بڑی فرماں برداری سے اشیاء میں سر ہلا دیا۔ اس وقت وہاں بڑی ڈیل چلی ہوئی تھی۔ گرفتار شخص کو محفوظ مقام پر پہنچانا، عروہ آدمی کے لیے اسے پولیس کا انتظام اور مقامی میڈیا کو پولیس کی اس کارروائی سے آگاہ کرنے کے مسائل درپیش تھے۔ مختصر فوری کے ساتھ یہ سارے معاملات نٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مفرور افراد کے پیچھے جانے والے بھی اندھیرے میں ٹانگ نوٹیاں مار کر آچکے تھے۔ ان لوگوں کے فرار ہو جانے کا اسے افسوس تھا لیکن جتنی بڑی کامیابی ملی تھی، اس

کے مقابلے میں یہ بھونٹا سا نقصان برداشت کیا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے آپریشنز میں ایسی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کا مار جین رکھنا ہی پڑتا ہے۔

”سیر اور ایس بر کال آ رہی ہے۔“ وہ لوگ ابھی ان معاملات کو دیکھ ہی رہے تھے کہ مشاہیرم خان نے آکر اطلاع دی۔ ڈی ایس بی کا ڈرائیو بیٹ اسی کی گاڑی میں تھا۔ اس اطلاع پر اس نے سوائی نظروں سے شہر پار کی طرف دیکھا اور اس کی طرف سے کال ریسیو کرنے کا اشارہ ملنے پر خود گاڑی کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر کھیرا ثرات تھے۔ وہ کچھ پریشان بھی لگتا تھا۔

”خیریت؟“ شہر پار نے پوچھا۔

”ایس بی صاحب تھے۔ نور پور گاڑی پر ڈاکوؤں نے حملہ کر کے وہاں پر کافی لوٹ مار مچائی ہے اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ڈاکوؤں کی وہاں آمد کی اطلاع بہت دیر سے ملی۔ اطلاع ملنے کے بعد بھی فوری طور پر کارروائی نہیں کی جاسکی۔ ضلع کی زیادہ تر پولیس پیر آج، میرا اور اللہ آباد کی حفاظت پر مامور تھی۔ نوکوتھانے میں موجود فوری کو بھی ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ پھر تھانے کا فون بھی نا کارہ تھا اس لیے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ دوسری جگہوں پر موجود پولیس کے جوان جب تک نوک پور پہنچے۔ وہاں سارا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ ایس بی صاحب خود نوک پور میں ہیں اور مجھے بھی وہیں کال کیا ہے۔ اس نے اطلاع دی تو شہر پار بھی سشندردہ گیا۔ وہ تو مجھ پر ہاتھ ڈاکوؤں کا ہوتا کھار کے لکڑی اور کھالوں کی اسٹینٹک کی طرف سے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی تھی ہے لیکن وہاں تو بیچ ڈاکوؤں نے کارروائی ڈال دی تھی، البتہ جن جگہوں کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی، ان سے بہت کراہل مختلف جگہ پر یہ کام ہوا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈاکوؤں کو پولیس کے تاک میں بیٹھے ہونے کی خبر ملی تھی اس لیے انہوں نے اپنا رخ بدل لیا تھا یا اصل ذرا مہی اس طرح چلان کیا گیا تھا۔ یہ بات کوئی بعد ازاں مان نہیں تھی مگر ڈاکوؤں کے حملے کا ڈراما بیچ اس کی توجہ ہٹانے کے لیے ہی بنایا گیا ہو اور اس ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے نور پور کو ناگٹ بنایا گیا ہو۔ اس طرح ذرا سے حقیقت کا بھی گمان ہوتا اور ڈاکو بھی محفوظ رہے جیسا کہ ہوا بھی تھا۔ زمینداروں، پولیس اور ڈاکوؤں کا آپس کا کچھ جوڑ کوئی بات تو نہیں تھی۔ تینوں گروہوں کے لوگ آپس کے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کی مدد بہ وقت ضرورت کرتے ہی رہتے تھے۔

”آپ نے ایس بی صاحب کو یہاں کی صورت حال کے بارے میں آگاہ کیا تھا؟“ نور پور میں یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد اس نے ڈی ایس بی سے پوچھا۔

”نور پور وہ اتنی جلدی میں تھے کہ اپنی بات کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

”انہیں آپ کے بتائے بغیر بھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو ہی جائے گا۔ بہتر ہے اس تھوڑی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر آپ اپنا کام مکمل کر لیں۔ میں خود اپنے ڈرائیور کے ساتھ نور پور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ آپ سے اس بارے میں کسی بھی قسم کی جواب دہی کی جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ بھی کیا گیا، اسے ہی صاحب کے کہنے پر کیا گیا۔ آپ کے نور پور نہ پہنچنے کی وجہ میں خود ایس بی صاحب کو بتا دوں گا۔“

ڈی ایس بی کا جواب سن کر اس نے اس سے کہا کہ تیز تیز قدموں سے چلا ہو اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ضم پر مشاہیرم خان نے گاڑی کو ہوائی جہاز بنادیا۔ فریٹ بھری ہوئی گاڑی جس تیزی سے نور پور کی طرف دوڑ رہی تھی، اسی تیزی سے اس کا ذہن بھی دوڑ رہا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا ہے، اس پر سارے لوٹ افراد بڑی طرح تھلا میں گئے۔ بہر حال، وہ انہیں دیکھ تو پہنچا ہی چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ گرفتار ہونے والا شخص کن ہاتھوں کی نشان دہی کرتا ہے اور اس شخص کے بیان کی بنیاد پر اس جرم میں ملوث کن افراد پر گرفت کا جاسکتی ہے؟ اپنی اس کامیابی کے ساتھ ساتھ اسے نور پور کی بھی گہرا تری تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں ڈاکوؤں نے جانے کتنی تباہی مچائی ہوگی؟ غریب دیہاتیوں کو پہنچنے والے نقصان کے خیال نے اپنی اتنی بڑی کامیابی کی خوشی کو مائع کر دیا تھا۔

☆☆☆

”میرے بچا یہ حربے سے نہیں ہیں۔ یہ حربے یہود و نصاریٰ بھی ہم پر آزماتے رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی خوراک، تعلیم اور صحت کے لغزے لگاتے ہوئے آتے ہیں اور انسانی جہد کی آڑ میں معصوم لوگوں کے ذہنوں کو تباہی میں کر کے انہیں اپنا مسمول بنا لیتے ہیں۔ ان کا کارہ اصل مقصد ہمارے لوگوں کے عقائد کو بدل کر انہیں اپنے مذہب میں شامل کرنا ہوتا ہے۔ اب انہوں نے ایک اور چال چلی ہے۔ ان کا منصوبہ ہے کہ بے شک مسلمان اپنا مذہب نہ چھوڑیں لیکن ان کے عقیدے اس طرح بدل جائیں کہ وہ بس نام کے ہی مسلمان رہ جائیں۔ اس کام کے لیے وہ ایسے روشن خیالی کاراگ لاپنے والے مسلمانوں کا استعمال کر رہے ہیں جنہیں تم اپنے

علاقے میں آج کل سرگرداں کر رہے ہو۔ ہمارے علاقے کا کیا اسے یہ بھی انکی لوگوں میں سے ہے۔ مجھے بھالے لوگ بڑے متاثر ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ اسی ان کی بھلائی کے کام کر رہا ہے لیکن انہیں نہیں معلوم کہ اس کے بتائے ہوئے اسکولوں میں جو تعلیم دی جائے گی، اس سے مسلمان بچاں کا ذہن خراب ہو جائے گا۔ وہ اپنے ذہن اکھول جائیں گے۔ اس چال باز اسے کیا پتا تھا؟ ایسے کرانے سے بچاں کوئی اللہ رسول سے ڈرنے والا نہیں۔ ان کی محفلوں میں کھلے عام شراب پی جاتی ہے، عورتوں کو گھسیا یا جاتا ہے، جو اکھلا جاتا ہے۔ ان کے بیٹک اکاؤنٹ حرام کی کتاب سے بھرے ہیں۔ ایسے بے دین شخص سے کیسے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اس کا کوئی کام مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہوگا۔“ مجھری ڈاڑھی والا وہ شخص اپنے سامنے بیٹھے چار باج لڑکوں سے بڑے نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ان لڑکوں میں سے کسی کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بہت توجہ سے اس شخص کی باتیں سن رہے تھے۔

”انکر مولانا صاحب آج کل تو ہرے ضلع میں سے اسے کی بڑی اہم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک ایمان دار اور مجاہد افسر ہے۔ اسی کی وجہ سے یہاں سے ہونے والی لکڑی اور کھالوں کی اسٹینٹک کا بیجا ڈھونڈا ہے۔“ تقریباً چودہ سال کے ایک گور سے بچہ لڑکے نے جس کی سسپن ابھی پہنچی شروع ہوئی تھی، کا تودہ شخص ایسے انداز میں مسکرایا جیسے کسی بچے کی نوابی پر مسکرا جاتا ہے اور پھر پہلے سے بھی زیادہ پُرسخت لہجے میں بولا۔

”بھئی تودہ جھٹکندہ جن میرے بچے جن سے وہ لوگوں کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ سارے میں اس کی داد دہا ہوگی لیکن دیکھو ابھی تک کھل کر کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ یقیناً اندر ہی اندر اس نے اور پولیس نے اسٹینٹکوں سے سک دھا کر لیا ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ بال بچا ابھی اس لیے عیا ہوگا کہ اسٹینٹک اس کی مرضی کا پڑا نہیں و سارے ہوں گے۔ تم لوگ، کہہ لینا کہ آئندہ ایسا ہو نہیں سکتا۔“

”میرے بس میں ہوتی ہیں ایسے ہمار لوگوں کو جان سے ماروں۔ ایسے دو چار سے جائیں گے تو ان کے ہائی ساتھیوں کے راج خود، خود ہی ٹھکانے آجائیں گے۔“ جذبات کی شدت سے سر ہلاتے چہرے کے ساتھ تیز لہجے میں یہ جملہ بولے وہ لڑکا کی کوئی چودہ پندرہ سال کا تھا۔ کھل سے میرے بچے اٹھلے۔ میں بہت سوچ سمجھ کر ان لوگوں سے غمناک ہوگا۔ یہ بڑے بچے والے لوگ

ہیں۔ تمہاری طرح خود میرا دل بھی غصے سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں نے مولوی غلام محمد پر جو رکیک الزام لگایا ہے، اس کے بارے میں سوچنا ہیوں تو جین جیل اٹھتا ہے۔ ایک معلم اور مسجد کے امام پر ایسا ایسا گندہ الزام انہوں نے لگایا ہے اس لیے ہے کہ لوگوں کا دل مذہبی ذہن رکھنے والے افراد کی طرف سے خراب ہو جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ پولیس جو چاہے وہ کر سکتی ہے۔ جاتے انہوں نے کب کس طرح اس معصوم بچے کو غائب کر کے اسے جان سے مارا اور پھر لاش مولوی صاحب کے گھر سے دریافت کر لی۔ بے چارے مولوی غلام محمد سیدھے سادے سے آدمی تھے۔ وہ اس سازش سے کیسے منتہی۔ بے چارے اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھے ہوں گے؟ وہ جو پیر آقا دین کا کافی عرصے سے ماسٹر لوگوں کے دماغ خراب کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی تو بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ مسجد والا بدرہہ بند ہو جائے۔ اب اس سازش کے بعد تو ظاہر ہے اس کا مطلب پورا ہی ہو گیا ہوگا۔ میرے خیال میں تو وہ ماسٹر بھی اس سازش میں اسٹینٹ کشنر کے ساتھ شامل ہوگا۔ بہر حال جس نے جو کچھ کیا ہے، ایک دن ضرور پکٹے گا۔ پس سمجھ لو کہ ابھی ان کفار کے آگے کاروں کی دہشت راز ہے۔ جس دن دہشت مچ گئی، سب کا دم تاگ میں آجائے گا۔" وہ لہجے میں بڑی حلاوت لیے ان معصوم ذہنوں میں ڈر بھر رہا تھا۔

"کیا ہم ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے مولانا صاحب؟ اپنے دین کے خلاف سازش کرنے والے ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنا تو ہم سب پر فرض ہے۔" وہی لڑکا ایک بار پھر جوش سے بولا۔

"اس کے لیے بڑے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔ جہاد جہاد پکارنا آگے بات ہے لیکن وقت پڑنے پر جان کی بازی لگانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔" اس نے جانتے والی نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکوں کو دیکھا۔

"وقت پڑنے پر ہم اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں۔ ہمارا جذبہ صرف زبانی نہیں ہے، ہم عمل کی بھی ہمت رکھتے ہیں۔" ان میں سے دو تین لڑکے ایک ساتھ بول اٹھے۔

"شاہاش میرے بچے! ہمارے دین کو تمہارے ہی جیسے جانناڑوں اور دیروں کی ضرورت ہے۔ مجھے فکر ہے کہ تمہارے اندر یہ ہمت اور جذبہ میری تربیت نے پیدا کیا ہے۔ تمہاری وجہ سے میری آخرت بھی سنور جائے گی۔" لڑکوں کے اس جذبے پر وہ آہ دیدہ وسا ہو گیا۔

"پھر آپ ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں مولانا صاحب؟

ہم ہمد سے جلد کچھ کرنا چاہتے ہیں۔" لڑکوں نے اصرار کیا۔ "ابھی نہیں میرے بچے! ابھی حوصلے اور عمل کا وقت ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں خود تم لوگوں کو بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی تم لوگ انتظار کرو۔" اس نے لڑکوں کو ڈالا پھر کمرے کی دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ اب تم لوگ گھر جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ میں بھی کچھ دیر کے لیے آرام کروں گا تاکہ تھک کے لیے اٹھ سکوں۔" اس حکم پر لڑکے فرمایاں برواری سے اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور عقیدت سے اس کے ہاتھ کی پشت چوم کر رخصت لینے لگے۔ اس نے بھی ہر لڑکے کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیر کر ہر ایک کے لیے انفرادی طور پر نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

"عبدالستین! پترا آج تم سیکل رک جاؤ۔ آج میرے ساتھ ہی تھجد اور خیر پڑھنا۔" ان لڑکوں میں سے سب سے زیادہ بڑے جوش نظر آنے والا لڑکا جب آخر میں اس سے رخصت لینے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے بہت محبت سے اسے حکم دیا۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کرنا تو اس پر فرض تھا اور پھر ان کے ساتھ عبادت میں شریک ہونا بھی ایک سعادت تھی جس سے وہ بھی کبھی کسی لڑکے کو نوازتے تھے۔ اس رات عبدالستین کو نہ صرف یہ سعادت نصیب ہوئی بلکہ ایسا بہت کچھ سننے کو ملا جس کو سن کر اس کے چلنے پھرنے میں سکون سا اثر آیا۔

☆ ☆ ☆

"اور سنا رکھو! چڈکی کیا خبریں ہیں؟ بڑے دنوں سے تو نے کہیں کی کوئی خبر ہی نہیں دی۔" بڑی چودھرائی نے فرش پر ایک طرف بیٹھی، اپنے دوپٹے کے کنارے پر تل ٹانگی رکھتے سے پوچھا۔ اس وقت وہ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے لیتی ہوئی تھی اور ابھی اس کے چہرہ دیا راقی تھی۔

"چڈکی کیا کوئی نئی خبر ہوئی ہے جی! جب سے غیائے کے پتر والا مالہ (معالف) ہوا ہے، ہر طرف چپ گئی ہے۔ نوراں (بہن) سمجھو بدھ کھوٹتی ہے۔ غیاہ بھی گپ چپ سا ہو گیا ہے۔ زہرہ بھی ایسی آکر مال بیو کو دکھ جاتی ہے، براسل میں اسے مہاں کی باہر کی کمانی کی ہوا لگتی ہے اس لیے پکے میں زیادہ دل نہیں لگتا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے دو بیویاں تاروالا فوج میں لے لیا ہے۔ اس پر روز میاں سے بات کرتی ہے۔" "اے موہاں! کہتے ہیں اماں۔" چودھرائی کے ہنسنے پر وہ بانی بھیجی نے درمیان میں قطعہ دیا۔

”اے ہاں، وہی موہیل۔ اسی پر لگی رہتی ہے یا پھرانی وی دیکھتی رہتی ہے۔ اب ایسے سڑے پھوڑ کر بھلا وہ روز روز کیوں جانے لگی۔ چھوڑا ہوا ہے ہاں پتھوکان کے حال پر۔“

”پھوڑنے لوگوں کو بکھول جانے تو وہ ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ نئے نئے والے روپے کی چمک انہیں آپے میں نہیں رہنے دیتی۔ زہر کو بھی میں دیکھ رہی ہوں۔ جب سے دیا ہوا ہے، تو جی میں آکر مجھ تک نہیں۔“ بڑی چودھرائن نے جھلنے ہوئے کچھ میں تبصرہ کرتے ہوئے ٹھوہ کیا۔

”آہو جی، تو آپ سولہ آئے ٹھیک دن رہی ہیں۔ میں تو زہر کا حال دیکھ کر ستر کر رہی ہوں کہ وہاں تو زیادہ زہر ہو چکی ہو میں نہیں آسکتی۔ زہر تو اتنے سے روپے با کر ہی آپے سے الٹی باہر ہو گئی ہے کہ سید سے مدد بھی نہیں کرتی۔“

گر جو وہ دوسری سالن بن کر حویلی آجاتی تو جانے مارے ساتھ کیسا سلوک کرتی؟“ چودھرائن کی پال میں ہاں ملاتے ہوئے رشتے نے ایک ایسی بات پھیندی جس کو چودھرائن ماہ پاؤ کی موت کے بعد بھی نہیں بھلا سکتی تھی۔ کہنے کو اس معاملے کو سب لوگوں سے چھپایا گیا تھا لیکن حویلی میں کام کرنے والے خود یہ خودی اس قصے سے واقف ہو گئے تھے اور رشتے اور اس کی شایاں تو جس بھی ذرا بڑی چودھرائن کی سر پر تھی۔ حویلی کے بہت سے راز وہ خود انہیں بتا دیتی تھیں لیکن اس وقت اسے یہ ذکر برا لگا تھا۔ اپنی ناگواری کا اظہار کرنے کے لیے وہ ہیر دانی بھی پرچہ دھڑکی۔

”میں نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں؟ ایسے پلے پلے ہاتھوں سے ہیر داب رہی ہے جیسے چارون سے قاتلے پر ہے۔“ اس نے اپنی ٹانگ اس زور سے جھگی کے پلو میں ماری کہ وہ جھٹکے سے دور جا کر گئی۔

”ٹھیک سے ہیر دیا م بخت ورتہ میں تیرے ٹوٹے ٹوٹے کر دوں گی۔ جن کا کھانی ہے ان کی خدمت نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟ دیکھنا نہیں غیاث کے خاندان کا حال۔ ماہ یا نو نے سرگشی دکھائی تھی، اس سمیت پورے خاندان پر ہیر سرکار کا قہر نازل ہو گیا۔“ رشتے نے ٹھک جلائی دکھانے کے لیے فوراً اپنی کوہ پڑھ رکھا ہے تو نے بے بھاد کی ستائی۔ وہ دونوں طرف کی مار کھا کر نہ بنائے بغیر ایک بار پھر چودھرائن کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے پیچھے دبانے لگی۔ اس بار وہ زیادہ زور لگا دیا تھا۔

”ناف (معاف) کر دیجیے گا اسے چودھرائن بی! اصل میں آج کل ان دونوں بہنوں پر کام بھی تو بہت بڑھ گیا ہے۔ نور ان نے جب سے حویلی آنا چھوڑا ہے، اس کے جھے

کا کام بھی میری اصریاں ہی پڑتی (عثمانی) ہیں۔ وہ رانی کی بچی تو کسی کام جو کی ہے ہی نہیں۔ سارا وقت شہرہ بی بی کے کمرے میں کھڑی چالوئی کرتی رہتی ہے۔ اور تو اور اب تو اس نے ان کی تمام بھی لے کر پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ میری بھی اور شاہو سپدی مادی ہیں۔ انہیں کام سے ہٹنے کے لیے یہ چالاکیاں کرتی ہیں آتمی کشہر بی بی کے آگے پیچھے کوئی رہیں۔ کچھ کل ہے ہی تمام تو آپ کوئی حویلی کا اصل مالک سمجھتے ہیں اس لیے سب سے زیادہ آپ کی ہی خدمت کر کے خوش ہوتے ہیں۔“ رشتے اب اپنی بی بی کی صفائی دیتے ہوئے بڑی چالاک سے دوسروں کے خلاف چودھرائن کے کان بھر رہی تھی۔ ان پر اھ اور مغرور چودھرائن خور اس کی باتوں میں آگئی اور غصے سے بولی۔

”اس رانی کی بی بی کا تو میں ایک منٹ میں دماغ ٹھیک کر دوں گی، پر پہلے مجھے کشہر کا بھی کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ مظلوم کہہ کر اس کا دماغ بھی آسان پر چلا دیا ہے سب نے۔ اس کا جو جی چاہتا ہے، منوائی ہے۔ تاہم بھی ہر وقت دھکی کی سفارش ہی رہتی ہے۔ مجھے بھی خوشامدیں کر کے رانی کر لیتی ہے کہ میں چودھرائی صاحب سے اس کی دھکی کی ضد میں منوانے کے لیے سفارشی کروں، پر میں نے ہی اب سوچ لیا ہے کہ اس کڑی کواب ذرا قابو میں کرنا ہے ورنہ یہ زیادتی سر پر چڑھ جائے گی۔“ بڑی چودھرائن کا سا بیلا پلہ اس وقت اس کے لپٹے سے جھانک رہا تھا۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں دوڑی چودھرائن ایوں تو میں توکر ذات ہوں اور میرا کچھ کہنا چھوٹے منہ سے بڑی گل کاٹنا ہے، پر یہ تو زمانے کا دستور ہے کی کہ دھکیوں کو ذرا بانڈھ کر رکھو، تب ہی خاندان کی عزت سلامت رہتی ہے۔ آپ جو آپ لوگوں نے کشہر بی بی کو موہیل بھی کر دے دیا ہے تو یہ تو انہیں دوڑی آزادی دینے والی گل ہے جی۔“

”کیا کہا تو نے۔ کیا ہے کشہر کے پاس؟“ بڑی چودھرائن چونک کر جلدی سے سیدی ہوئی۔

”موہیل بی، اسی بغیر چار والا فون۔ کیا آپ کو نہیں معلوم؟ جھے لگتا ہے چھوٹی چودھرائن نے آپ سے چوری چھپ کر دھکی کو موہیل دلوا لیا ہے۔“ بچی اور شاہو کی بھائی کے بیٹے میں کشہر کے پاس موہان کی موجودگی کا راز ان لوگوں پر چھل گیا تھا۔ ساتھ ہی اسے چوری چھپے موہیل پر بات کرنے دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھ چکی تھیں کہ اس کے پاس موہان کی موجودگی سب کے علم میں نہیں ہے۔ ہر وقت فون دھکیوں والی ماں شایاں کشہر کے ہلے ہوئے انداز پر ویسے ہی

ہوتی تھیں۔ اس کے پاس موہان کی موجودگی کا علم ہوتے ہی ان کے بیٹے میں کھد بد ہونے لگی۔ آج صبح دیکھتے ہی رشتے خور اس بات کو بڑی چودھرائن کے علم میں لے آئی۔ اس قسم کی لٹائی بجھائی یوں بھی اس کی نفرت میں شامل تھی اور یہاں تو اس کے نتیجے میں مالکان سے قربت بڑھانے کا موقع مل رہا تھا، چنانچہ اس نے بہت چالاک سے اس بات کو بڑی چودھرائن کے گوش گزار کر دیا۔ نتیجہ حسب توقع تھا۔ چودھرائن نے اسے اچھے ٹھیک ٹھیک جس کا مطلب تھا کہ اس نے اس اطلاع میں گہری دلچسپی لی ہے۔

”کل سن رشتے اگلی اور کو یہ سب مت بتانا۔ بس تو اور تیری بیٹیاں مل کر چپکے سے نظر رکھنا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھرائی صاحب سے بھی چھپا کر یہ کام کیا گیا ہے۔ وہ تو عورتوں کو فون کے پاس بھی آسانی سے نہیں جانے دیتے، بھلا کشہر کو موہیل کیسے دلا سکتے ہیں؟ یقیناً تاہید نے چھپ چھپا کر اپنی دھکی کو موہیل دلایا ہے یا پھر ہو سکتا ہے اسے بھی خبر نہ ہو۔ کشہر اتنی بار کتا ہیں شایاں خریدنے کے بھانے شہر جاتی ہے، وہیں چپکے سے اس نے موہان بھی خرید لیا ہوگا۔ تو میں کسی طرح اصل گل معلوم کر لے اور نظر رکھ کر کشہر کس سے گل کرتی ہے۔“ اس نے فوراً رشتے کو ڈسے دانی سوچنی تھی اس نے خود پشانی سے قبول کر لیا۔

”نور پور میں ساری تیار ہاں مکمل ہیں، مہمند المان؟“ قیال رکھنا کہ اس موقع پر کوئی بد مزگی نہ ہو۔ ڈاکے کی واردات کے بعد ویسے ہی میڈیا والے بڑی تنقیدیں کر رہے ہیں۔ ایس بی بھی کھٹکنا چھٹا سا ہے۔ اس رات لوگوں نے خاندان میں موجود دھکی کو بغیر اس کے علم میں لائے اسٹورز کے خلاف استعمال کرنے کے معاملے کو اس نے خوب ہوا دی ہے۔ اس کی باتوں سے میڈیا نے بھی تاثر لیا ہے کہ اگر خاندان میں موجود دھکی کو وہاں سے نہ بنایا جاتا تو نور پور میں بروقت ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی ممکن ہوتی۔ اس کے دادے کی وجہ سے لوگ پوری طرح اندازہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ کشہر اور کھالوں کی اسٹورز کو کتنا شکایت کار کا رہا ہے۔

”آپ ایس بی کی باتوں پر کان نہ دھریں سر اس کا معاملہ اس کی صفائی بی کا کام ہے جو صرف کھد ہی نوچ سکتی ہے۔ اپنی طرف سے تو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بڑی اچھی چال چھی گئی کہ ذہنی کی واردات کے بجائے میں نے اسٹورز کی طرف دھیان ہی نہیں جانے کا لیکن انور

کی بروقت اطلاع نے ان لوگوں کی یہ سازش نام کر دی۔ میڈیا والے بھی اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ اسٹورز کے تدارک کے لیے کی جانے والی کارروائی کی اہمیت کو نہ سمجھ سکیں۔ انہوں نے ایس بی کی بکواس کو صرف ”کر لے اہمیت دی ہے کہ انہیں آپ کے اور اس کے درمیان اختلاف کی کو آگئی ہے اور اب وہ اس آگ کو ہوا دے کر اپنے اخبارات کے لیے جٹ پٹی خبریں حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ نور پور کی خوب عوام کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ جانے کی خبریں بھی انہوں نے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چھپائی ہیں لیکن میرے خیال میں آج جب ست ڈاکوؤں میں اندازہ کی تقسیم کیے جا میں گئے تو ایسی کسی حکایت کی محنت نہیں ہی باقی نہیں رہے گی۔“

نور پور میں ڈاکوؤں نے جو واردات کی تھی اس میں لوگوں کا بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ بس چند ہی لوگ تھے جو متاثر ہوئے تھے۔ واردات کے انداز سے لگتا تھا کہ ڈاکو بہت جگت میں اپنی کارروائی کر کے فرار ہو گئے ہوں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی سے کی جانے والی ڈاکوئی میں کو ماں اس قدر جگت دیکھنے میں نہیں آئی۔ ڈاکو بڑی تفصیل سے کارروائی کرتے ہیں لیکن نور پور میں معاملہ مختلف تھا جس سے شہر پار کو اپنے اس ٹھک پر اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ سارا منصوبہ میٹ اپ تھا اور ڈاکوئی کی واردات صرف ڈاکے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کروائی گئی تھی۔

ڈاکوئی کی اس واردات کو الٹو بناتے ہوئے کچھ لوگوں نے وزیر بکلی والی کے نور پور جانے کو کھارائی کے حساب سے رسک قرار دیتے ہوئے دیے لفظوں میں اس تقریب کو ڈیل کرنے کی بھی تجویز پیش کی تھی اس سلسلے میں اس نے وزیر صاحب سے ذہنی طور پر بات کر کے ان سے تقریب وقت پر ہی منعقد کرنے کی تاکید حاصل کر لی تھی۔ وہ خود اس بات پر متفق تھے کہ ایک عام سی واردات کو اہمیت دے کر تقریب ملوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شہر پار سے بات ہونے کے اگلے ہی دن اخبارات میں ان کا بیان شائع ہوا تھا کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ اس بیان پر وزیر صاحب کی خوب داد دہائی گئی تھی۔

شہر پار کے لیے بی الحال اتنا ہی کافی نوکر وزیر صاحب نے آئے سے انکار نہیں کیا تھا اور تقریب وقت پر ہی منعقد ہوئی تھی۔ ایک دن پہلے وہ خود نور پور کا بکر لاکر تقریب کے سلسلے میں کیے جانے والے انتظامات کے بارے میں ہدایات دے کر آیا تھا۔ ڈاکے کے بعد خوف زدہ ہو

جانے والے نور پور کے باشندوں سے بھی اس نے خاص طور پر بات چیت کی تھی اور انہیں سمجھایا تھا کہ جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں اور اسے یاد رکھیں جو ان کے آنے والے محل کو روشن و تابناک بنا سکتا ہے۔ گاؤں والے اس نکتے کو سمجھ گئے تھے اور اسے امید تھی کہ ان کے تعاون سے منتقلی جیانے والی تقریب بہت کامیاب رہے گی۔

”میں ابیں لی کی زبانی گاؤں کو بالکل بھی خاطر میں نہیں لاتا ہوں لیکن جہاں تک مجھے اس کی فہمیت کا اندازہ ہوا ہے، وہ بدور اکینہ پروردگار کی ہے۔ ایسے آدمی موقع ملنے پر بلا ضرور لیتے ہیں۔ اگر اس نے بدلہ لینے کی غمازی ہوگی تو آج کا دن اس کے لیے بہترین ہے۔ سیکورٹی پلان عملی طور پر اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کوئی ایسا موقع تلاش کر سکتا ہے جس کے ذریعے یہ ثابت کیا جاسکے کہ وزیر صاحب کا نور پور جانا سیکورٹی کے حساب سے صحیح خطرناک تھا اور میں نے پروگرام کو برقرار رکھنے پر اصرار کر گئے حفاظت کی ہے۔“ پیشانی کو اٹھکی سے گزرتے ہوئے اس نے عبداللہان سے اپنے غمگیناں کا اظہار کیا۔

”آپ فکر نہ کریں سر! میرے خیال میں وہ ایسی غلطی نہیں کرے گا کیونکہ کسی بھی بدزگی کی صورت میں اس پر بھی ذمے داری عائد ہوگی بلکہ زیادہ ذمے داری ای برہم کی۔ پھر بھی اگر آپ کہیں تو میں وزیر صاحب کی آمد سے پہلے نور پور کا پیکر لگا کر ایک دفعہ اور جائزہ لے لیتا ہوں تاکہ اگر کہیں کوئی سقم نظر آئے تو اسے دور کیا جاسکے۔“ عبداللہان نے اسے تسلی دیتے ہوئے تجویز پیش کی۔

”میرے خیال میں یہ مناسب رہے گا۔“ اس کا یہ بیہوشا سا جملہ عبداللہان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ فوراً ہی نور پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے جاننے کے بعد شہر یار دوسرے امور کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق وزیر صاحب کو لاہور سے یہاں پہنچنے کے بعد کچھ دیر اس کے ہنگام پر رکھنا تھا۔ یہاں وہ تحویزی دیر تک آرام کرتے اور دوپہر کا کھانا کھاتے پھر اس کے بعد نور پور جا کر تقریب میں شرکت کرتے۔ وہ ایسی ٹیم ایک بار پھر انہیں اس کے ہنگام پر رک کر شام کی جانے جاتی تھی۔ یہ انتظام لاہور سے نور پور تک کی طویل مسافت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا۔

وزیر صاحب کی آمد کے پیش نظر ہنگام میں بھی خوب رونق اور ہنگام بچی ہوئی تھی۔ بارہ بجے تک اس ہنگام نے نور پور کی کاتھوسوں لہادہ اڑھ لیا۔ ہنگام کے ملازمین اور انتظامی عملے کے تحریک کے باوجود وہاں ایسا سکوت محسوس

ہوئے لگا جیسے وہاں مصروف عمل لوگ کسی خاص قسم کے بازو سے چلتے کیے گئے ہیں جن کے چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے کے نظام میں کوئی ایسی ترکیب کارفرما ہے کہ ہر کام انجام تو پا سکتا ہے لیکن آواز نہیں ابھرنے پائی۔ پونے ایک بجے تک عبداللہان بھی نور پور سے واپس آ گیا۔ اس نے وہاں کے انتظامات پر مکمل اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اظہارِ خیال کیا کہ ہنگام کے چاروں طرف لگائی جانے والی رسیوں کو، جو لوگوں کو ہنگام سے دور رکھنے کے لیے ایک باؤنڈری لائن کے طور پر لگائی جاتی ہیں، کھلو کر اس نے دو بار مزید فاصلے سے لگوایا ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص ان حد بندی کرنے والی رسیوں کو پھلانگ کر اسی تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے موقع نہ ملتا اور وہ درمیان میں ہی دھریا جاتا۔ شہر یار نے اس کی اس کارکردگی کو سراہا۔ ایک بج کر پانچ منٹ پر کال موصول ہوئی کہ وزیر صاحب سوا ایک بجے تک ضلع کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کال کے موصول ہوتے ہی وہ لوگ پہلے سے تیار گاڑیوں میں ان کے استقبال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹھیک سوا ایک بجے انہوں نے اپنے ضلع کی حدود میں وزیر صاحب کا استقبال کیا پھر ایک مشعر کہ قلعہ کی صورت میں ہنگام پر پہنچ گئے۔ اس موقع پر انہیں بی مقدمہ ہارڈ میچ موجود تھا اور وہ نام نہاد ایم این اے اور ایم پی اے بھی جنہیں یہاں کے عوام کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا۔ ہنگام بالکل داخل ماحول میں کیا گیا۔ بج کے بعد وہ لوگ نشست گاہ میں آکر بیٹھے تو وزیر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی اور وہ شہر یار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

”پورا سونیک مسز شہر یار! پہلی بار جب میں نے رازہ صاحب سے آپ کا ذکر سنا تھا، جب ہی کچھ کیا تھا کہ آپ کوئی ہنگام پر نہیں ہی ہوں گے۔ آپ کے کام میں جس قسم کا جوش اور تیزی نظر آتی ہے، اس کی ایک نوجوان سے ہی امید کی جا سکتی ہے۔“

”میرے خیال میں سر۔۔۔ یہ آدمی کے اندرونی احساسات کی بات ہوتی ہے۔ اگر آدمی کے اندر جذبہ زندہ ہو تو عمر سے بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ آپ میری اتنی گراں گے فرد نہیں لیکن پھر بھی اتنا تسلسلے کر کے یہاں تک پہنچ ہی گئے ہیں نا۔“ موقع کی مناسبت سے وزیر صاحب کو تھوڑا سا خوش گردینے میں اس نے حرج نہیں سمجھا۔ وہ یہاں سے خوش واپس جاتے، تب ہی یہاں کے لوگوں کے لیے خوشی جالی کے درمیان نکلتے تھے۔ وزیر صاحب کی گہری ہونٹ مسکراہٹ نے ظاہر کیا کہ اس کا جملہ کارگر بات ہوا ہے اور وہ

اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے میڈیا کے افراد کو پانچ منٹ کا جنم دیا اور اپنے اسٹے لیے سڑک کو جذبہ حب الوطنی سے تسلی کرتے ہوئے دو چار مخصوص جگہ پائی جگہ ادا کیے۔ اس کا ردائی کو بھٹکانے کے بعد وہ لوگ نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس بار وہ اور شہر یار ایک ہی گاڑی میں تھے۔ راستے میں وہ انہیں ضلع میں کیے جانے والے ترقیاتی کاموں اور منصوبوں کی تفصیلات سناتا رہا۔ وہ خاموشی سے بلا تیرہ سب کچھ سنتے رہے۔ اپنے پریوینٹس کی تفصیل سناتے ہوئے جب اس نے اپنے کام میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا تذکرہ چھپراتو وہ بے حد توجہ سے سنتے رہے پھر یک دم ہی بولے۔

”جس طرح آپ کو شکایات ہیں اسی طرح دوسرے لوگوں کو بھی آپ سے کچھ شکایات ہیں مسز شہر یار! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ اپنے قبیلے ایک گراؤ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ ان کی بات سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ جن لوگوں کے لیے وہ رکاوٹ بن رہا ہے، انہوں نے اوپر اقدار کے ایلوٹوں میں اپنی فریاد پہنچا دی ہے۔ وزیر بجلی و پانی کا یہ ظاہر ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن انہیں موقع دیکھ کر غمگیناں کے لیے تو استعمال کیا جا سکتا تھا۔

”میرے خیال میں، میں نے ایسی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں اپنے ضلع میں ہونے والے ہر کام پر نظر رکھوں اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے اقدام اٹھاؤں۔ آپ کے خیال میں اسکولز اور صحت کے مراکز قائم کرنے یا لوگوں کو بنیادی سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کرنے میں ایسا کوئی سا کام ہے جسے اختیارات سے تجاوز کرنا قرار دیا جاسکے؟“ اس کا لہجہ نرم لیکن لفظوں میں کٹ تھی۔ وزیر صاحب ذرا سا پہلو بدل کر رہ گئے پھر گھٹکھٹکارتے ہوئے بولے۔

”میرا اشارہ پچھلے دنوں کی جانے والی اس کارروائی کی طرف ہے جس کے ذریعے لکڑی اور کھانوں کی اسٹاکنگ کو روکا گیا ہے۔ یہ ظاہر تو یہی کہا گیا کہ سارا کاروبار ڈی ایس پی کی حضور کا تھا اور آپ نے صرف منظوری دی تھی لیکن حقیقت سے آپ بھی واقف ہیں اور میں بھی کہ آپ اس ساری کارروائی میں براہ راست شریک رہے تھے۔ ایس پی تازہ صاحب کو فکایت ہے کہ اس بے وقت کارروائی کی وجہ سے وہ نور پور میں ہونے والی ایکٹیویٹی کی واردات کو روکنے کے لیے مؤثر اقدامات نہیں کر سکے۔ آپ کو کچھ کرنے سے پہلے کم از

کم انہیں تو اس میں لینا چاہیے تھا۔“ ”میں انہیں اس میں لے کر ایک بار پہلے بھی کارروائی کرنے کا تجربہ کر چکا ہوں۔ اس تجربے کی ناکامی نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس تجربے کو دہرانے کی غلطی نہ کروں۔“ شہر یار نے بیہوش سادگی سے وزیر صاحب کی بات کا جواب دیا۔

”آپ کا یہ جملہ براہ راست الزام کے ذمے میں آتا ہے۔“ انہوں نے بے غور اس کا چہرہ دیکھا۔ ”میں نے آپ کو صرف اپنے تجربے کے بارے میں بتایا ہے۔“

”کیا گرفتار ہونے والے شخص نے اس طرح کا کوئی اشارہ دیا ہے؟“ انہوں نے اسے ٹھونکنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ اگلی نشست پر ان کا بی اے بھی بیٹا لیکن ان افراد کا شمار عزم راز لوگوں میں ہوتا تھا اس لیے وہ کل کر گفتگو کر رہے تھے۔

”نہیں، اس نے ایک دوسرے فرد کا نام لیا ہے لیکن وہ شخص جس شخص کا حصہ ہے اس میں ایس پی صاحب بھی شامل ہیں۔ گرفتار طرم کے ساتھ آپ اس شخص کو بھی جلد عدالت میں دیکھیں گے۔ اگر پولیس اس شخص کا ریمانڈ لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پانی و کے گھر میں پھلدا لانا بھی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔“ وہ جانتا تھا کہ یہ سب باتیں بولنے بھی چھیننے والی نہیں اس لیے خود سے بتا کر ان کا اعتماد حاصل کرنا مناسب سمجھا۔ گفتگو کے اس موڑ پر آنے کے بعد ان کی گاڑی نور پور کی حدود میں داخل ہو گئی۔ یہاں لوگ وزیر صاحب کے والدہاں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ چنانچہ گفتگو کو مزید آگے جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ لوگ وزیر صاحب کے لیے زوردار رفرے نگاہ رہے تھے۔ ان غروں کے درمیان کوئی نعرہ شہر یار کے لیے بھی سنائی دے جاتا تھا۔ نعرے لگاتے اور دھول کی تھاپ پر نارتے لوگوں کے درمیان گہری گاڑیاں بڑی مشکل سے رکتی ہوئی پڑاؤں تک پہنچیں۔ پروگرام کے مطابق پہلے وزیر صاحب کو یہاں مرنے والے اے ایس آئی اے اور کانسٹیبل کے لوگوں کو تفریفی اسناد اور امدادی چیکس دینے تھے۔ چھ دھری اختیار اور وزیر صاحب کی تقاریر اور آواز می میٹ۔ پروگرام میں ڈیپٹی سے متاثر ہونے والے نور پور کے باشندوں کے لیے چھوٹی مائیت کے امدادی چیکس کی تقسیم کے سلسلے کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس سہجی نے وزیر صاحب کو کوشش آگاہ کر دیا گیا تھا جس پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ تبدیلی

بھی ان کے لیے مفید ہی تھی۔ آج کا دن تو ایسے ہی اس وقت کے لیے وقف کر چکے تھے۔ اگر آٹھ دس منٹ اس کام میں خرچ بھی ہو جاتے تو کوئی حرج نہیں تھا بلکہ میڈیا کی بھرپور کوریج کی وجہ سے انہیں مزید شہرت ہی ملتی تھی۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر وہ اسکول اور مرکزِ صحبت کا سنگ بنیاد رکھتے اور پھر اس کے بعد واپس ہو جاتی۔

گاڑیاں پنڈال تک پہنچیں تو پولیس اور وزیر صاحب کے ذاتی اسکواڈ نے مل کر انسانی جسموں کی ایک حفاظتی دیوار سی بنادی۔ اس دیوار کے حصار میں وزیر صاحب اور دیگر ذاتی چیکر کو پہنچا دیا گیا۔ آٹھ چودھری بختیار میٹل سے موجود تھا۔ اس نے اپنی بیسیا بیوں کے سپارے کھڑے ہو کر وزیر صاحب کا استقبال کیا۔ وزیر صاحب نے بھی جواباً اسے بڑی شفقت بھری مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔ پھر تمام حضرات نے اپنی مخصوص نشستیں سنبھال لیں۔ تقریب کا آغاز روایتی طور پر تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا۔ کپڑے رنگ کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے پیر آباد سے ماسٹر نیب کو بلا دیا گیا تھا۔ آفتاب اگر چہ اسپتال سے فارغ ہو کر آچکا تھا لیکن ابھی اس کے لیے اتنی دور آکر یہ ذمہ داری سنبھالنا تکلیف دہ ثابت ہوتا اس لیے اسے زہمت نہیں دی گئی تھی۔ تلاوت کے بعد نیب نے نور پور کے زمیندار چودھری بختیار کو ڈاکس پر آنے کی دعوت دی۔ وہ بیسیا بیوں کے سپارے چلتا ڈاکس تک پہنچا اور بڑے مؤثر انداز میں وزیر صاحب کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے آہستہ آہستہ بات گو نور پور کے مسائل کی طرف لے گیا۔ آٹھ کے پیچھے دھکے جزیئر کے شور پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے نور پور میں بجلی کی فراہمی کے لیے بھی درخواست کر ڈالی۔ وہ تقریر ختم کر کے اپنی نشست پر واپس آکر بیٹھا تو نیب نے وزیر صاحب کو ڈاکس پر آنے کی دعوت دی۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ کر ڈاکس تک آئے۔ ان کے ڈاکس پر آنے پر لوگوں نے ایک بار پھر نعرے بازی شروع کر دی۔ کچھ چند باقی قسم کے نوجوان نعرے لگاتے ہوئے حفاظتی حصار کے طور پر لگائی جانے والی رسی کے بالکل قریب آ گئے۔ ان نوجوانوں میں سے ایک پندرہ سالہ نوجوان جوش میں یک دم ہی رسی پھلانگ کر آٹھ اور رسی کے درمیان موجود خالی جگہ پر آکھڑا۔ اس نوجوان نے کھیر وار شلوار کے ساتھ ذیلیا اُجالا کرتے چہن رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی گوڈر لوگوں کے درمیان میں سے ان طرف آیا، حفاظت پر مامور افراد اور آخر حرکت میں آ گئے۔ انہیں اس جذباتی نوجوان کو کچل کر داپس رسی کے اس

طرف موجود عوام کے درمیان پہنچا دیا تھا۔ دوسری طرف وہ آٹھ تک پہنچنے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔ نوجوان کی اس حرکت پر آٹھ پر بیٹھا شہر یاد رہے یعنی محسوس کرنے لگا۔ نوجوان کا چہرہ اس کے لیے شامسا تھا اور اس کے چہرے پر موجود تاثرات بھی کچھ نئے نہیں تھے۔ وہ کچھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ جذباتی نوجوان آٹھ پر پہنچ کر کیا کرنا چاہتا ہے۔ کیا برائی والوں نے اسے بری طرح جھڑپایا تھا اور اسے آٹھ تک نہیں آنے دے رہے تھے جس پر وہ زور زور سے چیخا ہوا کچھ بول رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے آٹھ پر موجود افراد اس کے الفاظ کچھ نہیں پارہے تھے مگر یہی اس صورت حال پر اپنی جگہ جڑ سے ہل رہے تھے۔ ڈاکس پر کھڑے وزیر صاحب نے ابھی تک اپنی تقریر شروع نہیں کی تھی۔ مانتے پر ناگواری کی بجلی سی لکیر لیے وہ خاموشی سے اس ہنگامے کے منت جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ذاتی باڈی گارڈز ان کے دائیں بائیں آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہنگامہ کرنے والا نوجوان نہبتا تھا اس لیے صورت حال زیادہ تشویشناک نظر نہیں آرہی تھی اور وہ لوگ یہی قیاس کر رہے تھے کہ وہ وزیر صاحب کے قریب پہنچ کر ذاتی طور پر ان سے اپنا کوئی مسئلہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ یہ ساری لمحوں کی کہانی تھی اور سب لوگوں کو امید تھی کہ کیا برائی والے ایک آدھ منٹ میں اس مسئلے سے نمٹ سکیں گے لیکن یہ اطمینان بس چند لمحوں کا ہی تھا۔ اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ نہایت غیر متوقع تھا۔ جوش سے بھرے نوجوان کو سیلبر رنی والے تحیث کر پنڈال سے باہر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ تو سب نے دیکھا لیکن اس کے بعد جو کان بھاڑ دھماکا سنائی دیا اور آگ کے شعلے بلند ہوئے، اس نے کسی کو کچھ کھنکھنے کی سہلت نہیں دی۔ دھماکے نے زمین کو لرزہ کر رکھا دیا تھا اور ٹکڑی کا آٹھ اس لرزش کو برداشت نہ کرتے ہوئے اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکا تھا۔ تباہ ہوتے آٹھ پر موجود میزوں، کرسیوں، ڈاکس، ٹائیس اور آرائشی پھولوں سمیت انسانی وجود بھی تباہ ہو کر رہ گئے تھے۔ اس تباہی میں کس پر کیا گزری تھی؟ کچھ جرحیں تھیں۔ بس ہر طرف مرتے ہوئے اور زخمی انسانوں کی کراہیوں کے ساتھ، بلند خوف زدہ چیخیں تھیں جو سنائی دے رہی تھیں اور دیکھنے کے لیے آگ کے شعلوں کا دھس تھا۔ اس دھس میں نور پور کے عوام کی خوشیاں اور امیدیں ان کے دم توڑتے جسموں کے ساتھ ہی دم توڑ رہی تھیں۔

حادثات و سانحات کی شکل بہانہ کی تلاش میں سرگرداں
ہاں بالوں کی داستانِ حیات کے واقعات اقلیمِ ماہِ رجب

گراب

چشم قلم

ہستار مسماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی پاک و رجب باتو سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل گئے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے نہیں کئی رخ ہیں بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تشریح و تفسیر تھہرتی ہے اور یہ تفسیر کتابوں میں نہیں روایتوں میں تھہرتی ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سمجھ کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طافندہ مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے پھستا وہی ہے جو نرمیائے طبق سے ہو سخت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشوں کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے یہ تو بس ہو جاتی ہے دل طبقوں کی پروا کوئی ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے زندگی کی بساط اور وقت کے دھاریے ... حسب قسمت کی باتیں اور تقدیر کی چالیں ہیں ... کبھی باڑی ہلت بھی جاتی ہے گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر تقدیر ساتھ دے جاتا ہے۔ اس وقت تک پہلوں کے نیچے سے مہبت سما پائی یہ چکا ہوتا ہے جرم افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ



وہاں گویا قسمت کا سان تھا۔ دم توڑتے اور دلی افتادوں کی کراہوں اور تکیوں نے ان لوگوں کے اعصاب کو بھی متاثر کیا تھا جو اس حادثے میں پاگل ٹھونڈے رہے تھے۔ اس آفت زدہ مقام سے دور جانے کی خواہش میں وہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے اور پلٹتے جانے سے بھاگ رہے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان ہی وہ لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے اپنے خواہش کو بخش نہیں ہوئے دیا تھا اور اس آفت کے نیچے میں پھیلنے والی جاتی سے نکلنے کے لیے متحرک ہو گئے تھے۔ انہی میں سے ایک شیر یا دہی تھا۔ حادثے کے وقت وہ اس طرح

ایک کمری پر براہمان تھا۔ دھماکے کے باعث اچانک پھوٹ کا فکار دیا تو وہ اپنی کمری سمیت آسمان کے پھیلنے میں جا کر لہ کر گئے اسے اس کی کھین اور ٹھٹھوں سمیت کمرے کی فصوں پر چومیں آئیں لیکن اس وقت اسے اپنی چوڑوں کوئی احساس نہیں تھا کہ گرتے کے ساتھ ہی وہ پکڑنے سے ہٹا جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنے زخموں کی طرف توجہ دے بغیر اتر کر پکا جہاں اسے ڈی ایس بی منظور دکائی دے۔ ہاتھ مارا اگل کچھ سلامت تھا اور کچھ کچھ کراہنے والے تھوڑے اکا اکا جان باری کر رہا تھا۔ شہر یا داس کے قریب پہنچا تو وہ اس کی طرف توجہ



ہو گیا۔ "خود انور کو تھانے سے راہنہ کر دو اور ماں سے مزید نفرتی بلاؤں کے ساتھ ساتھ اداویہ کی ضرورت بھی کر کے دانی نبیوں کو بھی کال کر دو۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی پستل پورنی کو اندھا پار کی طرف روانہ کر دو۔ وہاں سے انہیں اور کچھ نامی ایک شخص کو اس کی پوری منتیلی سمیت اربیت کر کے تھانے پہنچا دو گا۔ خیال رہے کہ یہ گرفتاری بہت جلد پیش سے ہوئی جائے اور جب تک میں وہاں نہ پہنچوں وہاں لوگوں کو کسی سے ملنے کی امید نہ رہے گی۔" یہ خبر پہنچے ہوئے ہوئے اس نے حکامات جاری کیے۔

"اے سر! " ڈی ایس بی نے جرح پر دینے کی گرفتاری والے حکم کو سب کچھ سمجھ کر تھا خیال اس نے توئی بھی سوال کیے بغیر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا اور اس طرف میں بڑا اہتمام دینے کی کارباز مقرر کی گئی۔ شہر بارخو بھی گرفتار کیا اور اس کی طرف چل پڑا۔ دریں صواب کا ذاتی طالعی علم اس دوران انہیں اپنے حصار میں لے چکا تھا۔ دھماکے کے اثر سے وہ بھی جھٹکا نہیں رہے تھے اور اپنی جگہ سے اچھل کر گر گئے تھے لیکن ان کے سیکورٹی گارڈز نے اس وقت ہی مستعدی سے اپنے فرائض نبھائے تھے۔ وزیر صاحب کے گرنے کے بعد وہ ان کی ڈھال بن گئے تھے چنانچہ وہ دھماکے کے اثر سے دھڑکھڑا کر لوگوں کو دھکی کر دانی کی کشتی کی زد میں آنے سے بچ گئے تھے۔ چنانچہ ان کے باقی گارڈز نے ان کے پیچھے کاہر دھم اپنے جسم پر بھرا لیا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا تو دھڑکھڑا کر دھم صاحب کا حفاظتی علم اس دوران ان کے گرد اٹھا ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے اس طرح ہڈ پر صواب کو اپنے گھر سے بھی لے لیا تھا کہ وہ دکھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔ اسے یہ مشکل اس حفاظتی گھیرے میں سے گزر کر ان تک پہنچنے کی اجازت تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے یہ اطمینان ہوا کہ وہ مکمل طور پر محفوظ ہیں اور انہیں کوئی دھم نہیں آیا لیکن ان کے پیچھے پر موجود شدید پریشانی اور خوف کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"جی ایف ایس سوری سرا! آپ کو یہاں آتی تاخیر گوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اس معاملے کی مکمل تحقیقات کروں گا۔ فی الحال تو موجودہ چھوٹیں سے صورت لوں۔ جیلز! آپ فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ آپ کی سیکورٹی اس وقت میرے لیے سب سے اہم مسئلہ ہے۔" ان تک پہنچنے کے بعد اس نے یہ چند جملے کہے جو انہوں نے شدید بے وفائی کے تاثرات کے ساتھ سنے اور

اسے جواب دینے بغیر اپنے پی ایف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے پی ایف کی سفید شرت پر خون کے چند قطرے نظر آ رہے تھے جس سے ظاہر تھا کہ اسے یہ خون آتی ہیں لیکن یقیناً یہ نہیں سمجھتی تو طبیعت کی رسی ہوس کی اس لیے وہ بہت زیادہ تکلیف میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"گاڑیاں ریلیٹی میں مرا ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلان ہو گا۔" وزیر صاحب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے مستعدی سے اپنی ذاتی ضرورتیں دریں صواب کی وہاں سے روانگی مکمل میں آگئی۔ اپنے محافظوں کے گھیرے میں وہ اپنے شرٹن بار کاڑھی کتہ پیچھے۔ میڈیکل فائلوں نے جو اس ساری ہنگامہ دارائی کی ضرورت کر رہے تھے اس سطر کو اپنے سر پر لپیٹ لیا۔ وہاں موجود افراد میں سے ان افراد نے اپنے صاحب کو دیکھ کر ہنس کر کہا تھا۔ ان میں سے انہوں نے تقدیر آمیزہ یا کے افراد کو بھی دیکھا۔ وہ صرف ایک تقریب کی کو جگہ کے لیے وہاں آئے تھے لیکن دھماکے کے بعد یہ ہوسے ذاتی منتیلی خیر صورت حال نے ان کی دیکھی کوئی گرا بڑھا دیا تھا۔ اب وہ یہاں سے یہ تہ کو ایک تقریب کی معمولی رپورٹ کے بجائے ان کے پاس منتیلی خیریتوں کو ذمہ دار ہونے پر پورے میں بھی آج ایک ایسی ہی حادثہ پر مایوس تھا۔ منتیلی تقریب سے بہت زیادہ توجہ حاصل ہوئی جس کے لیے یہاں سے اس کا مجمع ہوا تھا۔ وزیر صاحب نے اپنی پالی کی ایک چھوٹے سے گاڑی میں مرکز صحت اور اسکول کے سنگ بنیاد رکھے جانے کی خبر کتنے لوگ شوق سے پڑھتے؟ شوق سے پڑھتے تو دور کی بات اکثریت تو ساری پر سرسری نظر ڈال کر ہی آگے بڑھ جاتی لیکن اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں لوگوں کو متوجہ کرنے والا ایک خوشی حادثہ پیش آ چکا تھا۔ اس حادثے کے اسے داران جو شیخ نو جوان کا اب وہاں کوئی نام روشن نہیں تھا۔ وہ یقیناً اپنے جسم پر خوش خیمیت میں رہا وہاں آیا تھا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ کسی طرح اس تک پہنچ جائے اور وہاں پہنچ کر دھماکا کرے لیکن اسے موقع نہیں مل سکا وہاں سیکورٹی پر مامور پولیس کے افراد نے اسے اس طرح ہٹا کر وہ قدم آگے بڑھایں نہیں سکا۔ یہ ظاہر وہ نہیں لیکن اسے ہٹانے والے المکاروں نے یقیناً اس کے لباس کے نیچے موجود خوش خیمیت کی موجودگی کو محسوس کر لیا ہو گا اور جب اس نے دیکھا ہو گا کہ وہ لوگ اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور وہ کی طرح اس کی چیمیں پیچھے لٹکا تو اس نے اسی مقام پر خود کو دھماکے سے آزاد کیا۔ دھماکے کے نتیجے میں اس کو جسم کی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہی مشرین پولیس المکاروں کا بھی

ہوا جو اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب وہاں اس خود کش حملہ آور نو جوان اور فرشت کی ماضی جان قربان کر دینے والے پولیس المکاروں کے جسم کے ٹکڑے اور خون آہیں میں خلاصہ ہونے اس طرح نظر آ رہے تھے کہ ان کو علم اور مظلوم کے خون کو ایک ایک شہادت نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن خون کا وہ تلاب یہ زبان خاموشی بھی سوال کر رہا تھا۔

"آخر یہ سب کیوں ہوا؟ اس پھولے سے گاڑی میں ہونے والے ترقیتی کارکنوں سے آخر کی کو تکلیف تھی کہ آگ و خون کی ہولی جھیل کر اس خوشی کی تقریب کو ناگہم میں تبدیل کر دیا گیا؟" فی الحال ان سوالوں کے جواب کسی کے پاس نہیں تھے۔ یہ وقت ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا تھا بھی نہیں۔ ابھی تو اس سب کو جانے کا سرحدور پیش تھا وہاں حادثے میں مکمل طور پر تباہی ہو چکا تھا۔ شہر بارخو کے علاوہ وہاں موجود دیگر بڑے داران بھی اس وقت اسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ لوگوں کو جانے سے حادثہ سے دور ہٹایا جا رہا تھا۔ ایس بی ایف کی تنظیم تاہم بھی اس وقت پوری طرح متحرک تھا اور اس کی حمایت پر پولیس والے دونوں بچھڑے تھے۔ اس موقع پر اس نے عبداللہ کے اسن انتظام کو پوری طرح محسوس کیا۔ اس کا بھائی اور بھائی کے دو ماں فاصلہ بڑھانے کا فیصلہ اس وقت بہت کارآمد ثابت ہوا تھا۔ خود کش حملہ آور اس دوران ہی قتل ہو گیا۔ اس نے اپنے بھائی کے ساتھ ہی چلا گیا۔ بھائی کے ہاں جو اس کے قریب پہنچے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور کسی وی آئی بی کی موت واقع نہیں ہو سکی تھی۔ پولیس والے اور قریب موجود عوام میں سے جو لوگ زخمی تھے وہاں کی موت بھی یقیناً آہستہ آہستہ کی لیکن خود کش حملہ آور اپنے مکمل بڑھکت یعنی اس کی موجودگی کوئی چیز کو نشانہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس اعتبار سے انتظامی فوری طور پر اس کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی دوسری مثال وہاں موجود وہ ایس بی ایف کی ایک فائبر بکس گاڑی کی صورت میں بھی موجود تھی۔ اگرچہ چالکی کوئی اس میں داخلہ نہ ہو سچا نہیں تھا کہ تقریب کے دوران اس طرح کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ اس کے بارے میں اس انتظام صرف اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے آگے بڑھنے میں اگر خدا خواست کوئی خوش گوار صورت حال پیش آجائے تو اس سے فوری طور پر نشانہ بن سکے۔ اس وقت یہ انتظام کام آ رہا تھا۔ شدید زخمی افراد کو ایس بی ایف میں ڈال کر اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کام کے لیے پولیس کی گاڑیاں بھی استعمال کی جا رہی تھیں۔ دھماکے کے نتیجے میں جو آگ بھڑکی

خطرناک غلطیاں

- ۱۔ اس نسبت سے لپ کرنا کہ صرف وہ...
- ۲۔ سر پر کر کے چھوڑ دینا...
- ۳۔ اپنا راز کسی اور کو بھی شہرہ رکھنے...
- ۴۔ درخواست کرنا...
- ۵۔ آزادی کے ہونے اور بارہ آرمی...
- ۶۔ اپنے کو سب سے زیادہ لائق اور مکمل...
- ۷۔ آزادی تصور کرنا...
- ۸۔ ہر ایک شہر میں لوگوں کو دوست کو لینا...
- ۹۔ جو کام خود کر کے دوسرے کے لیے...
- ۱۰۔ ممکن خیالی کرنا...
- ۱۱۔ بے گارشی میں سکھ کے بے خیالی پڑا...
- ۱۲۔ پکارا اور خوش رہنا...
- ۱۳۔ اپنے والدین کی خدمت نہ کرنا اور اولاد...
- ۱۴۔ اس کی توقع کرنا...

تھی اس پر بھی فائبر بکس کے داران نے فوراً پکارا پالیا تھا کہ یہ آگ فوری طور پر بند بھائی جان توڑا مسئلہ ہو گا۔ "سر! اب یہاں سے کلر جیکس۔ یہاں اب آپ کے مزید گھبرانے کوئی ضرورت نہیں ہے۔" مکمل ہی بعد صاب صورت حال پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔ عبداللہ نے اس کے قریب آ کر اس سے کہا۔ وہ بھی اس دوران متحرک رہا تھا حالانکہ اس کی پیشانی پر کسی نے کاڑھا ہوا گواہ آگے لے کر باعٹ ایسا خاصا کمرہ خیمت لگ کر تھا جس میں اس نے اپنا رول نہ کر کے دیکھنے کے بعد اس پر پانی کو پانی کی طرح بوند لیا تھا۔ غم سے اب بھی خون کا گھونٹی سار سا باری تھا۔ "بھری گاڑی واپس آگے کیا؟" اس نے چپ کر کہا۔ انسان سے پوچھا۔ وہ کھانچا کی طرح اس کی کان سے بھی دھکیل گیا پتہ لگ چکا کہ اس کا کام لیا تھا۔ "ابھی سراسر اصرار تھا کہ اس آگ سے ڈی ایس بی کی نظروں کی طرف سے بھی یہ پتہ نہ پڑے کہ آپ نے جنت لوں کی گرفتاری کے احکامات دیے تھے۔ وہ گرفتار کیے جانے لے۔" اس نے تیار۔ "اور اگرچہ وہیں قوربان ہو جانا چاہیے۔" وہاں چانے کے لیے راضی ہو گیا لیکن یہاں وقت سے سب سے زیادہ چھوٹا کھانوں سے گھر گیا۔ "آپ اس حادثے کے بارے میں کیا نہیں سمجھتے؟"

ی صاحب ایروہری ہا ہوا ہے کہ آپ کی طرف سے کیے جانے والے ترقیاتی کاموں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ پہلے ہی آج وہ اسے اسکول کو لگا لگا کر اور اب یہاں تک پہنچا رہے ہیں کہ مونس پر بھی اتنا زیادہ پیش کر گیا۔ آپ کی نظر تھیں، ان واقعات کے پیچھے کن کوئیوں کا ہاتھ ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو ان کے اپنے کام میں ترقی ہوئے؟ انھیں فرار اور ذہن نظر آنے والے میڈیا کے ایک نمائندہ نے اور مختلف واقعات کو جوڑ کر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایسے ہی حالات اسے غلامی میں رکھتے تھے۔ واقعی حالات ایسے ہی تھے کہ گنت تھے۔ کوئی اسے ان ترقیاتی کاموں سے جو کتنے کی کوشش کر رہا ہو، ہی آتا رہا۔ اس کے پیچھے موجود شخص کو تو اس نے پیش قدمی کرتا تھا کہ پتہ دھری انعام کے علاوہ کوئی۔ بہت کم ہیں کہ سستا لیکن نور پور میں پیش آنے والے حادثے سے اسے الجھ دیا تھا۔ اتنی ہی مادیات میں باقاعدہ ایک وفاقی وزارت کی منت رخصتیاں کون نہ جانے کی کوشش کی تھی؟ اسے اسے نمائندہ اور اس پر عمل پیرا ہونے کی جرات نہ تھی پتہ دھری کے قتل سے کچھ بڑا کام نہیں ہوتا تھا۔

اس حادثے کے پیچھے کون ہے، یہ تو فی الحال میں نہیں کہہ سکتا لیکن وہ جو کوئی بھی ہے اس سمیت میں ہر فرد کو یہ پتہ ضرور دینا چاہتا ہوں کہ پتہ آج وہاں اسکول میں طرح کی تباہی ہونے کے بعد دوبارہ تعمیر ہو گیا ہے، وہی طرح کوئی دوسرا ہر جگہ بھی ہر جگہ ختم نہیں کیا جائے گا۔ سارا نہیں کرنے والے سازشیں کرتے رہیں، تعمیر کرنے والے ہاتھ تعمیر کرتے سے نہیں سے نہیں۔ ہمارا مضمون اس مسئلے کی ترقی تک جاری رہے گا۔

”لیکن میرا بھی آپ یہ بتانا نہیں۔“

ایک اور شخص سے نے اس سے سوال کرنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے روک دیا اور بولا۔ ”آپ کو اس حادثے کے وہ میں جو کچھ جانتا ہے، وہ ان میں ہی صاحب سے معلوم کریں۔ مجھے جو کچھ قیادہ کہہ چکا ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا بی بی اسے اچھا خاصا دیکھ رہے۔ خود مجھے بھی خوش آئی ہیں پھر مجھے دوسرے بھی بہت سے معاذات دیتے ہیں۔ اس لیے پلیز، آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔ اس کے بعد مزید وہاں نہیں دگا اور بعد انسان کے ساتھ اس جانب بڑھ گیا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔



”کہاں چلے؟“ آپ کے چنگے یا آفس؟“ وہ لوگ فوراً کٹ کی حد میں داخل ہو رہے تھے بہت مشاہدہ

خان نے یہ سوال کیا۔

”خان نے چلو لیکن اس سے پہلے گاڑی کسی میں داخل اسٹور کے سامنے روک کر ڈرامہ کی ڈریسنگ کے لیے سامان خرید لیا۔“ عبداللہ کی بی بی نے لگنے والے ڈرامے سے ٹھاننا کافی اخراج ہوا ہے، اس کا ثبوت اس کے ساتھ پرچی کی شکل میں بندھی ہوئی مٹی سے بورا قمار ڈھرنے کے وہاں میں بقیہ خریدیوں جنہاں کرنے کی گنتاں کی بی بی کی بھی اس لیے اوپر سے ہر مٹی کی مٹی میں خون سے تر ہوئی تھی پھر بھی وہ کمال صحت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ اپنے ڈھرنے کی طرف سے یہ پورا ہو کر اس نے نور پور میں بھی پھر لیڈر کا کردار دیکھا تھا اور ستر کے دوران بھی اپنے کسی انداز سے یہ پورا نہیں ہوتے رہا تھا کہ وہ تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس وقت اس نے مشاہدہ خان کو جو پراپرٹ میں تھی وہ عبداللہ کی حالت کے پیش نظر تھی۔ مشاہدہ خان نے اس پراپرٹ پر بھی کیا اور پہلے نظر آنے والے میڈیکل اسٹور کے سامنے گاڑی روک کر بیٹے آگے۔ اسی وقت اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے سامان کی بجائے اسکرین پر اسے والا پتہ دیکھا۔ وہ سجاد رانا کی کال تھی۔ اس نے کال رد کر لی۔

”پتہ شو بارڈ کیا حال ہے؟“ میں بہت اصرار سے اسے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کال میں ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے پہلو کہنے سے بھی پہلے جوارانے یوں شروع کر دیا، وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ شہر کا ٹرانسپورٹ ہو کر کمال ان تک جانے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اب وہ بھی تھا وزیر صاحب کی سواری بہت پہلے نور پور سے تشریف لے جا چکی تھی۔ ان کے ساتھیوں نے راستے میں ہی ان پر فوراً کر کے اس حادثے کی خبر پہنچا دی ہوگی۔ پھر بھی ممکن تھا کہ میڈیا کے افراد میں سے کچھ نہ یہ کارنامہ انجام دیتا ہو اور اپنے جھنجھٹ اور اپنے اخبار سے ہر جگہ کو پتہ منظر عام پر لانے کی ہر دوڑ لگی ہوئی تھی، اس میں سبقت نہ جانے کے لیے وہ لوگ آؤت آؤت دی اسے جا کر بھی کام کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں سجاد بی بی! میں جس گاڑی میں قیادہاں موبائل میں روکی جا کر نہیں کرتی اس لیے آپ کا کچھ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اب ہم لوگ نوکوت پہنچ گئے ہیں اس لیے آپ کی کال مل گئی ہے۔ آپ بے فکر رہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ آخر میں مائی کو بھی میری طرف سے کئی پیسے گئے۔ ”ان نے مجھ سے ہونے لگے میں ان کے سوال کا جواب دیا۔

”مٹی کو تو ابھی اس حادثے کے بارے میں خبر ہی نہیں

ہوئی ہے۔“ جنہیں معلوم ہے کہ کوئی وی کمی ہی ہو سکتی ہیں اور میں نے اور ڈریس نے جان بوجھ کر انہیں پتہ نہیں بتایا کہ پہلے تم سے رابطہ ہو جائے تب ہی انہیں اطلاع دیں گے ورنہ وہ پرائیڈان ہوئے اور ہلکی۔“

”آپ نے بہت بوجھا کر۔ ابھی میں ہی بہت مصروف ہوں۔ فی الحال مجھے نوکوت خان سے کچھ کرنا ہوگا۔ اس سے منٹا ہے۔ امید ہے کہ میں اس حادثے کے بارے میں اداران تک پہنچ جاؤں گا۔“ مشاہدہ راجن سید لیڈر اسٹور سے مطلب پر پچھریں خریدنے کے بعد وہاں پتہ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سجاد رانا سے یہ جملے کہے۔

”کیا مطلب؟“ جس میں کوئی کھانا ہے؟“ سجاد رانا چونکا۔

”کیا ہاں، ایسا ہی کچھ نہیں۔“ اس نے غصیلی جواب دینے سے گریز کیا۔

”کی کینر فل شہر دار سید بھی تم پر ایک قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ آج کے حادثے میں بھی میں نے سنا ہے کہ تمہیں ہتھیار چھین آئی ہیں۔ جو ہتھیار اتنا زیادہ سے کہہ دو مجھ سے مشورہ لے لیا۔ تم تمہارا انصاف ہر کچھ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“ سجاد رانا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”میں خیال رکھوں گا آپ میری قلمت کریں۔ مجھے جو ڈھرنے میں ہیں، وہ بہت معمولی نوعیت کے ہیں۔ البتہ مجھے اس حادثے میں دیکھ بولنے والے مصیبت دیکھائیں کی بہت فکر ہے۔ یہاں کے اسپتال میں بھی سب کچھ بہت کم ہیں۔ نہیں ڈیڑھوں کو لاہور کے ہی اسپتال میں شفٹ کرنا ہوگا۔ میں نے درخواست کی تو بے کسر پتہ دھری نے اس کی منتقلی کے لیے اپنی کا پتہ فراہم کیا یا نہیں لیکن ابھی تک اس کی اطلاع نہیں کی کہ پہلی کا پتہ کر رہا ہے۔ آپ ذرا ذرا کی طور پر اس معاملے کو دیکھ لیں۔“ سجاد رانا نے سجاد رانا سے درخواست کی۔

”اوس کے میں دیکھ رہا ہوں۔ دینے نہیں خود بھی معلوم ہے کہ اس طرح کی کارروائی میں کچھ وقت تو لگ جاتا ہے۔ پھر حال، میں دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ پہلی کا پتہ کر کے ساتھ کچھ انکوائری ضرور میری سید مل سکی ہوگا وہی جائیں۔“

”جنگ پیری کی؟“ اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو گا۔ وہ خوش ہو گیا اور سجاد رانا کا کھنر پر ادا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اس سمیت کے دوران مشاہدہ خان نے اس کے اشارے پر گاڑی کارن نوکوت خان کی طرف کر دیا تھا اور اب وہ لوگ خان سے پہنچنے ہی والے تھے۔

”مجھے خان سے ڈراپ کرنے کے بعد تم عبداللہ

مسائب کے ذمہ کی ذمہ داری رکھ کر ہر دن اور ہر لمحہ کے لئے اگر ہسپتال چلے جاتا۔ اس نے پہلے مشاعرہ خان کو ہدایات دیں پھر عبداللہ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے احساس ہے کہ تم کی تکلیف میں ہو لیکن اس میں کوئی دے وار فرد کا ہسپتال کا دورہ کرنا ضروری ہے تاکہ لوگوں کو کئی دلی جان سکے۔ وہاں اس وقت کمرام چھا ہوا ہو گا۔ سینہ پاوالے الگ تھیلے کے موائج پر بٹھ رہے ہوں گے۔ اگر کچھ اس وقت تھا کہ پہلے کی بھڑی ٹیس ہوئی تو فیض ہسپتال جا جا۔“

”میں بلا جاؤں گا مگر آپ مجھے شرمندہ نہیں کریں۔“

میں اتنا زور دے رہی تھی کہ میں بولتا ہوں کہ شاید مجھ سے زیادہ ہی نہیں آتی ہیں۔ مسائب کو بچا کر کچھ سے پہلے آپ زخموں کی ذمہ داری کرنا چاہیں۔“

”میں فی الحال اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔ معمولی طبیعت کی خرابیاں ہیں جنہیں بعد میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس وقت مجھے، خود سے زیادہ اس مارتے معاملے کو پینڈل کرنے کی فکر ہے۔ اس وقت تو میں اس بات کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ ماسٹر فیک کو پھینک دینے والے حادثے کے بعد میں نے ٹورنٹ ہسپتال میں طبی سہولیات کو بہتر بنانے کے لیے فوری طور پر چند اقدامات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔“

”تھا وہاں لے لے امید ہے کہ زخموں کو فوری طور پر بہتر مسائب طبی امداد کی بنی ہوئی صورت خوبصورت حال پہنچے گی۔“

میں تو اس کے بہت سی باتیں کر رہی تھی۔ ”اپنی طرف سے سہولت دیتے ہوئے اس نے ہسپتال کی بھڑی کے لیے کیے جانے والے اقدامات پر شکر ادا کیا۔ اسی وقت کہ ڈی ٹورنٹ تھا نے کے سامنے چاکی۔ شادرم خان نے بھڑی سے گاڑی سے اتر کر پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی سے اتر کر اپنے مخصوص بے لٹال انداز میں تھانے کی مارت کی طرف بڑھ گیا۔ خون کے دھبوں اور مٹی کے ٹھانڈے کے اس کے لباس کو اچھا سا خراب کر رہا تھا لیکن اس اہمیت کے باوجود اس کی تعلیمت کا وہ، کار کا چلنے، ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے اسے دیکھ کر تکیا ہٹا دیا۔ اگر وہ کی تحقیق کی پیش سے اسے جواب دیتے ہوئے وہ اندر چاکی۔ اس نے اس کے کمرے کے باہر بھی ایک سپاہی کھڑا تھا جس نے اسے سلام کرنے کے ساتھ دروازے پر بڑی جلی افکار سے اندر جانے کا راستہ دیا۔ کمرے میں اس نے اس کے بچے کی مٹی کی مٹھو موجود تھا جس نے گڑی سے اچھ کر اس کا استقبال کیا۔

”آئیے مرنے لگے ہیں تاکہ آپ کیلک فرمیت میں یہاں کا درجہ کریں گے اس لیے میں خود یہاں موجود ہوں۔“

ابھی اس کو کیلک سے رستہ میں سے ہسپتال پر ڈیوٹی کا فکری ہوتا ہے۔

”کیا یہاں ہیں اور کون؟“ اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے براہ راست سوال کیا۔

”الحد ایک کمرے میں بند ہیں۔ آپ نہیں تو انہیں یہاں بلاؤ۔“

”کیا اس کی بی بی نے مستبھی کا مکتبہ پر کمرے کی کوشش کی۔“

”نہیں، انہیں یہاں لانا مناسب نہیں۔ میں ان لوگوں کی گرفتاری کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتا۔ میں خود اس کمرے میں جا چکا ہوں جہاں ان لوگوں کو رکھا گیا ہے۔“

اس نے بھید کی سے جواب دیا تو ڈی ایس بی بولا۔

”مجھے اندازہ ہے کہ یہ کچھ خاص افراد ہیں۔ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق اس کے اوپر سخت تاکید کر دی تھی کہ کوئی ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر نہیں ملنی چاہیے۔ تھانے کے ٹھوڑے سے ملنے کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ کون لوگ گرفتار کر کے یہاں لائے گئے ہیں۔ ملے ہیں سے بھی بس انہی افراد کو معلوم ہے جو بڑے وقت میں اس کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں تو ان کے ساتھ چار میں لپیٹ کر انہیں لایا گیا ہے۔“

”ڈی ایس بی نے انہیں کی ملازمت میں ایک مدت گزار دی تھی۔ دو ایسے اندازہ ہیں کہ وہ کمرے کے قریب رہتے ہیں۔“

میں شادرم خان کی گرفتاری کا فکرمند ہوا تھا، اس کا حادثے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شادرم خان نے اسے اسے سمجھے وہاں اس کی فکر کی ایک ویش کوہ کے کا موائج تھا۔ اس کا مسائب چھاپے میں ایک فہم تھا۔ اسے اسے سب سے اہم ایشیاف تھا ہوا تھا۔ وہ قاریت آفیسر اقبال باجوہ کے اس جرم میں شریک ہونے کا تھا۔ وہاں قریب قریب باجوہ کی گرفتاری کا فیصلہ ہو چکا تھا اور ایک آواز دنا میں کہ منظر لیا جاتا۔ دو جو اس کیس کے بعد ہی اچھا سا مشہور ہو گیا تھا اور اس کے فیصلے کی انتہا سے اپنی ترقی کی امید باندھ رہے تھے۔ ایک اور کیس کا مسائب تحقیق کا سہرا بھی اس پر بندھنے لگا۔ وہ کچھ تھا جس کے بعد اس کی ترقی بھی ہوئی۔ شادرم خان نے اسے قریب قریب کے پیچھے اپنی ترقی کا کافی حق کا فرما تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا مسائب کیس کے ساتھ شادرم خان کی حمایت اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

”اوہ وہاں آگے پیچھے چلتے ہوئے تھانے کے اس کمرے تک پہنچے جہاں دین محمد اور اس کے اہل خانہ موجود تھے۔ کمرے سے دروازے پر تار لگا ہوا تھا۔ ڈی ایس بی نے حضور سے لاکھوں کر دروازے کو کھلیا۔ شادرم خان کے سبیل

دورہ کرے میں اس کے پیچھے داخل ہوتے ہی شادرم خان کے اندازہ ہو چکا تھا تھانے کا یہ کمرہ اور اس کے دو محنت خاند تھانے طرف عام میں ڈرائنگ روم کی جگہ پر تھا۔ کمرے میں تنگ کے کی آلات و لوازمات پر رکھے نظر آتے تھے جن میں ٹیبلوں کی دینی، چائیں اور بڑے سمیت کی اشیاء موجود تھیں۔ چھت میں دو آکر بے بھی موجود تھے جن سے یقیناً ملان کا لٹا لٹا کر اس سے پوچھ چوچھ کی جاتی تھی۔ اسی کمرے میں دین محمد اس کا بیٹا چلا اور اس کی بیوی کیسے ہوتے ایک دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں کے باوجود، بی بی میں بی بی یا شادرم خان کی آدھی تھیں۔ بیٹا اس بند کمرے میں جہاں اس دروازے کے عوا میں کے باہر تار لگا ہوا تھا کوئی دوسرا کسی کا راستہ نہ ہونے کے باوجود اس قدر احتیاط کی تھی کہ وہ بیٹوں اپنی جگہ سے بھی نہیں نکلتے تھے۔ شاید ڈی ایس بی نے منظور زیادہ ہی اہمیت دینے کے لیے یہاں پر رکھا تھا۔ اچھا نہیں دھانے کے پھر میں ہی وہ اس سے پہلے نو پر سے نکل کر اس تھانے میں آچھا تھا اور گرفتاری کا کام کرنے والے اس کے اوکواس طرح چلنے کی تھا کہ اس نے کسی کیس کی جانی بھی خود اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔

”تھیک ڈیوٹی ایس بی صاحب! آپ نے میرے محلو پر بدعت مجھے کچھ پکڑا دیا ہے۔ اب میں خود ان سے بات کر لوں گا۔“

کمرے میں موجود دین محمد خوف زدہ لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے ڈی ایس بی سے یہ جملہ کہا تو وہ اس کا اشارہ کچھ کوٹھک کیا۔ لیکن ظاہر ہے حکم سے صاف و خلاف تو نہیں کر سکتا تھا اس لیے کچھ دین محمد سا دروازے کی طرف پلٹ گیا۔

ڈی ایس بی نے اپنا سر ہٹا کر بیٹوں کی طرف اس کے عوا میں کا جواب نہ دینے کو مجھے بلانے کے ساتھ دین محمد کو اس کی زبان ایسے لوگوں کو یاد دلائی کہ اچھی طرح سمجھ جاتی ہے۔ میں ایک سپاہی کو اس کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا کر رہا ہوں۔ آپ جیسے ہی اشارہ کریں گے، وہ مجھے آپ کا پیغام پہنچا دے گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ اور باہر پکڑا جاتے ہوئے دروازہ بند کر دینے کا۔“

”قہر سے رکھنا ہے اسے اسے جواب دے کر اس نے وہاں موجود دین محمد کیس میں سے ایک کمری اٹھا کر دیوار کے ساتھ بیٹھے ان تینوں افراد کے متعلق رہی اور خود کمری پر بیٹھا۔ پیچھے دروازہ بند ہونے کا آواز ملنے لگا۔ دین محمد سے اندازہ ہوا کہ ڈی ایس بی اس کی باہر نکل چکا ہے۔

”تھارا کچھ دین محمد کہاں ہے؟“ دین محمد کی آنکھوں

میں کچھ ہوئے اس سے بہت لگے تھانے سے۔

”کون۔“ عبداللہ نے اس کی تو کچھ جھجھکی ہوئی۔

جب سے ہمارے ساتھ وہاں ہوا عبداللہ نے اس کی لب سا ہو گیا ہے۔ کئی کئی دن کمرے میں آتا ہے کہ ہوتا کچھ ہوا تھا ہے۔ میں کچھ ہوں تو غصہ کرنے لگتا ہے۔ وہاں اس کے ہاں کے مارا مارا نہیں کے ان کو اور اس کے کسی سے سیدھے درات ہی نہیں کرتا۔ ”کوہ سے“ دین محمد کی آنکھوں سے یہ جواب دیتے ہوئے کچھ کچھ ہرک رہا تھا۔

”کوہ سے“ کوہ دین محمد کی بات پر بڑھ گیا۔

”کیا باہر نکل۔“ اس نے ان کو اس کے دوران بے بی کی نوکی کھنسی ہوئی لاش جنگل کے باہر نہاں کی تھی۔ دین محمد ان کے پاس پرست کرنے گئے تھانے کو اس نے لاپروسیہ معصوم دین محمد کی اصرار لگا کر وہ اپنے کی عاشق کے ساتھ بھاگ کر گئی تھی اور اسی حادثے نے اپنا مکمل (مطلب) پورا کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ کوہ دین محمد سے تھے ہمارا پھر یہاں سے اور تو جان جو بڑھ گیا تھا وہ (خانوہ) کو بچھو (نامم) بہرہ دے رہا ہے۔ انہوں نے مجھے مسکرائی دیکھ کر بھول کر گئی اسے یہ مساب کے پاس سے جاتا دے دئے اور تیرے وہاں بیٹوں کو پکڑا کرتے ہیں۔ کوہ دین محمد سے کچھ بات چلا۔ اسے سن رہا تھا کہ وہاں کھڑے گا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کیس کے معاملے میں اس کی کارڈ نے اسے کیا یہ رنگ دی تھی کہ اس نے ہاتھ کمرے دین محمد نے خود اپنی بی بی کے انوار کے کا ڈراما کیا ہے۔ وہ زمانہ کی بی بی زہرا کی شادی سے بچے کے لیے اپنے ایک ٹکے کے ساتھ بھاگ کر گئی تھی اور اس نے بی بی کے ٹکے کے ساتھ بھاگ کر اپنے باپ باپ کو لوٹ لیا تھا۔ اس نے اسے خود دین محمد کے کردار پر بھی شک کا اظہار کیا تھا اور یہ اصرار لگا تھا کہ دین محمد نے اپنی پہلی بیوی کو قتل کرنے کے عوا میں کی پھیل نہیں سے بیاد چلا تھا لیکن اب دین محمد ایک باہل مختلف بات بتا رہا تھا۔ اس کے بیان سے یہ ظاہر تھا کہ اس کی غریب کا اعتبار ان تصانیف بھی ہوا اور ان سے ذرا دھمکا کا فکرت کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ دین محمد نے اس بیان کو سمجھ بھی سمجھ سکتا تھا لیکن اس کے سمجھنے میں لاپروسیہ سے ہوا کہ کی تھی وہ اس پر گزرنے والے تعلیم کی انتہا سے یہ صاف طور پر دین محمد کی وقت اپنی شادرم خان سے ہر پر اعتبار دین محمد کو بہت سی باتیں کہیں جس نے بنیاد پر خود اپنی مشکوک نظر لی۔ ایس بی نے تو یہ بھی دیکھا تھا کہ اس علاقے میں ڈاکوؤں کا کچھ خاص مکمل دین محمد اور ان کی کچھ

دن قبل ایک ایسا دور کیا جا چکا تھا جس میں ڈاکوؤں کے
 جسے نہ صرف کل اوقات اطلاع کی بھی بلکہ وہ بروکٹ نہ مئی
 بنایا گیا تھا۔ اس وقت اس نے یہ بات اس لیے نظر انداز کر
 دی تھی کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ ڈاکے کا دارا داخل سے کی جانے
 والی اسٹینٹنگ کی طرف سے اس کا بیان بنانے کے لیے تھیلا
 گیا ہے لیکن اب یہ بات سمجھ آئی تھی کہ ڈاکے سے بھی تو کسی نہ
 کسی حقیقت کی بنیاد پر ہی لکھتے اور بتاتے جاتے ہیں یہ
 سارے واقعات اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر رہے تھے
 کہ پولیس اور ڈاکوؤں کا جو زبردست مضبوط ہے اور وہ وقت
 ضرورت ایک دوسرے کی پشت پناہی کرتے رہتے ہیں۔
 ”جس میں میری وی کی لاش لی، عبداللہ کی پگھل سا ہو
 گیا۔ آپ نے خود دیکھا ہے اسے کہ وہ کتنے تیز مزاج لکھنڈا
 ہے۔ ہم دونوں جہاں پہنچے تو وہی کاظم بھول کر اسے ہی
 سٹیلٹے میں لگ گئے۔ وہ کسی طرح بہت تھکے ہوئے تھے
 ہوتے تھے، ہر وقت مرنے دے کی کل کر رہا تھا۔ پولیس والوں
 کے بے قیاس کی تھیں اس کی نفرت تھی کہ اس کا اس
 نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح تھے پہنچ کر ان سب کو جان سے
 مار دے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اس کو شہناز
 صاحب کے پاس بھیجا کہ کسی طرح وہی آکر عبداللہ کو
 سٹیلٹے میں خیریت ہوگئی ہیں اور وہ پولیس والوں سے جا کر
 بچ جاتا تو ان کا کیا بگاڑ پاتا۔ انٹیلیجنس ہی نقصان پہنچتا۔
 شہناز صاحب دڑے پھٹے آئی ہیں۔ میری گزارش پر
 انہوں نے عبداللہ کو سمجھا دیا تھا پھر اسے اپنے ساتھ ہی لے
 گئے۔ وہ ان کے پاس سے واپس آیا تو مضمحل چکا تھا لیکن پھر
 اس کے بعد اس نے دیکھا تھا۔ شہناز صاحب سب چھوڑ دے کی
 کئی دن کمرے سے غائب رہ گئے۔ اب بھی کئی دن گزرے وہ
 گھر نہیں آیا۔ کیا آپ کے پاس اس کی کوئی شکایت آئی ہے؟
 کہیں وہ جہاں تھے تو نہیں نکلتا کیا تھا؟ اگر اسی نے پولیس
 والوں کے ساتھ کوئی جھگڑائی کی ہے تو میں اس کی طرف سے
 آپ سے مافی (معافی) مانگتا ہوں۔ جوان خون ہے، بہن کی
 ذلت بھری موت کا ہم بھول نہیں جاتے۔ اگر انہی اس دماغی
 عمل کو کوئی غلطی کر بیٹھے تو آپ لوگ اسے بلف (معاذ)
 کر دیں۔ اب کی داری میں اسے جے میں بند کر کے رکھوں
 گا۔ وہ کمرے سے نکل ہی نہیں سکے گا تو یہاں کسی طرح پہنچے گا۔
 بس آپ ایک داری اسے بلف کر دیں تاہن پہنچے بھڑے ہوئے
 انہوں کو ہاتھ کر دیتے ہوئے وہ شہناز سے درخوامت
 کرنے لگے۔ وہ اسے کیا جواب دیتا؟ اس کی چند کھینچ لی تو
 اس نے عبداللہ کی صحت مند توانا جسم کو ایک دھماکے کے

ساتھ گھر سے نکلے ہوئے تھکے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جس
 تالے میں قید کر کے رکھنے کی بات کر رہا تھا وہ تو زمین کی قید
 سے بھی نکلتا چکا تھا۔ اب چاہے یہ یوزر تھا یا نہ
 ہندو کر کسی کے سامنے کتنی ہی ترسنا تھا اس کا بیٹا لونا بکس
 ملتا تھا۔ وہ وہاں میں پیدا ہونے والی بہت سی لکھنوی
 ساتھ روئے ہوئے وہاں کوئی طرف دیکھنے لگا اس کی بیوی
 بھی روئے اسے اس عمل میں اس کا ساتھ دے رہی تھی جبکہ
 سزا اٹھا رہا سالہا میں سر ہیکے افسرہ و ما بیٹھا تھا۔ وہ پورا
 منظر ایک لٹے بنے خاندان کا تھا اور اس خاندان سے کسی
 مرتبہ پر امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے قتل میں
 اس کے شریک رہے ہوں گے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ
 آخر عبداللہ کیسے یہ حرکت کر چکا تھا؟ کھینچا کوئی ایسا شخص
 نے اس کے اندر جیسے نفرت کے توڑ کو پھوڑا اور کرات اس
 کام کے لیے راضی کیا تھا۔ اسے دیکھا کہ وہ دو دن گھر کی
 بیوی کے غواہ ہونے کے بعد اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا تو
 عبداللہ اس وقت بھی بہت برا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے
 اس کے منہ پر اس سمیت حکومت کے تمام افراد کو لپی اور
 بے ایمان قرار دیا تھا۔ اس کے نزدیک وہ سب ڈاکوؤں سے
 ساتھ ٹٹلے تھے۔ اس کے اس الزام کو اس نے غلط نہیں سمجھا
 سکتا تھا کہ پولیس کی مدد تک تو یہ بات ساف تھوڑی دینی تھی۔
 ایک فوجی، جد پانی تھ کے دل میں بھی بدگمانی اور نفرت
 سے قائم تھا کہ اسے خود کو شہلے پر راضی کر لینا کوئی مشکل
 کام تو نہیں تھا۔ اسے اس کام کی ترقیب دینے والے نے اس
 سے کہا ہوا کہ تم جو کچھ سوچتے ہو۔ بالکل درست ہے۔ یہ
 فکروں ہی میں جو کچھ ہو گا تو اسے علم کے ذریعے اور ہیں۔ چنانچہ
 جا کر ان میں سے چھوٹا کوٹ اڑا لیا۔ بولتا اور بولتا کہ
 اسے بھڑکانے والے نے اسے یہ بھی امید والی بیوی کہ
 موجودہ ظالم حکمرانوں سے نہایت پالو گے تو ان کی جگہ سے
 اچھے حکمران آئے گی امید ہے گاؤں کے کچھ دو داخل میں
 زمین کی کڑا سے ادا تو ہو کر تھوڑی سی ہی رہیں اور شک کے
 بعد اس کام کے لیے تھیں ہو گیا ہوگا۔ خاص طور پر اس لیے
 بھی کہ خود اس کے اندر بھی اندر نفرت کا جوا لودا بھڑک رہا
 تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کی اس کیفیت سے کیا فائدہ
 اٹھا کر اسے آگے بڑھانے والا کون تھا؟ کوئی ایسا شخص ہو
 سکتا تھا جس کی بات اس کے لیے فوج اور قاضی اعظم ہو
 کیونکہ بہر حال اپنی جان سے گزر جانا کوئی آسان کام نہیں
 ہوتا۔ میدان میں جذبہ شہادت لے کر جانے والا یہی بھی
 اس فوجیہ کے ساتھ اپنی جان کا خزانہ پیش کرتا ہے کہ اس

قربانی کے بعد اسے بھیجی کی زندگی عطا کی جائے گی۔ ہو سکتا
 تھا کہ عبداللہ کو بھی کسی نے ایسا ہی لایا ہو اور کیا ہو کہ
 جانوں کو قتل کرنا جتنے ڈاکے کام ہے اور اس کام میں اپنی
 جان دے کر وہ کوئی شخص ہے کا سودا نہیں کرے گا۔ اس دیا
 میں اس کے لیے کیا رکھا ہے؟ یہاں اس کے پاس تو ایسا
 رکھا تھا جتنا ہے۔ اس کا لباس اور اس کی عزت بھی کوئی شخص تو
 بھرے کہ وہ اس شخص کوئی زندگی کی جگہ خستوں سے گھر کی
 جنت کے حصول کے لیے کوئی شخص کرے۔ اس ترکیب سے
 مدد یوں سے لوگ معصوم جانوں کو استعمال کر کے ان سے
 اپنے مقاصد حاصل کرتے رہے ہیں۔ تاریخ کے صفحات میں
 حسن صاحب سمیت اسے کی گزرا رہے ہیں۔ عبداللہ کو بھی
 ایسا کوئی فتنہ پرور آدمی کرنا ہوا کہ جس نے زینت زور و
 کر آرام سے اس میں شے کا جیوہ بکھیرا تھا کہ وہ
 آدمی کون تھا؟ اس سوال کا جواب: چھوٹے کے لیے اس
 نے ان قیدیوں کے چہروں کو ٹوٹا اور پھر اس کی تحریریں اس
 کے چہرے پر جا کر تحریر کیں۔ اس کی اور عبداللہ کی عروں
 میں تین سال سے زیادہ کا فرق نہیں تھا۔ اسے شرف سے مومنا
 لیکن چھائیوں کے تعلقات پر زیادہ فرق نہیں پڑتا اور وہ ایک
 دوسرے کے قریب ہی ہوتے ہیں پھر ان کو عبداللہ نہیں تو تھے
 ہی کل دو بھڑکی۔ حرائق کے فرق کے باوجود ان دونوں کی
 آنکھیں میں وہی بات تھی۔ بہت زیادہ وہ بھی مگر ان کی
 روشنی کا تو ان دونوں کے درمیان مکان موجود تھا کہ والدین
 کے مقابلے میں ان دونوں کی سرگرمیوں سے زیادہ
 واقعہ ہوتا۔ اس خیال کے کرتے ہی اس نے ایک فیصلہ کیا اور
 دواڑے کے باہر کمرے سے باہر آ کر اسے کافر دلا دیا۔
 ”میں سر“ وہ کسی پھل کے جھن کی طرح فوراً حاضر
 ہو گیا۔
 ”ان قیدیوں کی جھکریاں وغیرہ کھول کر انہیں پانی پلاؤ
 اور اس کے بعد ان دونوں میں پانی پانی کو اس آج آؤ گے
 کمرے میں لے جا کر بیٹھاؤ مجھے کچھ دیر اس لڑکے سے
 اکیسے میں بات کرنی ہے۔“
 ”جی جی تو ہی اس کی صاحب کے پاس ہیں سر“
 ”تو ان سے لے کر آؤ۔“ صاحب نے باہر پر اس نے
 جھکا کر گھر دیا۔ اس بار وہ سبھی سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر
 بعد آکر اس کے پاس چلے گئے وہاں بھی اس کے ساتھ ہی
 تھا۔ اس کی بات کے مطابق اس نے پچھلے ان قیدیوں کے
 فکروں کو آگے لے کر ان کو پوری پوری پانی پلا دیا۔ پانی پی
 کر وہ قیدیوں کو پانی پر کھنکھاتے آئے۔ جانے کئی دیر سے دواڑے

طرز پر اسے تھے۔ خوف اور کہنے سلیقہ نہایت یاد کرنے کا
 دیے ہوں گے۔ اب جو پانی ملا اور ان کے ذہن کے دھن
 شہناز نے ان سے نرم لہجے میں بات کی ان کی تھوڑی سی
 اخبار بندھی ہوئی کہ صورت حال آتی تھیں ہی نہیں تھیں
 اپنی گردن کی بعد سے جسوں کر رہے ہیں۔
 ”آپ دونوں اس بات کی سنا سنا جا میں۔ میں اس
 سے تھوڑی دیر بات کر کے پھر آپ سے ملوں گا۔“ ان کے
 نرم لہجے میں یہ ہونے لگے کہ وہ وہاں تھوڑے سے
 جذبہ بے وقاحت سے انہوں نے اس کی تمام حدوں میں
 کی۔ ان کے باہر کھینچے کے بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”جی“ اس نے کہا۔ ”اب تم ہٹاؤ کہ میرا تھیں کہاں ہے؟“ انہوں
 کی آنکھوں میں پھلنے ہوئے اس نے پوچھا۔
 ”میں“ کچھ نہیں معلوم۔“ وہ پکا اور
 ”یہ تو معصوم ہو گا کہ اس کی کن لکھنوں کے ساتھ جہاں
 اپنی تھی؟“ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ اس کا زبان اٹھا
 بیٹھا تھا۔ ”اس نے ایک اور سے لڑا دیا ہے۔ سو سال کا۔
 ”اس کی سنی سے بھی زیادہ وہ تھی کتنی تھی۔ وہ کیا اور
 اکیلا ہی رہتا پڑتا تھا اور اب تو اس سب سے بڑا
 بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بھی جیسا ہو اس سب کے پاس ہوا
 جاتا تھا لیکن اب وہ اندر ہی نہیں کرے۔ نہ کیا تھا ان کے
 پاس عبداللہ کے رہنے میں معلوم کرے کہ انہوں نے کیا
 کر دیا وہ دواڑے سے ان سے بھی لے نہیں آتا۔
 ”یہ شہناز صاحب کیسے آدمی ہیں؟“ ان کا ہمارا گھر
 کا منظر میں دکھانے پر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”وہ بچے آدمی ہیں۔“ چیتے کی لڑکی کے نام نے
 پاس پڑھنے جاتے ہیں۔ اندر سے انہیں ہی سمجھی زبان ملی
 ہے کہ افسر سے اسے اٹھا لیا بھی ان کی کی چپ کر کے سنا
 ہے۔ عبداللہ بھی ان کی کی سنتا تھا۔ چہ ہائے اب وہ ان
 چلا گیا ہے؟ اس نے شہناز صاحب کو بھی اپنے بارے میں
 کچھ نہیں بتایا۔ ”ابن الشہناز سے بتا دو۔“ ان کے انہوں
 میں کچھ دیر بھی کا ساما ہوا اس بات کا کوئی تو اس کا تو کہ
 عبداللہ کو بیکے والا شہناز ہی ہو۔ شہناز اور وہ مل کر
 کا دواڑہ اندر کر رہا تھا اور اس کی پاس کاوشی سے نہایت
 تھا۔ اپنے منہ کے لیے اس کی برین اور اٹھ کر اسے لے لیا
 راہم کا زہر تھان تھا اس کے ذہن میں ابھرے والے
 اس خیال کو اس بات سے بھی تھوڑے سی لڑکی کی شہناز کا
 تاثر بہت ہی لگ گیا اور بعد انہیں کا فائدہ نہ دیا گیا
 تھا کہ گاؤں والے اس کی طرح نہیں جانتے تھے۔ وہ ان کے

لکھنؤ میں بعد وہ اپنی آنکھوں سے اس کے ساتھ نہیں مل سکا اور وہ ایک اور نمبر لڑا کہ وہ جیتا تھا۔ وہ لوگ جو خوف زدہ ہو کر گھر گئے تھے۔

”بیٹھے۔ اس نے انکس اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ کر وہاں بیٹھ گئے۔

”اس مرد سے کے دھک شاد ہزار صاحب کے رہے۔ میں کیا جانتے ہیں آپ کو؟“

”وہ اسے چنگے آدمی ہیں سرنی اچھا ہے۔ وہ اپنی طرح کل کرتے ہیں۔ ہاں کبھی وہ بے کھتے ہیں۔“ ایک شخص فرمایا اس کی تعریف میں رجب النعمان ہو گیا۔ یہ وہی راجے کی جڑوں سے پہلے وہ وہی محمد علی دہلوی تھی۔

”آج وہ کہاں گئے ہیں؟“

”یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا کہ وہ کب گئے ہیں؟“

”تقریباً ان کے اس مسئلے کو روکنے کے لیے اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا۔

”وہاں (آج) کی توڑ لگے ہیں سرنی ادا وہ وہاں سے گئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ میرے اور اخصت میں کے پتھر بھی گئے ہیں۔ شاد ہزار صاحب کہہ رہے تھے کہ وہاں سے پتھر ڈنٹے نہیں ہیں۔ انکس ہوا۔ (ادھر) کے دو سے عدت میں واغوروات کے لیے لے گئے ہیں وہاں ہم نے بھی ہاک اس سے جاتی تھی جہاں کیا ہوگی۔ ادھر وہ وہاں پتھر کے دو سے مسئلہ ان کے ساتھ لڑتے بھڑکتے ہی بھڑکتے تھے۔ اب پور میں وہ نہ کر تھیں بھی حاصل کر لیں گے۔ سارا خرید شاد ہزار صاحب نے خود اٹھانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ پتھر چنگے آدمی ہیں۔ وہ۔ لہذا ان کو کبھی جانی ہوت۔“ وہ انھیں شاد ہزار کو دما میں دینے لگا۔ ہاں وہ واغوروات کے چہرے پر بھی ایسے تاثرات تھے جن سے ظاہر ہوا کہ وہاں کے ہم خیال ہیں۔ یقیناً شاد ہزار نے ان کے ذہن کو دہری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا جب ہی وہ اپنے دونوں گواہ کے ساتھ آتی اور پیچھے ہٹے اور اسے دیکھیں ہوئے تھے۔

”شاد ہزار صاحب وہاں سے لاہور گئے ہوئے ہیں تو ان کا مطلب ہے کہ وہاں سے رہے۔ یہ بھی بند ہو گا۔“ اس نے چونک کر پوچھا۔ ”اسے ہی جو حالت کی اس سے یہ معلوم تھا کہ نہیں۔ پور تھا کہ وہ وہاں سے بند پڑا ہوا ہے۔ گاڈ کی اس وجہ ادا کی ضمانت وہاں کے گھر میں شاد ہزار کے اندر اپنی خاصی عقل کی بیخ بوجہ جانی کہ جسے کبھی انکی جانب وہ لوگ نہ کر سکتے تھے۔ وہاں سے تھے تو انکس کی شے ہو کر رہی تھی۔ انکس نہیں آتی تھی۔ یہ انکس تھا کہ آج ہی میں نے مسئلہ کی ہو۔

”ادھر۔ وہ جہاں نہیں تھا۔ وہاں سے پہلے ہاں یہاں پر پتھر کے لیے آ رہے ہیں۔ پتھر سے بنا چلا تھا کہ آج کل شاد ہزار صاحب کا کوئی پروہن (سہارا) آتا ہوا ہے اور اسی ان لوگوں کو پڑھا رہا تھا۔ میں ان سے ملنے کے لیے بھی آتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی طبیعت مشکب نہیں ہے اس لیے میں سے نہیں کہتے۔ میں نے ہاں میں ہاں اور پھر وہاں آگئی کہ بعد میں میں لوگوں کو نہیں کہتا۔ میں میں میرا چھوٹا بھائی ہوا۔ ادھر وہ۔ میں ہی رہا رہتا ہے۔ گھر وہاں آگئے کہ شاد ہزار صاحب کے دوست وہاں جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہاں سے تو کہہ گا کہ پہلے جاؤں گے پھر چلاؤں گا پھر میں ہی شاد ہزار صاحب کو روکے ہیں گے۔“ وہ انکس کی آواز کے ساتھ ہی بے چارہ نظر میں نکلا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ وہی کی تھی۔ اس کے سوال کے جواب میں ہاں تانے لگے۔ ان کے جواب سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ یہاں صاف تھکا تھا۔ ساتھ ہی اس نے انداز سے ہی بھی لکھ دیا کہ وہاں شاد ہزار کے وہاں کوئی شخص نہیں تھا۔ تیسرا شخص جس میں سمجھو ہستہ کے ہوئے تھے یقیناً کچھ دن کے ان دنوں کے لیے مخصوص ہو گیا ہو جاتا تو قاعدہ سے میں قیام کرتے رہتے تھے۔

”وہی محمد علی دہلوی تھی تو نا؟“

”نہی ہے۔ اسے اپنے ساتھ نہیں لے گئے شاد ہزار صاحب۔“

”وہی محمد اور میں سے اسے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان کے مطابق عبدالحقین مسکین طبیعت کا۔ وہاں کے یہاں شاد ہزار کی بہت سی بات تھی۔ شاد ہزار کے ساتھ لاہور جانے والے جن دو لوگوں کے بارے میں بتایا گیا تھا ان کی بھی یہ خصوصیت سامنے آئی تھی کہ وہ شاد ہزار اور حضرت کے ایک تھے۔ یہی شاد ہزار کی خصوصیت تھی کہ مرکز وہ پہنچے تھے جن کی گرفت میں سرکاری سپاہی ہیں اور اسے موجود تھا۔ اس قسم کے بچوں کو اس نے یقیناً کسی خاص قسم کے تحت ہی خود سے قریب کیا ہوا کہ وہ مقدمہ کیا تھا۔ یہ وہاں انکس کے انجام سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ انکس نے یہاں جاتا تھا کہ عبدالحقین کو اس کا دم پر اسے۔ الا شاد ہزار ان خباہتیں انکس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا تھا کہ انکس انکس ہی کے ساتھ نہیں گیا۔

”عبدالحقین سے پوچھ کر کہتے تھے شاد ہزار صاحب۔ اگر وہ ابھر رہا تھا تو شاید اسے بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہ وہ تو کئی دنوں سے غائب تھا۔ یہی محمد چارہ تو خود اسے دھوکہ دے پھر رہا تھا۔“

”عقلیت میں نے جواب دیا تو وہ وہاں جاتا گیا۔ یہ بھی تو نہیں تھا کہ عبدالحقین کوئی اور پہلے نظر سے اس

لیے ہٹا دیا گیا ہو کہ اس سے ایک ہزار کا مایا جاتا تھا۔ شاد ہزار نہیں چاہتا ہو گا کہ بعد میں اس کی شناخت ہونے کے بعد کوئی اس کے پاس عبدالحقین سے متعلق یہ پوچھ کر کہنے آئے۔ کوئی آتا ہی ہو گا وہاں کہہ سکتا تھا کہ مجھے خبر نہیں، میں تو نہیں تھا۔ یہ عبدالحقین صاحب ہو گیا تھا۔ وہ جن دو لوگوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، انکس کی جگہ پکڑانے کے بعد یقیناً وہاں یہاں آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ انکس نے خبریں اس کے گھر والوں کے بوس کی حراست میں جانے کی خبریں کر اس کا یہاں مقیم سامی ٹھکانہ کیا اور جلد ہی جلد ہی تمام مشکوک چیزوں کو آگ لگا کر یہاں سے ہٹا دیا۔ جلد ہی کی وجہ سے اسے شراب کی بوتلوں کو ٹھکانے لگائے یا اس نے فریبی گورنر سے کہنے کا موقع نہیں مل سکا تھا جس سے اس کی بدعقلی کا ظہور ہو رہی تھی۔

”شاد ہزار صاحب کے جو دوست یہاں تھے وہاں سے ہوتے تھے ان کا نام معلوم ہے نہیں ہیں؟“

”اب وہاں لوگوں کے ساتھ موجود ہونے کے لیے صرف وہ ہیں۔“

”ہم تو انکس صاحب سے شاد ہزار صاحب سے بتا دیا تھا کہ وہاں کے بہت اچھے دوست ہیں۔ وہ تو عالم ہیں اور پور سے ادھر خود سے دنوں کے لیے رہے آئے ہوئے ہیں۔ ہم تو انکس مولانا صاحب کہہ کر لے جاتے تھے۔“

”ان کا جیہ کیسا تھا۔ کچھ جانتے ہو؟“

”انکس نے سوچتے ہوئے کہا کہ وہاں سے آئے ہوئے آدمی تھے اور جگہ دار مولانا تھا۔ انکس نے پوری سمجھی۔ سر کے بال کھینچنے سے تھے اور ڈاڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ انکس پر ہنسنے لگی لگاتے تھے۔“

”یہ سارا بھڑ پڑ ہے ہی۔ اس نے بالکل صحیح حد تک ہوا کہ وہاں سے ہی ان کی خدمت کے لیے۔ یہ میں کو ہوا تھا۔“

”عقلیت میں نے سچ میں دلی دیتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”وہ کس گھر میں رہتے ہوئے تھے اور کب سے یہاں لاہور رہے تھے؟“

”عقلیت میں نے اس کی طرف جواب دیا تھا کہ انکس نے انکس سے ایک اور سوال کیا۔

”وہ تو بے دنوں سے رہے تھے۔ یہ انداز اپنے گھر سے مل ہی رہے تھے۔ ہمارے سامنے نہیں آتے تھے۔ وہ جرحی والا کراہے۔ ادھر رہے تھے۔ یہیں تو ان سے شاد ہزار نے اپنے دور جانے سے ایک دن پہلے ہی ملوان تھا۔ یہ بات کافی غور طلب تھی۔ ایک شخص جو کئی دنوں سے

شاد ہزار کا مہمان تھا، مسلسل کی دن ویاں نام پتھر سے رہے کے بارہو رہی کے سامنے نہیں آیا۔ وہ وہاں پہلے تھا ہوتا رہا اسے اپنے لاہور جانے سے قبل بچوں سے ملوایا کہ وہ صرف بچوں تک ہی تھا۔ وہاں اور ملاقات کی خواہش سے کر آئے والے نصیحت بھی کو اس نے پہلو کر ڈال دیا کہ یہی طبیعت غریب ہے۔ اس بات کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسا شخص ہو جو لوگوں سے چھپ رہا ہو اور اسے تو وہو کہ کو اسے شناخت نہ کر لے اس کا جو قصہ سامنے آ رہا اس سے کیا یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انکس سے کسی نے اپنا حلیہ لے کر انکس کی ہوا۔ سر کے بال چھوئے کرانے کے بعد کوئی شخص اپنی ڈاڑھی بھی منڈی دے لے تو ایک شخص نے لے دیا وہاں پہنچانے والے بھی اسے شناخت کرنے میں دھوکا کھاتا ہے۔ اس پر کامیابی نہیں اور جسے کے استعمال سے اور بھی دھوکا دینا اپنی جاکتی ہے۔ اس تبدیلی شدہ حلیہ کے ساتھ انکس آزما کر طوم پر نہیں کے سامنے آیا تو وہو کہ کہہ اسے پکارتے ہیں یا نہیں۔ بچوں میں سے کئی نے اسے شناخت نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہی ہاں سے کے سامنے آئے کہ جو آتے ہیں کہہ سکا۔ بہر حال، یہ سارا مفروضہ ہے جن کی تصدیق ہزار پہ کرانے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ جو بات سب سے بڑا پاداش تھی وہ یہ کہ وہ یہاں پہنچنے میں ہرگز بیٹھے تھے اور اس طرح انکس کو مارا ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ شاد ہزار وہاں پہلے ہی مل گیا تھا اور اب اس کے وہاں آئے گا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے دو گھر کے کئی تھے جنہیں شاید وہ وہاں انکس ہی کی طرح استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ خیال بہت دھت ڈاک اور درد کو لہرزا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔“

”اپنے انکس میں کھاتا ہے ان انکسوں کو انکس اس نے اپنے چہرے انکس آئے دیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیا۔ وہاں شاید اس سے صورت حال جاننے کے خواہش مند تھے جن اس کی تہذیبی گواہی دیتے ہوئے کوئی سوال کرنے کی بہت نہیں کر سکتا اور چپ چاپ باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد وہ وہی انکس کی منظوری طرف متوجہ ہوا۔ اس کے پڑنے پر ہی تھیں تھیں اور یہی انکس کا چل چلا ہوا تھا۔ وہ شروع سے اس کیفیت میں اس کے ساتھ ساتھ تھا اور یقیناً اس نے بھی وہی سنا تھا کہ انکس نے جو لفظ کہہ رکھا۔

”اس گاؤں کے قاتلے اور کوہلو پر یہ عداوت فی الحال سب کر دلی پڑے گی۔ یہ کل لاہور سے کبھی نہیں آوا کر یہاں سے فخر پر قس وغیرہ لوگوں کو ان لوگوں نے

تھی ہی، جتنا دیکھ بولیں یہاں ان کا مسلسل فیہم تھا۔ کہیں نہ کہیں انہوں نے اپنے نظر پرش ضرور پھوڑے ہوئے ہوں گے۔ خصوصاً ان کمرہ میں جہاں شاہنواز اور اس کا ساتھی قیام پذیر تھے۔ ممکن ہے نقش پرش کی مدد سے انہیں ان کے چہرے میں کامیابی ہو جائے۔ اس کے اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد قاتلے دار اور اس کے دو ساتھی وہاں پہنچے تو انہوں نے پچھلے دروازے پر قبضہ کر لیا۔ یہی پھر جیسی تھی کہ انہوں کی سرکاری اور چھوٹی دہلی سے ترقی وادی کے سرکاری محکمہ دو چھوٹی تھوڑے سے چھوٹے تھے۔ تین یا چار افراد کے اہلکار یہ قتل گاہ میں موجود تھے۔ حقیقتاً اس قاتل گاہ کی بے لپی کی طرف۔ وہیں کی وہاں کا کردار کا سیارہ ان تھوڑی جتنی کے انفرادے کہیں سے ہی لگا ہوا ملتا تھا۔ قاتلے کا غلہ اپنی گواہی وصول کرنے اور گاؤں والوں کو اپنے رعب میں رکھنے کو ہی اس اپنی توہین تصور کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہی ان کے بے یقینی جتن لگتا تھا۔ خصوصاً اس بے یقینی کو انہیں اور بے یقینی اعتبار کا ذریعہ تھا بلکہ ایک طرح سے انہیں اپنے اسی افسران کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کی مثال بھی دیکھ کر ہی دہلی والے کہیں سے ہی جی تھی۔ انہیں نے ایک معمولی قاتلے داری اس طرح ثابت کی تھی کہ میں کاروبار ہی بدلی کر رہا تھا اور وہ یہی تھوڑی کٹنگ پر چھوٹے ہوئے خاموشی اختیار کر کے بیٹھ گیا تھا۔ قاتلے دار نے اس طرح اسی سے جب کوئلے دینے پر یقیناً خود کو بدلی دار دلی ہوئی تھوڑا بڑا دست کے اس پہرہ سے کسی ایک ایسے کے ساتھ وہاں نظر آ رہا تو گہری فینہ سے دھکے دے دے قاتلے دار کو جھٹکی کہیں دے رہا تھا کہ ان کی یہاں آمد کا کیا مقصد ہے؟ اس نے اپنی پٹیس کی ملازمت کے غرض میں یقیناً کھانچا۔ تو کوئی پرورش کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا، ورنہ تمام زمین تھوڑی ان کے اہل خانہ سمیت گرفتاری پر ہی چھوڑ دیا۔ اس کی غیر معمولی صورت حال کے لیے اپنے منہ کو کھلتا رہا۔ یہی اس کی فطرت کا یہ عالم تھا کہ اس کے قاتلے کی حدود میں ایک مرد سے جس قاتلے کا ہے سی ڈی ایس کی اور پٹیس کے چاہی اسی دہلی سے موجود تھے پھر بھی اسے کوئی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ گاؤں کے جاگ جانے والے افراد نے بھی یقیناً اس کی مشعل تھوڑی کے اعتدالی کو دیکھتے ہوئے اسے یہ اطلاع پہنچانی ضروری نہیں تھی اور اب وہ آئیں جانا۔ وہ چھوٹے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس اسے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ ڈی ایس کی منظور نے اسے درستی کی قیادت کو تسلیم کر دیا۔ وہاں کو وہاں

خبردار کرنے اور اندر موجود اشیاء کے ساتھ سمجھ بھڑک کر نے کا حکم دیا۔ شہر یا اس ساری کارروائی کے ایک سنگ کا زری میں یہ چھوٹا آخر کار رات کے باطل آخری پیران کی اندازہ ہے۔ وہی ممکن ہو سکتا ہے۔ انہیں اس سفر کے دوران اسے اپنی جسمانی کیفیت کا اندازہ ہونا۔ مسلسل جھاک اور سر اور زخموں کی وجہ سے اس کا جسم بھی پھوڑے کی طرح تھکا رہا تھا اور اب اس بات کی شدہ خبر رات تھی کہ چھوٹے قاتلے کے لیے یہی سی۔ اسے وہ انداز کے ساتھ خود سے آرام کا موقع مل جائے۔

وہ مشکل سے وہ چھوٹے کی فینہ سے کھانچا اپنی رہائش گاہ پر واپس پہنچنے کے بعد بھی اسے کی اہم امور مٹانے پڑے تھے۔ میرا کام کا اندازہ تو اس کے شہنشاہ کے ہونے کے متعلق تھا۔ اور ایک شخص وہاں جلد از جلد چھوٹے کی درخواست کرنے کا تھا جس نے چٹال کی صورت حال کے بارے میں جاننے کے لیے قاتلے کو قتل کر دیا۔ یہ جان کر کہ وہ چھوٹے کی اہم امور دیکھ رہا تھا، اسے خاصا سکون ملا تھا۔ وہی افراد میں سے کچھ کی موت بھی واقع ہو گئی تھی۔ اندازاً اس حادثے میں چھوٹے والوں سمیت تین سے چھ تین افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ اسی ہی رات ہی تھے۔ مرنے والوں کے لیے قبریں اور ان کے موت کی ایک شہر کی کے لیے مانی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ انہوں کو پھر وقت میں اندازاً ثابت ضروری تھی۔ وہ چھوٹے کی طرف سے مرنے والوں کے دروازہ اور زمین کے لیے مانی اندازاً اعلان سامنے آ گیا تھا۔ مدد اور ہر پانچھتے بھی اس واقعے کی خدمت کی تھی۔ ان ساری اطلاعات کے ساتھ اسے یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ اس کے منظر سے غائب ہو جانے کا کوئی کرنا نہ ہو گیا ہے۔ سینہ والوں نے اس ایشی کو لے کر تو اس آرائی کی تھی۔ ہونے کے بعد چھوٹے کی گرفتاری کی خبر بھی کر رہی تھی اور زمینے والے کی استوری کی جان میں یہ سمجھتے پھر رہے تھے۔ وہ چھوٹے اس صورت حال پر بھی کا اکتہار کیا تھا۔ وہ اس اطلاع کو زیادہ خاطر میں نہیں لیا۔ وہ اپنی کو بعد میں سمجھا چکا تھا کہ وہ چھوٹے کا خون میں مصروف رہا تھا، وہ توئی توجہ کے طالب تھے۔ اب بھی اسے انہوں کا تھکا تھکا یہ خبر سے ایک اہم شخص قرار دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے شہنشاہ کی اس کا وہاں سے کسی تو پھرائی جاتا۔ بہر حال، ہونے والی اس غلطی پر انہوں نے اسے دیکھ کر کبھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اصل بات وہ یہ تھی کہ

اس غلطی کی ساری کی کوئی صورت نکلی جاتی اور یہ ساری کچھ ربح و نقصات کرنے سے ہی ہو سکتی تھی۔ وہ جو کچھ کر سکتا تھا، وہ کر رہا تھا۔ ڈی ایس کی منظور کو بھی اس نے چھوٹا بات راستے میں ہی دے دی تھی۔ یہ سارے ضروری کام کھانے کے بعد ہی اسے اپنے زخموں پر سرسرم لگا کر ایک گاہ میں دوا کے ساتھ چھوٹے کرنے اور اس کی دل کے مرکز پر پٹیس کی قیادت میں لگی اور یہ بہت سرف دھکے کے لیے تھی۔ وہ چھوٹے کی دھمکی وہ بہتر سے اچھ کر فیش ہونے کے بعد دھمکی کے پیر پر آ گیا تھا۔ شہنشاہ اس نے بارے میں یہی کیا تھا۔ کل کے اعصاب جس حالت کے بعد جس میں اس نے اپنی نگہوں سے انسانی جسموں کے ڈرنے ہوئے تھوڑے اور پانی کی طرح بہت خون دیکھا تھا۔ کچھ کھانا پیچ آسان نہیں تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ ان حالات میں اسے اعصاب کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس وقت دل نہ چاہیے کے یاد ہو اس نے... جسمانی توانائی کے لیے انداز کی ضرورت پوری کی تھی اور اب چاہو ہوتے ہوئے عبد اللہ ان سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچتا رہا تھا کہ بہت میں نے اسے ڈی ایس کی منظور کی آمد کی اطلاع دی۔ ڈی ایس کی اس وقت آمد خالی اندازے میں ہو سکتی تھی۔ اسے بتا دے کے لیے منٹک دوم میں بچانے کا حکم دینے کے بعد وہ جلد ہی چند ہی تیار ہوا اور منٹک دوم میں پہنچ گیا۔ منٹک دوم میں قدم رکھتے ہی اس کی نظر ڈی ایس کی کے چہرے پر پڑی تو اسے کی غیر معمولی صورت حال کا احساس ہوا۔ ہر تھوڑے کوئی سوال کے بغیر وہ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک منٹک مٹنے پر پہنچ گیا۔

”آپ کی جانب کے مطابق میں نے اللہ آباد کے در سے سفر کر ہونے والے بندے کا کلیہ اپنے بندوں کو قوت کر دیا کہ انہیں اس اڈے سے معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ایک ایس کے کھنڈ پٹیس نے تصدیق کر دی ہے کہ اس خطبہ کا ایک بندہ اللہ آباد سے اس کی اس میں ہوا تھا۔ یہاں سے یہ جانیں کہ وہ کہاں اترا۔ اس یہاں سے لاہور تک کے رات پڑ چکی ہے۔ لاہور میں جب اس خفی ہوئی تو اس کے پیچھے مسافروں میں وہ شخص شامل نہیں تھا۔ یہ بات کھنڈ پٹیس کو بھی طرین یاد ہے اس لیے اس کا خیال ہے کہ وہ رات سے میں ہی کسی دوم سے شہر کے اس اڈے پر اتار گیا ہو گا۔ اس لاہور پہنچے ہے۔ چنانچہ اپنے بے شمار فیصلوں کے مطابق وہاں سے پھر بھی کی۔ اسے شہر سے جتنی بھی لکھن لاہور کے رات پڑ جاتی ہیں۔ ان کا آخر یہ کچھ فیصلوں ہے۔ اس میں روز بروز لاہور تک زیادہ مسافر نہیں

جائے۔ زیادہ کی منزل کوئی قریبی شہر ہوتا ہے۔ اس لیے کھنڈ پٹیس اور انہیں لگا کر وہ شخص کہاں اترا۔ ڈی ایس کی نے خود ہی اسے رات دینی شہر پر دینی بھٹے کے بعد وہ وہاں سے جہاں وہ رات پڑ گئی تھی۔ آپ وہاں اپنے بہتر سے کچھ سمجھ کر وہاں سے ملتا ہے وہ شخص وہاں سے کی دوسری کی میں پھوڑا گئے کیا ہوا اور اس میں کے کھنڈ پٹیس زیادہ کیا اس کا صحابہ، وہ تو ہمیں اندازہ ہو سکتا کہ وہ یہاں سے گئے کے بعد کہاں پہنچا ہے۔

”میں اس کام کے لیے بدایا ہے۔ اے چکا ہوں۔ آپ تک بندہ رات کی ہو چکے ہوں گے۔ یہ ہے کہ چھوٹے کھنڈ پٹیس کے بعد وہاں آئیں گے تو ان کے پاس اس مسئلے میں کوئی اطلاع موجود ہوگی۔“ ڈی ایس کی نے لڑا اپنی کارکردگی کے بارے میں بتایا۔ ہم اس کے چہرے پر ہر روز پریشانی کے کلمات پر دستور ہو جوتھے۔

”کوئی اور بات؟“ اس کی کیفیت پر پتہ چلتا ہے اس نے پٹیس کی سے سوال کیا اور کوئی پریشانی سمجھ رہا تھا۔ وقت دیکھا۔ اسے اب تک رات ہو گیا ہے تھا کہ ڈی ایس کی کی موجودگی کی وجہ سے رکنا پڑا۔

”ایک بڑے بڑے ہر اور میں سمجھ اس کی فیصلہ ناپ ہے۔ میں اللہ آباد سے آنے کے بعد قاتلے پہنچا تو وہ لوگ وہاں موجود نہیں تھے۔“ ڈی ایس کی نے بھی آزادانہ بیان کیا تو وہ چھوٹے کیا۔ قاتلے کے ایک مشعل کرنے میں وہیں کے پٹیس کی گرفتاری میں موجود وہ اقرار کر لیا کہ اس کے غائب ہو سکتے تھے۔

”وہ لوگ وہاں سے کس طرح غائب ہو سکتے ہیں اور وہ انہیں سمجھتے تھے۔ ان کا ایک مشعل کرنے سے لکل گرفتاری پر موجود پٹیس کو مل دے کہ گرفتار ہو جائے اس طرح میں ہوا؟“ اپنے ذہن میں اٹھتے سوال اس نے ڈی ایس کی کے سامنے بھی کر دیے۔

”وہ تو اسے گرفتار نہ کیا تھا۔ میں نے بلکہ انہیں غائب کیا گیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب اللہ آباد کے لیے روانہ ہو رہے تھے اس وقت اس کی صاحب تحریف لے آئے تھے۔ ان کی تحریف دوری کے بعد چھوٹے ہونا کی اطلاع چھوٹے قاتلے میں موجود اپنے ایک ٹکر کے ذریعے ہی ہے۔ اس نے چھوٹے یا کہ اس کی صاحب کے قاتلے چھوٹے ہی ایس کی وہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے مرنے ساری مشعل سے ایک رکھا تھا لیکن آپ کے حکم پر وہی لوہر اس کے

و انہوں کو اللہ آباد سے گرفتار کرنے کا کام تو میں نے اسی سے لیا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اس گرفتاری کا تو رپورڈ ملے
 حادثے سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے موقع سے
 ہی ایس بی صاحب کے کان میں سادہ بات چھوٹھ دی۔ وہ
 تو یقیناً پہلے ہی آپ سے اور مجھ سے ملا تھا۔ ہم نے
 اس مختلف سٹیٹس ہند سے کو جس طرح اس کے علم میں لائے
 بغیر خاموشی سے غلط فہم کرنے پر متفق کر دیا تھا، یہ بات انہیں
 جھوٹی تو نہیں ہوگی، چنانچہ انہوں نے اس موقع سے فائدہ
 اٹھا لیا اور دین محمد اور امی کی بیوی کی بیٹے کو کسی اور جگہ منتقل کر دیا
 دیا۔ یہ کام انہوں نے اپنے بہت ہی اعتماد کے بندوں سے لیا
 ہے اس لیے میرے فزیکل کو نہیں معلوم کہ وہ جگہ کون سی ہے؟ اب
 سمجھوتہ حال رہے کہ تمہارے کے دیکھنا اس کو ان لوگوں کی
 گرفتاری شادی نہیں کی گئی، عمل کسی طور ایس بی صاحب کے
 خلاف گواہی نہیں دے گا کہ گرفتار شدہ افراد کو انہوں نے
 نائب کر دیا ہے۔ ہاں تمہیں کہ جو کچھ مجھے اپنے خبر کے
 ذریعے معلوم ہوا ہے، وہ آف دی ریکارڈ ہے جس کے
 بارے میں ایس بی صاحب سے کچھ نہیں پوچھا جا سکتا۔ ان کی
 طرف سے صاف جواب مل جائے گا کہ جب کسی گرفتار دہی
 نہیں کیا گیا تو اس کے بارے میں نائب ہونے کا کیا سوال؟
 ڈی ایس بی کی دی ہوئی یہ اطلاع بہت تشویشناک تھی۔ وہ
 محمد اور امی کے اس خاندان کا دھماکے سے کوئی تعلق ہونے کے
 شک کا مطلب تھا کہ اب ان سے ہر ممکن طریقے سے یہ جرم
 قبول کر دینے کی کوشش کر دانی جانی۔ عموماً خود دش حملہ آور کا
 سر دھماکے کے بعد کھٹکا رو جاتا ہے۔ مہدائیں کا سر بھی
 موٹے پرش کیا گیا تھا۔ اس کے چہرے کی تصاویر کی مدد سے
 جس اس کے بارے میں تحقیق کی جاتی تو یہ بات ثابت ہو
 جاتی کہ وہ دین محمد کا بیٹا تھا۔ اس حقیقت کے معلوم ہونے کے
 بعد روئے چارہ و مزید قلاب میں آجاتا لیکن ڈی ایس بی کی
 بات سن کر مجھے کہ ایس بی کی عمر جانتا تو کسی طرح یہ ثابت نہیں کیا جا
 سکتا تھا کہ وہ مظلوم خاندان اس کی تحریں میں ہے اور اس کو
 یقیناً گرفتار کیا تھا۔ اگر اس کی نیت میں خرابی نہ ہوتی تو وہ انہیں
 نائب ہی کیوں کرتا؟

اب تو جو ہو گیا۔ ہو گیا۔ اب اپنے اضافہ سمیت
 زبان بالکل بند کر دیے کہ قوری کارروائی کی ضرورت محسوس
 کرتے ہوئے میں نے رسک لیتے ہوئے اپنے عام طریقے
 سے اس نہیں پر کا ہم شرع کر دیا تھا ورنہ یہ ایسا معاملہ ہے جس
 کی تحقیق بہت اہلی رنگ پر ہونی چاہیے۔ لاہور سے نیم آجائے
 کے بعد یہ میں اسے دیکھ کر دیا جائے گا۔ ایس بی صاحب

اپنی فحشی دکھانے کے پتھر میں جو کچھ کر رہے ہیں، انہیں
 کرتے دو۔ انہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس کھان کے بھی
 کام کا نہیں ہے۔ ابتدائی طور پر جسے والے بھگنے کے بعد اس نے
 خود کو سنبھال لیا اور ڈی ایس بی کی حمایت دی۔

میرے اپنی کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائے گا۔
 اپنی فحشی تو ڈی ایس بی کی بھی دکھانا چاہتا تھا چنانچہ رخصت
 ہونے سے پہلے اس سے استدعا کی۔

ہاں پر کا کر کرنے کے لیے جو نیم؟ کے اس کے
 ساتھ آج ہی گور بنایا ہو گا۔ کچھ برنگ وڈ میں خود انہیں وے
 دوں گا لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کے جوابات دینے کے لیے
 ظاہر ہے کوئی ایسا آدمی ہونا چاہیے جو باخبر بھی ہو۔ میرے
 خیال میں اس کام کے لیے آپ ہی سب سے مناسب آدمی
 ہوں گے۔ اس کے اس جواب نے ڈی ایس بی کا چہرہ کھلا
 دیا۔ وہ خود جان بوجھ کر اس شخص کو ایسے مواقع فراہم کر رہا تھا
 کہ اسے اپنے گیر پیر کو اوپر لے جانے کے لیے کام کر دے
 دکھانے کا موقع ملے۔ ایس بی کی طرف سے واپس ہونے
 کے بعد اس کے اس ماحول نے آفسر کے ساتھ اچھی اطلاع
 اسٹینڈنگ انتظامی نقطہ نظر سے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ وہ یہ بھی
 محسوس کر چکا تھا کہ اسے شک ڈی ایس بی کی اپنی طرف سے الٹی
 میں جتنا سے لیکن فطرتاً اکتا بر آدمی نہیں کہ ہر وقت کہنے کے
 لیے تیار رہتا ہے۔ اس طرح کے آدمی کو ڈی ایس بی اہمیت دے کر
 روٹن منتقل کی جگہ دکھائی جائے گا وہ کارآمد ثابت ہوتا
 ہے۔ ابھی تب اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہو رہا تھا اس لیے اس
 نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ڈی ایس بی منظور کو کسی ہر معاملے میں
 فرخ پر رکھتا ہے۔ اسے رخصت کرنے کے بعد وہ اسپتال
 کے لیے روانہ ہو گئے۔ اب تک اسے وہاں جانے کا موقع نہیں
 مل سکا تھا اور اسے علم تھا کہ میڈیا اس بات کو اچھا لے رہا ہے۔
 اس بہن کو اسے شعلے میں اسٹینڈنگ مشین سب سے بڑا فخر
 تھا اور اس کا مسئلہ صحر سے خاصہ چٹا وچ اور نظروں
 میں آیا تھا۔ لیکن تھا کہ اس کے لیٹھن نے بھی میڈیا کی توجہ
 چھپنے سے اس طرف مبذول کرادی، وہی ہو رہی وہ لوگ
 زیادہ اہم و محار سے تھے۔ وہ جیسے ہی اسپتال پہنچا، وہاں موجود
 دو سٹیشن جہاں اس نے اسے گھیرا۔

آپ کے قتل کے ایک گھنٹے کے افراد پر قیامت
 ٹوٹ پڑی تھی، ایک جیسا اسپتال میں سم توڑ کئے اور آپ
 اس ان کی مزاحمت پڑی کے لیے تحریک لارہے ہیں؟ ایک
 صحافی نے تنبیہ کی کہ میں اس سے سوال کیا۔
 اس ان لوگوں کی طرف سے عامل نہیں تھا۔ میرا پی

اسے دیکھی ہوئے کے باوجود مسلسل یہاں موجود تھا اور میرا اس سے فون پر رابطہ تھا۔ میں دیکھوں کہ بہترین طبی امداد پہنچانے کے لیے جو اہل کثافت کر سکتا تھا وہیں لے گئے۔ میری ذاتی کوششوں سے ہی یہ ممکن ہو سکا کہ زیادہ مختار و الزام کو نیکی کا چکر کے ذریعے لاہور کے بہتر سہولت والے اسپتال میں منتقل کیا جاسکے۔ حراج پری کی فارمیٹلٹی بھانے کے لیے یہاں بہت لوگ موجود تھے لیکن میں نے یہاں ایسے اہم کاموں میں مصروف تھا جو مجھے ہی کرنے تھے۔ بہت محنت سے صوفی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اس کا لچرہ لکھ کر ہو گیا جس کا فونش لیتے ہوئے اس صوفی نے تیر لکھ میں فوراً ایک اور سوالیہ وار کیا۔

”کیا آپ ان معلوم افراد کی حراج لپی کی لیے آئے ہیں؟“
 ”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ وہ فوراً سنہلا۔ ”میں اس حادثے کا شکار ہونے والے تمام افراد سے دلی صوفی رکھتا ہوں اس لیے پہلی فرصت میں ان سے ملنے یہاں آ گیا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کی کتنی قدر ہے، اس کا اعزاز تو آپ اس بات سے بھی لگ سکتے ہیں کہ خود دیکھی ہوئے کے باوجود میں جائے حادثہ پر مسلسل مصروف رہا۔ اگر مجھے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی تو میں اس طرح انہیں اپنی ذات پر ترجیح نہیں دیتا۔“ اس طرح سے سیاست دانوں کی طرح اپنی کارکردگی کو جتنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن یہ صوفی برادری بات کا پتلا نہ جانے، اس اعتبار کے پیش نظر اسے یہ جھٹے ہوئے ہیں۔

”منا ہے کلی آپ کے قسم سے کچھ افراد کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ کیا ان کا منتقلی فوراً ہو رہی ہوئے والے دھماکے سے ہے؟“ ایک دوسرے صوفی نے نیا سوال دیا۔
 ”آپ کی بات نہیں ہے۔ ابھی پولیس تحقیق کر رہی ہے اور یہ تحقیقات بالکل ابتدائی مراحل میں ہیں۔ کوئی واضح بات سامنے آ جانے کے بعد میں آپ کے افراد کو آگاہ کر دوں گا۔“ بہت عجیب کی قسم سے اس سوال کا جواب دینے کے بعد اس نے اپنے قدم اسپتال کے داخلی راستے کی طرف بڑھا دیے۔ صوفی ابھی اس کی جان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن اسے مزید کسی جواب کے لیے آمادہ نہ کر سکا۔ اس کی جان چھوڑ دی گئی تھی۔

۵۵

ہوتے ہی اسے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ لاہور سے تحقیقاتی ٹیم پہنچ چکی ہے۔ اس ٹیم سے اس نے اپنے جھگے میں ملاقات کی اور دھماکے سے متعلق اپنی معلومات کو شیئر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے شکوک و شبہات بھی ان کے سامنے بیان کر دیے۔ اس ملاقات کے دوران وہی ایسٹن کی منظر بھی وہاں موجود رہا۔ ٹیم کے ارکان سے اس کا تعارف کر داتے ہوئے اس نے انہیں تجویز دی کہ ابتدائے اس میں ہر اس کے ساتھ ساتھ کام کرنے کی وجہ سے وہ ان کے لیے ایک کارآمد فرد ثابت ہو سکتا ہے، اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ رکھیں۔ ٹیم کے ارکان نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ چائے پینے کے بعد وہ لوگ وہی ایسٹن کی منظوری پر رضامندی میں اللہ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب تک اس کا راستہ اپنے آگسٹین کے سامنے مل گیا۔ عبداللہ ان کو اس کے اس ملاقات میں اس لیے اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا کہ وہ دفتر میں ہی رہ کر اپنی معاملات سنبھالتا رہے۔ کل فوراً پور سے واپس آئے کے بعد اب جا کر ان لوگوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو رہی تھی اس لیے اس نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔

”جی جیسر مشاہیر میں ان نے بہت اچھی ذہنیات کی قسمی۔ بعد میں وہیں نے ایک ڈاکٹر کے مشورے سے جین لکڑ دیکھی لے لی تھی اس لیے اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی ایک دست اس کے سامنے رکھتے ہوئے ہوا۔“ یہ سرنے والے افراد کے ہاتھوں کی سمت تھے۔ میں نے بہت اصرار کر کے ایسٹن کی صاحب سے منگوائی ہے۔ ان کے دھماکے لیے امدادی ٹیمس کی تقسیم کے وقت اس دست کی خاص طور پر ضرورت پڑے گی اس لیے میں نے یہ دست منگوائی ہے۔ اسپتال میں داخل دیکھوں گی اس کے علاوہ ہے۔“

”یہ چرنے ٹھیک کیا۔ امدادی ٹیمس کی صبح حق داروں میں تقسیم کے لیے اس دست کی بڑی اہمیت رہے گی۔ ورنہ بعد میں یہ ہوتا ہے کہ سوچ شمس لوگ فراخ و معلوم بن کر جن داروں کا حصہ بڑپ کر جاتے ہیں۔“ اس نے دست کو اسے ہٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی پوچھنے لگا۔“ ہائے حادثے کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟ پوچھنے نے وہاں اپنی ابتدائی کارروائی تو مکمل کر لی تھی۔ ”میرے دماغ کی لاشوں کی تفتیش اور خود کش حملہ آور کو اپنی گھڑی میں لے کر منظر کرنے کے سلسلے میں پولیس کیا کر رہی ہے؟“

”اس سلسلے میں میرے پاس بہت سارے سارے رپورٹ نہیں ہے۔ سر! ایسٹن کی صاحب ضرورت سے زیادہ آگے بڑھنے

ہیں۔ وہ ارکان کا عملہ دونوں تھوڑے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ تاہم اپنے ذرائع سے مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ خود کش حملہ آور کا سر پولیس کو اپنی بہتر حالت میں مل گیا ہے اور پولیس فوراً گرفتار اس کی مختلف زاویوں سے فوٹو گرافی بھی بنال ہیں۔ سرنے والوں کی تفتیش کے لیے میں نے اپنے طور پر رضا کاروں کی ایک ٹیم تیار کی اور ان کے ساتھ چارہ آٹ کرانی ہے۔ مگر خابہ یہ ہے کہ تمام تک کی گئی ہو سکتی ہے۔“

”تفتیش کا صحیح وقت مقرر کر۔ قمار جتنا زہ میں حرکت کے لیے مہموز ہر طریق کے۔“
 ”کو کے سرا۔“ اس کے عمر پر عبداللہ فوراً ہوا۔

”میرے بتانے لگا۔“ اسپتال میں موجود لوگوں کا اندک کل ہی اچھا خاصا اسپتال ہو گیا تھا۔ میں نے مزید وہاں نہیں فوراً ہو کر ٹھکانے کے لیے کہہ دیا، امید ہے کہ وہ مجھے خود وہاں اپنا ہسپتال بھی جائیں گی۔ لاہور سے آئے دھماکے کی آواز کی رپورٹس کا ریت ہاتھ میں انتظام کر رہا ہوا گیا ہے۔“

”بہت اچھی بات ہے۔ اسی طرح ہر جھگڑے بڑے معاملے پر نظر رکھیں ایسٹن کی کامیابی ہو رہی ہے۔ وہ کسی بھی مقام پر کارآمد کسی ویک پوائنٹ کو پکارتے ہیں کامیاب ہو گیا کہ بہت اور ہم چائے گا۔ ابھی وہ مجھے ایک ساتھ لگا چکا ہے لیکن میں جان بوجھ کر خاموش ہوں۔“ عبداللہ ان کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نے مزید ہدایت دینے کے ساتھ اسے ہتھیار کیا۔

”اس موقع پر ایسٹن کی صاحب کا یہ رویہ میری کچھ باتیں پر ہے۔ اس وقت تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم سب متحد ہو کر کام کریں۔ ان کی بکلی حالات سے مشتعل نہ ہوں۔ ساتھ ساتھ ہر عمل ایک رسائی بھی ممکن ہو سکے۔“
 ”ایسٹن کی صاحب ہم جیسوں کے ساتھ نہیں بڑے چورہری افکار اور اقبال باجوہ جیسے لوگوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کے قابل ہیں کیونکہ اس اتحاد کے نتیجے میں انہیں مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت تو وہ دوسری اپنی چلائنگ کے باوجود اس کی کردہ لکڑی اور کامیابی کے ساتھ اپنا بندہ پکارتے ہیں کہ ہم سب سے بڑے تھے ہیں۔ یہ سبے جانور ہمارے انہوں نے کسی طرح انہیں پناہ دے جانے کے بعد کہاں ہے؟“ اب اس کا نام کیلئے کا سامنے مل رہا ہے انہیں۔ اپنے تئیں وہ یہ میں میرے کام کے سمجھ انہوں نے ان کو غائب کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمیں اللہ آباد میں پیش آئے وہاں اللہ آباد کے لوگ اب وہیں آگے ایک شخص کے اپنی بیٹی کے انوارہ دھماکے کی کارہائست

کرانے پر ہم اس کے ماتوں کے کو کچے تھے اور وہاں اس کے بیٹے میرے ساتھ بدستری کی کوشش کی تھی۔ کچل جس لڑکے نے وہ کھانے کھلیا۔ وہاں کچل کو دہی جینا ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت اس کی بچان کا تھا اور ماٹے کے ذریعہ بعد وہ لڑکی کھلی کھانا دے میں لے کر تھلے پہنچانے کے اجازت جاری کر رہے تھے۔ وہ لوگ بے چارے تو بے رحم تھے لیکن ان کے ذریعے مجھے کچھ ایسی معلومات حاصل ہوئی جس سے پتا چلا کہ اللہ آباد میں موجود دھماکے کا مالک بہرے کھٹک رہتا ہے۔ میں پولیس ٹیم کے ساتھ وہاں فوراً ہمارے پہنچنے سے پہلے وہ بندہ تو آ رہا ہو گا تاہم اس کے ساتھ کسی بھی طرح کے شواہد نہیں ہیں جن سے مجھے یہ پتہ ہو گیا ہے کہ شواہد اس بندے کا قتل ہمارے ہوتی ہے۔ تھا۔ ابھی اس کی دہانے سامنے آئے کے بعد یہ بات خود بخود بخود جانے لگی کہ ایسٹن کی صاحب کے بڑے اللہ آباد کے ایسٹن آئے تھے جو کاروبار اچھا کام، اور وہیں کچل کو اس کے خاندان سمیت قتل سے غائب کرنے کا تھا۔ اب پولیس معلوم کر انہوں نے سب مجھے بیان کرنے کے لیے کیا وہ خود کوئی ایسی کھلی رکھا تھا جو ہے ہیں۔ ان کی جو بھی خاموش ہو، مجھے اپنی ضرورت کی قدرتی پناہ لیکن اس کی خاموش ضرور ہے کہ وہ ہے، اسے منظور کرنا چاہتے ہوں ان کے قاب کا شکار ہوں گے۔ اس نے مجھے انہاری بات بتاتے ہوئے ایسٹن کی کے موجود رہتے۔ برائی ڈالی۔ عبداللہ توجہ سے یہ سب سنتے رہا۔ اب اسے پتا چلا تھا کہ کچل سے شہ پار کرنے چکوں میں ہوا تھا وہاں اسپتال آئے کی خدمت نہیں کر رہی تھی۔ اس کی مہم بدولت نے اسے اپنی دہی ہونے کے باوجود اسے لگا نہیں دینا تھا اور ایک بار پھر میرا ہاتھ طریقے سے کام کرتے ہوئے وہ سے مدد قبولی نہ کر سکا۔ کا اظہار کر رہا تھا۔ اب اسے پتا چلا تھا کہ اس کی یہ ساری جھگڑا دھماکے کے بعد سے ہے کچل کی کتنی تھی اور اصولاً اسے یہ سب چارنے کے چاہئے اپنی بیٹ پر اپنے بیٹے میں، پوچھنے میں کہنے کے ساتھ کہ یہ ہے تھا۔ ان کو قریب کرنا چاہتا تھا جس میں ہوا ہے۔

”آپ کو کچھ کہہ ہے سر! ایسٹن کی صاحب کی نیچر میں نہیں طرح بہت ہوں۔ آپ پر آگے میں ان لوگوں پر نکال دیں گے۔“ اس نے لڑائی آگے بات کی۔ برائی۔ ”کچل کی لاش میں ان لوگوں کی کوئی دھماکے نہ لگتا۔ ایسٹن کی صاحب اپنی ایک کی حرکت کو تسلیم کرنے کے ہی نہیں

اس لیے میرا انا ہے اس معاملے میں بات کرنا بھی ہے کہ
 ہے۔ اس نے ایک بڑی حقیقت بتائی جسے عبادت گاہ میں
 سمجھنا تھا اس لیے سر پہ کھانا پوش ہو گیا۔
 "الحال میں اس معاملے میں بھی یہ وہ نہیں کرنا ہے
 اور اپنے مسائل میں زیادہ اس سے متعلق کے لیے کی
 اہتمام کرنے میں ناکام اس بات کا خیال رکھ کر جو ہم دین
 سرپرست کی خدمت کا جو کام میں رہا ہے وہ یہی رہے۔ خود چو
 میں دیکھا ہے کہ اکثر ہونے میں یہ جو وقت لگ جاتا ہے
 لیکن میں یہی کوئی شکر کروں گا کہ اس میں بہت زیادہ وقت نہ
 لگے۔ باقی یہ وہ نہیں کہ کچھ دیر کی اس عرصے میں جاری
 رہنا چاہیے۔ اس نے سرگرمی سے گفتگو کرنا سنا دے جسے
 عبادت گاہ میں جو عبادت دی۔ یہ اس کا اپنے ملنے کی ترقی کے لیے
 شہیدانہ عطا کی تھا جو وہاں بیکاری حالات میں بھی اس
 بات کو نہیں بھولتا تھا۔
 "آپ نے خود ہر سوائے دین سے سب جاری رہے
 گا۔" عید الملتان نے اسے سب کی ویسی ہی بات اس کی میز پر رکھا
 فون پہنچے کہ عید الملتان نے اس کے اشارے سے فون اٹھایا۔
 "آئی بی صاحب کے دفتر سے فون ہے سر" ان کے
 لیے اسے بات کریں گے۔ "آپ نے اسے اطلاع دی وہاں
 نے کاپی دالنے کا کہا۔ اس طرح کی کارروائی دیکھ کر تھا۔
 اگر دوسری طرف سے شہر دار سے رستہ کرنے پر اصرار کیا
 جاتا تو وہاں اسے مشکل کروائی جاتی تھی۔ مزید کے علم میں
 ہو گا کہ اس وقت وہ دوسرا بار کے کھانے میں سے اس لیے اس
 نے کاپی یہاں فراسٹر کر دی۔ کمال ہے یہ علم صرف جس کے
 آخر میں عید الملتان کو صرف "اوکے" کا ایک غلط کہنے کا
 موقع مل گیا۔
 "آئی بی صاحب تشریف لے رہے ہیں۔ پچھلے وہ شام
 چچے کے نور پر دین اور ان کے جانے والی نماز جنازہ میں شرکت
 کریں گے اور پھر جاتے جاوے گا معاہدہ کریں گے۔" فون
 رکھنے کے بعد اس نے شہر دار کا احاطہ دی۔ اب انہیں نماز
 جنازہ کا وقت بھی سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔
 یقیناً ان لوگوں نے جو انہیں بھی تھی کھانے کے معقولہ وقت قرار
 دے رہے تھے۔ آئی بی صاحب کو یہ احاطہ
 فراموش نہیں تھی۔ ان کی اس بیکار حالت پر وہ مسکرا کر دیکھ۔
 عبادت گاہ میں کتنا ہی عجیب کوئی لگتی۔ اسے اٹھا کر تو نہیں
 چھوٹے سنی تھی۔

نور علی شاہ

نماز جنازہ میں شرکت کے لیے آئی بی صاحب آگئے

لیکن آئے تھے۔ ان کے ساتھ آئی بی صاحب بھی تھے۔
 مقامی اشراف اور گروہ کے رہنماؤں نے جو دوسری حضرات
 اور ضلع کے سیاسی قائد گاہ میں بھی نماز جنازہ میں شرکت کی
 تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر ان میں جو شرکت ہو رہا تھا۔ اس
 موقع پر کسی تاخیر کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے وہیں کی
 ٹرینی پوری طرح پوری تھی۔ فوراً کے لوگوں نے بھی اس
 ہونے پر بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنے ہوا
 جانے والے بیکاروں کے کم ہیں صاحبان پر مار دے۔ دوسرا
 رہے تھے لیکن ان کے علم سے انہیں اہتمام کی راہیں اہتمام
 تھیں۔ شاید ایک غیر ترقی یافتہ گاؤں میں رہنے اور خود مددگار
 کرانے کی وجہ سے انہیں احتجاج کے علم یوں کے علم یوں
 تھا۔ وہ سیدھے سادے لوگ تھے جو اپنا ہمہ تن انہوں کی
 پرستش میں سماتا رہے تھے اور وہیں کوئی خدمت نہیں دی
 تھی۔ خود وہ خود وہیں کے رہنے والے تھے۔ اس حالت میں کی
 پولیس اہلکار بھی بالکل ہونے تھے۔ وقت کی قلت کے باعث
 چاہیں بیٹیاں اور پٹیلیاں لکڑیاں ہی بھائی نماز جنازہ والی
 کی بھی تھیں پولیس والوں کی بات بات پر ہنسنے کا تو ہر بلڈن
 پر ہنسنے ہونے کی وجہ سے لگتے تھے کہ خود کے ہاں
 تھے نماز جنازہ کے بعد آئی بی صاحب نے ایک مختصر خطاب
 بھی کیا جس میں انہوں نے اس وقت پر کلمہ پڑھ کر ان کو دعا
 دینا کرتے ہوئے اس بات کی تلقین دینی سوائے کہ
 بھروسہ کو نہ کرنا کہ ہر جگہ پیچھے ہی رہیں کوئی کی جات
 کی۔ انہوں نے عہدہ وزیر اعلیٰ اور وزیر اعلیٰ کے عہدے
 پر جانا تھا۔ لیکن خود ان کے باشندوں تک پہنچے۔ اس مختصر
 خطاب کے بعد پولیس اہلکاروں نے انہوں کو اپنے ساتھ
 کے ساتھ فوراً وقت کی طرف روانہ کر دیا۔ سوائے ان
 اہلکاروں کے جن کا محقق دوسرے علاقوں سے تھا۔ باقی اشراف
 کی تہ فین فورٹ کے قبرستان میں ہی ہوئی تھی۔ فوراً کے
 باشندوں کے لیے ان کے اپنے گاؤں کا قبرستان تھا۔
 جنازہ کی دعا کی کے بعد آئی بی صاحب جانے جاوے کے
 معاملے کے لیے تشریف لے گئے تو ان کے ساتھ صرف
 سرکاری اہلکار موجود تھے۔ پودھری انڈیا جسے لوگ نماز
 جنازہ میں شرکت کے لیے آئے تھے ان لیے تھے کہ کوئی ایسی
 صاحب سے دعا نہ ہو کہ اس صورت حال پر پیچ و تاب
 کھا کر رہ گئے۔ انہیں نماز جنازہ پر سے غریب باشندوں کو
 پولیس کے معمولی اہلکاروں سے کیا جاتی تھی کہ وہ ان کی دعا
 جنازہ میں شرکت کے لیے آئی وہ آئے کی خدمت اٹھتے۔
 دو تہی سے آئے تھے کہ کوئی ایسی صاحب کی نظروں میں

آئیں مگر ان کی طرف سے یہ علان ہونے پر کوئی ایسی حالت
 کے پاس ملا تو ان کے لیے وقت نہیں ہے۔ ان کے انہوں
 پر اس پر کی گئی۔ صرف سوچ رہے تھے پودھری پختہ۔ شہر دار
 نے آئی بی صاحب کو ان کے علم یوں کے علم یوں کے گاؤں
 میں ان کا زیادہ پیش آقا۔ آئی بی صاحب نے ان کی دعا
 سے براہ راست انہوں کے چند ہی کہتے۔ یہ اس کا حق تھا
 مگر شاید انہوں کو ان کو یہ بات نہ لگتی تھی۔ انہیں نظر انداز کر
 کے نسبتاً ایک چھوٹے زمیندار کو اہمیت دی کی گئی۔ وہ آسانی
 سے اس پر معافی کو انہیں کر رہے تھے۔
 "انہوں نے اس کا مختصر تقریر ہے۔" انہیں کہیں سے یہ
 پودھری کی پختہ کی معذرت کی کہ ان کے انہوں
 والے لوگوں نے اس کی بلند ہوتی تھی۔ وہ یہی تھا۔ وہ یہ چارہ
 معذور نہیں ہم دھکے کے وقت جاتے جاوے پر سوچ رہا تھا
 دھماکے کے اثر سے ان کے انہوں کی اپنی کڑی سیت گری تھی
 لیکن ان حالات میں بھی وہ دھماکا بہت کا شکار نہیں ہوا۔ انہوں
 پر بھی خود اصرار نہ تھا۔ ان کی ہدایت پر عمل کرتے
 ہوئے اس کے ملازمین نے پولیس والوں کی اس موقع پر
 پھر پودھری۔ بعد میں بھی وہ اپنے علاقے کے لوگوں کی
 ایک شہر کی اور انہیں ہونے میں صرف مل رہا تھا کہ
 دولت کے پیدائش کے لیے تو ان کی بوائے کس ایک سی
 جاتا تھا کہ اس کی کچھ ہاں مال و زر سے پھر کی پڑی ہوئی۔
 پودھری پختہ اس پختہ کے اعتبار سے ان سے کافی پیچھے
 پڑا تھا۔
 پودھری پختہ رستہ ہونے والی اس کے بعد مختصر
 ملاقات کے بعد آئی بی صاحب اور سرکاری اہلکاروں پر مشتمل
 قافلہ جاتے جاوے پر چلا۔ وہاں اب مرنے والوں کی
 لاشیں اور ان کے جسم کے ٹکڑے تو جو پودھری تھے لیکن کسی میں
 جذبہ ہو کر نہ کہ جاتے ان کے فون کے دیتے تھے اور پھر آگے
 تھے۔ اس پر سے ان کو پولیس کے در درگ کے پختے سے
 گور کے بعد خود قائم کر دی گئی۔ شہوت انہیں کوئے اور
 ابتدائی حقیقت نہ جانے کے باوجود فی الحال وہاں پولیس
 کے چند جوان تعینات تھے۔ انہیں اپنی اپنی صاحب کو
 عادت کے بارے میں پڑھنا دینے لگا۔ خود شہر دار اور
 کس طرح تھا اس کے کس طرح کو روٹی کی... اس کا اصل
 ہدف ک تھا۔ پولیس والوں نے کس طرح اپنی جان پھیل کر
 اسے دیکھا۔ جاتے جاوے کے معاملے کے دوران وہ آئی بی
 صاحب کو تفصیل سے بتاتا رہا۔ خود کس کو کس شناخت کے
 معاملے میں بہت اس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا حالانکہ

انہوں نے تو یہ کہیں میں انہوں کے بعد اس بات کا کوئی امکان
 نہیں تھا کہ وہ عید انہیں کی شناخت سے تا وقت رہا ہوگا۔ پھر
 پھر بھی خاموش تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے ذہن میں
 کوئی اور منصوبہ چل رہا ہے۔
 جب وہ وہاں سے واپس آئے تو اس کے بعد وہ لوگ فوراً پورے
 دھماکا ہو گئے۔ آئی بی صاحب نے واپسی میں کچھ پر پھر بار
 کے پختے پر لگے گا اور اہلکار۔ یہاں پر پھر شہر دار اور
 کئی نوکریات کا پودھری اور پھر پختہ کی بی جاوے کے علاوہ
 اس کے ان کے ساتھ ٹریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں
 ہوتا تھا۔ جب وہ لوگ اس کے پختے پر پہنچے تو ان کے ساتھ
 کوئی پودھری نہیں تھا۔ ان کی گفتگو میں شامل ہو کر انہوں
 کیے جانے سے پہلے سے واپسی سہل میں وہ لوگ ڈانٹ
 دھم میں پختہ کر رہے تھے اسے لطف اندوز ہونے لگے۔
 "پودھری پختہ رستہ بہت برا میں ہر خود اور اس
 میرے پاس ان کا فون تھا اور وہ بڑی پر تک تھا۔ یہاں
 پودھری کا کھنڈ کر رہے تھے۔ کل حادثے کی اطلاع ملنے
 کے بعد وہ مسلسل قہقہے لگاتے رہے۔ اس کو کھنڈ کرتے رہے
 لیکن انہیں ہر دفعہ کچھ جواب ملا کہ اسے ہی صاحب کسی
 ضروری کام میں مصروف ہیں اور فی الحال ان سے رابطہ ممکن
 نہیں۔ میتہاںے پختہ سے متعلق سے غائب ہونے کی خبر
 دے کر ان کی ناراضگی کو کم کرنے کے لیے انہوں کو ادا کیا
 ہے۔" خود پورے اس کے دوران وہ ایک سرکاری
 عہدے دار کی حیثیت سے اس کے ساتھ کافی باخفا طریقے
 سے چلتے آئے تھے لیکن اب بالکل واضح ہو گیا تھا کہ
 پختہ سے ٹیک لگا رہے تھے۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ
 اچانک اس کے پختے پر پودھری پختہ کا پھر پختہ شہر دار
 نظر آئے۔ انہوں کو کمر اور حقیقت پہلے سے ملے تھا۔ وہ
 اپنے طور پر پودھری کی ہدایت پر کسی بھی دوسروں میں
 اس سے اس کی سرگرمیوں کی بات پر پختہ پختہ کرنے کے لیے
 اب ان کے تھے۔ سچا دارانہ انہوں نے اس دورے میں خاص
 طور پر ان لیے ساتھ کرنا کہ اپنے کزن کی موجودگی میں
 دوسرے وہاں کے رہا۔ گھر سچا دارانہ کو اس وقت دراصل
 بھائی اور سرگرمی کے درمیان ایک ایسے رابطہ کو کارواں کرنا
 تھا جس کی کارکردگی کا پھر پختہ تھا۔ لیکن جس کی پودھری
 ہی کا ہو۔
 "اس سچا دارانہ جو پورے پختہ رہا ہوں اور پختہ
 آپ کو کئی ہی ہوں گی۔ انہوں کو کئی ہی رہے ہیں آپ خود
 خود ہی نیکہ کر سکتے ہیں کئی میں جن کا میں میں مصروف رہا۔

وہ ذرا اچھی صاحب کی کال وصول کرنے سے گھسی دیا وہ ہم
تھے۔ انہوں نے فون پر مجھ سے کیا کہا تھا؟ ان کی ہدایات
کے بغیر بھی یہاں سارے کام انجام دیے جا رہے تھے۔
یہاں سونے پر پانچ اہل بیت تھے ان کے لیے آدھ روپے چوکنا چاہتے
تھے فون کے لیے میرے سب سے سوتوں سے روٹے کے
ادھارات اور تھوڑے تھوڑے ان کے جو بیانات سامنے آئے
ہیں وہ اس سے بڑا کچھ دے کر وہ اپنے حصے کا کام کر چکے
ہیں۔ بیانات جاری کرنے کے دوران بیانات انہوں کو اور
کوئی سا کام کرتا ہوتا ہے۔ اس نے بھی مجھے اس کی
باقول کا جواب دیا۔

”تھہار میں بی چند حیت تھہار۔“ مخالفین کو تھہار سے
غلاف ہونے اور ان کی سیدی راجہ کو پیش پیش کرنے کے مواقع ملتی
ہے۔ تم اس طرح سے کیوں کام نہیں کرتے جس طرح اور
لوگ کرتے ہیں؟“ تھہار نے ان کی یہی جملہ جملہ کا اعتبار کیا۔
”میرے خیال میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس
حرف دوسرے کو بغیر چوکے یا تھہار پر ہاتھ دھرے بیٹھے
رہتے ہیں وہی طرح مجھے بھی کرنا چاہیے۔“ اس بار اس کا جواب
زمین زمین انا نظر پر تھا۔

”تم انکم نہیں وہ سب نہیں کرتا چاہے جسے دوسرے
مجھے کے افراد اپنے اختیارات میں دخل اندازی تصور کریں۔
تھہار سے علاقے کے اہل بی کو تم سے اس مسئلے میں بہت
زیادہ حکایت ہے۔ تم کی پالیسی فیصلہ فی حق اس کا کچھ کوئی
مجموعہ کرنے میں چل پڑتے ہو۔ پچھلے دنوں کوئی اور کھیلوں کی
اسمبلی کی جو صیغہ پڑی تھی ہے، اس کا سہرا بے شک ڈی
اس کی فی نظر کے سر ہاتھ لگایا ہے لیکن اس حقیقت سے
دروغ خاندان سے داخل ہیں کہ تم اس میں جس ذاتی طور پر
شریک تھے۔ اگر اسمبلی سے متعلق نہیں تھیں یہ خبر ملی تھی
تو کہیں یہ معلومات اس کی فی سے خبر کوئی چاہے جسے لیکن تم
نے اسے عملی طور پر میں رکھا۔ اس کے بعد بھی اسے
بہت سی باتوں کا کام نہیں ہونے دیا گیا۔ اپنے علاقے میں
پولیس کا سب سے بڑا اثر ہونے کی حیثیت سے یہ سب جاننا
اس کا حق تھا لیکن جب اسے چھوٹا بنا دیا تو اس نے بھی
جھجھکی۔“

”اور اس کی بجائے انہیں اتنا غصہ کیا کہ انہوں نے اپنے
رہنے کے چھوٹی دہرائی صاحب کو میرے خلاف لڑا دیا۔
آئی جی صاحب کی بات میں کہ وہ بے حد ایمان سے ہوں۔
اسے معلوم تھا کہ دہرائی کی بھرتی ان کی کیڑوں میں اس لیے
دہرائی صاحب اس کے خلاف زیادہ شور مچا رہے ہیں۔“

”اگلیں۔ وہ ایسا کر سکتا تھا اس لیے اس نے ایسا ہی
کیا۔ یہاں سب کی اپنا کرتے ہیں۔ اگر تھہاری کچھ پر ہم
سب لوگ نہیں ہوتے تو کیا تم کی ہے۔ مگر اسے کام کر سکتے
تھے۔“ آئی جی صاحب کی یہ بات واقعی لاجواب کر دینے
والی تھی۔ وہ نظر کا مجمع جو اور زیادہ تھا، اب ایک بات بھی لیکن
حقیقت بھی اپنی جگہ کی کہ وہ بڑا خوف و خدشہ کوئی نہ دوسرے لیے
بھی آسانی سے اٹھانے تھا کہ اسے مسترد سمجھو تو حاصل کی۔
”تم ایس بی کے مقابلے میں جس میں تھہار نے دو مضبوط
پوزیشن کے رکھ دیں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کی اپنی
جے پاس صرف ایک دہرائی کا سپارہ ہے جو سیدی راجہ
چھوڑا کر چھوڑ کر دہرائی کو ہٹا دے۔ لیکن فی الفاں اس کا
جوتی اقدار میں ہے اور وہ اس کو ہٹا دے کہ اس کے ساتھ باہر
ہے۔ تم نہیں جانتے۔ ان وقت میں تھہار نے خلاف ایک
رپورٹ تیار ہو چکی ہے جس کے مطابق تھہاری یہ طور
استثنا کشی اس موقع میں توغباتی کے بعد یہاں کرنا کرنا
بڑھ گیا ہے۔ تھہار نے غصہ کے بعد پیش آنے والے چھوٹے
سے چھوٹے واقعے کو بھی تھہار کے ساتھ نہیں کیا گیا ہے اور اس
فی جب تک بیان کی فی ہے کہ تم ہر حال میں بے جا مخالفت
کر رہے ہو اس لیے پولیس کو اپنی کارروائی رکھانے کا موقع
نہیں ملتا اور فیصلے حالات ان کے قابو میں تھے۔“

”سب بلو اس ہے۔ اگر کر رہے ہیں تو ہم اس سے جلد
پہلے پولیس کے ذرا دے پڑاؤ کی وجہ سے جن واقعات میں
رپورٹ درج نہیں ہوئی تھی اب میری دخل اندازی کے
باعث پولیس والے انہیں درج کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
پھر ایک دوسری چیز میرا برقرار رکھنے اور ان کی غرضات سے
خلاف کام کرنا بھی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ میں افراد پر
مکمل سے محروم رہ کر ان پر اپنا قبضہ بنانے دیکھ رہے ہیں
ہیں وہ میرے خلاف تو فی مضبوط ہو کر نہ کرنے کے لیے وہی کوئی
شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔“ اس نے آئی جی صاحب کی
بات کا جواب دیا۔

”سب مجھے معلوم ہے بلکہ باقی لوگ بھی جانتے ہیں۔
لیکن جب کسی کو کوئی الزام جانتے کہ وہ تو اس میں ملوث
ہو جاتے تو نظر انداز کر کے صرف اصرار دیا کہ بیٹا وہ اپنے
صاف دیکھ رہے ہیں۔ اسی لیے میرا نہیں مشورہ ہے کہ تم ذرا
احتیاط سے کام لو۔“

”تم ان کی اگلی ٹھیکہ میرے ہیں مگر یہاں یہ تھہار کی بیٹی
پوچھتے ہیں۔ تم ابھی سے اسے اسے کھینچ کر ذرا آجائے تو
تھہار سے کیڑا کا کیا ہے؟“ تھہار نے ان کی بھی آئی جی کی

”اؤکے۔ میں فی الفاں پولیس کے کرتے والے
کاموں سے اگلی ہو جاتا ہوں لیکن اس کے بعد آپ مجھے
یہ یقین دہانی کروا سکتے ہیں کہ سارے کام باقی طریقے سے
انجام دیے جائیں گے؟ اللہ آدھو سارے سے میں کیا ہو رہا
تھا؟ وہاں کون کون کچھ کرتے؟ پولیس ان کی طرف سے اتنا
عصرہ غافل کیوں رہی؟ ان سارے حالات کے جواب
و محو غفلت کے ساتھ اسمبلی کے فیصلے میں اقبال، جوں کے
شریک ہونے اور اس لیے میں ذرا کوڑے کے مار کر ہم ہونے
کے مسئلے میں قابل اطمینان حقیقتات کی جانچ کی؟“ اس نے
گوایا اپنے پیچھے بے اثر اعلان کیا۔

”اگلیں۔ فور ہر دوسرے اور اللہ آدھو کے در سے کا
معاملہ تو ویسے بھی اب بہت اعلیٰ پر رہ چکا ہے۔ غیر ملکی
ہاتھ ملوث ہونے کا جو انداز تم نے بیان کیا ہے، ہم اس
پراخت کو خاص طور پر فوکس کریں گے۔ اقبال باجرو کے لیے
میں تھہار رہے ساتھ ہیں۔ اس بات کی کوئی نہیں اس بات
سے ہی ہو چکی ہے کہ اس کا نام ہی اس میں ڈال دیا گیا
ہے۔ وہ اگر اس میں سے بچ کر ملے ہے باجرو کے کی
کوئی شے کرے گا تو کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ گھر میں کوئی باجرو
ہے۔ انہیں ملتی ہے پولیس کے ذریعے ہی بدلت میں پیش کرنا
ہو گا اور اس کے فیصلے کوئی ہے کہ اگر تھہار وہ بندو باندھے لایا
جائے۔ ذرا کوئی کی سرکوبی والا معاملہ الیٹ ڈرامے کا ہے۔
اس لیے مجھے بہت اگلی مضبوط بندی۔ بھاری تقریر اور زیادہ
و حال کی ضرورت ہے جن کا فوری طور پر انتظام نہیں کیا جا
سکتا۔ الیٹ میں تم سے یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ یہ معاملہ
میرے مستقبل کے منصوبوں میں شامل رہے گا اور میں اس
مسئلے میں بھر پور کارروائی ضرور کرنا دوں گا۔“ آئی جی
صاحب اسے یقین دہانی کروانے لگے۔

”اؤکے۔ میں راضی ہوں مگر ان سب کاموں سے
پہلے آپ کو ایک چھوٹا سا کام اور کرنا ہو گا۔ خود کش حملہ اور
میرا اطمینان کی فیصلہ اس کی صاحب کے قبضے میں ہے، وہ بھی
اس طرح کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے نہیں۔ وہ
سے چاہے لوگ یہ تصور ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ
آپ ان کی فی صاحب سے ان کی دہائی کے لیے بات
کریں۔“ اس نے اپنی رفاقتی دینے کے ساتھ ایک اور
شرط بیان کی تو آئی جی صاحب اس پر سے اور حصار دینے
کامیاب ہوتے ہوئے ہوئے۔
”میں حصار دینے سے سال سے میری دامادی میں

ہونے کے باوجود تم نے بھی اتنی شرارتیں نہیں کی، بھتی
تھہار نے ان ہائی صاحب نے اس بھتی سی دہائی میں
چھین کر دی ہیں۔“
”چلیں اگلی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں جانی سے
آپ کے رہنے کا فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سب نہیں کر رہا
ہوں بلکہ یہ میرا اصولی موقف ہے۔ آپ کی بیٹی کی اور
ہو، میں جب بھی کسی سببنا اور منوانا کرتا ہوں اس کے
کی بہت نہیں دھکتا تو اتنا ہی دے کر ان کی باپ سناٹا ہو
جاتا۔“ حصار دینے کا کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے مقامی
دینے ہوئے اپنا موقف واضح کیا۔

”میں سمجھتا ہوں پر خود راہی نے اسے سال کی
سروس میں بھرتی نہیں چھوٹی ہے کہ بہت کچھ پچھلا کر
پس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فی طور ہو باقی معاملہ سے ہم نظر
دیکھیں گے۔ عدالتیں کی فیصلہ کئے بارے میں اگلی کی سے
معلوم کر لیا جائے گا لیکن فوری دہائی کی زیادہ نہیں
سے ملنے کی وجہ سے وہ بہر حال مشکل افراد کی آمد میں
شامل ہیں جنہیں اچھی طرح دیکھنے کے بعد ہی دیا گیا جا
سکے گا۔“ انہوں نے بہت جلدی کے شرابی کا پتہ اڑا دیا
دیا تو وہ مزید اصرار نہیں کر سکا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ صرف
اس کے ان لوگوں کو یہ تصور قرار دے دینے پر پولیس انہیں
نہیں چھوڑ سکتی۔ ان لوگوں کے کام کر کے کا اپنا خطرہ بڑھاتا
جس پر بہر حال انہیں مل کر تھا۔

”میں آپ کی اس مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ فی الفاں ان
باتوں کو جانے دیتے ہیں۔ کچھ الگ بات ہے۔ چلیے مگر کچھ
کہاتے ہیں۔“ کھنگھنگ میں انہیں وقت سے گزرنے کا اندازہ
ہی نہیں ہو سکا۔ وہ دھماکا داری کے ڈٹے بیٹھے تھا تا انہیں
بصر اصرار اپنے ساتھ ڈانٹ کر دم میں لے گیا۔

”کھنگھنگ اسٹاک بڑھ ہوا ہے اس کتاب کی بیچ میں نے
علاقہ کو بے کر دیکھی۔ چلیے مگر اگلی اور سے اس طرح
کی خبریں سننے میں آئی ہیں۔ پر اب تو ذرا چھوٹا سا مل بھی
کھنگھنگ رہا۔ تو پھر پوری آباد کے مقامات میں بہت کچھ ہوا
گاؤ ہے۔ وہاں کے سید سے سادہ ہونے لوگوں سے ہر ایک کا
کیا کا تھا کہ ان کی خوشیوں کو یوں بڑا کر کے انہیں موت
کا تصور دے دیا گیا۔ میرا دل بہت ادا ہے ان لوگوں کے
لیے۔“ اگلی تقریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت کچھ درجی
کی چھین پہلے مالہ پڑ جاتی تھی۔ یہ تان مانے میں تو تقریباً
ساری ہی سرگرمیاں دم توڑ رہی تھیں اور سب لوگ اپنے

اپنے کمرے میں جا کر سو جاتے تھے۔ کشتہ کے لیے یہ آفتاب سے بات کرنے کا سب سے مناسب وقت ہوتا تھا۔ آفتاب کو دیکھ کر وہ سوچا کہ اس سے بہت خلافت سے سفارش کر سکا ہو گا اور صرف اسی وقت اس سے بات کرنے کے لیے کافی تھی۔ لیکن دیکھ کر اسے عجیب و غریب محسوس کر دیا۔ اس نے اپنے آفتاب کو بھی اس سے بات کرنے میں شکیں نہیں اتنی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اس کا کیا تھا، اس میں تین کمرے تھے۔ دو کمرے کو ان کے ساتھ کچھ دلی کرشمہ کرتے تھے جبکہ تیسرا نسبتاً چھوٹا لیکن اگلی کمرہ اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ایک تو اس کی حیثیت اب اسکول کے پرنسپل کی سی تھی۔ دوسرے اس کے گھنے پرانے اور ادراک کے تنگ بائوٹرن کی عادت کے پیش نظر بھی دوسرے اساتذہ سے خراج دینی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے لیے اگلی کمرے کو ضروری قرار دیا تھا۔ اسی طرح اسے ذہنی اپنا کام زیادہ ارتکاز سے کرنے کا موقع مل جاتا تھا جبکہ کشتہ سے شکوک کا سلسلہ بھی کسی قسم میں آتے سے ہی ہوتا تھا۔

تقریباً بارہ سال تک ہی ہوئے وہ ان اس کشتہ میں وہ ایک دوسرے کو یاد دلاؤ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آفتاب کی قابلیت اور لیاقت کو بھی یہ سہولت مند خود بھی کبھی شائبہ نہیں ملتا تھا۔ اس کے ساتھ اور ہمدرد طبیعت سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ پہلے تو وہ اپنے چہرے کی شہرت کی وجہ سے اس سے اپنا آپ منوانے میں کامیاب ہوئی تھی تو اب اپنی خوش امدادی کے باعث اور بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ اپنے مصروف شیڈول میں سے اس کے لیے روزانہ وقت نکالنا اسے بڑا مشکل بنا کر رکھا تھا۔ اس وقت بھی اس سے جو کچھ تھا وہ اس کے اپنے دل کی آواز تھی۔ وہ خود اپنی حیثیت کی وجہ سے نور دیکھیں چاہتا تھا لیکن وہاں جانے والے اس کے سامنے ٹھہرے جو کچھ تھا تھا اس کوئی لڑائی ایک خاص دل کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ کشتہ کی بات کے جواب میں وہ خود بھی دنگی لگے میں ہوا۔

”واضح درست کہا آپ نے۔ بہت افسوسناک واقعہ پیش آیا ہے تو یہ درست نہیں۔ ایسے حالات میں بھی پیش آئیں، تو آپ زحمت ہوتے ہیں کیونکہ وہ میں آئے والے جاے فراہمی اور لاہور جیسے بڑے شہروں کے باشندے ہوں یا تو یہ دیکھیں چھوٹے شہر کاؤں کے ہوتے ہیں حال ہیے گناہ ہیں۔ البتہ نور پور کے حساب سے یہ واقعہ اس اعتبار سے زیادہ افسوسناک ہے کہ اتنے برسوں میں مکمل بارہاں بھی کو کچھ ترقی نہیں منسوب شروع کرتے کا خیال آتا تھا لیکن اس دہشت گردی کے بعد قیناً وہ منصوبہ بنیڈ میں چلے گئے ہوں۔“

”مجھے تو اسے ہی صاحب کے کچھ خیال آ رہے ہیں کہ انہوں نے کتنی بھاری دوا اور دوا دہشت کی تھی اس سلسلے میں وہ عادی دہشت بھی رانگن تھی۔“

”اے ہاں، اے ہی صاحب کے ذکر پر یاد آ رہا ہے، لیکن وہی پرانی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کی جا رہی تھیں۔ انکرت دہشت ہوتے ہوئے اس سے مواہل کو دیکھیں سے ہائیں گاہی پر لگا یاد رہی۔“

”جی ہاں، آفتاب نے چھپا۔“

”کوئی پراچین پھیل تھا جہاں سے دھماکے کے متعلق بہت باتیں پیش کرتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ اس اہم موقع پر مشعل کے استثنیٰ مشعل صاحب پر امر اور طور پر منتظر سے صاحب رہے۔ کافی تنقید کی جا رہی تھی اسے صاحب پر کہ انہوں نے اس اہم موقع پر بعض غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا اور موقع پر انہوں کی حواش پر ہی کے لیے اسپتال تک نہیں پہنچے۔“ اس نے خفا سے پیش کی جانے والی رپورٹ کے الفاظ اختصار کے ساتھ بیان کیے۔ ایک پرائیویٹ میگزین سے شہر ہونے والی اس رپورٹ کو وہ دھڑکی اٹھ کر خصوصی اجازت پر دیکھ کر کئی تھی۔ حوالی میں ڈاکر ریسورٹ سسٹم موجود تھا لیکن اس سے اشتہار صرف چوتھری ہی کر سکتا تھا۔ حوالی میں موجود باقی کی دلی تھیں لیکن وہی کی شہریت دیکھنے کے لیے ہی آتا تھا۔ ایسا تو فی فی خواستہ کو ماننے کی بکری ہوتا ہے جو بے رحمیت کے لیے کیا گیا تھا۔ جوڑے کو جانے میں مصروف تھے، لیکن علی آواز کی تھی۔ بیانی وہی پر تو حسب معمول دھماکے سے متعلق بہت کچھ تھا۔ مختصر خبریں ہی دلی کی تھیں اس لیے اس نے چھوڑی سے اجازت لے کر ایک پرائیویٹ میگزین سے خبریں دیکھیں اور سنی تھیں۔

”اس بارے میں مجھے بھی علم ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ شہر پر صاحب ایک بہت بڑے دار آدمی ہیں۔ وہ صاحب اس کو جی کے مرتکب نہیں ہوتے ہوں گے۔ یقیناً انہیں کوئی بہت بڑا دوا اہم کار چھپ چکا ہوگا اس لیے وہ وقت پر ہتھیار نہیں نکال سکتے ہوں گے۔ آپ پرائیویٹ مختصر پر خبریں کی جانے والی خبروں پر بہت زیادہ اصرار سامت کیا کیجیے۔ لیکن وہی پر اگر کچھ چھپا جاتا ہے تو پرائیویٹ مختصر پر ہی کے ساتھ انکسری سالانہ خبریں دلی جاتی ہیں کہ اصل حقائق ہی سچ ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ شہر بہت جانتے ہیں کہ ہم نے دہشت گردی کے لیے مسال کو کھانے لائے ہیں اور وہ اس کی تھمت کر رہے ہیں لیکن وہاں بھی کو کچھ مکمل کیلے جاتے ہیں۔“

جو مکمل تھی بہت بڑی اور سستی خبریں شہر کر رہے تھیں۔ اس نے دوا دہشت میں کے دور کا دوا دہشت کا مطالب ہے اشتہار است۔ یعنی جتنے دھماکے اور بھارت دہشت ہوں گے ان کے پیچھے کیوں زیادہ کا ذکر ہے۔“ کشتہ کی سامنے بات سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”مکمل ہوئی یہاں آگے تو ہی نہیں رہا تھا کہ اے ہی صاحب آپ کی فحوت پر متاثر ہیں اور آپ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔“ وہ میں کر رہی۔

”لہذا یہ رسائی کوئی یوں ہی نہیں بن جاتا۔ میں نے شہر پر صاحب کی راست بازی اور کچھ کرنا کے لیے کی تھی دیکھی ہے، اس لیے انہیں پسند کرنا ہوں۔“ اس نے خمیر کی سے جواب دیا۔

”موسیٰ جناب آفتاب اہم صاحب! آئندہ میں آپ کے اے ہی صاحب کی شان میں کوئی گستاخ کرنے کی ہرگز نہیں کروں گی۔“ وہ اسے پیچھے سے دھمکاؤں میں دلی کمر پھر پڑے سے ملتی، سننے والی ایک بہت سے اسے ٹھکانا رہا۔

”میں جمع میں آپ سے بات کرتی ہوں۔“ اس کوئی میں یہ جملہ ہر اس نے جلدی سے مواہل آف کر کے اپنے عجیب کے لیے پیچھا دوا دہشت کی سے دروازے کی طرف چلی۔ دروازے کی کڑی کر دروازہ دھکولنے کے بعد اس نے باہر جھانکا۔ غیر تارک یک بار دوا دہشت پر تھیں آخری سرے پر تھیں سے صاحب ہوتے ہی عورت کے چہرے کی جھلک اسے نظر آئی۔ وہ عورت کوٹ کئی، کلائی روشنی کے باعث وہ شہادت نہیں کر سکتی لیکن دل کو یہ دھماکا ضرور لگ گیا تھا کہ کسی نے اس کے کمرے کے دروازے سے گاہک لگا کر سن میں بیٹے کی کوشش کی ہے۔ اس کا دوا دہشت ہو سکتا تھا اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ کوئی مازدہ ہو چکی برآمد۔ یہ سزا دہشت کام سے کئی ہو لیکن پھر بھی یہ بدلتہ تھی جگہ تھا کہ کسی نے اس کی مواہل پر آفتاب سے ہونے والی گفتگو میں ملی ہو۔

”میری جان ابھی مصیبت میں آئی ہوئی ہے۔ حصار سب کا ہے مال میں لیکن پڑا میں اگرایا جاؤں گا فلا ریت آگھر جو ہوا۔“ اقبال! جو وہ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ جب سے اس کی شہر بکری اور کھانہ پکری کی تھی، اس کا کراہاں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ طور فار ریت آگھر اس پر ڈسے داری کا دھمکا ہوتی ہے اور جلد ہی یہ دوا دہشت سے اس سلسلے میں سوال کیا جائے گا۔ اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ فرار ہو جائے لیکن اس نے اسے اس بارے میں کچھ نہیں کیا۔

بارہ سال کا شہر دوا دہشت اس سے معاملات کو کتنا ہی سمجھتا تھا لیکن وہ جس پریشان میں تھا اسے کچھ نہ کچھ خبریں تو اس کی جانی تھیں۔ چنانچہ وہ جانتا تھا کہ اقبال! جو کچھ خبریں پر شہر کی جانی تھی اسے اور اس کے خدایں کو کوشش کی نہ چلا جائے گا۔ اس طرح اس کی بات مزید مشکوک قرار دی جا سکتی تھی۔ اب اس کی اس کے ذہن میں انہیں یہ اطلاع کی تھی کہ کس حد تک میں پیش کر جائے والا ہے اور کس حد تک اس میں پیش کرنے سے پہلے کی اہم شخص کی گرفتاری کا امکان ہے۔ زیادہ امکان کچھ تھا کہ اہم شخص اقبال! جو وہی ہو گا۔ اس لیے وہ اپنی سر بیانی سے خبر کر پڑو دہشت کی حوالی کیا تھا اور شکوے کر رہا تھا۔

”کیوں فکر کر رہے ہیں یا جو صاحب؟ ہم آپ کو کچھ (اکیلا) تھوڑی چھوڑیں گے۔ اگر وہ سرقاری ڈالے ہیں تو لڑال لے دیں۔ ہم سب بارہا دست کر رہا ہے کہ وہ کسی طرح آپ پر اثر کر سکتے ہیں لیکن کر سکیں گے۔ جس بارہا نہیں لے مل چلا تھا۔ اس روز کے لیے تارڑے آپ کا کمزور دوا دہشت کر رہی تھی اور کچھ مسوئیل کے کواد تیار کر لیں۔ آپ نے یہ کر لیا کر لیں۔“

”وہ وہ میں نے اگلا کر لیا ہے۔ میرے دور دست گواہ اپنے کے لیے تیار ہیں کہ ذہنی اس بات بھگاس سے پہلے کے دور میں بھی میں ان کے ساتھ ہم میں تھا۔“

چوہری کی بات کے جواب میں اس نے فوراً بتایا۔

”اس کو قیصر کیا مصیبت؟ آپ صاف بول سکتے ہو کہ کسی نے میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ایسی حرکت کر لی۔ اگر میں موجود ہوتا تو کئی اور کھانہ تو ایک طرف، جنگل سے ایک جنگل پال بھی اٹھرتا دھڑکھن کیا جا سکتا تھا۔“

”مگر وہ جو کم بخت گزار ہوا ہے وہ میرے گلے میں اٹکا ہوا ہے۔ وہ تو تھا بڑا بدلتہ۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے ہر مل عرضی سے ہوتا ہے۔ وہ اسے دونوں سے پیش کی کھول مل میں ہے، اب تک تو کچھ دواہوں نے اسے مارا کہ اس سے سب کچھ معلوم کر لیا ہوگا۔ اس کا بیان مجھے پسوسا سکتا ہے۔“

”اس کی آپ غلہ کر لیں۔ اس کا بڑا بہت تارڑ صاحب خود کر لیں گے۔ آپ ہمارے خائن کو تو خیر اہمیت کیلئے کا موقع دے دیں پر بھیجے گا کہ ہم کیسے آپ کو کمین میں سے ہال کی طرف سے ان میں سے نکال دیتے ہیں۔ عادی دہشت میں میں دل کی اس سے اور اس کے پتھر کی تو میرا نام بدل کر رکھ دیتے گے۔“ چوہری نے اسے اطمینان دلا دیا۔

اور اس اطلاع پر پولیس تھانہ بھی ہو گئی تھی۔

اطلاع ملنے اور پولیس کے حرکت میں آنے کے بعد میان عرف ایک رات کا وقت آیا تھا۔ وہ بھی اس سچواری کی بات سے کچھ تھکن میں رات کی چوڑی میں مناسب چوڑی کے بغیر دھن بونہو پولیس ہائی کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا لیکن اس وقت نے پولیس کو ناکامی کا درد دکھا دیا تھا۔

”بھرتے خیال میں چوڑی گرفتاری کے بعد ان لوگوں نے احتیاطاً اپنا بیٹا اس قدر روکا ہوا کہ انہیں ڈرہوا کہ کہیں پولیس اس سے کوئی ایسا اعتراف کرانے میں کامیاب نہ ہو جائے جس کے بعد اس حریف جرح عالی کر دے۔ اس لیے انہوں نے فوری طور پر سب بچتے بچتے رہا۔ اس نے ذی اللہ بنی شکور کی پوری بات سننے کے بعد خیال ظاہر کیا۔“

”مگر سچی اپنا کہ اقبال باجوہ گرفتار ہو گا اس بات کا تاثر نہیں پہلے ہی اندازہ ہو گیا۔ اس کی وجہ سے اپنا پیل مل جانے کا انہیں اندیشہ تھا تو یہ ساری کارروائی پہلے ہی ہو چکی تھی جسے جلد آپ کے اندر دوسری اطلاع سے ظاہر سے کھل چک سب بچھو موہ رہا تھا پھر اپنی بھتیجی سے انہوں نے جھگڑیوں خالی کر دی؟ تمام باجوہ سے بچھو اٹھانے میں کامیاب ہوتے بھی اس وقت سب عدالت سے اس کا جسمانی رپہ پڑھ لیتے ہیں کامیاب ہو جاتے۔ یعنی مجرموں کے پاس اپنی جگہ خالی کرنے کے لیے کافی وقت تھا جبکہ انہوں نے جس طرح راتوں رات کارروائی کی ہے اس سے تو کبھی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ کس طرح پولیس کی دھن سے واقف ہو گئے تھے۔“

ذی اللہ بنی نے ایک فنی نقطہ نظر سے کہا جس پر دوسرے میں ہنسا ہوا۔ ”جہاں بات ذہن میں آئی وہ وہیں جی کہ میں انورو کی کے تھے کھل چڑھ گیا۔“

”آپ ویٹ کریں۔ میں تھوڑی دیر بعد آپ کو بل کرتا ہوں۔“ اس نے فوراً ذی اللہ بنی کی کال منقطع کی اور اپنے سوا پاس سے انور کے موبائل کو ہیر ملائے گا۔ انور کو موبائل سے فراہم کیا تھا۔ اسے سوا پاس کے ”ستالی“ کی طرح دیکھ کر سوا پاس نے ہاتھ دھو کر دیکھ کر سوا پاس کے موبائل کو دے دیا تھا۔ سب کی نظر وہاں سے چھٹ کر رہ گئی۔ انور موبائل کو سوا پاس کی طرف سے چاند کرا سے اپنے کمرے میں ڈال دیکھا تھا۔ دوسرے والوں کو اس کے گھر میں چڑی سوا پاس کی نظر آئی تھی۔ چھوڑنا سوا پاس ویٹ اس کے گریبان سے نکلنے والی ڈوری سے دیکھ کر ان کے پیچھے اس کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ موبائل پر آنے والی کال کا احساس

اسے اس قدر اہمیت سے ہونے لگا کہ موبائل کے اکابر نے کمرے پر اسے اپنے بیٹے پر مٹھو کر ہونے لگی۔ اگر وہ مٹھو کر پڑ جاتا تو کال وصول کر لیتا۔ ورنہ اس جان بوجھ جاتا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ اسے کچھ روکا ہو گا۔ وہ بھی میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کر رہا تھا۔ اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ انور اس ڈوری سے کچھ موبائل میٹنگ کر سکتا ہے اور چوڑی کے خلاف چھری کا کام کرتا ہے۔ لیکن اب پولیس اس سے کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ چوڑی کا کام کر رہا تھا۔ اس کا یہ اندازہ اس کے نظر میں آ گیا۔ رات کے اٹھ ہوئے والا کچھ چوڑی کا کوئی بچہ تھا تو یہ کچھ تھا کہ اب انور چوڑی کی رقت میں ہو گیا۔ شاید وہ اسے اندر کر کے خود راہی ہی رقت میں آ گیا تھا۔ اسے پلانے کے بعد وہ جان بیٹھے جس کا موبائل ہو کر انور کے کچھ پولیس ہاں رہ کر دے والی ہے۔ چن چن رات بھر کمرے کا کچھ خالی کر دی تھی۔

”معدود بار کال ماننے کے بعد بھی سب موبائل کی سامان ہوا تو اس نے کھج بار کراہا۔ کچھ دیا اور کچھ بار چھ ذی اللہ بنی منظور کو گھر لایا۔“

”آپ کا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے ذی اللہ بنی صاحب ”نمبر“ اپنے اندر سے اٹھ کر پھر بات اس سے اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ پڑا ہے۔“

”یہ پھر نہیں ہو سارا حرام کی چوڑی مسلسل مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے باجوہ کے جسم میں اپنے دوستوں کے ساتھ جن دن گزارے والے جان کی تھکن سے لیے جا بندے لگے تھے۔ انہوں نے ایچ رپورٹ دے دی ہے۔ یہاں سے جسم کے رشتے میں آنے والی معدود جیک واکس پر باجوہ کی گاڑی کے گھبراہٹ کا پکارا ملا ہے جو اس سے کاتھوت ہے کہ وہ واقعی جھگڑ گیا تھا اور ہمدردت میں اس کے لیے کوئی دینے والے اس کے دوستوں کے بیان کو کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے عذر پر وہ بھی کوئی بات نہیں کر سکتے۔ باجوہ وعدہ پائی سے کام لے رہا ہے۔ دوسرے بھی جسم نہیں کیا تھا اور پولیس اپنے ہنگامے میں موجود تھا۔ یہ گواہ اس کے ہنگامے کے دو ماہر تھے لیکن اب ان کی گواہی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ لیکن کہا جائے گا کہ پولیس نے ملازمین کو سارا دھمکا کر ان سے یہ بیان کیا ہے۔ دو ملازمین کی گواہی نے مقابلے میں باجوہ کے دوستوں کا بیان اور چھک پس سے ملنے والا ریکارڈ یا دوسرے مضبوط ثبوت ہیں۔ پولیس ان ثبوتوں کے سامنے بارگاہی پڑے گی۔“ ذی اللہ بنی کے سچے میں کافی

اپنی تھی۔ اس کیس پر کام کرتے ہوئے وہ چھری کو ہونٹ تھا۔ اس کیس کا میں نے نامید ماہو کیا تھا۔ دوسرے سے پولیس میں تھا اور چھری کے لیے ثبوت کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ باجوہ کی پش پائی خود اس کی صاحب کر رہے تھے اس لیے اس کے لیے ایسے ثبوت حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

”آپ اسے باجوں میں لے لیں۔ ہمارے پاس خدا بخش کی صورت میں ایک اہم گواہ تو موجود ہے۔ اس کے بیان سے عدالت ضرور متاثر ہوگی۔ پھر باجوہ کو اس بات کا بھی جواب دینا پڑے گا کہ کھجک میں موجود وہ کونسی کے استعمال میں تھی اور وہ وہاں اس سے لایا گیا؟ میں کم از کم اس شخص کو معطل تو ضرور کر رہا ہوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں اور کل کی عدالتی کارروائی کے لیے تیار رہیں۔“ حالات واقعی ان کے خلاف تھے لیکن وہ باجوں کو ہر باجوں مان چاہتا تھا اس لیے وہی اس کی کچھ بھاننے لگا۔ اس وقت وہی تھا جو اس کے لیے کسی طور پر کام کر رہا تھا اس لیے اس کا حوصلہ بند رہا بہت ضروری تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ تھکے ہوئے مہم میں نہیں۔ میں تو اس روز سب سے پہلے منظر سے کھجکا کوئی پریشانی سے کھجکا تھا کہ جس سے شہر میں کئی اوجھ کچھ دوں گا۔ میں (پولیس) نے کچھ سب (غریب) کو اپنا کھجکا لیا۔ فیر تھکے اپنے ساتھ جانے کے بعد لے گئے۔ میں تھکے دوں سے ان کی قدم میں تھا۔ جس والوں نے مجھے بہت مانا اور کہنے لگے کہ یہ جان دے۔ اور کچھ اس کوڈر کے رپورٹ (ڈراما) ہو جس پر کھجک سے نکڑی اور کھجک میں دوسرے آدھ کی چوڑی تھی۔ شروع شروع میں، میں نے ان کی گل ماننے سے انکار کر دیا۔ پولیس کی بارے اس کے میں کریم آدمی کب تک مٹھو؟ میں راضی ہو گیا کہ جو رقم لوٹ کھجے ہو میں مان لیتا ہوں۔ کچھ چنے آن پڑا ڈی سے انہوں نے کاکڈ (کاکڈ) پر انگریز لکھا لیا۔ یہ میں ج کبکہ ہاؤس سرکار میں سے تصور ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ کوڈر ڈراما میں کی گواہی پر پولیس اس کیس کا اٹھارہ تھا۔ عدالت میں بیان دیتے ہوئے وہ کسی بدل گیا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل دو دوسرے موافق گواہ کے طور پر عدالت کے سامنے جج ہوئے پر واقعی تھا کہ اب اس کے اس بدلے ہوئے بیان نے صورت حال بالکل بدل کر رکھ دی تھی۔ اس بیان نے کمرے کے عدالت میں سستی کی بجائادی گئی۔ ذی اللہ بنی منظور سے بھی کے عالم میں گھر سے

میں سستی کی عقل بنا کر کوڈر کے کوڈر کے ڈراما کو گھر پر تھا۔ عدالت میں غائب ہونے کے بعد بیان بدل لینا کچھ مجرموں کا رواج ہوتا ہے لیکن اس شخص کے بیان بدل لینے کا مطلب تھا۔ کھجک کا بے حد کمزور ہو جانا۔

”گواہ نے اپنا بیان بدل لیا ہے جناب اور نہ ہی یہ ہے کہ پولیس نے اسے کھجک کی دھن کوڈر کا کام کرتے ہوئے جس کوڈر کوڈر ان میں سے ایک کوڈر میں یہ ہوا تھا اور اس نے اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ پولیس کے خلاف ہاتھ دیا۔ حوالت کی تھی۔ مضمون سے لے کر لے کر دیا تھا۔ ہاؤس کوڈر کے اندر سے جا چکا اس پر لکھوں کے نشان لگے ہیں اور یہ نشان پولیس پر لکھا کر دیا ہو گا۔ چنانچہ میں فاضل عدالت سے درخواست کر رہا ہوں کہ اس شخص کو سزا ایک ہفتے کے رہا کر دیا پولیس کی گواہی میں دے دیا جائے کہ اس سے حقیقت ظاہر کی جائے۔“ اس موافق پر سرکاری دھن نے مخالفت کرتے ہوئے درخواست کی۔

”یہ نظم ہے سرکار اس والوں نے زبردستی مجھے ہتھیار پکڑا یا تھا اور کوڈر میں کچھ دھجھے لگے تھے۔ آپ مجھے ان کے حوالے کر دیں گے تو مجھے پھر دھجک کریں گے۔“ کوڈر ڈراما چھکا۔

”عدالت مضمون کو جان کر، رہا کر دیا پولیس گواہی میں دیتی ہے۔ سرکاری دھن کے پاس انگریز پر پائی گواہ سے اسے عدالت کے سامنے پیش کرے۔“ اس شخص کے دوا لے پر کان دھرے پھر نے اپنا فیصلہ ناپا اور سرکاری دھن کو گھر لایا۔ ”شکر ہے پورا خراشے طر پر کوئی گواہ نہیں کھجکا۔“

دیکھ سنا ہی اپنے گواہان کوئی کر سکتے ہیں۔ ”سرکاری دھن کچھ بہت گھبراہٹ میں۔ مضمون کے سب سے میں کھجک سے اقبال باجوہ نے اس صورت حال کو اٹھایا کیا۔ عدالت میں یہ میں پیش کرتے ہوئے ذی اللہ بنی شکور نے جو بیان دیا تھا اس میں اسی کوڈر ڈراما کے بیان کی بنیاد پر اسے مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بیان دریافت ہونے والی مشکوک کھجکا بھی گواہان کی گواہی کا سب سے تہ ذہنیت اس گواہ کی تھی اور جب وہ کچھ تھا تو اس کا مطلب تھا کہ پولیس بے بس تھی۔ کم از کم اب پولیس کے لیے اسے مزید اپنی حراست میں رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا کھجک آج ہی عدالت سے اس کی مخالفت کر دے اس کا موبائل ہو جاتا۔ گواہ نے اپنا بیان کیسے بدل ہوا، یہ ہاتھ دھجک تھا۔ اس کے سامنے وار چوڑی اور پولیس نے ذی اللہ بنی شکور کی جالی پٹی ہوئی کوڈر ڈراما مضمون کو دے موافق گواہ نے میں کی کی پٹی کی ساری حجت

اکارت چلی گئی۔ دو جودا انت میں پیش ہوتے ہوئے نمودار سا
 ٹھہرایا ہوا تھا، اب باہل مطمئن تھا اور حرمان کے گہر سے
 میں کھڑا ہونے کے باوجود اتنے مزے سے مذاقی کارروائی
 دیکھ رہا تھا جیسے کسی سلیٹر میں میں موجود ہوا اور اپنے سامنے کھلیا
 جانے والا کوئی نیا دیکھ رہا ہو۔ وہیل صفائی نے اس کے
 دونوں دانتوں کو باری باری بدالت کے سامنے پیش کیا
 جنہوں نے گواہی دی کہ اقبال باوجود تھکان تک مسلسل ان
 کے ساتھ جہلم میں تھا۔ چپک پاشن سے حاصل کردہ ریکارڈ
 کی کاپیاں بھی ثبوت کے طور پر بدالت کے سامنے پیش کی
 گئیں۔ ان گواہیوں اور ثبوت کے بعد صورت حال یوں ہو
 گئی کہ بے شک اقبال باجوہ پر طور قادیات آفیسر اپنے
 فرائض سے کوتاہی کا مرتکب ہوا ہے۔ جنگل میں جاری
 سرگرمیوں سے اسے واقف ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے برادر
 بدالت کی جرم میں شریک ہونے کے شواہد موجود نہیں تھے
 اس لیے بدالت نے اس کی درخواست ضمانت منظور کر لی۔
 بدالت کے اس فیصلے پر اقبال باجوہ کا بیچر دھن اٹھا۔ اسے
 یقین تھا کہ ضمانت کی طرح اسے جہلم میں سے باعزت
 بری ہونے کی خوشخبری بھی سننے کو مل جائے گی۔ جیسے ہی بیچ
 نے دونوں طرف کے افراد کو اگلی پیشی پر بدالت میں حاضر
 ہونے کا حکم دے کر بدالت پر حاضری کی دھمکائی اور بدالت
 میں موجود پندرہویں انچارج کا پ کے چلوں کا ایک مونا سا بار
 لے کر اس کے قریب پہنچ گیا اور بار اس کے گھٹے میں ڈال کر
 گرم جوئی سے اسے ہمارک داد دیتے ہوئے اس سے معاہدہ
 کیا۔ اقبال باجوہ خرمی ایسے خوش تھا جیسے واقعی بے قصور ہو۔
 جہلم سے گواہی کے لیے آئے ہوئے اس کے دوست بھی اس
 کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان سے مبارک پاؤں وصول کرنا ہوا
 اب وہ اس سحائی کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا جو اس کیس
 پر اس کا موقف جاننے کا خواہش مند تھا۔ اس قضیے سے بے
 نیاز بنے پولیس اڈا کوڈر ڈاڈا اور کو اپنے کھیر سے میں لیے
 بدالت سے باہر نکل گئے۔ چند قدموں کے فاصلے پر وہ پولیس
 چین کھڑی تھی جس میں اس شخص کو لے جایا جاتا تھا۔ اس سے
 قبل کہ وہ چند قدموں کا فاصلہ طے ہوتا، نقض میں ایک فائرنگ
 آواز کوئی اور پولیس کے کھیر سے میں موجود اڈا ڈاڈا راجپر
 گھر کر رہے تھے۔ اس صورت حال پر ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔
 کچھ پولیس والے یہ گھبراہٹ دیکھنے کے لیے بھاگے کہ فائرنگ
 طرف سے کیا گیا ہے اور وہ فائرنگ پر تڑپتے ہوئے زخمی کی
 طرف متوجہ ہو گئے۔ کوئی اس کے سر میں گولی تھی اور کو پڑی
 کا ایک حصہ اڑ جانے کے باعث دماغ باہر نکل آیا تھا۔ صاف

ظاہر تھا کہ وہ کچھ لمحوں کا ہی سہاں ہے۔ ہر گھبراہٹ کی کارروائی
 پوری کرنے کے لیے اسے ہسپتال لے جانے کی فکر ہوئی
 جانے لگی۔ جس وقت اسے زمین پر سے اٹھا کر ہسپتال میں
 منتقل کیا گیا، وہ اپنی آخری سانس لے چکا تھا۔ غریب
 ہسپتال پہنچے تک کہ کبھی مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ ش بھی چاہتی تھی
 کیا ہو جاتا؟ وہاں موجود واحد سرکاری ہسپتال میں اتنی
 سہولیات تھیں کہاں موجود ہیں کہ اتنے شدید زخمی شخص کی جان
 بچانے کے لیے کچھ کیا جاسکے۔

بہار بہار

”مان گئے کبھی، کیا خوب انتظام کیا آپ لوگوں نے۔
 وہ بے جا رڈ کی الجھن پی تو حسرت سے بھگدڑ گھبراہٹ میں
 میں تھے آرام سے ضمانت پر رہا ہو کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا
 ہوں۔ اسے تو کمان بھی نہیں ہو گا کہ اس کا گواہ بدالت میں
 آکر یوں بیان بدل لے گا۔“ اقبال باجوہ نے کئی بیچ کی
 طرح تھکارت کرتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں تھا جسے جام سے
 ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر جہلم سے اس کی خاطر گواہی دینے کے
 لیے آئے والے اس کے دونوں دانتوں کو باری باری صفائی سے
 قلعن رکھتے تھے۔ وہ اس کے ایک دودن رک جانے کی دعوت
 کے باوجود اپنی کارروائی مصروفیت کی وجہ سے روکنے کے لیے
 راضی نہیں ہوتے تھے اور واپس جہلم لوٹ گئے تھے۔ وہ انہیں
 رخصت کر کے فارغ ہوا تو پندرہویں انچارج کی طرف سے چار
 ماہ کی حویلی پہنچ گیا۔ وہ فوراً وہاں پہنچ گیا اور اب دو تینوں
 بھراگ اڑانی شہیدین کے ساتھ اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔
 ”وہیستے اس نے اپنا بیان بدلا کیسے؟ مجھے یقین ہے کہ
 اس کے پیچھے آپ ہی کی میرانی ہوگی۔“ اب اس کا مخاطب
 ایش تی مظلم ہوا تھا۔

مظلم تارڑ اس کے انداز سے پر زور سے ہنسا اور پھر
 ایک آنکھ دباتے ہوئے ہوا۔ ”ناشا، اللہ آپ سے بڑے سمجھ دار
 ہو باجوہ صاحب! ہم کیا اور ہماری میرانی کیا؟ بس قار سا
 حق دینی بھانے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے کرا بھی گیا
 پڑا؟ بس اس بندے کے بدالت رواں ہوتے وقت اسے اتنا
 پیغام بھجوایا تھا کہ باجوہ صاحب پر زور بھی آئی تو تیرا آخر
 بیوی بچوں سمیت مل کر جہلم ہو جائے گا۔ بندہ سمجھ دار تھا۔ یہ
 بدلتا چاہیے، غور سمجھ گیا۔“

”تم آپ لوگوں نے تو اس کا سمجھ داری دکھاتے ہو؟
 سبکیا نکال باہر کیا۔“
 ”وہ اس بات کی سزا تھی کہ اس کے پیچھے میں ہم سے
 نڈاری کرنے کا خیال آیا کیسے؟ اندازوں کا انجام تو ہم جیل

بڑا نصرت تاک کرتے ہیں۔ وہ انور ابھی نہیں دیکھا ہے
 کی کھینک کر ہاتھ سزا دواؤں سے کسی کا نہیں (جاسوس) بنا
 ہوا تھا۔ وہ اچھا ہو کر میں نے پہلے ہی دیکھا تھا کہ وہ کام پر لگا
 دیا تھا کہ اپنے بچے کو جو دھوکہ حرام کو دھوکہ دے گا۔ اس نے
 بھی میں اس وقت اس کو بچا ہوا وہ چھپ کر خبریاں کر رہا
 تھا۔ حال دیکھو سال کا۔ ڈھونڈنے سے کھانے پینے کو نہیں ملتا
 اور مجھے میں سوچاں لگا کر پھر رہا تھا۔ دلاوا بائیں نسبت اسے
 چکر کھانے کے پاس لے گیا۔ مٹی سے اس سے سب انگلیاں کر
 کھرے ہو جانے آیا اور کسی کے لیے اس سے کون کون کی
 خبریاں کھینک رہی تھی۔ یہی شری سے مٹی کی اس انور سے
 لے۔ کہتے تھے کہ تھوڑی سی وجہ سے میری بیوی اور بچے کی جان
 تھی۔ اس واسطے تم سب کی جان مشکل میں ڈالنے کے
 لیے اسی سے مل گیا۔ اس کے کہنے پر میں نے نہیں جھکی
 میں درخت کاٹنے پر اپنی بیوی لگنے لگا۔ مٹی کا تو یہ سب
 سن کر متھوڑ گیا۔ اس کی کت کاٹی ہے اس تک حرام کی کہ
 اپنی جگہ سے لے کر بڑی کھینک رہا۔ ڈیرے پر اپنی موت کے
 انتظار میں رہا ہے۔ میں نے بھی کیا کر پڑا ہے۔ وہ پہلے
 شہر ضروری کا سونے سے نکل لیا پھر اس کا فیصلہ کر لیا۔
 چودھری افکار کا کہہ رہا تھا ہے۔ وہ ہے حد تک نہیں تھا۔
 ”آپ نے اچھا کیا چودھری صاحب اندرون کو توہانی
 عبرت تاک سزا ملتی چاہیے کہ کچھ کسی میں نہ داری کی جرأت ہی
 چو اندو بکے۔“ انہیں کی لے اس کے فیصلے کی تائید کی۔
 ”غدار کی کا انہی سب جانتے ہیں اسی لیے ہمارے
 تابع دار بنے رہتے ہیں مگر میں بھی کسی کا دماغ پھر بھی جاتا
 ہے جن کا دماغ پھر جاتا۔“ انہی تو ہم بددعا مانی دکھانے کے
 لیے زندہ ہی نہیں چھوڑتے۔ باقی انہوں کو بھی نصیحت ہو جاتی
 ہے کہ انکی کوئی گل سوجھتی بھی نہیں ہے۔ لوڈر کے ذریعہ کا
 انجام تو سب دیکھ ہی چکے ہیں اب انور سے کامی و کج نہیں
 کے۔ ویسے ذریعہ کا تو ہم نے یوں بھی ہر حال میں کامیاب
 کرنا تھا۔ وہ پولیس کی نظر میں آ گیا تھا۔ سانچہ (خدا کو)
 اس کے ذریعے پولیس میں تک کرنے کی کوشش کرتی رہی۔
 آپ یہ کہ جب ہمسایہ نہیں رہا تو کھانسی کھر سے چپے
 کی۔ آپ پر چھپنے سے جو میں بتایا ہے اس میں تو سمجھ لیں کہ
 ذرا دم نہیں رہا۔ ذریعہ کے بیان دے پے پر وہ لوگ پہلے ہی
 پکھلائے ہوئے تھے۔ سوچا ہوگا وہ دوبارہ اس پر کام کریں گے
 اور عدالت میں اپنی مرضی کا بیان دلا میں کے لیکن آپ تو ان
 کی ساری امیدوں پر داس پائی ہوگی۔“ وہ دوران گفتگو کی
 جام تالی کر چکا تھا۔ نئے کے باعث اس کی سرخ چاڑھ جاتے

واقی انھوں پر کسی کھوڑی انھوں کا مکان ہوا رہا تھا۔
 ہر وقت چھانی رہنے والی تھی کہ ساتھ یہ سرخ چھپیں اسے
 بہت خوش کاغذی تھی۔
 ”ہاں جو صاحب کی شانت کی خوشی میں، میں نے آپ
 لوگوں کو جو دعوت دی ہے اس دعوت کا اصل لطف لینے کے
 لیے آپ انور کو میرے ساتھ ڈیرے پر چلن ہوگا۔ ڈیرے
 پر چل کر ہی آپ کو کتنے معنوں میں اعزاز ہوگا کہ ہم دشمنوں
 کے کیسے دشمن اور دشمنوں کے لیے کیسے جہنم ہیں۔“ اس کے
 اعزاز سے لگا ہوا کہ وہ اب مزید شراب نوشی کا ارادہ ترک کر
 چکا ہے اور فوری طور پر ڈیرے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔
 ان دونوں نے اس کے ارادے کو سمجھتے ہوئے جلدی بدل دی
 اپنے عام مانی کیے اور اندھ کھڑے ہوئے۔ اب ان کی مزاح
 چودھری کا دوا دیا کرتے تھے وہ اپنی مٹا پندرہ گریوں کے لیے
 استعمال کرتا تھا۔ انہی گاؤں کی آبادی سے کافی فاصلے پر
 ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی سرگرمیوں کے لیے بالکل چھوڑ
 تھا۔ گاؤں والوں کو چھٹک لگی تھی پرانی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا
 ہے اور اگر کسی کو کھوڑی بہت جھک پڑی جاتے تو وہ جان
 بوجھ کر ان کی جان میں جاتا تھا۔ چودھری کے معاملات کی طرف
 سے انھیں اور کان بند رہتا ہی ان کے حق میں بہتر تھا۔
 انھیں اور کان بند رہتے تھے تو زبان کے پاس ہونے کے
 لیے بھی کچھ نہیں رہتا تھا۔ آبی جب بھی پھرتے۔ اپنی زبان
 سے پھرتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زبان بند کی کا انہی
 طرح اجتنام کیا جائے۔ سو گاؤں والے اس اصول پر عمل پیرا
 رہتے تھے۔
 ”ہاں ابھی کیا حال ہے میرے شیروں کا؟ کام سے
 لیے تیار ہیں؟“ ڈیرے پر پہنچ کر وہ لوگ بھیسی گاڑی سے
 اترے تھے انہی دکھانے کے استقبال کے لیے دوڑا آیا۔ مٹی
 کے پیچھے ایک بندہ دو ٹونڈوں کی زنجیریں تھامے ہوئے
 کھڑا تھا۔ کتے تھیم ہونے کے علاوہ بہت خوش خود بھی لگ
 رہے تھے۔ ان کے اعزاز سے انکی بھی بھگی اور خوش فوری
 جھک رہی تھی کہ صاف لگتا تھا ان کے منہ پر مسوں سے
 بندگی پڑے کے کہ کپ لہو شے سو جو دھن ہوئی تو وہ اپنے
 رکھائے کو ہی جی چڑا کر کھا جاتے۔ مٹی سے سوال کرتے
 ہوئے چودھری کی نظر ان تینوں پر پڑی رہی۔
 ”بالکل تیار ہیں سرکار۔“ بلکہ بے جین ہیں کہ کب
 انہیں کام دکھانے کا موقع ملے۔“ مٹی نے خوش انداز سے
 اس کے سوال کا جواب دیا۔
 ”میں تو پھر ملان، انہیں زیادہ انتظار کروانا بھی ایسا

نہیں۔ میرے افسانے اتنی آہ سے بھوکے ہیں تو کھلے
 میری بھی جھک اڑتی ہے۔ ان کے پیٹ میں کچھ پنے کا تو
 ہی میں کھینک ڈالوں گا۔“ اس کا اعزاز بے حد مٹی نے تھا۔
 اقبال باجوہ اور اس کی بیوی نے ہر طرح سے اس صورت حال
 کو کھینک پادے تھے لیکن چودھری کے اعزاز میں چوکا ہوا
 جس سے انہیں اپنے جسم میں پھر مٹی کی دھڑکی محسوس ہو رہی
 تھی۔ وہ چودھری کی معیت میں پہلے ہوئے مٹی سے اس
 کے ساتھ ڈیرے سے مٹی داخل ہو گئے۔ چودھری نے ڈیرے
 کے شان دار، بے سجاتے کمروں کے بجائے پہلے نہ خانے
 میں جانے والی بیڑیوں کا رخ کیا تو جی نہیں اسے اس کا
 ساتھ دیا۔ مٹی اور کتوں کی زنجیریں تھامے ہوئے رکھوا لیں
 پیچھے پیچھے تھے۔ نہ خانے کی تخت میں لیکن کی محسوس ہو رہی تھی
 روٹی کا استعمال انجام تھا۔ اس روٹی میں وہ کچھ کھاتے تھے کہ
 اس دھن و دھن میں نہ خانے میں کی کمرے سے ہوئے ہیں۔
 شاید وہ بیتے ہوئے پرکے تھیں کے کھانے تھے، پہلے بھی اچھی
 رقبہ استعمال ہوا تھا۔ مٹی نے آگے سے یہ کہ ایک کمرے کا
 دروازہ کھولا تو وہ اب اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک
 دیوال نما کمرہ تھا جس میں وہ چاروں کے ساتھ تھیں کرسیاں دھن
 ہوئی تھیں۔ ان تین کرسیوں کے علاوہ کمرے میں اس قسم کی
 زنجیر لٹھیں آ رہا تھا۔ یہ بیڑی کرسیاں بھی شاید ان تینوں
 کے پیچھے کے لیے خاص طور پر دیوال رکھائی گئی تھیں۔
 چودھری نے ان دونوں کو اشارہ کیا تو اس کے ساتھ دو دونوں
 بھی ان کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ مٹی اندر دکھانے کے
 ساتھ اندر نہیں آیا تھا۔ البتہ کتوں کا رکھنا ان کی زنجیریں
 تھامے ایک کونے میں دیوار سے لٹک گئے کھڑا تھا۔ ڈیرے
 میں مٹی بھی وہاں آ گیا۔ اس کے پیچھے دو دونوں اور تھے ایک
 مرد انھوں والی فرانت صورت ہا اور دوسرے قردق والی انور
 تھے بالآخر یہاں کھینکا ہوا دیوال لایا تھا۔
 ”ہاں یعنی انور دیوال کیا سزا دوں تھے تیری ملک
 حوی کی؟“ خرخر کر پینے انور کو چودھری کے سامنے پیش کیا
 گیا تو اس نے سر دھک میں اس سے سوال کیا۔
 ”مجھے معاف کر دیں سرکار میں فیصے میں سب کچھ کر
 تھی سے کیا کہ وہ مٹی پر اسے اچھا لگھوانے کا بندہ دست کر
 رہا۔ یہ نہ مانے اور میری کھراہی مٹی کو تھیم بہت فدا آیا۔
 میں فیصے میں ہی داسا سوچے تھے کسی کھلی کر جیسا۔“ انور کو
 پہلے ہی ٹھیک خاک مار لگائی چاہی تھی اور اب اسے اپنی جان
 کی خاطر سے میں تھیرا مٹی اس لیے وہ اپنے سارے

دوسے اور وہ بیڑی بوقیا تھیں بھول کر جو اس۔ شریار کے
 سامنے کی نہیں چودھری سے معافی طلب کر رہا۔
 ”مٹی کی سزا تو تھیم کو بھگت ہی پڑی تھی۔ تھے کچھ
 سزا تو ضرور ملے گی۔“ چودھری کے لیے میں سزا لگی۔
 ”اس بار معاف کر دیں سرکار میں سزا دیانی آپ
 کا غلام بن کر رہوں گا۔ مٹی اچھے سے میں بھگت کر رہا ہوں
 دوبارہ انکی کھلی نہیں کروں گا۔“ چودھری کے لیے کچھ کی
 سزا کیت سے وہ اپنے انجام کو بوجھ رہا تو اس لیے
 گڑگڑاتے ہوئے اس کے قدموں میں گر گیا۔
 ”ہم تھے دوبارہ مٹی کے لاتی ہی نہیں پھرنے کے۔
 بھگت ہوؤں کہ دست دکھانے میں وہی مٹی طرح آئے۔“ تھیم پر
 تو ہم ایک طرف سے ہر پائی ہی کرتے چارے ہیں۔ جس کھر
 والی کی جدلی میں تیری مت ماری کی ہے۔“ اسے ایک
 پکھانے کا فیصلہ کر لیا ہے ہم نے۔“ چودھری نے انہیں سے
 اسے جواب دیا۔ اس جواب پر اس کے چہرہ پر کھنڈی
 زردی کچھ اور بھی کھری ہوئی اور وہ مزید نہ اور اس سے
 گڑگڑاتے لگے۔ چودھری اس کی گڑگڑات اور مٹیوں پہ مٹی
 بے نیاز رہا مٹی کا باجوہ اور تار تو تھی یا سوا لٹا لٹا۔
 ”چارہ یاد نہ م نہ خراب کر میرا۔“ پہلے ہی کمرے شیر
 بیڑی در سے ہو گئے ہیں۔ اب ان سے ہر ہر دھن نہیں ہو
 گی۔ تو اگر خود کو میرے کا م کا بندہ نکالتے کرنا چاہتے تو خود
 کوان سے زیادہ طاقتور اور بہادر ثابت کر کے دکھانے۔ ان
 سے مقابلہ جیت لے۔ تو جیت کیا تو میں تھے اپنا خاص
 بندوں میں شامل کر لوں گا اور تو تھیم تیری کوئی ضرورت ہی
 نہیں۔“ تھیم نے سزا دل پڑے ہیں میرے پاس۔“
 چودھری نے اسے جواب دیا چوڑی کی کھاک سے کھڑے دور
 چلا دیا۔ اسی وقت کتوں کے رکھوانے لے ان کے منہ
 آ کر اور کتے کے بعد ہاتھ سے ان کی زنجیریں پھجوا دیں۔
 اسے ایسا کرنے کا اشارہ دیکھ چودھری کی طرف سے ہی ملا
 ہو گیا لیکن باجوہ اور تار دیکھ نہیں سکے۔ وہ تو اپنی اپنی
 نشستوں پر ٹھکے ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک گڑو واران اور
 دو درختوں کے کتوں کی لڑائی کا کیا انجام ہو سکتا تھا۔ یہ
 کسی کو بتانے کی ضرورت تو نہیں تھی۔
 کتے آ کر وہ ہر گز اور کی طرف لپٹے تو اس سے ملنے سے
 دھشت تاک چھپیں بلند ہوئے تھیں کھر دھب پہلے کتے نے اس
 کی ٹانگ پر مت مارا کہ اسے سمجھو تا شروا کیا تو شاید اسے
 اسام میں ہوئی کہ صرف چھپنے اور مٹی کی دغا ست کرنا سے
 بچو نہ ہوگا۔ بھکی پہلی خواہش نے اس کے ہاتھوں انہیں

مجھی اور شاہو کی بالاسا کی رختے ڈڈی چودھرائن کی سب سے
 مہر چھ می ملازم بھی۔ اس نے آفتاب کو اس بار سے میں کچھ
 نہیں بتایا تھا کہ کہیں وہ احتیاطاً سے فون کرنے سے منع کر
 دے لیکن خود اپنے طور پر ہوشیار رہنے لگی تھی اور ابھی غریب
 ایتھنے بھاگے لیے بعد ہی سوا گئی اپنی الماری سے نکال کر اس
 سے رابطہ کرتی تھی۔ اس ساری احتیاط کے باوجود اس کے
 دل میں ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ ٹوٹی کی کرتا دھرتا ڈڈی چودھرائن
 اسے پکڑنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ اس وقت بھی
 چودھرائن ہسپتال نے ڈڈی چودھرائن کو ساتھ لے کر بیٹھنے کی جو
 بات کی تھی اس پر وہ کچھ بڑی سی ہوشیار تھی۔ ڈڈی چودھرائن کی
 ہر طرف گھراں آٹھوں کی دہرے تو آدمی کو اپنے سامنے سے
 بھی قتلہ دہتا پڑتا تھا۔ بھلا اس کی سوجھ بوجھ میں وہ آفتاب کی
 طرف متوجہ ہونے کی قطعی کیسے کوشش تھی؟ لیکن یہ بھی مجبوری
 تھی کہ اس سے پہلے بغیر جان بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ جو رستوں پر
 کی سسرال سے پہلے تو وہ اس کا کیا تھا اور اس کے سینے جاتے
 وقت اس سے سی نہ ہو چکا تھا تو وہ یقیناً مر جائیگی۔

”کدھر چلے گی کھل ہو رہی ہے؟“ ڈڈی چودھرائن خود
 وہاں آگئی تھی۔ اس نے ہائیڈکابڈن لیا تھا اس لیے پوچھنے لگی۔
 ”یہ اپنی کٹورہ کدھر رہی تھی کہ بیٹوں سے لے بہت دن ہو
 گئے۔ بچہ بھی پاؤں سے ہیں تو میں نے کہا کہ چلو ان سے ملے
 چلے ہیں لیکن پہلے ڈڈی آپ سے پوچھ لیتے ہیں کہ ان کا کیا ارادہ
 ہے۔“ چودھرائن ہسپتال کے شامیہ کے نیچے میں جواب دیا۔

”آج تو وہ بچہ نہیں ملے تو بھانسنے مجھے پر ہماري
 جگہ کہتی ہے تو چلو اب کہتے ہیں کہ رات نہیں چلتے ہیں۔
 رات رک کر کئی سوپر سے لوٹ آئیں گے۔“ ڈڈی چودھرائن
 نے بڑے سہمے لکھ میں جواب دیا لیکن اس کی تیز نظر لی کٹورہ
 کے چہرے کو ٹوٹی رہی تھیں جیسے گہری میں جا کر اس کے اندر
 کا عید جانا چاہتی ہوں۔

”اگر آپ کے پاس فرصت نہیں تو آج رہے دیں
 ڈڈی ماں ہم مل وہاں پہنچ جائیں گے۔“ اس کی نظروں سے
 گھبراتے ہوئے وہ جلدی سے ہوئی۔ یوں بھی جو پروگرام
 بڑی چودھرائن نے ترتیب دیا تھا اس سے اسے تو کوئی فائدہ
 نہیں ہوتا۔ آفتاب تو ان اوقات میں وہاں تھا ہی نہیں۔

”کیوں رہنے دیں؟“ جب تیرا دل آج جاتے کو چاہ رہا
 ہے تو آج ہی نہیں گے۔ اس پہانے میں بھی اپنے پیسے میں
 ایک رات رک جاؤں گی، پروکچھ میں سوپرے ہمارے ساتھ
 ہی وہاں آجائے اور رکنے کی کوشش مت کرتا دھرتی سے ابھی تھا
 ہوں گے۔ وہ پہلے ہی نراش (ناراض) ہو رہے تھے کہ کٹورہ کا

میں جو چلی میں کیوں نہیں لگتا؟ پہانے بھاگنے سے جو چلی سے
 باہر جانے کے لیے اصرار کرتی ہے۔ ”اب اس کے کچھ میں
 ایک واضح حسیہ تھی۔
 کٹورہ کچھ ہتھکڑی لگی اور حلق سے ہوئی۔“ ٹھیک ہے،
 میں کہیں نہیں جاتی۔ پڑی رہتی ہوں لیکن میں قید ہوں
 کی طرح! اپنی تاراجی کا کھلی مظاہرہ کرنے کے لیے اس
 نے اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں سے باہر نکلنے کے لیے قدم بھی
 دروازے کی طرف بڑھا دیا۔

”اپنی جگہ کو دراستہاں کر دھنا یہی الزام تھا اس کے
 خزانے بہت بڑھ گئے ہیں۔ مجھے تو یہ پوری ہواؤں میں اڑتی
 دکھائی دے رہی ہے۔“ اسے پیچھے اسے بڑی چودھرائن کی
 کاتے دور کچھ میں کی ہوئی بات سنائی دی تو یوں لگے جیسے فون
 رگوں میں ٹھہر ہوئے لگے ہے۔ ہاتھیں دو اس کے راز سے
 آگاہ ہو گئی تھیں یا پھر ایک بات کہہ رہی تھی لیکن اس کا
 فائدہ ٹوٹیوں میں گھرا ہوا دل تو مزید خوف کا شکار ہو گیا تھا۔ اس
 خوف کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ ٹوٹی کی
 بالائی منزل کی طرف بڑھ گئی جہاں سر محمد مسیت کا دفنی
 معذور بیٹا بڑا ہوا کسی فائو سامان کی طرح پڑا رہتا تھا۔
 صرف وہ بھی جو اس کا ایک بہن کی طرح خیال رکھنے کی کوشش
 کرتی تھی۔ اسے وہ اپنی ہی طرح مظلوم لگتا تھا کیونکہ اس کی
 طرح اس بے چارے پر بھی خوشیوں کے سارے دور نہ تھے
 جس وہ اس اعتبار سے کوشش قسمت تھا کہ اس کا ذہن اس
 نا انصافی کو کھینچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا اور وہ ٹوٹی اذیت
 سے بھرا ہوا تھا۔

”سر! آپ کے گھر سے فون ہے۔“ وہیوٹے انجمن
 سے فی وی پر فون کیا جاتے والا وہ بچے کا خبر نامہ کچھ رہا تھا کہ
 نظر نے اسے اطلاع دی۔ گھر سے فون ہونے کا مطلب تھا
 کہ کال مسمانی آفرین نے کی ہے۔

”ہیو شیریڈار جیتا یہ میں بولی رہی ہوں نہ رہی
 مسمانی۔“ اس کے چلو کے جواب میں فون آوری دوسری طرف سے
 سنائی دینے والے جملے سے اس کے اعزاز سے لگی تھیں کہ
 وی مگر مسمانی آفرین کے لکچ میں جو پڑی تھی، اس نے
 اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”خیریت تو ہے مسمانی جان؟“ اس نے فوراً اس سے پوچھا۔
 ”نہیں، خیریت نہیں ہے۔“ ہیوٹے آج صبح... لاہا
 ہے۔“ فون کی وی مسمانی اطلاع پر وہ چلی کر گیا۔

حالات و مشکلات کی شکل بناؤ گی تلاش میں سو کرواں
 ماہ نامہ کی داستان حلت کہہ و افلاحت اللہ ماہ و بچے



گلاب

اسما قادری

ساتھ قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بالآخر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا قر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور چال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی چال کو تو زکو اور کمزور مچھلی بچ کر تکل جاتی ہے۔ پھستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تلے پلٹوں کے نیچے سے میت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

شہر کی فسون گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل ... ملے اور پھڑپھڑانے والوں کی کہانی



”کیا مطلب یہ کہ اس محفل دو؟“ لفظ ”لا چتا“ نے اس کے ذہن میں بھونچال برپا کر دیا۔ ایک چند روزہ سانس لڑی کے لاپتہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں لایا جاسکتا کہ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح گھر کا راستہ بھول گئی تھی یا نہیں بھول چکا وہیں ہم کو جی ہو۔ اس کے لاپتہ ہونے کا مطلب تھا کہ اسے کسی نئے غائب کر دیا ہے یا پھر، باقی مرنے سے نہیں چلی گئی ہے۔ یہ دونوں ایسی صورتیں نہایت تشویش ناک تھیں۔

ڈی آئی جی کا درانا بی بی کو اس شخص نے غائب کیا تھا تو اس کے پیچھے تھپتھپ کوئی سری سازش تھی۔ سجاد راہ کو کسی کام سے روکنے یا اس سے کوئی مطالبہ منوانے کے لیے ایسی حرکت کیا جاسکتی تھی جتنا دوسری صورت بھی بعید از امکان نہیں تھی۔ شوخ و شنگ، بیوقوف بھائی بیٹا عمر کے جس حصے سے نذر رہی تھی، وہ بہت نازک تھا۔ اس عمر کی لڑکیوں کو راستے سے بھٹکے دینے والے بہت ہوتے ہیں۔

یقیناً پریشان تھے لیکن اپنے دل سے کچھ نہ سمجھا ہوا تھا۔
 ”مجھے پریشان ہونا بھی چاہیے۔ میری سچی سچ سے
 غائب ہے اور مجھے خبر بھی نہیں دی آپ نے تھی۔ اس وقت وہ
 اسے سی شہر اور وہاں ملک ایک چلا تھا جو اپنی سچی کے غائب
 ہونے پر بری طرح پریشان تھا۔“ مجھے یقین ہے کہ یہ سچی
 کہہ رہا تھا؟ آخر اس طرح یقین کیسے غائب ہو سکتی ہے؟
 سجاد اٹانے اس کی بات کا جواب دینے میں کچھ توقف کیا تو
 اس نے غور سے اس کی دھڑکیاں سن کر کہا۔

دینے اور اس کی حالت مہلنے میں اسے دس بارہ منٹ کا وقت
مل گیا۔ دس بارہ منٹ بعد وہ وہاں اس جگہ آیا جہاں گاڑی
کھڑی کی تھی تو اس نے دیکھا کہ شینا گاڑی میں نہیں۔ اس
نے ارد گرد کے علاقے میں اسے تلاش کیا لیکن وہاں اسکی کوئی
جگہ نہیں تھی یہاں شینا بے ملتی۔ میں نے خود جا کر اس علاقے
کا معائنہ کیا ہے۔ واقعی وہاں تو کوئی دوکان وغیرہ تک نہیں کہ
یہ سو جا جائے کہ شینا کسی چیز کی خریداری کے لیے ہی گاڑی
سے اترتی ہو۔ بہر حال، ذرا تھک کے مطابق اس نے اپنے
طور پر شینا کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر مزید دس پندرہ
منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ اگر شینا کسی ضرورت کے تحت
گاڑی سے اتر کر کہیں کہے تو اس دوران میں وہاں آجائے
لیکن جب وہ نہیں آئی تو وہ اس کی کم شدگی کی اطلاع لے کر
گھر چلا گیا۔ مریم نے اسے کہا کہ وہاں پر واپس پہلے خوب
دعاؤں پڑھا پھر اسکول فون کر کے معلوم کیا کہ شینا وہاں تو نہیں
پہنچی ہے۔ مریم کو یقین تھا کہ شینا ضرور اسکول پہنچ چکی ہوگی۔
اس نے دیکھا ہو گا کہ ذرا تھک کر دیر ہو رہی ہے تو اس نے کسی
بیکسی وغیرہ کے ذریعے اسکول پہنچنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا لیکن
جب اسکول میں یہ بتایا گیا کہ شینا وہاں نہیں آئی ہے تو مریم کو
صحیح معنوں میں پریشانی ہوئی اور اس نے مجھے فون کر کے
بولو لیا۔ اس وقت کے بعد سے اب تک میں مسلسل شینا کو
تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نہیں ہے کچھ بھی پتا
نہیں چل رہا۔ سچو ابرار نے اسے پوری تفصیلات سے آگاہ
کر دیا۔

بہت ضروری محسوس ہو رہا تھا وہ جس لڑکی کا باپ وہی آدمی
 تھا، جانا آتی تھی اور وہ ادا کیا، اسے ہوں اس کی تلاش میں
 کون سی کسر باقی رہے ہوگی... یہ بات وہ خود بھی خوب
 سمجھتا تھا۔

یہاں سے غیب لگتا ہے لیکن وہ چپ چاپ ان قول کو
تیار کرنا ہوا کچھ ہی تھی۔ مگر انی اور تیار کرنے م سے بچانی
جانے ان قیول ہتیا اس آہنی میں اسکی مداف کرتے ہوئے
تیار ہو رہی تھیں۔ قیول نے غوب پڑ لکھے اور چنگ دار دور
مرد سے فک کے پڑے پکڑے تھے۔ ان کے جسم کے پڑے
پہننے کا ایک ہی سب تھا کہ لوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے۔
وہ وہ اپنے اس مقصد کے حصے کے لیے ہر جہاد و انتظام کرتی
تھیں یا شاید کرتے تھے۔ اسے وہ کچھ نہیں آتا تھا کہ ان
کے لیے کون سا سیدہ استعمال کیا جائے۔ وہ معاشرے کے
سے تیسرے طبقے سے تعلق رکھنے والی معتدل تھیں جنہیں اللہ
نے مرد یا عورت کی واضح پہچان عطا کرنے کے بجائے ایک
میانہ سی حالت میں پیدا کر دی تھی۔ وہ بڑا دور ب اس تیسرے طبقے
سے تعلق رکھنے والے وہ افراد بن چکی تھیں کے مقصد پر حیران
بیان زندگی کی کاوی کو سمجھنے کے لیے اپنی ذات کو تیار کرنا
پہچرتے تھے۔ صرف جس کا صیانت ہو سکے کے باعث وہ
خامی صحت مند یا تھوڑے عیال سے سلامت، عقل و شعور
تھے کے باوجود معاشرے میں ایک معتدل عورت کے طور پر
گی گزرا نے پر مجبور تھے۔ انکے شو افراد کے درمیان
بنے کا حق حاصل تھا، نہ تعلیم و نہ حاصل کرنے کا قدرت کی
صالح کامنے کے سپرد تھے، استوں پر چلنے کا۔ وہ سارے
ن جو بہ طور انسان انھیں حاصل تھے، معاشرے نے

سے ٹیک لگائے اپنی جگہ بھی رہی۔

”جتنے اٹھ جانا، کیوں غرے سوچ رہے ہیں آج تجھے؟“
خواتونہ ہمیں بھی دیر کروائے گی۔ انھی خاموشی شام پر کبھی
ہے۔ میں نے سچے راقولہ کر دوشادی والے گھر تیار کیے
تھے۔ اس تیار ہو کر سیدھے ہیں جانا ہے مگر تو تیار ہو۔
رائی اسے ٹھیکر سنا ہے تو خود اساتھ جلا کر بولی۔

”شہزادی کو بے کرے دو۔ آج میرے ساتھ رہے گی۔“
اس سے قبل کہ شہزادی ان لوگوں کے اصراء پر اپنی جگہ چھوڑ کر
تیار ہونے کے لیے اٹھی، مگر سے میں ایک آواز گونگی۔ یہ آواز
ان سب کے گرد لاس کی تھی۔

”لے جانے دیں، مگر جی شہزادی کو ہمیں اپنے
ساتھ۔ آج ہر جی کاٹی کا چائس ہے۔ شہزادی ساتھ ہوئی تو
زیادہ پیسے میں کیے۔“ رائی نے ٹھیک مقررہ مانگی کی۔

”کیوں؟ تو اپنا سارا بھرت بھول گئی ہے کیا جو لوگوں نے
تجھے رنوٹ نچھاؤ کر کے پھوڑ دیے ہیں؟ اگر ایسی بات سے تو
میں تجھے اپنے ذمے سے چٹا کر لی ہوں۔ تیری جگہ کوئی اور
آجائے گا۔“ مگر وہ فوراً اسے بھڑاوا۔

”ایسی کوئی بات نہیں کرو جی، رائی میں ابھی بڑا دم باقی
ہے۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ شہزادی بڑا اچھا ذمہ
بھاتی ہے۔ اس کے ذمہ کی قیاد پر میں دلی سے ہنسی
ہوں۔“ رائی نے جلدی سے اپنی منافی پیش کی۔

”کوئی بات نہیں، آج جگہ ذمہ لے جائے گی۔ پہلے بھی
تو یہی بھاتی رہی ہے اور تم لوگ اسی کے ذمہ پر تاج کا کر
کاٹی رہی ہو۔ آج شہزادی سے مجھے کام ہے اس لیے اسے
روک رہی ہوں۔ اگر تم کچھ کم بھی کا کر لائی تو میں ہر گز
کہوں گی۔“ مگر وہ گویا سادہ مستعد ہی مل کر دیا پھر شہزادی
سے مخاطب ہوئے ہوئے بولا۔ ”تو تیار ہو جا۔ آج تجھے
میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے۔“ حکم صادر کرنے کے بعد
اس نے گھر سے تیز رفتاری سے رخصت نہیں کی تھی۔

شہزادی کو گروہ سے سخت نفرت تھی اور اس کا دس نہیں
چلا جاتا تھا کہ اس کا کوئی حکم مانے عمران بے ضرر و جہدوں کے
درمیان گروہ کی حیثیت ایک ظالم نگران کی تھی جو اپنے حکم سے
ذمہ داری سر تابی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی یہاں آمد
کے ابتدائی عرصے میں گروہ کے بڑے مظلوم سب سے کبھی اس
لیے اب بھی دل نہ چاہتے ہوئے اس کے حکم پر عمل کرنے کے
لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نگار نے اس کی تیاری میں مدد دی۔ اس
نے اپنے میں اپنا جائزہ لیا۔ نگار کے کیے ٹیک اپ نے اسے
بالکل بدل کر رکھ دیا تھا اور آج کے میں نظر آتا تھا اسے اپنے

صرف اس وجہ سے ان سے جھجھکے تھے کہ قدرت نے
انہیں ایک واضح شافقت دینے کے بجائے آزمائش بنا کر دیا
میں اتارا تھا۔ وہ تیسرا طبقہ معاشرے کے ان افراد کے لیے
جو ہر طرح سے مکمل تھے، ایک آزمائش ہی تو تھا لیکن
معاشرے نے ان سے جو سلوک روا رکھا تھا، اس سے صاف
ظاہر تھا کہ مجموعی طور پر پورا معاشرہ اس آزمائش میں ناکام ہو
چکا ہے۔ انہیں معاشرے سے دیکھتا تھا تو وہ تنہیکر اور
بھٹکے تھے۔ لوگ انہیں روزگار کے مواقع دینے کو ضرور مستعد نہیں
ہوتے لیکن چند نئے بھیک میں دینے کے بعد خود کو ترخ رو
کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں بھی بددینی اور
درومندی کے احساس کے ساتھ بھیک دینے والے کم ہی
تھے۔ زیادہ تر توان کی بھونڈی آوازوں، بے لوجج جسموں کی
حرکت، تالیوں کی پاپت اور ذمہ کی دھچکاؤں سے تیار
کر دے بے ہودہ ٹماٹے سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہی
نوازتے تھے۔ ایک مختصر تعداد ان خوش فہم مزا جوں کی بھی تھی
جنہیں وارمیش دینے کے لیے یہی آدھے اور دھڑلے، معاشیہ
ہی بھاتے تھے۔ اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر آواز
احتجاج بلند کرنے کے بجائے اس تیسرے طبقے کے زیادہ تر
افراد نے معاشرے کے آگے سر ڈال دینا ہی مناسب سمجھا تھا
اور اپنی ایک الگ دنیا بنا کر مارا در و دل میں پھنسے ہی
خوش رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے ساتھ اس ٹھک و
تار یک گھر میں موجود افراد بھی ایسے ہی تھے جن کے ماں
باپ نے تو انہیں جانے کیا نام دیے تھے لیکن وہ خود کو ملکہ
رائی، نگار، کہلا کر خوش ہوتے تھے۔ اسے بھی یہاں شہزادی کے
عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ ایسی شہزادی کے عہدے پر جس
کے پاس کوئی اختیار و بکولت نہیں تھی اور وہ ان کے ساتھ جا کر
ذمہ داری سنبھالے، جب کہیں جا کر وہ چندہ دیے ہاتھ آتے تھے
جن کے سہارے زندگی کی گاڑی کو کھینچا جاتے۔

”اسے شہزادی اتو کھا کا پلوں کی طرح بھی مت ٹھک رہی
ہے۔ اٹھ کر تیار کیوں نہیں ہوتی؟“ اسے بہت دیر سے اسی
طرح بیٹھے دیکھ کر ملکہ نے اسے ٹوکا۔ وہ خود آکھینے کے سامنے
کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ اپنی گردن سے ذرا نیچے ٹک آئے
بالوں میں اس نے ٹکی بالوں کی چٹیا گونگنی تھی اور اب اس
چٹیا میں ذرا دار سنہری رنگ کا پراگندہ ڈال رہی تھی۔

”ہاں ہاں، جلدی اٹھ جا۔ دیکھ آج میں نے تیرے
لیے یہ سرخ رنگ کا جوڑا نکالا ہے۔ تو جلدی سے اٹھ کر
کپڑے بدل لے پھر میرے تیرا ایک آپ بھی کرنا ہوگا۔“ رائی
نے بھی ملکہ کا ساتھ دیتے ہوئے اسے ٹوکا مگر وہ کوئی دیوار

تجائے کسی اور کا محسوس ہو رہا تھا۔
 ”ہاں ابھی شہزادی ایتھار ہوئی تو؟“ ابھی وہ آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی کہ گردن پھینکے سے آکر پوچھا۔ اس نے محض اثبات میں سر ہلایا کہ اس کی بات کا جواب دیا۔
 ”چل تو پھر کل نہیں۔ ہمارا انتظار ہو رہا ہو گا۔“ گردن نے کہا تو اس کے چپے ہل پڑی تھیں۔ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ انہیں کہاں جانا ہے اور کون ان کا انتظار کر رہا ہے؟ اس کا یہی خیال تھا کہ گردن کی اسے کسی خوشی کے گھر میں کمانے کی خیال سے لے جا رہا ہے۔ ویسے یہ بات کچھ غلط فہمی کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ گردن کو تو پتہ تھا کہ وہ جاتا ہے وہاں کی معمولی داری اس کے سر پر نہیں تھی۔ ہاں اگر کہیں کوئی بڑا فتنش ہو رہا ہو تو وہ خود اپنی جگہ کے ساتھ گھرائی کے لیے ضرور جاتا تھا۔ آج نہ جانے اسے کہاں جانا تھا کہ اس نے باقی گھر کو ساتھ لے کر ضروری کتبیں سمجھا تھا۔ دل ہی دل میں ابھی وہ گردن کے پیچھے چلتی رہی۔ چکی تکی گھول میں سے گردن کے جہاں تک جگہ گھنٹی کے آہٹ سے تھے وہ دونوں مل جل کر بیٹھتے۔ یہ جگہ میں رو تو تھیں تھیں لیکن یہاں سے رکشا اور کسی وغیرہ آسانی سے مل جاتے تھے۔ اس وقت بھی گردن نے ہاتھ دے کر ایک خالی کرسی کو روکا۔

”کہہ رہا ہے سو بیڑیوں؟“ ان کے قریب رکنے کے بعد جیسی والے نے تعنی تیری سے پوچھا۔ یقیناً ان ابھی سواریوں کو دیکھ کر اسے تفریح ہو رہی تھی۔
 ”تم چلو تو کسی جگہ کا گھمبیاں ہیں گے۔“ گردن نے اس کے لہجے کی پروا نہ کرتے ہوئے خود ہی گھنٹی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھنے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا اور نرمی سے کھڑی شہزادی کو جیسی کی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت وہ عمر کے جس بچے میں تھا اسے اس طرح کے رویے سب سے کتنی عادت ہو چکی تھی کہ وہ ان رویوں کو کسی خاطر میں لانا غیر ضروری سمجھتا تھا۔

”اب تو بتاؤ کہ کہاں جانا ہے یا میں خود ہی اپنی مرضی سے کہیں سے چلوں؟“ جیسی میں رو دھمپتی ہوئی ڈرا بیڑی نے ایک بار پھر شونی سے پوچھا۔
 ”انڈل باؤن چلو۔“ گردن نے جواب دیا۔
 ”اوہو لوگن ہے کسی اور جگہ پروگرام ہے آج۔“ جب ہی بڑے بڑے سے بات کر رہی ہو۔ گردن کے لہجے کی مسلسل بے نیازی کو محسوس کرتے ہوئے ڈرا بیڑی نے اسے نہ بچھا۔
 ”امارے اسے اپنی جگہ پر پروگرام کرنے سے نہیں کیا فرق پڑتا ہے انم اپنا منہ نہ کر کے بیٹھو۔ جب ہم تہادی کسی

سے اتریں تو اس وقت اپنا منہ کھولیں۔ تمہیں تمہارا منہ دکھ کر ایل جانے گا۔“ گردن نے اس بار بھی اس کی بات کا جواب دیا لیکن وہ کافی ذہین انسان تھا۔
 وہ قہر مار کر بیٹھنے لگا پھر جبکہ وہ سرد میں شہزادی کی طرف دیکھ کر اسے اٹھارتے ہوئے ہوا۔ ”گناہ ہے تیرا گردن تیرا سودا کر کے جا رہا ہے۔ جب ہی اتنا مفرد ہو رہا ہے۔ ہاں جی، آج کل تو تہادی قوم کے کسی بڑے دام پڑے ہوئے ہیں اور تو تو بے بھی نہ درست مال۔“ اس کی یہ بے جا نہ باتیں سن کر شہزادی نے جواب تو گوی نہیں دیا لیکن منہ بصر کر گھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسی وقت ان کی جیسی کے قریب سے ایک گاڑی گزری۔ گاڑی کی جھلکی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ اس کے لیے مشابہ تھا لیکن اس سے کچھ کہ وہ شاسا چہرے والے اس شخص کو آواز دیتی، گاڑی۔ جیسی کو اور دیکھ کر مٹی ہوئی آگے نکل چکی تھی۔ دوسری طرف یہاں جیسی میں بھی صورت حال بدل چکی تھی۔ گردن کے لیے جیسی ڈرا بیڑی کا رویہ قابل برداشت ہو چکا تھا اور وہ جہاں سے غصے میں اسے دیکھ کر روکنے کا حکم دے رہا تھا۔

”اتنا غصہ ابھی بات نہیں۔ غصہ کرنے سے بچ رہے۔“ جبریل پڑ جاتی ہیں۔ تم تو پہلے ہی ابھی غصے کی آگ لگی ہو۔ ایسا نہ کہ کوئی زیادہ مجھ میں پڑ جائیں کہ یہ سہی پڑا رہی نہ ابھی بے کار جانے۔“ وہ بیڑی ان سے منہ کی منہ میں تھا اس لیے گردن کے غصے کو خاطر میں نہیں لارہا تھا لیکن گردن کی ولی معمولی شے نہیں۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ اپنے بھتہ سے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے رکھنے کے باوجود اس میں عورتوں والی کمزوری کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ چنانچہ پیچھے سے ہاتھ ڈال کر جیسی ڈرا بیڑی گردن کو اپنی تخت اور سردی انگلیوں کی گشت میں لے کر بھاگتا ہوا جیتے ہوئے تھکا نہ لے گیا۔

”گشت سے گاڑی روک دے۔“ گردن اپنی جان کی پروا کیے بغیر میں تیرا گھوٹ روک دی۔“ فرمستوں میں مسروق ڈرا بیڑی کو انگلیوں کی گشت اور ہاتھ کی گشت نے سمجھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ دہی پہنا سکتا ہے اس لیے مزید اپنی میل و جہت کے کسی روک دی۔
 ”تو اس لائق تو نہیں کہ تجھے کچھ دیا جائے۔“ گردن میں تھے یہاں تک کہ گردن سے ہی اپنی ہواں۔ جیسی رکنے کے بعد گردن نے فوراً اٹھ اترتے ہوئے ڈرا بیڑی سے کہا اور حڑ سے گھڑے اپنے بڑے سے پس کو نکل کر اس میں سے لڑائے کے پیچھے ڈھولنے لگا۔ شہزادی ابھی تک حیران پریشان کی

جیسی میں بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن اس صورت حال کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔
 ”اے شہزادی! اتر بیٹھ۔ کیا اس منظرے کے ساتھ جانے کا ارادہ ہے؟“ اسے وہی بیڑی دیکھ کر گردن سے ڈرا بیڑی نے اسے لاک کھول کر اپنی طرف کا دروازہ کھولا لیکن ابھی بچے اتر نہیں آئی تھی کہ ڈرا بیڑی نے اپنی جگہ بیٹھنے بیٹھنے کی طرف جھک کر تیزی سے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ شہزادی کے ملنے سے ایک تہ دروازہ کھلی۔ اس کا درمیان میں رکھا ہوا ہاتھ دروازہ بند کرنے کی وجہ سے بری طرح چل گیا۔ ڈرا بیڑی جو بیٹھنا دروازہ بند کرنے کے بعد اس سمیت جیسی کو بھاگنے جانے کا ارادہ کر رہا تھا، اس بچے پر ذرا سا ہلکا گیا۔ گردن کے لیے ڈرا بیڑی سا وقت ہی کافی تھا۔ اس نے ڈرا بیڑی کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور دونوں ہاتھوں سے بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ اتنی تیزی سے چل رہے تھے کہ ڈرا بیڑی چاہتا ہی نہیں کہیں کر پار ہاں تھا۔ ان کے قریب سے گزرتے والی گاڑیاں اور ابرو گردن موجود لوگ اس منظرے کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ جیسی ڈرا بیڑی کے ایک بیڑی سے کے ہاتھوں بیٹھنے کا نظارہ کرنے سے لڑاؤ دلچسپ کام بھلا اور کون سا ہو سکتا تھا۔

”میں بیٹھتا ہوں مگر تجھے پتہ نہیں ہے گردن اس سے غصہ خوب آتا ہے۔“ جس نے ڈرا بیڑی کی پانوں کی۔ جیسی ڈرا بیڑی کو مارنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی گشت آواز تھا اس سے بولتا ہی جہاں تھا۔

”چھوڑ دو دھمکیاں۔ اسے جانے دو۔“ دیکھو تہادی سماجی کے ہاتھ سے کتنا خون نکل رہا ہے۔ پہلے اسے دیکھو۔“ آخر ایک کچھ دار بڑے میاں سے آگے بڑھ کر مداخلت کی اور ڈرا بیڑی کی جان چھڑاتے ہوئے گردن کو شہزادی کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے ہاتھ سے وہ اپنی بہت خون نکل رہا تھا اور تکیف کی شدت سے چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کا حال دیکھتے ہوئے گردن نے ڈرا بیڑی کو ایک دور جا کر ٹھکر کر دیا اور پھر اس کی طرف لپکا۔ اپنے دوپٹے کو اس کے ہاتھ کے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور ایک دوسری جیسی ہاتھ کر اس میں سوار ہو گیا۔ جیسی والا بیڑی وچانچہ اور اپنے کام سے کام رہنے والا تھا۔ اس نے نہ تو ان دونوں کو کھڑکھڑا کر دیکھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اسے سیدھے حواالت کر کے دروازہ کھول دیا۔ جس خاموشی سے انہیں ماڈل ناؤن کی اس جالی کی کوئی تک پہنچا دیا آخر کار گردن نے بتایا تھا۔ انہیں لہلہا پہنچانے کے بعد وہ اپنا گریہ معمول کر کے روانہ ہوا۔

گردن نے کوئی کے دروازے کے ساتھ کھینچی کا چین دیا یا تو خورانی دروازہ کھل گیا۔
 ”کیا ہوا اہاں؟“ بیٹی زخمی کیسے ہوئی؟“ کیٹ کھولنے والے نے جو ابھی بیٹھا تھا، شہزادی کے ہاتھ سے ہتھتے ہوئے خون کو دیکھ کر فوراً پوچھا۔

”میں ایک غیبت آدمی تھا جیسا تھا اس کی وجہ سے یہ مصیبت آگئی۔“ گردن کو شہزادی کے زخمی ہونے پر بڑا بچہ دم تھا چنانچہ اس طرح دانت کھپاتے ہوئے بتا بیٹھے اس جیسی ڈرا بیڑی کو اپنے انڈل باؤن تلے میں رہا ہو۔

”تم اسے لے کر اندر چلو تاکہ اس کی مرہم پیٹی کی جا سکے۔“ اس کے مشورے پر گردن نے عمل کیا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر گردن نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کے ہاتھ پر بندھا ہوا دوپٹا کھولنے لگا۔ دوپٹا کھینچ کر ایک ہاتھ خون کا خارج شروع ہو گیا لیکن اس دوران انہیں یہاں بیٹھے والا فرست ایڈ بکس سے کر گیا تھا۔ اس نے اور گردن نے شہزادی کے زخمی ہاتھ کی مرہم پیٹی کی۔ اس کام سے ڈرا بیڑی کو وہ لوگ سامان سمیت گردن کو اہل فرست ایڈ بکس میں رکھ رہے تھے کہ ایک لہا پوڑا اور بیڑی پھرا کر اسے میں داخل ہوا۔

”نستے مہاراجہ کی؟“ گردن کام سپہ سالار گردن کی قدم لاری کے لیے پہنچا۔ صوفے کی پشت سے گردن کی شہزادی نے ہاتھ پکڑ کر کوئی طرف دیکھا۔

”بھئی۔۔۔ میں نے پیٹے ہی سنا کہ اہاں پہنچ گئی ہے، میں فوراً تجھ سے ملنے چلی آئی۔“ گردن کے ہاتھ پھیرتے ہوئے مہاراجہ نے کہا اور پھر شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ شہزادی ہے نا۔ جس کا تو نے مجھے سے ڈر لیا تھا؟“
 ”ہاں مہاراجہ کی دیکھ رہی تھی۔“ ایک ہاتھ جیسی ڈرا بیڑی وہ سے یہاں آتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ رہی ہو گیا۔ ”گردن اہاں اپنے مہاراجہ کو سارا قصہ انہیں سے سناتے لگا۔ یہ سب سناتے ہوئے اس کے لہجے میں ڈرا بیڑی اور غصہ تھا۔ وہ شہزادی کو کھیرت میں دھکا کر رہا تھا۔ اس نے گردن کو ہاتھ پر قبضہ کرتے ہوئے ہی دیکھا تھا اب اسے ڈر ہی ہوئے اس کے ہاتھ پر قبضہ اور غصہ نہ کہ ہونے کی وجہ سے جیسی نہیں آ رہی تھی۔

”پہل جانے دے۔“ غصہ تو کھٹک دے۔ گردن تھا ہو گیا۔ مہاراجہ نے ساری بات سننے کے بعد اہاں کو پچھار اور فرست ایڈ بکس اٹھا کر باہر جاتے ہوئے اپنے دوسرے پیٹھ کی طرف اشارہ کیے ہوئے بولا۔
 ”جیسی! اسے اپنا لہا پوڑا دے۔ میں کچھ کھول کر لے آؤں گی تو

پہلی کی حرکت تھی پہلی پرچی ہے۔ گھوڑوں والا دودھ پی کر اس میں ذرا جان شان آجائے گی۔

”ابھی لائی مہارو جی۔“ سوئی کے نام سے پکارا جائے والا ڈنڈا بھرتی سے کمرے سے باہر نکلا۔

”اب تو اس کی طرف سے بے فکر ہو جا مال اس کو“ اس کا خیال رکھنے کی۔ تو چل کر دوسرے کام دیکھ۔ تیری شہزادی آج رات اس کمرے میں مہمان بن کر رہے گی۔ سوچے وہاں جاتے ہوئے تو اسے اپنے ساتھ لے جانا۔“

مہارو مالک کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا تو تھوڑی ہی دیر بعد سوئی دودھ کے گلاس کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ شہزادی نے اس کے ہاتھ سے دودھ لے کر پی لیا۔ دودھ پیئے سے اسے خاصی تھوکت محسوس ہوئی۔

”تم اسی صوفے پر آرام سے لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہارے لیے کھانا لے آؤں گی۔ کھانا کھا کر آرام سے سو جانا۔“ سوئی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شہزادی کو محسوس ہوا کہ اس نے باہر سے دروازے کی لکڑی بھی لگا دی ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے اس بات کی تصدیق کی۔ واقعی دروازہ باہر سے بند تھا اور وہ اسے کھول کر دیکھیں نظر نہ آتی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ایسا کر کے اشارے پر کیا گیا ہو گا۔ گروگواس کے فرار ہونے کا خبر تو بہر حال لگائی رہتا تھا اس لیے وہ اسی جگہ صوفے پر احتیاط کر کے بیٹھ چکی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی جب بھی وہ باہر نکلتی تھی تو کلمہ رانی اور نگار اس پر خصوصی نظر رکھتی تھیں۔ وہ ان سب کے لیے ہی ناقابل اعتبار تھیں جسے وہ اپنی نظروں کے پیروں میں رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی اس کے فرار کی راہ مسدود تھی چنانچہ وہ واپس موٹے پر قابو تھی اور پھر سوئی کے مشورے کے مطابق اسی پر لیٹ کر آرام کرنے لگی۔

لیٹے لیٹے اس پر بھی سی ٹیوڈی بھانے لگی لیکن اس ٹیوڈی کے عالم میں بھی وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس کمرے سے باہر اچھی خاصی پھیل چکا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ میں بہت سارے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ شاید وہاں کوئی دعوت تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ گروگواس اسے یہاں لانے کے بعد بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اگر وہ اسے کسی دعوت میں شرکت کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا تو اسے اس طرح ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا کہ اب اس کی کچھ بات نہ آتی تھی۔ سوئی کو بھی ناقابل حالت میں سوچوں کے درمیان نظر پڑا ایک گھنٹہ گزار دیا اور اسے دروازے پر آ رست تھاق دی۔ آہستہ کی آواز پر وہ چونک کر اٹھی۔ سوئی نے

اٹھائے کمرے میں آ رہی تھی۔ ٹھہرے لاکر اس نے سبز پردہ کی اور بولی۔

”یہ تمہارا کھانا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد برتن ایسے ہی رہنے دینا اور خود آرام سے سو جانا۔ میں بعد میں آ کر برتن لے کر جاؤں گی۔“ اس کمرے کے ساتھ ایک بیچہ ہاتھ روم بھی ہے۔ یہیں اپنی کی ضرورت کے لیے باہر نہیں نکالنا پڑے گا۔ پانی بھی میں اس وقت میں بھر کر لے آئی ہوں۔ صرف ہاتھ دھو پانی سے بہت دیر تک ٹھنڈا رہے گا۔“

اسے یہ ساری باتیں بتا کر وہ نکلت چکی تھی۔ اسے باہر نکل گئی اور صوبہ سابق دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ سوئی کے جانے کے بعد اس نے ٹرے میں موجود کچے کھانے کا چکر لگایا۔ لیکن بریانی، مٹن کرکڑی اور فرفری پر مشتمل اس کھانے کے ساتھ سلا اور رات کے کا بھی اہتمام تھا۔ کھانا دیکھ کر اسے حیرت یقین ہو گیا کہ کونسی کونسی دعوت ہو رہی ہے۔ تاہم اچھا صاف ہو چکا تھا اور اسے بھوک بھی لگ رہی تھی چنانچہ اٹھ کر غسل خانے میں گئی اور نہ ہاتھ دھو کر تے کے بعد کھانا کھا کر اسے ایک باہر پھر ہاتھ دھوئے غسل خانے گئی۔ اس وقت اس نے بہت دیر ہاتھ روم کا جائزہ لیا۔ قید و بند والے اس ہاتھ روم میں صرف پانی کی ایک بائو رہی ہوئی تھی لیکن اس کی توجہ دھار کر دیا اور وہ دودھ روغن اور مٹن جس میں کوئی سلانہ اور دھنیں لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ روغن دان زیادہ بڑا نہیں تھا تاہم اسے امیہ کی کرا کر وہ کسی طرح اس روغن دان تک پہنچ گئی تو اسے دھپے پٹے وجود کو اس میں سے لڑا کر باہر نکلتی ہے۔ فرار کا ایک امکان نظر آنے کے بعد اس کا دل زبردست دھڑکنے لگا۔ دھڑکنے دل کے ساتھ وہ ہاتھ روم سے باہر نکلی اور کمرے کے دروازے سے کان لگا کر باہر کی کن کن سننے لگی۔ اس وقت باہر بالکل سناٹا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کونجی میں اس کے سوا دوسرا کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ کچھ دیر مزید کن کن سننے کے بعد وہ واپس ہاتھ روم چلی۔ روغن دان کی صورت میں نظر آتے والے فرار کا راستہ اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ وہ روغن دان تک رسائی کا تھا۔ اس کے بعد بھی کچھ مہم تھا کہ اس روغن دان کی دوری طرف کیا جائے وہاں سے کونے کی کوشش میں وہ کسی کی نظر میں نہ آسکتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی مشکلات مزید بڑھ جاتیں۔ گروگواس کا نظم اس نے صرف دیکھا ہی نہیں، سنا بھی تھا اس سے پکارا جاتے سے سے حد خوف زدہ ہو چکی تھی پھر آزادی کی خواہش بر خوف چ غالب آئی اور اس نے ایک

کوشش کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے روغن دان تک پہنچنے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ روغن دان فلیش ٹیپلی کے ہیں اور یہ تمام یعنی وہ فلیش ٹیپ پر چڑھ کر اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن فلیش ٹیپ سے روغن دان کا فاصلہ جتنے ہوئے اسے یہ کام مشکل لگ رہا تھا مگر وہ کوشش کیے بغیر باتیں نہ کرنا چاہتی تھی، چنانچہ مٹن کے لیے تیار ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے غسل خانے میں موجود پانی کو الٹ کر کھانچا جس پر پھر کھار فلیش ٹیپ پر چڑھ گئی۔ اس مختصر سی جگہ پر کھڑا ہوتا آسان نہیں تھا۔ دوسرے یہ فزجی تھا کہ فلیش ٹیپ اس کا وزن سہارنے سے اٹھار کے زمین پوس نہ ہو جائے لیکن خیر گردی اور ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ٹیپ کی راج پر بہت احتیاط سے چڑھ جاتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ کھنکھرتا آہستہ آہستہ بلند کیے۔ جلد اس کی انگلیوں نے روغن دان کے چوکھٹے کو چھو لیا۔ انگلیاں جو کھینچے سے۔ چھوئیں تو اس کا تھوڑا سا ہاتھ اٹھ گیا اور اس نے ہاتھوں کی طرف ہل کر کھنکھرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

اب اس کے پاس روغن دان تک پہنچنے کی واحد صورت یہی تھی کہ اپنے بازوؤں کی قوت کو آزمائے اور اچھل کر روغن دان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے یہی کیا۔ اس کی یہ پہلی کوشش بالکل بزدلی طور پر ہی کامیاب ہو گئی۔ اس کا جسم ذرا سا اوپر اٹھا لیکن وہ اتنا اپنے جسم کو اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ روغن دان تک پہنچ جائے۔ اب اس کی ہمت ٹھنک چکی تھی اس کی کمرہ روغن دان کی چوکھٹ سے لٹکی تھی اور اس کے پیر سیٹ دیوار پر چھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے اپنی مٹن مندی ضروری تھی کہ اپنی بیڑیوں کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ پیروں میں بیٹھ لیکن نہ ہونے کی وجہ سے اسے بیڑیوں کو زور دیا اور کھار دیا لیٹے میں کافی مدد مل رہی تھی۔ کچھ لمحوں میں روغن دان پر چڑھنے کی ممکن ہو گئی تھی کہ وہ اس سخت جدوجہد سے تھک گیا۔ طرح خرخر کر رہی تھی۔ اگر سیٹ دیوار کے بجائے یہ کوئی درخت ہوتا تو وہ اب تک اس کی چوٹی پر چل چلی ہوئی لیکن... فٹال طور روغن دان تک پہنچنے میں ناکامی ہو گئی تھی۔ جسم کو اچھال کر اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کا سارا جسم پٹے میں پڑ گیا تھا۔ آخر کار اس کی یہ محنت رنگ آئی اور وہ روغن دان

تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہاں کچھ کراس نے پھولے ہوئے سانپ کے ساتھ دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ اس حصے میں زیادہ روغن نہیں تھا۔ یہاں یہاں کچھ کراس کے باہر کھینچے بلکہ کوئی اندرونی حصہ ہے۔ بہر حال اس حصے تک پہنچ جانے میں بھی اس بات کا امکان تھا کہ اسے پھانسی کا موتی مل جائے گا۔ سراسر دوسرے کرینے کے بعد اس نے دوسری طرف اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس منصوبہ کے لیے ایک دم پھلجھٹ لگنے کے بجائے اس نے ابھی ترکیب استعمال کی جو روغن دان پر چڑھنے کے لیے استعمال کی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ روغن دان کی چوکھٹ پر ہار کر وہ اس سے ٹک چکی اور پھر آہستہ سے اپنے ہاتھ چھوڑ دیے۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ ٹیپ کی طرح نیچوں کے مٹن و مٹن پر گرنے کا چوٹ نہ آئے لیکن ظاہر ہے اسے اس کی محنتیں بھی اس کے وہیں سے زمین پر آ رہی۔ خوش قسمتی سے اس طرف وہ چڑھ نہیں چھا ہوا تھا اس لیے اسے زیادہ ہوش نہیں آئی۔ بہر حال قوت یہاں تک پہنچ جانے کا دل میں شکرت کرتے ہوئے اس نے اور گروگواس کا جائزہ لیا۔ یہ لاؤنج نما کھلے ہاتھ چھو لیا یہی کر سکیاں اور ہیرہ کمرہ بھی نہیں۔ سناٹا اور عیس جہاں کے باوجود وہ بعد احتیاط سے دیوار کے ساتھ لگ کر اس کی طرف دیکھی تاکہ کھم کراس سامنے جا لے اسے اس کی طرف آئے جہاں اس کمرے کا دروازہ تھا جس میں آجھوڑی اور پہلے قید تھی۔ اس سے بھی پہنچ کر اسے کوشش سے باہر جانے کا راستہ اچھونڈنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھنکھرتی محسوس کی جب وہ اس مقام تک پہنچی جہاں دیوار ختم ہو رہی تھی تو ایک دم سامنے جانے کے بجائے اس نے احتیاطاً ذرا سا سر نکال کر دیکھا اور فوراً پیچھے کر لیا۔ وہاں اسے سوئی کے علاوہ دو تین افراد اور نظر آئے لیکن ان میں سے کسی کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ اس نے محنت کر کے ایک بار پھر دیکھا۔ وہ سب اٹھاتے سے بے نیاز ایک ایک جگہ جگہ میں مصروف تھے کہ ان کے اس کی طرف متوجہ ہونے کا امکان بھی نہیں تھا۔ وہ ان پریٹن ہی اس منظر کو دیکھتی رہی اور پھر ان کے دائیں طرف چلنے کے بعد خود بھی وہ قدموں سے اس طرف چلی چلی۔ جس اور جگہ سے اسے فی الوقت اپنے فرار کا خیال بھلا دیا تھا۔

شہر سے باہر جانے والے راستوں کی ناکابندی کر دی گئی ہے۔ لڑکیوں کے بڑھاپے میں انہوں کو تمام گھر، بھون کو کھنگالا جا چکا ہے۔ پولیس کے بڑے شہر میں سرگرم تمام جرائم پیشہ گروہوں کی سرگرمیوں کے بارے میں پھانسیاں بچھ کر رکھے ہیں لیکن کہیں سے بھی ایک معمولی سا کیونجیک نہیں ملا۔ "سجاد رانا کے ذرا لگ دم میں اس وقت دو چار افراد جمع تھے جن کا ہینا سے بے حد قریبی رشتہ تھا۔ وہ چاروں ہی ملک کے باغیادار افراد میں شمار ہوتے تھے لیکن اس وقت چاروں ہی بڑے بے بس نظر آ رہے تھے۔

"میرے لیے تو حرم کو نہیں کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے دیکھتے تھی وہ ہینا کے بارے میں سوال کرنا شروع کر دیتی ہے کہ پاپا، ہینا کا کچھ بتا چلا اور میں شرمندہ ہو جاتا ہوں کہ آنٹی بچی بچا بھونے کے باوجود اتنا بے بس ہوں کہ اپنی نوادی کے بارے میں اب تک کچھ بھی معلوم نہیں کر سکا۔" مختار مراد کے چہرے پر شرمندہ بے بسی تھی۔

"میرے خیال میں کسی عام جرائم پیشہ گروہ کا کام ہے بھی نہیں۔ ذرا تیر کو آپ لوگ اچھی طرح کوکھال چکے ہیں۔ تحقیقات کا ہر طریقہ آزمائے کے باوجود وہ اپنے پہلے بیان پر قائم ہے۔ معلومات کروانے پر اس کی تمام باتوں کی تصدیق بھی ہو چکی ہے اس لیے یہ سوچنا تو بے کار ہے کہ کسی نے اس سے ساتھ باز کر کے ہینا کو غائب کیا ہے۔ موجودہ صورت حال میں میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے... ہو سکتا ہے کہ کوئی پہلے سے اس تاک میں لگا ہو کہ موقع ملے اور ہینا کو غائب کر دے۔ اس مقصد کے لیے وہ مسلسل اس کی نگرانی کرتا رہا ہوگا اور کل صبح جب... اسے ہینا ایک سنان جگہ پر تنہا گاڑی میں بیٹھی نظر آئی تو اسے انہو کہ لیا گیا۔" شہر یار نے خیال آرائی کی۔

"ایک شخص نے بہت اچھی طرح گاڑی کا جائزہ لیا ہے۔ انہیں دروازے کے پینڈل پر ہینا کے سوا کسی کی انگوٹھ کے نشانات نہیں ملے بلکہ پوری گاڑی پر کہیں کسی انہی کے فکر پر نہیں ہیں۔ گاڑی میں کسی قسم کی کوئی اہتری بھی نظر نہیں آئی جس سے خیال کیا جا تا کہ ہینا کو کسی نے زبردستی گاڑی سے اتار دیا ہے۔ اس کا پینڈیک، فلاور کے اور ایک کا قبا جو وہ پارٹی کے لیے اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، بالکل جوں کے توں پائے گئے ہیں۔

"کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسی بات ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ سوچ سکیں کہ ہینا کو انہو آتشیں لیا گیا اور وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے؟" سجاد رانا کی بات سن کر اس نے بھی نظروں

سے ایک ہلکا سا سوال کیا۔ وہ رات سے یہاں آیا تھا اور ہینا کی بازیابی کے مسئلے میں کی جانے والی کوششوں میں سب کے ساتھ تھا لیکن کہیں سے ایسا کوئی کیونجیک نہیں مل سکا تھا جس سے یہ گمان کیا جا تا کہ اسے انہو لیا گیا ہے۔ ایسے میں ہینا کے اپنی مرضی سے نہیں چلے جانے والی بات خوب فوری ذہن میں آ رہی تھی۔ لیکن ایک تو وہ خود جانتا تھا کہ ہینا کتنی معصوم طبیعت کی لڑکی ہے، دوسرے ایسے کسی سوال کو زبان پر لانا بہت تکلیف دہ بھی تھا اس لیے اب تک سب نہیں کھول سکا تھا۔ مگر ہر طرف سے ہونے والی مایوسی نے اسے اب یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہینا کو ایسی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ سب ہی کی لادلی ہے اور اس کی ہر بات ہر صورت میں مانی جاتی ہے۔ اگر وہ ہم سے کوئی ناجائز مطالبہ کرتی بھی تو ہم بہت نرمی سے اسے پینڈل کرتے... مختار کی کوئی بات بھی ہی نہیں پھر بھی احتیاطاً اس کے تمام ہلے چلنے والوں، دوستوں اور کلاس فیلوز کو چیک کر دیا جا چکا ہوں۔ وہ سب اس کے بارے میں مکمل طور پر بے خبر ہیں۔" سجاد رانا باپ تھے، چنانچہ یہ سمجھنے کے باوجود کہ وہ خود بھی ہینا سے ایسی وہی کسی حرکت کی توقع نہیں رکھتا ہے، اس کے سوال کے جواب میں رکھائی سے بولے۔

"سوری سجاد بھائی امیر۔ اس سوال کا کوئی ملال مطلب مت سمجھیے گا۔ میں جانتا ہوں کہ انہو ہینا بہت "سوم" اور تیز دار لڑکی ہے۔ میں نے صرف امکانات کا جائزہ لینے کے لیے یہ سوال کیا تھا۔" اس نے فوراً ہی ان سے معذرت کی اور اپنی گفتگو کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ہینا کو غائب ہوئے چھپتے تھے۔ یہ زیادہ کا وقت گزر گیا ہے۔ اگر اس انہو کے پیچھے ایسے افراد ہوتے جو اس کو پرغال بنا کر تروان میں آپ سے، ماموں جان سے یا مختار انکل سے اپنا کوئی مطالبہ منوانا چاہتے تو انہیں اس غرض میں رابطہ کر کے اپنا مطالبہ پیش کر دینا چاہیے تھا۔ اگر اس انہو کے پیچھے کسی بلیک میلنگ کا امکان کم کر دیا جائے تو دوسرا سبب انہو کی کچھ آتا ہے۔ اب ہم سب کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ دھار کوئی سا ایسا دشمن ہے جو ہینا کو انہو کر لے "انہو" تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔"

"ظاہر ہے دشمنوں کی تو ایک طویل فہرست ہے۔ اپنے پورے سیاسی کیریئر میں، میں نے بے شمار دوست اور دشمن بنائے ہیں۔ یہی حال مختار صاحب اور سجاد کا ہے۔ ان کی قیلمہ ہی ایسی ہے جس میں دوست سے زیادہ دشمن بنتے ہیں لیکن

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حد تک دشمنی میں آگے جا گئے والا کون ہو سکتا ہے؟ بہر حال، اس امکان کو ہم نے نظر انداز تو نہیں کیا ہے اور ہمارے ہندے ہمارے مخالفین کی ٹوہ لینے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں سے کوئی معمولی سی بھی بات باطنی تو انہیں معلوم ہو جائے کی لیکن اپنے طور پر مجھے یہ امکان ذرا کمزور ہی لگتا ہے۔ انہو کو بھی ایسی ایسی حرکت کرنے کی طاقت ہو رہی ہے کہ انہو کو اپنے مجرم تک پہنچنے کے تو اس کا اتنا بڑا حال کریں گے کہ کہلوں تک یہ بات یاد رکھی جائے گی۔" ایک بات رانا جواب تک خاموش بیٹھنے لگے، نہایت غصیلن لہجے میں بولے۔ ان کی یہ بات واقعی درست تھی۔ ہینا کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ انہو کی اور وہ خیال، دونوں طرف کے لوگ بے حد با اختیار تھے اس لیے کسی کے لیے بھی اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔

"آپ نور پوریم بلاسٹ والے کیس کو بھی دیکھ رہے تھے انکل! لیکن اس کیس میں تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس کی وجہ سے کوئی آپ کو یاد میں لے کر خاموش رکھنے کی کوشش کرے؟" اسے اپنا تک خیال آیا تو اس نے مختار مراد سے پوچھا۔

"اس کیس کی تحقیقات کے نتیجے میں تمہارے ظاہر کیے ہو کہ ایک تقدیر بن ہو چکی ہے۔ ہمیں ایسے شواہد ملے ہیں جن سے یہ اعزاز ہوا ہے کہ واقعی اللہ آباد سے انہو کیس کے ذریعے مملوک ریفات میں بھیجے گئے ہیں اور اس معاملے میں بڑی ملک کا ہاتھ ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس معاملے میں مجھے دباؤ میں لینے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ یہ بہت پر یول کا معاملہ ہے جسے اگر پھیل کر لیا تو پھر ہر بیان ممکن کے یول پر ہی جا کر بات ہوگی۔" انہو نے اس بات کا جواب دیا پھر چپے اچانک کچھ یاد جانے پر چونک کر بولے۔

"ایک اہم بات تو میں تمہیں بتانا چاہوں ہی گیا تھا۔ تم نے پیر آباد کی مسجد سے مولوی غلام محمد کے جو فکر پرش انہو لے گئے تھے وہ اللہ آباد کے مدرسے سے ملنے والے فکر پرش سے تھے جو گئے ہیں... اب دوسرے مدرسے کے فکر پرش کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ملے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہادی غلام محمد بھی شاہنواز کا ہی ساتھی تھا اور اسی دشمن پر کام کر رہا تھا جس پر شاہنواز انہو۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ پیر آباد سے غلام محمد کے نائب ہونے کے بعد جب ہم نے اس کے بارے میں تحقیقات کروائی تھیں تو انہو کی بھی پتا چلا تھا کہ وہ اور کرد کے کسی گاؤں تک گیا ہے لیکن گاؤں کا نام واضح طور پر سامنے نہیں آیا تھا۔ اب کچھ آ رہا ہے

کہ وہ شاہنواز سے ملنے اللہ آباد گیا ہوگا اور یہ پتا چل جائے ہے کہ اس کے شرمناک کردار کا کبلا عذر اجوت چکا ہے، وہیں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں اس نے اپنا مذہبی یول اپنا لیے موقع آنے پر وہاں سے نکل جاتے ہیں کا سبب بھی ہو گیا۔ مگر انکل! آپ خیال رکھیں کہ کسی طرح اسے اور شاہنواز کو تلاش کیا جا سکے۔ اللہ آباد کے دو لڑکے شاہنواز اپنے ساتھ لے کر گیا ہے جن کا کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہو رہا ان لوگوں کی طرح جانے اور بھی کتنے لڑکوں کے ذہن میں ان سے زہر بھرا کر انہیں بھیجے کے نام پر اس قسم کے بھانک کا کام پڑا ہوا ہے۔ وہ گریا ہو گیا۔ انہو بہت چالاک اور سادھی ہے۔ وہ ہمارے ملک کو کھوکھلا کرنے کے لیے ہمارے ہی لڑکوں کو استبداد کر رہا ہے۔ گاؤں دیہاتوں کے مولویوں کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنا کوئی نیا ٹکنڈا نہیں۔ جب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا تھا اس وقت بھی اسی طرح کی چالیں پھیل گئی تھیں۔ بعد میں کتنے ہی ایسے بے ثبوت ملے جن سے یہ معلوم ہوا کہ مسجدوں کے امام کے ہمیں میں بھارتی جاسوس اپنی کارروائیاں کرتے رہے۔ سادہ لوح لڑکوں کو بھانک کر اسے وطن اور اپنے مذہب کے خلاف کام کرانا کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ بعد وہوں کا چال باز دشمن تو اس معاملے میں بہت ہی ذریعہ ہے۔ اب جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں ان سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ اپنی مایہ زاریات کو برقرار رکھتے ہوئے اس وقت بھی اسی طرح لڑکوں کو بھانکے میں مصروف ہیں۔ ان کا انتخاب ہمسایہ گاؤں دیہات ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہاں کے کم علم لوگوں کو فوری سی بددینی، غلبہ معلومات اور خوش حالی کے خوابوں کے ذریعے آسانی سے بھکا یا جا سکتا ہے۔ آپ لوگ اپنی یول پر اس مسئلے کو اٹھائیں۔ اپنے غلبہ میں تو میں خود اب یہ طوفان اس معاملے پر نظر رکھوں گا اور کسی مذہب اور وطن کے دشمن کو مندرن شخصیت کے ہمیں میں وہاں تک ہر کام نہیں کرنے دوں گا۔" مختار مراد کی دبی ہوئی اطلاع پر سرعت سے سارے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ صوبہ صوبہ کی جان بوجھ چکا تھا۔ جذبات کو قابو میں رکھنے کی تربیت جانے کیوں اپنے ہر موڑ پر پابست چھٹی جاتی تھی۔

"اس معاملے کو بھی دیکھیں گے لیکن پہلے ہینا والے مسئلہ کا تو کوئی حل ملے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا ہے، یہ پتا ہی بدستو جاری ہے۔ حرم کے ساتھ ساتھ اب انہو کی بھی حالت خراب ہونے لگی ہے۔ ابھی تک وہ ہم ان دونوں کو تسلیاں دیتے رہے ہیں کہ جلد ہینا کے بارے میں

معلوم ہو جائے گا لیکن ہمیں جس طرح ناکامی کا سامنا ہے اس سے تو بیک لگ رہا ہے کہ ہم اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" اناقتہ رانا نے اصل مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

"اس مسئلے پر سوچتے ہوئے جو بات میری سمجھ میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ ہر طرف بھاگ دوڑ کر لینے کے باوجود ہمیں ناکامی کا سامنا ہوا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم جن لوگوں پر انحصار کر رہے ہیں، ان میں سے کسی نے کوئی کام نہیں کیا ہو۔" ہینا کوئی ٹوٹی ہوئی بات نہیں کہ اس کے ایک بار ہاتھ سے کھل جانے پر سراسر اٹکا ہوا تھا لیکن اندر سے وہ جس جگہ سے غائب ہوئی ہے وہاں بے شک کوئی دکان وغیرہ نہیں ہے لیکن چار پانچ مکانوں کے دروازے تو اسی طرف کھل رہے ہیں۔ ان مکانوں میں سے کسی کے کھین لے تو ہینا کو گاڑی میں بٹھا دوادیکھا ہوگا کہ میں نے خود وہ جگہ دیکھی ہے اور مجھے آتشیں ہتھیار چھوڑ کر وہ اس رپورٹ کو ماننے میں تامل ہے کہ کسی شخص نے ہینا کو وہاں نہیں دیکھا۔ ڈرائیور کے مطابق اسے اپنے گھر جا کر دواہن آئے ہیں جس میں دس بارہ منٹ لگے تھے۔ دس بارہ منٹ میں ان پانچ مکانوں میں سے ایک کے بھی کھین کا باہر لپٹنے یا بھاگنے کا اتفاق نہ ہوا اور یہ بات ذرا مشکوک لگتی ہے۔ میرے خیال میں تو ہمیں ایک بار پھر وہیں سے ہینا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"آج میں تو ہم وہاں گئے تھے۔ تفتیشی ٹیم کے علاوہ ہم نے خود بھی دو لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا، یہ غریبی جانتے ہوئے۔" اس کی بات سن کر سجاد رانا نے اسے یاد دلایا۔

"ہم اپنے ساتھ پولیس پارٹی لے کر گئے تھے۔ لوگ اگر چہ جانتے سمجھتے ہوں تو پولیس والوں کو بتانا مناسب نہیں سمجھتے۔ میرے خیال میں تو ہمیں سچ جاننے کے لیے کوئی غیر روایتی طریقہ کار استعمال کرنا پڑے گا۔ کل میں خود اس علاقے میں سائیکل گا اور اپنے طور پر لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے اپنا فیصلہ سنایا جس کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ کسی بھی طریقے سے کسی شخص کو اس جہان کے ذریعہ اب وہاں جانے کی ضرورت تھی۔

وہ سب حد احتیاط سے کام لیتے ہوئے وہیں تھکے تھکے لوگوں کے پیچھے چل رہی تھی۔ ٹوٹی ہوئی برآمدے کھلے کرنے کے بعد وہ آخری سرے پر موجود ایک دروازے کے قریب پہنچ کر

رکے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ سب اسی کھلے دروازے سے گزروا اندر پہنچے اور سب دروازہ برابر کر دیا۔ وہ جوان سے کافی فاصلے پر بھی دروازہ بند ہو جانے کے بعد تیز جیز قدموں سے چلتی ہوئی درمیانی فاصلہ طے کرنے لگی۔ سچ میں ہیڈنڈل نہ ہونے کے باعث فرش پر اس کے قدموں کی چاپ پڑیں ابھر رہی تھی اس لیے وہ اس طرف سے بے فکر کی کوئی آواز نہ کر سکتا تھا۔ البتہ یہ فکر ضرور تھی کہ اگر اندر جانے والوں میں سے کوئی اچانک باہر نکل آیا تو وہ دھری جائے گی۔ لیکن فیئر فرائیڈ کو ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ برآمدہ پر کھڑے اس دروازے سے نکل پہنچ گئی جس کے پیچھے وہ سب غائب ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے جھری سے اندر بھاگا۔ اندر اسے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس بات پر حیرت زدہ ہوتے ہوئے اس نے آہستہ سے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا چنانچہ اس کے دھکیلنے پر کھٹک چلا گیا۔ وہ کھیلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ یہ جگہ کوئی استور معلوم ہوتی تھی کیونکہ یہاں ٹوٹا پھوٹا فریج، ایک پرانی سی لمبائی اور دوسرا بے مصرف سا سامان رکھا نظر آ رہا تھا۔ یہاں داخل ہوتے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اس جگہ کوئی دوسرا دروازہ بھی ہوگا جس سے گزروا کہ وہ لوگ دوسری طرف پہنچے ہوں گے لیکن یہ بات دیکھ کر اس کو دل کڑھن میں کوئی ٹوٹی بات نہ ہو سکتی تھی، وہ اب گھر و گئی۔ نکاسی کا کوئی اور راستہ نہ ہونے کی صورت میں آخر وہ سب لوگ کہاں غائب ہو سکتے تھے؟ ان کے پاس کوئی سیڑھی یا دروازہ تو بھی نہیں کہ اس میں خود کو چھپا کر غائب ہو جاتے۔ حیران پریشان نظروں سے دروازے کو دیکھتے ہوئے کب دم ہی اس کی نظر فرش پر پڑی۔ پتہ چل گیا کہ وہ اسے فرش پر اسے چھری رنگ کے گونے سے دھنکے ہوئے کما جاتا ہے کہ چند تار نظر آ رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ سوئی نے اسی طرح کی کرن لگا دو پناؤ چھڑکھا تھا۔ وہ کمر کے بل بھی اتر کر ان تھری تاروں کو اپنی آنکھوں کی مدد سے اٹھا چا کر تار اس کی آنکھوں کی گرفت میں ہونے کے ساتھ ساتھ فرش سے پل پڑے۔ یہ جیسے ان کا دوسرا ہاتھ تھا۔ وہ خود اس کے پاس پہنچ کر اس کی گرفت میں لے لی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ تار باہر کے درمیانی خلا میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ اسے دھکے دے کر اس بات کا اندازہ لگائے کہ پتہ چل گیا کہ یہ تار اسے اس طرف سے نظر آنے والی گھیروں میں سے ایک مشام میں ہی ہے جہاں باہر کے درمیان صوف، لکیریں، ٹھیلے کپڑے وغیرہ ہلکے ایک

مجموعی سا جھری نما خطا ہے۔ اس نے اس درمیانی خلا میں انگلیاں ڈال کر در لگا تو فرش کا وہ حصہ کسی دشمن کی طرح اٹھ گیا اور نیچے کی طرف جاتی ہوئی لوہے کی سیڑھی نظر آنے لگی۔ شاید یہ سیڑھی اترتے ہوئے سوئی کا وہ پناؤ سطوں کے خلا میں اٹک گیا تھا۔ اس نے در لگا تو در پناؤ نکل آیا مگر وہ اپنے پر ہی کرن کے چند تاروں سے لڑ پڑ پھنس چکے۔ ان تاروں نے اس کی نچلی دھڑکتے ہوئے تھک رہی تھی۔ اس کی ماری وہ فرش میں ٹکرا رہی تھی۔ یہ تارے تھے۔ یہ سیڑھیوں کے فوراً بعد ہی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ اس نے جانی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر اندر بھاگا۔ یہ ایک بال نما کمر تھا جس میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر ہمیں کسی قریب افراؤ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان افراد کی اس کی طرف پشت تھی لیکن لباس اور بالوں کے اسٹائل وغیرہ کی جو جھلک نظر آرہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سب کے سب تیسری جنس کے ہی افراد ہیں۔ ان سب افراد کی توجہ اپنے سامنے موجود بڑے سے چوڑے کی طرف تھی۔ اس چوڑے پر نمایاں طور پر جو چیزیں نظر آرہی تھیں، ان میں مہارو، گرہ والاس، ہندوؤں کی ایک دیوی کا بڑا سا مجسمہ اور اس دیوی کے قدموں میں پڑی وہیں کی طرح سرخ لباس اور زیورات سے بھی ایک لڑکی شامل تھی۔ اس لڑکی کو کوئی اور اس کے سامنے کسی کی نظروں کے سامنے نہ تھا مگر یہاں لائے تھے۔ لڑکی بے ہوش تھی اور وہ صرف اس لڑکی کی وجہ سے ہی ان کے عقاب میں اس جگہ تک آنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ لیکن بنی اس لڑکی کو کہاں سے اٹھا لے ہیں۔ لڑکی نور اور حسین تھی اور اس کے فتوش کی نرمی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ ان لوگوں کا ہر اقد و غیرہ میں آگاہی تو لگتی ہی رہتا تھا لیکن کسی شادی کے گھر سے بھی ستوری نہیں لگتا تھا۔ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جانے وہ لوگ کسی طرح اس بے پردہ کو اٹھا لے گئے تھے اور اب اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے؟ اندر کمرے کا منظر دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ وہاں کوئی آتم کا ہروالی ہو رہی ہے۔ گرہ والاس تمام حاضرین کی طرف منہ کیے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر اسے فوراً وہ منظر یاد آیا جب اس نے گرہ والاس کو گھسیٹے کہتے ہوئے مہارو کے تھکوس میں پھنکے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اسے اس الفاظ پر حیرت ہوئی تھی لیکن اپنی تکلیف کی وجہ سے وہ یاد دہشانی نہیں دے سکی تھی۔ اب جو دوبارہ اس نے اس طرح کا منظر دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ

گرہ والاس ہندو عہد سے تعلق رکھتا ہے لیکن اسے ساتھیوں کی اندھیرے میں رکھ کر ان پر خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔ چوڑے پر وہ تو بے ہوش ہو کر گرہ والاس کے ہاتھ پر ہاتھ لیکن اس تک واضح آواز نہیں آرہی تھی۔ اس کی بات سننے کے لیے اس نے اپنی آنکھ جالی کے سوراخ سے بنا کر کان اس جگہ لگا دیا۔ اس کے کان تک گرہ والاس کی آواز پہنچنے لگی۔ وہ کبہ رہا تھا۔

"دیوی ماں کی کرپا ہے آج میں آپ لوگوں کے سامنے شرمسار ہونے سے قنہ کی۔ اگر انکاش اٹھا کر یہاں پہنچنے کے بعد آپ لوگوں کو زراش لوٹنا پڑا تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ میں ہر گز وہ دیکھنے کے مطابق یہاں خالی ہاتھ نہیں آئی تھی، پر راستے میں ایک ٹھکانا ہو گئی اور مجھے لگا کہ ہر آج کا صبح ہونا بے کار جائے گا۔ پر دیوی ماں نے کرپا کی اور مہارو نے مجھے بتایا کہ دیوی ماں کوئی جانتے والی بیعت کا انتقام ہو گیا ہے۔ اب ہم دیوی ماں کے چوڑوں میں بیعت دے کر اس سے پراعتنا کریں گے کہ وہ اپنے پیاروں کو اس کھٹ سے بچائے جو ہمیں اور ہمارے باپنا کو اٹھا رہا ہے۔ پھر دوبارہ ہمارے عہد کے سامنے والے کسی گھر میں ہم جیسی اولاد جنم لے۔" یہ جملہ بولتے ہوئے گرہ والاس کے لیے میں گھبرا دیکھا تھا۔ اس کے حواس دل نے اس کو کچھ پوری شدت سے محسوس کیا۔ اور گرہ والاس کی بات مہارو کی اور وہ کبہ رہا تھا۔

"اب میں مہارو سے بیتی کروں گی کہ وہ دیوی ماں کے چوڑوں میں ہم سب کی طرف سے بیعت چڑھائیں اور دیوی ماں کی پوجا کروائیں۔" گرہ والاس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اسے اندر سے "ہم ہری اوم" اور "سے دہی کی" کے نعرے سنائی دیے پھر خاموشی چھائی۔ خاموشی چھانے پر اس نے اپنا کان سوراخ سے بنا کر دوبارہ سے آنکھ وہاں لگا دی۔ اسے محسوس تھا کہ مہارو دیوی ماں کو کیا بیعت چڑھاتا ہے۔ آنکھ لگاتے ہی اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ مہارو ہاتھ میں بڑا سا سچھرا لیے دیوی کی مورتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر دوسری کے چوڑوں میں چڑھا کر ہاتھ میں سچھرا چھری وہاں بے ہوش پڑی لڑکی کے گے پر پڑا دی۔ فوراً ہی اس کے گلے سے خون کا فوارہ دھار دھار مہارو اور دیوی کی مورتی اس خون میں نہا گئے۔ اس نے گھبرا کر اپنی آنکھ وہاں سے ہٹائی۔ اس وجہ سے ناک منظر کو کچھ اصول اس کے غلط سے بلند نہیں اٹھ جاتی تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں خود کو دیوی کی آواز اندر ہی نہیں گنت کی

اور وہ دو دیواروں پر بیٹھ کر چڑھتی ہوئی وہاں پر پہنچ گئی۔
 خوف کی شدت کے باوجود اسے اس بات کا احساس تھا کہ ان
 لوگوں کو اس کے اس راز سے واقف ہونا چاہیے کہ ان کو نہیں ہوتا
 چاہیے اس لیے اوپر پہنچنے کے بعد اس نے بیٹھنے میں جانے
 والا اخیر راستہ بند کیا اور وہاں سے باہر نکل گئی۔ اب اسے کسی
 طرح اس کو بھی سے بھاگ لگانا تھا۔ وہ دوتی ہوئی اس
 دروازے کی طرف بڑھی جس سے گزرا کہ وہ لوگ کوئی کی
 قمارت میں داخل ہوئے تھے۔ دروازہ بند تھا اور اس کی بے
 حد کوشش کے باوجود کھینے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ یقیناً کسی
 بیرونی مداخلت سے پہنچنے کے لیے ان لوگوں نے دروازے کو
 لاک کر دیا تھا۔ دروازے کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد
 وہ کھڑکیوں پر طبع آزمائی کرنے لگی۔ کھڑکیوں کے پتے پٹے
 کے تھے لیکن ان پر لوہے کی مضبوط چابی لگی ہوئی تھی۔ اس چابی
 کو تو ذکر یا رکھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ہر طرف سے
 مایوس ہونے کے بعد وہ واپس اس کمرے کی طرف چلی گئی
 جہاں اسے یہ ظاہر آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے قید کر دیا
 گیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی باہر سے بندھی۔ اس نے کھڑکی
 کھولی اور کمرے میں بیٹھ گئی۔ اب اس کے پاس یہی چارہ
 رہ گیا تھا کہ ان لوگوں پر یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ ان کے
 راز سے واقف ہو گئی ہے۔ اگر انہیں اس کے واقف راز
 ہونے کا علم ہو جاتا تو وہ اس کی جان بھی لے سکتے تھے۔
 کمرے میں آکر اس نے کھلے خانے کا رخ کیا اور
 جلدی جلدی منہ پر چھپا کے مارنے لگی۔ چھپا کے مارتے
 ہوئے اسے کبھی بار بار احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کا رخ کھل گیا
 ہے اور اس میں سے خون دس دس کر پٹی کو بھلو چکا ہے۔ اب
 تک وہ ذہنی اور جسمانی طور پر جس مشقت میں مبتلا رہی تھی،
 اس میں ایسے ہاتھ کی چوٹ کو کھرا موش کر چکی تھی لیکن اب یہ
 تکلیف بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اس نے پئی کھول کر ہاتھ لگ
 کے تیزی سے بہتے ہوئے پانی کے نیچے رکھا۔ کچھ دیر کی
 جدوجہد کے بعد خون بہا بند ہو گیا، البتہ دروازے کوئی علاج نہیں
 تھا۔ یہی پئی بھی اس لائق نہیں تھی کہ اسے وہ بار بار ہاتھ پر
 بانو جا سکا۔ پئی کو وہ پچھلے کمرہ کا بھروسہ سے باہر لگنے
 کی تھی کہ اتنی دیر لگی ہوئی پانی پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے
 جلدی سے پانی کو یہ حاکر کے اس کی جگہ پر رکھا اور وہاں
 کمرے میں آگئی۔ اب اس کی ٹانگوں میں بائیں مچھلی جان
 نہیں رہی تھی۔ وہ لڑخلائی ہوئی سونے کی طرف بڑھی اور
 اس پر اوپر ہوئی۔ انہیں بند کرتے ہی اس کے ذہن میں
 لڑکی کو توڑ دینے کے بارے کا منظر ابھرا۔ اب تک تو وہ اپنی جان

بچنے کی فکر میں تھی اس لیے اس منظر کی اصل حقیقت ہر کسی کو
 پوری طرح محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اب جو یہ منظر دکھانے
 میں دوبارہ زندہ ہوا تو اس کے پورے وجود پر پکڑی طاری ہو
 گئی۔ کیا بات ہے جو اس کے ساتھ کھڑکیوں کے پتے سے لگا کر اسے
 کھنڈا وقت گزر گیا، وہ انداز نہیں کر سکتی۔ بس اسے صرف اتنا
 احساس ہوا کہ کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ فوری طور پر
 ہونے والا ہوا تو اسے "خودم ہوا کہ وہ گھر والوں میں سے نہ ہوتی پر
 غصہ کر رہا ہے۔"
 "میں نے تجھ سے کہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دینا
 لیکن تو نے میری بات پر عمل نہیں کیا۔ اگر یہ سوچتے کا فائدہ
 اٹھا کر بھاگ جاتی تو کیا ہوتا؟"
 "مجھے انہی طرح یاد ہے کہ میں جب اسے کھانا دے کر
 گئی تھی تو میں نے دروازے کی باہر سے کھڑکی لگا دی تھی۔ پتا
 نہیں کیسے کھل گئی؟" "الہام کی ذات سن کر سونے نے انہیں
 زردیچے میں اپنی صفائی بخشی کی۔"
 "بہن بھوت آئے ہوں گے یہاں کھڑکی کھولتے۔
 ایک تو تو اسٹیک سے کام نہیں کرتی، اوپر سے جھوٹی صفائیاں
 بھی دیتی ہے۔" "الہام نے مجھے ہونے والے لیے میں اسے
 اٹھا۔"
 "جانے دے الہام! کیا وہ کھڑکی باہر سے کھلی۔"
 گئی۔ پوری کوئی انہی طرح بند تو تھی۔ اگر تیری شہزادی یہی
 کمرے سے باہر بھی نکل جاتی تو یہاں سے بھاگ تو نہیں جاتی
 تھی۔" اس بار مہاراجہ کی آواز سنائی دی۔ اس کی مداخلت
 کے بعد گھر والوں کے مزید کچھ بولنے کا سوال ہی نہیں رہا
 تھا، چنانچہ سوئی کی جان چھوڑ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 "یہ شہزادی اس طرح کیوں لٹکتی ہوئی ہے؟ اس کا سامرا
 بدلتی ہوئی طرح پکپکا رہا ہے۔"
 "اگر وہ ہاں دیکھو تو لڑکی کو اس کی حالت تو واقعی عجیب
 نہیں لگ رہی۔" "الہام کے بولنے پر مہاراجہ بھی اس طرف
 متوجہ ہوا۔ مہاراجہ لوگ اسے چھوڑ دیکھتے گئے۔
 "اسے تو بڑا عجیب بظاہر ہے، جب تک تو اتنی بڑی طرح
 کانپ رہی ہے۔"
 "کیا تو اتنی اچھا نہیں لے کر آ؟ اس میں بخاری گولیاں
 کا پتا لگتا ہے۔ اتنی رات کے ذائقہ کو تو نہیں دیکھا سکتے۔ اگلی
 دن گولیاں کھلا کر کھارو کر دیتے ہیں۔ صبح الہام خود ہی اسے
 کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے گی۔" "الہام کی بات سن کر
 مہاراجہ نے سوئی کو علم دیا۔ سوئی قیافہ ڈالنے کے بعد حاکم
 گئی۔ اس نے اور الہام نے مل کر اسے چارے سے بخایا

اور زبردستی وہ گولیاں حلق سے نیچے اتارنے پر مجبور کر دیا۔
 گولیاں کھانے کے بعد وہ ایک بار گھر صوفے پر گر گئی۔ شاید
 ان گولیوں کا ہی اثر تھا کہ تھوڑی دیر بعد اسے کچھ آرام محسوس
 ہونے لگا اور تھوڑی سی لیکن یہ خند بہت سے بہنیں اور بے سکون
 تھی۔ بار بار پوچھ کر اس کی آنکھ لگی اور ایک خوشی بظاہر تک
 کرنے لگا۔
 صبح پر کمرہ میں وہ اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں سے
 لھنا غائب ہوئی تھی۔ یہاں آنے کے لیے اس نے ایک
 ڈرائیور کے علاوہ کسی اور کو ساتھ نہیں لیا تھا حالانکہ چارواں اور
 مختار سرائے اسرار کا تھا کہ وہ ایک آدھ پولیس میں کو بھی
 اپنے ساتھ لے جائے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا اور
 اب وہاں پہنچ کر گھڑکی کے نیچے بیٹھ والے دروازے پر
 دستک دے رہا تھا۔ دستک کے جواب میں اندر سے ایک
 درمیانی عمر کا آدمی باہر نکلا۔ اس آدمی نے سفید رنگ کی صفائی
 اور ہاتھ آستین کی بنیان چھین رکھی تھی۔ دونوں ہی چیزوں کی
 سفیدی کو ہم کرتی ہوئی بیٹھا ہٹ سے ظاہر تھا کہ انہیں بہت
 کثرت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ خود وہ کھس اپنے پیرے
 سے بھی ایک ایسا مزور لگ رہا تھا جس کی مشقت اس کی
 بد حالی کو خوش حالی میں تبدیل کرنے میں ناکام رہی ہو۔
 "مجھے شہزاد عادل کہتے ہیں۔ میں ایک ضروری کام
 کے سلسلے میں آپ سے آ رہا ہوں آپ کے کمرے والوں سے ملنا چاہتا
 ہوں۔" اس نے اس شخص سے ہاتھ ملائے تو بولے اٹھنا
 جان گیا۔
 "کیا ضروری کام؟" وہ شخص حیران ہوا۔
 "دونوں پہلے یہاں سے ایک لڑکی غائب ہوئی تھی میں
 اس کے بارے میں آپ کو گویا ہے کچھ معلومات حاصل کرنا
 چاہتا ہوں۔" اس نے بے حد نرم سبک میں بتایا۔ باحیثیت
 آدمی اگر کسی کم حیثیت شخص سے نرمی اور عزت سے معاملہ ہو
 تو اس کی بات زیادہ اثر انگیز ثابت ہوتی ہے وہ اس شخصیت کو
 بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔
 "ہم لوگ پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ انہیں اس بارے میں
 کچھ نہیں معلوم۔ اگر کچھ معلوم ہوتا تو ہم پہلے ہی پولیس والوں
 کو بتا چکے ہوتے مگر جانے کیوں آپ کو لوگوں کو یقین نہیں
 آتا۔" اس شخص نے اس کی بات کے جواب میں اپنے لبتے
 سے بے بسی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔
 "میں یقین کروں گا کہ اس صورت میں کہ آپ مجھے
 ایسا بار اپنے تمام گھر والوں سے مل کر بات کرنے کی

اجازت دے دیں۔"
 "لھیک ہے، آپ اندازاً جاسکیں۔" وہ شخص اس کے
 اصرار پر بادل کا فوارہ چھینے سے گستاخ اندر آنے کا راستہ
 دیتے ہوئے ہوا۔ اس شخص نے یہی کہنا ہوا تھا کہ کچھ کسکی
 رہی تھی اور مختلف باحیثیت افراد کا تباہکار رہا تھا اس سے
 علاقہ کیونوں کو اس بات کا تو بہت اچھی طرح انداز ہو گیا تھا
 کہ غائب ہونے والی لڑکی کی بڑی شخصیت کی بیٹی ہے۔ اب
 وہ اس بارے میں معلوم کرنے وہاں پہنچا تو اس کی شخصیت
 اور مقب میں جاوہر لڈا انجیر کے ساتھ کھڑکی کی قیمت
 لگاڑی کو کچھ کچھ بھی یاد انداز لگا، مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکی کا
 شخصیت ہے، اس لیے اس شخص نے اس کا مطالعہ کرنے سے
 انکار کرنا مناسب سمجھا تھا۔ اجازت ملنے پر وہ اس شخص
 کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کا قیام چھوٹا تھا جس کے مختصر
 سے کچن میں پڑے تخت پر بیٹھے افراد نا آشنا کرنے میں سرورف
 تھے۔ ان افراد میں مرد سے چار بچے برس ہوئی ایک بورت،
 دونوں جوان لڑکیاں اور ایک سات آٹھ سالہ لڑکا کاش تھے۔
 وہ سب افراد اسے اندازاً دیکھ کر لنگ گئے۔
 "میرے سارے گھر والے اس وقت نہیں ہیں۔ آپ
 کو جو بھی مل کر رہی ہے لیں۔" "مرد نے ایک سال ضرور ہی
 لکڑی کی کرسی اسے بیٹھنے کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا۔ وہ
 کرسی پر بیٹھ گیا اور ان لوگوں پر ایک نظر ڈالنے ہوئے ہوا۔
 "میں مقررہ دستہ خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو
 زحمت ہوئی مگر میری بھوری انگلی ہے کہ میں آپ لوگوں کو
 زحمت دینے بغیر یہ بھی کمالی سکتا تھا میری بات معصومہ کہ کمر
 نہ تھی آپ کے گھر کے آریب سے غائب ہوئی ہے۔ میری
 اور میرے گھر والوں کی تکلیف یہ ہے کہ لوگ بخوبی اندازہ لگا
 سکتے ہیں۔ تقریباً میری بیٹی ہی کی عمر کی لڑکیاں اس طرح
 بھی موجود ہیں۔ اگر آج اپنی بیٹیوں کو سارے رئیس تو آپ کو
 ہماری تکلیف اور چہ بیکار کا احساس ہو جائے گا۔ سے شک
 پولیس آپ کو لوگوں سے کچھ پوچھ کر لے جائے گا۔ آپ انکار کر
 پتے ہیں آپ کو کچھ نہیں پتہ کہ میں بھی جانتا ہوں کہ پولیس
 والوں کو کچھ بھی جانتے ہوئے شریف لوگ ہر راستے ہیں کہ
 کہیں خواہنا وہاں جاتے پھری کے بل میں دیکھیں جائیں۔
 اس وقت میری بیٹی آپ کو اس اتنا متاثر ہے کہ آپ کو لوگوں
 سے انسانیہ کے نام پر اپیل کر سکیں کہ اگر آپ کو کچھ معلوم
 ہے تو بتا دیں۔ میرا وعدہ ہے کہ آپ کو کسی قسم کی زحمت نہیں
 اٹھانی پڑے گی۔ جو کچھ آپ مجھے بتائیں گے میں سب وہاں
 رکھوں گا اور یہ کھلی پھول ہوں گا کہ مجھے یہ سب بتانے والا

وہ دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں پر اس کے لہجہ کا اثر ہو رہا ہے اور وہ سب ہمدردی سے اس کی بات سن رہے ہیں۔ ایک چل کے لیے اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لیے لب و لہجہ ہلکا کر رکھا تھا۔ یہی تھی اس لڑکی کے چہرے کے نشانات کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی نظر کے زاویے کو محسوس کرتے ہوئے عورت جو کہ یقیناً ان بچوں کی ماں بھی، ڈرامہ سے ٹھنکھاری اور ڈرامائی انداز میں بولی۔

”صاحب! میں نے پہلے ہی بتایا تھا اور اب پھر بتا رہی ہوں کہ یہاں کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ میرا گھر والا مزدوری کرتا ہے اور سوتے ہی گھر سے نکل پڑتا ہے۔ بچوں نے بھی سویرے ہی اسکول چلے جاتے ہیں اور چھپے میں ایسی گھر کے کام کاج کرنے کو رہ جاتی ہوں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد مجھے فرصت ہی نہیں ہوتی کہ دروازے سے باہر جھانک بھی سکوں۔ اگر آپ دس پندرہ منٹ بعد یہاں آتے تو آپ کو گھر پر میرے سوا کوئی نہیں ملتا۔ اب آپ بتائیں کہ جس وقت آپ کی بہن اس جگہ سے غائب ہوئی یہاں کون بیٹھا تھا کہ جو دیکھ سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ کون اسے لے گیا؟“

”تمہیک سے حشر نہ! میں آپ کی بات مان لیتا ہوں اور یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ آپ لوگ میرا یہ کارڈ رکھ لیں، اس پر میرا فون نمبر درج ہے۔ اگر کسی وقت آپ کو میری انسانیت کے نام پر کسی کی اتیلی کا خیال آئے تو اس نمبر پر فون کر مجھے اطلاع دے ملتی ہیں۔“ اس نے اپنا ڈیٹنگ کارڈ نکال کر عورت کے قریب تخت پر رکھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہاں بیٹھے سے پہلے اس نے ایک بار پھر لڑکی کے پیچھے پر نظر ڈالی وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں چاروں میں دوہ

چندنی سے چہرے کا رخ موڑ گئی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ شاید یہ لڑکی کچھ جانتی ہے لیکن مسکدہ کی تھا کہ وہ عیدنی تو اس سے کچھ نہیں اگلا سکتا تھا چنانچہ ان لوگوں سے زحمت دینے پر ایک بار پھر معذرت کرتا ہوا ہارنگل گیا اور دوسرے مکان کا رخ کیا۔ ایک در سے وہاں ہو جانے کے باوجود وہ بہت چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اس دوسرے مکان میں ایک سبزی فروش اپنی ٹوجہ ان بیوی، چند ماہ کے بڑے بچوں اور شادی بیاہ میں کے ساتھ بیٹھ رہا تھا۔ سبزی فروش تنگ قور سے تڑکے سبزی منڈی روایت وہ چکا تھا اور اس کی فوج ان بیوی بڑوں والے بچوں اور بارساں کو مٹھیاں لے کر جس گھر کی طرح بکاتا ہوتی ہادی تھی، اسے دیکھتے ہوئے وہ اپنی بیٹی کو

سکنا تھا کہ اسے گھر سے باہر بھیجنا کی تو کیا سر کھینے کی بھی فرصت نہیں ملتی ہوگی۔ تیسرے گھر میں دھیر سارے افراد بیٹھ تھے۔ اس گھر میں اڑے پر کینڑوں پر پردہ، ستاروں، کانا اور تیلے وغیرہ کا کام کیا جاتا تھا۔ گھر کا بھونا بڑا ہر فرد اس کام میں حصہ لیتا تھا۔ وہ اب اس گھر میں داخل ہوا تو اب بھی وہاں کام ہادی تھا اور سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ ایک بار پھر وہی کاٹھ بٹھنے کے بعد وہاں گھر سے باہر نکلا۔ اب بس ایک ہی گھر رہ گیا تھا جہاں سے کچھ معلوم ہونے کا موقع سامان تھا۔ البتہ اسے اس بات کا یقین تھا کہ وہ جس پہلے گھر گیا تھا۔ ان لوگوں کو یا کم از کم اس لڑکی کو تو ضرور پچھنے کا موقع تھا مگر اس نے جان بوجھ کر اپنے لب و لہجے لیے تھے۔ اگر آخری مکان سے بھی اسے کچھ معلوم نہ ہو پاتا تو پھر اس کے پاس یہی چارہ درہ جاتا تھا کہ پہلے گھر سے کھینٹوں سے سختی سے باز پرس کر کے وہ سب اگلا لے گا وہ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو تھے گھر کی طرف قدم بڑھانے سے قبل اس نے مڑ کر پہلے گھر کی طرف دیکھا۔ اسے وہی لڑکی مکان کی چھت پر نظر آئی۔ چھت پر تقریباً چار فٹ کی دیر اور ابھی وہ بھی اندر وہ لڑکی اسی دیوار کے پیچھے کھڑی تھی، ہر جھانک رہی تھی۔ اسے اپنی طرف متوجہ ہونا دلچسپ لگا اس نے

دھبے سے اسے دیکھ کر اشارہ کیا اور دیوار لے پیچھے ہٹا رہا۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ بعد اس کا پیچہ وہ دروازے کی جانب سے ابھر اور اس نے تھوڑے گھبراہٹ کی طرف کچھ پھینکا۔ کچھ گئی وہ شے اس کے قدموں کے قریب آ کر گر کر جب لڑکی فوراً ہی غائب ہو گئی۔ اس کے لیے یہ بہت آگورڈ چوکش تھی۔ ڈرامائی گڈی میں بیٹھا تھا اور یہ تھا ہر اس سے بے نیاز تھا۔ اس نے جانتا تھا کہ وہ ابھی طرح اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ بہر حال، اس وقت اسے اپنی پوزیشن سے زیادہ مٹھنے کے بارے میں جاننے کی فکر تھی۔ اگر یہ گھڑت ہوئی تو وہ اس طرح ایک ایک گھر کے دروازے کو کھٹکھٹا کر ان لوگوں سے تھون کی درخواست کیوں کرتا؟ اپنے قاتلانہ کے تمام تر اختیارات کے باوجود ہاتھ آئے والی ناکامی نے تو اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ لوگوں پر غم سادہ کرنے کے بجائے ان سے درخواستیں کرتا پھر رہا تھا۔ اس وقت پیش آئے۔ لی آگورڈ کلاش کو بھی اس نے خیال کی خاطر فون کر لیا اور بہت

کر اپنے قدموں میں پڑے ایک پھونے سے بچنے کے بعد سے تھوڑے کاٹھ کاٹھ کاٹھ کو کھانسی کھانسی سے مانتا رہا۔ پھونے سے سانس میں فونڈا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہر ماہ وہ دیکھا تھا جو بھینا اس لیے تھا کہ کاٹھ اپنی بے دردی کی سب سے

مطلوبہ جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ نہ کھنچ جائے۔ پتھر سے بندھے اس کاٹھ کو اٹھانے کے بعد اس نے مناسب سمجھا کہ اپنی گاڑی میں چاہیے۔ یہاں گھر سے گھر سے اس کاٹھ کو گھول کر پڑھنا پڑھنا نہیں تھا۔ کہیں سے بھی کوئی شخص نکل کر آگلا تھا چنانچہ وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا اور پتھر سے کاٹھ کو گھولنے کے بعد کاٹھ کی تھیں گھولنے لگا۔ ڈراما گھر کو اس نے گاڑی چھانے کا اشارہ نہیں کیا تھا اس لیے وہ اس کے علم کا منتظر ہونے کے باوجود اسے کسی دھڑکتے بیٹھا ہوا تھا۔

کاٹھ۔ پوری طرح عمل کی تو اس پر پہلی روشنی سے کھنسی تحریر نظر آئے گی۔ کھنسنے والی کی کھانسی خراب نہیں تھی لیکن کہیں کہیں سے کھنسنے والے الفاظ کو کچھ کرنا دہ لگا جا سکتا تھا کہ اس نے بہت جلدی میں یہ سب لکھا ہے۔ بغیر کسی القاب کے شروع ہونے والی اس تحریر کا متن کچھ یوں تھا۔

”مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلوم ہے۔ پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ کہاں نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ زبان نہ کھولنا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ میں کچھ بتاؤں اور پولیس والوں کے سوال جواب کا سامنا کروں لیکن آج آپ نے جس دھبے پر سے انداز میں تعاد کی درخواست کی۔ اسے سن کر میرا دل تپ اٹھا۔ پولیس والے تو بہت بدتمیزی اور سختی سے پوچھتے تھے اس لیے میں نے ذکر ان کے سامنے پھینک دیا۔ اب بھی آپ کو اس وعدے کے ساتھ سب کچھ بتا رہی ہوں کہ میرا انکس اور ٹکٹیں ہوا۔ دو دن پہلے سب آپ کی بیٹی وغیرہ ہوئی تھی، اس دن میں نے اتفاق سے اسکول کی پچھلی کی تھی اور کینڑے پھیلانے چھت پر آئی تھی۔ کپڑے پھیلائے ہوئے میں نے جھانک کر باہر دیکھا تو مجھے ایک شان داری گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اس گاڑی میں ایک لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ اتنی اچھی سی گاڑی اور لڑکی یہاں کہاں سے آگئی؟ میں چھت پر کھڑی اور گرد دیکھتی رہی کہ دیکھوں تو یہ گاڑی کس کے گھر آئی ہے۔ اسی وقت مجھے وہ نہیں

وہ افراد اس طرف آتے نظر آئے جو نہ ”بی“ میں شمار ہوتے ہیں اور نہ ”شی“ میں۔ ان لوگوں نے گاڑی کے قریب آ کر جھانک مائی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ کیا اس گاڑی میں کبھی وہ لڑکی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور ان لوگوں سے کوئی بات کرنے لگی۔ ان میں سے ایک فرد نے بات کرتے کرتے دھڑا دھڑا نظر دوڑا لی اور پھر اس پاس کسی گوند پا کر اپنے قبیلے میں سے ایک بڑا سا بھرا ڈال لیا۔ پھر پھر سے کھڑا ہوا وہ اس لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ کھین لے گئے۔ میں سمجھتے چ رہے یہ سب دیکھ رہی تھی مگر ان میں سے کسی کا دھیان اس

طرف نہیں تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر برقی طرح ڈر گئی اور بھاگتی ہوئی بچے گئی۔ اماں کو میں نے ساری تفصیل بتائی۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا لیکن گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اماں نے مجھے سمجھایا کہ میں اس بار سے میں اپنی زبان بند رکھوں ورنہ ہم لوگ بھی کسی پلار میں پھنس سکتے ہیں۔ اماں کی دہلیز کے مطابق میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی لیکن اب آپ کو بتا رہی ہوں۔ جو لوگ آپ کی بیٹی کو لے گئے، ان میں انکس نہیں پہچانتی۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ سب میں نے آپ کو بتا دیا۔ ان معلومات کی روشنی میں آپ اپنی بیٹی کو ڈھونڈ سکتے ہیں تو ڈھونڈ لیں۔ مگر برائے مہربانی دوبارہ میرے گھر کا رخ مت کیجیے گا۔ یہاں آ کر آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا بھی تو میں صاف انکار کر دوں گی۔ ان الفاظ پر آ کر پھر رنج ہو گئی تھی۔ جس طرح تحریر کے شروع میں القابات موجود نہیں تھے، اسی طرح اختتام پر بھی کسی کا نام موجود نہیں تھا۔

”گھر چلو۔“ پوری تحریر پڑھنے کے بعد اس نے ڈرامائی کو حکم دیا اور دوسرے حال پر فخر کرنے لگا۔ لڑکی نے پتھا تھا کہ مینا گاڑی سے اتر کر ان لوگوں سے گفتگو کرنے لگی تھی۔ تب اسے پھر اگلا کر اگلا کر لیا گیا۔ سوال یہ پوچھا تھا کہ مینا گاڑی سے اتر کر یہاں کیوں تھی؟ اس نے ان لوگوں میں لیا دیکھی تھی؟ ان میں سے کون کون سا گھر لگا رہا تھا؟ گھر بتا دیا۔ ”کیا ہوا۔“ کچھ معلوم ہوا مینا کے بارے میں ”اوہ لاڈلے تک اس پتھا تھا کہ مریم اسے دیکھ کر سوال کرنے لگی۔ وہ بہت تک سب سے رہنے والی خاتون تھیں لیکن مینا کے دیکھنے لگے انہیں اپنا آپ بھلا دیا تھا۔ نہ انہیں لباس بدھنے کا ہوش تھا اور نہ ہی بال سنوارنے کا۔ ان چند دنوں میں ہی ان کے چہرے کی خوب صورتی مانتہ پڑائی تھی اور وہ برسوں کی بیاہ گئے تھی نہیں۔

”ایک کھیت تو پتھا آتا ہے۔ اللہ! اللہ! ان کی مدد سے ہم جلد مینا کو کھون نکالیں گے۔“ اس نے اپنی جیب سے کاٹھ نکال کر وہیں سے موجود چاروں کے حوالے کیا۔ وہ کاٹھ پر کسی تحریر پڑھنے لگے۔ مریم بھی ان کے قریب ہی بیٹھ کر ان کے ساتھ ساتھ وہ تحریر پڑھنے لگی۔

”اوہ گاڑی میں کچھ لکھی کہ مینا کہیں ان لوگوں کے ہٹھے چلا جائے۔ اپنے اسکول کے ایڈل ٹیچر میں ایک بے میں تھوڑے سراسر کا دل پر قائم کرنا تھا۔ وہ یقیناً اسی مسئلے میں اندر مشغول حاصل کرتے کے لیے ان لوگوں سے بات چیت

کرتے کے ارادے سے گاڑی سے اتری ہوئی اور وہ بد بخت
اسے انکار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ سجاد آپ فوراً آڈر
دیں کہ ان لوگوں کے قبضے سے میری بیٹی کو برآمد کیا جائے۔
خبر پڑھنے کے بعد میرے جوش سے بولی تو اس کی اس اہم
کا جواب نہ کیا کہ شینا گاڑی سے کیوں اتری تھی۔
"میں ابھی آؤں کرتا ہوں کہ شہر میں غلوں ہزاروں کے
جو گروہ مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، فوری طور پر ان کی
مرکزیوں کا جائزہ لیا جائے اور مشکوک گروہوں کے خلاف
ایکشن لیا جائے۔" شینا ہاتھ آئے پر سجاد اور خود بھی جوش میں
آگئے اور اپنے ارادے پر عمل درآمد کے لیے فون کی طرف
ہاتھ بڑھایا مگر فوری طور پر سب ڈائل کرنے کے بجائے
شہر یار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ "کیا خیال ہے
شہری اہم اس خطروں کی لڑکی کو بھی تھامنے چلوں؟ اس نے
لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں کو کچھ پچھا تھی مگر میرا خیال ہے کہ وہ
ان کے طبع تو بڑی سختی ہے۔"
"نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا۔ میری افسانیت کے نام پر
کی گئی درخواست کے نتیجے میں اس لڑکی نے اپنے گھر والوں
سے چھپ کر مجھے یہ اطلاع دی ہے اور اطلاع دینے کے
ساتھ یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ اس معاملے میں اس کا نہیں ذکر
نہیں ہوگا۔ اس لڑکی کا اسحاق تعظیم کرتے ہوئے میں چاہتا
ہوں کہ اس کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ ہمارا اسے تھامنے
چاہنا اس کے لیے مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ جس کا اس سے
تعلق رکھتی ہے، وہاں لڑکیوں کو پہلے ہی بہت سے مسائل کا
سامنا ہوتا ہے۔ ہم اس کے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیں یہ
کچھ مناسب نہیں ہوگا۔ اس نے ان کی تجویز کی مخالفت کی۔
"او کے اگر تم کہتے ہو تو رہنے دیتے ہیں۔" انہوں
نے فوراً اس کی بات مان لی۔ شاید اپنی بیٹی کی ہدفی نے ان
کے دل کو زیادہ نرم کر دیا تھا جو وہ بھی اور لڑکی کی مشکل کو سہیلی
سے سمجھ گئے ورنہ پوچھنے کی طاقت کون کرتے؟ وہ خود اچھے
خامس تخت حراج ہو چکے تھے۔

میں ہی رہتے تھے اس لیے وہ بہت اطمینان سے نماز پڑھ رہی
تھی۔ نماز مکمل کرنے کے بعد اس نے دعا کی اور منہ پر ہاتھ
پھیر کر اٹھتے ہوئے جائے نماز سے گری تھی کہ اس پر نظر پڑا
گئی۔ جائے نماز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے بعد وہ اس کے
قریب آئی اور اس پر ہاتھ مارنے کے بعد پوچھنے لگی۔
"اب کتنی عیبت ہے میری شہزادی کی؟" اس نے
کوئی جواب نہیں دیا وہ اس کی خاموشی کی پر واکے بغیر خود ہی
بولتی رہی۔ "تو نے تو ذرا لڑی رکھ رکھا تھا۔ اتفاقاً سجاد
سے بار بار فوٹو لے رہا تھا۔ ہم لوگ تو کھراہی کئے کہ جانے کیا
ہو گیا ہے؟ شکر ہے اللہ کا کہ آج تیری طبیعت وراثت نہیں کی
ہے ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ اسپتال جا کر دوا لانا کوئی
آسان کام ہے ہم لوگوں کے لیے۔ لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ
بھاڑ کر دیکھتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں جیسے ہم انسان ہی
نہیں کہ ہمیں بھی پیار پڑنے پر دوا دار دینی ضرورت پڑے۔"
اس کے لہجے میں دینی دھتکا جو ازل سے ان جیسے لوگوں کے
مقدور میں لکھ دیا تھا۔
"تم تو مجھے سب سے بہت اچھے گھر کی لگتی ہو گھر دار تم کیسے
یہاں پہنچ گئی؟" اس نے انکار سے پوچھا۔
"ٹھیک لگتی ہو، میرا گھر ایسا اچھا تھا۔ سارے قریبی
پر ہیز گار خیرات لکھ دینے والے لوگ تھے۔ مجھے بھی نہیں
تیس ہی نماز پڑھنے کی عادت پڑی تھی لیکن تو کبھی غائب
کی طرح فوری گزرتی اور پھر مجھے احساس ہونے لگا کہ میں
اپنے گھر والوں کے لیے شرمندگی اور مشکلات کا سبب بن
رہی ہوں۔ اس پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے دل پر جبر کر کے
اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور میں یہاں گرو کے پاس پہنچ گئی۔" اس
نے اپنی بے بسی اور دھتکری داستان حیات چند لمحوں میں
کہہ دیا۔
"نہیں گرو کے ساتھ رہنے میں مشکل نہیں ہوئی؟ میرا
مطلب ہے وہ واقعتاً آخر کار بے دین سا ہے۔ تم اس
کے ساتھ کبھی گزارہ نہ کرنا ہو؟"
"مجھ کو وہی انسان سے سب کچھ کرنا لگتا ہے۔ اگر میں
گرو کے ساتھ گزارہ نہ کروں تو پھر کہاں جاؤں؟ سر چھپانے
کا ٹھکانا بنا ہوا ہے، بہت ہے۔" اس کے لہجے میں قنوت
پسندی تھی۔
"گرو نے تمہیں کبھی نماز پڑھنے سے روکا نہیں؟ وہ دانا
بندہ ہے، ایسے لوگ کبھی پسند نہ دیتے ہیں کہ ان کے سامنے
کوئی نماز پڑھ کرے۔" انکار کے لیے یہ انکشاف تھا۔ وہ
جیت سے اس کا بازو پکڑنے لگی اور پھر سر رانی بولی آواز میں

بولی۔
"کیا کہا تم نے؟ گرو بندہ ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوئی
یہ بات؟"
"اس دن جب وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا اب میں
نے اس کا اصل روپ دیکھا۔ وہ بھنا ہوا ایک نظر آتا ہے اس
سے نہیں زیادہ صاف صاف اور ظالم ہے۔ یہ جملہ بولتے ہوئے
اس کی آواز بڑی طرح کپکپاتی اور جسم بھی ہلکے ہلکے لرزے
لگا۔
"مجھے پوری طرح بتا شہزادی کہ اس روز جب تو گرو
کے ساتھ تھی تو کیا ہوا تھا؟ گرو تجھے کہاں لے گیا تھا؟ تو
نے وہاں کیا دیکھا جو تیری ایسی حالت ہو گئی؟" گرو نے
اسے چھجڑتے ہوئے پوچھا۔
"گرو انسان نہیں شیطان ہے۔ وہ سارے شیطان
ہیں۔ انہوں نے اس معصوم لڑکی کو... وہ بچپن اور سسکیوں
کے درمیان وہ سب کچھ بتا ہی چکی تھی جو اس نے ماڈل ڈاؤن
کی اس پرانی سی لڑکی کے دماغ میں دیکھا تھا۔ نکار اٹھیں
چھاڑے یہ داستان سختی رہی۔ داستان کے اختتام تک اس کی
حالت بہت تری ہو چکی تھی۔ لگاؤ لگا کر اس کی طبیعت بھر
خلب ہو جائے گی۔ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے تھے۔
"جوش کر شہزادی، استیصال نہ کرو۔ میری آواز سن کر نہیں
وہ لوگ یہاں آجائیں۔" اس نے اسے احساس دلایا پھر
ایک کرایک لکڑی میں پانی بھر لائی اور اسے مبارک دے کر
بٹھانے کے بعد گاں اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ نہیں
مٹھوت پانی پینے کے بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلتی تھی۔
"چل آرام سے لیٹ جا۔ میں یہیں ہوں تیرے
پاس۔ تیرا سر دباؤں گا۔ ملکہ اور رانی یا درہتی خانے میں
لکھا ناپکار رہی ہیں۔ کھانا پک جائے تو پھر میں تجھے لاکر کھلائی
ہوں۔ اتنی کمزور ہو گئی ہے تو۔ ڈھک سے کچھ کھائے گی ہے
کی جب ہی جسم میں جان آئے گی۔" انکار مسلسل بول رہی تھی
اور اس کا دھیان بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"گرو کہاں ہے؟" وہ تھوڑی دیر خاموش لیٹی رہی پھر
نکار سے پوچھا۔
"سو یا پڑا ہے؟" انکار کے سینے میں گرو کے لیے واضح
غیرت اور بے ڈاری تھی۔ ایک تو اس کا اپنی شائستہ چہرہ پر
ان لوگوں کو جو کچھ میں رکھتا اور اس پر سے شہزادی کا بیان
کرو دے داتا۔ گرو نے لے اس کے دل میں غیرت پیدا ہونا
ایک قدرتی بات تھی۔ اس کا سر دباتے ہوئے وہ اپنی گرو
کے لیے غیرت کا اظہار کرتے تھی۔

"گرو کے کتوت تو مجھے شرم سے بند نہیں۔ تجھے
نہیں معلوم کہ وہ ملکہ اور رانی کو کھانے پہانے کے علاوہ
دوسرے دھندے کے لیے بھیجتا ہے۔ یہ جو وہاں کبھی بھی
پوری رات گھر واپس نہیں آتیں تو وہی دھندے پر تکی ہوئی
ہیں۔ بڑے بڑے بد بخت اور حرام کاریاں کرنے والے
پڑے ہوئے ہیں یہاں اور گرو جیسے لوگ ان کی بددعت کرنے
دیتا۔ مجھے بھی اس نے اس آواز پر لانے کی آواز کی تھی لیکن
میں مار کھا کر بھی راضی نہیں ہوئی تو مجھے میرے سال پر پھیر
دیا۔ پر اب اس کا اصل روپ جان کر میرا دل اٹھ کر
ہے۔ بندوں کے سازشی زبان کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب
کیا کر جائیں۔ مجھے تو رہ کر اس معصوم لڑکی کا خیال آ رہا
ہے جسے ان ظالموں نے اپنی دیوی ماں کے چنوں میں
بھیست چڑھا دیا۔ معلوم نہیں کس کے گھر کا کڑا ہو گئی ہے
جاری۔ کیسے ظالم ہیں۔ انسان کھلانے کے ٹھکانے ہی نہیں یہ
لوگ۔"
"کیا گرو ہی جو تم دونوں؟ کیا تمہیں مل رہی ہیں
تمہارے درمیان؟" اچانک ہی گرو وہاں چلا آیا اور سخت
لہجے میں ان دونوں سے پوچھنے لگا۔
"کچھ نہیں گرو! شہزادی کے سر میں درد اور ہاتھ اس
لپے میں اس کا سر دبا رہی تھی۔" انکار نے جواب دیا۔
"نہیں بہت کڑے اٹھائے اس کے۔ اس نے کونسا پ
پانک کی جان چھوڑے اور کچھ کھانے دھانے کی فکر ہے۔ ہم
نے کوئی اس کے ذائقے اٹھانے کے لیے اسے یہاں نہیں
رکھا ہوا۔" گرو بولتا رہا اور وہ دونوں سر جھکا کر کھڑے رہیں۔
"کیا اطلاع ہے سجاد بھائی! کچھ معلوم ہو شینا کے
بارے میں؟" وہ اپنی آفیشل مجبور لیوں کی وجہ سے لاہور سے
واپس آ گیا تھا۔ اس کے طبع میں کتنی حساسیت تھی جو توجہ دینا
ضروری تھا اس لیے اس کا مزہ لاہور میں رکھنا نہیں رہا
تھا۔
"کہاں بار کچھ معلوم ہی نہیں ہو رہا۔ اسے ہاں میں
بہن انتہائی معلوم ہو سکا ہے کہ توجہ سرائی کا ایک گروہ مسلسل
اپنے ٹھکانے سے غائب ہے۔ شینا کے والد اور اس گروہ کے
غائب ہونے کا حرم۔ ایک ہی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے
کہ شینا کے انوار میں گروہ انوار ہے۔ میں پورا ماکہ گروہ
اتھ کر کہاں چلا گیا، کچھ معلوم نہیں لیکن وہ اب میرے پاس
میں چاروہ رہ گیا ہے کہ ایسے تمام گروہوں کے غلوں پر
چھاپ پڑاؤں۔" انہوں نے افسردہ انداز میں اسے بتایا۔

نہیں دیا اور بسے لیے ڈنگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆ ☆

”سیٹھ سندر رام۔“ کوٹھی کے گیسٹ پرگنی نیم پلیٹ پر رکھنا ہوا پام پڑھنے کے بعد انہوں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا تو اس نے فوراً ڈرائیور آواز میں گاڑی کا بارن بجایا۔ روٹل میں ایسی دروازہ کھول کر پڑکھیا اور باہر نکلا۔

”ڈی آئی بی چادران صاحب شریف لائے ہیں۔“ سیٹھ سندر رام نے ان کی اس وقت ملاقات لائے ہیں۔ ”ڈرائیور نے بتایا تو پڑکھیا اور بھرتی سے پڑا گیسٹ کو لے لگا۔ یقیناً اسے سیٹھ سندر رام کی طرف سے پہلے ہی ڈی آئی بی چادران کی آمد کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ گیسٹ سے کڑو کر ان کی گاڑی پر نیچلے میں داخل ہوئی تو سیٹھ سندر رام ان کے استقبال کے لیے خود باہر آ پہنچا۔ یقیناً گیسٹ کھولنے کے بعد پڑکھیا لائے سب سے پہلے انٹرکام پر اندر اطلاع کر دی تھی۔ سندر رام ایک مشہور صنعت کار تھا جس کی کئی عینکامل فرمیں رہی تھیں۔ اس کی دولت کے سامنے ماڈل ٹاؤن میں واقع یہ پرائیویٹ کوٹھی بہت معمولی تھی اور جانتے والوں کو حیرت میں مبتلا کر لی تھی کہ اس کی حیثیت کا مالک اتنی عام سی کوٹھی میں کیوں رہتا ہے؟

”آپ کی طرف سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی گئی تو بڑی خوش ہوئی۔“ آپ کی ٹیلی کا تو بڑا نام ہے۔ اتنی سہولت ملی کی ایک شخصیت مجھ سے ملنا چاہتی ہے، یہ سننے کے بعد میں نے اپنی ساری مصروفیات ملتوی کر دیں اور آپ کا انتظار کرنے لگا۔ ”بہت جوش و خروش ہے ان کا استقبال کرنے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ اندر لے جاتے ہوئے بولا۔

بلندو ہونے کے باوجود اس کی اردو بہت صاف تھی اور ایسا یقیناً اس لیے تھا کہ وہ چننا پشت سے سیکر روبرو تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس کے بزرگوں نے اپنا کاروبار سمیٹ کر یہاں سے ہجرت کر کے ہجرت۔ چلے جانے کے بجائے سیکر رہنا مناسب سمجھا تھا اور ان کا یہ فیصلہ اس حساب سے بہت سودمند تھا کہ وہ پاکستان میں اردو کو خوب چمک چمک رہے تھے۔

”تحیک سندر رام صاحب ایچھے اس اس ہے کہ آپ بہت سہرور ہیں۔ میری طرف سے ملاقات ہی اس لیے ایک خواہش کی وجہ سے آپ کا شیلڈول اسٹارٹ ہوا ہو گا لیکن معاملہ یہ ایسا تھا کہ میرا فوری طور پر آپ سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔“ سندر رام کے اشارے پر ایک صوفے پر بیٹھنے والے انہوں نے کہا۔ وہ خود بھی ان سے متعلق ایک

دوسرے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

”کیوں غیر دلچسپی بات کر رہے ہیں رانا صاحب آپ کے لیے حمودا سنا سنا کر بوجھ بوجھ کر باتیں لگا رہے ہیں چارے میں سے اس سے آپ کو اپنے غریب خانے پر خوش آمدید کہا ہے۔“

”اپنی کوٹھی کے لیے غریب خانے کی اصطلاح خوب استعمال کی آپ نے۔“ ایسے تو یہ کوٹھی کوئی ٹھیک ٹھاک ہے لیکن آپ پیسے اعلیٰ سرایت کے اعتبار سے تو یہ واقعی غریب خانہ ہی نکلتی ہے۔“ چادران پولیس کا ایک تربیت یافتہ اور سینئر آفیسر تھا۔ ایک چھوٹی سی بات کا سہرا اٹھام کر بہت خوب صورتی سے گفتگو کو اپنے مطلب کے رخ پر موڑ دیا۔

”یہ بات بہت لوگ کہتے ہیں مجھ سے لیکن میں اس کوٹھی میں ہی رہتا ہوں۔“ اصل میں یہ کوٹھی میرے بزرگوں نے اس وقت بنوائی تھی جب یہاں اردو کوٹھی اور عمارت نہیں تھی۔ بزرگوں کی نشانی، اس کوٹھی کو چھوڑ کر میرا امن راضی نہیں ہوتا۔ اگر ہال بچے ساتھ ہوتے تو اس کوٹھی کو چھوڑ کر نہیں جاتے۔ یہ غور کرتے ہیں بڑوں کو کہ سے پرلوک سدھار گئی۔ اپنی یاد کو ریڈیو پر چلی گئی۔ چنا آواز بلیا میں ہے وہاں سے پڑھ لکھ کر واپس آئے گا تو اپنے لیے اپنی مرضی سے پڑھنے کے مطابق کوٹھی اور کوٹھی دیکھ لے گا۔ تب تک میں اپنے بزرگوں کی اس نشانی کے ساتھ خوش ہوں۔“ اس نے آرا تفصیل سے ان کے سوال کا جواب دیا۔

”یہ آپ کے مزاج کی سادگی ہے جو آپ اس طرح سوچتے ہیں، ورنہ دنیا کا تو یہ چلے پڑے کہ ڈرائیور یا گھر میں آیا نہیں اور سب بھول بھال کر دھوئے سے اونچا اڑنے کی فکر میں ماضی سے جان چھڑالی۔“ انہوں نے پوچھی رواداری میں ایک بات کی۔ اسی وقت فریڈنگل کراندر آئی ہوئی ملازمہ کی وجہ سے ان کی توجہ پٹ گئی۔ ملازمہ سندر رام کے اشارے پر خرابی چھوڑ کر فریڈنگل پر چلی گئی۔

”یہ میری ملازمہ سوئی ہے۔“ اس کے ہاں باپ بھی ہمارے ہاں ہی ملازمت کرتے تھے۔ وہ دونوں چنر برس گزرتے آگے چلے کر گئے۔ یہ بڑے سنبھلے پیدا ہوئی اور چلی بڑھی اس سے میرے مزاج کو خوب متاثر ہے۔ میں ملازموں کی بھڑک بھڑک کر پھند نہیں کرتا۔ گیسٹ پر پڑکھیا رہتا ہے اور اندر کے سارے کام یہ فراہم کر لیتی ہے لیکن ابھی ہے۔ بڑی خوشی ہے کہ اس نے چادران کے سے پڑکھیا کی کوٹھی میں ہے۔ آپ خود بھی جانتے ہوں گے کہ اس کوٹھی کے افراد کے ساتھ لوگ بہت زیادہ سادہ رہتے ہیں۔“ ان کی آنکھوں میں حیرت کی لہریں

کوٹھ کر سندر رام نے خود ہی سوئی کا تعارف کروا دیا۔ ”جی ہاں، ایسے اندازہ ہے۔“ انہوں نے سرسری لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور پھر ڈرائیور کے ساتھ ہوتے ہوئے۔ ”میری اس وقت آپ کے پاس آمد کا تعلق کچھ انہی افراد سے متعلق ہے۔“ معاملہ ایسا ہے کہ پولیس پانی آپ کے پاس منتقلی کے لیے آتی یا ہم اندر آپ کی ملازمہ کو کھانے بلوایا جاتا۔ لیکن آپ کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ کسی چھوٹے آفیسر کو آپ کے پاس بھیجے کے بجائے میں خود آ کر آپ سے بات کروں۔“

”ایسا کیا مسئلہ ہے ڈی آئی بی صاحب! کیا سوئی سے کوئی جرم ہوا ہے؟ لیکن وہ بے چاری تو کوٹھی سے باہر جاتی ہی نہیں۔“ سندر رام نے تشویش سے پوچھا۔

”سوئی کوٹھی سے باہر نہیں جاتی یہ تو میرے بھی علم میں ہے لیکن ہماری اطلاع کے مطابق انھارہ تاریخ کی شام آپ کی کوٹھی پر سوئی جیسے کی افراد کا اجتماع ہوا تھا۔ میں سوئی سے ان افراد کے بارے میں جانتے کے علاوہ اس اجتماع کی نوعیت کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”انھارہ تاریخ“ سندر رام نے سوچنے کے انداز میں اپنی چوٹی پر انگلی کی دھرتی دھرتی بلکی کی ضربیں لگائیں اور پھر بولا۔ ”انھارہ تاریخ کو میں کراچی میں تھا۔ اس دن کے لیے سوئی نے مجھ سے اجازت لے کر وہی گئی کہ وہ اپنی چند سہیلیوں کو دعوت پر بلانا چاہتی ہے۔ اس کی سہیلیاں ظاہر ہے، اس جیسی ہی ہوں گی لیکن اس وقت سے پولیس کو کیا پڑی ہوئی ہے؟ اس طرح کے لوگوں کا ایک جگہ اکٹھے ہونا اور یہ جیٹھا قانوناً کوئی جرم تو نہیں۔“

”میں نے اسے جرم کہا بھی نہیں ہے لیکن میں ایک جرم کی کھوج میں ضرور ہوں۔“ سترہ تاریخ کی صبح ایک لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اغوا کر لے والے خلیفہ سروس کے ایک ٹروہ سے قطار کھینچے تھے۔ پولیس نے اپنی تحقیقات کے ذریعے اس گروہ کے بارے میں کچھ کلیدز تو حاصل کر لیے ہیں لیکن وہ گروہ غالب ہو گیا ہے۔ میں سوئی سے مل کر اس بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے اپنا مقصد بیان کیا۔

”ٹھیک ہے، میں سوئی کو بلا دیتا ہوں لیکن اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ سوئی کی کئی بڑی بڑیاں گروہ کے افراد سے دوستی نہیں ہو سکتی۔“ سندر رام نے انہیں جواب دیا اور چھٹی کا منہ داکر سوئی کو طلب کر لیا۔

”مجھے سمجھنا صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ انھارہ تاریخ کو

تم نے اپنی کچھ سہیلیوں کو دعوت پر بلا رکھا تھا۔“ اچھی اچھی سہیلیوں کی تعداد اور نام سچے کھواوا۔“ سوئی کے حاضر ہوتے ہی انہوں نے اسے حکم دیا۔

”تعداد اور نام تو میں بتا سکتی ہوں صاحب لیکن سب کے سچے سمجھنے نہیں معلوم۔ اصل میں وہیں خود تو باہر آتی جاتی نہیں ہوں اس لیے مجھے کسی کا پتا لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ اس نے منہ بول کر جواب دیا۔

”پھر تمہاری ان لوگوں سے واسطی کیسے ہوئی؟“ انہوں نے خوشی سے سوال کیا۔

”آپ کو تو معلوم ہے صاحب کہ ہم جیسوں کا زیادہ تر گزارہ بھیک مانگ کر ہی ہوتا ہے۔ بس ایسا ہی ہوا کہ ان میں سے دو تین افراد ایک بار مانگنے کے لیے آئے تو پڑکھیا کر کے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے خود گیسٹ پر جانا پڑا۔ اپنے چھٹی ایک ایک بستی کو ایک گھر میں دیکھ کر ان لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے بات چیت شروع کر دی پھر پلٹے پھر دو دن میں جب بھی ان کا چکر لگتا، وہ مجھ سے مل کر ضرور جاتے۔“

سیٹھ صاحب بڑے دباؤ میں۔ مجھے اجازت ہے کہ میں دروازے پر آئے والے آفیسر کو جو چاہے دے دوں، اس لیے میرے بھائی بند جب بھی آتے خوش ہو کر جاتے۔ ان کی وجہ سے آہستہ آہستہ میری گھر بیٹھے دوچار اور سے بھی دوستی ہو گئی۔“ سوئی نے وضاحت کر لی کہ اس پر چلا جاتے ہوئے انہوں نے اپنی جیب سے چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور اسے انھارہ تاریخ کی دعوت میں شریک افراد کے نام لکھنے کے کو کہا۔ سوئی نے پھر افراد کے نام لکھوائے، ساتھ ہی ملاقات کے نام بھی بتا دیے۔ مکمل پچاسے نہیں معلوم تھے لیکن یہ قول اس کے بات چیت میں رہا ہی ملاقات کا ذکر تو نکل ہی آتا تھا۔

”اچھا، ذرا یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کسی کو تم پہچانتی ہو؟“ انہوں نے کارڈ سائز کی ایک تصویر اس کے سامنے کی۔ اس تصویر میں تین خواہہ سنا رہے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ چٹوڑ گروہ کے افراد کی یہ تصویر بڑی بگ و اد کے بعد ان کے ہاتھ آئی تھی۔ سوئی نے ان کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی پھر فریڈنگل پر واپس کر دی۔

”انہیں صاحب! میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔“ تصویر انہیں پڑا تو وہ نے اس سے یہ پتہ چلا۔ اس نے جس جات انداز میں تصویر کو دیکھا تھا اس کے بعد وہ اسی جواب کی توقع کر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے، تم جاکو۔“ انہوں نے یوں ہوتے ہوئے

اسے جانے کی اجازت دی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں ڈی وائی جی صاحب کہ انہو ہونے والی لڑکی کون ہے؟ آپ کی یہاں آمد سے تو میں لاپرواہ رہا ہے کہ لڑکی کا تعلق کسی بہت بااثر گھرانے سے ہے۔“ سندھ رام نے ان سے سوال کرتے ہوئے خود بھی ایک خیال بھی پیش کر دیا۔

”آپ کا خیال درست ہے۔ زیادہ تفصیلات بتانے سے میں متذہب ہوں۔“ انہوں نے اسے جواب دیا اور انہر کھڑے ہوئے۔ سندھ رام نے بھی فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ انہوں سے بولا۔ ”اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیے گا۔ سوئی بھی پروقت آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔“

”تھیک ہو!“ اس کی پیش کش کے جواب میں انہوں نے فطرتاً ہی کہا اور پھر اس سے ہاتھ داکر باہر نکل گئے۔ ڈرائیور کم گاڑی گاڑ دے انہیں دیکھتے ہی پھر پی سے گاڑی کا پیچھا دوڑا دھکول اور ان کے پیچھے کے بعد دو اور دھند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ گاڑی پور بیکو سے نکل کر مین گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار گیسٹ ہال چکا تھا حراں کے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی کیٹ سے باہر لے جانے کے بجائے درمیان میں ہی روک دی اور چوکیدار کو اشارے سے گاڑی کے قریب بولایا۔

”کیا تم ہے صاحب؟“ چوکیدار سمجھ گیا تھا کہ گاڑی رکوا کر اسے ہوائے والا کون ہے اس لیے جھکی فٹہ۔ پر پیٹھے تیار انا سے کھڑکی میں جھک کر پوچھا۔

”یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کوئی اٹھارہ بارش کو سونی کی طرف سے دی ہوئی دعوت میں شرکت کے لیے آیا تھا یا نہیں۔“ انہوں نے وہی تصویر جو کچھ دیر قبل سوئی کو دکھائی تھی اس کے آگے لہرائی۔

”مجھے نہیں معلوم صاحب! دعوت والے دن میں ڈیوٹی پر نہیں آتا تھا۔ چھٹی لے کر اپنی بھین سے ملے گیا ہوا تھا۔ ویسے میرے خیال میں ان میں سے کوئی دعوت میں نہیں آیا ہوگا۔ میں نے سوئی کی سبیلوں کو دیکھ لیا ہے۔ اس تصویر میں ان میں سے کوئی بھی موہم نہیں۔“ چوکیدار نے جواب دیا تو انہوں نے تصویر واپس دیکھتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا حکم دیا۔

اس وقت ان پر شدید بارش پڑ رہی تھی اور مینڈا جٹ طاری ہو رہی تھی۔ مینڈا کے بارے میں جو اہل علم و فضلہ وہ بھی جانتے تھے کہ کچھ اکیلا تھا اور وہ اس کی عمارت میں مقیم تھا تاکہ کام سے آج پہلی بار

انہیں ایسے افراد کا خیال آ رہا تھا جو عوام میں شمار ہونے کے باعث اپنی جان، مال اور عزت میں سے کچھ بھی گوانے پر پولیس اسٹیشن کے پکڑی کاٹتے رہ جاتے تھے لیکن انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اتنے بار بار ہونے کے باوجود اپنی بیٹی کو اوصاف نے میں نام کام تھے اور نہ کامیابی کا احساس دلاتی ہے۔ یہ اس کی دلی امید ہو یا غریب با آخرا تھیک ہی سچ پر کھرا نظر آئے لگتا ہے۔

جن جتنا دے نیرے نیرے ہو
دھول جانا دے نیرے نیرے ہو

بے سہری آوازوں میں گانے جانے والے گانے کے بولوں کا ساتھ نبھانے کے لیے پیشانی تھک دوڑا لوڑھے وہ سر جھکا کر مشتاقی انداز میں دھول بجا رہی تھی۔ دھول بھینہ ہونے کے باوجود دھول پر پڑنے والی ہر قاب بڑی ہی جی جی جس کی دھمک ہر ایک اپنے دل پر محسوس کر سکتا تھا۔ ملکہ رانی اور نگار جھکے لگتی دھول کی لے پر اپنی جھوڑی آواز میں لہک لہک کر جا رہی تھیں۔ ان کے گرد موجود مورتوں، بچوں اور مردوں کا بھی خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تالیاں بجا جاکر چند آواز میں داد دی جا رہی تھی لیکن یہ داد ایسی تھی جس میں تسکین کا پہلو بھی تھا۔ وہ قبیلہ تو شاید مادی میں اپنے لیے اور فقر سے اور مذاقی پر داشت کرنے کی۔ لیکن وہ جو بزرگان کے ساتھ شامل کی گئی تھی، ہر بار بڑی اذیت کے ساتھ یہ سب سہی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر غصہ اور نفرت کی سرخی تھی لیکن چہرے پر بے اہم طریقے سے بھی میک اپ کی مسوئی تھ کے باعث اس سرخی کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ ان تینوں کے ساتھ شام ہو کر اس کرنے والے دو چھپوں نے چاہا بھی کہ اس کے ساتھ چھپ چھپ کر کے اسے کچھ بولنے پر مجبور کر سکیں مگر وہ لب سے دھول بجاتی رہی۔ خدا خدا کر کے گانے اور ناچنے کا سلسلہ ختم ہوا تو حاضرین کی طرف سے پھار کے لیے ٹوٹ کھینچے جانے لگے۔ وہ اس کام میں بھی شامل نہیں ہوئی اور دھول کی دھڑپوں کی ایک طرف تھیں رہی۔

”خدا! آج رات اسے اذیتوں کا جانے کے لیے نہیں روک میں۔ ہم لوگوں کا آج رات ہنگامہ کرنے کا پروگرام ہے۔ پر اچانک سے دھول بجانا کسی کو نہیں آتا۔ یہ اتنا اچھا دھول بجاتی ہے، آپ اس کو رک لیں تو ہمارا کام بن جائے گا۔“ وہ سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف تھی کہ اسے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

”دماغ خراب ہے کیا؟ رات بھر اس جھوٹے کو یہاں روک کر مجھے لوگوں کی باتیں سننی ہیں کیا؟“ ملکہ کہہ کر ملک طرب کی جانے والی عورت نے سخت پیچھے میں جواب دیا۔

”کوئی نہیں سنا ہے گا بھئی۔ آپ کے سامنے کسی کی کیا مجال کہ کچھ کہے۔“ اس بار ہوشیارہ نے کام لیا کیا۔

”بالکل خالص! انہو۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ میک اور آواز سنائی دی اور پھر تو بیسے ساری ہی لڑکیاں اس عورت کے پیچھے لگ گئیں۔ لڑکے بھی لڑکیوں کی حمایت کرنے لگے۔ شاید انہیں نعرہ کا ایک عمدہ موقع تھا آتا نظر آ رہا تھا۔ آخر کار اس عورت کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کرخت آواز میں بولی۔

”چپ کر جاؤ کم بختو! ان لی ہے میں نے تمہاری بات۔۔۔ پر مجھے ان لوگوں سے تو پوچھ لینے دو۔“ پھر وہ اس کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ ”ہاں بھئی! کیا ارادہ ہے حیران؟ رات کی یہاں؟ پورے پانچ سو دوں گی۔“ وہ چپ رہی۔

”اس اسکی کو ہم رات بھر کے لیے یہاں نہیں چھوڑ کر جا سکتے۔ یہ بڑی سیدھی ہے۔ اسکی گھر اسانے کی۔“ ملکہ چوکر کی ٹھیکر موجودگی میں اپنی سیڑیوں کی تہ سے گروہ میں سب سے زیادہ متاثر ہوئی تھی، خود جواب دینے کے لیے آگے بڑھی۔

”تو تم میں سے کوئی ایک اس کے ساتھ رک جائے حفاظت کے لیے۔“ عورت نے نفرت سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، پر صرف پانچ سو روپے پر بات نہیں بنے گی۔ ساتھ ایک بوزار، مٹھائی کا ڈیا اور تھوڑا سا ناچ بھی دینا ہو گا۔“ ملکہ نے فوراً اس سے بڑی شروع کر دی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔۔ دے دوں گی۔ میری بھانجیوں بھینچوں نے فرمائش کی ہے۔ اب میں پاس کرنے کے بعد ان معمولی چیزوں کے پیچھے ان کا دل تو نہیں توڑ سکتی۔“ عورت نے بے حد شائبہ انداز میں جواب دیا جس پر وہاں موجود لڑکیوں نے زوردار نفرت لگائے۔

”میں رک جاتی ہوں تھوڑی سی کے ساتھ یہاں۔“ عورت کے ہاں بھرتے ہی نگار نے انہو پیش کش کی جسے ملکہ نے قبول کر لیا اور دیکھ کر نفرت پیچھے میں نگار سے ٹھٹھکی۔ ”دھیان رکھنا، اگر یہ اجہرا دھڑوئی تو کمرہ تیری کھال بچھ لے گا۔“

”مجھے معلوم ہے سب۔“ تو زیادہ باتیں نہ دے۔۔۔ نگار نے رعب میں آئے بھیر جواب دیا۔ اس جواب پر ملکہ نے اسے گھور کر دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں بولی۔ پھر وہ اوپر

رانی کچھ دیر بعد وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

”لو! میں اپنے لکھاوا لکھاوا لکھاوا۔۔۔ پھر بعد میں آرام سے گانے جاتے جھنڈا۔“ کرخت آواز والی عورت نے غرور سے ان کے گرد موجود ہجوم پیچھے لگا کر کھانے کے لیے ایک دوسرے کو آواز دی جانے لگیں۔ ”میں میں موجود لڑکے جو آئیں ان کے ان پر ہنس کر رہے تھے، وہ بھی کسی کے پاس پر اندر چلے گئے۔ ایک لڑکی نے پاؤں سے پھری دو تھیلان دونوں کو بھی لاتھا میں۔

”یہ اچھی مصیبت ہے۔ پیسے کے لالچ میں وہ لوگ میں رات بھر زلت کئے کے لیے یہاں چھوڑ گئے۔“ تنہائی نے ہی اس نے دھیمی آواز میں نگار کے سامنے اپنی ناگوار کوری کا ٹکڑا کیا۔

”بے وقوف! اچھا ہے کہ وہ لوگ لالچ میں جھپٹے ہاں چھوڑ گئے۔ سمجھ لے کہ ان کے لالچ کی وجہ سے مجھے آزادی حاصل کرنے کا ایک موقع مل گیا ہے۔“ دیکھتے تو سب غرور نظر میں گاڑ کر بیٹھے۔ ”ہے ہیں کہ تو دھڑا دھڑا کر رہا ہے۔“ ایک بڑا سا لقمہ میں ڈالنے ہوئے نگار نے اسے جواب دیا تو وہ حیران رہ گئی اور اس کی جی اہلی کے عالم میں پائی۔

”کیا مطلب ناچ تم مجھے یہاں سے گروہ کے اڑنے کے علاوہ کچھ نہیں اور جانے والی؟“ نگار نے زبان سے جواب لہجہ دیا، اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

”میں ہاتھ سے نکل گئی تو گھر و تہارا بہت برا حال کرے گا۔ یاد نہیں ابھی ملکہ جاتے جاتے کیا بول کر گئی ہے؟“ وہ غرور بھی اس ماحول سے قرار کی خواہش مند تھی۔ خصوصاً گروہ کا اصل روپ دیکھنے کے بعد تو اس کی نفرت کی گتائیں بڑھ گئی تھیں لیکن اپنی وجہ سے نگار کو مصیبت میں ڈالنا اسے گوارا نہیں تھا۔ نگار نے اس کی تنویر میں ان کا کان پر سے بھی اڑانے والے اعزاز میں ہاتھ ہلایا اور ہلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے قوار حلق سے نیچے اتار کر بولی۔

”گروہ کی ایسی کی تھی۔ اس کا گھر کے ذرے اس میں تھہر کر مزے ظم نہیں ہونے والی کی۔ مجھے نہیں آیا کھڑ میں سمجھ بھی ہوں کہ اس دن کر دیکھنے کس لیے اپنے ہاتھ لے کر تھا۔ اگر تو دیتی تے، وہی ہوتی تو اس لڑکی کی طرف جھپٹے بھی لوگ بی بی جڑا دیتے۔ اللہ سائیں کا کرم ہو کہ تو کبھی اسے لے کر وہاں نہ دیتی ہوگی۔ اب وہ مرد اور لڑکی لڑکی کو تو اپنی دہلی کے کچے بیوت چڑھا نہیں سکتے تھے، اس لیے مجھے پھوڑ دیا۔ پر جب تو پوری طرح ٹھیک ہو جائے گی تو گروہ بھر دو بارہ مجھے وہاں لے جائے گا۔“ نگار کی باتیں سن کر وہ بڑی طرح کا شب

بھئی اور نظریں بے ساختہ اپنے رفیق ہاتھ کی طرف گئیں۔ وہاں موجود دم منڈل ہونے لگا تھا۔ اس دم نے اسے بہت تکلیف دی تھی لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ تھوڑی سی تکلیف اس کی زندگی کی ضمانت بنی ہوئی تھی۔

”میں نے سوچ لیا ہے، ہم صبح ہونے سے نمودری ویر پہلے چپکے سے یہاں سے نکل جائیں گے۔ ان لوگوں سے رہنے میں رات میں ہی وصول کر لوں گی۔ تجھے جہاں جانا ہو، چلی جانا۔ میں اپنے کمر پہلی جاؤں گی۔ تجھے بھی میں اپنے ساتھ ہی لے جانی تو مجھے معلوم ہے کہ کروہاری عمارت میں سب سے پہلے وہیں پہنچے گا۔ میری تو خبر ہے۔ آخر کو میرے گئے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں۔ میری جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے لیکن تجھے وہاں بٹاؤ نہیں ملے گی۔ میرا اپنے گھر والوں پر بس چلنا ہوتا تو میں تجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جاتی، پر میں خود مجبور ہوں۔ ورنہ اللہ کو اسے کمر میرے دل میں تیرے لیے لگی بیٹوں جیسا پیار پیدا ہو گیا ہے۔“ وہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کر لی ہوئی فلم سے لہجے میں بولی۔

”تم میرے لیے جو کچھ کردی ہو وہ بھی بہت ہے۔ تمہاری اس قربانی نے تو مجھے میری اپنی بہن کی یاد دلادی ہے۔“ اس نے نگاہ کا ہاتھ تمام کرکھ کر لہجے میں جواب دیا تو وہ دوسرے ہاتھ سے پیار بھرے اعزاز میں اس کا ہاتھ سنبھالتے ہوئے چپک چپک دم ہی اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

”چل بہت، خود تو بیکو کھاتی نہیں۔ لے کر میرا بھائی بھی لے کر اکر داری ہے۔“ یہ کہنے کے ساتھ اس نے گنگو کے دوران ایک طرف رکھ دی جانے والی اپنی پلیٹ دوبارہ اٹھالی۔ شہزادی بھی مسکراتی ہوئی اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھیں کہ لڑکیوں نے آکر انہیں گھیر لیا۔ محسن میں بڑی سی دہری پر جاندہ ناپ بھرا کر محفل جمائی تھی۔ بھائی بھینوں، اخترین اور پائنتائی ملی گانوں اور باپ سنگرز کے گانے مشہور مان گیتوں سمیت ہر شے کی ہنگ تڑی جانی لگی۔ نگاہ ان لڑکیوں کا ساتھ دینے میں جوش جوش تھی، البتہ اس نے حسب معمول ہونٹ سی لیے تھے۔

”اے پیو، اندر چل کر کھاتے ہیں۔ جس کی خاطر ہم اپنا گلا چاڑھ رہے ہیں وہ مختصر تو آرام سے سو رہی ہیں۔ ذرا اس کے سر پر بھی تو جا کر ہانک دیا جائے کہ اسے چاہیے کہ بیاہ کر کوئی ایسی آسمان بات نہیں۔“ کہتے ہوئے ایک لڑکی نے آئینہ یا دیا جسے سب سے پہلے کمر چار ہائیوں پر ذرا

فاصلے پر بیٹھے لڑکے احتجاج کرنے لگے۔ انہیں ہائیوں شیشی دہن کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی اور لڑکیوں کے اندر چلے جانے کی صورت میں ان کی تعزیت ختم ہو جاتی۔

”نہجک ہے تم سب اندر جاؤ گھر ان دونوں کو بیٹھیں۔“ وہ بڑے گام۔“ ذرا سی بیٹ کے بعد شہزادی اور نگاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک لڑکے نے شروع کر دیا۔

”انہیں تو تم نہیں روک سکتے۔ انہیں تو ہمارے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہو گا۔ ہم نے خال سے کہہ کر انہیں روکا ہے۔“ ایک لڑکی نے چنک کر جواب دیا۔

”لیکن خال نے نمودریں اور لڑکیوں کے سوا کسی اور کو دہن کے کمرے میں جانے سے بھی تو منع کیا ہے۔“ اسی لڑکے نے اعتراض کیا۔

”ہاں تو یہ کون سا مرد چن؟“ لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”نمودری بھی تو نہیں۔“ فوراً اعتراض ہوا جس پر سب نے زوردار قہقہہ مارا۔ سو پہے بغیر کہ ان کے اس بھئی فضول پر کسی کی دل آزاری ہو رہی ہے۔

”تم جو بھی کہو، ہم انہیں اپنے ساتھ اندر لے جائیں گے۔“ بھئی کا طوفان تھا تو لڑکیوں نے سرسبز بردہ دینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کو اپنے فریضے میں لے کر اندر دینی حصے کا رخ کیا۔ وہ سب انہیں لے کر جس کمرے میں داخل ہوئیں وہاں ایک لڑکی زرد لباس میں چار پائی پر کھین ہوئی تھی۔ لباس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ لڑکیوں کو کمرے میں آتے دیکھ کر وہ چار پائی پر اٹھ بیٹھی اور حیرت سے انہیں سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

”بہت سوئیں بی تو اب کچھ دیر ہمارے ساتھ جاؤ۔ ہم باہر بھی نہیں کرے گی شادی میں عبد اللہ بیوانے بے رہیں۔“ کہیں بھی جارہا تھا دہنا ہو گا۔“ اس کی نظروں کے سوال کا جواب فوراً دیا گیا۔

”میں بہت تھک گئی ہوں۔ سوتا چاہتی ہوں۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

”کل دن مجسوں لیانا۔“ بے بسی بھی ابھی تو تمہارے مہندی بھی لگانی ہے۔“ اس کے لیے تو تمہیں جاگنا ہی پڑے گا۔“ اس کی بے زاری کی قطع پر اٹھ کرتے ہوئے کسی نے کہا اور پھر جس کو جہاں چاہی، وہ وہاں بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر کانے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی اتنی ہی چار و چوٹی سنبھال تھا۔ عام حالات میں وہ رات بھر بھی یہ کام کر لیتی تھی لیکن اب ہاتھ کا نظم ہے حد تکلیف

دینے لگا تھا اس لیے وصول ہونا روک دیا۔

”یہاں۔“ لڑکیوں وصول نہیں ہوا رہیں۔“ لڑکیوں نے فوراً شہزادی شہزادہ کو روک دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔

”اؤں اللہ! میں تو بھول بی گئی تھی کہ تیرا ہاتھ دہنی سے لا مجھے۔“ وصول، میں بھائی ہوں۔“ نگاہ سب سے پہلے اس کا مسند بھی اور فوراً اس سے وصول لے لیا۔ وہ ایک طرف ... ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ کئی دن بیمار ہی تھی اس لیے ابھی تک کمزوری بہت تھی۔ انہی دیر کی محنت نے اور بھی تھکا دیا تھا۔

”تم نے اگر جانے والی پیو کو آرام دینے کے لیے اس نے چار پائی کے پاس سے پشت نکا دی۔ اسی وقت اس کی نظر چار پائی کے نیچے پڑی ایک پاسپورٹ سائز تصویر پر پڑی۔ تصویر میں موجود چہرہ اسے کچھ آشنا لگا۔ اس نے ہاتھ پر جا کر تصویر کو چپکے سے دیا ہے اٹھالیا۔ تصویر میں موجود شخص سے وہ واقعی واقف تھی۔ اس شخص کی شناخت ہو گئی تو اس نے سر موڑ کر دہن کا جائزہ لیا۔ زرد رنگت والی بے زار صورت دہن یقیناً اس شادی پر خوش نہیں اور اس کے خوش ہونے کی وجہ بھی اس کی بھوتہاں آتی تھی۔

”اسے لڑکیوں یا لڑکوں کی قانون آتا ہے کہ اس کی پہلی فوت ہو گئی ہے اس لیے وہ مہندی لگانے نہیں آ سکتی۔ اب تم لوگ خود ہی کچھ کر لو۔“ اسی وقت وہی لڑکت آواز والی صورت کمرے میں آئی اور اپنی مخصوص آواز میں اطلاع دی۔

”ہائے اللہ! اب کیا ہو گا؟“ لڑکے کو کوئی بھی مہندی لگا دے، پر دہن کے ہاتھوں میں پڑے ہوئے بڑی ابھی مہندی لگنی چاہیے۔“ لڑکیوں فوراً شہزادی سے لگیں۔

”میں لگا دوں لیکن تو مہندی لگتے بڑی ابھی مہندی لگانی آتی ہے۔“ ان کی پریشانی دیکھ کر اس نے بھاری آواز میں جوش کر کے۔

”ہیں۔ تم بولی گئی ہو؟ ہم تو سمجھے تھے تم کوئی ہو۔“ اس کی زبان سے نکلنے والا یہ سلاظہر بھی کہ ایک لڑکی نے حیرت کا اظہار کیا، وہ جو باؤ مارا مسکرا کر رو گئی۔

”پہلو تم ہی لگا دو۔“ چار و چوٹی، مہندی لگانے کے سرف سرف سے ادا کی۔ زیادہ دن مت کھانا۔“ عورت کا تو جیسے مسئلہ محض ہو گیا تھا اس نے اس کی پیشکش قبول کر کے ہونے ساتھ ہی اپنی شہزادی عمارت اس نے فوراً ہی منظور کر لی۔ ایک لڑکی نے اسے کون مہندی لگا دے دی۔ وہ اوپر چار پائی پر دہن کے مقابل بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تمام کر چمکی ہوئی چمکی پر تصویر پر دھنی۔ تصویر دیکھ کر وہ چونک گئی اور بیلدی سے ارد گرد نظر ڈالی۔ عورت باہر جا چکی تھی اور لڑکیاں دوبارہ

بے گانے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر چری تصویر فوراً اپنے نیچے کے خلاف میں چھپا لیا۔

”تم کچھ ہو؟“ کون مہندی دیا میں ہاتھ میں سکاراں کی ہتھیلی پر چمکی پھیر دانتے ہوئے اس نے بھی آواز میں پوچھا۔ اس سوال پر اسے بہت زوردار ہنسا لگا۔

”تم۔“ تم کون ہو؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ اسے بخور دے ہوئے کہہ بیٹھے تھی۔

”میں جو بھی ہوں، اتنا جانتی ہوں کہ میرے سر سے اور ہلم سے محبت کرتا ہے۔“ کئی تم سرمد کی محبت نہیں کھینچو؟“ انہوں اور گانوں کے درمیان ان کی بے حد دھیمی آواز جھرنی گئی گنگو کی کونسا کی نہیں دے رہی تھی۔

”ہاں، میں نیلم ہی ہوں۔ سرمد کی نیلم۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔

”یقیناً سرمد تمہارے ماں باپ کی شہزاد کے مطابق کسی باعزت نوکری یا کاروبار کا انتظام نہیں کرے گا اس لیے اب تم کسی اور سے شادی کر رہی ہو؟“ اس نے ایک چیخ بھرا سوال کیا۔

”ماں باپ کی شہزادیں صرف سوئیں کی شہزادہ یا عورت جو ابھی اندر آئی تھی، میری سوئیں ماں ہے۔ اس نے میرے ابا کو بھکا کر سرمد کا رشتہ قبول نہیں ہونے دیا۔ شہزاد سے اس کی خواہش تھی کہ میری شادی اس کے بیٹے، نندہ اور سے، چار پائی کے باپ کو دولت مند بولی کر دے ہو جائے۔ وہ غیبت بھرے ابا کی اس عورت سے شادی کے بعد سے ہی مجھ پر نظریں لگا کر بیٹھا تھا۔ حالے میری سوئیں ماں نے میرے باپ کے کسی طرح کان بھرتے کہ وہ بھی ان رشتے پر راضی ہو گیا۔ مجھے تو لگے کہ یہ عورت میرے ابا کو کوئی شے والی چیز پلاتی ہے جس کی وجہ سے وہاں مارا مارا یا تو سوتے رہتے ہیں یا کمر خیمے رہتے ہیں اور اس کا جو بیٹا جائے، وہ من مانی کرتی پھرتی ہے۔ شہزاد میں تو اس نے مجھے بھی بہت بے وقوف بنایا اور یہی لار سے بے یقینی رہی کہ سرمد کوئی باعزت کام کر لے تو مجھے اس سے بیاہاں کی۔ اس کی باتوں میں آکر میں سرمد پر ذرا نیور ہو چکا ہوں کے بے زور ادا کرتی رہی اور پیچھے سے اس نے چپکے سے جو رشتہ بھی کر دیا۔ جس دن سے شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے اس گھر سے قدم نہیں نکال سکی۔ ہر وقت اس کا کوئی نہ کوئی بوجھ، جیسے بیاہ روراز سے پریشانیاں اور بھرتا ہے کہ میں کھڑے ہر قدم نہ رکھ سکوں۔“ ایسے میں بھلا سرمد سے کیسے رابطہ کرتی؟“ اس نے سارا حال کہہ سنایا۔

”میں تمہیں یہاں سے نکال سکتی ہوں۔“ کچھ دیر غور و
فوض کرنے کے بعد وہ بولی تو غیم جو تک بڑی۔
”وہ کہتے؟“ وہ اس کے ہاتھوں پر نقش و نگار بنا رہے
ہوئے دھیمی آواز میں سارا منسوبہ اسے سمجھنے لگی۔ اس کا
منسوبہ جس کریم کی آنکھوں کی ٹہنی بولی پتکے لٹنے لگی۔
”تمہارا یہ احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“
”اس احسان کے بدلے میں تمہیں بھی ایک کام کرنا ہو
گا۔“

”میں تو یہی کہوں گی کہ تو ابھی طرح سوچ لے۔ کہیں اس ہمدردی کی وجہ سے تجھے خود اپنے کے اپنے نہ پر جا میں۔“ نکالنے والے نے سبھا نے کی کوشش کی۔

نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ شہزادی کی آمد سے پہلے وہ اپنے پاس موجود تھوڑی سی رقم کو بھی اسی جگہ رکھ چکی تھی۔ کمرے سے باہر قدم رکھتے سے پہلے وہ شہزادی سے کرم جوئی انداز میں گلے ملی اور درختی صوفی آواز میں بولی۔

میں اسے جواب دے۔

کامی بات پر یقین نہیں کر سکتے۔ ہمیں تمہارے گھر کی تلاشی لینی ہوگی۔" ملکہ کی گتھی پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے پولیس والے نے اسے جواب دیا۔ ملکہ کی حالت سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی ٹھیک ٹھاکہ حرمت دہی ہے۔ شاید اس حرمت کے نتیجے میں ہی وہ اپنی رہنمائی میں پولیس والوں کو یہاں تک لے کر آئی تھی۔ دروازے کے پیچھے جڑی شہزادی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پولیس والے کی زبان پر سے آواز نہ آنے کا سن کر وہ سمجھ گئی کہ کون لوگ ہیں جن کی وجہ سے پولیس اس کا سراغ لگاتے لگاتے یہاں تک پہنچ گئی ہے۔

"شریفوں کے گھروں کی تلاشی ایسے نہیں کی جاتی صاحب! پہلے وارنٹ لکھاؤ پھر تلاشی لیں۔" عظیم کی سوتیلی والدہ نے اپنی قانون دانی بھجھاری۔

"کیوں ہے کار میں روڑے لگا دینی سے رشیدہ لینے دے؟ انہیں تلاشی۔ تیرا کیا چارہ ہے؟" اس نے کار میں ہر بات میں اپنی قابلیت بھجھانے کا شوق ہے۔ "اسی وقت ایک مردانہ مداخلت کرتے ہوئے تیز و فطرد رشیدہ کو بھڑکا۔ وہ مرد شاید عظیم کا باپ تھا۔

"تم چپ رہو۔ معلوم ہوئی ہے شادی والا کمرہ ہے۔ بری کے زور، پڑوں کے علاوہ وہیں بقی چیزیں قی رچی ہیں۔ ان پولیس والوں کا کیا مجروسہ؟ اس کی تلاشی کے بھانے کیا پتہ چار کر نہیں کوئی چیز مہوئی تو ہم سلطان کو کیا جواب دیں گے کہ اس کی بھجھوٹی ہوئی چیزیں کہاں ہیں؟" وہ عورت یقیناً بدگلی میں اپنی مثال آپ تھی جو پولیس والوں سے بھی دہیے کے لیے تیار نہیں تھی۔ عورت کے الفاظ سن کر اسے اندازہ ہوا کہ اب پولیس والے ہر طرح کی تلاش میں آجائیں گے اور بھڑکا مزید بڑھ جائے گا، چنانچہ جس سے خود ہی باہر نکل کر ان لوگوں کے سامنے آجانا مناسب سمجھا۔

"یہ دیکھو۔ یہ رہی شہزادی۔ ان لوگوں نے بھڑکا کو بھی کہیں اندر ہی چھپا ہوا ہوگا۔" سب سے پہلے ملکہ کی اس پر نظر پڑی اور وہ زور سے ہنسی۔

"گدا اندر نہیں ہے۔ وہ عظیم کی لے کر چلا گیا وہ بھڑکا عظیم ہے۔" اس نے پولیس آفیسر کے بالکل برابر میں کھڑے ہوئے ہوئے نہایت اطمینان سے تاکید اس کے اس انکشاف پر دیا جس کی بچی تھی۔

"کیا ایک مرد ہے؟" وہ کہاں لے کر چلا گیا وہ بھڑکا عظیم کو رشیدہ اس پر پہنچنے کی کوشش کی جسے ایک پولیس والے نے اپنے ہاتھ میں سمجھ کر زوردار ہاتھوں میں اڑا کر ناکام بنا دیا۔

"وہاں، جہاں وہ اس فلم سے محفوظ رہ سکے۔ جو قریب کی شادی اچانک میں ایک بوڑھے سے کر کے اس چہرے پر چاہتی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"ہائے ہاؤ مرلے گئے۔ براہ دہی گئے۔ دیکھو عظیم کے ایا تمہاری بیٹی تمہارے منہ پر کالکٹ کر چلی گئی۔" وہ چہیت چہیت کر دوا دیا کرتے تھے۔

"یہ کیا مسئلہ ہے بی بی؟" پولیس والا اس سے مخاطب ہوا۔

"مسئلہ بہت صاف ہے آفسر! یہ عورت عظیم کی سوتیلی ماں ہے جو اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی زور دیتی ہے۔ بڑھے سے کر رہی تھی۔ رات میرا عظیم سے سامنا ہوا تو وہ میری جاننے والی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں اسے یہاں سے نجات دلا دوں گی۔ وہ میرے کپڑے جاکر کر لگا کر کے ساتھ یہاں سے نکل گئی۔ اب تک امید ہے کہ وہ محفوظ جگہوں میں پہنچ چکی ہوگی۔" اس نے مختصراً سنا دیا تھا۔

"مگر قریب لیں اسے! آپکے صاحب! اس پر انوکھا کر پھرنے کا نہیں۔ اس نے میری بیٹی کو درغاہ کر کے بھڑکا دیا۔" رشیدہ نے شور مچایا۔

"پرچہ تو تمہارے خلاف کتنے چاہیے۔ تم ایسے ساقی، بالنگ لڑکی کو نہیں بے جا جانی دیکھ کر اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر رہی نہیں۔ یہ لکھا برا جرم ہے پتہ اندازہ ہے تمہیں؟" اس نے وہ دہو جواب دیا۔ پولیس کو محفوظ جاننے کے باعث ان کا بھڑکا ہوا اختیارات کو کیا تھا اور وہ اپنی سادہ جوتوں میں لوہے رہی تھی۔

"اس مسئلے کو بعد میں دیکھیں گے بی بی! ابھی آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمیں اوپر والوں کو آپ کے منہ سے جاننے کی رپورٹ بھی دینی ہے۔" انہیں ملنے سے مداخلت کرتے ہوئے بحث کو بڑھنے سے روکا تاہم اس کا جو سونہا ہوا تھا۔ اس نے انہیں کی بہت مان لی فوراً ہی ان لوگوں کی وہاں سے روانگی فلم میں آئی۔ پیچھے عظیم کے خاندان والے شور مارتے رہ گئے۔

"ان لوگوں نے ساتھ گرا لیا اس بھی گرفتار کیا۔" انہیں رات میں اس نے انہیں بچا دیا۔

"تو کون سا مرد ہے؟" انہیں ملنے سے انہیں ہی اس سے بچا دیا۔

"وہ تھا۔ آپ بتا میں آپ کیسے ان لوگوں کے ہاتھ تک نہیں آئی؟" اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہیں نے اس کے بارے میں جانتا چاہا۔

"یہ ساری تفصیلات میں صرف انہی کو بتا سکتی ہوں جن کے حکم پر آپ نے مجھے تلاش کیا ہے۔" اس نے انہیں کو کچھ بھی بتانے سے گریز کیا۔ وہ اسرار نہیں کر سکتا۔ چھٹی اوپر سے آواز ملے تھے، اس نے یہی اندازہ ہوا تھا کہ لڑکی کا تعلق کسی بہت اونچے خاندان سے ہے۔ اپنے لوگوں کے معاملات کے بارے میں ضرورت سے زیادہ کچھ نہ لگانے سے احتیاط ہی اس کے لیے مناسب تھا۔ اس کا جیس اس کے لیے کسی مصیبت کا در کھول دیتا۔ اس کے مقابلے میں یہی مناسب تھا کہ وہ خاموش رہے اور لڑکی کی بازیابی کا کام نہ انجام دینے کے بدلے میں ملنے والے انعام کا ترقی کا انتظار کرے۔ تھانے پہنچ کر ملکہ کو حوالہ میں دیکھ لیا اور اسے احرام سے اپنے کمرے میں بٹھا کر انہیں فون پر کسی سے بات کرنے کا تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔

"میں نے اوپر اطلاع کر دی ہے۔ وہاں سے فوراً آجائے تو ہم آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیں گے۔ جب تک آپ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ اگر کہیں تو ہاتھ ملکواؤں؟"

"نہیں۔ اب میں گھر پہنچ کر ہی بات کروں گی۔" انہی نے یہ موقع نہ ہلنے سے انہیں میں جھکا کر دیا تھا۔ خالی بیٹ ہونے کے باوجود اس کیفیت میں اس کا کچھ بھی ملنے کے دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"نہیں ہی آپ کی مرضی۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ صرف مجھے ملنے والے ہوں۔" اسے اپنا خوش اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ستری کو بلانے کے لیے کھینچ کر بلایا مگر ستری کی آمد سے جس ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجے تھی۔ اس نے فون اٹھایا اور دوسری طرف کی بات سن کر انہیں سرسبز کی ہی گردان کر رہا۔ فون بند ہوا تو وہ کھینچ کر آواز پر انداز آئے والے ستری کو اپنے پیچھے ارادے کے مطابق حکم دیا بھول چکا تھا۔

"سب کو اسے کر دو۔" آئی بی صاحب! اور ہی بی صاحب خود ان قانون کو لینے یہاں آ رہے ہیں۔ وہ چندہ محض میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔" اس نے غصہ پڑھنے کی حدود میں قمر خرم کی کھینچ لی۔ پتہ ہوا کہ منت سے دھننے میں دوڑ کر وہ کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ انتظار کے چندہ منت پولیس والوں کے ساتھ اس کے لیے بھی بڑے لگانا خیر تھے۔ آخر کار یہ پتہ چلا کہ منت گرا رہی تھی اور باہر سے جوتوں کی شخص کو نہ لکھ سکتی دینے کی جوت بات کا ثبوت

تھی کہ آئے والے آچکے ہیں اور باقیات افراد سے سبھی ہر موصول کر رہے ہیں۔ انہیں اپنے اعلیٰ افسران کے استقبال کے لیے نوکری سے بے ہرنگ کر چکا تھا۔

"آئیے سر پلیز! آپ کی مطلوبہ نمائندہ اندر موجود ہیں۔" باہر سے اس کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ ہی دیر افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر اپنی خاطر وہاں آنے والے آئی بی اور وی آئی کی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان دونوں کے چہروں پر یہ بیک وقت حیرت اور مایوسی کا اثرات ابھرے۔

"تم کون ہو؟" وی آئی بی جی بھڑکانا سے سرسبز آواز میں بے مشکل یہ سوال کیا۔

☆ ☆ ☆

"اماں! میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھ سے بالکل بھی یہاں بیٹھا نہیں جا رہا۔ میں جو ٹی بی وائیں چلاؤں گی۔" کشور نے منہ بناتے ہوئے اپنے ہاتھ بھینچ پھینچ کر دھڑکا۔ اس نے کہا۔ اس سیت جو ٹی بی کی تمام خرابیوں ان وقت اپنے ٹی بی اوس کی اختیاری تقریب میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ بنیادی طور پر تو اس تقریب کا بہت سلاوی سے منعقد کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا لیکن اوپر دیکھا کہ یہ دوسری افکار کو اپنے شایان شان محض نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بڑی زوردار اس افتتاح کے لیے خاص طور پر جو بی سے باہر نکلے گی اس لیے تقریب کی زوردار ہوئی جاوے گی۔ اس زوردار تقریب کا انتظام اس نے اپنے لیے سے کر دیا تھا۔ اس وقت بڑے سے پنڈتوں میں جو بڑے گاؤں کی عورتیں جمع تھیں۔ ان عورتوں کے بیٹھنے کے لیے وہاں بھجائی گئی تھیں جبکہ ٹی بی کی معزز خواتین اوپر اسٹیج پر بھی شان دار کرسیوں پر بٹھ گئیں۔

اسکول کی اختیاری تقریب کے موقع پر پیش کیے جانے والے درسی پروگرام کی خبر جو ٹی بی تک پہنچی تھی۔ اس تقریب کو بھی وہی رنگ دینے کے لیے بڑی زوردارانہ لے فرمائش کی تھی کہ وہ عورتیں جن کی آواز انہیں بے باور تا جانا چاہتی ہیں ان پر آکر اپنے کان کا مظاہرہ کریں۔ فورتوں میں تقسیم کرنے کے لیے وہ بہت سے تھانے بھی اپنے ساتھ بیک کر دیا کرتی تھی۔ کشور کی مدد سے اس نے ان موقع کے لیے ایک تقریر کی بھی تیاری کر لی تھی۔ لکھتی پھاٹا ماسا پر اس کا تھا جس میں کافی وقت لگا بلکہ کشور نے اس منٹ سے بھی کم عرصے میں ضروری کیفیت کرتے ہوئے جو ٹی بی وائیں جانے کی فرمائش کر دی تھی۔ اس کی یہ فرمائش من کر لی گئی

پندال کے باہر ادا ہوئے اس طرح کاڑی لکڑی جسی
گراے کھلے آسمان سے، قدم بھی نہیں چلایا۔ وہ جیسے ہی
کاڑی کے نیچے دروازے سے گزرا کہ بجلی نشست پر بیٹھی،
رائی نے بھرتی سے دروازہ بند کر دیا خود دروازہ کے ساتھ
والی اگلی نشست پر جا بیٹھی۔ دروازہ نے غور سے کاڑی کے

انہیں یہاں چڑھا دے جگہ یہاں سے قریب ہی تھی۔
وگرہ کوئی گھٹیت نہ ہوئے اور گاؤں کی تمام عورتوں کے
قریب میں شرکت کے لیے چلے جانے کے باعث یہ بارگاہ
میں تھا کہ کوئی مشورہ کو کیمرہ کچان پہنچانے کے لیے
سے ملتی وہ وہاں ایک مکان کے سامنے جا کر رہیں۔ یہ وہی
مکان تھا جو آفتاب اور اس کے ساتھی بچے کو زور بٹھانے کے لیے
لیا گیا تھا۔ رانی نے دھنک دینے کے لیے وہاں سے چمک
لکھا تو وہ سچے کے زور سے کھٹکنا چلا گیا۔ کھلے دروازے کے
دوسری طرف میں کھٹکنا اس آفتاب صاحب نظر آ رہا تھا۔ وہ

آپ نے کی بھی، میں نے اس کا احترام کیا۔ اب ایک شہر
بھر کے مولیٰ ہے کہ اس کی میٹھا کھانچو چھوڑیں دھارے
جاگو اسے قراء ہے۔ آپ کو میرے دل کی آہیں کا احترام
کرنا ہو گا۔ اس کے ساتھ راستہ ساتھ کی خدمت مضبوط

صاحب کے حرم میں جیسے کہ یہ بات آئی اور اس سے سابقہ
 کے کچھ بھی نہیں ملتا۔ کہیں کے۔ اپنے ہاتھوں پر رکھنے
 کے ہاتھ کو جو دم کہنے ہاتھ میں لیتا ہوا اور کچھ کے ہاتھ
 میں اپنے کسی کچھ کو نہیں سستا چاہتی۔ ہم اگر کم آتے
 ہوں تو ہرگز نہیں۔ میں آپ کی کتاب سناؤں گے اور

سال گرہ کی خوشی سارے خدشے اور واسے بھول کر مناتا چاہتی ہوں۔ میں نے اتنا خطرہ مول لے کر یہاں تک آئے گی راہ اس لیے نہیں نکالی کہ میں ایسی جھوٹی کی باتیں سنوں۔ اس کے بجائے حق کا ٹھکانہ رہی۔

”تھیک ہے بابا اب نہیں کروں گا ایسی باتیں۔ آپ ایک تو کاٹیں۔“ اس نے فوراً ہی معذرت کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پھری ٹھوکی اور ایک پرگی موم جیال روشن کرنے لگا۔ کشور نے ایک کاٹا اور ایک چھوٹا سا تھیں اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ڈراما کیا کہ وہی تھیں اپنے ہاتھ سے اسے لگایا۔ وقت کے ان لحاظ میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ مکن پر طرح کے اندیشوں سے آزاد اور بے فکر ہو گئے تھے۔

”لائیے اب میرا تھوہ دیجیے۔“ کشور نے اس سے فرمائش کی تو اس نے ایک کے قریب رکھی ٹھوکیوں میں سے ایک کتاب اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس نے کتاب کھول کر دیکھی۔

”ابھی زندگی کی سال گرہ پر اس کے لیے چھوٹا سا تھوہ۔“ پہلے ہی غصے پر خوب صورت سنہری زروف میں یہ تحریر لکھی ہوئی تھی۔ کل رات فون پر ٹھٹھو کے دوران اس نے کشور کو بتایا تھا کہ اس کے کلمہ پر مشتمل کتاب پیسے کر چکی ہے۔ فی الحال کتاب کی درآمدائی کی تقریب ہونے لگی تھی لیکن جاپیشہ نے اسے کتاب کی چند جلدیں بھجوا دی تھیں۔

کشور اس کی زبانی یہ اطلاع سن کر بے چین ہو گئی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ کل اس کی سال گرہ سے اور اس موقع پر اسے یہ کتاب آتو کراف سمیت تحفے میں دی جائے۔ مطالبے کے ساتھ ہی اس نے سارا منصوبہ بھی طے کر لیا کہ وہ کیسے انڈسٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب سے بھانہ کر کے لٹکے گی اور اس تک پہنچ جائے گی۔ آفتاب نے بڑی کوشش کی کہ اسے اس ارادے سے باز رکھے لیکن اس پر دھن سوار ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنی سال گرہ کے موقع پر اس سے اپنا من پسند تحفہ اپنی من پسند جگہ پر آکر وصول کرنا اس کا حق ہے۔ آفتاب اس کے اس حق کو پہنچ نہیں کر سکا اور اب وہ تینچا بیٹا بن گئی۔

”یقیناً جائے آفتاب۔ پوری زندگی میں یہ تو کبھی پہری سال گرہ کا دن اتنا خوب صورت گزارا اور نہ ہی کوئی اتنا شان دار تھوہ ملا۔“ شکر یہ کہ اگر محبت کے اصولوں کے خلاف نہ ہوتا تو میں آپ کا شکر یہ ضرور ادا کرتی۔“

”شکر یہ ادا کرنے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ جو اب

آپ بھی مجھے اس خوب صورت موقع پر ایک تھوہ دے سکتی ہیں۔“ اس کی بات سن کر اس نے مسکراتے ہوئے مضمرہ نکالا۔

”میں تو اپنے ساتھ کچھ لائی ہی نہیں۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔

”مجھے ساتھ لائی ہوئی کوئی چیز بھی ہے بھی نہیں۔ میں اپنے ہاتھ سے چند اقل لکھ کر میری اس کتاب کی قیمت بڑھا دیں۔“ اس نے کتاب کی دوسری جلد کھول کر اس کے صفحے رکھی اور اپنی بیسب میں انکا پین نکال کر اسے تھمایا۔ وہ چین تمام کرتے بھر کے لیے کچھ سوچتی رہی پھر کتاب کے صفحے پر لکھنے لگی۔ وہ سامنے کھڑا اسے اتھک سے دیکھتا رہا۔ بہت سیلف سے اڑھائی گئی چار اب کچھ بے ترتیب ہو گئی تھی اور چار کے صفحے سے بھاگتا اس کا ہلکے ہنر رنگ کا لباس اسے متوجہ کر رہا تھا۔

”آج کی تیاری میرے لیے کی تھی تو پھر مجھے ہی کیوں محروم رکھا گیا؟“ وہ کتاب پر اس کے قریب فرمائش کرنے کے بعد فارغ ہوئی تو اس نے شکوہ کیا۔ وہ خود اس کا مطلب سمجھ گئی اور پھر سے پر سرخی سی وڑ گئی۔ تاہم اس نے آفتاب کی فرمائش روکنے کی اور بڑی سی چار اٹار کر ایک طرف رکھ دی۔ چار کے نیچے اس نے ہاروت کے لباس کا کیم رنگہ روہا اڈوہ رکھا تھا۔ داہنے سے کناروں پر بہت خوب صورت سی مثل لگی ہوئی تھی۔ چار بہت کا یہ روہا چار کی طرح اس کے جسمانی فطرت کی پر وہ پٹی کرنے میں ناکام تھا اور اس کے وجود کی رہنمائی خوب خوب اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ آفتاب نے پہلی بار اسے یوں بغیر چار کے دیکھا تھا چنانچہ اپنی نظریں اس کے وجود سے ہٹانے میں ناکام رہا۔

”بہت دیر ہو گئی۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔“ وہ غورت تھی۔ اس کی نظروں کی زبان پر بڑھ رہا تھا اس کے لیے بہت آسان تھا۔ چار چنانچہ کھڑی پر بندھی کھڑی میں وقت بگھٹی ہوئی گھبراہٹ شرمائی ہوئی بولی اور ایک جانب رکھی اپنی چار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”مست جاؤ۔“ تھیں میرے پاس ہی رہ جاؤ۔“ وہ بے قرار ہو کر آگے بڑھا اور اسے اپنی ہاتھوں کے مصار میں لے لیا۔ کشور کسی قسم کی طرح سادگت ہو گئی۔ آفتاب کے ہوت اس کے پیروں کے خدو خال سے گھٹکھٹکے لگے۔ یہ وہی سے پیا ز میں پر بارش کے چند پھینٹے پڑنے والی بات تھی جن کے سبب زمین میرا بے ہوشے کے بجائے مزید دلچسپ ہے۔ وہ بھی جذبات کی کشور سے دھک رہی تھی۔ اس پر

بڑے دلا بادل بھی ایسا تھا جو وادی وادی گھوم کر آنے کے باوجود کسی سرزمین پر نہیں برساتا تھا۔ یہ بادل محل کر رہا تھا تو زمین میرا بے ہو جاتی لیکن اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دھک ہوئی۔ وہ دونوں اپنی انجی انجی سانسوں کو سنبھالتے کچھ دم ہوش میں آ گئے۔

”بجائزت ہے۔“ وہ جانتی تھی کہ دھک دینے والی رانی ہے جس نے اسے وقت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے اس لیے بھرتی سے چار اٹھا کر اپنے گرد لپٹی اور بھی نظروں سے آفتاب سے سوال کیا۔

”یاکل۔“ اس نے جواب دیا تو کشور نے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے۔

”میری گستاخی نا گوار گزری ہو تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔“

وہ پیچھے سے آہستہ آواز میں بولا تو وہ تپ کر مڑی اور شکوہ کنان انداز میں بولی۔ ”آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں کہ محبت میں شکر ہے کی طرح معذرت کرنا بھی اصول کے خلاف ہوتا ہے۔“

”بہت اچھی طرح یاد ہے لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ چھوٹی سی معذرت آپ کی عقل کو اور بھی مضبوط کر دیتی ہے۔ محبت میں اپنا نہیں ہوتی اور صرف آدمی کی انائی ہوتی ہے جو اسے اپنے قصور پر معذرت کرنے سے دھک دیتی ہے۔ انات ہوا اور صرف محبت ہو تو آدمی نے تصور بھی بڑا جھک معذرت کر لیتا ہے۔“ اس نے اپنا تھوہ نظر بیان کیا جسے سن کر وہ مسکرا دی اور مسکراتے ہوئے بھی بولی آٹھوں کے ساتھ بولی۔

”تو جناب کا خیال ہے کہ درحقیقت آپ سے کوئی گستاخی نہیں ہوئی اور آپ بس یونہی ہم سے تعلق مضبوط رکھنے کے لیے معذرت کر رہے ہیں۔“

”آپ تو بچ کی محبت ذہین ہیں۔ میرا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ گئی۔“ وہ بلند آواز میں بھنا۔ کشور نے بھی دھکی آواز میں اس کی ہنسی کا ساتھ دیا اور پھر ہاتھ پلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رانی ہیرے پر پریشانی لیے سامنے کھڑی تھی۔

”اب نہیں چلنا چاہیے۔“ اس نے اس کی شکل دیکھ کر فٹہ اٹھا سائی ہنسی کیا لیکن کشور کو احساس تھا کہ وہ رانی دھک جانے کے باعث پریشان ہو رہی ہے۔

”تھیک ہے رانی! اعتباری ہے کہ آج مجھے اپنی زندگی کی بڑی ان مول خوشیاں ملی ہیں۔“ رانی کا ہاتھ تھا کہ مگر اس نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور پھر وہ دونوں دواں سے باہر نکل کر اس راستے پر چل پڑیں جو درختوں کے اس سبز رنگ چار ہا تھا

جہاں انہوں نے ڈرامہ گزری سمیت چھوڑا تھا۔ دوری سے انہوں نے دیکھ لیا کہ گزری کا بونٹ اٹھا رہا ہے اور قریب کھڑا رانی و کشور لپٹ سے دھڑا دھڑا دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں کو آہ و بیکہ کر اس کے چہرے پر اطمینان چھایا۔ بونٹ کا کر اس نے بھرتی سے گزری کا پچھلا دروازہ کھولا اور خود ڈرامہ گزری سمیت بڑھ کر گزری اسطرت کر دی۔ ان دونوں کے گزری میں بیٹھے ہیں گزری فرمائے بھرتی ہوئی سوچنی کی طرف رواں ہو گئی۔ اس تیز رفتاری سے وقت کے فرق کو کم نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ڈرامہ گزری اسطرت رانی مل تھا کہ وہ لاشعوری طور پر ایسی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

”کیا پوزیشن ہے عبداللہ! سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے نا؟“ گزری میرا آدمی حدود میں داخل ہوئی تو اس نے عبداللہ ان کا نمبر ملا کر اس سے پوچھا۔ میرا آدمی چار کی افتتاحی تقریب کے انتظامات سنبھالنے کے لیے عبداللہ ان کے ساتھ سے وہاں پہنچا ہوا تھا جبکہ وہ خود پور کے دورے پر چلا گیا تھا۔ ایک تو اسے وہاں چار کی تقریبی کاموں کا جائزہ لینا تھا۔ دوسرے وہ میرا آدمی زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ تقریب میں شرکت کرنے کے باعث اسے اپنا وقت چودھری کے ساتھ گزارنا پڑتا۔ جبکہ چودھری اور وہ دو ٹلف وینوں کے بندے تھے۔ چنانچہ چودھری کو براہ راست کرنا اس کے لیے کسی لڑے امتحان سے کم نہیں تھا۔ خود کو اس امتحان میں زیادہ دیر جتنا ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنا آج کا شیڈول اس طرح ترتیب دیا تھا کہ میرا آدمی میں مغر وقت کے لیے ہی ٹھہرا پڑے اور اب ملے شدہ شیڈول کے مطابق وہ مقررہ وقت پر میرا آدمی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

”اپوری تھک کر آؤ آؤ راستہ سراسر تقریب ابھی چار ہے۔ میرے ساتھ آنے والی خاتون سمجھاں اندر بیڑا مل میں سوچ رہی ہیں اور تقریب کی کوڑی کر رہی ہیں۔ کوئی می خواہی کے ملاوہ جن خواہن کو دعوت نامے جیسے گئے تھے، ان میں سے ایس بی صاحب اور ڈاکٹر مسعود کی مسز بھی کچھ دیر کل یہاں پہنچی تھی ہیں۔ اندازہ ہے کہ آدھے گھنٹے میں قریب تم ہو جائے گی اور نیم فارغ ہو جائیں گے۔“

”اموال تو اب تک تقریب کو ختم ہو چکا ہے تو۔“ بیوہ نے انڈسٹریل ہوم کے افتتاح کے لیے اتنا زیادہ وقت خرچ کرنا میری سمجھ سے باہر ہے نا؟“ وہ عبداللہ ان کی خوش کردہ پورٹ کون کر رہا تھا۔

”آپ چودھری صاحب اور ان کی فیملی کے مزاج کے

بارے میں تو جانتے ہی ہیں سرکہ کس قدر شہزاد لوگ ہیں۔ پہلے چودھری صاحب نے تقریب کو اپنی بیگمات کے شاہانہ شان متعقد کرنے کے پھر میں پھیلا دیا اور اب ان کی بیگم بانی کی سرپوری کر دی ہیں۔ میرا اندر سو جو خاتون صحافی سے رابطہ ہے۔ انہوں نے شکے بتایا ہے کہ بڑی چودھری صاحب نے تقریب کو کرتے کے مڈ میں نہیں ہیں۔ پہلے ورائٹی ٹو کے نام پر اچھا خاصا وقت لگا دیا گیا اور اب تصویریں لکھوانے کا سلسلہ جاری ہے۔ چودھری صاحب کی طرف سے اخبارات میں جو ملی کی خواہشیں کی تصویریں شائع کرنے پر پابندی ہے لیکن چودھری صاحب اپنا ذاتی کمرے کر آئی ہے اور اب انہوں نے ہماری سبھی بولی خاتون صحافی کو اپنا نوکر مقرر بنا رکھا ہے۔“

عبداللہ اللہ نے بے بسی سے بتایا۔
”او کے اہم کوشش کر دو کہ جلد از جلد تقریب ختم ہو جائے۔ میں جبراً بدلتی چکا ہوں اور اب جو بھی چاہتے ہی والا ہوں۔ تم فارغ ہوتے ہی وہاں آ جاؤ۔“ عبداللہ اللہ کی بیوہ کی کوٹھنے ہوئے اس نے اپنی بیگمات پر قابو پا لیا اور اسے بدابست دینے کے بعد سلسلہ متعلقہ کر دیا۔ اگلے دو دن میں وہ جو بھی ملتی چلتے تھے۔

ڈرائیو نے گاڑی جوڑی کے بارے سے جانک سے اندر داخل کی سی تھی کہ ایک دوسری گاڑی بھی پیچھے سے ملتی آتی۔ اس کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی پہلی گاڑی سے دو خواتین برآمد ہوئیں۔ ان میں سے ایک بڑی طرح چادر میں بچھی ہوئی تھی لیکن دوسری کو اس نے پہچان لیا۔ وہ وہی ملازمہ تھی جس کو اس نے لاہور کے اسپتال میں آفتاب کے کمرے کے باہر دیکھا تھا۔ اس ملازمہ کو دیکھ کر وہ بھی قیاس کر سکا تھا کہ چادر پوش لڑکی آفتاب کی بیوی ہے۔ وہ گاڑی سے اترنے کے بعد جب تک اندر نہیں چلی گئی، وہ احتیاطاً اپنی گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ چودھری انکھاری دختر کا اتنا احترام لازمی تھا۔

”تو خانی شہزادی بی کو اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔“ باقی بیگم میری اگلی گدی میں کھسکے وہاں آئیں گی؟“ شاہزادہ خان نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ تب اس کے کان میں چھٹی گاڑی کے ڈرائیو نے کہا گیا۔ جملہ پڑا۔
”میں بھی دوبارہ وہاں جاؤں گا۔ بی بی کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اس لیے وہ چلدی اٹھ آئی تھیں، پر انہیں اب کی خرابی کر دے میں گدی ہی خراب ہو گئی۔ ورنہ مشکل سے میں نے اسے ٹھیک کیا، تب تکیں جا کر ہم ادھر بیٹھے تھے۔ مجھے تو خود فکر ہو رہی ہے کہ ادھر گدی کا انتظار ہو رہا ہو گا۔“

وڑی چودھری ان کو سخت غما ہوں گی کہ میں سے اتنی دیر کیوں لگائی۔۔۔ میں گیا کرتا؟ ان بیگماتوں کو کوئی مجھ سے متعلقہ ہی ہوتا ہے، اچانک سے آئی وہ دوکانوں سے جاتی ہیں۔“ اندر جاتے ہوئے ڈرائیو کی بیان کردہ صورت حال اس سے جانوں میں بھی بڑی جس کو کہ وہ کچھ کہا کہ تقریب ختم نہ ہونے کے باوجود کوششیں بھلی دیاں ہو گئی ہیں۔ اس کا انتظار کرتے والے ملازم نے اسے بولی کے شاندار ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔ وہاں چودھری کے ساتھ انہیں کئی منٹوں کے پہلے سے موجود تھا۔ وہ دونوں شہر کی گاڑی ہمارے ہوئے بیٹھے تھے۔

”آئیے اسی صاحب! ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بڑی دیر لگا دی آپ نے۔“ اسے دیکھتے ہی چودھری نے پرجوش انداز میں استقبال کرتے ہوئے شکوہ کیا۔
”جی ہاں، اصل میں آج مجھے نوکر پور کے دورے پر بھی جانا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ وہاں بھی دورے پر چلنے پر کام ہو رہا ہے۔ میں وہاں سے واپس آتے آتے کچھ تاخیر ہو گئی۔“ چودھری اور انہیں بی دو توں سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے اس نے اپنے اوپر سے ہاتھ کی دھرتیائی۔

”اتنی سے عمر ہیں آپ کس پیمانیوں میں پڑ گئے ہیں۔“ اسی صاحب! ابھی تو یہ آپ کے عینے کھانے کی عمر ہے۔ ابھی آپ اقب کو انوائس کریں۔ بہت دقت پڑا ہے اس طرح کے سائل ورس کرتے کے لیے۔“ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے چودھری نے اسے مشورہ دیا۔
”چودھری صاحب! میں ان لوگوں کو بے وقفہ بھتا ہوں جو وقت پر مجھ ورسا کر کے اپنی عمریں برباد کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی ”ہم کھانے والوں“ میں سے نہیں ہیں اور ”کھیل“ بھی بغیر خریدے سے کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں اگر سامنے والا بے ایمانی پڑا آئے تو پھر اس کی چالوں کا ہمارے پاس بھی قورمہ جاتا ہے کہ اس کی چال اس پر اٹھ دیں۔“ اس نے مٹی تیز لے کر جس چودھری کی بات کا جواب دیا اور باہر پر کھڑے بہروں کا جائزہ لینے لگا۔ بہروں کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ انہیں بیگمات ہوئے ہی والی ہے۔

”کیا انہیں بی صاحب کو مات دوتے سے بچانے کے لیے فوراً کر رہے ہیں اسے ہی صاحب!“ چودھری نے اسے یہ پکارا۔
”کی نہیں۔ آپ میں سے کسی کو بھی مات ہو۔ پھر اس میں کوئی نقصان نہیں۔ آپ کھیل جاری رکھیے۔ میں دیکھتا ہوں کہ انہیں بی صاحب کو مات دوتے سے بچانے کے لیے فوراً کر رہے ہیں اسے ہی صاحب!“ چودھری نے اسے یہ پکارا۔

ہوں کہ انہیں بی صاحب خود کو مات دوتے سے بچانے کے لیے کیا دیکھ لڑاتے ہیں؟“ اس نے مسکرا کر اسی قسمی خیر لکھے میں جواب دیا جسے نہ سمجھتے ہوئے وہ دونوں ایک بار پھر ہیل کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن اس سے قبل ہی ڈرائنگ روم میں ہوشیال سا گیا۔ ہوشیال میں کمرہ ہاں آئے والا دھستے تن و دھن کا ایک نوجوان لڑکا تھا جس کے پیچھے پر موجود مخصوص دھستے اس کی ذہنی مدد دہی کا سامان کر رہی تھی۔

”میں یہاں کھیلوں گا تم گدی ہی ہو مجھے کہیں بھی نہیں جانے دیتیں۔“ وہ اپنی بولی ملازمہ سے مخاطب تھا جو اسے منہانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ملازمہ سے کہتا ہوا ہاتھ میں بلاسٹک کے پلے سے ڈرائنگ روم میں سے جتنی ڈیکوریشن پتھر کو بال کی طرح ہٹ کر ہار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چادر دیکوریشن میں اس کے پلے کی زد میں آ کر زد میں ہونے کے بعد چٹکا چور ہو گئے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہر ٹوٹنے والے ڈیکوریشن عین کے ساتھ ساتھ ملازمہ کے چہرے پر بھائے خوف اور بے بسی کے ہادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

”آپ اوپر چلیے چھوٹے شاہ بی! وہاں آپ کے بہت سارے کھلے ہیں۔ اوپر جا کر میں آپ کے ساتھ کھیلوں گی۔“ ملازمہ کی بولی آواز میں اس ایوارڈ نوجوان کو بھانسنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں اسے نیچے بڑی کرچوں سے زخمی ہو جانے والے جیروں کا بھی ہوش نہیں تھا۔ سہانوں کے سامنے پیش آنے والی اس صورت حال پر چودھری کا مود پر ہی طرح خراب ہو گیا اور وہ حلال میں بھرا ملازموں کو پکارنے لگا۔ فوراً ہی میں چار ملازم وہاں آ پہنچے اور اس کے اشارے پر نوجوان کو قاتلوں کر کے ڈرائنگ روم سے باہر لے گئے۔

”ماف کر دیں سرکار! مالوم نہیں کیسے چھوٹے شاہ بی میری آنکھ بچا کر نیچے اتر آئے۔ وہ بارہ ایک منٹ نہیں ہو گی۔“ ذہنی جیروں والی ملازمہ فوری طور پر باہر جانے کے بجائے وہیں رک کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے چودھری سے معافی مانگنے لگی۔

”تیرا تو میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔ ابھی اپنی شکل کم کر بھرے سامنے سے۔“ چودھری غصہ ناک ہو کر رہا۔ وہ وہ چارہ کی اس کی بات میں کر اور بھی لڑا وہ بڑی طرح لڑنے لگا تاہم اس میں مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے چپ چاپ باہر نکلی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد ایک دوسری

ملازمہ آ کر وہاں موجود پھیلاوا سنبھال گئی۔
چودھری کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس کا مزاج بڑی طرح برہم ہو چکا ہے اور اسے اپنا موزی حال کرنے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے۔
”آپ لوگ تعریف رکھیں، میں ابھی تو مزید دیر میں واپس آتا ہوں۔“ یا آخر وہ برواشت نہ کر سکا کہ یہ کتنا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

”کون تھے وہ صاحب! ذرا سے؟“ شہزاد یہ تو کچھ چکا تھا کہ لڑکے کا تعلق چودھری کے خاندان سے ہے۔ اس نے چودھری سے اس کا رشتہ معلوم کرنے کے لیے یہ سوال کیا۔
”چودھری صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا شہزاد تھا۔ بچے چارہ دینی طور پر معذور ہے۔“ انہیں بی نے بتایا تو وہ سر کو کھینچ کر غماش ہو رہا۔ چھوڑی دیر بعد چودھری بھی واپس آ گئی۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات قدر سے پر سکون تھے۔

”میں نے ملازموں کو کھانا لگانے کا کہہ دیا ہے۔ ہم لوگ چل کر کھانا کھا لیتے ہیں۔ خواتین تصویریں دی میں واپس آ جاؤں گی تو ان کے لیے الگ دسترخوان لگ جائے گا۔ میں نے چودھری کو بدایت کر دی تھی کہ تمام ملازموں کو اپنے ساتھ حویلی لے کر آئیں۔ مہمان صحافی خان سے ان کی تقریب کے بارے میں رائے بھی معلوم کر لی جائے گی تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اخبار کے لیے کیسی رپورٹ تیار کریں گی۔“

ایک سونے پر بیٹھے ہوئے اس نے کہا: لگوانے کی اطلاع دینے کے ساتھ آگے کا پروگرام بھی بتا دیا۔ حویلی میں کھانے کا ڈگر اب شہزاد کی طبیعت پر ناگوار گزرنے لگا تھا۔ چھٹی ایک ملاقاتوں میں تو اس نے وہاں کو بھی کھانے کے لیے سخت انتہاب کیا تھا لیکن آج بھی کوئی کھانہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو چھپائے وہ بات چہرے کے ساتھ وہاں بیٹھا رہا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی واچریشن سے اسے چٹا چٹا کر کوئی اسے کال کر رہا ہے۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ شہزادانہی کال آ رہی تھی۔ ”میں“ کا فن دکھاتے ہوئے اس نے کال نہ کی۔

”کہاں تھے شہزادی! میں کاتی دیر سے منتہیں رہیں کرتے کی کوشش کر رہا تھا۔“ اس نے معلوم ہوا کہ تمام دورے پر ہوا اور موبائل پر کال کرنے پر کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔

”فی الحال تو میں حج آباد میں ہوں۔ اس سے پہلے نور پور میں تھا۔ شاید آپ نے اس وقت مجھے کال کی ہوگی اسی لیے رابطہ نہیں ہو سکا۔ نور پور میں موہن سروس کام نہیں کرتی ہے۔ آپ بتائیے کہ سب ٹھیک تو ہے؟ کوئی کمی خیر...؟“ اپنے بارے میں وضاحت دینے کے بعد اس نے ان سے سوال کیا۔ اس وقت ان کی کال آنے پر لاہور اس کے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ وہ دھینکا کے حوالے سے کوئی خبر دینا چاہتے ہیں مگر انہوں نے اسے جو اطلاع دی اسے سن کر وہ پشیمان ہو گئے۔ خود کو اچھل پڑنے سے روک کر سچا رانا جو کچھ کہہ رہے تھے وہ بالکل اُن ہونی بات تھی۔

”آپ فی الحال اسے اپنے پاس رکھیں۔ میں فوری طور پر پہنچتا ہوں۔“ مکمل تفصیلات جاننے کا یہ موقع نہیں تھا اس لیے اس نے ان سے کہا اور موہن پائل آف کر کے اٹھ کر اُڑا۔

”خیر یہ اسے ہی صاحب؟“ چودھری اور الین نے جیو اس کے پیرے کے تاثرات سے کچھ بھی سمجھنے میں ناکام رہے تھے اسے گھرا ہوتے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”ایک ابھر چکی ہے، مجھے فوری طور پر جانا ہو گا۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ کھانے پر آپ لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔“ اس نے مختصر الفاظ میں بتایا اور دونوں سے مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔ ادا رنگ روم سے نکل کر اپنی گاڑی تک جاتے ہوئے اس کے حواس کانوں سے کسی ٹورٹ کی کوئی بھی نہیں سنیں۔

”پھوڑو... ناف کر دو مجھے۔ اب کبھی ایسی بھول نہیں ہوگی۔“ وہ دوتے ہوئے کسی سے اتھا کر رہی تھی۔ اس آواز پر اس کا دھیان فوراً اس ملازم کی طرف گیا جس کی غفلت کی وجہ سے بہنر شاہ وراثت روم میں پہنچ گیا تھا اور وہاں توڑ پھوڑ مچا دی تھی۔ یقیناً اس ملازم کو اس کی کوتاہی پر سزا دی جا رہی تھی۔ چودھری تھوڑی دیر کے لیے ذرا رنگ روم سے شاید ہی کام کے لیے باہر نکلا تھا کہ ملازمہ کے لیے سڑا کا مین کر سیکے اب ہی جب وہ واپس آیا تھا تو اس کے پیچھے پر اطمینان تھا۔ انسانیت کے ساتھ وہ اس نا انصافی پر جتنا کڑھتا وہ اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

”بھگے پر چلو۔“ وہاں سے ہم اہور کے لیے روانہ ہوں گے۔“ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے مشاہیر خان کو ظہر دیا۔ لاہور جانے کے لیے اپنے اہلی سہارا کو لینے کے علاوہ گاڑی کو بھی ایک بار چیک کرنا ضروری تھا اس لیے یہیں سے براہ راست روانگی کے بجائے کچھ دیر ٹورٹ میں اپنے بھگے پر کھانا ڈال دیا۔

”میں ایک ضروری کام سے فوری طور پر لاہور جا رہا ہوں۔ تم یہاں کے سارے معاملات خود ہی سنبھال لینا۔“ گجڑی کے چلتے ہی اس نے میدانان کو فون کر کے اسے حرایت دی۔ تجربہ کار مشاہیر خان صاحب لوگوں کے مزاج کو سمجھنے میں ماہر تھا۔ اس وقت بھی اس نے وعدہ دیا کہ گاڑی شہر یاجات میں ہے اس لیے بہت مشاقی کے ساتھ مل ایڈز میں گاڑی دوڑا دی۔ سبز رتاری سے چلتی گاڑی جیو کے قہرستان کے قریب سے گزری تو وہ کسی معمولی طرح کی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس قہرستان میں ایک قہرمانی بھی جس پر ماہ بانو کے نام کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اس قبر میں دفن ہستی کے لیے دعاے مغفرت کی اور رستے کی طرف توجہ مبذول کر لی۔ جانے پہچانے راستوں سے گزرتی اس کی گاڑی بھگے پر پہنچ گئی۔

”دفتر سے فون آیا تھا۔ کوئی سرمد صاحب آپ سے بات کرنے کے خواہش مند تھے۔ شاید کوئی بہت اہم معاملہ تھا۔ انہوں نے آپ کو اپنا نمبر دے کر ہدایت کی تھی کہ پیسے ہی آپ آئیں ورنہ اس سے رابطہ کریں۔ آپ بیڑے نے احتیاطاً فون کر کے مجھے بھی نمبر نوٹ کر دیا تھا کہ آپ آفس کے بجائے یہاں آئیں تو آپ کو پیغام دے دیا جائے۔“ بھگے میں داخل ہوتے ہی ریت میں سے اس کے ہاتھ سے ہر ایک کس بیٹے کو پیغام دیا تو وہ تھوڑا سا الجھ گیا۔ فوری طور پر اسے بائیں بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ سرمد ہی شخص کون ہے؟

”میں لاہور جا رہا ہوں۔ تم میرا سامان، بلی کی کر دو۔“ سرمد کے ہاتھ میں پاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بیٹ میں کو حکم دیا اور ٹیلی فون کے ساتھ رکھے نوٹ پیڑ پر درج سرمد کے نمبر کو دیکھنے لگا۔ یہ موہن نمبر تھا۔ بیٹ میں کے سامان بیک کرتے ٹیک ففے والی سہولت میں اس نے اس نمبر پر کال کر کے اپنی اطمینان کو دور کر لینا مناسب سمجھا۔

”الین اسسٹنٹ کمنٹر شہر ماہل بات کر رہا ہوں۔ آپ یقیناً سرمد صاحب بات کر رہے ہیں؟“ فریڈ نے آپ کو گھبراہٹ میں مجھ سے فوری طور پر بات کر لی تھی۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس سے دریافت کیا وہاں وہ بہت پر جوش انداز میں اپنے فون کرنے کی وجہ سے لگا۔

حادثات و سانحات کی مثال۔ بلا کی تلاش میں سو کوٹاں
ماہ نامہ کی داستان حیات کے واقعات اعلیٰ مادہ پر ہے

قدر کی فسون گری، قسمت کی پابلازی یا مقدر کا کھیل..... ملے اور بچ کر جانے والوں کی کہانی

اسما قادری

گلاب

آتشیں قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور چپ یا اثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنسنا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے جو محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزونا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھاوے... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے گزرا وقت لوٹ لو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ لے جاتا ہے... اس وقت تک پہلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔



مردے زندہ نہیں ہو سکتے لیکن وہ ہو گئی تھی۔ وہ جس کے نام کی قبر پر آباد کے قبرستان میں موجود تھی، اس کے سامنے زندہ سلامت پہنچتی جاتی حالت میں پہنچی تھی۔ پہلے کے مقابلے میں اگر اس میں کوئی فرق آیا تھا تو صرف یہ کہ اس کی صحت کافی گہری تھی اور چہرے پر زردی کی کھنڈی ہو گئی تھی۔

”یہ سب کیا ہے ماہ بانو؟ تم زندہ ہو تو وہ کون کون سی جے تھارے نام پر دفن کیا گیا؟ تم اتنے عرصے کہاں غائب رہیں؟“

”آپ کے ان سارے سوالوں کا جواب دینے کے لیے میں آپ کو اپنے ساتھ چش آنے والے واقعات بتاتی ہوں۔“

اس نے پے درپے کیے گئے اس کے سوالوں کے جواب میں کہا اور پھر ذرا سا کھٹکھارتی ہوئی روانی سے شروع ہو گئی۔

”آپ کو موتی والا صاحب اور ان کی بیوی کا تو علم ہوگا ہی۔ اس واقعے کی رات موتی والا صاحب کے ڈرائیور سرد نے مجھے اپنے ایک دوست عامر کے گھر منتقل کر دیا تھا۔ میں عامر کے گھر اس کی بوڑھی کے ساتھ رہنے لگی۔ اسی محلے میں جیل نائی ایک لڑکی رہتی تھی۔ اللہ کی مصلحت کہ اُس نے اس لیے مجاری کو مکمل شخصیت دیں تھی۔ خولید مرادوں کے ایک گروہ کی اس پر نظر پڑی تو وہ اسے اپنے ساتھ گھر کر لے جانے کے چکر میں پڑ گئے۔ ایک روز وہ عامر کی ای کی مزاج پر ہی کے لیے آئی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اسی وقت اس نے مجھے اپنی اصلیت سے آگاہ کیا۔ وہ اتنی ڈری ہوئی تھی کہ وہاں اپنے گھر جانے کی بھی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ میں نے یہ ترکیب نکالی کہ اس کا اور اپنا لباس آپس میں بدل لیا اور اس سے کہا کہ میں گلی کے ٹکڑے جاتی ہوں۔ جو لوگ تھارے پیچھے گئے ہیں وہ دھوکا کھا کر میرے پیچھے لگ جائیں گے، تم اتنے میں چپکے سے اپنے گھر چلی جانا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ جیل کا پچھا کرنے والے کپڑوں سے دھوکا کھا کر میرے پیچھے لگ گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ ٹکڑے پر پہنچنے کے بعد میں اپنے چہرے پر سے چادر ہٹا دوں گی تاکہ وہ لوگ یہ جاننے کے بعد کہ میں جیل نہیں ہوں، میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مگر یہاں مجھ سے اندازہ کی غلطی ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں اس پکڑی میں گلی کے ٹکڑے پہنچتی، ان لوگوں نے مجھ پر ایک بڑی سی چادر ڈال کر مجھے قابو کر لیا اور مجھے اپنے ساتھ اپنے ڈیرے پر لے گئے۔ وہاں جا کر ان پر یہ بات بھی کہ وہ جیل کے بجائے کسی اور کو اغوا کر لائے ہیں۔ وہ مجھ گئے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ غصے میں ان کے گردو نے مجھے بری طرح مارا پینا اور دسیوں سے باغہ کر ایک طرف ڈال دیا کہ جب ہمیں جیل لے گی، تب ہی تجھے چھوڑیں گے۔ دوسرے دن وہ لوگ

دو بار وہ اس محلے میں گئے اور انہیں پتا چلا کہ عامر کا گھر دھاکے سے اڑ چکا ہے اور اس حادثے میں اس کی ماں اور بھانجی لڑکی ماری گئی ہیں۔ میں تو ان کے قبضے میں تھی اس لیے انہوں نے سمجھ لیا کہ میرے والی لڑکی جیل میں تھی، ان کا گردو ایک ظالم اور غصہ ور شخص تھا۔ جیل کے ساتھ سے نکل جانے کا اس نے مجھ سے پورا پورا انتقام لیا۔ اس کی مار پیٹ اور تشدد سے گھبرا کر میں اس کا یہ مطالبہ ماننے پر راضی ہو گئی کہ میں جیل کے بدلے میں ان کے ساتھ رہ کر کام کروں گی۔ وہ لوگ اگلے سیدھے کچنوں اور میک اپ کے ڈیرے میرا حلیہ نکاڑ کر مجھے اپنے ساتھ اپنے دھندے پر لے جاتے۔ ان لوگوں کی سخت نگرانی اور تشدد سے خوف زدہ ہو کر میرا ذہن اس بری طرح مائل ہو گیا کہ مجھ میں فرار کی ہمت ہی نہیں رہی۔ مگر کچھ دن مل میں نے آپ کو لاہور میں دیکھا، اسی دن مجھ پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ گروہ لباس ایک بندو ہے۔ ان دونوں باتوں نے میرے کھوجانے والے خواہش کو بھال کر دیا۔ گروہ نے اپنے گروہ سے بھی اپنی حقیقت چھپا رکھی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک کو اس راز سے آگاہ کر دیا اور یوں مجھے اس کی ہمدردیاں حاصل ہو گئیں۔ پچھلی رات وہ اور میں ایک شادی والے گھر میں رکے ہوئے تھے۔ ہم نے منصوبہ بنایا کہ وہاں سے فرار ہو جائیں گے لیکن اتفاق سے مجھے معلوم ہو گیا کہ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے وہ سرد کی محبوبہ نلم ہے اور اسے مجبور کر کے زبردستی اس کی شادی ایک بوڑھے سے کی جا رہی ہے۔ میں نے نلم کو گھر کے ساتھ وہاں سے فرار کروا دیا اور خود ان کی جگہ لے لی۔ میں نے نلم کے ہاتھ سرد کو یہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ وہ کسی طرح آپ سے رابطہ کر کے میرے بارے میں اطلاع دے دے۔ صبح پولیس نلم کے گھر آ گئی۔ انہیں خولید مرادوں کے قبضے میں موجود ایک اغوا شدہ لڑکی کی تلاش تھی۔ میں یہی بھی کہ سرد کا آپ سے رابطہ ہو گیا ہے اور آپ نے پولیس کو بھیجا ہے لیکن بعد میں جب ڈی آئی جی صاحب تھانے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو کوئی اور لڑکی تھی جسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ڈی آئی جی صاحب آپ کے کزن ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ کو میرے بارے میں اطلاع دے دی جائے۔ بس پھر اس کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آئے لیکن معلوم نہیں سرد نے آپ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ مجھے فکر ہو رہی ہے کہ نلم اس کے پاس خیریت سے پہنچی ہوگی ہے یا نہیں؟“ ساری داستان انتظار سے سنانے کے بعد اس نے آخر میں نلم کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔

”سرد کا مجھ سے رابطہ ہو گیا تھا۔ نلم اس کے پاس پہنچ چکی ہے اور ان دونوں نے نکاح بھی کر لیا ہے۔“ اس کی سلی کے لیے شہر یار نے اسے اطلاع دی اور پھر جاوڑا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس ساری گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔ شینا کے ملنے کی امید بندھنے کے بعد ملنے والی بایوی نے اسے بے حد رنجیدہ کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالنے لگے تھے۔

”خولید مرادوں کا وہ گروہ گرفتار ہو چکا ہے۔ فرار ہونے والے خولید مراد کو بھی اس کے گھر سے اغوا لیا گیا ہے۔ ان کا گروہ اب تھانے میں آسکا۔ گروہ اصل مجرم ہے لیکن ان تینوں کو بھی اعانتہ جرم میں سزا دی جائے گی۔“ سجاد نے اسے اپنی طرف رخ کرتے دیکھ کر غور سے دیکھا۔

”ان افراد کی گرفتاری کے علاوہ انہیں کوئی شے کو کھر سے بھی بچے کچھ ضروری ہے۔ وہ ماہ بانو کے کیس پر کام کر رہا تھا۔ آخر اس سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوئی کہ اس نے جیل کو ماہ بانو تسلیم کر لیا؟“ سرد نے والوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہوا یہ بات واضح ہو جانی کہ جو لڑکی مری، وہ ماہ بانو نہیں تھی۔“ اس نے ایک لو جیکل نکتہ اٹھایا تھا۔ ایک نارٹھ لڑکی اور تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے فرد کا قرن کو سرسری جائزے میں ہی ذرا واضح ہو جاتا لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ ریش کو کھر نے بے پروائی دکھائی ہے۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔“ سجاد نے اس کی تائید کی اور فوراً ہی فون پر کسی سے رابطہ کر کے حکم دیا کہ ریش کو کھر سے بات کر دانی جائے۔ دو بہت بعد ہی ریش کو کھر کا فون آ گیا۔

”فرمائیے مرا میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

اس نے مودبانہ لہجے میں ان سے پوچھا۔

”بھائی سیرٹ کے قریب تھانے میں بلاست میں ماہ بانو نامی جو لڑکی ہلاک ہوئی تھی، تم نے اس کا پوسٹ مارٹم کروایا تھا؟“

”نہیں سر۔“ اس نے فوراً بات میں جواب دیا مگر لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

”پندرہ منٹ میں وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے پاس لے کر آؤ۔“ سجاد نے اسے حکم دیا۔

”اتنی جلدی سرا رپورٹ تو ریکارڈ میں ڈھونڈنی پڑے گی۔ ویسے خیریت تو ہے سر۔“ وہ اس کا حکم سن کر کچھ اور گھبرا گیا۔ اس کی یہ گھبراہٹ چھٹی کھار رہی تھی کہ شہر یار کا اندازہ درست ہے اور پوسٹ مارٹم کی کارروائی سرے سے کی ہی نہیں گئی۔

”میری طرف تو سب خیریت ہے لیکن تمہاری خیریت مشکوک ہے۔“ مجھے شک۔ یہ کہیں سے کہ اس حادثے میں ہلاک ہونے والوں کا پوسٹ مارٹم سرے سے کروایا ہی نہیں گیا تھا۔ سجاد نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں سر۔“ اس کا لہجہ ٹھنڈا پھر بھی وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”ایسی بھی بات ہے اور ان کا ثبوت یہ ہے کہ جس لاش کو ماہ بانو نامی لڑکی کے نام سے شناخت کیا گیا تھا اس وقت وہ میرے سامنے زندہ حالت میں پہنچی ہوئی ہے۔“

”مم۔“ مگر لڑکی کے کپڑوں وغیرہ سے تو اس کی شناخت ہو گئی تھی۔ وہ صبح معنوں میں گھبرا گیا اور گردی دیں دیں۔

”تمہاری اس نا اعلیٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ تم پولیس کے محکمے میں کام کرنے کے لائق نہیں۔ تم اسی وقت سے اپنے آپ کو قمار خاں سمجھ کر خیریت اور زبردستی جلد تم تک پہنچ جائیں گے۔“ اس نے غصے سے کہنے کوئے فون ڈال دیا۔

”میری اس شخص سے ملاقات ہوئی تھی تو مجھے کافی ایفنی ہفت بندہ لگا تھا لیکن نا اعلیٰ کے اس مظاہرے کے بعد پتا چلا ہے کہ میرا اندازہ غلط تھا۔“ شہر یار نے تہرہ کیا۔

”اب اسے اپنی اس بھائی کی سزا چھوڑنے پڑے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ پولیس کی باب کوئی مذاق نہیں۔ اس جیسے نا اہلوں کی وجہ سے ہی تو پولیس کا محکمہ بدنام ہو کر رہ گیا ہے۔“ وہ شدید غصے میں تھا۔

”ریش کو کھر سجاد بھائی! اس طرح اپنا نمبر لو ذکر میں تو معاملات کیسے سنبھالیں گے۔“ اس نے انہیں غصا کرنے کی کوشش کی اور پھر خاموش تھانے میں ماہ بانو کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم کیسے روم میں جا کر آرام کرو۔“

وہ اس حکم پر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے لاہور پہنچنے تک بھی وہ روم میں تھی اس لیے وہاں تک کارآمد معلوم تھا۔

”سجاد ادا کیس میں نے شہنشاہی یہ تصویریں نکالی ہیں۔ آپ بدنامی کا خیال چھوڑیں اور یہ تصویریں سارے اخبارات میں پھوڑا دیں۔“ ہو سکتا ہے کہ تصویریں اخبارات میں نہیں تو کوئی نہیں ہینا کے بارے میں اطلاع دے دے۔“ اس کے باہر نکلنے سے پہلے روم ونگوں حالت میں ہاتھ میں بہت سی تصویریں لیے وہاں چلی آئی اور دو ساری تصویریں سینٹرل شیل پر اس انداز میں رکھیں کہ وہ دیکھ رہی تھیں۔ ماہ بانو جس کی توجہ خود بخود ہی اس طرف مبذول ہو گئی تھی، تصویروں پر نظر پڑنے پر بڑی طرح چونکی اور پھر

ایک تصویر ہاتھ میں لے کر یہ غور اس کا جائزہ لینے لگی۔ جیسے وہ تصویر کا جائزہ لے رہی تھی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

”مجھے آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا ہے نہ! کیا آپ میرے ساتھ گیسٹ روم تک چل سکتے ہیں؟“ بالآخر ایک فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ کر اس نے شہر بارے درخواست کی۔ وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اس کے لچکے کی سنجیدگی کو محسوس کر کے اس کی بات ماننے پر راضی ہو گیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گیسٹ روم تک پہنچے۔

”پال بولو... کیا کہنا تھا جی؟“

”میں اس تصویر والی لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ لڑکی کون ہے؟“

”وہ چاد بھائی کی بیٹی بیٹا ہے۔ کچھ روز پہلے اسے خواہد سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا لیکن اب تک ہم اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مگر تم کیوں اس بارے میں پوچھ رہی ہو؟“ اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے ذرا چمک کر پوچھا۔

”مجھے یقین ہے کہ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے اور... اور مجھے یہ شک ہے کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔“ اس نے یہ مشکل اسے یہ اطلاع دی۔ ماڈل ناؤں کی کوٹھی میں کھلیا جانے والا خفیہ کھیل اس کی یادداشت سے بالکل بھی ٹوٹ نہیں ہوا تھا اور اب غیبی تصویر دیکھ کر تو اور بھی شدت سے اس پورے واقعے کی یاد آ رہی تھی۔

”تم کس وجہ سے یہ سب کہہ رہی ہو؟ مجھے تفصیل سے پوری بات بتاؤ۔“ شہر بارے اس سے کہا تو بوا بوا ایک ایک کر مارا قصہ سناتے لگی۔ ساری بات سن کر وہ تیر کی مانند تیزی سے گیسٹ روم سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کے اندر بھر غضب کی ایک آگ سی بھڑک رہی ہے جس میں وہ سب کچھ جلا کر چم کر دے گا۔

مشاہدہ خان گاڑی کو رازتا ہوا باؤں ناؤں کی طرف لے جا رہا تھا پھر بھی اسے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ یہ قہراری وس قدر تھی کہ دل چاہتا تھا، پک بھٹکتے میں یہ راستے لے ہو جائے۔ ہاں تو اسے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اس نے خود ہی سندھ سندھ رام کی کوٹھی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ فی الحال وہ سجاد گانا کو اتنی بڑی بات بتانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور چاہتا تھا کہ پہلے خود تصدیق کر لے۔ ان کی قربانی اسے سندھ رام کے بارے میں معلومات تو پہلے ہی حاصل ہو گئی

تھیں لہذا یہ اطمینان تھا کہ وہ اور مشاہدہ خان مل کر وہاں موجود افراد کو آرام سے سنبھال لیں گے۔ سندھ رام جیسے معروف شخص کا تو اس وقت کوٹھی پر موجود ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اسے بھی اصل میں سوئی نام کے اس کردار سے دودھ ہاتھ کرنے تھے جس کا تذکرہ سجاد گانا نے بھی کیا تھا اور ماہ پالو نے بھی۔

گاڑی سندھ رام کی کوٹھی کے سامنے جا کر رکی تو مشاہدہ خان نے اس کے اشارے پر پارن دیا۔ دو تین بار پارن دینے کے باوجود اندر سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔

”اتر کر تھیں بھائی۔“ اس نے حکم دیا۔ مشاہدہ خان نے حکم کی تعمیل کی مگر من دیا نہ پراسے اندر سے کتنی نیچے کی آواز سنائی نہیں دی۔ جانتے بھنتے شراب بھی یا بندہ گردی کو بھی۔ اس نے لوہے کے دروازے کے کدے کو بجایا۔ یہ زوردار دستک بھی بے گامی۔ دوسری طرف ایسی خاموشی تھی گویا کوٹھی خالی پڑی ہو۔

”دوسری طرف کوہ کر اندر سے کدے کی کھلو۔“ وہ جو گاڑی میں بیٹھا ہوا اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا، مضطرب ہو کر نیچے اتر آیا اور حکم دیا۔ مشاہدہ خان نے حکم کی تعمیل کی اور گیسٹ کے دوسری طرف کوہ کر دی۔ دروازہ کھول دیا۔ وہ فوراً کدے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس وقت اس کی نظروں نے تساوی کیڑوں کی بھٹکتی دیکھی۔ وہ یقیناً کوئی عورت تھی جو کوٹھی کی اندرونی عمارت سے نکل کر بائیں جانب کی پتھری لگی میں دوڑتی ہوئی کوٹھی کے عقبی حصے میں جا رہی تھی۔

”تم اندر دیکھو، میں پیچھے جاتا ہوں۔“ اس نے مشاہدہ خان کو جوا پنی پشت کا منظر نہیں دیکھ سکا تھا، چھری سے حکم دیا اور خود بھی اسی ہی کی طرف دوڑ گیا۔ لگی پار کر کے دو کوٹھی کے عقب میں پہنچا تو وہ عورت کچھلی دیوار پھلاٹ کر سندھ رام کی کوٹھی کی عقب سے جڑی ہوئی دوسری کوٹھی میں اترنے لگی۔ چمک میں تھی۔ اس نے بھپٹ کر اس کی بائیں ٹانگ سبز کر لی تھی۔ برٹول میں عورت نے اپنی دائیں ٹانگ چلائی۔

شہر بارے کے چہرے پر اس کی ٹانگ کی ضرب کی تسکین چونکہ وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے دیوار سے لگی ہوئی تھی اور اس کی ایک ٹانگ بھی اس کی گرفت میں تھی اس لیے ضرب زیادہ زوردار نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ جھنجھکیا اور لیوارا زوردار کر عورت کو کھینچا۔ اس بارہ وہ دیوار پر اپنے ہاتھوں کی گرفت قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور وہ چپ سے زمین پر آ گری لیکن نیچے کرتے ہی اس نے خود کو حیرت انگیز پھرتی سے سنبھالا اور اچھل کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس وقت شہر بارے

اور اک ہوا کہ وہ کوئی عورت نہیں بلکہ قہر ہے جس کا قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ ہی کم ہوگا۔ سیدھے کھڑے ہونے کے بعد وہ کس بل بھر کے لیے ہی رکا ہوگا پھر فوراً ہی اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے حملہ کرنے کا انداز ایسا تھا کہ شہر بارے فوراً ہی جاگ لیا کہ وہ جوڑو کے فن میں ماہر ہے۔ دائیں جانب بھٹک کر اس نے خود کو اس کے وارے سے بچانے کی کوشش کی لیکن یہاں اس سے اندازے کی قطعی ہو گئی۔ حملہ آور نے بائیں طرف حملے کا ذریعہ دے کر اس کے دائیں شانے پر ٹھکڑی پھینک کر زوردار اور کیا تھا۔ دائیں شانے پر لگنے والی یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ اسے لگا کہ اس کے شانے پر لگنے والی یہ ضرب انسانی پھل کی بجائے لوہے کی کسی مضبوط راڈ سے لگائی گئی ہو۔ وہ افراد جنہیں اس نے ساری زندگی سڑکوں پر تالیاں بجا بجا کر بھگنا کھتے دیکھا تھا، ان میں سے کوئی لڑائی بھڑائی کے فن میں اتنا ماہر بھی ہو سکتا ہے، اسے یہ جان کر حیرت سی ہوئی لیکن اس وقت اس حیرت کا اظہار کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اپنے شانے پر لگنے والی ضرب سے فوراً سنبھلتے ہوئے اس نے اپنی بائیں ٹانگ چلائی جو حملہ آور کے پہلو میں لگی۔ ضرب زوردار ہونے کے باوجود وہ اسے آرام سے صبر کیا اور خود بھی اٹھ بائیں ٹانگ سے ایک بار پھر اس کے شانے کو ٹھٹھکا دیا۔ وہ بارہا ہی جگہ جگہ کھاکر شہر بارے زوردار ساڑھ کھڑا گیا۔ اس نے خود ایک زمانے میں مارشل آرٹ سیکھا تھا لیکن کئی زندگی میں اس آرٹ کو آزمانے کی اسے بھی ضرورت نہیں پڑی تھی جبکہ سامنے والے کی پھرتی، قوت اور مشاقی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس فن میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ شانے پر ضرب لگانے کے بعد بھی وہ رکا نہیں بلکہ منہ سے ایک زوردار آواز نکالتے ہوئے ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوا اور اس کے دونوں پہلوؤں میں اپنے دونوں ہاتھوں کی پھیلپھیل سے ضرب لگائی۔ دیکھ کر اس کی طرف کاٹ دینے والی یہ ضرب کھاکر اس کے منہ سے آواز کی آواز نکلی اور وہ زمین پر گر گیا۔ گرتے گرتے البتہ اس نے حملہ آور کے بالوں کو پکڑ کر اس کا سر زمین پر مارنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن نتیجہ میں اس کے بال اس کے ہاتھ میں رہ گئے اور وہ بچ نکلا۔ شہر بارے کے ہاتھوں میں آ جانے والے بال دراصل ایک دگ تھی جس کے سر سے الگ ہو جانے کے بعد حملہ آور کا مردانہ ہنر اسٹائن دیکھا جاسکتا تھا۔ کرخت چہرے پر عورتوں والے میک اپ اور لباس کے ساتھ یہ مردانہ ہنر اسٹائن بہت عجیب لگ رہا تھا اور اس کی جنس ایک بار پھر مشکوک ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً خود بخود سراسر کوئی مرد تھا

جو سر سے دگ الگ ہو جانے پر ذرا سا ٹھکا خرد مگر پھر رکے بغیر گرے ہوئے شہر بارے کے پیٹ میں ایک زوردار ضرب لگائی اور ایک بار پھر بھی دیوار کی طرف دوڑ گیا۔ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف پھلاٹنے میں اس نے بندر کی سی پھرتی دکھائی۔ جب تک شہر بارے پھلپھل کر اس کے پیچھے دوڑتا، وہ دوسری طرف کود چکا تھا۔ اس کی پیروی میں وہ بھی دیوار پر چڑھا مگر اس دوران وہ دوڑتا ہوئی عقبی کوٹھی کے گیسٹ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ جب اس کوٹھی میں کودا تو وہ گیسٹ سے باہر نکل چکا تھا۔ اس کے تعاقب میں اس نے بھی گیسٹ کا رخ کیا۔ آدھے راستے میں ہی اسے باہر سے کسی گاڑی کا آگاہی اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ گیسٹ پر پہنچا تو اسے باہر سے بند پایا۔ جب تک اس نے گیسٹ پر چڑھ کر دوسری طرف چلائی لگائی، گاڑی بہت دور جا چکی تھی۔ قاصداً اتنا زیادہ تھا کہ گاڑی کا نمبر نوٹ نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن اس نے یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ وہ سلوو گرے لکری آلہ تھی۔ اس آلہ کا تعاقب کرنے کے لیے گاڑی کی ضرورت تھی اور اس کی گاڑی سندھ رام کی کوٹھی کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں سے اس تک پہنچنے کے لیے پوری گلی پار کر کے ایک لمبا جکر کاٹا پڑتا۔ اس راستے کو اختیار کرنے کے بجائے وہ جس راستے سے آتا تھا، وہی رو اپس چلا اور عقبی دیوار پھلاٹ کر سندھ رام کی کوٹھی میں پہنچ کر صحن گیسٹ کی طرف بھاگا۔ اس دوران البتہ اس نے یہ نوٹ کر لیا تھا کہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ شاید مشاہدہ خان اس آگ کی وجہ سے ہی مصروف ہو گیا تھا جو اس کی طرف ملت کر نہیں آیا تھا۔ وہ خود اس آگ کو نظر انداز کر کے گیسٹ پر کھڑی اپنی گاڑی تک پہنچا۔ وہ لوگ ایسی صورت حال میں کوٹھی کے اندر داخل ہوئے تھے کہ مشاہدہ خان کو گاڑی لاک کرنے یا چالی نکالنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ پک کر گاڑی میں سوار ہونے کے بعد اس نے اسے اشارت کیا اور فل اپس میں اس جانب دوڑا دیا جس طرف سلوو گرے آلہ لگی تھی لیکن تمام تر پھرتی کے باوجود اسے دیر ہو چکی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ آلہ کی کھول کوٹھی نہیں پاسکا اور تھوڑی دیر اور گرد کی سڑکوں پر پہنچنے کے بعد وہ اپس سندھ رام کی کوٹھی کا رخ کر لیا۔ وہاں کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں کوٹھی کے گیسٹ کے سامنے کھڑی صاف نظر آ رہی تھیں اور اس کا عمل کوٹھی میں لگی آگ بجھا رہا تھا۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“ اس نے کہا۔ آپ کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن آپ نے کال ہی ریسیو نہیں کی۔“ اسے دیکھتے ہی مشاہدہ خان پک کر اس کے قریب

آج اس کی بات سن کر اس نے اپنی بیٹی جیتھیا کیسے
 موبائل موجود نہیں تھا۔ شاید وہ جیتھیا کی جانب اس شخص سے لڑائی
 کے دوران اس کی جیب سے نکل گیا تھا۔
 ”کونسی کے اندر چھ لاشیں ہیں۔ پانچ افراد کو تو لگتا ہے
 کہ کوئی زہر پڑی ہے۔ دے کر مارا گیا ہے۔ جس کمرے میں
 لاشیں پائی گئی ہیں، وہیں شراب کی بوتلیں اور گلاس بھی موجود
 ہیں۔۔۔ جبکہ جیسے شخص کو سر پر کوئی بھاری ضرب لگا کر ہلاک کیا
 گیا ہے۔ میں آپ کو فوری طور پر ان لاشوں کے بارے میں
 اطلاع دیتا لیکن وہاں ایک کمرے میں زبردست آگ لگی
 ہوئی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ پہلے اس آگ کو بجھا دوں لیکن
 مجھے کامیابی نہیں ہوئی اور آگ مزید بھڑک اٹھی۔ مجھے مجبوراً
 قازر بریگیڈ والوں کو فون کرنا پڑا۔ آپ سے تو رابطہ ہی نہیں
 ہو رہا تھا ورنہ میں پہلے آپ سے اجازت لیتا۔ اب بھی میں
 نے اس کمرے کا دروازہ بند کر دیا ہے جس میں لاشیں ہیں
 تاکہ آگ بجھانے والے عملی ان لاشوں پر نظر نہ پڑ سکے۔
 اب آگے آپ بتائیں کہ کیا حکم ہے؟“ مشاہیرم خان نے
 اسے مکمل رپورٹ دی۔
 ”تم ذرا جھکی طرف جا کر چیک کرو کہ وہاں میرا
 موبائل تو نہیں گر ہوا؟ میں اس دوران لاشوں کو دیکھتا ہوں۔
 کس کمرے میں ہیں لاشیں؟“ اس نے اسے حکم دینے کے
 بعد اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ جو دراصل ہاتھ پر پہلا کمرہ ہے۔“ مشاہیرم خان نے
 بتایا جسے سن کر دوسرا ہاتھ والا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ قازر
 بریگیڈ کا عملہ اپنا کام کر رہا تھا ان پر توجہ دے بغیر وہ اندر کی
 طرف بڑھتا چلا گیا۔
 ”اے بھائی! اندر کہاں جا رہے ہو؟ اندر آگ لگی ہے،
 باہر ہی رہو۔“ ایک آدمی نے بلند آواز میں اسے ٹوکا۔
 ”شٹ اپ۔ اپنے کام سے کام رکھو۔“ جواباً وہ غرایا
 اور قدموں گورو کے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا انداز ایسا
 تھا کہ اسے ٹوکنے والا دیک کر چپ ہو رہا۔ اس نے مشاہیرم
 خان کے پتے پتے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازے کا
 لٹو کھٹک کر دروازہ کھولا۔ وہ ایک دریاغ کا منظر دیکھا جس
 میں سچے سچے عدد لاشیں موجود تھیں۔ لاشوں کی صورت میں
 وہاں موجود افراد میں سے چار غریب مرادھے جن کی لاشیں
 صوفوں پر ہی آڑھی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ انہی لاشوں کے
 ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی بھی لاش تھی۔ اس کے انداز سے
 کے مطابق جیتھیا لہاس میں ملیں وہ شخص سینہ مشہور رام ہو سکتا
 تھا۔ ان افراد کے آس پاس لڑکھے ہوئے شراب کے جام نظر

آ رہے تھے جبکہ میز پر چوتھائی سے بھی کم بھری ہوئی شراب کی
 بوتلیں کے علاوہ ایک بھرا ہوا جام بھی موجود تھا۔ اس منظر کو دیکھ
 کر سب سے پہلا خیال یہی آتا تھا کہ کسی نے ان افراد کو
 زہر ملی شراب پلا کر ہلاک کیا ہے۔ یہ شخص وہی ہو سکتا تھا جس
 سے ابھی ٹھوڑی دیر پہلے اس کا ٹکرا ہوا تھا۔
 چھٹی لاش دروازے کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ اس
 کی کھوپڑی پیچھے سے بری طرح بھردھ جی تھی اور اس بھروسہ
 جسے سے خون اور مغز کا مٹو باسا بہہ کر قالین میں جذب ہو رہا
 تھا۔ لاش کے قریب ہی تنگ مرم کا ایک خون آلود بھاری کس
 دان پڑا ہوا تھا جو قیمتی طور پر لٹکائی تھا۔ کمرے کا نقشہ دیکھ کر
 جو بات آپے سے بڑھ رہی تھی، وہ سن کر کچھ دیر تک کوئی سے غرار
 ہونے والا شخص یقیناً ان تمام افراد کے لیے شام تھا جس نے
 بہت آرام سے ان لوگوں کو گھومنے کے شراب میں زہر ملا کر
 پلا دیا۔ چھٹا کمرے والا شخص اپنے طے سے چوکیدار لگتا تھا
 جسے یقیناً بھانے سے کمرے میں بلایا گیا تھا اور پھر پیچھے سے
 وار کر کے اس کی کھوپڑی کو بائیں پاس کر دیا گیا۔ لٹک کا بھڑک
 دینا ان افراد کے سینوں میں موجود رازوں کو پوشیدہ رکھنا
 تھا۔ وہ سارے ایک کھمبے کے چنے بے تھے جو ایک ساتھ ہی
 دوسرے جہان پہنچا دیے گئے تھے۔
 ”فائر بریگیڈ والوں نے آگ بجھا دی ہے سرائے
 کے ذریعے علاقے کی پولیس کو بھی علم ہو گیا ہے کہ اس کوئی
 میں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ وہ لوگ یہاں پہنچ چکے
 ہیں۔“ اس نے ابھی کمرے کا سرسری سا جائزہ ہی لیا تھا کہ
 مشاہیرم خان اس کے موبائل سمیت والوں آگیا اور
 اطلاعات فراہم کیں۔
 ”تم ان سے جا کر بات کرو، میں سجاد بھائی کو فون کرتا
 ہوں۔“ اس نے مشاہیرم خان کو اپنی طرف بڑھایا ہوا موبائل
 تھا کہ اسے علم دیا تو دروازے کی طرف سے باہر نکل گیا جبکہ وہ
 خود سجاد خان سے رابطہ کرنے لگا۔
 ”شہر بارگاہ چاک کہاں پہلے گئے ہو یا؟“ رابطہ طے
 ہی سجاد خان نے اس سے پوچھا۔
 ”میں ماڈل ٹاؤن میں سینہ مشہور رام کی کوشمہ پر ہوں
 سجاد بھائی! پلیز آپ بھی فوراً یہاں آجائیں۔“
 ”لیکن تم وہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ حیران ہوئے۔
 ”مجھے شینا کے سلسلے میں ایک کھیلو تھا اسی لیے میں
 یہاں آتا تھا مگر یہاں تو معاملہ بہت ہی بڑا ہے۔ میں آپ کو
 فون پر زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ بس آپ آجائیں اور
 ساتھ ہی اپنے اعتماد کے کسی آفیسر کو بھی یہاں آنے کا کہہ

دی۔ میں فون بند کر رہا ہوں، مجھے یہاں موجود پولیس
 والوں سے بھی نمٹنا ہے۔“ اس نے جلدی جلدی کہنے کے بعد
 فون بند کر دیا۔ علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او کمرے کا بند
 دروازہ کھول کر اندر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہی مشاہیرم خان
 بھی تھا۔
 ”کیا؟ یہ تو سینہ مشہور رام ہیں اور یہ ان کی ملازمہ
 سوئی۔“ پولیس کس نے نقل کیا؟“ وہ جواب دے ملائے کے ایک
 صاحب حیثیت شخص کی کوئی میں کتنے والی آگ کی اطلاع سن
 کر یہاں تک آیا تھا لاشیں دیکھ کر بوکھلا گیا اور شہر بارگاہ سے
 پوچھنے لگا۔
 ”یہ معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے۔ ویسے میں آپ کو بتا
 دوں کہ اس معاملے کو دیکھنے کے لیے آپ کے ڈی آئی جی
 سجاد خان صاحب خود یہاں آ رہے ہیں۔“ اس نے ایس ایچ او
 کو بے نیازی سے جواب دیا مگر خود اس کے اندر ہوا شدید
 اعتقاد اور بے چینی تھی۔ یہاں کے حالات دیکھ کر وہ بائیں
 دھینکا کے متعلق دی گئی اطلاع کافی حد تک درست لگنے لگی۔
 اسے کچھ نہیں آتا تھا کہ اگر اس کے خاندان پر سچے سچے اتنا بڑا
 سانحہ گزر چکا ہے تو وہ سارے لوگوں کو اس بارے میں کس
 طرح اطلاع دے گا؟ ابھی تو اسے سجاد خان سے سامنا کرنے
 کے خیال سے ہی پریشانی ہو رہی تھی لیکن اس نے کچھ چھپانا
 بھی ممکن نہیں تھا۔
 ”میں آپسپرس کو کال کرتا ہوں تاکہ وہ جائے وقوعہ
 سے ثبوت وغیرہ جمع کر لیں۔“ یقیناً مشاہیرم خان نے ہی
 اسے آگاہ کر دیا ہوگا کہ اندر موجود شخص کی کیا حیثیت ہے۔
 مشاہیرم خان کی اطلاع پر شاید اس نے بھروسہ نہ کیا ہو لیکن
 اب ڈی آئی جی صاحب کے وہاں پہنچنے کی اطلاع سن کر
 بالکل اراٹ ہو گیا تھا چنانچہ اپنی سینٹ سٹیبلز ہوا میزری سے
 باہر پکا۔
 ”تم میرے ساتھ آؤ۔“ ایس ایچ او کمرے کے
 دروازے پر اپنے ایک ساتھی کو کھڑا کر گیا تھا چنانچہ یہاں
 ر کے رہے بغیر ضروری کھتے ہوئے اس نے باہر کی طرف
 قدم بڑھا دیے اور ساتھ ہی مشاہیرم خان کو بھی اپنے ساتھ آنے
 کا حکم دیا۔ اب اسے اس اسٹور روم کی تلاش تھی جہاں سے ماہ
 بائو کی اطلاع کے مطابق تھانے کے لیے راستہ جاتا تھا۔ جلد
 ہی وہ اسٹور روم اس کی نظروں میں آگیا۔ یہ غور دیکھنے پر
 اسے ہلکے دیرمیان وہ معمولی سا فرق بھی نظر آگیا جو
 دراصل تھانے تک پہنچنے کے لیے بنائے گئے غیر راستے کی
 نشان دہی کرتا تھا۔ اس کے اشارے پر مشاہیرم خان نے درز

میں انگلیاں ڈال کر اس جگہ کے بائو کو زور لگا کر اوپر کی طرف
 کھینچا تو اس حصے کے بائو کمرے کی طرف اوپر کی طرف
 اٹھنے چلے گئے۔ فرش میں پھینا ہوا ہے والے اس علاقے سے نیچے
 کی طرف جاتی سریزیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ اور مشاہیرم
 خان آگے پیچھے ان میزبوں سے گزرتے نیچے پہنچ گئے۔
 میزبوں کے قریب ہی کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے اس
 دروازے کو کھولا تو باہر بانو کی بتائی باتوں میں سے ایک اور
 بات کی تصدیق ہو گئی۔ اس ہال نما کمرے میں بہت ساری
 کرسیاں موجود تھیں اور ایک چوڑے پر سچے سچے ایک بڑی سی
 سوئی رکھی تھی۔ وہ کرسیوں کے درمیان میں سے گزرتا ہوا
 چوڑے کے قریب پہنچا اور اس سوئی کا جائزہ لینے لگا۔
 بھیا یک خندو خال والی وہ سوئی بے حد عجیب سوئی ہونے کے
 باوجود دل میں کراہیت کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ سوئی کے
 گھٹنے میں اور کانوں میں موجود سونے کا زیور اس کے لیے اس
 کے پیاروں کی عقیدت کا ثبوت تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس بھیا یک
 مٹی کی سوئی کے قدموں میں شوخ و چنگل، زندگی سے بھرپور
 شینا کو بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا، اس کا دل کانپ اٹھا اور
 آنکھیں ڈبڈبایں لگیں۔ اسی وقت اس کے موبائل کی
 تھر تھراہٹ نے کوئی کال آنے کا اشارہ دیا۔ اس نے موبائل
 کی اسکرین پر آنے والا سجاد خان کا نام پڑھا اور خود کو سنبھالنے
 ہوئے کال ریسیو کر لی۔
 ”تم کہاں ہو میزری؟ میں پہنچ گیا ہوں مگر تم نظر نہیں
 آ رہے۔“
 ”میں سبیں ہوں، ابھی آپ کے پاس آ رہا ہوں۔“ اس
 نے انہیں جواب دیا اور پھر وائیں اوپر جانے والے راستے کی
 طرف بڑھ گیا۔ مشاہیرم خان اس کے پیچھے تھا۔ وہ لوگ
 لاشوں والے کمرے تک پہنچے تو دیکھا ایک میزری کی لمبھی پہنچ
 چکی ہے۔ وہ لوگ لاشوں کی تصویریں لیتے، ایف بی اٹھانے
 اور موقع پر موجود تمام اہم اشیاء اپنی کسٹری میں لینے کا کام
 کر رہے تھے۔ علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او وہاں موجود
 نہیں تھا اور ایک دوسرے شخص کی زیر نگرانی یہ سارا کام ہو رہا
 تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گیا کہ وہ سجاد خان کا بندہ ہے۔
 ”ان ہاتھیوں افراد کے منہ سے کروے باداموں کی ہی
 ہوا آ رہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں سنا کا نیکڑے کر
 مارا گیا ہے۔ حتیٰ بات پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سامنے آنے
 کے بعد ہی یہی جان سکیگی۔“ نگرانی کرنے والے آفیسر نے
 اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس رائے کو سن کر وہ لوگ چونک
 گئے۔ ان افراد کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے، یہ تو کبھی

آہی گیا تھا لیکن سنا کیلئے استعمال معاملے کو مزید غور کر دیا تھا۔ اس سربل الاثر ذہن کا استعمال اتنا عام نہیں تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل کوئی معمولی شخص نہیں۔

”یہ تین افراد وہی ہیں جن کے بارے میں شک تھا کہ انہوں نے شہینا کو اغوا کیا ہے۔ ان تینوں افراد کو پولیس شہر بھر میں ڈھونڈ رہی اور یہ بیان جیسے بیٹھے ہوں گے، ذرا اندازہ نہیں تھا۔“ وہ سجاد رانا کے قریب جا کر کھڑا ہوا تو اس نے تین خواہ مخواہ سرائوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دھیمی آواز میں بتایا۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود اس کے لہجے کا بھانپنا محسوس کیا جاسکتا تھا۔

”مجھے سے غلطی ہو گئی کہ میں نے سندھ رام کی حیثیت دیکھتے ہوئے اس کی بات پر اعتبار کر لیا۔ اگر میں اسی وقت اسے اور اس کی ملازمہ کو اغوا کران سے پوچھ لیتا تو شہینا کا پتا معلوم ہو جاتا۔“ اپنے دائیں ہاتھ کی گلی بائیں ہاتھ کی پٹھلی پر مارے ہوئے اس نے غصے کا اظہار کیا اور نفرت بھری نگاہ سے سندھ رام کی لاش کو دکھایا۔

”میں سپاہیوں کو گولی کی تلاشی لینے کا حکم دیتا ہوں۔ جس طرح اس شخص کی لاش ان خواہ مخواہ سرائوں کے ساتھ ملی ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے درمیان بہت قریبی مراسم تھے۔ جب یہ لوگ اس گولی میں موجود ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ شہینا بھی یہیں نہیں ہوگی۔“ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جوش سے باہر کی طرف لپکا۔

”ایک منٹ سجاد بھائی! آپ رک جائیں۔ میں یہ کام کرتا ہوں۔“ اس نے فوراً ایک کرسچا کو بازو پکڑتے ہوئے اسے روکا تو وہ ٹھٹھک سا گیا مگر اس کی بات مان لی۔

”میرے خیال میں آپ دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھیں۔ میں خود بھی وہیں آتا ہوں۔“ اسے امید نہیں تھی لیکن سجاد نے یہ بات بھی غلاف توقع مان لی اور ابھی کچھ کم انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

”آفسیر! یہاں سے فارغ ہو کر تم اپنی ٹیم کو بھیج دینا۔ میں لے جانا۔ وہاں سے تم لوگوں کو خصوصاً خون کا کوئی نمونہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ وہاں موجود چوہرے یا مورق پر سے تمہیں یہ چیز مل سکتی ہے۔“ سجاد رانا کے باہر نکلنے کے بعد وہ پولیس آفسیر سے مخاطب ہوا اور اسے قسم دینے کے ساتھ ساتھ تھکانے والے جھنجھکے کا راز بھی سمجھا دیا۔

”جس کمرے میں آگ لگی ہے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ وہاں کیا تھا؟ وہ کمرہ اس منہدم کے لیے استعمال

ہوتا تھا؟“ باہر نکلنے نکلنے اس نے پلٹ کر آفسیر سے پوچھا۔

”میں سرائوں نے معلوم کیا ہے۔ آگ اصل میں ایک نہیں، دو کمروں میں لگی تھی اور یا قاعدہ یا بیرون چکر کر لگائی گئی تھی۔ ویسے تو آگ نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا ہے لیکن کمروں کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کمرہ ایڈمرم اور دوسرا اسٹڈی روم تھا۔“ آفسیر نے بتایا تو وہ سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہ اطلاع بھی بڑی معنی خیز تھی۔ عموماً لوگ اپنی رستہ اشیا خصوصاً ڈاکٹر اور کاغذات وغیرہ انہی دو کمروں پر رکھتے ہیں۔ ان دونوں کمروں پر آگ لگنے جانے کا مطلب تھا کہ سندھ رام کی زندگی میں کوئی ایسا حادثہ جس کو چھپانے کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا۔ اس واقعے نے اسے اللہ آباد کے مدرسے کی یاد دلا دی تھی۔ وہاں بھی کچھ مشکوک چیزوں کو اسی طرح آگ لگا کر ان کا وجود چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ ایک سپاہی کی نشان دہی پر اس کمرے میں پہنچا جس میں سجاد رانا اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے چلا گیا تھا۔ وہ ایک مونس کی پشت سے لپکے آگے آگے مونس سے بیٹھا نظر آیا۔ اس کے پیچھے یہ پریشانی اور دکھ کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آہٹ یا کراہنے کی آواز آگے نہیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شہینا گریہ کی کوشش کرتا رہا ہو۔

”مجھے شہینا کے بارے میں بتاؤ شہر بار۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟... وہ بے گنجی یا نہیں؟“ آخری سوال کرتے ہوئے اس کی آواز کا پتہ بھی تھا۔ سجاد رانا نے پولیس کی ملازمت میں برسوں گزارے تھے اور اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تجربہ کار تھا۔ اس لیے اس کے رویے سے یہ بھانپ لیا کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے، اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ شاید شہر بار... کے مشورے پر وہ سب کے درمیان سے بہت کراں الگ تھلک کمرے میں آکر بیٹھے پر بھی اسی لیے راضی ہو گیا تھا کہ اسے خود کو کچھ دیکھنے کے لیے تھوڑی سی مہلت دے کر بھی۔

”نی انالی کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ کوئی میں ابھی تک ایسا کوئی سراغ نہیں ملا ہے کہ شہینا کی یہاں موجودگی کا ثبوت مل سکے۔ البتہ میں ماہ بالو کی جس اطلاع کو سن کر یہاں پہنچا تھا، اس اطلاع کے ساتھ جزی بہت ہی باتوں کی تصدیق ہو گئی ہے اور یوں لگتا ہے کہ وہاں سے بدترین خدشات درست ثابت ہوں گے۔“ وہ آہستہ آہستہ سارے حقائق ان کے سامنے پیش کرتا چلا گیا۔

”میری بیٹی کا خون راسگال نہیں جائے گا۔ میں اس کے

قاتلوں کو زمین کی تہ سے بھی کھینچ لکھوں گا۔“ ساری بات سن کر وہ ایک جوش کے عالم میں بولا اور تیز تقریر قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ اس کے کمرے سے باہر نکلنے سے قبل شہینا نے اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھا تھا۔ وہ پیلے سے کچی لکھن زیادہ سرخ ہو گئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے ان آنکھوں سے خون چھٹک پڑے گا۔

☆ ☆ ☆

”نی نی! کھانا تیار ہے۔ آپ کے لیے تین لے آؤں یا ڈھنگ ٹیکس پر لگا دوں؟“ وہ ایک کتاب کا جو کچھ سرسری سا مطالعہ کر رہی تھی کہ ملازمہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی اور اس سے پوچھا۔ وہ سجاد رانا کے کمرے میں ہی تھی۔ یہاں اس کا ایک مہمان کی طرح خیال رکھا جا رہا تھا لیکن یہ عزت اور مہمان نوازی اسے کبھی چنگ کی طرح ڈولنے اپنے مستقبل سے بے فکر نہیں کر سکتی تھی۔ اسے تو کچھ جگہوں کے بارے میں کچھ خبر تھی اور نہ ہی بے بے اور ابا کے بارے میں۔ داماد الامان میں پیش آنے والے واقعے کے بعد وہ محتاط ہو گئی تھی کہ فون پر ان لوگوں سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس وقت بھی وہ صرف ایک فون کال کرنے کے نتیجے میں بری طرح پھنس گئی تھی۔ اگر داماد الامان کا جو گیارہ اپنی جان پر خلیل کراں کے اغوا کے لیے آئے والوں کو نہ روکتا تو وہ چودھری افکار کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ دولت کے نشے میں پھندا ہوں گے اس پجاری سے بچنے کے لیے وہ وہاں سے دور راہزہ اُدھر پہنچ چکی پھر رہی تھی۔ آبلے پانی کے اس سفر میں گروالاس کے ٹھکانے پر زور سے تکلیف دو اور دولت آمیز شب و روز بھی شامل تھے۔ قسمت اسے اس قید سے تو نکال لائی تھی لیکن انہوں تک پہنچنے کی راہ ابھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ شہر بار سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بھی اسے دستیاب نہیں تھا۔ جب سے اس نے اسے شہینا کے بارے میں اطلاع دی تھی، اس کا کچھ پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سجاد رانا بھی گھر سے غائب تھا۔ کل رات نہ جانے کس وقت ان دونوں کی گھر واپسی ہوئی تھی اور ان پھر وہ علی الصبح ہی رات ہو گئے تھے۔ ان حالات میں وہ شہر بار سے اپنے متعلق کوئی بات کرنے کا موقع کہاں سے کاٹتی؟ چنانچہ فی الحال نہیں رہنے پر مجبور تھی۔

”آپ نے بتایا نہیں لی! آپ کھانا کہاں کھائیں گی؟“ ملازمہ نے اپنا سوال دہرایا تو وہ اپنے خیالات سے نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ایسا کرو، ڈانٹنگ ٹیکس پیل پر ہی کھانا لگو۔ بیگم صاحبہ نے بھی

تو کھانا نہیں کھایا ہوگا، ہم دونوں رات بھر کی کھالیں گے۔“ وہ کمرہ بند کھینچ کر صبح کو صبح کر چکی ہیں۔ میں ان سے پوچھ کر آئی ہوں۔“ اس کی بات سن کر ملازمہ نے اطلاع دی۔

”تم کھانا لگو۔ میں کچھ دانی لے کر آتی ہوں۔“ وہ پھر میں چٹان ڈالتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور مریم کے بند روم کے سامنے پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔

”ایس، ہم ان۔“ اندر سے مریم کی بھی تھکی آواز سنائی دی۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھولا کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ شہینا کی ایک فریم شدہ تصویر پر نظر پڑا جسے اپنے بند پر نیم دراز تھی۔ اسے مریم پر بہت شدت سے رحم آیا۔ اس کی بیٹی کو چند غالموں نے اپنی اندھی عقیدت کی سمجھوتہ چڑھا کر جھین لیا تھا اور وہ اب تک اس کی ڈوری سے بندھی اس کی واپسی کی منتظر تھی۔

”خیریت... کوئی کام ہے کہ تمہیں مجھ سے؟“ وہ اس کی آہٹ پر تصویر سے نظر اٹھا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور قدرے حیرت سے پوچھا۔

”میں آپ کو کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ میرا اکیلے کھانا کھانے کا بالکل بھی دل نہیں پڑ رہا۔“ اس نے اپنا دعا بیان کیا۔

”اچھا، چلو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ حیرت انگیز طور پر وہ غور اندیشی راضی ہو گئی۔ ”میری بیٹی شہینا کو بھی اکیلے کھانا کھانا بالکل پسند نہیں۔ کبھی میرا ہونا نہ لگی ہو تو اس کی وجہ سے مجھے زبردستی ٹھوڑا بہت کھانا چڑھتا۔“ ڈانٹنگ ٹیکس پر پہنچنے کے بعد جب اس نے خود اپنے ہاتھ سے مریم کی پلیٹ میں کھانا نکالا تو اس نے بے ساختہ غیبت بات بتائی۔ مریم کی اس بات کو سن کر وہ سمجھ گئی کہ اس نے ان کے ساتھ کھانا کھانے کی ہامی کیوں بھری تھی۔ وہ اس کے وجود سے اپنی پیاسی مٹا کر بیلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”شہینا گھر واپس آجائے تو میں ایک بہت بڑی پارٹی کروں گی۔ تم بھی اس پارٹی میں ضرور آؤ۔ اللہ نے چاہا تو اس وقت تک تمہارے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ شہر بار بہت اچھا اور ہمدرد لڑکا ہے۔ ان کی ذہنی مجھے تمہارے حالات کا ٹھوڑا بہت علم ہوا ہے۔ تم غم نہ کرو، وہ کسی نہ کسی طرح تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا کر رہے گا۔“

وہ شاید اپنے اندر کی شہینا کی بے گھبراہٹ اس سے مسلسل باتیں کر رہی تھی جبکہ کھانے کی طرف ان کا دھیان بہت ہی کم تھا۔

”پارٹی پر میں تمہیں اپنے تار اور ان لاز سے بھی

ملوؤں کی۔ میری مدد کی تو ذرا سہ ہو گئی ہے لیکن سجاد کی کمی کی وجہ سے مجھے ان کی کمی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ آخر میں آپنی بہت کا منتظر اور سوخت ہیں۔ وہ میرے پاس ہی رہ رہے ہیں لیکن انکل کا بی بی بہت شوق کر گیا تھا اور ان کے اشیائے نامیہ تکلف بھی شروع ہو گئی تھی اس لیے ان کی وجہ سے مقررین آپنی کو گھر واپس جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ انکس مینشن والے ماحول سے دور رکھا جائے۔ وہ خود ہی اسے سب کچھ بتاتی جا رہی تھی۔ وہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس وقت اسے اس پر بھی لکھی مازن اور ت اور اپنی آن پڑھ سیدی سادی بے بے میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بے بے بھی اس کی جدائی میں اسی کیفیت سے گزر رہی ہو گی۔

”ارے! تم تو کچھ کھاؤ۔ صرف میری باتیں سننے میں لگی ہوئی ہو۔“ ہاتھ کرتے کرتے مریم کا دھان اس کی پلیٹ کی طرف گیا تو اس نے اسے ٹوکا اور خود سامان کی ڈش اس کی پلیٹ کے قریب کرتے ہوئے اس کی پلیٹ میں سامان ڈالنے لگی۔ اسی وقت لٹا میں گولیوں کی تڑپا بہت گونگی۔ اس آواز کو سن کر وہ دونوں ہی بری طرح جھپٹیں پھر مریم نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے دروازے کا رخ کیا۔ ماہانہ گونگی اس کے پیچھے لگی مگر ان دونوں کے ڈانگ روم سے باہر نکلنے سے قبل ہی ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”پتا نہیں کون لوگ ہیں بیگم صاحبہ۔۔۔ دیوار پھلنگ کر چکے سے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گارڈز نے دیکھ لیا اور فائر کھول دیا۔ جواب میں وہ لوگ بھی فائرنگ کر رہے ہیں۔“ ملازمہ نے خوف زدہ سے لہجے میں انکس اطلاع دی۔ ”کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ یہاں گھسنے کی کوشش کرنے کے لیے بڑی جرأت چاہیے۔“ وہ بڑبڑاتی پھر اس کی نظر گھبرائی ہوئی ماہانہ کے چہرے پر پڑی۔ فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہاری یہاں موجودگی کی خبر ایک ہو گئی ہے اور اسی پتھر میں وہ لوگ یہاں آئے ہیں۔“ مریم نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور تیزی سے ڈانگ روم میں ہی موجود فون کی طرف پلنگی مگر اگلے ہی لمحے اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیلی فون لائن سے جان گئی۔ دوسری طرف باہر سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آواز لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں رک رہی تھی۔

”میرا موبائل شاید روم میں ہی رہ گیا ہے۔ میں وہاں جا کر سجاد کو کال کرتی ہوں۔“ فون کی طرف سے مایوس

ہونے کے بعد مریم کو اپنے موبائل کا دھان آیا لیکن اس سے کال کے وہ ڈانگ روم سے باہر نکلتی، اسے کھلے دروازے کی دوسری طرف ایک ڈھان پوش شخص نظر آیا۔ اس نے ایک کر دروازے کو بند کیا اور آٹو ٹینک لاک لگانے کے ساتھ ساتھ اوپر کی چٹنی بھی چڑھا دی۔ ڈھان پوش جو اس طرف متوجہ نہیں تھا، دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونک کر متوجہ ہوا۔

”وہ یہاں ہے۔ اس کمرے میں چھپی ہے شاید۔“ اس کی آواز بند دروازے کے پیچھے سے ان کو گون گونائی دی۔ پھر فوراً ہی دروازے کے لاک پر فائر کر گیا۔ یہ پتھر سے کیا گیا فائر تھا جس نے لاک کے پرچے اڑا کر رکھ دیے۔ ایک گولی اطلاع لے کر آنے والی ملازمہ کے پہلو میں بھی گھس گئی۔ وہ بری طرح چھپتی ہوئی فرش پر گر کر اور ترے کی۔ مریم کی قسمت ابھی گئی کہ وہ دروازہ بند کرنے کے بعد ایک طرف ہٹ گئی تھی ورنہ ملازمہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی گولی کی زد میں آ سکتی تھی۔ لاک ٹوٹنے کے بعد اب باہر سے دھکا دے کر دروازے کی چٹنی اکھاڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ چٹنی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گی۔

”آؤ! ادھر سے باہر نکلتے ہیں۔“ مریم نے ملا ٹینک وینڈو کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس سے کہا۔ زمین سے چند فٹ بلند اس ملا ٹینک وینڈو کی طرف گونگی کا لانا تھا۔ وہ دونوں باری باری دوسری طرف کودیں۔ خود اس کے لیے تو کوئی مسئلہ نہ تھا کہ پھلنگے پھلنگے وجود کے ساتھ ساتھ اپنی چٹنی قیامت کی وجہ سے اسے اس طرح کیا اچھل کود کرنے کی مشق تھی لیکن مریم قدرے بھرتے ہوئے جسم کی مالک تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنی بے حد آرام دہ زندگی کی وجہ سے ایسی کسی مشقت کی عادت نہیں تھی اس لیے اسے دوسری طرف کودنے میں تھوڑی سی دقت پیش آئی اور ماہانہ کو اسے سہارا دینا پڑا۔ جس لمحے ان دونوں نے لان میں قدم رکھے ڈانگ روم کے دروازے کی چٹنی ٹوٹ گئی اور دھکا دینے والے اندر داخل ہو گئے۔

”ادھر دیکھو۔ وہ ادھر سے نکلی ہیں شاید۔“ وہ مریم سے ساتھ دوڑتی ہوئی قطعی جانب بے سروتہ گوارڈز کی طرف جا رہی تھی، تب کسی کی چٹنی ہوئی آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے اپنے قدموں کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

”اسے ارک جاؤ۔۔۔ ورنہ گولی مار دیں گا۔“ لمبے بھر میں ہی دوبارہ سنائی دینے والی اس آواز پر ان دونوں کو احساس ہوا کہ انکس دیکھ لیا گیا ہے۔ بند کمرے میں موجود کھلی ہوئی ملا ٹینک وینڈو کو دیکھ کر ظاہر ہے ان کے فرار کی سمت کا

اندازہ لگانا علماء و روں کے لیے ذرا مشکل ثابت نہ ہوا ہوگا۔
 ماہ یا نوے بھاگتے بھاگتے ذرا سا مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ایک
 نقاب پوش ہاتھ میں خنجر نکال کر گھن لیے وٹو دے لائن میں کود
 رہا تھا۔ اسی نے یقیناً انہیں گولی مارنے کی دھمکی دی تھی لیکن وہ
 دونوں ہی اس دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر بھاگتی چلی گئیں۔
 سروٹ کو اڑا کر اب بس دو چار قدم کے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ
 فاصلہ ختم ہوتا، اس سے قبل ہی ان کے پیچھے آنے والے شخص
 نے لگا دو تین فائر کیے۔ گولیاں سائیں سائیں گرتی ہوئی
 ان کے دائیں بائیں سے گزرتی تھیں۔ مگر گولی کی اپنی ایک
 دہشت ہوئی ہے۔ محفوظ رہنے کے باوجود سر میں اپنے اسٹے
 قریب سے گزرنے والی گولیوں سے وقتی بری طرح دہشت
 زدہ ہوئی کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ بین سروٹ کو اڑا کر
 کے دروازے پر گر پڑی۔ ماہ یا نوے گھبرا کر اپنے پیچھے
 دیکھا۔ دو نقاب پوش ہاتھوں میں خنجر لیے اپنی طرف دوڑتے
 آ رہے تھے۔ وہ دونوں ان کے نشانے نہ تھے۔ لیکن اس کے
 باوجود انہوں نے دوبارہ فائر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
 کیا ایک اسے اور اک ہوا کر حملہ آور ہو چکی ہیں، ان کی جان
 لینے کا ارادہ نہیں رکھتے جیسا کہ انہیں زندہ بچا رہا ہے۔ انہیں
 جو فائر ان پر کیے گئے تھے اس کا مقصد بھی صرف انہیں دہشت
 زدہ کرنا تھا۔ وہ اس کی جگہ پر وہ دونوں ہی اسٹے واضح طور پر
 ان کے نشانے پر تھیں کہ وہ لوگ چاہتے تو آسانی سے انہیں
 نشانہ بنا سکتے تھے۔ جان کی طرف سے ملنے والی اس بے لگاری
 کے احساس نے اسے حوصلہ دیا اور وہ سہارہ دے کر سر میں کو
 اٹھنے میں مدد دینے لگی۔ اسی وقت دو فائر مزید ہوئے اور
 گولیاں سر میں کے بالکل قریب زمین پر آ کر گئیں۔ ان گولیوں
 کے زمین پر پڑنے کی وجہ سے اس جگہ کی تھوڑی سی مٹی اٹھ کر
 اوپر سر میں اور اس کے چہرے کو خاک آلود کر دیا۔ سر میں کے حلق
 سے ایک بار پھر دہشت زدہ چٹخیں بلند ہوئیں۔ خود اس کے
 اپنے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا۔ خوف کے اس عالم میں وہ
 چاہتی تو خود سروٹ کو اڑا کر میں داخل ہو کر اپنے آپ کو محفوظ
 کرنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن اسے سر میں کو اڑا کر چھوڑ دینا
 مہوار انہیں تھا۔ سر میں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں
 لے کر اس نے اسے کھڑا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس بار
 خود سر میں نے بھی ہمت سے کام لیا اور کھڑی ہونے میں
 کامیاب ہو گئی۔ کھڑے ہونے کے بعد سروٹ کو اڑا کر میں
 داخل ہونے کے لیے باقی رہ جائے والا ایک قدم کا فاصلہ
 طے کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا مگر اس ایک قدم کو اٹھانے میں
 اتنی تاخیر ضرور ہو گئی تھی کہ نقاب میں آنے والے نقاب پوش

ان کے سر پر پتھر پڑ چکے تھے۔ ماہ یا نوے پورا یقین تھا کہ جب اس
 نے کو اڑا کر دروازہ بند کر دیا تو وہ لازماً اسے موجود آدمی کی ناک
 سے ٹکرایا ہوگا۔
 یہ جیسا سا کو اڑا کر گئی میں کام کرنے والے ٹنگ کے
 زیر استعمال تھا اور اس کا دروازہ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ وہ
 دونوں زیادہ دیر کے لیے اپنے تعاقب میں آنے والوں سے
 محفوظ رہ سکتیں۔ ان کی توقع کے عین مطابق باہر سے
 دروازے کو ٹوڑنے کی کوشش کی جانے لگی لیکن اس کے ساتھ
 ہی انہوں نے ایک ایسی آواز بھی سنی جس نے انہیں حوصلہ
 دیا۔ یہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں تھیں جو لمحہ بہ
 لمحہ قریب آتی محسوس ہوتی تھیں۔
 ”بلکلر آپ میرے ساتھ مل کر اسے دروازے کے
 سامنے رکھنے میں مدد کریں۔“ کو اڑا کر میں موجود بڑے سائرن
 کے ایک جتنی صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس
 نے سر میں سے درخواست کی۔ وہ اس کا مقصد سمجھ کر فوراً ہی
 مدد کے لیے آگے بڑھی۔ اس جتنی صندوق کی پوزیٹیو اتنی تھی
 کہ وہ پورا کا پورا دروازے کے سامنے فٹ ہو جاتا۔ بلندی
 کے اعتبار سے بھی صندوق اتنا اونچا ضرور تھا کہ نصف
 دروازے کی بلندی تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ صندوق بند دروازے کے
 بالکل ساتھ ملا کر رکھ دیا جاتا تو قیفے اکٹرنے کے باوجود
 دروازہ گرنے سے محفوظ رہتا اور انہیں تھوڑی سی سہولت مل
 جاتی۔ اس بڑے صندوق میں یقیناً کھانے کی چیزیں اور دوسرا
 کوئی بھاری سامان رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے انہیں اسے
 دھکیلنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ صرف یہ خود کو
 محفوظ رکھنے کی جلی خواہش تھی جو وہ دونوں، عورتیں والی
 مخصوص نازک حجاب کو فراموش کیے۔ یہ سخت کام کر رہی
 تھیں۔ دروازے کے کمزور پڑتے قیفے بھی انہیں سمجھ
 کر رہے تھے۔ کسی بھی لمحے یہ قیفے مکمل طور پر اکٹڑ جاتے اور
 دروازہ اندر آگرتا۔ پینا پینا ہوتے ان دونوں نے اپنا
 تمام تر قوت صرف کرتے ہوئے بالآخر اس بڑے سے
 صندوق کو دروازے کے سامنے پہنچ دیا۔ جی وہ لمحہ تھا جب
 دروازے سے قیفے مکمل طور پر اکٹڑ چکے تھے لیکن صندوق
 سامنے آ جانے کے باعث دروازہ گر گیا۔
 ”سائرنوں نے دروازے کے سامنے کوئی بھاری چیز رکھ
 دی ہے۔“ انہیں باہر سے کسی کی چھٹیانی ہوئی آواز سنائی دی۔
 ”چھوڑ دو، جا لے دو۔“ پولیس پہنچ چکی ہے۔ یہاں سے
 نکلنے کی کروڑوں ہم بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔“ ایک
 دوسرے شخص نے بلند آواز میں یہ حکم دیا۔ اس حکم کے ساتھ ہی

دروازے پر جاری کارروائی بند ہو گئی اور دوڑتے ہوئے
 قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ ان
 سے دور جا رہی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر ان دونوں ہی نے
 سکون کا سانس لیا اور کھینچے کھینچے انداز میں صندوق کے ساتھ
 ہی اپنا پشت نکال کر فرار ہو چکے تھے۔
 ☆ ☆ ☆
 پولیس ہیڈ کوارٹر میں موجود وہ کرا انسانیت بچوں سے
 گون رہا تھا۔ یہ بچیں اس شخص کے حلق سے برآمد ہوتی تھیں
 جو بچپن میں گئے آنکڑے سے رتی کی مدد سے الٹا لٹکا کسی
 پنڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔ ایک تو الٹا لٹکنے کی اذیت،
 دوسرے قریب کھڑے سادہ لباس پوش والے کے ہاتھوں میں
 موجود بید کی مسلسل حرکت جس کا نشانہ اس کی پیٹھ تھی۔ وہ
 جنہیں نہ بارتا تو کیا کرتا لیکن اس کی پیٹھیں سن کر کمرے میں
 موجود کسی شخص کا دل نہیں کانپ رہا تھا۔ وہ شخص اس لائن ہی
 نہ تھا کہ اس پر رحم کیا جاتا۔ اس کی گردن پر تو اتنی مصلوم
 زندگیوں کو برباد کرنے کا ہتھیار تھا کہ اگر ان لوگوں کو اس سے
 چند اہم معلومات حاصل نہ کرنی ہوتیں تو اس وقت وہ بیرون
 کے بجائے گردن کے بل ہی اس آنکڑے کے ساتھ لٹکا ہوا
 ہوتا۔ وہ شخص گردن الٹا تھا جسے وہ لوگ بڑی جدوجہد کے بعد
 ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ سندر رام کی کوشش سے
 نکلنے ہی سہارا دینے کے لیے سسرانی ہی جی مراد کے ساتھ مل کر
 شہر بھر کے خواجہ سراؤں پر بلا بول دیا تھا۔ حینا کے انوکھے
 سلسلے میں خواجہ سراؤں کے قوت ہونے کا معلوم ہونے پر
 پہلے ہی ان لوگوں کی شامت آتی ہوئی تھی اور اب تو کیا ان
 لوگوں پر مصیبت ہی قوت پڑی تھی۔ کئی مظلوم اور بے تصور
 لوگ بھی اس کارروائی کی زد میں آئے تھے۔ جو بھی شخص ذرا
 مشکوک لگا تھا، اسے گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا گیا تھا
 اور اس سے بے حد سختی کے ساتھ پوچھ گچھ کی جارہی تھی۔
 پولیس کی یہ کارروائی میڈیا کی نظر میں آئی تھی اور وہ لوگ
 خواجہ سراؤں کے ہمدرد ہیں کہ پولیس کے خلاف کھڑے ہو
 گئے تھے۔ کل شام بھی شہر کے بہت سے خواجہ سراؤں نے
 میڈیا کے افراد کے ساتھ مل کر پریس کلب کے سامنے احتجاجی
 مظاہرہ کیا تھا۔ کئی رپورٹرز آئی جی اور ڈی آئی جی سے رابطہ
 کر کے اس صورت حال کے بارے میں معلومات حاصل
 کرنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن انہیں کوئی بہت واضح جواب
 نہیں دیا گیا تھا۔ سجاد رانا اور جعفر اور دونوں پر پتی ایک جنوں
 سا سوال تھا جس کے باعث وہ کسی تعقید اور بدعقلیت کو خاطر میں
 نہیں لارہے تھے۔ یہاں تک کہ متح وزرا علی کی طرف سے

آنے والی کالی کو بھی نظر انداز کر دیا گیا تھا اور انہیں یہ کہہ کر
 قتل دے دی گئی تھی کہ بہت اہم اور ناپ سیکرٹ معاملے کی
 جھان بین کے لیے یہ کارروائی ناگزیر ہے۔ مسلسل تحقیقات
 کے نتیجے میں جو حالات سامنے آ رہے تھے، اس سے یہ بات
 بج بھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی کہ واقعی معاملہ بہت پیچیدہ
 ہے۔ اس لیے معاملے کی تھک پیچھے کے لیے وہ سب پوری
 طرح سرگرم تھے۔ ذاتی دھک نے ان کی سرگرمی کو کمزور کر کے
 بہت تھک کر دیا تھا۔ مفرور گروالماں تک رسائی بھی اس سرگرمی
 کی وجہ سے ممکن ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے لگاؤ کا
 تعاون حاصل کیا تھا۔ اسے خواجہ سراؤں کے کئی ایسے ٹھکانوں
 کا علم تھا جن کے بارے میں پولیس بھی سمجھ نہیں جاتی تھی۔
 اس کی مدد سے وہ ان ٹھکانوں پر گروالماں کو ڈھونڈتے رہے
 تھے۔ نگاری گروالماں اور مدد کے لیے وہ پولیس والے بھی خواجہ
 سرا کا روپ دھار کر اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ بالآخر
 اندرون شہر کی گلیوں میں پہنچے۔ جیسکے وہ لوگ اس جگہ پہنچے میں
 کامیاب ہو گئے جہاں گردن الٹا اپنے ٹھکانے سے بھاگنے
 کے بعد روپوش تھا۔ پولیس والوں نے وہ کھینچ کر اس کے اس
 نئے ٹھکانے کو گھیر کر رکھ دیا تھا اور اسے گرفتار کر کے یہاں لے
 آئے تھے اور اب وہ الٹا لٹکا ان کے سوالوں کے جواب دے
 رہا تھا۔ جہاں کسی سوال کا جواب دینے میں اس کی زبان
 اٹھتی، وہاں اس کے سر پر سلسلہ سادہ لباس شخص کا ہتھ تھک
 ہو جاتا اور اس وقت تک تھک رہتا جب تک اس کی زبان
 دوبارہ نہ چل پڑتی۔
 ”کتنی لمبیوں کو قتل کر چکے ہو تم اپنی دیوی کو بیعت
 دینے کا نام پڑ؟“
 ”صرف تین!“ اس نے سکاری بھرتے ہوئے
 جواب دیا۔
 ”صرف تین... حیرے تو دیک تین انسانی جانیں کوئی
 اہمیت نہیں رکھتیں؟“ سوال کرنے والے سجاد رانا نے اس
 کے من پر ایک زوردار تھپہ مارا پھر لگا تار بارت ہی چلا گیا۔
 ”آخری بار تم لوگوں نے جس لڑکی کو قتل کیا تھا اس کی
 لاش کہاں ہے؟“ شہر یام نے آگے بڑھ کر سجاد رانا کو بازو
 سے پکڑ کر پیچھے بٹاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ وہ اس
 سوال کے جواب میں خاموش رہا لیکن پھر بید کی پے درپے
 ضربوں نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا اور وہ اس جگہ کا
 پتا بتانے لگا جہاں حینا کو مارنے کے بعد اس کی لاش کو دفن کیا
 گیا تھا۔
 ”پارٹی تیار کرواؤ۔“ اس کی بانی ہوئی جگہ پہنچ کر ہمیں

لاش ڈس کور کرنی ہے۔ "سادہ لباس پولیس آفیسر کو یہ حکم دیتے ہوئے سجاد رانا کی آواز کانٹ گئی اور وہ تیزی سے پلٹ کر اس کمرے سے باہر نکلی گیا۔ شہر یار اور مختار مراد بھی اس کے پیچھے نکلے۔ وہ اپنے آئین میں کیا تھا اور میز پر سرور کے کی بنے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رہا تھا۔ اسی میز پر ایک فائل میں وہ رپورٹیں بھی موجود تھیں جن میں سیدھے سندھ رام کی کوٹھی پر کل ہونے والے افراد کی پوسٹ راکٹر رپورٹیں اور مرنے پر پائی جانے والی دیگر شہادتوں کی تفصیل موجود تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں نے تصدیق کر دی تھی کہ کل ہونے والے ہانچوں افراد کی موت سائنائی کی وجہ سے ہوئی ہے جو شراب کے ذریعے ان کے جسم میں داخل کیا گیا تھا۔ چونکہ ان کی موت کا سبب سر پر لگائی جانے والی ہلک ضرب تھی۔ شراب کی بوجھ اور گھاسوں پر مرنے والوں کے سوا کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے اور شہر یار کو اچھی طرح یاد تھا کہ کوٹھی میں اس کی جس شخص سے مذبحہ ہوئی تھی، اس نے اپنے ہاتھوں میں نیکلون کے ہار ایک دستاں پہن رکھے تھے۔ ان رپورٹوں میں سب سے اہم رپورٹ خون کے اس نمونے کی تھی جسے تھے خانے میں موجود دھوڑی پر سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس نمونے کا جو تجزیہ پیش کیا گیا تھا، اس کے مطابق اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ ہینا ہی کا خون ہے مگر پھر بھی انہیں موبوہی امید تھی کہ شاید ہینا مری تہ اور صرف زخمی ہوئی ہو لیکن الماس سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد یہ موبوہی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس کی زبانی ہینا کی موت کی تصدیق کے علاوہ دیگر بھی کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ الماس کے مطابق ہندو خلیہ سر اؤں پر مشتمل ان لوگوں کی ایک تنظیم تھی جو سال بھر سے کام کر رہی تھی۔ اس تنظیم میں ملک کے ہر حصے کے افراد شامل تھے لیکن ان افراد کا انتخاب بہت احتیاط سے کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کی کل تعداد تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان افراد کو مہارو کی حیثیت سے پہچانے جانے والے ایک شخص نے تنظیم کیا تھا۔ لاہور میں سوتی اس کی دھوکا دہی اور اسی کے ذریعے وہ لوگ اس تنظیم میں شامل ہوئے تھے۔ الماس سے انہیں تنظیم کے دیگر افراد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے مطابق مہارو کی طرف سے انہیں آپس میں ٹھٹھنے ملنے اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی پکڑا جائے تو باقی افراد محفوظ رہیں اور ان کے نزدیک شروع کیا جائے والا مقدمہ منجھ جاتی رہے۔ الماس کے بیان سے یہی سمجھا جاتا تھا

کہ مہارو کو کوئی نہایت شاطر اور منصوبہ ساز شخص ہے جو اپنے کسی خاص مقصد کے لیے ان لوگوں کے ذہنوں کو مسرا کر کے اپنا الوسیدہ کر رہا تھا۔ اس خیال کو تقویت الماس کی بتائی اس بات سے ملتی تھی کہ وہ اپنے گروہ میں شامل خوب صورت اور جوان خلیہ سر اؤں کو شائقین افراد کی دل بستی کے لیے بھی بھیجتے تھے۔ ان لوگوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ جب بھی کسی ایسے شخص کے پاس جائیں تو خلوت و جلوت دونوں میں پیش آنے والی معمولی سے معمولی بات کا دھیان رکھیں اور اس کی تفصیلی رپورٹ دیں۔ ہر گروہ کا گروہ رپورٹیں مہارو تک پہنچاتا تھا۔ مہارو ان معلومات کا کیا کرتا تھا، انہیں علم نہیں تھا۔ مہارو کی شخصیت بڑی پراسرار تھی۔ وہ اپنی مرضی سے اس سے ملاقات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بس وہ کسی خاص اجتماع کے موقع پر ہی ان کے سامنے آتا تھا۔ اس کے علاوہ باقی دنوں میں وہ لوگ سوئی سے ہی رابطے میں رہتے تھے۔ الماس کے کیے گئے ان انکشافات نے ان سب کے ذہنوں کو بڑی طرح الجھا دیا تھا۔ ان باتوں سے یہ اشارہ مل رہا تھا کہ یہ ظاہر چند مذہبی جونی خلیہ سر اؤں پر مشتمل یہ تنظیم درحقیقت کسی اور مشن پر کام کر رہی تھی جن خود تنظیم کے ممبران کو بھی صحیح طرح اندازہ نہیں تھا کہ دراصل انہیں کسی مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ کچھ جیلوں کی طرح مہارو کے اشاروں پر تابتے تھے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کرتے تھے۔ ان لوگوں کو سیدھے سندھ رام جیسے موبوہی شخص کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ اس کی پشت پناہی کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کی ملازمہ اس کی کوٹھی پر اس قسم کے اجتماعات کروا سکتی۔ اس کی لاش جس طرح ان خلیہ سر اؤں کے ساتھ پائی گئی تھی، اس سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی تھی کہ اس کے ان لوگوں کے ساتھ قربانی تعلقات تھے۔ تب ہی تو وہ ان کے ساتھ شہر یار نوٹی کر رہا تھا اور جتنی طور پر اسی وجہ سے موت کے گھاٹ بھی اترا گیا تھا۔ جو بھی فرد یا افراد ان سب لوگوں کے پیچھے تھے، انہوں نے یہ جان لینے کے بعد کہ سندھ رام کی کوٹھی اور وہ خوب پولیس کی نظر میں آچکا ہے، اسے لٹکانے لگائے میں دیو نہیں کی۔ ہینا کا ان جانے میں کیا جانے والا ان کے کچھ میں ایک گھبراہٹ تھا۔ خلیہ سر اؤں کے جس گروہ نے اسے اغوا کیا تھا، انہیں خبر نہیں ہوئی کہ وہ ڈی آئی جی کی بیٹی کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں اور یہ اغوا ان کے لیے مصیبت بن جائے گا۔ بہر حال، منظر پر موجود سادہ افراد مصطفیٰ ہستی سے منادے گئے تھے۔ مفرد الماس کے ذریعے انہیں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، وہ بھل جیں

جن کے ذریعے کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل تھا۔ سندھ رام کی کوٹھی سے بھی انہیں کوئی کچھ نہیں مل سکا تھا۔ اگرچہ کچھ بھی تو وہ آگ میں جل کر تبسم ہو گیا ہوگا۔ "خوشی سے کام لو سجاد اگر تم اس طرح سے ہمت ہار بیٹھے تو مریم کو کیسے حوصلہ دے گے؟" وہ دونوں سجاد رانا کے پیچھے کمرے میں آنے کے بعد کچھ دیر تو بالکل خاموش کھڑے رہے پھر آخر کار مختار مراد نے ہی آگے بڑھ کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ البتہ اس کوشش میں وہ خود بھی بڑ حال نظر آ رہے تھے۔ خود ان کا اپنا غم بھی تو الگ نہیں تھا۔ انہوں نے بھی اپنی انکوئی ناخوشی کو کھپا تھا۔ "مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں مریم کو کیسے حوصلہ دوں گا؟ میں ہر روز اسے یہ کہتا رہا ہوں کہ تم جلد ہینا کو ڈھونڈ کر اس کے پاس لے آؤں گا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے اپنی بیٹی ایک لاش کی صورت میں ملے گی۔ میں مریم کے سامنے اس کی بیٹی کی لاش کے کر کے کیسے جاؤں گا؟" یہ وہ سوالات تھے جو ان میں سے ہر ایک کے ذہنوں میں تھے۔ اسے تسلی دینے والے مختار مراد کی اپنی انگلیوں سے بھی آنسو ٹپک رہے۔ پولیس کی ملازمت ایسی تھی جس میں ان لوگوں کا دن رات لاشوں کے واسطے پڑتا تھا۔ دیگر لوگوں کی طرح خود ان کا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ وہ اتنی موبیں، اتنے حادثات دیکھ چکے ہیں کہ ان کا دل سخت ہو گیا ہے اور اب اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہونے والا۔ لیکن اس وقت جو دھکا پہنچا تھا، اس نے ان کے خیال کو غلط ثابت کر دیا تھا اور وہ اپنے دل میں ویسی ہی تکلیف ٹھوس کر رہے تھے جیسی یقیناً اپنے پیادوں کو کھونے والا کوئی بھی شخص محسوس کر سکتا ہو بلکہ ان کی تکلیف دوسروں سے دو چہر ہی تھی۔ طاقت اور بہت سارے اختیار ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اتنے بڑے نقصان سے کیسے دوچار ہو گئے تھے، انہیں سمجھ ہی نہیں آتا تھا۔ "ختم رانگل بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سجاد بھائی! وہ بے شک بہت بڑا ہے لیکن اب حوصلے سے اسے ہٹنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ بھی نہیں رہا ہے۔ ہم خود حوصلہ کریں گے تو دوسروں کو بھی سنبھال سکیں گے۔ پھر اس وقت ہمارے شانوں پر جو سب سے بڑی ذمہ داری ہے، وہ ہینا کے اصل قاتلوں تک رسائی اور انہیں پکڑ کر دار تک پہنچانا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی ہم اس خوب سر الماس کی زبان میں طور پر کھولتے ہیں کچھ سچ نہیں ہو سکے ہیں۔ اس پر ہمیں مزید کام کرنا ہوگا تاکہ مکمل معلومات حاصل ہو سکے۔ ہینا کی ڈیڑ باڈی ڈس کور ہو جائے تو پھر اس معاملے کو اچھی طرح

”او کے اہم لوگ آتے ہیں۔“ سجاد رانا نے اسے مختصر جواب دیا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

اب وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھال چکا تھا۔ اس کے رد عمل سے شہر یا دار اور مختار سارا کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری طرف کون ہو گا اس لیے وہ بھی اس کے ساتھ ہی حرکت میں آئے۔ ابھی وہ لوگ کمرے کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ سجاد رانا کا سواگل بجنے لگا۔ انہوں نے سواگل نکال کر چیک کیا۔ گھر سے کال آ رہی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ انکو کمرے سے گھر پھر مریم کی پریشانی کا خیال کر کے کال مینو کر لی۔ دوسری طرف سے اسے جو کچھ بتایا گیا، اسے سن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ ابھی کال بن ہی رہا تھا۔ اس کے مختار مراد کا لی اسے ایک پولیس آفیسر کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتا ان لوگوں کے قریب آیا اور مختار مراد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”سرا! اطلاع آئی ہے کہ ڈی آئی جی صاحب کے گھر پر حملہ ہوا ہے۔ پولیس کے بروقت پہنچ جانے کے باعث گھر کے افراد تو محفوظ رہے لیکن گارڈز اور دیگر ملازمین مارے گئے ہیں۔ حملہ آور پولیس والوں کے ہتھکنڈے سے قتل ہی قرار ہو گئے تھے اس لیے کوئی گرفتاری نہیں ہو سکا۔“

پلی اسے کی دعوتی اطلاع سن کر ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ سجاد رانا کو فون پر کیا بتایا جا رہا ہے جسے سن کر اس کے چہرے کی رنگت مختصر ہو گئی ہے۔

”ہمارے لیے کیا حکم ہے سرا؟“ پلی اسے کے ساتھ آنے والے آفیسر نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختار مراد سے پوچھا۔

آئی جی اور ڈی آئی جی کی وہاں ہر ایک وقت موجودگی کے علاوہ اس اندازے نے کہ وہ اپنے کسی بھی معاملے کی تحقیق و تفتیش میں مصروف ہیں، پولیس ہیڈ کوارٹر میں انہیں خاصی حوصلہ شکنی ہو گئی تھی۔ کئی افراد تو اس بات سے واقف بھی تھے کہ سجاد رانا کی معوی بیٹی شہنا کے بارے میں تحقیقات کی جارہی ہیں۔ شہنا کی بازیابی کے سلسلے میں اب تک کتنی بھی کوششیں ہوئی رہی تھیں وہ دیگر افسران کو شریک راز بتائے بغیر نہیں تھیں۔

”میں اور میرا بی اے پولیس پارٹی کے ساتھ ڈیٹا ہاؤس کی ڈس کوری کے لیے جا رہی ہیں۔“

اس دوران سجاد رانا کال سے فارغ ہو چکا تھا۔

”آپ کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم دونوں کو فوری طور

پر گھر پہنچنا ہو گا۔“ مریم بہت پریشان ہو رہی ہے۔ اس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ حملہ آور اس کی ماہ بانو کی تلاش میں آئے تھے اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ ”مختار مراد کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے اس نے بتایا تو شہر پار چوکنک گیا۔ ماہ بانو کی تلاش میں کسی کا سجاد رانا کے گھر پر دھاوا بولنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ کسی ذریعے سے چودھری افتخار کو اس کی وہاں موجودگی کا علم ہو گیا ہے کیونکہ وہی وہ واحد شخص تھا جسے اس کی تلاش تھی۔ البتہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے بے پناہ جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہو گا کہ اس حملے کے بعد وہ ان لوگوں سے براہ راست دشمنی مول لے گا۔

☆ ☆ ☆

”ایک بار پھر ناکامی۔ میں نے اس لڑکی کے پیچھے اتنا بڑا خطرہ مول لیا کہ مجھے ڈی آئی جی کے گھر میں کھس کھس کر آئے لانے کی اجازت دے دی اور تو اتنا ہنگامہ مچانے کے بعد بھی خالی ہاتھ آیا۔ اب میرے پیچھے کون کی طرح کو موٹھتے ہوئے وہ لوگ مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ کڑی تھو آجانی تو میں یہ دشمنی بھی خفیہ مول لیتا لیکن اب تو بالکل بے کاری کی مصیبت اٹھانی پڑے گی۔“ کمرے میں بیٹھا ہو چودھری افتخار بالے پر برس رہا تھا۔ ایک بار پھر محروم وہ جانے کے احساس نے اس کو اس قدر مایوس کیا تھا کہ مایوسی کی وجہ سے چہرہ ہی مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر قیام ہی پھر آپاد سے لا اور پہنچا تھا۔ لیکن جس کے لیے یہ تھا وہی نہیں مل سکتی۔ وہ تو ماہ بانو کو مرد تسلیم کر کے صبر بھی کر چکا تھا لیکن جب یہ اطلاع ملی کہ وہ مردہ بھی جانے والی لڑکی زندہ ہے تو ایک بار پھر اسے جانے کے لیے بے چین ہو گیا اور اپنی بے چینی میں سجاد رانا کے گھر پر حملے کا حکم دینے سے بھی نہیں پوچھا۔ ماہ بانو کے زندہ ہونے کی اطلاع اسے اسپیکٹر ریشنگ کھوکھر سے ملی تھی۔ اپنی معطلی کے احکامات صادر ہو جانے کے بعد پہلے تو وہ کوشش کرتا رہا تھا کہ کسی طرح سجاد رانا اسے معاف کر دیں لیکن پھر ان کے اندازے سے بے تحاشے کے بعد کہ وہ قریب نہیں پڑیں گے، اس نے پشتراب دل لیا۔ تفتیش کے دوران اس پر یہ بات تو عمل ہی چلی تھی کہ سوئی والا کے گھر سے غائب ہونے والی اور پھر بلاست میں مردہ بھی جانے والی لڑکی کے پیچھے کون شخص پڑا ہوا ہے، چنانچہ جب سجاد رانا کے سامنے والہنگی تو چودھری سے سزا باز کر گیا۔ ماہ بانو کے زندہ ہونے کے علاوہ اس کی سجاد رانا کے گھر میں موجودگی کی اطلاع دینے پر اسے چودھری سے ٹھیک ٹھاک نفع حاصل ہوا تھا۔ ملنے والی رقم سے

”میں نے پوری احتیاط کی تھی سرکار آپ کا نام نہیں منس آئے گا۔ احتیاط کی وجہ سے میں خود اپنے بھندوں کے ساتھ ڈی آئی جی کی کوشش پر نہیں گیا تھا بلکہ اٹھو کھر صاحب نے کسی ذریعے سے بھندوں کا انتظام کر دیا تھا۔ ان بھندوں کو کمزور سے کام کر دیا گیا تھا۔ انہیں تو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ خود کھوکھر صاحب بھی سامنے نہیں آئے۔ اس لیے آپ اطمینان رکھیں، آپ پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“

”ہالے نے چودھری کو کولی دی۔“

”تیرا بڑا احسان ہے مجھ پر کہ تو نے اپنی قتل مندی سے مجھے بچالیا۔“ بالے کی لڑکی چودھری پر الٹا اثر ہوا اور اس نے قریب رکھا ایک آرائشی گل دان اٹھا کر اسے دے دیا۔ گل دان اچھا خاصا بھاری تھا لیکن بالے کی قسمت اچھی تھی کہ اس کا سر زبردستی آیا اور گل دان اس کے بازو سے ٹکرا کر پیچھے فرش پر گر گیا۔

”لڑوے پھٹے! میں تجھے حلق تک نوٹ اس لیے نصیحتا ہوں کہ تو میرا کام پورا کرنے کے بجائے مجھے تسلیوں پر رکھے۔ تیری وجہ سے لڑی ایک بار پھر میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ دیکھ نہیں رہا تو کہ کیسے اس کے ہمدردوں نے اس کے

☆ ☆ ☆

دھوکے کوئی چھوٹا سونہ کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ چودھری سے ہونے والا یہ عہدہ و بیان اپنی جگہ تھا کہ اب وہ دونوں ساتھی ہیں اور وقت ضرورت ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔ لیکن ابھی تو اصل مسئلہ ماہ بانو کے نہ ملنے کا تھا۔ چودھری جو اس کے خوابوں میں کھوپا ہوا تھا اب تک پہنچا تھا، اسے نہ پا کر بری طرح سچ و جھوٹ کھا رہا تھا۔ اپنی ناکامی کی اطلاع اسے بالے سے بھی پہلے ملی، وہ پڑن سے بے خبر ہوئے والے نیوز ٹینشن سے ناکام تھی۔ پھر یہاں سے ہی نیوز چینل سے ڈی آئی جی سجاد رانا کے گھر پر مسلح افراد کے حملے کی خبر نشر کی جا رہی تھی۔ خبر کے ساتھ ہی اسکرین پر ان کے گھر کے مناظر بھی دکھائے جا رہے تھے۔ ان مناظر میں مرنے والے گارڈز اور ملازمین کے خون کے دھبوں کے علاوہ گھر کی مختلف دیواروں اور دروازوں پر گولیوں کے نشانات بھی شامل تھے۔ خبروں میں سب سے زیادہ ہنگامہ دینے والی خبر سجاد رانا کی کم سن بیٹی کے فائرنگ کی وڈیو میں آکر ہلاک ہونے کی تھی۔ چودھری جو کہ شہنا کے اغوا والی بات سے باخبر تھا، سمجھ گیا تھا کہ سجاد رانا نے سوچنے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بہر حال، فی الحال اسے اس معاملے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ماہ بانو کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور خبروں میں اس کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں تھا۔

”میں نے پوری احتیاط کی تھی سرکار آپ کا نام نہیں منس آئے گا۔ احتیاط کی وجہ سے میں خود اپنے بھندوں کے ساتھ ڈی آئی جی کی کوشش پر نہیں گیا تھا بلکہ اٹھو کھر صاحب نے کسی ذریعے سے بھندوں کا انتظام کر دیا تھا۔ ان بھندوں کو کمزور سے کام کر دیا گیا تھا۔ انہیں تو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ خود کھوکھر صاحب بھی سامنے نہیں آئے۔ اس لیے آپ اطمینان رکھیں، آپ پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“

”ہالے نے چودھری کو کولی دی۔“

”تیرا بڑا احسان ہے مجھ پر کہ تو نے اپنی قتل مندی سے مجھے بچالیا۔“ بالے کی لڑکی چودھری پر الٹا اثر ہوا اور اس نے قریب رکھا ایک آرائشی گل دان اٹھا کر اسے دے دیا۔ گل دان اچھا خاصا بھاری تھا لیکن بالے کی قسمت اچھی تھی کہ اس کا سر زبردستی آیا اور گل دان اس کے بازو سے ٹکرا کر پیچھے فرش پر گر گیا۔

”لڑوے پھٹے! میں تجھے حلق تک نوٹ اس لیے نصیحتا ہوں کہ تو میرا کام پورا کرنے کے بجائے مجھے تسلیوں پر رکھے۔ تیری وجہ سے لڑی ایک بار پھر میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ دیکھ نہیں رہا تو کہ کیسے اس کے ہمدردوں نے اس کے

☆ ☆ ☆

یادے میں خبر کو اپنے پیٹ میں جھپا کر رکھا ہوا ہے۔ کہیں کسی نے معمولی سی بھاپ بھی نکالی ہے لڑی کے بارے میں اپنے من سے؟ اب تک وہ لوگ اسے کسی دوسری جگہ پہنچا دیے ہوں گے۔ مجھے جو کچھ کا معلوم تھا وہاں سے تو لڑی کو انہیں سکا۔ دوسری جگہ کا پتا کہاں سے لائے گا؟“ بالے کو گل دان کی ضرب سے بخروج کرنے کے باوجود اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں پڑا تھا اور وہ مسلسل منہ سے کھڑا اڑا اس پر برس رہا تھا۔

”لڑی کا پتا مل جائے گا سرکار! خبر یہی ہے کہ وہ ابھی تک ڈی آئی جی کے گھر میں ہی چھپی ہوئی ہے۔ جن ہندوں کے قے ہم نے اسے اٹھانے کا کام لگا یا تھا، وہ ڈی آئی جی کے گھر کی گمرانی کر رہے ہیں۔ اگر لڑی کو کسی دوسری جگہ لے جایا گیا تو انہیں مایوس ہو جائے گا۔ ان کا ہم سے وعدہ ہے کہ وہ ہر حال میں لڑی کو حاصل کر کے رہیں گے۔ لڑی کے ملنے کے بعد ہی انہیں پوری رقم ملے گی۔“

”نہوٹ کھا کر کھجی اف کیے بغیر بالے نے ایک بار پھر چودھری کو کولی دینے کی کوشش کی۔“

”ٹھیک ہے۔“ اکبر داری اور تیری کارکردگی کو دیکھ لیتے ہیں۔ ملوم پڑ جائے گا کہ تو کتنے پانی میں ہے۔“ گمرانی والی بات سن کر اسے کچھ بھی ہوئی تو وہ بخورزا سا سنبھلا پڑا اور کمرے میں بیٹھنے کا سلسلہ ختم کر کے ایک کا بیج پر بیٹھتے ہوئے بالے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ اب اس کی توجہ ایک بار پھر فی وکی کی طرف تھی جہاں ڈی آئی جی کے گھر پر حملے کی خبر کو بار بار نشر کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف اعلیٰ حکومتی عہدے داروں کے مذمتی اور تعزیری بیان بھی نشر کیے جا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

”آج رات بارہ بجے کے بعد میں اندر مل رہا ہوں میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ اپنے سواگل پر موصول ہونے والے مشورہ اس مسیج کو پڑھ کر وہ پریشان ہوا تھا۔ اس کا اس طرح بار بار حوصلے سے نکل کر چوری پھیس اس سے ملاقات کے لیے آمابہت خطرناک تھا۔ کسی کو خبر ہو جانی تو دونوں ہی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ خود اپنی ذات کے لیے تو وہ اتنا فکر مند نہیں تھا لیکن مشورہ کو کوئی نقصان پہنچتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ خود اس کی اپنی زندگی کا معاملہ تو ایسا تھا کہ وہ کسی بھی وقت زور پر آسکتا تھا۔ گاڈ والوں کی فلاح کے لیے جاری اس کا مشن اور اخبار میں پھنپنے والے ٹکلیے کا لہری اس کے لیے کسی بھی وقت کوئی بڑا خطرہ بن سکتے تھے۔ اپنے اس بالکل مختلف طرز زندگی کے باعث ہی اس نے ابتدا میں مشورہ کی محبت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا لیکن پھر اس کی محبت نے کسی تند نری کی طرح اسے اپنے ساتھ بہہ جانے پر مجبور کر دیا۔

☆ ☆ ☆

پھر بھی وہ خواہش مند تھا کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے لیکن کشور اپنی شوریدہ سری سے اس کے ہر ارادے کو ڈھا دیتی تھی۔ اس وقت بھی اسے یہ سمجھنا پڑا کہ اس نے اپنا موہاں آف کر دیا تھا۔ سمجھنا آئے آٹھ بجے کے بعد ملا تھا اور اس کے بعد وہ مسلسل کشور کا نمبر لہرائی کر رہا تھا لیکن ہر بار سنا ہی دیتے دانی ریکارڈنگ اسے بتا رہی تھی کہ اس کا مطلوب نمبر۔۔۔ آف ہونے کی وجہ سے براہِ ممکن نہیں۔ اس نے کال کی طرف سے بائوس ہونے کے بعد کشور کو دینے سمجھ بھی بھیجے تھے کہ اگر وہ کسی لمحے اپنا موہاں آف کرے تو اسے وہ منتھن کر جائیں لیکن بھیجے گئے منتھن کی ڈیٹریمر کی رپورٹ نہ آنے پر اسے معلوم ہو گیا کہ کشور نے ایک منٹ کے لیے بھی اپنا موہاں دوبارہ آن نہیں کیا ہے۔ منتھن طور پر وہ جانتی تھی کہ اس کا پیغام ملے پر آفتاب کی طرف سے اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ وہ اس کی ایسی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتی ہوگی، اس لیے رابطے کی واحد صورت ہی ختم کر دی تھی۔ اتنا یقین تو اسے بھی ہو گا کہ وہ لاکھ بھولتا رہے، مخالفت کرے مگر اس کا پیغام ملنے کے بعد آئے گا ضرور یہ تو ہوگی سلسلہ تھا کہ وہ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر جو بھی کی اور پھر اس کو خاطر میں لائے بغیر رات کے اندھیرے میں اس سے ملاقات کے لیے پہنچتی اور وہ خود وہاں نہ جا کر اسے مایوس کر دیتا۔ دماغ کے مشورے اور عقل کی سکھائی ہوئی احتیاطیں اپنی جگہ لیکن جب معاملہ دل کا ہو تو اہل دل کو ہاسان عقل کو رخصت کر کے یا ذانت ڈپٹ کر چپ کروانے کے بعد اپنے دل کی ہی مانگی پڑتی ہے۔ اس نے بھی یہی کیا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک جب اس کا کشور سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا تو وہ اس سے ملاقات کے لیے جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ لہاں کے معاملے میں بہت سادہ مزاج ہونے کے باوجود اس وقت اس نے ذرا مختلف سے کام لیا تھا اور اپنا ایک بھترین لباس زیب تن کرنے کے ساتھ ساتھ پرفیوم کا اسپرے بھی کیا۔ اس کے ساتھی رات کو جلد ہی سو جانے کے عادی تھے، چنانچہ جب وہ بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے روانہ ہوا تو ان میں سے کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ اسے پیدل ہی گھر سے اسکول سے ملحقہ انڈسٹریل ہوم تک کا سفر طے کرنا تھا یہ چندہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ بارہ بجے میں دس منٹ قبل گھر سے نکلا تھا، اس حساب سے بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ مقررہ جگہ پہنچ جاتا۔ کشور نے بارہ بجے کے بعد ہی اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائے گا۔ ٹھیک بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ

انڈسٹریل ہوم کے دروازے پر جا پہنچا اور اپنی جیب ٹول کر اس میں سے چابی برآمد کی لیکن جب وہ تالا کھولنے کے لیے جھکا تو احساس ہوا کہ دروازے پر تالا موجود نہیں ہے۔ "اندر تشریف آئے" اس کی غالی جاہ! ہم دیکھ دو دل فرس راہ کسے بیٹھے ہیں۔" ابھی وہ سیدھا ہوا ہی تھا کہ کھٹ سے دروازہ کھل گیا اور کشور کی مدھم مگر شوش آواز سنا دی۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ یقیناً خود ان میں ہو کر کھڑی ہو گئی تھی اس لیے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس کی آواز کی ڈور سے بندھا کھلے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ نورانی دوبارہ بند ہو گیا۔ بند دروازے سے پشت نکالے وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے فاقانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے اسے پس کر کے وہاں ملائے پر بہت خوش ہو۔ روشنی بہت کم ہونے کے باوجود وہ اس کے انگ انگ میں دوڑتی سرشاری اور خوشی کو محسوس کر سکتا تھا۔ بجلی موجود ہونے کے باوجود وہاں روشنی کے لیے صرف ایک موم بجڑ روشن کی گئی تھی اور وہ بھی ایک کونے میں اس زاویے سے گھٹے کے ایک ٹکڑے کی آڑ میں رکھی تھی کہ اس کی روشنی باہر نہ جا سکے۔ یہ احتیاطی تدابیر تھیں جو یقیناً اس نے اپنی وہاں موجودی کو عینہ دوا میں رکھنے کے لیے اپنائی تھیں۔ "بہت شدید ہیں آپ۔۔۔ مجھے بہت تک کرتی ہیں۔" اسے مسکراتے دیکھ کر اس نے شہو کیا۔ "تو اب میں حاضر ہوں۔ آپ کا جتنا جی چاہے مجھے تک کر لیں۔" اس کی شوش آواز میں لاپرواہی تھا۔ "آپ کو ذرا احساس نہیں کہ اس طرح صیحب کر جو جلی سے نکلتا آپ کے لیے کتنا خطرناک ہے۔ کسی کو علم ہو گیا تو نتیجہ آپ مجھ سے بڑھ کر جانتی ہیں۔" اس کی شوشی کو نظر انداز کر کے آفتاب نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، شاید میں اپنی خواہش کے پیچھے آپ کی زندگی بھی داؤ پر لگا دیتی ہوں۔" وہ بیک دم ہی اداس ہو گئی۔ "نظارہ رخ پر مت مچیں۔ میں یہ سب اپنی نہیں آپ کی ہمد سے کہہ رہا ہوں۔ میں تو پہلے ہی آپ کے ہاتھ کی نظر میں معتوب ہوں لیکن یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ اپنے ہاں کی روایات کے مطابق محبت کے جرم میں سزا کی حق وار شہرادی جائیں۔ کسی کو ذرا دماغی علم ہو گیا تو آپ کے ساتھ کتنا بدترین سلوک کیا جا سکتا ہے، میں یہ بات ابھی طرح جانتا ہوں۔ اسی لیے میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ابھی اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر چوری جیسے مجھ سے ملنے نہیں آئیں گی۔"

لیکن آپ نے تو اس وعدے کا بھی پاس نہیں رکھا۔" آفتاب۔۔۔ آپ صحرا میں بیٹھتے بیٹھے اسے مسافر کی کیفیت سمجھتے ہیں ایسے مسافر کے سامنے اگر خطہ ہے، بیٹھے پانی کا چشمہ آجائے تو کیا وہ خود کو اس پانی سے میراب کے بغیر رہ سکے گا؟ ہرگز بھی نہیں۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بہت بچا ہی تھی۔ لگتا تھا ایک دن اسی بیاس کے ساتھ سر جاؤں گی لیکن پھر آپ میری زندگی میں چلے آئے۔ کسی کی محبت کو تر سے میرے پیاسے بدن میں امید کی ایک کوئیل بھوت پڑی۔ اس نئی بھونے والی کوئیل نے مجھے حوصلہ دیا کہ زندگی پر میرا بھی کوئی حق ہے۔ میں اپنے اندر بھونے والی امید اور خوشی کی اس بھی کوئیل کو آپ کی محبت سے میراب کرنے کے لیے آپ کے پاس آتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا راز بہت عرصے تک راز نہیں رہے گا۔ اس راز کے کھلنے کے بعد مجھے اپنی جان ملے جانے کا بھی خطرہ ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اس خوشی کی مہلت میں ہی آپ کا ذخیرہ سارا اپنا پا لوں تاکہ جب مرنے کو میرے اندر کوئی شے نہ ہو۔" اس کی آواز بھرانے لگی جس سے آفتاب کو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ نورانم پڑ گیا۔ "اچھا آئیں، ادھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ یوں کھڑے کھڑے تو آپ ٹھک جائیں گی۔" کشور ابھی تک دروازے سے پشت کھاکر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تمام کر فرس پر بھی درمی طرف لے گیا۔ انڈسٹریل ہوم کی حیثیت رکھنے والے اس کمرے میں دو دیواروں کے ساتھ بائکان والی مساحی تختیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان تختیوں پر کام کرنے والوں کے لیے بیٹھنے کی تختیں اس طرح بڑی ہوئی تھیں کہ انہیں وہاں سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ اس نے کشور کے ساتھ ہاتھ کی کڑھائی وغیرہ کرنے والی خاتون کے بیٹھ کر کام کرنے کے لیے بچھائی کی درمی کارخ کیا تھا۔ اس درمی پر وہ ایک دوسرے کے پہلو پہ پہلو بیٹھ سکتے تھے۔ درمی پر بیٹھنے کے بعد اس نے پہلی بار کشور کو ٹھیک سے دیکھا۔ دروازے کے قریب موم جتی کی روشنی بہت کم تھی اس لیے اسے بہت کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اب وہ جس جگہ بیٹھے تھے، وہاں ان دونوں پر ہی روشنی اچھی طرح پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں وہ کشور کا گلابی رنگ کا خوب صورت لباس دیکھ سکتا تھا۔ اس لباس کے ساتھ اس نے پیچنگ کا مین سا دو بٹا اوڑھ رکھا تھا۔ دو بٹا اگرچہ سر پر اوڑھنے پر پھیلا کر اوڑھ گیا تھا لیکن یہ صاف جیسے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں والی صورت حال تھی۔ اس دوپٹے کے پار اس کی کھلی سیاہ زلفیں

بھی نظر آ رہی تھیں اور کانوں اور گھٹے میں پہنا زیور بھی۔ زیور اور لباس کے اس اہتمام کے علاوہ آنکھوں میں موجود کاجل اور ہونٹوں پر چمکی لپ اسٹک بھی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ آج کی اس ملاقات کے لیے اس نے خصوصی تیاری کی ہے۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ جو اس کی نظر میں چپے کے لیے ہی یہ سارا اہتمام کر کے آئی تھی، اسے مشکل اپنی طرف دیکھتا ہر کچھ عجوب سی ہو کر پوچھنے لگی۔ "اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے یہ سب پہلے بھی نہیں کیا ہو گا اور اب میرے لیے کیا ہے تو مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔" آفتاب نے اس کی تیاری کی طرف اشارہ کیا۔ "خود کی تیاری کو ہی کم ہے؟ اتنی خوشبو لگا رکھی ہے کہ مجھے دور سے ہی بتا چلی گیا تھا کہ آپ آ رہے ہیں۔" اس نے لہجہ بھر کے لیے اس پر نظر ڈالی اور پھر جھکی نظروں کے ساتھ اسے جتایا۔ وہ اس کی بات سن کر ہنس پڑا پھر بولا۔ "بھی تیاری تو لازمی تھی۔ کوئی تھارے لیے اتنا کٹ اٹھائے تو کیا ہمارا دل نہیں چاہے گا اس کی نظر میں چھتے کو۔" "آپ تیاری نہ کرتے، تب بھی مجھے اچھے لگتے۔ جو دل میں بیٹے ہوں وہ نظر کو بھی ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔" اس نے اپنا سر آفتاب کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اس کی خوشبو آفتاب کے وجود میں سرایت کرنے لگی۔ "آج کی اس ملاقات کا انتظام بھی یقیناً آپ نے اپنی اس ملازمہ خاص کے تعاون سے کیا ہو گا۔ کہاں ہے وہ؟" مجھے باہر کہیں نظر نہیں آتی۔" وہ جانتا تھا کہ اس خوشبو کی گرفت سے بچ نکلتا بہت مشکل ہے مگر پھر بھی ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ کر وہاں بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر اپنے منیجر کے ساتھ اس کے ساتھ گئے ہیں۔" ابھی میری راہ دیکھ رہی ہے۔" اس نے سرسری جواب دیا اور اس کے حریف قریب کھسک آئی۔ اب صرف عواس پر چھائی خوشبو ہی نہیں بلکہ ایک منیجر سی آج بھی تھی جو اس کے دہڑ میں پھینکی جا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ہاتھ بڑھا دیا اور کشور کی زلفوں سے کیلئے لگا۔ اس کے سر پر سو دو دو پٹا تو نہ جانے کب کا ڈھنگ چکا تھا اور یوں لگا تھا کہ اسے اس کی نظر بھی نہ ہو۔ "ٹھیک، ایک خواب بیٹے ہیں آفتاب! ایک ایسا خواب جس میں ہم دونوں ہوں، ایک چھوٹا سا گھر ہوا اور اس گھر میں

ہمارے محبت کی پیاری پیاری سی لڑکیاں ہوں۔ تصور کریں کہ
اس ہر خوشی اور اندیشے سے آزاد جب ایسے کسی گھر میں ہوں
گئے تو زندگی اتنی خوش صورت ہوگی۔ میری زندگی میں اگر کبھی
وہ وقت آگیا تو مجھے یقین ہے میرے قدم تہ من پر نہیں ٹک
سکیں گے۔ میں تو بادلوں کے سنگ اڑتی پھروں گی۔ اس
کے شانے سے سرنگار آنکھیں موندے وہ خوابیدہ سے لہجے
میں بولتی اس وقت بھی زمین کے بجائے آسمانوں میں اڑتی
محسوس ہو رہی تھی۔ صرف ایک خواب نے اس کے چہرے پر
اسنے رنگ بھیر دیے تھے کہ وہ خود اپنا آپ ان رنگوں میں
بیٹھ گیا محسوس کر رہا تھا۔

شہر یا کوہ کی تجویز بہت پسند آئی۔ کل رات ہی اس نے ماہو کو
 پناہ فیصلہ سنایا تھا لیکن اس وقت زیادہ بات کرنے کا وقت
 نہیں مل سکا تھا اس لیے اب رواں لگی سے محلِ شائے کی میز پر یہ
 موضوع چھیڑ بیٹھا تھا۔ خواہے کچھ ہی آج ہی واپس جانا تھا اور
 طے یہ پایا تھا کہ وہ خود اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے واپس جائے گا
 جبکہ مشاہیر مہمان ماہو کو اپنے گاؤں پہنچا کر واپس ڈیوٹی پر
 آجائے گا۔

تمہیں معلوم ہے نا کہ اس لڑکی کے لیے کتنا خطرہ ہے یہاں؟“ کھلے ہوئے دروازے سے گزرا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس نے ہدایت دی۔

جی تھی۔ مشاہیرم خان آتا ہوا نظر آیا۔ جیب کی پچھلی لاشٹ پر
 حسب پروگرام برتنے میں بیوس ماہ بانو بیٹھی تھی۔ جیب تیزی
 سے اس موڑ پر سے گزرنی۔ اس نے چونک کر اپنی گاڑی ایسے
 زاویے سے گھڑی کی تھی کہ کسی کی نظر میں نہ آ سکے اس
 لیے وہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکے۔ ان کے موڑ پر سے گزر
 جانے کے بعد اس نے اپنی گاڑی اشارت کی۔ وہ موڑ سے
 تنگ ان کے پیچھے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ
 اگر کوئی ان لوگوں کے پیچھے ہوا تو وہ لاہور میں ہی نہیں
 گھبرنے کی کوشش کرے گا اور شہر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں
 دے گا۔ ابھی تک ایسی کوئی صورت حال پیش نہیں آئی تھی اس
 لیے اسے کچھ اطمینان ہو چلا تھا لیکن اپنا ارادہ بہر حال اس
 نے تبدیل نہیں کیا تھا۔ گاڑی اشارت کر کے دوبارہ موڑ کا
 آغاز کرنے سے قبل ہی جیب کے تعاقب میں آنے والی ایک
 موٹر سائیکل کو دیکھ کر اسے اپنے پیچھے کی روٹی کا احساس ہوا۔
 اب سفر اس انداز میں جاری تھا کہ سب سے آگے مشاہیرم
 خان کی جیب تھی، درمیان میں موٹر سائیکل سوار اور پیچھے کافی
 فاصلے پر وہ خود تھا۔ ملتان روڈ شروع ہونے سے قبل موٹر
 سائیکل کی رفتار ایک دم تیز ہوئی اور وہ جیب کو اور تنگ کرتے
 ہوئے تیزی سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے تھے۔ موٹر سائیکل
 سوار کی اس حرکت پر اس کا جسم اکڑا گیا۔ اسے خطرہ محسوس
 ہوا کہ کہیں وہ چلتی جیب میں مشاہیرم خان یا ماہ بانو کو نشانہ
 بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے خود بھی جھٹ اپنا منسل
 نکال لیا لیکن خبر گزری اور اس کے اندیشوں کے برعکس موٹر
 سائیکل سوار تیزی سے آگے نکل گیا۔ اب ملتان روڈ کا آغاز
 ہو گیا تھا۔ اس روڈ پر مشہور زمانہ شاہ نور اسٹوڈیو کے علاوہ کئی
 ڈانس اکیڈمیاں، ایکٹنگ اکیڈمیاں اور کچھ دکانیں بھی
 تھیں۔ ظاہر ہے، صبح کے اس دھندلے شہر سے سارے
 مقامات سنبھل پڑے تھے۔ ان سارے مقامات پر رونق
 لگنے والے اتنی صبح اٹھنے کی زحمت کرنے کے عادی نہیں
 تھے۔ چنانچہ فی الحال ملتان روڈ پر عجیب و غریب بھول والی
 اکیڈمیوں کے اشتہاری بورڈز کی سی اجارہ داری تھی۔ ملتان
 روڈ پر سفر کا آغاز کرنے والی پہلی سوار کی موٹر سائیکل تھی، اس
 کے پیچھے مشاہیرم خان کی جیب تھی اور اصولاً تیسری گاڑی اس
 کی ہوتی چاہیے تھی لیکن اس سے قبل ایک سرخ شیراز نے
 بازی ماری۔ اب وہ سرخ شیراز اس کی گاڑی اور مشاہیرم
 خان کی جیب کے درمیان سفر کر رہی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی
 بات نہیں تھی۔ سڑک پر کسی ایک فرد یا گاڑی کی اجارہ داری
 نہیں ہوتی کہ اس کی جگہ کوئی دوسری گاڑی نہیں لے سکتی۔

جب کوئی شخص سفر پر نکلتا ہے تو خود دسیوں گاڑیوں کو اور تنگ
 کرتا ہے اور دسیوں ہی گاڑیاں اسے اور تنگ کرتی ہیں
 چنانچہ اس نے سرخ شیراز کے اچانک ارادہ ہوجانے کا خاص
 نوٹس نہیں لیا اور خود مختار فاصلے سے تعاقب کرتا رہا۔ اس کا یہ
 اطمینان اسے گھبراہٹ نہیں تھا۔ موٹر سائیکل سوار جو یہ ظاہر سڑک پر
 سیدھا جا رہا تھا، اس نے اچانک ہی اپنی رفتار کم کر لی۔ ساتھ
 ہی سرخ شیراز کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔ موٹر سائیکل سوار نے
 اپنی موٹر سائیکل سڑک پر ترچھی گھڑی کرتے ہوئے پھرتی
 سے مشاہیرم خان والی جیب کے بازو کو نشانہ بنایا۔ نقصان ساز
 پہنچنے کی زبرداری اور گاڑی اور جیب لہرائی تھیں۔ مشاہیرم خان
 نے مہارت سے اسے بے قابو ہونے سے بچایا۔ اس دوران
 موٹر سائیکل سوار دوسرا فائر بھی کر چکا تھا جس نے جیب کے
 دوسرے بازو کو بھی ناکارہ بنا دیا۔ جیب کی تو مشاہیرم خان نے
 اپنی جانب کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگائی اور وہاں
 ہاتھ میں موجود گن سے موٹر سائیکل سوار پر فائر کیا۔ گولی اس
 کے سینے پر دو تھیں جانب جاکر گئی لیکن بے اثر تھی۔ یقیناً اس
 نے اپنے پیراشوٹ کے سرخ اور چمکے ٹکڑے اسے ڈالے اور
 کے نیچے جلتے پروف جیکٹ جیکن دھکی لی اس لیے گولی کھارک
 بھی اطمینان سے کھڑا تھا۔
 لیکن چھپک کر ہاتھ اوپر اٹھا اور ٹھکانے سے جا
 گئے۔ "سرخ شیراز والے اس دوران اس کے سر پر پہنچ گئے
 تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی
 رائفل مشاہیرم خان پر تانتے ہوئے اسے یہ دھکی دی تھی۔
 دھکی سننے کے باوجود اس نے گن نہیں چھوٹی اور تادیب کے
 عالم میں کھڑا رہا۔
 "ہماری عمر سے کوئی دشمن نہیں ہے۔ ہمیں صرف لڑکی
 چاہیے۔ ہمیں لڑکی لے جانے دو، ہم تمہیں کچھ نہیں
 تمہیں گئے۔" اسی شخص نے ایک بار پھر زبان کھولتے ہوئے
 جیب کی پچھلی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ دور سے اب وہاں
 برج پوش ماہ بانو نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مشاہیرم خان کی مدایت
 پریش کے نیچے جوبک کر چننے لگی تھی مگر مطالبہ کرنے والوں کو بھی
 اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہوگی اسی لیے انہوں نے مشاہیرم خان
 سے مذاکرات کا آغاز کیا۔ ان مذاکرات کے کسی بھی مرحلے
 میں داخل ہونے سے قبل شہر یار اپنی گاڑی سمیت ان کے
 سردی پر پہنچ چکا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے ایک
 فائر کیا۔ گولی رائفل بردار شخص کے ہاتھ میں جاری اور اس
 کے ہاتھ سے رائفل جھوٹ گئی۔ شہر یار کو کچھ کر مشاہیرم خان
 تو ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا تھا، ایک بار پھر اپنی جون

میں لوٹ آیا۔ اس نے بھی اپنی گن سیدھی کی اور ایک فرد پر
 گولی چلا دی۔ گولی اس کے بازو میں لگی اور وہ جھٹا ہوا گیا۔ دو
 افراد کے زخمی ہونے کے باوجود حملہ آوروں کو اب بھی عددی
 برتری حاصل تھی۔ موٹر سائیکل سوار سمیت ان کے دو آدمی
 اب بھی بالکل صحیح سلامت تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے
 پھر بھی سے شیراز کی آڑ میں پناہ لے لی جبکہ موٹر سائیکل سوار
 نے اپنے ہتھیار سے مشاہیرم خان کو نشانہ بنایا۔ وہ اس وقت
 شیراز کے پیچھے چھپنے والوں کی طرف ایک رہا تھا، چنانچہ موٹر
 سائیکل سوار کا نشانہ خطا گیا اور گولی سائیکل کی آواز کے ساتھ
 اس کے قریب سے گزرنی۔ اس دوران شیراز کے پیچھے چھپنے
 والوں نے شہر یار کی گاڑی پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اگر وہ
 گاڑی میں بیٹھا رہتا تو گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ پہلا فائر
 کرتے ہی اسے معلوم تھا کہ جوانی فائرنگ ضرور کی
 جائے گی، چنانچہ وہ فائر کرنے کے ساتھ ہی فوراً دروازہ کھول
 کر اپنی سیٹ سے اتر کر رینگتا ہوا گاڑی کے عقبی حصے میں چلا
 گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے شیراز والوں پر جوابی فائرنگ
 کی۔ اس ساری جھڑپ میں شیراز والے اور مشاہیرم خان ہی
 زیادہ ڈک پوزیشن میں تھے بلکہ ایک طرح سے ان کی
 پوزیشن عجیب و غریب تھی۔ وہ لوگ چھپتے ہوئے بھی تھے اور
 دوسروں کو بھی چھپایا ہوا تھا۔ شہر یار اور موٹر سائیکل سوار
 قدرے بہتر پوزیشن میں تھے۔ وہ چاہتے تو وہاں سے فرار بھی
 ہو سکتے تھے لیکن ظاہر ہے، وہ فرار ہونے کے لیے تو اس لڑائی
 میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ دونوں نے فائرنگ کا سلسلہ
 جاری رکھا۔ آخر کار موٹر سائیکل سوار کو کامیابی حاصل ہوئی اور
 بین اس وقت جب مشاہیرم خان دونوں مجروح افراد کے
 ہتھیار اپنے قبضے میں لینے کے بعد انہیں اپنی جیب کی عقبی
 نشست پر پھینک کر چلت رہا تھا وہ گولیاں سائیکل سوار میں گرنی
 ہوئی آئیں اور اس کے جسم میں بیست ہو گئیں۔ وہ ایک جھٹکا
 کھا کر سڑک پر گر گیا۔ اس نے اسے اس نے زخمی اپنی گن
 ہاتھ سے پھوڑی اور نہ ہی بہت باری۔ اور یہ پناہ دوست
 برداشت سے کام لیتا ہوا جیب کے نیچے دھبک گیا۔ اب وہ
 قدرے محفوظ پوزیشن میں تھا لیکن اس درمیانی وقفے کا فائدہ
 اٹھاتے ہوئے دونوں مجروح افراد شیراز کی آڑ میں چھپے اپنے
 دونوں ساتھیوں سے چلے گئے۔ ان لوگوں کے پاس تھیں
 طور پر اضافی ہتھیار بھی موجود تھے، چنانچہ ان کے اپنے
 ساتھیوں کے ساتھ شامل ہوئے ہی ایک دم ہی فائرنگ میں
 تیزی آ گئی۔ وہ لوگ اپنی دونوں جانب فائرنگ کر رہے
 تھے۔ ان حالات میں تو مشاہیرم خان جیب کے نیچے سے

نکل سکتا تھا اور نہ ہی شہر یار اپنی پناہ گاہ پھوڑ کر آگے بڑھ سکتا
 تھا۔ پس وہ صرف فائرنگ کا سلسلہ تھا جو جاری و ساری تھا اور
 اس فائرنگ سے ملتان روڈ کو گونج رہا تھا۔ شاہی بینڈ باجا، مشہوری
 بینڈ سروس اور بانڈو دم بھی اکیڈمیوں سے ابھرنے والے
 ساز و آواز کے عادی ملتان روڈ پر بالکل انگلی موسیقی کا
 راج تھا۔ اس موسیقی کی وجہ سے ہی یقیناً ملتان روڈ پر سفر کرنے
 کا ارادہ رکھنے والے ڈرائیور حضرات کئی کاٹ کر گزرے
 چارے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ موسیقی جو روح کی بالیدگی کے
 بجائے اس کے جسم سے پرواز کر جانے میں زیادہ معاون و
 مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اب پہلے سے لوگ زندگی کو نکلتا ہی برا
 بھلا گئیں۔ اس سے بے زاری کا اظہار کریں مگر حقیقت میں
 زندگی سب کی کوئی پیادہ ہوتی ہے کہ جہاں ڈراما خطرہ نظر
 آیا، وہاں سے رخ پھیر لیا۔ چنانچہ وہاں کو بھی موسیقی سے
 لطف اندوز ہونے کے لیے ہتھیار بند موسیقاروں کے سوا کوئی
 بھی ٹھہرنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ ان کے موسیقارتن وہی سے اپنی
 پر فارغ دینے میں مصروف تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ جس کا
 ہاتھ رکھا، اس کی زندگی کا رگ بھی وہیں دم توڑ دے گا۔ شیراز
 والے چاروں افراد کے دوبارہ متحد ہوجانے کی وجہ سے ان کا
 زور بڑھ گیا تھا۔ شہر یار کا ساتھ دینے کے لیے مشاہیرم خان
 بھی اپنی کی طرف توجہ دے رہا تھا۔ شہر یار کی حالت میں اس
 کی یہ کارکردگی بھی قابلِ تحسین تھی اور اگر وہ اپنے عقب میں
 موجود موٹر سائیکل سوار کی طرف سے قائل ہو گیا تھا تو یہ ایسی
 قابلِ گرفت بات نہیں تھی۔ موٹر سائیکل والے نے اس کی
 اس غفلت کا فائدہ اٹھا لیا اور جیب کی طرف بڑھا۔ یقیناً وہ عقبی
 حصے میں موجود ماہ بانو کو قابو میں کر کے اس لڑائی کا فیصلہ کرنا
 چاہتا تھا۔ ہلے پر پروف جیکٹ اوسر پر بیٹھے بینڈ نے اس کا
 اعتراف بہت بڑھایا ہوا تھا چنانچہ وہاں چلتی گولیوں کی زد میں
 آنے کی پروا کیے بغیر وہ جیب کے عقبی حصے کی طرف بڑھتا چلا
 گیا۔ اسے امید ہوئی کہ نشست کے نیچے وہ بی ہوئی ماہ بانو کی
 چھٹی بندھی ہوئی ہوگی اور وہ کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس
 پر قابو پا سکے لیکن اس کی غلطی اور خود اعتمادی اسے لے
 ڈولی۔ وہ جیسے ہی جیب کے قریب پہنچا، ایک رائفل کی تال
 اس کے پیٹ کے بالکل نیچے حصے پر آ گئی اور اس کے لیے وہ
 بری طرح چھٹا ہوا اچھل کر پیچھے کی طرف گرا۔ پلٹ پروف
 جیکٹ کی حفاظت سے محروم اس حصے میں رائفل کی گولی نے
 داخل ہو کر ایک بہت بڑا سوراخ کر دیا تھا اور اس سوراخ سے
 فوراً سے کی طرح خون اچھل کر باہر نکل رہا تھا۔ ماہ بانو کی کاج
 میں حاصل کی گئی این سی سی کی ٹریٹنگ زندگی کے ان نازک

محلات میں اس کے کام آئی تھی۔ اس ہلکی پھلکی ٹریننگ کے ذریعے اگرچہ کوئی بھی طالب علم تھپتھپاؤں کے استعمال میں مایوس نہیں ہو سکتا لیکن اس لائق تو بہر حال ہو جاتا ہے کہ کئی لوڈز رائلٹ کی بجلی دبا کر فائر کر سکے۔ اس نے بھی یہی کیا تھا۔ مشایم خان نے حملہ آوروں سے بچھن کر جیب کے عقبی حصے میں جو اسلحہ چھپی تھیں، ان میں سے ایک اس نے اپنے قبضے میں لے لی تھی اور وقت پڑنے پر اس کا بڑی تدبیر سے استعمال بھی کر لیا تھا۔ اپنی اس کامیابی نے اس کا حوصلہ بلند کر دیا اور وہ ہر فتنے کا ادبیری حصہ اپنے سر سے اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے باقاعدہ طور پر معرکے میں شامل ہونے کے ارادے سے نشست پر مستحکم کر بیٹھ گئی۔ موثر سائیکل سوار سڑک پر کچھ حیرانہ طور کی طرح پڑا لوث پوٹ چھو رہا تھا جبکہ اس کے سامنے اب بھی شیراز کی آڑ لے لیے ہوئے فائرنگ میں مصروف تھے۔ مشایم خان اور شیراز کے مقابلے میں وہ ایسی پوزیشن میں تھی کہ اسے وہ لوگ صاف نظر آرہے تھے۔ اس نے رائلٹ کو مخصوص انداز میں اپنے دائیں شانے کے ساتھ تکیا اور سانس روک کر ان کی طرف فائر کر دیا۔ اس جھڑپ اتناڑی سے امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اتنے فاصلے سے درست نشانہ لے سکتی ہے لیکن وہاں چار چار ہدف موجود تھے اور ایک دوسرے سے قریب بھی تھے۔ اس نے جس شخص کا نشانہ باندھ کر فائر کیا تھا، اسے تو کوئی نہیں لگی لیکن اس کے ساتھ پیٹھ جوڑ کر بیٹھا اس کا سامنے زوئیں اٹھیا۔ اس کی کھوپڑی کے پرچھے سے اڑ گئے اور بھیجا نکل کر اس کے کئی ٹکڑے اس کے سامنے کے لباس پر جا کر گرے۔ جس شخص کو اس نے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، اس نے بے پناہ بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف جوابی فائر کیا مگر خوش قسمتی سے وہ اپنے کیے ہوئے فائر کے پھٹکے سے تھکے میں ناکام ہونے کے باعث نشست پر جا کر بیٹھی تھی، چنانچہ بال بال بچا گئی۔ موت کو اتنے قریب سے گزرتے دیکھ کر ایک ہلکے لیے اس کے ہاتھ جھٹھلے پڑے لیکن مگر پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھا کہ اس طرح ہاتھ جھڑپ کر بیٹھ جانے سے زندگی کی بچا ممکن نہیں۔ وہ جس گرواب میں بچھن چکی ہے اس سے نکلنے کے لیے اسے خود بھی ہمت کرنی پڑے گی، ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک دقت وہ بھی آجائے کہ اس کے ساتھی بھی ہمت ہار کر پہپائی اختیار کر لیں۔ پہپائی میں ذلت اور موت دونوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر رائلٹ پر اپنی گرفت مضبوط کی اور احتیاط سے سر اٹھاتے ہوئے پیچھے کی جانب دیکھا۔ اسے گرتے دیکھ کر اس

پر فائر کرنے والا شاید یہ سمجھا تھا کہ وہ گولی کا نشانہ بن چکی ہے اس لیے اس طرف متوجہ نہیں تھا اور ہیٹ کے بل لیٹ کر دھیرے دھیرے آگے کی طرف رینگتا ہوا مشایم خان کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے رائلٹ سیدھی کی اور پوری احتیاط سے اس شخص کا نشانہ باندھا۔ اس بار اس کا نشانہ اپنے ہدف سے چونک کر کسی دوسری طرف نہیں ٹکلا بلکہ گولی سڑک پر اتر گئی۔ لیکن شخص کے پیٹ میں جا گئی۔ تین ساتھیوں کی موت نے جہاں حملہ آوروں کے لوہان خطا کیے، وہیں شیراز اور مشایم خان کو بھی سہولت ہو گئی۔ مشایم خان تو خیر غمی ہونے کی وجہ سے زیادہ تیزی سے حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن شیراز نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ باقی بچ جانے والے دو افراد جو اب تک اس کی طرف فائرنگ کر رہے تھے، عقب سے ہونے والے فائر سے گھبرا کر پلٹ کر اندھا دھند جیب کی طرف فائر کرنے لگے۔ ماہ داد اپنے پہلے فائر کا رٹول دیکھ چکی تھی اس لیے اس بار وہ فائر کرتے کے بعد خود ہی نیچے دھک لگی تھی۔ یہ حکمت عملی سو مہر ثابت ہوئی اور وہ کسی گولی کی زد میں نہ آ سکی۔ اس دوران شیراز اپنی گاڑی کی آڑ سے نکل کر اس پوزیشن پر پہنچ چکا تھا کہ ان دونوں کو نشانہ بنا سکے مگر اس نے کوئی ہلاکت خیز فائر کرنے کے بجائے ان کے پیروں کو نشانہ بنانا ہی کافی سمجھا۔ ان دونوں کی چیخوں کے ساتھ ہی ملتان روڈ پر جاری فائرنگ کی گونج بھی ختم ہو گئی اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ اس سائرن پر کان دھرے بغیر وہ اپنی گاڑی کی طرف لپکا اور ڈیوٹی بورڈ پر پڑا ہوا سوا بال اٹھا کر سجاد رانا کا نمبر ڈائل کیا۔ جب تک انہوں نے کال ریسپونڈ کی پولیس کی سائرن بجائی ہوئی گاڑیاں ان کے قریب آ کر رک جی تھیں۔

”زیادہ تفصیلات بتانے کا وقت نہیں ہے سجاد بھائی! بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ راستے میں کچھ افراد نے ماہ داد کو گواہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان افراد سے اچھا خاصا معرکہ ہوا ہے اور میرے خیال میں میں بھی تین تین بارے گئے ہیں۔ میرا ڈرائیور مشایم خان بھی زخمی ہوا ہے۔ آپ کے چھکے کے لوگ حسب روایت سارا معاملہ منظم کے بعد موقع پر پہنچ گئے ہیں اور یقیناً اب یہ لوگ کارروائی کے نام پر دقت صانع کرنے کی کوشش کریں گے میری آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ ان لوگوں کو قابو میں رکھنے کا انتظام کر دیں۔“ اس نے جلدی جلدی غلاصہ بیان کرتے ہوئے مخاطب پیش کیا۔

”تم کس جگہ پر ہو؟“ انہوں نے بھی زیادہ تفصیلات

میں جانے کے بجائے سنجیدگی سے پوچھا۔

”مکان روڈ پر... شاہ نور اسٹوڈیو کے بالکل قریب۔“ اس نے بتایا۔

”اوکے! میں ابھی تہیاری جان چھڑانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ انہوں نے کچھ کر سلسلہ منتقل کر دیا۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد وہ زخمی مشایم خان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جیب کے پیچھے سے نکل آیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو پر گولیاں لگی تھیں جن سے خون کی بہت بڑی مقدار نکلنے کے باعث اس کے کپڑے سرخ رنگ میں ڈوبے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”اسے سسزایہ سب کیا ہوا ہے... کیا آپ عیسیتا سکتے ہیں؟“ اس کی گاڑی اور لباس سے اس کی اصل حیثیت کا نہ کئی گھر اس بات کا تو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی صاحبہ ثروت آدمی ہے، اس لیے اس شخص کو اس کی جیب پر لگے پولیس والے نے اس سے نیپتا نیپتے انداز میں سوال کیا۔

”اے سی شہزاد عادل۔“ خود کو پکارے جانے کے انداز پر فہرے برامانتے ہوئے اس نے اپنا تعارف کروایا اور دوبارہ مشایم خان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کیا ہوا ہے یہ تو تھوڑی دیر میں آپ کو آپ کے چھکے کے ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب خود بتا دیں گے، فی الحال آپ سب سے پہلے زخمیوں اور لاشوں کو اسپتال پہنچانے کے لیے ایوبینس کا بندوبست کریں۔“ اس کا اپنا تعارف اور پست ڈی آئی جی کے حوالے کے ساتھ حکمتانہ لہجے سے اس شخص کو... ٹیٹا سائیں... بے چارے کی بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بات پر یقین کرے بھی یا نہیں۔ ایک آدھ منٹ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے کم از کم ایوبینس تو پٹالے۔ جس بندے کے بارے میں وہ تذبذب کا شکار تھا، وہ کہیں بھاگتا ہوا تو نظر نہیں آ رہا تھا جس سے ایک طرح سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنے بیان میں سچا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے سوا بال پر ایوبینس کے لیے کال کرنے لگا۔ اس کال سے فارغ ہو کر اس نے اپنے چابیوں کو بلند آواز میں ایک دو انگلیات ہی دیے تھے کہ سوا بال بچنے لگا۔ اس نے جتنا انداز میں کال ریسپونڈ کی اس نے لمحے دو اس طرح اٹھیں کہ انہوں نے اس کی آئی جی صاحب فون پر اس سے مخاطب نہ ہوں بلکہ فون پر اس سے کھڑے ہوں۔ ”میں سر“ کی گردان کے ساتھ اس نے ان کی تمام ہدایات سنیں اور فون بند ہونے کے بعد ایک گہرا سانس لیتا ہوا شیراز کی طرف بڑھا۔ وہ مشایم خان کے قریب بیٹھا اس سے کوئی بات کر رہا تھا۔

”ایوبینس ابھی تک نہیں پہنچی وین اسچ او صاحب؟“ اسے اپنے قریب پا کر اس نے پلٹ کر پوچھا۔

”میں نے کال کر دی ہے مگر اب اس پہنچتی ہی ہوگی۔“ اس نے مودبانہ جواب دیا۔ اسی وقت ایوبینس کا مخصوص سائرن سنائی دینے لگا۔

”تم میری گاڑی میں جا کر بیٹھو۔“ اس کا یہ جملہ سن کر ایوبینس اسچ او بریج پش ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔ پولیس کی گاڑی کا سائرن سن کر وہ جیب میں ہی دھک لگی تھی اور دوبارہ صحیح طریقے سے برقع پہن لیا تھا۔ برقع پہننے کے بعد وہ ابھی ابھی جیب سے برقع ہوتی تھی اس لیے ایوبینس اسچ او کی پہلی بار اس پر نظر پڑی تھی۔ شیراز کی ہدایت کے مطابق وہ اس کی گاڑی کی طرف بڑھی تو ایوبینس اسچ او سوا بال نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ضرور رہا لیکن زبان پر کوئی سوال لانے کی جرأت نہیں کر سکا۔

”یہ میرا خاص بندہ ہے۔ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹرز کو خصوصی ہدایت دی ہوگی آپ کو۔ باقی بندوں کے بارے میں بھی مناسب بندوبست کر کے رپورٹ براہ راست ڈی آئی جی صاحب کو دینیے گی۔ آگے وہ جو ہدایات دیں، ان پر عمل کیے گا۔“ مشایم خان کو ایوبینس میں منتقل کیا جا رہا تھا، تب اس نے ایوبینس اسچ او کو یہ ہدایات دیں اور خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کی پہلی نشست پر ماہ بانو بھی تھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسکاتے رہی تھی۔

”کیا بات ہے... کیوں رو رہی ہو؟“ اس نے سوا بال سے پوچھا۔

”میں نے تین تین بندوں کو مار ڈالا۔ اب پولیس مجھے ان کے قتل کے الزام میں پکڑ لے گی۔“ اس نے مزید بلند سسکیوں کے درمیان پریشان اپنے رونے کی مہر بتائی۔

”اپنے ڈیوٹی میں کسی کو مارنے پر قانون کی طرف سے کافی پھوٹ ہے... پھر تم سے تو کہنے سے اب تک ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تو تمہیں کیوں فکر ہو رہی ہے؟ اس سارے معاملے کو سوا بال کو اپنے طریقے سے پھیل کر لیں گے۔ تمہیں اس سلسلے میں قطعی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے اسے سمجھا یا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”اب تم لوگ کہاں جا رہے گے... کیا واپس ڈی آئی جی صاحب کے گھر؟“ اس کی سسکیوں پر زور مضبوط ہوتے ہوئے اس نے آگے کا پروگرام جاننے کی کوشش کی۔

”نہیں... تمہیں جلد از جلد یہاں سے نکالنا اب اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ تم پروگرام کے مطابق اب بھی کا نہ سے

ہی جاؤ گی۔ البتہ اب مشاہیرم خان نہیں وہاں تک نہیں پہنچا سکتا۔ چنانچہ اس کے مشورے سے یہ چلے پایا ہے کہ میں خود تمہیں ہشام تک پہنچاؤں گا۔ وہاں سے تمہیں مشاہیرم خان کا بھائی آگے لے جائے گا۔ اس کا بھائی پورے اور اسکرودا تا جاتا رہتا ہے۔ مشاہیرم خان نے بتایا ہے کہ اگر ہم کے نو موٹیل فون کر کے اس سے بات کرنے کی خواہش کریں تو بات ہو جائے گی ورنہ نہ بھی ہوا تو پیغام تو ضرور ہی پہنچ جائے گا۔ اس نے بتایا اور پھر اپنے موبائل پر کوئی نمبر ڈال کر دے لگا۔ رابطہ ہونے کے بعد اس نے گفتگو کا آغاز کیا تو ماہ بانو کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کے نو موٹیل کے فون پر بات کر رہا ہے اور اسے وہاں مشاہیرم خان کا بھائی مل گیا ہے۔ اس فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سیاردا تا کو فون کیا اور انہیں سارے واقعے کی تفصیل منانے کے بعد مشاہیرم خان کا خصوصی خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ معاملے کی تحقیقات کروانے کی درخواست کی۔ موزوں پر سفر کا آغاز ہونے کے بعد اس نے موبائل کو وہاں ڈیش بورڈ پر ڈالتے ہوئے اپنی پوری ذرا تھک پر میڈل کر لی۔

”جاہو تو اب تم اپنا برقع اتار سکتی ہو۔ موسم کافی گرم ہو رہا ہے تمہیں تمہیں تکلیف نہ ہو۔“ گاڑی ٹھہر کر کی ڈھلوانوں پر ریختی، موزوں کے لیے ترانے گئے سرخ پہاڑوں کے درمیان سے گزر رہی تھی، جب اس نے ماہ بانو سے یہ بات کہی۔ گاڑی میں چلے ایئر کنڈیشنر کی وجہ سے اگرچہ اندر کا موسم خاصا خوش گوار تھا مگر بھی اس نے شہر یار کی بات پر مکمل کیا۔ عادت نہ ہونے کے باعث وہ برفے میں خود کو بے آرام محسوس کر رہی تھی۔ اب اجازت فی تو بحث برقع اتار کر اس کی جگہ اپنے ایک دو پٹا نکال کر اوڑھ لیا۔ یہ نئے رنگ کا ایک بڑا سا سوئی دو چٹا تھا جسے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹنے کے بعد وہ سیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گئی۔ پچھلے دو تین دن بہت زیادہ میٹھن میں گزرے تھے اور وہ کئی طرح سو بھی نہیں کی تھی۔ اب جو میٹھ سے چیک لگا کر میٹھی تو اسے خود بھی اندازہ نہ ہوا اور وہ نیند کی وادی میں جا رہی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے شہر یار نے ایک ویپر مرد میں یہ مقرر دیکھا۔ نیلے دوپٹے کے بالے میں شیم وایونٹوں کے ساتھ نیند میں ڈوبی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی لیکن پھر بھی ایک ہی سی تھی۔ یہ کی نیلے پھولوں والی اس سیاہ چادر کی بھی جس میں وہ اول روز سے اسے دیکھتا آ رہا تھا اور جو عام کے گھر پر بلاست میں سرنے والی جیل کے ساتھ ہی میٹ ونا ہو گئی تھی۔ جیل کی میٹ کے ساتھ چادر کے باقی ماندہ ٹکڑے دیکھ کر ہی تو اسے

خود بھی ماہ بانو کی موت کا یقین آ گیا تھا۔ اب وہ چادر نہیں رہی تھی لیکن ماہ بانو موجود تھی اور اس چادر کے بغیر کچھ ادھوری ادھوری سی لگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”تم فریش ہونا چاہو تو ہو جاؤ، میں بالکونی میں ہوں۔“ ایک طویل ٹھکا دینے والے سفر کے بعد وہ لوگ ہشام موٹیل پہنچے تو شام سر پر آ پڑی تھی۔ ہوٹل کے ریسپشن پر رگ کر اس نے دو سنگل بیڈز والے ایک کمرے کی بکنگ کر والی اور کمرے میں آنے کے بعد ماہ بانو سے یوں ہوا بالکونی میں چلا گیا تاکہ وہ بغیر کسی جھجک کے سہولت کے ساتھ خود کو سڑکی تنکان اور دھول مٹی سے نجات دلائے کا بندوبست کر سکے۔ ویسے محسن اور حبیب کی خرابی کی ڈسٹ داری طویل سفر سے زیادہ ملتان روڈ پر پیش آتے والے فونی تصادم پر خاندان ہونی تھی، ورنہ سفر تو ایئر کنڈیشننگ گاڑی میں بڑے آرام اور سہولت کے ساتھ کتنا تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر اس نے نیچے بیٹے دریائے سندھ پر ایک نظر ڈالی۔ قدیم تاریخ رکھنے والے دریائے سندھ کے بہاؤ کا سا شور شام کے اس دھندلے منظر میں کسی آدھری سے کھنکھرتی موسیقی کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ اس انوکھی موسیقی میں ہم ہو کر وہ کچھ دیر کے لیے سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔ جیت کی جھیل یا سدرہ سے بہہ گرنے والے دریائے سندھ میں کچھ ایسی ہی انوکھی بات ہے کہ آدھی حرز وہ ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی کچھ عرصوں کے لیے اس بحر کا شکار ہو گیا لیکن پھر جلد ہی اس کام کی طرف اس کا دھیان گیا جسے کرنے کے ارادے سے وہ بالکونی تک آیا تھا۔ اسے لاہور فون کر کے سیاردا تا نے وہاں کے حالات کے بارے میں معلوم کرنا تھا، چنانچہ باہم میں کچھ سو بائیں کی طرف متوجہ ہو گیا مگر اگلے پل ماہ بانو کی تھک ہو بائیں کی بیڑی بالکل ڈاؤن ہو چکی تھی اور اسے ری چارج کیے بغیر استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چارجر اس کی ہڈی میں پڑا تھا۔ کوفت کے عالم میں وہ چارجر لانے کے ارادے سے کمرے سے باہر نکلا۔ ریسپشن کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ لینڈ لائن پر ہی بات کر لی جائے۔ موبائل گوری چارج کر لینے کے بعد بھی صورت حال جانتے کیا ہوئی؟ اس حلائے میں سنگھار بھی ٹھیک طرح سے آتے ہیں یا نہیں، اسے علم نہیں تھا۔ وہ ریسپشن پر ہی رک کر ان غیر ملکیوں کے قاریغ ہونے کا انتظار کرنے لگا جو اپنے لب و لہجے سے امریکی لگ رہے تھے۔ چار باغ افراد پر مشتمل وہ گروپ شاید ایسی ہی مشین پر چار ہوا تھا اور ہشام میں اسے کارا وہ رکھتا تھا۔ ریسپشنسٹ نے انہیں کمرہ

کی چابیوں پکڑائیں تو وہ وہاں سے جہٹ گئے اور اس نے آگے بڑھ کر مدعا بیان کیا۔ استقلیہ کلرک نے مسکراتے ہوئے فون اس کی جانب کھسکا دیا۔ ٹھوڑی دیر بعد وہ سیاردا تا نے بات کرنا تھا۔

”ہم لوگ ہشام پہنچ گئے ہیں۔ آپ بتائیں وہاں کی کیا صورت حال ہے؟“ اس نے تمام الفاظ میں گفتگو کا آغاز کیا۔ پبلک فلیکس پر کھڑے ہو کر گفتگو کرنے میں یہ احتیاط لازمی تھی۔

”یہاں تو صورت حال بہت پیچیدہ درج اختیار کر چکی ہے۔ ملتان روڈ پر جن لوگوں سے تمہارا واسطہ پڑا تھا، ان کی شناخت ہو چکی ہے۔ وہ ایک ایسے ٹینک سے تعلق رکھتے ہیں جو رقم کے عوض افواہ پھیلانے کا شہرہ رکھتے ہیں۔ اس کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان افراد کی ہتھیاری کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے ہی میرے گھر پر بھی حملہ کیا تھا۔ مقصد دونوں دفعہ ایک ہی تھا۔ وہ لوگ ماہ بانو کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کے عوض انہیں بہت بڑی رقم ادا کی جا رہی تھی اس لیے خطرے کے باوجود وہ راضی ہو گئے۔“ سیاردا تا نے بتایا۔

”وہ کس کے لیے کام کر رہے تھے، یہ نہیں بتایا انہوں نے؟“

”بتایا ہے اور نام سن کر میں حیران ہو رہا ہوں کہ اسے معمولی آدمی کی کیا سیاحت کہ وہ اتنی بڑی رقم ادا کر سکے۔ پھر اس کا ماہ بانو سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ انسپکٹر نے کھوکھو کا نام سامنے آیا ہے اس سلسلے میں۔ اسے حاشا کیا جا رہا ہے لیکن وہ منظر سے غائب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ خود کو مختل کیے جانے کے بعد اس نے اقامت چھوڑی تھا اسے ساز باز کرنی ہے اور چودھری نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے ذریعے یہ کام کروایا ہے۔“

”آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ میں بھی اسی رخ پر مروج رہا ہوں۔“ اس نے فوراً ان کے خیال کی تائید کی۔

”میرا حال، تم فکر نہ کرو۔ میں ریشم کھوکھو کو تلاش کروا رہا ہوں۔ باقی معاملات بھی میں نے سنبھال لیے ہیں۔“

جائے وقوع پر کچھ اخباری رپورٹرز وغیرہ پہنچ گئے تھے۔ انہیں بھی بتایا گیا ہے کہ کچھ مشہور افراد کہیں سے ڈھکی کی واردات کر کے فرار ہو رہے تھے کہ پولیس سے تصادم ہو گیا اور نتیجے میں تین افراد ہلاک اور دو زخمی ہو گئے ہیں۔ تمہارے ذرا نیوہ کے زخمی ہونے کی خبر منظر پر نہیں لائی گئی۔ پولیس رپورٹ میں بھی تمہارا ماہ بانو کا کوئی ذکر نہیں ہے۔“ اس کی توقع کے عین مطابق انہوں نے سارا معاملہ بالکل اسی طرح میٹ کر دیا تھا جس طرح وہ چاہتا تھا۔ اس واردات میں جو افراد مارے گئے

تھے، ان کی ہلاکت ماہ بانو کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ چاہتا تھا کہ حالات کے گرداب میں چھپی وہ مشکل میں پڑے۔ جو افراد مارے گئے تھے، وہ مجرم تھے اور یہ بھی ملے تھا کہ اگر انہیں موقع ملتا تو وہ اسے مشاہیرم خان کو قتل کر کے ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

”تمہیں یوتھاد بھائی! مجھے آپ سے یہی امید تھی۔“ اس نے بدل سے ان کا شکر یہ ادا کیا پھر پوچھنے لگا۔ ”اماں کی کیا خبر ہے؟“

”بہت بری خبر ہے۔ اس نے خودکشی کر لی ہے۔“ انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے بتایا۔

”کب... کب؟“ وہ بری طرح چونکا۔

”رات کو کسی وقت۔ اسے پانی پینے کے لیے جواسٹیل کا گلاس فراہم کیا گیا تھا، اس کا کنارہ کافی چٹا اور تیز تھا۔ اسی کی مدد سے اس نے اپنی کلائی کی دھکیں کاٹ لیں۔ صبح ہونے کے بعد ہی اس کی موت کا پتا چل سکا۔ میرے پاس اطلاع تمہارے رشتہ دار ہونے کے بعد پہنچی تھی۔ بس کچھ صبح سے ہی میرے پاس بری اطلاعات آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سارا دن میں انہی معلومات میں الجھا ہوا۔ سمجھتا ہوں کہ ہمارے میں بھی تفتیش چاری ہے۔ کئی مشکوک باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس کی کوشش کے پیچھے والی کوشش بھی اسی کی ملکیت تھی۔ اسے وہ اپنے گودام کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ خاص بات جو معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ اس گودام میں جو چیز ادا رکھا جاتا تھا، وہ مختلف کھیتوں کے ذریعے ادا کیا جاتا رہا ہے۔ ایک کیسے سے معلوم ہوا ہے کہ کپڑے کے کچھ خصوصی تھان ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں بارڈر پر آدمی کے انفرادی خریدتے تھے۔ مجھے شک ہے کہ کپڑوں کے ان تھانوں کے درمیان کوئی خاص شے رکھ کر ایئر اینڈری تک پہنچائی جاتی رہی ہے۔ وہ ہمارے ملک کے بیوقوف راز بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ سندھ رام کا جو کردار اب تک سامنے آیا ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہاں رو کر بھارت کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کے بچوں تک اس کے مرنے کی اطلاع پہنچا دی گئی تھی لیکن انہوں نے پاکستان آنے یا باپ کی جگہ ادا میں کوئی دہشتی ظاہر نہیں کی۔ سندھ رام کے بڑے بچے کے بارے میں بھی جو معلومات سامنے آئی ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ بے تحاشا کمانے کے باوجود وہ شخص بیوقوف کا بے حد متروض ہے۔ یعنی وہ کافی ساری کی ساری بیرون ملک شہر اپنے بچوں کو پہنچا دیتا تھا اور یہاں جو کچھ ہے، اس کی نیلای کے بعد اتنا مل سکتا ہے جس سے بیوقوف کا قرض ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔“ وہ

جو کچھ بتا رہا تھا وہ ساری معلومات صرف آج کے ہی دن میں حاصل نہیں کی گئیں۔ اس کا اضافہ سندر رام اور خواجہ سراؤں کی ہلاکت کے بعد مسلسل کام کرتا رہا تھا لیکن درمیان میں وہ شینا کی لاش کی بازیابی اور پھر اس کی تدفین کے سلسلے میں اتنی بڑی طرح مصروف ہو گیا۔ یہ ساری معلومات لینے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ آج کی دن بعد اس کا دوبارہ اپنے دفتر جانا ہوا تھا تو یہ ساری معلومات بھی اس تک پہنچ گئی تھیں اور اب وہ انہیں اس سے شیئر کر رہا تھا۔

”صورت حال واقعی بہت پیچیدہ ہے۔ ذمے دار افراد کوئی سے کوئی ایکشن لینا چاہیے۔ پھر بارے تبصرہ کیا اور پھر استقبالیہ کلرک کی بار بار خود پر انہی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”کال بہت لمبی ہو گئی ہے، میں واپس پہنچنے کے بعد آپ سے دوبارہ اطمینان سے بات کروں گا۔ فی الحال آپ مجھے اجازت دیں۔“ اس نے ریسور واپس کر لیا پر رکھ کر سلسلہ متعلق کر دیا۔

”اس کال کے چار جزیرے مل میں شامل کر دینا۔“ کلرک سے مختصر ا کہتا ہوا وہ تیز قدموں سے چلتا وہاں سے ہٹ گیا۔ پہلے باہر جا کر اپنی گاڑی سے موبائل کا چارجر لگا لیا پھر واپس کمرے میں آ گیا۔ دادا نو اس دوران غسل سے فارغ ہو چکی تھی اور اب بالونی میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی اپنے کپڑے لگا لے اور فریش ہونے چلا گیا۔ وہ فریش ہو کر واپس کمرے میں آیا۔ تب بھی ماہ بانو بالونی میں ہی کھڑی تھی۔ وہ خود بھی وہاں جا پہنچا۔ دریاے سندھ پر رات اترا آئی تھی اور اس کی سلیٹی چادر پر ان روشنیوں کا عکس جھللا رہا تھا جن کا شمع اس کے پار واقع پہاڑوں پر موجود جیسو پنڈوں میں چلنے والے دیے یا لالٹینیں وغیرہ جیسے دریائے سندھ پر اترتی رات اس کی اصدلی شام سے زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ خاموشی سے ماہ بانو کے ساتھ اس سحر انگیز منظر کا نظارہ کرنے لگا۔ دریا کے پانیوں سے نگر کر آنے والے ہوا کے جھبھوں کی فطرتی نے بتایا کہ وہ لاہور سے بہت دور ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے آگے کی دنیا بہت مختلف ہے۔ کل وہ ماہ بانو کو اس دنیا کی طرف روانہ کر کے خود واپس پہلے والے ماحول میں لوٹ جاتا لیکن ابھی تو وہ اس کے نظارے میں کوڑکی کی سنگت میں کھڑا بیٹھیں ٹھہر جانے کی، وقت کو روک لینے کی خواہش کر رہا تھا۔

”ابھی خاصی ٹھنڈک ہو رہی ہے، اندر چلے ہیں۔“ کھانا کھا کر رام سے سوچا۔ مجھے بھی واپس جانا ہے اور انہیں بھی لہا سفر کرنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ ہم ابھی طرح آرام کر

لیں۔“ اس سحر میں پکڑے رہنے کے خوف نے اسے ماہ بانو کی محویت توڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ حکمتاً لکھے میں لکھا ہوا اپنک پلٹ گیا۔ وہ چوکی اور پھر تاج داری سے اس کے صدم کی تہذیبی کرتے ہوئے خود بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں نکلی۔

☆ ☆ ☆

”بالا ہمارا ہاتھ کتر ہم سے ملنا چاہتے ہو۔ کوئی کام تھا کیا؟“ سامنے کھڑے رفیق کھوکر سے چودھری نے چرخوت لکھے میں سوال کیا۔

”کام آپ بھی سمجھ سکتے ہیں چودھری صاحب! اس لڑکی ماہ بانو کو اغوا کرنے کے چکر میں میرے باز کیے ہوئے بندے کڑے گئے ہیں اور میرا نام سامنے آ چکا ہے۔ ذی آلی جی صاحب پہلے ہی مجھ سے خفا ہے، اب پھر میرا نام سامنے آنے پر ان کی فطرتی کھانچا ہو گا، آپ اندازہ لگاتے ہیں۔ پولیس پورے شہر میں مجھے دھمکتی پکڑ رہی ہے۔ اگر مجھے بروقت ملتان روڈ والے واقعے کی اطلاع نہ ملتی تو میں دھمکیا جاتا۔ یہ اطلاع ملنے ہی کہ قسدام کے بعد دو بندے زخمی حالت میں زندہ گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ میں نے فوراً اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں کہ آپ مجھے جانا فراہم کریں۔ آخر آپ کا کام کرتے ہوئے ہی تو میں اس مشکل میں پھنسا ہوں۔“ رفیق کھوکر نے بتایا۔

”تم بھول رہے ہو اسکیلو کتر تم نے ہمارا کام کرنے کے عوض منہ مانی رقم لی تھی۔ ہم نے رقم ادا کر دی تھی مگر ذمے داری ختم۔ اب یہ تمہارا مسئلہ ہے کہ تم اپنی حفاظت کے لیے کیا کرتے ہو۔“ چودھری کے اس کورے جواب پر پل بھر کے لیے رشتہ کھوکر کا چہرہ فنی پڑ گیا مگر پھر وہ جیترا ادا ہوتے ہوئے بولا۔

”سوچ لیں چودھری صاحب! میرا محفوظ رہنا آپ کے مفادات کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ اگر میں جیڑا گیا تو آپ بھی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ میں خود پولیس کی نوکری کرتا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب پولیس والے کسی سے کچھ اگھوانے پر آ جائیں تو پھر ہندے کے لیے زبان بند رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ آپ نے مجھے تحفظ فراہم نہیں کیا اور میں جیڑا گیا تو کتنی دیر تک آپ کا منک حلال کرنے کے لیے اپنی زبان بند کر سکوں گا۔ کچھ کہ نہیں سکتا۔ پر مجھے انصاف بڑا ہو گا کہ آپ میری جگہ سے پریشانی میں پڑ گئے۔“

چودھری اس کی بات سن کر دوازا۔

”نہیں جتا! میری اسکی جال کلاں؟ میں تو آپ کو صرف

ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔“ اس نے عیاری سے جواب دیا۔

”سننا ہے ابھی سال بھر پہلے ہی تمہاری شادی ہوئی ہے۔ مگر والی بڑی خوب صورت ہے۔ مگر یہ بڑی ماس اور جوان خوب صورت بیوی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا۔ اگر ان دونوں عورتوں کی جان و عزت خطرے میں ہو تو کیا تب بھی تم اپنی زبان کو بند رکھتے سے انکار کرو گے؟“ چودھری نے اس کی عیاری کے جواب میں اپنا جو کڑا دھوکا، اس نے اس کی ساری تیزی و طراری کو کھجاک کی طرح جھٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

”کک... کک... کیا مطلب؟ میری ماس اور بیوی کا اس معاملے سے کیا تعلق؟“ وہ بھلا یا۔

”بھی ان کا تم سے تعلق ہے تو تمہارے معاملات سے بھی تعلق ہو گا۔ ہم سے وصول کی گئی رقم سے انہیں بھی تو عیش کرواؤ گے۔ سننا ہے تم نے اپنی ماس اور بیوی کو ابھی خاصی موٹی رقم دے کر تھم یا خان بیوی کے سینے گھرا دیا ہے کہ کچھ دن دونوں وہاں رہیں اور خوب عیش کریں۔ اب بتاؤ، جب وہ تمہاری کمائی پر عیش کریں گی تو کیا تمہارے افعال کی ذمے دار نہیں ہوں گی؟“ چودھری کی باتوں نے رفیق کھوکر کے ہونٹوں پر تالا ڈال دیا۔ اس وقت پہلی بار صبح منوں میں اسے احساس ہو رہا تھا کہ اپنی اوقات سے بڑھ کر اونچا اڑنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اچھی جگہ عزت کی نوکری تھی۔ پہلے اس نے اپنے فرائض سے کوتاہی پر لی، جب اس کو تباہی کی سرائی تو بجائے معافی طلبی کے ذریعے وہ اس سرا کو ختم کر دینے کی کوشش کرتا۔ چودھری سے مل بیٹھا۔ خیال میں تھا کہ چودھری سے رقم بھی ملے گی اور ضرورت پڑنے پر وہ تحفظ بھی فراہم کرے گا لیکن اس نے تو صاف ہری جھنڈی دکھا دی تھی اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ اگر اس نے زبان کھولنے کی کھٹکی کی تو ماس اور بیوی کی تیر نہیں۔ وہ اتنا باخبر شخص تھا کہ اسے یہ کچھ معلوم تھا کہ اس وقت وہ خواتین کہاں موجود ہیں۔ ایسے شخص کے لیے اپنی جگہ پر عمل کرنا کتنا سہل ہو گا، وہ سمجھ سکتا تھا۔

”تم کچھ پریشان ہو گئے اسکیلو! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم اپنے خدمت گزاروں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ابھی جتنی باتیں ہوئی ہیں انہیں بھول جاؤ اور آرام سے یہاں رہو۔ ہم آج اپنے گاؤں واپس جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی یہاں سے آج ہی کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ ہماری اس کوٹھی کے بارے میں سب کو علم ہے اس لیے تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ میں بالے سے کہہ دوں گا۔ دو تھیں کی دوسری محفوظ جگہ پر جہاں تمہارے گھر کے آدی تہہ بھی محفوظ رہتا ہے۔ تم

بے فکر ہو جاؤ، اب تم ہمارا مسئلہ ہو۔“ رفیق کھوکر ابھی پریشانی کے عالم میں کم سم سائی کھڑا تھا کہ چودھری نے ایک بار پھر تیزی سے جیترا بدلا اور اپنا سوز فطرتی بدلتے ہوئے خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ اسے تسلی دی۔

”شکریہ چودھری صاحب! بہت مہربانی آپ کی۔“ اس کے قلم سر وہ گویا بیان ہی پڑ گئی۔

”شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم ہمارے اتنے کام آئے ہو تو ہم تمہارا خیال کیسے نہیں رکھیں گے۔“ چودھری نے اسے جواب دیا اور پھر اس کے پیچھے بالکل خاموش کھڑے بالے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اسکیلو صاحب کو ساتھ لے جا جائے! اور ان کا اچھی طرح بندوبست کر دے۔ یہ ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں تو ابھی طرح جانتا ہے۔“ ”بالکل مرکا را!“ بالے نے اسے جواب دیا اور پھر رفیق کھوکر کو باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی یاہر نکل گیا۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی چودھری کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ ہمیشہ اپنی من چاہی مرادیں پوری ہوتے دیکھنے کا عادی تھا لیکن ماہ بانو کے سلسلے میں اسے مسلسل تکان کی کا سامنا تھا۔ وہ ہر بار اس کے ہاتھ میں آتے آتے کسی پختی پختی کی طرح پھسل جاتی تھی اور اب اس کے پیچھے جو لوگ آ کھڑے ہوتے تھے، ان کی وجہ سے اس تک رسائی اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ وہ بار بار مانتے والا بندہ نہیں تھا، نہ ہی اس کی اتنا جارت دیتی تھی کہ کسی اور کو خود سے بڑھ کر با اختیار تسلیم کرتے ہوئے مقابلے سے پیچھے ہٹ جائے۔ وہ شینا کی موت پر تعزیت کرنے سجاد رانا کے گھر گیا تھا اور ان سے گھر سے دھک کا اٹھارہ بھی کیا تھا لیکن یہ طے تھا کہ جو جنگ شروع ہو چکی ہے وہ جاری رہتی ہے۔ اس جنگ میں کتنے مہرے کام آجاتے، اسے غرض نہیں تھی۔ رفیق کھوکر جیسے معمولی مہرے کو بھی اس نے پڑا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کھوکر کو زندہ رہتے دیا تو آگے جا کر وہ خود اسے مروا دے گا۔ وہ اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کھوکر پولیس کے ہاتھ نہ لگے، اس بات کی اہمیت کا اسے خود بھی اندازہ تھا اور صبح سے اس کے اپنے ہندے اسے تلاش کرتے پھرتے تھے۔ یہ تو اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے حق جتانے خود ہی یہاں آ پہنچا اور ان لوگوں کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ اس کی فرمائش پر اسے ملاقات کا شرف بخشے ہوئے اس نے اس سے جتنی بھی گفتگو کی تھی، وہ محض دل گئی کے لیے تھی۔ ورنہ فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا اور اس وقت بالا اس فیصلے پر عمل

درآمد کے لیے ہی کھوکھر کو ایک ایسی جگہ منتقل کرنے کے لیے کیا تھا جہاں تک نہ تو پولیس کی رسائی تھی اور نہ ہی وہ خود اپنی لوٹ سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

”میں نے ایسے مناظر صرف نیل دیوان پر دیکھے تھے۔ میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جیسی ہی اتنی قریب سے یہ سب دیکھ سکوں گی۔“ درپائے سندھ کے کنارے پر موجود اس بڑے سے پتھر پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سادگی سے بتایا۔

”تمہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہے؟“ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے قدم جما کر پتھر پر براجمان ہونے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہی، چنانچہ مہاراجہ کے اس کی کوشش کو کامیاب بناتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس وقت وہ لوگ اس کی خرابائش پر ہی موبائل سے باہر نکل کر یہاں تک آئے تھے۔ صبح کے اس پہر جبکہ ابھی سورج کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی، درپائے سندھ کے کنارے پر بیٹھ کر اس کا نظارہ کرنا واقعی بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

”ابھی چیزیں تو پر ایک کواچی تھیں۔ مجھے بھی یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ اس نے اسی سادگی سے جواب دیا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جب تم مشاہیرم خان کے بھائی کے ساتھ یہاں سے آگے جاؤ گی تو اور بھی کئی خوب صورت مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا چھٹا بھی وقت یہاں گزرے گا، تم پور نہیں ہو گی۔“ وہ خود بھی اس کے قریب ہی پتھر پر ٹپک گیا۔

”مناظر کی خوب صورتی اپنی جگہ لیکن اس سے بڑھ کر خوب صورت وہ رشتے ہیں جو مجھے اپنے پیچھے چھوڑ کر آنے پڑے ہیں۔ اتنے بہت سارے دن گزر گئے، میں نے کہا اور بے کے کی شکل تک نہیں دیکھی۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہیں۔ اگر آپ مجھ سے میری خواہش پر پیچیں تو میں ان سارے خوب صورت مناظر کے مقابلے میں فیصل آباد میں موجود اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنے ابا اور بے کے کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کروں گی۔“ وہ جو ابھی اتنی پرمشوق لگ رہی تھی، ایک دم ہی اداں ہوئی۔ وہ بے اختیار اس سے نظر ہٹا گیا کیونکہ جانتا تھا کہ اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی گی۔ وہ خبردار گھر سے دوبارہ نہیں جاسکتا تو وہاں اس کے پیارے تو نہیں مل سکتے تھے۔

”انسان کی ساری خواہشیں پوری ہونا تو ممکن نہیں ہوتا۔ اپنی اوجھری خواہشوں پر یہ سوچ کر مہر کر لینا چاہیے کہ

جو ہمارے لیے زیادہ بہتر تھا، وہ اللہ نے ہمیں عطا کر دیا۔ میری کامیاب زندگی کے پیچھے یہی سوچ کارفرما ہے۔ میرے پیش میں بہت کم عرصہ تھا جب ہی ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بعد ماموں جان، ممالی اور سجاد بھائی نے اتنا خیال رکھا کہ میں سمجھتا ہوں اتنا خیال دینا میں بہت کم لوگوں کا رکھا جاتا ہے۔ خصوصاً آخرین ممالی تو مجھ پر جان چڑھتی ہیں۔ ان کی تربیت کی وجہ سے میری شخصیت میں کئی ایسے رنگ ہیں جنہوں نے مجھے دوسروں سے کچھ بہتر بنا دیا ہے، ورنہ ہوسکتا تھا کہ میں بھی ان سارے لوگوں کی طرح ہوتا جو اختیار ہاتھ میں آجانے پر برے بھلی کی تمیز کھو بیٹھے ہیں۔ اللہ نے مجھ سے ماں باپ کی نعمت لے کر بدلے میں انسانیت کا شعور عطا کیا ہے اور میں اس کے اس فیصلے پر راضی ہوں۔ کیا تم میں حوصلہ ہے کہ تم اللہ کے فیصلوں کو بہتر کر دو؟ ان کے آگے اپنا سر جھکاؤ؟“ وہ بات جواز سے دوں سے وہ اسے بتائیں۔ سکا تھا، ایک دم ہی بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس نے ان کے منہ کو جانتے کی کوشش کی۔

”کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میری بے اور ابا ٹھیک تو ہیں۔“ وہ اس کے سوال پر بری طرح چوی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس تمہارے لیے ان کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں۔“ اس نے جواب دیا اور آہستہ آہستہ اسے سارے حالات سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ ”اتنے دن گزر گئے اس حادثے کو اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ وہ دونوں مجھ پر اپنی جان بچا چکے تھے اور میری ہی خاطر اپنی جان سے تلے گئے۔ تمہی بد نصیب ہوں میں۔“ وہ بری طرح سسکتی گئی۔

”ایسی باتیں مت کرو۔ بد نصیب صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر نہ کریں اور اس کے فیصلوں کو قبول کرنے سے انکار کریں۔ تم یہ ایک مشکل وقت پر آ رہے ہو، ان جانے کہ جب تم اس آقماش سے ٹکڑو تو تمہارے ہاتھوں اللہ کتنے بڑے بڑے کام انجام دلو گے۔ ایسے کام جو تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری بے اور ابا کی بھی بخشش کا ذریعہ بنیں۔“ وہ اسے سمجھانے لگا اور وہ حیرت زدہ ہی اس کی باتیں سننے لگی۔ افسرانہ شان کے ساتھ دینے والا اور آپ تولد کر گھٹکھڑکے والہ وہ شخص ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے، اسے واقعی اندازہ نہیں تھا۔ وہ تصور پر حیرت مانی اس کی صورت نگاہ رہ گئی۔

”چلو، واپس چل کر ناشتا کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد چاہو تو دوبارہ یہاں آجانا۔ مشاہیرم خان کا بھائی شام سے پہلے

یہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ تم سارا دن آرام سے یہاں کا نظارہ کر سکتی ہو۔“ اس نے سکراتے ہوئے اس کے رخسار پر ہنسا ہوا آنسو آنکھ کی پور سے صاف کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ وہ ساتھ ساتھ چلے موٹیل کے قریب پہنچے تو کل شام ریسپشن پر نظر آنے والے غریبی اپنی جیب میں روانہ ہوتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں سے ایک نے ماہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے ہوائی بوسا اچھالا۔ اس کی اس حرکت پر وہ غفلت زدہ ہی ہو گئی۔ شہریار کے ساتھ پر بھی ناگوار کی شکلیں نمودار ہوئیں۔ ممکن تھا کہ وہ ان سے اچھے جانتا لیکن ان کی جیب حرکت میں آکر وہاں سے آگے بڑھ گئی تھی، سو یہ ممکن نہ ہو سکا۔ وہ دونوں واپس موٹیل پہنچ گئے اور ناشتے کا آرڈر دیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ایجوکریٹر یہاں آنا مشالے کر کمرے میں پہنچ گیا۔

”صاحب! انکڑھی ہوئی چادریں خریدو گے؟ میری بیوی نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔“ ناشتے کے برتن لگانے کے بعد میرے نے اس سے پوچھتے ہوئے ترغیب دی۔

”لا کر دکھاؤ۔ اگر پسند آئیں تو لے لیں گے۔“ اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر بعد میرا جب ناشتے کے برتن لینے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھا۔ تھیلی میں سے چادریں نکال نکال کر وہ ان دونوں کو دکھانے لگا۔ اس کے دعوے کے برخلاف وہ چادریں بالکل بھی اچھی نہیں تھیں۔ کچھ کی کڑھائی بھدی تھی تو کچھ کے رنگ بڑا سب سے تھے۔ وہ بے زار ہو کر اس سے بے سب سمیٹ لینے کا کہنے لگی والی تھا کہ ایک سا چادر پر نظر پڑی۔ اس چادر پر بنے پریم سے چھوٹے چھوٹے پھول کا ڈھمکے تھے۔ اسے دیکھ کر اسے بے ساختہ ماہ بانو کی وہ چادر یاد آئی جس کے پتھر اور جھری لگی تھی۔ اس نے فوراً وہ چادر خرید لی۔ کپڑے کی کوالٹی اور کڑھائی کے مقابلے میں اس کی قیمت بہت زیادہ تھی لیکن اس نے پورا نہیں کیا۔ جب میرا ناشتے کے برتن اور اپنا سامان سمیٹ کر باہر نکل گیا تو اس نے وہ چادر ماہ بانو کو تھما دی۔

”یہ میرے لیے ہے؟ میں تو بھی آپ اپنے گھر کے کسی فرد کے لیے لے رہے ہیں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”میں نے یہ تمہارے لیے ہی لی ہے۔ تمہاری چادر عامر کے گھر پر ہونے والے حادثے میں خراب ہو گئی تھی نا اس لیے۔“ اس نے جواب دیا اور پھر تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ شام تک کا وقت ایسے ٹھنڈا کہ وہ زیادہ تر باہر ہی رہا۔ سامنا ہوا ابھی تو یہاں گھٹکھڑکھٹکی کی۔ شام کو مشاہیرم

خان کا بھائی اسے لینے پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ روانہ ہوتے ہوئے وہ عجیب اور جھڑپ کی کیفیت میں بھی نہ شہریار کا رویہ سمجھ رہا تھا اور نہ ہی اپنی کئی کیفیت۔ کوئی نیا سا احساس تھا جو وہ ایک نئے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے اپنے ساتھ لے کر جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”بچہ آیا وہ لے کر کر سکتی کی کسٹیشن کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ سارا فریج، ضروری آلات اور دوا میں وغیرہ بھی وہ دن کے اندر وہاں پہنچا دی جا سکیں گی۔ اسلاف کے ایجنٹ منٹ کا پروسس بھی تقریباً مکمل ہو چکا ہے، بس لڈی ڈاکٹر کے سلسلے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ کوئی لڈی ڈاکٹر فی الحال وہاں جا کر کام کرنے کے لیے راضی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم مستقل اشتہار شائع کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے دو چار دن میں یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔“ وہ حق ہی اپنے طویل سفر سے واپس لوٹا تھا اور آج دفتر میں موجود تھا۔ پچھلے ہی دن کی مصروفیات کی وجہ سے اسے علاقے میں جاری کاموں کے بارے میں جاننے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ چنانچہ آج پہلی فرصت میں اس نے عبد المنان سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کر شروع کر دی تھیں۔

”ابھی پروگرامس ہے۔ لڈی ڈاکٹر والا مسئلہ بھی انشاء اللہ جلد حل ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو کہ اشتہار میں یہ بھی پیش کر دو کہ اس جاب کے لیے اہل قرار پانے والی خاتون کو ان کی تعلیمی سمیت رہائش کی سہولت دی جائے گی۔ عموماً خواتین دور دراز علاقوں میں جاب کرنے کے لیے تھکاتی اور رہائشی مسائل کی وجہ سے ہی راضی نہیں ہوتیں۔ ہم یہ سہولت پرو دیاؤ گے کہ ان کی یقین دہانی کروائیں گے تو انشاء اللہ جلد اچھا رزلٹ سامنے آئے گا۔“ اب تک کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس نے ایک مشورہ بھی دیا جو عبد المنان نے قوت کر لیا۔

”نور پور میں کیا صورتحال ہے؟ وہاں کا کام کیا چل رہا ہے؟“

”وہاں بھی تیزی سے کام جاری ہے۔ چودھری بختیار کے تعاون کی وجہ سے وہاں ہمیں بڑی سہولت ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی وہاں کا کام مکمل ہو جائے گا۔“

”گڈ!“ اس اطلاع پر اس نے خوشی کا اظہار کیا پھر پوچھنے لگا۔ ”چودھری، باجوہ اور تارڑ کے ٹرانساکٹس تو میرے پیچھے کوئی گز بڑھنے کی کوشش نہیں کی؟“ خلیفے سے باہر جانے والے مال پر اچھی طرح نظر تو رکھی جا رہی ہے؟“ اس معاملے

پر چپک رکھا بہت ضروری ہے۔ ہم ذرا بھی گوز پڑے تو یہ لوگ پھرسے اٹیکو ہو جائیں گے۔
 ”آپ بے فکر ہیں میرا میں اس سلسلے میں مسلسل ڈی ایس پی منظور سے رابطے میں ہوں۔ اب تک وہ ہم سے بھرپور تعاون کر رہا ہے۔ سخت نگرانی کی وجہ سے کسی کی ہمت نہیں کہ یہاں سے کچھ اٹیکل کرنے کی کوشش کر سکے۔ ویسے بھی باجوہ معطل ہے اور چودھری بھی پچھلے دنوں زیادہ تر لاہور میں رہا ہے۔ اس لیے ان کا خرابیہ یہاں بالکل بھی اٹیکو نظر نہیں آیا۔“
 ”اچھی بات ہے۔“ اس نے ذرا سارے ٹیکس ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا اور پوچھنے لگا۔
 ”اور کوئی اہم بات... کوئی خاص مسئلہ؟“
 ”آپ کی غیر موجودگی میں اللہ آباد سے کچھ لوگ آئے تھے۔ وہ لوگ شاہ نواز کے ساتھ غائب ہونے والے لڑکوں کی بازیابی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں دین محمد اور اس کی فیملی کے بارے میں بھی تشویش تھی کہ وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ پولیس ان لوگوں کو اپنے ساتھ گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ یہ بات گاؤں والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر دین محمد کا خاندان کسی جرم میں ملوث بھی ہے، تب بھی ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر تو ملنی چاہیے۔“

”اللہ آباد والوں کے مطالبات اپنی جگہ بالکل درست ہیں لیکن وہ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ معاملہ کتنا زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس معاملے میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہونے کے جو شواہد سامنے آئے ہیں، اس کے بعد صورت حال یکسر مختلف ہو چکی ہے۔ خطیہ ایکسپریز اس سلسلے میں کام کر رہی ہیں لیکن فی الحال مجھے ایسی کوئی خبر نہیں ہے کہ میں غائب ہونے والے لڑکوں کے سلسلے میں کچھ بتا سکوں۔ دین محمد کی فیملی والے معاملے کے بارے میں البتہ میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ انہیں تو تارڑ صاحب نے اپنی جتنی دیکھا ہے سب بتا دیا ہے۔ بلاوجہ جھگڑا نہیں رہا ہے۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ ان... یہ چاروں کی جان بخشی ہو جائے۔ وہ بے چارے تو اپنے بیٹے کی حماقت کو بھگت رہے ہیں۔ اگر وہ لڑکا شاہ نواز کے بہکاؤ سے میں آکر بم بلاسٹ میں ملوث نہ ہوتا تو خود بھی زندہ رہتا اور اپنے گھر والوں کو بھی مشکل میں نہ ڈالتا۔“ عبداللہ ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ خود اساد واس ہو گیا۔

اس وقت اس کی نظر وہیں میں جذباتی سے چودہ چندرہ سالہ عبداللہ کی شکل گھوم رہی تھی۔ اپنی بہن کے انخواہ پر چپک رکھا بہت ضروری ہے۔ ہم ذرا بھی گوز پڑے تو یہ لوگ پھرسے اٹیکو ہو جائیں گے۔
 ”آپ بے فکر ہیں میرا میں اس سلسلے میں مسلسل ڈی ایس پی منظور سے رابطے میں ہوں۔ اب تک وہ ہم سے بھرپور تعاون کر رہا ہے۔ سخت نگرانی کی وجہ سے کسی کی ہمت نہیں کہ یہاں سے کچھ اٹیکل کرنے کی کوشش کر سکے۔ ویسے بھی باجوہ معطل ہے اور چودھری بھی پچھلے دنوں زیادہ تر لاہور میں رہا ہے۔ اس لیے ان کا خرابیہ یہاں بالکل بھی اٹیکو نظر نہیں آیا۔“
 ”اچھی بات ہے۔“ اس نے ذرا سارے ٹیکس ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا اور پوچھنے لگا۔
 ”اور کوئی اہم بات... کوئی خاص مسئلہ؟“
 ”آپ کی غیر موجودگی میں اللہ آباد سے کچھ لوگ آئے تھے۔ وہ لوگ شاہ نواز کے ساتھ غائب ہونے والے لڑکوں کی بازیابی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں دین محمد اور اس کی فیملی کے بارے میں بھی تشویش تھی کہ وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ پولیس ان لوگوں کو اپنے ساتھ گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ یہ بات گاؤں والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر دین محمد کا خاندان کسی جرم میں ملوث بھی ہے، تب بھی ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر تو ملنی چاہیے۔“

اس وقت اس کی نظر وہیں میں جذباتی سے چودہ چندرہ سالہ عبداللہ کی شکل گھوم رہی تھی۔ اپنی بہن کے انخواہ

آبروریزی اور پھر بے دردی سے قتل کر دیے جانے کے المناک حادثے نے اس کم عمر لڑکے کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ شاہ نواز جیسے شخص کے ہر کانے پر اپنی ذات سمیت دوسرے بھی کئی افراد کی موت کا سبب بن گیا۔ نور پور میں ہونے والا وہ بم بلاسٹ جس میں عبداللہ کی خودکش حملہ آور کے طور پر سامنے آیا تھا، اسے اب بھی کسی حالیہ دھماکے کی قسم کے مناظر کی طرح یاد تھا۔ ٹی بھگتی کی قوی بات تھی وہ... لیکن اس ایک ہل میں کئی جیتے جانے وجود رکھنے والے بن گئے تھے اور کتنوں ہی کے حصے میں عمر بھر کی معذوری آگئی تھی۔ اداس کر دیے والے ان بوٹھل محلوں میں انٹرکام بجتے سے ارتعاش پیدا ہوا۔ عبداللہ انان نے ریسیور اٹھا کر دوسری طرف سے کئی جانے والی بات کی پھر ماتھو نہیں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی۔ ”چودھری افتخار صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں سر“ اس اطلاع کو سن کر اس کے ماتھے پر ناگواری کی کھینچیں پھیل گئیں۔ اس شخص سے ملنا اسے ہمیشہ ہی طبیعت پر گراں گزرتا تھا لیکن پھر بھی ملنا پڑتا تھا۔ شینا کے انتقال پر بھی وہ سجاد رانا کی کوئی پرہیزگاری کے لیے آیا تھا۔ وہاں بھی اسے دھکے دے کر باہر نکال دینے کی خواہش کو قابو میں رکھتے ہوئے اسے برداشت کرنا پڑا تھا اور اب پھر وہ اس کے ضبط کو آزمانے کے لیے اس کے دفتر میں موجود تھا۔
 ”بولو... دیکھتے ہیں کہ کس سلسلے میں چودھری صاحب کو ہماری یاد آئی ہے۔“ عبداللہ انان کی خود پرکھی سوالیہ نظروں کے جواب میں بالآخر اس نے ملاقات کے لیے رضامندی دے دی تھی مگر سچے کئی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ رضامندی خود پر بڑا جبر کرتے ہوئے طوعاً و کرہاً ہی دے رہا ہے۔ بہر حال، چودھری کے اندر آئے تک وہ خود کو کمپوز کر کے پھر سے کے تاثرات کو سیاہ بنا لینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

”کیا حال چال ہے اسی صاحب؟ سنا ہے کس ہی داہنی ہوئی ہے۔ یہ تو غلط بات ہے جناب! آپ کی غیر موجودگی میں بھلا ہمارے ضلع کا انتظام کیسے چل سکتا ہے؟ اب تو آپ ہی یہاں کے کرتہ دھرتہ ہیں۔ زیادہ دنوں کے لیے یہاں سے دور ہر ہا کر رہے، آپ کے پیچھے کوئی گزبڑ ہوگئی تو کون دیکھے گا؟“

”مجھے خود بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہے چودھری صاحب لیکن آپ سے بڑھ کر کس کو خبر ہوگی کہ پچھلے دنوں میں کس قدر کراسر میں رہا۔ میں ان کراسر سے سخت کر یہاں پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ آپ سنا میں، آپ کی طرف تو سب ٹھیک ٹھاک ہے؟ سنا ہے آپ بھی پچھلے دنوں زیادہ تر

کاؤن سے باہر ہی رہے ہیں؟“

چودھری کی فضول بھواس کے جواب میں اس نے اشاروں کنایوں میں اسے جتا دیا کہ وہ جانتا ہے کہ بہت سارے کھیلوں کی ذمہ داری چودھری پر عائد ہوتی ہے مگر چودھری ذہیت بندہ تھا۔ اس کے بتانے کا برا مانے بغیر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اللہ کا کرم ہے کہ میری طرف سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ جو نہیں ہے، اسے بھی میں ٹھیک کر لوں گا۔ اس وقت تو میں آپ کے پاس دو خوش خبریوں کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے آپ سن کر خوش ہوں گے۔“

”کیسی خوش خبریاں؟“ وہ ذرا سا چونکا۔ چودھری افتخار جیسے شخص کی طرف سے ملنے والی کوئی خبر کچ خوشخبری ہی ہوتی، اس بات پر یقین کرنا تو ذرا مشکل ہی تھا۔

”میرے لیے تو کچھ دو دنوں ہی خوشخبریاں بہت اہم ہیں لیکن پہلے میں آپ کو وہ خبر سنا ہوں جس سے گر آپ محسوس کریں گے کہ ہم نے آپ کا ایک اہم مسئلہ حل کر دیا اور ہمیں بھی اپنے علاقے کی اتنی ہی فکر ہے جتنی آپ کو۔“ سیدی طرح جواب دیتے کے بجائے اس نے تمہید باندھ کر شہر یار کے محسوس کو خبر کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنے چہرے پر ایسا کوئی تاثر آنے دیا جس سے چودھری کو اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے اس سے نیازانہ انداز پر وہ خود اسما جزیرو تو ہو لیکن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”سنا تھا کہ اسپتال کے لیے لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست نہیں ہو پا رہا۔ ہم نے سوچا کہ یہ مسئلہ حل کر دیتے ہیں، آخر کو یہ ہمارے علاقے کا ہی مسئلہ ہے۔ آپ چاروں کی نوکری میں یہاں کے مسائل حل کرنے کے لیے اتنے پکڑاں رہتے ہیں تو ہم تو خبر یہاں کے جدی طبیعتی مہرانوں میں سے ہیں۔“ وہ یقیناً یہ ساری باتیں اسے اشتعال دلانے کے لیے کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ شہر یار کو اندازہ تھا کہ ماہیانو کے ایک باہر پھر ہاتھ سے نکل جانے پر وہ کتنا تھکا ہوا ہے اور اب اس تھلاہٹ کے اظہار میں خود کو اس کے مقابلے میں زیادہ با اختیار اور عزت دار ثابت کرنے کے لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ وہ کمال ضبط سے کام لیتا ہوا اس کی ساری سوچا فیاں مسترد کر رہا۔

”ہم نے آپ کے اسپتال کے لیے ایک قابل لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کر دیا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کی رہائش کا انتظام اور تنخواہ وغیرہ سب ہمارے ذمے ہوگی۔“
 ”یہ تو آپ نے بہت زیادہ تحفہ کیا چودھری

صاحب! رہائش اور تنخواہ کا انتظام تو موتی والا صاحب کی جائداد سے قائم کردہ ٹرسٹ کے ذریعے بھی ہو سکتا تھا۔ آخر اسپتال کی تعمیر بھی تو اسی ٹرسٹ کے ذریعے ہو رہی ہے۔“ چودھری کے اس قدر جتانے پر اس سے برداشت نہیں ہوا تو خود بھی بہت سلیقے سے اسے جتا دیا کہ جہاں اتنے بڑے بڑے اخراجات اس کے تعاون کے بغیر ہو رہے ہیں، وہاں یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔

”تکلف کی کیا بات ہے جناب! اس بہانے کچھ ثواب ہم بھی کمائیں گے۔ ساری نیکیاں آپ کے حصے میں ہی چلی جائیں یہ تو ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔ کچھ نہ کچھ تو ہمارا بھی ہونا چاہیے اس کا ثواب میں۔“ اس کا جتنا محسوس کر کے وہ ذرا اپنی منافقت بھری عاجزی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

”طبیعی جس میں آپ کی خوشی۔ اگر آپ نیکیاں لکنا ہی چاہتے ہیں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اب میرا بی کر کے ذرا جلدی سے دوسری خوشخبری بھی سنا دیں۔ آپ کو تو علم ہی ہے کہ میں کتنے دنوں بعد آج واپس آیا ہوں۔ مجھے کئی معاملات پر توجہ دینی ہے۔“ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے ملاقات کو مختصر کرنے کی کوشش کی۔

”دوسری خوشخبری ذاتی نوعیت کی ہے لیکن آپ کو یہ جان کر خوش ہوگی کہ آپ کے دوست چودھری مختیار اور ہمارے درمیان رشتے داری قائم ہو رہی ہے۔ ہم اپنے بڑی شادی چودھری مختیار کی بہن سے کر رہے ہیں۔“

چودھری کی دی ہوئی یہ اطلاع ذرا چونکا دینے والی تھی۔ اسے علم تھا کہ چودھری مختیار کی اکلوتی بہن فریدہ اپنے بچا زاد قربان میں وہ بچی رہتی ہے۔ خود چودھری افتخار اور چودھری مختیار کے درمیان تعلقات کی نوعیت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی... بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا جب چودھری مختیار نے روایت سے انکشاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چودھری افتخار کے دادا کے عرس کے موقع پر سونے کے تاروں والی چادر چڑھانے سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں اسے پانی کے مسئلے کی وجہ سے چودھری افتخار کے سامنے کھٹے پکٹے پڑے تھے۔ ان حالات میں یہ رشتے داری قائم ہونا کچھ انوکھی بات تھی۔ فریدہ کی پسند والا معاملہ تو خیر اس لیے نظر انداز کیا جا سکتا تھا کہ جس شخص کو وہ پسند کرتی تھی، اس کی فیملی سے اس کے بھائی کے تعلقات بے حد خراب تھے۔ پھر لڑکیوں کی پسند ناپسند کو تو ابھی تک کی شہری گھرانوں میں بھی بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تو ایسے میں فریدہ بھی گاؤں کی پروردہ لڑکی کی پسند کون پوچھتا؟ لیکن وہ مخالف

چودھریوں کے درمیان رشتے داری حیرت انگیز تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ چودھری بختیار وحیثیت کے اعتبار سے چودھری افکار سے بہت کمتر تھا۔
 ”یہ تو واقعی اچھی خبر ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔ میرے علم میں نہیں تھا کہ آپ کے صاحب زادے امریکا کے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اچھا ہے، مجھے ان سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔“ اپنی حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے چودھری کو مبارکباد دی۔

”خیر مبارک! لیکن آپ کا یہ اندازہ غلط ہے کہ چودھری مراد یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ تو امریکا میں ہی ہے اور بہت مصروف ہے۔ پھر شادی ہوگی اتنی جلدی میں رہی ہے کہ اس کا بیٹھا ممکن ہی نہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ لوگوں کو دعوت بھی نہیں دی گئی ہے۔ بس اس پاس کے ہی خاص خاص لوگ ہیں جن کو دعوت تھے دے دیے ہیں۔ آپ کا دعوت نامہ میں یہ طور خاص خود لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔“ چودھری نے دعوت نامہ اس کے سامنے رکھا تو اس نے بے ساختہ ہی اسے فوراً اکھول لیا۔ دعوت نامے پر دوہما کا نام چودھری بہزاد عالم شاہ تحریر تھا۔ وہی بہزاد عالم شاہ جسے اس نے چودھری کی حویلی میں ایک ایب نائل لڑکے کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ ایک اچھی لڑکی کے دوہما کے طور پر اس ایب نائل لڑکے کا نام دیکھنا اس کے لیے ایک شدید ذہنی جھٹکا ثابت ہوا۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین آ گیا کہ چودھری افکار سے کسی بھی وقت کوئی بھی غیر معمولی اور غیر انسانی کارنامہ سرانجام دے جانے کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ جس شخص میں انسانیت نہ ہو، بھلا اس سے انسانیت کے احترام کی امید رکھی بھی کیسے جاسکتی ہے؟ چودھری کے اندر ذرا بھی انسانیت ہوتی تو آج ماہ بانویں در بدر کیوں ہوتی؟ اور جو اس ماکہ ریتیں کھوکھرا اپنی جان سے کیوں جاتا؟ بیٹام سے واپسی میں شہر یا تھوڑی دیر کے لیے لاہور میں جاوڑا کے گھر رک کر آیا تھا۔ وہاں اسے ریتیں کھوکھرے قسمت کی اطلاع سننے کو ملی تھی اور اس اطلاع کو سننے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس نے وفوف انیکل کی موت کا قوسے دار کون ہو سکتا ہے؟ ریتیں کھوکھرا ایک ایسا فرد تھا جو پولیس کے ہاتھ آ جاتا تو چودھری کے خلاف ایک مضبوط گواہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے، یہ بات چودھری بھی سمجھتا تھا اس لیے اس نے خود کو جانے کے لیے اس کا کام تمام کر دیا۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ وہ لوگ یہ سارے حقائق جانتے تھے لیکن کوئی شخص ثبوت نہ ہونے کے باعث چودھری پر ہاتھ ڈالنے سے

معدوم تھے اور وہ ان کی بے بسی کا تماشا دیکھتا اپنے مظالم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے آزادی سے محروم رہا تھا۔ چودھری بہزاد کی شادی کے دعوت نامے کی صورت اس کے ظلم کا ایک اور منظر اس وقت اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ حیران تھا کہ افکار عالم شاہ کے اس خالص فاضل میں چودھری اختیار جیسا اچھی فطرت رکھنے والا بندہ کیونکر شامل ہوا؟

☆☆☆

”ابہا کرانی، میرے یہ کپڑے استری کر دے۔ میں تا جہز آپ کے ساتھ شہر بھی گئی، اب انہوں نے زبردستی مجھے یہ جہز دلوا دیا تھا کہ مجھ پر بہت اچھا لگے گا۔ پر تب میرا بی بی نہیں چاہتا تھا ایسا شوخ رنگ پہننے کو اتنے عرصے سے ایسے ہی ان پھرا ہوا ہے یہ جہز، پر آج بھی کر رہا ہے اسے پہننے کو۔ بس تو جلدی سے اسے اچھی طرح استری کر دے۔“ اندری سے سرخ رنگ کا موتیوں کے کام والا ایک ریڈی میڈ سوٹ نکال کر رانی کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن شادی کی باتیں ہوتی تھیں۔ رانی نے اس کا ہاتھ ہوا جوڑا ہاتھ میں تولے لیا لیکن اپنی جگہ متذبذب ہی کھڑی رہی۔

”کیا ہے؟ مل کیوں نہیں رہی اپنی جگہ سے؟ ابھی موقع ہے۔ ایسا لی ڈو جاسوس نوکرانیاں اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ تو جلدی سے یہ کپڑے استری کر کے میری انماری میں ٹانگ دے۔ اگر ان جاسوسوں کی نظر پڑے گی تو توہہ میں لگ جائیں گی کہ میں نے آج یہ کپڑے کیوں استری کر دئے ہیں۔“ رانی کو اپنی جگہ بٹھے دیکھ کر اس نے اسے ٹوکا۔

”میرا بی بی بول رہا ہے بی بی! بار بار اس طرح حویلی سے نکل کر جانے میں برا خطرہ ہے۔ کسی کو خبر ہوگی تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔“ وہ اپنے اندر کا سوسہ زبان پر لے آئی۔

”مجھے اپنی جان جانے کا ڈر لگ گیا ہے کیا؟“
 ”نہ بی بی نہ۔ اپنی جان کی فکر نہیں ہے مجھے۔ آپ کی خاطر اگر جان چلی جاتی ہے تو پروا نہیں، پر آپ کا سوچ کر دہی ہوتا ہے۔ مجھے خبر ہے کہ یہاں سب آپ کی چھوٹی سوتی خواہشیں تو آسانی سے پوری کر دیتے ہیں، پر اس معاملے کی ذرا بھی ہینک پڑ جائے تو آپ کو کوئی نہیں ملے گی۔“ کشور کے کڑے لہجے میں پوچھتے پر وہ ہنگامہ کو وضاحت پیش کرنے لگی۔

”مجھ سے زیادہ اچھی طرح مجھے یہ بات معلوم ہے، پر سوچتی ہوں کہ اب جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں۔ ہوں گھٹ گھٹ کر بیٹے سے ایک بار یہ سر جانا اچھا ہے۔ کم سے کم سرتے وقت یہ سون تو ہو چکا کہ اپنی مرضی اور خوشی سے نکلی ہوا میں چند سائیں لینے کوئی نہیں۔“ محبت نے اسے اتنا

فرد بنا دیا تھا کہ اب موت کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔
 ”پھر بھی بی بی! میری اوقات تو نہیں آپ کو شورہ دینے کی، پر میں یہی کہوں گی کہ آج آپ نہ بی جا سیں تو اچھا ہے۔ آج تو وہ ہے چودھری صاحب بھی حویلی میں ہیں۔ ان کے ہوتے سارے نوکر چاکر زیادہ ہی ہشیار رہتے ہیں۔ ہمارا کھانا مشکل ہو جائے گا۔“ وہ مقدور بھر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آج نہ روک رانی! آج میں اپنی خواہش پر نہیں ان کے بلاوے پر جا رہی ہوں۔ آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے خود دیکھے ہلایا ہے، ورنہ اب سے پہلے ہمیشہ میں ہی ضد کر کے ان سے ملنے جاتی تھی۔ اب انہوں نے ہلایا ہے تو کیسے انکار کروں؟ آج تو میں رک ہی نہیں سکتی۔ آج تو مجھے ہر حال میں جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے بی بی! ابھی آپ کی مرضی۔“ اس کے ارادے کی مضبوطی دیکھتے ہوئے با آغوش رانی نے ہار مان لی اور کپڑے لے کر چلی گئی۔

”یہ کپڑے لے کر باہر مت جانا، یہیں میرے کمرے میں ہی بیٹھ کر ان پر استری پھیر دے۔“ کشور نے اسے ٹوکا۔

”جی اچھا بی بی!“ اس نے تابع داری سے جواب دیا لیکن لہجہ پر مہرہ ہی تھا۔

”کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہے؟ اس سے پہلے بھی تو جا چکے ہیں ہم۔ جس کپڑے کو خبر ہوئی تھی جواب ہو جائے گی؟ کچھ باری طرح آج بھی تو سب کو دودھ میں نیند کی دوا ملا کر پلا دینا۔ کسی کو کاکاں خبر نہیں ہوگی اور ہم واپس بھی آجائیں گے۔ دوا تو ہوگی تاہم یہ پاس؟“ اس کا انداز دیکھ کر کشور نے اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی بی بی! رونا تو ہے، اس کا مسئلہ نہیں۔ پر مجھے رات سے پہلے جا کر اکو سے بھی ملنا ہو گا تا کہ وہ تیار رہے اور چوکیدار کو بھی ادھر ادھر کرنے کا بندوبست کر دے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ادھر اسکول کی دیکھ بھال کے لیے چوکیدار ہوتا ہے۔ آپ وہاں جائیں اور وہ وہاں ہوتو کچھ اچھی عمل نہیں ہوگی۔“ اس نے فوراً مفصلی جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تو اپنے سارے کام نمٹائے۔ میری طرف سے رات تک حیرتی چھٹی ہے۔ مغرب کے بعد لوٹ کر آجانا۔“ کشور نے اسے اجازت دی۔ جب سے انڈسٹریل ہوم کا آغاز ہوا تھا، رانی سہ پہر کے بعد حویلی آنے لگی تھی۔ کشور نے اپنی سفارش سے اسے انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے کی اجازت دلوائی تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ حویلی

آتی اور پھر باقی کا وقت وہیں گزارتی۔ اپنے گھر اس کا دن میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے ہی جاتا ہوا تھا لیکن یہ معمول اسے اس لیے زیادہ گراں نہز رہا کہ حویلی میں اس کی حیثیت کشور کی خاص ملازمت کی ہی ہو چکی تھی اور کشور کا سلوک اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے تمام تر اندیشوں اور دوسموں کے باوجود کشور کے ادکامات کی پیروی کرتے کے لیے راضی ہو چکی۔ اکو کو رات گئے چوری چھپے اسکول تک چھوٹی بی بی کو لے جانے کے لیے راضی کرنے کا مرحلہ ہمیشہ سب سے دشوار ثابت ہوتا تھا لیکن وہ کچھ اپنی محبت کے واسطے دے کر اور کچھ کشور کی بھانجی کی رقم کے زور پر اسے تیار کر ہی لیتی تھی۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ حسب حکم مغرب کے بعد اس کی حویلی میں واپسی ہوئی تو سب کچھ سیٹ ہونے کی خوش خبری ساتھ تھی۔ رات گہری ہونے کے بعد سب کے اپنے کمروں میں چلے جانے تک کا وقت کشور نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ حسب معمول جب رانی سب کو ان کے کمروں میں دودھ کے گلاس پہنچانے گئی تو وہ اپنا کمر بند کر کے تیار ہونے لگی۔ ایک تو سرخ رنگ کا لپٹا بلیٹن، دوسرے اس کی دل سے خود کو منوارنے کے لیے کی گئی جدوجہد۔ مکمل طور پر تیار ہونے کے بعد وہ اپنے کے سامنے کھڑی ہوئی تو خود اس کی اپنی نظریں بھی اسے سراسر بغیر نہ رہ سکیں۔ رانی اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد واپس آئی تو اس نے بھی بر ملا اس کی تعریف کی۔ پھر وہ دونوں کچھ دیر بعد یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ سب لوگ تیار اور دودھ کی کمرہری نیند سو چکے ہیں، روانگی کے لیے تیار ہو گئیں۔ کشور کی مسمری اور پیچھے کا پیرے پر اس انداز سے گاؤں گئے رکھ کر ان پر چادر مین پھیلا دی گئی تھیں وہ اور رانی دونوں سو رہی ہوں۔ رانی نے بندوبست کیا تھا کہ حویلی کے کینوں کے علاوہ کچھ اور شاد بھی خواب آور گولیاں ملا دودھ کی میں اس لیے راستے میں انہیں کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ دے قدموں چلتی وہ دونوں حویلی کے پچھلے حصے میں پہنچ گئیں۔ یہاں بھی دیوار میں ایک دروازہ تھا جو حویلی کے پچھلے حصے سے متصل چودھری کے آبائی قبرستان میں کھلتا تھا۔ اس دروازے پر ہر وقت کالا پڑا ہوتا تھا۔ کچھ بھی حویلی کی خواہشیں اسے بزرگوں کی قبروں پر فاقہ پڑھنے قبرستان جاتیں تو جب یہ تالا کھولا جاتا۔ تالے کی چابیاں چوکیدار کے پاس ہوتی تھیں۔ رانی نے ایک دن ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے چابیوں کے مجھے سے اس دروازے کے تالے کی چابی اڑائی تھی اور پھر واپس بلانے کے بعد واپس کچھ میں پہنچا دی تھی۔ اب قبرستان کی طرف

کھلنے والا بگنی دروازہ خفیہ آمد و رفت کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ آج بھی وہ دونوں اسی دروازے سے گزر کر قبرستان میں پہنچیں اور مردات کے ہولناک سنائے اور قبرستان کی مخصوص وحشت کی پروا کیے بغیر قبروں کے درمیان سے گزرتی آگے بڑھنے لگیں۔ عام حالات میں کوئی لڑکی یقیناً تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ رات کے اس پہر کی قبرستان سے گزرتی لیکن محبت کی شہیدہ سری نے مشہور کوہ خوف سے آزاد کر دیا تھا۔ رانی حتی و فاداری بھانے کے لیے اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اس وقت بھی ایک ہاتھ میں نارنج تھاے وہ بڑی مستعدی سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ نارنج کو مستقل جلائے رکھنے کے بجائے وہ وقفہ وقفے سے ہنسنے پھرنے کے لیے روشن کرتی تھی تاکہ آگے کا راستہ واضح ہو جائے۔ مستقل روشنی کیے رکھنے میں کسی کے متوجہ ہو جانے کا خطرہ تھا، چنانچہ سیاہ چادروں میں اپنے اپنے وجود چھپائے انہوں نے تقریباً تین بجی میں ہی قبرستان کو پار کیا اور اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں اکوٹا سے سمیت ان کا خطر تھا کہ شور کو دیکھ کر اس نے سلام کیا جس کا اس نے سر کی جنبش سے ٹھنڈا اشارے میں جواب دیا اور تانے میں سوار ہو گئی۔ رانی بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ ان دونوں کے سوار ہوتے ہی اکوٹا نے تانے کو ترک کر دیا۔ تاریک اور سنسان راہوں سے گزرتا تانے کی شہدہ منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سڑاٹا طویل نہیں تھا بھٹا خوف اور اندیشوں میں گھبرے ہونے کے باعث محسوس ہوا لیکن یہ احساس صرف اکوٹا اور رانی کے لیے تھا۔ کشور تو ہر خوف سے آزاد آنے والے لکھنؤ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آفتاب سے باتیں کر رہا، ملنا اور اسے دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ ایسی خوشی جس کے سامنے زندگی کی اپنی حیثیت بھی گھٹ جاتی تھی۔ جس کی خاطر زندگی قربان کر دینا بھی مہنگا سودا نہیں تھا اور پچھلی بار کی ملاقات نے تو اس کے انگ انگ میں نشہ سا بچر دیا تھا۔ اس نشے کا سرور وہ اب تک اپنے اندر محسوس کرتی تھی اور اس وقت بھی ایک سرور کی کیفیت میں ہی اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی۔ چنانچہ اسے شہر بھی نہ ہو سکی کہ راستہ کیسے اور کب ملے ہو۔ سوہنہ نورانی کی آواز پر چونکی جو اسے منزل پر پہنچ جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔ اس اطلاع پر وہ چونک کر تانے سے پیچھے آ گئی۔ انڈیز میں ہوم کے دروازے پر تالا نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ آج آفتاب ان سے پہلے پہنچ چکا ہے۔ رانی نے آگے بڑھ کر ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور آفتاب کا چہرہ نظر آیا۔ اسے سامنے پا کر کشور بڑا جھجک اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی

دروازہ فوراً بند کر لیا گیا۔ آج بھی اندرونی پہلے والا بائیل تھا۔ موسم بھی اسی دن کی طرح ہی ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی گزرتی تھی اور کمرے میں بس اتنی ہی روشنی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے دھندلے دھندلے سے نقش و نگار دیکھ سکتے تھے۔ البتہ محسوس کرنے کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ ایک دوسرے سے فاصلے پر کھڑے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی کیفیت سمجھ سکتے تھے۔ وہ گویا کسی ساگر اور ندی کی مانند تھے۔ ندی بڑی ہے۔ بے قرار سی ہے۔ گیل کمر ساگر سے ملنے آتی تھی تو ساگر بھی اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کو بے قرار تھا مگر اس سے قبل کسان کی یہ بے قراری کوئی رنگ دکھائی، باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کشور دروازے کے قریب کھڑی تھی اس لیے اس نے پہلے بے آواز میں سنا۔ آوازوں سے لگتا تھا کہ تین چار افراد مل کر اس طرف آرہے ہیں۔ وہ ایک دم شکار کی آہٹ پا جانے والی تھی ہرئی کی طرح سر اسیمہ ہو گئی۔ قدموں کی چاپیں مین دروازے کے قریب آ کر رکیں اور اگلے ہی لمحے سنائے میں ابھرنے والی دستک کی آواز نے اسے ہلوا ہراساں کیا جیسے دستک کے بجائے کسی زوردار بم دھماکے کی آواز سنائی دے گئی ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرتا پھلتا تو ذکر باہر نکلنے کے لیے تیار ہونے لگا۔ آفتاب نے اس کی یہ وحشت زدہ حالت دیکھی اور شاید دروازہ کھولنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔

”نہیں... نہیں۔“ دروازے کی کندھی کی طرف اس کا ہاتھ بڑھنے سے قبل ہی کشور نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا اور یوں خوف زدہ فکروں سے دروازے کی طرف دیکھنے کی جگہ دوسری طرف موت کا فرشتہ منتظر کھڑا ہو۔

”دروازہ مت کھولیں اور اگر یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے تو آپ جیکے سے یہاں سے باہر نکل جائیں۔“ آفتاب کا بازو پکڑے پکڑے ہی اس نے سرگوشی میں اسے مشورہ دیا۔ آفتاب نے اس مشورے پر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں تاجی وحشت، خوف، کا پتا دینا، دہشت زدہ دل کی بے ترتیب دھڑکن کا پتا دینا سنے کا درد بڑا۔ ہر ہر شے کو اتنی دے رہی تھی کہ اس نے کسی آنے والے طوفان کی آہٹ سنی ہے پھر بھی وہ اسے یہاں سے بھاگ نکلنے کا مشورہ دے رہی تھی اور اسے طوفان سے بچا کر خود اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس اہارہ قربانی یاد رہی تو فتنہ ایک نام ہی دیا جاسکتا تھا۔ محبت...

حادثات و سائنات کسی شکار... پہاڑ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اقلہ ماہ پڑھے



تقدیم کی غصوں گری، قسمت کی جاہلاری یا تقدیر کا کھیل..... ملنے اور ٹکرنے والوں کی کہانی

اسما قادری

گلاب

نور قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بالآخر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح تھیوتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور چال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو محبت نہ تو روایتوں کو ماننی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو جس ہو جاتی ہے دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ رونہ سبکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی ہائیں اور تقدیر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقرر ساتھ رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔ اس وقت تلہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوگا ہے، جرم، آفسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ

وقت گویا ختم سا گیا۔ آفتاب ایک تک اپنے قریب کھڑی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس پر اپنی جان تک لٹا دینے کے لیے تیار تھی۔ وہ ہمیشہ اس لڑکی کی شدتوں سے ہارنا آیا تھا لیکن وہ اس سے کس انتہا دور ہے کی محبت کرتی تھی، اس بات کا حقیقی اور ایک وقت کے ان ناؤک لمحوں میں ہی ہوسکا۔ کسی پر اپنی جان لٹا دینا آسان نہیں ہوتا اور جو محبت میں اس حد کو چھو لے، اس سے بڑھ کر اس کو مل سکتا ہے؟ وہ اس اصول لڑکی کے قریب کھڑا ہر موجود کو لوگوں سے غافل ہو چکا تھا۔ دروازے پر ایک بار پھر جھٹک دی گئی تو وہ چونکا۔ دستک بہت زور سے نہیں دی گئی تھی لیکن رات کے سائے میں زوردار محسوس ہو رہی تھی۔

”پلیز آفتاب! میں آپ سے کہہ رہی ہوں نا کہ آپ کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔“ ہر اسان و خوف زدہ کشور نے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے سرگوشی میں اس سے التجائی مگر اس نے اپنی جگہ سے ہٹنے کے بجائے اپنے بازو پر موجود اس کے ہاتھ کو ہولے سے تھپکا اور دروازے کی طرف متحرک کرتے ہوئے قدر سے بلند آواز میں بولا۔

”پانچ منٹ انتظار کرو قریب! میں بی بی کو ساری صورت حال سمجھا دوں پھر تم لوگوں کو اندر بلاتا ہوں۔“ پریشان مت ہو، باہر کوئی دشمن نہیں بلکہ میرے دوست ہیں اور میرے بلائے ہوئے ہیں یہاں آئے ہیں۔“ ابھی ابھی نظروں سے اپنے طرف دیکھتی کشور کو اس نے کھلی دی اور اس کا ہاتھ تمام گرفت پر پھینکی اور کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

”ادھر چل کر پیچھے میں آپ کو سب کچھ سمجھا تا ہوں۔“ اس نے خاموشی سے یہ بات مان لی مگر اس کی سوالیہ نظریں مسلسل آفتاب کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”آپ یقیناً حیران ہو رہی ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟“ اس کی نظروں کا سوال بڑھتے ہوئے آفتاب نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ کسی بھی قسم کا رد عمل ظاہر کیے بغیر چند پہلوؤں کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد وہ جس کیفیت سے گزر رہی تھی، اس کے بعد دوسری عجیب و غریب صورت حال سمجھنے میں اسے کافی دشواری پیش آرہی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس پر کبھی قیامت گزری تھی، یہ تو وہ خود ہی جانتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ رانی کے سارے واسطے جج ثابت ہونے والے ہیں۔ وہ ڈر گئی تھی کہ شاید حویلی سے کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آ پہنچا ہے۔ اتنی جلدی اپنی محبت کے چھین جانے کے خوف نے اس کے وجود سے ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں اور وہ اب بھی تک اس خوف کے زبردست دھیرے

دھیرے کا نپ رہی تھی۔

”میں معافی مانگتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑی۔“ آفتاب نے اس کی حالت کو بھانپتے ہوئے معذرت کی۔

”خدا را! مجھے گناہ گار نہ کریں۔“ اسے آفتاب کا معافی مانگنا ہرگز بھی گوارا نہ ہوسکا اس لیے خود پر قابو پاتے ہوئے فوراً اپنی اسے ٹوکا۔

”اصل میں بات کچھ ایسی تھی کہ میں چاہتا تھا، فون پر کرنے کے بجائے رو بہ رو ہی کروں۔ آپ پر اعتماد تھا کہ آپ میری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گی اس لیے باقی کے اختیارات پہلے ہی کر لیے تھے بس ذرا سی غائب غلط ہو گئی۔“

آپ میرے اندازے کے برخلاف کچھ تاخیر سے یہاں پہنچیں ورنہ یہ صورت حال جتنی بھی نہیں آتی۔“ وہ تمہید باندھنے لگا لیکن اس تمہید سے کشور کے لیے اصل معاملے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

”آج آجی حویلی میں ہی موجود تھے اس لیے ہم بہت سی احتیاطی تدابیر اختیار کرتے کے بعد یہاں تک آنے کی راہ نکال سکے۔ احتیاط کی وجہ سے ہی دیر بھی زیادہ ہو گئی۔“ خود انہیں میں ہونے کے باوجود اس نے فوراً اپنے تاخیر سے آنے کی وضاحت پیش کی۔

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں تک آنے کے لیے کتنی دشواریوں سے گزرنا پڑا ہو گا اسی لیے ہمیشہ آپ کو روکتا رہا لیکن آج کی ملاقات کے حضوروری تھی اس لیے میں نے آپ کو خطرے میں ڈال بھی گوارا کر لیا۔“

”ایسی کیا بات ہے آفتاب! آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟“ اس بار وہ اپنے ہونٹوں پر سوال آنے سے نہ روک سکی۔ کچھ دیر اپنے والے خوف کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد وہ اس کے رویتے سے انہیں میں پڑ گئی تھی۔ جواباً آفتاب نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگا۔

”ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ دو چاہنے والوں کو ایک دوسرے کی طلب بھی ہوتی ہے۔ ہماری پہلی ملاقات میں جو کچھ ہوا وہ اسی محبت اور طلب کی کارستانی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ مجھے میری زندگی کے سب سے خوب صورت ملے تھے لیکن آپ سے جدا ہونے کے بعد ایک ایسا جج میرے سامنے آ کھڑا ہوا کہ میں اس مور کی طرح جو بے خودی میں پاپے ناچتے اپنے بد صورت بیروں کو دیکھ کر شرمندہ ہوا جا

ہے۔“ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا، اس کے لیے سمجھنا مشکل تھا۔ ذہن میں کئی اندیشے کھلانے لگے جس میں سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ کہیں آفتاب کی زندگی میں کوئی اور عورت تو نہیں۔ کوئی ایسی عورت جو اس کی ان جھپٹوں کی حق دہار ہو اور وہ اس کا حق کشور پر لانے کے بعد شرمندہ ہو رہا ہو۔

”محبت کے ساتھ طلب کا ہونا گناہ نہیں لیکن اس طلب کے ساتھ قانونی اور شرعی رشتے میں بندہ بے بضربہ جانا انٹا بڑا گناہ ہے کہ بھر محبت، محبت کہلانے کی حق دار نہیں رہتی۔“

ہوس کہلانے لگی ہے اور مجھے اپنی محبت کے دائم پر یہ داغ گوارا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محبت کے دامن پر گئے اس داغ کو دھونے کے لیے ہم کفر کے بندن میں بندہ جائیں۔ اگر آپ میری یہ بات ماننے کے لیے راضی ہیں تو میں ابھی غیب اور اپنے دوسرے دوستوں کو اندر بلوا لیتا ہوں ورنہ آپ کے لیے باہر کا راستہ کھلا ہے۔ میں آپ کو یہاں سے جانے سے روکوں گا نہیں مگر پھر بھی آپ کے بلائے پر آمون گامی نہیں۔“ اس کے اندیشوں سے بے نیاز اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے آخر میں دو ٹوک لہجے میں

اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ خود بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی نظروں میں کوئی سوال نہیں بلکہ بے انتہا حقیقت تھی۔ یہ حقیقت دھیرے دھیرے اس کو من کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔

”تھیک ہے آفتاب! آپ نے یہ بات کہہ کر مجھے کتنا معجز کر دیا ہے، میں آپ کو گناہیں سنکی۔ میری انجمن محبت میں اتنی بصیرت نہیں تھی کہ میں آپ سے یہ مطالبہ کر سکتی۔ اب آپ نے کہا ہے تو احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنی بڑی غلطی میں مبتلا تھی۔ محبت کرنے والے مرد و عورت کے درمیان اگر نکاح کے دو بول نہ ہوں تو وہ سب کچھ پانے کے بعد بھی ہمیشہ ججی خوشی سے محروم رہتے ہیں۔ آپ کا ٹھکر یہ کہ آپ نے مجھے یہ ججی خوشی عنایت کرنے کا سوچا۔“ زندگی ہوئی آواز میں اس نے آفتاب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”اوکے! آپ ٹھیک سے چادر اوڑھ کر بیٹھ جائیں۔ میں ان لوگوں کو اندر بلواتا ہوں۔“ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کشور کے بہتے ہوئے آنکھوں کو اپنی انگلی کی پوہوں پر چننے لے لیکن باہر کھڑے سبب اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔ باہر دو ٹوک نکاح پر حوالے کے منتظر کھڑے تھے اور جنت کا نکاح ہونا تھا، وہ ایک ہند کرے میں تھانہ اگر اکر اس میں مصروف تھے تو یہ ابھی خاموشی معیوب صورت حال تھی... چنانچہ کشور کا غم نہ پاتے ہی

فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر اس نے غیب، شہر سے آئے اپنے دوستوں اور نکاح خواہ کو اندر بلایا۔ نکاح خواہ کو کم تھا کہ نکاح کس صورت حال میں پڑھایا جاتا ہے۔ اسے اپنے والے آفتاب کے دوستوں نے پہلے ہی سوائے اس بات کے کہ ان کا گلوں کے مالک چورہری انکار عالم شاہ کی بیٹی ہے، سب کچھ بتا دیا تھا۔ لاہور کے رہائشی اس نکاح خواہ کو ڈوڑاں دور دراز گاؤں کے چورہری کے نام کا علم تھا اور نہ ہی دہلاہن کی اصلیت جاننے سے دھجی۔ وہ فقط اس رقم کی کشش میں یہاں آیا تھا جو اسے آفتاب کے دوستوں نے دی تھی اور جو نکاح کی عام فیس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھی۔ بعد میں کوئی مشکل پڑی تو اسے یہی کہنا تھا کہ مجھے کیا معلوم لڑکی کس گاؤں کی مرے والی ہے۔ میں تو لاہور میں رہتا ہوں اور میرے پاس لڑکا لڑکی جج گوانا خود چل کر نکاح کے لیے آتے تھے، ہوس نے یہ نیک کام کر دیا۔ کتنی کا بدلہ رو بڑا پراختہ کر رکھے کے بجائے اس نے میں لڑک تو فوں کی صورت میں وصول کر لیا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے، وہ کسی کو نہیں بتاتا۔

آفتاب نے کشور کی سہولت کے لیے دانی کو بھی اندر بلوایا تھا اور اب وہ خوف اور خوشی کی جلی کیفیت میں اپنی مالک کے نکاح میں شریک تھی۔ ایوب و قبول کے مراحل طے ہونے کے بعد نکاح خواہ نے نظر دیا کہ اس کی پھر قریب نے اپنے ساتھ لایا ہوا مٹھائی کا ڈیا کول کر سب کا منہ میٹھا کر دیا۔

”بھائی! ابھی تو ہم نے آپ لوگوں کی بجدی کو کھتے ہوئے اس مٹھائی پر گزارہ کر لیا ہے لیکن یہ بات کان کھول کر سن لیں کہ دیکھ کی دعوت آپ لوگوں پر ڈیو ہے اور وہ آپ نے ہمیں ضرور کھلائی ہے۔ وقت کی طرف سے ہمیں کوئی فکر نہیں۔ اگر آپ ہمیں اتنی لیٹ دعوت دیر کھائیں کہ اس دعوت میں ہمارا کوئی نتیجہ نہ پہنچے بھی حرکت کے لیے دنیا میں آ پہنچے تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ مٹھائی کھاتے ہوئے آفتاب کے ایک دوست نے شوخ لہجے میں براہ راست گھونگھٹ کی آڑ میں بھی کشور سے مطالبہ کیا تو اس کے ہونٹوں پر نجوب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسے آفتاب کے دوست کا خود کو بھائی کہہ کر مخاطب کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ نکاح کے دو بولوں نے اس کی اور آفتاب کی محبت کو قوی مضبوط بنایا کیا تھا بلکہ وہ رشتے بھی اس کی جھپٹوں میں لا ڈالے تھے جن کے بارے میں وہ بھی سوچ ہی نہیں تھی کہ اسے کبھی مل جائیں گے۔

”وقت کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اب آپ لوگوں کو یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“ آفتاب نے یہ سب بہت اچھا لگا رہا تھا مگر گزرتے وقت کا خیال کر کے اور خود پر جبر کرتا ہوا کشور سے ہلاتا وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور گھونگھٹ کے طور پر لی گئی چادر کو کتھ کے انداز میں پھرنے پر پریٹ کرنے لگی۔

”کتاب ہے چارہ دہلایا ہے۔ بنائے وہاں رخصت کروا کر اپنے ساتھ لے جانے کے اسے رخصت کرتے چارہ ہا ہے۔“ وہ لوگ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جب آفتاب کے دوست نے ایک آہ بھرتے ہوئے پیچھے سے یہ کہیں دے۔ وہ انہی ہی کرتا ہوا کشور کے ساتھ باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے کے بعد ان دونوں کے ہی قدم خود خود رک گئے جب رانی بے خیالی میں یا پھر شاید جان بوجھ کر انہیں تنہائی فرام کر کے کے خیال سے تانگنے کی طرف بڑھ گئی۔

”کہتے تو تھے ہی میں میرے دوست... واقعی میں کتنا بے چارہ ماں دہلایا ہوں جو اپنی دین کو روک بھی نہیں سکتا۔ نہ سرخ جوڑے میں ہے اس کے منہ کو سہرا سکتا ہوں۔ ویسے جی بتائیں، یہ سرخ جوڑا محض اتفاق تھا یا آپ کے دل کو جبر ہوئی تھی کہ آج کچھ خاص ہونے جا رہا ہے؟“ اس نے کشور کو پوچھا۔

”میرے لیے تو یہ بھی خاص بات تھی کہ آج پہلی بار آپ نے خود مجھے بلایا تھا۔ آج کی رات مجھے اتنا معتبر کرنے والی ہے، یہ معلوم ہوتا تو مجھے کتنا اہتمام کرتی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اہتمام اہتمام میں ہی سارا وقت گزر جاتا اور آپ نکاح خواں اور گھوٹاں کے ساتھ یہاں بیٹھے میرا راستہ ہی جھٹکتے رہ جاتے۔“ جذباتی لہجے میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے آخر میں وہ یک دم شوخ ہوئی تو آفتاب نے ہنس پڑا۔

”پہلیں آج نہ کہیں پھر بھی آپ کو یہ سوچ مل جائے گا۔ اب تو آپ جب بھی مجھ سے ملنے آئیں گی سزا آفتاب احمد کی حیثیت سے ہی آئیں گی، پھر دیکھیں گے کہ ہماری بیہوش صبر میں لبر کرنے کے لیے کون کون سی باتوں سے ملے ہو کر آئی ہیں۔“ پر دھیان رکھیے گا اب آپ کے جملہ حقوق ہمارے نام محفوظ ہو چکے ہیں۔ اب جو ملاقات ہوگی اس میں ہمارا کوئی اور اثر نہ رہے گا آپ کو ملے گا آپ کو۔“ اس نے دھیرے سے کشور کا ہاتھ دبا دیا۔ وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چیرا کر کھینچ کر ہٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ آگے کچھ فاصلے پر وہ ٹکا کھڑا تھا جس میں دیکھ کر اسے واپس جھونکی جاتا تھا۔ تانگنے کی طرف بڑھتے اس کے قدموں کے برخلاف اس کا

شریر دل ہلک ہلک کر پیچھے کی طرف لپک رہا تھا مگر مجبوری تھی کہ اس وقت وہ دلی کی بات ماننے کی پوزیشن میں نہیں آ سکتا تھا۔ آگے بڑھتی چلی گئی۔ تانگنے پر چڑھنے سے پہلے البتہ اس نے پیچھے مڑ کر ضرور دیکھا۔ آفتاب اپنی جگہ کھڑا ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ لہرا کر اسے الوداع کہا تو جواب میں اس کا ہاتھ بھی الوداعی انداز میں اٹھ گیا۔ البتہ یہ تو دونوں ہی جانتے تھے کہ الوداع کا استعارہ بننے یہ ہاتھ وصل کے لمحوں کے لیے کس شدت سے منتظر ہیں۔

☆ ☆ ☆

لکڑیوں کا چولہا جلا کر اس نے تو رکھا اور پرات میں گوندھے ہوئے آٹے کا پیڑا بنا کر روٹی بننے لگی۔ مشاہیرم خان کے گھر بیچنے کے بعد دوسرے دن سے ہی اس نے گھر کی ساری قسے داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس کی بوڑھی ماں نے جو ایک ایک کر کے روٹیوں کی ابتدا میں اسے روکنا چاہا پھر اس کی خند کے آگے بار مان لی۔ اب وہ گھر کے تقریباً سارے ہی کام کو کرتی تھی پھر بھی دن مشکل سے گزرتا تھا۔ ہزار افراد سے بھی کم آبادی پر مشتمل اس گاؤں میں زندگی بہت محدود تھی اور مشاہیرم خان کے گھر میں تو محدود ترین۔ اس کا بھائی اکرم خان اسے یہاں اپنی ماں کے پاس چھوڑنے کے بعد اسکو روہاں چلا گیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایک ایسی عورت کے ساتھ رہ کر جو اس کی بات بھی پوری طرح نہیں سمجھ پاتی، کس طرح وقت گزارے؟ اس گھر کے کام کاج میں کچھ وقت اچھا گزرتا تھا اور نہ سارا دن وہ ہوتی تھی اور نہ ہن پر سوار کوس اور پریشانیوں۔ سمجھنے سے بے ادراک کی موت کا غم رلاتا تو بھی اپنے مستقبل کا سوچ کر طبیعت خمیرا نہ لگتی۔ اس وقت بھی وہ انہی سوچوں میں کہ روٹی چکا رہی تھی۔ پہلی روٹی تو سے سے اڑی تو سیانہ مائل رحمت دیکھ کر طبیعت کچھ اور نکھر رہی ہو گئی۔

”گیا تو اس“ نامی گندم کے آٹے کی روٹیاں ایسی ہی کچن تھیں۔ ان روٹیوں کو کھاتے اور کھاتے ہوئے اسے وہ سنہری مائل روٹیاں یاد آ جاتیں جنہیں وہ ساری زندگی کھاتی رہی تھی اور جنہیں کھاتے ہوئے اسے بھی گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ ایک دن وہ اپنے شہر سے بہت دور کا بندے نامی اس ہستی میں بیٹھی ہوگی۔

سست روٹی سے دوسری روٹی میں کڑوے پر ڈالنے ہوئے اسے جیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھولا اور ایک مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ وہ یقیناً اکرم خان تھا جو اپنے گھر آیا تھا۔ اس کی آواز سن کر اس نے جلدی

جلدی ہاتھ چھلانے شروع کیے اور اس کے جھکے روٹیاں بھی کا ڈالیں۔ روٹی پکانے کے بعد وہ کھانے کے برتن وغیرہ لے کر اندر کمرے میں گئی۔ اکرم خان اپنی ماں کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔

”جیو ہمارا اکرم! ہم بیٹھ سوچتا تھا کہ ہمارا کوئی بہن ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ آج تم کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اللہ نے ہمارا تمنا پورا کر دیا۔“ کھانا لگاتا دیکھ کر وہ اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ اسے اس طرح خوش ہونا دیکھ کر وہ مسکراتے لگی۔

”تمہارے لیے شہر یا رصا جب نے کچھ سامان بھجوایا ہے۔ یہ ادھر رکھا ہے۔ کھانا کھاتے کے بعد تم دیکھ لینا اور ان کو کوئی خط لکھنا ہو تو وہ بھی بعد میں لکھ لینا۔ ابھی ہم ایک نیم کے ساتھ ہوئے تک جاتا ہے۔ وہ لوگ ادھر کر رہا تو ہم تھوڑی دیر کے لیے گھر آ گیا تھا۔ نیم کو ہوش میں چھوڑ کر واپس آئے گا، جب بھی تمہاری ریرد کر واپس اسکو روہاں جائے گا۔“ اس کی اطلاع پر ماہ بانو کی نظر ایک طرف رکھے گئے کے بڑے سے کارٹن پر پڑی۔ وہ کھانا کھانے کے بجائے فوراً اٹھ کر اس کارٹن کے قریب بیٹھی۔ اس پر چھٹی سفید رنگ کی چٹ پر علی حروف میں لکھا تھا۔ ”اکرم خان پورن۔ گاؤں کا بندے ڈاک خاں تھا کس“ تحصیل مشاہیرم۔ ضلع گمانچے۔ اکروہاں بلتستان۔ پاکستان۔“

”اس پر تو آپ کا نام کھانا ہے اکرم بھائی؟“

”وہ تو اس لیے لکھا ہے کہ ادھر سب ہم کو جانتا ہے۔ رصا جب نے ادھر کے ٹو موٹیل میں ہم کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ ماہ بانو فی کے لیے سامان بھجوا رہا ہوں۔ ویسے بھی وہ ہمیں کیوں بھجوائے گا؟ آپ کو ہی بھیجا ہے۔ یہ سب۔“

اکرم خان نے جتنے ہوئے اسے یقین دلایا تو اسے قائل ہونا پڑا۔ پھر اس شخص نے کہ اس کارٹن میں کیا ہے، اسے فوراً ہی کارٹن کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سامان کے اوپر ہی ایک سفید رنگ کا لفافہ رکھا تھا جس پر اس کا نام موجود تھا۔ اس نے۔۔۔

بیٹابی سے لفاق کھولا۔

”امید ہے کہ تم خیریت سے ہوگی۔ لاہور سے جلت میں روانہ ہونے کی وجہ سے تمہاری ضرورت کا سامان نہیں لیا جا سکا تھا۔ اسنے انداز سے کے مطابق کچھ چیزیں بھجوا رہا ہوں۔ اگر ان کے علاوہ بھی کچھ کی اور شے کی ضرورت ہو تو اکرم خان کو لکھ کر دے دینا۔ میں اس سے نون پر معلوم کروں گا۔“

بے حد مختصر پیغام پر مشتمل اس خط کے علاوہ لفافے میں کچھ رقم بھی موجود تھی۔ وہ لفافہ بند کر کے کارٹن میں موجود سامان کا

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔

انشاء اللہ اولاد دہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی برائیاں ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے ویسی طبی یونانی قدرتی جزی بوٹیں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خواہمورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے ہڈیوں کا دیکھ دی پی VP بے اولادی کورس منگو سکیں۔

المسلم دار الحکمت ریسرچ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی، آپ تک ہم پہنچائیں گے

جائزہ لینے لگی۔ گرم بلبومات اس کے گورس کی کتابیں، موسم سرما میں استعمال ہونے والے لوشنز کے علاوہ کچھ تحریر کی رسائل وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس نے بے حد خیال سے اس کی ضرورت کی تمام اشیاء بھیجی تھیں اور فی الحال اسے اس سامان میں کسی شے کی کمی نہیں ہو رہی تھی پھر بھی دل کچھ ادا اس سا ہو گیا۔ دل میں خواہش ہی چلی کہ کاش اس سارے سامان کے بجائے وہ خود اس کی خیریت معلوم کرنے یہاں تک آگیا ہوتا لیکن پھر وہ خود ہی اپنی اس خواہش پر اپنے آپ کو روک کر نہیں کرنے لگی کہ اسے یہ شہر یا عادل جیسے اون کی حیثیت والے شخص کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اس شخص کو ملو لڑکی سے ملنے اس دور دراز گاؤں تک آتا۔ اس نے اس نیت کے ساتھ اسے یہ سب چیزیں بھجوا دی تھیں تو یہ بھی اس کا بہت بڑا احسان تھا۔

”اماں کبہ رہی تھی کہ تم صبح سے روٹی نہیں کھاتے۔ ہم اس بارے میں گئے تو ساتھ میں دوسرا آنا لے کر آئے گا۔ یہ گلیاؤں کا روٹی کھانا واقعی بڑا مشکل ہوتا ہے، پر کیا کرے۔ جب سے ادھر سیلاب نے جاں بھیا ہے، بڑا مشکل پڑ گیا ہے۔ کتنا لوگ لے تو ادھر سے دور کینڈاس تھک میں جا کر اپنی آئے کر لیا ہے حالانکہ ادھر ان کو پانی کا بڑا پریشانی ہے۔ غیر ہم آگے تو اسکو دوسرے اچھا والا لگیم کا آگے لے کر آئے گا۔“ وہ اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی اس لیے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ کب اکرم کھانے سے فارغ ہوا اور اماں برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اکرم خان بولا تو وہ چونکی پھر شرمندہ ہی ہو کر بولی۔

”ایسی کوئی بات نہیں بھائی اکرم! بس ابھی عادت نہیں ہے اس لیے مشکل ہو رہی ہے۔ آج سے آہستہ عادت پڑ جائے گی۔ تم جتنا و مشاہیرم خان کا کیا حال ہے؟ اسی صاحب نے اس کی خیریت کے بارے میں کچھ بتایا ہے کہ نہیں۔“

”وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس کا نام ہمارے باپ نے مشاہیرم کی چوٹی سے واپس آنے کے بعد مشاہیرم خان رکھا تھا۔ ہمارا بھائی کسی پہاڑ کی طرح ہی مضبوط اور طاقتور ہے۔ چھوٹا سونا ڈھم اسے کچھ نہیں کہتا۔ وہ مرد کا بچہ ہے، ہر تکلیف برداری سے سہہ سکتا ہے۔ اگر اماں کی دی خصلتوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ شیر جوان گورا لوگ کے ساتھ بڑی بڑی چوٹیاں سر کرتے جاتا۔ میں بھی (ڈانکا پرست) تو اس کو بہت اچھا لگتا تھا، پر اماں نے ہم دونوں بھائیوں کو قسم دیا کہ ہم ادھر جانے کا سوچے گا بھی نہیں تو بس پھر وہ شیر چلا گیا۔ کہتا تھا کہ ادھر

رہوں گا تو پہاڑوں سے دور نہیں رہ سکوں گا اور اماں کی دی قسم توڑ دوں، یہ بھی گوارا نہیں۔“

”گھر اماں نے ایسی قسم دی ہی کیوں؟“ اکرم خان کی بات سن کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اماں اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ اصل میں ہمارا باپ ہماری پیدائش کے بعد دس عرصے بعد ہی ایک نیم کے ساتھ کلاہننگ کے لیے گیا تھا تو ادھر والا بچہ جس دب گرم گریبا۔ باپ پر اماں نے صبر کر لیا لیکن جب ہمارا سب سے بڑا بھائی اچھل خان برالہ دور پڑا تو اس کو گرمی تو اماں نے ہم دونوں سے وعدہ کیا کہ ہم خود کو ایسے خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ بس پھر مشاہیرم خان ادھر چلا گیا اور ہم ادھر رہتا ہے لیکن اسکو دس لے کر ہمیں ہوش تک کا ہی سہہ کرتا ہے۔ آگے پیادوں کا سفر نہیں کرتا۔ پیسا کم ملتا ہے، پر پروا نہیں... ماں تو خوش ہے۔“

اکرم خان نے اداں کے لیے میں بتایا اور پھر یک دم ہی غلٹ کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”اب ہم چلتا ہے، بہت دیر ہو گیا ہے۔ ادھر صاحب لوگ ناراض ہو رہا ہوگا کہ پورے گھر چلا گیا ہے۔“ اپنی بات کہنے کے بعد وہ در کے بغیر باہر نکل گیا۔ ماہ وقوع حقیقت سے ان لوگوں کے بارے میں سوچتی رہی جو پہاڑوں کے پاس تھے اور پہاڑ جیسا ہی طرف رکھتے تھے۔ اکرم خان نے ایک بار بھی تو اسے نہیں جتنا تھا کہ اس کا بھائی جسے ماں نے اس کی سلامتی کے خیال سے پہاڑوں کے سفر سے روک دیا تھا، اس کی خاطر شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔ بس اس نے یہاں آتے ہوئے اتنی گزارش کی تھی کہ ماں کو مشاہیرم خان کے رہی ہونے کے بارے میں نہ بتاتا۔ اس کے بعد جیسے وہ سب کچھ بھول گیا تھا اور کچھ بات چیت اور صرف اتنا کہ وہ اس کے گھر مہمان ہے جس کا اس نے ہر ممکن خیال رکھنا ہے۔ بھائی جدوجہد میں تھکی وہ کچھ اوروں کو کھانے کی مقررہ ہوئی اور جانے ابھی یہ سلسلہ کب تک جاری رہنا تھا۔



صبح صبح کا وقت تھا۔ کشور اپنے کمرے سے نکلی اور اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ حوٹلی کے کینٹون میں سے وہی تھی جو اکثر و بیشتر وہاں جاتی رہتی تھی۔ جانے کا مقصد اپنے سوٹیے بھائی چودھری بہنراؤ کی خیر عافیت سے آگاہ رہنا تھا۔ چودھری بہنراؤ کی مری ہوئی ماں نے اسے علم کی روشنی عطا کرنے کا بڑا احسان کیا تھا، وہ اس احسان کا بدلہ اس کے ایک نادر ملنے کی وفاق و تقابیر گیری کے ذریعے اتارنے کی کوشش کرتی تھی لیکن آج

بڑھیاں ملے کر کے اوپری منزل تک پہنچنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ اس لڑکی سے ملنا چاہتی تھی جو کل رات چودھری بہنراؤ کی دہن بن کر حوٹلی میں آئی تھی۔ حوٹلی کی خواتین کو یہ تو معلوم تھا کہ چودھری بہنراؤ کی شادی نور پور کے زمیندار چودھری بختیار کی بہن سے ہو رہی ہے لیکن یہ بات کسی کے لیے نہیں پڑی تھی کہ چودھری بختیار نے اپنی بہن کی شادی ایک ایسے نادر لڑکے سے کرنا چاہیے منظور کر لیا۔ تاہم اور تصویر نے خیال غماہ کیا تھا کہ ہونہ وہ لڑکی میں ضرور کوئی عیب تھا جب ہی یہ بیان ہو گا۔ وہی چودھراؤں کے خیال میں لڑکی خود بھی بچی ہی تھی۔ کشور کی ماں نے ہید کا خیال تھا کہ چودھری بختیار، چودھری افتخار کا مقروض تھا اور اس نے قرض معاف کر دینے کے لیے بہن کو بی چڑھا دیا۔ غرض ہر فرد نے ہی اپنے اپنے طور پر اس شادی کے بارے میں کوئی نہ کوئی خیال آرائی ضرور کی تھی۔ حقیقت کا کسی کو علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ برات کے ساتھ بھی حوٹلی کی کسی عورت کو نہیں لے جایا گیا تھا۔ چودھری گھر کے ساتھ اس کے چند خاص ملازمین، اس پاس کے دیہاتوں کے ایک دو زمیندار اور چودھری بہنراؤ کے ذاتی کاموں کے لیے مختص ملازمہ نے ہی برات میں شرکت کی تھی۔ اسی ملازمہ نے دہن کو رخصت کر کے لانے کے بعد اوپری منزل پر اس کے کمرے تک پہنچانے کا فرض بھی ادا کیا تھا۔ جب تک چودھری افتخار کی ایذا نہ تھی، کسی کی خیال نہیں تھی کہ خود سے چند سیڑھیاں کا قافلہ لڑکے کے اوپری منزل تک چلا جائے لیکن کشور کے تجسس نے اسے زیادہ مہر نہیں کرنے دیا اور وہ صبح ہی صبح چنگ اپنی سارے لوگ سوئے ہوئے تھے اور اپنی منزل پر جا پہنچی۔ اس وقت وہاں بھی سانا چھایا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے چودھری بہنراؤ کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے ہکا سادہ ڈال ڈال تو وہ کھلتا چا گیا۔ اس نے کھلے دروازے سے اندر بھاگ کر دیکھا تو اسے بہنراؤ نے پٹنگ پر گہری فینڈ میں ڈوبنا نظر آیا۔ بستر پر اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھالو بھی موجود تھا اور وہ اس بڑے سے بھالو کی گردن میں اپنی ہاتھیں ڈالے دیکھتا تھا۔ اسے خبر تھا۔ نیچے قالین پر اس کی ملازمہ خاص بھی گہری فینڈ میں تھی۔ کمرے میں دہن کا کوئی ہم نشین نہیں تھا اور نہ ہی ایسا کوئی اہتمام نظر آتا تھا جو کسی نئی نوبی دہن کے استقبال کا پتا دیتا۔ نہ کوئی سیاحت تھی اور نہ ہی بھول چوں کا وجود۔ وہ ابھی ہوئی سی وہاں سے ہٹ گئی۔ تو سوچا کھانسا تھا کہ دہن وہاں لائی ہی نہیں تھی۔ تجسس کی ماری وہ رات کے تک برات کے واپس لوٹنے کے انتظار میں جا گئی

رہی تھی اور اس نے خود اپنے کمرے کی کھڑکی سے بڑی سی چادر میں لپیٹی دہن کو حوٹلی میں اترتے دیکھا تھا لیکن وہ جس کی دہن بتا کر لائی تھی، اس کے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اب بھی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کسی اور کمرے میں ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آنے پر وہ تیزی سے دوسرے کمروں کے دروازے کھول کر جھانکے لگی۔ کمرے حسب معمول خالی تھے۔ اوپری منزل چودھری بہنراؤ کے سوا کسی کے استعمال میں نہیں رہتی تھی اور ان کمروں کے استعمال کی نوبت صرف اسی وقت آتی تھی جب حوٹلی میں بے تحاشا مہمان ہوتے تھے۔ عموماً ایسا سالانہ عرس کے موقع پر ہی ہوتا تھا۔

کشور ایک ایک کمرے کو دیکھتی چوتھے کمرے میں پہنچی تو اسے بستر پر ایک سرخ رنگ کی ٹھنڈی سی پڑی نظر آئی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سرخ عروسی جوڑے میں ملیں ایک لڑکی ہے جو کھٹے پیٹ سے لگائے ہوئے جس و حرکت پڑی ہوئی ہے۔ وہ جلدی سے اس لڑکی کے قریب پہنچی۔ قریب سے جائزہ لینے پر اسے اور بھی بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ بستر پر بڑے مٹلے ہوئے پھول، ٹوٹی ہوئی کالچ کی چوڑیاں اور مزید کچھ نشانیوں ایسی تھیں جو گزری رات کا افسانہ بناتی تھیں۔ اسے حیرت سی ہوئی کہ اپنے کمرے میں بھالو کی گردن میں ہاتھیں ڈال کر سونے والے اس بچے چودھری بہنراؤ نے یہ افسانہ کیسے رقم کیا ہوگا؟ حیرت میں ڈوبے ڈوبے ہی اس نے لڑکی کا چہرہ دیکھنے کے لیے اس کے چہرے پر ہڈیاں کا آئینہ سر کیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں حالانکہ وہ یوں ہے جس و حرکت پڑی ہوئی تھی کہ اسے لمحے بھر کو گمان گزرا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہے۔ اب جو آنکھوں کے حرکت کرتے ہوئے ڈیلے دیکھے تو یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ ہوش میں ہے۔

”میں کشور ہوں۔ چودھری بہنراؤ شاہ کی بہن۔“ اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے لڑکی کے چہرے پر موجود آنسوؤں کے نشانات کا بھی جائزہ لیا۔ لگتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں تک روٹی رہی ہے۔

”میرا تقاضا کھینچے آئی ہو؟“ اس کا تعارف سن کر وہ قہر آلود لہجے میں بولی تو پہلی بار کشور کی نظر اس کے نچلے ہونٹ پر مودود ڈھم پڑی۔ اسے شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس کے سامنے موجود لڑکی بے شک عروسی لباس میں تھی لیکن سہارن والی قرا سی بھی رقص اس کے وجود میں نہیں جھلک رہی تھی۔ وہ تو کوئی لڑکی ہی، برباد ہو جانے والی عورت نظر آ رہی تھی۔ اگر اسے آفتاب کی قربت کا تجربہ نہ ہوا

ہوتا تو وہ اپنی باریک بینی سے اس لڑکی کا جائزہ لے کر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی تھی۔ آفتاب کو پانے کے بعد اس نے جب بھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا اسے وہاں عجیب سی چمک نظر آتی تھی۔ لیکن یہ لڑکی تو ایسا لگتھا کہ قبر سے نکلا ہوا کوئی مرد ہو۔ شاید اس کا یہ حال اس لیے تھا کہ اسے رقیق حیات کے طور پر چودھری بہن ادا کا ساتھ ملا تھا اور یہی طور پر یہ ساتھ کسی بھی ہوئی مند لڑکی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے شدت سے لڑکی کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی اور اس کے سر ہانے بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اس کے بھرے ہوئے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ بہن! کسی طور تمہارے لائق نہیں تھا۔ ابائی کو تمہارے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”تمہیں کیا خبر کہ تمہارے باپ نے میرے ساتھ کیا کیا؟“

”یہاں تو چلنا پڑا ہے؟ اس ظلم کا بدلہ ایک دین اسے کیا اس کے پورے خاندان کو چکا کر دے گا۔“ نہایت غمی سے کہتے ہوئے اس نے کشور کا ہاتھ جھٹکا اور اپنی نگاہیں اٹھائیں۔

”معلوم صرف ابائی کا تو نہیں۔ تمہارے گھر والوں نے بھی تو جانتے ہو مجھے نہیں بہن! اسے یہاں ہے۔ تمہیں بد دعا دینی ہے تو نہیں بھی دو۔“ اسے اپنے خاندان کو بد دعا دینا بد لگا تھا اس لیے اسے ٹوک بیٹھی۔

”جانتے ہو مجھے نہیں، مجبور میں اپنی عزت بچانے کے لیے انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ میرے بھائی تو سخت ناپسند کرتے ہیں تمہارے ابائی کو۔ عام حالات میں تمہارے اس باگھ بھائی کے بچانے اگر ولایت سے ڈگری لانے والے بھائی کا پیغام بھی آتا تو میرے بھائی صاف انکار کر دیتے، پراپی تو وہ مجبور ہو گئے تھے۔“

”وہ کیسے؟“ کشور نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے نصیب کی خرابی ان کی مجبوری بن گئی۔“ اس نے اداسی سے جواب دیا۔

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ تم اس طرح پہیلیاں بھجوانے کے بجائے ذرا مکمل کر تفصیل سے سب کچھ نہیں بتا سکتیں؟“ وہ تھوڑا سا جھنجھائی۔

”پر میں تمہیں کچھ بتاؤں ہی کیوں؟ تم کون لگتی ہو میری؟“ وہ تجھے سے اکڑنے لگی۔

”کننے لگا تو چھوڑو۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک دوسرے کی سہیلیاں بن سکتے ہیں۔ مجھ میں بھی تمہاری طرح اس جرمی میں تمہا ہوں اور تمہاری طرح میرے بھی بہت سے

پھر تمہا بھی لگا کیں گے۔ بھائی و چارے اس دھمکی کو سن کر ڈر گئے۔ مجھے بھانا تو ان کے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا، سو انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنی پگ بچائیں۔ میں نے بھی ان کی خاطر جھنجھار ڈال دیے ورنہ سچ ہے کہ تمہارے ابائی کا کوئی فیصلہ ماننا تو دور کی بات ہے، میں تو اس شخص پر تو کتنا بھی پسند نہیں کرتی۔“ اس کے لہجے میں شدید نفرت تھی اور کشور کے خیال میں وہ اس نفرت کے لیے حق بجانب بھی تھی۔ جس سے اس کی محبت جھین کر اس کا وجود کسی ایب نابل انسان کے حوالے کر دیا گیا ہو، اس لڑکی کے پاس خود سے زیادتی کرنے والے کے لیے نفرت کے سوا اور بھی کیا سکتا تھا۔

”میں شرمندہ ہوں فریہ کہ میرے ابائی نے تمہارے ساتھ اتنا برا دھوکا کیا لیکن میں شرمندہ ہونے کے سوا اور کبھی کسکتی ہوں؟ میں تو خورد و ادویں اور پابندیوں میں جکڑی ایک کمزور لڑکی ہوں جسے خود ہر مل کسی ایسے روزی کی تلاش رہتی ہے جہاں سے کچھ تازہ ہوا اور روشنی اندر آ سکے۔“

”میں جانتی ہوں، جب ہی تو تمہیں تمہارے باپ کا وہ روپ نہیں دکھایا جسے دیکھنے کے بعد تم شرم سے زندہ زمین میں دفن ہو جانے کی خواہش کرنے لگو گی۔“ اپنی بات کے جواب میں کچھ غمی فریہ کی بات نے اسے بری طرح چوڑا کر دیا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے دو۔ میں تمہا کرتی ہوں۔ تم اپنی دیر میں میرے لیے ناشتے پانی کا کوئی انتظام کرواؤ۔ ملازمہ سے کہنا کہ اسے رات کو آئیں، بند کر کے رکھنے کا حکم ہے۔ اب دن میں تو آئیں کھول لے اور کچھ ہاتھ پر چلائے۔“ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی اور انداز بھی بکسر بدلا ہوا تھا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے ایک لڑکی ہی عورت دکھائی دیتی تھی، اب کوئی چوٹ کھاتی ہوئی ناخن لگ رہی تھی جس کا سن نہیں چلا کر کسی طرح خود کو چوٹ لگانے والے سے انتقام لے۔ اس سے یہ سب کہہ کر وہ مشکل خانے میں کھس گئی لیکن کشور کچھ بھی نہ سمجھنے والے انداز میں اس ابھی پہیلی کے حل کے لیے وہیں بیٹھی، کوئی سرا ہو جاتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

وہی کہ تقریب میں شریک شہر یا مختلف لوگوں سے ملاقات کرتے ہوئے ارگرد کو کچھ جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ تقریب میں بہت زیادہ لوگ شریک نہیں تھے۔ صرف مقامی افسران، زمینداروں اور رشتہ داروں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ ایسا تقیفاً وقت کی قلت اور دولہا کی ذاتی معذوری کی وجہ سے

ہوا تھا ورنہ چودھری افتخار جیسا بندہ تو سوتے کی تلاش میں رہتا تھا کہ کس طرح انہم شخصیات سے تعلقات اور رسم و رواج کا سہاگہ مگر آج کی اس تقریب کا رنگ بیکہ تھا۔ یہاں تک کہ دلہن کا بھائی چودھری بختیار بھی دعوت میں شریک نہیں تھا۔ اسے موقع نہیں مل سکا تھا کہ چودھری بختیار سے ملاقات کے لیے جاتا اور اسے جو شادی کے بارے میں استفسار کرتا۔ خود چودھری بختیار کی طرف سے بھی شادی کا دعوت نامہ نہیں ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہی کہ تقریب میں ملاقات ہوگی تو وہ چودھری سے اس ظلم کی بابت دریافت کرے گا لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ چودھری بختیار نے اپنی معذوری اور بیماری کا عندر پیش کر کے تقریب میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔

شہر پار کے گرد سے لوگوں کا ہجوم چھٹا تو اس کی نظر آفتاب پر پڑی۔ وہ بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ ایک ملازم سے کہہ کر اس نے اسے اپنی پہیلی پر بلوایا۔

”کیا حال ہے آفتاب؟“ مجھے امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہو سکے گی۔“ آفتاب کے قریب آنے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے اس سے کہا۔

”ہی ہاں، امید تو مجھے بھی نہیں تھی کہ حویلی کی کسی تقریب میں مجھے مدعو کیا جائے گا لیکن شاید دوسروں، سفیروں کی کمی کی وجہ سے ہماری تنگدستی نکل آئی۔“ اس نے بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

”دوسریوں، سفیروں کو بلا کر چودھری افتخار کو اپنے لیے مصیبت بلوائی تھی؟“ وہ سہمہ آتے تو ساتھ میز یاد لے بھی آتے اور یہ بات خوب اچھلتی کہ چودھری صاحب نے اپنے ذاتی معذور بننے کا ناکام ایک چھوٹے زمیندار کی محنت مند لڑکی سے کیا ہے۔ وہ لوگ اصل اسٹوری بھی کھونے کی کوشش کرتے کہ یہ نکاح ہو کیسے؟ ویسے میرے خیال میں تمہیں تو علم ہو گا اس اسٹوری کا؟“ اس نے بڑے یقین سے آفتاب سے سوال کیا تو وہ انکار نہیں کر سکا اور کشور کی زبانی علم میں آنے والی تمام معلومات فراہم کر دیں۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ چودھری بختیار عرصے سے چودھری افتخار کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر اس بے چارے کی مجبوری سے فائدہ اٹھالیا۔“ ساری تفصیل سن کر اس نے دانت کچکا تھے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ اس وقت وہ آفتاب بختیار پر تنہا تھے اور کشور بھی دھیمی آواز میں ہورہی تھی اس لیے کسی اور کے کچھ سن لینے کا احتمال نہیں تھا۔

”چودھری کی شقی اٹھنی کوئی ذہنی چھٹی بات تو نہیں

سرا ہم لوگ تو خود اس کی اس فطرت کا مظاہرہ دیکھ چکے ہیں۔ آفتاب دھبے لہجے میں بولا۔ اسی وقت ملازمین نے کھانا لگا کر شروع کر دیا۔ ان کی میز پر کھانا لگ چکا تو چودھری خود ایک کمران کی طرف آیا۔

”بسم اللہ کیجیے اے سی صاحب! آج اس خوشی کے موقع پر ہر گھنٹہ بالکل بھی نہیں چلے گا۔ آفتاب کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے شہر یار سے کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یکسیکوزی امیر سے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں۔“ آفتاب خود ہی معذرت کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے چودھری کی ناگواری پر بجانب کسی کمرے سے ایک معمولی اسکول بچہ کا اس جگہ بیٹھنا اچھا سمجھا لگا تھا۔

”شروع کیجیے جناب امیں دو چار تھے آپ کے ساتھ لینے کے بعد باقی مہمانوں کا ساتھ دینے ان کے درمیان جا کر بیٹھوں گا۔ میری ذاتی خواہش تو یہی تھی کہ آپ سب معززین ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا تناول کرتے لیکن باجوہ صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ آپ ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کریں گے۔ ایس بی صاحب سے بھی آپ کے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار ہیں اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ حضرات کو ایک میز پر جمع ہونے کی زحمت نہ دی جائے۔ ناگواری کے ساتھ بھلا کیا خاک کچھ کھایا جاتا ہے۔“ اسے

کھانے کی ترغیب دیتے ہوئے چودھری نے خود بھی اپنے لیے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا مسالان نکال لیا۔ شہر یار نے البتہ چاول لیتا پسند کیا۔ پچھلے تھے چاول بھی وہ بمشکل ہی کھا سکا۔ ایک تو چودھری کی کمانی میں حرام کی آمیزش کا خیال، دوسرے

پر احساس کہ ایک معمول لڑکی کے ارمانوں کی راہ پر خوشی کی پمپھل برپا کی گئی ہے، اسے بری طرح چٹوے لگا رہا تھا۔ لیکن اندر زنا خانے میں کسی لیکن دولہا کے طور پر ادھر ادھر پھرتے چودھری، ہنر واد کو دیکھ کر تو اندازہ لگا دیا ہی جا سکتا تھا کہ اس شادی سے اس بے چاری پر کیا بڑی ہوتی۔

”آپ نے تو کچھ کھا پایا نہیں۔ ذرا سا کچھ کھائیے تاکہ کچھ اور بھی لیجیے۔“ اسے ہاتھ پیچھے دیکھ کر چودھری نے پمپھل پر موجود افواہ و اقسام کی ڈسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اصرار کیا۔

”بس چودھری صاحب! مجھے جو کچھ نہیں ہے۔“ ”اچھا تو یہ ذرا سا میٹھا ہی کچھ لیں۔“ اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چودھری نے زبردستی اس کی پلیٹ

میں کھیر ڈال دی۔ ناچار اسے دو تین گچے کھیر کھانی پڑی۔ ”مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ کا اس طرح سو گھٹے کے انداز میں کھانا کھانا۔ بہر حال، میں آپ سے تو بردہتی بھی نہیں کر سکتا۔ آپ پیچھیے، میں ذرا دوسرے مہمانوں کو بھی دیکھ لوں۔“ چودھری وہاں سے اٹھ کر اس دوسری میز پر چلا گیا جہاں باجوہ اور تارڑ کے علاوہ کچھ دوسرے مقامی افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ملازم شہر یار کی میز پر سے کھانے کے برتن پیچھے لگا۔ ابھی برتن مکمل طور پر پیچھے بھی نہیں گئے تھے کہ اسے پیٹ میں ہلکی سی تکلیف محسوس ہوئی۔

”لگتا ہے چودھری کا حرام ہال مجھے ہضم نہیں ہوا۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فانیشتی پوری ہو گئی تھی اور اب مزید یہاں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر چودھری دیگر مہمانوں کو چھوڑ کر ایک کمرے کی طرف آیا۔

”ارے یہ کیا اے سی صاحب! آپ اتنی جلدی جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہمارا ارادہ تو آج کی رات آپ کو یہیں روکنے کا تھا۔ دوستوں کی تفریح کے لیے کچھ خاص انتظام کیا تھا ہم نے۔ آپ ہماری درخواست پر رگ جائیں تو بڑے لطف اندوز ہوں گے۔“ ایک آنکھ دہاتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں اسے ترغیب دی۔

”میری طرف سے معذرت چودھری صاحب! میرا ایسی کسی تفریح کا موزون نہیں اور طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ چپٹ میں اٹھنے والی درو کی شدید لہر کو برداشت کرتے ہوئے اس نے انکار کیا۔

”مگر آپ کی مرضی نہیں تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ آئیے میں آپ کو آپ کی گاڑی تک چھوڑ دوں۔“ اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے چودھری نے پیش کش کی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے لیکن شہر یار محسوس کر رہا تھا کہ ہر اچھے قدم کے ساتھ اس کی تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اب تکلیف کے ساتھ ساتھ شدید چکر اور تلی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے قدم بڑھانے سے گئے۔

”آپ کی طبیعت تو زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔ ایسا کریں آج رات یہیں مونی میں آرام کریں۔ میں ڈاکٹر کو بھیس بلوا لیتا ہوں۔ آرام آجائے تو کل صبح واپس چلے جائے گا۔“ اس کی حالت دیکھتے ہوئے چودھری نے چٹا ٹشمن کی۔

”نہیں، میں واپس ہاؤس گا۔“ تکلیف کے باوجود اپنی بات پر اڑا ہوا تھا لیکن پھر تردد وار بالائی آئی اور اسے

تے ہو گئی۔ چودھری فوراً ہی اپنے ملازمین کو آواز دینے لگا۔ ملازمین اس کی آواز سن کر دوڑے چلے آئے۔ مہمان بھی متوجہ ہو گئے۔ متوجہ ہونے والوں میں آفتاب بھی شامل تھا۔

”اے سی صاحب کو اندر لے چلو اور اسپتال سے ڈاکٹر کو لے کر آؤ۔“ چودھری نے ہدایات جاری کیں جن پر فوراً عمل درآمد کیا جانے لگا۔ شہر یار پرانی قہر طاری ہو چکی تھی کہ وہ اپنی کوئی رائے دینے کے قابل نہیں رہا تھا اور کسی اور میں اتنی عزت نہیں تھی کہ چودھری کی رائے کے سامنے اپنی رائے دے سکتا۔ یوں بھی صورت حال کے مطابق اس نے جو احکامات جاری کیے تھے، وہ مناسب ہی معلوم ہوتے تھے۔

آفتاب البتہ تشویش میں مبتلا تھا کہ اگرچہ شہر یار کی اتنی زیادہ طبیعت کیسے خراب ہو گئی۔ کھانے سے قبل تو وہ اس کے ساتھ بالکل ٹھیک ٹھاک بیٹھا تھا کہ شہر یار کھانا کھانے کے بعد ڈی وریل بعد ہی اس کی یہ حالت ہو جاتا ہے شگ میں مبتلا کر رہا تھا کہ کہیں کھانے میں تو کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ لیکن اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کھانے میں چودھری خود بھی شہر یار کے ساتھ شریک تھا۔ اگر کھانے میں کچھ ملا ہوا تھا تو اس پر بھی اثر ہونا چاہیے تھا جبکہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ ملازمین شہر یار کو اندر لے گئے۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اس قدر دہ حال ہو چکا ہے کہ تقریباً نیم بے ہوش کی حالت میں ہے۔

”آپ یہیں رو کو ماسٹر صاحب! امر کار کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ لے دیا جائے۔“ بھیر بھڑ سے سریش کو پریشانی ہو گئی۔ آفتاب جو بے اختیار ہی شہر یار کو اندر لے جانے والوں کے پیچھے لگا تھا، اسے ایک ملازم نے روک کر یہ حکم نامہ سنایا۔ اس حکم کو سن کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ چودھری کی اجازت کے بغیر زبردستی اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ دینے بھی بات ایک طرح سے معقول ہی تھی۔ سریش کے کمرہ موجود تھوڑا دروازہ کا جھوم بسا اوقات اس کے لیے باعث تسلی بننے کے بجائے زحمت بن جاتا ہے۔ وہ پریشان ماسٹروں ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ چودھری کے بندے خود ہی طور پر کمرہ صحت سے ڈاکٹر کو لے کر آ گئے۔ یہ ایک لیدی ڈاکٹر تھی جو دروازہ میں ہی جھڑپا دیتی تھی۔ لیدی ڈاکٹر کے پیچھے چودھری کا ایک ملازم ہوا ماسٹر بیکل پاس اٹھا لے ہوئے چل رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے جانے سے آفتاب کو کچھ تسلی ہوئی اور وہ لوگوں کے درمیان سے نکل کر باہر نکلے جسے بھی پہنچ گیا۔ یہاں آنے والے مہمانوں کی گھڑیاں پارک تھیں۔ ان گاڑیوں میں شہر یار کی گاڑی شناخت کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں

آئی۔ وہ ٹھٹھا ہوا اس گاڑی تک چلا گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مشاہیرم خان کے بجائے کوئی اور ڈرائیور موجود تھا جو سیٹ کی پشت سے سر نکالے مڑے سے سو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے کھلے شیشے سے آفتاب اندر ڈال کر ڈرائیور کا شانہ بلایا۔ وہ ہنر بڑا کرینڈ سے جا لگا۔

”مہمارے صاحب کی طبیعت خراب ہے اور تم یہاں مڑے سے سو رہے ہو۔ ڈرائیور کے آنکھ کھولنے پر اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

”کیا ہوا صاحب کو؟“ وہ پریشانی کے عالم میں گاڑی سے اترتا۔

”معلوم نہیں۔ بس کھانا کھا کر باہر نکل رہے تھے کہ اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی۔“ چودھری صاحب انہیں اپنے بندوں کے ذریعے اندر لے گئے ہیں۔ اسپتال سے ڈاکٹر کو بھی بلوایا ہے۔ ڈاکٹر بھی اندر ہی ہے۔ آگے مجھے نہیں معلوم کہ کیا حال ہے؟“ اس نے بتایا۔

”میرے خیال میں میں ہی اسے صاحب کو اس بات کی اطلاع دینی چاہیے۔“ ڈرائیور پریشانی سے بولا تو آفتاب کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ پریشانی میں اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ عبدالمنان کو فون کر دے۔ وہی ایک ایسا شخص تھا جو شہر یار کا کچا بھائی خواہ بھی تھا اور جسے روکنا چودھری کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اپنا موبائل نکال کر عبدالمنان کا نمبر ڈائل کر کے لگا۔ دوسری طرف میں چار ہی گئی لیکن کوئی کال ریسپو نہیں کر رہا تھا۔

”بی اے صاحب کال ریسپو نہیں کر رہے ہیں۔“ اس نے ڈرائیور کو بتایا۔

”آج ان کی شادی ہے، وہ ادھر جمعے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے شادی کے بنگلے میں انہیں فون پہنچے گا تا ہی نہ چلا ہو۔ آپ دوبارہ کوشش کر کے دیکھیں۔“ ڈرائیور نے اسے معلومات فراہم کرتے ہوئے مشورہ دیا تو وہ ٹھٹھکی انداز میں سر کوشش و بچے ہوئے ایک باہر کوشش کرتے لگا۔ ڈرائیور کی قراہم کردہ اطلاع نے شہر یار کی یہاں اس کے موجد کو پر بھی روشنی ڈال دی تھی، ورنہ موبائو عبدالمنان اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

دوسری بار کوشش کرنے پر بھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ آفتاب نے کچھ مایوس ہوتے ہوئے موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔ موبائل جیب میں رکھتے ہی پتہ چلا۔ اس نے نکال کر دیکھا تو امر کرین عبدالمنان کا نام ہلکا رہا تھا۔ اس نے کال ریسپو کر لی۔



تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

آپ کیلئے کون سا سال 'میدان' بن سکتا ہے؟ محبت، دولت اور دیگر معاملات میں کب کامیابی ملے گی؟

معروف ملیر فلکیات سید محمد علی قادری سے راہنمائی حاصل کریں۔

اس کے علاوہ قادری صاحب آپ کے دیوانی مسائل کا حل قرآنی آیات اور اسماء الحسنی سے پیش کرتے ہیں۔

”چلیں، اگر آئے بغیر آپ کی تسلی نہیں ہو سکتی تو پھر تشریف لے آئیں۔ ہم تو جاگ ہی رہے ہیں۔ آپ کے استقبال کے لیے بھی تیار ہیں گے۔“ عبداللہ نے یقیناً اس کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا جب ہی اس نے مایوسانہ انداز میں اسے یہ جواب دینے کے بعد فون بند کر دیا۔ اسی وقت اس کی نظر آفتاب پر پڑی۔

”اوسے باسٹر! تو ابھی تک یہیں ہے؟ کیا بات ہے، کیا روٹی شونی نہیں ملی تھی اب تک؟“

”میں اسے ہی صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رکھا ہوا ہوں۔“ چودھری کے تو ذہن آئینے کے پر خود پرکرا

غیر ملکہ تھے ہوئے اس نے اسے جواب دیا۔

”یہ بولنا کہ تھے تھے چچہ کی مری کا اچھا موقع ملا ہے۔ ابھی تیرا کوئی اور مطلب اٹکا ہوا ہوگا اسی سے؟“ جب ہی ادھر پرکرا رہا ہے۔ ”چودھری نے ایک اور طنز کیا۔

”میرا کیا مطلب اٹکا ہے ان سے؟ چودھری صاحب! میں تیرا سرکاری افسر ہوں اور نہ ہی کوئی جاگیر دار۔ علاقے کے پھولے موئے مسائل کے حل کے لیے ضرور کوشش کرتا ہوں۔“ پرکرا ہلکا ہلکا ہے اسے اسی صاحب خود ہی بہت اچھے آدمی تھے۔ کسی کے توجہ دلائے بغیر بھی بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اللہ انہیں حامدوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

افتاء اللہ آتے والے وقت میں بہت کچھ بدل کر دے جانے لگا۔ ”آفتاب بے باکی سے چودھری کو یہ جواب دے کر لے لے ڈگ بھرتا ہوا چرونی راستے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں مزید کرنا سو مند نہیں تھا۔ شہر بانگ وہ لوگ اسے جانے نہیں دیتے اور یہاں رکھنے سے فضول میں مزید کوئی بد مزگی ہو جاتی تو یہ کسی بھی اعتبار سے اچھا نہیں ہوتا۔

”ہالے! ڈاکٹر نے کو چاکر بول کہ تھوڑی دیر بعد اسے کاپی اسے ادھر آ رہا ہے۔ وہ چنگی طرح سب دیکھ بھال لے۔“ باہر نکلتے نکلتے اس کے کانوں میں چودھری کی آواز

پڑی۔ اپنے کارندے کو یہ عامی دبا دیت دیتے ہوئے اس کے لیے میں جوتیش تھا، وہ یقیناً آفتاب کی باتوں کے دھڑل میں پیدا ہوا تھا۔ چودھری کے اس طیش پر وہ سکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل فیش تو اسے محل کا اخبار پڑھ کر آئے گا۔ مقامی اخبارات اگر اس کے ایسے غافل بننے کی شادی پر خاموش تھے تو کیا ہوا؟ کل لاہور کے اخبارات میں تو یہ خبر آئی ہی آئی تھی۔

☆☆☆

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ اس کے اشارے

”خیریت آفتاب صاحب! آپ اس وقت کیسے کال کر رہے تھے؟ میں اصل میں اپنی سسران لاکھ شادی میں آیا ہوا ہوں۔ یہاں رخصتی کا سلسلہ چل رہا تھا اس لیے ہجے میں مجھے آپ کی کال ریسپونڈ کرنے کی صحت نہیں مل سکی۔ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ وہ بہت شائستہ لہجے میں اس سے دریافت کر رہا تھا، جواباً اس نے شہر یار کی طبیعت کے بارے میں اسے آگاہ کر دیا۔

”بہت اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے اطلاع دے دی۔ اب میں خود اس معاملے کو ہینڈل کر لوں گا۔“ ساری بات سن کر عبداللہ نے کہا تو اس کے لہجے میں پریشانی جھلک رہی تھی لیکن بہر حال وہ تجزیہ کار آدمی تھا جو ہر طرح کی صورت حال سے نمٹتا جانتا تھا۔ آفتاب اس سے بات کرنے کے بعد قدرے مطمئن ہو گیا اور واپس اندر بیڈ روم میں چلا گیا۔

مہمانوں کی اکثریت رخصت ہو چکی تھی۔ صرف ایشیائی معتمد بڑے اور چند ایک دوسرے افریقی نظر آ رہے تھے۔ ان افریقیوں کی طور پر شہر یار سے دیکھی تو نہیں تھی لیکن وہ اپنے ضلع کے اسے ہی کو یہ باور کروانے کے لیے کہ انہیں اس کی بہت فکر ہے، ابھی تک یہاں دے ہوئے تھے۔

”بہن! فکر نہ کرو، ابھی اسے ابھی یہاں بڑے آرام نال ہیں۔ ڈاکٹر نے بے چینی طرح ان کو دیکھ لیا ہے، کبہ رہی تھی فوڈ پوائزننگ ہوئی ہے۔ اس نے کچھ انکسٹن وغیرہ لگا یا ہے۔ اب اسے ہی صاحب کی حالت سنبھال رہی ہے۔ وہ آرام سے سو رہے ہیں۔ پھر بھی میں نے ڈاکٹر کی کوراء

تین روک لیا ہے۔ وہ رات بھر سنبھال رہے ہیں اسے ہی صاحب کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ صبح فجر میں انہیں واپس بھجوانے کا بندوبست کر دوں گا۔“ آفتاب ان بڑے لوگوں کی سنبھال سے کچھ قائل ہو رہا تھا جب اس نے چودھری اخبار کی آواز سنی۔ یقیناً اس کے موہاں پر عبداللہ کی کال آئی ہوئی تھی جسے وہ یہ

تسلیم دے رہا تھا۔

”آپ آتا چاہتے ہیں تو شوق سے آئیں۔ میں تو صرف اس لیے منع کر رہا تھا کہ کہاں رات کے وقت اتنا لمبا سفر کر کے بے آرام ہوں گے۔ ہم یہاں شہر یار صاحب کا خیال رکھ رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ صرف ضلع کے اسے ہی کا معاملہ تھوڑی ہے، ہمیں تو رانا صاحب کو بھی جواب دینے کی فکر ہے۔ ان کا بھائی ہمارا مہمان بن کر کسی تکلیف میں مبتلا ہو، ہمارے لیے یہ کوئی ایسی گل تو نہیں ہے نا۔“ وہ اپنی مخصوص حرب زبانی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ عبداللہ ایسا تھا جیسے

عبداللہ ان کو یہاں آنے سے روکنا چاہتا ہو۔

ہذا شاہ صاحب! میں نے بڑی بھوری میں آپ کو ان کیا تھا

میرا شوہر میرا بالکل خیال نہیں رکھتا تھا نہ ہی اسے اپنے بچوں کا خیال تھا نہ ہی مجھے خرچہ دیتا تھا، ماگوں تو مارنا تھا میں سلامتی کر کے بچوں کو یونین پر جا کر گھر چلا رہی تھی پھر آپ کا کسی نے بتایا تو آپ نے کسی عورت کا پتہ بتایا تھا پھر آپ نے مجھے چاندی کا نقش اور مبارک پتھر دیا، میں نے تقریباً دو ماہ

وظیفہ پڑھا مگر کچھ نہیں ہوا، میں بہت مایوس ہو گئی تھی مگر آپ نے کہا مگر نہ کرو وظیفہ 31 دن اور پڑھو جب دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو ان کے رویے میں کچھ تبدیلی نظر آئی اور پھر تو آہستہ آہستہ وہ بالکل ٹھیک ہو گئے، مجھے سلامتی کرنے سے بھی منع کر دیا، خود سارے گھر کا خرچہ اٹھاتے چلنا برا خیال بھی بہت رکھنے لگے ہیں بچوں سے بھی بہت شفقت سے پیش آتے ہیں قادری صاحب آپ کے لیے ہر وقت میرے دل سے دعا میں نکلتی ہیں آپ نے میرا گھر اجڑنے سے بچایا اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا، نقش کا کیا کرنا ہے؟ (تسمیم کوڑا ہور)۔

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایا وظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایا وظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایاوظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایاوظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایاوظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایاوظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایاوظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایاوظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی، مگر تو آپ کا اللہ نے بچایاوظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دوا کو دلوں گل کرانے کے ادا کر لیجئے گا اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمن)

● شادی کب ہوگی اپنوں یا غیر میں؟ (تانیلا ہور)

● شادی کا امکان اگلے سال میں تک نظر آ رہا ہے، انہوں میں زیادہ امکان ہے۔

● میں نے بی بی۔ اسے کے پیچھے دینے میں بہت توجہ بہت کی ہے کامیاب ہو جائوں گی؟ (تورین اختر! پیٹ آباد)

● کامیابی کے امکان نظر آ رہے ہیں۔

● قادری صاحب! میرا مسئلہ یہ تھا کہ میری منگنی زبردستی ایک ایسے لڑکے کے ساتھ کر دی گئی تھی جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا قریب تھا کہ میں خودکشی کر لیتی کہ میری ایک دوست نے مجھے آپ کا بتایا آپ سے فون پر بات کر کے میرے دل کو بہت تسلی ہوئی آپ نے ایک لوح مبارک اور سعد پتھر منگوانے کا کہا، میں نے یہ سب چیزیں منگوائیں اور وظیفہ شروع کیا، ایک ماہ بعد ہی وہ لڑکا جس سے میری منگنی ہوئی تھی اس نے خود ہی مجھ سے شادی کرنے کے لیے انکار کر دیا عام

حالات میں تو یہ بہت برا ہوتا لیکن میرے لیے یہ بہت بڑی خوشی کی بات تھی ہر وقت آپ کے لیے دعا کرتی ہوں وظیفہ ابھی جاری رکھنا ہے؟ (تسمیم کوڑا ہور)

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، لوح کو ٹھنڈا کر دوا دیں اور دو نقل کرانے کے ادا کریں، نماز کی پابندی رکھیں۔

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، لوح کو ٹھنڈا کر دوا دیں اور دو نقل کرانے کے ادا کریں، نماز کی پابندی رکھیں۔

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، لوح کو ٹھنڈا کر دوا دیں اور دو نقل کرانے کے ادا کریں، نماز کی پابندی رکھیں۔

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، لوح کو ٹھنڈا کر دوا دیں اور دو نقل کرانے کے ادا کریں، نماز کی پابندی رکھیں۔

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، لوح کو ٹھنڈا کر دوا دیں اور دو نقل کرانے کے ادا کریں، نماز کی پابندی رکھیں۔

● بی بی! اللہ کا شکر ادا کریں، لوح کو ٹھنڈا کر دوا دیں اور دو نقل کرانے کے ادا کریں، نماز کی پابندی رکھیں۔

نوٹ: منسلک وقت ایسا نام اپنی والدہ کا نام تاریخ پیدائش اور وقت پیدائش ضرور لکھیں۔ برادر راست جواب کے لیے جوابی تلفاز ساتھ بھیجیں۔

دبا طے کے لیے:

A-911، سیکٹر B-11، تارکھ کراچی، نزد ٹیلی فون ایکسچینج، کراچی۔ موبائل: 0333-2105914
E-mail: mashal_e_raah@yahoo.com / mashal_e_raah1@hotmail.com

پرائیکہ کر رہی تھیں ہونے آفتاب نے دریافت کیا۔
 ”یا کل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اگر عبداللہ آرام پر اتنا زیادہ اصرار نہ کرتا تو میں آج آفس چلا جاتا۔ معمولی سا فوڈ ہائزن تھا۔ ڈاکٹر ماربا کے ٹریٹمنٹ سے فوراً کنٹرول میں بھی آگیا۔ کل سارا دن کچھ کوری کا احساس ضرور ہوا لیکن آج تو میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر بھی آرام کرنا مناسب تھا۔ عبداللہ صاحب نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا۔ برسوں رات آپ کی جو حالت ہوئی تھی، اسے دیکھ کر تو میں ڈر ہی گیا تھا۔“

”جھے تمہاری پریشانی کا علم ہے۔ تمہاری فون کال پر عبداللہ کو آدمی رات کو دوڑ لگتی پڑی۔ بے چارہ صبح تک جاگتا رہا پھر مجھے واپس لے کر یہاں آیا۔ یہاں بھی میں اس کی کڑی نگرانی میں ہوں۔ میرے آرام کے خیال سے وہ کسی کو مزاج پر سی تک کے لیے نہیں آنے دے رہا۔ کل چودھری افشار کو بھی باہر ہی سے ٹال چکا ہے۔ تمہیں تو میری خصوصی سٹاف پر اجازت ملی ہے۔“ اس نے ہنسنے لگا۔

”نئی ہاں، مجھے علم ہے۔ کل میں نے فون پر غیریت معلوم کی تھی، تب ہی انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ۔۔۔ فالحال آپ کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے اس لیے تو میں آج آیا ہوں۔“ آفتاب نے مسکراتے لیوں کے ساتھ کیا پھر جیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”ویسے آپ کی اس طرح لچا تک طبیعت خراب ہو کیسے گئی؟ آپ نے واپس آنے کے بعد کسی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا؟“

”یقیناً کھانے پینے میں کوئی بد امتیازی ہو گئی ہوگی۔ شاید میں نے دوپہر کو جو کھانا کھایا تھا، وہ صبح سے ہضم نہیں ہوا تھا۔ اس پر میں نے دھوکے کا کھانا بھی کھا لیا تو معدہ برداشت نہیں کر سکا۔ رہی کسی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کی بات تو اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر ماربا اچھی ڈاکٹر ہے۔ میں اس کی تجویز کردہ میڈیسن لے رہا ہوں اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ اس نے بے پردائی سے جواب دیا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ گڑبڑ دھوکے والے کھانے میں ہی ہو۔ چودھری افشار جیسے شخص سے کسی بھی بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔“ آفتاب نے اپنے غصے کا اظہار کیا۔
 ”ارے نہیں، میرے خیال میں وہ اسے گھر پر میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی مجھے یہ تکلیف پہنچا کر اسے کیا فائدہ مل سکتا تھا؟ ویسے

عبداللہ ان احتیاطی اقدامات کی چیلنگ کر رہا تھا ہے۔ ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ جس سے یہ شک گزرے کہ مجھے خائف کر کے ان لوگوں نے ملائے سے مال باہر ادھر کرنے کی کوشش کی ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب ایک اتفاق ہی تھا۔“
 ”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو ورنہ چودھری افشار پر اعتبار کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے چودھری جیسا سوچ پرست آدمی نہیں دیکھا۔ چودھری بہزاد کی شادی کی مثال سامنے ہی ہے۔ چودھری بختیار سے بدلہ لینے اور اس کا سراپے آگے جھکائے رکھنے کے لیے اس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی اس طرح داؤ پر لگا دی ہے۔ یہ ہم سب ہی جانتے ہیں۔“ آفتاب اب بھی مشکوک ہی تھا۔

”واقعی یہ معاملہ ہے تو بہت افسوسناک۔۔۔ لیکن ورثہ کی موجودگی میں ہونے والے اس نکاح کو پیش بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یاں، اگر لڑکی خود اس مسئلے میں کوئی احتجاج کرے تو ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں۔“ اس نے خیال ظاہر کیا۔
 ”میں کشور کے ذریعے فریڈ کو یہ پیغام بھیجوں گا کہ وہ آپ کے پاس انصاف کے لیے تحریری درخواست بھجوا دے۔ فریڈ نے درخواست لکھنی چاہی تو کشور اس کام میں اس کی بھرپور مدد کریں گی۔ میں تو بہر حال اس ظلم کے خلاف اپنے طور پر جس طریقے سے احتجاج کر سکتا تھا وہ کر چکا ہوں۔ آپ نے لاہور سے نکلنے والے نکل کے اشتباہات تو دیکھ دیے ہوں گے؟“

”اوہ ہاں، اچھا تو یہ تم جتنے جس نے چودھری بہزاد کی تصویر کے ساتھ فراخاد کے دفتر تک پہنچائی تھی۔“ آفتاب کے سوال پر وہ چونک کر بولا۔ ”دولہا والی تیاری کے ساتھ کسی تین چار سالہ بچے کی طرح رو تے چلتے چودھری بہزاد کی تصویر پیشی طور پر ایسی گئی کہ کوئی لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔“

”جی ہاں، یہ میرا ہی کام تھا۔ میں دعوت میں شرکت کے لیے وہاں پہنچی تھی تھا کہ میری نظر چودھری بہزاد پر پڑی۔ حویلی کے دو تین ملازمین اسے لے کر اپنے ساتھ چنچل میں داخل ہونے والے تھے کہ وہ اچانک اس بات پر توجہ لگ گیا کہ وہاں کو بھی وہاں بلایا جائے۔ ملازم اسے سمجھاتے رہے کہ کہن زمان خانے میں ہے اور اسے باہر مردوں میں نہیں لے جایا جا سکتا مگر وہ مانتے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ خد میں آکر اس نے نیچے زمین پر لیٹ کر ایڑیاں ہلکائی شروع کر دیں۔ میرے پاس موبائل تو موجود ہی تھا۔ مرنے کا فائدہ اٹھا کر میں نے چودھری بہزاد کی تین چار یادگار

تصویریں کھینچ لیں اور جس اخبار کے لیے لکھتا ہوں، اس کے ایڈیٹر کو تصویریں مع خبر SEND کر دیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ خبر میں چودھری افشار کا کھل کر نام نہیں لیا گیا۔ صرف یہ لکھا گیا ہے کہ جناب کے ایک دور افتادہ گاؤں کے چودھری کے بچے کے ویسے کے مرنے پر لیا گیا دولہا کا خصوصی پوزیشن میں بھی اتفاقاً درج ہے کہ ایک با اختیار جاگیردار نے اپنے ایک نارس بچے کی شادی زبردستی ایک صحت مند لڑکی سے کروادی۔ دولہا ایک صحت مند یا کسی بھی قسم کی لڑکی سے شادی کرنے کا کتا دہلی ہے، اس کا اندازہ اس تصویر کو دیکھ کر لگا یا جا سکتا ہے۔“

آفتاب نے تعصبات جتان تو وہ ہنسنے لگا پھر ایک ڈراما سی تشویش سے بولا۔ ”نہیں تمہاری یہ جرأت تمہیں پہنچی نہ پڑ جائے۔ چودھری افشار کے ایڈیٹر سے یہ جاننے کی کوشش ضرور کرے گا کہ اس کے خلاف یہ خبر کس نے لگوائی ہے؟“
 ”کر دیکھے کوشش۔ ایڈیٹر سب سے پہلے تو اسے یہ جواب دے گا کہ جناب انہیں نہیں معلوم کہ یہ خبر آپ کے خلاف ہے۔ ہمارے ایک فری لانس صحافی نے ہمیں بغیر کسی حوالے کے یہ خبر بھیجی تھی، موہم نے تمہارے ہی۔ معلوم ہوتا کہ اس خبر کا تعلق آپ سے ہے تو آپ نے تصدیق کر لیتے۔ ویسے تو خبر غیر ثابت تھی لیکن آپ کے مطابق جھوٹی ہے تو ہم اپنی اس غلطی کی عتابی کے لیے تیار ہیں۔ آپ ایک عدد تردید کی بیان دے دیں، وہم اسے بھی اپنے اخبار میں چھاپ دیں گے۔“

”اور بے چارہ چودھری یہ کر نہیں سکتا۔ اس کے تردید بیان دینے کا مطلب ہوگا کہ جن لوگوں کو علم نہیں انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ خبر چودھری افشار کے متعلق ہے۔ بہت خوب۔۔۔ زبردست دنگ پہنچائی تم نے چودھری کو۔ دیکھنے میں کتنے شریف اور سیدھے ساوے لگتے ہو لیکن ہونا جرنلسٹ۔ لیکن اپنی اصلیت دکھائی جاتے ہو۔“ وہ بے حد جھجکا ہوا۔

”دوسرے لفظوں میں آپ مجھے چالاک اور چال باز ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ جو حقیقت تھی، میں نے لوگوں کو وہی بتایا۔ دھوکا تو چودھری افشار جیسے لوگ دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ بہزاد چودھری کے غم جمانے پر ملازمین اسے واپس لے گئے تھے اور پھر وہ تقریباً تقریب کے اندر ہی میں دوبارہ نظر آیا تھا۔ وہ بھی اس حال میں کہ میرا خیال ہے اسے کوئی خاص میڈیسن دی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ بالکل نرم ہو گیا تھا اور چپ چاپ وہی کر

رہا تھا جو اس کے ساتھ۔۔۔ موجود ملازم اس کے کان میں کہتا جا رہا تھا۔“ کچھ احتجاجی انداز اختیار کرتے ہوئے اس نے شہر یا رکی تو یہ ایک اہم نکتے کی طرف مبذول کر دئی۔
 ”واقعی یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ چودھری نے یہ بیان تو پہلے ہی بنادیا تھا کہ دولہا کی طبیعت کچھ ساڑے اس لیے جو لوگ حقیقت سے واقف ہیں انہیں چھوڑ کر باقی لوگ یہی سمجھیں ہوں گے کہ خرابی طبیعت کی وجہ سے دولہا بے چارہ کچھ سست نظر آ رہا ہے۔“ اس نے داد دینے والے انداز میں آفتاب کے تجزیے سے اتفاق کیا۔

اسی وقت ایک ملازم چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوا۔ چائے پیش کرنے کے ساتھ اس نے ایک خاک کاغذ بھی شہر یار کے سامنے رکھا۔ ملازم کی اس حرکت پر وہ چونک گیا۔ کسی ملاقاتی کی موجودگی میں بھی قسم کی ڈاک کا اس طرح پیش کیا جاتا معمول کے خلاف تھا۔ دولہا ڈھانچے بغیر نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لے لے گا۔ رچی شہر کے ڈاک خانے کی مہر لگا یہ عام سافا قہ تھا لیکن اس پر دیکھے اس کے نام کے ساتھ موجود پرٹل اور سوٹ آرجنٹ کے الفاظ اسے خاص بنارہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھایا اور اسٹ کر دوسری طرف پھینچنے والے کام دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں کوئی نام موجود نہیں تھا۔ اس نے کسی قدر الجھن محسوس کرتے ہوئے کاغذ چاک کیا، ہاتھ ڈال کر اس کے اندر سے کارڈ سائز کی ایک تصویر باہر نکالی۔ اگلا کھداس کے لیے بے حد دھماکا خیز تھا وہ اس کی طرح شاکد ہوا تھا کہ اپنے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت بھی چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

”غیریت ہے سر؟“ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“ آفتاب کی آواز کا قوت میں پڑی تو اسے خیال آیا کہ وہ اس جگہ پر تنہا نہیں ہے۔ اس نے چونک کر تصویر سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ملازم واپس چا چکا تھا جبکہ آفتاب کمری پر بیٹھا اسے تشویش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ایک سیکنڈ آفتاب آپ چائے پئیں۔ میں مزید آپ کو وقت نہیں دے سکوں گا۔“ مہران پریشان آفتاب سے کہتا ہوا وہ میز سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلے ہوئے وہ خاک کاغذ اس کے ہاتھ میں تھا۔ البتہ لٹکانے سے نکلنے والی تصویر اس نے واپس اندر ڈال دی تھی۔

”اگھڈ ایلوٹک سہ! معاف کیجیے گا مجھے آپ کے پاس آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ اہل میں جب آپ کا ڈراما خیر

پیغام لے کر پہنچا تو کافی سریشیل بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں قاصر کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اچھا نہیں لگتا کہ کبھی بوسے آدمی کی کال پر بے جا رہے غریبوں کو بے بارود گار چھوڑ دیا جائے۔ ویسے بھی مجھے تسلی تھی کہ آپ کو کوئی ایمر جی نہیں ہو سکتی۔ ایمر جی کی صورت میں آپ اتنی دور سے مجھے بلانے کے بجائے یقیناً پرسک ڈاکٹر سے رابطہ کرتے۔ یقیناً آپ نے مجھے صرف اپنی تسلی کے لیے چیک اپ کروانے بلایا ہوگا۔ یہ ڈاکٹر یا بھی جسے شہر یار کے طور پر پھر آباد سے بلوایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے تک وہ گویا دیکھنے انگریزوں پر چڑھ رہا تھا اور اب انگریزوں جیسی ہی سرحقی اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی تھی جس سے مکمل طور پر بے خبر ڈاکٹر یا مارا اپنے دیر سے آنے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے بڑی سی سی ایسے ٹائلڈر بیک سے اسٹیج اسکوپ نکالنے کے بعد اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ بڑھا کر اس کی کھالی کی بخش چیک کرنی چاہی۔

”خبردار! دور ہو مجھ سے اور آرام سے اس کمری پر جا کر بیٹھو۔“ اس کے کھالی پکڑنے سے پہلے ہی شہر یار نے یہ حد درجہ لہجے میں حکم جاری کیا۔

”لے۔ لیکن سر... میں آپ کا چیک اپ کیسے کروں گی؟“ وہ پکھائی۔

”کیسا چیک اپ؟ کیا ویسا ہی جیسا تم نے پیر آباد میں چودھری افکاری جوتلی میں کیا تھا؟“ شہر یار نے طرے سے پوچھا۔

”میں کبھی نہیں سرا کیا۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟ میں نے تو اپنی طرف سے آپ کو بہترین ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ آپ کی طبیعت چند گھنٹوں میں ہی مکمل تھی تھی۔ اب بھی آپ مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں پھر آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟ کیا آپ کے خیال میں مجھ سے آپ کی خدمت میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہے؟“ وہ اس کے حکم پر کمری پر تک تو گئی لیکن خوفزدہ سے انداز میں اس نے ایک ہی سانس میں کئی وضاحتیں اور سوالات کر ڈالے۔

”میری خدمت...“ شہر یار کسی سانس کی طرح پھسکا رہا۔ ”خدمت تو تم نے چودھری افکاری سے ہے۔ مجھے تو تم اپ بے پناہ ہو گئی کہ اس خدمت کے صلے میں چودھری نے تمہیں کتنی رقم ادا کی ہے؟“

”میں سمجھی نہیں۔“ ڈاکٹر یار نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”تو پھر یہ دیکھ لو۔ شاید انہیں دیکھ کر تمہیں بہت کچھ سمجھ آجائے۔“ اس نے سائڈ میں رکھے لفافے سے تصویریں نکال کر اس کے سامنے میز پر پھینکیں۔ ان تصویروں کی تعداد

تین تھی۔ اس وقت اس نے آفتاب کے سامنے گھبراہٹ ایک ہی تصویر نکال کر دیکھی تھی اور وہ تصویر اتنی شرمناک تھی کہ وہ لفافے میں موجود دوسری تصویریں نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ تصویر میں اسے اور ایک لڑکی کو جس شرمناک انداز میں دکھایا گیا تھا، اس کے بعد تو اسے اپنا دماغ ہی بھک سے اڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جب ہی اس نے آفتاب کو بھی بے حد سر دھری کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا۔ کوئی عجیب نشیمن میں پڑھنے، کس گید ونگز میں شرکت کرنے اور کئی خواتین سے دوستی ہونے کے باوجود اسے اپنے کردار پر ہمیشہ زور ہا تھا۔ نہ خود اس نے کبھی حدود پار کی تھیں اور نہ ہی کی اور کبھی موقع دیا تھا کہ وہ اس کے شفاف کردار پر بدتمنا واضح بن سکے لیکن یہ تصویریں کبہر تھیں کہ وہ تصویر میں موجود لڑکی کے ساتھ ہر حد پار کر گیا تھا۔ تصویریں اتنی بے باک اور شرمناک تھیں کہ اس بیٹھے شفاف کردار کے بالک ٹھٹھ کے بجائے کوئی کرپٹ آدمی بھی ہوتا تو اس کھو بیٹھتا کیونکہ بہر حال تصویروں کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے سے قطع نظر انہیں سمجھنے جانے کا مقصد صرف ایک ہو سکتا تھا... وہ تھا تصویر میں موجود بندے کو بلیک میل کرنا... اور وہ جانتا تھا کہ اپنے کیریئر کے اس پہلے مرحلے پر ہی وہ کس کے گتے میں اٹک گیا تھا؟ اور کون تھا جو اس کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اوجھ بھٹکتے سے استعمال کر سکتا تھا؟

یہ سب کب اور کیسے ہوا ہوگا، سمجھنا بھی اس کے لیے موقع دو چار کی طرح سیدھا سادہ حساب تھا۔ آفتاب نے ٹھیک کہا تھا کہ چودھری کسی صورت بھی اعتبار کے لائق نہیں لہذا طبیعت بگڑنے پر طبی انداز کے بہانے اسے حویلی کے اندر لے جایا گیا اور علاج کے لیے لڑکی ڈاکٹر یا ماروایا گیا حالانکہ مرکز صحت میں تو میل ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر یار کے آنے تک وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ بے ہوشی کے اس عالم میں اس کے ساتھ کیا کچھ کیا گیا، اس وقت اسے خبر نہیں ہو سکی لیکن اب تصویریں دیکھ کر سمجھ آ رہا تھا کہ اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر دشمن فسط کی جال پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹر یار کی صورت میں اس کے سامنے دشمن کا جو اہم تر مہرہ موجود تھا، اس نے سب سے پہلے اسی سے نمٹنے کا سوچا تھا اس لیے اب وہ اس کی رہائش گاہ پر اس کے سامنے موجود تھی۔

”یہ کیا ہے؟ آپ بے ہودہ تصویریں مجھے کیوں دکھا رہے ہیں؟“ تصویروں پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر یار کا چہرہ سفید ہو گیا تھا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے غصے کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا، تو یہ تصویریں بے ہودہ ہیں؟ کمال ہے، اس

بات کا خیال آپ کو تصویریں اترواتے وقت کیوں نہ آیا۔“ آپ مجھ پر کس قسم کی الزام تراشی کر رہے ہیں۔ میں آپ کی یہ فضول الزام تراشیاں سننے کے لیے کسی صورت بھی یہاں نہیں رک سکتی۔“ اس کے منہ پر وہ سختی ہوئی اپنی جگہ سے گھڑی ہوئی۔

”آرام سے تشریف رکھیں خاتون! میری اجازت کے بغیر آپ یہاں سے نہیں نہیں جاسکتیں۔“ اس نے مرد لہجے میں حکم دیا۔

”آپ کیوں میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں؟ میرا ان تصویروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ بے بسی سے دوبارہ کمری پر بیٹھ گئی اور اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”لیکن مجھے یقین ہے کہ ان تصویروں میں جو لڑکی نظر آ رہی ہے، وہ آپ ہی ہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟ ان تینوں میں سے کسی بھی تصویر میں لڑکی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا۔ صرف آپ کا چہرہ واضح ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے ایک مضبوط دلیل پیش کی لیکن لہجے کا کھوکھلا پن اس دلیل کو کمزور ثابت کر رہا تھا۔

”میرے یقین کے پیچھے دو بڑی وجوہات ہیں۔ نمبر ایک، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ تصاویر دو دن پہلے اس وقت چودھری افکاری حویلی میں تھیں جب میں بے ہوش تھا۔ نمبر دو یہ کہ تصویر میں آپ کی شکل نہ کسی مگرثاؤں تک کے ہوئے براؤن اور گولڈن یاں صاف نظر آ رہے ہیں۔ اس میسر اسٹائل اور میز کلرز والی کوئی دوسری خاتون میں سے ان چند دلوں میں اپنے آس پاس بالکل نہیں دیکھی۔“ اس نے اپنے دلائل پیش کیے تو وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

”آپ بہت ذہین ہیں۔“

”تقریب کے لیے شکر یہ لیکن بہر حال میں نے آپ سے یہ تعریفی کلمات سننے کے لیے آپ کو حجت نہیں دی۔ میں جانتا چاہتا ہوں بلکہ جانتا تو ہوں مگر یوں سمجھیے کہ آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کس کی ایما پر یہ کام کیا اور اس کے لیے کیا قیمت وصول کی؟ یقیناً اس کام کی قیمت تو اس کی سہری کے مقابلے میں اور بھی زیادہ اچھی ہوگی جس کے لالچ میں آپ نے شہری زندگی چھوڑ کر ایک گاؤں میں آ کر رہنا اور جاب کرنا منظور کر لیا۔“ وہ ایک ایک لفظ چا کر بولتے ہوئے خود کو بہت قابو میں رکھتے ہوئے تھا لیکن

درحقیقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مساج کے روپ میں اس کرپٹ لڑکی کے ساتھ کس بھی طرح پیش آئے۔ ڈاکٹر یار نے اس کی ہر بات خاموشی سے سنی مگر منہ سے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آپ کے سامنے جو حالات ہیں، ان کی روشنی میں آپ جتنا چاہیں مجھے پیرا بھلا کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی آپ کی طرح ٹرپ کیا گیا ہے۔ میں اپنی خوشی سے اس مکروہ کام کے لیے راضی نہیں ہوئی۔“

بچیوں اور سسکیوں کے درمیان اس نے یہ چند جملے کہے تو شہر یار چونکا۔

”کیا مطلب؟“

”میں ایک بڈل کاس گھبرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے والد میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ میری کمی نے خود جاب کر کے بڑی جدوجہد سے مجھے بڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا۔ مجھے پریکٹس شروع کیے صرف تین سال گزرے ہیں۔ اپنی ملازمت کے بعد میں نے ہی سے جاب پھر وادی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹی بہت مطمئن زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک مصیبت نے ہمارے گھر کا راستہ دکھ لیا۔ ایک روز میں اپنی جاب سے واپس آ رہی تھی کہ ایک آدمی نے مجھے روک کر ضروری بات کے لیے قریبی ریستورنٹ خلیے کا کہا۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ ہم ریستورنٹ پہنچے تو اس نے چائے پینے کے دوران مجھے پیر آباد کے مرکز صحت میں رہائش اور اچھی سہری کے ساتھ جاب کی آفر کی۔ اس شخص کی پیش کش پر کشش تھی لیکن میں شہر چھوڑ کر گاؤں میں جانا چاہتی تھی۔ میں جس پرائیویٹ اسپتال میں جاب کر رہی تھی، وہ بہت نامور تھا اور وہاں بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ساتھ بہت کچھ سیکھے کھاتا تھا۔ اپنی وہ جاب چھوڑ کر میں پیر آباد جاتی تو تجربہ کار ڈاکٹر زندگی راہنمائی سے محروم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ میری ہی جاب کا تھا۔ ساری زندگی ملازمت کرنے کی وجہ سے ہی بہت سوشل تھیں۔ جاب چھوڑنے کے باوجود ان کا دوستوں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میں پیر آباد آئی تو انہیں بھی یہاں آکر پڑنا اور جتنی بات ہے کہ گاؤں کی حدود زندگی میں وہ بور ہو جائیں۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے اس شخص کی بہت اچھی آفر کے باوجود اس ملازمت کے لیے انکار کر دیا۔“ اس نے بہت تیزی سے اپنے آپ کو سنسٹال لیا تھا اور اب اپنے متعلق تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھی۔

”میرے انکار کے باوجود وہ شخص مسلسل میرے پیچھے

بزار ہا۔ بکری کی آفر بھی ذیل کر دی لیکن مجھے اس کے اس طرح پیچھے پڑنے سے کچھ چڑ ہوئی اس لیے میں نے پھر انکار کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس کا اصرار و تمکین میں تبدیلی ہو گیا۔ جب میں ان دو چمکیوں کو بھی خاطر میں نہ لائی تو میرے ساتھ وہ چمکیاں چال چلی گئی جس کے بعد میں ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔

”کیسی چال؟“ وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو کر اپنی پٹیلی کی کیسروں کو کھونٹے لگی تو شیر یا رکواسے ٹوکن پڑا۔ ”ایک دن اسپتال جاتے ہوئے مجھے راستے میں اغوا کر لیا گیا۔ اغوا کرنے والے کون تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں چند گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں ان کے قبضے میں رہی پھر ہوش میں آنے کے بعد مجھے واپس میرے گھر پہنچا دیا گیا۔ چونکہ یہ سب چند گھنٹوں میں میرے ذہن پر آوری ہو گیا تھا، اس لیے مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ خود میں نے بھی کچھ نہیں بتایا کہ میرے اندازے کے مطابق کد خیر نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن اگلے ہی دن ڈاک سے موصول ہونے والی اپنی شرمناک تصویروں نے مجھے بتایا کہ مجھے کس طرح شرب کیا گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد میں خیر آباد آنے سے انکار کر رہی نہیں تھی۔ خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے مجھے یہ مطالبہ مانا پڑا۔“

”اور شاید اسی بلیک میلنگ سے ڈر کر آپ نے میرے خلاف کھیلے جانے والے ڈرامے کا حصہ بننا بھی منظور کر لیا؟“

شیر یا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں واقعی مجبور ہو گئی تھی۔ بدنامی کے خوف سے میں نے وہ دو افرام کر دی جس کو کھاکر آپ کی حاکمیت بگڑی اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ پھر آپ کی بے ہوشی کے دوران ہی یہ شرمناک تصویریں بھی منسلک کی گئیں۔ میں نے اپنے طور پر احتجاج ضرور کیا لیکن میری اپنی تصویروں نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ان لوگوں نے مجھے سلی وی کی کہ آپ کے ساتھ چھپی جانے والی تصویروں میں میرا چہرہ دکھائی نہیں دے گا اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ یہ وعدہ پورا بھی کیا گیا لیکن آپ اپنی ذہانت کی وجہ سے حقیقت سمجھ گئے۔“

”ذہانت کی بات نہیں، یہ بالکل سیدھا سادہ معاملہ ہے جو ذرا سا غور کرنے پر کسی بھی شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن آپ بتائیں کہ آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟ اتنا کہ کھڑا ان لوگوں نے صرف مجھے شرب کرنے کے لیے تو کھڑا نہیں کیا ہوگا۔ حالات سے ظاہر ہے کہ وہ آئندہ

بھی آپ کو اس قسم کے کاموں کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔ آپ چند تصویروں کی وجہ سے کب تک ان کے ہاتھوں کھینچا کر دیں گی؟“

”میری خود کچھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟“ اس کے پوچھنے پر وہ اپنی انگلیاں سروڑتے ہوئے بے بسی سے بولی۔ ”تھوڑی سی ہمت کریں۔ آپ ہمت کر کے بیان دیکر ڈکھوانے پر راضی ہو جائیں تو ہم وہ نوٹس کر چودھری کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔“

”یہ کسی صورت ممکن نہیں۔ جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ کسی ریکارڈ پرانا تو دور کی بات میں چند دھری کے سامنے بھی اسے نہیں ڈھرا سکتی۔“ ڈاکٹر ماریا نے صاف انکار کیا۔

”لیکن کیوں؟“

”وہ اس لیے کہ اب تصویروں سے بھی بڑھ کر میری ایک کھروادی اس کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں خیر آباد آتے ہوئے اپنی بھی کوسا کھینچ لائی تھی۔ مجھے یہاں درجن آٹا پڑا تھا جبکہ کسی کی خواہش بھی کہ وہ اپنے تمام اہباب سے فائدہ کی ملاقات کر کے اور گھر کا ضروری سامان سمیٹ کر یہاں آئیں لیکن وہ نہیں پہنچیں۔ آج صبح میں نے ان سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تو دوسری طرف سے کسی اجنبی نے میری کال ریسپونڈ کی اور مجھے بتایا کہ میری مٹی اس کے قبضے میں ہیں۔ اگر میں نے کسی بھی معاملے میں زبان کھولی تو میری مٹی کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں نے جو کچھ آپ کو بتایا ہے، وہ افسانیت کے نہ صرف یہ سوچ کر بتایا ہے کہ آپ اپنے تحفظ کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کر لیں۔ میں بہر حال، آپ سے اس کے سوا مزید کوئی تعاون نہیں کر سکتی۔“ وہ یک دم ہی روڑ ہو گئی تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر غریب سے بولا۔

”شک ہے، آپ کھل کر میرے ساتھ تعاون نہیں کر سکتیں لیکن کچھ سوالات کے جواب تو دے سکتی ہیں؟“

”کیسے سوالات؟ آپ پوچھ کر دیکھ لیں۔ اگر مجھے لگے کہ ان سوالات کے جواب دینا میرے اور میری مٹی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے تو میں آپ سے تعاون کروں گی۔“ اس نے مختار انداز میں جواب دیا۔

”آپ سلی رخصت، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ شیر یا نے اسے یقین دلایا پھر اگلے چندہ منٹ ان دونوں کے درمیان سوال جواب کا سلسلہ جاری رہا جس کے دوران وہ اپنے سامنے رکھے نوٹ پیڑ پر کچھ ضروری نوٹس لیتا رہا۔ چندہ منٹ

بعد اس نے مطمئن ہوتے ہوئے ڈاکٹر ماریا کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی اور خود فون پر مصروف ہو گیا۔

”آئی جی صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ کا کھنکھہ آ کر کیا کرتا پھر رہا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں جانتا کہ آپ کس بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟“ ڈاکٹر ماریا نے کہا ہمت خستے کے ساتھ پوچھنے کے سوالات کے جواب میں اس نے مختصر سے لکچے میں بے نیازی کا تاثر دیتے ہوئے پوچھا۔

”خوبہ سزاؤں کی گرفتاری کے بارے میں بات کر رہا ہوں میں۔ کیا حکمہ پولیس کے پاس کرنے کے لیے کوئی دوسرا کام نہیں رہا ہے جو آپ لوگ ان مظلوم افراد کے پیچھے لگ گئے ہیں؟“ ڈاکٹر ماریا کو یقینا اس کی بے نیازی ناگوار گزری تھی چنانچہ اس کا لہجہ کچھ اور خراب ہو گیا۔

”یہ ایک ٹاپ سیکرٹ معاملہ ہے سراسر جس پر حکمہ پولیس پوری جان نشانی سے کام کر رہا ہے۔“ اس بار آئی جی مختار روئے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ٹاپ سیکرٹ معاملہ۔“ ڈاکٹر ماریا نے ایک استہزائیہ سا بکا کر بھرا۔ ”آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ ایک نجی معاملہ ہے جس کے پیچھے آپ حکمہ پولیس کو استعمال کر رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے اور آپ کے داماد نے چورس اور پبلک کو بتایا ہے، مجھے بھی پس انداز معلوم ہے؟“

”مجھے ایسی کوئی غلط فہمی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے مجھے میں ایسے کی لوگ ہیں جو ملازمت تو پولیس کی کرتے ہیں لیکن خدمت سیاست دانوں کی انجام دیتے ہیں۔ آپ کو بھی آپ کے کسی تنگ خوار نے بہت کچھ بتا دیا ہو گا لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ ملکی مفادات میں ہی ہو رہا ہے۔“ مختار مرامو نے سیاست سے لکچے میں وضاحت دی۔

”سیاست دان ہونے کا طعنہ نہ دیں آئی جی صاحب! سیاست دان تو آپ کے ہمہ جہت صاحب بھی ہیں اور شاید اسی وجہ سے آپ کے داماد میں ہانی کرتے پھر رہے ہیں۔ انہیں تو دو طرفہ سپورٹ مل گئی ہے لیکن یاد رکھیں کہ سجاد خان کا یہ پاگل پکن اسے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگر اس کی بیٹی کے اغوا اور موت کے پیچھے خوبہ سزاؤں کا کوئی گروپ تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شہر بھر کے خوبہ سزاؤں کا جینا دو بھر کر دے۔ پریس نے پہلے ہی اس سلسلے میں اچھا خاصا طوفان اٹھایا ہوا ہے۔ خوبہ سزاؤں کے پولیس کسٹڈی میں مارے جانے کا

میڈیا نے بڑی شدت سے توجہ لیا ہے۔“

”میں یکدم ہی سراخو پیر الماس کو پولیس کسٹڈی میں بار نہیں کیا بلکہ اس نے خود کو کی گئی۔“ مختار مرامو نے فوراً دھڑکے کر انہیں نوکا۔

”تو آپ کا موقف ہے نا جس پر پبلک یقین نہیں کرتی۔ پولیس کسٹڈی میں ملزمان پر کیے جاتے والے غیر انسانی تشدد کے نتیجے میں ان کی جان بچاؤ اور اس واقعے کو خود کشی قرار دے دینا آپ کے منہ کی بہت پرانی روایت ہے جس سے اب سب ہی واقف ہو چکے ہیں۔“

”میں آپ کے اس الزام کے جواب میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ الماس کی موت واقعی خود کشی کے نتیجے میں ہوئی تھی ورنہ ہم اس سے جو معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے حصول کے لیے اس کا زندہ رہنا بہت ضروری تھا۔ اب آپ کی مرضی کو آپ میرے اس بیان پر یقین کریں یا نہ کریں۔ بہر حال، میں آپ سے یہ ضرور جانتا چاہوں گا کہ اس وقت آپ کے کال کرنے کا کیا سبب ہے؟ ظاہر ہے آپ نے ان گزرتے ہوئے واقعات پر غفلت کے لیے تو اتنی زحمت نہیں کی ہوگی۔“ مختار مرامو نے چپا چپ کر بولتے ہوئے دریافت کیا۔ ڈاکٹر ماریا کے اختیارات اور پٹیلی جلد لیکن پھر حال وہ خود بھی کوئی ایسا سمجھتی آدمی نہیں تھا کہ ایک ایسا شخص جو اپنی پارٹی کے حکومت میں ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر غرور و زوال کے دورے گزرتا رہتا ہو، ان پر مکمل طور پر حاوی ہو سکتا۔

”میرے پی آدو نے مجھے اطلاع دی ہے کہ لاہور کے سارے خوبہ سزاؤں کو ڈاکٹر ماریا کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کرنے والے ہیں کیونکہ ان کی رات پولیس نے پھر کی خوبہ سزاؤں کو گرفتار کیا ہے اور یہ بھی پولیس ان لوگوں کو تنگ کر رہی ہے۔ پولیس کے نام پر ان لوگوں کو کئی کئی گھنٹے قانون میں دھکا کر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کا کام دھندلا کر رہتا ہے۔“

”اور شاید وہ لوگ بھی جوان کی خدمات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔“ مختار مرامو نے یہ بات صرف دل میں سوچی مگر کہی نہیں۔ پچھلے عرصے کی تحقیقات کے نتیجے میں ایسے چند افراد کے نام سامنے آئے تھے جو سرکاری طور پر بڑی اہمیت کے حامل تھے اور ان افراد کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ جس دوسری قسم کا شوق رکھتے ہیں اس کی تسکین کے لیے انہیں اس قسم کے افراد کی حاجت ہوتی ہے۔ ان کے مجھے کو شوق تو نہیں ملے تھے لیکن انہیں ملک ساتھ کر

خواب سراؤں میں سے کچھ ایسے افراد بھی تھے جو پڑوسی ملک کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور ان شوقین افراد کا دل بھلانے کے عوض قیمتی معلومات حاصل کر کے پڑوسی ملک تک منتقل کر رہے تھے۔ سندھ رام کی ٹیکنیکل ٹرین میں تیار کردہ کپڑے کے چند مخصوص تھانوں کا اثر بین آری کے ہاتھ ہی فروخت کیا جانا ایک بہت ہی قابل غور بات تھی۔ یقیناً کپڑے کے یہ تھان معلومات کی خفیہ ترسیل کا ذریعہ بنے رہے تھے۔ سندھ رام کی موت کے بعد چونکہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لیے اس سلسلے میں بھی شہادت تو کوئی نہیں تھا۔ بس واقعات کی ترتیب کو سامنے رکھ کر ہی قیاس آرائی کی جاسکتی تھی۔

”میں جانتا ہوں کہ شنگھ پاپلس کی طرف سے آپ مجھے اس سلسلے میں یقین دہانی کروائیں کہ اب شہر کے کسی خواب سرا کو شک نہیں کیا جائے گا تاکہ میں احتجاج کے لیے آنے والوں کو مطمئن کر سکوں۔ ورنہ یاد رکھیے کہ آپ کا محکمہ میڈیا کی زبردست تنقید کی زد میں آ جائے گا۔“ اس کی سوچ اور پریشانیوں سے خبردار وزیر اعلیٰ اپنی ہی کبے جارہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کر لیں وعدہ۔“ مہارام نے جان چھڑائی۔

”آپ نے اور آپ کی پارٹی نے اس سے پہلے کہ عوام سے کیا ہوا کوئی وعدہ وفا کیا ہے جو اس ایک وعدے کے پورے ہوتے پر کسی کو حیرت ہوگی۔“ یہ اس کے ذہن میں اٹھنے والی وہ سوچ تھی جس کا اس نے وزیر اعلیٰ کے سامنے اظہار نہیں کیا اور شنگھ کو سلسلہ ختم ہو جانے کو غصہ نہ چاہتے ہوئے ریسور واپس رکھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ابھی مشکل سے چند روز مٹ ہی گزرے تھے کہ نوں ایک بار پھر جج اٹھا۔ ریسور واپس پر اسے دوسری طرف سے ڈی آئی جی سجاد رانا کے آن لائن ہونے کی اطلاع ملی۔

”ٹھیک ہے، بات کرواؤ۔“ اس نے مصروف سے انداز میں اجازت دی۔

”ایک بندہ تیرے اگلے!“ اس کی ہیلو کے جواب میں سجاد رانا کی کچھ پریشان سی آواز سنائی دی۔

”کیا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”کل رات جس خواب سرا کو گرفتار کیا تھا وہ پولیس کھڈی میں سر گیا ہے۔“

”کیسے؟“ اس اطلاع پر وہ بھونکے رہ گئے۔

”بھئی طور پر تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا

ہے لیکن لاش کی ظاہری حالت دیکھ کر بھی کہا جاسکتا ہے کہ موت کا سبب زہر خوردانی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گرفتاری کے بعد اس شخص کی مکمل علاجی ٹیم تھی اور اس کے پاس موجود معمولی سے معمولی شے بھی قبضے میں لے لی تھی تھی اس لیے یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ اس نے اپنے پاس زہر رکھا ہوا تھا جسے کھا کر خودکشی کر لی۔ یقیناً اس کی موت کا سبب بننے والا زہر باہر سے ہی آیا تھا اور یہ بات ہمارے محکمے کے لیے بدنامی کا سبب بن سکتی ہے۔“

”یہ تو تم نے بہت تشویشناک بات بتائی ہے۔ اس ایڈووکیٹ کو تو میڈیا بہت طوفان برپا کرے گا۔ پہلے ہی ہم پر مسلسل تنقید ہو رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میری وزیر اعلیٰ سے بات ہوئی ہے۔ وہ بڑی طرح برہم ہو رہے تھے کہ ہمارا محکمہ کیوں ہاتھ دھو کر خواب سراؤں کے پیچھے چڑھ گیا ہے۔“ وہ سجاد رانا کو وزیر اعلیٰ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کر رہے تھے۔

”یہ تو واقعی بہت بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ چینا کی ڈسٹھ کے بعد ڈیڑی خود کو سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہو پارہے ہیں۔ ان کی صحت فی الحال اس لائق نہیں کہ کسی سیاسی اتحاد آرائی میں الجھ سکیں۔ ان حالات میں اگر وزیر اعلیٰ بھی میڈیا کے ساتھ مل گئے تو ہمیں بہت مشکل ہو جائے گی۔“ ساری بات سن کر سجاد رانا نے تشویش کا اظہار کیا۔

”اگر کوئی کوئی گھٹیا کش میپ نہیں۔ وزیر اعلیٰ ہر حال میں میڈیا کے ساتھ ہی کھڑے ہوں گے۔ میں اس شخص کو ابھی طرح جانتا ہوں۔ سستی شہرت حاصل کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع کرنے والا آدمی نہیں ہے وہ۔ بہر حال، تم فی الحال سب سے پہلے تو مارم کی موت کے وقت ڈیڑی پر موجود عملے کی معطلی کے احکامات جاری کرواؤ تاکہ چلک کو یقین دلا جا سکے کہ غفلت کے مرتکب ہونے والے افراد کے خلاف انکوائری کی جارہی ہے۔ ساتھ ہی کویش کرنا کہ وہ بندہ پکڑا جائے جس کے ذریعے زہر دیا گیا۔ یقیناً یہ خلیہ عملے میں سے ہی کوئی فرد ہوگا۔ میں اس دوران اوپر بات کرتا ہوں۔ ہم اسے طور پر جو کوششیں کر سکتے تھے وہ کر لیں، اب انٹیلیجنس کے افراد کو اس معاملے میں اعتماد میں لیتا تا زہر ہو گیا ہے۔“ مہارام نے ہدایات جاری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام وگرام بھی بتایا جس کی سجاد رانا موجودہ حالات میں مخالفت نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کی دلی خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کے قتل میں ملوث ایک ایک فرد کو اپنے ہاتھوں کیفر کرادینا چاہتا ہے۔

”اور سائیکے چودھری صاحب! اپنے اے سی صاحب کے کیا حال ہیں؟ کچھ دنوں کے بعد ان کے کامیابیوں کی صفائی کی پشٹ سے ٹیک لگا کر دونوں ٹانگیں خوب پھیل کر بیٹھتے ہوئے منظر ہارنے پوچھا۔

”حال تو پتا ہے بے چارے اے سی کا۔ کل بلایا تھا اس نے ڈاکٹر ہارما کو پوچھ چکے کے لیے۔“ تارڑ کی بات کا جواب دے کر چودھری نے جھکے کیلئے منہ سے لگائی اور بے حد لطف اندوز ہونے والے انداز میں ایک نیا کش لگا یا۔

”پھر کیا بتایا اسے ڈاکٹر ماریا نے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے ہم پریشانی میں پڑ جائیں۔ ان عورتوں کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب بندے کو چھینا دیں۔“ اس نے پیٹنے تشویش کا اظہار کیا۔

”اے نہیں تارڑ صاحب! تمہی فکر نہ کرو۔ ڈاکٹر پی پوری طرح ہمارے ہاتھ میں ہے۔ وہ ایسی کوئی غلطی نہیں کرے گی کہ ہمیں مشکل پڑ جائے۔ آپ تو بس اب اطمینان سے اس دن کا انتظار کرو جب اے سی ہمارے سامنے دک سے لکیریں لگائے گا۔ اس واری ایسا وار کیا ہے ہم نے کہ اس کا رخ لکنا ممکن ہی نہیں۔ بڑے نام والے خاندان کا سپوت ہے۔ ہم سے اڑی لگا کر اپنے خاندان کی عزت رو لے لے کا خطرہ نہیں مول لے سکے گا۔“ چودھری نے حد مطمئن تھا۔

”بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیں کہ کب اس سلسلے میں اے سی سے مذاکرات شروع کریں گے؟“

”دو چار دن گزرنے دیں پھر بات بھی کر لیں گے۔ ایک جلدی کیا ہے؟ ابھی تو ہم چند دن اس اے سی کے بیچے کے نڑے کا قماش دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ڈی نڈس اڑائی ہیں اس نے ہمارے اب کچھ دن وہ بھی قوت دکھائے۔ ابھی تو بے چارہ اس انجمن میں بیٹھا ہوگا کہ تصویریں ہم نے بھجوائی ہیں یا نہیں اور نہ؟ اس کی بے بسی کا قماش دیکھنے کے لیے ہی تو میں نے ان تصویروں کے ساتھ کوئی خط پڑ نہیں بھجوا تھا۔ شک ہے شک اسے ہم پر ہی ہے لیکن خود سے کل چیمپز نے کی امت تو نہیں کر سکتا۔“ چودھری کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ شہر یار جس کے ہاتھوں اس نے ہمیشہ رک اٹھائی تھی، اب اپنے داڑ میں پھنسا نظر آ رہا تھا تو یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ ان تصویروں کے ذریعے شہر یار کو بلک سہل کر کے اس سے اپنے کئی مطالبات پورے کروائے جاسکتے ہیں۔

”اصل میں بات یہ ہے چودھری صاحب!“ ایس بی سیدھا ہو کر بیٹھا ہوا ذرا سا ٹھنکھار۔ ”اپنے باجوہ صاحب

کچھ پریشان ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس معاملے کو نمٹایا جائے تاکہ ان کی کئی کئی بھائی ہو سکے۔“

”ایک تو باجوہ نے ہمارے پریشان کر رکھا ہے۔ ذرا حوصلہ نہیں اس آدمی میں۔ مجھے بھی بار بار فون کر کے میرے کان کھاتا رہتا ہے۔ اب آپ کو سفارشی بنا کر بھیج دیا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں جان پھڑاؤں اس بندے سے۔ ویسے ہی سالا سب کی نظروں میں آ گیا ہے۔ حال ہوگا تو بھی پریشانی ہی رہے گی نہیں۔“ چودھری نے ہموادی سے کہا۔

”باجوہ کا بیٹی خیال ہے کہ آپ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے سے شکایت کر رہا تھا کہ چودھری صاحب کا رویہ کچھ بڑا بدلا ہے۔ مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتے کہیں ایسا تو نہیں کرے مجھے اس سارے سیٹ اپ سے الگ کرنے کے پھر میں ہوں؟“

”تو آپ اسے بتا دیں کہ اس کا خیال ٹھیک ہے۔ فارسٹ آفسر کا کیا ہے؟ اس کی جگہ جو نیا بندہ آئے گا ہم اسے پارٹنر بنائیں گے۔ خواجہ ایک شک کی زد میں آئے بندے کو اپنے ساتھ تھیں رکھنے کی کیا ضرورت ہے نہیں۔ بہت کمالیا اس نے ہمارے ساتھ رہ کر۔ اب کسی اور کو موع دے۔“

”یہ اتنا آسان بھی ثابت نہیں ہوگا چودھری صاحب! باجوہ بکھر جائے گا۔ ہو سکتا ہے فیصے اسے کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھا لے جس کے بعد ہمارے ہم بھی سامنے آ جائیں۔ ابھی تو جو کچھ ہم صرف شک کی حد تک ہے۔ باجوہ نے کوئی اقبالی بیان دے دیا تو ہم بڑی طرح پریشان جائیں گے۔“ تارڑ نے اسے معاملے کی نزاکت کا احساس دلایا۔

”میرے خیال میں آپ یہ بھی اپنی طرف سے نہیں کر رہے ہیں۔ باجوہ نے اپنی انٹیلیجنس کے ساتھ یہ دھمکی بھی آپ کے کانوں تک پہنچائی ہے۔“ چودھری نے فیصے سے بولتے ہوئے تارڑ کی شکل دیکھ کر غصہ چرا گیا۔ یہ ایک طرح سے اس کی طرف سے اعتراف تھا کہ دانی باجوہ نے ایسی کوئی دھمکی دی ہے۔

”یہ معاملہ مجھے پر بھڑو دو ایس بی صاحب! میں آپ باجوہ سے نمٹ لوں گا۔ کسی ریسک نہ کرو۔“ چودھری نے ٹیک دم می موڈ بدل لیا اور نرم لہجے میں اسے تسلی دینے کے بعد ایک ملازم کو کھار۔

”اوشیدے! ایس بی صاحب کے لیے کھانا شانا لگوا۔ بڑے دن گزر گئے ہم نے اپنے جن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔“ اس کے انداز سے تارڑ نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اب مزید اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرے گا اور واقعی اس

کمرے سے اٹھ کر ڈائنگ روم تک جانے اور کھانا کھانے کے دوران چودھری اور اُدھر کے موضوعات پر فیس فیس کرتے رہا لیکن باجود والا معاملہ دوبارہ نہیں چھیڑا۔ اسی نے بھی انجان بن گیا اور خوشگوار محل میں شان دار کھانا تناول کر کے خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد چودھری نے ہالے کو بلا دیا۔

”عزم چودھری صاحب! وہ فوراً ہی خدمت میں حاضر ہو گیا۔“

”سنا ہے اپنے باجود صاحب کی زبان بڑی کھل رہی ہے۔ ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ بس نہیں چل رہا کہ جو کچھ اندر سے باہر نکال دیں۔ اور تو جانتا ہے کہ ہم اسی حرکت کو پسند نہیں کرتے۔“

”آپ عزم کریں چودھری صاحب! باجود کا علاج ہو جائے گا۔ اگر علاج ہوا تو اسے وہاں بھی بیٹھایا جاسکتا ہے جہاں ہر علاج مریض کو پہنچتا ہوتا ہے۔“ ہالے کو گویا اس کا من پسند مشغلہ ہاتھ لگنے والا تھا جس کے بارے میں سن کر اس کی چوٹی چوٹی سر و آنکھیں جھپکنے لگیں۔

”ابھی تو ایسا کر کہ اس پر نظر رکھ۔ آگے کیا کرنا ہے، میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔“ کوئی بھی انتہائی عزم صادر کرنے کے بجائے اس نے ہالے کو صرف ٹھنکائی کا کام سونپا۔ عین وقت پر اسے خیال آگیا کہ باجود کو کوئی نقصان پہنچا تو اس کی ٹھنک جائے گا کہ یہ اسی کا کام ہے اور فی الحال وہ اس کی بی پائرشپ سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ باجود کے مقابلے میں وہ اب بھی اس کے لیے کارآمد تھا پھر وزیر پاملی سے اس کی رشتے داری کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ باجود کو کچھ ہوتا تو اس کے آگے پیچھے کوئی ایسا بڑا آدمی نہیں تھا جو چودھری کے گھنے پٹے لیکن اس کی اسے چھسکا سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے چودھری صاحب! جیسا آپ کا حکم۔“ ہالے کو کچھ مایوسی ہوئی لیکن ظاہر ہے وہ چودھری کے سامنے اس کے فیصلے پر اعتراض تو نہیں کر سکتا تھا اس لیے فرماں برداری سے بولا۔

”ایک کام اور کرنا۔ ڈاکٹر مارپا سے ہٹنا کہ تیار ہے۔“

آج رات ہم اسے اپنے ڈیرے پر دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ٹھیک ہے چودھری صاحب! میں خود اسے رات کو آپ کی خدمت میں لے آؤں گا۔“ ہالے نے جواب دیا اور پھر اس کا اشارہ پا کر ہانپٹل گیا۔ چودھری مسرور سا آنے والی رات کے تصور میں کھڑا ہوا اسے اپنی کسی موٹی بھتیجی بیوی یا بھاری عورت کے بجائے ڈاکٹر ماری پاملی پھر پور

عورت کی قربت میں گزرا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

خوف سے حشر کھڑے ہوئے اس شخص پر سجاد رانا نے ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ وہ کل رات ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں میں سے ایک تھا۔ پولیس کسٹڈی میں زہر خورانی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے خولہ سر اس کی ہلاکت کے بارے میں یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ اس کی موت کا سبب کھانے میں شامل زہر تھا، فوری طور پر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں کی طرف ہی دھیان گیا تھا۔ خولہ سر کی موت کا انکشاف صبح اس وقت ہوا جب رات والا ملازم واپس جا چکا تھا اور صبح اس کی جگہ نئے عملے کی تھی۔ تحقیقات کرنے والوں نے فوری طور پر رات والے عملے کو کال کر لیا۔ سارا ملازم حاضر ہوا مگر توہیر احمد نامی یہ سپاہی نہیں آیا۔ حاضر افراد نے تفتیش شروع کرنے کے ساتھ ہی دو سپاہی توہیر احمد کے گھر کی طرف روانہ کیے گئے جہاں اس کی بیوی نے بتایا کہ توہیر گھر پر نہیں ہے۔ وہ صبح ڈیوٹی سے واپس آئے ہی اپنے چند جوڑے کپڑے لے کر گھر سے نکل گیا تھا کہ کسی ضرورتی کام سے جاتا ہے۔ سپاہیوں نے اس بات کی اطلاع ایس کی کو دی۔ توہیر احمد کے بلاوے پر حاضر ہونے پر ویسے ہی اس کی طرف سے شکا ہو گیا تھا اب جو اس کے گھر سے غائب ہونے کی اطلاع کی تو یقین ہو گیا کہ خولہ سر اس کے قتل کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ ہے۔ برقی رفتار سے ہر طرف بندے دوڑائے گئے۔ توہیر احمد کے گھر سے کپڑے وغیرہ لے کر نکلنے سے پہلے اندازہ ہوا تھا کہ وہ شہر سے باہر نہیں جانے کا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ اسی رخ پر تحقیق کی گئی۔ اس کی بیوی کو ڈراہم کا کر اس سے ان کے حیران شہر مقیم رشتے داروں کے نام پر معلوم کیے گئے۔ توہیر احمد کے گھر سے اس کی چند تصویریں بھی مل گئیں۔ سپاہی تصویریں سپیت ویلے اسے انکھن اور بسوں کے اڈے کی طرف دوڑے۔ بالآخر اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں بس اڈے سے معلوم ہو گیا کہ اس خطبے اور شکل و صورت کا آدمی فلاں روڈ کی بس میں بیٹھ کر فلاں وقت روانہ ہوا ہے۔ بس جس شہر کی طرف گئی تھی، وہاں توہیر احمد کی بیوی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس کی بس نہیں رہتی تھی۔ اب پولیس کے پاس بھی مل تھا کہ یا تو یہاں سے گئی کو توہیر احمد کے تعاقب میں روانہ کرے یا وہاں کی مقامی پولیس کو ڈسے وادی سوئے کے پیچھے ہی توہیر احمد پہنچے، اسے گرفتار کر کے واپس لاہور بھیجا جائے۔ لیکن سجاد رانا کی ذاتی دلچسپی اور سخت دہائیات کے باعث پولیس والوں نے کچھ غیر معمولی مستعدی دکھائی۔ ٹرانسپورٹ کمپنی سے یہ معلوم

کرنے کے بعد کہ وقت کے اس دورانیے میں ان کی کمپنی کی بس کہاں تک پہنچی ہوگی، اس علاقے کے تھانہ انچارج کو حکم دیا گیا کہ راستے میں ہی بس روک کر فلاں شخص کو گرفتار کرو اور فوری طور پر لاہور روانہ کر دو۔ نتیجتاً اس وقت توہیر احمد ابھی اڑنے بھی نہ پاے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔ کے مصداق انھوں میں ہتھکڑیاں پہنے وہاں موجود تھا۔ سجاد رانا یہ معاملہ کسی اور پر چھوڑنے کے بجائے خود اس سے پوچھ گچھ کے لیے آگیا تھا اور اب اس شخص کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کس کے کہنے پر تم نے اس شخص کو زبردیا؟“ چند لمحوں تک اسے گھورتے کے بعد اس نے سر دیکھنے میں سوال کیا۔

”اللہ پاک کی قسم سراسیمہ میں نے کسی کو زبردیا نہیں دیا۔“ اپنی شررگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کا پختی آواز میں جواب دیا۔

”تو پھر بھاگ کیوں رہے تھے شہر سے؟“ اس نے کچھ اور کات دار لکھنے میں پوچھا۔

”میں بھاگ نہیں رہا تھا سراسیمہ میں کا فون آیا تھا کہ اس کے گھر والے کی طبیعت خراب ہے اس لیے میں ابھی ہی میں اپنی بہن کے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں پولیس والوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ میں نے بہت پوچھا مگر کسی نے نہیں بتایا کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر ہلاک آپ میں بند خولہ سر کا زہر دینے کا الزام ہے۔“ وہ اب کسی حد تک خود کو سنسناں چکا تھا اور شاید وہ سب کہہ رہا تھا جو اس دوران اس نے اپنی صفائی میں کہنے کے لیے سوچا تھا۔

”آپ خود سوچیں سراسیمہ میں بھلا اس خولہ سر اسے کیا دشمنی تھی جو میں اسے زہر دے کر مارا؟“ سجاد رانا کو براہ راست مخاطب کر کے یہ جواب دیتے ہوئے اس نے پہلے ٹھوک نکل کر اپنے خشک ہوتے حلق کو تر کرنے کی کوشش کی تھی۔ خود کو تیز اس سنسناں لینے کے باوجود بہر حال اس معمولی سپاہی کا ڈی آئی جی سے بات کرتے ہوئے پتہ پانی ہو رہا تھا۔

”میرے خیال میں ہاشمی صاحب... یہ شخص شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ بہتر ہے کہ اسے اس کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ لوگ خود ہی اس سے سارا جھوٹ اگوائیں گے۔“ اس کے بیان کو خاطر میں لائے بغیر سجاد رانا نے ایس کی کو مخاطب کرتے ہوئے سیات سے بچھے میں حکم دیا تو توہیر احمد کا جسم ایک بار پھر کانپنے لگا۔ اس نے پولیس کی ملازمت میں پانچ سال گزرا رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس

کے ساتھی اس سے بچا اگوانے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال کریں گے۔ ان طریقوں کو تجربوں پر آزمایا مختلف بات تھی، خود پر ہنسنا اور بات۔ وہ فوراً ہی ڈھٹے گیا۔

”میں بچ جاتا ہوں سراسیمہ میں آپ کو سب کچھ جانتا ہوں۔“ اس سے قبل کہ ایس کی کے اشارے پر اسے وہاں سے لے جایا جاتا، وہ فریادی بول پڑا اور دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

”بولو... لیکن بار کھتا کہ ایک لفظ بھی جھوٹ کہا تو تمہارے حق میں بہت بڑا ہوگا۔“ سجاد رانا نے اسے دھمکایا۔

”میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔“ اس نے یقین دہانی کروائی پھر ڈرا سا توقف کرتے ہوئے پوچھنا شروع کیا۔

”میں رات کے کھانے سے پہلے باہر بان والے کے کھوکھے سے ٹکریٹ لے گیا تھا۔ ٹکریٹ لے کر واپس آیا تو ایک عورت نے آواز دے کر روک لیا۔ بے چاری اچھی خاصی بوڑھی عورت تھی، اس کے ہاتھ میں سلور کا ایک نشتر تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ پولیس نے میرے بے گناہ بچے کو پکڑ لیا ہے۔ وہ بے چارہ پہلی قسمت کا مارا ہے کہ نہ تو مکمل طور پر عورت ہے نہ ہی عرصہ، لیکن بھائی اس نا کردہ گناہ کے جرم میں بے چارے کے ساتھ عداوت سے چٹھا آتے ہیں۔ باپ ناراض رہتا ہے کہ اس کی وجہ سے سر جھک گیا۔ ایک کے دے کر میں ایسی مایوسی ہوں جو اپنے خلیق جگر کا دکھ سمجھتی ہوں۔ اب بھی پولیس نے اسے گرفتار کیا ہے تو بہن بھائیوں اور باپ کو کوئی فکر نہیں۔ میں ہی ماری ماری پھر کر اس کے یہاں موجود ہونے کا مطمئن کرنے کے بعد یہاں آئی ہوں۔ پہلے کوشش کی تھی کہ اپنے بچے سے ملاقات کر لوں لیکن جواب ملا کہ بڑے صاحب کی اہانت نہیں۔ مجھ ہمت کی ماری کو اور کچھ نہیں آیا تو گھر پر اپنے بچے کے لیے کھانا بنا کر لے آئی۔ اب جب سے یہاں انتظار میں کھڑی ہوں کہ کوئی رحم دل شخص نظر آئے تو اس کے ذریعے اپنے بچے کو کھانا بھیجاؤں۔ تم تھانے سے نکلے تھے تب ہی تمہاری عقل دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ تم کی ٹیک ماں باپ کی ٹیک اولاد ہو۔ بیٹا اللہ کے واسطے مجھ دعاوی کی مدد کرو۔ میرے بچے تک یہ کھانا پہنچا دو۔“ اس کا بچہ بھر جائے گا تو میرے کچھ میں بھی ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ میں راتوں کی ماری ماں اس بھلائی کے بدلے میں تمہیں ڈھیر ماری دعا میں اور یہ پانچ سو روپے دوں گی۔ بس چننا اب اس عورت کی باتوں میں آگیا۔ کچھ میرا دل پیچھا، کچھ پانچ سو کے لالچ نے کام دکھایا۔ میں

لے کھانے کا قفن عورت سے لیا اور قیدی کو پہنچا دیا۔ صبح کے قریب میں سے چکر لگایا تو دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ہوند ہو کھانے میں کوئی غلطی ہو گئی۔ بڑی عورت بائیں بنا کر مجھے بے وقوف بنا گئی تھی۔ گھبراہٹ میں میری اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا، ڈیوٹی کا نام سنم ہوتے ہی میں گھر گیا اور پھر وہاں سے چند جوڑے لے کر گیس اڈے چلا گیا۔ خیال تھا کہ کچھ دن مہین کے گھر چھپ کر رہوں گا اور دیکھوں گا کہ معاملات کیا رخ اختیار کرتے ہیں لیکن راستے میں ہی دھڑلایا گیا۔

اس نے ایک سانس میں ہی سب کچھ کہہ ڈالا۔ سجاد رانا کی تجربہ کار نگاہیں کسی پوئی گراف مشین کی طرح اس کے کپے ہوئے ایک ایک لفظ کو چاٹتی رہیں۔ ان کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ اس نے سمجھتے نہیں کیا۔ واقعات اسی ترتیب سے پیش آئے ہیں جیسے اس نے بتایا ہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی عاقبت اور لالچ کی وجہ سے نہ صرف وہ پھنس گئے تھے بلکہ ایک اہم کلیہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ان کے ممبروں نے کئی دن کی محنت کے بعد جسم فروشی کے دھندے میں ملوث اس خولہ سرا کا پتا لگایا تھا۔ تحقیق سے معلوم ہوا تھا کہ یہ خولہ سرا کچھ بڑے عہدے داروں تک بھی رسائی رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر اسے مشکوک قرار دیتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا کہ ممکن ہے یہ شخص جاسوسی کا کام انجام دے رہا ہو۔ اگر وہ لوگ اس کی زبان کھولتے ہیں تو اس کا سبب ہو جاتے تو اس شخص تک رسائی ممکن ہو سکتی تھی جس کی گرفتاری میں یہ سب ہو رہا تھا مگر اس کی ہلاکت سے سارا منصوبہ ہی دھوا رہ گیا، ایذا اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی وہ دشمنوں کا ایک اہم مہرہ تھا جس کے ہاتھوں اپنے چھپنے سے قبل ہی انہوں نے خود ہی اسے پٹا دیا تھا۔

”لے جاؤ اسے اور چپک کر دیکھو اس نے کہا ہے ٹھیک ہے یا نہیں۔“ وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ حکم بے معنی ہی ہے لیکن تو یہ احمد پر جو قصہ تھا وہ کسی صورت تو ٹھکانا ہی تھا۔



”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھتی۔“
”بالکل سیدھی سادی تو بات ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم اپنی اس زبردستی کی بے جوڑ شادی کے خلاف قانونی مدد حاصل کرنے کے لیے درخواست دو۔ درخواست میں لکھ دو گی، تم صرف دستخط کرو دو۔ تمہاری درخواست کو آگے پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔“
فریدہ کے حیرت بھرے لہجے میں یہی بات کا جواب نہایت

دھماکا سے دیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اسے ساری بات سمجھائی۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ کیوں؟ آخر تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے کہ تم اپنے ہی گھر والوں کے خلاف مجھے آگسا رہی ہو؟“ وہ عمر میں کشور سے کافی چھوٹی تھی مگر دونوں کے درمیان حیثیت کا بھی واضح فرق تھا، اس کے باوجود وہ اسے مخاطب کرنے کے لیے ”تم“ کا مصیبتہ استعمال کرتی تھی۔
”میں تمہیں اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں، ظلم کے خلاف اکسار رہی ہوں۔ ایک عاقل و بالغ لڑکی کا کسی ذہنی طور پر ہمسائہ شخص سے نکاح اس کے ساتھ برابر نا انصافی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس ظلم اور نا انصافی کے خلاف آواز اٹھانے میں تمہارا ساتھ دوں۔“

”مگر تم یہ سب کر دیتی کیسے؟ تم بھی تو میری طرح اس حوصلے سے بنا اجازت باہر نہیں جاتیں۔ چلو مان لیا کہ تمہاری کوئی ملازمت میری درخواست کو کسی سرکاری دفتر تک پہنچا دے گی لیکن درخواست پر غور کروں کرے گا؟ سارے افسر اور قانون دان دے چودھری کی منجھ میں ہیں۔ کسی کی ہمت ہی نہیں ہوگی کہ انہیں کچھ کہیں۔“ فریدہ ہاپسی سے یوٹی۔
”اس بات کی تم فکر نہ کرو۔ جو کچھ کر سکتے ہیں انہوں نے ہی مجھے تم تک یہ پیغام پہنچانے کے لیے کہا ہے۔“ کشور سکرانی۔

”کون؟ کون ہے وہ؟“
”اس بات کو نہ دو۔ تم صرف درخواست بھجوانے کی بات کرو اور پھر انتظار کرو کہ کب تمہیں یہاں سے نجات ملتی ہے۔“ کشور نے اسے ٹالا۔

”یہاں سے نجات مل بھی گئی تو کیا فائدہ ہوگا؟ میرا جو نقصان ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا۔ اس حرکت کے بدلے میں اٹا میرے بھائی بھی پھنس جائیں گے۔ میں نے پہلے ہی انہیں ڈکا دکھ دیا ہے، اب ہور ان کی عزت خراب نہیں کر سکتی۔ اب جو بھی کرنا ہوگا، میں آپ ہی کروں گی۔“

”بے وفائی مت بنو۔ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہاں عورت کسی جانور کی طرح بے بس ہے۔“ اس کے انکار پر کشور بھٹکلا کر بولی۔

”تم نے وہ گل تو سن ہوئی نا کہ وقت آنے پر چھوٹی بھی باقی کو کاٹ لیتی ہے۔۔۔ بس میں بھی وقت کے انتظار میں ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، امت مانو میری بات۔ ایسا کرو کہ مجھے اپنے اس نزن قربان کا چاہتا دو۔ تم از کم میں اس بے

چارے کو تو تمہاری کوئی خبر نہ دے دوں۔“ اس کی خند دیکھتے ہوئے کشور نے بات کا رخ موڑ دیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ قربان کا نام سننے ہی فریدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس بار اس نے ہنسی میل و جھٹ کے اس کے سوال کا جواب دے دیا پھر یک دم ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کشور نے بھی اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور واپسی کے لیے اٹھ گئی۔ ہنزا و شاہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر کھلے دروازے سے اندر گئی تو اس نے وہاں فریدہ کو اس کے ساتھ ربر کی بڑی سی گیند سے کھیلنے ہوئے دیکھا۔ بہتر اثناء وہیں کو اپنے ساتھ کھیلنے یا کر بہت خوش تھا اور اس خوشی کا اظہار تالیاں بجا بجا کر کر رہا تھا۔ فریدہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی لیکن یہ مسکراہٹ خود پر کتنا جبر کرنے کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں پر سجائی ہوگی، کشور سمجھ سکتی تھی۔ دل میں گہرا مساف لیے وہ اوپری منزل سے اتر آئی۔ میڑھیاں اترتے ہی اس کا بڑی چودھرائی سے سامنا ہو گیا۔

”وڑے لاڈ ہو رہے ہیں نومی بھانج کے۔ جب دیکھو تب اوپر جاتی آتی نظر آتی ہے۔ وڑے چودھری صاحب نے منع بھی کیا ہے کہ اس سے زیادہ میل ملاپ کی ضرورت نہیں ہے، پر تیری مت میں تو کچھ آتا ہی نہیں ہے۔۔۔ جو جی میں آتا ہے وہی کرتی پھرتی ہے۔“ اسے میڑھیاں اترتے دیکھ کر اس نے فوراً تنقید کی۔

”فریادہ کیاں جاتی ہوں اماں! میں پورے دن میں ایک ہی پتھر تو لگتا ہے اوپر کا۔ اور وہ تو میں ہنزا و شاہ کے لیے بیٹے بھی لگاتی تھی۔“ وڑی چودھرائی سے بگاڑنا مناسب نہیں، یہ بات وہ بھی سمجھتی تھی چنانچہ نرمی سے ڈرا لاڈ بھرے لہجے میں بولی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور الماری میں کپڑوں کی دھڑے درمیان چھپا کر رکھا گیا موبائل نکال کر آن لائن ڈرا ویر میں وہ آفتاب کو آج فریدہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”آپ اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ اس طرح چپ رہ کر وہ اپنے ساتھ مزید ظلم کر رہی ہے۔“

”میرے خیال میں یہ کام میرے مقابلے میں قربان زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا ہے۔ میں نے فریدہ سے اس کا پتا معلوم کر لیا ہے۔ آپ اس پتے پر جا کر قربان سے ملیں۔ کسی دن موقع دیکھ کر ہم ان دونوں کی موبائل پر بات کروا دیں گے۔ قربان سمجھائے گا تو وہ مادے ڈر خوف بھول کر

ہماری بات ماننے پر راضی ہو جائے گی۔“ اس نے آفتاب کو قربان کا پتا بتا دیا تو اسے امید ملا ہوئی۔

”جو حکم پیغم صاحب! بندہ آپ کے حکم کا غلام ہے۔ آپ جیسا کہیں گی ویسا ہی کرے گا۔ ویسے کیا بات ہے؟ آج کل آپ کی طرف سے ملاقات کا حکم ملنا بند ہو گیا ہے؟ اب ہم خطر ہیں ایسے کسی پیام کو تو آپ کی طرف سے خاموشی ہے۔“ شجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ اچانک ہی خوشی پر اتر آیا اور کشور کو پھینچا۔

”اب اس کھنڈر سے اندر میل ہوم میں ملے کا جی نہیں چاہتا۔ اب کبھی ملیں گے تو ایسے ماحول میں جو ہمارے رشتے کے شایان شان ہو۔ جب سے میرے ہم کے ساتھ آپ کا کام جڑا ہے، اپنا آپ اتنا معتبر لگتا ہے کہ کسی عام سی جگہ پر آپ سے ملنے کے لیے آئے گا جی ہی نہیں چاہتا۔“ اس نے ٹھیکے لہجے میں جواب دیا۔

”بہت خوب! یعنی اب ملنے کے لیے لمبا انتظار کرنا ہو گا۔“ آفتاب نے ایک مصنوعی سدا بھری۔

”کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ میرا کچھل بیٹھا ہوتا ہے۔“ اپنے لیے اس کی بے قراری محسوس کر کے اس کے دل میں خشر کا احساس جاگا اور وہ کھٹکلا کر شغنی سے بولی۔ جواباً آفتاب اس سے کچھ کہتا، اس سے قبل ہی کمرے کے دروازے پر ہنک کی آواز ابھری۔ کشور نے جلدی سے لاکن کاٹ کر موبائل ایک دروازے ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے بھی کھڑی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ گجلی کی پھیل ہوئی باجھوں پر اندر ہی اندر جڑ بڑھتے ہوئے اس نے تختے سے پوچھا۔

”آپ کے کمرے کی صفائی کرنے کے لیے آئی تھی بی بی۔“ اس کے لہجے کی سختی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے ہنوز پھیل ہوئی باجھوں کے ساتھ بتایا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم تو ہے تجھے کہ میرے سارے کام رانی کرتی ہے مگر کس لیے منہ اٹھا کر پھل آئی ہے؟“ اس نے کچھ اور سختی سے اسے جھڑکا۔

”جیسی تباہی مرضی بی بی۔ میں تو ڈی چودھرائی کے کہنے پر آئی تھی۔“ وہ جھپ سے لہجے میں کہہ کر لیرائی مل کھائی وہاں سے آگے بڑھی۔ کشور دروازے پر ہی کھڑی پیر سوچ انداز میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ بڑی چودھرائی اس کے ساتھ چوے لہجے کا کوئی کھیل، کھیل رہی ہے۔ وہ کھل کر کبھی کچھ کہتی نہیں تھی لیکن آنے بھانے اسے جگہ ضرورت تھی کہ وہ اس کی نگرانی

کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ دل بھی دل میں خود کو مزید محتاط رہنے کی تلقین کرتے ہوئے گوشہ نشینی کے نظروں سے غائب ہونے پر حور واز سے پرے پلٹ کر واپس اپنے بیوی پر آکر لیٹ گئی اور سر ہانے دہی ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی لیکن یہ پڑھائی ایسی نہیں تھی کہ کتاب سے خود کو بہلا کر نظر انداز کرنا جاسکتی۔

☆☆☆☆

”ڈاکٹر ماریا کے متعلق آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل ہو چکی ہیں سر! آپ نے جو ایڈریس نوٹ کروایا تھا، وہ لاہور کے اسی گھر میں رہتی تھیں۔ محلے والوں کے مطابق وہ اور ان کی والدہ سٹوڈیا تقریباً تین سال سے اس گھر میں رہ رہی ہیں۔ محلے والوں سے ان لوگوں کا زیادہ ملنا جلتا نہیں البتہ سٹوڈیا آتے جاتے آس پڑوس والوں سے تھوڑی بہت بات کر لیتی تھیں۔ مجموعی طور پر محلے والوں کے مطابق دونوں ماں بیٹی شریف اور بے ضرر خواتین ہیں۔ ڈاکٹر ماریا کے بڑے بھائی آئے کے بارے میں سٹوڈیا نے ایک دو محلے داروں کو بتایا تھا اور یہ راز وہ ظاہر کیا تھا کہ چند دن بعد وہ خود بھی بیٹی کے پاس چلی جائے گی۔ سٹوڈیا نظر نہیں آتی تو ان لوگوں نے یہی خیال کیا کہ وہ بڑا بچا چلی گئی ہے۔ جن لوگوں کے ذمے میں نے یہ معلومات جمع کرنے کا کام لگایا تھا، انہوں نے ڈاکٹر ماریا کے گھر کا جائزہ لیا ہے۔ گھر کا کافی سامان بندھا ہوا ہے جس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ کمین کین جانے کی تیاری میں تھے۔ ڈاکٹر ماریا جس اسپتال میں جاب کرتی تھیں وہاں سے بھی یہی اطلاع ملی ہے کہ وہ بہت لمبی عرصے میں جاب چھوڑ کر گئی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسپتال سے اپنے واجلیت بھی وصول نہیں کیے۔“ عبداللہ نے حور پورٹ پیش کی وہ ڈاکٹر ماریا کی اپنے بارے میں مہیا کردہ معلومات کی تصدیق کر رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیٹے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹپک لگا اور دھیمی آواز میں بولا۔

”تھینک یو عبداللہ! اچھے امیڈ بھی تم یہ کام ذمے داری سے انجام دو گے اسی لیے میں نے اسے تمہارے سپرد کیا تھا۔“

”مجھے آپ کے اس اعتماد پر خوشی ہے سر! اللہ تعالیٰ جاپا تو میں آئندہ بھی آپ کے اعتبار پر پورا اتروں گا۔“ اس نے مودبانہ جواب دیا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”کیا بات ہے سر! آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟ کیا آپ کو ڈاکٹر ماریا پر کسی قسم کا کوئی شک ہے؟“

”نہیں... اصل میں، میں ان کی والدہ کے سلسلے میں

معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریا کے مطابق انہیں کسی نے جس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس غبار پر انہیں بالیک میل کر رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی کسی قسم کی حد کرنے سے قبل پہلے تصدیق کروا دوں جیسی کوئی اسٹیبلشمنٹ ہو۔“ تصویروں والا معاملہ اتنا ناگہان تھا کہ وہ اسے فی الحال عبداللہ سے بھی شیعہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اس لیے صرف اتنی ہی بات بتا کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”اوہ! آئی سی۔“ عبداللہ نے ہونٹ مسکڑے پھر پوچھنے لگا۔ ”کیا ڈاکٹر ماریا نے کسی پر شک ظاہر کیا ہے؟“ ”بہت صاف گفتگوں میں تو نہیں لیکن مجھے ان کی باتوں سے ایسا لگا تھا کہ شاید چودھری افتخار کی طرف سے انہیں پریشان کیا جا رہا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر گریز کی راہ اپنانے سے متنبہ جواب دیا۔

”پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ اس سلسلے میں ہمارا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟“ عبداللہ نے فوراً مستعد نظر آنے لگا۔ ”فی الحال تو ہم خاموش رہیں گے۔ اگر ڈاکٹر ماریا کی والدہ دو تین دن میں خود ہی واپس آجاتی ہیں تو تھینک ہے ورنہ پھر کوئی کارروائی کریں گے۔“ اس کا یہ جواب آپ کی فطرت کے خلاف تھا جسے عبداللہ نے محسوس تو کیا لیکن مزید کوئی سوال کیے بغیر اس سے اجازت لے کر بار پھر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی شہر پارک کی دیرینک سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ تصویروں والا یہ معاملہ کتنا بڑا اسکیڈزل بن سکتا ہے، وہ جانتا تھا۔ اس اسکیڈزل کے سامنے آنے پر ان کے خاندان کی ساتھ واؤ پر لگ جاتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے صرف تصویریں بھیجی گئی تھیں۔ جیسے والے نے نہ تو اپنا تعارف کروایا تھا اور نہ ہی کوئی ذیما ٹھہرا سائے رکھی تھی۔ ان حالات میں وہ چودھری افتخار سے براہ راست اس موضوع پر کوئی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ صاف مگر جانتا کہ یہ میرا کام نہیں۔ وہ ہنزا دشاہ کے لیے یہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا حوالہ بھی دیتا تو بے کار جاتا۔ جو تصویریں اسے بھیجی گئی تھیں، ان میں نہ تو ڈاکٹر ماریا کا چہرہ نظر آ رہا تھا، نہ ہی کوئی اور ایسی شے دکھائی دے رہی تھی جس سے ثابت کیا جاسکتا کہ تصویریں حور کی کے اندر بھیجی گئی ہیں۔ وہ عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ہر لمحہ یہی فکر رات کی کہ جانے ان تصویروں کی بنیاد پر کون سا مطالبہ کر دیا جائے۔ فی الحال تو وہ ایسی صورت حال میں پھنس گیا تھا کہ انکار کر نہیں سکتا تھا اور اقرار کرنے کا مطلب دشمن کے سامنے پسپائی اختیار کرنا تھا۔

”ڈاکٹر ماریا آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں سر!“ ملی فون کی گھنٹی پر اس نے چونک کر ریسورٹ اٹھایا تو دوسری طرف سے اسے اطلاع دی گئی۔

”تھینک ہے۔ بات کروائیں۔“ ڈاکٹر ماریا کا نام سن کر اس نے اجازت دی۔

”ہیلو اے سی صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ رابطہ ملنے پر دوسری طرف سے ڈاکٹر ماریا نے اس سے پوچھا۔ پھر اس کی طرف سے کوئی جواب دیے جانے سے قنن ہوئی۔ ”ظاہر ہے آپ پریشان ہوں گے۔ میں نے آپ کی پریشانی کا سوچ کر ہی آپ کو فون کیا ہے۔“

”تھینک یو سوچ۔“ وہ فی الحال یہی کہہ سکتا تھا ورنہ ڈاکٹر ماریا کے فون کرنے یا نہ کرنے سے اسے کیا فرق پڑتا تھا۔ اپنی مجبوری پتا کر وہ کسی بھی قسم کے تعاون سے پہلے ہی صاف افکار کر چکی تھی۔

”تھینک یو تو جب کہیں گے جب میں آپ کو اپنے پاس موجود ایک زبردست خبر دوں گی۔“

”بیمیں خبر؟“ اس کے لیے میں موجود جوش کو محسوس کر کے وہ اپنی کرسی پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھنے سے پوچھنے لگا۔ ”آپ کا فون تو محفوظ ہے نا؟ یہ نہ ہو کہ ہائیڈرو پمپ کوئی اور ہماری گفتگو سن لے۔“ اس نے خبر نہ آنے کے بجائے محتاط لہجے میں پوچھا۔

”اگر ایسی بات ہے تو آپ میرے موبائل پر کال کر لیں۔“ اس نے اپنا موبائل نمبر نوٹ کر دیا۔ ”تھینک ہے، میں ابھی کال کرتی ہوں۔“ اس نے کہا اور فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔ چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ اس کا موبائل کال آنے کی نشان دہی کرنے لگا۔ اس نے جھپٹ کر کال ریسپونڈ کی۔

”آپ کی خاطر میں نے ایک اہم کام تو کر ڈالا ہے لیکن ڈر رہی تھی کہ کہیں کسی اور کو اس بات کا علم ہو گیا تو خود میں مشکل میں پڑ جاؤں، اس لیے احتیاط ضروری سمجھی۔“ دوسری طرف وہی گئی اور اس کی ”ہیلو“ سننے کے بعد وضاحت پیش کر رہی تھی۔

”میں سمجھتا ہوں۔ آپ پلیز وہ بات بتائیں جس کے لیے آپ نے مجھے کال کی ہے۔ میرا موبائل بالکل محفوظ ہے۔ آپ اس بات کا اطمینان رکھیں کہ آپ جو کچھ کہیں گی، وہ میرے سوا کسی اور شخص کے علم میں نہیں آئے گا۔“ اپنے بیان کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے ڈاکٹر ماریا کو تسلی دی۔ ”مجھے اس جگہ کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے جہاں

جاسوسی ڈائجسٹ مارچ 2010ء

چودھری نے آپ کی تصویریں اور ان کے ٹیکھے رچھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ چودھری کے ذمے میں موجودہ خانے کے ایک کمرے میں خفیہ تجویزی ہے۔ اس تجویزی میں وہ اپنے خاص خاص کاغذات اور دوسری بیش قیمت اشیاء رکھتا ہے۔ آپ کی تصویریں بھی اسی تجویزی میں رکھی گئی ہیں۔“

”آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“ ڈاکٹر ماریا کی ہر جوش لہجے میں فراہم کردہ معلومات کو کن کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کل رات میں چودھری کے ذمے پر اس کے ساتھ ہی موجود تھی۔ شراب کے نشے میں چور جب وہ میرے ساتھ اپنی امن مانیوں کو رہا تھا، میں نے موقع دیکھ کر اس کے ساتھ یہ موشور جھپٹ لیا۔ میں نے کہا۔ چودھری صاحب! آپ نے اسے ہی شہر یا رکو جو شہر میں بھی ہیں، ان کو کچھ کر اس کا سارا فک تو آپ پر جائے گا۔ وہ با اختیار آدمی ہے، کچھ معلوم نہیں کہ آپ کی حور یا دغیرہ کی خلائی لینے پر اثر آئے۔ جواب میں وہ یو لاکر لیا تو ایسا ممکن ہی نہیں پھر بھی اگر کسی طرح یہ ممکن ہو جاتا ہے تو اسے ہی کے ساتھ کچھ نہیں آئے گا۔ میں نے وہ تصویریں بڑی حفاظت سے اپنی خفیہ تجویزی میں رکھی ہیں جس تک پہنچا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ بس پھر میں نے اس کو اس طرح اپنی باتوں میں الجھایا کہ اس نے خود ہی اپنی خفیہ تجویزی کے بارے میں ساری تفصیل اگل دی۔ مگر غصیٹے بے بڑا چالاک۔ آپ کے بارے میں تو زبان کھول دی لیکن میری ماں کے متعلق کچھ نہیں اگلا۔ اب کوشش کروں گی کہ اگلی بار میں اس کی زبان کھلوا سکوں۔“

ماریا نے اسے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے آپ کا مستقل چودھری کی غلوت میں آنا جانا ہے؟“

”ظاہر ہے، میں مجبور ہوں۔ میری کمزوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں اس لیے مجھے اس کا مطالبہ بھی ماننا پڑتا ہے اور آئندہ بھی اس وقت تک ماننا پڑے گا جب تک میں خود کو ان کمزوریوں سے چمکا رہا نہ ہوں۔“

”میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکوں۔“

”بہت شکریہ۔ فی الحال تو آپ خود کو بچانے کی کوئی تدبیر کریں۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے... اس کے مطابق بڑا بڑا میں مقرر بہ جو سالانہ میلہ لگنے والا ہے، اس کے حوالے سے آپ کو بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ چودھری کا پروگرام ہے کہ نیلے سے پہلے آپ کو پیغام بھیجا جائے گا کہ

جاسوسی ڈائجسٹ مارچ 2010ء

آپ اس کے راستے سے ہٹ جائیں۔ مزاحمت نہ کرنے کی صورت میں آپ کی تصویریں بھی منظر پر نہیں آئیں گی اور آپ کو انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے گا۔ اگر آپ انکار کرتے ہیں تو میلے میں دوسرے نشانوں کے ساتھ اپنی تصویریں بھی دکھانے کے لیے تیار رہیں گے۔ ویسے بھی اس بار بہت بڑے پیمانے پر میلے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کئی سیاسی اور سماجی شخصیات مدعو کی جائیں گی۔ میڈیا کو رنج تو لازمی ہے۔ سمجھیں، آپ بڑی طرح پھنس جائیں گے اس لیے بہتر ہے کہ جو کچھ کرنا ہے ابھی کر گزریں... بعد میں آپ کے پاس بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ وہ بہت ظلوں سے مشورہ دے رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر شہر یار کے دگ و پے میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔

اس بار چودھری نے اس پر بہت کاری وار کیا تھا۔ سب کچھ اگر اسی ترتیب سے پیش آجاتا جس طرح ڈاکٹر ماریا کے مطابق چودھری نے پلان کر رکھا تھا تو وہ بڑی طرح پھنس جاتا۔ چودھری کے سامنے ہتھیار ڈال دینے یا اپنے خاندان کے ناموس کو داؤ پر لگا دینے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ رہتا اور ان دو آپشنز میں سے کسی ایک کا بھی انتخاب کرنا اس کے لیے ناقابل قبول تھا۔ اس وقت تو ڈاکٹر ماریا کی صورت میں ایک طرح سے اس کی ٹیبلی امداد ہوتی تھی۔ وہ چودھری کے بچھانے ہوئے چال میں خود کو پھنسنے سے بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار سکتا تھا۔

”آپ مجھ سے جتنا کوا پرہٹ کر رہی ہیں اس کے لیے بہت بہت شکریہ ڈاکٹر ماریا... یلپڑا آپ مجھے چودھری کی خفیہ تجویزی کے متعلق تعصبات سے آگاہ کریں۔“ اس نے بے حد ممنونیت سے کہتے ہوئے درخواست کی۔ جواب میں ڈاکٹر ماریا سے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے لگی۔

☆☆☆

کرتی پریشی اور غیر عورت کی نظریں وال کلاک پر جی ہوئی تھیں۔ تین بجے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اسے صرف پانچ منٹ ہی انتظار میں گزارنے تھے۔ پانچ منٹ بعد اس کی معاون لڑکیاں وہاں پہنچ جائیں۔ ندا اور دنانی وہ دونوں لڑکیاں وقت کی بے حد پابند تھیں۔ انہیں اس شادی دفتر میں اس کے زیر نگرانی کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزارنا تھا لیکن وہ یہ بات بہر حال جانچ چکی تھی کہ دونوں لڑکیاں وقت کی پابندی کے معاملے میں بے حد ذمے دار تھیں۔ انہیں ہر روز شام چھ بجے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا تھا اور انہوں نے بھی اس سلسلے میں کوئی ہی نہیں برتی تھی۔ آج بھی

انہیں معمول سے تین گھنٹے قبل پہنچنے کا حکم دینے کے باوجود وہ مطمئن تھی کہ دونوں اپنی عادت اور تربیت کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گی۔ یہ یقین بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ سب مل کر جن لوگوں کے لیے اور جس ناسک پر کام کر رہی تھیں، اس میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ذرا سی کوتاہی اور غفلت کا انجام ناکامی اور تڑکیل کے ساتھ ساتھ بسا اوقات موت بھی ہو سکتا تھا اس لیے وہ سب بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اب بھی انتظار کے چار منٹ مزید گزرے تو اس نے میسر حویں پر کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ پھر پیرولی حصے میں جو کہ یک وقت انتظار گاہ اور استقبالہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، دونوں لڑکیوں کے چلتے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک منٹ کا مختصر دور اور جیسے ہی گزرا اور گھڑی نے تین بجنے کا اعلان کیا، اس کے آفس کے دروازے پر دھک کی آواز ابھری۔

”ہیں... کم این۔“ اس نے ٹروکار انداز میں اجازت دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور دو نوجوان لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ دونوں لڑکیوں نے جدید تر شاخراش کے شلوار قمیض زیب تن کر رکھے تھے۔ ان کی شکلیں آپس میں کافی ملتی جلتی تھیں جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آپس میں بہنیں ہیں۔

”ہیو آئیٹ۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں ان دونوں سے کہا۔

”تھیک یو میڈم۔“ وہ دونوں کرسیاں کھسکا کر ان پر بیٹھ گئیں اور ہر سوال کے منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس طرح بے وقت اپنے ملائے جانے پر وہ اندرونی طور پر بے حد الارٹ تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ حصول سے ہٹ کر دفتر بلائے جانے کا مطلب تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔

”تم دونوں جاری بہت اچھی در کر رہو۔ اب تک تمہیں جو بھی کام سونپا گیا، تم دونوں نے ہی اسے بہت اچھے طریقے سے انجام دیا لیکن آج جوڈے داری تمہیں سوچی جاتی ہے، وہ دھڑلے پر مختلف ہے بلکہ بے حد نازک بھی ہے۔ اس کام کو کرنے میں تمہیں بے حد ہوشیاری اور ہوش مندی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ناکامی کا نتیجہ صرف ایک صورت میں نکلے گا اور وہ ہے موت۔“ اس نے اپنے سپاٹ اور سرد لہجے میں گفتگو کے لیے تہدید باندھی۔

”ہم ہر ممکن طریقے سے اپنے کام کو پوری جان سے ساتھ انجام دیتے گی کو خوش کریں گے۔ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر ایسا ہو ہی گیا تو اوپر سے حکم آنے سے پہلے ہم خود اپنے لیے موت کا انتخاب کر لیں گے۔ ہمارا جیون

ہمارے دلش کی امانت ہے۔ ہمارے پانے بھی فرض کو بھایا تھا، ہم سے بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔" ندا ٹامی لڑکی نے جواب دینے کا فریضہ انجام دیتے ہوئے لپٹیں دہائی کر دیا۔ "گدا مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اس کا لہجہ ذرا سائز ہو اچھر وہ ان دونوں کو ان کا کام سمجھانے لگی۔ وہ دونوں پوری توجہ سے اس کی بات سنتی رہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ کام کی نوعیت بچ بچ ہی حساس ہے۔ اس سے قبل انہوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ بہر حال، انہیں اس سے کام کو کر کے میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"تم لوگ میری بات سمجھ گئی ہو؟"

"میں میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ سب کچھ آپ کی ہدایات کے مطابق ہی ہوگا۔" ندا نے جواب دیا۔ اگرچہ دیکھنے پر دونوں بہنوں میں چھوٹی بڑی کا اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن وہ جس طرح ہر سوال کا جواب دینے کی ذمہ داری خود انجام دیتی تھی، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ وہ بڑی بہن ہے۔

"ٹھیک ہے پھر تم دونوں روانہ ہو جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ سچہ بچے ہمیں یہاں اپنی ڈیوٹی پر دوبارہ موجود ہونا چاہیے۔" اس نے وال ٹاک کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا تو وہ دونوں خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ استقبال پر ان کی مطلوبہ اشیاء موجود تھیں۔ حنا نے ایک تھیلا کھول کر اس میں موجود اشیاء باہر نکالیں۔ یہ ایک سیاہ رنگ کا برتن، ایک بڑی سی چادر اور دو عدد سن گھاسڑ تھے۔ برتن اس نے نما کو تھیلا اور خود چادر اوڑھ لیا۔ اس کے چادر اوڑھ کر ایک چلو کو کتاب کے انداز میں چہرے پر پھیلا کر من گھاسڑ لگانے تک ندائے بھی برتن اوڑھ کر من گھاسڑ لگالے۔ ان دونوں کو دیکھ کر اب کوئی بہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں جو کچھ دیر قبل اس دفتر میں بیٹھیں تھیں۔

اس تیار سے پہلے جانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو "اوکے" کا اشارہ دیا اور ندائے دیاں رکھا دوسرا بیک اٹھا لیا۔ کیونکہ یہ بیک اٹھا خاصا بھاری تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوئی تو اس بیک کو اٹھانے میں غرے دکھائی لیکن اسے مستحق ورزش اور یوگا کی عادت کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس کے بیک اٹھا کر باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہی حنا نے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے قدموں کو حرکت دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیٹ بیک تھا۔ اپنے ڈائی پرس ان دونوں نے پہلے ہی ایک دراز کھول کر اس میں رکھ دیے تھے۔ دفتر سے نکل کر وہ آرام سے

سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نیچے کی طرف جانے لگیں۔ اس چار منزلہ عمارت میں مختلف نوعیت کے کئی دفاتر تھے۔ سڑھیاں اترتے وقت کسی نے انہیں دیکھا بھی ہوگا تو زیادہ نوٹس نہیں لیا ہوگا اور یہی سمجھا ہوگا کہ دونوں خواتین کی شادی دفتر میں اندراج کے لیے یا پھر کسی عامل یا پروفیسر کے پاس اپنے کسی رکے ہوئے کام کی تکمیل کے لیے یہاں آئی ہوں گی۔ اس عمارت میں اس قسم کے دفاتر کی بھرمار کی وجہ سے اس طرح کے طے والی خواتین کا مسلسل آنا جانا لگا رہتا تھا اور کوئی بھی ان کے آنے جانے کا نوٹس لینے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔

عمارے سے باہر نکل کر وہ دونوں پیدل چلی ہوئی قریبی بس اسٹاپ کی طرف بڑھیں اور اسٹاپ پر آنے والی پہلی بس میں سوار ہوئیں۔ حنا نے کنڈیکٹر کو گراہیہ ادا کیا۔ دو اسٹاپ گزرتے ہی وہ دونوں بس سے اتر گئیں۔ یہاں سے وہ پھر ایک بس میں سوار ہوئیں۔ اس بس میں انہوں نے صرف ایک اسٹاپ کا قافلہ طے کیا اور پھر ایک رکشے میں بیٹھ کر اسے ایک معروف مارکیٹ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے دفتر کے بیٹھے سے براہ راست رکشے میں بیٹھ کر مارکیٹ تک جا سکتی تھیں لیکن وہ جو کام انجام دینے جا رہی تھیں، اس کے لیے احتیاط کا قافلہ خاصا بھی تھا کہ کوئی رنگ نہ لیا جائے۔ اب ان کی طرح وہ کسی کی نظروں میں آجھی جاتیں تو رکشے والا بعد میں ان کے دفتر کی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا۔

مارکیٹ تک کا قافلہ انہوں نے خاموشی سے گزرا۔ مارکیٹ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دو دکانوں سے خریداری کی اور بنا کسی جمل و جبت کے دکان دار کو اس کی مطلوبہ قیمت ادا کر کے آگے بڑھ گئیں۔ اب ندا کے ہاتھ میں کیونٹ بیک کے علاوہ مزید دو شاپنگ بیک اور نظر آرہے تھے۔ حنا نے بھی ایک بڑا سا شاپنگ بیک اٹھا رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ کافی دیر سے مارکیٹ میں ہیں اور بہت سی خریداری کرنے کے باوجود ابھی اور بھی بہت کچھ لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ دونوں اپنے دایک بائیں موجود دکانوں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ آخر انہیں ایک ایسی دکان نظر آئی جو ان کی مطلوبہ خصوصیات کی حامل تھی۔ یہ ایک کپڑے کی دکان تھی جس میں قہقہے پر چاند نیلیں بچھا کر کپڑے کے تھان ڈالے گئے تھے۔ وہ چادر اور انہیں کو کافی کے سوٹ ڈھکی پر بے نظر آرہے تھے۔ دونوں انہیں اس دکان میں داخل ہو گئیں۔ دکان کافی تنگ تھی۔ تخت اور گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے بچھائی گئی بیچوں کے درمیان کا فاصلہ اتنا کم تھا کہ گاہک بچ

بیٹھنے تو ان کے گھٹنے تخت سے تقریباً ٹکرائے گئے۔ وہ دونوں دکان پر موجود تین خواتین کے درمیان سے راست بنائی بمشکل اندر داخل ہوئیں اور پھر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود تھیلے نیچے زمین پر قدموں کے قریب رکھ لیے۔ ان تھیلوں میں کیونٹ کا وہ بھاری بیک بھی شامل تھا۔

"جی ہاں! کیا دکھاؤں آپ کو۔" ان کے بڑے اچھے برنٹ آئے ہوئے تین میرے پاس۔" ایک سٹریٹ فور ان اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اچھا تو پھر دکھاؤ۔" حنا نے اسے جواب دیا۔ وہ تھان کھول کر ان کے سامنے پھیلائے لگا۔ ساتھ ہی سٹریٹ فور کی دکان پر چوبیس بیانی کا مظاہرہ بھی کرتا رہا۔ "یہ سوٹ دیکھیں بائی، بالکل نیا برنٹ آیا ہے اور یہ والا کھڑو آج کل بہت ہی اچھا ہے۔" وہ ہر تھان کھولتے ہوئے تقریباً اسی طرح کے بیٹے ادا کر رہا تھا۔

"اور بھی دکھاؤ۔" اس کے ہاتھ چھ تھان کھولنے کے بعد ندائے فرمائش کی۔ دکان پر موجود دوسری گاہک خواتین اپنے لیے کپڑے کا انتخاب کر چکی تھیں اور اب ان کی سٹریٹ فور سے قیمت پر بحث چلی رہی تھی۔

"جی ہاں! آپ تو بہت ہی کم قیمت لگا رہی ہیں۔ اتنی تو ہماری خرید بھی نہیں ہے۔ آپ کے لیے میں ایسا کرتا ہوں کہ بچاں روپے کم کروا دیتا ہوں۔" وہ بیٹھیں، اب مزید بحث مت بیٹھ گئے۔ انہیں کپڑے دکھاتے ہوئے سٹریٹ فور نے اپنے ساتھی کی مدد کرتے ہوئے ان کے درمیان ہونے والی بحث میں دخل دیا۔ اسی وقت ندائے اپنے بڑے قریب رکھے کیونٹ بیک کو چپکے سے تخت کے نیچے چھپا لیا۔

"یہ وائے برنٹ کا ایک سوٹ ہیں نکال دیں اور دوسرا وہ فریڈی والا دے دیں۔" حنا جس نے ندا کی کارروائی دیکھ لی تھی، کام مکمل ہوتے دیکھ کر سٹریٹ فور سے فوراً اس کی بات پر عمل کیا۔ البتہ اس کی زبان مسلسل ان دونوں خواتین کو تنویر کرنے کے لیے مصروف رہی تھی۔ ان دونوں نے بغیر کسی جھٹ و مباحثہ کے اپنے خریدے ہوئے سوٹوں کی قیمت ادا کی اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرا خرید ہوا سامان بھی اپنے پیروں کے پاس سے اٹھا کر دکان سے باہر نکل گئیں۔ اس سامان میں وہ کیونٹ بیک شامل نہیں تھا۔ کپڑے کی دکان سے نکلنے کے بعد انہوں نے کسی اور دکان کا رخ نہیں کیا اور مارکیٹ سے نکلی چلی گئیں۔ یہاں سے انہوں

نے پہلے والے طریقے پر ہی عمل کرتے ہوئے واپس اپنے دفتر کا رخ کیا لیکن بس سے اترنے کے بعد وہ دونوں اکٹھی عمارت میں داخل نہیں ہوئیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی ایک ساتھ دوبارہ دکھائی دینے پر وہ کسی کے نہیں میں آسکتی تھیں چنانچہ احتیاطاً باغیچہ کا وقت دے کر اندر گئیں۔

دفتر چھ کر انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی چھ نہیں بچے تھے۔ برتن اور چادر سے جمات حاصل کر کے واپس پہلے والے طے میں آنے کے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ انہوں نے پھر تپ سے یہ کام انجام دیا۔ خریدی ہوئی اشیاء اور برتن وغیرہ کو ایک کلماری میں رکھنے کے بعد وہ استقبال پر یوں تروتازہ کھڑی تھیں جیسے ابھی ابھی دفتر آئی ہوں۔ ٹھیک چھ بجے ان کے پاس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ان کی پاس کے باہر آنے کے بجائے صرف دروازے سے ہی جھانک کر ان کی طرف دیکھا۔ ندا نے اٹھیں کی مدد سے کھڑکی کا نشان بناتے ہوئے اسے دیکھا۔ جواباً اس نے مہلتیں سے انداز میں اپنا سر ہلایا اور واپس پلٹ گئی۔

حنا اور ندا جو کہ درحقیقت ارمیلا اور گیتا تھیں، اس کی بہت کارآمد ماتحت تھیں۔ اسے ان سے ای کارکردگی کی امید تھی۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوئیں اور جنس جاتیں تو بھی لوٹ کر واپس دفتر نہیں آئیں۔ چھپنے کی صورت میں وہ اپنے دیے ہوئے وجہ کے مطابق وہ نہ ہریلا کپھول نکل لیتیں جو بہت وقت ان کے پاس موجود رہتا تھا۔ وہ کوئی عام لڑکیاں نہیں تھیں جو موت کو گنگے لگاتے ہوئے ہچکچاتیں۔ ضرورت پڑنے پر جان دینا اور جان لیتا انہیں بہت اچھی طرح سکھا گیا تھا۔ وہ "نرا" کے بارے تازہ بحث راجیش شرمہ کی بیٹیاں تھیں۔ راجیش شرمہ نے اپنی ساری زندگی پاکستان میں ہی گزار دی تھی۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا تھا جو کٹر براہمن تھا۔ اس کے باپا چچا تقسیم کے وقت پاکستان سے ہجرت کر کے بھارت تو گئے تھے لیکن انہوں نے تقسیم کے فیصلے کو قطعی غلط قرار دیتے ہوئے ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر ڈال دی۔ ان اٹھاپنچسہ والدین کے زیر سایہ پنے والا راجیش بھی انہیں جیسی سوچ کا حامل تھا چنانچہ پاکستان میں اپنے بے خدمت انجام دینے والوں کے خلاف شریعتی دالوں کی نظر انتخاب اس پر پڑ گئی۔ وہ ان کے لیے کام کرنے پر یہ خوش راضی ہو گیا لیکن اس کی زندگی نے زیادہ واقف نہیں کی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے آقاؤں نے اس کی بیوی ستیا سے رابطہ کیا۔ ان کے مشورے پر ستیا نے اپنی دونوں بیٹیوں سمیت دکھاوے کا اسلام قبول کر لیا۔ اب وہ بچیاں جوان ہو

جنگی تھیں۔ لوگ انہیں جنا اور نما کہہ کر پکارتے تھے لیکن ان کی تربیت جن خطوط پر ہوئی تھی، اس کی وجہ سے وہ اندرونی طور پر اب بھی ارمیلا اور گیتا تھیں۔ بھارت باتا کی وہ قابل فخر بیٹیاں جن کے لیے جان دینا اور لینا ایک تکمیل تھا۔ شادی دفتر کی آڑ میں انہوں نے اپنے قدم خوب بھرا رکھے تھے۔ اس دفتر کی انچارج اور ان کی باس ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرنا خوب جانتی تھی۔ ان کی کارکردگی کے پیش نظر اس نے بڑے بڑے افسروں سے کئی قیمتی راز اٹھوائے تھے اور اب اپنے موہن فون پر ریڈیو لگائے مختلف انٹیلیجنس بیوروں پر بھی۔ آخر ایک انٹیلیجنس سے نشر ہونے والی نوٹ نے اس کے کانوں تک اس کی مطلوبہ خبر پہنچا دی۔ شہر کی معروف مارکیٹ میں ایک کپڑے کی دکان پر ہونے والا ہجوم دھماکا کا کئی ہلاکت خیز ثابت ہوا تھا۔ دھماکے نے اس دکان کے ساتھ ساتھ اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کی کئی دکانوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رش کا وقت ہونے کی وجہ سے تمام ہی دکانوں پر اچھے خاصے گاؤں موجود تھے چنانچہ بڑی تعداد میں چلاکتوں کے ساتھ ساتھ کافی لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔

”وزیراعظم نے کہا ہے کہ اس قسم کی پرتشدد کارروائیاں کرنے والوں کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے گا اور کسی کو عوام کی جان و مال سے کھینچنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“ نندو ریڈیو خبریں پڑھتے ہوئے وہی روایتی بیان دہرا رہی تھی جو اس سے قبل بھی ایسے مواقع پر دیا جاتا رہا تھا۔

”ہمیں کسی کی اجازت کی ضرورت ہے بھی نہیں۔“ وہ مسکراتے لیوں کے ساتھ بڑبڑاتی۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

”ہیں... کم ان۔“ اس نے تیزی سے اپنے چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے اجازت دی۔ لدا کی صحبت میں ایک عمر رسیدہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔ خاتون شکل اور لباس سے کافی خوش حال لگ رہی تھیں۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر جب انہوں نے اپنی بیٹی کی تصویر سامنے رکھتے ہوئے اس کے اوپر اپنے کواکف بٹانا شروع کیے تو اس کے انداز کے تقدیق ہو گئی۔ وہ این ماڈن میں سے تھیں جن کی بیٹیاں اپنے آئینہ میں یوں سماجی کے اعتبار میں عمر کا قیمتی حصہ گزار دیتی ہیں اور بعد میں مائیں ان کی تصویریں پر میں ڈالے ان کے لیے کسی مناسبت برکی تلاش میں شادی دفتروں کی خاک بھانچتی پھرتی ہیں۔ خاتون کا مسئلہ نہایت ہمدردی سے سنتے ہوئے اس کے چہرے پر اتنی نرمی تھی کہ کوئی اندازہ ہی نہیں لگ سکتا کہ ابھی کچھ دیر قبل یہ عورت

ایک بم بلاسٹ کی خبر سن کر بڑی سفاکی سے مسکراتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کی چست پیٹ پر سیاہی جڑی پہن کر اس نے ہاتھوں میں دھاتے اور بیروں میں کیڑوں کے سیاہ جوتے پہنا رکھے اور الماری کھولی کر دراز میں سے روٹو اور کھال کر اپنی ٹیٹ کے ساتھ لپکتے ہوئے شیش پر رکھا اور اسے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی گیا۔ رات ابھی خاصی گزر چکی تھی چنانچہ ملازم سونے کے لیے جا چکے تھے اور پورے جنگے میں شام سا چھا ہوا تھا۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا بچا کوئی آواز پیدا کیے بغیر نکل آیا۔ پھر کچھ دیر اس کی گاڑی کے ساتھ ہی ایک میٹھا آڈی ڈی سیڈی ہانک کھڑی تھی۔ اس کے میٹھل کے ساتھ ہی سیاہ رنگ کا ہیڈسٹ فلک رہا تھا۔ اس نے ہیڈسٹ اٹھا کر اپنے سر پر پہنا اور پیٹ کی جیب سے تھپتھا کر اس میں سے چابیاں برآمد کیں۔ ان چابیوں میں ایک چابی اس ہانک کی تھی لیکن وہ چابی لگا کر ہانک کا انجن اشارت کرنے کے بجائے اسے دھکیلتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گیٹ پر چوکیدار مستعد کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے بے حد پھرتی مگر خاموشی کے ساتھ گیٹ وا کر دیا۔

”خیال رکھنا ڈرائیو کو بڑبڑاتی میرے اس وقت باہر جانے کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔“ اس نے دیکھی مگر بے حد ختم آواز میں چوکیدار کو قسم دیا۔

”آپ بے فکر رہیں میرا میں کسی کے سامنے کچھ نہیں کہوں گا۔“ چوکیدار نے اسے یقین دلایا۔ شہر پار نے شام کے بعد ہی اسے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ رات کو پورے کچن باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کی یہ آمد وقت فطری ہوگی اس لیے وہ پوری طرح مستعد رہے تاکہ جنگلے میں موجود کسی اور ملازم کو کھربند ہو سکے۔ چوکیدار ظاہر ہے اس پر دو گراہم کوئٹ کر حیران ہوا ہو گا لیکن سوال کر کے اپنی اس حیرانی اور تجسس کو دور کرنے کی اس کی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے شہر پار کی اطلاع کے مطابق کسی بندے کی جنگلے پر پہنچائی جانے والی ہانک بھی خاموشی سے پرکھیں اس کی گاڑی کے پہلو میں کھڑی کر دی تھی۔ اندازہ تو اسے ہانک کو کچھ کرسی ہو گیا تھا مگر اسے ہی صاحب اپنی شان دار گاڑی چھوڑ کر اس ہانک پر کھنکھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اب اسے ہانک سمیت باہر کی طرف جاتے دیکھ کر تعجب ہی ہو گئی۔

”میں چند لمحوں تک واپس آ جاؤں گا۔ تم ہوشیار رہنا۔ یہ نہ ہو کہ میرے واپس آنے تک سو جاؤ۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر۔“ اس نے مستعدی سے جواب دیا۔ شہر پار نے دیکھ کے بتایا ہانک کو دھکیلتا ہوا جنگلے سے ڈرا آگے لے گیا اور پھر یہ اطمینان ہونے کے بعد کہ اس محفوظ فاصلے سے ہانک اشارت ہونے کی آواز جنگلے کے اندر سونے ہوئے ملازمین میں سے کسی کے کانوں میں پڑ کر اسے بیدار کرنے کا سبب نہیں بنے گی، انٹیلیجنس میں چابی ڈال کر ہانک اشارت کی۔ موٹر سائیکل کا انجن غرایا۔ آگے ہی گئے وہ اس دو پہیوں والی قطعی غیر افسرانہ سواری پر بیٹھا ہوا ہو چکا تھا۔ حکمرانی کے اصول و قواعد کی مجبوری اپنی جگہ خود اسے ذاتی طور پر یہ سواری بڑی پسند تھی۔ دور مطالبہ علمی میں وہ عموماً موٹر ہانک پر ہی ستر کرتا پسند کرتا تھا اور اسے اس دو پہیوں کی سواری کو چلانے میں خاصی مہارت بھی حاصل تھی اس لیے اس وقت بڑے آرام سے اپنی منزل کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

آج اسے جس مشن پر جانا تھا وہ قطعی غیر سرکاری نوعیت کا... بلکہ اس کے عہدے کی شان سے متصادم تھا لیکن اس کی رگوں میں دوڑتے جوان اور گرم خون کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ڈاکٹر دیا سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور اب اس پر عمل پیرا بھی تھا۔ اس کی فور ورجنل گاڑی کے بجائے ہانک کا انتخاب اس نے اس لیے کیا تھا کہ اس چھوٹی سی سواری کو کہیں بھی چھپانے میں آسانی رہتی تھی جبکہ گاڑی آسانی سے نظروں میں آ جاتی پھر اس کی گاڑی تو کبھی بھی جانی پہچانی... اور وہ یہ قطعی نہیں جانتا تھا کہ کوئی شخص بطور اسٹیشن کھنڈر اسے شناخت کر سکے۔ ہزاروں بے باک ہوتا اپنی جگہ لیکن ذہن کی کھچا رہیں ہاتھ ڈالنے سے قبل جو لازمی احتیاط تھی، وہ تو اسے کرتی ہی تھی۔

اپنی آج کی اس مہم پر جاتے ہوئے اسے مشاہیرم خان بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اس جیسا ہزاروں جاں نثار شخص اس مہم میں اس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اپنے ساتھ ضرور لے کر جاتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ گھٹان روڈ پر جہاں آنے والے خونی تصادم میں مشاہیرم خان بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ خود ذاتی طور پر تو وہ یہی کہتا تھا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن شہر پار نے اسے ابھی تک ڈیوٹی پر آنے کی اجازت نہیں دی تھی اور وہ لاہور میں ہی مقیم تھا۔ ان حالات میں وہ اسے ایک ایسے سمر کے پرانے ساتھ لے جاتے کے لیے کیسے بلا سکتا تھا جہاں کافی اٹھانچ کی امید تھی۔ مشاہیرم خان کے بعد جس دوسرے شخص پر اسے اعتبار تھا وہ عبداللہان تھا لیکن عبداللہان نے ذرا مختلف فطرت کا آدمی

تھا۔ وہ اس سے کہتا تو وہ ساتھ چل پڑنے پر راضی تو ہو جاتا لیکن بارودھاڑ اور اچھل کود اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر اس میں اور مشاہیرم خان میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ مشاہیرم خان کم تجسس کرنے والا، سیدھا سادہ اور خاموشی سے حکم کی تعمیل کرنے والا آدمی تھا جبکہ عبداللہان عرصے سے بیورو کرکسی کا ایک چھوٹا سا گھڑوہ ہونے کے باعث بے حد ذہین اور معاملہ فہم تھا۔ اپنی تربیت کے مطابق تجسس اور کھوج کی عادت اس کی فطرت کا تانبہ بن چکی تھی۔ وہ خاموش رہتا اور اس سے کوئی سوال نہ کرتا، تب بھی معاملہ بھابھ جاتا اور شہر پار نہیں جانتا تھا کہ تصویروں والا معاملہ کسی بھی شخص کے علم میں آئے۔ بالائی بالا اس معاملے کو نشتانے کی جو سیل ڈاکٹر پارک کے تعاون کی وجہ سے نکلی تھی، وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتا جا رہا تھا۔

ہانک کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس نے پیر آباد تک کا فاصلہ عموماً دو روایتی سے نصف وقت میں ہی طے کر لیا البتہ پیر آباد کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اسے احتیاط کرنی پڑی۔ تاہم وار کے راستے پر پہلے کے مقابلے میں قدرے کم رفتار میں ہانک دوڑتا ہوا آخروہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں چودھری کا ڈیرا موجود تھا۔ ڈیرے کی عمارت سے کچھ فاصلے پر اس نے ہانک کا انجن بند کر دیا اور اسے کھینچتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ ڈیرے کے قریب ایک درخت کی آڑ میں چھپ کر اس نے ہانک کھڑی کی اور خود بے قدموں ڈیرے کی عمارت کی عجمی دیواری کی طرف بڑھنے لگا۔ دیوار بہت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یقیناً اپنی ریاست میں واقع اپنے اس خاص ٹھکانے میں کسی کے کھینچنے کی جرأت کرنا چودھری کے خیال کے مطابق ناممکن ہو گا اس لیے زیادہ بلند و بالا دیواریں تعمیر کرنے کی دھمک نہیں کی تھی۔ اس بے نیازی کی دوسری وجہ یہ کہ کتے بھی تھے جو اس کے نوکروں کے علاوہ پھر سے داری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اگر کوئی شامت کا مارا دیواریوں کی کم بلندی دیکھ کر چوری چکاری یا کسی دوسرے مقصد کے لیے ڈیرے میں کھنچنے کی کوشش کرتا تو چوکیداری پر مامور بے کتے اسے چیر بھاڑ کر رکھ دیتے۔ وہ خود ڈاکٹر پارک کی فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے ان کتوں کی موجودگی سے واقف تھا چنانچہ بے خبری میں مارے جاتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دیواری کی منڈیر پر ہاتھ جھرا کر ایک کراس پر چڑھنے کے بعد اس نے دوسری طرف چلا گیا لگنے کی قطعی قطعیت نہیں کی اور وہیں بیٹھ کر پھر سے دارکھنوں کا انتظار کرنے لگا۔

سائیکس رگور بالور اس کے ہاتھ میں بالکل تیار تھا۔ انتظار کا یہ دورانیہ چند سیکنڈ سے زیادہ کا ثابت نہیں ہوا۔ اس کی جیک وارڈر جن نظروں نے اس طرف غمو دار ہونے والے دو جسم کوں گھور رہی دیکھ لیا۔ اس نے تہمت بھرتی سے ریوالور کی نال سیدھی مٹی اور پتلی دہادی۔ ریوالور سے گولی نکل کر آگے والے کتے کے سر میں ٹھک سے لگی اور وہ جین ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا آگے سامنے گولی کرتے دیکھ کر خشک اور پھر زور زور سے بھونکنے لگا لیکن اس نے اسے زیادہ بھونکنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے ریوالور سے نکلنے والی گولی اس دوسرے کتے کے بھی سر میں بیست ہو کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر گئی۔ دوسرے کتے کے جہان فانی سے کوچ کرتے ہی اس نے دیوار پر سے چھلانگ لگائی اور ڈیرے کے احاطے میں کود گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈیرے پر رات کے وقت پہرے داری کا فریضہ انجام دینے والے توں کی تعداد صرف دو ہی تھی۔ وہ دونوں اپنے اس فرض سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فارغ ہو چکے تھے اور اسے ان کے کسی بھائی بندے کی آمد کا خوف بھی نہیں رہا تھا چنانچہ وہ قدرے اطمینان سے مگر متبادہ قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ یہ چوہری کا ڈیرا تھا اور یہاں اس کے گرگوں کا موجود ہونا لازمی تھا۔ چھانچا انداز میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اس بات کی بھی امید کر رہا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی سپید جانتے کے لیے اس طرف کا رخ کرے گا لیکن اس کی توقع کے خلاف کوئی شخص نمودار نہیں ہوا اور وہ بنا کسی ٹکراؤ کے اگلے حصے تک پہنچ گیا۔

”تو بہت کام ہو رہا ہے شریف! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ کتا جو نکالے وہ ذرا جاگد کر دیکھ لے کہ کیا مسئلہ ہے۔ پر تو اپنی جگہ سے مل کر رہی نہیں دیا۔“ کسی کی شکل نظر آنے سے پہلے ہوا کے دوش پر لہرائی یہ آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔

”میں کام پور ہوں تو تو جاگد کر دیکھ لے۔ تیرے چہروں میں مہندی لگی ہے یا تو میرا اثر لگا ہے جو خود چل کر جانے کے بجائے مجھے محم دے رہا ہے۔“ وہ یقیناً شریف نامی شخص تھا جو گلوے تیروں کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔

”محم شکم نہیں دے رہا ہے، تجھے احساس دل رہا ہوں۔ تو ساری دے داری مجھ کتلے بندے پر ڈال کر خود پڑا بیڈتا رہتا ہے۔ کسی روز میں نے چوہری صاحب نوں تیری شکایت لگا دی تو تیرے گلوہ پتہ کرنا۔“

”چل بھئیہ یار! تو بھی ایوں تاراشی ہو جاتا ہے۔ یار نہیں ہے میرا؟ ذرا سا کتے کے بھونکنے پر میرا مزہ کیوں خراب کرتا ہے۔ جتاور (جانور) ہی تو ہے، بھونک دیا ہوگا۔

کوئی انکار ہوتا تو وہ کوئی ایک داری بھونک کر چپ ہو جاتا؟ اس نے تو آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ ”سامنے کی دھکی پریشانی نامی آدمی اگر چھوڑ کر خوشامندانہ انداز میں اپنے سامنے کے سامنے دھکیں پیش کرنے لگا۔ وہ یقیناً کام چور آدمی تھا جو ہاتھ پیر چلانے کے بجائے زبان بلا کر ہی جہاں تک کام نکل سکتا ہوگا لے کر قاتل تھا۔

”کہو تو ٹھیک ہی رہا ہے۔ چل بھئیہ جانے دے۔ لا میرے پیالے میں تھوڑی سی بورڈال۔“ شریف کا سامنے فوراً ہی نرم پڑ گیا اور جانے کس چیز کی بابت فرمائش کرنے لگا۔ وہ جوتانی در میں ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ صرف دو ہی آدمی ہیں، آٹھ سے نکل کر فوراً سامنے آ گیا۔ وہ دونوں جو پیکل کی چھوٹی سی گھڑ چلتی سامنے رکھے اس میں سے بھنگ نکال کر پی رہے تھے، اسے ایک دم سامنے پا کر بکا بکا رہ گئے۔ سیاہ لباس میں، سر پر سیاہ ہی ہمیشہ پہنے ہوئے۔ وہ بھی اس انداز میں کہ بیسٹ کا شیشہ گرہا ہونے کی وجہ سے اس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی، وہ یقیناً ان لوگوں کو ایک جگہ کے لیے بھوت ہی لگا ہوگا۔ بھوت بھی ایسا جس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ریوالور تمام رکھا تھا۔

”اے اکوں سے تو؟“ بالآخر ان میں سے ایک نے خود کو مستحیلا اور بھڑک کر پوچھتے ہوئے اپنے دائیں جانب رکھی کلاشکوف اٹھانے کی کوشش کی۔

”خبردار! حرکت مت کرنا ورنہ گولی ماروں گا۔“ اس نے غراتے ہوئے تنبیہ کی۔ کلاشکوف کی طرف بڑھنے والا ٹھٹھک کر رک گیا مگر اس کے سامنے نے احمقانہ دیرلی سے کام لیتے ہوئے بھٹ کر کلاشکوف اٹھانے کی کوشش کی۔ ابھی وہ اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے بھی نہیں پایا تھا کہ شہر یار کے خاموش ریوالور سے ایک گولی سنائی ہوئی لگی اور اس کے ہاتھ کی پشت پر لگی۔ اس آدمی کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی اور اس نے کلاشکوف چھوڑ دی۔

”میری بات خاموشی سے مان لو مجھے تو فائدے میں رہو گے ورنہ انجام تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔ ممکن ہے اگلی بار میں ہاتھ یا چہرہ کو نشانہ بنانے کے بجائے تمہاری کھوپڑی کو نشانہ بناؤں۔“ شہر یار نے سرد لہجے میں دھکی دی۔ حقیقتاً وہ یہاں فوجی خرابائیں چاہتا تھا۔ اسے یہاں سے صرف اپنی تھوہریں ملنی تھیں اور وہ یہ کام کسی انسانی جان کے نقصان کے بغیر کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ لوگ شاید اس بات پر آمادہ نہیں تھے اور چوہری کا نمک حلال کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس کے ہاتھ میں موجود ریوالور کی پروا کیے بغیر اس کی طرف بھٹے۔ دھکی آدمی

زیادہ ہی جلد یا ہوا تھا چنانچہ کسی بھینے کی طرح ذکر آتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اسے نگر مارنے کی کوشش کی۔ اس کے حملے میں ایسی پھرتی تھی کہ شہر یار دوبارہ ریوالور کو استعمال کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فیصلہ نہ کر سکا۔ بہر حال، یقیناً اس لیے جب وہ ہمیشہ اس سے ٹکرانے ہی لگا تھا، اس نے دائیں جانب ہٹتے ہوئے خود کو اس کے حملے سے بچایا اور اڑتا ہوا اس دوسرے آدمی پر جاگرا جو اس پر ہاتھ پیروں سے حملہ کرنے کا ارادہ ہلاتی کر کے ایک بار پھر کلاشکوف کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ وہ اس سے ٹکرایا تو جھٹکے سے کلاشکوف اس کی گرفت سے نکل گئی۔ شہر یار نے اسے ایک زوردار لات رسید کی اور ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر خود کلاشکوف پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران زخمی آدمی جو اس کے ایک طرف ہٹ جانے کے باعث اپنے ہی زور میں آگے چلا گیا تھا، سنبھل کر ایک بار پھر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے شہر یار کو سر سے تمام لپا اور زمین پر رگدینے کے پتھر میں تھا لیکن اس نے اس کی چیخیں نہ سنے دی اور مٹی کی مدد سے اس کے بائیں پہلو میں ایک پتی تلی ضرب لگائی۔ ضرب کی شدت کا اندازہ زخمی آدمی کی چیخ سے لگایا جاسکتا تھا۔ وہ تکلیف سے ہلکا کر اس کی کمر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر شہر یار دوسرے بندے پر تھپتا۔ وہ ایک بار پھر کلاشکوف پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان دونوں کو ہی احساس تھا کہ کلاشکوف جس کے قبضے میں ہوئی، اس لڑائی کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے گا چنانچہ وہ اپنی ہی کوشش کر رہے تھے۔ مقابل کے مقابلے میں شہر یار کی پھرتی قابل دید تھی۔ اس کے پاس یہاں سے کامیاب واپس جانے کے باوجود کوئی آپشن نہیں تھا۔ ایک طرف سے تو اس نے یہاں آکر ہی حاق کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک پیور کریم سے اسے غیر متعجب مٹی کی امید کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں پھنس جاتا تو بہت بڑے اسکینڈل کا سامنا کرنا پڑتا۔ کسی کے سامنے اپنی یہاں موجودگی کا جواز پیش کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا چنانچہ اسے ہر حال میں یہاں سے واپس جانا تھا اور اس صورت میں کہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب رہتا اور دشمنوں کے ہاتھ اپنی یہاں آمد کا کوئی ثبوت بھی نہ لگنے دیتا۔ اپنی ساری تیاری میں اس نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس موجود ریوالور بھی وہ تھا جو کسی چور بازار سے اس تک پہنچا تھا۔ وہ بھی اسے ہاتھوں سے گزرنے کے بعد تحقیق کرنے والے کوشش کرتے ہی تو ان کے لیے اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ ویسے تو اسے معلوم ہی تھا کہ

یہاں کی پولیس اتنی باریک بینی سے کسی کیس کی تفتیش و تحقیق کرتی ہی نہیں کہ کسی خاص ملک کے ہتھیار سے چلائی گئی گولی کے سہارے اس کے استعمال کرنے والے تک پہنچ سکے۔ اس کے پھرتی کے مظاہرے کے باوجود وہ شخص کلاشکوف کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن بہر حال، فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ شہر یار نے بے پناہ جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نال کی جانب سے کلاشکوف کو تھام لیا۔ اب ان دونوں میں اسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے زور آوری ہو رہی تھی۔ شہر یار نے اگر باقاعدہ ورزش اور جوڈ وغیرہ کی تربیت کے ذریعے خود کو کافی مضبوط بنا رکھا تھا تو وہ بھی دیہاتی ماحول کا پروردہ بھاری ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ دونوں اپنی طرف سے پورا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح کلاشکوف اپنے قبضے میں لے لیں۔ بالآخر شہر یار نے کلاشکوف کو اپنی طرف کھینچنے کی جدوجہد چھوڑ کر اس کی نال پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالنے ہوئے اپنے جسم کو اٹھایا اور دونوں پیر اپنے مقابل شخص کے پیٹ میں دے مارے۔ اس چوٹ کو کھاکر اس شخص کی کلاشکوف پر گرفت ختم ہوئی اور وہ پیٹھ کے بل پیچھے کی طرف گرا۔ شہر یار بھی خود کو گرنے سے نہیں بچا سکا اور اسی آدمی کے انداز میں ہی خود بھی پشت کے بل زمین پر گر گیا لیکن اسے یہ برتری حاصل تھی کہ کلاشکوف اس کے قبضے میں آچکی تھی۔ اسے نال سے پکڑے پکڑے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ اس دوران اس کا مقابل بھی بے حد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا لیکن اس بار شہر یار نے اسے حملہ کرنے کی مہلت نہیں دی اور کلاشکوف کو لاسی کی طرح استعمال کرتے ہوئے اس کا پٹ اس کے پہلو میں مارا۔ اس شخص کے حلق سے مٹی سی چیخ برآمد ہوئی لیکن وہ پسائی اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوا اور شہر یار کے پیٹ میں اپنے سر سے نگر مارنے کی کوشش کی۔ اس کا ارادہ بھاپ کر شہر یار چند قدم پیچھے ہٹا اور نہایت اطمینان سے کلاشکوف کے پسے سے اس کے سر پر ایک پتی تلی ضرب لگائی۔ ضرب کھا کر اس شخص نے منہ سے ”اورغ“ کی آواز نکالی اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ساتھی پہلے ہی زمین جاٹ رہا تھا۔ بائیں پہلو میں ایک خاص زاویے سے لگائی گئی شہر یار کی مٹی کی ضرب کوئی معمولی نہیں تھی۔ یہ ضرب پولیس کے چھاتھی جھڑکواطر میں لائے بغیر اس کے دل پر اثر انداز ہوتی تھی جس کے نتیجے میں وہ جو پہلے ہی ہاتھ سے بچتے خوں کی دہ سے بڑھا ہوا تھا، اب ہاتھ سے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے دو بارہ کھڑکھڑے ہونے کا امکان نہ ہوتے ہوئے بھی شہر یار نے مناسب سمجھا کہ اس

کے تریبوز جیسے سر پر بھی کلاشکوف کے ہت سے ہلکی سی چٹکی دے دے۔ یہ شفقت بھری چٹکی وصول کرنے کے بعد وہ شخص بالکل ہی اٹا ٹھیل ہو گیا جبکہ اس کا سامنی تو پہلے ہی سے ہوشی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہوتے ہوئے اس نے ہتھانے کا رخ کیا۔ اس ڈیرے پر اس کا پہلی بار آتا ہوا تھا لیکن ڈاکٹر ماریا نے اسے ہر بات اتنی تفصیل سے بتائی تھی کہ اسے بالکل بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے مقابلے پر آنے والے ان دو آدمیوں کو نمٹانے کے بعد اس نے کسی شہرے کی تلاش میں بھی اس لیے وقت ضائع نہیں کیا تھا کہ ڈاکٹر ماریا کے مطابق چودھری کی عدم موجودگی میں ڈیرے پر اس کے دو تین سے زیادہ آدمی موجود نہیں ہوتے تھے۔ اگر کوئی تیسرا وہاں موجود ہوتا تو اس دھچکا ہشتی کے دوران سامنے آچکا ہوتا چنانچہ کسی بھی مداخلت کی طرف سے قطعی مطمئن وہ ہتھانے کی طرف بڑھ گیا۔ سڑکیاں اتر کر نیچے پہنچنے کے بعد اس نے سب سے آخر میں موجود کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے دروازے میں جدید ساخت کا آئوٹیک لاک لگا ہوا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق یہ چودھری کا کمرہ خاص تھا جس کی چابی کسی کا رندے کے پاس ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود کلاشکوف سیدی کی اور بلا تکلف لاک پر فائر کھول دیا۔ ہتھانے میں کلاشکوف چیلے کی آواز بڑی طرح گونگی مگر اسے اطمینان تھا کہ یہ آواز باہر نہیں نہیں سنی جاسکتی۔ ڈیرا گاؤں کی آبادی سے دور ڈرائسٹان سے علاقے میں تھا جہاں مونا چودھری کے آدمیوں کے علاوہ دوسرے لوگ رخ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

کلاشکوف سے نکلنے والی گولیوں نے لاک توڑ دیا تھا۔ پیر کی شوکر سے دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ بیڈروم کے انداز میں سجھا ہوا تھا اور یہ کھاؤت اتنی عمدہ تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں داد دیے بنا نہ رہ پائیں لیکن اس کی آنکھوں سے کسی بھی قسم کی تحسین کے بجائے نفرت اور کراہیت برس رہی تھی۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں چھٹی ہی رات چودھری نے ڈاکٹر ماریا کی بے بسی اور مجبوری کا قاتلہ ہاتھاتے ہوئے داؤد پش دی تھی۔ اور بھی جانے کتنی لڑکیاں اس کمرے میں آئی جاتی رہی تھیں اور چودھری کی ہوس کا نشانہ بنی رہی تھیں۔

دل میں غما نہیں مارے نفرت کے طوفان کو قابو میں رکھتے ہوئے وہ دیوار میں بنے بیک شیفٹ کی طرف بڑھا اور ہاتھ سے دباؤ ڈال کر اسے بائیں طرف کھسکانے کے لیے

زور دے گا۔ بیک شیفٹ بائیں طرف موجود دیوار کے خلا میں غائب ہو گیا۔ اب اس کے سامنے ایک اور شیفٹ موجود تھا جس میں ملکی اور غیر ملکی شراب کی بوتلیں تکی ہوئی تھیں۔ ان بوتلیں کو دیکھ کر ماریا گمان ہو گیا تھا کہ انہیں ہی ہوشیار رکھنے کے لیے بیک شیفٹ کے پیچھے یہ خفیہ الماری بنائی گئی ہے لیکن درحقیقت یہ بھی ایک ڈانچ تھا کہ تلاش لینے والا ان سے دھوکا کھا کر پلٹ جائے۔ اگر اس کے ساتھ ڈاکٹر ماریا کا تعاون نہ ہوتا تو وہ بھی دھوکا کھا جاتا لیکن اسے حقیقت معلوم تھی کہ اس شراب کی بوتلیوں سے بھری الماری کے پیچھے بھی کچھ ہے۔ اس نے اس الماری کو زور لگا کر دائیں طرف دھکیلا۔ بیک شیفٹ کی طرح وہ بھی دیوار کے خلا میں غائب ہو گئی۔ دراصل یہ سارا سیٹ اپ وہی دیوار میں ہوا کہ ان کے درمیان بنایا گیا تھا۔ سرسری نظر ڈالنے والے کو خیال ہی نہیں گزرتا تھا کہ دو کمروں کی درمیانی دیوار ایک نہیں ہے بلکہ وہ الگ الگ دیوار ہیں انھما کر درمیان میں یہ خفیہ جگہ بنائی گئی ہے۔ ویسے بھی اس ہتھانے تک دو طرح کے افراد کی ہی رسائی تھی۔ ایک چودھری کے تھک خوار اور دوست تھے تو دوسرے وہ قسم رسیدہ افراد جو پہلے ہی اپنی کسی نہ کسی مجبوری کے سبب چودھری کے ہاتھوں ہمال ہو رہے تھے۔ دونوں گروہوں کے افراد کے پاس چودھری کے خلاف کچھ بھی سوچنے اور عمل کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اب تک یہاں جو مظلوم افراد لائے گئے تھے، ان میں شاید ڈاکٹر ماریا ہی وہ ذی شعور ہستی تھی جس نے مجبور ہونے کے باوجود اپنے حواس قائم رکھے تھے اور چودھری کے چند اہم راز جان کر یہاں سے باہر نکل گئی۔ اس کی اس ہوش مند نے شہر یار کا بڑا بھلا کیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں الماریوں کے ہتھ جانے کے بعد وہاں پیدا ہو جانے والے درمیانی خلا میں کھڑا اپنے سامنے موجود مجبوری کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سوچ بچوڑے تلاش کر کے وہاں روشنی کر دی تھی۔ وہ روشنی یہاں تک بھی آ رہی تھی۔ روشنی کی مدد سے وہ سامنے موجود مجبوری کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ مجبوری کھولنے کے طریقے سے واقف نہیں۔ نہ ہی چودھری نے اسے براہ راست مجبوری کا دیدار کرایا ہے جو وہ اس میں موجود لاک کی نوعیت سے اسے آگاہ کر سکے۔ خود اس کا اندازہ تھا کہ مجبوری میں نمبروں والا تالا ہی موجود ہوگا اور نمبر ظاہر ہے صرف چودھری ہی جانتا ہوگا اس لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی دھمت میں پڑے بغیر سیدھے سیدھے دیوار کی گولی سے لاک توڑ دے گا لیکن اب جو لاک کا جائزہ لیا تو

اندازہ ہوا کہ یہ نمبروں والا لاک نہیں بلکہ اسی کی طرز پر بنایا گیا قدرے مختلف انداز کا لاک ہے۔ مجبوری پر نظر آتے ڈانچ پر نمبروں کے بجائے الفاظ پیش نظر آ رہے تھے۔ یہ فوراً کی نشین والا لاک تھا جس کا درست بھی پیش جیسے ہی ملایا جاتا لاک کھل جاتا۔ لاک کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چودھری کی نسیات کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے غور کیا کہ اس جیسا بندہ میا کیبی پیش سیٹ کر سکتا ہے؟ فوراً ہی اس کے ذہن میں چودھری کا نام ابھرا۔ اس جیسا خود پسند بندہ اپنے نام کے کسی سے کوئی سوچ سکتا تھا۔ انھما عالم شاہ... اس نام میں "عالم" اور "شاہ" دو ایسے حصے تھے جن میں چار چار الفاظ آتے تھے۔ اس نے ان دونوں کو بھی باری باری آزمایا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی پر وہ تھوڑا سا جھجھکا گیا۔ جھجھکاہٹ میں اس نے کلاشکوف سیدی کی اور لاک پر فائر کرتے ہی جا رہا تھا کہ ایک اور خیال ذہن میں ابھرا۔ اس خیال کو آزمانے کے لیے اس نے آخری کوشش کے طور پر یہ آئی اے اور اس کا بھی پیشین ملایا۔ یہ چودھری انھما عالم شاہ کے مکمل نام کے ہر حصے کے پہلے حرف والا بھی پیش تھا جسے ملاتے ہی لاک کھل گیا۔ لاک کھلتے ہی اس نے مجبوری کا پتہ کھولا۔ اس کی آنکھیں خیرہ رہ گئیں۔ وہاں سونے کے سلسلے کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ غریب مزاجوں کا خون چوس کر اور دوسری بے ایمانیوں سے کمائی گئی حرام دولت کو چودھری نے اپنی اس خفیہ مجبوری میں سونے کی شکل میں جمع کر رکھا تھا۔ بہر حال، اسے سونے کے اس ڈھیر سے کوئی دیکھی نہیں تھی۔ یہاں وہ اپنی ان تصویروں کے حصول کے لیے آتا تھا جن کے ذریعے چودھری اور اس کے سامنی اسے زیر کرنے کا منصوبہ بنا کر پیچھے ہوئے تھے۔ اس نے مجبوری کے نیچے خانے میں موجود مختلف کاغذات اور بند لٹافوں کو نوٹوں شروع کر دیا۔ ایک لٹافہ میں اسے آخر کار اپنی تصاویر مل گئیں۔ تصویروں کے ساتھ ان کے ٹیکسٹ بھی موجود تھے۔ اس لٹافہ کو اپنی بیلٹ میں ڈالنے کے بعد اس نے مجبوری کی مزید تلاش لینا جاری رکھا۔ اسے ڈاکٹر ماریا کی تصویروں کی تلاش تھی۔ وقت کی قلت کے باعث وہ وہاں موجود کاغذات کی نوعیت جاننے میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اسے صرف تصویروں کی تلاش تھی لیکن اس تلاش میں اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر وہاں پلٹ گیا۔ وہاں پلٹتے ہوئے اس نے مجبوری کو بند کرنے یا شیفٹ کو وہاں ان کی جگہ لانے کی کوشش نہیں کی البتہ شراب کی بوتلیوں میں سے چند نشیہ شراب کی بوتلیں نکال لیں اور کمرے میں پہنچنے کے بعد انہیں بند کر ڈالنے سے

نکرا کر توڑ ڈالا۔ قیمتی شراب بوتلیوں سے نکل کر میسر پر گر گئی اور کمرہ بالکل کی بو سے بھر گیا۔ اس نے سانس بھر ڈر پڑا۔ استہری لائٹ اٹھایا۔ یہ لائٹ وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہاں کا جائزہ لینے ہوئے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس کے آنکھوں کی معمولی سی جھنجھٹ سے سبھی لائٹ کے ایک سرخ شعلہ اٹھا۔ اس نے کسی خون آشام یا کسی سرخ زبان جیسا شعلہ اگلے اس لائٹ کو بستر کی طرف اچھال دیا اور آخری تیز قدم اٹھاتا ہوا بائیں پیچھے مڑ کے دیکھے، باہر نکلتا چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک شعلے سے وہاں کی شعلے بھڑک چکے ہوں گے۔ یہ سرخ سرخ شعلے ذرا دیر بعد چودھری کے اس پیش کدے کو خاک میں بدل دیتے مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ چودھری کا لاک کا مال خاک میں تبدیل ہونے کے باوجود ان مظلوم لڑکیوں کے نقصان کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا جن کے وجود یہاں، اس پیش کدے میں ہمال کیے گئے تھے۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ ظالم اور اس کے قلم کے خلاف نفرت کا معمولی اظہار تھا۔ اظہار کے اس لمحے میں وہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھتے والا، ڈے دار اور قانون کا پاسدار اسٹیشن کمانڈر ہے۔ اس وقت وہ ایک جذباتی اور غصے سے بھرا نوجوان تھا جس کے ذہن میں اقبال کا یہ شعر گونج رہا تھا۔

اس حکمت کے ہر خوشہ گندم کو جلا ڈالو جس حکمت سے دھتان کو میسر نہ ہو روزی اپنے پیچھے جاری شعلوں کے نقص کو چھوڑ کر وہ ڈیرے سے باہر نکل آیا۔ مونز بانگ اپنی جگہ پر موجود تھی۔ ذرا دیر میں وہ اس پر سوار جہاز سے باہر جانے والے راستے پر گامزن تھا۔ واپسی کا سفر اس نے پہلے سے بھی کم وقت میں طے کر لیا۔ چوکیدار اس کی ہدایت کے مطابق مستعد اور چوکنا اس کا منتظر تھا۔

”صبح سے پہلے ہی وہ آدمی جو یہ بانگ دے کر گیا تھا، یہاں آئے گا۔ تم یا ایک اس کے حوالے کر دینا۔“ سر پر موجود ویلیوٹ اتار کر اسے پہلے ہی کے انداز میں بانگ کے پیڈل کے ساتھ لٹاتے ہوئے اس نے چوکیدار کو حکم دیا۔

”ٹھیک ہے سر“ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”اور ہاں ٹھانڈی آگ میں نے انتظار کر لیا ہے۔ بہت جلد تم اپنی خواہش کے مطابق اپنے آبائی علاقے میں جا کر وہاں کام کر سکو گے۔“ اندر کی طرف قدم بڑھااتے ہوئے اس نے چوکیدار سے کہا۔

”بہت بہت شکر یہ سہرا“ چوکیدار خوش ہو گیا۔

”شکر ہے کی کوئی ضرورت نہیں... بس آج کی رات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جانا ورنہ نقصان میں رہو گے۔“ اس نے بے حد سروسلیج میں کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے لہجے کی سننا ہٹ ایچ ریڈھ کی ہڈی میں محسوس کرتا ہوا چوکیدار اپنی ذہنی دینے لگا۔

☆☆☆

”آپ خوب تر ساری ہیں مجھے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ میں آپ سے ملنے کے لیے کتنا بے قرار ہوں۔“

”بھئی ہم بھی تو ایسے ہی بے قرار رہتے تھے اور آپ پابند پاؤں لگاتے تھے۔“ وہ اس کی بے قراری کا لطف لیتے ہوئے دھجھے سروں میں ہنسی۔

”شب اور اب میں بڑا فرق ہے بہتر! پہلے میں جسے روکتا تھا وہ پیرا پاؤں کی ایک چودھراں تھی لیکن اب جس سے ملنے کی خواہش کر رہا ہوں، وہ میری مستحضر ہے۔“ آفتاب نے جتایا۔

”میں فرق تو مجھے درکاتا ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ اب اس پہلے والی جگہ پر ملتا مجھے اپنے رشتے کے شایانہ شان نہیں لگتا۔ میں آپ سے ملوں گی لیکن ابھی نہیں۔“

”وہ مجھے موقع ملے دیں پھر میں لاہور چلی جاؤں گی۔ آپ بھی وہیں آجائے گا۔“

”اس پروگرام پر عمل درآمد ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟“ آفتاب نے بے تابی سے پوچھا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اصل میں مجھے شک ہے کہ بڑی ماں کو کسی قسم کی پھٹک رہی ہے۔ ان کی جیتی ملازما میں میری نوہ میں رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مجھے آپ سے فون پر بات کرنے کے لیے بھی بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔“ اس نے اپنی مجبوری بتائی تو وہ خوشنوش میں ہلکا ہو گیا۔

”نہیں آپ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔“

”آپ بے فکر ہیں۔ میں پوری طرح ہوشیار رہتی ہوں۔“ کشور نے اسے تسلی دی اور پھر گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔ ”آپ نے فریڈ والے معاملے میں کچھ کیا؟ میں نے آپ سے قربان کا پتا معلوم کرنے کا کہا تھا۔“

”آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے سرکار! میں نے اپنے ایک شاگرد سے ذکر کیا تھا۔ وہ قربان کو جانتا ہے۔ اگر میں اس سے کہوں گا تو وہ قربان کو میرے پاس لے آئے گا پھر ہم اس کی اور فریڈ کی آپس میں بات کروا دیں گے۔“

”تھنک یو آفتاب! اصل میں فریڈ کے سلسلے میں بڑا بوجھ محسوس کرتی ہوں۔ اس پر ظلم ہوا ہے اور ظلم کرنے والے

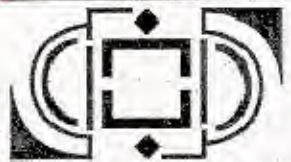
میرے اپنے ہیں۔ اگر میری مدد سے وہ اس اذیت ناک زندگی سے نجات پاتے ہیں گا سیاب ہوگی تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔“ تو وہ دردمندی سے بولی۔

”انشاء اللہ آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہو گی۔“ آفتاب نے صدق دل سے کہا پھر مزید بولا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ ابھی فریڈ سے میری بات کروا دیں؟ ہوسکتا ہے آپ کی باتوں پر اس نے یقین نہ کیا ہو، میں بات کروں تو وہ قائل ہو جائے گا وہی ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں اسے یقین دہانی کروانے کی کوشش کروں گا کہ اسے ہی صاحبِ بذاتِ خود اس کے کہیں میں دیکھی لے رہے ہیں۔ وہ ذرا سی ہمت کرے اور ہمارا ساتھ دے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔“

”میں کوشش کرتی ہوں۔ آپ انتظار کریں۔ اگر فریڈ راضی ہوگی تو میں تھوڑی دیر بعد آپ کو فون کروں گی۔“ اس نے آفتاب سے کہتے ہوئے کال منقطع کر دی اور موبائل کو اپنی اڈھنی میں چھپاتے ہوئے باہر نکلی۔ اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی رانی ایک کمرے کے قریب آئی۔ کشور کی طرف سے کچھ اور شاوہرے پناہ ٹھک کے اظہار کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مینی ریپر کشور فون پر بات کرے گی۔ وہ باہر ہی رہے گی تاکہ کوئی اس کے کمرے کے دروازے پر آکر سن نہ سکے۔

”میں تھوڑی دیر کے لیے اوپر جا رہی ہوں رانی،“ غم جہاں کا خیال رکھتا۔ ”رانی سے آگے سے کہتے ہوئے وہ گئے۔ بڑھ گئی۔ اوپر ہی منزل کی سڑکیاں ملے کر کے وہ اوپر پہنچی اور سب سے پہلے بڑا اوشاہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے بستر پر پرسکون نیند سو رہا تھا۔ اس کی ملازمہ بھی کارپٹ پر لیٹی گھری نیند سو رہی تھی۔ اس کمرے کے سامنے سے گزرا تو وہ اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں فریڈ کا قیام تھا۔ دروازے کی چابی درز سے جھانکی نیلی رہتی نہٹ بلب کے جلنے کا پتہ دے رہی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ فریڈ وہاں سو رہی ہے۔ اس کی نیند میں مداخلت کے خیال سے وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ پر پھر جھانکے کیوں اسے احساس ہوا کہ اندر کمرے میں نیند کے بعد والی خاموشی نہیں ہے۔ ایک بار چیک کر لینے کے خیال سے اس نے دروازے کو ہاتھ سے دکا سا دھکیں کر کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اس پر گویا کوئی پہاڑ آگرا۔ کمرے کا منظر جانتی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ حقیقت ہے۔

حادثات و مصائب کی شکل... پناہ کی تلاش میں سرگردانی
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ دیے



دسویں قسط

اسماقادی

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور یا اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقہ کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے۔ یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھستا وہی ہے جو درمیانہ طبقہ سے ہو۔ صحیت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرتا پڑتا ہے۔ زندگی کی ہمسایہ اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں۔ کبھی بازی ہلٹ بھی جاتی ہے۔ بھلا وقت لوٹ تو نہیں سکھتا مگر مقدر ساتھ لے جاتا ہے۔ اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تشریح کی اس نگرانی قسمت کی پابندی یا مقررہ تکمیل..... طے نہ کر سکتے ہیں اور ان کی کہانی

اسے اسے اور گرد موجود ہر شے کھوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پھرتا ہوا ہے دو دو یار پوری قوت سے آکر اس سے لگتا ہے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیں گے۔ موجودہ منظر نے اس کی ساری ہمتی کو تو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آفتاب کی اپنی زندگی میں آدھ سے جس وہ خوشی کے وجود سے ناواقف تھی۔ زندگی اس کے نزدیک ایک طے طے صحرا میں تنگے سبز سفر کرنے کے سوا کچھ نہیں تھی لیکن ابھی وہ جس لمحے میں موجود تھی، وہ تو ساری عمر کے دکھوں سے بڑھ کر تکلیف دہ تھا۔ آج اس نے اپنی زندگی کا سب سے گریہ منظر دیکھا تھا۔ اس منظر نے اسے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔

حوالی میں فریاد کی وہ پہلی صبح... جب وہ اس سے ملے اس کے سر پر ایک آبی مٹی اور حیران ہو رہی تھی کہ کیا ہندو شاہ بھی کسی لاکھ ہے؟ آج اس پر سارے اسرار کھل گئے تھے۔ فریاد کی سچ اور نہر میں ڈوبی ہوئی باتوں کا مفہوم بھی اس لمحے اسے بہت اچھی طرح سمجھ آ گیا تھا۔ چند سیکنڈوں کے اندر وہ آگے کے کرب تک عذاب سے گزری تھی۔ اسے لگا کہ مزید ایک سیکنڈ بھی وہاں رہی تو اذیت سے مر جائے گی۔ چنانچہ وہ اپنے جسم کی تمام تر طاقتیں جمع کر رہی ہوئی چلی اور دیوانہ وار دوڑ پڑی۔ بالائی منزل سے چلی منزل کی طرف جانے والی بیڑیاں اس نے اتنی برقی رفتار سے ملے کیں جیسے کسی پہاڑی ڈھلوان سے لڑھک رہی ہو۔ بیڑیاں ملے کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی تو رانی نے اسے دیکھ لیا۔ وہ برآمدے میں اسی کے انتظار میں کھلی رہی تھی۔

”کیا گل ہے بی بی! سب خیر تو ہے؟“ رانی گھبرا کر اس کی طرف چلی۔ ساتھ ہی اس نے کشور کے عقب میں بھی نظر دوڑائی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کے تعاقب میں ہو گا لیکن برآمدہ ہنوز سنسان پڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ پھر کشور کی یہ حالت کیوں ہے؟

رانی کو زیادہ غور و خوض کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ کشور اس کے وجود کو سراسر نظر انداز کرتی ہوئی وحشت زدہ انداز میں بغیر کے اپنے کمرے میں کھس گئی۔ رانی نے کمرے میں داخل ہونے سے قبل گردن موڑ کر یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا اور پھر مطمئن ہو جانے پر کمرے میں داخل ہو گئی۔ کشور اپنے بستر پر گری کھبے لمبے ماس کے رہی تھی۔ رانی نے احتیاطاً پہلے دروازے کی کنڈی پر چڑھ کر کشور کے قریب آئی۔

”دکھی ٹھیک تو ہوئی بی! کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟“ پریشانی کے عالم میں اس نے کشور سے پوچھا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ بستر پر گری کشور بری طرح کپکپا رہی ہے اور کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے اسے ایک ٹھیکس اوڑھ لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ کافی دیر بعد کشور کی حالت ڈرامائی ہو گئی۔

”کیا جوا تھا بی بی! آپ کس چیز سے ڈر رہی تھیں؟“ اسے سمجھا ہوا دیکھ کر رانی نے اپنا سوال دہرایا۔

”کسی سے نہیں۔ تم جی بھادو، مجھے نیند آرہی ہے۔“ کشور نے روکنے سے کچھ نہیں جواب دے کر اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ حیران پریشان رانی نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور غیب لائٹ بند کر کے ٹائٹ بلب روشن کر دیا۔ بلب روشن کرنے کے بعد اس نے کشور کے سر ہانے پر ماسو یکل اٹھا کر الماری میں اس کی مخصوص جگہ پر رکھا اور الماری کو لاکھ دیا۔ کشور چٹکوں کی درز سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اپنی وفادار ملازمہ اس کی قدر خیال داری پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس حوالی میں جہاں پر پیل ساز میں جسم لپٹی رہتی تھیں، خدمت گزاروں کی فوج جبراً بھرتی کی جاتی تھی۔ انسانی حقوق اور انسانیت کی پامالی معمولی باتیں نہیں، وہاں رانی جیسی ملازمہ کا میسر آ جانا بہت بڑی نعمت تھی۔

”یہ تاٹ بلب بھی بند کر دے رانی!“ آنکھوں پر بازو رکھے رکھے ہی اس نے حکم دیا جس کی فوراً تعمیل کی گئی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا ہو گیا لیکن وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ اندھیرے میں کچھ دیر میں دیکھنے کے منظر سے فرار حاصل ہو جائے گا، اپنی کوشش میں بڑی طرح ناکام رہی۔ اندھیرا تو اس منظر کو اور بھی واضح کر کے دکھا رہا تھا۔ اس منظر کے پس منظر میں اسے اپنی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”میں شرمندہ ہوں کہ میرے لبا بچی نے تمہارے ساتھ اتنا برا دھوکا کیا لیکن میں شرمندہ ہونے کے سوا اور کچھ بھی کیا سکتی ہوں۔“ فریاد سے پہلی ملاقات کے موقع پر جب اسے یہ علم ہوا تھا کہ چودھری اختیار نے نہا کے لیے اپنے پاس آنے والی فریاد اور اس کے محبوب تر بان کو دھوکا دے کر فریاد کی شادی زبردستی ہندو شاہ سے کرادی ہے، اس وقت اس نے یہ بات فریاد سے کہی تھی۔ جواب میں فریاد نے کہا تھا۔ ”میں جانتی ہوں اب تو تمہیں تمہارے باپ کا درد روپ نہیں دکھانا چاہیے دیکھنے کے بعد تم شرم سے زندہ و زمین میں دفن ہونے کی خواہش کرنے لگو گی۔“ واضحی اس نے جو منظر دیکھا

تھا، اسے کچھ کر دل یہ جابا تھا کہ زمین میں شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ ان کے خاندان کے مرد میں سراج اور عیش پرست ہیں، یہ حقیقت جاننے کے باوجود اس کے لیے اپنے باپ کا وہ مکروہ روپ دیکھنا بے حد دشمن ثابت ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ ایک بُرا آدمی ہے لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ وہ اتنا بُرا باپ ہے کہ اسے اپنے رشتوں کے تقدس کا بھی احساس نہیں۔ وہ اپنے دکھی معذور بیٹے کی بیوی کو بھوکے نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی داشت بنایا تھا۔ وہ اپنے دل میں اس کے لیے اتنی شدید نفرت محسوس کر رہی تھی کہ اس کے مقابل کھڑی ہو کر بھی اس نفرت کا اظہار کر سکتی تھی۔

”کدھر مری رہتی ہو تم دونوں؟ کچھ ہوش رہتا ہے جنہیں حوصلہ کیلے نہیں؟“ بڑی اور چھوٹی دونوں چودھرائیں صبح کی اس پہلی گھڑی میں چودھری کی عدالت میں موجود تھیں اور وہ ان پر برسرِ راج تھا۔

”ایسا کیا ہو گیا چودھری صاحب! حوصلہ میں تو سب کچھ بھلا چل رہا ہے۔ خیر بھی اگر کوئی گل ہے تو بیٹوں دسو۔“ ”میں نے منع نہیں کیا تھا کہ کوئی ہندو کی وہ دہلی سے تعلق نہیں رکھے گا؟ دوسرے دشمن کی بہن ہے۔ میں اس کی ناک چنپی کرنے کے لیے اس کی بہن کو ہندو سے دیا دھوکا دیا ہوں، یہ یہاں تو اس سے دوستیاں گھڑی جا رہی ہیں۔ کیوں چاہیے بھلا کشور اس سے ملے اور؟ تم اسے روکتی کیوں نہیں ہو؟“ چودھری کا ردہ دشمن بڑی چودھرائیں کی طرف تھا کیونکہ کشور کی ماں سے تریا رہی چودھرائیں ہی حوصلہ کی کرتا دھرتا تھی۔

”میں تو اسے بہت وادی سمجھا چکی ہوں چودھری صاحب! آپ کی یہ دہلی بڑی انگریز ہے۔ میرے مدد کے پر بولی کہ میں اپنے بھرا سے ملنے جاتی ہوں۔ میں نے تو ناہید سے کہا تھا کہ سنبھال کر رکھا اپنی ڈی کوور نہ یہ کوئی نہ کوئی گل کھلا کر رہے گی، پر اسے دھجی کی ویران زندگی کا برا اختیار رہتا ہے۔ میرے سمجھانے پر بھی اس کے ساتھ زیادہ روک ٹوک نہیں کرتی ہے۔“ بڑی چودھرائیں نے فوراً توپوں کا رخ سوکن کی طرف کر دیا۔

”تم گل نہیں ہے چودھری صاحب! میں تو اس لیے نہیں روکتی کشور کو اوپر جانے کے کہ وہ چار سے ہندو چودھری کی بہت میں جاتی ہے۔ کشور کو روکنے کا سوچوں تو دل میں خوف خدا آتا ہے۔ خیر یہ بھی سوچتی ہوں کہ میرے روکنے توکنے پر گل کو کوئی یہ الزام لگا دے گا کہ میں گویا کفار فریق

کرتی ہوں۔ کشور اور ہندو شاہ مجھے بھائی نہیں اس لیے کشور کو اس سے ملنے نہیں دیتی۔“ چھوٹی چودھرائیں ناہید نے شک بڑی چودھرائیں سے دکھی تھی لیکن خود کو چھتہ دیکھ کر اشارے کناہے میں ہی کھنکھائی، سوکن کو روک دینے سے باز نہ رہ سکی۔ اس کی اس حرکت پر بڑی چودھرائیں کوئی جوابی حملہ کرتی، اس سے تپل ہی کمرے کے دروازے پر زور دار دستک ہوئی اور پھر ایک ملازمہ پریشان اور گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”کیا گل ہے؟“ اس دخل اندازی پر چودھری نے غصے سے پوچھا۔

”دکھی اندر کھا آب سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی بہت بڑی گزبڑ ہوئی ہے، چودھری صاحب سے ملنا ضروری ہے۔“ ملازمہ نے خوف زدہ سے لہجے میں بتایا تو چودھری کچھ سوچتا ہوا ملاقاتی کمرے کی طرف چلا گیا۔ ویسے وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ دکھی کیا اطلاع لے کر آیا ہوگا؟ اسے اپنی جلدی کی امید نہیں تھی۔

”ہاں بھی نہیں! بول کیا خبر لایا ہے جسے ستانے کے لیے اتنا بے تاب ہو رہا ہے؟“ ملاقاتی کمرے میں پہنچ کر اس نے اطمینان سے دکھی سے پوچھا اور خود اپنے مخصوص تخت پر بیٹھ کر کھٹے کی تھام لی۔

”خیر بڑی بڑی ہے چودھری صاحب! ابھی ابھی بالا وہ خبر لے کر آیا ہے۔ میں اسے بلواتا ہوں، وہ آپ ہی سب کچھ بتائے گا۔“ دکھی کے لہجے میں واضح کپکپاہٹ تھی۔ بالے کا ذکر سن کر چودھری پہلے سے بھی زیادہ مطمئن ہو گیا۔ بالا کمرے میں آیا تو اس کا حق چہرہ دیکھ کر وہ ٹھوڑا سا ہلکا۔

”کیا گل ہے؟ یہ تیرے ہوتے پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں؟ جس کام کے لیے گیا تھا اس میں کوئی گزبڑ کر دی کیا؟“ اس نے تیز لہجے میں بالے سے پوچھا۔

”نہ چودھری صاحب! وہ کام تو میں نے وڈی چنگی طرح کر دیا ہے۔ اوھر سے آپ کو جلد اپنی مرضی کی خبر مل جائے گی، پر ابھی جوش خیز لایا ہوں، وہ بڑی بڑی ہے۔“ ”اب کب بھی دے کہ کیا ہو گیا ہے؟ بڑی خبر، بڑی خبر کہہ کر جب سے دونوں مجھے ہولانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ بالے کا جواب سن کر چودھری کا ضبط جواب دے گیا اور وہ بڑی طرح دباؤا۔

”بھرا تو آپ کو معلوم ہی ہے سرکار کہ رات میں ڈیرے پر نہیں تھا۔ دو ہندوؤں کو اوھر چھوڑ کر میں آپ کا حکم پورا کرنے گیا ہوا تھا۔ کام ہونے کے بعد میں ڈیرے پر پہنچا تو

وہاں عجیب حالت تھا۔ جن دو بندوں کو میں ڈیرے پر چھوڑ کر گیا تھا، وہ پانی کا پائپ لگائے بیچے تھے خانے کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ لگ گیا۔ آگ ابھی تو میں نے ان دونوں سے تفصیل پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی بندہ ڈیرے میں چپکے سے گھس آیا تھا۔ اس نے کتوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور ان دونوں کو بھی بے ہوش کر ڈالا۔ وہ ہوش میں آئے تو بندہ غائب تھا اور بیچے تھے خانے میں آگ بجھاتی ہوئی تھی۔

”کیا بکواس ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ گھس مانی کے لیل میں اتنی جرات ہے کہ چودھری انکار کے ڈیرے میں گھس کر بیٹھ کر بیٹھے؟“ چودھری نے خیرین کو بھڑکاتھا۔ ”معلوم نہیں چودھری صاحب! دونوں بندوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس آدمی کی شکل نہیں دیکھی مگر یہ اندازہ ضرور ہے کہ وہ ادھر چڑا ہوا کہ رہنے والا نہیں تھا۔ وہ تو یہ تک کہہ رہے تھے کہ وہ بندہ آدمی کے بجائے کوئی بھوت لگ رہا تھا جو پوری کوشش کے باوجود ان کے قابو میں ہی نہیں آیا۔“

”ان بڈھراہوں کی تو میں کھال پھینچاؤں گا۔ پڑے ہوں گے نشتر کے اس لیے کچھ نہیں ہوئی اور اب بھانہ بنا رہے ہیں کہ کوئی بھوت تھا۔ بھوتوں کو بھلائی ضرورت پڑی ہے ڈیرے میں گھس کر آگ لگانے کی۔ وہ یقیناً میرا کوئی دشمن تھا جو ان بندوں کی غفلت کی وجہ سے ہاتھ دکھا گیا ہے۔ ان خرام خوردوں سے تو میں اچھی طرح حساب لوں گا۔ پہلے میں ڈیرے پر جا کے دیکھوں کہ وہاں کیا حشر مچا ہے۔“ بھٹے سے سرخ ہوئے چرے کے ساتھ چودھری اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ تینوں ایک شان دار لینڈ کروزر میں بیٹھے ڈیرے کی طرف جارہے تھے۔ لینڈ کروزر کے طاقتور انجن نے بہت تیزی سے انہیں ان کی منزل تک پہنچا دیا۔ چودھری زمین پر زور زور سے جبر مار کر چیخا ہوا ڈیرے میں داخل ہوا۔ سماتے ہی اس کے چہیتے کتوں کی لائیں موجود تھیں۔ ان لاشوں کے قریب شریف اور اس کا ساتھی سر جھکاے بیٹھے تھے۔ چودھری کے کچھ دوسرے کارندے بھی ڈیرے پر موجود تھے۔ ان سب کے چہرے ہستے ہوئے تھے لیکن شریف اور اس کے ساتھی کی حالت یکنگھی۔ وہ جانتے تھے کہ رات جو کچھ پیش آیا ہے، اس کی ذمہ داری انہی کے سر ڈالی جائے گی۔ وہ حافظہ بھر کر ڈیرے کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تھے اور چودھری کے نزدیک یہ ناکامی ٹھک حرا کی کے ذمہ سے مل آتی تھی۔ اس لیے وہ دونوں خوف زدہ تھے۔

کہ جانے ان کا کیا انجام ہوا؟ اگر نہیں اپنے پیچھے اپنے بچوں کی زندگی کا خوف نہ ہوتا تو وہ ہوش میں آئے گئے بعد ایک لمحہ بھی یہاں رکھنے کے بجائے گاؤں سے فرار ہو جاتے میں ہی عافیت سمجھتے۔ اپنے گھر والوں کا لڑوہ خیر انہی مسوج کردہ اپنی ذات کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن بہر حال، انجام سے خوف زدہ تو تھے۔ چودھری کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ کسی یا تو جاتا تو کی طرح لپک کر اس کے قریب آئے اور اس کی ٹانگوں میں اپنے سر رکھ دیے۔

”صورت تم کو ان تک حراموں کی۔“ چودھری نے دونوں کے سروں پر ہادی ہادی پیر سے زوردار ٹھوکر لگا دی اور اس طرف بڑھ گیا جہاں خانے کا راستہ تھا۔ ششی اور بالا دونوں اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پہلی بڑھی پر قدم رکھتے ہی ان کے تختوں سے وہ شخص بونگرائی جو کسی جگہ لٹکے والی آگ کو بجھانے جانے کے بعد آئی ہے۔ آگ بجھنے کافی دیر ہو چکی تھی چنانچہ اندر دھواں تو نہیں بھرا ہوا تھا لیکن بہر حال، شخص ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ چودھری نے سب سے پہلے اپنے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کا دروازہ کھڑکی کا تھا اور اس کا بیشر حصہ جل چکا تھا۔ چودھری نے چونک کر کمرے ہو کر کچھ بھر کے لیے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں موجود ہر شے کو آگ کے شعلوں نے جالت لیا تھا۔ وہاں اگر کچھ خاک بننے سے رہ بھی گیا تھا تو اس ایک سیاہ ڈھانچے کی صورت میں ہی موجود تھا۔ بڑی چاہت سے سچائے گئے کمرے کی یہ حالت دیکھ کر اسے دھچکا تو ضرور لگا لیکن اس سے بھی زیادہ اسے تجوری میں موجود اپنے خزانے کی فکر تھی۔ دو تختیں نیچے ڈگ بھر کر اس نے درمیانی فاصلے طے کیا اور اس خلیق تک گیا جس میں اس کی خفیہ تجوری موجود تھی۔ تجوری پوری کھلی ہوئی تھی۔ اس میں رکھے گاؤں کا چمک چمک کر خاک ہو چکے تھے۔ سونے کا ڈھیر بھی مٹا ہوا تھا لیکن بہر حال موجود تھا۔

”اسے کسی صندوق میں ڈال کر محفوظ جگہ پر رکھاؤ۔“ اس نے سونے کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتا کر کسی کو مخاطب کیے حکم صادر کیا۔ ”بہتر سرکار!“ ششی کو معلوم تھا کہ یہ حکم اس کے لیے ہے اس لیے فوراً مستندی سے جواب دیا۔

چودھری پلٹ کر کمرے سے باہر نکلا۔ آگ بڑے خوفناک طریقے سے لگی تھی لیکن بہر حال بجت ہوئی تھی کہ آگ کے شعلوں نے اس کمرے کے سوا تو خانے کے کسی اور حصے کو لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کے کارندوں کے لیے آگ بجھانا بھی طور ممکن نہ ہوتا۔ کمرے

سے نکلنے کے بعد وہ خانے میں مزید نہیں رکا اور بیڑیاں چڑھ کر اوپر کھلے حصے میں آ گیا۔ بالا اس کے پیچھے پیچھے تھا جبکہ ششی حکم کی پیروی کے لیے وہیں رک گیا تھا۔ کھلے حصے میں پہنچ کر چودھری نے اپنا موبائل نکال کر ایس پی کی نمبر ڈائل کیا۔

”میں آپ کو ہی فون کرنے والا تھا چودھری صاحب۔ لیکن لگتا ہے آپ کو میرے فون سے پہلے ہی جھرمٹ گئی ہے۔“ کال ریسیو کرتے ہی تار نے ہونا شروع کر دیا۔ ”کیسی خبر؟“ چودھری لمحہ بھر کے لیے بیٹھا۔

”اوہ! اس کا مطلب ہے آپ کو نہیں معلوم۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میرے پاس ہیلپ لائن ہونٹ سے ڈاکٹر کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اقبال باجوہ کا شوگر اور ملازم اسے لے کر ہیلپ لائن آئے تھے۔ باجوہ کا چیک اپ کرتے ہی ڈاکٹر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے اور موت کی وجہ ہمارے فون ہے۔“ ایس پی نے مختصر آسان بات بتائی۔

”اوہو۔۔۔ یہ تو صبح صبح دوسری بڑی خبر سننے کو مل گئی۔“ چودھری نے تبصرہ کیا۔ ”دوسری بڑی خبر! اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“ ایس پی نے پوچھا۔

”ادھر میرے ڈیرے کے خانے میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ ہیرا خاصہ کمرے میں لگا کر خاک ہو گیا ہے۔ رات جانے کون آدمی ڈیرے میں گھس آیا تھا۔ اس نے پہلے میرے کتوں کو گولی، پھر پھر میرے بندوں کو بے ہوش کر کے تو خانے میں آگ لگا دی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ساتھ میں کچھ لے بھی گیا ہو لیکن ابھی میں اندازہ نہیں لگا سکا۔ آپ کو ایسی لیے کال کی تھی کہ یہاں آکر ذرا اس واقعے کی چھان بین تو کریں۔“ چودھری نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”یہ تو بڑی بڑی خبر سنائی آپ نے۔ ایسا کون سا جی دار دشمن پیدا ہو گیا آپ کا جس نے ڈیرے میں گھس کر یہ کارروائی کرنے کی ہمت کی؟ بہر حال، آپ پر یقین نہ ہوں۔ میں سچ آپ کو بتا رہا ہوں۔ باجوہ والا معاملہ بھی دیکھ لوں گا اور ڈیرے کا بھی چیک کر لوں گا۔“ ایس پی نے چودھری کو تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ فون سے فارغ ہو کر چودھری بالے کی طرف متوجہ ہوا۔

”کام تمام ہو گیا ہے باجوہ کا۔ ایس پی تیار تھا کہ موت ہارٹ ٹپل سے ہوئی ہے، یعنی کسی کو تک نہیں ہو گا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ تو جتنا۔۔۔ کچھ تو کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی؟“ چودھری کے چہرے پر چھائی تھی ڈراما ہوئی تھی۔

”کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی سرکار! میں آپ کا پیغام لے کر باجوہ صاحب کے پاس گیا۔ پروگرام کے مطابق میں کافی رات گئے وہاں پہنچا تھا۔ جب انہیں پیغام پہنچا کہ فارغ ہوا تو اور بھی دیر ہو گئی تھی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ باجوہ صاحب کا فون کمرے پر ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ رات میں رک جا۔ میں رک گیا اور اپنے بارے کے ساتھ ساتھ گارہا۔ اس نے باجوہ صاحب کے لیے دودھ گرم کر کے گلاس میں نکالا تو میں نے بہانے سے اس کی توجہ جنادی اور موٹے کاغذ اٹھا کر دودھ میں آپ کی دی ہوئی دو ملا دی۔ اگر رات موقع نہ ملتا تو میں سویرے سے جانے میں دو املا سکتا تھا، پر قسمت اچھی تھی کہ رات میں ہی کام ہو گیا اور میں مزید اندھیرے سے اذانوں سے بھی پہلے وہاں سے لوٹ آیا۔ ڈیرے پہنچا تو یہاں الگ مصیبت کھڑی تھی، پرمیرے پیچھے سے یہ فائدہ ہوا کہ آگ بجھانے میں آسانی ہو گئی۔“ بالے نے اپنی کارکردگی پر بڑھت پیش کی۔

”یہ مسئلہ تو حل کرنا ہی پڑے گا کہ یہاں میری ناک کے نیچے آکر کارروائی ڈالنے کی حرکت کس نے کی؟ اتنا کھلا پتہ نہ کرتے والے دشمن کو میں ہیرا پر معاف نہیں کروں گا۔“ موٹھ کو ڈاکو دیتے ہوئے چودھری غرایا۔

”یہ کام وہی بندے کر سکتے ہیں چودھری صاحب! ایک چودھری سختیار، دوسرا اے سی شہر یار۔ یہ وہی بندے ہیں جن کی ذمہ پر آپ نے پاؤں رکھا ہوا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ہلکا کر جملہ کرنے کی قسطی کر سکتا ہے۔“ بالے نے چودھری کی توجہ اس کے دشمنوں کی طرف مبذول کر دینی تو چودھری سوچ میں پڑ گیا۔

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ سارا اے سی کا کیا دھرا ہے۔ وہ اپنی تصویروں کی تلاش میں آیا ہوگا۔ اب جانے تصویریں لے گیا یا نہیں جلا کر رکھ کر دیں، پر ہمارا بڑا نقصان ہوا۔ ساری محنت ہی ضائع ہو گئی۔ دوبارہ اس اے سی کے بیچے کو اس طرح گھیرنا بڑا مشکل ہوگا۔“ اس کا مزاج باجوہ کی موت کی خبر سن کر ذرا سماجیل ہوا تھا، ایک بار پھر پریم ہونے لگا۔ پہلے کشور کا اسے فریڈ وکس کمرے میں دیکھ لیتا، پھر ڈیرے میں آگ لگنا اور اب اتنی منصوبہ بندی کے بعد حاصل ہونے والی تصویروں کا ہاتھ سے نکل جانے کا خیال۔۔۔ اسے تو براہم ہونا ہی تھا۔

”میں صبحی واپس جا رہا ہوں۔ وہاں سے باجوہ کے بیٹے پر جاؤں گا۔ تو ادھر ہی رک اور شریف اور کریم کی ہڈیاں کا مڑہ پکھا کھال اور ڈھیر ڈالنا سالوں کی پر جان نہ لگنے

دینا۔ ایس بی ادھر آئے گا تو ان سے ملنے کی بات بھی کرے گا۔ ویسے تو اپنا ہی بندہ ہے، پر پھر بھی ہشام رہنا ضروری ہے۔ بندوں کو فحشی دیکھنے کا تو ہم رات آگ لگا کر جاتے والے کے سوا آرام رکھ دیں گے، پر بیان دینے کے لیے ان خبیثوں کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ بالے گے لیے احکامات جاری کرنے کے بعد وہ آف موڈ کے ساتھ ڈیرے سے روانہ ہو گیا۔ ہمیشہ اپنی شراب پر، کامیابی کے نشے سے شرار زندگی گزارنے کے عادی اس شخص کے لیے متواتر ناکامیوں کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ شہریار کی شرمناک تصویروں کے حصول کے بعد جو امید بندھ گئی تھی، وہ بھی ڈیرے پر لگنے والی آگ میں جل کر خاک ہو گئی تھی۔ وہ جو یہ گمان کیے بیٹھا تھا کہ اور بہت سے کام لگنے کے ساتھ ساتھ شہریار سے ماہ بانو کا چہ بھی حاصل کر لے گا۔ خود کو لگنے والی اس چوٹ پر اندر تک ہلکا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”رات بالا چودھری صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا۔ صاحب نے اس سے ملاقات کی تو اس وقت چنگے بھٹے تھے۔ فیر میں نے روزانہ کی طرح انہیں سونے سے پہلے دودھ کا گلاس لے جا کر دیا، تب بھی مجھے وہ بالکل ٹھیک نظر آئے۔ آرام سے بیٹھے بی وی پر کوئی انگریزی فلم دیکھ رہے تھے۔ میرے سامنے انہوں نے دودھ پیا۔ میں خالی گلاس لے کر باہر نکلا، تب بھی ان کو دیکھ کر ایسا کوئی خیال نہیں آیا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ دو سویرے جب میں نے بالے کو ناشتا کروا کر ادھر سے روانہ کیا تو صاحب نے کھٹنی بجائی۔ میں حیران سا کھٹنی کی آواز سن کر ان کے کمرے کی طرف لپکا۔ صاحب اتنے سویرے نہ تو کبھی اٹھتے تھے اور نہ ہی مجھے بلاتے تھے۔ میں کمرے میں پہنچا تو صاحب کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ بالکل بے دم سے پڑے تھے۔ میں نے جلدی سے ڈاکٹر کو جا کر جگایا۔ ہم دونوں نے مل کر صاحب کو گاڑی میں ڈالا کہ اسپتال میں جائیں، پر اندازہ ہم دونوں کو ہی ہو گیا تھا کہ صاحب قلم ہو گئے ہیں۔ ادھر اسپتال میں ڈاکٹر صاحب نے بھی تصدیق کر دی اور بولے کہ صاحب کا دل بند ہو گیا ہے۔“ اقبال باجوہ کا ملازم مجھے ہوتے چہرے کے ساتھ ساری تفصیل سنا رہا تھا۔ تفصیل سننے والوں میں ایس بی، ڈی ایس بی اور مقامی تھا کہ دارسیت شہر پارکمی شامل تھا۔ چودھری کے ڈیرے پر رات اس نے جو کارروائی کی تھی، اس کے بعد اسے سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اپنے معمول کے مطابق صبح جب وہ انیسرے سائز میں مصروف تھا، اس وقت اس

کے پاس ایس بی کی کال آئی اور اس نے اقبال باجوہ کی موت کی اطلاع دی۔ اطلاع سن کر فوراً پیر آباد کے لیے روانہ ہونے کے بجائے اس نے اپنے معمولات نمنائے اور پھر مقررہ وقت پر دفتر پہنچ کر اسٹاف کو چند ضروری ہدایتیں دیں پھر ڈرائیور کے ساتھ پیر آباد کے لیے روانہ ہوا۔

اقبال باجوہ کا رہائشی بیٹلا گاؤں سے کافی بہت کر بیٹلا کے قریب تھا۔ وہ جینگے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ لاش ابھی کچھ دیر قبل ہی مرکز صحت سے جینگے پر پہنچائی گئی ہے۔ موت طبعی تھی اس لیے پوسٹ مارٹم وغیرہ کا تو مجتہب نہیں تھا لیکن ڈیڈ باڈی کو تیرہ چودھ بھٹے کی مسافت پر واقع باجوہ کے آبائی گاؤں پہنچانا تھا۔ چنانچہ غسل دینے اور کفنانے کے بعد جب لاش کو تابوت میں منتقل کیا جا رہا تھا تو ڈاکٹر نے چند ایسے انتظامات کر دیے کہ لاش چند خراب نہ ہو۔ شہریار کے وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی اقبال باجوہ کی ڈیڈ باڈی اس کے آبائی گاؤں روانہ کر دی گئی۔

ڈیڈ باڈی کی روانگی کے بعد ایس بی صاحب کی عمرانی میں باجوہ کے ملازم کا بیان لیا جا رہا تھا اور اس وقت شہر پارکمی موجود تھا۔ ملازم کے بیان سے یہ ظاہر ہونے کے بعد کہ بالا رات چودھری کا کوئی پیغام لے کر آیا تھا اور صبح تک جینگے پر ہی رکھا تھا، وہ چونک پڑا۔

”بالا چودھری صاحب کا کیا پیغام لے کر آیا تھا باجوہ صاحب کے پاس؟“ اس نے ملازم سے پوچھا۔

”کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی۔ یہ چودھری صاحب نے آج رات کے کھانے کی دعوت کہلاوائی تھی۔ اکثر ہی وہ بلا تے رہتے تھے صاحب کو۔ ہر چند وہ وی دن میں ان کا فون آجاتا تھا صاحب کے پاس کہ فلاں وقت کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ کل جینگے کا فون خراب تھا، شاید اس لیے انہوں نے بالے سے کہلاوا دیا۔ وہ کہیں ہو رہی کام سے گیا ہوا تھا اس لیے ادھر پہنچنے میں دیر ہو گئی اور میرے کہنے پر رات ادھر ہی ٹھہر گیا۔“ ملازم نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ یہ ظاہر یہ ایک سیدھی سادی صورت حال تھی جس میں کسی قسم کا شک کرنا مناسب نہیں تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ موت کی وجہ طبعی تھی پھر بھی وہ اپنے اندر ٹھیک ہی محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو باجوہ تو خود چودھری کا ہی ساتھی تھا اس لیے اس سے اسے نقصان پہنچنے کے امکانات بہت کم تھے لیکن چودھری کی ساہمہ بھی فطرت و سمجھنے کے بعد وہ اس سے کوئی اچھی امید نہیں رکھتا تھا۔ ساہمہ لے آئے پر آتے ہیں تو بھلا کب دیکھتا ہے کہ سامنے

دوست ہے یا دشمن... وہ تو بس دس لیتا ہے۔
 ”ملازم کا بیان مکمل ہو گیا ہے اگر آپ اس سے کوئی اور سوال نہ کرنا چاہتے ہوں تو میں اسے فارغ کر دوں؟“ اس سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر ایسا پنی نے اس سے پوچھا۔
 ”جھجک ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ تو رانی ایسا پنی کے حکم پر ملازم سمیت دیگر افراد بھی باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں صرف وہ دونوں ہی موجود تھے۔
 ”چودھری صاحب نظر نہیں آرہے یہاں؟“ درختہ باجوہ کے دوست کی حقیقت سے تو میں ان کی یہاں موجودگی کی امید کر رہا تھا۔“ اس نے ایسا ہی سے پوچھا۔
 ”تھوڑی دیر پہلے تک وہ یہیں موجود تھے پر انہیں مجبوراً جانا پڑا۔ وہ بے چارے خود بڑی پریشانی میں ہیں۔ رات جانے ان کے کس دشمن نے ڈیرے میں قتل کر دیا۔ غلے میں آگ لگادی۔ لاکھوں کا سامان جل گیا۔ خیر، مال کی تو چودھری صاحب کو فکر نہیں لیکن پریشان ہو گئے ہیں کہ کس دشمن نے اتنی جرأت کی؟“ اس کی طرف مہر کی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔
 ”یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے۔ آپ کے جھگے کے لوگوں نے انوشکی کیشن کی اس معاملے کی؟“ اس نے بے یارزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھا بن کر پوچھا۔
 ”ابتدائی تحقیق تو ہو چکی ہے۔ جلد آدرا تھا اور موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ یہیں موٹر سائیکل کے پیموں کے جوشانات ملے ہیں اس سے ملتی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیر آدرا سے باہر کا آدمی تھا جو آئی اور اپنی کارروائی کر کے چلا گیا۔ اس کا اصل مقصد کیا تھا، یہ ابھی سمجھ نہیں آیا۔ ممکن ہے کسی نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہو یا پھر یہ کوئی شخص خاص ہے کی تلاش میں آیا ہو۔“ اس نے اپنی کچھ معنی خیز تھا۔ اپنے آخری جھلے سے اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ شہر پارک کی ذات بھی شک کی زد میں آئی ہے لیکن شہر پارک بھی تروں میں ہوا اور بے پروائی سے بولا۔
 ”چودھری صاحب سے ان خاص چیزوں کی فہرست بتائیں جن کی تلاش میں ان کے خیال میں کوئی ڈوبے سے نہیں سمجھنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ چیزوں کی تفصیل سامنے آئے گی تو مشکوک افراد کے نام بھی سامنے آجائیں گے۔“ اسے معلوم تھا کہ اس کے اس مشورے پر عمل ممکن نہیں۔ کم از کم چودھری یہ تو ہرگز بھی نہیں پاسکتا تھا کہ اس نے ڈیرے میں موجود اپنی خلیہ بھری میں چند ایسی تصویریں رکھی ہوئی تھیں جن کے ذریعے وہ شہر پارک کو ایک سیل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اس جگہ کو تسلیم کیے بغیر شہر پارک کوئی اصرار نہ کر سکتا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ کم از کم وہ لوگ اسے قانون کے چیلے میں بھڑکنے کی ہمت تو ہرگز بھی نہیں کر سکتے تھے۔
 ”آپ تو یقیناً یہاں سے چودھری صاحب کے پاس ہی جائیں گے۔ میری طرف سے انہیں پیغام دیکھنے کا کہہ کر میری مدد و درکار ہو تو تکلف نہ کریں۔ میں فی الحال مزید یہاں رک نہیں سکتا ورنہ خود ان سے ملاقات کرتا۔ اپنے پیچھے کئی اہم کام چھوڑ کر آیا ہوں اس لیے جلد واپس جانا ضروری ہے۔“ اس نے ایسا ہی کو اپنا پیغام دیا اور اس سے مصافحہ کیے بغیر دوا رانداز میں قدم اٹھا تا وہاں سے روانہ ہو گیا۔
 ”آپ کو کیا ہو گیا ہے بی بی؟ رات سے ایسے ہی لپٹی ہیں۔ نہ کچھ کھاتے ہیں۔ نہ کھاتی بیٹھی ہیں۔ اس طرح تو آپ بیمار پڑ جائیں گی۔“ کشمیر کے سرہانے کھڑی رانی تشویش زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حق طلب تھی۔
 ”جی تو کہتا ہے سر جاؤں، پر موت پر بھی تو اختیار نہیں۔“ آنکھوں پر بازو دھرے کشمیر نے رند سے ہونے کے سبب میں جواب دیا۔
 ”اللہ نہ کرے بی بی! امیرن آپ کے دشمن۔ چکا بولیں، کوئی کھڑی قویہ کی بھی ہوتی ہے۔ رانی نے دل نہ کر اسے ٹوکا۔
 ”اس وقت تو سب سے اچھا یہی لگ رہا ہے کہ اپنی جان سے چلی جاؤں۔ گناہ کرنے والے گناہ کرتے نہیں شرماتے لیکن میں ایک گناہ کو ہوتے دیکھ کر اتنی شرمندہ ہوں کہ جی چاہتا ہے زمین پیچھے اور اس میں سما جاؤں۔“ وہ بنو رانی کی کیفیت میں تھی۔
 ”آپ دل کی بہت نرم ہیں ناچی، اس لیے ذرا رانی گل پر اتنی شرمندہ ہو جاتی ہیں... ورنہ ادھر تو لوگ وڈے سے وڈا گناہ کر کے بھی انکار کر جاتے ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کشمیر کی اس حالت کی وجہ کیا ہے، بس بولیں ایک عمومی بات گمراہی تھی لیکن یہ بات کشمیر کو کوڑے کی طرح کی اور چودھری کا چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ کہتے بڑے بڑے گناہوں کا بوجھ تھا اس کے سر پر لیکن وہ اس بوجھ کو محسوس کیے بغیر پوری اٹھاتی سے جی رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے باپ کے عہدے پر فائز اس ظالم اور بے حیا شخص کو کوئی کڑی عوامی دالے مگر اس کے اختیار میں نہیں تھا۔
 بے بسی سے جھپٹے پر ادھر سے ادھر سر ہٹتے اپنے یک دم ہی شہر پارک خیال آیا۔ آفتاب کے مطابق وہ ایسا شخص تھا جو

چودھری سے ٹکر لے سکتا تھا۔ اگر فریڈ و سائٹھ و جی تو شہر پارک بددے چودھری کے خلاف کارروائی کی جا سکتی تھی۔ شدید دکھ اور اذیت کے احساس سے دو چار وہ اس خیال کے آتے ہی بستر چھوڑ بیٹھی۔ اسے فوری طور پر فریڈ و سے ملنا تھا اور اسے قائل کرنا تھا کہ وہ خود بخود غلط سمجھنے کے بجائے اس حکم کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔ اسے امید تھی کہ رات والے واقعے کے بعد اسے فریڈ و کو راضی کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔
 ”کہاں جا رہی ہیں بی بی؟ کوئی کام ہے تو مجھے حکم دیجیے۔“ اسے پھر سے ہونے سوڈے کے ساتھ کمرے سے باہر کا رخ کرتے دیکھ کر رانی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ آج صبح سے ہی حویلی کی فضا میں ایسا خاصا بھانپا تھا۔ ڈیرے پر آگ لگنے کی خبر حویلی میں بھی پہنچ گئی تھی۔ باجوہ کی موت کا بھی پتا چلا تھا اور یہ دونوں واقعات ایسے تھے جن سے حویلی کی فضا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی... لیکن رانی محسوس کر رہی تھی کہ ان دو بات کے علاوہ بھی کوئی وجہ ایسی ہے جس کے سبب وہی چودھرائی کا مزاج برہم ہے۔ چودھرائی تاہم بھی اسے کچھ پریشان ہی لگتی تھی۔ بڑی چودھرائی نے اسے حکم بھی دیا تھا کہ کشمیر کو میرے کمرے میں بھیجو لیکن اس نے کشمیر کی حد خراب طبیعت کا کہاں بنا کر اسے ٹال دیا تھا۔ کشمیر کی مزاج آشنا ہونے کے ناتے وہ جانتی تھی کہ اس وقت وہیں کیفیت کا شکار ہے، بڑی چودھرائی کے حکم کی ہرگز بھی تعمیل نہیں کرے گی۔ بڑی چودھرائی کی منہ چڑھی ملازمین بھی اور شاوہ کشمیر کی مزاج پرستی کے بہانے اس کی بات کی تصدیق کر گئی تھیں کہ وہ واقعی پیرے پر پابانہ بن گیا ہے۔ چودھرائی تاہم بھی وہاں آئی تھی لیکن کشمیر نے انہیں کھول کر ماں کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی اور اسے تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھنے کے بعد واپس بوٹروا جانے چاہا۔
 ان ساری باتوں سے رانی نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے کشمیر اپنے برہمگوں سے اور بزرگ اس سے ناراض ہیں۔ اپنے اسی اندازے کی بنیاد پر وہ کشمیر کو باقاعدگی کی کیفیت میں کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر گھبراہٹ مچ گئی اور اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ اس کی گئی بات پر دھیان دے بغیر باہر نکل گئی اور برآمدہ پارک کے عہدے اور بی منزل کی طرف جانے والی بیڑھیوں کا رخ کیا۔ پریشان ہی رانی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔
 ”ٹوک جاکشور اتوا پر نہیں جا سکتی۔“ ابھی کشمیر نے پہلے قدم چھ پر ہی پیر رکھا تھا کہ ایک دعب دار آواز فضا میں

ابھری۔ کشمیر اس جھگڑا نہ آواز کو پہچان سکتی تھی پھر بھی اس نے گردن گھما کر حکم دینے والی ہتھی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی چودھرائی کی جواس کی طرف کچھ جلال نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
 ”کیوں؟ کیوں نہیں جا سکتی میں اوپر؟“ اس نے چودھرائی کی جلال بھری نظروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شتکار کر پوچھا۔
 ”یہ تیرے ابا جی کا حکم ہے۔ میرے روکنے سے تو کوئی نہیں، کہا ان کی کل بھی نہیں مانے گی؟“ وہ گویا اسے چیل چکر رہی تھی کہ چودھری کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے بعد بھلا وہ کیسے حکم عدولی کی جرأت کر سکتی ہے؟
 ”کسی کا بھی حکم ہو... میں نہیں رکنے والی۔“ کشمیر نے ٹرکھائی سے کہتے ہوئے بڑی چڑھی پر اپنا جہر رکھا۔ رات سے اب تک وہ خود کو سنبھال ہی نہیں پائی تھی ورنہ اس جرأت مندی کا مظاہرہ بے وقافی ہوش و حواس کرنا ممکن نہیں تھا۔
 ”رب دا واسطہ بی بی! شعرت نہ کریں۔ واپس اپنے کمرے میں چلیں۔“ وقادار ملازمہ نے اس بھڑکی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اس کے قریب جا کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس سے استعفا کی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ رانی کے ہاتھ سے چھڑوا لیا۔
 ”ت روک مجھے۔ اب میں کسی ظالم کے دباؤ میں آنے والی نہیں۔“ وحشت زدہ سے انداز میں جھپٹے ہوئے اس نے ایک قدم اور بڑھایا۔
 ”مرمت ماری گئی ہے اس کڑی کی۔ گلتا ہے دماغ پر کوئی اثر ہو گیا ہے۔ کہاں ہے ناہید؟ اسے بلاؤ۔ کہو کہ اگر آپ اپنی دھمی کو سنبھالے۔“ اس کی کھلم کھلا بغاوت نے بڑی چودھرائی کو چار پا کر دیا اور وہ ڈر سے بیٹھی۔ اس سے قبل کہ وہاں موجود ملازمین اس سے کوئی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے جاتی، اقامت و خیراں چودھرائی تاہم خود وہاں آج نہیں۔
 ”کہا ہو گیا ہے میری دھمی؟ کیوں؟ اتنی خند کر رہی ہے؟ تو نے منافقین کا تیرے ابا جی نے تیرے اوپر جانے پر پابندی لگائی ہے۔ تو چل میرے ساتھ اپنے کمرے میں۔ میں تیرے ابا جی سے گلے کر کے تجھے بھڑا دے ملنے کی اجازت دلا دوں گی۔ مجھے معلوم ہے تو اپنے بھرا سے وڈی محبت کرتی ہے۔ اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پر اس وقت تھوڑا سا صبر کر لے۔“ اپنے بھائی دجو کے ساتھ تیز سے چل کر آئے اور پھر دو تین بیڑیاں چڑھنے کی وجہ سے چودھرائی تاہم کا

سائنس پھول رہا تھا لیکن پھر بھی وہ کشور کا بخاری حدت سے جلتا ہاتھ تھا اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔
 ”کیا ہنگامہ ہو رہا ہے یہاں؟ کیوں تھا تھا لگا کر دکھا ہوا ہے؟“ چودھرائی ناہید گواہی کوشش میں کامیابی ہوئی اس سے پہلے ہی چودھری افتخار خود وہاں چلا آیا۔ ایک تو ذریعے والے حادثے نے پہلے ہی موڈ آف کر رکھا تھا اس پر سے حوصلے کے زخموں نے غائب ہونے میں قدم رکھتے ہی جو پہلا منظر دیکھنے کو ملا... اسے کچھ کر مزاج اور بھی برہم ہو گیا۔ کشور کو سیر جیوں پر کھڑے دیکھ کر صورت حال بھی اس کی سمجھ میں آئی تھی چنانچہ اپنے مخصوص دنگ اور بارعب لہجے میں بے آواز بلند پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں چودھری صاحب! یہ کشور کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بخار دماغ پر چڑھ گیا ہے اس لیے عجیب عجیب خدیں کر رہی ہے یہی فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ چودھرائی ناہید نے غصہ کر بھرا کر بھانہ بتایا تاکہ بچی کو باپ کے خطاب سے بچا سکے مگر وہ خود اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ ماں کی مصلحت پسندی کی یہ دوا کیے بغیر زور سے نکلتی۔

”کوئی دماغ خراب نہیں ہوا ہے میرا، مجھے بس اوپر جانا ہے۔“

”میدوں جانا ہے تجھے اوپر؟ جب ایک واری منع کر دیا تو تیری کچھ میں نہیں آتا؟“ چودھری نے اپنے لہجے کے جلال سے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

”ہاں نہیں آتا میری سمجھ میں۔ آپ بتائیں آپ کیوں جاتے ہیں اوپر؟“ وہ بجائے دینے کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو اس کی نظروں میں اتنے شرارے تھے جن کی چودھری جیسا بندہ بھی تاب نہ لا سکا اور بے اختیار نظریں چرا گیا۔ وہاں موجود دیگر لوگ البتہ کشور کی جرأت مندی پر دنگ رہ گئے تھے۔ رانی نے تو اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ کو روکنے کے لیے ہاتھ دلائے مگر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جرأت مندی کے اظہار کے بعد کشور کو کوئی ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

”اس کو تو دماغ سچ خراب ہو گیا ہے۔ لگتا ہے علاج کے لیے کسی دوائے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ مگر لوگ اس کا سامان تیار نہ کر دے۔ کل سویرے میں اسے لاہور لے جا دوں گا۔“ اُدھر وہ کہ اس کا علاج ٹھیک طرح سے ہو جائے گا۔“ دوسرے لوگوں کو باپ بچی کے درمیان پھرتی سرور جنگ کی وجہ معلوم نہیں تھی اس لیے وہ اس نرم مزاج کو کس کھیران رہ

گئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ چودھری جس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے غبی کے سامنے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے، اس میں خود بھی اتنی تاب نہیں رہی کہ اس کا سامنا کر سکے اسی لیے علاج کے بہانے اسے شرمجوہ کر اس کی نظروں سے بچا جاتا ہے۔

”آئیں بی بی! اپنے کمرے میں چلیں۔“ چودھری بہ ظاہر چورے رعب کے ساتھ احکامات جاری کرنے کے بعد وہاں سے فوراً ہی ہٹ گیا تھا۔ رانی نے سادگت سی کڑی کشور کا ہاتھ زنی سے دبا دے ہوئے اس سے دھمکے لہجے میں کہا تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھائی رانی کے سہارے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

”ماہانوبہن! اتیار ہونا؟“ وہ اپنے دروازہ بالوں کی چٹا گوندھنے کے بعد اپنے گرد چادر لپیٹ رہی تھی جب اکرم خان نے اسے نکال کر پوچھا۔

”ہاں بھائی اکرم! اتیار ہوں۔ ابھی باہر آتی ہوں۔“ اس نے اکرم خان کو جواب دیا اور دروازہ پر ایک میل کی مدد سے نکلے دھندلے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرائی۔ نیلے پھولوں والی سیاہ چادر میں اس کا چہرہ اس دھندلے آئینے میں بھی چلتا نظر آ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ چمک اس کے چہرے کے گرد ہالے کی طرح لپٹی اس چادر کی وجہ سے ہے جو بڑی شدت سے کسی کی یاد دلاتی ہے۔ اسے یہ چادر خرید کر دینے والا خود تو شاید اپنی اس سہرا بانی کو بھول گیا ہو گا لیکن وہ ایک پل کے لیے بھی اسے بھلا نہیں پاتی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے اسے یاد آتا تھا۔ اس کے بیچوائے گرم کپڑوں کی حدت میں، ہاتھ پیروں پر لگائے جانے والے لوشن کی چمک میں، کتابوں کی سطروں میں، ہر ہر شے میں اس کی یاد کی تھی۔ وہ یہاں نہیں تھا لیکن ہر پل، ہر دم نہیں تھا۔ وہ یہاں بھی لیکن ہر پل، ہر دم نہیں تھا۔ بہت دور بخاب کے اس ضلع کے کوچوں میں بھٹکتی تھی جہاں وہ اسٹینٹ کشور کی اسے داریاں بھاتا تھا۔ اسے یاد کرنے کی فرصت بھی نہ پاتا ہوگا۔ اس سے جدا ہوتے وقت اس نے اپنے دل میں جو

عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی، کاندے کے تپا شب دروازے اس کی خوب وضاحت کر دی تھی۔ وہ جان کی تھی کہ وہ کھلے میں ڈرا ڈرا سا خود پسند اور مغرور نظر آنے والا ہے ہی اس کے دل میں جس چکا سے اسی لیے ہر پل کسی سامنے کی طرح ساتھ ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ شہر پار کے لیے اس کے دل میں وہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا تو لوگوں کے جوم میں گھر کر مئی انسان

کوسب سے کٹ کر تھرا رہنے کا ہنر سکھا دیتا ہے لیکن یہ تھائی ایسی ہوتی ہے کہ انسان اپنے کسی دنیا میں محفل سمجھائے بیٹھا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس محفل میں سوائے محبوب کے کسی اور کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس وقت آئینے کے سامنے کھڑی وہ ایک دم ہی محبوب کی اس محفل میں پہنچ گئی تھی۔ دروازے پر آہٹ اُبھری تو چونک کر اس طرف متوجہ ہوئی۔ اکرم خان کی ماں جو کھٹ پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندہ ہی ہو گئی۔

”تیار ہوں ماں! آ رہی ہوں۔“ اس نے یوں لے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ باہر جن میں اکرم خان منتظر کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی دو بیک تیار رکھے تھے۔ ان میں سے ایک بیک ماہ بانو کا تھا جبکہ دوسرے بیک میں اکرم خان اور اس کی ماں کا سامان تھا۔ وہ لوگ اکرم خان کے ماموں زاد بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے ہوئے جارہے تھے۔

”آ جاؤ بہن! اوپر سے نکلے تو مشکل ہو جائے گا۔ ہم تو مادی سے ان راستوں کا پر تھارے لیے سرفہر تو مشکل رہے گا۔“ اسے دیکھتے ہی اکرم خان دونوں بیک کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ وہ ایک پروفیشنل پورٹر تھا جسے بڑا بھاری بھر کم سامان اپنے شانوں پر رکھ کر ادھر سے ادھر پہنچانے کی اچھی خاصی مشق تھی۔ ان دونوں بیگز کو تو اس نے یوں اٹھایا تھا، گویا گھاب کے پھول ہوں۔

”جیس تو یہ سارا سامان ہاتھوں کی کپڑوں کی طرح پار ہے۔ ادھر اسکرودے ہوئے تنک اتنے چکر لگائے ہیں کہ کتنی بھی یاد نہیں۔ آج کل سیاح لوگ گندو گورو دیکھنے بہت جاتا ہے۔ ہم ماں کی وجہ سے پہاڑوں پر نہیں جاتا لیکن اسکرودے ہوئے تنک سفر کرتا رہتا ہے۔“ گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ خوش و غلام و مس ماہانوبہن کو کوٹھارہ تھا۔

”پھر تو آپ کا ہوئے ہیں ماموں کے گھر بھی آنا جانا لگا رہتا ہوگا؟“ ماہانوبہن نے اس کی گفتگو میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، ہر بار ادھر جانے کا موقع نہیں ملتا۔ ہم میم کے ساتھ جاتا ہے تو پھر اسی کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔“ اکرم خان نے بتایا۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کاندے والا بیدار تھا۔ بلند پہاڑوں سے بہہ گرتے اس نالے کے پانی کا شور دور سے ہی سنائی دے گیا تھا۔ نالے میں تیزی سے بہتے پانی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پتھر بھی لڑھکتے ہوئے دکھائی دے

رہے تھے۔ نالا پار کرنے کے لیے جوں بٹایا گیا تھا، وہ محض دو پتھر وں پر مشتمل تھا۔ اس پل کے ذریعے اسے پرشور نالے کو پار کرنے کے خیال سے ماہانوبہن کا پٹھان۔

”فکر نہ کرو بہن! ہم جیس ہمارا دے کر پل پر سے لے جائے گا۔“ اکرم خان نے اس کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے اسے تسلی دی پھر بھی اس کا ذہن قلم نہیں ہوا۔ ”پہلے ماں کو لے کر جاؤ۔“ اس نے اکرم خان سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ پہاڑوں کی باسی اس بوڑھی عورت نے ہٹا چکے جھلسن زدہ پتھر وں پر مشتمل پل پر قدم رکھا اور اپنے جوان بیٹے کے سہارے نالے کے اس پار جا پہنچی۔ ماں کو اس پار پہنچانے کے بعد اکرم خان واپس آیا۔ اس دوران ماہانوبہن اپنے اندر کافی حوصلہ پیدا کر چکی تھی، چنانچہ اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی لیکن پھر بھی خوف تو دل میں تھا ہی۔ اس نے اپنی زندگی میں پانی کا جو سب سے بڑا تجربہ دیکھا تھا، وہ پیر آباد کی نہر تھی۔ وہ سہرا جیسی خاصی طویل اور گہری ضرورت تھی لیکن اس کا پانی اتنا ہنگامہ درود نہیں تھا کہ دیکھنے والا دور سے ہی ڈر جائے۔ قریب دغا نہیں مانتے اس نے اکرم خان کے سہارے کاندے کا کثرت ناک نالا پار کیا اور کھارے پر پہنچنے ہی ایک طویل اٹھتانا بھرا سانس لیا۔

”اچھا ہوا ہم نے تمہیں اس نالے کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر ہم نہیں بتا دیتا کہ اس نالے میں گرنے کے بعد آبی کا پچھا ممکن نہیں تو تم تو پل پر قدم ہی نہیں رکھتا۔ اس میں گرنے والا تو بس پھتا ہوا سیدھا نیچے شیوک میں ہی پھینچتا ہے۔ شیوک دریا کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟“ اکرم خان اس کی حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے اسے پچھنے لگا۔

”مجھے ابھی یاد دکر آگے تمہارے ہوئے کے راستے میں اور کتنے ایسے ندی نالے پڑتے ہیں تاکہ میں نہیں رک جاؤں۔ اس سے آگے میں اور کوئی ایسا خطرناک نالا پار کرنے کو تیار نہیں۔“ ماہانوبہن نے پھر پھر جھپٹتے ہوئے کہا تو اکرم خان زور سے ہنس پڑا پھر اسے اطمینان دلاتے ہوئے بولا۔

”فکر نہ کرو ہمارا بہن! آگے ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں سے آگے ہم ہوئے تنک آرام سے جیب میں سفر کر گئے گا۔“ ماہانوبہن نے دیکھا تو واقعی وہاں کچھ قاصدے پچھتہ جیس کھڑی ہوئی تھیں۔ اکرم خان اسے اور اپنی ماں کو لے کر ان میں سے ایک جیب کی طرف بڑھ گیا۔ جیب ذرا نیچو اس کا

آتشا تھا جس نے مقامی پولی میں اس سے دوستانہ لہجے میں بات کرتے ہوئے ان لوگوں کے جیب میں بیٹھنے کی جگہ بنا دی۔ جیب میں بہت سا سامان لدا ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے بیٹھنے کے لیے مشکل سے ہی جگہ بن سکی تھی۔

”پچھلی جیب میں جو اچھی ڈنٹیں ہم بیٹھا ہے، یہ اس کا سامان ہے۔ یہ جیب ڈراپور ہمارا دوست ہے اس لیے ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے راضی ہو گیا ہے ورنہ اس سے ہوشے تک جانے کا جیب والا بہت پسپا لیتا ہے۔“ اکرم خان نے جیب میں موجود سامان اور غیر آرام دہ نشست کے لیے اس کے سامنے وضاحت پیش کی۔

”کوئی بات نہیں بھائی اکرم! آپ نے بتایا تھا کہ یہ صرف گھنے بھر کا راستہ ہے، تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک گھنٹہ تو آسانی سے گزر جائے گا۔“ اس نے اکرم خان کو شرمندگی سے بچانے کے لیے کہا۔ جیب مروان ہوئی تو وہ اور درو کے مناظر کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ نہیں درخت اور بھاڑیاں تھیں تو کھس بڑی بڑی پٹائیں۔ ان کا کھیتوں کے ایک سلسلے کے قریب سے بھی گزر رہا تھا۔

”اس پل کے پار جانے کے بعد ایک چڑھائی آئے گی اور ہم ہوشے پہنچ جائیں گے۔“ اچھا خاصا طویل راستہ طے کرنے کے بعد جب ان کی جیب چڑھائی کی اوٹ میں سے گزر رہی تھی تو اکرم خان نے گہرائی میں موجود پل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرخوشی کے عالم میں بتایا۔ اس کے لہجے کی اس خوشی پر وہ اچھی خود کر رہی تھی کہ جب نے پل طے کر لیا اور ایک دروست چڑھائی پر چڑھنے لگی۔ چڑھائی اتنی زیادہ تھی کہ اسے گھٹا تھا جیب سے نکل کر پیچھے جا کر گرنے کی ٹیکن خبر گزری اور ماہر ڈراپور نے انہیں بے خبر و عافیت ہوتے ہوئے پہنچا دیا۔ چند گھنٹوں پر مشتمل ہوشے گاؤں کا ایک کچا کچا مکان ان کی منزل تھا۔ اپنی اکر جانے والی ناٹوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ لوگ جیب سے اتر کر پیچھے ہی اس مکان میں داخل ہوئے ایک لڑکی سامنے آگئی۔ لڑکی کی رنگت صاف تھی اور اس نے اپنے بالوں کو بے شمار میٹھیوں کی صورت میں گوندھ رکھا تھا۔

”یہ گل بیٹا ہے، ہمارا ماموں زاد۔“ لڑکی پر نظر پڑتے ہی اکرم خان کی آنکھیں جھٹکتی گئیں اور اس نے ماہ بانو سے اس کا تعارف کروایا۔ کچھ دم اس پر مشفق ہو گیا کہ اکرم خان کی خوشی کا سبب یہی لڑکی گل بیٹا ہے۔ گل بیٹا پہلے اپنی پھوپھی سے ملی پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ماہ بانو نے آگے بڑھ کر

اسے گلے لگا لیا۔ گل بیٹا کے جسم سے کبھی ہی ہوا بھری تھی۔ یقیناً ہوشے کی روایت کے مطابق وہ بھی بہت کم کم ہی ہوائے کی ذمہ داری کرتی تھی۔ ماہ بانو کے ہنسنے نے اس کو کھنکھناتے ضرور کیا لیکن ناگوار کی احساس کے بغیر۔ کیونکہ اس کی ہوشے کے مقابلے میں محبت کی وہ نمک زیادہ طاقتور تھی ہنسنے کوئی محبت بھرا دل رکھنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ وہ بانو نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ گل بیٹا کے ہنسنے دل میں اکرم خان کی محبت کا پھول ہمک رہا ہے۔

گھنٹوں سے اونچے مینے چنک چکا گھرؤں کے ساتھ۔ سر پر پھٹی پرانی سی اوڑھتیاں رکھے وہ دونوں عورتیں زمین پر اوڑھ اور نظر دوڑاتی آئے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے شانوں سے بڑے بڑے جھولے لٹک رہے تھے جن میں وہ راستے میں ملنے والے ہڈیوں اور کچے کھڑکوں کے علاوہ کالہ گے تڑے اور دھگر اسی طرح کی چیزیں ڈالنی جا رہی تھیں۔ ان کے چروں کی سیاد رنگت، چڑی زدہ ہونٹ اور گندے اچھے ہوئے بال ان کے شانوں سے لٹکے جھولوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ لوگ اس میںے نہیں گھومیں اور کچرا کھنڈیوں سے کچرا چھنے والی ان عورتوں کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان دونوں عورتوں کو کبھی کی ایک افراد نے دیکھا تھا جن سر پر ہی نظر ڈال کر ایک معمول کا حصہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ کبھی نے اگر گہری نظر ڈالی بھی تھی تو ان کے چروں پر نہیں بلکہ ان شیب و فراز پر جوسر پرانی اوڑھتوں کے دونوں پلو شانوں سے پیچھے پڑے ہوئے کی وجہ سے ہر ایک کو ہی دعوت نظر دے رہے تھے۔ جو ہوں پرست تھے، وہ اس نظارے سے بن باگی لغت کی طرح لطف اندوز ہونے کے ساتھ ہی ایک آدھ ٹش جملہ جھٹک کر آگے بڑھ جاتے تو کوئی ان کے زیادہ قریب نہیں آتا تھا۔ کہ سب ہی کو معلوم تھا، یہ کچرا چھنے والی عورتیں کس درجہ بد زبان اور مردار ہوتی ہیں۔ کبھی بوری میں کمرلوں پر بچھنے والی یہ عورتیں اپنی بے باکی سے محسوس کر پاتا کہ کمر لڑکی اس اعتماد کی بنیاد پر نہیں کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی مانی کالال ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کوئی جرأت کرتا تو وہ اس کی عزت کو پھرا کرنے میں لچر بھر بھی نہیں لگا تھی۔ چنانچہ کن جیلہ دور سے چاہے جتنی آنکھیں کھلیں، قریب آنے کا رشک نہیں لیتے تھے۔ ان عورتوں کے گندے ہاتھ بھی مردوں کو ان سے دور رکھنے کا ایک سبب تھے۔

اپنے کام میں منہمک بڑی بے نیازی سے قدم اٹھا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ اپنی نظریں اور گرد و زرائے ہیں تو صرف زمین پر پڑے کچرے کو نہیں ٹوٹیں بلکہ اپنے اطراف کا بے حد مہرمان اور پیشہ ورانہ جائزہ بھی لیتی ہیں۔ یہ ظاہر بے نیازی سے لیکن حقیقت میں ایک ایک قدم چوک چوک کر اٹھاتی وہ دونوں اب ایک سرکاری اسکول کے مین گیٹ کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ اچھی آنسو دین نہیں ہوا تھا لیکن اسکول کے گیٹ کے باہر پھیلے اور خراپے والے جج ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اس منظر کو سرسری نظر سے دیکھتی ہوئی اسکول کے سامنے سے گزر کر وادیں جانب مڑ گئیں۔

اسکول کی وادیں جانب کی دیوار کے ساتھ اہل علاقہ نے کچرا کھنڈی بنائی تھی۔ وہ دونوں کی معمول کی طرح اس کچرا کھنڈی میں داخل ہو گئیں۔ وہاں کچھ کچرا کھنڈی کے پھرا ختنے کا مل جاری رکھا۔ پھر ان میں سے ایک کچرا چھنے ہفتے اسکول کی دیوار کے بالکل قریب پہنچ گئی اور اپنے شانے پر لٹکا بڑا سا بھرا پھرتی سے اتار کر دیوار کی جڑ میں رکھ دیا۔ اس محل سے فارغ ہوتے ہی اس نے ذرا فاصلے پر کچرا چھتی اپنی سامنے کی طرف دیکھ کر کبھی کا نشان بنایا اور پھر وہ دونوں جس انداز میں اپنی آئی تھیں، اسی انداز میں اس علاقے سے دور نکلی چلی گئیں۔ اس علاقے سے بہت دور نکلنے کے بعد ایک گاڑی ٹوڑا کر ریت ان کی نظر میں گازی میں بیٹھنے ہی انہوں نے اپنے لیے تبدیل کرنا شروع کر دیے۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی، کچرا چھنے والی عورتوں کے چھلے میں سے دو مختلف لڑکیاں برآمد ہو رہی تھیں۔ ”را“ کی خصوصی آنکھیں ارمیلا اور گیند لکھنؤ دھڑکتی۔

”ایک جتنے میں دوسرا ہم راست۔۔۔ دیکھی ایسا جس میں اسکول کے محصوم بچے مارے گئے۔ لوگ کیسے برداشت کر سکتے ہیں اس صورت حال کو؟ اوپر سے پیچھے سب مل کر رہ گئے ہیں۔“ اپنی کبیب اتار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے مختار مراد خود کھانسی کے انداز میں بولا اور کرسی پر براہمان ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تڑات سے ظاہر تھا کہ وہ بہت زیادہ اوصالی دیا اور دشمن کا شکار ہے۔

”اوپر والوں کو کہتے ہیں۔ انہیں کسی حادثے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ دوچار چاندنی بیان دے کر قارخ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہم پولیس والے ہیں جو ایسے ہر موافق پر گدھوں کی طرح کام کر رہے ہیں اور لوگوں کی باتیں بھی

سننے ہیں۔ آپ معلوم کر کے دیکھ لیں، وزیر اعظم اور صدر میں سے کوئی ذات کے اس چہرے کا ربا ہوگا۔“ مختار مراد نے گلے گلے انداز میں خود بھی ایک کرسی سنبھالے ہوئے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا جسے سن کر مختار مراد کے لبوں پر ہمہ کی مسکراہٹ دوڑی اور لب بھر میں محدود ہو گئی۔

”آج تو تم اپنے کزن شہریار کے لہجے میں بات کر رہے ہو۔“

”ہر گز آدمی کو ان حالات میں اسی لہجے میں بات کرنی چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ شہریار غلام نہیں ہے، بس مصلحتی اسے ٹوٹتا رہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جڈ بات کا اعتبار ہم جیسے لوگوں کو سوٹ نہیں کرتا لیکن میں تو بہر حال، ہم بھی انسان۔ آپ قہقہے، کیا آپ کا دل نہیں کاٹتا ان بھونے بھونے بچوں کی سوختہ لائیں اور پھر سے ہونے مصلو دیکھ کر؟ لیکن میڈیا والے ہم سے ایسا رویہ رکھتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ہم نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہو۔ پولیس کیا کر رہی ہے؟ حادثے کا ذمے دار کون ہے؟ اس واقعے کے پیچھے کوئی جہادی تنظیم ہے یا پڑوسی ملک کے دہشت گرد؟ ہر سوال کا جواب ان دی اسپاٹ چاہیے ہوتا ہے انہیں۔ کیا پولیس کو الہام ہوتا ہے کہ حادثہ ہونے ہی کھڑے کھڑے ان کے ہر سوال کا جواب دے دیں۔ اگر ہمیں کسی پر شک بھی ہے تو کیا میڈیا پر ایسی باتیں جاسکتی ہیں تاکہ ہمارے کچھ کرنے سے پہلے ہی مجرم ہوشیار ہو جائیں۔“ حادثے کی ہولناکی، دن بھر کی بھاگ دوڑ اور میڈیا کی مسلط کردہ اوصالی جنگ نے اسے اتنا اعصاب زدہ کر دیا تھا کہ اس وقت وہ کسی طرح اپنے مزاج کی برہمی کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

”پانی پوتا کہ کچھ فصد بھٹتا ہو۔“ مختار مراد نے گلاس میں پانی اٹھیں کر اس کی طرف بڑھایا اور اس کا کام پر چائے اور انیس کے لیے آرڈر دینے لگا۔ اسے مختار مراد کی چینی کیفیت کا مکمل ادراک تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ایک ایسا شخص جس نے حال ہی میں اپنی بیوی کو جان دینی کو کھنڈیا تھا، محصوم بچوں کے کھلے جیسے جسم دیکھ کر کس ذہنی و فنی اذیت سے گزرا ہوگا۔ خود وہ بھی بری طرح ڈر رہا تھا، ہوا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

”سوری! میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔“ اس کے مشورے پر گلاس بھر پائی چھینے کے بعد مختار مراد ڈراپور اٹھا ہوا تو شرمندگی سے بولا۔

وقت ضرورت آتا ہے جب وہ اپنے عہدے اور فرائض سے ہٹ کر ایک عام انسان کی طرح ری ایکٹ کرنے لگتا ہے۔ تربیت اپنی جگہ لیکن اپنے جذبات کو یکسر ذات سے اکھاڑ پھینکا بہر حال ممکن نہیں۔ مختار مراد نے اپنے مخصوص نظریے ہونے انداز میں اسے جواب دیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور ایک ملازم اجازت ملنے پر چائے اور اسٹیکس سے بھری ہوئی نمالی لے کر اندر داخل ہوا۔ ملازم کے نمالی پیچھا کر رہا تھا چائے جانے تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ وہ واپس چلا گیا تو مختار مراد نے گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر جوڑا۔

”میں تمہاری کیفیت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میڈیا والے بعض اوقات واقعی بہت زیادہ زیادتی کر جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بھی آپ سے باہر ہو جائیں۔ جس طرح کی جذباتیت کا مظاہرہ تم ابھی میرے سامنے کر رہے تھے، اگر کسی فیروز جیٹل کے نمائندے کے سامنے کر دیتے تو اس کا انجام جانتے ہو؟ ہمارے باپ پہلے ہی پولیس سے بڑھ کر ناقابل اعتنا کوئی ادارہ یا فرد نہیں۔ تم میڈیا کے خلاف کچھ اتنا سیدھا کہہ دیتے تو ہر طرف سے لوگ پچھے پچھے جھڑک رہے ہوتے۔ پچھے جاتے۔ پہلے ہی تمہاری پوزیشن کافی نازک چل رہی ہے۔ خواہ سب سرائوں والے معاملے میں تمہارا نام سر فہرست ہے۔ پولیس کھڑی میں جو خواہ سب مارا گیا، اس کے بارے میں ہی ہم ابھی تک میڈیا کے شلوک و شہادت دور نہیں کر سکے۔ ایسے حالات میں اگر تم نے میڈیا کے خلاف کچھ بول دیا تو وہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے کیا؟ وہ تو تمہارے اگلے پچھلے سارے کھاتے کھول کر بیٹھ جائیں گے۔“ اس کا کہا ایک ایک لفظ اپنی جگہ درست اور جی حقیقت تھا۔ مختار مراد جیسے پہلے ہی اپنی جذباتیت کا احساس ہو چکا تھا، کچھ اور بھی شرمندہ ہو گیا۔

”آپ جانتے تو ہیں اگلے کس میں شینا والا کیس ابھی تک حل نہ ہونے کی وجہ سے کتنا پریشان ہوں۔ ابھی تک اس معاملے میں کوئی حتمی بات معلوم نہیں ہوئی۔ اوپر سے ان ہم دھماکوں نے ابھی کر رکھا ہے۔ مارکیٹ والے طاقت پر کتنا کام کیا میری ٹیم نے لیکن کیا معلوم ہوا؟ اتنی جدوجہد کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ جس دکان میں ہم رکھا گیا تھا وہاں بلاسٹ سے پہلے وہ ایسی لڑکیوں کو جانتے دیکھا گیا تھا جن میں سے ایک کے ہاتھ میں بیماری ٹیک تھا۔ لڑکیوں کو کوئی جانتا تھا اور نہ ہی کوئی ان کا حتمی حلیہ بتا سکا۔ خیر اداروں

نے بھی کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے کیس کو حل کرنے میں مدد ملے یا تفتیش کی گاڑی آگے بڑھائی جاسکے۔ اب آج والے بلاسٹ میں بھی وہ مشکوک عورتوں کا ذکر سننے میں آیا ہے۔ ہم اسکول کی جس دیوار کے ساتھ رکھا تھا، اس کے ساتھ پکڑا کھرہ ہے اور بلاسٹ سے پہلے وہاں پکڑا ہوا والی رو عورتوں کو جانتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ پولیس کے پتھر آج سارا دن ان لوگوں کے درمیان دونوں عورتوں کی بوسختی ہوئے پھر رہے ہیں، لیکن اسے کوئی کچھ نہیں ملا۔ بات ویسے بھی سمجھ آتی ہے۔ یقیناً پکڑا ہوا عورتوں کا گیت اب دہشت گردوں نے گور کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ عورتیں آرام سے اپنے کپڑے کھانے پر بیٹھی ہوں گی اور دنی وی پر خبریں دیکھ کر ہمارے ہی کسی اور اپنی کامیابی پر قہقہے لگا رہی ہوں گی۔“ اپنے رویے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر کہہ جاتے ہوئے بھی جذباتی ہو گیا۔

”ان معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، اے کام کرنے والا اعتبار سے کام تو لے گا۔ مجرم خود تو اپنے آپ کو قتالی میں سجا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے خصوصی کیسز میں تو ویسے بھی حالات بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اکثر تو سارے کیسز بھی مل جاتے ہیں اور مجرم کی شناخت بھی ہو جاتی ہے لیکن مصیقتوں اور مجبوریاں ابھی سے کچھ بھی سامنے نہیں لایا جا سکا۔ تم نے تو ایک طویل وقت گزارا ہے ملازمت میں۔ تم خود یہ سارے حقائق جانتے ہو۔ میرے خیال میں تو مجھے تمہیں کچھ بھی سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی چاہیے کچھ۔“ مختار مراد نے گفتگو کے دوران سامنے دھکی جانے والی سینڈ وچر کی پلیٹ کی طرف اسے متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر چائے کے برتن اپنی طرف کھکے۔

”آپ رہتے دیں۔ میں بتاتا ہوں۔“ اسے یک دم اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ عہدے کے اعتبار سے بھی اور رشتے کے لحاظ سے بھی دونوں صورتوں میں مختار مراد اس کے لیے واجب الاحرام تھا۔ اگر چنانچہ اور بے تکلفانہ ماحول درکار تھا تو اس وقت ملازم یہ خدمت انجام دیتے لیکن ملازم کی عدم موجودگی میں تو اس کا ہی فرض بنتا تھا کہ وہ اس بات کا دھیان رکھے مگر وہ اپنی انجمن میں گھر کر گیا ہی کا مرتب ہو گیا تھا۔ اب خیال آیا تو فوراً مستعد ہوا۔

”ساتھ میں کچھ کھا بھی لیتے تو اچھا ہوتا۔ چند کھٹوں بعد صبح پھر ہم گھر دوڑ شروع ہو جائے گی۔“ جب وہ اپنی بات بتاتی ہوئی چائے کی پیالی میں سے کھونٹ بھر رہا تھا تو مختار مراد نے اسے ٹوکا۔

”نہیں، کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے پی کر اب فوراً کھرہ کے لیے نکلوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ مجرم ابھی تک جاگ رہی ہوگی اور پریشان ہوگی۔ شینا کے بعد اس کی ذہنی حالت بہت خراب ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر لے لیتا ہے۔ آج والا حادثہ اس کے علم میں آیا ہوگا تو میری طرح متاثر ہوئی ہوگی۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اسے لے کر مٹی کی طرف شفٹ ہو جاؤں۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میری عدم موجودگی میں وہ کسی اپنے کے ساتھ ہے۔“ تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ میرے خیال میں تو تمہیں فوراً اپنے اس فیصلے پر عمل کر لینا چاہیے۔“ مختار مراد نے اس کی بھرپور تائید کی۔

”میں ایسا ہی کروں گا۔ ابھی تو میری کی ٹکری وہرے میں بہت سے معاملات ابھر رہے چھوڑ کر کھرہ واپس لوٹنے پر مجبور ہو جاتا ہوں لیکن اسے مٹی کے پاس شفٹ کرنے کے بعد میں پوری یکسوئی سے شینا کے کیس کی نگرانی کر سکوں گا۔ اپنی بیٹی کے قاتلوں کو کیڑا کر دار تک پہنچانے بغیر مجھے کسی صورت چین نہیں آئے گا۔ مجرم کتنے ہی طاقتور اور ترقی والے کیونکر ہوں، میں نے انہیں فست و فساد کرنے کا عہدہ کر رکھا ہے۔ اس عہدہ کی راہ میں کوئی مصیقت اور مجبوری نہیں آسکتی۔“ اس نے اپنے عزائم کا اظہار کیا اور چالی میں موجود آخری کھونٹ بھی اپنے حلق میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مختار مراد خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اب تک جو حالات سامنے آئے تھے، ان سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ شینا کا کل می عام مجرم کے ہاتھوں نہیں ہوا ہے۔ اس قتل کے ڈانٹے جن لوگوں سے جا کر مل رہے تھے، ان کے مقابل کھڑا ہونا آگ کے شعلوں میں کودنے کے مترادف تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اپنے ہی لوگ اس جنگ میں ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے لیکن وہ سجادہ کو روک کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ والا کی جدائی کے غم سے جلتا ہوا باپ کا بیٹا کسی بھی مصیقت کا پانی چھڑک کا خنڈ نہیں کیا جا سکتا، یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

☆☆☆

”دیکھی ہیں ڈاکٹر ماریا۔“ حراج تو اچھا ہے آپ کا؟“ ”جی ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ آپ خاص، آپ کا مسئلہ ہو یا نہیں؟“ ”اسی کے سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اصولاً تو مجھے کل ہی آپ کو فون کر لینا چاہیے تھا لیکن مصروفیت ہی کچھ ایسی رہی کہ موقع نہیں مل سکا۔“

فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ کے انتقال کے بارے میں تو آپ کو علم ہے ہی۔ اس کی وجہ سے کل شیڈول سے ہٹ کر پتھر کا پاد آنا پڑا مگر دوسرے بہت سے کام بھی دیکھنے تھے اس لیے آپ کو کال کرنے میں تاخیر ہوئی۔ وہ دن سے ماریا کا احسان مند تھا اس لیے شکر یہ ادا کرنے میں دیر ہو جانے پر اتنی وضاحت پیش کر رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں اسے ہی صاحب! مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں اس لیے آپ سے شکوہ کرنا ٹھیک نہیں۔ آپ کا کام ہو گیا ہے، اس کا اندازہ کل ذریعے پر آگ لگنے کی اطلاع سن کر ہی ہو گیا تھا۔ خوب سبت سکھایا آپ نے چودھری افتخار کو۔ تم لایا ہوا پھر رہا ہے بے چارہ۔ میرے خیال سے تو کل کا دن آپ کے لیے بہت ہی خاص تھا۔ ایک طرف چودھری کو ڈک پہنچانی تو دوسرے اس کے اہم حلیف باجوہ سے بھی جان چھوٹ گئی۔ لگتا ہے قدرت بھی آپ کا ساتھ دے رہی ہے۔ میری طرف سے ان کامیابیوں پر مبارکباد قبول کریں۔“

”بہت بہت شکریہ لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے باجوہ کی موت کی خبر سن کر بالکل بھی خوش نہیں ہوئی۔ میں کسی کی موت کو اپنی کامیابی تصور کر کے شادمانے بھانے والا آدمی نہیں ہوں۔ ہاں، البتہ اگر باجوہ کا جرم ثابت ہو جاتا اور اسے عدالت سے سزا ملتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔“ شہر یار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”یہ تو اتنا اہم نقطہ نظر ہے۔ آپ سرکاری آدمی ہیں اس لیے قانون کی برتری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم جیسے عام لوگوں کے لیے یہی کافی ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح کی بڑے آدمی سے نجات مل گئی۔ آپ کے بڑے اعتبارات ہیں، کوشش کیجئے گا کہ باجوہ کی جگہ کوئی ایسا بندہ آجائے جو چودھری کا بیٹا نہ بنے۔“ ”ہے کوئی ایسا نہیں آپ کی نظر میں؟“ ”فی الحال تو نہیں لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں خیال رکھوں گا کہ نیا فاریسٹ آفیسر کوئی ڈھنگ کا بندہ ہو۔“ اس نے ڈاکٹر ماریا کو تسلی دی۔

”ایک نام میں بھی جو بڑ کر سکتی ہوں۔“ غایہ انصاری نام ہے ان صاحب کا۔ میں جس اسپتال میں جا کر رہتی تھی، ایک بار وہ اپنے بچے کے آپریشن کے سلسلے میں وہاں کچھ عرصے داخل رہے تھے۔ ان دنوں میری ان سے کافی بات چیت ہوتی تھی۔ مردم شناس کا دعویٰ تو نہیں لیکن چونکہ ڈاکٹر کی حیثیت سے ان میں سے شمار لوگوں سے ملنا پڑتا ہے، اس لیے کچھ نہ کچھ بندے کی پرکھ رہے تھے۔ غایہ انصاری صاحب کو

میں نے بہت اچھا آدمی پایا تھا۔ اپنی گفتگو سے بہت جڑے لکھے، نہیں اور ایمان دار آدمی لگتے تھے۔ اگر ہو سکتے تو آپ انہیں ضرور آزما لیتے گا۔ ڈاکٹر ماریا نے بے حد شائستگی سے ان کے مشورے سے انکار کیا۔

”جی ہاں، میں دھیان رکھوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی والدہ کی کوئی اطلاع کی؟ اس وقت آپ کا شکر ہے اور کرنے کے علاوہ میرے کال کرنے کا اہم مفہوم ان کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے میں آپ کی کوئی مدد نہ کروں۔ چودھری کے ایک دو خاص بندے ہیں میری نظر میں۔ ان میں سے کسی کو اپنے آدمیوں سے انکار کرنا پڑے گا۔ پھر کچھ کروں تو آپ کی والدہ کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔“

”نہیں نہیں، پلیز! ایسا کچھ مت کیجیے گا۔ اس طرح میری جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ آپ چودھری کے آدمیوں میں سے کسی سے انکار اس مسئلے میں پیش کریں تو فوراً یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میں نے آپ کوئی والے معاملے کی خبر دی ہے اور مجھے یہ بات پہلے ہی سمجھادی تھی کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتا دیا تو میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ میں کسی کی زندگی کے لیے کوئی دسک لینے کو تیار نہیں۔ اس لیے پلیز! آپ کوئی بھی کارروائی کرنے سے گریز کریں۔ میری قسمت میں جب ہوگا وہی مجھے مل جائیگا۔ ابھی تو میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور فون پر بھی بکھار مجھے ان کی آواز سنا دی جاتی ہے۔“ خوف زدہ سے لہجے میں اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے روکتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے اپنے انکار کی وجہ بیان کی۔

”لیکن اس طرح تو آپ کا معلوم مدت تک چودھری کے چنگل میں پھنسی رہیں گی اور وہ آپ کا جذباتی و جسمانی استحصال کرتا رہے گا۔ میری مائیں تو تھوڑی سی صبر کریں اور مجھے خوش کرنے دیں۔“ شہر یار نے اسے سمجھایا۔

”ہاں! نہیں۔“ میری بی بی اس دنیا میں میرا واحد رشتہ ہیں۔ میرے ساتھ جانا ہے کچھ بھی ہو جائے نہیں میں ان کے لیے ذرا سا بھی دسک لینا پسند نہیں کروں گی۔ اگر آپ نے زبردستی اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی کوشش کی تو میرے خدان سے محروم ہو جائیں گے۔ اپنی بی بی کی حفاظت کے لیے میں آپ کا ساتھ چھوڑ کر چودھری افشار کی صف میں بھی کھڑی ہو سکتی ہوں۔ یہ بات ابھی ملے یا نہ ملے گی۔“ ڈاکٹر ماریا کا لہجہ کچھ جھکی آمیز ہو گیا لیکن شہر یار نے برا نہیں مانا۔ وہ جانتا

تھا کہ ماریا بہت خوف زدہ ہے اور کسی بھی صورت اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہتی ہے اس لیے اس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔

”اے ڈاکٹر ماریا! رہیں! آپ فکرت کریں۔ میں آپ کی اجازت کے بغیر اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔“ اس نے ماریا کو تسلی دی۔

”تھیک! اسے ہی صاحب! مجھے امید ہے کہ آپ میری باتوں کا برا نہیں منائیں گے۔ آپ میری بازائیں کچھ سکتے ہیں۔ میں دیکھوں گے ترے میں سے کتنی ایک تہا لڑکی ہوں اور ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی جو مجھے ناقابلِ اطلاعی نقصان سے دوچار کر دے۔ لیکن آپ سے میرا وعدہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکا، آپ کی مدد کرنی رہوں گی۔“ اس کی تسلی پر مطمئن ہو کر وہ اپنے تعاون کی یقین دہانی کروانے لگی۔

”جیسی آپ کی مرضی۔ میں بہر حال، ہر وقت آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ جب جاناں بچھ فون کر سکتی ہیں۔“ اس نے ڈاکٹر ماریا کو جواب دیا اور ایک دو روایتی الوداعی جیسے ادا کرتے ہوئے رابطہ منقطع کرنے کے بعد ایک گہرا سانس لیا۔ چودھری کے جرائم اور مظالم کی کئی داستانیں سامنے ہونے کے باوجود وہ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے خلاف ٹھوس اقدامات اٹھا سکے۔ چودھری کا مٹر رسوخ اور دہشت قدم قدم پر راکٹ بن کر سامنے آ جاتی تھی۔

”آپ کا شک درست نکلا چودھری صاحب! آپ کے ذمے پر کارروائی کرنے والا شخص میری طور پر اسے ہی شہر یار ہی تھا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں۔ اس بات کی تصدیق ہوئی ہے کہ جس رات ڈیرے پر کارروائی ہوئی، اس رات اسے ہی نے اپنے بچے پر ایک موٹر سائیکل چوری جیسے منگوائی تھی اور صبح وہ بندہ جس کی موٹر سائیکل میں اسے بچے سے واپس لے گیا تھا۔ موٹر سائیکل کی حالت دیکھ کر کسی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر غول سفر کیا گیا ہے۔ وہ بھی بچے کے، نیز جسے میز سے ہار سٹوں پر۔“

”تو پھر آپ کارروائی کریں! ایسا بی صاحب! آپ کے پاس ثبوت ہے تو پھر آپ جانیں تو اسے ہی کوئی گرفتاری کر سکتے ہیں۔ میں نے ابھی تک ایف آئی آر میں کسی شکوک بندے کا نام نہیں لکھوایا۔ آپ نہیں تو اب اسے ہی کا نام لے لیتا ہوں۔“ اس نے تارڑ کی فراہم کردہ اطلاع سن کر چودھری

اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے اور ہر جوش لہجے میں اسے مشورے سے نوازتے ہوئے خود بھی آگے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا چودھری صاحب! ہمارے سارے ذرائع ایسے نہیں ہوتے کہ ہم انہیں عدالتوں میں گواہ بنا کر کھڑا کر سکیں۔ بس آپ سمجھیں کہ یہ آف دی ریکارڈ معلومات ہیں جو میں نے آپ تک پہنچائی ہیں۔ اگر میں نے کسی طرح خبری کرنے والے کو عدالت میں گواہی دینے پر مجبور بھی کر دیا تو بھی ہم اسے ہی کوئی گھر نہیں گے۔ وہ کہہ دے گا کہ ہاں، میں نے اس رات اپنے بچے پر ایک موٹر سائیکل منگوائی تھی اور رات بھر اس پر ارد گرد کے علاقے میں گھومتا رہا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں چودھری افشار کے ذمے پر آگ لگانے کی جی چاہتا تھا۔ کیا وہاں کوئی ایسا ثبوت ملے جس سے میری آمد ثابت ہو سکے؟ چودھری یا اس کے کسی بندے نے اپنی آنکھوں سے مجھے وہاں آتے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو پہلے ہی دن کیوں نہ بتا دیا؟“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کی تصدیق کے باوجود میں اسے ہی کے بچے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ کی دی ہوئی انفارمیشن آف دی ریکارڈ ہی رہے گی اور اس سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔“ تارڑ کے انکار اور دلائل نے چودھری کو بھٹکاٹ میں مبتلا کر دیا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ آپ کو اس انفارمیشن سے کوئی فائدہ ہی حاصل نہ ہو۔ کم از کم آپ اسے ی پر دباؤ تو ڈالوا ہی سکتے ہیں۔ فون کریں اس کے ایم این اے ماموں کو اور بتائیں کہ اس کا بھائی یہاں کیا کچھ کرنا پھر رہا ہے۔ ساتھ یہ احسان بھی بتا دیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے میں صرف آپ کے لحاظ میں آپ کے بھائی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہا۔ باقیقت رانا خود اپنے بھائی کو سمجھالے گا کہ چودھری سے زیادہ پیگا نہ لو۔ مجھے یقین ہے کہ اسے ہی صاحب کم از کم اپنے ماموں کے علم میں تصویروں والی بات لانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ ان میں انہیں ڈر ہوگا کہ جانے ماموں یقین کریں یا نہ کریں۔ انا اپنا کردار منگوا کر ہو جائے۔“ تارڑ نے شہر یار انداز میں چودھری کو صلاح دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”مجھے تو تھوڑی بائیں ٹھیک ہے ایسا بی صاحب! چلیں تو فیروا ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ دن تو وہ بولنگوا آرام نہال بیٹھ جائے۔“ آخر اس نے تارڑ کا مشورہ قبول کر لیا۔

”آپ تے بائیں ٹھیک فیصلہ کیا ہے چودھری صاحب! ان سیاست دانوں اور بیوروکریٹس سے ذرا مختلف

انداز میں منہ پڑتا ہے۔ ان لوگوں کے معاملے میں ڈائریکٹ ایکشن سے زیادہ اس طرح کی چال بازیوں سے کام لینا مناسب رہتا ہے۔ کیونکہ حاف بات ہے کہ ہم انہیں آسانی سے اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتے، اس لیے بہتر ہے کہ تھوڑی فوری، تھوڑی گری کے ساتھ معاملات چلاتے رہیں۔“ اس نے اس کے فیصلے کو سراہتے ہوئے اسے مزید سمجھایا۔

”آپ کا مشورہ ہے تو ہم ماننے سے انکار کیسے کرتے، پر یاد رکھیے گا کہ جلد ایسا کوئی موقع دو بارہ آئے گا جب آپ کو ہماری طرف کی بات جاننے کے بعد اسے آف دی ریکارڈ رکھنا ہوگا۔“ چودھری نے معنی خیز لہجے میں کہا تو تارڑ الجھ گیا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا چودھری صاحب؟“ اس نے نا جی کے انداز میں وضاحت چاہی۔

”کل یہ ہے ایسا بی صاحب کہ وہ لڑکی ماہ بانو ابھی تک ہمارے دل میں پھنس بن کر پھنسی ہوئی ہے۔ جب تک ہم اسے پا نہیں لیں گے، چین نہیں آئے گا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ماہ بانو کا پتا اپنے اے سی صاحب کے موابی کو معلوم ہی نہیں۔ میرے بندوں نے اس کے اضافہ کو بڑا اغوا۔ رشوت، دھونس، دھمکی سارے حربے آزما لیے، پر انہیں سے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ جس کا مطلب ہے کہ کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ اب میرے پاس آخری حل یہی ہے کہ اسے ماہ بانو کا پتا اگواؤں۔ پہلے سوچا تھا کہ تصویروں والے معاملے میں اسے ایک سیل کر کے اور کاموں کے ساتھ یہ کام بھی لگوا لوں گا، پر تصویریں تو نکل گئیں تھوڑے۔ اب میں ایسا سوچ رہا ہوں کہ یہ اپنے اے سی صاحب گڈی میں بیٹھ کر بہت ادھر ادھر وزیریں لگاتے پھرتے ہیں۔ کسی دن موقع دیکھ کر انہیں اپنے کسی بھائی کے پر ہتھیاروں۔ کچھ دن آرام بھی کر لیں گے اور انہیں ماہ بانو کا پتا بھی بتا دیں گے۔ اب آپ بتائیں کہ یہ معاملہ آف دی ریکارڈ رہے گا کہ نہیں؟“ چودھری نے اپنا پورا منصوبہ اس بی بی کے سامنے رکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”یہ ذرا خطرناک کام ہو جائے گا چودھری صاحب! بہر حال، آپ کا اطمینان تو رکھیں کہ میرا تعاون آپ ہی کے ساتھ ہوگا لیکن جلد بازی سے کام مت لیجیے گا۔ کچھ دن انتظار کریں، ہو سکتا ہے کسی اور ذریعے سے لڑکی کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ وہ اس کے ماں باپ... اور ایک بہن بھی تو ہے یہاں۔ ممکن ہے کہ ارد گرد لڑکی خود اپنے رشتے داروں سے رابطہ کرے۔ آپ ان لوگوں پر نظر رکھو! میں تو میرے خیال

میں آپ کا مقصد زیادہ آسانی سے پورا ہو جائے گا۔" ایس بی کے مشورے نے چودھری کو یاد دلایا کہ وہ ایک عرصے سے ماہ بانو کے ماں باپ کو قراموش کیے بیٹھا ہے، وہ دونوں کیا کر رہے ہیں اور کسے ان کا گزارہ ہو رہا ہے، کچھ معلوم ہی نہیں؟ اس نے فوراً ان معلومات کے حصول کے لیے منشی اللہ رکھا کو آواز دی۔

"حکم سرکار" منشی اس کی پکار پر فوراً اوتار کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

"غیاثے اور نوران کی کیا خبر ہے؟ زندہ ہیں کرم کھپ گئے ہیں؟"

"زندہ ہیں سرکار... پر مردوں جتنی حالت میں۔ نوران تو اپنے پتر کی موت کے بعد حواسوں میں ہی نہیں رہی۔ سارا دن گلوں میں ماری ماری پھرتی ہے۔ غیاثا سے کچڑ کچڑ کر گھر لے جاتا ہے۔ اس کا پانا چلا بھی اچھا نہیں۔ ایک تو اکلوتے پتر کی موت کا غم، اس پر سے گھر والی کی حالت۔ سالا کس کام جو کا نہیں رہا۔ شاہے اسے کسی کے دفتر سے اس کے گھر کے لیے مہینے کا داراں جاری ہو گیا ہے۔ اس پر گزر رہے ہو رہی ہے۔" منشی کی معلومات ہمیشہ آپ ٹوڈت ہوتی تھیں اسی لیے تو وہ چودھری کے اتنے قریب تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس کے سوال کا بھرپور اور تفصیلی جواب فراہم کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے، تو جا۔" چودھری نے اسے رخصت دی اور ایک بار پھر تارڑ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ نے سنا تارڑ صاحب! منشی کیا کہہ رہا تھا؟ ان باتوں کو سن کر تو مجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں کی فکرائی کروانے سے کچھ حاصل ہوگا۔ ویسے بھی ماہ یا نو اپنے ماں باپ سے تاراض تھی، وہ ان سے رابطہ کیوں کرے گی؟"

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے دادا اور لالچ میں آکر غیاث اور نوران نے ماہ بانو کی اس سے شادی کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ ماہ بانو کو اپنے ماں باپ سے بدگمان کر گیا تھا۔ اس سے اس بات کا امکان ذرا کم ہی تھا کہ وہ اپنے ماں باپ سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اسے رابطہ کرنا ہوتا تو اپنی بڑی بہن اور بھائی کی موت کے موقع پر گرتی لیکن جب وہ اتنے نازک مواقع پر خاموش رہی تھی تو اب کس لیے ان سے رابطہ کرے؟ خود کو منظر پر لانے کا خطرہ مول لیتی؟

"اگر یہ معاملہ ہے تو پھر آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں لیکن ذرا لبا تھہر بھیا کر مٹھائی کے ساتھ... اور ہاں، کچھ کرنے سے پہلے مجھے ضرور مطلع کر دیجیے گا۔ میں بھی کچھ

انتظامات کروں گا۔" خصوصاً ڈی ایس بی منظور کو اس موقع پر ادھر ادھر کرنا ہوگا۔ پچھلے دنوں بڑی چچی گری کر رہا ہے وہ اسے سی کی۔ یقیناً اسے سی کو استعمال کر کے میری جگہ خود ایس بی بننے کے خواب دیکھ رہا ہوگا۔ بہر حال، میں نے بھی کوئی جگہ گولیاں نہیں نکلی ہیں جو اسے اس کے مقصد میں کامیاب ہونے دوں۔ خواب ہی دیکھتا رہ جائے گا وہ ایس بی بننے کے۔" تارڑ نے بھی اپنے اندر پستی و شرمی کا اظہار کیا۔

"اگر زیادہ مسئلہ ہے تو مجھ سے کہیں، میں کام ہی تمام کر دو دیتا ہوں آپ کے دشمن کا۔ ہمارے جوتے ہمارے دوستوں کو کوئی پریشانی ہو، ہمیں ذرا اچھا نہیں لگتا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ باجوہ کا کتنا ساتھ دیا ہم نے۔ ہمارے ہی تعاون کی وجہ سے وہ مشکوک ہونے کے باوجود مسافروں سے باہر بیٹھا تھا۔ دیکھا جائے تو ہمارے کام کا بھی نہیں رہا تھا، غیر بھی ہم اس سے آخری دم تک دوستی نبھاتے رہے۔" تارڑ کو پیش کش کرتے ہوئے چودھری نے ایک ایسا حوالہ دیا جو خود تارڑ کے لیے معنی دینا ہوا تھا۔ باجوہ کی موت منشی تھی اس کے باوجود جانے کیوں اس کے دل میں ٹھک سی تھی۔ شاید اس کی وجہ وہ ملاقات تھی جس میں اس نے چودھری سے باجوہ کے خدشات کو دیکھ کر کیا تھا اور جو اب چودھری نے بہت عجیب و غریب رویہ اپنایا تھا پھر باجوہ کی موت والی رات اس کے بچنے پر پالے کا وہ بھی بڑا سستی تھوڑا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مرگڑ محنت میں موجود دونوں ڈاکٹر ز نے موت کی وجہ رپورٹ مل بتائی تھی۔ وہ ڈاکٹر ز کے بیان پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر ز کو فریڈ لینا چودھری کے لیے کوئی مشکل بات نہیں مگر ڈاکٹر ز کے بیان کو پہنچ کر کے زبردستی باجوہ کا پوسٹ مارٹم کروانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کی ایسی کوئی کوشش چودھری کو بھڑکا سکتی تھی، وہ چودھری کو بھڑکا کر اپنے لیے مصیبت میں مول لے سکتا تھا۔ اس لیے وقتی طور پر خاموش ہو گیا تھا مگر اس صورت حال میں اس کے لیے چودھری پر پہلے جیسا اعتماد کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں ذرا سا پیدا ہو گیا تھا کہ کسی روز وہ بھی باجوہ جیسے انجام سے دوچار ہو سکتا ہے۔ وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ چودھری کو کھوس ہونے لگے کہ وہ اس کے لیے اب مفید نہیں رہا۔

"کیا ہوا ایس بی صاحب! اس سوچ میں پڑ گئے؟" اسے غائب رہاں پا کر چودھری نے اسے ٹوکا۔ "کچھ نہیں، بس باجوہ کا خیال آ گیا تھا۔ اچھی سیٹنگ بنی ہوئی تھی اس کے ساتھ۔ اب نہ جانے اس کی جگہ جو نیا

فارہسٹ آفیسر آئے، وہ کیسا بندہ ہو؟ ہم سے تعاون کرے یا نہیں؟ پہلے ہی اسے ہی کی وجہ سے بڑے خراب ہو رہا ہے۔ اگر فارہسٹ آفیسر بھی کوئی اس کا جوڑی دار آگیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔

اپنی اصل قلبی کیفیات چھپاتے ہوئے تارڑ نے بات بنائی جسے سن کر چودھری سگرا دیا اور خوش دلی سے یولا۔ "تھی کیوں فکر کرتے ہو ایسی فی صاحب! میں ہوں نا۔ میں اپنا پورا زور لگا دوں گا کہ نیا فارہسٹ آفیسر اپنے مطلب کا بندہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو آنے والا باجوہ سے نہ زیادہ کام کا بندہ لنگے گا۔" وہ جو شیطان کا بیرو کا تھا، اپنے پیدائشی مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھا کر بڑے دھڑلے سے اپنے مذموم مقاصد کی کامیابی کے لیے اللہ کا نام استعمال کر رہا تھا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اللہ بھی بھی ظالم کا ساتھ نہیں دیتا، بس بھی بھی اس کی رشتہ دار کو کرتا ہے۔

ہم ہمارے

"تم بہت خوب صورت ہو گل! تمہارے بال تو بہت ہی ہمارے ہیں۔" گل مینا دھوپ میں بیٹھی اپنے کیلے بالوں میں گھسٹتا کرتے ہوئے انہیں شگ کرنے کی خوش گزر رہی تھی۔ ماہ بانو کی اس پر نظر پڑی تو اس کے قریب چلی آئی اور بڑی بے ساختگی سے اس کی تعریف کرنے لگی۔ ویسے یہ بات اپنی جگہ بالکل سچ تھی کہ بالوں کو مینڈھیوں کی شکل میں باندھ کر قدرے لمبے سے چیلے میں رہنے والی گل مینا اس وقت واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آج اس کے بھائی کی برات تھی اور اس خوشی میں جانے کتنے دنوں بعد اس نے شگ کی زحمت کی تھی۔ اس کا چلا چلا ہوا اور تازہ وجود بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

"تم خود بہت بہار لڑکی ہو۔" گل مینا نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی تعریف وصول کی اور اس کو جوابی تعریف سے نوازا۔

"ہاں تمکھانے کے بعد کیا تم دوبارہ ان کی مینڈھیوں بجالو گی؟" وہ گل مینا کے ہاں رہیں ہی مینڈھی اور اس کے نرم ریشمی بالوں کو چھوئے ہوئے پوچھا۔ ویسے اسے گل مینا کے جواب کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ اس نے گل مینا سمیت یہاں تمام خواتین کو ایسی ہیئر اسٹائل میں دیکھا تھا جبکہ بچوں کے سروں پر موڈا ستر اچھا ہوا تھا۔

"بالوں کی مینڈھی نہیں بنائے گا تو کیا کرے گا؟" ادھر اس کے بغیر گزرا وہ نہیں ہوتا۔ اس کی توقع کے مطابق گل مینا نے اسے جواب دیا۔ وہ "کیوں" کا سوال اٹھاتے

اٹھاتے ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے یاد آگیا تھا کہ پانی کی قلت اور موسم کی سختی کا شکار ان علاقوں اور پنجاب کے میدانوں میں بڑا فرق ہے۔ جغرافیائی تقریبی ماحول اور مزارع میں بھی تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ ہونے کی گل مینا پنجاب کی ماہ بانو کی سی عادات کی مالک نہیں ہو سکتی، البتہ فطرت دونوں کی ایک تھی۔ گل مینا مشاہیرم کے دامن میں واقع جس ہوشے میں رہتی تھی، وہاں سکڑوں مسائل تھے۔ سال کی ایک فصل، بھل دار درختوں کی بھی، شدید برف باری، ٹکڑی کی قلت... جانے کون کون سے مسائل تھے جس کا اسے سامنا تھا پھر بھی وہ مطمئن تھی اور اپنی مٹی سے محبت کرتی تھی۔ ماہ بانو نے یہ سارے مسائل نہیں دیکھے تھے لیکن ایک درندہ صفت انسان کے ہاتھوں اس بڑی طرح ستائی تھی کہ اپنا علاقہ چھوڑ کر ان پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی تھی لیکن وہاں چلت کر جانے کی خواہش اب بھی دلی میں موجود تھی۔ اس خواہش کے پیچھے یقیناً وہی فطری محبت تھی جو ہر انسان کو اپنے گھر سے ہوتی ہے۔ انسان نہیں کا بھی ہوا فطرت سے اخراج نہیں کر سکتا۔

"کیا سوچتا ہے؟" اکرم خان بتا رہا تھا کہ تم ادھر لہور سے آیا ہے۔ ادھر اور ادھر میں تو بڑا فرق ہے۔ تم رہ لے گا ادھر؟" ماہ بانو کو خاموش یا کراس نے خود گھسٹو گھے بوجھائی۔ "کیوں نہیں، آخر مشاہیرم خان بھی تو یہاں سے جا کر وہاں رہ رہا ہے۔ اور ابھی کتنے لوگ رہتے ہیں۔ جب یہاں والے وہاں جا کر رہ سکتے ہیں تو میں کیوں یہاں نہیں رہ سکتی؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ انگ بات ہے۔ یہاں سے لوگ تعلیم اور روزگار کے لیے جاتا ہے، یہاں زندگی بڑا سخت ہے۔ باہر سے لوگ یہاں گھومنے پھرنے تو آ سکتا ہے لیکن رہنے کے لیے نہیں۔ گل مینا کے اداس لہجے میں یہی گئی بات میں دیکھ تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ تھی، کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ بہت سے افراد مل کر کسی بات پر بحث کر رہے ہوں۔ بولنے والے سب مرد تھے چنانچہ وہ خواہش کے باوجود بھی گھر کے اس حصے کی طرف نہیں جاسکی۔ گھر میں موجود دیگر خواتین کے چہروں پر بھی تشویش نظر آ رہی تھی۔ آخر ضرور کچھ تھا اور اکرم خان اس طرف آتا نظر آیا۔

"کیا ہوا، سب خیر تو ہے نا؟" اس نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اکرم خان سے سوال کیا۔

"ابھن کے گھر سے آدمی آیا تھا۔ دہن کے باپ نے کہلایا ہے کہ دس ہزار کا اور بندہ ہست کرو نہ گناہ نہیں ہو

گا۔" اکرم خان نے پریشانی سے بتایا۔ اس جواب پر باقی خواتین تو آپس میں چٹکیوں اور تھپڑوں میں مصروف ہو گئیں لیکن اس کی حیرانی سوا تھی۔

"کیا مطلب؟ کیسے دس ہزار؟"

"ہمارے ہاں رواج ہے کہ لڑکا شادی سے پہلے دہن کے باپ کو رقم دیتا ہے۔ میرے ماموں زاد نے بھی اپنے سرسور کو دیا دیا ہے لیکن اب وہ دس ہزار اور مانگتا ہے۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا۔ ایک بار جو بات ہو جائے تو اس کے بعد کوئی اپنی زبان نہیں بدلتا، ہر اس خانہ خراب کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تو ہم نے بونی مشکل سے سب کو سمجھا بھجا کر چپ کر دیا ہے کہ ذرا آرام سے مل بیٹھ کر اس مسئلہ کا حل سوچتے ہیں لیکن ہم کو معلوم ہے کہ زیادہ دیر تک کوئی چپ نہیں رہے گا اور خاندانہ (خانوواہ) لڑائی شروع ہو جائے گا۔" اکرم خان جو کچھ بتا رہا تھا اس کی روشنی میں یہی سمجھ آ رہا تھا کہ دہن کے باپ نے عین وقت پر ایک بالکل ناز یا مطالبہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اچھا بھلا شادی کا گھر بنگل بن سکتا تھا۔ ماہ بانو اپنی نرم طبیعت کے باعث یہ ساری صورت حال جان کر پریشان ہوا تھی۔ پھر ایک دم اس کے ذہن میں ایک خیال بنگل کی طرح کودا۔

"بھائی اکرم اتم مجھے دہن کے گھر لے چلو۔" وہن میں خیال آئے ہی اس نے اکرم خان سے مطالبہ کیا۔

"لیکن تم وہاں جا کر کیا کرے گی؟" اکرم خان اس مطالبے پر حیران ہوا۔

"جو بھی کروں گی تم اسے چھوڑ دو۔ بس مجھے وہاں لے چلو۔ میرے جانے سے شاید یہ مسئلہ بغیر کسی لڑائی جھگڑا کے ختم ہو جائے۔" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

"ہماری تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کرنا چاہ رہا ہے؟" اکرم خان تذبذب کا شکار تھا۔

"وہ تم میرے ساتھ چلو گے تو دیکھ لینا لیکن مجھے لے کر تو چلو۔" اس نے تعویذی سی مظلومانہ دعا مانگا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم لے جاتا ہے لیکن دھیان رکھنا کہ تم ادھر اٹھتی ہو۔ ادھر کے رواجوں کو جاننا نہیں ہے۔ کچھ انا سیدھا ہو گیا تو نہیں بڑا مشکل ہو جائے گا۔ ہم نے مشاہیرم خان کے صاحب سے تمہاری حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔" وہ راستی تو ہو گیا لیکن پریشان تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا، تم بے فکر ہو۔" ماہ بانو نے اسے تسلی دی اور ایک منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ کمرے سے باہر آئی تو اس نے اپنی مخصوص سیاہ چادر

اور ڈھ دھکی تھی۔ تازہ صورت حال پر تبصرے میں مصروف خواتین کو اس کے اور اکرم خان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ ان دونوں کو باہر جاتے دیکھ کر وہ چونک گئیں۔

"ہم لوگ ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہے۔" سوالات کرتے والوں کو یہ مختصر جواب دے کر اکرم خان اسے لیے گھر سے باہر نکل گیا۔ گاؤں بہت مختصر تھا۔ بس چند گھنٹوں میں وہاں جن میں کے کے مکانات تھے۔ ہر گلی کے بعد ایک اترائی آتی اور پھر کھیت شروع ہو جاتے۔ اس مختصر سے گاؤں کو البتہ بے اعزاز حاصل تھا کہ دنیا بھر سے آنے والے بہانوں کے عاشق اپنے محبوب یعنی پہاڑوں تک پہنچنے سے قبل کچھ دیر اس کی خیمہ گاہ میں ضرور ٹھہرتے تھے اور پھر وہاں میں بھی جب وہ محبوب کو سوسر لینے کے نشے میں چور ہوتے تھے، ہونے کی قدم بوسی کرتے ہوئے ہی واپس جاتے تھے۔ وہ دونوں بھی اس بے ظاہر ہرچیز نے گمراہ حقیقت عظیم ہونے کی نگینوں میں قدم نہ رکھتے چند منوں میں دہن والوں کے گھر پہنچے۔ اکرم خان کی، وہ بھی ایک انجی لڑکی کے ساتھ آمد کو وہاں بہت عجیب سے دیکھا گیا۔ تاہم کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور اکرم خان کی خواہش پر انہیں دہن کے باپ سے ملوا دیا گیا۔

"ہمیں آپ کا پیغام ملا۔ اس پیغام کو سننے کے بعد ہی میں بھائی اکرم سے اصرار کر کے آپ سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔" ماہ بانو نے خوار گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بھاری ادنی لہجہ کے ساتھ ہر مفید ادنی ٹوپی پہنے دہن کے بوڑھے باپ کو بتایا۔ جواب دہ کچھ بولائیں صرف سوالیہ نظروں سے اس طرح اس کی جانب دیکھتا رہا جیسے اس کے چہرے سے اسے پیغام کا ترس مل جانا چاہتا ہو۔

"مجھے آپ کے رواجوں کا علم نہیں۔ بھائی اکرم خان نے البتہ اتنا ضرور بتایا ہے کہ ایک بار جو بات ملے ہو جائے اس کے بعد کوئی فرق نہیں اپنی زبان سے نہیں بھرتا۔ آپ نے پیغام صحیح کمر پر دس ہزار کا جو مطالبہ کیا ہے اس کے پیچھے یقیناً آپ کی کوئی مجبوری ہوگی۔ رواج کا ہے، آپ اپنی روایت کے خلاف کیوں جاتے؟ میں اس وقت آپ سے آپ کی مجبوری کے بارے میں پوچھنے نہیں آئی ہوں۔ میں آپ کو یہ دس ہزار دے آئی ہوں تاکہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے اور سب کی خوشی بھی قائم رہے۔" اس نے اب تک چادر کے نیچے چھپ کر رکھا اپنا دایاں ہاتھ باہر نکالا اور چند لمبے ٹوٹ بوڑھے کے سامنے رکھ دیے۔ یہ وہی ٹوٹ تھے جو شہر یار نے

یہاں آنے کے بعد اسے بچوائے تھے۔

”ماہ بانو! کیا یہ کیا؟“ اکرم خان اس کے عمل پر ہنستا گیا۔

”کچھ مت کہو بھائی اکرم!“ اس نے اکرم خان کو زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشارے سے بھی منع کیا اور خود بوڑھے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”اب ہم چلتے ہیں بابا! وقت پر بات لے کر آئیں گے۔“ ساکت و صامت بیٹھے بوڑھے سے نرم لہجہ میں یہ مختصر سی بات کہنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ اکرم خان کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی، البتہ بوڑھا خود اپنی جگہ سے مل رہا تھا اور نہ ہی اپنے سامنے دھڑے نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

”تم نے اتنا بڑا رقم اس لالچی بڑھے کو دے دیا۔ یہ سب کرنے سے پہلے تمہیں عین بتانا تو چاہیے تھا۔“ وہ لڑکی کے راستے پر چلتے ہوئے اکرم خان اس سے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں بھائی اکرم! میرے پاس بھی تو وہ روپے بونچے رکھے تھے۔“ اکرم ان دونوں سے کوئی ہنکڑا رک گیا اور کسی کو خوشیاں ملنے کی امید بندھ گئی تو میرا کیا گیا؟ تم پریشان مت ہو، نہ ہی کسی اور کو اس بارے میں کچھ بتانا۔ جو کچھ ہوا، وہ بس میرے اور تمہارے درمیان رہتا چاہیے۔“ اپنے میزبانوں کے گھر میں داخل ہونے سے قبل ماہ بانو نے اکرم خان کو سمجھایا۔ اکرم خان نے اس کی بات کا مان رکھا اور کسی کو بھی اصل صورت حال بتانے بغیر وہاں کے باپ کے مان جانے کی توجہ نہ دی۔ مقررہ وقت پر سفید پھندوں والی سرخ ٹوپی پہنے دولہا کو لے کر برات وہاں کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو اکرم خان کو ماہ بانو کی بات کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اگر وہ صوبہ کو اصل صورت حال بتا دیتا تو حالات میں کشیدگی ہوئی اور کسی کے پیچھے سے وہ خوشی دیکھنے کو نہیں جتی جواب نظر آ رہی تھی۔ وہاں کے گھر پہنچنے کے بعد شادی کی مخصوص رسومات انجام دی گئیں۔ آخر میں کچھ خوش گلوں نے جو اداؤں نے طرہ پر گیت گیت چھیڑ دیے۔ گیتوں کی لے اور تالیوں کے آہنگ کے ساتھ بہت سے لوگ رقص کرنے لگے۔ شاید اس طرہ پر محفل میں پھرنے گیتوں کی آوازیں بونٹے کی گلیوں سے نکل کر اس کیسٹنگ سائٹ تک بھی پہنچی تھیں جہاں موجود رنگ برنگے ٹیموں میں سفید پوش بھانڈوں کے عاشق فروکش تھے۔ ان میں سے کچھ نہ چلے گئے ہیں کیرے لٹکائے ہوئے کی گلیوں میں اتر آئے اور خود بھی اس محفل کا حصہ بن گئے۔ یہاں کسی کو بھی ان کی آمد پر اعتراض نہیں تھا۔ خواہ ماہ بانو بھی گھن گھن جب تیسری

بار اس نے اپنے چہرے پر نیشی چمک چمکائی تو ہمارے اس کے احساس کے ساتھ اس حرکت کے مرتکب شخص کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اسے متوجہ دیکھ کر وہ غیر ملکی پوری ڈھٹائی کے ساتھ مسکرایا اور اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی جانب ایک ہوائی بوسا اچھالا۔

ماہ بانو جو ابھی اس کے کچھ کچھ آشنا کئے نقش و نگار میں ابھی ہوئی تھی، اس حرکت پر یک دم ہی اسے پہچان گئی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے بیٹام ہونے کے سامنے بھی یہی حرکت کی تھی۔ اس کی اس حرکت پر ماہ بانو کے ساتھ موجود شہر یار چارخ باغیو لگا تھا لیکن چونکہ یہ شخص چلتی جیب میں موار تھا، اس لیے شہر یار اسے اس حرکت کا مزہ نہیں چکھ سکا تھا۔ اس روز ماہ بانو نے دل میں شکر ادا کیا تھا کہ ابھی ہوا وہ بدتمیز آدمی شہر یار کے ہاتھ نہیں لگا ورنہ خواہ مخواہ کا جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس شہر یار یہاں موجود ہوتا اور اسی شخص کا منہ توڑ ڈالتا۔ مگر شہر یار یہاں کہاں تھا؟ وہ تو اس سے بہت دور بیٹھا اپنے فرائض منصبی انجام دیتا تھا۔ ماہ بانو کی حیثیت بھی اس کے نزدیک ایک فریضے کی سی تھی جسے محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد شاید وہ اسے بھول بھی گیا تھا۔ اسے ضرورت بھی کیا پڑی تھی اسے اسے اس قدر اور بے حیثیت ماہ بانو کو یاد رکھنے کی؟ وہ تو کسی شہزادے کی طرح تھا جس کے ساتھ کوئی شہزادی ہی نہیں، ماہ بانو تو اس سے اپنے دل کی ہر کنوں میں بسا کر چپکے چپکے جا چکی تھی جرات کر سکتی تھی۔ اس چاہت نے اسے رو بہ کیے خوابوں کے بجائے تاریکی کے دکھ میں اپنی اداسی عطا کی تھی۔ اس نے محبت کا پتلا یہ تجھ بھی بڑے طرف سے بیٹے سے لگا کر رکھا تھا لیکن یہ اداسی سچی بھی اسے ساری دنیا سے کاٹ کر اپنی ذات میں تھما ہوا جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس بدتمیز غیر ملکی سیاح سمیت اس ساری خوش بھری محفل کو فراموش کر بیٹھی اور خالی ستالی نظروں سے اپنے ارد گرد کے مناظر دیکھنے لگی۔ اس خود فراموشی کے عالم میں اسے احساس بھی نہ ہوسکا کہ کب وہاں کا باپ اس کے ساتھ آکر کھڑا ہوا اور اس کی کٹھنی میں کوئی شے باندھ کر فوراً ہی اس سے دور بھی ہٹ گیا۔ وہ چونک کر اپنی کٹھنی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی کٹھنی میں وہی نیلے ٹوٹ دھے ہوئے تھے جو چند گھنٹوں پہلے اس کی خوشیوں کو بفر قرار دینے کے لیے اس بوڑھے کی تذکرہ کے آئی تھی۔ یقیناً بوڑھا ایک ایسی لڑکی کے خلوص سے ہار گیا تھا اور احساس ہوتے ہی پہلی فرصت میں اپنی غلطی کی تلافی کروا لی تھی۔

☆☆☆

”کی بی! آپ کے لیے فون ہے۔“ وہ بیس پر رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر گم غم بیٹھی آسمان کی دھندلوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ رانی نے فون کی اطلاع دی تو اپنے خیالات سے چوکی اور سراسیمہ مندی سے اٹھ کر اندر کمرے میں رکھی اس تپائی کی طرف بڑھی جس پر نیلی فون سیٹ دھڑکتی۔

”ہیلو!“ ریسورٹ گھر اس نے بے حد بے دلی سے کہا۔ اندازہ تھا کہ یہاں اس کے لیے آنے والی کال خوبی کے ہی کسی کمین کی طرف سے ہو سکتی ہے۔

”محبت کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک تو نہیں کرتے۔ کچھ اعزاز ہے آپ کو کہ میں اس طرح اچھا کیا آپ کی طرف خاموشی چھپا جانے پر کتنا پریشان ہوں۔“ دوسری طرف سے اس کی توقع کے بالکل برعکس جو آواز سنائی دی، اس نے اس کے جسم و جاں کو لرزہ کر رکھا۔

”آفتاب! آپ! آپ کو یہاں کا نمبر کیسے ملا؟“ بے پناہ حیرت سے سننے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”آپ کا خیال تھا کہ آپ سواکل آف کر دیں گی اور اپنی شہر والی کٹھنی میں آچھیں گی تو مجھے آپ سے رابطہ کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ملے گا؟“ اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی ٹھٹھکی تھی۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں آفتاب! ایسی کوئی بات نہیں ہے میرا آپ کمان کر رہے ہیں۔ میں نے سواکل آف نہیں کیا، بس مجھے اسے چارنگ کرنے کا خیال نہیں رہا اور شاید بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے وہ خود ہی آف ہو گیا۔“ کشور نے وضاحت پیش کی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو سواکل چارنگ کرنے جیسا اہم کام بھی یاد نہیں رہا؟“ آپ تو مجھ سے بات کیے بغیر وہ ہی نہیں کہتی تھیں پھر یہ کیا انقلاب آیا کہ آپ کو وہ بھی بھول گئی جو میرے آپ کے رابطے کا ذریعہ ہے؟“ اس کے لہجے سے ہنوز ناراضی جھلک رہی تھی۔

”مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔“ یا آخر اس کے ضبط کی طنائیں ٹوٹ گئیں اور وہ سسک پڑی۔ اس کے اس طرح رونے سے آفتاب اپنی ناراضی بھول کر پریشان ہو گیا۔

”کشور! پلیز! اس طرح روئیں نہیں۔ مجھے بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟“ دیکھیں، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ اس رات آپ میری فریڈ سے بات کروانے کا کبہ کرنا تب ہی

ہو گئیں اور میں انتظار کرتا رہا۔ میں نے خود رابطہ کرنے کی کوشش کی تو آپ کا سواکل بند جا رہا تھا۔ رانی بھی اندر سڑ مل ہوئیں آپ کی کٹھنی اس سے آپ کے بارے میں پوچھتا۔ پھر اس کے بھائی کی قربانی مجھے اطلاع ملی کہ آپ لاہور پہنچی ہوئی ہیں اور رانی آپ کے ساتھ ہے۔ میں سمجھا کہ آپ نے مجھ سے ملاقات کے لیے کوئی ٹیکل نکالی ہے۔ میں فوراً لاہور پہنچ گیا لیکن یہاں آکر بھی آپ نے کوئی رابطہ نہیں کیا تو مجھے بہت برا لگا۔ میں نے آپ کی کٹھنی کا فون نمبر حاصل کیا اور آپ سے رابطہ کی کوشش کرتے لگا۔ ہر بار کوئی ملازم فون اٹھا جاتا تھا اس لیے مجھے بتا بات کیے لائن کاٹنی پڑی۔ اس بار فون پر رانی کی آواز سنائی دی تو میں نے اس سے آپ سے بات کروانے کے لیے کہا۔ آپ کچھ کہتی ہیں کہ اچھا چھیل نا کامیوں پر میں اچھا خاصا بھنگایا ہوا تھا اس لیے آپ کی آواز سننے ہی کچھ ہو گیا۔ لیکن پلیز! آپ اس طرح روئیں تو نہیں۔ مجھے آپ کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“ وہ اسے سمجھنے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے اسے چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں نے آپ کی باتوں کا برا نہیں مانا آفتاب! مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت پریشان رہے ہوں گے اور پریشانی میں آدمی کے منہ سے کچھ بھی اسی سیدھا نکل سکتا ہے۔ آپ نے تو ایسا کچھ بھگایا ہی نہیں۔“ اسے شرمندہ پا کر کشور نے خود کو مٹھایا اور آہستہ سے بولی۔

”تو پھر وہ کیا بات ہے جس نے آپ کو اس قدر دیکھی اور پریشان کر دیا ہے؟ کیا کوئی میں کچھ ہوا ہے؟“ آفتاب نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”کوئی میں تو ہر روز کوئی نہ کوئی نیا ظلم و ستم ہوتا رہتا ہے اور یہ میری بدقسمتی۔ کہ میں وہاں پیدا ہوئی۔“ اس کے لہجے میں ہی اور کچھ دونوں ہی جھلک رہے تھے۔

”آپ مجھے کچھ بتائیں تو کسی کو ایسا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ اس قدر پریشان ہیں؟“ آفتاب نے اصرار کیا۔

”نہیں بتا سکتی۔ بات ایسی ہے کہ زبان پر آتے ہوئے میں شرم سے سر نہ نکالتی ہوں۔ رانی دن رات میرے ساتھ رہتی ہے، میں اسے بھی کچھ بتانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔“ اس نے انکار کیا تو آفتاب سوچ میں پڑ گیا۔ کشور کی باتوں سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے وہ شدید ذہنی پریشانی کا شکار ہے۔ اس کا یہ ذہنی پریشانی خود آفتاب کو تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس مسئلے کا یہی حل تھا کہ کشور کی اس سے ملاقات ہو جائے کیونکہ وہ جانتا تھا

کراس کا ساتھ مشہور کو ایسی بے پایاں سرت عطا کرتا ہے کہ اس کے آگے وہ سب کچھ بھول سکتی ہے۔

”آپ مجھے بتائیں جانتیں تو میں اصرار نہیں کروں گا لیکن آپ تکلیف میں ہوں، یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی طرح مجھ سے ملاقات کی راہ کا نہیں بلکہ ایسا کریں کہ تمہیں خریدنے کے بہانے لبرٹی تک آجائیں۔ میں وہاں تک شاپ پر آپ کا منتظر رہوں گا۔“ اس نے پروگرام ترتیب دیا لیکن جواباً مشہور خاموش رہی۔

”میکیا بات ہے، آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ کیا آپ مجھ سے ملنے کے لیے آج نہیں جاتیں؟“ اس کی خاموشی کے باعث آفتاب نے پوچھا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ آپ سے ملنا تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے لیکن آج میں نہیں مل سکے۔ آپ کو ملاقات کے لیے تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ میں خوفون کر کے آپ کو وقت کے بارے میں بتاؤں گی۔“ مشہور کا انداز کچھ مزاحیہ تھا۔ آفتاب الجھ سا گیا تاہم کوئی اختلاف نہیں کیا۔

”چلیں جیسی آپ کی مرضی۔ میں یہاں اپنے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس دو دن اور ہوں یہاں۔ اگر ان دو دنوں میں آپ کا سوؤ نہ بن جائے تو مجھے بتا دیجئے گا۔“ اس نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے بچے کے غائب ہونے کا اسے کھوار جواب سن کر کچھ اچھا نہیں لگا ہے۔ ظاہر ہے، وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کی خاطر دوڑا آیا تھا اور وہ بہانے بنا رہی تھی تو اس کا سوؤ آف ہونا لازمی تھا۔ مشہور نے اس کا انداز محسوس کر لیا پھر بھی زیادہ توجہ نہیں دی اور ریلیوڈ کر لیل پر رکھ کر دلی کو واپس دے دی۔

”ڈراما کر سے ہوگا ذی نکالے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔“ رانی آئی تو اس نے غم دیا۔ اس غم پر رانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ماسٹر صاحب سے ملے جانا ہے بی بی؟“ آفتاب کے فون کے بعد اس کے اس غم کو رانی بھی نتیجہ اخذ کر سکتی تھی۔

”نہیں... نہیں اور جانا ہے۔“ اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختصر جواب دیا لیکن اس کے چہرے پر کھلی ہنسی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی جس کا مطلب یہ سمجھنے کے باوجود رانی اتنا اندازہ لگائے میں تو کامیاب ہوئی گی کہ بی بی اپنے پچھلے دنوں کی کیفیت سے بہرہ ور ہیں۔



”کل مینا! یہ جو تمہارے گاؤں میں کیسپنگ سائٹ

ہے وہاں چلیں؟ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ قریب سے ان دہانوں کو دیکھوں ہوا بھی بجلی آرام کی زندگی چھوڑ کر اسے مشکل مشکل پہاڑوں کو سر کرنے نکل پڑتے ہیں۔ سفر ناموں میں ان لوگوں اور ان کی خیمہ گاہوں کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ آج ذرا قریب جا کر اپنی آنکھوں سے اس دنیا کا نظارہ کرنا چاہتی ہوں۔“ شادی کا پہلا سال رات گئے تک جاری رہا تھا، اس کے باوجود اگلی صبح دو لوگ جلدی جاگ گئے تھے۔ اس نے گڑبڑ کے چلنے پر تورا رکے جلدی جلدی روٹیاں تھوپتی گل مینا سے اپنی خواہش بیان کی تو وہ تذبذب میں پڑی۔

”ابھی تو بہت کام کرنا ہے۔ اتنا کام چھوڑ کر ہم کسے چ سکتا ہے؟“ وہ بھی اصرار رکھنے لگیں۔ ہماری بستی کا بچہ لوگ گوروں کے ادھر قدم رکھتے ہی ان سے سارا چاکلیٹ اور چوڑی وغیرہ نکال لیتا ہے۔ آدھ کپ چائے کا تو ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ محنت میں تھوڑا لوگ تصویریں کھینچنے کے لیے پیچھے پڑ جائے گا۔“ اپنی مصروفیت کے علاوہ گل مینا نے اپنے ساتھ نہ ملنے کی جو بیہ تابی، اسے سن کر ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس طرح کے علاقوں کے باسی ولایتی چاقوئیں اور اس قسم کی دوسری اشیاء ہتھیانے کے لیے ساحلوں کا پیچھا لے لیتے ہیں۔ گل مینا کی بات سن کر اس بات کی تصدیق ہوئی۔ وہ بھی تو اسی ماحول کا حصہ تھی جہاں کے باسی اپنی غربت اور بھوک کے باوجود آئے دن یہاں سے گزرنے والے غیر ملکی سیاحوں کی عاتقوں کے باعث ولایتی مال کی کثرت میں مبتلا ہو چکے تھے۔

”تمک ہے، تم اپنا کام کرنا۔ میں خود چکر لگا کر آتی ہوں۔“ وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گل مینا نے پیچھے سے آواز دے کر اس سے کچھ کہا بھی لیکن اس نے ان کی نہی کر دی۔ آزادی کے احساس کے ساتھ اس دھندلی سی صبح میں ہونے کی گلیوں میں چلا اسے بہت اچھا لگا رہا تھا۔ یہاں کا موسم اس کے لیے کچھ سخت ضرور تھا لیکن وہ اس خوف سے آزادی کی کہ جو دھری یا اس کا کوئی پرکار اسے دیکھ لگے گا۔ آزادی کی اس نعمت سے لطف اندوز ہوئی وہ گرم کپڑوں میں ملبوس ہوئے کی کیسپنگ سائٹ کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ یہاں دو تین خیمہ گاہیں تھیں۔ اتنی صبح کے وقت وہاں دو وقت تو نظر نہیں آ رہی تھی جس کا تذکرہ سفر ناموں میں پڑھتی رہی تھی لیکن دھندلی سی صبح میں سر اٹھائے کھڑے رنگ برنگے خیموں کا نظارہ بھی بہت شان دار لگ رہا تھا۔ ایک خیمہ گاہ میں جھانکنے پر اسے متحرک پور نظر آئے۔ وہ چند خیموں کو اکٹھا

رہے تھے۔ شاید وہاں موجود کسی ٹیم کو بہت جلدی تھی اور وہ جلد سے جلد روانہ ہونے کے خواہش مند تھے۔ ماہ بانو اس خیمہ گاہ کو چھوڑ کر دوسری طرف بڑھ گئی۔ یہاں بالکل خاموشی تھی۔ خیمہ گاہ کے کھلے چھانک سے اندر داخل ہو کر پہلے تو وہ دیوار کے ساتھ ساتھ لگے پائلوں کے درختوں کے نیچے سے گزرتی وہاں موجود دو سوچ سمجھی کے پودوں کا جائزہ لیتی رہی پھر خیموں کے درمیان چلی آئی۔ یہاں چند ہی خیمے تھے اور ابھی ان خیموں میں زندگی کا حرکت نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید ان خیموں میں پہاڑوں سے اتر کر آنے والے سیاح اسراحت فرما رہے تھے جو ابھی کے سفر سے پہلے اپنی ٹھوڑی سی محنت ادا کر لیتا جا رہے تھے۔ اس سوئی ہوئی خیمہ گاہ کی خاموشی سے لطف اندوز ہوئی وہ ایک بڑے سے خیمے کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ ایک دم ہی کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد نے اسے اتنی بڑی طرح ہلکا ہٹ میں مبتلا کر دیا کہ وہ جوج تک نہیں کی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد ذرا ہتھکڑی تو خیمے میں موجود روشنی میں اس نے اس امر کی کو دیکھا جسے پہلے وہ بظاہر سوئیل کے باہر اور گھل رات نہیں ہونے میں بھی دیکھ چکی تھی۔

”تم بڑی خوب صورت لڑکی ہو۔ پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، جب ہی دل تمہیں پانے کے لیے بل گیا تھا لیکن اس وقت ایک تو تم کسی اور کے ساتھ تھیں، دوسرے میرے پاس بھی وقت نہیں تھا اس لیے صبر کرنا پڑا۔“ خیمیں شاید میری دلچسپی کا اندازہ ہو گیا تھا جب ہی گل رات مجھے گاؤں میں دیکھنے کے بعد آج صبح صبح خود ہی مجھے دھندلی ہوئی آگئی ہو۔ لیکن دیکھو میرے پاس بس ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہی ہے۔ پھر ہم لوگ واپس چلے جائیں گے۔ تم مجھے اس وقت میں خوش کر دو۔ میں تمہیں اس ریٹ سے بھی زیادہ دوں گا جسے تم رات بھر کے لیے چاہتے ہو۔“ وہ بہت رواں اور صاف اردو میں بات کر رہا تھا۔ ایک امریکی گورے کو اتنی صاف اردو میں بات کرتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے والی ماہ بانو کو اس کی مہکی بات کا مفہوم سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ جب بات سمجھ آئی تو اس کا چہرہ فیسے سے سرخ پڑ گیا۔ اس نے ابھی تک گورے کی گرفت میں موجود اپنی کان کو ہلکا دے کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔

”ناراض کیوں ہو رہی ہو؟ اگر تمہیں میری آخر قبول نہیں تو تم اپنی مرضی کا رٹ بتا دو۔“ وہ اسے جو کچھ رہا تھا اسی حساب سے بات کر رہا تھا۔ شاید ریشم میں اسے شہر یار کے ساتھ دیکھنے کے بعد یہاں ہونے میں مقامی لباس میں

مقامی لوگوں کے درمیان دیکھ کر اس نے اپنی مرضی سے کچھ اندازے قائم کر لیے تھے اور اب اسے ایک کال گرل کی طرح ذلیل کر رہا تھا۔

”بھواس بند کرو۔ میں اس طرح کا کام کرنے والی لڑکی نہیں۔“ اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ماہ بانو کو اپنی زبان کھولنی پڑی۔

”اچھا! اس کا جواب سن کر وہ بے چینی سے بولنے ہوئے تھا۔“ تم جو بھی ہو، اب میں تمہیں ایسے تو نہیں چاہنے دوں گا۔“ اس نے ماہ بانو کو اپنی طرف کھینچنا اور پھر زور دے کر اسے زمین پر پڑنے پھینک دیا۔ اس کی اس حرکت پر ماہ بانو کے اوسان خطا ہوئے گئے۔ اسے لگا کہ سہری بالوں اور گوری رنگت والے اس شخص کے نقش میں ڈھلنے لگے ہوں۔ شاید یہ ہوس جو بھری انگار کے نقوش میں ڈھلنے لگے ہوں۔ ایک پرست کا چہرہ اتنا ہی بھیانک اور مکروہ لگتا ہے۔ وہ ایک چوہری سے اپنا آپ بچا کر اس الگ تھک دنیا میں آکر کسی بھی تو یہاں اس جیسے دوسرے سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ چوہری اگر ایک گاؤں کا مالک ہونے کے ناتے اپنے علاقے میں موجود ہر جان دارو بے جفاں ہے پھر اپنا حق سمجھتا تھا تو اس وقت اس کے سامنے موجود شخص بھی اس تو کم کا فرد تھا جو بھری دنیا کو اپنا محکم بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ محکم تو کم کی گزروں میں تو قلعین کو سب سے پہلا نشانہ ہوتی ہیں۔ وہ امریکی گورائے ماہ بانو کو دھکی اور معافی غلامی میں مبتلا تو کم کی کزور عورت کچھ کر اس پر پل پڑا تھا۔

ماہ بانو اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پاری تھی۔ اس کے جسم سے پٹنی چادر الگ ہو چکی تھی اور اب لہاو بھی جدا ہونے کو تھا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے وہ ہاتھ چیر چاٹنے کے ساتھ ساتھ خچر میں بھی مار رہی تھی۔ شاید یہ ان خچروں کا ہی نتیجہ تھا کہ اس نے خیمے میں کسی اور کی موجودگی کو محسوس کیا اور پھر اٹھنے ہی سمجھے اس کے وجود سے لینا عفریت ایک جھٹکے سے دور جا کر۔ خیمے میں آنے والا اکرم خان تھا جس نے غیر ملکی سیاح کو اپنی ٹھوکروں میں رکھ لیا تھا۔ اب وہاں ماہ بانو کے بجائے اس گورے کی خچر گونج رہی تھی۔ ماہ بانو نے پھر جی سے اپنا لباس درست کیا اور ایک بار پھر اپنے گرد پار لیٹ لی۔ اس دوران خیمے میں دو تین افراد اور بھی گھس آئے تھے۔ ان افراد کے آنے کے بعد معمول سے کافی بڑا شہید بھی تنگ پڑ گیا تھا۔

”اعصاب... اعصاب! ات اندر آئے والے افراد

میں وہ غیر ملکی اور ایک مقامی آدمی تھا۔ اکرم خان کو رکھنے کا حکم غیر ملکی نے دیا تھا جسے من کر اکرم خان تو نہیں رکھا لیکن مقامی شخص نے آگے بڑھ کر اسے قابو کر لیا۔

”چھوڑ دو ہمیں۔ ہم اس گورے کو چھوڑ دے گا نہیں۔ اس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔“ اکرم خان بھرا ہوا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔ میں نے اس سے ریہٹ ملے کیا تھا۔“ فرخ پر گرا وہ امریکی سیاح اٹھ کر بیٹھنے ہوئے پوری دھڑائی سے بولا۔

”جیوت بولتا ہے بد بخت۔“ اکرم خان چلا یا۔

”دیکھ یارا! بھگوا مت کر۔ ہم نے بھی دیکھا تھا کہ یہ لڑکی خود آیا تھا۔ ہم چنانچہ اسے ہٹ کر حاجت کے لیے جا رہا تھا، تب ہم نے اس لڑکی کو ادھر آتے دیکھا تھا۔ ہم جلدی میں تھا اس لیے اسے روک نہیں سکا۔ بعد میں یہ ہمیں نظر نہیں آیا تو ہم سمجھا واپس چلا گیا ہے۔ ابھی تم ادھر آیا اور پھر لڑکی کا بیچ صفائی دیا تو ہمیں پتا چلا کہ یہ ادھر صاحب کے خیمے میں ہے۔“ مقامی شخص جو اس خیر کا چوکیدار تھا، اکرم خان کو بھانے لگا۔

”یہ ادھر صرف گھومنے آیا تھا۔“ اکرم خان نے ماہ بانو کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ خود اس میں تو اتنی بھی بہت نہیں رہی تھی۔

”بحث مت کرو خان! اگر تم نے مزید بد معاشری دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہارا ایسا بدوہست کروں گا کہ اس علاقے میں نظر بھی نہیں آوے گا۔“ امریکی پوری طرح مستحضر چکا تھا اور اکرم خان کو دھمکی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھیوں کے توجہ بھی خاصے خطرناک تھے۔

”جانتے دے اکرم خان! کیوں خود کو مشکل میں ڈال رہے؟ ان لوگوں کا کتنا پتہ ہے، تجھے بھی معلوم ہے۔ تو چپ رہے گا تو کچھ نہیں جانے گا۔ یہ لوگ تو ویسے بھی کھنڈ بھر بعد ادھر سے نکلنے والے ہیں۔ اگر تو نے بات بڑھائی تو تو زیادہ مشکل میں پڑ جائے گا۔“ چوکیدار اب سرگوشیوں میں اکرم خان کو بھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی یہ سرگوشیاں سنیں۔

”یہاں سے چلو بھائی اکرم! اللہ نے مجھے بھالیا کافی ہے۔ اب تمہیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ماہ بانو آگے بڑھی اور اکرم خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے خیمے سے باہر لے گئی۔ اب وہ دونوں چپ چاپ واپسی کے راستے پر چل رہے تھے۔

”میں یہاں صرف گھومتی آئی تھی۔ گل مینا نے

مصرفیت کی وجہ سے آنے سے منع کرو یا تھا اس لیے میں اسکی ہی آئی تھی۔“ تجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں...“ ٹھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے اکرم خان کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ امریکی گورے نے اس پر جو الزام لگایا تھا، اس کی وجہ سے وہ اکرم خان کے سامنے بڑی نیکی محسوس کر رہی تھی۔

”میں معلوم ہے۔ گل مینا نے ہمیں بتایا تھا کہ تم اس طرف آیا ہے جب ہی تو ہم تمہیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ورنہ ہم مشاہیرم خان اور اس کے صاحب کو کیا جواب دیتا؟ ان مور لوگ کی فطرت ہمیں ابھی طرح معلوم ہے۔ ہم دیکھتا رہتا ہے انہیں کہ یہ کیسے شراب پی کر عورتوں کے ساتھ موج مسیقی کرتا ہے۔ ان کے ساتھ عورت لوگ آتا ہے وہ بھی انہی جیسا ہوتا ہے، پر ہم تمہیں جانتا ہے۔ تم ہمارا بہن جیسا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا یہ بہن بہت اچھا اور نیک ہے۔“ اس کی پیش کی گئی نامکمل وضاحت کے جواب میں اکرم خان نے جو ہنسلے کیے، وہ اسے اپنی نظر میں سرخ تر کرنے کے لیے کافی تھے۔

☆ ☆ ☆

”میں امریکا جا رہا ہوں۔“

”چانک کیوں؟“ فرخیت تو ہے چودھری صاحب۔“

تاؤ اس اطلاع پر حیران ہوا۔

”ہاں ہاں، سب خیر ہے۔ میں بڑے دنوں سے اپنے پٹر کی یاد آ رہی ہے۔ آٹھ ماہ ہو گئے اس سے ملا نہیں۔ خود وہ تو ادھر آنے کی کل کرتا نہیں۔ میں نے سوچا، میں آپ ہی اس سے مل کر جاتا ہوں۔ اس بہانے ٹھوڑا میوں کے ساتھ بھی وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔“ اپنے امریکا جانے کی وجہ بتاتے ہوئے آخر میں چودھری نے ایک اور شوٹا چھوڑا اور خود اپنی بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسنے لگا۔

”میںوں کی آپ کو کیا کی چودھری صاحب! اب تو جیر آباد میں آپ کو ایک سیم کی اولاد مل گئی ہے۔“ تاؤ نے ڈاکٹر ماریا کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ اپنی جگہ ہے۔ چیز زبردست ہے...“ تجھے انکار نہیں، پر ساری خالص سیم نہیں۔ اس کا باپ ایشیائی تھا۔ پڑھنے کے لیے ولایت گیا تو گوری سیم کو بھانسا۔ بے چاری اسکی دیوانی ہوئی کہ اس کی خاطر دلایا پتہ چھوڑ کر ادھر آئی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بھی واپس نہیں گئی۔ ان دونوں ناشتوں کی اوادود ڈاکٹری ادھر ہمارے پاس ہے، پر پوری سیم نہیں۔ پوری سیم سے ملے ہمیں ادھر امریکا ہی جانا پڑے گا۔“

چودھری ایک بار پھر خواہش سے ہنسنے ہوئے بولا۔

”پھر کب تک جا رہے ہیں؟“ تاؤ نے اس کا پروگرام جاننا چاہا۔

”ویرا گئے کے لیے دے دیا ہے۔ دو چار دن میں کام ہو جائے گا تو گل جانوں گا۔ آپ کو تو مام (معلوم) ہے کہ میرا آنا جانگزی رہتا ہے اس لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ یہ تو اس واری ہی کچھ لمبا وقت گزر گیا ورنہ جب سے مراد ادھر ہے، ہر جا رہا ہوں، بعد چاہتا ہی رہتا ہوں۔“

”چلیں اچھی بات ہے۔ آپ کچھ عرصہ بیٹے کے ساتھ انجوائے کر لیں۔ یہاں تو ویسے بھی پرنس ڈاؤن جا رہا ہے، ابھی خاصی فراغت ہی ہے۔ اسے مطلب کا نیا فارینٹ آفیسر آگیا تو کچھ کام بن جائے گا۔ آپ جامل، آپ نے لیاقت رانا صاحب سے شہر یار کے سلسلے میں بات کی؟ ذرا وہ نیا بیٹھے تو میں ڈی ایس ایس منظور کو بھی یہاں سے کھسکاؤں۔“

”ابھی تو اس کے سر پر اسے کی کاٹھ ہے اس لیے کہیں اور ٹرانسفر کر مشکل ہوگا۔“ چودھری انھوں تو جلدی پٹائی جاگیر دار تھا۔ اگلے سیدھے پھندوں میں نہیں پڑتا تب بھی زمینوں سے اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ جو دیوں بھری پڑی رہتی تھیں۔ وہ تو اپنی ہوئی کے انھوں بھجور ہو کر یہ سارے وعدے کرتا تھا ورنہ حقیقت اسے کوئی کی نہیں تھی لیکن تاؤ کو کلگری اور کھالوں کی اس گھٹک میں سے نکلے والا میٹھن بند ہو جانے سے برا فرق پڑ گیا تھا۔ حرام کو گھٹکے کے بعد سو کھی تھوہ میں گزارا مشکل لگتی تھا اس لیے اسے بڑی پریشانی تھی کہ کی طرح چھلا سیتا اپ دو بارہ قائم ہو جائے۔

”نفت رانا سے تو میں نے مل نہیں کی۔ سوچا کچھ دن اور اوس بلوگرو سے کوئن مانی کرنے دن۔ واپس آکر، کچھ لوں گا، پر کسی گزرتے کو سب ٹھک ہو جائے گا۔“ چودھری نے بے پروا سے انداز میں اسے تسلی دی۔

”آپ کہتے ہیں تو نہیں کرتے فکر۔ آپ امریکا جا کر گوریوں کے ساتھ انجوائے کریں۔ ہمارے لیے ذرا ڈاکٹر ماریا کو اشارہ کر جائے گا۔ ہم بھی کچھ دن ادھوری سیم کے ساتھ گزار کر غم رواں کو بھرنے کی کوشش کر دیکھیں گے۔“ تاؤ نے موقع دیکھ کر اپنی خواہش بیان کی۔ جب سے ڈاکٹر ماریا کو دیکھا تھا، اس کی طلب ستاری تھی لیکن چودھری کی اس پر خالص توجہ دیکھ کر اس کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا اس سے۔ آپ جیسے دوستوں کی کئی بات کہے دینی جا سکتی ہے بھلا۔“ چودھری کے جواب نے اس کی کو خوش کر دیا۔

”تھنک یو چودھری صاحب! آپ سے مجھے نیکی امید تھی۔ اچھا، اب اجازت دیجئے... اور ہاں، پٹیر! آپ کی سیم کتنی کم ہو جائے تو مجھے ضرور پتا ہے گا۔“ میں ان پورٹ تک آپ کوئی آف کرنے ضرور دہاؤں گا۔“

”کیوں نہیں، میں آپ کو اطلاع کروں گا۔“ تاؤ کو یقین دہانی کروانے کے بعد چودھری نے فون بند کر دیا اور ایک نوکر کو آواز دے کر باٹے کو بھیجے گا حکم دیا۔ دراز میں بالا اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

”دیکھ بھی بالے! تیری کچھ ساری غلطیاں میں نے ناف (محاف) کر دی تھیں، پر اس واری جو کام تیرے سرگ کر جا رہا ہوں اس میں کوئی غلطی نہیں ہوئی چاہیے، ورنہ میرے کچھ کرنے سے پہلے تو آپ ہی مارا جائے گا۔ میرے پیچھے تو نے سارا کام وڈی صفائی اور شادی سے کرنا ہوگا۔“

”دستی فکری نہ کرو رکار! میں سب سنبھال لوں گا۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ ڈیریکٹ (ڈائریکٹ) انکسٹن کا موقع مل جائے۔ آپ نے وہ ڈاچنگ لٹل کیا ہے کہ سیدھے سیدھے اسے ہی پر ہی جھٹک لائے گا سوچا ہے۔ اب آپ دیکھیں گے کہ میں کیسے اس کا دماغ ٹھکانے لا جاؤں۔ غیائے کی دہی کا پتا تو وہ میرے دو ہاتھ کھا کر خور اٹھی اگلے دو گے۔ میں تو اس کے کانوں کو ہتھ لگاؤں گا۔ آپ اپنے منہ سے کسی لہوے میں پڑنے سے توبہ کر لے گا بلکہ آپ دیکھیں گے کہ ادھر سے بھاگ ہی نکلے گا۔“ بالا حسب عادت سید بھڈا کر چودھری کو یقین دہانی کروانے لگا۔

”زیادہ بھڑکیں نہ مار۔ مجھے تیری بھڑکیں نہیں سننی۔ کم (کام) نہ کھنا ہے تم... بیچوں کا کھیل نہ سمجھاؤ اسے انگوٹھ۔ اس کے سارے ماتے چاہے اسے ڈھونڈنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ تجھے بہت صفائی کے کام کرنا ہوگا۔ رازداری کی وجہ سے میں نے اس کی کو بھی یہ گل نہیں بتائی۔ پر اسے میرا ارادہ تو مام ہی ہے۔ سب سے پہلے تم لوگوں پر ہی شک کرے گا، پر اسے بھی ہوانہ کئے دیں۔ وہ میرا ساجھے دار نہیں، پر آدمی کا کیا پتا چلتا ہے کہ کب دھوکا دے جائے۔“

چودھری کی اپنی فطرت میں وہ نائنس تھی اس لیے وہ دوسروں پر بھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

”جیسا آپ کا حکم سرکار! آپ نے کہہ دیا تو سمجھیں کسی کو کانوں کان کبھی خبر نہیں ہوگی۔“ بالے نے ایک بار بھر اسے یقین دہانی کروائی۔

”اور ہاں، دیکھ... ڈاکٹر ماریا کا بھی دھیان رکھنا۔ اس کا کام کی چیز ہاتھ لگی ہے، اسے ابھڑے لٹکانا نہیں چاہیے۔“

اپنے ایس بی کی رال ٹیک رہی ہے اس پر۔ میرے جانے کے بعد ایک واری ڈاکٹر ماربا کو اس کے پاس لے جاتا۔ ایس بی بار بار صدمہ کرتے تو اسے بہانے سے ہال دے دیتا۔ سمجھ رہا ہے تاہم میری کس؟ ہالے کو مزید بدانتہوں سے توڑتے ہوئے جو صبری نے اس سے پوچھا۔

”جتنی گل ہے۔ میرے چھپے چھپے ہی یہ سب دیکھنا ہے۔ منشی زمینوں کے معاملات دیکھنے گا اور تجھے یہ بھڑکنے ٹھنسنے ہوں گے۔ میں پندرہویں دن سے زیادہ نہیں لگاؤں گا امریکا میں۔ میرے آنے تک تجھے مادہ کو کچا چلا کر اسے لانا بھی ہوگا اور سنبھال کر بھی رکھنا ہوگا۔ اس واری اسے ہاتھ سے لٹکانا چاہیے۔ اس کے چھپے میں اتار سک لینے کو تیار ہوا ہوں۔ وہ نہنی تو میں جان نکال دوں گا تم ساروں کی۔“ چودھری نے ہالے کو دھمکایا جس کے جواب میں ظاہر ہے اسے اپنی تابع داری کا یقین دلاتے ہوئے چودھری کو سب کچھ ٹھیک ہو جانے کی یقین دہانی ہی کروائی تھی۔

☆☆☆☆

”اچھا مریم! میں ڈراما کام سے جا رہا ہوں۔ مجھے واپسی میں کافی دیر ہو سکتی ہے۔ تم کی کویتا دینا اور خود بھی آرام سے سو جاتا۔“ اپنی تیاری کو فاصلے تک دیتے کے لیے سجاد رانا نے خود پر ایک بار پھر پر نیوم چھڑکا اور ہسٹری پیش ہوئی مریم سے کہتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ یہ سبیاں اتر کر وہ نیچے پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی بجٹی ٹھکنی نے اس کے قدم روک لیے۔

”ہیلو! اس نے ریسپونڈ کرنا کونوں سے لگا یا۔“

”السلام علیکم سجاد بھائی! خبریت سے ہیں آپ؟“

دوسری طرف شہر پار تھا جو اس کی آواز سن کر خیر خبریت دریافت کرنے لگا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم اپنی سناؤ۔“ اس نے اپنی گھائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی اس کے پاس کچھ وقت تھا چنانچہ وہ شہر پار سے بات چیت کر رہا تھا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ میں ماموں جان سے ایک کام کے سلسلے میں بات کرتی تھی اس لیے خوش قسمتی سے آپ کی آواز سننے کو مل گئی۔ ورنہ آج کل جیسے حالات ہو رہے ہیں، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے پاس فرصت بالکل نہیں ہوگی۔ پچھلے دنوں بھائی سے بات ہوئی تھی تو انہوں نے بھی یہی بتایا تھا کہ آپ بہت مصروف ہیں۔“

”ہاں! یار! مصروفیت تو بہت ہے اسی لیے میں سربراہ کو لے کر ٹھیک شہت ہو گیا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں اب تم

اور کم اسے بالکل بھائی نہیں رہتا پڑے گا۔“ سجاد رانا کی آواز میں اداویسی کی دھڑکی مگر پھر اس نے خود کو فوراً ہی سنبھال لیا اور پیش قدمی لے کر بولا۔ ”تم سناؤ کوئی نئی گزیر تو نہیں کر دی جس سے خشنے کے لیے پاپا کی مدد کی ضرورت ہے؟“

”نہیں، فی الحال تو خاصا امن وامان ہے، بس ایک بندے کے سلسلے میں ماموں جان سے بات کرتی تھی۔ عابد انصاری نام سے اس کا۔ مجھے کسی نے تجو یزدادی بھی کہا ہے جو کی جگہ اس شخص کو فار ایسٹ آفسر کی جگہ دلوا دوں تو اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔ میں نے سوچا ماموں جان سے ڈسکس کر لوں اور اگر واقعی وہ اچھا آدمی ہے تو کوشش کر کے اسے اپنے علاقے میں لے آؤں۔“ شہر پار نے اپنے فون کرنے کی وجہ بتائی۔

”عابد انصاری تو کافی ٹھیک تھا کہ بندہ ہے۔ میری تھوڑی بہت واقفیت ہے اس سے۔ کبھی کسی قسم کی کرپشن کے سلسلے میں اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔“ اس نے شہر پار کو بتایا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے، میں ماموں جان سے گویں گا کہ پھر پور کوشش کر کے یہ بندہ مجھے دلوا دیں۔ میں اپنے علاقے میں جو تھم گیا اس چاہ رہا ہوں اس کے لیے مجھے ایک اچھی ٹیم کی اشد ضرورت ہے۔“ سجاد رانا کی عابد انصاری کے سلسلے میں اچھی رائے نے اسے خوش کر دیا۔

”اللہ تمہیں تمہارے ٹیک مقصد میں کامیاب کرے۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

”میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپائزز کو معمولی فنڈ نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔ اگلے چھوٹے واپس آئے تو میں نے انکشافات ہوئے ہیں۔“

طرح ہوا بھر کر پھلنا خوب آتا تھا۔

”تم تو کافی حساس اور ذہین خاتون لگتی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کے بعد بھی میرا تم سے بار بار ملنے کا جی چاہے گا۔“

سجاد رانا بھی اپنی سمجھ بھنی کے مطابق خوب چل رہا تھا۔
”بعد کی بعد میں دیکھی جانے گی۔ آپ ابھی تو ہم سے مل کر دیکھیں۔“ وہ ایک دم جارحانہ موڈ میں آگئی۔ اپنے داماد کو پوری طرح الارٹ رکھنے کے باوجود بھی سجاد رانا کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ لڑکی کسی بھی مرد کے ہوش و حواس پر چین لینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ گزرنے والے اگلے دوڑھ دوڑھ دیکھنے اس کے لیے سخت آزمائش تھے۔ اس آزمائش سے کسی نہ کسی طرح گزرنے کے بعد جب اس نے اس حسین فتنے کو وہاں سے رخصت کیا تو اتنا مطمئن ضرور تھا کہ اس لڑکی کی صورت میں ایک ایسا راستہ دکھائی دے گیا ہے جس پر چلتے ہوئے وہ اپنے اصل ہدف تک پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆☆

سجاد رانا سے ہوش کے کمرے میں کال گرل کی حیثیت سے ملنے والی اس لڑکی کا نام جولیا تھا لیکن اپنے قدر دانوں میں وہ مرس جولیا کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ قیامت خیز حسن رکھنے والی مرس جولیا جب ہوگئی سے روانہ ہوئی تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ سجاد رانا کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کامیابی کا مطلب تھا کہ اسے سجاد رانا سے مزید ملاقات کے مواقع بھی میسر آئیں گے۔ اس پہلی ملاقات میں تو اس نے احتیاطاً اسے کسی حساس موضوع پر چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مراد وہ چونک جائے لیکن اسے امید تھی کہ آئندہ دو چار ملاقاتوں میں وہ اسے کھولے میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہی اس کا مشن بھی تھا۔ ہائی ڈیٹائی میں مود کرنے والی کال گرل کا بہرہ وہ اس نے کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لیے ہی اپنایا تھا لیکن ابھی تک اس کے کریڈٹ پر کوئی خاص کارنامہ موجود نہیں تھا۔ ابھی تک وہ ایک آدھ ہی اعلیٰ افسر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی اور وہ بھی ایسے نہیں تھے جن سے وہ بہت زیادہ کارآمد معلومات حاصل کر سکتی۔ اسے تو اس پر بھی حیرت ہوئی تھی کہ اسے سجاد رانا سے ملاقات کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟ حالانکہ اس کی طرف سے واضح طور پر خواہش ظاہر ہی تھی کہ کوئی بہت ہی تجزیہ کار کی کارڈ کی ہونی چاہیے۔ وہ بہت باقاعدگی لیکن عملی تجربہ ساز یا وہ نہیں تھا چرچا بھی اپنے بیڑوں کی ہدایت پر اس نے سجاد رانا پر یہی نظا ہر کیا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی

بہت سے اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ وقت گزار چکی ہے۔ اس نے اس کی بات پر یقین بھی کر لیا تھا اور اب وہ اس سے رخصت ہو کر بہت فوری فوری واپس جا رہی تھی۔ سجاد رانا کے منہ میں آجانے کا مطلب تھا کہ وہ اس سے بہت سے قیمتی راز انکوائے میں کامیاب ہو جائے گی اور یہ کامیابی اسے اپنے آقاؤں کے سامنے سرخ رو کر کے اس کی ٹرٹی کا سبب بن سکتی تھی۔ کامیابی کے نشے میں چور اپنے ٹھکانے کی طرف واپس لوٹتے ہوئے اسے قطعی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ تعاقب کرنے والے کی مہارت نے بھی اس کے بے خبر رہنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ موجود ہونے کے باوجود اس کی نظروں سے ہوجھ رہا تھا۔

جولیا کمرے کے پوش علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے پاس اپنی ایک بھینسی سی گھڑی بھی موجود تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ڈرائیوگ کے دوران ہی اس نے گھوٹا کپڑا شٹ میں رکھا ایک موبائل سینٹ نکالا اور اسے آن کیا۔ اس موبائل میں موجود ہم ان ڈیویس میں اس کے ایک بھیجی جوائی نے اپنی دیگر کامیابیوں کی شرح غیر قانونی طور پر دیکھی ہوئی تھیں۔ کال ٹریس ہونے کے خطرے سے بچنے کے لیے ایسی قسم کا استعمال سب سے محفوظ رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے فلیٹ پر پہنچنے سے پہلے اپنی کارکردگی کی رپورٹ اوپر والوں کو دینا چاہتی تھی اس لیے موبائل باہر نکالا تھا لیکن نہیں ملاتے پاس کا اپنے مطلوبہ نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکا۔ موبائل کی اسکرین پر روشن ہونے والے NOT AVAILABLE کے الفاظ نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ باقی کارنامے بھی وہ بار بار ٹریس کر رہی تھیں لیکن ہر بار ایک ہی نتیجہ سامنے آتا رہا۔ اپنی انجین میں جلا وہ اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی اور اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ ہوش سے یہاں تک اس کا تعاقب کرتے ہوئے آنے والا تھا اس کا فلیٹ نمبر جاننے کے بعد کب چیکے سے واپس بھی پلٹ گیا۔ اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد اس نے پہلے لاؤنج کی اسٹ روٹن کی اور پھر بیڈروم کی طرف بڑھی۔ بیڈروم مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سوچے بورد پر موجود تیسرے نمبر کو بالکل صحیح انداز سے کے ساتھ اس طرح ڈایا جیسے دن کی روشنی میں اسے دیکھ رہی ہو۔ جن دیکھتے ہی کمرے میں ٹیبل لائٹ کی دودھیار روشنی پھیل گئی لیکن اس روشنی میں اس کی نظر جس چہرے پر پڑی، اس نے اسے تنگ کر دیا۔

”مس گیتا آپ؟ میں تو خود آپ کو فون پر رپورٹ کرنے والی تھی لیکن آپ سے رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔“ اس نے خود کو کھنکھنے والے جھٹکے سے تجزی سے سمجھتے ہوئے کرسی پر بیٹھی نظر کیا اپنی ہم عمر لڑکی سے کہا۔ لڑکی کے ہم عمر ہونے کے باوجود جولیا کے کچھ میں موجود احترام بتا رہا تھا کہ وہ اس سے سینئر ہے۔

”اچھا! کیا رپورٹ ہے تمہارے پاس؟“ گیتا نے شہزادہ کچھ میں اس سے دریافت کیا۔
”ابھی تو پہلی ملاقات تھی لیکن میں سجاد رانا کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہوں۔ اس نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ دوبارہ بھی مجھ سے ملنا پسند کرے گا۔ میرے خیال میں وہ اتنا متاثر ہو چکا ہے کہ ایک آدھ دن میں دوبارہ رابطہ ضرور کرے گا۔“ وہ جو سجاد رانا سے ملاقات کے بعد بہت بڑبڑاتی تھی، گیتا کو اپنے فلیٹ میں پاکر خاموش کنیڈو ہو گئی تھی اور کچھ دیر کے بعد اسے انداز میں اپنی کارکردگی کے بارے میں اسے بتا رہی تھی۔

”میرے خیال میں تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ سجاد رانا تو تم سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اس کے تمہارا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے تمہارے پیچھے پیچھے اپنا آدمی بھی بھیج دیا ہے۔“ گیتا کے بے حد چپا چپا کر بولنے ان جملوں نے جولیا کے چہرے پر خوف دوڑا دیا۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبانی پھیرتے ہوئے تردید کرنے کی کوشش کی۔
”ایسا ہی ہوا ہے لیکن تمہاری بے خبری سے ظاہر ہے کہ تم نے اپنی تربیت سے کچھ نہیں سیکھا۔ اگر ہم نے تمہاری عمرانی پر اعتیاداً اپنا آدمی نہ لگا دیا ہوتا تو تم اپنے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سون کو مر وادیتیں۔“ گیتا کا لہجہ زہر خند ہو رہا تھا۔ جولیا اپنا سر کھڑکی کی بلڈ پر دھسے لگی۔

”اسی باتیں کارکردگی کا انجام معلوم ہے نا تمہیں؟“ گیتا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا جس کے جواب میں وہ شخص سر ہی ہلا سکی۔
”تمہیں یاد ہو گا کہ ہم سب کی طرح تم نے بھی ”را“ میں شامل ہوئے وقت وچن دیا تھا کہ دیش کی خاطر جان بھی دینے سے نہیں ہچکچاؤ گی۔ اس وقت کی ناکامی کا داغ دھوٹے کے لیے تمہیں اپنا دودھن پورا کرنا ہو گا۔“

”کیسے؟“ وہ بے مشکل گیتا سے یہ سوال کر سکی۔
”یہ رات تنگ بیڈ اٹھاؤ اور اس پر کھجور کے میں ایک کال گرل کی زندگی گزارتے گزارتے بیڑا روٹی ہوں اس لیے

اس زندگی سے چھکارا پانے کے لیے خودکشی کر رہی ہوں۔“ وہ کانپتے ہاتھوں سے گیتا کی ہدایت و ہمراہ کرنے لگی۔ گیتا کی آنکھوں میں کبھی اپنی موت وہ بہت اچھی طرح پڑھ رہی تھی۔ اگر اس کی بات ماننے سے انکار کرتی، تب بھی موت سے نہیں بچ سکتی تھی اس لیے بھر تھا کہ اس کی بات مان لے۔ کم از کم اس پر دیش دروہی (تھار) ہونے کا الزام تو نہیں آتا۔

”وہی گڈ! اب یہ، یہ دودھ پی کر اچھے بچوں کی طرح بستر پر آگھٹیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔“ وہ نوٹ لکھ کر فارغ ہوئی تو گیتا نے پہلے سے تپائی پر رکھے دودھ کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ جولیا کو اندازہ نہ تھا کہ ہوش سے اس کے تعاقب کا علم ہوتے ہی اس کے اوپر والے فوراً حرکت میں آگئے ہوں گے، جب ہی تو اس کے فلیٹ پر پہنچنے سے قبل گیتا اس کی موت کا ہر کارہہ بین کر چھپاتی وہاں پہنچتی تھی۔ دودھ کی ٹھنک میں گلاس میں موجود اپنی موت کو کھنے سے بچنے کا تارے ہوئے اسے اس سوال کا جواب بھی مل گیا تھا کہ سجاد رانا جیسے افسر کے لیے کسی بھی ہوئی انجینٹ کے بجائے اس کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ قطعی طور پر وہ لوگ سجاد رانا کی طرف سے پہلے ہی مشکوک تھے چنانچہ کسی قیمتی انجینٹ کو ضائع کرنے کا رسک لینے کے بجائے انہوں نے جولیا کو چارو بنا کر سجاد رانا کے سامنے ڈال دیا تھا اور اب اسے دیش پر بھی ہوتے کا ثبوت دینے کے لیے خود اپنی موت کو اپنے وجود میں اتارنا پڑ رہا تھا۔

☆☆☆☆

”کیا خبر ہے سلجھیا! کہیں کوئی گریڈ تو نہیں؟“
”گریڈ تو کافی تھی سر لیکن ہم نے معاملہ سنبھال لیا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم سجاد رانا کی انجینٹ کے بارے میں پہلے ہی غائب الارٹ تھے ورنہ خبری میں مارے جاتے۔ اسے یقیناً کہیں سے کبیل گیا تھا کہ ہماری دیگر لڑکیاں کال گرل کے جھپٹ میں بھی کام کر رہی ہیں۔ کسی طرح وہ درمیانی آدمی تک بھی پہنچ گیا تھا۔ میں پہلے ہی سے الارٹ تھی اس لیے کسی خاص درکار کے بجائے جولیا کو اس کے پاس بھیج دیا۔ جولیا کی گھڑی پر موجود ہندے نے جیسے ہی یہ اطلاع دی کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے، میں نے فوری ایکشن لے لیا۔ دیگر فدا حسین ڈیویس سے واپس جاتے ہوئے ایک ٹک کی زد میں آکر مارا گیا ہے جبکہ جولیا کی موت آجما تھیا ظاہر کی گئی ہے۔ دونوں کام بالکل نیچرل طریقے سے کیے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے، سجاد رانا چونکہ تو ضرور جائے گا۔ اسے ملنے والے کلیدز مٹانے کے لیے اپنے دونوں درکاروں کی دینا ضروری ہو گیا تھا ورنہ آئندہ اس سے بھی زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا۔“

سٹھیا نے مژدہ باندھ لے لی تھی اسے مکمل رپورٹ پیش کی۔
 ”ورکرز کا پرانہ نہیں۔ ایسے نچلے درجے کے کام کرنے کے لیے تو بہت لوگ مل جائیں گے لیکن اصل مسئلہ سجاد رانا کا ہے۔ بیٹی کی موت نے اسے پاگل کر دیا ہے اور وہ ہر حال میں اس کے قاتلوں تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کے اس پاگل پن کی وجہ سے اچھا خاصا بنا بنایا سینٹ آف خراب ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے سارے لوگ انڈر گراؤ نڈر کرنے پڑے ہیں۔ اب اگر وہ تمہاری ورکرز کیوں کے پیچھے پڑ گیا تو ہم اور بھی کھٹنا بولیں گے عسکار ہو جائیں گے۔“

”اگر آپ قسم دیں تو اسے خاموش کرنے کا بندوبست کیا جائے؟“ سٹھیا نے غصے سے پوچھا۔
 ”میرے خیال میں ایسا بھی کرنا پڑے گا۔ ہماری... لگاؤ ہے کہ ذاتی انتقام کے چکر میں پڑنے کی وجہ سے سجاد رانا نے ساری افادیشنز اپنی ذات تک بنی محدود رکھی ہیں۔ اپنے سوز سے اس بات کی تصدیق کر چکا ہوں کہ سجاد رانا اپنی کسی بھی اینٹیونی کو کسی انجینی کے ساتھ شہر نہیں کر رہا ہے۔ پھر بھی خطرہ تو ہے کہ وہ ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ پہلے ہی سجاد اور اللہ آباد والے سینٹ آپ چڑنے کی وجہ سے اوپر والے مجھ سے ناراض ہیں۔ تم سب کی تو پھر بھی بچت ہو جاتی ہے لیکن مجھے ڈر ایک جواب دینا پڑتا ہے۔ اوپر والے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مسزور ما! تمہارے لوگ یہ میں غلطیاں کر رہے ہیں؟ میرے پاس شرمندگی کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا۔“ وہ خاصا خفا لگتا تھا۔
 ”لیکن سجاد ہمارے طرف سے تو آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوئی چاہیے۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے دونوں نمائندہ کوئی کامیابی سے پورے کیے ہیں۔ یہاں کی اینکیز یہ تک معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ ایلپیو زیو یا کہاں سے؟“ سٹھیا نے اپنی کارکردگی بتائی۔

”اس بات سے تو مجھے بھی انکار نہیں۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری ان کارروائیوں سے ہم حکومت کو چلانے کے علاوہ سجاد رانا کا دھماکا بھی بنانے میں کامیاب رہیں گے۔ اصولاً موجودہ پچھویشن میں اسے اتنا مصروف ہو جانا چاہیے تھا کہ اپنی بیٹی کی موت کے معاملے کو بھول جاتا لیکن وہ نہیں بھولا۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مناسب رہتا ہے کہ ان کا کوئی مستقل انتظام کر دیا جائے۔“ درمیانے گویا سجاد رانا کی موت کے پروانے پر ہر تصدیق ثبت کر دی۔

”آپ کہیں تو یہ کام بھی میں کروں سر؟“
 ”جی ہاں، فی الحال تو تم بھی احتیاط سے کام لو۔ یہ کام

کرنے کے لیے دوسرے بندے ہیں میرے پاس۔“ اور نے سختی سے انکار کیا تو سٹھیا کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔
 ”یہ بتاؤ کہ شہر یار کے حلقے میں کچھ ہوا یا نہیں؟ جوانی کے جوش میں وہ بہت پر پڑے نکال رہا ہے۔ وہ انکیز تو ہوتا تو ہمارا جیسا اور اللہ آباد والے سینٹ آف تباہ نہیں ہوتا۔ سارے آتش کو اپنی بری عادت کی وجہ سے میرا بادی مسجد چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ دوسرے اگر وہ ایسی کاچر اس معاملے میں نہیں کودتا تو پولیس والے اتنی اینٹی اینٹی دیکھیں کہیں کتنے تھے کہ مسجد کے حجرے کا فرش کھود کر بیکے کی لاش نکال لیجئے۔ پانڈے کی حماقت کے بارے میں بھی نہیں معلوم ہے۔ اس نے نور پور میں بلاسٹ کے لیے ٹھکانے کا سیکشن کیا۔ لڑکے کا ہار سے سے تعین ظاہر ہونے کے بعد یہ سمجھا توں سما مشکل تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے کون تھا۔ وہ تو پانڈے کی ایک اچھی بھی کردہ پہلے ہی نکل چکا تھا اور آتش کو بھی ٹھکانے کا موقع مل گیا۔“

سٹھیا نے ایک سے متبادر سے رہا سے پوچھی لیکن اس کی کارکردگی ہمیشہ اتنی اچھی رہی تھی کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ قابل بھروسہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے وہ بھی اس کے سامنے یہ ساری گفتگو کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا تھا۔

”آپ فیئشن مت لیں سجاد! دوسرے دوسرے سب معمول پر آجائے گا۔ شہر یار کو بھی قابو کر لیا جائے گا۔ وہ اپنے ضلع کی ترقی کے جو خواب دیکھ رہا ہے، وہ ہرگز بڑے نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ آدھا کام تو وہاں کا ڈیرا افکار عالمی کر دے گا۔“ سٹھیا نے اسے تسلی دی اور اس کے کشیدہ اعصاب کو آرام دینے کے لیے جسکی کا جام تیار کرنے لگی۔

کسی زمانے میں وہ اس واقعہ کی خبر سے کئی سال چھوٹے ورما کو شہر کے ساتھ ساتھ شہر سے بھی مستفید کر کے لیکن جوانی ڈھلنے کے بعد درمیانے لیے اس کے وجود میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر شہر سے لطف اندوز ہوتا بھی جانتا تو اس کا انتخاب سٹھیا کے بجائے اس کے اندر کام کرنے والی کوئی شہر بھولا جوتی تھی۔ وہ چن اور کچھ دار سٹھیا نے وقت کی اس جدی کو آسانی سے قبول کر لیا تھا۔

”رانی! تو نے میری ساری بات اچھی طرح سمجھ لی ہے نہ؟ دیکھ، کوئی غلطی نہیں کرنا ورنہ مشکل ہو جائے گی۔“
 ”آدم آجیئے کے سامنے کڑے ہو کر اپنے کیلے ہاتھوں میں برش

پھرتی ہوئی کھڑی رہی تھی۔
 ”نہی فکر نہ کرو بی بی! میں سب سنبھال لوں گی۔“

سرخ کام دار دو بچے کو احتیاط سے ڈکر کے ایک جگہ میں رکھتے ہوئے رانی نے جواب دیا اور پھر بڑی عورت سے کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ آج وہ بڑی ٹھیکری ٹھیکری ہی لگ رہی تھی۔ پچھلے دنوں کی کیفیت کہیں اندر چھپ گئی تھی اور اندر سے جو روپ نکلتا تھا وہ بڑی یاد تھا۔ اس روپ کو حیرت انگیز ایک مشہور پارلر کی ماہر بیوٹیشن نے دیا تھا۔ کل جب کھڑکی سے اسے اپنا کج باہر چلنے کا حکم سنایا تھا تو وہ بھی تھی کہ بی بی ماسٹر آفتاب سے ملنے جا رہی ہیں لیکن اس کے انداز سے کے برخلاف کھڑکی سے لڑتی تھی جہاں سے اس نے بڑی چھان چھلک کے بعد سرخ عروسی جوڑا اور اس کی بیچنگ کے زیورات وغیرہ خریدے تھے۔ لہری سے وہ لوگ سید سے ایک مشہور پارلر پہنچے تھے۔ اس پارلر کے بارے میں کھڑکی کو اخبار میں دیکھنے والے اشتہار کے ذریعے علم ہوا تھا۔ پارلر میں کھڑکی نے اگلے دن کی بیچنگ کروانے کے ساتھ بیوٹیشن کے مشورے پر ضروری فیس فریٹ بھی کروا تھا اور ہاتھ پیروں پر میندی بھی لگوائی تھی۔ میندی کو ڈرائیور کی نظروں سے چھپانے کے لیے وہ پارلر سے خود کو بہت اچھی طرح چادر میں لپیٹ کر لکھی واپس آئی تھی۔ لکھی واپس پہنچنے کے بعد کل سے آج تک کا سارا وقت اس نے اپنے کمرے میں ہی گزارا تھا کہ مایا کو بھی میں کام کاج کرنے والی چنیدار کی بیوی نہ چونک جائے۔

گھانے چنے کا سامان رانی نے اسے کمرے میں ہی مہیا کر دیا تھا۔ کل سے اب تک وہ کھڑکی ایک ایک جنبش کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ آفتاب سے ملنے جانے کے لیے وہ ہمیشہ ہی بڑی پر جوش نظر آتی تھی لیکن آج تو معاملہ ہی الگ تھا۔ آج وہ صرف محبوبہ بن کر نہیں بلکہ منکوحہ کی حیثیت سے جا رہی تھی۔ اس کے اگلے ایک سے ملنے سٹی اس کی اندرونی کیفیت کے راز افشا کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر چھاپا آلودہ ہنس ہلکے دلیسا ہی تھا جو بائیل کے آنگن سے رخصت ہو کر بی بی کے گھر جانے والی ذہن کے چہرے پر چھلپا ہے۔

”کیا دیکھ رہی ہے رانی؟“ اس کی عورت کو محسوس کر کے کھڑکی نے اس سے پوچھا۔

”اپنی نظروں سے آپ کی بلا نہیں لے رہی ہوں بی بی! آج تو آپ اتنی یادگار لگ رہی ہیں کہ آپ کے چہرے سے نظر ہٹانے کو نہیں ہی نہیں کر سکتا۔“
 ”اچھا۔“ اس کی بات سن کر کھڑکی خوش گوار انداز میں ہنسی۔
 ”سوچ لیں ماسٹر صاحب! آج ہم آپ کے ہوش اڑا

کر رکھ دیں گے۔ ابھی تو کچھ تیاری کی ہی نہیں تو رانی کی ہمارے بارے میں پراے ہے، جب ہم کل تیاری کے ساتھ آپ کے روبرو ہوں گے تو آپ کیا کریں گے؟“ آکھ کی بچوں سے آکھنے میں اتر آئے والے آفتاب کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں اسے چٹخ کیا اور پھر خود ہی شرمائی۔

”شریف سے بل رانی کہ گاؤں نکالے۔ میں بھی آ رہی ہوں۔“ رخصت راز پر اترتی سرخی کو رانی سے چھپانے کے لیے اس نے یہاں سے اسے کمرے سے باہر بھیجا اور تھوڑی دیر بعد خود بھی بڑی ہی چادر میں اس طرح لپیٹ کر کہ سوائے آنکھوں کے جسم کا کوئی عضو نظر نہیں آ رہا تھا، کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے سامان والا ایک رانی پہلے ہی ساتھ لے گئی تھی۔ پورنگیو میں رانی اور ڈرائیور دونوں اس کے منتظر تھے۔ شریف نامی یہ ڈرائیور گاؤں سے ان کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا۔ اس سے لے کر جب کھڑکی اسٹریٹ بوم کی افتتاحی تقریب چھوڑ کر یہاں سے آفتاب سے ملنے اس کے گاؤں والے گھر میں گئی تھی، اب بھی یہی ڈرائیور ان کے ساتھ تھا۔ وہ ان کا مکمل راز دانا نہیں تھا لیکن جتنا دیکھتا تھا، اسے بھی قیمت وصول کرنے کے بعد بھول جاتا تھا۔ کھڑکی کی حالیہ معروضات پر بھی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور صرف حکم کا غلام بننا مکمل کر رہا تھا۔

”مجھے پارلر میں کافی دیر لگ جائے گی رانی! مجھے ہاں پہنچانے کے بعد تو شریف کے ساتھ کوئی واپس چلنا چاہتا اور حائرہ کا کام میں ہاتھ بٹانا۔ میرے ساتھ پارلر میں بیٹھ کر تو کچھ نکلیاں مارنے کا کام بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ میں دو ڈھائی گھنٹے بعد یا جب بھی مارا ہوں گی، مجھے کوئی پرفون کر دوں گی۔ تو شریف کے ساتھ آکر مجھے سے آنا۔“ طے شدہ منصوبے کے تحت راتے میں کھڑکی نے آواز بلند رانی کو حکم دیا۔ اصل مقصد ڈرائیور کو سنانا تھا۔

پارلر میں داخل ہو کر کھڑکی نے پہلے اپنا سامان ایک مددگار لڑکی کے سپرد کیا پھر اپنے سوپاگل سے آفتاب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ہی منٹ پر کال رینگنے لگی۔

”آخراً آپ کو ہماری یاد آئی؟“ کال ریسپونڈ کرتے ہی اس نے شکوہ کیا۔

”یاد آنے کے بارے میں تو مجھے۔ جن کا خیال دل سے جدا ہی نہ ہوتا ہو، انہیں یہ شک ہو کہ ہم انہیں یاد کرنے کے لیے بھی فرصت کی تلاش کرتے ہیں... تو دل بڑا دھکتا ہے۔ ہم تو بس اپنا وعدہ نبھانے کی کوشش میں لگے ہوئے

تھے۔ کہا تھا کہ اب جب کہ میں ملے تو اس طریقے سے میں کے جو طریقہ ہمارے رشتے کے شاپان شان ہو۔ ہم اپنا وعدہ نبھانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ بتائیں، وہ شخصوں کے اندر آپ ایسی کسی جگہ کا انتظام کر سکتے ہیں جہاں ہم آپ سے ملنے آسکیں؟“ اس نے آفتاب کے شکوے کا بھرپور جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”جگہ کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنے دوست کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ بتائیں کہ یہاں کیسے پہنچیں گی؟ آپ چاہیں تو میں آپ کو لے آجاتا ہوں۔ بتائیں کہاں میں آئی؟“ وہ سارے گلے شکوے بھول کر اس سے ملنے کے خیال سے جوش میں آگیا۔

”بتائیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ بس دو گھنٹے تک انتظار کیجیے پھر آپ کو جگہ بھی بتا دی جائے گی۔“ اس کی بے قراری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کشور نے شرارت سے کہا اور لائن کاٹ دی۔ اس کا خیال تھا کہ آفتاب دوبارہ کال کر کے اس سے بات کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تیاری کے طویل مرحلے سے گزرتے ہوئے ایک بار بھی اس کے موبائل کی گھنٹی نہیں بجی۔ آفتاب کی اس بے اعتنائی پر وہ دل ہی دل میں رو بانی ہوئے گی۔

یونین نے اسے مکمل تیار کر کے آئیے کے سامنے کھڑا کیا تو اس وقت تک وہ عجیب سے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ جس شخص نے پلٹ کر دوبارہ پوچھا بھی نہیں اس کے لیے اتنی تیاری کرنی بھی چاہیے تھی کہ نہیں؟ وہ ابھی اسی موقع میں گھری کھڑی تھی کہ خاموش موبائل بول پڑا۔ کال کرنے والا آفتاب کے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”امتحان کے دو گھنٹے گزر گئے ہیں محترمہ۔ اب فرمائیے کہ کہاں حاضر ہوں؟“ اس کی شوخ زندگی سے بھرپور آواز نے کشور کے تن مرد میں بھی جان ڈال دی۔ اس نے فوراً آفتاب کو اس بار کا پتا بتایا جہاں وہ اس وقت موجود تھی۔

”بس دس منٹ انتظار کیجیے۔ میں پہنچتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور واقعی دس منٹ بعد وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ پارے سے نکلنے سے پہلے کشور نے پہلے ہی کی طرح خود کو چادر میں چھپا لیا تھا لیکن غلطی بنی کہ وہ آفتاب کے پھول کی مٹی تو خاموش ہوتی ہے کہ چھپانے کے باوجود ان کی مہک چھپ نہیں جاتی۔ آفتاب نے بھی اس کی تیاری بھانپ لی تھی اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”گلتے ہے آج آپ مجھے سر پرائز دینے کے موقع میں

ہیں۔“ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ساتھ بٹھی مشور کو پھینکا۔ جو پانچواں خاموش رہی۔ آفتاب نے بھی راستے بھر مسکراتے رہنے کے سوا اس سے دوسری کوئی بات نہیں کی۔ دس منٹ بعد وہ اپنے دوست کے وہ منزلہ مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ دروازے پر گاڑی روک کر اس نے ہارن دیا تو تقریباً سیڑی کے ہم عمر ایک مرد نے گیٹ کھول دیا۔ آفتاب کھلے گیٹ سے گاڑی اندر لے گیا۔ سامنے ہی ایک بے حد گوری اور فریبی خاتون کے ساتھ دو چھوٹے بچے کھڑے ہوئے تھے۔ آفتاب گاڑی سے اتر کر اس کی ساختہ والے دروازے پر آیا اور اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اتارا۔ وہ جو اسے سر پرائز دینے کے لیے آئی تھی، اب شرم و حیا اور گھبراہٹ کے مارے ہاتھ قاعدہ کاغذ پر رہی تھی۔ رہی کسی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب استقبال کے انداز میں کھڑی خاتون اور بچوں نے پہلے اس پر پھولوں کی چٹائیں بچھا دیں اور پھر خاتون نے ایک موہ سا بار اس کے گلے میں ڈال کر اسے خود سے لپٹا کر پیار کیا۔

”بڑی امیر نہیں میں آئی ہوہ پورانی صاحبہ۔ اس لیے اگر کوئی کی رہ جائے تو نظر انداز کر دینا۔“ اسے گلے سے لگے لگے علی خاتون نے کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف لے گئیں۔ دونوں بچے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ خاتون کشور کو ایک کمرے میں لے جانے لگیں تو بچوں میں سے ایک نے احتجاج کیا۔

”یہ کیا کیا آگیا وہیں ہمارے ساتھ ڈر نہیں کرے گی؟“ ”نہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ نہیں بلکہ اپنے دوہلا کے ساتھ ڈر کر رہے گی۔“ خاتون نے بچے کو جواب دیا اور کشور کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولی۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ تم زیادہ وقت کے لیے یہاں نہیں رک سکو گی اس لیے تمہیں اور آفتاب کو ایک ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع دیتے کے لیے میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ تم لوگ کھانا اپنے کمرے میں ہی کھاؤ۔ ہمارا آپس میں تفصیلی تعارف اور ملاقات بعد میں ہو جائے گی۔ ابھی تم بس یہ سن لو کہ آفتاب افضل کو اپنے گھر بھائیوں کی طرح عزیز سے اور اس کے حوالے سے تم بھی ہمارے لیے اتنی ہی اہم ہو۔“ انہیں بھی حیرت بھنا۔ ”خاتون کے چہرے میں جتنے کو سنتے ہوئے وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی تو بہت رہ گئی۔ پورا کمرہ بچوں سے بھرا ہوا تھا اور لگتا تھا کہ کئی لہجوں کے استقبال کے لیے ہاتھیں پھیلائے کھڑا ہو۔

”یہ ہمارے پھول آفتاب خرید کر لایا تھا۔ میں نے اور افضل نے اس کے ساتھ ل کر نہیں ڈکڑا دیا ہے۔“

اس نے اس کے ساتھ ل کر نہیں ڈکڑا دیا ہے۔“

خاتون نے اسے اطلاع دی تو وہ مسکرا دی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دو گھنٹے جو اس نے پارک میں گزارے تھے، ان میں آفتاب بھی بہت مصروف رہا تھا۔

خاتون اسے کمرے میں پہنچا کر بچوں سمیت باہر نکلیں تو فوراً ہی آفتاب چلا آیا۔ خوش اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بن کر نکلی رہی تھی۔ گاڑی میں تو وہ حیا کی وجہ سے دھیان نہیں دے سکی تھی لیکن اب اس نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے ہمیشہ والے لباس سے بہت کچھ خوب صورت آف وہائٹ رنگ کے کرتے شلوار میں ملیں ہے۔

”مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کس انداز سے ملنے کے لیے آ رہی ہیں۔ دو گھنٹے کے مختصر وقت میں بڑی بھاگ دوڑ کر کے یہ سارا انتظام کیا ہے۔ افضل اور مہتاب بھائی نے بھی میرا بڑا ساتھ دیا۔ وہ آپ کے سر پرائز کے مقابلے میں ہماری ادھوری تیاری تو ہمیں آپ کے روبرو شرمندہ گردا دی۔“ کشور کے مقابل میں بیٹھے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جگر جگر کرتے ہوئے عینوں سے سرسبز نازکی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

”جس دن سے نکاح ہوا ہے اسے جب میں لیے محوم رہا تھا کہ جیسے ہی موقع ملے حق و حق دار تک پہنچا دیا جائے۔“ خیریت سے بوجھل لہجہ کشور کو یقین دلایا تھا کہ اس نے حق اس شخص تک پہنچنے کے لیے اتنا کشت نہیں اٹھایا۔ وہ واقعی اس کا سچا قدردان تھا۔ بالکل اس جوہری کی طرح جس کے ہاتھوں میں آکر غیر تراشیدہ بھرے کی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ اس نے بھی پوچھ ہی اپنا آپ اپنے قد رشاس جوہری کو سوچ لیا۔

”تو بی بی کے ساتھ ہی رک جاتی تو اچھا تھا۔“ گاڑی واپس کے راستے پر ڈالتے ہوئے شریف نے رانی سے کہا۔ ”کیسے رک جاتی؟ سنائیں تھا تو نے کہ بی بی نے آپ مجھے کوٹھی واپس جانے کا حکم دیا تھا۔“ شریف کی بات کے جواب میں رانی چمک کر بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے، پر مجھے وہ دے چوہری صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ کیا خبر انہیں بی بی کا اس طرح اکیلے کوٹھی سے باہر نکلیں رہنا اچھا نہ لگے۔“ وہ تذبذب کا شکار تھا۔

”اس سے نہیں کیا؟ ادھر تو بی بی ہی ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ان کا ہی حکم ماننا ہوگا۔ وہ بے بسی دے چوہری کو کفر کیسے ہو گی اس گل کی۔ کیا تو بتائے گا انہیں؟“ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے کرتے اس نے آجاکہ معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”مینیو لوڑ پڑی ہے؟ میں تو بی بی کے خیال سے ہی کہہ رہا تھا۔“ وہ برامان کر بولا۔ پھر بی بی کے راستے میں اس کے اور رانی کے درمیان کوٹھی بات نہیں ہوئی۔ کوٹھی واپس پہنچنے کے بعد رانی چوکیدار کی بیوی حاجرہ کے ساتھ کامیوں میں ہاتھ بٹانے لگی۔ کامیوں کے دوران فریڈ پونے دو گھنٹے کا دورانیہ تیزی سے گزر گیا۔ کام کرنے کے ساتھ ساتھ حاجرہ سے باتوں میں مصروف رانی کا ذہن وقت کا حساب کتاب بھی کر رہا تھا۔ پونے دو گھنٹے گزرنے کے بعد اس نے چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا۔

”بار پانی خانے کا باقی کام میں دیکھ لوں گی حاجرہ۔۔۔ تو ذرا میری کر کے بی بی کے کمرے کی بھاری پوچھ کر دے۔ بی بی نے کمرے نکلے ہوئے مجھے صدمہ دیا تھا، پر میں بھول گئی۔ تو جلدی سے یہ کام کر آچھوں کر چائے پیئے ہیں۔“ چائے کا پانی کھولنے لگے تو اس نے بہانے سے حاجرہ کو وہاں سے بنایا۔ وہ اس کی بات مان کر باہر نکل گئی تو اس نے جلدی سے چائے تیار کر کے پہلے ایک پیالی میں اپنے لیے نکالی پھر باقی کی چائے میں اپنے گریبان میں چھپا کر رکھی پڑا نکال کر اس میں موجود گولیاں الٹ دیں۔ یہ لیٹین ہوئے کے بعد کہ گولیاں چائے میں پوری طرح حل ہو چکی ہیں۔ اس نے چائے کو تین پیالیوں میں الٹا اور کپڑے میں رکھ کر باہر نکل گئی۔ سب سے پہلے اس نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو چائے پہنچائی پھر شریف کے کوارٹر میں پہنچ گئی۔

”لے بھائی شریف! اچالے پی لے۔ بی بی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں ابھی آ جا کھانا ہو رہے گے۔ تو چائے پی کر تھوڑی دیر آرام کر لے۔“ فیر ہم انہیں لینے چلیں گے۔“

”چنگا ہے۔“ شریف نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا پھر بڑبڑانے کا انداز میں بولا۔ ”ایک گل مجھے نہیں آ رہی۔ یہ اچانک ہی بی بی کو بیٹے سنورنے کا اتنا شوق کیوں چڑھ گیا کہ روز روز پورے پارک جاگے لگیں؟“

”کیوں۔ بی بی انسان نہیں ہیں کیا جو ان کا دل کسی چیز کو نہیں چاہ سکتا؟ ویسے بھی تجھے کچھ مجھے کی ضرورت کیا ہے؟ تو اپنے کام سے کام نہ رکھ۔“ براہ راست مخاطب نہ کیے جانے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ شریف نے اسی سے سوال کیا ہے اس لیے اسے نوک کر باہر نکل گئی۔ سامنے ہی حاجرہ چلی آ رہی تھی۔

”کردی صفائی؟“ عین آتیرے کوارٹر میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک شپ بھی دکھائیں گے۔ حاجرہ کو لے کر وہ اس کے کوارٹر میں چلی گئی۔ اپنی اپنی چائے پیتے ہوئے وہ

دونوں ہاتھ بھی کرتی رہیں۔ چائے ختم ہوتے ہی حاجرہ بجاہیاں لینے لگی۔

”آج چائیں کیوں ابھی سے ختم آنے لگی؟“ منہ پر ہاتھ رکھ کر بجاہی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے حاجرہ نے کہا۔
”تھک گئی ہوگی۔ تھوڑا آرام کر لے۔ میں بھی چلتی ہوں۔ ابھی شریف کے ساتھ بی بی کو لینے بھی جانا ہے۔“ اسے مشورہ دے کر وہ گوارڈ سے باہر نکل گئی۔ گولیوں کی اثر انگیزی کے بارے میں اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ ان گولیوں کی مدد سے تو وہ حویلی میں موجود ملازمین اور مالکان کی بڑی تعداد کو غافل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ یہاں صرف تین بندوں سے نمٹنا کیا مشکل تھا؟ چائے کی ٹرے باورچی خانے میں رکھ کر وہ گیٹ کی طرف آئی۔ چوکیدار کرسی پر بیٹھا اٹھ رہا تھا۔

”ختم آ رہی ہے تو اندر اپنے کوارٹر میں جا کر سو جاؤ۔“ گھٹنے دو گھٹنے بعد ڈیوٹی پر واپس آ جانا۔“ چوکیدار کا شانہ بلا کر اس نے اسے یہ مشورہ دیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ اب رانی کو اطمینان تھا۔ صبح حسب پروگرام کشور رانی سمیت ان تینوں کو اپنے سامنے بلا کر ان کی بغیر فیس داری پر ڈانٹ بھی پلائی اور یہ بھی ظاہر کرتی کہ کوئی بھی پر کسی ملازم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے رات اسے مجبوراً کسی سے تنہا واپس آنا پڑا۔ ملازم اس صورت حال پر مفلک ہوئے تو حاجرہ ہوتے لیکن ظاہر ہے وہ مالکان سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ رانی بھی مالکان کی چدیتی ہونے کی وجہ سے محض غلام رہتی۔

ہر طرف سے مطمئن رانی کوئی میں کشور کے زیر استعمال کمرے میں چلی آئی۔ یہاں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ وہ احتیاطاً رات جاگ کر گزرتا چاہتی تھی چنانچہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ اردو سے اس دلچسپ ناول میں کھوئے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ گیٹ پر کسی گاڑی کا زور دار ہارن سنائی دیا تو وہ چونکی اور پھر کتاب چھوڑ کر بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف دوڑی۔ خیال تھا کہ کشور واپس آئی ہوگی۔ اپنے اسی خیال کے سبب اس نے بے دھرم گیٹ کھول دیا لیکن سامنے موجود گاڑی اور اس میں سوار افراد کو کچھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ گاڑی میں تاجور اور اس کا شوہر اشرف بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گیٹ ملل واکیا تو گاڑی تیزی سے اندر آ گئی۔ کاپتے ہاتھوں سے گیٹ بند کر کے رانی تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی اور پچھلی نشست پر بیٹھی تاجور کی گود میں سر رکھ کر سوئے ہوئے منور کو اپنی گود میں لے لیا۔

”چوکیدار کہاں مر گیا ہے جو تجھے گیٹ کھولنا پڑا؟“ جاسوسی ڈائجسٹ

اشرف نے سخت لہجے میں اس سے سوال کیا۔

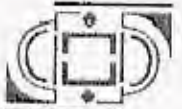
”اس کی طبیعت وہی خراب ہے جی۔ اپنے کوارٹر میں پڑا لوٹ رہا ہے۔“ حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس نے چوکیدار کی گیٹ سے غیر حاضری کا بہانہ بنایا اور بچے کو لیے ہوئے کوٹھی کے اندرونی حصے میں ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حویلی سے یہاں چودھری کے علاوہ کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا لیکن سارے کمرے ہر وقت حاف سقرے اور تیار رہتے تھے۔ ان کمروں میں سے ہی ایک میں اس نے تاجور کے بچے کو بچپا کر آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ تاجور خود بھی پیچھے ہی چلی آئی۔

”آپ لوگوں کے لیے کھانا لگاؤں بی بی؟“ رانی نے اس سے مؤدبانہ پوچھا۔

”نہیں، کھانا ہم کھا کر آتے ہیں۔ اشرف کے ایک دوست کی شادی تھی یہاں، اسی میں شرکت کر کے آرہے ہیں۔“ تاجور نے اسے جواب دیا۔
”تو فیئر میں آپ لوگوں کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔“ ایک تو اسے معلوم تھا کہ حویلی سے اٹھ کر کھنے والے سارے افراد رات سونے سے پہلے دودھ پینے کے عادی ہیں، دوسرے وہ زیادہ دیر تاجور کے سامنے ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی کہ مبادا وہ کشور کے بارے میں کوئی مبالغہ نہ کر لے اس لیے اس کے جواب کا انتخاب کے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے سیدھا باورچی خانے کی طرف جانے کے بجائے نشست گاؤں کا رخ کیا۔ کئی فون سیٹ میٹیں رکھا ہوا تھا۔ اسے کشور کو فون کر کے اس کی صورت حال کے بارے میں خبر دینی تھی۔ ایسی ہی کسی ایمر جیسی کے لیے ذہن نشین کر دیا ہوا کشور کا موبائل نمبر ڈائل کر کے وہ بیل جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت اس پر ایسی گھبراہٹ طاری تھی کہ سینکڑہا ہزاروں حصہ گزرتا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ جیسے ہی بیل بیل جانے کی آواز سنائی دی، اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہونے لگی۔

”اس وقت گیسے فون کر رہی ہے؟“ عقب سے سنائی دینے والے اس سوال پر وہ اس بری طرح اچھلی کہ ریسٹور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نیچے پڑے ریسٹور پر سے ٹھہرنا کر اس نے اپنے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ہاتھ پر پھر اس فکٹیں بیٹھے چودھری اشرف شاہ اسے خشونت بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

حادثات و سانحات کی سنگار... یہاں کی لائن میں سو گز دان
بہاؤ خان کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ دیکھیں



اسماقادی

گیاہویش

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے۔ یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانہ طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو پس ہو جاتی ہے۔ نل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی ہسات اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں۔ کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے۔ بوٹا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے۔ اس وقت تک ہاروں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسردہ، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

نقدی کی شہنشاہی، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... ملے اور پھڑپھڑ جائے والوں کی کہانی



رانی کے اندر اتنی اہمیت نہیں تھی کہ فوری طور پر اشرف شاہ کے سوال کا جواب دے سکتی۔ وہ خوف زدہ رہی مگر اس کی شکل دیکھتی رہی۔

”میں نے تجھ سے پوچھا ہے کہ اتنی رات گئے کسے فون کر رہی تھی؟“ اسے خاموش پا کر اشرف شاہ نے اپنا سوال دہرایا۔

”کسی کو نہیں شاہی افون کی بجائی تھی تو میں نے فون اٹھا لیا تھا، پر دوسری طرف سے کوئی کچھ بولا ہی نہیں۔“

رانی نے ٹھوک لگ کر اپنا خشک ہو جانے والا گھر کیا اور اشرف شاہ کی بات کا جواب دیا۔ اچانک نازل ہو جانے والے چودھری افکار کے اس بڑے داماد کو نالے کے لیے فی الحال یہی بہانہ اسے سوجھ سکا تھا۔ اشرف شاہ نے اس کا جواب سنا اور خود آگے بڑھ کر پیچھے گرا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔

ریسیور کان سے لگانے پر اسے اندازہ ہوا کہ ابھی تک لائن پر کوئی موجود ہے۔

”ہیلو“ اس نے غراٹے کے انداز میں کہا۔ ”میں فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا اور لوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اشرف شاہ نے رانی کو کھانچا جانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

”مشورہ کیا ہے؟“ یہ سوال کرتے ہوئے اس کے لیے میں شک سرسرا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس مقام کال کا کشور سے تعلق حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”نی تو اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔“ تاہم اور اشرف شاہ کی کوئی بات نہ تھی اس لیے اس سوال کا جواب سوچا شروع کر دیا تھا اس لیے اس بار پورے اعتماد سے اشرف شاہ کو جواب دیا۔

”بی بی کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ بڑی دیر تک مجھ سے سرد ہو رہی ہیں۔ ابھی ٹھوڑی دیر پہلے ہی دو کھارہ سوئی ہیں۔ سونے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ جب تک میں خود نہ جاؤں مجھے سویرے اٹھنا نہیں۔“ حفظہ بالقدم کے تحت اس نے آگے کے حالات کو سنبھالنے کے لیے بھی جوش بندی شروع کر دی۔

تاہم جو اشرف شاہ کو کشور کے غیاب سے بے خبر رکھنا اور خواب آور دوا ملی جائے گی کہ سو جانے والے ملازمین کو سنبھالنے کی تمام تر ذمہ داریاں اس کے سر نہیں۔ صرف وہ تھی جو کشور کے راجہ بخت کی امین تھی اور اس امانت کا حق ادا کرنے کے لیے اسے بے حد مستعدی سے کام لینا تھا۔

”آفتاب! مجھے یقین دلانا کہ یہ سب خواب نہیں ہے۔ میں کچھ آج اس وقت آپ کی بیوی کی حیثیت سے آپ کے قریب، آپ کے ساتھ موجود ہوں۔“ کشور نے اپنا سر آفتاب کے سینے پر رکھتے ہوئے خوابیدہ سے لہجے میں اس سے فرمائش کی۔ اس کی فرمائش پر آفتاب نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اپنی نظروں کی گرفت میں لیا۔ کشور نے اپنی آنکھیں موند کر رکھی تھیں۔ شاید وہ واقعی اپنی زندگی کے ان اہم لمحوں کو کوئی خواب تصور کر رہی تھی اور اس خوب صورت خواب کے ٹوٹ جانے کے ڈر سے آنکھیں نہیں کھول رہی تھی۔ آفتاب اس کی کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ وہ خود بھی انہی احساسات سے دوچار تھا۔ کبھی کبھی اچانک مل جانے والی خوشیاں انسان کو ایسی ہی بے یقینی میں جلا کر دیتی ہیں۔ وہ خواب جو بار بار دیکھے جا رہا تھا، تعبیر کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد بھی خواب ہی محسوس ہوتے ہیں۔ خوب صورت خوابوں کی خوب صورت تعبیر خواب دیکھنے والے کو ڈرا دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ تعبیر نہیں کاٹنے کا تاڑک بلوریں جام ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جائے گا۔ وہ دونوں بھی اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہونے اور بہت سے کیف اور لحاظ گزار جانے کے بعد بھی اسی ذرا سی خوف میں مبتلا تھے۔

”اگر آپ کو یہ کہنے سے خواب لگتے ہیں تو بھی کیا حرج ہے کہ ہم یہ خواب دیکھتے رہیں۔ اتنے خوب صورت خواب تو قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتے ہیں۔ رنگ برنگے خوابوں کے پھولوں سے بھری یہ فصل تو بس انہی دلوں کی سرزمین پر اگتی ہے جنہیں محبت کے پانی سے سیراب ہونے کا موقع ملے ہو۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ قدرت نے ہمارے دلوں کی زمین کو اتنا زرخیز بنایا ہے۔“ بہت دیر سے آواز میں اپنے لفظوں کا جادو بکاتے ہوئے اس نے غری سے کشور کی بند آنکھوں کو باری باری چومنا۔ پھر گویا اسے اور خود کو یقین دلانے کے لیے پوری شدت سے اس کے ایک ایک انگلیش کو چومتا چلا گیا۔ کشور کے قریب نے اسے ایک ایسا پالنا دیا تھا جو جوتے کے بعد بھی خالی نہیں ہوا تھا۔ اس کی چاہت کی گھٹا اور بھی اندازہ کر

آ رہی تھی۔ دھرتی بھی جمل تھیں ہو جانے کے باوجود مزید برسات کو قبول کرنے سے انکار ہی نہیں تھی۔ ان کے لیے اس وقت کا نکات میں ایک دوسرے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ ”میں اور تو“ کا فرق مٹانے ایک دوسرے میں سم تھے۔ ایک دوسرے کو چاہت سے ہر چیز پر جام پر جام پلاتے وہ بالکل مدہوش تھے۔ اچانک ہی ایک آواز نے اس فسون کو توڑ دیا۔ دو چائے والوں کی تنہائی میں ٹپ ٹپ ہونے والی یہ آواز کشور کے موبائل کی رنگ ٹون کی جیسے کہ وہ بری طرح چوک گئی۔ اس کے موبائل پر صرف ایک شخص کال کرتا تھا اور وہ شخص اس کے ساتھ تھا۔ یہاں آتے سے قبل وہ رانی کو اپنا موبائل نمبر رٹوا کر آئی تھی اور کتنی تینے کا مطلب تھا کہ کال کرنے والی رانی ہے۔ رانی کی طرف سے کال آنے کا یہی مطلب لیا جا سکتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے ورنہ وہ اس وقت اسے ہرگز بھی دسرب نہیں کرتی۔ اندیشوں اور خوف میں گھر کر کشور نے ہاتھ بڑھا کر اپنا موبائل اٹھا لیا۔ موبائل کی اسکرین پر کوئی کالوں نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے ”میں“ کا نمبر پیش کرتے ہوئے کال پر سیو کی لیکن دوسری طرف سے توقع کے برخلاف رانی کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ کچھ بولتی اس سے قبل ہی ایک مردانہ آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے اپنی اساتذوں کو پوری طرح دوسری طرف سے سنا دیے والی آوازوں پر سر کوڑ کر دیا۔

”میں نے تجھ سے پوچھا ہے کہ اتنی رات گئے کسے فون کر رہی ہے؟“ اس بار وہ آواز سننے کے ساتھ ساتھ لفظوں کو سمجھنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ اسے اس آواز اور لہجے کو پہچاننے میں کچھ دیر لگی۔ نتیجتاً چاہت کے رنگوں سے جی اس کا چہرہ فٹ پڑ گیا۔ اس کے ساتھ موجود آفتاب خاموشی سے اس کی اس برقی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ فی الوقت وہ اسے بھی بھلائے رانی کی آواز سن رہی تھی۔ رانی کا وضاحتی جملہ ابھی اس کی سماعتوں سے گزر رہا تھا کہ ایک غرائی ہوئی مردانہ ”ہیلو“ اس نے اس کے وجود کو بلا ڈالا۔ اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سو فیصد اس کا بڑا بیٹوں کی اشرف شاہ تھا۔ اشرف شاہ کے کوئی میں موجود ہونے کا مطلب تھا کہ بہت بڑا خطرہ سر پر منتظر رہا ہے۔ اس کے ساتھ اگر تاہم جو بھی تھی تو کشور کا کوئی سے غیاب چھپنا بہت مشکل تھا۔ بے حد خوف زدہ ہوتے ہوئے اس نے لائن کاٹ دی اور بارے ہوئے انداز میں موبائل کان پر سے ہٹاتے ہوئے بند پر ڈال دیا۔ حقیقت کی کٹی اسے خوابوں کی دنیا سے واپس لے آئی تھی۔

”کیا بات ہے کشور... کیا ہوا؟“ آفتاب نے ہر تیش میں نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بھاشرف کو کبھی پڑے ہوئے ہیں۔“ اس نے مردہ سے لہجے میں بتایا۔

”یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔“ آفتاب اس کی دی ہوئی اطلاع کو سن کر پریشان ہو گیا۔

”مجھے فوری طور پر کوئی واپس جانا ہوگا۔“ کشور جو بالکل بے دم ہی تھی اب بھی کوئی خیال آنے پر یک دم ہی متحرک ہوئی۔

”لیکن اس وقت آپ کا اس طرح سے جانا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“ آفتاب نے تشویش کا اظہار کیا۔

”میرا تھنا رانی کے لیے بہت برا ثابت ہوگا۔ میں اسے اس کی وفاداری اور محبت کے بدلے میں اسے بڑے خطرے سے دوچار نہیں کر سکتی۔“ کشور کا لہجہ اٹل اور دھکیل جان دار تھی۔ واقعی انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ ایک وفادار و جاس خاں ملازم کو حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے۔

”میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“ اس نے جرأت مندی سے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ اور کشور ایک دوسرے سے الگ نہیں تھے۔ وہ اس کی ذات سے اپنے لیے خوشیاں کشید کرتا تھا چنانچہ اب مصیبت کی گھڑی میں بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔ دوسری طرف کشور اسے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن آفتاب کے ساتھ جانا بھی اس کی مجبوری تھی۔ رات کے اس پیر وہ اس کی کوئی تک واپس نہیں جاسکتی تھی۔ آفتاب کو کوئی سے گیت سے ہی واپس لوٹا دینے کا قسم

ارادہ کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ آفتاب آسانی سے واپس لوٹنے کے لیے راضی نہیں ہو گا مگر وہ اسے اپنی قسم دے کر واپس ہونے پر مجبور کر سکتی تھی۔

”آپ تیار ہو کر باہر آئیں، میں آفتاب اور بھابی کو صورت حال سے آگاہ کرنا ہوں۔“ آفتاب نے کہا اور شرٹ کے بٹن بند کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور بھی بچھے دل کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ زندگی کے اتنے خوب صورت لمحات اس طرح درہم برہم ہو جانے پر دل کا بچھ جانا ایک فطری ہی بات تھی۔ اس نے کبھی سے پارلر جاتے ہوئے جو لباس پہنا تھا وہی اب دوبارہ پہن لیا اور حسرت بھری نظروں سے اس سرخ غری لباس کو دیکھتے گئی جو اس نے بہ طور خاص بڑے اربانوں سے اس موقع کے لیے خریدا تھا۔ آفتاب نے اسے اس لباس میں دیکھ کر خوب خوب سراہا تھا لیکن اتنا سراہے جانے کے بعد بھی وہ میر نہیں ہوئی تھی۔ جو لے کر گئے تھے وہ بے شک اہم لگتے تھے لیکن وقت نے،

خواہش سے بہت کم یہ اموال حالت اس کی جھولی میں ڈالے تھے۔ اسے اپنا آپ ایک ایسے سے خوار کی طرح لگ رہا تھا جسے پوری طرح سے مٹوا دینے سے قبل ہی سے خانے سے رخصت کا حکم سنایا گیا ہو۔

”تیار ہو کھڑو؟“ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور افضل کی بیوی مہتاب اندر داخل ہوئی۔

”جی، بس یہ چیزیں سنبھلی ہیں۔“ اس نے بیڈ پر بکھرے عروسی لباس اور زیورات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ سب سیٹ لوں گی۔ تم ایسا کرو کہ اچھی طرح منہ دھو لو۔ افضل گاڑی نکال رہے ہیں۔ وہ اور آفتاب دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے۔“ گزرتے لمحات کا فسانہ سناتے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مہتاب نے اسے مشورہ دیا اور خود اس کی چیزیں سینے لگی۔ کھڑے اس کی ہدایت پر قفل کیا اور ملحقہ قفل خانے میں جا کر اچھی طرح منہ دھو آئی۔ منہ دھو لینے کے باوجود اس کے وجود پر کئی ایسی نشانیاں بھی مہتاب میں جو اس کے ذہن ہونے کی گواہی اے رہی تھیں۔ مہندی کے نقش و نگار سے سجے ہاتھ پر بالوں کا خوب صورت سا اسٹائل جو تھوڑا سا ریگڑا ضرور تھا لیکن بہر حال قائم تھا۔ بالوں میں کہیں کہیں چمکیں افشاد اور سب سے بڑھ کر اس کے وجود کی انہیں خوشبو کی پیمیں۔ ہر ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ وہ ایک دلہنا ہے۔ مہتاب نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ بے رحمانہ اور غیر منصفانہ رویوں کی شکاوت اس کی لڑکی نے اپنے ہا اختیار و عالی مرتبت باپ سے چھپ کر اپنے لیے خوشیوں کا ایک چور دروازہ کھولا تھا لیکن اسے خوشی کے بہت ہی مختصر لمحات میسر آ سکے تھے۔

”بھائی امیری یہ چیزیں آپ کے پاس امانت رہیں گی۔ انہیں بہت سنبھال کر رکھیے گا کیونکہ صرف باوی اشیا ہیں۔ ان میں میرے جذبات اور زندگی کے اصول کھوں کی مہک بھی ایسی ہوئی ہے۔“ چادر کو ماتھے تک لاکر اوڑھتے ہوئے اس نے رندگی ہوئی آواز میں مہتاب سے درخواست کی۔

”تم فکر مت کرو۔ تمہاری ہر شے بالکل محفوظ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر عطا کرے اور تمہیں دوبارہ ان چیزوں کو ہر نصیب ہو۔“ مہتاب نے بڑی بہنوں کے انداز میں اسے لگے دکھاتے ہوئے دعا دی تو اس کی آنکھوں سے اور بھی تیزی سے آنسو بہنے لگے۔ بس یہی تو تھی اسی کی زندگی میں۔ اس کے خون کے رشتے اسے زندگی کی ہر آسائش فراہم کرنے کو تیار رہے تھے لیکن ان کے لبوں پر اس کے لیے ایسی

خوش کن دھانک کبھی نہیں ہوتی تھیں۔

”چلو اب چلتے ہیں۔ افضل اور آفتاب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ مہتاب جس کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو اٹھ آئے تھے، خود کو سنبھالتے ہوئے بولی اور اسے خود سے الگ کر کے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے رخساروں پر بہتے آنسو صاف کیے۔ کھڑے بھی وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خود کو تیزی سے سنبھال لیا اور چادر کے پلو کو مہتاب کے انداز میں چہرے پر لپٹنے کے بعد مہتاب کے ساتھ باہر نکل گئی۔ افضل اور آفتاب باہر منتظر کھڑے تھے۔

”اپنا خیال رکھیے گا۔“ مہتاب نے ان کے نکلنے سے قبل یہ یوں والی مخصوص فکر مندی کے ساتھ افضل کو تاکید کی۔

”میں تو کہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ ہی مت چلو۔ کھڑو کے ساتھ میرا کیلے ہی جانا مناسب ہے۔ وہاں کچھ بھی حالات ہو سکتے ہیں۔“ مہتاب کی فکر مندی دیکھتے ہوئے آفتاب نے افضل سے کہا۔

”اس بات پر اہم پہلے ہی بہت بحث کر چکے ہیں اور میں جنہیں واضح طور پر ہٹا چکا ہوں کہ میں ان حالات میں تمہیں ہرگز بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“ افضل نے حتیٰ لچھے میں کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔ آفتاب بے بس سا ہو کر مہتاب کو دیکھنے لگا۔

”افضل ٹھیک کہہ رہے ہیں آفتاب! تم ہمیں بھانپوں کی طرح عزیز ہو۔ ہم نہیں کسی صورت بھی تمہیں چھوڑ سکتے۔ اگر بچوں کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں بھی اس وقت تمہارے ساتھ ہی جاتی۔“ وہ جو یہ خیال کر رہا تھا کہ مہتاب، افضل کے اس کے ساتھ جانے پر مستحسن ہے، اس کی بات سن کر جبراً انراہ گیا۔ گوری جونی، لمبی چوڑی مہتاب نے اپنے الفاظ سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ چہاڑوں میں آیا وہ ایک قباغی خاندان کا خون ہے۔ ایک ایسے خاندان کا جہاں مردوں کی طرح عورتوں کے حوصلے بھی بہت بلند اور مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ مہتاب پر ایک متکبرانہ نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔ کھڑو بھی اسی کے ساتھ تھی۔

”آپ نے دوبارہ کوئی فون کر کے صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کی یا نہیں؟“ گاڑی کو روڈ پر لاتے ہوئے افضل نے کھڑو سے پوچھا تو اس نے غمی میں سر ہلا دیا۔

”اگر آپ وہاں فون کر سکتیں تو ممکن تھا کہ آپ کو اپنی ملازمہ۔۔۔ سے صحیح صورت حال معلوم ہو جاتی۔“

”مجھے اڑھا کر فون رانی کے بجائے بھائی اشرف سنیں گے اس لیے میں ذکر فون نہیں کر سکی۔“ کھڑو نے اپنے کوئی فون نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

”فون کرنے کے مقابلے میں اس طرح براہ راست کھڑو واپس پہنچ جانا زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ نہیں معلوم کہ وہاں کیا صورت حال درپیش ہے۔ فون پر بات کر لینے کی صورت میں کچھ تو واضح ہو جائے گا۔“ افضل نے اسے سمجھایا۔

”صورت حال جو بھی ہو، مجھے بہر حال میں کوئی واپس پہنچنا ہے۔ میرا نہ پچھڑا رانی کی زندگی کو خطرے میں ڈال دے گا۔ میں بدترین حالات میں بھی اسے کسی زیادتی کا نشانہ بننے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ لوگوں سے میری درخواست ہے کہ مجھے کوئی کے قریب اتار کر خود واپس چلے جائے گا۔ آگے جو کچھ پیش آئے گا اس سے میں خود دست لوں گی۔“

کھڑو کا کہنا اس بار بہت مضبوط تھا لیکن آفتاب کو اس کی بات نے تکلیف پہنچائی کہ کھڑو کا یہ کہنا کہ آپ لوگ واپس چلے جائے گا میں خود دست لوں گی۔ اس کو اپنی محبت کی توہین کرنا لگا تھا۔ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کھڑو کی فطرت میں کھرا چھوڑ کر خود واپس آ جاتا؟ اس نے پلٹ کر مہتاب کی طرف دیکھی مگر ایک ہلکے کناں نظر ڈالی اور کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے قبل ہی کھڑو کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے تیزی سے موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ حسب توقع کوئی کا فون نمبری وہاں جھلکا رہا تھا۔ اس نے کال کر میسر کر لی لیکن زبان سے کچھ نہ بولی کہ مہتاب دوسری طرف اشرف شاہ ہی موجود نہ ہو۔

”لی بی! میں رانی بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے رانی نے کال کر میسر کیے جانے کو کھڑو کی کر کے تکی آواز میں بتایا۔ اس کی آواز اتنی دہشت انگیز تھی کہ سر کوئی سے نہ بارہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”وہاں کیا حال ہے رانی! تجھے کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟“ رانی کی آواز سن کر کھڑو نے بے جا بی سے پوچھا۔ افضل اور آفتاب کے کان بھی رانی کا نام سن کر کھڑے ہوئے۔

”زیادہ مشکل نہیں ہوئی لی بی! تاہم رانی بی اور اشرف شاہ بھی نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ پر موبائل میں سے کیا کروں گی جی؟ آجھی تو میں نے انہیں دودھ میں چھوڑ دی تھی تھوڑی دوا ملا کر دے دی تھی، وہ لوگ دودھ پر کر سگے ہیں۔ آپ بتائیں آپ کب واپس آئیں گی؟“ رانی کی آواز سے خوف جھٹک رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس حقیقت سے ابھی طرح واقف تھی کہ اگر کھڑو کے کوئی پر موجود نہ ہوئے کی بات ممکن تھی تو سب سے پہلے ہی کی شامت آئے گی۔

”فون نہ کر رانی! میں کوئی واپس آ رہی ہوں۔ راستے

میں ہی ہوں۔“ صورت حال قابو میں ہے، یہ جان کر کھڑو نے ایک منگن بھرا سا سنا لیا اور رانی کو بھی تسلی دی۔

”ٹھیک ہے لی بی! میں آپ کا انتظار کرتی ہوں۔ آپ دروازے کی گھنٹی مت بجاتا۔ میں چھوٹے گیت کی کنڈی اندر سے کھول دوں گی اور خود قریب ہی رہوں گی۔ آپ بچے سے اندر آ جانا۔“ رانی نے جلدی سے آگے کا منصوبہ ترتیب دیا جس سے اتفاق کرتے ہوئے اس نے کال منقطع کر دی اور محسوس سے پیچھے آفتاب اور افضل کو تفصیلات بتاتے لگی۔

☆ ☆ ☆

”کھڑو کہاں ہے رانی؟“ اسے کچھ کہہ بھی آ کر ہشاش کر لے۔ رانی اور جابرہ میز پر ناشتے کے لوازمات سجا رہی تھیں جب تاہم رانی کو یہ علم دیا۔

”بی بی نے تو سویرے جلدی ناشتا کر لیا تھا۔“ رانی نے اطلاع دی مگر مزید وضاحت دیتے ہوئے بولی۔ ”اصل میں لی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے میں نے ان کے کمرے میں ہی ناشتا پہنچا دیا تھا۔“

”چل ٹھیک ہے۔ ویسے بھی رات جانے کیوں اتنی گہری نیند آئی کہ سویرے جلدی آگے نہیں کھل سکی۔ اب بھی طبیعت مندی مندی کی ہے۔ اچھا ہے تو نے کھڑو کو ناشتا کروا دیا۔ بے جا دی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کب تک ہمارا انتظار کرتی۔“ کھڑو کے کمرے سے باہر نہ آنے پر تاہم رانی دل میں بے حد پرہم جی لیکن اشرف کے سامنے اظہار کرنے سے گریز کیا اور فی الحال مکان کی حمایت کرنا ہی مناسب سمجھا۔ دوسری طرف رانی اس سے نظر پر چارہنی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تاہم اور اشرف کی صبح جلدی آنکھ کیوں نہیں مل سکی۔ خود اسی نے تو اس انتظار کے پیش نظر کہ انہیں کھڑو کرات کے آخری پہر کوئی واپس آنا کسی کے علم میں نہ آ جائے ان کی نیند کے گہرے ہونے کا بندوبست کیا تھا۔ کوئی پر موجود دوسرے ملازمین کو بھی وہ کسی نہ کسی طرح قابو کر چکی تھی۔ ویسے بھی وہ اس معاملے میں زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ کھڑو کے بارے میں کوئی ایسی ویسی اطلاع سن کر مالکان اس کا جو مشر کرتے سو کرتے لیکن اس سے بھی پہلے اطلاع دینے والا زیر خطاب آ جاہلو انہوں نے خاموش رہتے ہیں ہی حاکمیت تھی۔ ناشتے کا مرحلہ خاموشی سے تمام ہوا۔ تاہم اور اشرف شاہ، کھڑو کے خود کو نظر انداز کرنے پر کبیدہ خاطر تھے تو رانی اور جابرہ اندر دینی خوف کے زچہ اثر تھیں۔ ایسے بھی وہ خاندان میں تھیں جنہیں مالکان کے خوف سے مخاطب کے بغیر کم ہی زبان کھولنے کی جرأت ہو پاتی تھی۔ ناشتے کی میز پر اگر کوئی

”ہاں کل نہیں جانتا۔ اگر کو تو اکرم خان کو بلا کر اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔“ ماہ بانو نے اسے مزید پھیرا۔

”مجھ سے کیا پوچھنا ہے؟“ اچانک ہی دروازے کی طرف سے اکرم خان کی آواز سنائی دی۔

”ماہ بانو! میں پوچھ رہا تھا کہ کب تک وہاں جائے گا؟“ ماہ بانو سے الگ ہوتے ہوئے گل مینا نے جلعری سے بات بنائی۔ اس کے اس طرح بات بولنے پر ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تاہم اس نے تروید کی کوشش نہیں کی۔

”میں یہی جانتے آیا تھا کہ جیپ آگیا ہے۔ اگر تیاری پورا ہے تو چل کر جیپ میں بیٹھ جاؤ۔“ اکرم خان نے جواب دیا۔

”تیاری تو ہو گئی ہے بھائی اکرم! آخر میرا یہ بیک جیپ میں رکھو، میں سب گھر والوں سے مل کر ابھی آتی ہوں۔“ ماہ بانو نے جواب دیا تو اکرم خان گل مینا پر ایک بھرپور نظر ڈال کر حسب ہدایت بیک لے کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ دونوں بھی کمرے سے باہر آئیں۔

اکرم خان کی ماں نے اپنے عزیزوں سے رخصت لے رہی تھی۔ ماہ بانو بھی ان سب سے ملنے گئی پھر وہ اور اکرم خان کی ماں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اکرم خان ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ان کا مختصر تھا۔ وہ دونوں پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئیں۔ جیسی جیسے میں ان کے سامان کے علاوہ دیگر سامان بھی رکھا تھا جس کا حلقہ یقیناً کسی نہ کسی اگلی ڈسٹن ٹیم سے ہی ہوگا۔ ان کے بیٹھے ہی جیپ اشارت ہو کر ایک ہینکے سے آگے بڑھی۔ ماہ بانو نے پچھے مڑ کر دروازے کے باہر آکھڑے ہونے والے اپنے

میزبانوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ سوائے گل مینا کے تقریباً سب ہی لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔ گل مینا بھی لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی جیپ کی طرف ہی دیکھ رہی تھی لیکن اس کی توجہ کمزور اکرم خان تھا جس کو رخصت کرتے ہوئے جدائی کے پہلے ہی اسے میں گل مینا کی آنکھوں میں انتظار کے دھپ جل گئے تھے۔

ماہ بانو کو اکرم خان پر رشک آیا۔ وہ کتنا خوش قسمت انسان تھا کہ کسی کی آنکھوں میں اس کے لیے انتظار کے دھپ جلتے تھے۔ دوسری طرف وہ خود بھی جیوس کے ساتھ

اس جیپ میں سفر کرنے کے باوجود اس جیسی قسمت نہیں رکھتی تھی۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ اس کے لیے کہیں کسی کی آنکھوں میں انتظار کے دھپ جلتے ہوں گے۔ وہ وہ و چراں

تعب بھی جسے وقت کے طوفانوں نے اپنے پیاروں سے جدا کر کے اس اپنی علاقے میں پہنچا دیا تھا۔ اسے کچھ نہیں سمجھی کہ حالات کے اس گرداب سے کب نکلے گی۔ اور گل بھی

سکے یا نہیں؟

لامعنی خیالات اور اداسیوں میں گھرے ہونے کے باعث اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ لوگ کب ہوشے سے باہر نکل آئے۔ اس کے علاوہ جیپ میں موجود باقی تین آنکھوں بھی بالکل خاموش تھیں۔ اس کے ساتھ بیٹھی اکرم خان کی ماں اور کمرہ رہی تھی۔ خود اکرم خان بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا لیکن

ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ وہ سوتے کے بجائے اپنی بند آنکھوں کے پیچھے موجود گل مینا کے تصور میں گم ہے۔ جیپ ڈرائیور شاید مزاجاً کم گو آدمی تھا یا پھر اپنے ہم سفر کی خاموشی میں

مکمل ہونے کو مایوس نہ جانتے ہوئے خاموشی سے ڈرائیوگ کر رہا تھا۔ وہ اسے ذہن میں موجود مایوس کن سوچوں کو چھٹکتی ہوئی بیرونی مناظر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیپ گردا گرد آتی ہوئی

بڑی بڑی چٹانوں والے ایک نہایت خشک صحرائی علاقے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اس علاقے میں پتھروں سے تعمیر کردہ چند گھر موجود تھے۔ ماہ بانو کو یاد آیا، ہوشے جاتے ہوئے اکرم خان نے اس علاقے کو کینڈا اس تھک کے نام سے متعارف کروایا تھا۔ وہی کینڈا اس تھک جہاں گاندے کے سیلاب ڈوگان نے اسے لیے نئے گھر بنائے تھے۔

چٹانوں کو توڑ توڑ کر بنائے گئے ان گھروں کے کین اس علاقے میں باقی جیسی بنیادی ضرورت سے محروم تھے مگر وہ یہاں رہنے پر مجبور تھے۔

ان لوگوں کے حالات پر۔۔۔ دیکھ محسوس کرتے ہوئے وہ اتنی بری طرح ان کے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں کھڑی جیپ کب حرکت میں آئی اور دھناتی ہوئی ان کے سروں پر آچھلی۔ اس جیپ کے اچانک سامنے آ جانے کے باعث ان کی جیپ کے ڈرائیور نے ایمر بنائی پر یک لکھائے جس کے نتیجے میں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لوگ اس جھٹکے سے سنبھلے تو چار عدد مسلح افراد ان کی جیپ کو گھیر چکے تھے۔

”کون لوگ سے تم؟“ اکرم خان ذرا سا سنبھلا تو اپنی جانب کھڑے ہوئے مسلح قلاب پوش سے بلند آواز میں پوچھا اور جیپ سے اترنے کی کوشش کی۔ قلاب پوش نے اپنی رائفل کی نال اس کی گردن پر رکھتے ہوئے اسے اس کوشش سے باز رکھا۔

اکرم خان کو برا تعقل کے زور پر قابو میں رکھنے والے قلاب پوش کے علاوہ باقی تینوں قلاب پوشوں نے جیپ کو ایک ایک زوردار سنبھال رکھا تھا لیکن ابھی تک ان تینوں کو کسی حرکت کی ضرورت نہیں آئی تھی۔ جیپ ڈرائیور نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ انہیں گھبرانے والوں نے جس کسی

320

مقدمہ سے انہیں روکا ہے، اس کا تعلق بہر حال اس کی ذات سے نہیں ہے۔ وہ برسوں سے اس علاقے میں بیپ چلا رہا تھا اور بھی ایسی کسی صورت حال سے وہ چار نہیں ہوا تھا۔ اب جو صورت پیش آئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ جلد آوروں کا لشکر اس کے بجائے اس کی بیپ میں سوار دیگر افراد ہیں۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کیے رکھنے میں ہی عافیت جانی تھی یا پھر شاید وہ صورت حال کے واضح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ بہر حال، جو بھی بات تھی، اس کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ اکرم خان کی ماں بے حد گھبرا جانے کے باعث کچھ کہنے یا کرنے کے لائق نہیں رہی تھی جبکہ ماہ بانو دھک دھک کرتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ کیا فکری گتوں کی طرح اس کے تعاقب میں لگے ہوئے چودھری کے کارندوں نے اس جگہ بھی اس کی بو پائی ہے۔ اور اب اسے وہ بوجھ کراہتے مالک کے قدموں میں پہنچانے والے ہیں؟

”لوگ کو بچے اجاڑو۔“ اکرم خان کی گردن سے روافل کی نال لگائے کھڑے شخص نے حکم صادر کیا تو ذہن میں سرسراتے اس خدشے کی تصدیق ہو گئی کہ یوں اس ویرانے میں انہیں گھیرنے والے ماہ بانو کے ہی دشمن ہیں جو ایک بار پھر اس کی زندگی کا سکون درہم برہم کر دینے کے درپے ہیں۔

”بیچہ اتر دلاؤ؟“ حکم ملنے ہی ماہ بانو والی جانب کھڑا نقاب پوش اس کے شانے سے مراد روافل کی چکی دوتے ہوئے غرایا اور پھر اپنے کپے جیسے کارڈنگی ظاہر ہونے سے مکمل خود ہی ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے بیپ سے باہر کھینچا۔

”کیسا بد تیزی ہے؟ تم نے ہاتھ کیسے لگا دی گئی؟“ اپنی گردن سے لگی روافل کی نال کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اکرم خان بھڑکا۔ عورت کا احترام یوں بھی اس کی گتھی میں پڑا تھا اور ماہ بانو تو بھی بھی اس کی مہمان .. جسے پناہ کے لیے ہی اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کے ساتھ کسی بدسلوکی پر اس کا بھڑکنا لازم تھا۔ ماہ بانو جو نقاب پوش کے خود کو پیچھے کی وجہ سے بیپ سے باہر پھینچ چکی تھی، اکرم خان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا چہرہ شدید غصے کے باعث شہما رہا تھا اور آنکھوں میں سرنی اتر آئی تھی۔ اس حالت میں وہ مشاہیرم خان سے بہت زیادہ مشابہ لگ رہا تھا۔ سنگے بھائی ہونے کی وجہ سے یوں بھی ان کی شکلوں میں تھوڑی سی مشابہت تھی اور اب غصے کی کیفیت میں ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ پرجوش و مہم جو مشاہیرم خان سے مشابہ لگ رہا تھا۔

”آرام سے بیٹھو۔ زیادہ جوش لگایا تو اپنی جان سے جاؤ گے۔“ اکرم خان کی گردن سے روافل کی نال لگا کر

کھڑے نقاب پوش نے نال سے ہی اس کے جڑے پر زور دار ضرب لگائی لیکن اب اکرم خان بری طرح بھڑک چکا تھا۔ اس نے جڑے کی پوت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے روافل کی نال کو پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ روافل برادر اس جھگڑے سے پیچھے کی طرف لڑھکا۔ اکرم خان دندنا ہوا بیپ سے پیچھے اتر آیا اور پیچھے گرتے ہوئے شخص کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ عالم جوش میں تھا اور اس حقیقت کو فراموش کر چکا تھا کہ اس کے مقابل صرف یہی ایک شخص نہیں ہے جسے زیر کر کے وہ حالات پر قابو پا سکتا ہے۔ وہاں تین سائے افراد اور اب بھی موجود تھے۔ اکرم خان کی زور آور دوی دیکھتے ہوئے اس کی ماں کو کور کے کھڑے نقاب پوش نے اپنی روافل سیدھی کی اور پھر دھاک میں کی زور دار آواز کے ساتھ اکرم خان لہراتا ہوا پیچھے آگرا اور تڑپنے لگا۔ اس کے پہلو سے لگتا خون بہت تیزی سے اس کے کپڑوں کو مکمل رنگ کر رہا تھا۔ اس ساری کارروائی کے دوران خوف زدہ ہی منہ کھولے نہیں اس کی ماں نے یہ منظر دیکھ کر ایک دل دور چیخ ماری اور بیپ سے اتر کر اس کی طرف دوڑی۔ نقاب پوشوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ماہ بانو اور بیپ کا ڈراؤ بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ذرا سیورے شروع سے ہی ایسا طرز عمل اختیار کیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی جھگڑے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اب جو کچھ ہاں ہوا تھا، اس کے بعد تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا سی جنبش بھی کرے۔ کہ ماہ بانو کی مشکل میں پڑ جائے۔ ماہ بانو خود کو بیپ سے اتارنے والے نقاب پوش کی گرفت میں جکڑی شاگ کے سے عالم میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اکرم خان جس کے گھر میں وہ پناہ گزین تھی۔ جسے دولہا بنا کر مکمل پینا کے دروازے تک لے جانے کا وہ اس سے وعدہ کر کے آئی تھی۔ جسے اس کی ماں صرف اس لیے بلند و بالا پہاڑوں کا سفر نہیں کرنے دیتی تھی کہ انہیں پہاڑ اس کے ایک اور پیارے کو نہ لگ لے۔ اسے ہی خون میں نہا ہوا خشک زمین پر پڑا تھا۔ پیاسی زمین اس کے جوان خون سے سیراب ہو رہی تھی جبکہ غم سے مذہم حال کراچی ماں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس طرح اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ رکھا تھا جیسے فریضہ اہل سے اسے چھپا لینا چاہتی ہو۔ ماہ بانو پچھلی ہوئی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ آج پھر ایک انسانی جان اس پر قربان ہوئی تھی۔ آج پھر کوئی اسے بچانے کے لیے اپنے خون میں نہا گیا تھا۔ آج پھر اس کے گرداب میں پیسے وجود کو گرداب سے نکالنے کی کوشش کرنے والا خود اس گرداب کا شکار ہو گیا

تھا۔

”لوگ کو بیپ میں نہاؤ۔“ اکرم خان کے دھکے سے بچنے لگنے والا نقاب پوش جو یقیناً ان حملہ آوروں کا لیڈر تھا، کب کا سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے وہاں پچاس مت پر ایک سرسری نظر ڈالی اور ماہ بانو کے عیب میں اسے جکڑے کھڑے شخص کو حکم دیا۔ وہ شخص حکم کی تعمیل میں اسے کھینچتا ہوا اپنی بیپ کی طرف لے گیا۔ ماہ بانو کے صدر سے اسے ساکت ہو جانے والے وجود میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنی ناگوں کو حرکت دے سکتی۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ اپنے ساتھ کئے جانے والے سلوک پر مزاحمت کر پائی۔ وہ کچھ کی کچی گڑیا کی طرح خود کو کھینچنے والے کے ساتھ ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اسے بیپ میں ڈالنے کے بعد اس کی ناک پر گھور و قام میں ڈوبا ہوا درمال رکھا، تب ہی اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے بے ہوشی کے اندھیروں میں اتر گئی۔ ان اندھیروں میں سفر کرنے سے اسے علم نہیں تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ جس بیپ میں سفر کر رہی تھی، اس کے چاروں جزیر روافل کی گولیوں سے ناکارہ کر دیے گئے ہیں اور اب وہ اپنے دوستوں کے بجائے دشمنوں کی ہم رکابی میں ایک انجان دانہ میں لے جانی جا رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

”رانی اؤرا ایک کپ گر ماگر چائے تو لے آئے۔“ حیلے چہرے کو قویہ ..۔۔۔ سے چستیا کر صاف کرتے ہوئے کشور نے صبر دیدہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ رات کے آخری چور کوئی واہیں لوٹنے کے بعد ہائی کا وقت نہا دھو کر اپنا علیہ درست کرنے اور رانی سے مشاورت میں گزرا تھا۔ چور کی کوئی میں موجودگی اس کے لیے اتنی اعلیٰ کی کشیدگی کا باعث تھی کہ جو تھوڑا بہت وقت بچا، اس میں بھی بیٹھ نہیں آ سکی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اشرف شاہ جلدی میں تھا اس لیے تا جوروں زیادہ دیر وہاں رکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اس نے بے حد وقتی سکون محسوس کیا اور کئی تان کر سو گئی۔ رات بیکے اور اعلیٰ کشیدگی کے بعد آنے والی یہ تندرستی گہری تھی اور وہ کئی گھنٹوں بعد دوبارہ جاگ تھی۔ جانتے کے بعد اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اب بھی کچھ کچھ نیند کے خمار میں ڈوبے ذہن کو فراموش کرنے کے لیے چائے پینے کی قریض کی۔

”آپ کہیں تو کھانا لکھو ہوں گی؟“ آپ نے صبح بھی بہت قوی آواز نہا تھا۔ اب تو وہ پیر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ خالی پیٹ چائے پینے کے بجائے اگر پیلے کچھ کھا لیں تو اچھا ہوتا۔ ہر دم اس کی بھلائی کے لیے فکر مند رہنے

والی رانی نے مشورہ دیا تو وہ مسکرائی۔ واقعی صبح رانی کے بے حد اسرار کے باوجود وہ ایک کپ چائے کے ساتھ ایک سلاخ کے سوا کچھ نہیں کھا سکتی تھی۔ رات افضل کی بیوی مہتاب نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا تھا لیکن وہ بے حد اہتمام سے تیار کیا گیا کھانا جذبات کی شوریدہ مہری کے باعث اس کی اور آفتاب کے بہت زیادہ توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کروا سکا تھا۔ ان دونوں ہی نے بہت کم کھانا کھا یا تھا چنانچہ اصولاً اسے اس وقت پھوک لگتی چائے بھی اور لگ بھی رہی تھی۔ پھر بھی وہ رانی کو بل گئی۔

”ابھی تو تم چائے لے آؤ کھانے کا میں تمہیں بعد میں بتاتی ہوں۔“ وہ اپنا پرس کھول کر موہل تلاش کرنے لگی۔ کوئی میں داخل ہوتے وقت اس نے موہل آف کر دیا تھا جو اب تک بند ہی تھا۔ موہل کی اپنے پاس موجودگی کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ عموماً اسے بند ہی رکھتی تھی کہ مبادا اچانک کسی کی موجودگی میں گتھی پڑ جائے اور اس کا رخا غش ہو جائے۔ موہل پرس سے نکال کر آن کرنے کے بعد اس نے آفتاب کا ٹیبلٹ لپا۔ ٹیبلٹ میں ہی پرکال ریسیور کر لی گئی۔

”کہاں ہیں آپ؟ میں کب سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“ فوراً ہی دوسری طرف سے آفتاب کی خفا سی آواز سنائی دی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر چکی ہے۔ پہلے حالات کو اپنے کنٹرول میں لینے کے پلک میں اچھے ہونے کے باعث اسے خیال ہی نہیں آیا کہ آفتاب کو کال کر لے اور بعد میں ریپکس ہونے کے بعد اسے نیند نے دبوچ لیا۔ وہ بے چارہ رات سے اب تک یقیناً اس کی طرف سے کال کیے جانے کے انتظار میں بیٹھا قوار ہو رہا تھا۔

”سواری آفتاب! میں آپ کو کال بھی نہیں کر سکی۔ پہلے آپا کی موجودگی کی وجہ سے اتنی تیش تھی، بعد میں سو گئی۔ اچھی اچھی اچھی ہوں اور سب سے پہلے آپ کو فون کیا ہے۔“ اس نے نہایت شرمندگی کے عالم میں سچائی کا اعتراف کیا۔

”کیا کہنے چاہا آپ کی بے نیازی کے۔ شاید اللہ نے عورتوں کو دنیا میں بھیجا ہی اس لیے ہے کہ ہم بے چارے شریف مردوں کو غوار کر سکیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں نے آپ سے سواری کہا تو ہے۔ بس غلطی ہو گئی۔ اب کیا کان بکڑوں۔ تب معاف کریں گے؟“ اس نے فوراً ہزوا داکا بھڑا سنبھال لیا۔ اسی وقت رانی ٹرے میں چائے رکھے اندر داخل ہوئی اور اس کے اشارے پر ٹرے سے بیڈ کی ساکھ نیکل پر رکھ کر باہر نکل گئی۔ کشور نے ایک نظر میں ہی دیکھ

لیا کر خرے، چائے کی پیالی کے علاوہ اور بھی بہت سے لوازمات سے بھری ہوئی ہے۔ ان لوازمات میں ٹیکسٹ، شامی کباب اور سینڈو چڑھائیاں تھے۔

”کان بگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر کچھ بگڑنا ہی تو ہمارے پاس آکر ہمارا ہاتھ بگڑیں۔“ اس بار آفتاب کا لہجہ خاصا شوخ تھا۔

”اچھی فرمائش کی ہے۔ یہ تو پوچھا نہیں کہ یہاں کے حالات کیسے ہیں؟ ہم جیتے ہیں کہ مرتے ہیں... بس فوراً اپنے مطلب کی بات کہہ ڈالی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا اور نرے میں سے چائے کی پیالی اٹھا کر اس کا ایک گھونٹ بھرا۔

”ابھی ایسے بے خبر بھی نہیں ہیں۔ رات سے آپ کی گونگی کے باہر میرے بارے میں پھرا بھایا ہوا تھا۔ سب معلوم ہے کہ آپ کے بہن بہنوئی اپنے منہوت کے ساتھ جمع کئے جانے کو کھینچے منٹ پر روانہ ہوئے تھے۔ باقی کی اطلاعات کوغنی کے فون پر کالی کر کے ان خاتون سے حاصل کر لیں جن کا نام تو رانی ہے لیکن فرائض وہ آپ کی کنیز کے انجام دیتی ہیں۔ ویسے آپ کی کیا بات ہے۔ آپ چاہیں تو جگہ کے رانی راجا چاہیں اور اپنی خدمت پر مامور کر ڈالیں۔ وہ بے چاری تو خبر ہے ہی صرف نام کی رانی۔“ آفتاب آج اپنے مزاج کے برخلاف بہت زیادہ شوخی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

شاید ہر انسان کے اندر چائے وہ کتنا ہی سنجیدہ و بردبار ہو، ایک شوخ و خشک اور شریر سا گوشہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسی کسی کو ہی اس تک رسائی حاصل کرنے دیتے ہیں۔ کشور، آفتاب کے سید دل پر برا بھلا بھی اور اس پر حکومت کرتی تھی، اس سے بھلا وہ اپنی ذات کا کوئی گوشہ کیونکر پوشیدہ رکھتا؟ کشور بے ساختہ ہی اس کی باتوں پر ہنسی چلی گئی پھر بولی۔ ”کھساری ہیں نا... افغلوں سے بھینا آپ سے بڑھ کر بھلا کس کو آسکتا ہے؟“

”افغلوں کے کھلوٹوں سے بہت کھیل چکے اب تو میں آپ کی زلفوں سے کھینا چاہتے ہیں۔“ اسے واقعی افغلوں کا استعمال خوب آتا تھا۔ کشور کے منہ سے لفظ پکڑتے ہوئے اچھی مطلب کی بات کہہ گیا۔

”میں کوشش کرتی ہوں آفتاب آج پوچھیں تو میں بھی آپ کے پاس آتا چاہتی ہوں۔ بلکہ میں تو چاہتی ہی یہ ہوں کہ ہر دم، ہر لمحہ آپ کے پاس رہوں لیکن حالات آپ کے سامنے ہی ہیں۔ میری بہت زیادہ بے اختیار علیا میں آپ کے لیے بھی پریشانی کا موجب بن گئی ہے۔ رات میں نے حالات سنہال لیے تھے۔ ملازمین کو بھی کسی نہ کسی طرح خاموش

رکھنے میں کامیاب رہی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کب اپنی کاپاسوں بن جائے۔ ان ملازمین کو جل دے کر ہی مجھے آپ تک پہنچنا ہوگا۔“ کشور نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس کو حالات سے آگاہ کیا۔

”میں آپ کی عبوری کو بھی طرح بھگتا ہوں اور آپ کو بہت زیادہ مشکل میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس وقت یہ فرمائش اس لیے کی ہے کہ آج رات مجھے پیرا یاد آ رہا ہے... جانا ہے۔ دوبارہ چھٹی کے دن سے پہلے لاہور نہیں آسکوں گا۔ آپ جانتی ہیں کہ میرا یاد آ سکو میرے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے اور میں اس سے غیر حاضر رہ کر اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسی لیے چاہتا تھا کہ چائے سے پہلے آپ سے ملاقات کر لوں ورنہ ہم دونوں کو ہی گونگی رہے گی۔ جہاں تک میرا خیال ہے، دن کے وقت کوغنی سے نکلنے میں آپ کو بہت زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔“ ہوا آفتاب نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے جواب دیا۔

”نہیک ہے۔ میں ٹھوڑی دیر بعد فون کر کے آپ کو آگے کا پروگرام بتاتی ہوں۔ آپ مہتاب بھائی سے کہیں کہ کھانا تیار رکھیں۔ میں نے رات سے اب تک کچھ نہیں کھایا۔“ اس نے شعوری طور پر اپنے لہجے میں خوش گواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا۔“ چلیں، آپ آجائیں تو ساتھ مل کر ہی کھائیں گے۔“ آفتاب نے بھی جتنے بھینکے انداز میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ فون بند ہونے کے بعد کشور سوچ میں پڑ گئی۔ کوغنی سے باہر نکل کر کہیں جانے کے لیے ڈرائیور کو ساتھ لے جانا پڑتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایسی کون سی جگہ جائے جہاں چند گھنٹے گزارنے کا بہانہ بنا کر ڈرائیور کو واپس بھیجا جاسکے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک جگہ اس کے ذہن میں آئی لیکن اس دوران چالی میں منہ بچ جاتے والی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ چالی ٹرے میں واپس رکھ کر اس نے رانی کو کمرے میں بلایا۔ ”آپ نے تو کچھ نہیں کھایا یا لہ! چائے بھی آجی پھوڑ دی۔“ رانی نے اس سے شکوہ کیا۔

”کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر بعد میں برا حیرہ سرا کھانا کھانے والی ہوں۔ تم ڈرائیور اور غیر وزی والا سوٹ تو نکال دو جو میں دونوں پہنے پڑے کر لاتی تھی۔ اور ہاں، ڈرائیور سے بھی کہہ دینا کہ گاڑی تیار رکھے۔ ہم ٹھوڑی دیر میں سینٹرل لائبریری تک چلیں گے۔“ کشور نے احکامات جاری کیے جنہیں سن کر رانی کو انہاز ہو گیا کہ کشور ایک بار پھر آفتاب سے ملنے جانے والی ہے۔ وہ تہذیب کے عالم میں کھڑی

رہی۔ لیکن کو روک بھی نہیں سکتی تھی لیکن کل جو کچھ پیش آیا تھا، اس کے بعد فوری طور پر یہ دوسرا خطرہ مول لینا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

”اس آج کی بات سے رانی ابھر پڑے تھرتک میں کوغنی سے باہر قدم بھی نہیں لگانا لگی۔“ کشور نے اس کا تہذیب بھانپ کر فوری اسے تسلی دی تو وہ احکامات پر عمل کرنے کے لیے متحرک ہو گئی۔ چند منٹ کے وقفے کے بعد وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ لائبریری کی طرف جاری تھیں۔

”لائبریری پانچ بجے تک کھلی رہتی ہے۔ ہم اس وقت تک اندر ہی رہیں گے، تم چاہو تو واپس بیٹے جاؤ یا باہر ہی رہ کر رہو۔ میری طرف سے پانچ بجے تک تم آزاد ہو۔“ لائبریری کے سامنے اترنے سے قبل اس نے ڈرائیور سے کہا۔ اس بار سے ٹھٹک میں پڑنے سے بچانے کے لیے اس نے ایسا رویہ اختیار کیا تھا۔

”میں یہیں رک کر آپ لوگوں کا انتظار کروں گا کی بی ا!“ ڈرائیور نے اپنا فیصلہ سنایا جس پر کوغنی بھی ڈھل ٹھل کر گئی۔ ڈرائیور نے لائبریری کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ سیکورٹی کے نقطہ نظر سے چند مخصوص لوگوں کے علاوہ دیگر افراد گاڑی لائبریری کی عمارت کے اندر لے جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ وہ دونوں لائبریری کے احاطے میں پہنچیں تو افضل کی گاڑی کو بائیں کھڑے دیکھ کر کشور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آفتاب اور افضل دونوں پرنٹ میڈیا سے تعلق رکھتے تھے۔ افضل پتھلا، اور میں رہ کر اس میدان میں زیادہ سرگرم عمل تھا، اس لیے اس کے تعلقات بھی زیادہ تھے۔ اس کے تعلقات کا ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے آفتاب اس کی گاڑی کو لائبریری کے احاطے کے اندر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”تم جا کر پانچ بجے تک مرے سے اپنی پینڈی کتابیں پڑھو۔ ہم اپنی دیر میں زندگی کو بڑھ کر آتے ہیں۔“ رانی کو اشارے سے لائبریری کی مرکزی عمارت کا دروازہ دکھاتے ہوئے وہ خود گاڑی میں بیٹھ بیٹھے آفتاب کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اس کے قریب پہنچنے سے قبل ہی کار کا دروازہ کھول چکا تھا۔ ”کیا قسمت ہے افضل کی گاڑی اور اس کے گھر کی...“ جہاں آپ قدم نہ ڈھکی رہی ہیں۔“ اس کے اگلی سیٹ پر بیٹھنے ہی آفتاب نے سر دی آہ بھرے ہوئے کہا۔

”گاڑی اور گھر تو آپ کے دم سے ہم ہیں۔ آپ کی خاطر ہی تو ہم آئے ہیں۔“ اس نے دل ربا لہجے میں جواب دیا تو آفتاب مسکرا دیا اور گاڑی اشارت کر کے لائبریری سے باہر نکلی۔ لائبریری کے مین گیٹ سے باہر عام پبلک کے

لیے مختص پارکنگ ایریا میں گاڑی سے نکلے گاے گاے کشور کا ڈرائیور گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ابھی تو گاڑی تیزی سے گیٹ سے باہر نکل کر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہوئی ہے، اس میں اس کی مالک بھی سوار ہے۔ احتیاط کے پیش نظر کشور نے اپنے چہرے کو چادروں کے پلو کی دھڑ سے مزید چھپا لیا تھا۔

”آپ کے دوست اور ان کی ٹیم کتنا مشکل میرے بارے میں کیا گمان کرتے ہوں گے۔ اس طرح چوری چھپے نکاح کرنے اور ملنے ملانے والی لڑکیوں کو عموماً لوگ پسند نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں ایسی ہر لڑکی کو کرپٹ سمجھا جاتا ہے۔“ گاڑی ڈرا آگے ہوئی تو کشور نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اندیشے کو آفتاب سے شیئر کیا۔

”کل آپ کو ان دونوں کے رویے میں ایسی کوئی بات نظر آئی تھی جو آپ سے سب سوچ رہی ہیں؟“ آفتاب نے مل بھر کے لیے اس کے چہرے پر نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ ڈرائیور کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں لیکن شاید ایسا تو انہوں نے آپ سے دوستی کے احترام میں کیا ہو، دل میں تو وہ کچھ بھی سوچ سکتے ہیں۔“ وہ نرمی سے جواب دیا۔

”اس بات کی میں آپ کو گارنٹی دے سکتا ہوں کہ ان کے دلوں میں بھی آپ کے لیے احترام ہے۔ وہ دونوں پڑھے لکھے، سمجھ دار اور روشن خیال لوگ ہیں جو ہر معاملے کو ایک ہی منہ سے نہیں دیکھتے۔ کسی لڑکی کا اپنے گھر والوں سے چھپ کر نکاح کر لینا یقیناً کوئی پسندیدہ فعل نہیں لیکن جہاں بنیادی انسانی حقوق کا استحصال کیا جا رہا ہو، وہاں ایسے ہی رویے اور ڈھل ظاہر ہوتے ہیں۔ قانون و شریعت دونوں کی رو سے آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ اپنے دل کی رضامندی کے ساتھ کسی بھی شخص کو براہ شفیق حیات منتخب کر سکتی ہیں لیکن یہ حق تسلیم کرنا تو درجہ کی بات، آپ کے والدین نے تو اپنے خود ساختہ اور جاہلانہ رویوں کی پابندی کرتے ہوئے آپ کو ایک تارنل زندگی سے بھی دور کر رکھا تھا۔ جو لوگ اپنی ذہنی کمزوریوں کے ساتھ ایسی زیادتی کرتے ہیں وہ اللہ کی نظر میں بھی یقیناً مقبوع ہی ہیں۔ تو آپ یہ کیسے سوچ سکتی ہیں کہ ایک خلاء شخص کے ظلم کے خلاف احتجاج کرنے پر ہر دوست یا اس کی بیوی آپ کو برا سمجھ سکتے ہیں؟“

”میں یونہی ذہن میں خیال آسکتا تھا۔ اصل میں ہمارے ہاں عورت کی ضروریات و خواہشات کو سمجھنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں ڈرا جاتی ہوں۔“ آفتاب کا جواب سن کر کشور اداسی بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”مت ڈرا کر رہیں۔ ہمارے درمیان جو رشتہ ہے اس کا سب سے زیادہ احترام میرے دل میں ہے اور آپ کو اس میرے دل کی پروا ہونی چاہیے۔“ دائیں ہاتھ سے اسٹیرنگ وٹیل سنبالنے آفتاب نے اس کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی گرفت میں لیا اور دونوں کے قریب لے جا کر ہاتھ کی پشت پر ایک نرم سا بوسہ لیا۔ کشور کے چہرے پر اس کے اس عمل کے باعث سرخی کی دوڑ گئی۔

”ویسے میں آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں؟ یہ جو افضل اور مہتاب بھابی ہیں، ان کا کس بھی کچھ ہماری ہی طرح کا ہے اس لیے ان دونوں سے ایک فیصد بھی امید نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ مجھے یا آپ کو غلط سمجھ سکیں۔“ اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت ختم کیے بغیر آفتاب نے انکشاف کیا۔

”مطلب؟“

”مطلب کچھ یوں ہے کہ یہ جو ہماری مہتاب بھابی ہیں، ان کا تعلق ایک پٹھان قبیلے سے ہے۔ بھابی کے والد آکسفورڈ سے ڈگری یافتہ ایک خاصے روشن خیال سردار تھے لیکن یہ روشن خیالی بس اس حد تک تھی کہ انہوں نے بیٹی پر تعلیم کا دروازہ بند نہیں کیا۔ بھابی نے نہ صرف گریجویٹن کیا بلکہ ماسٹرز کے لیے بھی اپنے علاقے سے نکل کر اسلام آباد کی یونیورسٹی تک پہنچ گئیں مگر خاندانی رواج کے مطابق ان کی تعلیمی سہولتیں میں ہی ان کے چچا زاد سے کر دی گئی تھیں۔ چچا زاد ان سے عمر میں تین سال چھوٹے ہونے کے علاوہ تعلیمی میدان میں بھی بہت پیچھے تھا۔ اصل میں اس بالائے اور بڑے ہونے سردار زادے کو پڑھنے لکھنے سے روکی ہی نہیں تھی۔ ظاہر ہے، مہتاب بھابی جتنی پڑھی لکھی اور نازک احساسات رکھنے والی خاتون اپنے شخص کو پسند نہیں کر سکتی تھیں لیکن اپنے والد کے احترام میں اس رشتے سے انکار بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان حالات میں ان کی ملاقات افضل سے ہوئی۔ افضل اپنے ایک اسائنمنٹ کی تیاری کے سلسلے میں تباہی علاقوں کا دورہ کرتا پھر رہا تھا۔ مہتاب بھابی جوان دنوں پیچھون پر اپنے گھر آئی ہوئی تھیں، افضل کے لیے بہت سہل حال ثابت ہوئیں۔ وہیں دونوں کے دلوں میں پسندیدگی کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ لیکن بھابی نے ایسا کوئی موقع پیدا ہونے دیا کہ اس جذبے کا اظہار ہو سکتا۔ افضل بنا اظہار کیے ہی واپس آ گیا لیکن اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ بھابی اسلام آباد یونیورسٹی سے ماسٹرز کر رہی ہیں۔ اس نے ان سے رابطہ کیا مگر بھابی نے اپنی معنی اور روایات کے بارے میں بتاتے ہوئے انکار کر دیا۔ افضل اپنی تمام تر کوشش کے باوجود انہیں قائل نہیں کر سکا۔“

اور یوں تقریباً مال بھر کا عرصہ گزر گیا۔ بھابی استقامت سے فارغ ہو کر اپنے گھر واپس پہنچیں۔ ذاتی طور پر آدھ بھی نہیں کرکڑن سے شادی کر لیں گی لیکن جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ ان کا منکبتر اخلاقی ہے راہروی کا شکار ہے تو وہ برداشت نہیں کر سکیں۔ منکبتر صاحب کی اپنی ایک ملازمت کے ساتھ زیادتی کا کہیں ان کے سامنے ہی پیش آیا تھے سرداروں نے اپنے اثر رسوخ کے استعمال سے دبا دیا۔ لیکن ظاہر ہے بھابی پر تو چٹائی عیاں تھی۔ انہوں نے اپنے والد سے بات کی کہ بے شک ہماری زندگی ان کی کسی سے شادی نہ کی جائے لیکن وہ اس بدکردار شخص سے شادی نہیں کریں گی۔ پڑھے لکھے، روشن خیال والد صاحب اس سوچ پر ردائی سردار ثابت ہوئے جن کے مطابق مردوں کی ایسی غلطیاں قابل گرفت نہیں تھیں۔ بھابی نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے والد کو قائل نہیں کر سکیں گی۔ انہوں نے مکمل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی اور جب اپنا درخت معلوم کرنے اسلام آباد گئیں تو افضل سے رابطہ کر کے اس سے پوچھا کہ کیا تم فوری طور پر مجھ سے نکاح کر سکتے ہو؟ افضل صاحب، اندھا کیا چاہے دو آگے تھیں کہ صدیق فوراً راضی ہو گئے۔ دونوں کا خاموشی سے نکاح ہوا اور پھر دو لوگ اسلام آباد سے لاہور شفٹ ہو گئے۔ سرداروں میں سے کوئی گمان نہیں کر سکا تھا کہ سال بھر پہلے ان کے علاقے میں آنے والا اخباری رپورٹر ان کی لڑکی کو لے اڑا ہے۔ وہ انھیں بچے سے کام لیتے ہوئے اپنی لڑکی تلاش کرتے رہے۔ اب تو کافی سال گزر گئے ہیں لیکن مہتاب بھابی کو یقین ہے کہ آج بھی انہیں تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ اس خوف کی وجہ سے وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتی ہیں۔ لہذا بھی جن کو مکمل پردے میں۔“ آفتاب کے یہ ساری داستان سنانے کے دوران راستہ کھٹ بھی گیا اور کشور کو خبر نہیں ہو سکی۔ وہ تو اس وقت چوٹی جب گاڑی افضل کے دو منزلہ مکان کے سامنے رکھی اور آفتاب نے بارن دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ کل رات کی طرح اس وقت بھی مہتاب نے مسکراتے ہوئے گرم جوشی کے ساتھ ان دونوں کا استقبال کیا لیکن آج اس کے ساتھ افضل اور بچے موجود نہیں تھے۔

”افضل بھابی اور بچے گھر پر نہیں ہیں کیا؟“ کشور نے اپنا ہتھ کے گہرے احساس کے ساتھ اس سے گلے تلے ہوئے سوال کیا۔

”افضل اپنے دفتر گئے ہوئے ہیں اور بچے ابھی اسکول سے آئے نہیں ہیں۔ بس آئے ہی والے ہوں گے۔“ مہتاب کا جواب ابھی اس کے منہ میں ہی تھا کہ باہر سے بارن سنا دیا۔

”لو آگئے بچے بھی۔ نام لینے کے ساتھ ہی شیطان حاضر ہیں۔“ مہتاب متا بھری محبت کے ساتھ ہنسی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ پل بھر کے وقفے کے بعد ہی دونوں کول کوٹنے سے بچے کشور کے سامنے موجود تھے۔

”آپا۔ لیکن آئی ہے۔“ اسے دیکھ کر وہ دونوں خوش ہو گئے۔

”بارا تم لوگ انہیں چچی کہہ لیا کرو، لیکن تو یہ میری ہیں۔ خواہ مخواہ تمہارے لیکن کہنے سے مجھے جیسی ہونے لگی ہے۔“ آفتاب نے چھوٹے والے کو گود میں اٹھاتے ہوئے شوشہ چھوڑا۔

”ٹھیک ہے، ہم انہیں لیکن چچی کہیں گے۔“ بڑے آصف نے مدبرانہ انداز میں فیصلہ سنایا۔

”یعنی لیکن سے دوست پرادر بہر حال صابزادے نہیں ہوں گے۔“ آخر والا اس شخص کی ہیں۔“ آفتاب نے جس کر کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ باقی سب بھی اس کے پیچھے تھے۔ مہتاب نے مسکراتے ہوئے حیرت انگیز اشارے کر رکھا تھا۔ شیشے مسکراتے ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کشور کو زندگی میں پہلی بار ایک مکمل گھر لانے کا یہ ماحول میسر آیا تھا۔ وہ مستقل مہتاب کے آصف اور آصف نامی دونوں بیٹوں کے ساتھ کھاتی رہی۔ کھانے کے بعد بچوں کا موزہ نہ ہونے کے باوجود مہتاب نے انہیں آرام کے لیے ان کے کمرے میں بھیج دیا اور خود لیکن کی مصروفیت کا بہانہ کر کے منظر سے ہٹ گئی۔ مہتاب کی کچھ داری کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے وہ دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں کل رات انہوں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے اولین لحاظ منائے تھے۔ اس کمرے کا فساد آج بھی اسی طرح قائم تھا۔ اس فساد خیزی کے حصار میں گھرے وہ پھر ایک دوسرے کو چاک پستول سنانے لگے۔ کل اگر پہلی شب عروسی کی ہے تبایاں تھیں تو آج جدائی کی دھبیز پر کھڑے دو پیارے ستاروں کی الوداعی ملاقات کی ہے قراری آفتاب آج پیرا باد واپس چلا جاتا تو پختہ بھر بعد ہی آپا تا اور یہ طے نہیں تھا کہ جتنے بھر بعد وہ دوبارہ ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ محبت میں اندیشے اور خدشات یوں بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کا تو معاملہ ہی اسی تھا کہ جب ملتے تھے، چاہتے تھے کہ عمر بھر کا پیار اس ایک ملاقات میں ہی ایک دو سب پر لندیں۔ محبت کی اس دم دم سے سیراب ہو کر مقررہ وقت پر طے شدہ طریقہ کار کے مطابق جب کشور واپس کوٹھی پہنچی تو اس کے دل میں ایک ہی سوال تھا۔ خوشی میں ہیکے نے اتنی جلدی کیوں گزر جاتے ہیں؟

”تم نے چیک اپ کر لیا ہے؟“

”ییس سر!“ لیکن کی دوسری طرف موجود رہا کے سوال کا مستحیض نے مستعدی اور انحصار کے ساتھ جواب دیا۔

”گڈا پھر کب تک تم لوگ منظر سے ہٹ جاؤ گے؟ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اور تمہاری نیم کے انڈر کر اوٹڈ ہونے سے پہلے کوئی کارروائی ہو۔ رات تم لوگوں کی بوسہ لگتا پھر رہا ہے۔ اس کے مانتوں میں سے بھی ایک آدھ لازماً صورت حال سے واقف ہوگا۔ ہماری کارروائی کے جواب میں ایسا کوئی شخص ایکٹو ہو کر تم تک نہ پہنچے، اس لیے احتیاط ضروری ہے۔“

”ڈونٹ وری سر! آپ کو جو ایکشن لینا ہے لیں۔ ہم لوگ بالکل ٹھیک ہیں۔ اور میلا اور گیتا اپنی ماں کے ساتھ پہلے ہی ناردرن ایریا کی طرف کھل چکی ہیں اور میں بھی آج لکھا بدلتے والی ہوں۔“ وہ مایا کی تشویش کے جواب میں اس نے پرسکون اور بخند رویہ اختیار کیا۔

”اوکے! مجھے بس تمہاری طرف سے ہی کریں سٹیل چاہیے تھا۔ میرا گلنگ سیکشن ایکشن کے لیے بالکل تیار ہے۔ رات کی تمام ایکٹیوٹیز ہماری نظروں میں ہیں۔ میں صرف تم لوگوں کی طرف سے خاموش تھا۔ پہلے ہی ہمارے چھ اہم ورکرز مارے جا چکے ہیں اس لیے میں کوئی دمک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اب تم نے اطمینان دلادیا ہے تو بس سمجھو کام ہو گیا۔ بہت جلد ہمیں خود بھی نیوز سننے کو مل جائے گی۔“

”ہیٹ آف لک سر!“ اور مایا کی بات سن کر مستحیض نے اس کے ارادوں کے لیے اپنی ٹیک خواہشات کا اظہار کیا۔ درحقیقت اس خواہش میں ٹیک یعنی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بس اقتدار و اختیار کی وہ بوسہ تھی جو دوسروں کو بے امنی اور خوف میں مبتلا کر کے ہی ممکن پائی تھی۔

”ہیٹس!“ وہ مانے سپاٹ سے لہجے میں مستحیض سے کہتے ہوئے کال منقطع کر دی۔ اس کے فون بند کرتے ہی مستحیض نے بھی ریسیور کر نیل پر ڈال دیا اور میز پر رکھا اپنا چند بیگ ہاتھ میں لیتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ میز پر اب علی فون سپاٹ کے علاوہ کوئی شے موجود نہیں تھی بلکہ چارے دفتر میں فریج کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنا تمام ضروری اور غیر ضروری سامان بہت خاموشی سے یہاں سے ہٹا چکے تھے۔ دفتر کی بہت باریک بینی کے ساتھ سناٹی بھی کر دی گئی تھی کہ اگر کوئی کمون لگا تا وہاں تک پہنچ بھی جائے تو اسے کوئی کلیو نہ مل سکے۔ خصوصاً فکر پر نہیں کے معاملے میں انہوں نے بے

مدا احتیاط برتی تھی۔ سٹھیا تو اس معاملے میں اتنی محتاط تھی کہ
پہر وقت ہاتھوں کے لیے باریک دستاں کا استعمال کرتی
تھی۔ لباس کی بیچنگ سے چار کے جانے والے پہرستانے
کسی کو شک میں مبتلا کرنے کے بجائے اس کی شخصیت کو دلکش
تاثر دیتے تھے۔ عمر کی سنیری سال گزارنے کے بعد ادھر
عمر کی ویل پر قدم رکھ چنے والی سٹھیا کی شخصیت میں ایسا
وقار تھا جو لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے پختہ ہونے کے
جذبات ابھارتا تھا۔ اس تاثر کو قائم رکھنے میں اس کے لباس
اور رنگ رکھا ہوا دخل تھا۔ اس وقت بھی اس نے فائن کلر کا
ایک خوب صورت لائٹ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ پر
گولڈن کلر کی نہایت نازک سی نین کرکڑی ہوئی تھی۔ لباس کی
مناسبت سے اس نے فائن کلر کے ہی گولڈن پیچ والے خوب
صورت دستاں پہن رکھے تھے۔ کانوں میں موجود سونے
کے پھولے پھولے ٹاپس اور گلے میں بڑی نازک سی چین
بھی اس کے لباس سے ہم آہنگ تھی۔ اپنی شخصیت کے اس
گرہن سے واقف سٹھیا نے تلے قدموں سے چلتی ہوئی دفتر
سے باہر نکلے اور بیرونی دروازہ لاک کر کے بیڑیوں کی طرف
بڑھ گئی۔ جس ثارت میں اس کا دفتر موجود تھا وہ علاقے میں
موجود دیگر کمرشل بلڈنگز کی طرح کچھ ایسے طرز پر تعمیر کی گئی تھی
کہ دن کے وقت بھی وہاں اصحا خاصا انداز چلا رہتا تھا اور
مصنوی روشنیوں کے بغیر گزارہ ممکن نہیں تھا۔ آج بیڑیوں کو
روشن رکھنے والے پبلک کی چلائی لائن میں شاید کوئی گز ہو
گئی تھی جس کی وجہ سے بیڑیاں تار یک پڑی تھیں۔ اس
تاریخ نے بیڑیاں ملے کرتے سٹھیا کے قدموں میں کسی قسم
کی ڈھکاوٹ پیدا نہ ہوئے دی۔ وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ
تھی جس کا ذہن ہر شے کا حساب کتاب رکھنے کا عادی تھا۔
اسے بیڑیوں پر آنے والا ہر منہ اور اس کے قدموں کی
تعداد از بر ہی چنانچہ وہ تاریکی میں بھی پورے اطمینان سے
چلتی ہوئی گزراؤں پر ٹکرتی گئی اور وہاں موجود ایک اسٹینٹ
الیکٹریک کے دفتر کا رخ کیا۔ اس دفتر کا مالک وہ حقیقت اس
پوری بلڈنگ ہی کا مالک تھا جو اپنے کاروباری مزاج کی وجہ
سے بلڈنگ میں قائم ذخیرہ دفاتر کے کرائے سے حاصل
ہونے والی آمدنی کے باوجود مزید کمائی کے لیے یہ انجینی
کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ سٹھیا کو اپنے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ
کر اس نے خوش گوار مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ کل
از وقت بغیر کسی مبالغے کے پابندی سے کرایہ ادا کرتے والی
سٹھیا کو وہ کافی پسند کرتا تھا۔

یہاں آنے کی رحمت کی؟“ سٹھیا صرف کرائے کی اوائلی
کے لیے ہی اس کے دفتر کا رخ کرتی تھی اور کرایہ وہ دو دن
پہلے ہی دے چکی تھی اس لیے اسے اسے پاکر وہ کچھ تشویش
خوش کر رہا تھا۔
”میں بیڑیوں کی نہیں مسر رحمت میں بس آپ کو آپ
کے دفتر کی یہ چاہیاں واپس کرنے آئی تھی۔ میں اپنا میرج
بیورو بند کر رہی ہوں اس لیے مجھے مزید آپ کے آفس کی
ضرورت نہیں ہے۔“ سٹھیا نے اپنے پیچہ بیگ سے دفتر کی
چابی نکال کر اس کے سامنے رکھی۔
”لیکن کیوں؟ اتنی اچانک آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر
لیا؟“ عمارت کے مالک حیران ہوئے۔
”اصل میں بات یہ ہے کہ میرے ساتھ کام کرنے
والی دونوں لڑکیاں ملازمت چھوڑ کر جا چکی ہیں اور اکیلے کام
سنبھالنا میرے بس میں نہیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کام
سینٹ کرنا ضرورت لے لوں۔ میرے بچے بہت عرصے سے
اصرار کر رہے تھے کہ میں ان کے پاس آ کر رہوں۔ اب میں
اپنے بچوں کے ساتھ رہ کر آرام سے اٹلک انجوائے کروں
گی۔“ سٹھیا نے اسے تسلی جواب دیا اور مزکورہ وار سے کی
طرف بڑھ گئی۔ اس بار عمارت کے مالک نے مزید کوئی سوال
نہیں کیا۔ اس کا دفتر خالی ہو چکا تھا اور اس صورت میں کہ دفتر
کا کرایہ بھی ادا کیا جا چکا تھا اور ایڈوائس کی رقم کے لیے بھی
کوئی تقاضا نہیں ہوا تھا وہ مکمل طور پر فائدے میں تھا۔ لیکن
اب اسے خالی ہونے والے دفتر کے لیے فی پاری تلاش کرنی
تھی جو کہ ایسا خاص کام نہیں تھا۔
سٹھیا عمارت کے مالک کے تمام احسانات کو ابھی
طرز سمجھتی تھی لیکن اسے رقم کی چوائش تھی۔ اس کے لیے وہ
مشتعل تھی۔ اسے پورے اسٹے رہسوں سے کام کر رہی تھی۔ اس
وقت بھی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد اس نے ایک خالی بیسی
بازر کی اور عیشی والے کو دس منٹ کی مسافت پر واقع ایک
علاقے کا نام بتا کر وہاں ملنے کا حکم دیا۔ اپنے مطلوبہ علاقے
میں پہنچ کر اس نے ایک چمک کال میں کارخ کیا۔ خود کو
ٹریس ہونے سے بچانے کے لیے اہم کارٹر کے لیے ان پنی سی
اور کا استعمال سب سے مناسب رہتا تھا۔
”لیکن بے پول رہی ہوں۔ کام ہونے والا ہے۔
میں ہدایت کے مطابق کچھ عرصے کے لیے انڈر گراؤنڈ بورڈ
ہوں۔“ سٹھیا نے بغیر ہر پر اہل قائم ہوتے پر اس نے رپارٹ
پیش کی۔
”اوکے اپنی اسے کے بارے میں رپورٹ کرو۔ وہاں

کیا چوٹیشن ہے؟“ دوسری طرف سے حکم دیا گیا۔
”وہاں سب کنٹرول میں ہے۔ پلی اسے کالارڈ تین
دن بعد نیو یارک کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔“ پلی اسے
سے سر اڈیج آد اور لارڈ کا مطلب چودھری اختیار تھا۔ سوال
کرنے والے کو اطلاع دیتے ہوئے اس نے چودھری اختیار
کی روٹھی کا وقت اور فائنل ٹرین بھی بتا دیا۔
”اوکے! ہم اسے سنبھال لیں گے۔ بس تم نی اے
کے معاملات پر نظر رکھو۔“ دوسری طرف سے حکم صادر کیا گیا
اور لائن کٹ گئی۔ سٹھیا اپنے مخصوص باوقار انداز میں چلتی
ہوئی بی سی او سے باہر نکلے اور ایک دوسری عیشی کو اشارے
سے روک کر اس میں سوار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ ہونے سے
کی طرف منہ مانگے داسوں پر عیشی دوڑانے والے عیشی
ڈرائیور کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس وقت وہ مسافر کی
اتھلیٹ سٹھیا کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ بے
چارے عیشی ڈرائیور کی تو خیر حقیقت ہی کتنی تھی۔ خود کو بہت
زیادہ ذہین اور قابل سمجھنے والے ”را“ کے سوار بھی کتنی اپنے
درمیان موجود سٹھیا کی حقیقت نہیں جان سکے تھے۔ انٹرا
نہیں معلوم تھا کہ ان کی یہ ظاہر وقار ایجنٹ سٹھیا درحقیقت
فیل ایجنٹ ہے جس کی اصل دفاداریاں ”موساد“ کے ساتھ
وابستہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

کال گرل جولی اور دیگر کی موت نے سجاد رانا کو بری
طرح بھڑکلا میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ ظاہر حادثہ معلوم ہونے
والی یہ اسات و حقیقت سوچے سمجھے ہیں وہ یہ بات ابھی
طرح سمجھتا تھا۔ ویٹر کی روزانہ رپورٹ میں موت کی اطلاع تو
اسے فوری طور پر مل گئی تھی۔ ظاہر یہ ایک حادثہ تھا جو کسی بھی
فحش کے ساتھ پیش آسکتا تھا لیکن جولی سے اپنی ملاقات کے
چند گھنٹوں بعد ہی اس حادثے کی اطلاع اس کو ہو چکے گی
اور فوری طور پر اپنے دو ہاتھوں کو جولی کے پارٹنر کی طرف
دوڑایا۔ وہاں جانے والوں نے پہلے پارٹنر کی کال نکل
بجائی لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ جولی ہوٹل سے اپنے
پارٹنر کے چھپنے کے بعد دوبارہ باہر نہیں نکلی سے اس بات کا
اسے علم تھا۔ چنانچہ کتنی کاروں میں ظاہر ہونے پر یہی خیال آیا
کہ اندر موجود جولی یقیناً کسی حادثے سے دوچار ہو چکی ہے
اور دروازہ کھولنے کے لیے آنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔
دونوں ہاتھوں کو اپنے مخصوص اختیارات استعمال کرتے
ہوئے دروازے کا لاک توڑ کر اندر جانا پڑا۔ جولی کا کشادہ
اور خوب صورت پارٹنر مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بند

روم میں انہیں جولی اس حال میں نظر آئی کہ اس کے ہونٹوں پر
ابدی خاموشی تھی۔ زندگی کی رحمت سے عاری اس کا جسم موت
کی اذیت سے گزرتے ہوئے مجھ بے ترتیب ضرور ہوا تھا
لیکن اس کے بیلے روم سمیت پورے پارٹنر میں کہیں کوئی
بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دودھ کا خالی گلاس اور جولی کے
ہاتھ سے لٹکا خود کشی کا خدو خراہی ان کی نظروں میں آ گیا تھا
جسے اپنی کھڑکی میں لینے کے بعد انہوں نے بعد میں سجاد رانا
تک پہنچا دیا تھا۔ گلاس میں پیچ جانے والے دودھ کے نمونے
اور جولی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ظاہر کر دیا تھا کہ اس کی
موت زہر خورانی کے باعث ہی ہوئی ہے۔ جولی کے پورے
جسم پر ایسا کوئی نشان یا زخم وغیرہ نہیں ملا تھا جس سے یہ اندازہ
لگا جاسکتا کہ اسے زہر دی زہر ملا دودھ پینے پر مجبور کیا گیا
ہے۔ دودھ کے گلاس پر ملنے والے نقشہ پر تیش بھی صرف جولی
کے تھے۔ پولیس کے ایکسپرس پورے پارٹنر میں سے
جولی کے سوا کسی دوسرے شخص کے نقشہ پر تیش حاصل کرنے
میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ کسی قسم کی بے ترتیبی سے عاری
پارٹنر، جولی کے بے دار جسم اور خود کشی کے خط کی
موجودگی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ واقعی خود کشی کا کیس ہے
لیکن سجاد رانا جانتا تھا کہ اس نے جن لوگوں کی ذمہ داریاں
کی کوٹیشن کی ہے، وہ ایسے ہی بے دار مجرم کے پاس ہیں۔
جولی اور دیگر کی موت نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہاں کچھ خطو ط
پر کام کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی جو بری بات ہوئی تھی، وہ یہ تھی
کہ مجرم ہوشیار ہو گئے تھے اور انہوں نے وہ نشانات مٹا
ڈالے تھے جن پر چل کر کوئی ایک تک پہنچ سکتا۔ اس سے فلی کرو
المناس اور ایک دوسرے مشکوک خواہہ سوا کو بھی پولیس کھڑکی
میں ہلاک کر کے اس کی راہیں سدھو دی گئی تھیں۔ اسے ایسا
لگ رہا تھا کہ جیسے وہ جتنا آگے بڑھتا ہے، دھن اسے اس
سے دگنا پیچھے وکیل دیتا ہے۔ یہ ناکامی اس کے سینے میں
بھڑتی آگ پر تیل کے پتھروں کے مانند اثر کرتی تھی۔ ذی
آئی جی کی پوسٹ پر تھنات ہوتے ہوئے وہ اسے دن گزار
جانے کے بعد بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے قاتلوں تک رسائی
حاصل کرنے میں ناکام تھا۔ شینا کی سوسائٹ لاش پر ملے اس کی
نظروں کے سامنے کتنی ہی رشتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی فوہر
بینی کی لاش اس سے اپنے قاتلوں کا مطالبہ کر رہی ہے۔ شینا کی
دماغ سے جانے کی غم تو نہیں... ابھی تو اس پر پوری طرح
شیاب بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو جتنی کے مانند گئی تھے مٹنے سے
پہلے ہی تو زکر مسل دیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی انتہا پسندی اور
تہون نے یہی جاتی شینا کو ایک بھڑکی مودی کی سمیت

چہ حاکم زندگی سے محروم کر دیا تھا۔

تین گھنٹوں کو کھینچ کر درگاہ تک پہنچانے کی خواہش میں وہ دونوں کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا اور اس کا رویہ ناراض نہیں رہا تھا۔ اسے اپنی اپنی اپنا مانتی کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس پر بھی فتنے دار یوں کہ ایک کوہ گراں تھا لیکن جیسا کی موت کسی طور سے بھڑکی نہیں تھی۔ اس وقت بھی اسے ایک طے شدہ مہنگ میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ روز بروز ہوتی وحشت گردی اور امن و امان کی خراب صورت حال پر غور و فکر کے لیے وزیر اعلیٰ کی طرف سے بلائی گئی اس مہنگ کے بعد حسب معمول عوام کے لیے ایک پرس ٹوٹ جاری کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جائے گا، یہ جاننے کے باوجود اسے مہنگ میں شرکت تو کرنی ہی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر اپنے دفتر سے اٹھا۔ گاڑی ڈرائیور سمیت بالکل تیار تھی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور وہ جھپٹا کشت پر بیٹھ گیا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک کن بین بیٹھا تھا۔ آج بھی وہ صرف ایک ڈرائیور اور کن بین کے ساتھ مہنگ میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے ہتھوں پر ایک فائل دھری تھی جس کے مندرجات کا وہ آنکھوں پر موجود سنہری کمائی کی ٹیگ سے مطلع کر رہا تھا۔ سبک رفتاری سے چلتی گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر کی تو اس نے فائل پر سے نظر ہٹا کر باہر کے منظر پر دوڑائی۔ ٹریفک سگنل کے قریب کھڑا ایک فوجی ہار کلا کا آواز لگا کہ کرا خیار جینے کی کوشش مگر باقما۔

”کالعدم تنظیم کی طرف سے مزید اسکولوں کو ہم سے اڑانے کی دھمکی“ اسکول کی دیوار سے ملحق پھر اکندی میں رکھے گئے ہم۔ دھماکے سے ہلاک ہونے والے معمول بچوں کا ذکر ابھی اخباروں کی سرخیوں میں زندہ تھا۔ اس نے باہر کے ہاتھ میں موجود اخباروں کی طرف سے توجہ پٹائی اور ایک بار پھر فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی لمحے سگنل گرین ہوا اور اس کی گاڑی حرکت میں آگئی۔ اس سگنل سے آگے دائیں جانب مڑ کر اس کی گاڑی جس روڈ پر چلی، وہاں ٹریفک کا بھاؤ قدرے کم تھا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے ہی ایک سفید رنگ کی مارگا اور سیویئر موٹر سائیکل بھی اسی روڈ پر مڑی تھیں۔ سفید مارگا میں تین افراد بیٹھے تھے جبکہ سیویئر موٹر سائیکل پر دو افراد تھے۔ پہلی سیٹی والے نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار بڑھائی اور دہرائی فاصلہ بات کرا خیار کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کی گاڑی کے بائیں جانب دھکی ہوئی تھی۔ اس جانب بیٹھا ہوا کن بین ساتھ چلتی موٹر سائیکل کو دیکھ کر اٹھ ہوا۔ موٹر سائیکل سواروں کے ہاتھ خالی نظر آنے کے باوجود اس کا گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا اسے ٹھک رہا تھا۔

اس نے اپنی کن بین کے مقابلے میں اور بھی نمایاں کی تاکر موٹر سائیکل سواران کی گاڑی سے دور ہٹ جائیں۔ اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ کارگر تو ان کی ترکیب بھی جو گاڑی میں موجود اکلوتے گاڑی کی توجہ بٹانا چاہتے تھے۔ کارگر موٹر سائیکل کی طرف متوجہ رہا اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب سفید مارگا نے اپنی رفتار بڑھائی اور خیار کی گاڑی کے دائیں پہلو میں پہنچ کر اس پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ خیار کی گاڑی میں دائیں جانب ہی بیٹھا تھا۔ پہلے برست میں ہی اس کے جسم میں کئی گولیاں اتر گئیں۔ گولیوں کا نشانہ بننے والا وہ تنہا نہیں تھا۔ ڈرائیور اور کن بین بھی اس اندھا دھند فائرنگ کی زد میں آئے تھے۔ سفید مارگا اور سیویئر سیکندوں میں اس ساری کارروائی کو نمٹا کر آگے بڑھ چکی تھیں۔ متوجہ ہونے والے جب تک متوجہ ہوئے، منظر میں خون سے نہایت جوئے تھے بے جان انسانی جسموں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ زندگی سے محروم ان جسموں سے بہتے خون کی سرخی سے اخبارات کی تازہ خبروں کی سرخیاں ملتی تھیں۔

”کیا خبریں ہیں عبداللہ؟“

”جانی سب کچھ تو معمول کے مطابق ہی جا رہا ہے۔ بس پیر آباد میں لگنے والے سالانہ میلے کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انی مال اسے ملتوی کر دیا گیا ہے۔“

”وہ کیوں بھی؟“ اس اطلاع کو سن کر شہر پار چوڑا۔

پیر آباد کے میلے کے ذکر کے ساتھ ہی اسے چودھری کی وہ بھانک سازش بھی یاد آئی تھی جب بھرا دشاہ کے دیہے کے موقع پر چودھری نے اس کے کھانے میں کچھ شائل کروا دیا تھا اور پھر اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ڈاکٹر داریا کے ساتھ شرمناک تصویریں اتاری گئی تھیں۔ چودھری کا ارادہ تھا کہ تصویروں کو میلے کے موقع پر منظر عام پر لانے کی دھمکی دے کر اس سے اپنے مطالبات تسلیم کروائے گا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی لگی کہ وہ ڈاکٹر داریا کے تعاون کی وجہ سے چودھری کے ذریعے کی خفیہ تجویزی سے وہ تصویریں نکال لانے میں کامیاب ہو گیا اور چودھری کو موت کی کمائی پڑی ورنہ شاید وہ چودھری کی اس سازش میں جھپٹ کر اس کے سامنے جھوڑ ہوئی جاتا۔

”چودھری افتخار عالم شاہ صاحب اپنے پر غور دار سے ملاقات کے لیے نیو یارک تشریف لے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی ہر آیا میں غیر موجودگی کے دوران اس کی جرات نہیں ہو سکتی کہ سیلوں ٹیلیفون سے لطف اندوز ہو سکے، چنانچہ جب چودھری صاحب نیو یارک سے شغل میلے کے واپس

آئیں گے تو پیر آباد کے سالانہ میلے کے بارے میں غور و خوض کیا جائے گا۔“

عبداللہ ان نے جس نظریہ کے لیے میں جواب دیا، اسے سن کر شہر پار مکر دیا پھر مکر ہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

”ویسے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ چودھری صاحب آں جناب کو اتنی اہمیت کیسے ملے سے ملاقات کی کیونکر ہو سکتی؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ویسے تو چودھری صاحب مخبر بے بیرون کے خاندان کے چشم و چراغ۔ کیا خبر خراب میں انہیں بشارت ہوئی ہو کہ بیٹے سے ملنے نیو یارک چلے جائیں، سوا وہ پوریا بستر سیٹ کر وہاں جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔“ عبداللہ ان کے جواب پر شہر پار یک بار پھر مکر اٹھا۔ یہ وہی عبداللہ ان تھا جو اس کی بیباں آمد کے پہلے دن مکمل طور پر چودھری کے دباؤ میں نظر آتا تھا لیکن جوں جوں اسے یہ معلوم ہوتا گیا کہ کیا اسے ہی چیلوں سے بہت مختلف ہے اور کسی چودھری وغیرہ کے دباؤ میں نہیں آئے والا، اس کی صلاحیتیں اور چودھری کے خلاف ٹاپتہ پیکر مکمل کر سامنے آنے لگی۔ اب وہ نہ صرف چودھری کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرتا تھا بلکہ شہر پار کے لیے بھی اچھا معاون ثابت ہو رہا تھا۔

”چلو جانے دو اپنے چودھری صاحب کو نیو یارک۔ وہ بھی وہاں کچھ دن پیش کر لیں گے اور یہاں بھی ڈرائیونگ رہے گا۔“ شہر پار نے تہور کرتے ہوئے اپنے سامنے دھکی فائل کھولی۔ یہ اس بات کا بھی اشارہ تھا کہ اب وہ مزید گپ شب لگانے کے سزا میں نہیں ہے۔

”سرا آج سے مشاہیر خان نے دوبارہ ڈیوٹی جوائن کر لی ہے۔ باہر آیا بیٹھا ہے۔ آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کر رہا تھا۔“ اس کا انداز سمجھنے کے باوجود عبداللہ ان نے یہ اطلاع دینا ضروری سمجھا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم فوراً اسے اندر بھیج دو۔ میں اس سے اس کا حال چال ہی پوچھ لوں گا۔“ شہر پار نے اس کے انداز سے کے مطابق مشاہیر خان کے لیے ملاقات کی اجازت دے دی۔ مشاہیر خان بے شک ایک معمولی ڈرائیور تھا لیکن اس کی جاں نثاری کی ادا اسے اس بات کی مستحق بناتی تھی کہ اس کے ساتھ خصوصی سلوک روا رکھا جائے۔ عبداللہ ان اس کی طرف سے رضامندی پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر لنگے کے دو منٹ بعد ہی مشاہیر خان نے دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔

”آؤ مجھے مشاہیر خان... بیٹھو۔ تمہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ معاف کرنا بھی، میں مصروفیات کی وجہ

قانونی تہذیبوں

اکرم حکیم کی مقدمہ میں آجیاد و احاد بیٹھ کر ایک ایک درجہ و درجہ میں افسانہ اور فیاض کے بیٹے بٹاؤ کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ان کا جواب پریشانی سے ہے۔ لیکن ان صفتاات پر ان کا جواب دیتے ہیں، ان کا صیغہ سلاطین طریقے کے مطابق ہے۔

سے دوبارہ چھین دیکھنے اسپتال نہیں آسکا لیکن تمہاری کمی میں نے بہت محسوس کی۔“ مشاہیر خان کو اندر آنے کی اجازت دیتے ہوئے وہ خوش حراشی سے بولا۔

”آپ نے مجھے یاد کیا، یہ کافی ہے سرا! آپ کے اسپتال نہ آنے کا مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ آپ فون پر میری خبریت پوچھ لیتے تو ہی میں خوش ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا، وہ تو آپ نے اجازت نہیں دی ورنہ میں بہت پہلے ہی ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا۔“ مشاہیر خان نے عاجزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”اور سنا، وہاں کا نمبر میں کیا حال ہے؟ تمہاری بات تو ہوتی ہوگی نا اپنے بھائی اکرم خان سے؟“ یہ سوال کرتے ہوئے شہر پار نے یہ طور خاص کی کام نہیں لیا تھا لیکن اس کی نظروں میں ماہ بانو کا کراپا ضرور گھوم گیا تھا۔ عام سے گھرانے سے ملنے رکھنے والی وہ چھوٹی سی لڑکی جانے کیوں اسے بھوتی نہیں تھی۔

”ادھر بات ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔ آپ نے مجھے موبائل خرید کر دیا ہے لیکن اکرم خان تو اس اسی وقت فون کر رہا ہے جب اسکو دوں ہوتا ہے۔ ایک ہفتے پہلے جب اس نے مجھ کو کیا تھا تو بتایا تھا کہ ماموں کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے وہ لوگ ہوشے جا رہے ہیں۔ وہ لڑکی ماہ بانو بھی ساتھ ہی جانے والی تھی۔ اکرم خان بہت تحریف کر رہا تھا ماہ بانو کی۔ کہتا تھا، ماہ بانو بالکل بیٹی کا موافق اماں کا خیال رکھتا ہے، گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا ہے اس نے۔“ مشاہیر خان نے اسے رپورٹ دی۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے نہ جانے کب تک وہاں رہتا پڑے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ وہ وہاں اپنا دل لگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تمہاری اب اکرم خان سے بات ہو تو میری طرف سے پوچھ لینا کہ اگر ماہ بانو کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔ یہاں سے بھجوا دی جائے گی۔“ اس نے ماہ بانو کی مصروفیات پر تہور کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے پیغام بھی نوٹ کر دیا۔

”ٹھیک ہے سراسر میں کہہ دوں گا۔“ مشاہیرم خان نے جواب دیا اور پھر عین حرکت کی بیسے کر ہی سے اٹھنے والا ہو لیکن مزید کچھ کہنے کی خواہش میں اٹھ بھی نہ رہا ہو۔
”کیا بات ہے مشاہیرم خان۔“ کچھ کہنا چاہتے ہو؟“
شہریار نے اس کی گفتگو کو بوجھتیے ہوئے سوال کیا۔
”میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا سر کہ آپ کی گاڑی تو میں ہی چلاؤں گا نا؟“

”بالکل سچی، وہ تو مجبوری تھی ورنہ میں خود بھی تمہیں ساتھ رکھ کر زیادہ آرام محسوس کرتا ہوں۔“ شہریار نے اسے تسلی دی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مشاہیرم خان اپنی عدم موجودگی میں اس کی گاڑی چلانے والے ڈرائیور کی وجہ سے پریشان ہے۔ اس کے اور مشاہیرم خان کے درمیان جو ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی، اس کے باعث اب مشاہیرم خان مسلسل اسی کے ساتھ رہنے کا خواہش مند تھا۔

”بہت بہت شکر۔“ مشاہیرم خان کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔
”موری سرا۔“ وہ شہریار کے مقابل بیٹھ کر موبائل کے سچ اٹھنے پر سرخس مندہ ہو گیا۔

”گھڑی بات نہیں... کال انیڈ کر لو۔“ شہریار نے اجازت دی تو اس نے قمیص کی جیب میں رکھا موبائل نکالا۔
”یہ تو اسکرڈ کا نمبر ہے۔“ مشاہیرم خان آہستہ سے بولا اور کال انیڈ کر لی۔ شہریار اس دوران بے ظاہر اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا لیکن لاشعوری طور پر اس کے کان مشاہیرم خان کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

”کون؟“ کل خان بات کر رہا ہے؟ ہاں ہاں یار! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم اکرم خان کے دوست ہو، یہ بتاؤ کہ اکرم خان کے بچائے تم نے کیوں توں کیا ہے؟“ وہ کال کرنے والے کو شناخت کر لینے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اب قدرے تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ دوسری طرف سے یقیناً اس کے سوال کا جواب دیا جائے گا۔ شہریار کو دوسری طرف کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن مشاہیرم خان کی مروتشیش ”دب“ اور ”کیسے“ سرور سنائی دی تھی جسے سننے کے بعد اس نے مشاہیرم خان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہاں بے تحاشا شبہ کے باوجود دلوں کے لیے سے آمار تھے۔ وہ بالکل خاموشی سے دوسری طرف موجود شخص کی بات سن رہا تھا لیکن اس کے بھرے سے ظاہر تھا کہ کوئی بہت بری خبر سنائی گئی ہے۔ اس کی اس کیفیت پر شہریار خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ توں کرتے والا اسکرڈ سے بول رہا تھا اور اکرم خان کا

دوست تھا۔ مشاہیرم خان کی جو حالت تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس کے گھر سے متعلق ہی کوئی بری خبر سنائی جا رہی ہے۔ اس کے گھر میں آج کل ماہ بانو بھی مقیم تھی۔ چنانچہ شہریار کا ذہن لامحالہ اس کی طرف بھی چلا گیا تھا کہ کہیں وہ بھی پریشانی میں نہ ہو۔ ماہ بانو کی پریشانی اور تکلیف کا خیال آتے ہی اس کا دل خود کار انداز میں تشویش میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

”خیریت تو ہے خان؟ کیا کوئی پریشانی کی خبر ہے؟“ مشاہیرم خان کال سے فارغ ہوا تو اس نے دریافت کیا۔
”بہت بری خبر ہے سراسر میرے بھائی اکرم خان کو کوئی کمر دیا گیا ہے۔“

”وری سید۔“ یہ واقعہ کب اور کیسے پیش آیا؟“ شہریار نے دلی ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔

”یہ کُل کی بات ہے سراسر میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرے گھر والے اور ماہ بانو شادی میں شرکت کے لیے ہوئے گئے تھے۔ ہوشے سے وہ ابھی یہ کچھ صبح لوگوں نے ان کی جیب کو گھیر کر ماہ بانو کو انوار کرنے کی کوشش کی۔ اکرم خان ان لوگوں سے مقابلہ کرنے کھڑا ہو گیا چنانچہ انہوں نے اکرم خان کو گولی ماری اور ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے گئے۔ جاتے جاتے وہ جیب کے اندر بھی ناکارہ کر گئے تھے اس لیے ڈرائیور اکرم خان کو اسپتال بھی نہیں پہنچا سکا۔ دو گھنٹے بعد جب ایک دوسری جیب وہاں سے گزری تو اس جیب والوں نے مدد کی لیکن اس وقت تک اکرم خان مر چکا تھا۔ اس کی لاش اسکرڈ کے دوغائے اسپتال میں رکھی ہے۔ میری ماں جس کا ممد سے سے دماغ الٹ گیا ہے، وہ بھی وہیں داخل ہے۔ اکرم خان کے دوست نے بڑی مشکل سے میرا نمبر تلاش کر کے بعد ابھی مجھے حادثے کی اطلاع دی ہے۔“ مشاہیرم خان نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا حوصلہ اور شبہ قابل رشک تھا۔ فرط غم سے چہرہ سرخ پڑ جانے کے باوجود یہ سب بتاتے ہوئے ایک بار بھی اس کی آواز بھرائی نہیں گئی۔
”یہ تو بہت برا ہوا۔ میں نے ماہ بانو کو حفاظت کے خیال سے اتنی دور بھجوا دیا تھا۔ اس کے دشمن اس کی بو بوجھتے ہوئے وہاں بھی پہنچ جاتے گے، مجھے بالکل امید نہیں تھی۔“ شہریار تاسف سے بڑبڑایا اور انفرکام اٹھا کر عبدالمنان کو اپنے آفس میں آنے کا حکم دیا۔

”عبدالمنان! فوری طور پر اسکرڈ جانے والی پہلی قلائد میں دو پیشیں کب کرواؤ۔ میں اور مشاہیرم خان ابھی یہاں سے کل رہے ہیں۔ ہمیں یہاں سے لاہور اور لاہور سے باقی اتر اسلام آباد پہنچنے میں جتنا وقت لگے گا، اس

دوران یقیناً تم یہ سارا انتظام کر لو گے۔"

"اوکے سر! میں ابھی ٹرائی کرتا ہوں۔" عبدالمنان مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوا۔ اس نے شہر پار سے یہ پوچھنے کی تلقین جرات نہیں کی تھی کہ اتنی اونچا ایک اسکرو جانے کا پروگرام کیوں بنایا گیا؟ البتہ اسے یہ ضرور سمجھ آ گیا تھا کہ جو بھی بات ہے، اس کا حلق لازماً ماہ بانو سے ہی ہے۔

"صرف ٹرائی کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے ہنڈ ریڈ پرسنٹ شیڈیوٹی چاہیے۔ ماہ بانو انخواہ کر لی گئی ہے اور اکرم خان ہلاک ہو گیا ہے۔ ہمیں اس معاملے کو دیکھنے کے لیے فوراً اسکرو دیکھنا ہوگا۔ کیلے مشاہیرم خان کے جانے سے بات نہیں بنے گی اس لیے میں ساتھ جانا چاہتا ہوں۔" شہر پار کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ جہاں بات میں اس کی آواز کافی بلند ہو چکی ہے۔

"اوکے سر! میں انتظام کرتا ہوں۔" اصل صورت حال جان کر مستعد ساجد عبدالمنان اور بھی پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا ہیر کی طرف دوڑا۔

"تمہیں اپنی جو ضروری چیزیں وغیرہ ساتھ رکھنی ہوں، وہ لے لو خان! ہم دس پندرہ منٹ میں یہاں سے نکل جائیں گے۔" اس نے مشاہیرم خان کو ہدایت دی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد خود وہ اپنے بیٹے کا نمبر ملا کر ہیٹ میں کوہنا سامان تیار کرنے کا حکم دینے لگا۔ حکم دینے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا کہ عبدالمنان کچھ گھبرا ہوا سا اندر آیا۔

"ایک بلڈ نیوز ہے سر!" اس نے اپنی گھبراہٹ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے شہر پار سے کہا۔

"کیا ہوا...؟" ہیٹ میں کسی کی یا موسم خراب ہونے کی وجہ سے آج اسکرو دے کے لیے کوئی فلاح نہیں جاری؟" اس نے اسکرو جانے کے خواہش مندوں کو درپیش دو عمومی مسائل کے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کام کے لیے تو میں ابھی فون کر رہی نہیں۔" ساجد یہاں سے اپنے کمرے میں جاتے ہی میرے پاس لاہور سے ایک فون کال آگئی۔ اطلاع ملی ہے کہ ڈی آئی جی حیدر آباد کو نارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں نے اس خبر کی تصدیق کر لی ہے۔ نیوز چینل پر بھی اس وقت یہی رپورٹنگ نیوز چل رہی ہے۔" عبدالمنان نے جلدی جلدی بولتے ہوئے اسے بتایا تو وہ ایک چل کے لیے تو سانس ہی رہ گیا۔ اعلیٰ افسران، سیاست دانوں اور ممتاز سماجی و دینی شخصیات کو دہشت گردی کا نشانہ بنانا کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ آئے دن نیوز چینل دہشت گردی کی ایسی ہی نہ کی کارروائی کی خبریں نشر کرتے

ہی رہتے تھے لیکن اپنی اتنی قریبی ہستی کے بارے میں یہ خبر سن کر حواس کو قائم رکھنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ کہنے کو چادرانا اس کا کڑوا ہوا تھا لیکن ان کی حیثیت اس کے نزدیک بڑے بھائی جیسی تھی۔ بڑا بھائی بھی ایسا جس نے بھائی سے بڑھ کر باپ کا کردار نبھایا ہو۔ جب وہ عظیم ہو کر اپنے ماموں لیاقت رانا کی زیر نگرانی آیا تھا تو لیاقت رانا کے ساتھ ساتھ چادرانا نے بھی اس پر اپنی بے تحاشا محبت لٹائی تھی۔ قدم قدم پر وہ اس کے کام آیا تھا اور اب اسے اطلاع دی جا رہی تھی کہ وہ سجاد رانا اب اس و فیاض نہیں رہا تھا۔

"آریو اوکے سر؟" اس کی بے پناہ خاموشی سے گھبرا کر عبدالمنان نے پوچھا۔

"ہیں!" وہ عبدالمنان کو مختصر جواب دے کر مریم کا نمبر ملانے لگا۔ مہینے کے بعد سجاد رانا کی موت کا صدمہ ان کے لیے کتابی بڑا ثابت ہوگا، وہ اندازہ لگا سکتا تھا۔ دوسری طرف بتل جانے کی آواز سنائی دیتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔

"میں لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ تم مشاہیرم خان کے اسکرو جانے کا بندوبست کر دینا۔" دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر اس نے مایوسی کے عالم میں اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا اور خود کوئی اور نمبر ملاتا ہوا ہیر کی طرف بڑھ گیا۔ اس بار اس نے لیاقت رانا کا نمبر ملا یا تھا۔ کال ان کے نمبر پڑی نے ریسیو کی۔

"رانا صاحب تو اس وقت بات نہیں کر سکتے۔ ان کی طبیعت کافی بگڑ چکی تھی اس لیے انہیں اسپتال شفٹ کر دیا۔" اس وقت وہ ڈی آئی جی میں ہیں۔" یہ جاننے کے بعد کہ کال کرنے والا شہر پار ہے، نمبر پڑی نے مؤدبانہ انداز میں معلومات فراہم کیں جو ظاہر ہے اس کے لیے تشویش ناک تھیں۔ اسے شدت سے اپنی لاہور سے دوری کا احساس ستانے لگا۔ وہ کچھ جھپٹتے میں لاہور پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن یہ بس تھا۔ اس کی جدید ذول کی طاقتور انجین والی مرسیڈز بھی ایک حد تک ہی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی تھی اور مجبوری یہ تھی کہ اس سے بڑھ کر تیز رفتار کوئی دوسرا حملہ و حمل کا ذریعہ یہاں موجود ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

ماہ بانو نے ہوش کی دیتا میں قدم رکھتے ہوئے اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً ہی بند کر لیں۔ سورج کی کسی پرچی کی طرح آنکھوں میں دو آتی کرنوں سے بچنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ سورج کی کرنیں جو روشنی کی پیابریں کر

کا نہایت کے ایک ایک ذرے کو دیدار کے لیے عیاں کر دیتی ہیں۔ کسی بھی مقام پر ایسی ہی ظالم حمایت ہوتی ہیں کہ دیکھنے والی آنکھوں سے ان کی دنیا کی ہی ایک کر لے جائیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی یہی بحر کے لیے اپنی روشنی بھر گئی تھی کہ اسے اپنی بصارت جانے کا خدشہ لاحق ہو گیا۔

قدرت کے دو دیعت کردہ خود کار نظام کے تحت اس نے فوری طور پر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دیگر حواس کی ملامتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ارد گرد کے ماحول کے بارے میں اندازہ کرنے لگی۔ سب سے پہلا احساس جو اس کے اندر جاگا وہ یہ تھا کہ وہ کسی مسلسل ہتھی ہوئی شے پر دراز ہو کر ستر ہے لیکن یہ ہتھی ہوئی شے کوئی انسانی ایجاد نہیں تھی۔ وہ کوئی جانور تھا جس کی پشت پر اسے باندھ کر آگے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ جانور کی چال کے مخصوص پتوں کے علاوہ جو دوسری چیز اس نے فوری طور پر محسوس کی، وہ شدید قسم کی سردی تھی۔ اس سردی سے اسے جانے کے لیے اس پر کوئی خرابی ٹانے ڈالی گئی تھی۔ وہ کہاں تھی اور کن لوگوں کے ساتھ تھی، اسے فوری طور پر اندازہ نہیں ہو سکا۔ البتہ اپنے انگوٹھے جانے کا سارا مقرر کسی فلم کی طرح آنکھوں میں محسوس کیا۔ اس منظر کے یاد آتے ہی اسے اکرم خان کا بے جان وجود اور اس کی پوزیٹو ماں کی ویران آنکھیں بھی یاد آئیں۔ اس کے لبوں سے ایک سکا رہی سی لگی۔ عجیب تعجب تھا اس کا!...! محبت کرنے والے لوگ ملتے جلتے اور اچانک ہی چھوٹ جاتے تھے۔ وہ بھی اس عالم میں کہ وہ ان کی جان جانے کا ہوا اپنی جان پر محسوس کرتی تھی۔ سب سے پہلے اسے پال پوس کر بڑا کرنے والی بے بے اور ابا نے اس کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ چودھری نے اس کے غائب ہو جانے پر صوب سے پہلے انہیں ہی ظلم کا نشانہ بنایا تھا کہ کسی طرح ان سے ماہ بانو کا پتا حاصل کر سکے۔ دارالامان جہاں وہ ہر آباد سے نکلنے کے بعد بناؤگزین ہوئی تھی، اس کی منظر اور چونکیدار بھی اسی کی وجہ سے مارے گئے تھے۔ موتی والا کے گھر میں پناہ لی تو چودھری کے گھر سے کتوں کی طرح اس کی پوس گھومتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے اور موتی والا اور اس کی بیوی کو کٹ کر ڈالا۔ موتی والا کے ذرا نیچے سرد نے اسے اپنے دوست عامر کے گھر پہنچایا تو وہاں عامر کی ماں اور اس کی پڑوسی کی بیوی عاتقہ کے کھار ہو گئیں۔ بیہوش لاش اس کے دھوکے میں دفنانے کے بعد کافی دنوں تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ وہ فتنہ ہو گئی ہے لیکن وہ تو بیہوش کے دھوکے میں خود ہی سڑاؤں کے پتنگ میں پھنس گئی تھی۔ وہاں بھی اس کی طرف لپکتے والی موت رخ موز کرنا چادرانا کی

مننا: (اپنی سے) "بارش کا پانی کہاں جاتا ہے؟" (اپنی اٹھتے سے) "میرے سر میں۔" مننا: جب ہی تو آپ کی ناگ ہر وقت بھتی رہتی ہے۔"

پہلی ہینا کی طرف چلی گئی۔ یہ قدرت کا اس پر احسان تھا کہ ہر قدم پر بے شمار مصائب کے باوجود اس کی حفاظت کی جارہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ تا دم تک ایک اس کی زندگی پر اپنی جائیں بچھاؤ ہو گئی ہیں اور مصائب کا سلسلہ ہے کہ دراز ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اب وہ جو پہلے ہی اپنے علاقے اور اپنے لوگوں سے دور تھی، ایک جانور کی پشت پر سوار نہ جانے کہاں لے جانی جا رہی تھی؟ اور کون تھا جس کے اشارے پر یہ مذموم حرکت کی گئی تھی؟ اس کے ذہن میں تو اپنے دشمن کی حیثیت سے بس ایک چودھری افکار کا نام ہی خطرے کی سرخ چکی کی طرح روشن رہتا تھا اور اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اتنی بھاگ دوڑ اور تنگ دود کے باوجود بھی بالآخر چودھری اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ چودھری کی گرفت میں آ جانے کے خیال سے اس کا بندھا ہوا جسم کھسکا اور اس بار اس نے چہرے کا رخ بدل کر ایسے زاویے پر لاتے ہوئے کہ سورج کی روشنی براہ راست آنکھوں میں نہ گھسے، دھجے سے اپنی آنکھوں کو کھولا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ نے اس جانور کو اپنی زد میں لیا جس کی پشت پر وہ ستر کر رہی تھی۔ وہ گھسے ہوئے بدن کا مایہ کھٹے کھڑے سے بالوں والا جانور تھا جس کے آگے اسی جیسا ایک دوسرا جانور حرکت کر رہا تھا۔ آگے والے جانور کی خوب گھٹی اور مورچیل تمام دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کی سواری کا کام انجام دینے والا جانور بھی ایسی ہی ایک دم کا مالک ہوگا۔ بس فرق تھا تو یہ کہ وہ جس جانور کی پشت پر سوار تھی، اس کے بال مکمل طور پر سیاہ تھے جبکہ آگے والا جانور چمکتا تھا۔ "یا ک...!" اس کے ذہن میں جانور کا نام سرسرایا۔ اچھے اچھوں کو صرف اپنی دید اور سموں کی دھمک سے دہشت زدہ کر دینے والا یہ جانور اس وقت اس کی سواری تھا۔ آگے والے پاک پر سوار گرم کپڑوں میں ملبوس انسان یقیناً اس وحشی جانور کو سدھانے اور اس کا قتل بنانے کے ذمے دار تھے۔ وحشی کو قتل ہو کر لینے والے خود کیسے لوگ ہوں گے اس بات کا اندازہ لگا یا جاسکتا تھا۔ ان یا کوں کو کچھ کر قدرتی طور پر اسے خیال آیا کہ اس وقت وہ کسی بہت ہی بلند مقام پر موجود ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے آج کل کی مقدار قدر سے کم تھی اس کے چاروں

طرف برف ہی برف تھی جس سے کلرا کر سورج کی شعاعیں یوں منتشر ہو کر کہ سیوڈی آنکھوں میں مسکی چلی آئیں اور ابھی بیلے انسان کو اسنو پانڈا نہیں کا خطہ واقع ہو جاتا۔ وہ بھی چند ساعتوں سے زیادہ اپنی آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ ہچکے لے کھاتے جسم کے ساتھ آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ وہ اس بات پر حیران ہوا ہی تھی کہ اگر اغوا کاروں کا تعلق چودھری اختیار سے ہے تو وہ اسے پہاڑوں سے میدانون کی طرف لے..... جاتے کے بجائے مزید بلندی کی طرف کیوں لے جا رہے ہیں؟ کیا چودھری کا ان برف زاروں میں بھی کوئی ٹھکانا تھا؟ شاید ایسا ہی ہو۔ ایسا بندہ جو تہذیب کے آخری گاؤں ہو شے تک رسائی رکھتا ہو..... جس کے بندے اتنی دور پہنچ کر اسے اغوا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں، اس سے ٹو پکو بھی بعید نہیں تھا۔ دولت..... اور یہ تھا شادولت کے بل بوتے پر تو دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنے لیے کیش کدہ خریدایا جاتا یا ٹھکانا تھا۔ اس میں کہ میں اپنے من پسند جسم بھی خرید کر ڈالے جا سکتے تھے اور جو میرے قریب نہ ہوں، ان کو کرائے کے ٹیڈوں پر لا کر لایا جا سکتا تھا۔ ماہ بانو کو چودھری نے تو دھوکے سے حاصل کر دیا تھا، نہ دولت کی جھلک دکھا کر یہ جا سکتا تھا..... چنانچہ اب طاقت میں استعمال پر تلا ہوا تھا۔ چودھری کے اختیارات اور مزاحمت اپنی جگہ لیکن اس نے بھی ٹھکان لے کر چاہے جان چلی جائے، چودھری کو اپنے وجود سے کچھ حاصل نہ کرنے دے گی۔ اس فیصلے پر چننے کے بعد وہ سکون ہو گئی اور سفر کے اختتام کا انتظار کرنے لگی۔ سفر کچھ طویل تھا۔ راستے میں دو بار ایک آدمی نے اس کے منہ سے بوتل لگا کر کوئی مشروب اس کے حلق میں اگل دیا۔ ڈالنے میں وہ مشروب نکول کے مانند لگتا تھا۔ ڈی بائیزریشن سے منپے کے لیے ان برف زاروں میں اکسیر کی حیثیت رکھتے والا مشروب، جو پہاڑوں کے عجیب و غریب موسم میں بڑا کام آمد ثابت ہوتا ہے۔ ماہ بانو نے دونوں بار اس مشروب کے گھونٹ خاموشی سے حلق سے نیچے اتار لیے۔ جب تک جسم سے روح کا نانا قائم تھا، اسے جسم کی توانائیاں برقرار رکھتی تھیں تاکہ وقت ٹھل جوت ٹھل جواب نہ دے جائے۔

آخر کار سفر ختم ہوئی گیا اور وہ لوگ ایک مقام پر ٹھہر گئے۔ یہاں رکنے کے بعد اس کے جسم کو ہندوئوں سے آزاد کر کے اسے نیچے اتار کیا۔ زمین پر قدم ہمارا کھڑے ہوئے کے بعد اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ کافی کھلی تھی جس کے ارد گرد چھوٹی بڑی برف پوش پہاڑیاں اس طرح کھڑی تھیں کہ اس جگہ سے ہٹ کر بہت دور تک کا منظر نہیں

دیکھا جا سکتا تھا۔ نظر کی حد ان پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس چلت آتی تھی۔ وہ لوگوں کی نظروں سے پیچ کر رہنے کے خواہش مندوں کے لیے ایک آبدی غل ٹھکانا تھا مگر ایسا ٹھکانا تو ہمیں وہی لوگ حاصل کر سکتے تھے جو بے پناہ وسائل کے مالک و مختار ہوں۔ ماہ بانو کو ابھن کی محسوس ہونے لگی۔ چودھری اختیار کی دولت مندی میں کوئی کام نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ چودھری کو ایسے کسی ٹھکانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس نے اپنا مال یہاں خرچ کیا تھا تو اس سے اسے حاصل کیا ہونے والا تھا؟ شخص عیاشی کے لیے تو ایسی حماقت نہیں کی جا سکتی تھی۔

”ادھر چلو۔“ وہ اپنی سوچوں کے تانے بانوں میں الجھی جانے کب تک ہوئی کھڑی رہتی کراہیک..... فرانی آواز والے شخص نے کمر دے کچھ میں سکھ دیتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ یہ وہ شخص تھا جو راستے میں اسے نکول پاتا رہا تھا۔ اس شخص کی اپنے قریب آمد و رفت سے اسے اندازہ ہوا کہ آگے جانے والے یاک کے علاوہ ایک یاک اس کے پیچھے بھی موجود ہے۔ اب وہ تینوں یاک اس کی نظروں کے سامنے موجود تھے۔ ان کے جسم سے بندھے کپڑے کے بھرے ہوئے بڑے بڑے پورے نیچے اتارے جا رہے تھے اور انہیں مشقت کا صلہ دینے کے لیے تازہ گھاس ان کے سامنے ڈال دی گئی تھی۔ پہاڑوں پر اترنے شام پر ایک نظر ڈال کر وہ خود کو سکھ دینے والے شخص کے اشارے کی سمت بڑھ گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے پہاڑ میں موجود وہاں نظر آگیا جو آگے کسی غار کی موجودگی کا پتہ دے رہا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ چلتے چلتے غار کے کنارے وہاں سے اندر داخل ہو گئی۔ اندرونی طور پر بے حد پیمانہ میں بچھا ہونے کے باوجود اس نے ابھی تک کسی سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ تکی تھی کہ اسے یہاں تک لانے والے شخص جہرے ہیں جو بساط پر بازی کھینے والے کی مرضی سے ہی حرکت کر سکتے ہیں۔ ان بہ ظاہر متحرک لیکن وحقیقت قوت عمل سے محروم افراد سے کوئی سوال کرنے سے بچھڑتا کہ اس بازی کر کا سامنا ہونے کا انتظار کیا جائے جس نے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ وہ جو بہت آسانی سے اس بازی کر کے گھر لوگوں کے ہاتھ لگ رہی تھی، اب اتنی بے تحاشہ فتنے میں بھری ہوئی تھی کہ خوف کا نام و نشان سٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ نئی چال چلنے والا اگر چودھری تھا تو وہ اپنی طرح تیار تھی کہ اس کا سامنا دوتے ہی اس کا منہ بوج ڈالے لیکن یہی وہی وہاں سے گزر کر غار میں داخل ہوئی۔ بھونچک رہ گئی۔ اندر سے کافی کشادہ

اس غار کی دنیا تو اس کے لیے بالکل ہی انوکھی تھی اور وہ اندر لینگ میں اتھا تا جھنجکے والی ایٹس کی طرح کھڑی حیرت سے آنکھیں پھنپھناتی تھی۔

☆☆☆☆

لیاقت رانا کے خاندان پر قیامت ٹوٹی تھی۔ ابھی تو وہ لوگ دنیا کی موت کے صدمے سے پوری طرح تسکین نہیں پائے تھے کہ عباد رانا کے قتل نے ایک اور قیامت ڈھالی۔ پیراندہ سالی سے گزرتے لیاقت رانا نے پوتی کے بعد بیٹے کی موت کی خبر سنی تو بہتر سے جا گئے۔ صدمے سے پور چوران کے دل کی دھڑکنوں کو اعتدال پر لانے کے لیے اسپتال میں ملک کے بہترین ڈاکٹر متوج کر دیے گئے تھے لیکن شہر یاری پریشانی قائم تھی۔ اس کا ایک ہیرا اسپتال میں تو دوسرا گھر پر ہوتا تھا۔ گھر میں سسر آخرین رانا اور مریم دونوں ہی کی حالت خراب تھی۔ ان کا دن شہر یار کے دل کو چھ ڈانٹا لیکن فی الحال اس کے پاس انہیں صبر کی تلقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دونوں خواہش میں انہیں کون کر اور بھی شدہ سے روٹیں اور اس کا دل ہل چل کر ڈانٹیں لیکن وہ مرد ہونے کے ناطے آنکھوں سے آنسو نہیں بہا سکتا تھا۔ کم از کم سب کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ رعایت تو قدرت کی طرف سے خواتین کو ہی ملی ہے کہ وہ ہر دھ پر دل کھول کر روئیں ہیں اور نتیجہ ڈال کا بوجھ لگا ہو جاتا ہے۔ مرد بے چارے اس نعمت سے محروم اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے سب کچھ اندر ہی اندر سمیٹے رہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے دنیا میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں امراض قلب کا تناسب زیادہ ہے۔ مثال رانا یا اس میں ہی موجود تھی۔ خواہ تین لم سے زیادہ بڑھ چال نظر آتی تھیں لیکن اسپتال لیاقت رانا پہنچ گئے تھے۔ شہر یار اس وقت ان کی خیریت معلوم کرنے اسپتال ہی پہنچا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے کسی دلی تھی کو لیاقت رانا کی طبیعت اب سمجھنے کی ہے۔ وہ فون پر بھی اسے یہی تسلیاں دیتے رہے تھے اور اسے مجبوراً ان تسلیوں سے بھلنا بھی پڑا تھا۔ اس وقت ساری ڈتے داریاں اسی کے شائقوں پر تھیں۔ عباد رانا کی تدفین، تعزیت کے لیے آنے والوں سے منٹے اور اخباری رپورٹرز کو بیانات دینے کے فرائض اسے ہی انجام دینے پڑے تھے۔ ان سارے فرائض کی انجام دہی میں وہ ضبط کے گڑھے میں مریض سے گزرا تھا۔ فحوصاً حکمرانوں کے مذمتی بیانات اسے بری طرح چڑانے کا سبب بنے تھے۔ وہ ہنستا تھا کہ حکمرانوں کے یہ بیانات شخص زبانی کلامی باتیں ہیں۔ وہشت گردوں سے ابھی ہاتھوں سے ٹھٹھنے کے ان کے

ہمارے دعوے سراسر کھوکھلے ہیں۔ یہ اپنی ہاتھ نہ تو مانی ہیں کبھی حرکت میں آیا تھا اور نہ ہی اب کوئی امید تھی۔ شاید بغیر استعمال کے یہ بھی صرف بیانات کا حصہ بننے والا یہ اپنی ہاتھ ڈنگ آلود ہو کر ناجائز استعمال ہو چکا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کے طول و عرض میں دہشت گرد اس طرح ران کیسے کرتے پھرتے؟ عوام سے لے کر خواص تک کوئی بھی تو اس دہشت گردی سے محفوظ نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عوام ایک ہی جے میں کیڑوں کوڑوں کی طرح بڑی تعداد میں ہے۔ دردی سے مارے جاتے اور خواص کو بڑا ناپ تول کر، حساب کتاب سے ملک عدم کی طرف روانہ کیا جاتا۔ اس نچے تلے قتال کو "ٹارگٹ کلنگ" کا نام دیا جاتا تھا۔ سجاد رانا کی موت بھی ٹارگٹ کلنگ تھی اور حسب معمول کلرڈ کا کوئی نام و نشان نہیں مل سکا تھا۔ خود ہی آئی جی ہونے اور آئی جی کے داماد ہونے کے باوجود ان کے قتل کی رپورٹ نامعلوم قاتلوں کے نام درج کی گئی تھی۔ ان کے ایم این اے والد اپنی تمام تر تعلق کے باوجود بیٹے کی موت کے صدمے سے سنبھلا ہوا ہسپتال کے ایک وی آئی پی روم میں بے دست و پا پڑے تھے۔ ان میں تو اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ بیٹے کے جنازے میں ہی شرکت کر سکتے۔ شہر یاران سے ملاقات کے لیے ہسپتال آیا تو وہ تھوڑی دیر تک صرخت بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر آنکھیں موند کر اپنا رخ بدل گئے۔ جس سچ کو انہوں نے انکی کپڑ کر چلنا سکھا یا تھا اور قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے اسسٹنٹ کمشنر کی کرسی تک پہنچا دیا تھا، اس کے سامنے وہ اپنے دل کا درد کیونکر آنکھوں سے بہا سکتے تھے؟ ان کی کنیات کو سمجھتے ہوئے شہر یار نے ان کے ہاتھ کی پشت پر ایک عقیدت مندانہ بوسہ دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اسی وقت مختار مراد وہاں پہنچ گئے۔ تم ان کا بھی کم نہیں تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی کی کود اور مانگ دونوں ہی اجڑ گئی تھیں لیکن بے پناہ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ تم کے اس طوفان سے گزرتے ہوئے شہر یار کو ان کی ذات سے بڑا سہارا ملا تھا۔ اب بھی وہ نظر آتے تو اس کے دل کو حارس ہی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے رانا صاحب کی؟" شہر یار کے قریب پہنچ کر انہوں نے اس سے سوال کیا۔ ان کی سیٹھ رانی پر مامور متعلقہ دفاتر سے برہنہ رہ گئی تھی۔

"طبیعت تو آپ کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ خطرے سے نکل آئے ہیں لیکن میرے انداز سے کے مطابق شدید پڑ پڑ رہے ہیں۔"

"وہ تو ہوتا ہی ہے۔ کسی پوڑھے باپ کے لیے اپنے بیٹے کا جنازہ دیکھنا کسی بھی صورت آسان نہیں ہو سکتا۔" اس کی بات سن کر مختار مراد نے دہشت گردی میں تہیہ کیا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے وزینگ روم میں رہی کر بیٹوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہ عام وزینگ روم تھا۔ یہاں صرف لیاقت رانا جیسے وی آئی پیز سے قطع کر کے والے لوگوں کے حار و راری داخل ہو سکتے تھے۔

"کچھ معلوم ہوا سجاد بھائی کے قاتلوں کے بارے میں؟" وہ دونوں ایک دوسرے کے آسے سامنے بیٹھ گئے تو شہر یار نے ان سے پوچھا۔

"قاتلوں کی کوئی نشان دہی تو نہیں ہوئی لیکن ایسی بہت سی وجوہات سامنے آئی ہیں جن کو سجاد کے مرڈر کی وجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل میں اس نے ہینا کی موت کا بہت گہرا اثر لیا تھا اور اس کے قاتلوں کو کیونکر وارنٹک پہنچانے کے لیے دجوانہ اور کوششیں کر رہا تھا لیکن اپنی ان کوششوں میں اس نے کچھ شامل کرنا یا گا کر بائسنڈ نہیں کیا تھا۔ تحقیقات کے مطابق ہینا کی موت کے بعد سجاد مسلسل غصہ سرگرمیوں میں مصروف رہا لیکن اس نے ان سرگرمیوں میں اپنے ہاتھوں کو بھی ایک حد سے زیادہ مہولت نہیں کیا۔ جن لوگوں نے اس کے احکامات کی بھڑکی دی، وہ بھی تھاق سے واقف نہیں یا بہت کم جانتے ہیں۔ اس سارے عرصے میں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اس نے گارڈز اور ڈرائیور کو بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کیا۔

پھر سے پاس جو اطلاعات پہنچی ہیں، ان کے مطابق کچھ دن قبل ہی وہ تنہائی گاڑی خود ڈرائیور کے ایک فاتحہ اشارہ ہوں پہنچا تھا اور وہاں اس نے جولی نامی ایک لڑکی کے ساتھ چند گھنٹے گزارے تھے۔ جولی ایک کال گرل تھی جسے سجاد نے ہوں کے ایک ویٹر کے ذریعے اپروچ کیا تھا۔ سجاد کے حکم پر اس کے ایک ہاتھ نے جولی کے تعاقب کر کے اس کی رہائش گاہ کا پتا معلوم کر لیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اسی رات ہوں کا ویٹر ایک روڈ ایکسٹنٹ میں سر گیا اور جولی نے اپنی غیر شریکانہ زندگی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے خود کوئی کر لی۔ مختار مراد کی باتیں سنتے ہوئے اسے یک دم ہی اپنی سجاد رانا سے آخری ٹیلی فونک گفتگو یاد آگئی۔ اس گفتگو کے دوران انہوں نے اسے بتایا تھا کہ ہینا کے قاتلوں کو تلاش کرتے ہوئے وہ کچھ ایسے پلاٹز تک پہنچ گئے ہیں جن کے روپ میں خطرناک انتہیں نیچے بیٹھے ہیں۔ یہ بات جانتے ہوئے انہوں نے ہم فرشتے کے ہندے کا یہ طور خاص ذکر کیا تھا لیکن پھر نیلی فون پر ہونے والی گفتگو کو غیر محکوم قرار دیتے

ہوئے تفصیلات ملاقات پر چھوڑ دی تھیں۔ شوخی قسمت کہ ملاقات کی قربت ہی نہ آسکتی۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں حادثات قریبی طور پر قتل کی وارداتیں تھیں۔ سجاد بھائی کے اس قسم کے افراد کے خلاف کام کرنے کا تو کسی حد تک مجھے بھی علم ہے۔ یقیناً جو بڑے مجرم ہیں انہوں نے اپنی طرف جانے والے راستوں کا نشان مٹانے کے لیے اپنے ہی بندوں کو بلی چڑھا دیا ہوگا۔" وہ بے ساختہ ہی درمیان میں بول پڑا اور مختار مراد کو اپنی اور سجاد رانا کی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔

"تمہارا تجربہ بالکل درست ہے۔ میرے سامنے کچھ ایسے شواہد آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سجاد کچھ خاص قسم کے مجرموں کی راہ پر لگ گیا تھا جس کے نتیجے میں اسے جان سے ہانا پڑا۔ میرے بندے ایک ایسے ہیرو بدو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اس کی بالکل لڑکیوں کی پیارا رہی ہے لیکن انہوں نے کہیں نہیں پہنچتے تھے دیر ہوئی۔ وہ میری پورا بندہ ہو چکا ہے اور بالکل سمیت اسٹاف کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ عمارت کے مالک کے ریکارڈ میں عورت کا جو پتا درج ہے، وہ بھی غلط ہے۔ میرے آڈیو نے دفتر کی تلاشی کے کرکیز حاصل

کرنے کی کوشش کی لیکن اسے پہلے ہی مکمل طور پر پکھن کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہم کسی کے قطر پر نہیں حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس صورت حال سے ظاہر ہے کہ مجرم کوئی عام لوگ نہیں بلکہ تربیت یافتہ اور بے حد ذہین تھے جنہوں نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔ مختار مراد نے اسے آگے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور پھر یوں خاموش ہو گئے جیسے جانتے کے لیے مزید کچھ بات نہ رہا ہو۔

شہر یار خود بھی کچھ دیر خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھا رہا پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اچھا انگل! اب اجازت دیجیے۔ مجھے کچھ اور معاملات بھی دیکھنے ہیں۔ آپ البتہ ماموں جان سے مل لیں۔ آپ کی بہت اور جوصلے کو دیکھ کر یقیناً انہیں بھی حوصلہ ملے گا۔" وہ ان سے مصافحہ کر کے ہسپتال کی رخصت ہو گیا۔ اسے یہاں سے لیاقت رانا کی رہائش گاہ کی طرف جانا تھا۔ مختار خان کی عدم موجودگی میں ڈرائیور کے فرائض انجام دینے والے ڈرائیور نے اس کی سبک رفتار سربسٹ پڑینگ کے بہاؤ میں شامل کی تو اس نے اپنا سٹیل فون نکال کر مختار خان کا نمبر طلب کیا۔ سجاد رانا کی آخری رسومات اور دیگر فرائض کی ادائیگی میں اسے موقع نہیں مل سکا تھا کہ مختار خان سے رابطہ کر پاتا، حالانکہ اس

مایوسی گناہ ہے

ہم چھین لیں گے آپ کی ہر

پریشانی اللہ کے کرم سے

پیرزادہ وسیم جعفری

ادبیاتی کار

کا اعلان

وہ کام جو بڑے سے بڑا عامل و جادوگر نہ کر سکے وہ میرے بزرگوں کی دعا سے ہو جاتا ہے مثلاً شوہر کے دل سے شک و نفرت کی آگ، سنگدل محبوب نے نیند حرام کر دی ہو تجارت میں دن بدن نقصان، رشتوں میں بندش، عزیزوں سے لڑائی جھگڑا عزت و وقار میں کمی یا دشمن جلوی ہو، بیٹی کی سسرال میں عزت نہیں، امیگریشن کے مسائل، لاٹری نمبر غرضیکہ ہر مشکل کیسی ہی کیوں نہ ہو اپنی آخری امید سمجھ کر رابطہ کریں

0300-7462777

0333-8217808

پیرزادہ وسیم جعفری

مہجرت

پاکستان

بے جا شہر پریشانی کے عالم میں بھی وہ اس مسئلہ کو بھولا نہیں تھا۔
 ماہ بانو کو اس نے اپنی ذمہ داری پر پختہ جان بوجھ کر ہاتھ دیا۔ اس کے انوکھے خیال پر وہ خود سب سے بڑھ کر مضطرب تھا لیکن حالات تھیں کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ چیر کٹے ہوئے جسموں کر رہا تھا۔ خواہ کتنی بھی کسی طرح پاکستان پہنچا جائے اور ماہ بانو کی بازیابی کے سلسلے میں ہاتھ چیر مارے جائیں لیکن فرائض اور خونی رشتوں کا حق راہ میں حاصل تھا۔ وہ اپنے پیاروں کو ان حالات میں تنہا چھوڑ کر کسی لڑکی کی خاطر کتنی نہیں جاسکتا تھا، چاہے وہ لڑکی اسے اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر پیاری ہوتی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مرد بھی چھوڑ نہیں ہوتا لیکن مگر زندگی میں بہت سے مقامات ایسے آتے ہیں جب طاقتور سے طاقتور مرد خود کو مجبور محسوس کرتا ہے۔ خصوصاً اگر معاملہ فرض اور خواہش کی جنگ کا ہو تو اعلیٰ ترین بہت کے حامل افراد اپنی ذاتی خوشی قربان کر کے فرض کی ادائیگی کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا اور خود پر ضبط کر کے ماہ بانو کا معاملہ سیر افتادہ کر دیا تھا۔ البتہ تقدیر پر بھروسہ کرنے کے باوجود وہ کتنی تدبیر یہاں بیٹھے بیٹھے کر سکتا تھا۔ وہ اس نے ضرورت کی تھی اور اب اسی تدبیر کے نتائج جانتے کے لیے مشاہیر خان کو کال ملائی تھی۔

”السلام علیکم سر“ مشاہیر خان نے کال رسیو کر لی اور اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا۔

”وہو بیگم السلام! کیا حال ہے خان؟ آرام سے وہاں پہنچے تو گئے تھے؟“ اس نے غصہ سے اوتے لہجے میں اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں سر آپ کی مہربانی سے سفر میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔“ مشاہیر خان نے ترتیب وار اس کے سوالوں کا جواب دیا لیکن اس کا لہجہ کچھ بگڑا ہوا اور صوفی زدہ تھا۔

”تمہاری والدہ کو کسی طبیعت ہے؟“ وہ بے شک ماہ بانو کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا لیکن اخلاقی تقاضا تھا کہ پہلے مشاہیر خان کے مسائل پر بات کی جائے۔

”اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اماں کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ابھی وہ اسپتال میں ہی ہے اور بے ہوش ہے۔ مجبوری میں مجھے اکرم خان کی تدبیریں بھی اس کے بغیر ہی کرنی پڑی۔“ مشاہیر خان نے اداسی سے بتایا۔

”میری سیدہ! تمہیں میری کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ بلکہ ایسا کرو کہ اپنی ماں کو لے کر لاہور یا اسلام آباد کے کسی اسپتال پہنچ جاؤ۔ اسکرود کے مقابلے میں ان شہروں

کے اسپتال زیادہ جدید اور باسہولت ہیں۔ تم کہو تو میں انتظامات کروا دوں؟“ اس نے ہمدردی کے ساتھ مشاہیر خان سے پوچھا۔

”شکر سر! لیکن میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ماں کو کوئی جسمانی مسئلہ نہیں ہے، بس صدمہ ہے جس سے وہ آہستہ آہستہ ہی نکل سکے گی۔“ مشاہیر خان نے جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اگر مشاہیر خان خود مطمئن تھا تو مزید اصرار بے کار تھا۔

”حادثے کے بارے میں معلوم ہوا کہ کیا ہوا تھا اور کون لوگ ہیں اس کے پیچھے؟“ اس نے اصل موضوع چھیڑا۔

”واقعہ ہوش سے واپس کاٹھنے جاتے ہوئے کینڈا اس ٹھنک کے قریب پیش آیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور کے مطابق اچانک ہی ایک جیپ میں سوار دو لوگوں نے انہیں گھیر لیا تھا اور ماہ بانو کو نوکرنے کی کوشش کی تھی جس پر اکرم خان نے جوش میں ان سے بھڑکنے کی کوشش کی اور جوپا سے گولی مار کر دو لوگ ماہ بانو کو لے گئے۔ یہاں کی پولیس نے اس واردات کے بارے میں تحقیقات کیں تو اس جیپ کا پتا چل گیا جس میں اغوا کار تھے۔ وہ ایک نورس چینی کی جیپ تھی۔ جیپ کا ڈرائیور خالی جیپ لے کر ٹھہرے شیدول کے مطابق پہاڑوں سے واپس آئے والی ایک ایسی ہی ڈیشنیم جو کو لینے جا رہا تھا کہ راستے میں اس کی جیپ روک لی گئی اور اسے بے ہوش کر کے روکنے والے جیپ لے اڑے۔ ہوش میں آنے کے بعد جب تک اس نے تھانے میں رہا تو کر دائی اور جیپ تلاش کی گئی۔ تب تک جرم اپنا کام کر چکے تھے۔ خالی جیپ پولیس کو ایک بائیکل دیران پہاڑی کے قریب کھڑی مل گئی تھی۔ جرم وہاں سے کہاں اور کیسے گئے اس بات کا سراغ نہیں مل سکا۔ کیونکہ جس علاقے میں جیپ ملی، وہاں زمین کی ساخت ایسی ہے کہ کسی سوار کی انسانی قدموں کے نشانات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اب یہاں کی پولیس ابھی ہوئی ہے کہ آگے کی تحقیقات میں کیا برکریں آئیں گی یا بیاری اور اکرم خان کی آخری رسومات کی ادائیگی میں اچھے ہونے کی وجہ سے میں خود بھی اب تک پکھ نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں سر! اب میں کوشش کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح کچھ معلوم کر سکوں۔“ مشاہیر خان نے تفصیلات سناتے ہوئے آخر میں اپنا غم ظاہر کیا۔

”اپنی سہولت اور وسائل کے مطابق اگر تم کچھ کر سکو تو ضرور کرو خان۔ لیکن میری طرف سے تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ اس وقت کسی بھی

اور کام سے بڑھ کر تم پر اپنی ماں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس لیے تمہیں سب سے زیادہ اپنی کا دھیان رکھنا چاہیے۔“ وہ اور مشاہیر خان کم و بیش ایک ہی جیسی صورت حال سے دوچار تھے، چنانچہ وہ مشاہیر خان کے مسائل کو کچھ سنا تھا۔ ان مسائل کو سمجھتے ہوئے ہی اس نے مشاہیر خان کو کسی بھی ذمہ داری کے بوجھ سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

”ماں کا خیال تو اسپتال والے رکھ رہے ہیں سر... لیکن مجھے اپنے بھائی کے کالوں کو تلاش کرنے کا کام خود کرنا ہوگا۔ ابھر جا رہے علاقے میں ایسی وارداتیں سبیل بھی نہیں ہوئی۔ یہاں کی پولیس کو تو یہ بھی نہیں آتا کہ اب کیا کریں؟ اس لیے مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔“ مشاہیر خان کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ وہ جگہ جہاں گرا کر مر رہا تھا وہاں اس طرح کی کوئی واردات ہوجانے تو وہاں کی پولیس کا بھلا نام سمجھا جاتا تھا۔

”ٹھیک ہے خان... جیسا تم مناسب سمجھو۔ میں وہاں کی انتظامیہ سے ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ تمہارے ساتھ تعاون کریں۔“ اس نے مشاہیر خان کو اجازت دی اور کال منقطع کر کے سیٹ کی پشت سے سر نکال لیا، گھر، اسپتال اور ماہ بانو سمیت ایک پورے ضلع کی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا اس کے شانوں پر تھا اور وہ بے ظاہر آرام وہ انداز میں بیٹھا ہونے کے باوجود اندرونی طور پر ان ساری ذمہ داریوں سے اسن طور پر بوجھ دہرا ہونے کی تدبیر سوچنے میں ابھی ہوا تھا۔

وہ بہت دیر سے غامدی دیوار سے پشت دکائے ایک ہی پوزیشن میں ٹھکی ہوئی تھی۔ اسے کچھ گریوں لگتا تھا جیسے قدیم دیو بالائی داستانوں میں مذکور کسی دیوی کا سندی آنکھوں والا مجسمہ دیوار کے ساتھ لگا ہوا ہو لیکن ایک ایسا مجسمہ تھا جس کے خطوط میں ایک آچنگ سے ہونے والی حرکت سانسوں کے تھوچ کو ظاہر کر رہی تھی۔ سانس بوندگی کی علامت ہے اور جس کے دم سے ہی سارے جذبے اور خواہشیں قاصر ہیں۔ سانس جسم کا ساتھ چھوڑ دے تو جس سے حسین انسان بھی مٹی کے قویر کے برابر ہو جاتا ہے۔ چھروں سے تراشے گئے بھی اپنی تمام تر خوب صورتی کے باوجود صرف سانس کی عدم موجودگی کے باعث اوجھڑ رہ جاتے ہیں۔ ایسے مجسموں کے لیے دیکھنے والی آنکھ میں حسین تو ہوتی ہے لیکن دل میں جذبات نہیں۔ اور اس کی خوبی یہی تھی کہ وہ اور مٹی نہیں تھی، اس کے انگ انگ میں زندگی بھری تھی۔ جوانی اور شباب سے چڑ زندگی جو دیکھنے والی آنکھ میں صرف حسین نہیں

بھرتی، پورے وجود کو کاساتی ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ لپک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور بے ظاہر اپنے ارد گرد سے بے نیاز تھی لیکن اچانک ہی اسے اپنے جسم پر بوند نیلیاں سی رہ گئیں محسوس ہوئیں۔ اس کی زائد جہالت نے فوراً اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجائی اور اس نے چوک کر ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس سے پہچھی فاصلے پر ایک پختہ عمر کا لکھی ہوئی ڈائمنی اور بالوں والا شخص کھڑا اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ ان عجیب و غریب لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں وہ کینڈا اس ٹھنک سے افوا جو کر اس برف دار میں آنے کے بعد سے مسلسل اپنے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ وہ سارے لوگ بڑے عجیب تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ایک زمانے سے تہذیب یافتہ دنیا کی شکل نہ دیکھی ہو۔ ان کے چہروں سے وحشت برسی تھی اور آنکھوں میں کسی جنگلی جانور کی سی زندگی تھی۔ ان کے اعضاء کے تناؤ سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ہتھکڑ پر گھات لگائے بیٹھے ہوں اور کسی بھی ٹپ اس پر بھٹت پڑنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ ان عجیب و غریب لوگوں کے ساتھ ان کی دنیا میں قیدی کی حیثیت سے رہ رہی تھی اور حیران تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کس مقصد کے تحت دنیا سے کٹ کر اس دیرانے میں رہ رہے ہیں؟ اس بات کا تو اسے حتمی یقین تھا کہ بہر حال، وہ اس جگہ کے قدیمی باشندے نہیں ہیں۔ وہ سب باہر کی دنیا سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان کے رنگ روپ اور لہجے چٹلی دکھاتے تھے کہ وہ مختلف علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے طبع بے شک یکساں تھے۔ ان کی بڑھی ہوئی فائز حیاں اور اٹھتے ہوئے بالوں نے انہیں ایک دوسرے سے مشابہ ظاہر کرنے کی کوشش بھی یا پھر اس علاقے میں پانی اور دیگر سہولیات کی قلت کے باعث ان کے لیے خاموش کر دیا لیکن نہیں تھا، وہ ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ ان کے جسموں پر موجود لباس بھی ایک جیسے تھے۔ وہ بدیرنگ اور گھٹے ہوئے اونٹنی پاجاموں کے ساتھ ہی بٹن شرٹ نما ٹیئیں پہنے ہوئے تھے۔ یہ مشن کر کے حلیے اختیار کر لینے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ شناخت کیے جا سکتے تھے۔ ان میں کوئی گورے رنگ اور سبزی بالوں کا مالک تھا تو کوئی لیے قد اور کھڑے کھڑے نہیں نکش والا۔ سیاہ کورتال سے رنگ والوں کے ساتھ ہونے قد اور سانوی رنگت والے چہرے بھی وہاں نظر آ رہے تھے۔ یہی حال زبان کا تھا۔ وہ جو زبان انہیں میں بولتے تھے اس میں سندھی، مراٹھی، پنجابی، پشتو اور انگریزی کے الفاظ آپس میں اس طرح مدغم ہو گئے

ماؤ تھیں جس میں بولی اور سواگل کے لیے بچے رکھ کر سیدی ہوئی۔
 "کون ہے؟ اندر آ جاؤ۔" بلند آواز میں دیے گئے اس
 جواب پر حارہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ رانی گونود
 اس نے اپنی ہچکچاتی چیزوں کی خریداری کے لیے ڈرائیو
 کے ساتھ مارکیٹ تک پہنچا ہوا تھا۔ پہلے بھی اس کا لاہور آنا
 ہوتا تھا تو وہ اپنی ہر طرح کی خریداری کے لیے خود ہی جانا
 کرتی تھی۔ اس طرح اسے کچھ وقت آزاد فضا میں سانس لینے
 کا موقع مل جاتا تھا لیکن اب وہ خود کو بھی سے باہر نکلنے سے
 گریز کر رہی تھی تاکہ آفتاب کی لاہور آمد پر جب باہر نکلتا
 پڑے تو لٹاڑ میں کوئی محسوس نہ ہو سکے کہ وہ روز بروز سیر پانے
 کرنے چلی جاتی ہے۔

"کیا کام ہے حارہ؟ کیوں آئی ہو؟" بے نیازی کا
 مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے حارہ سے پوچھا۔
 "وہ بی بی... آپ سے ملنے کے لیے ایک عورت آئی
 ہے۔ کتنی بے کشور بی بی سے ملتا ہے۔" حارہ نے اپنی آمد کا
 مقدمہ بتایا۔

"یہاں کون عورت مجھ سے ملنے آ سکتی ہے؟" وہ
 حیران ہوئی۔ "تم نے نام پوچھا تھا اس عورت کا؟"
 "جی بی بی! پر اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ بس یہی کہتی
 ہے کہ آپ سے ملتا ہے۔ مئی چوڑی سی برقع والی عورت
 ہے۔ منہ پر شاد بھی لگایا ہوا ہے۔ آپ کہیں تو میں جا کر منع
 کر دوں... جانے کون عورت ہے؟ چکیدار نے اسے کیٹ پر
 ہی روک رکھا ہے۔" حارہ نے اسے تشکیلات سے آگاہ
 کرتے ہوئے اپنی طرف سے آنے والی عورت کو ٹالنے کے
 سلسلے میں اجازت بھی چاہی۔

"نہیں، رہنے دو۔ میں دیکھتی ہوں۔ شاید میری کوئی
 جانتے والی ہی ہو۔" وہ ابھی ابھی سی بسز سے اتر کر کمرے
 سے باہر کی طرف چل پڑی۔ حارہ کو اس کے پیچھے پیچھے
 "چکیدار سے کہو کہ عورت کو گھٹ سے امداد آنے
 دے۔" گھٹ سے کافی فاصلے پر ہی رک کر اس نے حارہ کو
 حکم دیا تو وہ تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی جبکہ کشور اپنی جگہ
 رک کر انتظار کرنے لگی۔ حارہ نے اس کا حکم چکیدار کو پہنچایا
 تو ڈراپر کے نزدیک کے بعد اس نے ڈی کیٹ کھول کر
 عورت کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ مئی چوڑی عورت
 سر جھکا کر اندر داخل ہوئی اور اعتاد سے چلتی ہوئی فاصلے پر
 کھڑی کشور کی طرف آئے گی۔ اس کے پیچھے چکیدار داخل
 تھا۔ بائیں اراٹ کھڑا تھا۔ عورت ذرا ابھی کوئی ایک سیدی
 حرکت کرتی تو وہ اسے فوراً گولی مار دیتا۔ کشور خود انہیں میں

کھڑی اس عورت کو دیکھ رہی تھی جواب اس سے ذرا سے
 فاصلے پر آ کر رک گئی تھی۔

"کون ہیں آپ... اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتی
 تھیں؟" عورت کے اعتاد سے ذرا سا خائف ہوتے ہوئے
 اس نے پوچھا۔ جو اب عورت نے کچھ ہونے کے بجائے ہاتھ
 بڑھا کر اپنے چہرے پر موجود نقاب ہٹا دیا۔ نقاب کے پیچھے
 سے نمودار ہونے والے چہرے کو دیکھ کر کشور بری طرح ہوشی
 لیکن یہ اس کا ابتدائی رد عمل تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غرور
 مسرت سے عورت کے گتے لگے بچی تھی۔

"آپ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہیں۔ مجھے یقین نہیں
 آ رہا۔" اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ کچھ میں بھی بے پناہ
 خوشی تھی۔

"میں نے سوچا کیا فی دیر رانی کا حال چال ہی معلوم کر
 آؤں۔" وہ بے تہداری خوشی دیکھ کر تو مجھے سوچنا پڑا ہے کہ مجھے
 سامنے دیکھ کر تہداریہ حال ہے۔ تو اگر جو بھی دیر ہی اس طرح
 اچانک آگے تو تم کیا کرو گی؟" وہ منکرہ کر دہی آواز میں بولتی
 ہوئی کشور کو چیلنے لگی۔ اس پیچھے چھوڑ کر کشور کا چہرہ کھل رنگ
 ہو گیا لیکن پھر وہ تو رانی سے چونک کر اپنے اطراف میں دیکھنے لگی۔
 اسے ڈر محسوس ہوا تھا کہ کہیں حارہ نے مہتاب کے الفاظ نہ سن
 لیے ہوں لیکن یہ تو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ حارہ کافی فاصلے پر
 تھی۔ چکیدار تو تیز چلائی دور۔

"نہیں، اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔" اس نے
 مہتاب کا ہاتھ تمام کر اندر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور پھر
 پلٹ کر حارہ سے ٹکرائے۔ "بھئی میں بولی۔" بھئی سے آتش
 چائے تیار کر کے لے آؤ اور پھر اچھا سا کھانا بھی تیار کر لینا۔"
 "کھانے دانے تک میں نہیں رکوں گی۔ دو تو میرا تم
 سے ملنے کا بہت دل چاہ رہا تھا اس لیے چلی آئی۔ بچے اسکول
 گئے ہوئے ہیں۔ ان کے واپس آتے تک مجھے گھر بیٹھنا ہو
 گا۔" اس کا حارہ کو باجائے والا حکم سنتے ہوئے مہتاب نے
 صحت اس پر صورت حال واضح کی۔

"تو آپ بچوں کے اسکول سے آئے کے بعد انہیں
 بھی اپنے ساتھ لے کر آجائیں نا۔ میرا تو خود بڑا دل کر رہا
 ہے ان سے ملنے کا۔" مہتاب کی بات سن کر وہ مت بڑھتے
 ہوئے بولی۔ اب وہ دونوں اس کے بیڑہ دم تک پہنچ چکی تھیں
 اور کل کر بات کر چکی تھیں۔

"بچوں کو میں جان بوجھ کر ساتھ نہیں لاتی۔ بچے
 موصوم ہوتے ہیں۔" انجانے میں ان کی زبان سے کوئی ایسی
 بات نکل سکتی تھی جس کی وجہ سے تم مشکل میں پڑ جاتیں۔"

مہتاب نے اس کے بسز پر بیٹھتے ہوئے بچوں کو ساتھ نہ لانے
 کی وجہ بتائی۔

"اچھا، آپ یہ برقع تو تاریں اور آرام سے بیٹھیں۔
 ابھی بچوں کی پیمانی میں کافی وقت ہے۔ کھانا چاہے آپ نہ
 کھا سکیں لیکن درمیان کا وقت میرے ساتھ ہی گزارنا ہو گا۔"
 کشور نے بہت جلد سے کچھ میں کہا تو مہتاب مسکراتی ہوئی برقع
 اتارنے لگی۔

"وہی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنی پردہ دار
 خاتون ہیں کہ گھر سے باہر نکلنے کے لیے باقاعدہ برقع اور حجب
 ہوں گی۔ میں تو لٹاڑ مکی نہ بانی یہ سن کر حیران ہی ہو رہی تھی
 کہ کوئی برقع پوش خاتون مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ آپ نے اپنا
 نام بھی تو نہیں بتایا تھا۔"

"نام تو میں نے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ اچانک
 چہارے سامنے پہنچ کر تمہیں سر پائز دے سکوں۔ رہی
 برقع والی بات تو سچ کہوں، یہ برقع میں پردہ دار ہونے کی
 وجہ سے نہیں پہنچتی بلکہ اس لیے پہنچتی ہوں کہ خود کو کچھ لوگوں کی
 نظروں سے روک رکھ سکوں۔" مہتاب کا جواب سن کر اسے
 آفتاب کی اس کے متعلق سنائی گئی داستان یاد آگئی۔ مہتاب
 نے دور کی سوچی تھی جس کے لیے محبوب سے ملنے زندگی کی
 بنیادی شرائط تھیں اس ملنے کے لیے اس نے جو قدم اٹھایا تھا،
 وہ منہ زور لہروں کو کچے گھر سے پر پار کرنے سے کم نہیں تھا۔
 اپنے قبیلے کے رسم و رواج کو ٹھکرا کر وہ سادی دپٹا سے تاج تاج
 کر اٹھنے کی بن گئی تھی اور اب بھی اس خوف کا شکار تھی کہ
 جانے کوئی کبھی نہ لہرا سے اس کے کچے گھر سے سمیت بھاگ
 لے جائے۔

"اوہ... مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ میں آپ کے
 آنے سے پہلے آفتاب سے باتیں کر رہی تھی۔ ذرا انہیں آپ
 کے بارے میں بتا دو تاکہ وہ مطمئن ہو جائیں ورنہ بے
 چارے پریشان ہی ہوتے رہیں گے کہ میں کس مشکل میں
 گرفتار رہوں۔" مہتاب سے متعلق آفتاب کی بتائی ہوئی باتیں
 یاد آئیں تو ساتھ ہی یہ بھی یاد آ گیا کہ وہ آفتاب سے اپنی گفتگو
 اجوری چھوڑ کر حارہ کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔ اب یاد آیا تو
 فوراً سمجھ گئے تھے چھپا سواگل کال کر آفتاب کو خوشی
 سے مہتاب کی آمد کے بارے میں مطلع کیا۔

"ٹھیک ہے، آپ بھابی کے ساتھ انجوائے کریں...
 میں بھی اپنے کام و خدمت سے فرماتا ہوں۔" اس کی دی ہوئی
 اطلاع سن کر آفتاب نے کہا اور دونوں بند کر دیا۔
 "اب آپ بتائیں بھابی کو کیا حال ہے؟ بچے اور

افضل بھابی تو غیریت سے ہیں نا؟" آفتاب کی طرف سے
 مطمئن ہو کر وہ مہتاب کے برابر میں آ کر بیٹھی اور اس سے
 پوچھنے لگی۔ اپنا سواگل اس نے بے پروائی سے بیڑہ ہی ڈال
 دیا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔ بچے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔
 مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ کون چاہتی دو بارہ ہمارے گھر
 کب آئیں گی؟" مہتاب مسکراتے ہوئے اسے بتانے لگی۔
 اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی بے تکلفانہ باتیں کرتے ہوئے
 وقت گزرنے لگا۔ حارہ اس دوران کھانے پینے کی ہر تکلف
 اشیاء سے بھری فراخی کمرے میں پہنچ کر جا چکی تھی۔ رانی کے
 بارے میں بھی اطلاع مل گئی تھی کہ وہ مارکیٹ سے واپس
 آ چکی ہے اور اب باورچی خانے میں حارہ کا ہاتھ باندھ رہی
 ہے۔ مہتاب کے کھانے سے انکار کے باوجود کشور کوئی اسے
 واپس نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اگر مہتاب کھانے پر نہ بھی
 رکتی تو وہ بچوں کے نام سے اس کے ساتھ کھانا باندھ کر بھجوا
 دیتی۔ ابھی تو خیر وہ باتوں میں ملن نہیں اور مہتاب نے واپس
 جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ آج کی باتوں میں ملن وہ
 دونوں اس وقت چھٹیں جب کسی نے بنا دستک دیے دھڑ سے
 دروازہ کھولا۔ اس غیر مہذبانہ انداز پر کوئی رد عمل ظاہر کرنے
 سے کل ہی کشور نے کھلے دروازے میں کھڑی تاہید کو کچل دیا۔
 "السلام علیکم اماں! آپ یہاں... وہ بھی اتنی
 اچانک؟" وہ بولکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور ماں کی
 اچانک آمد پر حیرت کا اظہار کرنے لگی۔

"کیوں، میرے یہاں آنے پر پابندی ہے کیا؟" جیسے
 یہ تیرے باپ کی کوئی ہے، ایسے ہی میرے شوہر کی بھی ہے۔
 تو یہاں رہ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں رہ سکتی؟" چودھراجن تاہید
 نے نرے مجھے پتا ہے جواب دیا۔ عمو ماں کے انداز میں کشور
 کے لیے بڑی رعایت ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ خاصی خفا
 لگ رہی تھی کشور اس خفا کا پس منظر سمجھ سکتی تھی۔ تاہید نے
 اپنے لاہور کے دورے سے واپس جانے کے بعد یقیناً اس
 کے بارے میں ایسی باتیں کہی ہوں گی کہ اس کی ماں
 سے جبراً بائیں زادہ دن نہیں رکھا گیا اور وہ موقع ملنے ہی بیٹھی
 کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے لاہور آچکی۔ ماں کی
 آمد کا مقدمہ سمجھتے ہوئے کشور نے بے ساختہ ہی اپنے مہندی
 سے بچے ہوئے ہاتھ پشت پر کر لیے۔ اس کے ہاتھوں پر لگی
 مہندی بے شک مدھم پڑ چکی تھی لیکن آفتاب کی محبت کا جو رنگ
 اس کے پورے وجود پر چڑھا تھا وہ بہت پاک تھا اور اسے
 چھپانا بھی ممکن نہیں تھا۔ چودھراجن تاہید نے کسی جلی نظر میں

سجائے اسے بروایت کرتی رہی لیکن اس کی آنکھوں سے
جھلکتی نگاہوں کی روشنی تھی۔ چہاڑ کے بک آنے کے بعد
جب پرواز نمودار ہوئی اور چاکلٹ کی طرف سے مسافروں کو
سیٹ بیلٹ کھول لینے کا عندیہ دیا گیا تو چودھری نے خود سے یہ
معمولی کام انجام دینے کے بجائے اتر ہو کر کسی کی خدمات
حاصل کرنا ضروری سمجھا اور سیٹ کے ساتھ گئے مگر کوڈ ہانے
کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”لائیں جناب! میں آپ کی سیٹ بیلٹ کھول دیتا
ہوں۔“ چودھری کے ہنسنے دیکھنے سے پہلے اس کی ساتھ والی
سیٹ پر بیٹھا گورا شاہنگی سے رواں اردو میں بولا۔ ”گورے کی
زبان سے اتنی صاف اردو سن کر چودھری اتنا حیران ہوا کہ
ہن دہانا بھول گیا۔ اس کی حیرانی کی پروا نہ کرتے ہوئے
گورے نے اس کی طرف جھٹک کر اس کی سیٹ بیلٹ کھول
دی۔

”آپ تو بڑی صاف اردو بول لیتے ہیں۔ مجھے بالکل
انداز نہیں تھا کہ آپ اردو جانتے ہوں گے۔ شاید آپ نے
پاکستان میں طویل عرصہ گزارا ہے۔“ گورے کے اردو
بولنے پر حیرت کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ چودھری نے
انداز بھی لگایا۔

”ابھی کوئی بات نہیں ہے جناب! میں یہاں بے شک
کئی بار آچکا ہوں لیکن اردو میں نے یہاں سے نہیں بلکہ امریکا
میں ہی رہ کر سیکھی ہے۔ اصل میں مجھے زبانیں سمجھنا بہت
شوق ہے۔ میں اردو کے علاوہ اردو بھی کئی زبانیں روانی سے
بول سکتا ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھ سے ہانپانی میں بات کر سکتے
ہیں۔“ گورے نے اسے مزید حیران کیا۔

”پین کرینو ڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔ اردو اور پنجابی
بولنے والا امریکی مینو پہلی بار ہے۔ ایسا کروہ پہلے تھا
اقرار کروا دو کہ آگے چنی کل شل رہے۔“ چودھری نے
چڑبوش انداز میں فرمائش کی۔

”میرا نام ڈیوڈ ہے۔ چنے کے اعتبار سے میں انجینئر
ہوں لیکن سیاحت خصوصاً کھانپنگ کا بڑا شوق ہے۔ یہ شوق
مجھے باہر سفر کی ممالک کا رخ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔
آپ اپنے بارے میں بتائیے کہ آپ کیا فعل فرماتے ہیں؟
ویسے آپ کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے میں نے آپ کے
بارے میں جو اندازہ قائم کیا ہے اس کے مطابق تو آپ کوئی
فیوڈل لارڈی ہو سکتے ہیں۔“

”آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے جی۔ میرا نام
چودھری افتخار عالم شاہ ہے۔ میں چہاڑا ذاتی ایک گاؤں کا

مالک ہوں۔ پرکوں سے ہم وہاں صحرانی کرتے آ رہے
ہیں۔ پڑھنے لکھنے اور سیر و تفریح کے لیے ادھر ادھر آتے
جاتے رہتے ہیں لیکن پھر اپنے اصل ٹھکانے کی طرف پلٹ
جاتے ہیں۔ ابھی میں اپنے پتر سے نکلنے نکلنا چاہ رہا
ہوں۔ تھوڑے دن اس کے ساتھ رہ کر انہیں آجاؤں گا۔ میرا
پتر ذرا دھری کا ہے۔ پرکوں کی طرح اسے صحرانی کا
ذرا شوق نہیں ہے۔ امریکا میں رہ کر پڑھا لکھا اور اب وہیں
ملازمت کر کے خوش ہے۔ پتا نہیں آپ کے ملک میں ایسی کیا
کل ہے کہ ہمارے جوانوں پر جادو ہو جاتا ہے۔ واپس آنے
کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔“ چودھری نے شکوہ کیا۔

”ارے نہیں چودھری صاحب! ہمارے ہاں کچھ نہیں
رکھا ہوا جو کچھ ہے مصنوعی ہے۔ اصل حسن اور جادوگری تو
آپ کے ملک میں موجود ہے۔ میں تو آپ کے شمالی علاقہ
جات کے حسن کا اتنا عاشق ہوں کہ موقع ملنے ہی یہاں کا رخ
کرتا ہوں۔ کہنے والے آپ کے ناک پر بت کو دیا میری بیٹی
پر یوں کی سرزمین کہتے ہیں اور سچ کہیں تو مجھے بھی ان برف
پوش پہاڑیوں پر پریاں دھس کر بیٹھ کر نظر آتی ہیں۔ آپ
پاکستانی تو اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتے ورنہ ایک بار ان
برف پوش پہاڑوں کی سیر کے لیے چلے جائیں تو ہمارے
امریکا کو بھول ہی جائیں۔“ ڈیوڈ کے انداز سے ظاہر تھا کہ
واقعی وہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی خوب صورتی سے
بہت متاثر ہے۔

”آپ کہتے ہیں تو مانا ہی پڑے گا مسٹر ڈیوڈ! ہم
پاکستانیوں کو تو ویسے بھی امریکا کی ہر کل مانتے کی عادت
ہے۔“ چودھری اپنی بات کہہ کر دھڑکی بلند آواز میں ہنسا۔

”باتی باتوں کے بارے میں کچھ نہیں سنا چودھری
صاحب لیکن جو بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں، اس پر تو
آپ آگے نہیں بند کر کے یقین کر لیں۔... کیونکہ یہ بات تو آپ
جانتے ہی ہیں کہ ہم امریکی بھی کبھی کبھار جگہ جگہ پائے خرچ
نہیں کرتے۔ میں اتنا خرچ کر کے ان علاقوں کی سیر کرنے آتا
ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ خاص ہے ان علاقوں
میں ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اپنی رقم ضائع کرنے
کی؟“ ڈیوڈ نے اسکی دلیل دی کہ چودھری کو قانگ ہونا پڑا۔

”اچھا تو تھوڑی ٹھیک ہے۔ اب تو میرا بھی دل چاہ رہا
ہے کہ میں ادھر کی سیر کے لیے جاؤں۔“

”تو ایسا کریں نا چودھری صاحب! میرے... ساتھ
پر گرام رکھ لیں۔ آپ مجھے اپنا کالکٹ نمبر دے دیں۔ میں
ٹیکسٹ نام پاکستان آؤں گا تو آپ کو انعام کروں گا۔ پھر

آپ میری ٹیم کے ساتھ چلے گا۔ ویسے ہم لوگ تو کافی اوپر
تک جاتے ہیں۔ آپ کی جہاں تک ہمت ہو ہمارا ساتھ دیجیے
گا۔ اصل میں کھانپنگ میں شوق کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔
آپ کے ہاں لوگ اپنی شوق میں کھانا نہیں رکھتے اس لیے
زیادہ بلندی تک نہیں جاتے ورنہ تو ہمارے پاس ان لوگوں
کی بھی مشا میں ہیں جو سترہ اسی سال کی عمر میں کے نو کے تیس
کیس تک پہنچ گئے۔“ ڈیوڈ کے آخری الفاظ نے چودھری کی انا
کھوڑک پہنچائی لیکن بہر حال، سچ تھا اس لیے وہ چاہنے کے
باوجود ڈیوڈ کے سامنے کوئی بڑک نہیں مار سکا۔ اگر وہ ابھی اپنی
جوان مردی کا دعویٰ کر بیٹھتا تو آنے والے وقت میں اسے
حادثہ نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ اس موضوع پر خاموشی کو ہی قیمت
جیانا اور ڈیوڈ کو اپنا کالکٹ نمبر لکھواتے گا۔

”تعلیم تو پھر ڈن ہو گیا کہ اب جب بھی میرا دوبارہ
پاکستان آتا ہوا، ہم ساتھ لے کر اپنی ڈیوڈ میں کے۔ ابھی
میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے حالیہ ڈن کی تصویریں دکھاتا
ہوں۔ بڑے شاندار سیر شوٹ کیے ہیں میں نے۔“ چودھری
کا کالکٹ نمبر نوٹ کرنے کے بعد ڈیوڈ اپنا ریفریف تیکس کھاتے
ہوئے بولا اور اس میں سے ایک بڑا سا لافاف نکالا۔

”اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے تصویریں بنائی تھیں میں
نے۔ زیادہ تر تو ابھی کیمرے میں ہی محفوظ ہیں۔ بس کچھ
خاص خاص تصویریں جو مجھے زیادہ ہی پسند آئی تھیں، انہیں
میں نے یہیں سے ڈیوڈ پر کرا لیا۔ آپ تصویریں دیکھیں
گے تو خود میرے حسن نظر کے قائل ہو جائیں گے۔“ اس نے
لافاف چودھری کے ہاتھ میں تھمایا۔ لافاف کے وزن سے
اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں ابھی خاصی تصویریں موجود ہیں۔
چودھری نے لافاف کھولا تو اس میں سے ایک اہم برآمد ہوا۔ وہ
سیر اشتیاق انداز میں اہم کھول کر اس میں لگی تصویروں کا جائزہ

لینے لگا۔ ڈیوڈ کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔ واقعی اس نے بڑی خوب
صورتی سے قدرتی مناظر کو کیمرے کی آنکھ سے قید کیا تھا۔
چودھری بے ساختہ ہی تعریفیں کرتا ہوا ایک ایک تصویر دیکھتا
آگے بڑھتا رہا لیکن پھر ایک ایک مقام پر اس کی ہوتی بند
ہو گئی اور وہ حیرت سے گنگ تصویر میں نظر آنے والے چہرے
کو دیکھنے لگا۔ بھاری گرم لہاو سے میں کسی پہاڑی دوشیزہ کے
روپ میں موجود وہ لڑکی ماہ بانو ہی ہے، اسے شناخت کر لینے
کے باوجود اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی انا
کے لیے امتحان بن کر اس کی ٹیم میں جھپٹ لینے والی ماہ بانو
چہرے پر مسکراہٹ سجائے خوشی کی نگاہوں میں شرکت کرتی پھر
دہن بھی... اس بات کو سوچ کر اس کا تن بدن گنگ اٹھا۔

”خوب صورت لڑکی ہے نا چودھری صاحب؟ مجھے
بڑی اچھی لگی تھی اس لیے میں نے اس کے کئی پوز لے لیے
تھے۔ آپ آگے دیکھیں، آگے اور بھی پوز ہیں اس لڑکی
کے۔“ چودھری کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈیوڈ نے اس
سے کہا اور پھر خود ہی ہاتھ بڑھا کر کئی تصویر سائے کر لی۔
”یہ لڑکی آپ کو کہاں ملی تھی مسٹر ڈیوڈ؟“ تصویر پر نظر
جمائے جمائے چودھری نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں ڈیوڈ سے
سوال کیا۔

”اسے میں نے ایک پہاڑی گاؤں میں دیکھا تھا۔
میں اپنی ٹیم کے ساتھ اس گاؤں کی یکپہنگ سائیں موجود تھا
کہ ہمیں اطلاع ملی، گاؤں میں شادی کی تقریب ہو رہی
ہے۔ ہم لوگ مقامی شادی دیکھنے کے شوق میں بغیر دعوت
کے وہاں جا پہنچے۔ بڑے اچھے مہمان تو اڑ لوگ تھے گاؤں
والے۔ انہوں نے ہمارے اس طرح بیٹھنے کا برا نہیں مانا بلکہ
تصویریں بنانے کی بھی اجازت دے دی۔ تصویریں بناتے
ہوئے میری اس لڑکی پر نظر پڑی تو میں بے ساختہ ہی اس کی
کئی تصویریں لے بیٹھا۔“ ڈیوڈ نے تفصیل سے اس کے سوال
کا جواب دیا۔

”اس گاؤں کا کیا نام تھا مسٹر ڈیوڈ؟“ ڈیوڈ کی
تفصیلات میں سب کچھ ہونے کے باوجود بنیادی جواب نہیں
تھا اس لیے اس بار چودھری نے ذرا زیادہ وضاحت سے اپنا
سوال دہرایا۔

”خیریت ہے چودھری صاحب! مجھے لگتا ہے کہ آپ
اس لڑکی کو جانتے ہیں اور اس کی تصویر دیکھ کر کچھ پریشان ہو
گئے ہیں؟“ ڈیوڈ کا انداز اگرچہ سرسری تھا لیکن وہ بہت گہری
نظروں سے چودھری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے
رہا تھا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی اس لڑکی کو جانتا
ہوں۔ اس کا نام ماہ بانو ہے اور یہ میرے ایک حراس کی بیٹی
ہے۔ پہلے کافی دنوں سے اپنے گھر سے غائب ہے اور اس
کے ماں باپ اس کے لیے بے حد پریشان ہیں۔ میں نے
اپنے طور پر اسے تلاش کروانے کی کوشش کی تھی لیکن میرے
لوگ کامیاب نہ ہو سکے۔ کسی کو گمان ہی نہیں تھا کہ لڑکی اتنی
دور ایک پہاڑی گاؤں میں پہنچی ہوئی ہوگی۔“ چودھری نے
ایک ہمدرد مسکراہٹ کا سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے ڈیوڈ کو
تفصیلات سے آگاہ کیا۔

”اوہ، آئی سی! خیر، آپ فخر نہ کریں بلکہ یہ سمجھیں کہ
آپ کی تلاش آپ ختم ہوئی۔ میرے رائے میں وہاں ہم

لینڈ کر جائیں پھر میں پاکستان میں موجود اپنے دوستوں سے رابطہ کر کے اس لڑکی کو اس کی موجودہ قیام گاہ سے بازیافت کرالوں گا۔ اگر ان لوگوں کا معاملہ ہے تو میں آپ کی پونیس کے ذریعے بھی یہ کام لے سکتا ہوں۔" ڈیوڈ کے لکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ غیر ملکی ہونے کے باوجود پاکستان میں کافی مضبوط رابطہ رکھتا ہے۔

"نہی اپونیس کے ہاتھ میں معاملہ نہیں دیتا ہے۔ وہ لوگ خواہ مخواہ کا ایجنڈا دیتے ہیں۔ مجھے لڑکی بالکل مازداری سے اپنے قبضے میں چاہیے۔" چودھری نے غوراً ہی ڈیوڈ کی تجویز سے انکار کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"جیسا آپ چاہیں، ویسا ہی ہوگا چودھری صاحب! آخر آپ کی طرف دوڑی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو وہ تو کسی بھائی بھی ہوگی۔ میرے خیال میں ہم منزل پر پہنچ جائیں تو پھر اس موضوع پر عمل کر بات کریں گے۔ آپ مجھے تفصیل سے بتائیے کہ اگر آپ کا پریشانی لڑکی کی کیا اعتراض ہے۔ بلکہ ایسا ہے کہ میں آپ کو اپنے ہاں کھانے پر انوائٹ کروں گا پھر ہم مکمل کر اور اتحاد کی تفصیلات بات چیت کریں گے۔ آپ البتہ اتنا اطمینان رکھیں کہ آپ کی ماہ بانو اب آپ کے ہاتھ سے نکلنے والی نہیں ہے۔ وہ ہماری نظر میں ہے بلکہ آپ ایک طرح سے یکنی جھپٹیں کہ وہ ہمارے پاس ہے۔ آپ جب چاہیں گے، وہ آپ کو مل جائے گی۔" ڈیوڈ کے آخری جملے بڑے مٹتی نظر آتے۔ ان جملوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ماہ بانو کو ابھی طرح جانتا ہے اور چودھری کی اس کے لیے بے ثباتی سے بھی واقف ہے۔ یہی اب تک جو کچھ چودھری کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا، وہ محض ایک ڈراما تھا۔ اس ڈرامے کا مقصد سمجھنے کے لیے چودھری، ڈیوڈ کے چہرے کا ٹوٹنے والی نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ وہاں صاف لکھا تھا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں ہے۔

"کون ہو تم؟ اور ماہ بانو کے بدلے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے سرد سے لکھنے میں ڈیوڈ سے دریافت کیا۔ "ان سوالوں کے جواب کے لیے آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔" ڈیوڈ نے اس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں جواب دیا اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سیٹ کی پشت سے ٹپک لگا کر آنکھیں موندتا ہوا بولا۔ "ایکسپیکٹ می! میں بہت تھک گیا ہوں، اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے لکھنے اور چہرے کے تاثرات میں وہی رعونت تھی جو سکرانی کرنے والوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ چودھری اندر ہی اندر بیچ و تاب کھاتا خود بھی اس کی طرف سے رخ موڑ

گیا۔ ڈیوڈ اس کی جاگہ پر کام کرنے والا کوئی بے بس مزارع نہیں تھا جس سے وہ کسی قسم کی زبردستی کر سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا موڈ خراب کر سکتا تھا، سو وہ تو پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ حراج کی اس خرابی نے اسے طویل سفر میں اتر ہو سٹوں سے دل پٹوری کا خیال بھی بھلا دیا تھا۔

☆☆☆☆

کشور بستر پر چپٹ لیٹی کر کے کی چھت کو گھور رہی تھی۔ یہ کمرہ اس کے لیے ایک ایسے فکس کے ہاتھ تھا جہاں اسے ہر حال میں لوٹ کر واپس آنا ہی پڑتا تھا۔ اس بار بھی وہ لاہور میں آزادی کے چند دن گزارنے کے بعد واپس یہاں پہنچا دی گئی تھی۔ چودھرائی ناہید نے اس کی ایک نہ سنتے ہوئے اسے اپنے ساتھ چلی آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چوٹی کی یہ قید اس پر پہلے ہی اتنی بھاری نہیں گزری تھی جتنی کہ اب... اب تو دل ہمیشہ اپنے دلدار کے ساتھ رہنے کی خواہش کرتا تھا لیکن اچانک چوٹی واپس نے سب کچھ درم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جو آنے والے دنوں میں ایک بار پھر آفتاب کی ہاتھوں میں مل کر زندگی کی خوشیاں کشید کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی، ایک دم ہی زمین پر آگری تھی۔ بالائے ستم یہ کہ آفتاب سے رابطے کا ذریعہ وہ موبائل بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ موبائل کو اپنی ملکیت نہ ظاہر کرنے کے چکر میں اسے موبائل مہتاب کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ اس وقت اگر موبائل ہی اس کے پاس ہوتا تو وہ آفتاب سے بات کر کے ہی اپنی سلی کر لیتی۔ جب آئے سانسے بیٹھ کر ملاقات کرنے کی کوشش نہ لگے تو اس نشتے سے برقی آگ کا سہارا بھی قیمت لگتا ہے لیکن اس سے تو یہ سہارا بھی جدا ہو گیا تھا۔ لاہور سے پھر آباد واپس آتے وقت راستے میں اور اب اپنے کمرے میں عالم استراحت میں بھی اس کا ذہن مسلسل اپنے موبائل میں ہی لگا رہا تھا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ آفتاب میری کال کا انتظار کر رہے ہوں گے، انتظار سے تھک کر اب انہوں نے خود کال مانی ہوگی۔ شاید مہتاب بھائی نے ان کی کال ریسپونڈ کی ہو اور بتا دیا ہو کہ کشور کو اس کی ماں واپس چوٹی لے گئی ہے۔ آفتاب یہ اطلاع سن کر بڑے مایوس ہوئے ہوں گے۔

آفتاب کی مایوسی کا سوچ کر وہ مزید افسردہ ہو گئی اور چھت پر سے نظر ہٹا کر اپنے ہاتھوں پر ڈالی۔ کچھ دن خوب نکل کر انارک بھانے والی ہندی کے فکس ونگار بے حد ہضم پڑ چکے تھے لیکن وہ دن کے رنگ سے ہٹ کر بظاہر غیر سرگرم لیکن جھپٹا بہت کمرے آفتاب کی محبت کے رنگوں کو وہاں دیکھ سکتی تھی۔ یہ رنگ تو اس کی پور پور میں بس گئے تھے۔ اس کے

مضبوط مردانہ ہاتھوں کی پرجوشی گرفت، ہونٹوں کی نرم سی جلد، پرجوش لکھن کی شوٹی... سب کچھ ہی تو بڑی آب و تاب سے اس کے وجود سے اپنا جوا تھا۔ آفتاب نے اتنی نزاکت سے اسے اپنی محبت کے رنگوں سے رنگا تھا کہ وہ اس کی مہارت کی قائل ہو گئی تھی۔ اس کی بے رنگ تصویر آفتاب کی محبت کے رنگوں سے رنگ کر لیں گی کی کتاب اس کا دل چاہتا تھا، وہ ہر روز نئے سرے سے ان رنگوں سے رنگی جاتے۔ مگر یہاں اس فکس تک آفتاب کی رسائی ہی کہاں تھی؟ چوٹی میں مردہ کر وہ آفتاب سے ملنے کی خواہش کرتی تو اسے رات کی تیار کی میں چھپ کر اس انڈسٹریل ہوٹم کو جانا پڑتا جہاں پہلی بار اس نے آفتاب کو اپنے جسم و جاں سونے تھے۔ جہاں وہ دو دن انکاح کے بندھن میں بندھے تھے اور آفتاب نے اپنے تعلق پر سے ہوس کا ٹیک ہٹا کر محبت کا جھنگ کا تانہ سن سناں آویزاں کر دیا تھا۔ انڈسٹریل ہوٹم تک راتوں کو چھپ کر ملاقات کے لیے جانا بہت خطرناک تھا۔ فکسوں سے وہ اتنا نہیں ڈرتی تھی لیکن کاح کے بعد اس نے خود اپنے آپ پر یہ پابندی عائد کر لی تھی کہ وہ اس جگہ آفتاب سے ملنے نہیں جائے گی۔ وہ اپنے کئی اس فیصلے پر قائم بھی رہتا تھا جتنی لیکن افضل اور مہتاب کے گھر اس کی اور آفتاب کی جو یادگار ملاقاتیں ہوئی تھیں، اس کے بعد آفتاب سے زیادہ دن کی دوری برداشت کرنا بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ لاہور سے روانہ ہونے سے لے کر اب تک وہ گھنٹوں اس مسئلے پر سوچتی رہی تھی۔ شاید بہت زیادہ سوچنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی دباؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ اسے اپنا پورا جسم بری طرح تھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے اس کی سانس بند ہو رہی تھی کہ وہ بستر سے اٹھنے کی ہمت بھی نہیں کر پاتی تھی۔ حالانکہ کئی بار فریڈ سے ملاقات کا خیال بھی دل میں آیا۔ سرماں نصیب فریڈ جو ذہنی معذور ہے لیکن او شاید منکوحہ کی حیثیت سے چوٹی کی اوپری منزل میں مقیم بھی اور جسے درحقیقت ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چودھری اپنی ہوس کا پیٹ بھرتے کے لیے چوٹی لے کر آیا تھا۔ وہ فریڈ سے مل کر اسے اپنے باپ کے فکس کے خلاف لڑنے پر اکسانا چاہتی تھی لیکن جب اس نے فریڈ سے ملاقات کے خیال سے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اتنی بری طرح سر پھٹ گیا کہ پھر وہ ہمت ہی نہیں کر سکی۔ طبیعت میں عجیب سا بھاری پن تھا۔ یہاں تک کہ ملازمدار اس کے کھانے کا پوچھنے آئی تھی تو اس نے انکار کر دیا۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ رانی اس کے ساتھ چوٹی واپس نہیں آئی تھی۔ اسے وہی چودھرائی کی طرف سے حکم جو بھایا گیا تھا کہ وہ لاہور والی فکس میں ہی رک

کر جا کر وہ کے ساتھ کچھ کام کاج دیکھے۔ کشور نے اس حکم پر احتجاج کیا تھا لیکن اس کے احتجاج کو خاطر میں نہیں لایا گیا اور رانی کو لاہور میں ہی رکنا پڑا۔ رانی کے بغیر وہ خود بالکل بے دست و پا محسوس کر رہی تھی۔ یہی تھی جو اس کی آفتاب تک رسائی کو ممکن بناتی تھی۔ وہ نہیں تھی تو نہ تو پیغام رسائی کا کوئی ذریعہ تھا، نہ ہی ملاقات کی کوئی تسلی لکائی جا سکتی تھی۔ چوٹی کے سازشی ماحول میں رانی جیسی وفادار ملازمہ کے بغیر موجودہ صورت حال میں رہنا اسے عذاب ناک لگ رہا تھا۔ اتنا عذاب ناک کہ سوچ سوچ کر سر پھٹنے لگا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے چکرانے سر کو چلیے پراہر ادھر بھتیخند کے مہربان ہونے کا انتظار کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور پھر رانی چوٹی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں بڑی سی ٹرے تمام رکھی تھی۔

"کھانا کھا لیں لی بی اوڈی دیر ہو گئی ہے۔ رات میں خالی پیٹ سونا محبت کے لیے چکا نہیں ہوتا۔" کشور کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ جھپٹ پھیلاتے ہوئے بولی۔ "مجھ سے کس نے کہا تھا کھانا لانے کو؟ چل جا یہاں سے۔ مجھے نہیں کھانا کھانا۔" چوٹی سے پہلے ہی اس کی جان چلی گئی اور اس وقت تو ویسے ہی طبیعت بڑی عجیب ہو رہی تھی اس لیے بالکل بھی برداشت نہیں کر سکی اور چوٹی کو ڈپٹ کر رکھ دیا۔

"یہ میرے کہنے سے آئی ہے۔" چوٹی اس کے حکم پر واپس پھرتی، اس کے بجائے کمرے میں وہی چودھرائی کی آواز گونجی۔ وہ شاید چوٹی کے پیچھے پیچھے ہی وہاں تک آئی تھی اور اب بالکل بین وقت پر ٹپک انداز ہوئی تھی۔

"مجھے اہم سے رانی کے شہر میں رکنے کی وجہ سے تجھے پریشانی ہو گی اس لیے میں نے چوٹی کو حکم دیا تھا کہ جب تک رانی چوٹی میں نہیں ہے، اسے تیرا خیال رکھنا ہو گا۔ چل اب اٹھ اور اٹھ کر کھانا کھا لے تاکہ اس دوپاری کی ذہنی بھی ختم ہو۔" چودھرائی کی طرف سے محبت کا یہ اظہار درحقیقت اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

"میرا نہیں کر رہا، وہی باس!" وہ وہی چودھرائی کے احرام میں لیٹنے سے اٹھ کر بیٹھتی تھی لیکن کھانا کھاتے پر پھر بھی آمادہ نہیں تھی۔

"جی نہیں کر رہا، تپ بھی تھوڑا سا کھالے۔ تیری طبیعت پہلے ہی خراب نہیں، جھوٹی رہ کر اور کمزور ہو جائے گی۔" چودھرائی اس دانتے کے حوالے سے اس کی طبیعت کو خراب قرار دے رہی تھی جب وہ چودھری کو فریڈ کے ساتھ قابل

اعتراف حالت میں دیکھ کر اسے حواس کھو بیٹھی تھی اور عالم طیش میں چودھری کے مقابل ٹھری ہو گئی تھی۔ اس وقت چودھری نے خود کو بچانے کے لیے اسے ذاتی طور پر بتا کر قرار دیتے ہوئے علانیہ کہ یہاں لاہور بھجوا دیا تھا حالانکہ درحقیقت خود اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا کہ اپنی پوری پکڑی جانے کے بعد بیٹی کا سامنا کرے اور اس سے نظر ملا سکے۔

”تو کیا ابھی تک ٹرے پڑ کر کھڑی ہے؟ یہاں رکھ لی جی کے سامنے۔“ اس بار چودھرائی نے چھی کو ڈانٹتے ہوئے تنہم دیا تو اس نے ٹرے کشور کے سامنے رکھ دی۔ کشور کو اندازہ ہو گیا کہ وہی چودھرائی ایسے ملتے والی نہیں۔ سچا ہے اسے دوبارہ اس قید خانے میں بلا لینے کی خوشی میں اس کی بے بسی سے ڈانٹا گئے کے لیے ہی کسی۔۔۔ وہ اس وقت اس کی اور وہی ٹھری تھی تو وہ اس کے حکم سے سر تابی کی جرأت نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ دل پر جبر کرتے ہوئے اس نے گھاتے سے بھری ٹرے کی طرف ہاتھ رہایا اور پلٹ میں ٹھوڑا سا سامان نکال کر روٹی کا لقمہ منہ میں رکھا۔ لقمہ منہ میں رکھتے ہی اسے زور کی اٹکائی آئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ غسل خانے کی طرف دوڑی لیکن اس بری طرح سر پھکایا کہ خود کو سنبھال نہیں سکی۔ اگر یہ وقت بھی اسے سہارا نہ دیتی تو وہ فرش پر گر پڑتی۔ چھی کے سہارے وہ غڑھالی اسے بستر تک پہنچی۔ منہ میں رکھا لقمہ تو پیلے پیلے پانی کے ساتھ چھیلے ہی نکل چکا تھا۔ بستر پر بیٹھنے کے بعد چھی اسے دوبارہ اٹکائی آئی، اس بار اس کے پیٹ سے صرف پانی نکلا۔

”ڈرائیور سے کہہ چھی کہ اسپتال سے ڈاکٹر کی کوٹے کر آئے۔ ڈاکٹر کی آکر دیکھ تو لوم ہو گیا کہ ہوا ہے کڑی کوہ؟ کشور وہی الٹیوں کے بعد چلی پڑی تھی اور اب بیڈ کی پشت سے قہقہے لگاتے نظر حال ہی ہے بے سانس لے رہی تھی۔ اس کی حالت کا بغور جائزہ دیتی چودھرائی نے سر سے انداز میں چھی کو حکم دیا۔ وہ فوراً اس کے حکم کی تعمیل کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

”اور ہاں، اس کی ماں کو بھی خبر کر دینا چھی کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں۔ اس کو اپنی نیندیں پوری کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی، وہی کی خبر کیا خاک رکھے گی۔“ یہ دوسرا حکم وہی چودھرائی نے چھی کے کمرے سے باہر نکلتے تلخے جاری کیا تھا جسے سن کر چھی تو سر ہلاتی باہر کی طرف دوڑ گئی لیکن نظر حال ہی کشور کے اندر عجیب سا احساس جاگا۔ وہی چودھرائی کے کیلئے کچھ میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اسے کھینچے پر مجبور کر دیا تھا۔ آخر ہوئی حالت کے باوجود وہ اس کی بات پر غور کرنے لگی۔ یک دم ہی اس کے اندر ایک

احساس ہانکا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ سوچنے کے نتیجے میں جو خیال ذہن میں ابھرا اس نے اسے لرزاکر دکھایا۔ وہ جو نظر حال کی بیٹی تھی، بیٹھنے کی سخت کھو بیٹھی اور بستر پر لڑھک کر گئی۔ زندگی سے اپنے صدمے کی خوشیاں دوسولتے ہوئے یہ خیال تو ذہن میں آئی نہیں رہا تھا کہ کبھی ایسی کسی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

”کیا کھل ہے وہی آیا؟ کیا ہوا ہے کشور کو؟“ وہ آنکھیں بند کیے خوف زدہ سی چلی گئی کہ اسے اپنی ماں چودھرائی ناہیدگی پریشان اور موکھالی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”طبیعت خراب نہیں ہے اس کی۔“ الٹیوں پر الٹیوں کر رہی ہے۔ اب کیا ہوا ہے؟ تو ڈاکٹر کی ہی آکر بتائے گی۔ ڈرائیور کو بھجوا دیا ہے میں نے ڈاکٹر کی کوٹے کے لیے۔“ وہی چودھرائی کے طور بھرے لہجے پر اندر ہی اندر مزہ لیتے ہوئے کشور نے آنکھوں کے درمیان ڈرا سی بھری بنا کر کھمرے کا منظر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جبکہ وہی چودھرائی اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھی فرش صاف کرتی شادو کا جائزہ لے رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے کشور؟ کیا الٹا سیدھا کھا لیا تھا جو ایسے طبیعت خراب ہو گئی؟“ چودھرائی ناہید نے کشور کے قریب آکر اس کا شات بلاتے ہوئے لرزائے ہوئی آواز میں پوچھا۔ کشور اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکی اور جب چاب پڑی رہی۔ سانسوشی سے بوٹھل کریشان کن لکات آفر کا رسی نہ کی طرح آگے بڑھ ہی گئے اور ڈاکٹر ماریا کو ملی آگئی۔ آتے کے ساتھ اس نے پیشورانہ انداز میں کشور کا چیک اپ کیا اور اس سے اس کے کھانے پینے کے متعلق پھرے ہوئے سوالات کیے۔ چیک اپ سے فارغ ہونے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی وہی چودھرائی کی طرف چلی اور اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ”پریشان کی کوئی بات نہیں ہے چودھرائی صاحبہ ایسا کوئی تشویش کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے کہ۔۔۔“ اس ”کہ“ کے آگے وہ ج بھی کہنے والی تھی، وہ دھوئی کے دروازہ کو کھڑا کر بھی رکھ سکتا تھا۔ آنے والے طوفان کی آغوش میں چودھرائی ناہید کا دل چاہا کہ وہ ڈاکٹر ماریا کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دے۔۔۔ جبکہ خود کشور کا یہ حال تھا کہ طبیعت کی خرابی سے اس کا پیٹ پڑ جانے والا چہرہ خوف کی زد وہی سے مل کر اور بھی پیلا ہو گیا تھا۔

خاندان وراثت کی شکل۔۔۔ بڑھاپے والی میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے مادہ پر ہیں

سکمر سے میں موجود تمام نفسوں کو اکٹرا مارا یا کاجلہ مکمل ہونے کے انتظار میں اپنی سانسیں روکے ہوئے تھے۔ وہ اکثر ماریا نے ان سب کے چہروں پر ایک نظر دوڑائی اور مسکراتی ہوئی بولی۔ "آپ لوگوں کے لیے ابھی خیر ہے کہ میں اپنے ساتھ گھوڑوں اور ضروری انجنین وغیرہ لے کر آئی ہوں۔ میں انجنین ابھی ڈپ لگا دوئی ہوں۔ انجنین کی وجہ سے جسم میں پانی کی جو کمی ہوگئی ہے، وہ پوری ہو جائے گی۔" ڈاکٹر ماریا جوں جوں بولتی جا رہی تھی، وہاں موجود افراد کے چہروں کی رنگت میں تغیر آتا جا رہا تھا۔ چودھرائی ناہید کے چہرے کی گھبراہٹ سے تدریج بھڑکان کے رکوں میں پہلنے لگی تھی۔ شوہر کے چہرے کی زردی میں بھی کی دانغ ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ماریا چودھرائی کے چہرے پر اپنی کے رنگ تھے۔ وہ تو ہنسنے لگی تھی کہ کوئی ایسا بات سامنے نہ آجائے جس کے ذریعے وہ سوکن کو ذلیل کرنے کا موقع نکال سکے لیکن ڈاکٹر ماریا کے الفاظ اس کی اس خواہش کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ اس کی کیفیت سے بے نیاز ڈاکٹر ماریا بے باقی بات جاری رکھی ہوئی تھی۔ "یہ ڈاکٹر ماریا کی بالکل ابتدائی آغاج ہے۔ ایک آدھ لائین سین اور ڈپ سے معاملہ منجھل جائے گا۔ انجنین کی وجہ سے انجنین ڈی ہائپریشن ہوگئی ہے۔ میں گھوڑوں پر حادثے کی تو یہ لیک ہو جاؤں گی۔" ڈاکٹر ماریا کی زبان کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی مصروف تھے۔ اپنا ہڈا اس کا کھول کر وہ اس میں سے ٹریسٹ کا سامان نکالتی جا رہی تھی۔

ابھر ڈاکٹر ماریا چودھرائی پر اس نے ہنسی کی۔ "تاہرہ کی زبانی اس نے شوہر کے لاہور کے قیام کے عرصے میں اس کے طبی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، اس سے وہ شک میں نہ آئی تھی۔ تاہرہ نے اسے بتایا تھا کہ شوہر نے کسی نئی ذہنی کی طرح ہاتھ چروا کر پھرنے لگا رکھی تھی۔ اگرچہ اس بات کو شوہر کی ذہنی کیفیت کی قربانی سے چھڑا کر تھا لیکن ڈاکٹر ماریا چودھرائی شک میں نہ آئی تھی۔ اسے شک تھا کہ شوہر کوئی کل کلا جیٹل ہے اور اس کا نتیجہ آج سامنے آنے والا ہے۔ لیکن خلاف توقع بات کہہ اور بولی تھی۔ ڈاکٹر ماریا نے بتایا تھا کہ شوہر ڈاکٹر ماریا کا شکار ہوئے ہیں اور اسے اطلاع گون کر ڈاکٹر ماریا چودھرائی کو ماریا بولی تھی۔ "سوئٹ کو بیچ دیکھانے کا ایک شہری صبح اس کے ہاتھ سے کل گیا تھا۔ وہ سوئی کی قربانی میں سب سے صحت دیشیت رکھتی تھی۔ چودھرائی کے بعد سوئی میں اس کا ہی سکہ چٹا تھا لیکن سوئٹ کا چھلایا اس صبح میں بھی اس کے دل میں ہزار رفت۔ چودھرائی ناہید آخر چہ اس کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رہتی تھی لیکن چودھرائی ڈاکٹر ماریا سے رک پٹپٹانے کا کوئی

موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اپنی ملازمہ خاصا رخصت کی زبانی یہ سننے کے بعد کہ شوہر کے پاس مہنگے جوتے مسلسل کھوت میں لگی ہوئی تھی کہ شوہر کی طرح رکنے والوں پر کڑے۔ اس مقدمہ کے لیے اس نے دستے کی بنیاد بھی اور شاہد کو شوہر کی عمر یا پر مامور کر دیا تھا لیکن ابھی تک اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت امید بندھ گئی تھی کہ شاید کچھ ایسا سامنے آجائے جسے شوہر کی مشکوک سرگرمیوں کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر ماریا کو ڈپ لگانے کی تیاریوں میں مصروف چھوڑ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ بیٹے ناہید اپنی دکان کے پاس۔ میں تو اب آرام کرنے جا رہی ہوں۔ نہ جانے کیا ایسا کھا کر بھیجی ہے کڑی کر آجی رات ویلے پر پٹائی کھڑی کر دی ہے۔" وہ مغرورانہ انداز میں اپنی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے بھی اور شاہد بھی تھا۔

"آپ بھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں بیٹھو چودھرائی! میں جوں جوں پران کی دیکھ بھال کے لیے۔" جانے سے پہلے اطلاع کر دوں گی۔ اگر ضرورت ہوگی تو آپ کسی ملازمہ کو ان کے پاس بھیج دوں گے۔" وہ بیٹھو میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے انجنین سے سوچا میں گی۔ اس لیے میں تو آپ کو بھیج دوں گی اور آرام کر لیتے ہیں اور آرام سے جا کر سو جاؤں۔" ڈاکٹر ماریا چودھرائی کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد ڈاکٹر ماریا نے چودھرائی ناہید سے کہا تو وہ بھی فوراً ہی پھر نکل گئی۔ سوئی کی پڑھیں ڈاکٹر ماریا میں جہاں دن رات ملازمہ میں خدمت کے لیے حاضر رہتی تھیں، انگوں میں شاد خواتین کو خود سے ہاتھ جو پلانے کی طبی عادت نہیں رہی تھی۔ ان کے پیچھے ملازمہ کوئی گھوڑا نہیں لے کر پڑے ہوئے تھے اور انجنین حادثے کی پوری آزادی میں چھوڑ کے سر ہانے بیٹھ کر خدمت کرتی۔ اس وقت بھی چودھرائی ناہید نے شوہر کے کمرے میں رانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے نزدیک ایک قاش ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے شوہر کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ خود کو بے آرام کرنے کے بجائے اس نے ڈاکٹر ماریا کے مشورے کو عمل کرنا بھڑکھا۔

شوہر نے اپنی ماں کے کمرے سے باہر نکلنے کا مشورہ دیکھا تو کرب سے انجنین موند میں بیٹھنے کے معاملے میں وہ مدعا قاش رہی تھی۔ یہی ساز و سامان سے بھرئی اس کو لیا

میں ہر طرح کا آرام تھا لیکن رشتوں کے درمیان وہ چہرے نہیں جتا نہیں اس کی پائیداری تھا کہ وہ کتاب کی طرف بڑھنے والے اپنے قدموں کو روک پائی۔ اس کی پیاری روح کو یہ اب کرنے والا جام میت آفتاب کے پاس تھا پھر وہ ہر خیرے کو گھسی پٹ ڈال کر اس کی اور سفر کرنے پر خود کو مجبور پائی تھی۔ آفتاب کی زندگی میں آمد کے بعد اس نے جانا تھا تھا خوش کیا ہوئی ہے اور زندگی کب جاری تھی ہے۔ آفتاب کی محبت اس کی ساری زندگی کی عمر میں کا ادا ہونا تھی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اپنی کئی ماں کی بے نیازی کو دیکھا تو یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ جو کچھ میں کر کر دی ہو، وہ قطعی جائز اور صواب ہے۔ وہ رشتے جتنیں میری پر والیں، میں ان کی خاطر سو اصرار میں آؤں گی جان سے کیوں لگا کر رکھوں؟ "فی الحال تو میں نے آپ کے مشکل سے بچا ہے لیکن آگے کیا چلے گا؟ آپ نے سوچا ہے یا نہیں؟" خیالات میں غمگین اور حیران شوہر کے کانوں سے ڈاکٹر ماریا کی آواز گونجتی چوہرہ کی طرف چوہرہ کی انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر ماریا کا جملہ کچھ نہیں کہانی کافی معنی خیز تھا۔ وہ چودھرائی ناہید کی ایک بار پھر پریشان ہوگئی۔

"گگ۔ کیا مطلب؟" اٹھتے ہوئے اس نے ڈاکٹر ماریا سے پوچھا۔

"مطلب تو آپ مجھ سے بہتر جانتی ہوں گی۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میں نے آپ کے جسم میں جس شے کا سراغ لگا کر ہے۔ آپ خود اس سے کیے ہوا وقت ہو سکتی ہیں؟ آپ کی رضا مندی کے بغیر تو آپ کے جسم میں ایک نئے وجود کی دانغ نہیں ڈالی ہوگی؟" ڈاکٹر ماریا کا طرز بھلا کر چہرہ دیکھا تھا جیسے سوئی کی کسی خاتون سے بات کرتے ہوئے ہونا چاہت تھا لیکن اس احترام کے ساتھ ایک شخص کی کئیات تھی تھا کبھی شوہر کو اس کے لیے، انداز کی کسی راز پر کر کے کی خدمت نہیں تھی، وہ تو بھی ابھی ڈاکٹر ماریا کے لیے گئے انجنین سے اٹھنے والے اطلاع دانی کی دوشم تھی۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے کسی خبر نہ پائی تھی؟ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس خبر کو کون کونسا خوف ہے جسے جس نے دل کو ہر کی طرح چلا رکھا تھا۔ اسے کرب شوہر کی نشانی کے اپنے وجود میں سانس لینے کی خبر نے فطری طور پر ہر عورت کی طرح اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی خوش گار سا منتشر رکھا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی راز کھل جانے کا خوف بھی چڑھا ہوا تھا۔ وہ پوری طرح خوش ہے میں نا کام تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جیسے ہی خبر سوئی جانوں کو لے گی، سوئی میں طوفان اٹھ کر آوے گا۔

سوئی کا قانون بھی کسی جگہ کے اس کے لیے سوائے سوت چوڑ کر دے گا۔ وہ زندگی بھر ایسی کچھ مرے ہی ابھی لگنے لگی تھی اس نے خود ہو جاتا اب اسے منظور نہیں تھا۔ خصوصاً یہ جانتے کے بعد کہ وہ کائنات کے سب سے عظیم رعبے پر فائز ہوئے وانی ہے۔ اسے زندگی کی اور بھی شدت سے خواہش ہونے لگی تھی۔

"چلیز ڈاکٹر! میرے اس راز کو راز ہی رکھیے گا۔ اگر یہاں کسی کو اس بات کا علم ہو گیا تو جو کچھ مجھے جان سے مار دیں گے۔" اس نے ڈاکٹر ماریا کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی لچاوت سے اس سے درخواست کی۔

"اوکے! میں کہیں کچھ نہیں بتاؤں گی لیکن سوال تو میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر کب تک؟ یہ کوئی جیتنے والی بات تو نہیں۔ میں اپنی زبان بند رکھوں گی لیکن کچھ مرے بعد آپ کا جسم خود بولنے لگے گا۔ اس وقت آپ کیا کریں گی؟" ڈاکٹر ماریا کا سوال بالکل منطقی تھا۔

"میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل سوچ لوں گی۔ بس مجھے خود ہی مہلت ملی جائے۔" وہ خود بھی اپنی اپنا آئندہ کا اندیشہ لے لیں کر سکتی، سو ڈاکٹر ماریا کو کیا بتائی۔ فی الحال تو اسے خود ہی مہلت مل جائے گی کسی آرزو تھی تاکہ اس مسئلے پر غور و خوض کر سکے۔

"شک ہے۔ میں آپ کے ساتھ اتنا کوڑا پھرتے کر سکتی ہوں کہ کسی کو چھو نہ بتاؤں۔ چند ضروری دوائیں وغیرہ بھی ہیں آپ تک پہنچاؤں گی۔" پراپرڈائن اور میڈیسن لکھی دہیں تو امید ہے کہ آپ کی حالت بہتر ہوگی۔ اس عرصے میں آپ اپنے لیے کوئی مناسب فیصلہ کر لیجیے گا۔" ڈاکٹر ماریا کبھی کے احوال سے سے نہیں بڑھ کر اس کی مدد کر رہی تھی۔

"شک کیوری ریج ڈاکٹر! شوہر نے ممنونیت کے تجربے احساس کے ساتھ اس کا طرز ادا کیا۔

"شوہر کی کوئی بات نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ جس، بول میں نہ پڑی ہیں وہاں اگر کسی کو اس بات کا علم ہو گیا تو آپ کی زندگی کو خیرہ و خوار الاق ہو جائے گا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے انسانی جان کو بچانے میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ آپ نے اپنی معاشرتی اور مذہبی حدود کو ڈاکٹر کے تو آپ کا مسئلہ ہے۔ میں بہر حال فائل ہونے کے ہائے ۱۱ انسانی جانوں کا تحفظ زیادہ ضروری سمجھتی ہوں۔" ڈاکٹر ماریا کے احوال میں بے نیازی کی دانغ تھی۔

"آپ کی اس بعد روٹی کے لیے ایک بار پھر بہت

سوچتے سوچتے اس کا سر ہڈی طرح پھرنے لگا۔

بچہ بیٹہ

دھڑ میں بیٹھے ایک قاضی کے مطالعے میں مصروف تھے۔ بارے ایک دوسری قاضی ہند کی اور کسی کی پشت سے لپکے گھر کر آگئیں موند میں۔ پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے احساس سے اسے لاہور سے واپس آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سہارا کی موت کے بعد وہ اپنے شانوں پر خاندان کی ذمہ داری کے بوجھ و محسوس کر رہا تھا لیکن بھوری بیٹی کی کہ وہ جس سیت پر بیٹھا تھا اس کے بھی بہت سے بھانپے تھے۔ اس نے شانوں پر اپنے زیریں طبق کے سینکڑوں خاندانوں کا بوجھ دھرا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان کو مصلحت نظر انداز کر کے، انہیں فوراً لوٹ آگیا تھا۔ اسے یہاں وہ کر بہت سے معاملات کی نگرانی کرنی تھی۔ بچہ آباد، نور پور اور اللہ آباد میں بددی قاضی قاضی منصب اس کی عدم توجہ کی وجہ سے کھلیاں میں پڑ جاتے تو اسے ماری کی زندگی افسوس رہتا۔ اس نے صرف افسر کی کا شوق پر مار کرنے کے لیے اسٹیشن کسٹمر کی ذمہ داریاں قبول نہیں کی تھیں۔ وہ ایک حساس شخص اور بڑے جوش و خروش کا حامل تھا جو کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا جس کے دل میں کوئی گواہی ذات سے بھرا کی پہچانے کی امید تھی۔ اس مسئلے نے اسے چودھری کے افکار جیسے گھر سے ہر لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چودھری نے اسے خود زور سے عرصے میں ہی اسے اچھا خاصا راج کر دیا تھا۔ اس کے منصوبے اور ادارے چودھری کے مفادات کے خلاف تھے چنانچہ پہلے تو اس نے دوش کا ہاتھ بدھا کر اس کو اپنی راہ پر لانے کی کوشش کی اور اشاروں و کتابوں میں اسے اس کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ شہر بارے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ براہ راست چودھری سے آسامی کی قیمت نہ آئے لیکن اس کوشش میں سیر حال دواپنے فرائض سے کوئی سی کا مرتب تو نہیں ہو سکا تھا، چنانچہ چودھری نے چھٹیش کی صورت میں ہی لگا۔ اسے اپنی دوش کے جال میں پھنسانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد چودھری کو جیسے جھگڑاؤں پر اتر آیا تھا جس کی سب سے بڑی مثال شہزاد شاہ کے دوسرے کے موند پر اسے ملنے میں نظر آ رہے تھے کھانے کے بعد اس کی کوششوں کے ساتھ قاضی اعتراض تھا وہ ہمارے کی صورت میں موجود تھی۔ اگر دواپنے دایاں سے تعاون نہیں کرتی تو وہ بری طرح چودھری کی اس جال میں پھنس جائے گا۔ ڈاکٹر مارک کے تعاون کے بعد وہ اسے قاضی سے مل گیا تھا کہ ان خونی کے قصوں کو حاصل کر کے شائع کرے لیکن یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ یہ

بہت غریب ڈاکٹر... البتہ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرے وجود میں بیٹے والے بیٹے کے باپ سے میرا نکاح ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے ڈاکٹر مارک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت ضروری کی تھی۔

”یہ تو بہت اچھا ہے کہ آپ کا بچہ جائز ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ جو بھی اس کے تئیں ہرگز بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ آپ کا نکاح ہو چکا ہے اور بیٹی طور پر یہ نکاح ہی ایسے شخص سے ہوا جو کا جو کوئی والوں کے لیے ناقابل قبول ہوگا۔“ ڈاکٹر مارک کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اس نے اس کم عمری میں بھی ایک دنیا دیکھ رکھی ہے اور حالات کا بالکل ٹھیک ٹھیک جزیہ کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس اس کی باتوں کے جواب میں ایک خاموش اعتراف کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”اگر آپ چاہیں تو مجھے اپنا مکمل راز دواں بنا سکتے ہیں۔ میں آپ کے سہیل سے مل کر آپ کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت نکال سکتی ہوں۔“ ڈاکٹر مارک نے اسے چھٹیش کی تو دوسرے میں پڑ گئی۔ ڈاکٹر مارک اپنے روتے سے بہت مہربان ثابت ہو رہی تھیں لیکن پہلی بار میں کسی پر اتنا اعتماد کر لینا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ اگر کسی موقع پر ڈاکٹر مارک کی زبان پر سچ آجاتا تو آفتاب کی زبردستی خطرے میں پڑ سکتی تھی اور وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی، چنانچہ وہ لکھی میں صر جاتے ہوئے بولی۔

”آپ کا شکریہ ڈاکٹر لیکن فی الحال میں اس معاملے کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ براہیں مائیں گی۔“

”جیسی آپ کی سرشتی، میری آخر بہر حال یہ قرار ہے گی۔“ ڈاکٹر مارک مسکراتے ہوئے اپنا سامان پیٹنے لگی۔ ”کل میں آپ کی دوا میں اور ڈاکٹر آئن شٹین بھولا ہوں گی۔ احتیاط کے ساتھ اپنا خیال رکھیے گا۔“ اپنا ایک کندھے سے لٹکاتے ہوئے وہ مشورے کو لے کر لوٹی اور کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھا گئے۔

”اگر آپ کھیں تو کسی خانہ کو آپ کے پاس بھیجیں اس“ اپنی برقعے سے پہلے اس نے شوشے سوال کیا۔ ”نہیں، میں اس وقت پانچ کی اپنی رہنا چاہتی ہوں۔“ مشور نے انکار کیا تو ڈاکٹر مارک نے اپنے اچکے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد ڈاکٹر نے دروازہ دھک کر آگئیں بند کر لیں۔ زندگی اسے ایک ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کوئی داب میں گھر محسوس کر رہی تھی۔ اس کو داب سے باہر نکلنے کا طریقہ

کوئی آخری وار نہیں تھا جو چودھری نے اس پر کیا تھا۔ وہ جب تک چودھری کے مفادات کے خلاف کام کرتا رہتا، چودھری کی نظر میں ہنگامہ نہ تھا۔

پچھلے آسمیت ارد گرد کے کسی بھی گاؤں میں کسی سہولت کی فراہمی اور تعلیم کا پھیلاؤ چودھری کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ چودھری اور اس جیسے دوسرے افراد مایا پر اسی وقت تک نگرانی کر سکتے تھے جب تک ان کا شعور بڑھتا۔ شعور کو سلائے رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان لوگوں کو تعلیم سے محروم رکھا جائے اور زندگی کی بنیادی ضروریات اپنی مرضیا تر سار کر فراہم کی جائیں کہ وہ ان ضروریات کے حصول میں ہی الجھ کر رہ جائیں۔ شہر بارے صنعت کے عوام کو ان دونوں طرح کی مشکلات سے نکلنے کا ٹھکانا تھا چنانچہ اس کی اور چودھری کی عداوت تو لازمی تھی۔ اس عداوت نے شہر بارے کے احساہی ذمہ داری کا ور بھی بڑھا دیا تھا۔ عام حالات میں شہر بارے تھوڑا بہت دھیان دے بھی جاتا لیکن موجودہ صورت حال نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس کے پاس کی کوتاہی کی معائنہ نہیں ہے، چنانچہ وہ ذاتی طور پر پہلے بددی اور پیچیدہ ہونے کے باوجود اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک بار بکر مریدان میں اتر آیا تھا۔ خاندانی ذمہ داریوں کے مقابلے میں یہ فیصلہ انجام دینا بڑا ضروری تھا، ہوسا اس لیے بھی کہ اس کا خاندان سیر حال کوئی لاوارث اور بے سہارا خاندان نہیں تھا۔ بہت سے رشتے دار اور دوست تھے جو ان مشکل گھڑیوں میں دلائے کے لیے راہ ہاتھ آتے جاتے رہتے تھے۔ خود وہ بھی ان سے مکمل طور پر غافل نہیں تھا۔ راتوں کی آسانی نے کم از کم اتنی مدد کی تھی کہ وہ بے چارہ قانون پر لاہور بات کر لیتا۔ اس کے علاوہ وہ تھا تو تھا حالات کے لیے بھی جایا جاسکتا تھا چنانچہ وہ بہت اچھی طرح پر پہلو پر غور کرنے کے بعد دباں سے واپس آگیا تھا لیکن بے ہوش تھا کہ جو تعلیم دیکھا تھا اس کے حصار سے نکلتا تھا آسمان نہیں تھا۔

اس وقت بھی اسے اس کا بہت شدت سے سجا رہا کی یاد آتی تھی اور وہ اپنا کام روک کر بیٹھ جاتے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سگے بھائیوں سے بڑھ کر محبت کرنے والے شہزاد کی موت کا حدمہ اپنا نہیں تھا جس کے اثر سے وہ خود کو آسانی سے نکال سکتا۔ جسے میں اچھے جوار بھانپنے کے ذریعہ آگئیں بندھے جیسے کتا وقت گزارا، وہ اندازہ نہیں کر سکا۔ اس کام پر تودہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”اب خدا انسان کو لوگوں کی بات ہے؟“ اس نے قدرے جزاری سے پوچھا۔ خیال یہی تھا کہ کوئی بے وقت کا ملاقاتی

اسے ہی صاحب سے راورم بیٹھانے کے لیے آیا ہوگا۔ ہوسکتا کو کافی وقت گزار جانے کے باوجود وہ کسی تک سے سلسلہ کا نہیں تھا۔ اس کے سرورہیے کے باوجود بھی بعض ذہین قسم کے ملاقاتی قسمت آزمائی کے خیال سے ملے جاتے تھے۔

”اللہ آباد سے ایک بہت بری خبر آئی ہے سہرا آپ کو اس کے بارے میں بتاؤ تھا۔“ عیدالمنان کا جواب غلاب توقع تھا۔

”میرے آفس میں آ جاؤ۔“ اس نے مختصر جواب دے کر ان کا کام کار کیوریور رکھ دیا۔ اللہ آباد سے کیا بری خبر کے بارے میں سن کر وہ خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اللہ آباد سے جزی کوئی بھی بات اس تک خوش کن حلیت نہیں ہوتی تھی۔ اللہ آباد ہی گاؤں تھا جس شاہنواز نامی شخص نے دینی مدرسے کے نام پر معصوم اور بھولے ذہنوں کی بریں دانتھک کر کے ان سے جن کے خلاف کارروائیاں کروانے کا اڈا کھول رکھا تھا۔ بعد میں واقعات و شواہد سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ شاہنواز کوئی عالم دین یا ملحق وغیرہ نہیں تھا بلکہ بڑی ہی ملک سے تعلق رکھنے والا ان کی کسی خیر یا کسی کارکن تھا جو اس پس ماندہ سے گاؤں میں یہ کہہ کر اپنے ملک کے مفاد میں کام کر رہا تھا۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے ذہن کو ہونے کر انیس پاکستان کے خلاف ہی استعمال کرنے سے بڑھ کر بھلا کس بات سے بھارت کا مفاد وابستہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو بھلا ہوا کہ اللہ آباد سے تعلق رکھنے والے جو شے نوجوان عبدالستین کو شہر بارے میں اس وقت شناخت کر لیا جب وہ لوہر پور میں اسپتال و اسکول کی تعمیر سے تعلق رکھنے والی اقتدار کی تقریب میں خود حملہ آور کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شہر بارہ عبدالستین کو نوہر پور والے حادثے سے پہلے سے جانتا تھا۔ عبدالستین وہ نوجوان تھا جس کی بہن کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا۔ لڑکی کا باپ شہر بارے کے پاس اس کے اغوا سے مسئلے میں شکایت کرنے آیا تھا لیکن اس وقت انہیں ہی رہنمائی دے رہی تھی اور اس کے باجھت نے شہر بارہ کو گمراہ کر کے اپنی کہانی بنا دی تھی۔ اصل حقائق بہت بعد میں شہر بارے کے سامنے آئے لیکن اس وقت عبدالستین کی کا پلٹ ہو چکی تھی۔ بہن کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور قانون کی بے نیازی نے اسے اتنا دل برداشتہ کیا کہ وہ شاہنواز کا آکا کار بن کر نوہر پور کی اقتصادی تقریب میں خود کو شعلہ کرنے لگی۔ اس حادثے میں خود کو شعلہ آور عبدالستین سمیت کئی لوگ مارے گئے تھے۔ حالات و واقعات کی گزیراں نوہر پور شہر بارہ اللہ آباد میں واقع شاہنواز کے مدرسے تک پہنچا تو

شاہنواز وہاں نہیں تھا لیکن ایسے ثبوت ضرور ملی گئے جن سے اس کا وہی ملک سے متعلق ظاہر ہو گیا۔ اس موقع پر شاہنواز کی شخصیت پر سے پردہ اٹھنے کے علاوہ دھڑا بادی مسجد کے معمر اور امام غلام محمد کے بارے میں بھی پتا چلا تھا۔ فوراً لوہی باقیات میں شامل ظاہر ہونے بھی ایک امام اور معلم کی شخصیت کی وجہاں بخیر دی گئی۔ باور کوکا انکوٹہ بھڑائی اس کی ادنیٰ بوس کا نشانہ بن کر اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ غلام محمد اسے قتل کرنے کے بعد فرار ہو کر اللہ آباد میں شاہنواز کے عدر سے شریعی چھپا تھا اور پھر شہر بارادور اس کی نیم کے چھاپا بارے سے شہر دی وہاں سے بھی فرار ہو گیا تھا۔ اسے بہت سارے ناخوش گوار واقعات کے ساتھ بڑے ہڈا بڈا کے ہم والے لگوں سے ایک اور بڑی خبر کے بارے میں شہر کرشمہ یاد منظر ہوا تھا اور یہ سبھی سے عبداللہ ان کے اپنے دفتر میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ عبداللہ ان کو ہاں پہنچنے میں ایک منٹ سے بھی قبل وقت ہی لگا ہو گیا لیکن اس قبل وقت میں بھی اس کی بے قراری وہی تھی۔

”اب عبداللہ ان ابولوکی مسئلہ ہے؟ کیا خبر آتی ہے اللہ آباد سے؟“ عبداللہ ان اندر آیا تو اس نے اس کے چہرے کے کھیر جراثیم کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ عبداللہ ان اچھا خاصا سیال سنگھ والا آدمی تھے جن میں اس وقت اس کے چہرے سے جو کیفیت جھلک رہی تھی اسے دیکھ کر اندازہ کیا گیا جاسکتا تھا کہ کوئی بہت ہی اشد جھٹکا واقعہ پیش آیا ہے۔

”خیر بہت افسوسناک ہے سراسر میں تو سن کر کاہل اٹھا ہوں کہ گئے ماں باپ بھی اسے بے رحم ہو سکتے ہیں۔ ابھی اطلاع ملی ہے کہ اللہ آباد میں دہنے والے ایک جوڑے سے اپنے ہاتھوں سے اپنے دو بچوں کو ہلاک کر کے گھر میں ہی دفن کر رکھا تھا۔ رات وہ اپنے تیسرے بچے کو بھی ذبح کرتے جا رہے تھے کہ بڑے بیوں کو غم ہو گیا اور انہوں نے دشمن انداز میں اس کے انہیں اس تمام حرکت سے روکا۔ اب وہ دونوں میاں بی بی تھے جس میں اور ان سے اس حرکت کے بارے میں اب پتہ چل چکا تھا۔“ عبداللہ ان کی دہی ہوئی اطلاع دانی کر دے تھیں۔ ”ماں باپ جیسے محترم رشتے کا یہ بھانک روپ بے جا ہونے والا تھا۔ اس خبر کو سن کر کوئی بھی سادہ دلی شخص رنج محسوس نہ کرنا ہی ممکن ہی نہیں تھا۔ والدین جو اپنی اولاد کی بیکارگی سے بھی پیٹلے سے اس کے متعلق چہنچاہا، خواب دیکھتا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا شروع کر دیتے ہیں، وہی اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیتی ہے کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟“ انہوں کوئی جاوہری پائے تو

اس سے محبت ہو جاتی ہے اور اسے کسی ضرورت کے تحت ضرور سے جدا کرتے ہوئے دھکی جاتا ہے تو پھر اپنے بچوں کو نہیں کی اس نے قدم قدم پر بھارت کی ہوتی ہے۔... زمانے کے سرد و گرم سہہ گر انہیں برکتی ہے جانے کی خوشی کی ہوتی ہے، انہیں اس بے دردی سے کیے ہلاک کیا جاسکتا ہے؟

”اس جوڑے کے بڑے بیوں کو کبھی علم ہوا کہ وہ لوگ اپنے قبیلے کے بچے کو ہلاک کرنے جا رہے ہیں؟“ دکھ کے شدید احساس کے تحت شہر بارانے واقعے کے بارے میں مزید تحقیقات جاننے کے لیے سال کیا۔

”بڑی بڑی بچے کی ماں کے بلند آواز میں رونے پر جاگے تھے۔ آدھی رات کے وقت انہوں نے اپنے ایک عورت کے دروازہ پر سے چھن کر لے کی آواز سنیں تو وہ مینہ سے جاگ کر اس کے گھر کی طرف بھاگے اور گھر کا دروازہ کھولا لیکن دروازہ کھٹکھٹا گیا۔ ایسا اندر سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے عورت کا شور مچا رہا ہو اس کا منہ پا کر اسے چہنچہا رہا۔ بڑے بیوں کو شک ہوئی اور ایک لڑکے نے دلوں پر ہاتھ رکھ کر اندر سے دروازے کی کڑی کھول دی۔ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے بالکل عجیب منظر دیکھا۔ گھر کے کچن میں ایک تازہ قبر کھدی ہوئی کسی اور قبر کے قریب چھوٹی تھیں سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں کچرا بھی تھا۔ اسی طرح جا کر وہ آواز نہ نکال سکے۔ ایک بڑی بڑی بچے کو ہڈیوں سے آواز کرنے لگا جبکہ باقی اندر کی طرف جھپکے جہاں دونوں میاں بیوی موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شوہر ایک ہاتھ میں تیز و تار چھری اور دوسرے میں بیوی کے بال جھڑک کر اٹھا تھا۔ اس نے عورت کو اس حد تک خوف زدہ کر دیا تھا کہ دوسرے کوئی تو دیکھ بھی نہیں نکال پادی تھی۔ بڑے بیوں نے بڑی مشکل سے سر کو ہٹا کر پھر اس کی پاس کی طرفوں نے لے کر عورت کو منہ والا۔ بی بی وہم اندیش ہو کر وہ اس اٹنی ہو گئی کہ لوگوں کو بتا سکے کہ اس کے بچے کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور پہلے ہی دو بچوں کے ساتھ کیا ہو چکا تھا۔“

”اور بی بی؟“ بی بی وہاں ہی بے حد افسوسناک صورت حال ہے جس کی ابھی خبر سنیں ہوئی جا رہی ہے۔ ویسے مجھے نہ تو ہے کہ پہلے دو بچوں کی ہلاکت کا بڑے بیوں کو کیوں غم ہو گیا ہو؟ کاؤں کی وجہات میں تو لوگ ایک دوسرے سے اسے غرض نہیں دیتے کہ انہیں ایک دوسرے کے حالات کا علم ہو۔ بچے کم از کم لوگوں کو پہلے دو بچوں کے غیاب پر تو ضرور پریشان ہو چکے تھے۔ “شہر بارانے ایک ایک کھوکھلا چاہے ایک ایک جگہ جو صورت حال سامنے آتی ہے اس کے

مطابق مجرم بہت چالاک اور منصوبہ ساز آدمی ثابت ہوا ہے۔ اس نے سارا کام بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ کیا۔ پہلے بچے کو ہلاک کرنے کے بعد اس نے اور دوسرے مشہور کردہ تھا کہ وہ بچے کو اس کی شہر پر گرا تو اس میں اس کی خالہ کے گھر رہنے کے لیے چھوڑ آیا ہے۔ دوسرے بچے کے بارے میں بھی اس نے یہی بہانہ کیا کہ بچے کا خالہ کے گھر بہت زیادہ تنگ تھا اس لیے اس نے اس کی شہر پر گرا دیا تھا۔ دوسرا بھی وہاں جاتا چاہتا تھا اس لیے میں اسے بھی وہاں چھوڑ آیا ہوں۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ بچے کی خالہ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ بچوں کو مستقل اسی کے پاس چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انہیں اسکول میں داخل کر دے اور ان کی تعلیم کا معقول بندوبست کر دے۔ مجرم اپنے اور دوسروں میں یہی ظاہر کر رہا کہ وہ بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ان کی خالہ کی یہ پیشکش قبول کرنے کا راز دہکتا ہے۔ یعنی اس نے مستقبل کے لیے بڑی پیش بندی کی تھی کہ اس کی پاس اسے طویل عمر سے تھے اس پر شک نہ کر سکیں۔“

”وہاں بالی گاؤں پر تو بالکل ناقابل یقین صورت حال ہے۔“ مجھے نہیں آتا کہ آخر ایک باپ اس حد تک اپنی اولاد کا دشمن کیوں بن گیا۔ لیکن وہ شخص غیبی سرائیں تو نہیں ہے؟“

”جاری تھی یہ سن کر شہر بارانے خیال توڑا لی کی۔

”اس بارے میں ابھی حتیٰ طور پر کچھ کن مشکل سے سراسر اس شخص نے اس پر سے واسطے کے پس منظر میں موجود اصل وجہ کے مسئلے میں ابھی تک زبان نہیں کھولی ہے۔ بڑے بیوں وغیرہ سے اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق وہ ایک بے حد جذباتی اور جوشیلا آدمی ہے۔ موم و مولا کی پابندی کرتے ہوئے تو اسے اتنا نہیں دیکھا گیا لیکن دیگر معاملات میں اس کا جوش و خروش بڑی ہوتا تھا۔ غرض میں شرکت کرنا خاص مساعفوں پر گواہ کو بھانا، وقت فوقتہ کی جاسی بزرگ کی قبر پر حاضری دینا اور کسی بھی امر شہر بارانے کی شان میں معمولی سے بھی گستاخانہ کلمات سن کر کھٹنے والے کو چڑھنا اور دیکھ دینے پر اس کا اس کے مملکت میں شامل تھا۔ یہی کسی شخص کی کسی گرامت کا معمولی شہرہ ہونا ہے پر وہ اس سے گہری عقیدت پیدا کر لیتا تھا۔ گاؤں والوں کے نزدیک بھائی کی طور پر، وہ ایک شریف آدمی ہے جس کی وجہ سے بڑے بڑے بھائی حساسیت کے علاوہ اس میں کوئی خامی نہیں تھی اور بہر حال اس کی اس حساسیت کو بھی لوگ بڑی نظر سے دیکھتے تھے۔ “عبداللہ ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ شہر بارانے اطلاع دینے سے جس خود ذاتی طور پر واسطے کی تمام تفصیلات

موصول کر چکا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار شخص تھا جسے اندازہ تھا کہ اس کا اقرار اس سے کیا واقعے کے کن کن پہلوؤں سے متعلق سوال جواب کر سکتا ہے اس لیے ہر معاملے میں اپنی معلومات تک نہ تک عمل دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ان دونوں میاں بیوی کو کس خاتون نے رکھا تھا؟“ شہر بارانے سوال کیا۔

”وہ لوگ جہیں تو کوٹ میں موجود ہیں۔ مرد خاتون میں سے جگہ عورت کی حالت کافی خراب تھی اس لیے اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے سکون اور ادویات دی ہیں تاکہ وہ وقتی طور پر کھل سکے۔ بتا جائے والے بچے کو بھی پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔“ عبداللہ ان نے مستعدی سے جواب دیا۔

”اس میں دونوں میاں بیوی سے طاقت کرتا چاہتا ہوں تاکہ واقعے کا اصل محرک جان سکوں۔ کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے۔ میں اس کی گہرائی میں جاتا ہوں تاکہ آئندہ کے لیے سہو باب کیا جاسکے۔“ وہ اس وقت بے انتہا متحیر تھا اور بڑی عجیبی سے اس واقعے کی تحقیقات کرانا چاہتا تھا۔ اس قومیت کے حکم واقعات پہلے بھی اخبارات کے ذریعے اس کے علم میں آتے رہے تھے جن پر انہوں نے گئے کے علاوہ وہ وقتی طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان واقعات کا کھٹن ان خاتون سے تھا جو اس کے دروازہ اختیار میں لیں آتے تھے لیکن اللہ آباد تو اس کے زیر نگیں تھا، چنانچہ وہاں پیش آنے والے اس افسوسناک واقعے کی مکمل تفصیل وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

”آپ جب چاہیں چل سکتے ہیں سراسر میں اسپتال اور خاتون جگہ طاقت کا انتظام کر دے گا۔ اس وقت تک ویسے بھی میڈیا والے بھی متحرک ہو چکے ہوں گے۔ جانے حالات پر ان کا بیچنا لازمی ہے۔ وہاں بھی اسے کچھ کھدائی وغیرہ کر کے پہلے ہلاک کیے جانے والے دونوں بچوں کی لاشیں دریافت کر لی گئی ہوں گی۔ میڈیا کو تو اپنے مطلب کی بہت سی خبریں مل جائیں گی وہاں سے۔“

”پہلے میں دو بچوں کو ہلاک کیا گیا تھا، ان کی قبریں کھنڈی ہو گئیں ان میاں بیوی نے؟“ عبداللہ ان کا جواب سن کر شہر بارانے کو خیال آیا تو اس نے بڑھ چکا۔

”دونوں بچوں کی قبریں گھر کے آگن میں ہی بنائی گئی تھیں مگر قبریں ہاتھ سے جوئے یا عتیاد کی گئی تھیں گرائیں لیول میں رکھا گیا اور پھر ان پر بھولوں اور سہریوں کے ہونے لگا کہ انہیں کیاری کی گئی تھی اس لیے تو اور گرد و خالوں کو شہر بارانے گھر کے آگن میں دو مسام

پانی کی قبر میں موجود تھی۔

”سب کرنے کے لیے قربت زیادہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ ہوا وہ اتفاقاً یا ایجاباً ہوا۔ سب کچھ بی بی طاہرہ قادریہ کی معلوم کرنا ہے۔ کیا ایک باپ نے ایسا منصوبہ کیا کہ عورت تہیب دیا۔ میرے خیال میں ہر میلے ہسپتال ملتے ہیں۔ عورت نے تیسرے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کے وقت جس طرح کا رازی ایکشن ظاہر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس مرحلے پر آکر ٹوٹنے کی گئی اور اگر ہر کوشش کریں تو اس سے پورا ہی اگلا سکتے ہیں۔“

شہریار نے خیال ظاہر کیا جس کی عبداللہان نے تائید کی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس واقعہ میں عورت سے عداوت کر کے عمل صورت حال جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”لو کہ۔ تو تم افواہات کرلو۔ آدھے سٹے بعد ہم اسپتال چلیں گے۔ اور ہاں۔ آؤ کہ وہ عورت سے میڈیا والوں کو دور رکھا جائے۔ میڈیا کے لوگوں کی بھاری کھرا کر ہر گئی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بہت زبردستی اور احتیاط سے اس معاملے کو چنل کر کے عمل صورت حال معلوم کی جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ سراسر ابھی آپ کے آؤرڈر پہنچا دیتا ہوں۔ شاہ ہے آج اس بی صاحبہ کی کئی دور سے برطانیہ سے پہنچ رہی ہیں۔ اس واقعے کو مکمل طور پر آپ ہی کو دیکھنا ہوگا۔“ عبداللہان اسے ایک اور اہم اطلاع دے کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ شہریار کے پاس کی المال آؤ سٹے کا وقت تھا۔ اس رہنمائی و شفقت کو سامنے کرنے کے بجائے وہ خود کو گھوڑ کرنے کی ہر پور کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر اس فائل کی طرف متوجہ ہو گیا جو کچھ عدالت ال کے زیر حاکمگی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ اسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسپتال میں حسب توقع میڈیا کے نمائندے سب جڑے اور اس کوشش میں تھے کہ انہیں خبر سے پہلے کا موقع مل جائے۔ شہریار اور عبداللہان اسپتال پہنچے تو سمانی جاوڑی نے انہیں بھی پھرنے کی کوشش کی۔

”یقیناً ایک نہایت افسوس ناک واقعہ ہے جس کی جتنی بھی مدد کی جائے کم ہے۔ میں نے ذاتی طور پر اس واقعے پر کچھ راز محسوس کیا ہے اور میری خواہش ہے کہ وہ اپنے کی عقلی وجوہات معلوم کر سکیں۔ اگر ہمیں کچھ معلوم ہوا تو ہم میڈیا کو بھی ضرور تقسیمات سے آگاہ کریں گے۔“ شہریار نے یہ مختصر بیان دیا اور صحافیوں کے سوالات کو نظر انداز کر دیا عبداللہان کے ساتھ اسپتال کے ٹھکانے کی راہنمائی میں اس گھر سے کی طرف بڑھ گیا جہاں منتقل ہونے کی ماں اور اپنے

نادر کی شریک جرم بھول بی بی نور کھانگیا تھا۔ گھر سے کی طرف جاتے ہوئے اس نے عبداللہان کی طرف جھک کر اس سے کوئی حوالہ کیا جس کے جواب میں عبداللہان نے اہمیت میں گردن جلا دی۔ اس کے ثبوت جواب پر عبداللہان نے لپٹا ہوا شہریار لینڈی ایم آر او کے چھپے گھر سے داخل ہو گیا۔ لینڈی ایم آر او کے علاوہ ان کے ساتھ چھپانے کے سٹے کے جو افراد تھے انہیں جاہز کئے کی جاہز کر دی گئی تھی۔ منجانبہ اور بچے بل پر ایک دہلی چلی گئی تھیں سالی کی سمانی کی عورت لیلی بولی تھی۔ عورت کی آنکھیں علی گھبرا اور ۱۰ ایک تک صحت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بھول بی بی الملک کے اسٹنٹ منسٹر شہریار عادل صاحب تم سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“ لینڈی نے اگرتے اسے مخاطب کیا تو اس نے بچے کے گھر میں چھپ کر شہریار کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یہ حد پرانی اور مشت تھی۔

”یہی طبیعت ہے آپ کی بی بی؟ یہاں اسپتال میں آپ کا خیال تو رکھا جا رہا ہے؟“ شہریار نے نرم کچھ میں اسے مخاطب کر کے پوچھا تو اس کی ویران آنکھوں میں حیران کی لہری دوڑ گئی۔ یقیناً گرفتاری کے بعد سے اب تک وہ مسلسل لوگوں سے ملنے لگتی تھی۔ یہی تھی، ایسے میں کسی نے نرم کچھ میں بات کی تو وہ حیران رہ گئی اور کڑواہٹ میں دہلی سی نہیں دے کر شہریار کے سوال کا جواب دیا۔

”آپ کے بچوں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس پر مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ یقیناً آپ اپنے شوہر کے جبر سے سامنے بھجور ہو گئی تھیں ورنہ میں جانتا ہوں کہ کوئی ماں اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنے یا ان کے گھر میں شامل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ آپ کے شوہر نے آپ کے بچوں کے ساتھ یہ کیا کیا؟“ وہ عورت کے ہتھ کے قریب ہی دھکی کر پی پر بند بچا تھا اور بے حد رنج کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا لیکن عورت نے اس کی زنی کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا اور نہ کوئی اور زور سے گئی میں حرکت دینے لگی۔

”دیکھیں مجھے معلوم ہے کہ اصل جرم آپ کا شوہر ہے۔ اگر آپ اس کے عمل میں دل سے شامل ہو سکتی تھیں تو سب سے کم ہلاک کرنے کی کوشش کے موقع پر ہرگز نہیں احتجاج نہیں کرتیں۔ یقیناً جو کچھ ہوا وہ کسی مجبور کی وجہ سے ہوا۔ لیکن سب تک آپ نہیں اپنی اس مجبوری کے حقائق دیکھیں گی نہیں۔ ہم اس قسم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں

کھیں گے۔“ شہریار نے عبداللہان کو مخفی سا اشارہ کرتے ہوئے حکومت کو بھگانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ عبداللہان اس کے اشارے پر دروازے کی طرف لپکا اور دوسری طرف اپنے انتظار میں کھڑے کھن کی گود سے ایک تقریباً چھ سال کے بچے کو لے کر وہاں صحت کے بنیادی طرف بڑھا۔ بچے کو دیکھتے ہی عورت جھڑی سے اندر کر بچتی اور اسے اپنی گود میں لے کے لیے انہیں بچھانیں۔ شہریار کے اشارے پر عبداللہان نے بچہ اس کے حوالے کر دیا۔ بچے کو گود میں لے کر بھول بی بی اسے سب سے جانتا ہوئے تھی۔

”یہ بچا صرف اس لیے زندہ ہے کہ آپ نے میں وقت پر اپنے شوہر کے ظلم کے خلاف احتجاج کر ڈالا۔ اگر آپ کئی رات بھی سہلے کی طرح خاموش رہتیں تو اس بچے کی بھی اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی طرح گھر کے آگن میں قبریں بنی ہوئی ہوتی اور آپ اپنی اولاد کو بھار کرنے کے لیے ترس جاتیں۔“ بھول بی بی کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شہریار نے اسے اسساں لایا تو وہ رو پڑی اور مزید شدت کے ساتھ بچے کو بھار کرنے لگی۔

”مجھے تو قسوس ہے کہ یہ بچہ بچہ تو چھپا رہے تھیں اسے اپنے ماں باپ کے سامنے سے دور رہنا پڑے گا۔ یہ کسی رفاقتی ادارے میں رہ کر بچا ہوگا اور بچا ہونے کے بعد اس سوال کا جواب ضرور پتا رہے گا کہ اس کے والدین نے اس کے بھائیوں کو کیوں قتل کیا؟ اس بچے کی زندگی اپنے والدین کی قتل آگسٹ کے طعنے ملتے ہوئے گزرے گی اور وہ سننے کے ردعمل میں یہ خود بھی کوئی خسرناک مجرم یا جنونی قاتل بن جائے۔“

”اب نہ کرے۔“ شہریار کی بات سن کر عورت دہلی کر پڑی۔

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ سب نہ کرے یہ بچہ کوئی مجرم نہ ہوگا تو چھپ رہے۔ اسی لیے تو آپ نے کہہ دیا ہوں کہ مجھے اصل واقعے کے بارے میں بتائیں۔“ شہریار نے دوبارہ گریو کی طرح لکھائی۔

”اصل واقعہ تو یہ ہیں آپ بھی کچھ نہیں آئے۔ میرا خاوند عزیز محمد بڑا بھائی اور اللہ والوں سے محبت کرنے والا آدمی ہے۔ کوئی اللہ والا ایسے کچھ کہہ دے تو ضرور اس کی محبت بڑھتا تھا۔ اس بچہ میں بھی ایسے کچھ سے ہڈی سے بھی ہو جاتے تھے۔ کئی بار وہ ایسے بھی ہوا کہ اس نے اپنی ساری آہ کی کسی حرا یا دیکھ پڑے دی۔ ہمیں لوگوں سے قریب آدھار مل کر کیا فائدہ؟ کہنے لگا کہ مجھ پر ایسے موقعوں پر

اگر میں بڑے بھائی کو کچھ بھی تو وہ میری نہیں سنتا تھا۔ کبھی تھا۔“ اور کئی دفع آگے کی آسانی سے۔ اللہ والوں کو خوش رکھنے کے اور ان کی محبت انہیں کے آخرت میں بخشے جائیں گے۔ میں ہر وادی اس کی محبت مان جاتی تھی۔ تیرہ مارے گاؤں میں شاپورا صاحبہ نے مدرسہ حصول لیا۔ سارے ہی گاؤں والے ان کی دوزی تریف (تحریف) کرتے تھے۔

بڑے بھائی کا وہ بچہ نہ ہو گیا تھا۔ کبھی تھا، میں نے شاپورا صاحبہ پر یاد دلا دی، ٹھیک اور بھلا داری تھیں اور کوئی دوجا نہیں دیکھا۔ سارا وقت وہ انہی کے گن کا تو رہتا تھا۔ میں بھی دو ایک دفعہ ان سے ملنے گئی تھی۔ بیٹوں بھی دوڑتے چلے گئے۔ میرے بچوں کو تو دوا چار کرتے تھے۔ ان کا دم کیا ہوا پانی میں اپنے کسی بیمار بچے کو پلاؤ تھی تو وہ فوراً بھلا چکا ہو جاتا۔ ہور بھی جس ماٹے میں ہم نے ان سے رات کی، انہیں فیرو (فادر) ہی ہوا۔ میں اور تو بڑھ کر ان کے کچے کے کچے بن گئے تھے۔ وہ جو کچے ہم مانتے، پر نیر ایک ایسی گل ہوئی کہ میں شاپورا صاحبہ کی محبت سے کنب کی بڑے بھائی ذرا نہ گھرایا، ہر بڑا کہ ہم وہی کریں گے جس کا ہمیں شاپورا صاحبہ نے مشورہ دیا ہے۔“ بھول بی بی یہاں تک

بتانے کے بعد بری طرح پچھنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ بیٹوں دور سے دوزنی ہوئی آئی ہو۔ یقیناً شہریار نے اپنی انتظار سے اس کی یہ حالت کر دی تھی اور اس کے دماغ میں وہ واقعات گردش کر رہے تھے جن کے بارے میں وہ چاہتی تھیں۔ مال اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔

”شاپورا نے ہمیں اور بڑے بھائی کو کیا مشورہ دیا تھا؟ کیا اس نے کہا تھا کہ تم لوگ اپنے بچوں کو ہلاک کر دو؟“

”کی حد تک بات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے عورت سے تیز لہجے میں پوچھا۔

”انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی محبت پر عمل کرنا ہوگا۔ جس طرح وہ اپنے رب کے حکم پر اپنی بیٹیاں دینے کے لیے دل سے تیار ہو گئے تھے، اسی طرح ہمیں بھی اپنے بچوں کی قربانی دینی ہوگی۔ قربانی دینے کا ہم اللہ کی نظر میں سب سے اچھے ہو جائیں گے اور وہ ہمیں جنت میں دوزی بھی جگہ دے گا۔ اور وہ سونے کے کل ہوں گے۔ وہ جتنے اچھے کھاتے ہوں گے اور ہر وہ چیز سے جس کو ہمارا ربی کرے گا۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ جنت میں ہمیں ہمارے بچے بھی دلائے جائیں گے۔“ بھول بی بی خود کو سنہل رہی تھی اور اب بڑی حقیقت مندی سے پھر رہی تھی۔

”کیوں، شاہنواز کے پاس کیا وہی آگئی تھی جو اس نے تم لوگوں سے یہ سب کچھ کیا؟“ شاہنواز وہ شخص تھا جس کی ہر سے پہلے علی غدا المین سمیت کی لوگ مارے گئے تھے۔ جو اپنے ساتھ گاؤں کے دو بھائیوں کو لے کر غائب ہو چکا تھا۔ جس کے بارے میں شہر تھا کہ وہ بھارتی خفیہ ایجنسی ”مرا“ کا ایجنٹ ہے، چنانچہ اس کے بارے میں یہ جان کر کہ اس نے بتوں کی بنیاد پر دیکھ بیٹھے اُن پڑھ اور اُن سے عقیدے رکھنے والے لوگوں کے ذہنوں کو اس پر بریت کے راستے پر ڈالا تھا، وہی داشت کہیں کر دکھا اور بے حد غصے سے بولا۔

”وہی تو جیسوں پر آتی ہے بی، پر اللہ والوں کے پاس بھی بڑی گرانیس ہوتی ہیں۔ وہ اشدادوں سے بھی بہت کچھ کچھ لیتے ہیں۔ شاہنواز صاحب نے بھی بھولا تھا۔ نہ پھر لے آئیں، اپنا ایک خواب سنایا تھا۔ خواب سن کر شاہنواز صاحب والے کہ نہ پھر لے آئیں یہ خواب تو حضرت امیر اکبر کے خواب جیسا ہے۔ تجھے ان کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ غیرو کیلئے تھ پر رب کی سنی رحمت ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر کو چھتری جسمرات کو یہ کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ نہ پھر حکم سن کر رو کیا تو بڑا، اس نے کہا کہ رب کے حکم سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں۔ پھر میرا اونچا نصیب ہے کہ رب نے مجھے اس کام کے لیے چنا جس کے لیے مجھے وہ اپنے ایک نبی کو تیار چکا ہے۔ بس نیچے اس نے ویسا ہی کیا جیسا اسے شاہنواز صاحب نے بتایا تھا۔ میں بھی اپنے پیچھے پھر رکھ کر رب کی مرضی میں راضی ہو گئی تھی، پر اس وادی کچھ سے بدداشت نہیں ہوا۔ درست پر مجاہد کے بعد دینے کی میرا بھی کچھ ٹھٹھ گیا تھا، پر نہ پھر اپنے عقیدے میں پکا رہا۔ کہنے لگا اللہ والوں کو دنیا اور لوگ ای طرح ٹھٹھ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے پیکر میں پڑ کر میں کسی اللہ والے کے خلاف دل میں نیکی نہیں لانا چاہیے۔“

بتوں کی بنیاد کے چنانچہ وہ حقائق رو گئے تھے کہ اپنے والے تھے۔ ان حقائق کے سامنے آنے کے بعد شاہنواز کا کردار اور بھی چمکی کر دیا۔ ہو گیا تھا۔ دین و داری اور نہ کوئی کمی آؤں وہ شخص معصوم کا دل والوں کی جہیز اور شہ کا کام کر رہا تھا۔ اس نے جس شخص کے حرات میں ڈرا بھی فتنے کے لیے کوشش کی، اسے اسے راوتے بھٹکا دیے۔ وہ بھی اس طرح کہ بھٹکے (۱۱) بھی بھٹکے، ایک دو ظلال کی راہ پر چل رہا ہے۔ عبدالستار (۱۱) کا پر اس کا نہیں ہوا تھا کہ کسی کے ذہن سے نکل جا اور یہ واقعہ سامنے آ گیا تھا۔ علم اور عیندہ بانی دیکھا کہ نہ پھر کو شاہنواز نے اس طرح گمراہ کیا تھا کہ وہ خود کو سٹیٹ ای آئی کا بیج و کار سمجھتے ہوئے اپنے وہ معصوم بچوں کی

جان لے بیٹھا۔ اگر نہ پھر میں ذرا بھی فہم و شعور ہوتا تو اپنے اور حضرت امیر اکبر کے درمیان فرق کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ کیا کا خراب تو وہی ہوتا ہے لیکن عام آدمی کے خواب کے بارے میں کوئی حسی بات نہیں کی جاسکتی۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی رسیخ و غلو نہیں۔ اللہ نے تو حضرت امیر اکبر کی بھی بعض آزمائش کی تھی۔ باپ کے ہاتھ بیٹے کے خون سے بہر حال رشتے نہیں ویسے تھے۔ اس کی سوچ اور عمل دونوں غلط تھے۔ جس کا ادراک نہ رکھتے ہوئے اس نے اپنی دونوں اولاد کو ہلاک کر ڈالا اور اس کے بعد تیسرے کی قربانی بھی دیتے چلا تھا۔ اس طرح کی اندھی عقیدت مندی کو نصیاتی مارنے کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بتوں کی بنیاد کی لاپانی معلوم ہونے والے حقائق نے شہر پر سمیت عبداللہ اور لیدی ڈاکٹر کو بھی اندر سے لرزہ کر دیا۔ جو لرزہ نیز حقیقت سامنے آئی تھی، اس نے ذہنوں میں یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ ہائے شاہنواز نے اور کتنے ذہنوں میں گمراہی کا بیج بویا ہوگا اور یہ بیج ایک دن پھر کسی طاقتور دولت کی صورت میں ابھر کر سامنے آ جائے گا۔

”شاہنواز کے بارے میں یہ ظاہر کیے بغیر کہ اس کا بڑی ملک سے بھی کوئی تعلق نہ تھا، اس کی تمام منجلی کارروائیوں سے میڈیا والوں کو حیرت سے آگے کر دو۔ حقائق سامنے آئیں تو شاید لوگوں میں شعور پیدا ہو جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ ہر گاہ میں کوئی حکیم کے لیے مستعد ہوں گی تھناتی ہو سکے۔ عالم دین کا کردار معاشرے کی تعمیر کے لیے بے حد اہم ہوتا ہے لیکن اکثر ہم اس بات کو نظر انداز کر کے شیعہ خاندان پر پھر سادگی اور ڈوایا دینی راہنما بنا لیتے ہیں جس کا نتیجہ پھر اس طرح کے ہمایاں واقعات کی صورت میں ہی سامنے آتا ہے۔“ بتوں کی بنیاد کے بیان کر دہ حقائق کو سن کر دلی لافسوس محسوس کرتے ہوئے شہر یار اس کے کمرے سے باہر نکلا تو اس نے عبداللہ کو کمرے سے پکارا۔

”اگر کے سر میڈیا والوں کو تو میں ابھی تو دینی طور پر برہنہ کر دوں گا، وہاں فی کے کی بنیاد ٹھٹھ پ کے وہن شہ ہے اس کے لیے ظاہر سے کچھ وقت اور وسائل دے دوں گے جس کے لیے میرا مکمل تعاون آپ کے ہر وقت حاصل رہے گا۔“ عبداللہ نے مستعدی اور غرض کشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”کیا کرنا کہ اس واقعے پر آپ کو کویشی کچھ کہنے کے لیے ضرور کہیں۔ وہ حساس اور دور مدبر فطرت رکھنے والا آدمی ہے اس لیے اس کی تحریر میں خاصی اثر انگیزی پائی جاتی

ہے۔ "شہر دار نے ایک اور ہدایت جاری کی جس سے ظاہر ہے عبداللہ کو اخلاق کی ترہ تھیں جس کے کسی بھی طرح کے رویے کا مظاہرہ کرنے سے اس کی ایسی ہی منظور تھی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے قریب چلا آیا۔ اس وقت وہ لوگ ہسپتال کی قمارت سے باہر کھلے تھے اور گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ گرام میں تھا کہ وہ لوگ یہاں سے سپر مارٹ کے چائیں گئے اور تھوڑے عرصے میں ملاقات کر گئے۔ اس ملاقات کے بعد میڈیا مانوں کو انھوں نے کے مطابق بریفنگ دی جانی لیکن وہ ایسی جی منظور چلے۔ پر جس طرح کے تاثرات سمجھائے اور جس اعتماد میں سامنے آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے۔

"ابھی ابھی تھا نے میرے پاس فون آیا ہے سہرا! مجھے افسوس ہے کہ وہاں سے کوئی ابھی خبر نہیں ہے۔" شہر دار متوجہ ہوا تو وہی ایسی ہی منظور سے لنگھو کا آواز کیا۔

"خبر یہ کیا ہوئی ہے تھا نے؟" شہر دار کا تھکا تھکا "خبر آئی ہے کہ ایک سہیلی نے ملزم بذریعہ محمد کو فارغ کر کے ایک آپ میں اسی جاکر کر دیا ہے۔ اصل میں سہیلی بے حد جذباتی ہو گیا تھا اور جذبات میں یہ حرکت کر بیٹھا۔" شہر دار نے اس سہیلی کو گرفتار کر لیا ہے لیکن وہ خود کو مجرم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے ایک برے آدمی کو اس کے سبب انجام تک پہنچایا ہے، چنانچہ یہ مجرم نہیں بلکہ بھلاؤ لگتا ہے گا۔" وہی ایسی ہی منظور کی بات سن کر شہر دار کا بے ساختہ دل چاہا کہ اپنے سر کے بال نوچ لے۔ خواہ اس کی یہ حد سے بڑھی ہوئی جذبہ ہیئت ایک ایسا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے بھی کسی کام کرنے والوں کو بچ پلاننگ کے مطابق کام کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اب بھی جانے اور کون کون سے حقائق تھے جو تھوڑے عرصے میں موت کے بعد میڈیا کے لیے پروے میں ملے گئے تھے۔ وہ خود بخود بتاتا تھا شاید اس سے شائبہ باز کے بارے میں کوئی نہیں جانتا لیکن اب تو خالی کپیر پینے کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

"اسلام علیکم اہل بیت! آج ہر پست پر چیکنگ کے طویل مرحلے سے گزر کر چودھری اختر دراجپال لاؤنج میں پہنچا تو اس آواز کو سن کر چونک پڑا۔ ماننے اس کا بڑا اور چیتا چیتا چودھری مراد کو سن کر مسکرا رہے تھے اس کا استقبال کر دیا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔ مراد کے نیو یارک کے قیام کے طرے میں چودھری جب بھی وہاں آتا تھا، مراد اس کے استقبال کے لیے ضرور پہنچتا تھا۔ خود بخود دیکھ کر انہوں نے لاؤنج

میں داخل ہوئے ہی بیٹے کو گلائی نظروں سے گھورتے گتے تھے۔ آج درجہ مختلف صورت حال تھی۔ وہ اپنے ہم طرح قادیان سے وہی طرح اچھے کیا تھا۔ خود بخود انداز میں ایک اچھا سہرا اور وہاں سے مزاج رکھے اور آدھی گھنٹوں ہوا تھا، اچانک ہی خطرہ آگ لگنے لگا تھا۔ چودھری نے اپنی عمارت کی دہری سے بھاگ لپکا تھا کہ ڈیڑھ کا اس سے ملتا اور ماہو کو کی تصویر میں دکھانے کوئی اخلاقی نہیں تھا۔ وہ ابھی طرح جاتا تھا کہ چودھری کے لیے وہ ماہو کی کیا ہیئت ہے اور اب شاید وہ ماہو کے بدلے اس سے کوئی ذلیل کر رہا تھا چاہتا تھا۔ اس نے چودھری کو کھانے پر مدد بھی کی تھی۔ کہ کھانے کی میز پر بیٹھا اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس ملاقات کا ایجنڈا کیا ہوگا، چودھری نہیں جانتا تھا لیکن انتہا پر حال سمجھتا تھا کہ ذوق اسے اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کر رہا تھا ہے۔ وہ کامیاب مقصد کیا ہو سکتا ہے، اس سوال نے چودھری کو الجھا رکھا تھا۔ اسی الجھن میں اسے ہونے کی وجہ سے اسے مزہ شاد کا خیال نہیں رہا تھا۔ وہ چیکنگ کے مراحل سے گزر کر اراکینوں کو درج میں چیکنگ کے ذوق کو کھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ تو جہاز سے اترنے کے بعد کھانے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ چودھری کو اس کی کھلی ایک تھک جھک نظر نہیں آتی تھی۔

"خیریت تو ہے ابھی آپ کچھ پریشان پریشان سے لگ رہے ہیں؟" مراد شاد نے فوراً ہی اس کی کیفیت پوچھ لی۔

"کوئی پریشانی نہیں پڑا میں ادھر یہ لوگ ہم پاکستانیوں کی اپنے چیکنگ کرتے ہیں کہ شہیت پوری ہونے لگی ہے۔ اپنے ملک میں ہم اپنے ملے عزت دار آدمی ہیں۔ لوگ جھک جھک کر نہیں سلام کرتے ہیں لیکن یہ گورے بندے کی ساری عزت خاک میں مریں دیتے ہیں۔" چودھری نے خود کو سنبھالے ہوئے یہاں بتایا تو مراد شاد مسکرا دی۔ یہ جھگڑو چودھری پر بڑا بڑا پرکھ آمد کے موقع پر کرتا تھا اور اب تو صورت حال خاصی کے مقابلے میں اور بھی زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا پروپیگنڈا کرنے والے امریکی اپنے پروپیگنڈے و حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ہر ذمہ دار مسلمانوں کے لیے بے حد سختی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے ابھی ایک ہوشیار یہ بھی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ دو مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ان میں مسلمان بھی کوئی باہر والی کر سکتے ہیں۔ ساری دنیا پر چیکنگ مسلح کرنے والے اپنے

بڑھکائے مجھے شعلوں کی آج اپنے دامن میں گئے سے سدا خوف دور رہے تھے چنانچہ ان کے خفاقی اقدامات میں بھی اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

"جانتے ہیں ابھی اپنا بی سلا کر کریں۔ ہر جگہ کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ یہاں والے ہمارے لوگوں کے لیے ذرا دھرمی خیمیت کے ہیں، آپ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اپنے علاقے میں تو آپ کی بڑی عزت ہے نا۔" مراد شاد نے باب کی دل بولی کی کوشش کی اور انہیں اپنے ساتھ لیے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔

"سوتو ہے۔ اسی واسطے تو میں تھکے بھی کہتا ہوں کہ واپس اپنے گاؤں آ جاؤ۔ دنیا کو کون سا آرام ہے جو اور نہیں ہے۔ اپنی خودی میں ہر کھٹ مڑو ہے۔ خیر اور ہر دہری کی کوئی شہر کی کوئی نہیں کرتی پتی۔ رب کے کہہ سے ہمارے رنگوں نے کھتا چھوڑا ہے کہ سات چلیں تو تک بھی چھوڑ کر کھائیں تو کم نہیں پڑے گا۔" انے خفاقی کوئی خدا کو گوروں کی کوئی کر رہی ہے وہ تھیرے لیے تو وہاں اتنا کچھ ہو رہا ہے کہ چالیس ہندے تھیرے آگے چھپے ہاتھ ہاتھ کر کھڑے۔ چودھری نے اپنی ہر پار کی جانے والی بات ایک بار پھر بیٹے کے سامنے بڑھائی۔

"آپ کی بات اپنی جگہ ٹھیک ہے ابھی ایسٹ میں کیا کروں یہ امرات قدر مختلف ہے۔ مجھے لوگوں کا اپنے آگے ہاتھ اٹھ کر کھڑے ہونا چھوٹا لگتا۔ انسان کو اللہ نے آزاد بنا دیا ہے۔ میں اپنے جیسے انسانوں کو اپنی غلامی کرنا دیکھتا ہوں تو دل پر اڑاؤ لگتا ہے۔"

"خیر یہی تھی۔ تھک میں اور ان چالیس مزارعوں میں وہاں فرق ہے۔ تو چودھری افکار کا پڑا، اس کی جائیداد کا جائیداد ہے۔ تو اور وہاں سے ہمارے دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟" شہر دار نے کھڑکی کے لیے ہاتھ ہے اور انہیں غلامی کے لیے لے کر اللہ سب کو ایک میسر کیا جانتا تو یہ آپ سے کہہ رہی ہے ہاں اور بات اور تمام درجہ۔ اللہ نے آپ بھوکوں کے درمیان اونچے نیچے رکھی ہے، تو چھوڑے تو جو ان پر سوشلسٹ شے کا بھوت سوار پڑتا ہے۔ خیر، وہ لے جیتے ان چاہے یہاں۔ آخر کو ایک دن تھے میری کئی کچھ بھی جانے کی۔" بے کا جواب چودھری کو نہ تھیں۔ باہر وہ اپنی طرف سے دیکھیں کہ اسے خوف کرنے کی کوشش کرتے لگے۔

"میں جانتا ہوں کہ اللہ نے بندوں کے درمیان اونچے نیچے رکھی ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ انسانوں میں سے

کچھ کو بڑا کر دے اور کچھ کو کم تر رکھنا چاہتا ہے۔ اللہ کے پاس تو وہ ہے پیسے کی بنیاد پر بڑی اور کم تر ہے ہی نہیں۔ اس کے نزدیک تو کس وہ بڑے جو بھوکے اختیار کرے۔ معاشی اور معاشرتی تقسیم کے ذریعے تو جس وہ ہماری آزمائش کر رہا ہے۔ جو اس آزمائش میں پورا اترے گا، وہی اللہ کے نزدیک بلند اور کامیاب ہوگا۔"

"جہل جہل۔ رہنے دے اس کل کو۔ میری کل کی کر بیٹھ لگتا ہے کہ جیسے تو امریکا میں نہیں، سعودی عرب کے کسی مدرسے میں رہ رہے جہاں تجھے یہ سب سکھایا جاتا ہے۔" چودھری کا موڈ اچھا خاصا خراب ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے موضوع ہی ختم کر دیا۔ سب سمجھا۔ مراد نے بھی باپ کا موڈ دیکھتے ہوئے اسے مزید پیچھے نہ مانا۔ سب نہیں سمجھا اور وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ صرف سعودی عرب کے مدرسوں میں نہیں سکھایا جاتا۔ فطرت میں بھلائی اور دل میں نیک خواہشات رکھنے والے کو ہر جگہ رہنا ملتی ہے جاتی ہے۔ وہ نیو یارک جیسے آزادانہ مزاج رکھنے والے شہر میں رہ کر ایسی باتیں کر رہا تھا تو صرف اس لیے کہ اس کے احباب کا حالت انسانی حقوق کا شعور رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا۔ ان افراد میں بہت سے ایسے مسلمان بھی تھے اور کچھ غیر مسلم۔ لیکن ایسے انسان بھی۔ چنانچہ وہ امریکی پروٹسٹ کے ابتدائی مرحلے میں خود کو ملنے کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے چھوٹا جیسا تھا تو ان پندرہ سالوں میں بالکل مدھر گیا تھا۔

"شاید اور علیحدہ گھر پر بڑی ہے چینی سے آپ کا اقرار کر رہی ہوں گی۔ جس وقت میں ان وقت کے لیے مروان ہوا تھا، میں نے قون پر ان دونوں کو اطلاع دے دی تھی۔ مجھے آج آس میں ضروری کام نہیں ہوتا تو میں چینی کر لیتا اور ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ ہی اپارٹ لانا لیکن مسروریت سمجھا بھی کہ مجھے کھسے کے گل کر سیدھا یہاں آ؟" مراد شاد لنگھو بدلنے کے لیے مراد شاد، چودھری کو اپنی بیوی اور بچی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی بیوی شاید اس کی کئی بیوی کی بیٹی تھی جس کو وہ اب کی خواہش پر چلا کر اپنے ساتھ امریکا لے آیا تھا۔ یہ تقسیم یافتہ شادہ اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن مراد شاد نے سمجھ داری اور بہت پائی کا بھوت بیٹے ہوئے بیوی کے ساتھ اپنے جہنم کی راہ نکالی کی تھی۔ اگرچہ بیوی اور اپنے درمیان موجود واقعی فرق کی وجہ سے بعض اوقات اسے شادہ احسانی تھی لیکن اس میں تو تھا لیکن اس نے بھی بے بات شادہ پر لڑائی کی تھی اور یہاں دو دونوں اپنی اپنی علیحدہ کے ساتھ کافی سنا سب

زندگی گزار رہے تھے۔ علیحدگی ستر تین سال ہو چکی تھی اور اس کا جو دردوں میں بیوی کے لیے خوشی کا باعث تھا۔

بے۔ اب اگر اس کی جگہ پر سے گاؤں میں ہوتا تو کسی کوئی نوکری کی بیوی پتا چلتا جس نے فراری اسے جتا دیا۔ مراد اس کی بات کن کرخص شکر ادا اور بواب میں چاہے بغیر دروازہ کھولا رہا۔ لیو رک جیسے مصروف شہر کے ٹریفک میں اپنی گاڑی چلانے کے لیے ابھی خاصی حاصر دہائی کی ضرورت ہوئی ہے۔ یہ سونیاں رہنے کی وجہ سے اس ٹریفک کا مادی ہو گیا تھا جس کی پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا۔

بلکی چٹکی کی شپ کرتے ہوئے آخر کار وہ لوگ مراد شاہ کے گھریلو اپارٹمنٹ تک پہنچ گئے۔ مراد کی یہاں ٹھیک ٹھاک ملازمت تھی لیکن یہ شاندار اپارٹمنٹ بہر حال اسے چودھری نے ہی خرید کر دیا تھا وہ خود مراد شاہ کی شپ کی کرتے تھے۔ اپارٹمنٹ میں تھے وہ رہا ہوتا۔ اپارٹمنٹ کچھ کر چودھری کی اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ ملازمت ہوئی تو ان میں لگ کر دینی دینی انکھیں کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھا۔ شاید نے اس کے لیے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے شرفی کھانا تیار کیا تھا۔ وہ خود بھی مشرق کی کباب، زب نہ کے ہوتے تھے۔ اسے مراد شاہ کے ساتھ نیو یارک بھیجے ہوئے چودھری نے بیٹے سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو شرفی روایات کے خلاف امریکا میں نہیں ڈھلے دے گا۔ شاید وہ کوئی کئی دوسری خواتین کی طرح نیو یارک میں رہنے کے لیے راجہ کر رہے زندگی گزار رہے کی۔ مراد نے یہ شرط قبول کر لی تھی۔ خود شاید وہ بھی باہر کی دنیا سے لڑاؤ لگاؤ نہیں تھا اس لیے وہ آرام سے ایک گھر بیوی کی کتے دار یاں بھرا بھی گیا۔ کام کج میں وہ دس کے لیے دن بھر ایک ملازم اس کے ساتھ رہتی تھی اس لیے اس پر بہت زیادہ دیر بھری تھی۔ دوسرے مراد شاہ نے اسے بھی آزادی سے بھیج دیا تھا۔ دوسری سے معاملات میں اپنی مرضی کی بالک تھی اور اسے اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنے کے لیے آزادی بھی حاصل تھی۔

”ماںوں جان آپ کا کمر اتنا بڑا ہے۔ آپ لیے ستر آئے ہیں، دیکھو آرام کر میں پھر اپنی کے اڈا کھائے گا۔“ مراد نے چودھری کو طلب کر کے ہوتے کہا جو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بیوی کے ساتھ مصروف تھا۔

”باب پتا میں دینی پڑا تھا۔ کیا ہوں۔ اب کچھ دیر آرام کروں گا۔“ لیو دھری نے فوراً اپنی منہ پھوڑ دی۔ اسے

کی توجہ سے کچھ دم بخود ہو جانے پر علیحدہ سے احتجاج کر رہا۔ شروع کر دیا لیکن اس بار چودھری نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ وہ علیحدہ کو بیوی ہونے اور آزادی دے دینے کی وجہ سے کافی رعایت حاصل تھی وہ بیٹیوں سے محبت کا کچھ کرنا تو بھی والدین کی روایت میں ہی شامل نہیں تھا۔ مراد شاہ جو باپ کے اس انداز کو نہیں تھا خود ہی علیحدہ کو کھانے کے لیے یہاں سے ایک کچل چودھری نے اپنے لیے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں کچھ کر رہا مراد وہ سبز پارکینا تو اسے ایک بار پھر بولا اور اس کے ساتھ بیوی والی گفتگو یا آگئی۔ اس گفتگو میں ایک کراہت بات بھی کی کہ بیوی نے اسے ماہ و ماہ سے تعلیق یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ اسے مل جائے گی۔

زیادہ سے معاملات جس طرح بھی ملے یا تے لیکن ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ اسے ماہ و ماہ کے حصول کے لیے اب شہر پار رہا ہوا ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، چنانچہ اسے فوجی اکروان بھی بے کار رہی تھا۔ اس خیال کے آنے کے بعد اس نے فوراً ہی بالے کاموں میں مگر مایہ۔ سونیاں کی سہولت آجانے کے بعد اس نے بالے سمیت اپنے کچھ خاص ملازمین کو سونپ کر دیا۔ مراد شاہ کے ہاتھ میں تھے تاکہ وقت ضرورت فوری رابطہ ہو سکے لیکن اس وقت اسے بالے سے رابطہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ جانے کس وجہ سے بالے کاموں میں مگر مایہ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد چودھری نے مٹی اللہ رکھا تاکہ مگر مایہ مل گیا۔ اس نے دوسری بھی تلاش کر کال رہیہ کر لی۔

”مستاد مراد شاہ کا اخیر حال پہنچ گئے۔ میں بھی انتظار کر رہا تھا کہ آپ کی طرف سے خبر یہ کت فون آجائے۔“ چودھری کی آواز سننے ہی مٹی نے خوشامد انداز میں یوں شروع کر دیا۔

”بابا کچھ حق مٹی میں اپنی دوسرے سے فون کر رہا ہوں، پاس کا کمرہ میں کس میں رہا۔“ مٹی کی خوشامد انداز میں پکارا دوسرے پتے چودھری نے اپنے مطلب کی دہائی۔

”بابا تو رات سے ہی غائب ہے سہرا کچھ سے کہہ کر آیا تھا کہ آپ نے اس کے ذمے کوئی کام لکھا ہے اس کے سلسلے میں انتظامات کرنے بار بار ہے۔ وہ نہیں دن میں واپسی ہو گی۔“ مٹی نے اسے اطلاع دی تو وہ ایک کھرا سانس لے کر رہ گیا۔ حقیقت یہاں شہر کے بارے میں انتظامات کرنے کے لیے کسی ایک جگہ موجود تھا جہاں وہ پاس کسنگٹون ٹھیک رہتے ہوں گے۔ یہ مشعل کر کے کچھ کر کی طرف رہا ہے

سے تیرا رابطہ ہو جائے۔ اس سے گل ہو تو بولنا کہ ابھی رک جائے۔ میں نے اسے جو کام کہا تھا۔ اس میں فوری توجہ نہ ڈالے۔“ چودھری نے جاہلیت جاری میں اور سلسلہ متعلق کر دیا۔ اب اگر مٹی کا بے سے رابطہ ہو جائے تو شہر پار کا انوار ک جانا ورنہ دوسری صورت میں اس نے سوچ لیا تھا کہ بالے سے کہے گا کہ شہر پار سے ماہ و ماہ کا معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے اور یہی اس کی توجہ پر بہت چٹکی لگا کر اسے آزاد کر دے۔ شہر پار کو کئی تکلیف پہنچ گئی تھی تو وہ اپنے دل میں بیوی ٹھنڈک محسوس کر رہا۔

☆ ☆ ☆

قدیمے ہامور مارک پر بیٹے مشاہیر خان کے قدم اس نورس کچی کے دفتر کی طرف اٹھ رہے تھے جس کی چپ ماہ و ماہ کے انوار کے لیے استنباط کی تھی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق ماہ و ماہ کے چپ چلانے والے ڈرائیور کا چپ کئی روک کر اس سے چپ نہیں لیا تھا اور ڈرائیور کو بے ہوش کر دیا تھا۔ انیس کے مطابق چپ ڈرائیور ملے آدروں کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں بتا سکتا تھا لیکن مشاہیر خان ایک بار خود چپ ڈرائیور سے مل کر معلومات حاصل کر چاہ رہا تھا۔ اس سے قبل وہ اپنی ماں، اکرم خان اور ماہ و ماہ کو کوہوٹے سے کام لے رہا تھا۔ اسے والے چپ ڈرائیور سے بھی بچھ کچھ کر چکا تھا لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ انوار کو اس کی تعداد جارہی اور انیسوں سے اپنے چپوں کو کتاب میں چھپا رکھا تھا۔ وہ انوار کا رول کی قریب کے بارے میں بھی کوئی اندازہ و قائم نہیں کر رہا تھا۔ البتہ اس نے ان کے قدم و قیامت کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

مشاہیر خان جاہت تھا کہ انوار کے لیے استنباط کی جانے والی چپ کے بارے میں دوسرے کو بھی بتا دے تاکہ اگر وہ کوئی نیاں بات لوت کر نہ پوچھ اس کے ذمے ملے اور وہ اس کا سرانجام لگا دے۔ اسے بتانے سے چپ ڈرائیور کے بارے میں معلوم نہ مل گی تھی اس شخص کا نام پتلا تھا اور وہ بھی ساون سے ایک نورس کچی میں رہتا تھا۔ یہ شخصیت ڈرائیور ملازمت کر رہا تھا۔ اس کا بہت دن کے کٹھن حصوں میں مسلسل کام چلا رہا تھا۔ وہ پہلی بار اپنی صورت حال سے بے چارہ ہو رہا تھا۔ جو سے اس کو بے چارہ دینی بھی ہوا تھا۔ عملہ آدروں سے اسے بے ہوش کرنے کے لیے سب سے بڑا لکائی تھی جس کی وجہ سے اس کے سر پر کم آگیا تھا۔ دینی ہونے کی وجہ سے نورس کچی آج کل اسے کی جگہ نہیں پہنچ رہی تھی اور

مشاہیر خان کی معلومات کے مطابق ان دنوں وہ اپنے گھر پر آرام کر رہا تھا۔ بتانے سے اسے نیاز ملے گی کہ گھر کا پتا معلوم نہیں ہو سکا تھا چنانچہ وہ نورس کچی کے دفتر کا رولوں سے اس کے گھر کا پتا معلوم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنے خیالوں میں کم دفتر کی طرف جانے والے راستے پر گھر چکے بیٹھے ہوئے وہ آدروں سے تقریباً بے خبر تھا اس لیے جب کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تو وہ چونک پڑا اور سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ پلانے والا اس کا ایک واقف کار ڈرائیور تھا۔ اسے اس کے آدروں سے تقریباً اور عموماً چمپن میں پہاڑوں کے سطرپی رہتا تھا۔

”اور یا مشاہیر خان! کیا حال چال ہے؟ ابھی اس خطرہ سے بچنے کے لیے خبری میں گھر چلا جائے؟“ مشاہیر خان متوجہ ہوا تو آواز اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”میں یا ایک کام سے جا رہا تھا۔ ماں اپنیل میں داخل ہے اس کے لیے وہاں خریدنی تھی اور ایک دوسرا کام بھی تھا۔“ اس نے آدروں کے سوال کا سرسری انداز میں جواب دیا۔

”بابا! یہیں تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کا پتا چلا تھا۔ بڑا بڑا ہوا تمہارے خاندان کے ساتھ رہے۔ باہر اکرم خان تو بہت اچھا لڑکا تھا۔ ہم دونوں کا اکثر ہی ایک ساتھ آجنا ہوتا تھا۔ اکرم خان بالائی کی خارجی اور پہاڑوں میں نہیں جاتا تھا۔ گھبراہٹ میں فوری کے کر نہیں میرے باپ اور بڑے بھائی کی طرح میں بھی کسی ماہو سے کا شکار نہ ہو جاؤں، پر قسمت کی قربانی دیکھو کہ اپنی اعتبار کے باوجود بھی بے چارہ ماں کو اس عمر میں انقلاب احمد سہا پڑا۔ میں ایک کچھ کے ساتھ کے کوہے میں کچھ تک گیا ہوا تھا۔ رات ہی واپس آیا ہوں۔ اگر یہاں ہوتا تو اکرم خان کی خدمت میں ضرور شریک ہوتا۔ تو سہاڑی زعمی بھی انیسوں سے گا کہ اسے اتنے اتنے سچے سچے کا آخری دیر ابھی منسوب نہیں ہوا۔“ آدروں سے اکرم خان کی موت پر اٹھا پڑا انیسوں نے لگا۔ جہاں مشاہیر خان خاموش رہا۔ اکرم خان کے ذکر پر اسے اپنے سینے میں جوں سا بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

”انوار! ایک کچھ کی جی جوتن بدن کو جھلکا لگتی تھی۔ اپنی اس کیفیت کو لوگوں سے چھپانے کے لیے وہ اپنے موافق پر خاموش رہتا ہی مناسب سمجھتا تھا۔“

”انوار! اگر تم بھرا رہے میں ایڈل گئے۔ وہ سن کر خود تم سے ملنے کے لیے اپنیل کی طرف ہی جا رہا تھا۔ گھٹے کی سے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنا بڑا وقت اپنیل میں اپنی ماں کے

پاس ہی گزار دے جو۔ چلو چل کر ماں کی دوا لیے لیتے ہیں پھر میں تمہارے ساتھ ہی اپنا تھک چکوں گا جا کر ماں کی مہراجہ پڑی کر سکوں۔" آؤرنے اس کی خاموشی کو محسوس کیے بغیر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلا دلا دینے کے انداز میں چلی ہی نکلی دی اور اسی راستے پر قدم آگے بڑھاتے جس راستے پر مشاہیرم خان پہلے جا رہا تھا۔

"اگر انہیں چل دی تو ہوتو میرے ساتھ بیوہ نہ جا ہوتو سیدھے ماں سے ملنے اپنا تھکا ہوا جسم لے آئے۔ اصل میں مجھے دوا میں خریدنے کے بعد نیاز علی ڈرائیور سے ملنے اس کی فورسٹ میں کے دفتر تک بھی جانا ہے۔" تمہیں شاید کسی سے معلوم ہو کہ اگر کم خان کے گل میں جو لوگ لوٹ ہیں، انہوں نے نیاز علی کی جیب ہی استعمال کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ نیاز علی سے مل کر ان لوگوں کے تھپے وغیرہ معلوم کر سکوں۔" آؤر کو اسے ساتھ بیٹے پر سرور دیتے ہوئے مشاہیرم خان کو اس پر اپنا پروگرام ظاہر کرتا ہوا۔

"ہاں، میں نے سنا تھا کہ ان لوگوں نے نیاز علی سے جیب چھین کر اسے اور اس کے لیے استعمال کیا تھا۔ اگر تم کو تو میں تمہیں اس کے کمر تک لے جا سکتا ہوں۔ سنا ہے اپنی کھیتی کے دفتر تو وہ آج بھی نہیں جا رہا ہے۔ دفتر والوں نے اسے آرام کے لیے بھیج دی ہوگی۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن مجھے نیاز علی کے کمر کو پتا نہیں معلوم تھا اس لیے میں دفتر کی طرف جا رہا تھا کہ وہاں سے اس کا پتا معلوم کر لوں گا۔" وہیں اس کا گھر معلوم ہے تو ابھی بات ہے۔ یہاں کہہ دو کہ مجھے اس کا گھر دکھا دو، پہلے میں اس سے ہی ملاقات کر لیتا ہوں۔" آؤر وہی پیشکش کرتا کہ مشاہیرم خان فوراً ہی اس کے ساتھ نیاز علی کے گھر جاتے پر آمادہ ہو گیا۔

"چلو، تم کہتے ہو تو پہلے وہیں چلے جی لیکن تم نیاز علی سے زیادہ اچھی امید نہ رکھنا۔ کچھ درمیان سداؤں سے۔ یہ زیادہ کسی سے ملنا ملنا اور بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ کچھ سال پہلے اس کا مزاج ایسا نہیں تھا۔ سب سے مل کر رہتا تھا وہ چاہ بہت بدل گیا ہے۔" وہاں پر نہیں کرتا لیکن اس کے بڑی بیوی لگا لگا بیٹنا اور اس کا کچھ رنگت سے کہ اس کے پاس نہیں سے جیسا آئے لگا ہے۔" خاتمہ پہلے بھی وہ ڈرائیور ہی کرتا تھا اور اب بھی کئی کام کرتا ہے۔" نیاز علی کے گھر کی طرف سے جاتے ہوئے آؤرنے اسے بتایا تو ٹھٹھک گیا۔ آؤر کہ نیاز علی کے پاس سے کسی سرسری طور پر کیا جائے والا اخیر وہ تو علی غور تھا۔

آؤر کسی طرح نیاز علی کے پاس معمول سے زیادہ جیسا آئے لگا

تھا تو اس کا مطلب تھا کہ نیاز علی کچھ مشکوک شخصیت کا مالک ہے اور اپنے شخص کی ہر بات پر گھر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

"تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ نیاز علی کے پاس جیسا کہاں سے آ رہا ہے؟ اگر وہ کوئی کام دھندا کرتا تو جیسا آئے والی بات کبھی بھی آتی لیکن پہلے والی تو کمری کے ساتھ زیادہ جیسا آئے تو درجائے ہی بات ہے۔" مشاہیرم خان نے آؤر کو ٹوٹنے کی کوشش کی۔

"کہاں دارا امارے پاس نہ تو فرصت ہے اور نہ ہی تمہیں عادت ہے کہ دوسرے کے معاملوں میں ٹھٹھکاؤ اڑا میں اس لیے بھی جان کر اس معاملے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔" آؤرنے بے نیازانہ انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

"پھر کبھی۔" کبھی تو تم نے نیاز علی کی کوئی ایسی حرکت دیکھی ہوگی جو تمہیں معمول سے ہٹ کر اور ڈرا مشوک لگی ہو۔" مشاہیرم خان آسانی سے ہمت دار نے والا نہیں تھا، چنانچہ آؤر کو مارچ پر درویش کے لیے اس کا پاس۔

"اس کی کوئی خاص مشکوک حرکت تو نہیں دیکھی، پر ایک بار اس کی ایک حرکت پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ یہ کچھ سال کا ذکر ہے۔ میں ایک ٹیم کے ساتھ جہاز گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کینیڈا کا رابرٹ صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ اسکرودا آیا ہوا ہے۔ رابرٹ صاحب مجھے بڑا پسند کرتا ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں اسکرودا میں نہیں ہوں لیکن جلد واپس آئے والا ہوں تو وہ میرے لیے پیغام بھیج دیا کہ میں کسی طرح اسے جوشن کر لوں۔ اتفاق سے مجھے معلوم ہوا کہ نیاز علی ایک ٹیم کو واپس لانے کے لیے آئے جانے والا ہے۔ میں نے اس سے وقت مانگ لی۔ اس وقت میں نے اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی جیب میں کھانے پینے کا سامان اور دوا کی دیکھو وغیرہ بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اگر وہ کسی ٹیم کے ساتھ سفر پر جا رہا ہوتا تو سامان کی موجودگی کبھی آتی لیکن وہ تو ٹیم کو واپس لانے کے لیے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے وہاں کے بارے میں پوچھا تو یہ کہہ کر کسی کی گواہی میں اس کے ایک دوست نے پورے حلقہ کو لے لیا۔ میں اس کا جواب سن کر خاموش ہو گیا لیکن اس کے بعد کئی دنوں کے ٹوٹے نیا کہ نیاز علی باب بھی کسی ٹیم کو واپس لانے جاتا ہے تو اس کی جیب خالی نہیں ہوتی، اس میں اس کا کافی سامان لدا ہوا ہوتا ہے۔ آؤر کی طرف سے ہر ایک کردہ معلومات بڑی قیمتی تھیں۔ ان معلومات کی مدد سے نیاز علی کا کردار جس طرح سامنے آیا تھا، اس کے

مطابق وہ قاتل مجرم و سار آرمی نہیں تھا، پہنا نہیں اس کے اس بیان پر بھی یقین کرنا نہ سب نہیں تھا کہ افواہ کاروں نے اس سے جیب چھینی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میرے کے حصول کے لیے نیاز علی نے خود ان لوگوں سے سوا کچھ کیا ہو اور انہیں واردات کے لیے بیپ فراہم کر کے خود کو کوٹھی کے جانے کا ذرا مہیا کیا ہو۔ یہ امکان کیا تھا جس کو سامنے رکھتے ہوئے مشاہیرم خان سمجھتا تھا کہ نیاز علی سے سیدھے طریقے سے بات کرنا اچھا ہو وہ منہ بہ من نہیں ہو گا اور اس شخص سے درست معلومات اکٹوارے کے لیے اس پر ذرا محنت کرنی پڑے گی۔

"دہ رکھو۔ وہ جو بال صحت والا مکان ہے اس میں نیاز علی رہتا ہے۔" مشاہیرم خان کی پوچھ سے بے خبر آؤر نے ہاتھ کے اشارے سے ایک مکان کی نشان دہی کی تو وہ مکان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن عمارت اچھی حالت میں اور مضبوط تھی اور اس پر موجود رنگ و روغن بھی اچھا تھا تھا کہ حال ہی میں کیا گیا ہو۔

"یہاں کہہ دو تم نیاز علی سے ملاقات کرو۔ میں پھر کسی وقت تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔" نیاز علی کا معلوم نہیں کر سکی رو کے انداز میں نے اور میں رات ہی سفر سے تھکا ہوا آیا ہوں۔" شخص میں برداشت ذرا کم ہو جاتی ہے اس لیے میرے خیال میں، میں اس سے نہ ہی ملوں تو اچھا ہے۔" گھر کے قریب پہنچ کر آؤرنے اچانک ہی اندر جانے کا ارادہ بدل دیا اور مشاہیرم خان سے بولا۔

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ مگر میری تو مجبوری ہے۔ مجھے نیاز علی سے بڑی اہم باتیں معلوم کرنی ہیں اس لیے چاہے وہ جس انداز میں بھی ملے، مجھے تو اس سے ملنا ہی پڑے گا۔" مشاہیرم خان خود آؤر کے اس ملاقات میں ساتھ ہونے کے خیال سے ابھن کا ٹھیکہ تھا اس لیے اب جو آؤر نے ارادہ بدل کر فرس ہو گیا اور اسے خوش دلی سے رخصت کی دے دیا۔ آؤر اس سے معافی مانگ کر واپس کے راستے کی طرف میں پڑا سب مشاہیرم خان نے نیاز علی کے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک بلند آواز میں لیکن مہذبانہ انداز میں دی گئی تھی۔ دستک کے جواب میں تقریباً سات آٹھ سال کا ایک بچہ دروازے سے باہر نکلا۔

"سیرانام مشاہیرم خان ہے۔ مجھے نیاز علی سے ملنا ہے۔" اس نے بچے کی سوالیہ نظر دیکھ کر جواب میں بتایا تو وہ سر ہلاتا ہوا واپس اندر چلا گیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے وقفے کے بعد دروازے پر ایک دروازہ کھولی گئی اور مجبوری آؤر کو ان کے پاس لے گیا۔ یہاں سے اس کا سفر شروع ہوا۔

"اسلام بیگم بھائی مشاہیرم آؤر اندر آ جاؤ۔" آؤر کی فراہم کردہ معلومات کے برخلاف نیاز علی نے اس سے کافی گرم پوچھ سے معافی مانگنا اور اسے گھر کے اندر بچہ کی دعوت دی۔ مشاہیرم خان نے یہ دعوت قبول کر لی۔

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ اگر کم خان کا بھائی مشاہیرم خان اسکرودا آیا ہوا ہے۔ میں اس گھر خان کے افسوس کے لیے قمرے لانا بھی چاہتا تھا لیکن خیریت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ جیسی معلوم ہو ہوا ہو گا کہ جن لوگوں نے اگر کم خان کو بلا کر کیا، وہ جب جیتنے کے پکر میں بھی کبھی نہیں کر سکتے تھے۔" گھر کی بیٹھک میں آؤر نیاز علی سے ایک وضاحتی سامان دیکھ کر اس کے کچے سے ظاہر تھا کہ وہ صرف مشاہیرم خان کو سامنے پا کر انہیں بار بار سے درست حقیقتوں اور اہم کوئی ارادہ میں رکھتا تھا۔

"مجھے تمہارے دینی ہونے کا معلوم ہوا تھا۔ میں نے سوچا چل کر حراج پڑی کر لوں۔ ساتھ ہی اگر کم خان کے قاتلوں کے بارے میں کچھ پتا نہ ہو تو یوزی میری بیوی۔" نیاز علی کی مجبوری آنکھوں سے پھٹکی عیاری کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے زہی سے درخواست کی۔

"پہنسی والوں نے بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھا تھا لیکن میں کیا بتا سکتا تھا۔ جن لوگوں نے مجھ سے جیب چھینی وہ اپنے چہروں کو غائب میں چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھی اس لیے ان کے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔" اس بار نیاز علی کا لہجہ قدرے نرم ہوا گیا تھا۔

"لیکن تم نے ان لوگوں کے بارے میں کوئی تو اندازہ لگایا ہو گا۔ کم از کم اتنا اندازہ ہی ہو گیا ہو گا کہ وہ لوگ مقامی تھے یا کہیں باہر کے؟" آؤر کی طور پر غصہ بھری نظر دیکھ کر نے کے باوجود مشاہیرم خان نے نیاز علی کے سامنے اپنا جہاز نہ رکھا۔

نیاز علی جواب میں چٹو ہوا، اس سے گھس ہی مشاہیرم خان کی آمد پر دروازہ کھلنے والا سات آٹھ سال کا بچہ کھولی کی گول تھا لیکن قہر سے کی پٹیا لیاں رکھتے اندر چلا آیا۔ بچے کی آمد پر نیاز علی اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے تھامی لے کر مشاہیرم خان کے آگے بھیجی۔ مشاہیرم خان نے دیکھا کہ قاتل میں قہر سے کی پٹیا لیاں کے ساتھ ایک مختصر سی شکل خرابیاں بھی رکھی ہیں۔

"لو بھائی، قہر ہو۔" بچہ قاتل چھانے کے بعد ذرا ہی واپس چلے گیا جبکہ نیاز علی بھائی کے فرائض اٹھا رہا تھا۔

"تمہارا بیٹا ہے؟" مشاہیرم خان نے نیاز علی کی بڑھائی ہوئی شکل میں سے ایک شکل خوب لپکتا تھا ہے۔

اس سے بڑھا۔

باب۔ میرا نکاح چاہیے۔ اس سے بڑی دشمنی ہیں۔ اللہ نے مجھے ایک ہی بیٹا دیا ہے، پر بڑا لالچ۔ زیادہ سوتا نہیں ہے۔ ہر صبح ماسنا ہے اور بڑے لئے کاکھی بڑا شوقین ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ یہ پانچویں اسکول پاس کرے تو اس کی بڑے شہر کے اچھے اسکول میں داخلہ دواؤں گا۔ اچھی جگہ پر ہے گا تو کچھ مالہ بڑا ہو کر کہیں اچھا افسر بن جائے گا۔ ذرا کھڑے سے چلے تو خواب بھی نہیں دیکھتا میں اپنے بیٹے کے لیے۔ یہ بے لگیاں آٹا ہیں کہ مجھے لکھیں گے کہ میرے سارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔" نیاز علی نے لکھتے میں گہری پیراں شفقت و محبت تھی۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری خواہش پوری کرے لیکن یہ بہت مشکل خواہش۔ خاص طور پر یہی ہے شہر کے اچھے اسکول میں سے کوئی اسکول کی فیسیں زیادہ ہوتی ہیں دوسرے نہیں دہلی دلیہ کا خرچ لیکن اچھا پڑے گا۔" مشاہیرم خان کو یہاں آکر رہنے سے ہوتا تھا کہ نیاز علی کے پاس کہیں سے روپ آئے وہ کہے۔ اب جواس نے بیٹے کے بارے میں اپنی خواہشات کا اظہار کیا تو اسے احساس ہوا کہ آؤ، واقعی کچھ برا تھا۔ دوسری عام آدمی کے لیے تو اتنے مجھے خواب دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

"خرید تو واقعی آئے گا لیکن اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے آدمی کو کچھ نہ کچھ اچھ ہی کرنا پڑے گی۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے کی اچھی تعلیم کا انتظام کروں گا۔" نیاز علی نے یہ کہا ہے نیاز علی سے جواب دیا لیکن مشاہیرم خان محسوس کر رہا تھا کہ اس کی اس بے نیازگی میں ایک خاص قسم کا یقین ہے۔ پس لگتا تھا کہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اسے وسائل کی سطح کا ذرا بھی تحفظ ہو۔ "چلو، اللہ تمہارا ساتھ دے۔ میں نے تو بڑے ہی اچھے بات کہی تھی۔ دلت کا یہ ہے کہ تم خود زیادہ اچھی طرح جانتے ہو گے کہ وہ بچے کے لیے کیا کر سکتے ہو اور کیا نہیں؟ میں تو یہاں اپنے بھائی کے قانون کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوں۔ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ وہ لوگ مقامی تھے یا نہیں دہلی کے تھے؟" بچے کی آمد کی وجہ سے جو سوال مل گیا تھا، وہ مشاہیرم خان نے پھر دہرایا۔

"میں یقین سے کہہ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے خیال میں وہ کہیں باہر کے ہی لوگ ہوں گے۔ ملتی ہی افراد میں سے تو کوئی بھی ایسی کارروائی کی جرات نہیں کر سکتا۔" کوئی واضح

جواب دینے کے بجائے نیاز علی نے خیال آزمائی کی۔

"تم مجھے وہ کچھ دیکھا کرتے ہو یا میری جہاں سے ملے آ رہا ہے تمہاری جیب چھٹی گئی؟" "کوئی تو سنا ہو گا۔ میں تم وہ کچھ دیکھ کر کچھ کر کے دو۔" تو بالکل ویران اور خالی جیب تھی۔ اس جگہ پولیس والے پہنچ کر ہی جائزہ لے چکے ہیں اور انہیں وہاں سے اٹھا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کے ذریعے جرموں کی نشان دہی ہو سکتے۔" نیاز علی نے قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہاتھ کی کوشش کی۔

"ابھی میں ایک بار اپنی تسلی کے لیے وہ کچھ دیکھ چکا ہوں۔ تم ایک بار مجھے وہاں لے چلو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"نیکہ۔ تم خند کر رہے ہو تو میں چلوں گا لیکن وہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے اور پھر جیب کے پھٹنے ممکن نہیں۔ وہاں تک جانے کے لیے جیب کا انتظام کریں خود کرنا ہوگا۔ میں جس کورسٹ جگہ کے لیے جا رہا ہوں، وہ صرف اپنے کام کے لیے ہی مجھے جیب فراہم کرتی ہے۔" نیاز علی نے ختم دلانے سے انکار میں باقی بھری۔

"جیب کا مسئلہ نہیں اس کا مسئلہ خود انتظام کروں گا۔ تم دو کھٹے جھٹکار دینا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔" نیاز علی کو کسی قسم کا جوا نہ بنانے کا موقع دے لیں اس نے کیا اور قید کے کی خالی پیانی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"دو کھٹے جھٹکار۔ لیکن میری طبیعت اچھی دلتی اچھی نہیں ہے کہ میں گاڑی چلا سکوں۔ سہی چوت کا معاملہ ہے۔ اگر اچھا چکر و گھیر دیا تو کوئی عادی نہیں ہو سکتا ہے۔" مشاہیرم خان کو بالکل چارہ کچھ کہ نیاز علی نے ایک اور جھٹکا فرمایا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو۔ مجھے ذرا پیانی کا بڑا تجربہ ہے۔ میں آرا سے جیب چلاؤں گا۔" لیکن صرف پھر ہی رہنمائی کر لی ہو گی۔ "مشاہیرم خان نے اس کا یہ بیان بھی مسرور کر کے سنے جا مل چل کر دیا۔ ہوا بانی نیاز علی کے چہرے کے مشعلات چھوٹنے سے گئے لیکن اب وہ اپنی جھڑپ سے کام لے رہا تھا لیکن نہیں تھا چنانچہ بے بسی سے ہی کسی سے اس کی خاطر کوئی پڑی۔ اس کے انہی ہاتھ ہر کرتے ہی مشاہیرم خان اس سے رخصت کے لیے سیدھا ایک نو دست بھی لے دئے پہنچا کہ وہاں سے جیب ماسٹر نہ سکے۔ فورسٹ لکھنی، اسے کھوٹا لکھنا دے اس کے کسی کو جیب فراہم نہیں کر سکتے لیکن اس وقت میں مشاہیرم خان کا ایک درندہ دست نیاز سے رہا تھا۔ اس کی غفلت پر اسے جیب فراہم کر دی گئی۔

وہ کھٹے بند ہو ایک بار پھر نیاز علی کے کمر کے دروازے پر تھا۔ "میری تو کچھ ہی تھیں اور ایک دم وہ جگہ کچھ کر گیا کرو گے جہاں سے ان فنڈوں نے مجھ سے جیب چھینی تھی۔" بے گار میں تھرا اور میرا دونوں کا وقت ہی ضائع جاتے تھے۔ اسے سامنے دیکھ کر نیاز علی نے منہ دھاتے ہوئے ایک بار پھر اسے اس کے ارادے سے باز کھینے کی کوشش کی۔

"ابھی تم میری تسلی کے لیے چلے چلو۔ اب تو میں کمرے پر جیب بھی لے آیا ہوں۔" مشاہیرم خان نے اصرار کیا تو نیاز علی کو چاروں چاروں کے ساتھ جیب میں سوار ہونا ہی پڑا۔ ذرا سیٹنگ مشاہیرم خان گرد ہوا تھا اور تھیرے مہارت سے نیاز علی کی رہنمائی میں گاڑی آگے بڑھاتا جا رہا تھا۔ ذرا سیٹنگ کھینے کی تھیں مشقت طلب ذرا سیٹنگ کے بعد وہ لوگ ایک ایسے قاسم پر پہنچے جہاں زمین کی رنگت سلیٹی بالٹ اور ساخت چٹھری تھی گی۔ یہ علاقہ باغی ویران اور غیر آباد اور در سک کیسی چٹری زمین کے سر سے پرانی کی طرح ویران اور خشک چھاؤں سے ہوتے نظر آ رہے تھے۔

"اس جگہ ان فنڈوں نے مجھے بھرا تھا۔ اس جگہ سڑک سختی غراب ہے تم دیکھ رہے ہو۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ذرا تیز رفت بہت احتیاط سے اور بالکل آہستہ میں گاڑی چلائی پڑتی ہے۔ ورنہ ڈروہتا ہے کہ جیب سے گاڑی کو روک کر کی دوسری طرف کھائی میں گر جائے گی۔" جیب اٹھائے جانے کی جگہ زمین دھن کرتے ہوئے نیاز علی نے مشاہیرم خان کی قیودار سے اس کی تسلی کی طرف بڑھنے کی راہ لی۔ وہ جگہ کہہ رہا تھا۔ سڑک کی حالت واقعی کوئی عجیب و غریب تھی اور اس کی ایک جانب موجود پتھر لینڈ اسکیپ کے مقابلے میں دوسری طرف کھنکھری کھائی تھیں۔ سڑک وہاں کھائی کے قریب سے گزرتی تھی۔ مشاہیرم خان کی جگہ کہہ رہا تھا۔ سڑک کی حالت واقعی کوئی عجیب و غریب تھی اور اس کی ایک جانب موجود پتھر لینڈ اسکیپ کے مقابلے میں دوسری طرف کھنکھری کھائی تھیں۔ سڑک وہاں کھائی کے قریب سے گزرتی تھی۔ مشاہیرم خان کی جگہ کہہ رہا تھا۔ سڑک کی حالت واقعی کوئی عجیب و غریب تھی اور اس کی ایک جانب موجود پتھر لینڈ اسکیپ کے مقابلے میں دوسری طرف کھنکھری کھائی تھیں۔ سڑک وہاں کھائی کے قریب سے گزرتی تھی۔

"میری جیب چھیننے والے فنڈ سے شاید اس چارہ کے پیچھے پیچھے ہوئے تھے۔ میں راستے پر توجہ ہونے کی وجہ سے دھیان نہیں دے سکا کہ وہ کس طرف سے آئے تھے۔ پس مجھے تو ایسا لگا کہ وہ بالکل اپنا کھیرے راستے میں سے گزرتے ہوئے ہوئے۔" نیاز علی تفصیلات بتا رہا تھا جبکہ مشاہیرم خان بے نیچہ سڑک سے اتار کر غرور میں پر ایک طرف دھک لیا تھا اور اگر وہ کچھ جائزہ لے رہا تھا۔ علاقے کا سا منظر کرتے ہوئے اسے نیاز علی کی بات کوئی درست محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے جیب چھیننے والے فنڈوں کا اصول آ پڑا جی کے پیچھے

ہی چھپا ہوا چاہیے تھا۔ کئی جگہ سوچو ہوئے کی صورت میں تو وہ فوراً ہی نظروں میں آجائے۔ وہ لکھا ہوا پتھر پھاڑی کی طرف بڑھتا چا گیا۔ نیاز علی بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ وہ قریب پہنچ کر نیاز علی کا ہاتھ اپنے پر چمک سکیا۔ وہ بلند ہوا، نیاز علی یقیناً چھیننے والوں کے لیے پھرین پڑا گا۔ ہاتھ ہونے لگی لیکن اس صورت میں کہ اس کے پیچھے کچھ جگہ سوچو ہوئے لیکن اس پہاڑی کے پیچھے تو بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ گھوم کر پہاڑی کی دوسری طرف جاتے ہی کوشش کرنے والے مشاہیرم خان نے اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد بھی تیز انداز میں سر ہٹا کر نیاز علی کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں کی معنی تیزی نے نیاز علی کو بولوا دیا۔ وہ خود بھی وہاں سے محسوس کر چکا تھا تھے مشاہیرم خان نے ٹوٹ کیا تھا۔ پہاڑی کی دوسری طرف کسی شخص کے کمرے ہوئے کے لیے بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ دوسری طرف بالکل ویسی ہی گہری کھائی تھی جیسی سڑک کے دائیں جانب سوچو ہوئے۔

"تم کہتے ہو کہ وہ فنڈ سے اس پہاڑی کے پیچھے چھپے ہوئے تھے لیکن یہاں تو چھیننے کی جگہ ہی لگتی ہے۔" مشاہیرم خان وہاں پہنچا اور نہایت چھپکھپکی سے نیاز علی سے بولا۔ "میں نے شاید بول دیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں اور چھپے ہوں۔" نیاز علی نے بولکھا ہے ہوئے انداز میں مٹائی پیش کی۔ "نہیں اور کہاں چھپ سکتے تھے وہ لوگ؟ سڑک کے دائیں جانب گہری کھائی ہے جہاں کوئی چھپ ہی نہیں سکتا۔ اب بائیں جانب کا علاقہ قبیروں کا ہے اور یہاں کا کھلا ہے کہ تم دوسری سے ان لوگوں کو دیکھ سکتے تھے۔" اب مشاہیرم خان کے لہجے میں ذرا تھری آئی تھی۔

"لیکن میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے وہ زمین سے چھپ کر کہیں ہوئے ہوں اس لیے میری آن پر نظر نہیں پڑ سکی ہو۔" نیاز علی نے ایک اور دلیل دی جو قدرے معقول تھی اس جگہ کی زمین واقعی ایسی رنگت کی تھی کہ اگر کوئی ملے ملے رنگ کے پڑے کہیں کر اس سے چھپ کر گریٹ جائے تو بے دھیانی میں گزرنے والے کو کسی کی سوچو ہوئے کا احساس نہیں ہو سکتا تھا لیکن مشاہیرم خان، نیاز علی کی طرف سے ٹھٹھک رہا تھا۔ پہلے آدمی کی طرح کہ وہ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں پر کھلا ہوا رہتے اس کے ذہن میں شک پیدا کر رہا تھا۔ اس میں موجود شک سے ہی اسے روک دیا تھا اور اسے ایک اہم نکتے کا خیال آیا۔

"تمہاری جیب چھیننے والے فنڈ سے خود جہاں تک پہنچے تھے؟ یہ جگہ کتنی دور نہیں کہ جہاں تک کوئی پیدل آسکے۔ وہ

لوگ یقیناً کسی جیب میں ہی یہاں تک آئے تھے۔ اگر وہ جیب میں آئے تھے تو انہوں نے اپنی جیب کہاں چھانی تھی؟
 نیاز زلی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے یہ سوال کیا تو وہ واضح طور پر بولنا لگا اور اپنی اس بولکھانے کو چھپانے کے لیے غصے کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں پتا کہ وہ لوگ یہاں کسے آئے تھے اور کہاں چھپے تھے؟ میں نے تمہاری درخواست پر نہیں مانے تو تم کھادی سے۔ اب تمہیں جرو تھکنا ہے اور معلوم کرنا ہے، خود ہی معلوم کر لو کہ میں تمہارے سامان کا جواب دینے کا بند نہیں ہوں۔"
 "مجھے جو دیکھنا تھا وہ تو دیکھ چکا ہوں لیکن جو معلوم کرنا ہے وہ تم سے معلوم کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا پڑے گا۔" اس کا جواب سن کر مشاہیرم خان جارجانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔
 "خبردار! مجھ سے دور رہو ورنہ میں تمہیں کوئی مار دوں گا۔" نیاز زلی نے اس سے بھی زیادہ بھڑکی اور مفاہرہ کرتے ہوئے اپنی جیب سے ہاتھ نکال کر اس پر تان دیا۔
 "تمہاری اس حرکت سے بات ہوتا ہے کہ اگر ہم خان کے ساتھ جو کچھ ہو کر خود بھی اس میں شامل تھے اور جیب چھینے جانے کا دریا کر کے تم نے پولیس والوں کو بے وقت جاننے کی کوشش کی ہے۔" اپنی طرف سے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے مشاہیرم خان نے پوچھنے لگے میں کہا۔ نیاز زلی کے ہاتھ اتار لینے کے بعد وہ بے شک اپنی جگہ پر رک گیا تھا لیکن اس کے سچے اور انداز میں خوف زدگی کا دریا مشاہیرم تک نہیں تھا۔ وہ برقی طور پر چمکنا اور مدھن نظر آ رہا تھا۔
 "تم جو چاہے مجھ میں کوہ چٹانوں کے میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" نیاز زلی نے بہت جلدی کا مظاہرہ کیا اور مشاہیرم خان پر نظر جمائے جانے لگے۔
 "تم اپنے دونوں ہاتھ اچھا کر سر پر رکھو اور اس وقت تک وہی جگہ سے حرکت مت کرنا جب تک میں یہاں سے جا نہ جاؤں۔ اگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو تیار رہنا کہ میں بلا تکلف تمہیں کوئی مار دوں گا۔" نیاز زلی کا انداز اس کی لپٹی کا ساتھ جو بند کر کے میں نہیں کی ہو اور باہر نکلنے کی خواہش میں سامنے آنے والے انسان کو ترخا ادھیڑ ڈالنے میں بھی عار نہ سمجھے۔ اس کے لپٹے کی غول خواری دیکھتے ہوئے مشاہیرم خان نے اس کے صدمہ کی شکل کیلن اسے بھی دیکھ کر ابا و ابا پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔
 اس نے وہی نظریں نیاز زلی پر کاڑھ رکھی مگر وہ اس پر ہاتھ نہ لگنے دے کر قہر سے پیچھے ہٹا۔ باقدا۔ مشاہیرم خان کو

اس کا ارادہ بھانپنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اسے اس دہانے میں پھنسا کر خود جیب میں فرار ہونے کا سوچ دیا۔
 تھا۔ اگر اسے آسانی سے جیب تک پہنچنے کی مہلت دے دی جاتی تو اسے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔
 مشاہیرم خان کو جیب سے اترتے وقت چلتی کانٹے کا خیال نہیں آیا تھا اور چلتی چلتی انہیں میں لگی ہوئی تھی۔ نیاز زلی ایک بار جب تک پہنچ جاتا تو اسے وہاں چوڑا کر کوہ جرجر میں ہوا ہو سکتا تھا۔ اسے اپنے اس ویران مقام پر نہ جانے کی تو نظر نہیں چلی کہ بھی نہ کسی کوئی نورس یہاں سے گزرتا تو وہ اس سے غلط سے ملتا تھا ورنہ دوسری صورت میں پیدل چل کر آگے بڑھے اس کی مقام تک جایا جاسکتا تھا جہاں سے سواروں کا کوئی بندہ راست ہو جاتا لیکن اگلے مسئلہ نیاز زلی کا تھا۔ وہ ایک بار باجھ سے نکل جاتا تو پھر وہ بارہا سے صبر نہ اور اس سے کچھ معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا۔ مشاہیرم خان نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے میں ٹھہر کر سارا حساب کتاب کیا اور اپنے ارادہ کو ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کی دامن ہاتھ کے قریب چھانچ کا ایک ٹکڑا جھپٹا پھر رہا تھا۔ اس پھر کے نظروں کی گرفت میں آتے ہی وہ فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا اور بے حد تیزی سے دائیں ہاتھ کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے انداز میں حرکت دی۔ اس کی فوکر سے جگہ کے قریب پڑا پتھر زمین سے اچھا تھا اور قوس کی صورت میں حرکت کر رہا تھا نیاز زلی کی طرف بڑھا۔ نیاز زلی جو اس پر نظر کیا جھکے ہوا تھا۔ اس کی حرکت پر ہلک گیا اور جتنا وقت فارغ دیا لیکن مشاہیرم خان اس میں ٹھیک کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا اس لیے اس کے فائر کرنے سے کوئی غلطی نہ ہو سکتی تھی۔ اس کا فائر اس کا پھر بھی آگیا اور کوئی چھانچ کے فاصلے سے اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اس وقت میں اس کا نیاز زلی کی طرف اچھا لگا پتھر بھی اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ بہت حساب کتاب سے چھپنے لگے پتھر نے فائر کے اگلے لپٹے میں کوئٹہ لگائی اور وہاں اچھل کر نیاز زلی کے ہاتھ سے لپٹے کے بعد لپٹا ہوا نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ ہاتھ کے غائب ہوتے ہی نیاز زلی کی خود احتیادی ہاتھ جواب دے گئی اور وہ پلٹ کر جیب کی طرف بھاگا لیکن مشاہیرم خان کب چھو گئے اور اچھا۔ اس نے ایک ہی جست لگائی اور پتھر ٹھنڈا وہاں پہنچ گیا اسے چھاپ لیا۔ نیاز زلی نے جب فرار کی راہ مسدود کی تو وہ بدھانے سے لپٹے فرار ہوا اس کی طرف بڑھا۔ پتھر کے اس لپٹے میں اسے انہی غامضی حاکم صرف کرنی پڑی گی لیکن اس کی

گڑباز اور ایک بار وہ مشاہیرم خان کی گرفت میں تھے۔ پتھر کے ساتھ ہی اس نے باقدا لپٹا اپنے دائیں ہاتھ کا مٹا کر مشاہیرم خان کے منہ پر مارنے کی کوشش کی۔ مشاہیرم خان نے ہچکچاہٹ کے لیے اپنا چہرہ پیچھ کر لپٹا لیکن پھر بھی نیاز زلی کے ہاتھ سے مکمل طور پر محفوظ نہیں رہ سکا اور پھٹکا ہوا سارا اس کے رخسار پر لگا۔ اس معمولی چوٹ نے ہی تھالی کی ایک عظیم ہوش کے ہم نشین مشاہیرم خان کو غصہ ہلک کر دیا۔ وہ پہاڑوں کا پیٹا تھا۔ اس نے پہاڑوں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس کا باپ ساری زندگی پہاڑوں کو گھر کرتا ہوا آخر کار انہی کی آغوش میں جا سوبا تھا۔ اس پہاڑ آتش فشاں نے اپنے بیٹے کا نام ایک پہاڑی چوٹی کے نام پر رکھا تھا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی رکھا تھا۔ شاید وہ اپنے بیٹے کو پہاڑ جیسا ہی مضبوط دیکھنا چاہتا تھا۔ بہر حال وہ جو بھی دیکھتا ہی ہے بے شک جب پہاڑ بہر بان ہو گیا تو ان کے آگے کسی کی نہیں نکلتی۔ پہاڑوں کا غصہ سہا سہی کے پس میں نہیں ہوتا۔ مشاہیرم خان بھی فتنے میں آیا تو نیاز زلی کی ذرا جھپٹ نہ چلی۔ مشاہیرم خان نے اسے در بے در کیوں کر رو کر دیکھا۔ ساتھ ہی اس کی دامن بھی مسلسل چل رہی تھیں۔ اس فرار کا نیاز زلی بے حال ہو کر نیچے گر پڑا۔
 "تاکون تے دو لوگ جھنڈوں سے میرے ہاتھ کی قوت کیا اور اہری مہمان لڑکی کو لوٹا کر کے لے گئے؟" مشاہیرم خان نے اپنا گھٹنا اس کے سینے پر رکھ کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی سخت گرفت میں لپیٹے ہوئے پچھا۔
 "میر۔" مجھے نہیں معلوم۔" نیاز زلی نے خوف زدہ لہجے میں انکار کیا۔ اس کے انکار نے مشاہیرم خان کو مزید غصہ ہلک کر دیا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اس کی دو انگلیوں کو نیاز زلی کے غصوں میں ڈال کر اس کی زور سے دباؤ ڈالا کہ اس کے ہاتھ سے میرے اس ارادے کی شدت سے تیار لپٹ کر ذرا کیے جانے والے ہر کسی کی طرح چھینے گا۔
 "مجھ پر اس وقت خون سوار ہے نیاز زلی! میرا سینہ اپنے توان بھی کی موت کے غم سے اٹل رہا ہے۔ چھوٹے صرف اسی صورت میں بھڑکتے ہیں کہ میں جہاں کے قاصدوں کو ان کے انجام تک پہنچا دوں اور اپنی مہمان لڑکی توان کی گرفت سے نکال لاؤں۔ اگر تو نے میرے اس ارادے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور مجھے جکھیں یا تو پتھر سے سینے میں چلتی آگ سب سے پہلے تجھے ختم کر دے گی۔" مشاہیرم خان کے بڑے بڑا ہاتھ ایک سر کی پھانسی ہوئی تھی جیسے آگ کے قریب میں موجود جسم کے چہرے پر

دیکھنے میں آتی ہے۔ دو ہاتھ جمع کر رہا تھا کہ اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس آگ کے شعلوں کو دھس اس کے چہرے پر دیکھا جا سکتا تھا۔
 "وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میں نے تمہیں کچھ بتایا تو دیکھو اور میرے بیوی بچوں سب کو مار ڈالیں گے۔" نیاز زلی تقریباً زور پڑا تھا۔
 "اس وقت میں بھی تمہارے لیے کسی جہاد سے کسم کسم ہوں۔ تم نے اگر مجھے ان لوگوں کے بارے میں نہیں بتایا تو میں بھی تمہیں مار ڈالوں گا اور وہ بھی آسانی سے تمہیں مار ڈال دے گا۔ حد اذیت کے ساتھ۔" گھبراہٹ سفاکی سے جواب دیتے ہوئے مشاہیرم خان نے اس کے غصوں میں ڈال دی ہوئی انگلیوں کو ایک بار پھر جھپٹ دی۔ نیاز زلی کے غصے سے ایک بار پھر پتھر پڑا ہوا۔
 "کیلو آکون چہ دو لوگ۔ تمہارا ان فتنوں سے کیا مقصد ہے؟" اس کے چھیننے کی پیرا دیکھ کر مشاہیرم خان نے پچھا۔
 "وہ کون اس میں کسی جہاد میں سے معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔" نیاز زلی نے سہا سہی لپٹے ہوئے بتایا۔
 "تمہارا ان لوگوں سے کیا مقصد ہے؟" انہیں وہ دیکھتے اور کہاں ہے؟" مشاہیرم خان نے اپنا سوال زور سے اٹھانے کے ساتھ دہرایا۔
 "وہ خود میرے ہاں آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں۔۔۔ ان کا ایک معمولی سا کام کر دیا کہ ان کو بدلے میں مجھے کافی بڑی رقم ملا کر دے گی۔ میں اپنے بچوں کے ہاتھ سے ان کے لیے رقم کے ایلو میٹیا پھر کام بھی کوئی خطرہ نہ تھا لیکن تمہارے انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ میں جیب سے انہیں دیکھتی تھی تو انہیں اپنے جیب سے جاکر انہیں راشن اور ادویات وغیرہ سہائی کر دیا۔ میں انہوں کے لیے کام کر رہا تھا ورنہ میں نے مجھے انہیں رقم کی پتی تھی۔ اس بار میں انہیں راشن پہنچانے گیا تو انہوں نے مجھ سے پیری جیب ہاتھ لی۔ ظاہر ہے کہ میں اس طرف انہیں جیب نہیں لے سکتا تھا۔ وہ دیکھ کر اپنی پتھری کے ہاتھ کو جواب دینا کہ میں وقت پر مجھ کو پہنچے کیوں تک پہنچا۔ ایک کے سوال جواب سے منجھ کے لیے سم سے جیب چھینے جانے اور مجھے یہ ہوش کرنے کا دریا دیا۔ پولیس والوں سمیت سب نے اس ذرا سے پوچھنے کر لپٹا لیکن تم کو جانتیں کیسے شک پڑ گیا۔ تم جیتیں کرو خان! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ مجھ سے جیب سے لے کر لیا کر کے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ میں جی کہتا تھا کہ انہیں اپنے

ایک کام کے لیے چند گھنٹوں کے لیے ٹیپ چاہیے۔ اس خدمت کے لیے انہوں نے مجھے رقم بھی دی تھی۔ میں دیتے، تب بھی میں انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میرے انکار پر غصے میں آکر مجھے قتل بھی کر سکتے تھے۔" نیاز علی کے لہجے میں واضح خوف تھا۔

"تم انہیں دشمن کہہ چکے پچائے ہو؟" اس کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر مشاہیرم خان نے پرسوج انداز میں سوال کیا۔ "کسی ایک جگہ نہیں۔ دشمن سمجھنے والے جب مال میرے حوالے کرتے ہیں تو اس وقت جگہ کے بارے میں بتاتے ہیں۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟ کیا ممکن اسکو وہاں رہتے ہیں؟" مشاہیرم خان اس کا جواب سن کر چوڑھا۔

"میں ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" نیاز علی نے جواب دیا لیکن یہ جواب دیتے ہوئے اس نے جس طرح فکر میں چرائی تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔

"جھوٹ مست ہو کر نیاز علی! یہ ممکن ہی نہیں کہ جو لوگ اسے ملے سے مسلسل تم سے یہ کام لے رہے ہیں، تم ان میں سے کسی کو پہچانتے ہی نہ ہو۔" مجھے یقین ہے کہ تم ان لوگوں کے بارے میں جانتے ہو۔ آخر دشمن کی معمولی اور اپنی خدمت کا معاوضہ لینے کے لیے جیسے کسی سے ملنا پڑتا ہوگا۔ تم مجھے ان لوگوں کے بارے میں جانو۔" پہاڑوں میں ٹھکانا بنا کر رہنے والوں کے بارے میں تو مشاہیرم خان یقین کر سکتا تھا کہ وہ نیاز علی کے لیے ایسی ہیوں گے۔ جو لوگ سب سے سبب کہ پہاڑوں میں اپنا مکان بناتے ہوتے تھے ان کے بارے میں یہ بات سچی تھی کہ انہوں نے اپنی شناخت چھپانے رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہوگی لیکن دیکھو دیکھو میں رو کر نیاز علی سے کام لینے والے کا پردے میں رہنا ممکن نہیں تھا۔

"میں نے کہہ دیا تھا کہ میں کسی کو نہیں جانتا تو پھر تم کیوں زبردستی میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟" نیاز علی نے جھنجھٹائے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا اور یک دم سی اسے دھکا دے دیا۔ مشاہیرم خان جو تیار ہی تھا تو گھٹاؤں پر آمادہ دیکھ کر اسے قدرے ڈھیلا پھوڑ چکا تھا، اس کا ایک دھکے کو سہارا نہیں ملتا اور پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کے گرتے ہی اب تک بے ہوش پڑے نیاز علی نے چھری کا مظاہرہ کیا اور تیزی سے کھڑا ہو کر جب کی طرف دوڑا۔ مشاہیرم خان کے منہ پر کھڑا ہونے تک وہ جب کے قریب پہنچ چکا تھا۔

مشاہیرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ نیاز علی کو نہیں جانتے جانتے گا پھر بھی وہ اس کی طرف دوڑا لیکن اس دور بھاگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے کھینچنے سے قتل نیاز علی جب میں بیڑا کرانجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ مشاہیرم خان نے پتلا تگ لگا لی کہ کسی طرح جب میں سوار ہو سکے لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کی آنکھیں صرف جب کی بات کو محسوس ہی کر سکتی تھیں کہ جب بھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ بے ہوش معاذ میں یہ مگر مشاہیرم خان ابھی کتبہ انوس ہی ل رہا تھا کہ اگلے پل دم بہ خود رہ گیا۔ اس کی دسترس سے نکل جانے والی جب تو ازان پر قرار نہیں رکھ کر اس کے اوپر بے قابو ہو کر سرنگ کی دوسری طرف موجود کھائی میں ٹھک جی۔ شاید غلط اور گھبراہٹ کے باعث نیاز علی ہیسٹا تجربہ کار ڈرائیور ٹپٹی کر بیٹھا تھا۔

مشاہیرم خان ٹھہر کے لیے شاک کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور کھائی کی طرف دوڑا۔ سرنگ پر کھائی کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے جھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ بے قابو ہو کر سرنگ سے گرنے والی جب لڑھکی ہوئی کافی نیچے تک پہنچ چکی تھی اور ابھی لڑھکنے کا عمل جاری تھا۔ موجودہ صورتحال دیکھ کر پھر کسی فکر و شبہ کے بغیر بات سمجھی جا سکتی تھی کہ نیاز علی کی زندگی کا چراغ جل رہا اب ممکن نہیں تھا۔ کھائی میں لڑھکی ہوئی جب نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جب کے غائب ہو جانے کے بعد مشاہیرم خان ایک گھبراہٹ میں لپٹا ہوا پیچھے ہٹا اور سرنگ پر پیدل چلے دیا۔ اب اس کے واپس شہر پہنچنے کا اٹھارہ گھنٹے بات یہ تھا کہ کوئی سوار ہی انھوں نے اس طرف آگئے اور اسے اٹھل چائے۔ کچھ دیر قتل نیاز علی نے اسے اس دیوانے میں سمجھو کر قرار ہونے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں وہ ہر حال کا سبب ہو گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنے ارادے کے مطابق یہاں سے نکل کر واپس شہر کی طرف سفر کرنے کے بجائے بیش کی واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ یہ وہ سفر تھا جس پر جانے کا ارادہ بھی کوئی نہیں بنا دیتا لیکن یا انھوں نے اس راستے پر سفر کے لیے قدم اٹھانے ہی نہ تھے۔ نیاز علی کی واپسی کا سفر بھی قدرت کے طے کر وہ وقت چرلوں ہو گیا تھا اور اس سفر کے دوران ہی اس کو یہ جاننا تھا کہ دنیا کی چند دہ وزندگی کے آرام کے لیے وہ جو مل و زر جمع کرتا، ہاتھ اس نے اس کا سفر آخرت کے کتنا مشکل بنا دیا تھا۔

۲۰۲۰

"کیا حال ہیں چودھری صاحب اسٹریکٹس انٹر نیوٹل نہیں" گرم گرم لانی سے ٹھٹھ اندازہ ہوتے چودھری نے

ایسا تیل فون جتنے پر کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نہایت
نے ٹھکانا لڑا انداز میں پوچھا گیا۔ چودھری چوہان کی اس مگرین
پر انہی جیسو کی طرح لڑا تھا اس لیے ٹھکانا لب و لہجہ کو رہا
شناخت کر گیا۔

"آپ سنا نہیں ستر ڈیو؟ آپ نے کیسے کال کی
رجسٹر کی؟" دوسرا ان ستر کی ڈیو سے اسے جاننے خاصی دیتی ہو
گئی تھی لیکن آخر میں جس طرح ڈیو نے جیٹرا بیل کر دھکی
آئینہ لپٹا اختیار کر لیا تھا وہ چودھری کو جواں تھا۔ چنانچہ اس
وقت اس کے لیے میں کافی سہجہ رہی تھی۔

"رجسٹر کیسی؟ آپ کو کال کر کے جو مجھے دلی خوشی
ہوئی ہے البتہ اس کا ضرور ہے کہ اس کال کے ذریعے میں آپ
کو سمجھو گی میری رجسٹر دیا جاتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ستر
کے دوران مجھے دوسرا ایک ڈیو کے سلسلے میں ٹھکانا
چلی رہی تھی اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس موضوع پر
بعد میں واپس جان سے بات چیت کریں گے۔ شاید اپنے
ساتھ کسی کی آفر بھی میں نے آپ کو ہی وقت دے دی تھی۔

ابن وقت میں نے اسی سلسلے میں یاد دہانی کے لیے فون کیا
ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ آج صبح میرے ساتھ ہی
کریں۔" ڈیو کا لہجہ سے حد شائستہ ہونے کے باوجود
چودھری اس میں موجود ٹھکانا لپٹ کر محسوس کر رہا تھا اور یہ
نے اس کے لیے بے حد تکلیف ہوئی۔ اس نے ستر کے چلائے
کے عادی شخص کے لیے کسی دوسرے کے امکانات کو
برداشت کرنا قطعی ناقابل قبول تھا۔

"فی الدی میرا ان کی سوا نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ
وقت اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔" اس نے
قدر سے روکنے پر اسے ایسا کو جواب دیا۔

"میرا کیا ہے چودھری صاحب آپ چاہیں گے تو
سو ڈیو میں جانے گا اور یاد نہیں کروائے میں اس پر آپ
کافی فائدہ ہے۔ وادی پر ملاقات آپ کے لیے بہت زیادہ
موجودہ بات ہوگی۔"

"میرے فائدے کو چودھری، یہ بتانے کہ آپ کا کیا
فائدہ ہے جو آپ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟" انہوں نے
میرے فائدہ سے کہنے کو تو آپ اپنے سے بہت نہیں ہو
سکتے؟" ڈیو کی بات سن کر چودھری نے چڑے ہوئے لہجے
میں پوچھا۔

"آپ ہاں نہیں آتی ہیں چودھری صاحب؟
آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگا دیا کہ میں بھی آپ سے کوئی
فائدہ حاصل کرتا چاہتا ہوں لیکن یاد نہیں کہ آپ کا سوا کچھ

سے زیادہ ہی ہوگا۔ میں آپ کو آپ کی منظور نظر ماہر ہو چکی
ہوئے دوں گا اور ساتھ ہی مجھے دوسرا ایک کاروباری
معاہدہ بھی ہے چاہئے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ستر اسے
شہر بارہاں کی آمد کے بعد آپ کا کمزری کا کاروبار ہاں
مضبوط ہو گیا ہے۔ آپ مجھ سے ملاقات کریں تو میں آپ کو
اس کے متبادل دوسرے کاروبار کے سلسلے میں مشورہ دوں گا
اور یقین چاہئے کہ وہ دنیا کا روپار آپ کے لیے زیادہ منافع
کثیر ثابت ہوگا۔" ڈیو نے چودھری کے سامنے وہ فائدہ
کہ اس کے لیے فائدہ سے انکار نہیں ہی نہیں رہا۔ وہ دن
ڈراور میں کھانا کھا۔ ڈیو اسے ان تینوں میں سے دو کے
لئے کی نوید دے رہا تھا اس لیے لیکن ہی نہیں تھا کہ وہ اسے
انکار کر دیتا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہاری آفر قبول کر لیتا ہوں۔ یہ بتاؤ
کہ کب اور کہاں پہنچنا ہے؟" اس نے ہلکی جھرتے ہوئے
ڈیو سے پوچھا۔

"آپ ایک بجے تک باغیچہ اسٹارڈن پہنچ جائیں۔ وہاں
سے میں خود آپ کو پک کر لوں گا۔" ڈیو نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔" چودھری نے جواب
دے کر سلسلے متعلق کر دیا اور پھر سوچ انداز میں اپنے سامنے
بٹنے لگا۔ اپنی اس اسکرین کو دھونے لگا۔ البتہ اسکرین پر
فکر کے انسانی جسموں کے بجائے اس کا دوسرا ڈیو تھی
باتوں میں ہی الجھا ہوا تھا۔ وہ اسے کسی صنعت کاروں یا
میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ یہ کوئی عام آدمی تو
کہ وہ کاروبار کیا ہو سکتا تھا؟ اگر ایسا ہوتا تو ڈیو کو اس سے
کرم کاروبار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو اس کے کوشش کرنے کی
برائے انداز پر لپٹے سے لے کر دھونے کی کوشش کرنے کی
ضرورت نہیں تھی۔ انہی سوچوں میں کمرے کا قی وقت گزر
گیا۔ چودھری اپنے خیالات نہ دیتا تھا اس وقت ان کا جب
دروازہ سے جوتھک کی آواز ابھر کر اس کی بہر شاہد سے
اختیار سے خود اس دروازہ کو کھول کر اندر چلا گیا۔

"آپ صرف تو نہیں ہیں ماموں جان؟" چودھری
اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے غماص سے پوچھا۔
"فی الدی تو نہیں؟" کرم کوئی کام تھا کیا کچھ ہے؟"

چودھری نے اپنے مخصوص روئے انداز میں پوچھا۔
"فی الدی میں کھانا تیار کر رہی تھی اس لیے آپ سے
پوچھنے آئی تھی کہ آپ وہ پھر سے کھانے میں کیا کھانا چاہتے ہیں
کے؟" تھوڑے دن میں ہی اس نے اپنے بے حد شاہد میں کافی
فراغتاری ڈیو کی کئی کئی سہجہ والی اور کئی بہار

میں ہوئی تھی کہ چودھری انکار عالم شاہ سے جس کی ہیبت
پوچھنے خاتون پر طاری تھی۔ ایک عامی بات بھی پورے
اختیار سے کرتی۔

"دوپہر کے کھانے پر مجھے ایک دوست نے بلایا ہے۔
میں کھانا اس کے ساتھ کھاؤں گا اس لیے میری فکر چھوڑ کر تم
اپنے لیے جو چاہئے چکواؤ۔"

"فی الدی؟" شاہد اس کا جواب سن کر واپس بیٹھنے لگی۔
"کچھ نہیں شاہد۔" چودھری نے اسے روکا۔
"جی ماموں جان؟" دور دراز سے وہ بانہ انداز میں بہر
تن گوش ہوئی۔

"میں نے تجھے شاید ٹھیک ہی وادی بھی بتا چکا کہ ہر روز
دوسرے کھانے میں ہے؟" ڈیو نے مت کھڑی ہو جایا کر۔ فائدہ
سے کہہ کر چھ آٹھ کھانے خالی کر۔ وقت پھر انہوں نے کمرے
کا وہ کھانا لیا۔ اگر تجھے میری پسند آئے پھر تو خود ہی فون
کر کے اور اپنی ساس سے پوچھ لے۔ وہ تجھے میرے پسند
کے کھانوں کی لسٹ لکھوا دے گی۔"

"مسلّم میں ماموں جان امراد شاہ کو ایک وقت میں دو
سے زیادہ کھانے کچھ کر مشورہ آئے لگتا ہے۔ دو کہتے ہیں کھانا
آدھی زور رہنے کے لیے کھانا ہے۔ کوئی کھانے کے لیے فون
نہیں رہتا جو کھانے کی کھانا کھانا کھانا ہے وہاں تک پھر
دیا جائے۔ پھر یہاں حریفی والی کھی کھی کھانے کے ہر وقت کے
کھانے پر پھر سارے لوگ موجود ہوں۔ زیادہ کھانا کھانا تو
جاسی ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ ملازمہ بھی صرف ایک ہے۔ اس
سے اتنا سارا کام اس کی فون کر ہی چھوڑ کر چلی جاتے گی۔ پھر
کام کو تو منہ نہیں۔ آپ کی خاطر میں اپنے اچھے سے کھانا
تیار کر سکتی ہوں۔ اس آج وہ وہ کر لیں گے میرا شاہد کی
ڈائن سے چاہیں گے۔" شاہد نے بڑے سہجہ سے یہی
بات اس کے گوش کر کر کر دے گی لیکن مانتے ہو چو کہ مانتا ہے
تھا جسے اپنی بات سے اس کی کالک حرف بھی گوارا نہیں تھا۔
نہ امراد شاہ کا مارا تو مجھے ٹھیک کرتا پڑے گا۔ دن بہ

دن اتھالی فٹا جاتا ہے۔ یہ کرم وہ نہ کر۔ ہوتا کون ہے وہ
یہ صبا بٹے والا؟ میں اس کا پاپ ہوں دوپہر انہیں کھانے
اس کے بنائے ہوئے اسونوں پر چلیں۔ پر مگوں سے عادی
کچھ اور سہجہ رہی ہیں۔ اس گلی کے چھوڑنے کے لیے پھر میں
اپنی ان راتوں کو پھوڑ کر ٹھٹھانوں اور سوسنوں میں لٹائی
تو نہیں کر سکتا ہوں، اگر وہ یہ کہتے ہے کہ میری عمرانی
صرف تو یہ تک محدود ہے اور اس طرح کا مالک وہاں ہے تو
کلی ایک ہے۔ یہ تو میرے یہاں لگے کا کھی کوئی جوتھا

نہیں ہوتا۔ جس آواز اور سہجہ یہاں سے چلا جاتا ہوں اسے
بڑے شہر میں ہونوں کی کی ہے۔ نہ ہی میری بیب خالی کھیں
اپنے ہی پتھر کے در پہے عزت ہونے کے لیے پڑا ہوں۔"
نہایت جسے سے کہتا ہوا وہ اس انداز کی طرف بڑھا چہاں
اس کا سٹریٹ ایک اور بے کیف کھیں و لپٹے رکھا ہوا تھا۔

"سوری ماموں جان؟ پیڑھی جانا مانو۔ میں تو
صرف آپ کو امراد شاہ کے خیالات کے بارے میں بتا رہی
تھی۔ ہوگا تو ہی جو آپ چاہیں گے۔" چودھری کو انداز
سے سامان نکال کر شاہد سٹینا گئی اور محضرت کرتے
ہوئے اسے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تو جو بھی کہ لے۔ اب میں یہاں رکنے والا نہیں۔
مراد شاہ کو بتا دے کہ اس کے گھر سے نکل کر میں کوئی کھانے
آمان کھانے نہیں آ جاؤں گا۔ میں اسے امراد میں بدل کر سکا
ہوں تو کیا خود اپنے چند دن رہنے کا کھانا نہیں کر سکتا۔"
شاہد کی منت ساجت کے چارو دو کی صورت رکھنے کے
لے تیار نہیں تھا۔ شاہد نے کچھ سالہ علیہ کو اس کے سامنے
لا کر اس کا کھانا کھاتی پوتی کو دیکھ کر اس کا دل کھینچ جائے
لیکن وہ چودھری انکار عالم شاہ جس کی عداوت دوسری کے
سامنے کسی شے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے ایک بار بغل
کر لیا تھا کہ مراد شاہ کے بارگشت میں نہیں رہتا تو اب دنیا کی
کوئی طاقت اسے وہاں رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ شاہد کی
معدنوں اور علیہ کی معصوم بچہ کو دیکھ کر انداز کرتا ہوا وہ
وہاں سے باہر نکل گیا اور ایک کیمپ لے کر اس کے فی ایمراد
اور اسے ایک بہترین ہوٹل کیمپ لے کر اس کے فی ایمراد
رکھے۔ وہاں وہ بیٹا اپنی آؤت ملک سے ہی تار ہا تھا کہ وہاں
قیام کرنا کسی معمولی طبیعت کے بندے کے لیے کی بات نہیں۔
چودھری عام طبیعت کا ایک نہیں تھا کہ اس ہوٹل میں قیام
رکھتے ہوئے ٹھکانا اس کے پیٹک انکا وہ اس دولت سے
بھرتے ہوئے تھے جو اس نے اور اس کے آقا دیا ہائے
دوسروں کا خون چس چس کر کھڑے تھے۔ اس دولت کو وہ
کوئی بازاری میں لانا، نہ ہی اس میں پائش و خورد کو پڑے۔
وہ تو کسی صورت نہیں ہوتا تھا۔ پیسے کا بے جا ہوا تو اس محنت
نہیں کو کراں گزارتے ہیں جس نے ایک ایک پیسے کے حصول
سے بے خون کو پہنچا دیا ہوا اور رزقی حساب کے حصول
کے لیے کی جانے والی محنت اس کی ہڈی تک کو دی
ہوں۔ چودھری جیسے شہر ہے اور صاحب کو اس دولت کو لانے
میں کیا عادی گئی اس نے ہونے کے ہوئی رہ کر اسے کی پناہ

کرتے ہوئے اس میں اپنے لیے ایک سوئٹ بک کر دیا اور
 وینٹر کی راہنمائی میں اس شان دار سوئٹ میں جا پہنچا۔ یہاں
 پہنچ کر اس نے وقت دیکھا تو معلوم ہوا کہ سوا بارہ بجے
 ہیں۔ ڈیوڈ نے اسے ایک بے نامہ اسکاؤٹ بلایا تھا۔ یعنی اپنی
 تیاری اور وہاں تک سفر کرنے کے لیے اس کے پاس
 بعض پانچ تھانے تھے۔ اس پانچ تھانے کو اس نے ڈیوڈ کی مشایخ
 غیبی کیا۔ یہ بھی ایک جگہ تھی وہیں منہ ہاتھی تھے کہ وہ
 نامہ اسکاؤٹ پہنچ چکا تھا۔ تو یہ پارک کے اس چڑھتی علاقے
 میں وہ پہلے بھی کیا بارڈر چکا تھا اور اس کے ساتھ بھی پس منظر سے
 واقع تھا۔ آج کا معروف ترین نامہ اسکاؤٹ اسیسو میں صدی
 تک "ونگ ایکٹر" کہلاتا تھا۔ 1904ء میں جب مشہور
 زمانہ اخبار "نیو یارک ٹائمز" کی قمارت اس علاقے میں
 کھڑی کی گئی تو اس بلند عمارت کی مناسبت سے اس جگہ کو
 "نامہ اسکاؤٹ" کہا جانے لگا۔ ماضی میں یہ جگہ کچھ اونچی
 تصور نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں فنڈز کو راق تھا۔ بعد میں
 جوں تو نام کے ایک میئر نے اس علاقے کی اصلاح کی اور
 یہاں سے فنڈز نامہ اسکاؤٹ باہر نکالا۔ اب یہ جگہ کافی ترسوں کی
 جہاں لوگ آتا اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے پسند کرتے
 تھے۔ ماضی کا نامہ اسکاؤٹ کے مقابلے میں اب یہاں شوقی
 قمارداروں، کاروباری افراد، ضرورت مندوں اور سیاستوں
 وغیرہ کا راج تھا۔ چودھری کی یاد کے دیکھے منظر پر سرسری کی
 نظر ڈال کر آئے ہواست چلا گیا۔ بارڈر اس کی نظریں پر مشغول
 کہیں کو دور دانی کو جان ڈالیں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک
 ایسی ٹری پر جا ٹھہری جو ٹھکانا تو ہے لیکن اپنی دوری
 ساریوں سے بڑھ کر خوب صورت نہیں تھی لیکن اس کا جسم
 غیب کا پیش تھا۔ وہ چلتی ہوئی اپنی اس جسمانی کشش
 سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اس نے خود کو ایک پیروز
 کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب تمام کر رہا تھا۔ چودھری کو یقین تھا کہ
 بھی میں چھپنے کے شوقی افراد میں سے ہر شخص افراد کا انتخاب
 اس کی ٹری کی بھی ہوئی ہوگی۔ خود اس کا دل ٹری کی بھی میں
 ہونے کو سر کرنے کو چاہی تھا۔ یہ کہہ جاتے وہ اس کے سینے
 بے جا ب کا اور بھی زیادہ ترس سے تقاریر کر رہا تھا۔ اسی وہ
 اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے نوم افغانے کا ارادہ کرتی
 رہا تھا کہ کسی کے سامنے یہ ہاتھ رکھے پر نہ کہ پٹا۔ وہ ڈیوڈ
 تھا اس کے باطل قریب کہ اسکاؤٹ رہا تھا۔

جہاز کے سفر کے دوران بھی ماحول پر چکا تھا لیکن پھر بھی اسے
 اس خاص امر کی پیش وگانا اور پاس کے مالک شخص کی زبان
 سے یہ جیسے سننا عجیب لگا۔
 "کیا خیال ہے؟" پھر پتے ہیں۔ "مجھے بالکل ریلنگ ہے
 اس لیے زیادہ دیر کرتا حساب نہیں ہوگا۔" پھر اس کی
 رائے کو پختہ ہوا اور اصل اپنا فیصلہ منار ہوا۔
 "فکیم ہے۔" چودھری خود اصل بات جاننے کے
 لیے بے یقینی تھا پتا چلے اس کی تائید کی اور کو چنانچہ ٹری پر ایک
 نظر ڈال ہوا تو وہ دیکھے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی
 ڈیوڈ کو ڈرائیو کر رہا تھا۔
 "انٹوس مت کریں چودھری صاحب! میرے
 اپارٹمنٹ پر اس کو چڑھانے سے بھی زیادہ حسین ٹری آپ کی
 میرانی کے لیے موجود ہوگی۔" گاڑی اسارت کر کے آگے
 بڑھاتے ہوئے ڈیوڈ نے چار سو سرسری لنگھ میں یہ بات کہا
 لیکن اس کے اس جیسے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ خاصی بھر
 رکھا ہے اور چودھری کا ڈیوڈ نے نظر بھانپ چکا ہے۔ چودھری
 نے اس کی بات کے جواب میں خاموشی مناسب بھی اور
 کھڑکی سے باہر دیکھا رہا۔ سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ ڈیوڈ کا
 اپارٹمنٹ نامہ اسکاؤٹ کے ہیڈ میں موجود براؤز کے
 علاقے میں تھا۔ چودھری اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ
 میں داخل ہوا تو متشہور ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہاں موجود واپش
 خود اپنے منہ سے اپنی قیمت کا اعلان کر رہی تھیں۔ پھر ان کی
 تہایت پتہ کی ترتیب سے بھی واضح تھا کہ کسی ماہر تعمیر
 انکو ویرل فرم واپس یہ کام کیا گیا ہے۔ لاؤنچ میں رکھے
 صندوق سے لے کر دروازوں پر موجود پیشکش تک کسی شے کے
 بارے میں یہ نہیں لکھا گیا تھا کہ وہ اس جگہ میں رکھے ہے۔ ہر
 شے کی جگہ اپنی منزلوں تک رہی تھی کہ دیکھنے والے کے لیے
 کہیں کسی مزاحمت کی گنجائش نہیں تھی۔ پھر ان سب اشیاء سے
 بڑھ کر وہ حسد میں نے ڈرائیو کے جواب میں اپارٹمنٹ
 کا دروازہ کھولا تھا۔ سر کی آواز والی وہ حسد میں کے بالوں
 اور چند حرکت میں سرخی میں اتنا نمایاں تھا کہ اس پر سونے
 سے ہی ہوئی کسی سونے کا گن ہوتا تھا، بالکل ایسی لگ رہی
 تھی جیسے اپارٹمنٹ میں موجود دیگر اشیاء کی طرح اسے بھی
 ہاتھوں آؤر ہر چیز کے واسطے یہاں سجایا گیا ہو۔ چودھری کی
 نظر اس حسد پر پڑی تو پھر اس کے سارے جسم پر چمکی ہی
 چلی گئی۔ ایک طرف اس کے عریاں ڈیوڈ کو مت نکال دیتے
 تھے تو دوسری طرف ہنسائی تشبیہ و فراز کے نہیں بڑھتے
 دیتے تھے عریاں کر کے غم میں دیکھنے والے کو گونا گونا گے

کی ملاپ تھی تو لمبی سڈول ٹائیکس قدموں سے لپٹ جاتے
 پر مجبور کر رہی تھیں۔
 "یہ میری دوست لڑکا ہے۔ اسے میں نے خاص طور
 پر آپ کی میزبانی کے لیے یہاں بلوایا ہے۔" ڈیوڈ نے اس
 چمک حسد سے اس کا تعارف کر دیا تو اس نے جواباً مسکراتے
 ہوئے چودھری سے مصافحہ کیا۔ یہ ایک نہایت مرحبوس مصافحہ
 تھا جس کے دوران لڑکا نے چودھری کے ہاتھ کو مخصوص انداز
 میں دبا کر یوں آگے سے آزاد کیا کہ وہ اس ڈیوڈ کی
 سنسناہٹ اپنے پورے جسم میں محسوس کیے بغیر نہ رہا۔
 "میرے خیال میں پچھلے چکر لپٹے ہیں پھر بعد میں
 طبعیتانہ سے مجھے کھنگھو کر رہی کے۔" چودھری کے سرخ
 پڑتے ہوئے چہرے کا سرسری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے
 ڈیوڈ نے خیال ظاہر کیا۔ اپارٹمنٹ میں قدم رکھنے کی لڑکی
 موجود کی کے باعث ان کے وہاں کھنگھو کے لیے انکس کا
 استعمال ہونے لگا تھا۔ چودھری اگرچہ اپنے مخصوص لب و
 لہجے میں کھنگھو کا وہ پندرہ گنا فحاشی گھر پر ہی سے تامل نہیں
 تھا۔ جس طرح اس نے اپنے بے کے لیے بہترین تعلیم کا
 بندوبست کیا تھا، اس طرح اس کے باپ نے بھی اس کی
 شخصیت کو مکمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ اس
 کے باپ نے جیسے بھی مجرم ذکر کیا تھا لیکن اس اور تربیت
 کا کوئی غیر معاملہ ہی الگ تھا۔ وہ دوسروں پر شکرانی کرنے
 والے لوگ تھے چنانچہ ان کی تربیت مکملوں میں رونق
 اعلاقیات کے اصولوں پر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
 تھا۔ چودھری اور اس نے مکمل اس کے باڈی اید کی تربیت
 مکمل کر کے والوں کے اپنے سے گروہ اصولوں پر ہوئی
 رہی تھی۔ جانے کیسے چودھری کی مراد وہاں پر کثرت ذرا کمزور
 پڑ گئی اور وہ اپنے خاندان کے مردوں سے مختلف تھی۔ ایک
 شاید یہ کسی سال اپنے ماحول سے دور ایک آؤر ماحول سے
 میں رہنے کا اثر تھا۔ اس آؤر ماحول میں رہ کر اسے جو کچھ
 مناسب محسوس ہوا وہ اسے اپنا کامیاداد پر نتیجہ دہا اپنے باپ
 دادا سے باطل مختلف تھا۔
 "ڈیوڈ صبح کہہ رہا ہے چودھری صاحب! اچھا تیار
 ہونے کافی ہو چکی ہے، اگر خطا ہو گیا تو لطف نہیں دے
 مجھے لڑکا نے ڈیوڈ کی تائید کرتے ہوئے چودھری کا ہاتھ دھما
 اور اس لہجے کی طرف بڑھتی تھی ایک لیکن سے پورے کے
 ڈیوڈ نے لاؤنچ سے الگ کر کے وہاں آٹھ کر سڈول والی
 ڈائنگ ٹیبل رکھی تھی۔ لاؤنچ میں رکھے سامان کی طرح یہ
 ڈائنگ ٹیبل اور اس پر رکھی گاڑی بھی بے حد شان دار تھی۔

چودھری کے لیے اس شان و شوکت سے مراد یہ ہوا لیکن نہیں
 تھا کہ خود اس کی دسترس میں دیا کی برکت موجود تھی لیکن اس
 کا ذہن یہ حساب کتاب ضرور لگا رہا تھا کہ ایک انجینئر کی لکھی
 آمدنی ہو سکتی ہے جو وہ اپارٹمنٹ میں اپنی بیٹی قیمت شیا
 مت کر کے۔ لڑکا کی خوب صورت میرانی میں مت سے لطف
 اندوز ہوا گیا۔ ڈائنگ ٹیبل پر انگریزی کی کالوں کے علاوہ ٹی
 بیک مشرقی کھانے کی موجود تھی۔ لڑکا خود بڑھ چکا کہ ہر
 شے چودھری کو پیش کر رہی تھی۔ پہلو میں بیٹھ کر مکمل آؤر
 اسے قیاب اور سامنے رکھی شراب سے لطف اندوز ہونے
 ہوئے وہ کہتا تھا کیا اسے اندازہ نہیں ہوا۔ اس کا ماحول
 دینے والے لڑکا اور ڈیوڈ البت بہت فکا و انداز میں کھانا
 رہے تھے۔ چودھری کو باک تک مختار دینے کے بعد جب
 وہاں خدمت کے لیے مامور دیگر مرید ڈائنگ ٹیبل صاف
 کر رہی تھی تو ڈیوڈ کا مکمل فون ہٹنے لگا۔ اس نے چودھری اور
 لڑکا کی طرف دیکھتے ہوئے افسانوی ٹی کیا اور کال پر رسیو
 کر لی۔ موبائل پر کی جانے والی اس کی ایک طرف کھنگھو کر
 اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کھلے آئے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس
 کے لیے وہ راضی نہیں۔ پھر یوں لگا کہ جیسے اس نے باؤنڈ
 مجبور ہو کر چھپا ڈال دیے ہوں۔
 "کیا بات ہے ڈائنگ؟ تم کچھ پریشان لگ رہے
 ہو؟" اس کے موبائل آف کرتے ہی لڑکا نے اس سے پوچھا۔
 "ہاں، اصل میں ہاں کی کال تھی۔ اس نے کسی
 پراجیکٹ پر اسٹیشن کے لیے ہینک دکھائی ہے اور اس سٹینڈ
 میں میری شرکت کو ضروری قرار دے رہا ہے۔ لیکن مجھے
 چودھری صاحب کا پھوڑ کر نہیں جانا اچھا نہیں لگ رہا۔"
 "تو کوئی اتنا بڑا امر نہیں ہے تم جاؤ گی لیکن سٹینڈ
 انڈیا کرواؤ گی۔ میں چودھری صاحب کو بھی لگتی ہوں۔"
 لڑکا نے گویا جی بجاتے میں مسئلہ کیا تھا اور چودھری کی
 طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کو کوئی اعتراض نہیں
 ہے چودھری صاحب؟ آپ تو عا ہے تو بڑا پارک کے عا
 گئے پھر نے اور شروع کے بارے سے ہیں۔ مجھے یقین
 ہے کہ ڈیوڈ کے آئے تک آپ اگر کچھ وقت میری بھی میں
 گزاریں تو ہرگز بھی بور نہیں ہوں گے۔" یہ بات کہتے ہوئے
 لڑکا کے ہجرت ہجرت ہوتی ہے ایسی جاوا تھی کہ اسے
 کہ چودھری جیسا بانی تو وادی بات کوئی راہرونگ تک پہنچا تو
 ایک لمحے کے لیے سرور کا گناہ تھا۔
 "مجھے کوئی اعتراض نہیں مسٹر ڈیوڈ! میں آج پھر ان
 فارغ ہوں۔ آپ جا کر اپنی سٹینڈ انڈیا کر لیں، میں اتنی

بندوں کا رہت بھی اونچا ہوتا ہے۔ میرے بندے میرے وفادار ہیں تو صرف اس لیے کہ میں انھیں ان کی وفاداری کی مناسب قیمت ادا کرتا ہوں۔ آپ جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے میں جو بندہ لگاؤں گا، ان کی قیمت اچھی خاصی ہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ مجھے مناسب ادا کر سکیں۔ بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ یہ کام پارٹنرشپ کی بنیاد پر ہو۔ ملگری اور گھالوں والے برس میں بھی میری ملکی شرط ہوگی۔ چودھری نے ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے تعاون سے کاشت کی جانے والی پوسٹ آئے والے وقت میں کشتوں کی زرعی برادری کرنے کا مطلب بنے گی۔ وہ بے خبر انسان انسانیت کا پرفریضہ احساس بھولی کر مال و دولت کے حساب کتاب میں الجھ گیا تھا۔

پارٹنرشپ کی غنہ نہ گریں چودھری صاحب! آپ نے غنہ کی تو ہم آپ کے کسی حریف سے بھی معاملات نہ کر سکتے ہیں۔ "ڈیوڈ نے اس کا مطالبہ سن کر دھکی دی۔ "میرا کوئی حریف اتنا طاقتور نہیں کہ میرے مقابلے پر اثر کر سکی کام میں آجہو قال سکے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے اس علاقے میں میرا کوئی حریف وسطیٰ نہیں ہے۔ میرا ہاؤ کو چھوڑ کر جتنے گاؤں ہیں وہاں میں سے کسی کا بھی زمیندار میری فکر کا نہیں ہے اس لیے اگر کسی کے دل میں دشمنی ہوگی تو زبان سے اصرار کی جرات نہیں کر سکتا۔" معاملے کی نوعیت سامنے آنے کے بعد چودھری مکمل طور پر خاموش ہو گیا تھا اور بہت عیاری سے ڈیوڈ سے معاملات ملتے نہ کر رہا تھا۔

"اوکے اگر آپ کی یہی شرط ہے تو ہم پر نتائج سے معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ آپ اس برس میں میں میں پرست کے حصے دار ہوں گے۔ سب تو آپ خوش ہیں؟" ڈیوڈ بھی چودھری کے بیان کردہ حلقی اچھی طرح جانتا تھا اس لیے فوراً اٹھیا کر ڈال دیے۔

"میں پرست بہت کم ہے۔ تقریبی قایم پرست سے ایک پوائنٹ نیچے بھی معاملہ نہیں ہوگا۔" ڈیوڈ کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے چودھری نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"تقریبی قایم پرست تو بہت زیادہ ہے۔ آپ کو شاید اعزاز دینا پسند ہے کہ جو بیس کر کے جاری ہے۔ اس میں قدم قدم پر ملکی و شادیاں سامنے آتی ہیں۔ اور کتنے لوگوں کو ساتھ لانا پڑتا ہے۔ اگر میں اپنے ایک یا دو کو تقریبی قایم پرست دے دوں گا تو باقی لوگوں کے اقرار جلد سے پورے ہوں گے؟" ڈیوڈ نے اصرار پیش کیا۔

"سب میں نہیں جانا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ سب سے زیادہ خطر میرے لیے ہوگا۔ میرے بندے کام کرتی کے تو کسی اور جگہ کی صورت میں، میں میں ہی جڑا ہوں گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرا مطالبہ بالکل درست ہے۔" چودھری نے پتا صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ڈیٹا پرائز ادا کیا۔

"اس طرح روٹے میں لپک لائے بغیر تو بات نہیں بنے گی چودھری صاحب! میری نرم گفتاری کو شاید آپ میری کوئی بھوری سمجھ رہے ہیں لیکن دور کیے کہ ہم جسے کام کر لے والے لوگ کسی کے سامنے بھجور نہیں ہوتے۔ اگر کوئی ہم سے تعاون کرے تو بھیک روٹا پانی راوی کو پیش نہ کرنا چاہیے۔" لڑائی آتا ہے۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" ڈیوڈ کی بات سن کر چودھری بھڑک اٹھا۔

"یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔" اس نے منہ ہلکا کر جواب دیا۔ "میں تو اس میں چودھری اپنی جگہ سے اٹھ کر نہ اڑاؤں گا۔ آرام سے ڈارنگ ایڈم چودھری صاحب جیسے شخص سے کس انداز میں بات کر رہے ہو؟" ایک ناک نامی کردار کی طرح کمرے کے منظر میں وہ جو رینڈا فرائی حرکت میں آئی اور ڈیوڈ کو ٹوکا۔

"ڈیوڈ کی بات کا برامت نہیں چودھری صاحب! اصل میں اپنی جگہ یہ بھی بالکل سچی ہے لیکن آپ چونکہ پہلی بار اس برس میں ساتھ ڈالنے جا رہے ہیں اس لیے آپ کو کتنا صورت حال کا اندازہ نہیں ہے۔ آپ کو تقریبی قایم پرست دے کر واقعی ڈیوڈ کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں تو میں ڈیوڈ سے آپ کے لیے کوئی قایم پرست شیزر کی سفارش کر سکتی ہوں۔ لیکن کریں، کوئی قایم پرست لے کر بھی آپ بہت فائدہ میں رہیں گے۔" چودھری کا بازو پکڑ کر اسے یہ بات کی کہ وہ مزاحمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ آپ رینڈا اس سے پہلو سے باطل چڑھ رہی ہوئی تھی۔

"تم نے تو مجھے چھٹا ڈیوڈ انٹرنیٹ قایم پرست شیزر بھی بہت زیادہ ہے۔" ڈیوڈ نے اصرار کیا۔

"انتہائی ضرورہ ہو، اب تو میں چودھری صاحب سے وعدہ کر چکی ہوں۔" چھین میرا وعدہ پرست پورا کرنا ہو گا۔" ڈیوڈ نے چودھری کے سامنے ہاتھ مٹا دیے۔ "تجرباتی حقائق سے تو میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔"

ڈیوڈ نے فوراً اٹھیا کر ڈال دیے۔

"اب تو آپ خوش ہیں؟" چودھری صاحب! "لڑا نے کاغذات انداز میں منکھڑے ہوئے چودھری سے پوچھا۔ "تم ساتھ ہو تو خوش نہ ہوں گے کیا سوال بیانی اتھ لے جو کہ وہاں سامنے مان لیا۔" لڑا کے آگے دھپے ہوئے جان کی حدت ہے اندازاً تار سے ہوئے چودھری نے جواب دیا۔ "جہاں لڑا کے سامنے بیٹھے ہوئے ڈیوڈ کی پردا کیے بغیر اس کے رخسار کو چوم لیا۔ چودھری کے نزدیک یہ اس کی رنج بھی کہ ڈیوڈ کی گرل فرینڈ اس کے سامنے اس کے بچانے چودھری کے بازو اٹھ رہی تھی۔ حسن کی شاطران چالوں کے آگے ہار جانے والا چودھری پھلا کیسے جان سکتا تھا کہ رنج تو انجی کے ساتھ آتی ہے جنہوں نے اس حیل کا آغاز کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بات سنو ڈیوڈ! دو منٹ یہاں رگ جائو۔" کھانے کے برتن لے کر آنے والا اس کے سامنے کھانا رکھ کر ٹیٹ رہا تھا۔ باہر ہونے لے کر مارا۔ یہ فیچر چاہیں ایس سال کا ایک خوش حال تو جو ان قاضی کی سبز آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ "ان آنکھوں کو دیکھتے ہی دل میں یہ احساس جاگتا تھا کہ اس تو جو ان نے اپنی زندگی میں کوئی بہت بڑا نقصان اٹھایا ہے۔" ایک نقصان جس کے بعد اس کے لیے زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ باہر ہونے آج دوسری بار اس تو جو ان کو دیکھا تھا وہ جانتے نہیں اس کے دل میں یہ احساس جاگتا تھا کہ وہ وہاں موجود دیگر لوگوں کے مقابلے میں قدرے مختلف ہے۔ اس کے چہرے پر دھشت و دہریت کے وہ آثار نظر نہیں آتے تھے جو دوسروں کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے۔ شاید یہ اس کی مثل و صورت کا بھی ایک تھا کہ دیکھنے والے کو خود بخود خود ہی اپنے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشا پیدا ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ باہر تو کچھ بھی وہاں چاہا تھا اور ایک بے نامی امید کے سہارے وہ اسے اپنا کر رہی تھی۔ اس کی پکار کے جواب میں وہ تو جو ان کا سرورین نظیر کچھ کے سوا یہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تجربہ عام کیا ہے؟" باہر ہونے اس سے دریافت کیا۔ "میں تو اس میں وہ جواب دے کے کے بچانے یوں منہ پھیر گیا جیسے اسے جانا چاہتا ہو کہ اگر کوئی کام کی بات کر لے تو کر دے میں چلتا ہوں۔"

"دیکھو، میں جانتی ہوں کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور اس کا جواب بھی دے سکتے ہو۔ میں تم سے بات کر رہی ہوں تو اس لیے کہ مجھے تم اپنے دوسرے ساتھیوں

سے مختلف لگے ہو۔" وہ سب دلی اور جنگلی ہیں لیکن تمہاری شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کسی ایسے خاندان کے پڑے ہوئے لڑکے ہو۔" چھین میرا مسئلہ جھٹکا جائے۔ میری طرح تمہاری بھی تو کوئی بہن ہوگی۔" ڈیوڈ سوچا کہ اس طرح کی جگہ قید کر دیا جائے تو اس پر کیا گزرتی؟ "ساری دنیا سے کتے کو اس دہانے میں دھکی مروں گے وہاں رہنا کتنی خوشی کہ ہے تم مجھے ایک بہن کی نظر سے دیکھو تو نہیں اندازہ ہوگا۔" اسے وہاں سے بٹنے کے لیے پرتوت دیکھ کر ماہ بانو نے پرتوت لچکے میں جلدی جلدی ہونا شروع کر دیا۔

"تم یہاں کیوں قید ہو چکے ہو؟" چھین نہیں معلوم لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہاں نہیں ہم سے کوئی تکلیف نہیں لگتی رہی۔ ہم تمہارے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ رہی مردوں کے درمیان تمہاری بات کی بات تو اس طرف سے تم نے کر دیا ہو۔ یہاں کوئی نہیں ملتی آج کے چھین دیکھ سکتا۔" یہ پہلی بار تھا کہ اس برف زار کی قید کے دوران کسی نے ماہ بانو سے براہ راست بات کی تھی ورنہ تو وہ لوگ اس کے سامنے گھٹنے بن کر رہتے تھے۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ مجھے یہاں کوئی ملے آج کے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن یہ ہے کہ میں یہاں خود بخود نہیں کچھ رہی۔ کچھ رات میں نے یہاں کی آنکھوں میں ہوں دیکھی ہے اور اس کو دیکھنے کے بعد مجھے ایک پل کے لیے بھی سکون کی فیل نہیں آئی۔ تم جو کوئی بھی ہو اور تمہارا جو بھی نام ہے، میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ کسی بڑے جنگ میرا پیغام پہنچا دو۔ ان سے کہو کہ مجھے میرا جرم بتایا جائے۔ میں اس طرح کہ ان سے قید خانے میں بند ہوں گی؟ اگر میں کسی کی جرم ہوں تو وہ مجھے آکر میرے میرے جرم کی سزا سنائے لیکن اس ڈیوڈ اذیت سے تو کسی طرح نجات لے۔"

"تو جو ان کا جواب سن کر ماہ بانو فیس میں بڑی سی پٹی کی۔ جذبات کی شدت کے باعث اس کے احتیاط پر اس کی آنکھوں سے آنسو بھی چھٹک پڑے تھے۔ حقیقت بھی مکمل جس طرح وہ شخص ہوس ناگ انداز میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ اس صورت حال سے بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ایک تو بے جرم کی نوردی مسئلہ کر دھکی جاتی اور اس سے بے عزت جانے کا خوف۔ اس کے اصرار جواب نہ دیتے تو اور کیا ہوتا؟

"کچھ رات کون نہیں لکھا، پوچھنے آیا تھا؟" اس کی بات سن کر تو جو ان چڑھا۔ "کوئی بھی شرم کا آدمی تھا۔" ماہ بانو نے رخساروں پر پھیلے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

نہایت نفرت میں ڈوبی پر آواز مایہ کو کوشا سا گئی۔
 یقینی طور پر یہی تو جوان کی آواز تھی جس سے بکھوہر کی اس
 نے اپنے قید خانے میں گفتگو کی تھی۔ تو جوان کی اس آواز کو
 پہچانی ہوئی نفرت پر دل میں شدید ریخ محسوس کرتے ہوئے
 اور اپنے انداز سے کی تعریف کے لیے باہر ہونے لگے
 کھول کر آواز کی سمت دیکھا۔ غریب جوش سے سرخ ہونے
 چہرے کے ساتھ وہ یقینی تھی تو جوان تھا جس کے بارے میں
 بکھوہر کی اس نے انداز لگا دیا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے
 مقابلے میں بہت معصوم اور شریف ہے۔ وہ معصوم دکھائی
 دینے والا چہرہ اس وقت غصے اور اقام کی آگ میں جلی کر
 بری طرح سرخ ہو چکا اور کٹی گھو بیٹھا تھا۔

”ہم نے جان بوجھ کر نہیں تمہارے ساتھیوں سے یہ
 کام نہیں کرنے دیا۔ تم ہمارے دوست ہو اور دوستوں کے
 دشمنوں کو سطر ہستی سے منانا ہم پر فرض سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنا
 فرض ادا کر دیا۔ رہی تمہارے انتقام کی آگ بجھنے کی بات تو
 میرے خیال میں یہ آگ بجھ کر رہ جائے گی۔ یہ آگ بجھتی
 رہے گی تو ہی تم اسی جیسے کرہت رکھنے والے دوسرے
 شیطانوں کو ان کے انجام تک پہنچا سکتے ہو۔ انہی انتقام
 کر سکنے سے بچنا چاہو تو کوئی کارنامہ نہیں، بات تو جب یہ
 کر آدی رہی ہے آدی کے خلاف لڑو اور اس کا وہ حشر
 کر کے کہ باقیوں کو صدمہ حاصل ہو۔ ہم سب یہاں اسی دشمن
 پر کام کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تم اس
 دشمن میں ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟“ نہایت نرم لہجے میں
 بولتا وہ بھی عمران نامی اس تو جوان سے بوجھ رہا تھا۔

”بالکل دوں گا پھر میری زندگی میں اب رہی کیا گیا
 ہے؟ اگر یہ سچ جانتے والی ساتھی کسی اچھے شخص کے ساتھ
 گزار سکیں تو میں انہوں کو کہیں سے زور دینے کا حق ادا کر
 دیتا۔“ عمران نے وہی کہا تھا جو اس سے مصر وہ گفتگو کر
 کھا۔ چاہتا تھا۔ نہ جانے وہ کتنے دنوں سے اس معصوم
 تو جوان کی برہنہ داشتہ کر رہا تھا جو اس کے دل میں زہری
 اور جہم گیا تھا۔ اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر شعور اور حساسیت کی
 مالک ہوا جانے اس صورت حال پر گہری سانس لیتے ہوئے
 وہاں موجود دیگر افراد کے چہروں پر گھر ڈالی۔ وہ وحشت زدہ
 ہے اس وقت کچھ اور بھی ہمایا کھنگرتے تھے۔ ان کے
 چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے بے خیالی میں اس کی نگاہ پر وینکٹر
 کی اسکرین پر جا پڑی۔ اسکرین ابھی تک روشن تھی اور اس پر
 دیکھ کر وہ تو جوان کی خون آنور لاش دکھائی دے رہی

تھی۔ جوان صحت مند جسم سے لکھے والے ڈھیروں خون سے
 لاش کے گرد ایک چھوٹا سا سرخ تالاب بنا ڈالا تھا۔ اپنے ہی
 خون میں پڑی تو جوان کی وہ لاش کسی ذرا کے ہونے جاوڑ
 کی لاش سے مشابہت رکھتی تھی۔ مایہ کو صرف ایک لمبے
 لیے یہ مظلوم کھینک لگے ہی پلے اس سے روکی ایک لمبی آنی اور وہ
 اپنی جگہ شیشے شیشے دہری ہوئی۔ وہ لوگ جو کسی تفریق قسم کی
 طرح اس دردناک منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ ان کی
 کی آواز سن کر چمک پڑے۔

”لکھتے قیدی لڑکی اپنی کوٹھری سے نکل کر یہاں آگئی
 ہے۔“ سب سے پہلے عمران شکر ہوا اور آواز کی سمت
 دوڑا۔ اس دوران مایہ کو خود پر قابو پانے کی کوشش میں کام
 ہو کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اس لڑکی کو یہ سب نہیں دیکھنا
 چاہیے تھا۔“ وہ آدی جو اب تک عمران سے منگھٹھٹا رہا تھا
 اور وہاں موجود افراد کو کمانڈر مایہ کو کچھ کہہ لایا۔
 ”یہ باہر بھی آگیا۔“ ان اسے کھاتا دیکھتا تھا مایہ کو
 صورت حال پر تبصرے کے ساتھ ہی کمانڈر کو قہرانی سب
 سے اہم خیال آیا۔

”میں نے اسے کھانا پہنچایا تھا۔“ عمران نے کسی عزم
 کی طرح اعتراف کیا جسے سن کر کمانڈر کے ہونٹ ہنچ گئے۔
 ”ہمارے کام میں ایسی غلطیوں کی گنجائش نہیں ہوتی،
 اس بات کو بھول کر رہنا۔ اس بار تو میں نہیں معاف کر رہا
 ہوں لیکن آئندہ کسی کو بھی کاہم بہت ہر اوگ۔“ وہ جواب
 تک بڑی نرمی اور محبت سے عمران سے بات کرتا رہا تھا،
 نہایت وقت لگنے میں بولا۔

”دوبی کمانڈر“ عمران نے فوراً ہی اس سے معافی مانگی۔
 ”اسے اس کی کوٹھری تک پہنچا کر کوٹھری کو آگ لگا دو۔“
 اس کی معذرت کو مناظر میں لائے بغیر کمانڈر نے سر ہٹ گئے
 حکم دیا اور پلٹ گیا۔ مایہ کو کمانڈر نے ہانڈوں میں اٹھا کر اس
 کی کوٹھری کی طرف لے جاتے ہوئے عمران کا ذہن کچھ کے
 ان تضادات میں گہری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

”کچھ بڑی تیار ہے سر“ عبداللہ ان کی اس اطلاع پر
 اس نے سر کو ہلکی سی ہنسنے والی اور گہری چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 اس نے لاہور سے واپس آکر جو نیا شیفہ دل ترتیب دیا تھا
 اس کے مطابق آج اسے ہی آؤ کے دور سے پرانا تھا۔ اس
 کے زیر زمین علاقے میں جی آؤ سب سے بڑا گاؤں تھا اس
 لیے وہ اسے بالکل بھی نظر انداز نہیں کرتا چاہتا تھا۔ جبکہ

دہانوں کے متعلق ہے جی آؤ کی ترقی کی رفتار قدر سے تیز
 ہونے کے باوجود وہ اس کی طرف خصوصی توجہ دینا چاہتا تھا
 ”یہ کچھ اسے معلوم تھا کہ سب سے زیادہ محنت لگتی تھی اسی جگہ
 ہے اور اگر وہ ذرا بھی ڈھیلا پڑا تو سب کیا کر لیا شائع ہو
 جائے گا۔“

”نور پر میں بوجھنے والا کام کر رہا ہے آج تم اس سے
 ملاقات ضرور کر لیتا۔ اس کی رپورٹ کی روٹی میں ہم کسی دن
 اس تک وہاں جا کر کام کا جائزہ میں سے تاکہ اعزاز ہو سکے
 یہ کتنے افسار کیا جا سکتا ہے۔“ اپنے دفتر سے نکل کر
 باہر جا کر کھٹک کی طرف جاتے ہوئے اس نے عبداللہ ان کو یاد
 دہانی کر دیا۔

”میں صرف آپ سے گزر رہی ہوں، میں یہ کام کر لوں گا۔“
 عبداللہ ان نے مستعدی سے جواب دیا تو وہ یقیناً ہو کر کچھ بڑی
 میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھے ہی ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور
 خود کھم کر ڈرائیور تک سیت پر آ بیٹھا۔ مشاہیرم خان کی غیر
 موجودگی میں آج کل سیکرٹریاں اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔
 مشاہیرم خان ابھی تک وہیں نہیں آتا تھا، البتہ اس کی طرف
 سے رپورٹیں مسلسل آ رہی تھیں۔ اس نے غازی سے اپنی
 ملاقات سے لے کر اس کی جائزاتی موت تک ہر بات تفصیل
 سے شریار کو بتا دی تھی۔ غازی کی حادثاتی موت نے اسے
 کچھ مشکل میں بھی ڈال دیا تھا۔ غازی کے بیپ سمیت کھائی
 میں گرجانے کے بعد وہ بیل طویل سفر کر کے ایسے مقام پر
 پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا جہاں سے اسے پھاڑوں سے
 واپس لوٹنے والی ایک دیکھی ڈبلن لیم نے اپنی بیپ میں
 ٹھک دی اور اس کی درخواست پر تھانے کے قریب
 ڈراپ کر کے چلے گئے۔

تھانے پہنچ کر اس نے وہاں موجود ڈیوٹی افسر کو
 جاننے کے بارے میں بتایا۔ افسر نے پولیس کی رپورٹ کے
 مطابق اسے ڈھیر سارے سوا لوں کی زد پر لے لیا لیکن
 مشاہیرم خان بتاتی تھیں، چار تھا اس لیے پولیس افسر اس کے
 من سے کوئی ایسی بات اٹھوانے میں کامیاب رہا جس کے
 ذریعے مشاہیرم خان کو غازی کی موت کا قصہ واضح کیا جا
 سکتا۔ غازی کے ساتھ اپنے اس علاقے میں جانے کی وجہ
 اس نے بالکل سچ بتا دی تھی جس پر پولیس افسر تھوڑا بڑبڑا
 بھی ہوا تھا کہ اسے پولیس کی کارروائی پر یقین نہیں تھا جو خود
 معاملے کی حقیقت کرنے نکل کھڑا ہوا۔ جواب میں مشاہیرم خان
 نے اس کو دھیان ان نکات کی طرف دلایا۔ انہیں پولیس
 والوں نے کچھ نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے انہیں باہر کر دیا

کہ وہ لوگ صرف غازی کے بیان پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے تھے
 اور معاملے کے ان پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا تھا جس سے غازی
 علی کے جج بھوت کا اعزاز ہو سکتا۔ اس نے پولیس افسر کو
 تفصیل سے اس علاقے کے کل دھوج اور اس کی ساخت وغیرہ
 سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بات کر دیا کہ غازی کا بیان سراسر
 جھوٹ پر مبنی تھا اور اس نے اس سے جیپ بھی نہیں لگی بلکہ وہ
 خود بھرموں کا سامھی تھا۔ اس نے پولیس افسر کو صاف گفتگو
 میں یہ بھی بتا دیا کہ غازی اپنا جھوٹ مکمل جانے کے بعد
 ٹھہرا ہوا تھا۔ البتہ وہ غازی سے نفرت اور اس کے بیٹھے میں
 کا فکار ہوا تھا، البتہ وہ غازی سے نفرت اور اس کے بیٹھے میں
 حاصل ہونے والی معلومات کا ذکر کر لیا تھا۔ اس کے
 بیان کی روٹی میں پولیس افسر نے غازی کی لاش اور بیپ
 کھائی سے نکالنے کے انتظامات شروع کر دیے لیکن یہ حال
 بیپ بالاش نہیں نکالی جا سکی تھی۔ مشاہیرم خان کے ذہنی خیال
 کے مطابق یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ بہر حال، لاش نکلی جائے وہ خود
 ہر اور است غازی کی موت کا قصہ وار نہیں ٹھہرا یا جا سکتا تھا۔
 کچھ کمال شہر یار کی فون کال نے بھی دکھایا۔ اس نے بدستار
 میں موجود اپنے ہم منصب کو فون کر کے یہ باور کر دیا کہ
 مشاہیرم خان ایک دیانت دار اور بے ضرر آدمی ہے جو اپنی ماں
 کی دیکھ بھال کے لیے اسکو روک رہا ہوا ہے۔ اپنے بھائی
 کے قتل کی حقیقت کے لیے اس نے کچھ باہر جہر مارے ہیں تو
 یہ صرف ہر اور راہداریت کا نتیجہ ہے۔ وہ وہ قانون کو کچھ نہیں
 لینے والا یا انسانی جان سے کھینچنے والا بندہ نہیں ہے۔ اس کی
 نہایت پر مشاہیرم خان کے ساتھ خصوصی نرمی رہی تھی اور اسے
 قتل کے حکم میں گرفتار کر کے تھانے میں بند کرنے کے
 بجائے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ البتہ اپنی پابندی ضرور خاندان کی گئی
 تھی کہ وہ مقامی حقار سے اجازت لیے بغیر اسکو وہ چھوڑ کر
 واپس اپنی ڈیوٹی پر نہیں جا سکتا۔ مشاہیرم خان کا ان احوال واپس
 لوٹنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ انہی دو ہیں وہ کراس معاملے کی
 مزید تحقیق کر رہا تھا چنانچہ اس نے اس حکم پر کوئی احتجاج
 نہیں کیا۔

شہر یار خود وہی اس کے اس پروگرام سے متعلق تھا۔
 مشاہیرم خان کے دہان رہتے اور باہر جہر مارنے کی صورت
 میں ان سے ممکن تھا کہ مایہ کو کمانڈر کی اپنا سنا سنا اور ساتھ ہی
 اس رات سے بھی بڑا اہم تھا کہ وہ کون لوگ تھے جنہیں غازی علی
 خلیہ ضرور پر اسٹانڈ اور روایات وغیرہ سنا دی کر رہا تھا۔ اسے غلط
 طور پر سمجھ کر رہے والے لوگوں کا کسی کاروبار میں مصروف
 ہونے کا امکان تو کیا نہیں جا سکتا تھا پھر ان کا مایہ کو کمانڈر

بھی ان کے خلاف اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ لوگ خلق سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ بات شہر یار کو بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ ان لوگوں نے اس قدر پانچک کے ساتھ ماہ بانو کو انوکھ کیا؟ ہاں تو ان کو صرف ایک ہی بندہ کو بھی اور اس شخص کا بھتیجا تھا۔ اس کے تعلق میں بتا تھا۔ اپنے علاقے میں بے حد اعتبار اور طاقتور پڑھری کی بے شک ملکوتی اپنا انوکھ بھی کچھ ہی لیکن وہ اتنا اعتبار بہر حال نہیں تھا کہ بھتیجا میں اس کے بندے اس قدر سرگرم ہوتے۔ شہر یار کی بھٹی جس گھر میں تھی کہ کوئی اور معاملہ سے لیکن سوال وہی تھا کہ اس معاملے سے ماہ بانو کا کیا تعلق تھا؟ فیصل آباد میں پرورش پانے والی وہ کم عمری کی جو اپنے آبائی گاؤں چمپان نڈر نے آئی تھی، پڑھری کی ہوس بھری نظروں میں آنے کے بعد ان کی مصیبت میں بڑی کہ بھراس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ وہ مشاہیر خان کے مشورے اور شہر یار کے تعاون کے نتیجے میں پانہ کی تلاش میں بھتیجا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا کر ٹھہری تو وہاں بھی اسے سکون سے رہنا نصیب نہیں ہوا اور اس دور افتادہ گاؤں میں بھی حالات کے گرداب نے اسے اپنے گھر سے میں لے لیا۔ آج بٹاتے تھے کہ اس بار وہ جن لوگوں کے ترے میں تھی کہ اس کا چودھری سے کوئی تعلق نہیں بتا۔ لیکن سوال وہی تھا کہ ایک عام سی بے ضرورتی میں آخر ایسی کیا بات تھی کہ وہ بالکل انجان جگہ پر بھی ٹھکانا لیں وہ کسی اور اسے باقاعدہ ایک سازش کے ذریعے بھرا کر لیا گیا؟

سارے وہ سوالات تھے جن کے جواب کے حصول کے لیے تحقیق و تفتیش کی ضرورت تھی۔ مشاہیر خان کی صلاحیتیں شہر یار کو کچھ چکا تھا اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اسے بھتیجا میں ہی اس کے رہنے کی منظوری دیتے ہوئے اس کی بھنیاں بڑھا دیں۔ خود وہ اپنی پست اور ذلت دار پول کی وجہ سے بڑی طرح بجزا ہوا تھا چنانچہ خواہش رکھتے ہوئے بھی اس کام کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم فوری طور پر تو باہل نہیں۔ ان حالات میں مشاہیر خان کے تعاون کو ٹھیکہ جانتے ہوئے اس نے اپنی خواہش کو دل میں ہی دبا لیا اور ماہ بانو کی تلاش کی فریاداری اسے سوچ و سمجھنے کی گنجین دینا چاہتا تھا کہ اس کا دل میں ہی بار بار بات پر گونجتی رہتی تھی کہ وہ خود جا کر ماہ بانو کو تلاش کرے۔ اسے آج بھی وہ گات ۱۰ تھے جب مشاہیر خان کے اسکول میں چہرے کو نقاب میں چھپانے ماہ بانو اس سے مدد کی درخواست کرنے وہاں پہنچ گئی۔ فرخشاہ اور اس کی بھری اپنی جگہ لیکن

حقیقت یہ تھی کہ خود اس کے اپنے دل سے بھی یہ خواہش کی تھی کہ وہ اس ہراساں بری بھی لڑی کو کھانا پناہ میں لے لے۔ دل کی اس خواہش کو اس نے اپنی سرکاری حیثیت کے اندر دھپتے ہوئے پورا بھی کیا تھا لیکن اس کی پرورش کا کام چلی گئی اور آج شہر یار ماہ بانو اس سے بہت دور کی قید میں تھیں اس کی مدد کی طلب گار تھی اور وہ مجبوراً اور اصولوں کی قید میں جلا خوار اس کی تلاش میں نکلے سے قاصر تھا۔

گاؤں کی چھٹی نشست پر یہ ظاہر سکون سے بیٹھا وہ مسلسل حالات و واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تیز رفتاری سے چلتی گاڑی کے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے مگر طرح اس کے ذہن کے بصرہ کے سے بھی واقعات ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے تھے۔ پچھلے چند بیٹوں میں کیا بھٹکس ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا بیٹا ہی خبر سے گزرا تھا۔ ان خبروں میں اچھی خبروں کا تناسب کافی تھا بلکہ دیکھا جائے تو چند بچوں سے ملنے لڑائی مصلوبوں کے قاتل کے ہوا کوئی ایسی بات بھٹی ہی نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ خوش ہو پاتا۔ سازشیں، حادثات، دشمنیاں یہی سب تھا جنہیں وہ اس عرصے میں بھٹاتا رہا تھا۔ لیکن بہر حال خود اس کی طرح وہ بھی اس کا حوصلہ ہی جوان تھا اور وہ اتنی آسانی سے حالات کے سامنے ہار نہیں مانتے والا تھا۔ اسے حالات کے اس گرداب سے لھٹا تھا اور وہ چند بیٹیاں لائی تھیں جن کو اسے بغیر حق انصافیت اور انہیں ہولناکیاں اس حق کو مار کرنے کے لیے وہ ہر ذاتی خواہش اور تکلیف کو نظر انداز کر کے سرگرم عمل ہو گیا تھا اور کسی عام بشر کی طرح اپنے عزیز کڈ بیٹا دفتر میں بیٹھ کر محض رپوٹوں کا مطالعہ کرتے تھے، بھٹاتے خود تکلیف اٹھاتے ہوئے پیر آباد کی طرف رواں دواں تھا۔ خیالات کے جھوس میں گھر سے پیر آباد تک کا سفر طے ہوا وہ خود بھی اندازہ نہیں کر سکتے تھے جب گاڑی پیر آباد کے داخلی راستے پر پہنچنے لگی تو کچھ راستے پر نکلے والے چٹکوں نے اسے بارہ کی گولی کی گولی کے ساتھ ساتھ مزاحمت کی گھیر اور حاضر و ہوا ہے۔ اسل میں اسکول اور گھر کی صحت کی خبر کے کام تو فوری طور پر اس لیے انجام پا گئے تھے کہ ان کے لیے سیکرٹری والا کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے قلم کردہ نوٹس سے مزید خبر ان کو مل گیا تھا لیکن مزاحمت کی وجہ سے لیے ناخوشگوار کھوئی فنڈ سے رقم حاصل کی جاتی تھی اور اس کے لیے تنخواہ ملتی تھی اب ہی ہاتھ پاتا۔

خیرا، وہ اس کا شیلڈوں سے شدہ خدا سے سب سے پہلے مگر نہ صحت پھر اسکول و انڈسٹری میں اور آخر میں نے قاریٹ آفیسر عالیہ اندری سے حالات کے لیے جانا تھا۔

اس لئے شدہ شیلڈوں پر عمل کرتے ہوئے ڈرائیور نے گاڑی مرکز صحت کے سامنے لے جا کر روک لی۔ مرکز صحت کے دروازے پر تیس چالیس سال کا ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ آدمی یہاں پر ایک وقت کیا ڈائری اور پھر کیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ شہر یار کو کچھ گروہ صحت دہلا یا اور اسے سلام کیا۔

”ایک سلام۔“ سب ٹھیک ہے؟ اندر ڈاکٹر کو موجود ہیں یا نہیں؟“ اس نے تیزی سے اس شخص کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دروازہ کھولا۔

”ڈاکٹر صاحب ہیں، ایک دو مریض موجود ہیں روگنی ہیں، وہ نہیں دیکھ رہی ہیں۔“ ڈاکٹر صاحب البتہ اپنے کوارٹر میں بیٹھے تھے۔ اس شخص نے مستندی سے اطلاع دی جس پر مرکز صحت سے ہاتھ ہوئے شہر یار دروازہ داخل ہو گیا۔

”یہ دو رکھو اور اسے پابندی سے کھاتی رہنا۔ ابھی تمہاری ملائی کو بڑا دھرم صحت میں لڑا ہے۔ ابھی سے بچوں وغیرہ کے چھتھ میں بڑے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چار پانچ سال آرام سے گزارو پھر اس بارے میں سوچنا۔“

سسرال والے طعنے دیتے ہیں تو دے دو۔ ابھی تمہارے بیٹے چھپنے کے دن ہیں اور انہیں بچوں کے چکر میں بڑے کا خلع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ ڈاکٹر ماہ بانو کے کمرے کے قریب پہنچا تو اسے اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔

مریض کی موجودگی کی وجہ سے وہ اندر جانے کے معاملے میں تذبذب کا شکار تھا لیکن کچھ دیر کے بعد وہ اپنے کمرے کے دروازہ کھول دیا اور ڈاکٹر ماہ بانو کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ فوراً ہی اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اب اس کے باہر دے رہے گا کوئی نواز لگا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے سے اندر داخل ہو گیا۔

”ابا، بٹا، فیل سر پر تڑا آپ کو بیاں اچانک دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہوئی ہے۔“ اس کو بھٹکے کے لیے تری پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ماہ بانو نے خوشی کا اظہار کیا۔

”ابھی اپنے درمیں ڈٹ پڑا تھا۔ آپ بتائیں انوری تھک کر آئے؟ اور کات؟“ اس نے مریضہ عورت کا برسرِ نگرہوں سے جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ماہ بانو سے پوچھا۔

”ابھی ہاں۔ سال کی دو عورت ابھی شکل و صورت کی مالک تھی اور پچاس سے بڑے کچھ، پانچ تھیں ہی تھیں۔“

”آں از او کے سر۔“ جگہ بھر سے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک اچھی بھونجی ہے۔“ ڈاکٹر ماہ بانو نے خوش گوار لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر مریضہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے یونی۔“ اب تم جابہ دلی اور میری حیات کے مطابق

پابندی سے دو استعمال کرتی رہتا۔“

”بہت بہتر ڈاکٹر صاحب۔“ عورت فوراً ہی باہر نکل گئی۔ اس عورت کی صحت اور عمر دیکھتے ہوئے شہر یار کو خیال آیا کہ ڈاکٹر ماہ بانو کی دیر لگے اسے جو مشورے دی تھی، وہ بالکل مناسب نہیں تھا خصوصاً گاؤں کے ماحول میں جہاں کم عمری کی شادی اور بچہ بیلہ بچوں کی پیدائش کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں خوں عرصے تک اس عورت کا دل نہ بڑا اس کے لیے مشکلات بھی کمزوری کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنے اس خیال کا ڈاکٹر ماہ بانو کے سامنے اظہار نہیں کیا اور یہ سوچ کر ڈھن سے بھٹک دیا کہ لیکن بے حد عورت کو کوئی ایسی پرالہم ہو جس کے پیش نظر ڈاکٹر ماہ بانو کی اہمال اس کے لیے بچے کی پیدائش کو خطرہ نہ ہو۔ بہر حال، وہ ڈاکٹر صاحب اور ان معاملہ کو بڑا دھرم صحت میں لگ گئی۔

”اور کوئی مریضہ رہی ہے تو اسے اندر بھیج دو۔“ عورت کے باہر نکلے کے بعد ڈاکٹر ماہ بانو نے کچھ دیر کو صحت دیا۔

”صرف ایک عورت اور ہے۔ نئی میں اسے بھیجتا ہوں۔ آپ اسے دیکھیں، تب تک میں اسے ہی صاحب کے لیے جانے پائی کا ہندو بست کر رہا ہوں۔“ ڈاکٹر ماہ بانو نے مستندی دکھانے کی کوشش کی۔

”جائے پائی رہے دو۔ وہ میں انہیں اپنے کوارٹر میں لے جا کر کروا دوں گی۔“ اس شخص کو کچھ ڈاکٹر ماہ بانو نے کہنا دیا اس سے قبل ڈاکٹر ماہ بانو نے خود ہی منع کر دیا۔

”ابھی زیادہ دیر یہاں نہیں رکوں گا اس لیے کسی تکلیف کی ضرورت نہیں۔“ اس شخص نے کہا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی رائے بھی لے لیں تو مناسب ہوگا۔“ مارا کوٹنے ہوئے شہر یار نے اس سے کہا لیکن وہ کوئی جواب دینے بغیر اندر آنے والی اور پھر عورت کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ عورت زلد زلام اور بھاری جھانکھی۔ اس کا چپک آپ کرنے کے بعد ڈاکٹر ماہ بانو نے بے پروا دیکھ کر دیکھ کر جا کر کچھ ڈاکٹر سے بے لوم شہر یار کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہاں کی ضروریات کی کٹ میں اور ڈاکٹر ماہ بانو کی پہلی ہی بنا چکے ہیں۔ میں وہاں آپ کو لے آتی ہوں البتہ آپ چاہیں تو اپنی سلی کے لیے ڈاکٹر ماہ بانو سے بھی مل سکتے ہیں۔ میں کیا تو نہ کو کچھ کر انہیں بلوائی ہوں۔“ کچھ کی سلی پیش کی اور اہم ہونے کی وجہ سے وہ ڈاکٹر ماہ بانو سے ملنے جاتے ہیں۔ اس وقت شاید وہ رستہ کر رہے ہوں گے۔

”اؤ کے پھر آپ نہیں رہنے دیں اور اس مجھے دے دیں۔“ شہر یار نے اس کی بات سن کر کہا یہ مرکز صحت کی صورت حال اسے یہاں داخل ہونے کی عملی پیشگی تھی۔ اس کی نظر خوروں نے بھر میں ہی جائزہ لے لیا تھا کہ وہاں صحتی کا معیار عمدہ ہے اور ہر شے تہ تیہ و تنظیم کے ساتھ موجود ہے اس لیے میں لاؤنگر کو صحت دینا مناسب نہ سمجھا۔

”یہ کیسے لست اور اب میرے ساتھ چلیے۔“ لاؤنگر یا یا نے دروازہ کھول کر اس میں سے ایک ٹیبل اسکپ بھی نکال کر شہر یار کے حوالے کرتے ہوئے اپنی فرمائش دہرائی۔

”چلیں! میں نے کہا تھا کہ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔“ اسی جگہ یہاں اور بھی کام ہیں۔“ اس سے لست وصول کر کے اپنے پر لپک نہیں میں دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”اچھا، میں تو چاہ رہی تھی کہ آپ کی اپنی بھی سے ملاقات کروادوں۔“ لاؤنگر یار کے چہرے پر مایوسی چھائی۔

”مجھی سے۔۔۔“ اسی میں آپ کی مدد چودھری کی قید سے آزاد ہو کر آپ کچھ پہنچ چکی ہیں۔“ شہر یار نے ان ہوا جس کے جواب میں لاؤنگر یار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن کیسے؟ یہ کیسے ممکن ہو گا؟“ شہر یار اب بھی حیران تھا۔

”میرے اور چودھری کے درمیان ڈیل ہو چکی ہے۔ میں یہاں رہ کر چودھری کی مرضی کے مطابق کام کرتی رہوں گی۔ اس شرط پر اس نے میری بھی گورہ لیا ہے اور ساتھ ہی بھی تنخواہ کر دی ہے کہ میں خود کو آزاد رکھوں۔ اس کے بعد سے بروقت میری اور میری بھی کی نگرانی کرتے رہیں گے۔“ لاؤنگر یار نے ادا کی سے بتایا۔

”یہ تو عملی فیذا گردی ہے۔ آپ کو اس دانے کی رپورٹ لکھوائی جائے۔ میں خود اس فاضائی کے خلاف آپ کا ساتھ دوں گا۔“ قصے سے سرخاں پڑتے چہرے کے ساتھ شہر یار نے بار بار کہا کیا۔

”مخلص فارم جگہ کا بیڑا نہیں سہرا ہے آئی کانت ڈو اے۔ میں اچھی طرح اس فلوڈ سسٹم کو جانتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا کیا حشر ہو گا۔“ لاؤنگر یار نے صاف انکار کیا۔

”اگر آپ جیسے پڑھتے کچھ لوگ بھی ایسی باتیں کریں گے اور اس طرح ڈرتے رہیں گے تو کن اسظم کے خلاف چہاں کرے گا۔ آپ تھوڑی سی بہت تو کریں! میں ہوں نا

آپ کے ساتھ۔ میں چودھری کو اسلحہ عطا کر کے گا کہ کسی کے ساتھ اس طرح زبردستی کرنے کو کیا انجام ہوتا ہے۔“ شہر یار نے اس پر زور ڈالا۔

”سوئی سرہا میں آپ کا ساتھ ہرگز بھی نہیں دے سکتی۔ آپ چودھری کے خلاف ہیں اسلحہ معلوم ہے لیکن میں دو ٹوک چوں کی لڑائی میں خود کو فریق بنانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ دونوں بڑے لوگ ہیں۔ اس لڑائی میں آپ کا کچھ نہیں جانے گا لیکن میں اور میری کسی سمجھت میں پڑ جائیں گے۔“ بار بار نے بھر صاف انکار کر دیا۔

”لو“ کے پھر میں چلتا ہوں لیکن مجھے بیٹھ افسوس ہے کہ ایک دوسری جگہ بھی اسلحہ خاؤن نے عالم کے سامنے آئی تو آسانی سے اختیار ڈال دیے اور ورنل اور انکس کیا جو اس کا فرض بننا تھا۔“ لاؤنگر یار نے آف موڈ کے ساتھ لاؤنگر یار کے پاس سے رخصت ہوا۔ اس کی اگلی منزل اسکول واؤنڈ میں ہو گیا۔ اسکول کا نام نہر چوک نام پر چکا تھا اس لیے کہ وہاں میں جانا پڑتا تھا البتہ انٹر سٹریم دوم ملنا ہوا تھا۔ وہاں چھائی پر تعلیمات چوکیدار شام کے بعد ڈیوٹی پر آتا تھا اس لیے شہر یار کے آنے کی اطلاع اندر پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنی گاڑی رکوائی تھی وہاں پہنچے پر ہی دروازہ گاڑی کی آڑ میں کر ی کوئی متوجہ ہو جائے گا گاڑی سے اتر کر وہ چیل ہی انجینان سے چلتا ہوا انٹر سٹریم دوم میں پہنچا۔ ایک کمرے پر مقفل انٹر سٹریم دوم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے دروازے سے اندر کام کرتی خواتین صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بہت منظم انداز میں خاموشی سے اپنا کام سر انجام دے رہی تھیں۔ کام کرنے والی ان خواتین کے علاوہ وہاں آفتاب بھی موجود نہ ہو کر ہی پر بیٹھا اپنے سامنے کھڑے جیسے مٹی طرح فرق تھا۔ شہر یار کی ایک جگہ آہ نے اسے اسے حیران کر دیا۔

”تکریف لائیں سر! میں اس وقت آپ کی آمد کو ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔“ شہر یار سے معافی مانگ کر اسے اپنے کے لیے کرسی چن کر کرتے ہوئے اس نے خوشی اور حیرانی کی نئی نئی کیفیت میں کہا۔

”ایکسپیکٹ تو میں بھی نہیں کر رہا تھا کہ اس پر تم جیسے یہاں دیکھ سکوں گا۔“ شہر یار نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے تو میں بھی بھلا ہی یہاں کا پیکر کا تھوڑا سا لیکن آج کل یہاں بھلائی پر مامور لوگ چودھری افکار کی لاہور والی کوئی میں سے اس لیے مجھے روزانہ ہی آنا پڑتا ہے۔ وہ لڑکی ان کی ملازمہ ہے۔ اس کے حکم کی

تعمیل پر مجبور تھی۔“ شہر یار کو کہہ کر یہ ظاہر مسکرا کر یہ جواب دیتے ہوئے آفتاب حیدر کا کافی اب بیٹھ ہے۔

”اوہ آئی سی۔“ لیکن اس طرح تمہیں تو یہی پریشانی ہو رہی ہوگی۔“ بھترے کے تم اس لڑکی کی جگہ کسی دوسری ایسی لڑکی کو لے آؤ جو کسی اور کی ملازمت میں نہ ہو۔“ شہر یار نے اسے مشورہ دیا۔

”میں تو مشکل ہے کہ یہاں ایسی لڑکیاں ملتی نہیں ہیں۔ رانی کافی بھلا اور تھوڑی سی پڑھی لکھی لڑکی ہے اس لیے مجھے ذرا سہولت دینی ہے۔“ شہر یار نے اس دن وہاں آئی جانے کی۔ بی ایچال آپ یہ دیکھیں۔ میں نے لاہور اور اسلام آباد میں ملازمت کے بند سے جڑے کچھ افراد سے رابطہ کیا تھا۔ ان کی طرف سے اچھا ریسپانس ملا ہے۔ وہ یہاں کی خواتین سے کام کر داتے کے لیے تیار ہیں اور معاوضہ بھی مناسب آفر کر رہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ان سے آرڈر لے لے لے جائیں۔ اس طرح ان خواتین کے لیے آمدنی کا مستقل ذریعہ بن جائے گا۔“ آفتاب نے شہر یار کے سامنے دو وقت لے کر کے جن پر مشورہ ڈالیں لاہور کے مودہ گرام پر بن چکے تھے۔

”اؤں دن آفتاب آفر تو ہر فیڈ میں بڑی پر فیکشن کے ساتھ کام کرتے ہوئے میں نے آج صبح شہر یار کو کام پر بھانے جو چھوٹے اللہ آباد والے آفرے پر میرے کہنے پر کھٹا تھا۔ بہت شاندار کام ہے۔“ شہر یار نے اپنے کام میں ہر دو چار ٹائم شامل کیا جو میں جانتا تھا۔ اتنی محنت سے اور اتنا اچھا کام لکھتے پر مجھے تمہیں اچھی محنت ملتا ہے۔“ شہر یار نے اسے دل سے اس کی کا کر دی کہ ہوا۔

”مخلص کی ضرورت ہی نہیں سر! آپ اور میں ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں۔ اچھا استعداد اور اعلیٰ جتنوں کے مطابق جس نے جو کر لیا، تمہیں وہ اس کا فرض تھا جس کی ادائیگی کے لیے اللہ نے ذریعے بنا دیے ورنہ انسان کی کیا اوقات کہ نہیں بھی، کچھ بھی کر سکتا۔“ آفتاب نے اٹھارہری سے جواب دیا اور یہی اٹھارہری تو جی جوا سے بہت سے لوگوں میں بہت بڑی تھی۔ دل میں بہت خوش گوار سا احساس لے کر شہر یار نے وہاں سے رخصت چاہی۔ بارہ آفتاب کی کام کے ساتھ مل کر بیٹھ ہی اسے بہت جلد کر تھی لیکن آج اس نے محسوس کیا تھا کہ پوری دن وہی سے اپنے کام میں مصروف آفتاب کو بھرا ہوا ہے۔

”تمہاری ترقی کی رفتار دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی آفتاب! اس سہرت کے ساتھ کام جاری رکھو۔ میری طرف

سے تمہیں اجازت ہے کہ اٹھارہ اسکول اور انٹر سٹریم دوم کی باہر کی کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا چاہتے ہو تو اپنی مرضی سے اٹھانے ہو۔“ سب شہر یاروں پر مجھے یہ عید النان کو انعام کرنا کافی ہو گا۔“ آفتاب سے معافی کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”تھیک ہے! آپ کا انعام میرے لیے بہت بڑا ہوا۔“ آفتاب مسکرا کر لیکن یہ مسکراہٹ کچھ بھی نہیں ہوئی تھی۔

”اؤ کے آؤ پھر میں چلتا ہوں۔“ اگر کسی نویت کا کوئی بھی مسئلہ ہے تو مجھ سے کہہ دیجئے۔“ اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے لاؤنگر یار کو کہنا ہی پڑا۔

”نوسر! کوئی کام نہیں۔“ اس نے اپنی مسکراہٹ کو کچھ اور بھی کھرا کر کے ہونے شہر یار کو یقین دلانے کی کوشش کی تو وہ جب ہو گیا۔ اتنا انداز تو وہ بہر حال اسے ہو گیا تھا کہ جسکے کی نویت کچھ بھی مرضی ہے اس لیے آفتاب بتانے سے گریزاں ہے۔ جڑا ہوا اور کچھ کار جان کے وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کی اگلی منزل فارسیسٹ فیڈر عابد انصاری کا بھلا تھا۔ یہ وہی بھلا تھا جس میں کچھ عرصہ تک ایک اقبال باجوہ رہا تھا۔ یہ بھلا تھا اور یہ بھلا تھا کہ فارسیسٹ فیڈر بطور کی بدولتی میں ملوث رہنے کے بعد لاؤنگر یار کی دن باطل اچھا بھارت ایک سے جاں بحق ہو گیا تھا۔ موت اسے اپنا کچھ دوپٹے ہوئے نہ اس کی کمائی دولت سے مرعوب ہوئی تھی۔ نہ ہی سراسر سے۔ وہ اپنا کیا ہوا سارا مال اس کی خانی دینا پس چھوڑ کر سیاہ کاریوں سے مہربانہ اعمال کے کھانچ جتنی کے سامنے شرمندہ ہونے لگا تھا۔ وہ جتنی کی ابتدائی حد میں واقع فارسیسٹ فیڈر کے جگہ تک پہنچا تو شام کے سامنے پہنچے تھے۔ شہر یار عابد انصاری نے اس کا پڑ جوش استقبال کیا۔ وہ پچیس سالہ لیکن سال کا ایک کر لیں لی آری تھا جس کے لباس سے بھی کیسے گنگے بالوں میں سے کبھی نہیں کی سفید کی اس کی شخصیت کو اور بھی خوب صورت و دلکش بنا رہی تھی۔ شخصیت کی اس کشش کو بڑھانے میں اس کی آنکھوں پر لگے چھری فریم کے عین سے بننے کے ساتھ وہ آف وہاں سے رانی سوٹ بھی اہم کردار ادا کر رہا تھا جو اس نے یقیناً کسی باہر روزی سے سلا کر اپنے تن پہنا تھا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یہاں پہنچنے سے قبل آپ کے بارے میں کافی کچھ سننے کو ملا تھا۔ یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ آپ کی سٹارٹ پر مجھے یہاں پوسٹ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یقیناً تمہیں کہ میں آپ کی امیدوں پر پورا اٹانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔“ اسے ڈراٹھنگ دوسرے میں بھانے کے بعد جب ابتدائی تعارف کا مرحلہ طے کر گیا

تو عابد انصاری نے مسکراتے ہوئے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا۔

”میں بھی یہی خواہش رکھتا ہوں کہ آپ میری امیدوں پر پورے اتریں اور میں اپنے علم و دہک کے لیے جو ٹیم تشکیل دے رہا ہوں، آپ اس کے ایک اچھے ممبر بن جائیں۔ ڈاکٹر بارہا نے مجھ سے یہ طوطا خاں آپ کی تعریف کی تھی۔ وہ خود ایک فنی اور فرض شناس خاتون ہیں اس لیے میں نے ان کی تعریف پر یقین کرتے ہوئے آپ کی یہاں پر سٹنگ کے لیے سفارش کر دینی۔ اب آگے آپ کا کام بتائے گا کہ میں اپنے اس عمل میں درست تھا یا نہیں۔“ شہر پار نے اسے جانتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔ البتہ میں یہ بات سمجھ سکتا ہوں کہ آپ اسے حق یا کیوں ہیں۔ دنیا سے اٹھ جانے والوں کی بڑی مناسب توہینیں لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ عابد صاحب نے اپنے فرائض سے غفلت کی حد تک بے پروائی برتی تھی اور یقیناً ان کا یہی رویہ آپ کو کھانا ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ بہر حال میں اپنے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے ہی مرضے میں آپ پر مجھ سے اور باجوہ صاحب کے درمیان موجود فرق ظاہر ہو جائے گا۔ آپ کی آسلی کے لیے میں اتحادیوں کے میں سے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی ہے۔ خصوصاً میں دیکھتا ہوں میں یہی کرنے پر تیار رہا ہوں۔ ہمارے پاس جنگیں میں موجود جانوروں اور درختوں کے کچھ اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جس کی وجہ سے اس کا کھنگ کی دھوکہ تمام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے ایک درخواست تیار کی ہے جس میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مجھے ایسے افراد پر اہم کیے جائیں جو اس کام کے ماہر ہوں۔ میں ملک کی تکنیک استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح جنگل میں موجود غائب اور قندار کی کاؤ ٹننگ بھی ہو جائے گی اور نشان زد کیا جانوروں اور درختوں کو اسٹیک کرنا بھی آسان نہیں رہے گا۔“ عابد انصاری نے مختصر الفاظ میں اسے اپنا سارا منصوبہ بتا دیا۔

”یہ تو آپ بہت زبردست کام کریں گے انصاری صاحب! میری ذاتی خواہش بھی یہی تھی کہ جنگل کے مسئلے میں کچھ اس طرح سے کام کیا جائے جو مشکل بنیادوں پر ہو۔ آپ بے فکر ہو کر اپنی درخواست سمجھائیں۔ میں خود بھی آپ کی مدد کر دوں گا۔“ وہ کام کر کے والے افراد کا دل سے قہر دیکھ کر عابد انصاری کی بات سن کر خوش ہو گیا اور انہیں اپنے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کروانے لگا۔

”تعاون کے لیے شہر پار صاحب! اگر آپ کو اعتماد اور تعاون اسی طرح میرے ساتھ رہا تو میں اپنی کارکردگی سے آپ کو جیون کر دوں گا۔“ عابد انصاری اس کے جوش کو دیکھ کر متحیر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بھی ان دونوں میں کافی دیر تک اس موضوع پر گفت و شنید ہوئی رہی۔ اس گفتگو کے دوران وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ شہر پار نے اس وقت جو نکات باب لازم سے کھانے لگنے کی اطلاع دی۔

”مجھے اجازت دیں انصاری صاحب! آپ کی مہربانی میں مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور تھکے ہوئے شیدوں کے مطابق تو مجھے اب تک وہاں نور کوٹ بنی جانا چاہیے تھا۔“ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر عابد انصاری سے اجازت طلب کرنے لگا۔

”اب آپ اس طرح بغیر کھانے کھائے تو یہاں سے نہیں جاسکتے۔ جہاں اتحاد وقت گزر گیا ہے پھر وہاں منٹ اور رعایت کر دیں۔“ عابد انصاری نے اسرار کیا اور پھر ان کا یہ وسیع دارانہ اسرار اتار دیا وہ پڑھ گیا کہ شہر پار کو کھانے کے لیے رکھنے ہی تھی۔ کھانا عمود اور قدرے مختلف تھا لیکن اتنی برکت میں نہیں تھا جیسا چوہری کی ڈانٹنگ بھلی پر ہوتا تھا۔ شہر پار اور عابد انصاری نے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا۔ ڈرائیو کے بارے میں بھی اسے اطلاع مل گئی تھی کہ اسے بھی کھانا کھانا دیا گیا ہے۔ کھانے کے بعد گرین ٹی کا دور چلا اور پھر آخر کار شہر پار نے وہاں سے رخصت ہوئی۔ عابد انصاری کے چپکے سے نقش کر دیا اپنی گاڑی میں واقعہ کے لیے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ایک بہت خوش گوار ماحول تھا۔ اسے لگے کہ وہاں کچھ وہ جس مشن کے تحت کام کر رہا ہے۔ اس کے لیے اس کا ساتھ دینے والوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھیوں کا ایک قافلہ تشکیل پا رہا تھا جو اس امر کی نشان دہی کر رہا تھا کہ وہ اپنی منزل تک ضرور پہنچے گا۔ سکوت اور اطمینان کے اس گیرے احساس کے ساتھ وہ گاڑی کی سیٹ سے ہر گھنٹے آنکھیں موندے چمکا تھا۔ وہ عوامی پر پائی گاڑی کو کتنے والے بچھوئے بھی اس کے اطمینان میں غرق نہیں لارہے تھے لیکن پھر ایک دوسری ایک زوردار جھلک اور ہر گھنٹے کی زوردار جھلک کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ شہر پار نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر دیکھا۔ گاڑی کے باہر نظر آنے والا مظہر میران تھا۔

حادثات و ساجات کی سنکر۔ ہند کی تلات حص سر گوشان
جان ناتو کی دلسان حیات کے ولعت اکس مادہ نیج



ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھسستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس پوچھ جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی پاتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیٹا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی قسوں گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... ملے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی



وہ ایک کھلی جیب تھی جس نے اس کی گاڑی کے عین سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا تھا اور اب اس سے ہتھیاروں سے لیس نقاب پوش اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے۔ وہ کون لوگ تھے؟ فوری طور پر اس کے لیے فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ جو بھی ہیں، دوست ہرگز نہیں ہو سکتے۔ وہ اچانک سامنے آ جانے والے ان دشمنوں کے لیے ترنوالہ بننے کو تیار نہیں تھا اس لیے بے حد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا لاک کھولا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ سیدھا کھڑا نہ ہو اور جسم کو ایسے زاویے پر رکھے کہ گاڑی کے دروازے کی آڑ میں چھپ سکے۔ ورنہ دوسری صورت میں اگر حملہ آوروں کی طرف سے فائرنگ کی جاتی تو وہ نشانہ بن سکتا تھا۔ اگلے ہی پل سنائی دینے والی فائر کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اسے باہر نکلتے دیکھ کر ان میں سے کسی نے فائر کر دیا تھا۔ فائر کی آواز کے فوراً بعد جو دوسری آواز اس کی سماعتوں تک پہنچی، وہ اس کی گاڑی کے ڈرائیور کی بھیاں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ بے چارہ اس صورت حال پر بری طرح بوکھلا گیا تھا اور اچانک راستہ روک کے جانے پر ایمر جنسی بریکس لگانے کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اس کی چیخ سن کر شہر یار کو اندازہ ہوا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہلاک یا شدید زخمی ہو چکا ہے۔ ڈرائیور کے ساتھ جو بھی حادثہ پیش آیا تھا، اسے اس پر دلی افسوس تھا لیکن اس وقت وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال تو اسے اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی اور وہ بھی بنا ہتھیار... فی الوقت وہ قطعی نہبتا تھا۔ ایک عام سے معمول کے دورے پر آتے ہوئے اسے خیال ہی نہیں گزرا تھا کہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لے کر چلتا۔ اس نے ڈرائیور کے پاس موجود ریوایور کو بھی کافی جانا تھا لیکن قسمت کی خرابی سے ڈرائیور اس کے تحفظ کے لیے کوئی قدم اٹھاتا، اس سے قبل خود ہی نشانہ بن گیا تھا۔ اس کی طرف سے کسی مدد کی قطعی امید نہ رکھتے ہوئے شہر یار گاڑی کے عقب میں رینگ گیا۔ جیب سے اترنے والے نقاب پوش ابھی تک اس کی گاڑی کے قریب نہیں آئے تھے اور دور سے ہی جائزہ لے رہے تھے۔

”بے کار کی محنت نہ کریں اے سی صاحب! ہم تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ہمارے پاس اسلحہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ اگر ہم چاہتے تو آپ گاڑی سے اتر بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے ڈرائیور کو لٹنے والی گولی کو ہماری کوئی خطا نہ سمجھیے گا۔ نشانہ ہم

سب کا بالکل اے ون ہے۔ آپ ہمیں گولیوں میں کچے کھیلنے والے لوٹے تصور کرنے کی غلطی نہ کریں اور آرام سے بغیر کسی مزاحمت کے ہاتھ اٹھا کر سامنے آجائیں۔“

وہ گاڑی کے عقب میں پہنچا ہی تھا کہ ان نقاب پوشوں میں سے ایک کی قدرے بلند لیکن ہموار آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کو سن کر تذبذب میں پڑ گیا۔ بولنے والے کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا اور پُر اعتماد آدمی ہے۔ پھر اس نے جو بات کہی تھی، وہ تو بالکل روشن حقیقت کی طرح عیاں تھی۔ حملہ آور تعداد میں زیادہ بھی تھے اور مکمل طور پر ہتھیار بند بھی۔ وہ اگر ان کے خلاف مزاحمت کرتا بھی تو ان کے آگے اس کی کتنی دیر پیش چلتی۔ آخر کار اسے ہار مانی ہی پڑتی لیکن اس طرح بغیر کسی مزاحمت کے ہار مان لینا بھی اس کے لیے خلاف فطرت تھا۔ وہ فطرتاً ہی جو تھا اور ایسے کسی موقع پر اپنی حیثیت و مقام سب بھول کر میدانِ عمل میں اترنے کے لیے تیار تو نہ لگتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے عضلات پوری طرح تھپتھپاتے ہوئے تھے اور اس کی فطرت اسے مقابلے پر اکسا رہی تھی۔

”دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑے ہو جائیں اے سی صاحب! کوئی بھی غیر ضروری حرکت آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔“ اس سے قبل کہ وہ از خود کوئی فیصلہ کرنا، اس کی پشت پر سے آواز ابھری اور کوئی ٹھنڈی سی شے اس کی گردن سے ٹکرائی۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ گردن پر موجود ٹھنڈک کو پہچاننا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ یوہے کی یہ ٹھنڈک یقینی طور پر کسی ہتھیار کی نشان دہی کر رہی تھی۔ اس کا راستہ روکنے والوں میں سے کوئی بہت آہستگی سے چل کر اس کی پشت پر پہنچ گیا تھا اور اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس بے بسی پر شدید جھنجھلاہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ اپنی پشت پر موجود شخص کے حکم کے مطابق سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس پر سامنے کا منظر زیادہ واضح تھا۔ اسے روکنے والی جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈھانٹا پوش بالکل تیار بیٹھا تھا۔ اس نے جیب کا انجن بند نہیں کیا تھا تا کہ کسی ایمر جنسی کی صورت میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو فرار ہونے میں مشکل پیش نہ آئے۔ ڈرائیور کے علاوہ دو ڈھانٹا پوش اس کی گاڑی کے بالکل قریب کھڑے ہوئے تھے جبکہ ان کا چوتھا ساتھی تو اس کی پشت پر موجود ہی تھا۔

”آگے بڑھو۔“ وہ اس جائزے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کی پشت پر موجود شخص نے اسے ہلکا سا ٹھوکا دیتے ہوئے حکم دیا۔ شہر یار نے اس کی آواز کو شناخت کر لیا۔ اسے

گھیرنے والوں میں سے اب تک صرف یہی شخص اس سے ہم کلام ہوا تھا۔

”میرا ڈرائیور زخمی ہے۔ یہ اگر اسی طرح پہاں پڑا رہا تو مر جائے گا۔“ عقب میں موجود شخص کے حکم کی تعمیل میں اس نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ زخمی ڈرائیور پر نظر پڑنے پر ٹھٹھک کر رک گیا۔ ارد گرد چھائے اندھیرے کے باوجود گاڑی کی اندرونی بتی روشن ہونے کی وجہ سے وہ اندر موجود ڈرائیور کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی اور زخم سے نکلنے والے خون نے اس کے سفید یونیفارم کی قمیص کو بے تحاشا رنگ ڈالا تھا۔ خون کے اس بے تحاشا بہاؤ کے باوجود شہر یار نے ٹوٹ کر لیا تھا کہ ابھی اس کی جان نہیں لگتی ہے اور وہ آنکھیں بند کیے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا ہے۔

”اس کی فکر کرنا بے کار ہے۔ یہ چند منٹ سے زیادہ مزید زندہ نہیں رہ سکے گا۔“ بے حد سرد لہجے میں اسے جواب دے کر ایک ٹھوکا اور دیا گیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہے۔ اندر ہی اندر ہیچ و تاب کھاتے ہوئے شہر یار نے اپنے قدم آگے بڑھائے لیکن خود کو سوال کرنے سے نہ روک سکا۔

”تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح گھیرنے کا کیا مقصد ہے؟“

”ہم کون ہیں یہ تو نہیں جانتے، البتہ مقصد شاید آپ کو آگے چل کر معلوم ہو جائے۔ ہم تو بس اپنے دوستوں کا ساتھ دینے کے لیے اس کام میں شامل ہوئے ہیں۔“ بڑے بے نیاز اور پُر اعتماد انداز میں اس کی بات کا جواب دیا گیا۔ اس جواب کو سن کر شہر یار چونک گیا۔ قطعی مختلف لب و لہجے میں بات کرنے والا یہ آدمی جس کے بارے میں وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ شخص مقامی نہیں ہے، اس کے کسی دشمن کے ایما پر اسے اغوا کر کے لے جا رہا تھا اور اس علاقے میں اس کی چودھری افتخار کے علاوہ بھلا اور کس سے دشمنی تھی؟

اس سوچ کے حصار میں گہرا وہ جیب تک پہنچ گیا۔ پشت پر موجود شخص کے علاوہ اب باقی دو افراد کی رائفلیں بھی اس پر اٹھی ہوئی تھیں اور اس کے لیے کسی قسم کی حرکت کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ اسے جیب کی پچھلی نشست پر بیٹھانے کے بعد دونوں ڈھانٹا پوش اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے جبکہ عقب پر موجود ڈھانٹا پوش نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ اس کے جیب میں سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے جھٹکے سے جیب آگے بڑھا دی۔ رات کے سناتے میں جیب

کے ٹائروں کی چرچراہٹ دور تک گونجی لیکن آبادی سے دور جنگل کے اس قریبی حصے میں کوئی گولی چلنے کی آواز سننے والا نہیں تھا تو ٹائروں کی چرچراہٹ کسے متوجہ کرتی؟ طاقتور انجن والی جیب زناتے بھرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

”تم لوگ جس بھی مقصد کے تحت مجھے...“ یہ سمجھتے ہوئے کہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ڈھانٹا پوش ہی اسے اغوا کرنے والوں کا اس کا رروائی کے دوران لیڈر ہے، شہر یار نے اس سے گفتگو کی کوشش کی لیکن اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے افراد میں سے کسی ایک نے کلوروفام میں بھیگا ہوا رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ چونکہ اپنی توجہ مکمل طور پر اگلی سیٹ پر موجود شخص پر مرکوز کیے ہوئے تھا اس لیے بروقت اس کا رروائی سے آگاہ نہ ہو سکا اور بے خبری میں ہی بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈوبنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

رات بے حد تاریک تھی اور اس مقام پر تو تاریکی کے ساتھ ساتھ بھیاں تک بھی لگ رہی تھی۔ دنیا کی رونقوں کا سبب، اس کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے والے جسموں کی آخری پناہ گاہ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ جیسے ہی روح جسم کو چھوڑ کر پرواز کرتی ہے، مٹی کا ڈھیر خالی دجو کو یہاں لا کر گاڑ دیا جاتا ہے۔ وہ جو بھی کاروبار حیات چلایا کرتے تھے، اس شہر خموشاں میں منوں مٹی تھے دبے ڈی کمپوزرز کی کارروائی سے آہستہ آہستہ خود بھی مٹی ہوتے اس مٹی میں ملتے جاتے ہیں۔ ہنگامہ حیات کو جاری رکھنے والے انسانوں کی آخری پناہ گاہ کی خاموشی میں جانے ایسی کیا بات ہوتی ہے کہ جیتا جاگتا انسان اس طرف کا رخ کرے تو ایک دہشت کی محسوس کرتا ہے۔ خصوصاً رات کے وقت قبرستان میں داخل ہونے کو بڑے دل گردے کا کام سمجھا جاتا ہے۔ اکثر لوگ یوں محسوس کرتے ہیں کہ جیسے قبروں کے اندر لیٹے مردے مٹی کے ڈھیر کو چیر کر اپنے ہاتھ باہر نکالیں گے اور انہیں بھی اندر گھسیٹ لیں گے۔

لیکن وہ چاروں اس خوف سے قطعی بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک قبرستان کا گورکن تھا جس کے شب و روز گزرتے ہی اس شہر خموشاں میں تھے۔ وہ انہی قبروں کے درمیان مردوں کی ہڈیوں سے کھیلتا ہوا بڑا ہوا تھا اور اب عمر کی آخری منزل پر تھا۔ عمر کے ان سالوں میں اس نے بے شمار مردوں کو مٹی تلے اترتے اور پھر ہڈیوں کا جھرجھکتے دیکھا تھا۔ مرنے والے مر جاتے تو چند دنوں تک ان کے عزیز واقارب

باقاعدگی سے قبر پر آتے رہتے، تازہ قبر پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا اور پھولوں کی پتیاں بکھیری جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہوتا جاتا اور ایک وقت ایسا آتا کہ عید، شبِ برأت پر حاضری کا سلسلہ بھی موقوف ہو جاتا۔ گورکن کی بوڑھی آنکھیں برسوں سے یہ سارے تماشے دیکھ رہی تھیں۔

مگر آج کی رات بوڑھے گورکن کے تجربوں میں ایک اور تجربے کا اضافہ کرنے کے لیے آئی تھی۔ رات کے آخری پہر قبرستان میں آنے والے وہ تینوں نفوس کسی مرنے والے کے لواحقین تھے، نہ ہی پناہ کے متلاشی نئے باز و پریم دیوانے۔ وہ کفن چور بھی نہیں تھے لیکن آئے بہر حال کچھ لے جانے ہی تھے۔ انہوں نے گورکن سے کفن سمیت قبر میں دفن ایک مُردے کا مطالبہ کیا تھا۔ گورکن اس مطالبے پر ہکا بکارہ گیا لیکن مطالبہ کرنے والوں کی شناخت اور حیثیت نے اسے انکار کی جرأت نہیں کرنے دی۔ وہ سرکاری اہلکار تھے اور کچھ عرصے قبل ہی یہاں دفن ہونے والے ایک سرکاری افسر کی ڈیڈ باڈی لے جانے آئے تھے۔ ان کے پاس اس کام کے لیے مختار نامہ موجود تھا اور وہ چاہتے تو دن دھاڑے بھی یہ کام کر سکتے تھے... لیکن انہوں نے اس کام کے لیے رات کے آخری پہر کا انتخاب کیا تھا۔ گورکن کے لیے حکم تھا کہ کام نہایت صفائی اور خاموشی سے کیا جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی جائے۔ غریب گورکن کے پاس اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بھاؤ اور کدال سنبھالے اپنی دھونی کو گھٹنوں سے اوپر باندھ کر میدانِ عمل میں اتر آیا اور مشاقت سے کھدائی کا کام کرنے لگا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ قبر ابھی کچی نہیں کی گئی تھی اور اسے صرف چاروں طرف اکھری اینٹوں کی چار دیواری چن کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچی قبر کی کھدائی کرتے کرتے بالآخر گورکن اس مقام پر پہنچ گیا جہاں قبر میں دفن لاش ظاہر ہو گئی۔

لاش ظاہر ہونے سے پہلے وہاں موجود افراد کا اس بدبو سے سابقہ پڑا جو مُردہ مکتے سڑتے جسموں سے اٹھتی ہے۔ یہ کوئی معمولی بو نہیں تھی۔ اگر کسی عام آدمی کے نشتوں سے ٹکرائی تو وہ ابکانی لے کر پیٹ میں موجود خوراک اٹھنے پر مجبور ہو جاتا لیکن گورکن تو اس شہرِ خموشاں کا ہی باسی تھا۔ یہاں بسنے والے میٹروں باسیوں میں سے واحد زندہ باسی۔ اس کے لیے یہ بوانجان نہیں تھی اور اس نے پہلے ہی حفظِ ماتقدم کے تحت اپنے منہ پر کپڑا لپیٹ لیا تھا۔ اس کے ساتھ موجود سرکاری اہلکاروں نے بھی اپنے منہ اور ناک بلکے سبز رنگ کے ماسکس سے ڈھانپ رکھے تھے۔ وہ لوگ گورکن

کے کھدائی کرنے کے دوران مٹی کو ہٹا کر ایک جانب کرنے میں اس کی مدد کرتے رہے تھے۔ قبر کشائی کے بعد لاش ظاہر ہوئی تو اسے قبر سے نکال کر مخصوص پولی تھین بیک میں منتقل کرنے کے کام میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ لاش بہت زیادہ پرانی نہ ہونے کے باوجود اچھی خاصی خراب ہو گئی تھی۔ گورکن کے تجربے کے مطابق لاش کو دفن ہوئے جتنی مدت گزری تھی، وہ اس سے دُہری مدت کے برابر پرانی لگ رہی تھی۔ اس طرح کی گلی سڑی، بدبودار لاش کو قبر سے برآمد کر کے پولی تھین بیک میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ان لوگوں نے کر لیا۔ ظاہر ہے، وہ اس کام کے ماہر تھے تب ہی تو یہاں بھیجے گئے تھے۔

”قبر کو دوبارہ مٹی ڈال کر پہلے والی حالت میں کر دو۔ کام اتنی صفائی سے کرنا کہ کسی کو قبر کھولے جانے کا شبہ نہ ہو سکے۔“ لاش کو جراثیم کش ادویات اور بودبانے والی خوشبوؤں کے چھڑکاؤ کے بعد اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک تابوت میں منتقل کر کے... ان میں سے ایک نے گورکن کو حکم دیا اور پھر اسے ایک ٹیلا کڑکڑاتا ہوا نوٹ تھا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ تابوت سمیت وہاں سے رخصت ہو گیا۔ سرکاری اہلکار کا حکم، اس پر سے نیلے کڑکڑاتے نوٹ کی خوشبو... گورکن ان کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی پوری تن دے سے قبر کا گڑھا بھرنے لگا۔ اس قبر کا گڑھا جو اپنے یکن کے رخصت ہونے پر کسی ماں کی کوکھ کی طرح خالی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شہر یار کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک نیم روشن کمرے میں فرش پر بچھے گدے پر لیٹا ہوا پایا۔ کمرے میں مختصر تھا جس میں اس کے بستر کے بعد بس چند فٹ کی جگہ بچی تھی۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا اور مدھم روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک چوکور کمرہ تھا جس میں اس کے بستر کے علاوہ جو دوسری شے موجود تھی، وہ دیوار کے ساتھ رکھی پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ موجود نہیں تھا۔ اس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی اپنا باقی جائزہ بھی مکمل کیا۔ کمرہ اینٹوں کی بدو سے بنایا گیا تھا اور دیواریں پلاسٹر اور رنگ و روغن سے قطعی عاری تھیں۔ دائیں دیوار میں لکڑی کا ایک پٹ والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کی چوڑائی بہت کم تھی اور وہ دیوار میں کچھ اس طرح سے فکس تھا کہ کوئی درز نظر نہیں آرہی تھی۔ یہاں تک کہ باہر سے روشنی آنے کے لیے بھی جگہ موجود نہیں تھی۔ کمرے کی تاریکی کو نیم روشن کرنے کے لیے دیوار پر ایک کیل کے ساتھ لائیننگ لگی ہوئی تھی۔ اس مختصر قید

خانے کا جائزہ لینے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو لمحہ بھر کے لیے سر چکرا کر رہ گیا۔ یہ یقیناً اسے بے ہوش کرنے والے کلوروفام کا اثر تھا جو اب بھی باقی تھا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو اس کے اثر سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور صراحی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس پر رکھے اسٹیل کے گلاس میں پانی اٹھایا۔ پانی بالکل شفاف تھا اس لیے اسے پانی پینے میں کوئی غار محسوس نہ ہوا۔ پانی پی کر اس کی طبیعت ہلکا ہو گئی۔ وہ اٹھ کر دروازے تک گیا اور اسے ہلانے جلانے کی کوشش کی لیکن دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا اور کچھ اس طرح سے دیوار میں فٹ کیا گیا تھا کہ اسے ہلانے جلانے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی تاکہ اس کو یہاں تک لانے والے اگر باہر موجود ہوں تو انہیں اس کے ہوش میں آنے کا علم ہو جائے اور وہ اس سے بات چیت کر کے اسے اغوا کر کے یہاں لائے جانے کا سبب بتائیں۔ مگر اس کی مسلسل دستک بے کار گئی اور باہر سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خاموشی سے بیٹھ کر ان لوگوں کے متوجہ ہونے کا انتظار کرے۔ اس نے یہی کیا لیکن اس خالی خولی انتظار کے دوران بھی اس کے حواس جاگ رہے تھے۔ ذرا سے ارتکاز کے بعد وہ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ اسے جس چار دیواری کے اندر قید رکھا گیا ہے، وہ عام آبادی میں موجود آوازوں کو محسوس کر رہی تھی۔ چار دیواری سے باہر موجود آوازوں کو محسوس کر رہی تھی۔ پرندوں کی چچھاہٹ، ہوا کی سرسراہٹ اور کچھ غیر معمولی سی آہٹیں تھیں جو ارد گرد بکھری ہوئی تھیں۔ سماعت کے بعد اس نے اپنی قوتِ شامہ پر زور دیا تو فضا میں جنگلی بوٹوں کی مہک اور نمی سی محسوس ہوئی۔ اس کا ذہن فوراً حساب کتاب کرنے لگا۔ قوتِ سماعت و شامہ کی حاصل کردہ معلومات کے تجزیے نے اس کے سامنے ایک ہی جواب پیش کیا۔ وہ اس وقت جنگل کے کسی حصے میں موجود تھا اور اس خیال کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی تھی کہ اسے جنگل کے قریب سے ہی اغوا کیا گیا تھا۔ یعنی اغوا کرنے والوں نے اسے جنگل ہی میں موجود اپنے کسی خفیہ ٹھکانے میں رکھا تھا۔ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟ وہ جب بھی خود سے یہ سوال کرتا، اس کے سامنے ایک ہی جواب آتا۔

چودھری افتخار عالم شاہ... یہاں اس کا دشمن بھی وہی تھا اور اختیارات بھی اسی کے اتنے وسیع تھے کہ وہ اس جنگل سمیت پورے علاقے میں جہاں چاہتا اسے قید کر داسکتا تھا۔

چودھری کے پاس اسے اغوا کر دینے کے لیے کئی مضبوط جواز بھی موجود تھے۔ وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ تھا اور لوگ اپنی ہر ضرورت کے لیے نہ صرف اس کی طرف دیکھتے تھے بلکہ اس کا ہر ظلم بھی خاموشی سے برداشت کر لیتے تھے... لیکن اب اسکول و اسپتال کے باقاعدہ آغاز نے چودھری کی اس حیثیت کو زک پہنچائی تھی۔ دوسری طرف لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کے لیے کی جانے والی سختی نے اسے مالی اعتبار سے نقصان پہنچایا تھا۔ پھر ماہ بانو کا شہر یار کی مدد سے اس کے ہاتھوں سے نکل جانا بھی اس کے غصے کو بھڑکانے کا سبب بنا تھا۔ اس نے ڈاکٹر مار یا کو چارے کے طور پر استعمال کر کے شہر یار کو ٹریپ کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن خوش قسمتی سے شہر یار اس کی اس گھناؤنی چال سے بچ گیا تھا۔ اب یقیناً وہ ایک نیا حربہ لے کر آیا تھا اور اس حربے کے استعمال سے پہلے خود امریکا روانہ ہو گیا تھا تاکہ خود کو شک سے بری رکھنے کے لیے عدم موجودگی کا جواز دے سکے۔

شہر یار جوں جوں اس صورت حال پر غور کر رہا تھا، اس کا یقین مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے چودھری کا ہی ہاتھ ہے۔ اپنے یقین پر پختہ ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے پر دستک دی۔ حسب سابق اس دستک پر بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا لیکن اسے یقین تھا کہ باہر کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے اتنی جدوجہد سے اغوا کر کے لانے کے بعد بغیر کسی نگراں کے تنہا چھوڑ دیا جاتا۔

”میں جانتا ہوں کہ باہر میری آواز سنی جا رہی ہے۔ بے شک تم لوگ مجھے رسپانس نہ دو لیکن میرا یہ پیغام چودھری تک پہنچاؤ کہ وہ تھوڑا کلاس مجرموں کی طرح اوجھے جھکنڈے استعمال کرنے کے بجائے مجھ سے فیس ٹوفیس بات کرے۔“ اپنے یقین ہی کی بنیاد پر اس نے بلند لیکن باوقار لہجے میں یہ بات کہی اور واپس بستر پر آ بیٹھا۔

”آپ بے کار اندازے لگانے میں اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں اے سی صاحب! یہاں جس کو اور جب بھی آپ سے مذاکرات کرنے ہوں گے وہ خود سامنے آجائے گا۔“ ذرا سے توقف کے بعد دروازے کی دوسری جانب قدموں کی آہٹ سنائی دی اور نہایت ٹھنڈے لہجے میں شہر یار کو جواب دیا گیا۔ جواب دینے والے کی آواز شناخت کرنے میں اس بار اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ وہی تھا جو اغوا کے دوران بھی اس سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ اس شخص کے لہجے کا ٹھہراؤ اور زبان کی روانی اس کو ہر بار ٹھکانا دیتی تھی۔ وہ بولتا تو

صاف احساس ہوتا تھا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا، شہری ماحول کا بندہ ہے جو شاید کسی مجبوری کے سبب ان مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں میں شامل ہو گیا ہے۔ فی زمانہ بڑھتی ہوئی... بے روزگاری اور کرپشن نے یہ ایک نیا ٹریڈ جنم دیا تھا۔ یہ حیثیت ایک انسان کے شہر یار کے لیے یہ ایک بڑا لمحہ فکریہ تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی قید و بند کی پریشانی کو بھول کر اس نوجوان کی ذات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شہر یار عادل زندہ سلامت چاہیے ایس پی صاحب... آپ یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لیں۔ اگر آپ اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے تو یاد رکھیے گا کہ پھر پولیس کی نوکری میں آپ کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ ناکامی آپ کے اگلے پچھلے سارے کھاتے کھول دے گی۔ شہر یار عادل کوئی معمولی شخص نہیں ہے جو اسے اس طرح اغوا کر لیا جائے اور کہیں کوئی طوفان نہ اٹھے۔ مجھے ہر حال میں وہ چوبیس گھنٹے سے پہلے واپس چاہیے۔“

ریسیور کان سے لگائے یہ سب سنتے معظم تارڑ کو دوسری طرف موجود آئی جی مختار مراد کی کیفیت کا خوب اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے باقاعدہ چنگھاڑ رہا تھا۔ یقیناً سجاد رانا کی ہلاکت کے بعد ہونے والا شہر یار کا یہ اغوا اس کے اعصاب کے لیے بڑی آزمائش ثابت ہوا تھا اور اس کا اپنا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح گھڑی کی چوتھائی میں شہر یار کو بازیافت کروا ڈالے۔

”ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں سر! پولیس فورس کے جوانوں نے اس سارے علاقے کو گھیر لیا ہے جہاں سے شہر یار صاحب کی گاڑی اور ان کے ڈرائیور کی لاش ملی ہے۔ میرے جوان کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح کوئی کلیولر جائے جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ اے سی صاحب کو اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا ہوگا۔ ویسے مجھے شک ہے کہ انہیں جنگل کی طرف لے جایا گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو پولیس فورس کو کارروائی کرنے میں بہت مشکل پیش آئے گی۔ ہمارے پاس نہ تو اتنی نفری ہے اور نہ ہی اتنی سہولیات کہ جنگل میں شخص کو کارروائی کر سکیں۔“ اس نے مختار مراد کے سامنے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ذہن میں موجود خدشات اور درپیش مسائل بھی بیان کر دیے۔ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ شہر یار کا اغوا اتنی معمولی بات نہیں تھی کہ آرام سے دب جانی۔ ابھی مختار مراد کا فون آیا تھا بعد میں اور بھی نہ جانے کون کون اس سے رابطہ کر

کے شہر یار کی بازیابی کے سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالنا۔ ”آپ کو شہر یار کی تلاش میں جنگل چھاننا پڑے یا کسی کا محل... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بس مجھے چوبیس گھنٹے میں اس کے ملنے کی اطلاع چاہیے۔ باقی آپ کو جتنی فورس اور سہولیات درکار ہیں، وہ نوٹ کروادیں۔ آپ کو چند گھنٹوں کے اندر سب کچھ پرووائڈ کر دیا جائے گا۔“ مختار مراد نے طنز اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں اس کی بات کا جواب دے کر ریسیور بند کر دیا۔ ریسیور بند ہونے کے بعد اس نے مختار مراد کو گھبراہٹ سے لگا کر مختار مراد کی گہرا سانس لیتے ہوئے کان سے لگا کر ریسیور کیڈل پر ڈال دیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا کہ مختار مراد کا اشارہ نہیں سمجھتا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کو شہر یار کی تلاش میں جنگل چھاننا پڑے یا کسی کا محل... مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ اس بات کا مطلب تھا کہ وہ چودھری مختار پر شبہ کر رہا تھا کیونکہ اس علاقے میں محل جیسی حویلی تو بس اسی کی تھی۔ خود معظم تارڑ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ کارروائی چودھری کی طرف سے ہی کی گئی ہے۔ چودھری اس سلسلے میں پہلے ایک بار اپنا ارادہ ظاہر کر چکا تھا، بعد میں اس نے اچانک نیویارک جانے کا پروگرام بنالیا۔ اب اس کی غیر موجودگی میں یہ واردات ہوئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ چودھری یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کا اس کارروائی سے کوئی تعلق نہیں... لیکن دوسرے لوگ بھی کوئی گھاس نہیں کھائے ہوئے تھے جو حقیقت کو نہ سمجھ پاتے۔ تارڑ نے بھی حقیقت سمجھ لی تھی اور واردات کی اطلاع ملنے کے بعد سے مسلسل چودھری سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ پاکستان اور نیویارک کے درمیان جو طویل فاصلہ تھا، اس نے وقت کا بھی بہت بڑا بھد پیدا کر دیا تھا۔ ایس پی تارڑ کو معلوم تھا کہ اس پہر جبکہ یہاں دن نکلا ہوا ہے، نیویارک میں رات ہوگی۔ اب جانے رات کی یہ گھڑیاں چودھری خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہوئے گزار رہا تھا یا کسی گوری رنگت والی حسینہ کی سنہری زلفوں کی چھاؤں میں۔ وجہ بہر حال جو بھی رہی ہو... مسلسل کوشش کے باوجود وہ چودھری سے رابطے میں ناکام تھا۔

مختار مراد سے احکامات ملنے کے بعد اس نے ایک بار پھر چودھری سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہاں ہنوز وہی صورت حال تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر اس نے حویلی فون کیا اور منشی اللہ رکھا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ فوراً ہی منشی لائن پر آ گیا۔

”حکم ایس پی صاحب! آپ نے خادم کو کیسے یاد فرمایا؟“ اس کا وہی سدا کا خوشامدانہ انداز اور لب و لہجہ تھا۔

”یاد تو اصل میں مجھے تمہارے سرکار کی آرہی ہے لیکن کئی بار کوشش کرنے کے بعد بھی ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ سوچا تم سے معلوم کر لوں۔ تمہیں تو یقیناً ان کے بارے میں علم ہو گا۔“ تارڑ نے منشی کی خوشامد کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے اپنے مطلب کی بات کی۔

”سرکار سے تو خود ہمارا رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ انہوں نے اپنا فون بند کر رکھا ہے۔ ادھر چھوٹے چودھری مراد شاہ کے گھر کے نمبر پر گل کرنے کی کوشش کی تھی، پر ادھر سے بہوجی نے بتایا کہ چودھری صاحب کسی گل نول ناراض ہو کے گھر سے چلے گئے ہیں۔ چھوٹے چودھری صاحب نے وہ ہوٹل تو تلاش کر لیا ہے جدھر چودھری صاحب رکے ہیں، پر آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ ابھی ادھر رات ہو رہی ہے اور چودھری صاحب ہوٹل والوں سے کہہ کر سوئے ہیں کہ انہیں صبح سے پہلے کوئی نہ جگاے... تو آپ سمجھ لیں کہ جب ادھر صبح ہوگی، تب ہی آپ سرکار سے گل کر سکتے ہو۔“ منشی نے اسے چند جملوں میں پوری کھٹا سادی۔

”ٹھیک ہے... میں چودھری صاحب سے بعد میں بات کر لوں گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ بالا کہاں ہے؟“ یہ جان لینے کے بعد کہ ابھی کم از کم تین چار گھنٹوں تک اس کا چودھری سے رابطہ نہیں ہو سکے گا، ایس پی نے دوسرے رخ سے تفتیش کی کوشش کی۔

”ادھر حویلی میں ہی ہے سر جی! کل سے وچارے کو تاپ چڑھا ہوا ہے اس لیے منجی پکڑ کر لیٹا ہوا ہے۔ آپ دسو، آپ کو ہن نال کوئی کام شام ہے کیا؟ میں کسی ہو ر کام کے بندے کو تہا ڈے نال بھیج دوں گا۔“ چرب زبان منشی کی باتیں سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کے فون کرنے کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا ہے لیکن کسی نہ کسی طرح اسے بہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

”تم میرے اور چودھری صاحب کے درمیان تعلقات کی نوعیت اچھی طرح جانتے ہو منشی... ہم ایک دوسرے کے راز داں ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو اور سیدھی طرح سے وہ بتاؤ جو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔“ ایس پی، منشی کا انداز سمجھ کر یک دم ہی براہ راست گفتگو پر آ گیا۔

”میںوں کیا خبر حضور کہ آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے کل کر پوچھیں۔ میںوں اگر کسی گل کی خبر ہوئی تو آپ کو ضرور دسوں گا۔“ منشی کی منافقت تو کبھی ہی بے مثال، سوا سی فدویانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

”رات تمہارے علاقے میں اے سی شہریار کو اغوا اور اس کے ڈرائیور کو گل کیا گیا ہے۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہی ہو گی۔ اب میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اے سی کہاں ہے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ تمہارے علاقے میں اتنی بڑی واردات ہو اور تمہیں کچھ خبر ہی نہ ہو۔“ منشی کی اداکاری کی پروا نہ کرتے ہوئے ایس پی نے اس سے سوال کیا۔

”یہ آپ کیسی گل کر رہے ہیں ایس پی صاحب! بے شک اے سی صاحب کا اغوا ادھر سے ہی ہوا ہے لیکن گاؤں سے بہت دور جنگل کے علاقے میں... ہو ر آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل ادھر ہمارے بندے کام نہیں کر رہے ہیں۔ ادھر حویلی میں بھی صبح ہی واقعے کی خبر پہنچی ہے۔ میں یہی خبر سنانے کے لیے تو سرکار کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا، پر ان سے گل نہ ہو سکی... پر آپ کی گل سن کر تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ہم پر ہی شک کر رہے ہیں۔ یہ تو ڈی غلط گل ہے۔ آدی کو اپنے دوستوں پر تو بھروسہ کرنا چاہیے۔“ منشی فوراً معصوم بن کر اس کی تردید کرنے لگا۔

”بات شک کی نہیں ہے۔ پیر آیا اور اس کے قرب و جوار کے سارے علاقے میں کم لوگوں کا ہولڈ ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ براہ راست اگر اس واقعے میں تم ملوث نہیں بھی ہو تو بھی تمہیں کچھ نہ کچھ معلوم ضرور ہو گا۔ یہ تو میں یقین کر ہی نہیں سکتا کہ وہاں کچھ ہو اور تم لوگوں کو اس کی سن کن نہ ملی ہو۔“ ایس پی نے طنز اور سختی سے پھر پور لہجے میں منشی کو بار بار کروایا کہ وہ اس کے انجان ہونے پر قطعی یقین نہیں رکھتا۔

”اب ایسی بھی گل نہیں ہے ایس پی صاحب! اب وہ پہلے والی گل رہی ہی کدھر ہے؟ آپ کو تو خود یاد ہو گا کہ ابھی تھوڑے دن پہلے ادھر ڈیرے پر کوئی شخص آیا تھا اور ہمارے بندوں کو بے ہوش کر کے تہ خانے میں آگ لگا گیا تھا۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ساتھ یہ کارروائی کرنے والے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے... تو فی رات ہی صاحب کے معاملے کی ہمیں کیا خبر؟ آپ کے محکمے کے بندے صبح سے ادھر پہنچے ہوئے ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ کھوج لگائیں اے سی صاحب کا۔ اسماں نوں کچھ ملوم ہوا تو آپ کو بتا دیں گے۔“ منشی کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ قطعاً تعاون پر آمادہ نہیں ہے۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر ایس پی نے کال منقطع کر دی اور صورت حال بر غور کرنے لگا۔

شہریار کا اغوا اس کے لیے اتنی تشویشناک بات نہیں تھی جتنے چودھری کے بدلے ہوئے تیور اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ اس نے چودھری کا باجوه سے

بدلا ہوا روٹیہ بھی دیکھا تھا اور اس کے بعد باجوه کی اچانک موت بھی۔ بظاہر باجوه دل کے دورے سے جاں بحق ہوا تھا لیکن ایس پی کو یقین نہیں آیا تھا کہ یہ سچ ہے... اور وہ سچ کے سامنے آنے کا منتظر تھا۔ سچ کو جاننے کے لیے ہی اس نے ایک بار پھر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک خاص نمبر ڈائل کیا۔

”اچھا ہوا آپ نے خود کال کر لی تارڑ صاحب! میں آپ سے رابطہ کرنے ہی والا تھا۔ رات جو ڈیڈ یا ڈی آپ نے جھجوائی تھی، آپ کے حکم پر میں نے اس کا ایمر جنسی میں پوسٹ مارٹم کر ڈالا ہے اور پوسٹ مارٹم کے نتیجے میں بہت ہی حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے۔ مرنے والے کی موت آپ کے مطابق ہارٹ ایٹیک سے ہوئی تھی لیکن پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا ہے کہ اس شخص کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ایک ایسا زہر دے کر جس کے ظاہری اثرات دیکھ کر ڈاکٹرز یہی اندازہ لگا پاتے ہیں کہ مریض کو ہارٹ ایٹیک ہوا ہے اور اسی حساب سے ٹریسٹ بھی دیتے ہیں۔ نتیجتاً مریض کی موت واقع ہو جاتی ہے۔“ دوسری طرف موجود سرجن جو انکشافات کر رہا تھا، انہیں سن کر تارڑ زلزلے کی زد میں آ گیا تھا اور اس کے ذہن میں بجتی خطرے کی گھنٹی کسی دیوہیکل گھنٹے کی سی قوت سے بجنے لگی تھی۔

☆☆☆

”اباجی! ناراضگی جانے دیں نا... دیکھیں میں خود آپ کو منانے کے لیے آیا ہوں۔“ مراد شاہ، چودھری کے مقابلے بیٹھا اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنی بیوی شادیہ کی زبانی چودھری کی ناراضگی کا سبب بننے والے سارے قصے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں شادیہ کا کوئی قصور نہیں۔ اس بے چاری نے تو چودھری سے وہی کچھ کہا تھا جو اپنی بر حقیقت تھا۔ نیویارک میں قیام کے دوران مراد میں واقعی ایسی کئی تبدیلیاں آ گئی تھیں جو حویلی کے طرز زندگی سے میل نہ کھاتی تھیں۔ ان تبدیلیوں میں سے ہی ایک تبدیلی کھانے پینے کے معاملے میں نسبتاً سادگی اختیار کرنا بھی تھی جس کا اظہار شادیہ نے... جو کہ ایک اچھی مشرقی بیوی کی طرح شوہر کی پسند ناپسند میں ڈھل گئی تھی، چودھری کے سامنے کر دیا تھا اور چودھری کی تازک مزاجی اسے برداشت نہیں کر سکی تھی۔ مراد کو آفس سے واپس آنے کے بعد سارے واقعے کا علم ہوا تو اس نے چودھری کو منانے کے لیے اس کی تلاش شروع کر دی۔ وہ اپنے باپ کے مزاج سے آشنا تھے اس لیے اتنا اندازہ تو کر سکتا تھا کہ وہ کسی بڑے ہوٹل کا ہی رخ کرے

گا۔ اس نے اپنی تلاش کا آغاز انہی ہوٹلوں سے کیا اور بالآخر ایک ہوٹل کے ریسپشن سے اسے علم ہو گیا کہ چودھری افتخار عالم شاہ نامی شخص وہیں ایک سوئٹ میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اس وقت اس کی چودھری سے ملاقات ممکن نہیں ہو سکی۔ وہ ہوٹل انتظامیہ کو پہلے ہی ہدایت کر چکا تھا کہ بے حد تھکن کے باعث وہ رات کے وقت کسی سے ملاقات نہیں کر سکے گا، چنانچہ کسی ملاقاتی کی آمد یا ٹیلی فون کال کی صورت میں اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ تا چار مراد کو مایوس لوٹا پڑا اور دوسرے دن وہ صبح ہی صبح دوبارہ ہوٹل پہنچ گیا۔ اس بار اسے باپ کی طرف سے اذن یا ریائی مل گیا اور اب وہ اس کے سامنے بیٹھا اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چودھری سے بہت سے نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ چودھری اس کا باپ تھا اور وہ اس رشتے کو ہرگز بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”تو نہ آتا منانے۔ میں نے کیا تجھے پیغام بھیجا تھا کہ آکر مجھے منا؟“ چودھری اتنی آسانی سے رام ہو جانے والا بندہ ہوتا تو ذرا سی بات پر ناراض ہی کیوں ہوتا؟ مراد کی خوشامد کا دیکھ لےجے میں جواب دے کر وہ بے نیازی سے اپنی مونچھوں کو تڑپنے لگا۔

”کیسے نہ آتا اباجی! آپ میرے گھر سے ناراض ہو کر نکل گئے، یہ کوئی معمولی بات ہے کیا؟ میں کل سے اتنا بے چین ہوں۔ رات بھر نیند بھی ٹھیک طرح نہ آ سکی۔ شاہدہ بھی بڑی شرمندہ ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک بار کسی طرح ماموں کو منا کر لے آئیں پھر میں انہیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ اپنی کیفیت بتانے کے ساتھ مراد شاہ نے لگے ہاتھوں بیوی کا پیغام بھی پہنچا دیا۔

”نا تو وہ کیوں شرمندہ ہے؟ اس نے تو مجھے وہی کچھ بتایا تھا جو تو نے اسے سکھایا ہے۔ انقلابی بن گیا ہے نا تو۔ وڈی وڈی گلاں کرنے لگا ہے۔ اب ہمیں تجھ سے سیکھنا پڑے گا کہ کیسے رہیں؟ کیا کھائیں؟ کیا پہنیں؟ ہماری پرکھوں سے چلی آئی ریت رسموں کو تیرے جیسا کل کا منڈا غلط کہے گا اور ہم مان لیں گے؟“ چودھری کو موقع ملا تھا، وہ کیوں نہ جی بھر کر بیٹے کے لئے لیتا۔

”میں آپ سے یہ ساری بحث کرنے نہیں آیا ہوں اباجی! میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں اور اس وعدے پر کہ جب تک آپ یہاں رہیں گے، گھر میں وہی کچھ ہوگا جو آپ چاہیں گے اور جیسی آپ کی مرضی ہوگی۔“ وہ جانتا تھا کہ نظریاتی اعتبار سے اس کے اور اس کے باپ کے

درمیان مفاہمت ممکن نہیں اس لیے ایک بیٹے کی حیثیت سے ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔

”اچھا، میں سوچتا ہوں۔ ابھی تو چل، چل کر ذرا ناشتا کرتے ہیں۔“ چودھری نے اگرچہ اپنا لہجہ سخت ہی رکھا تھا لیکن پھر بھی مراد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ نرم پڑ گیا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے کمرے سے باہر نکلے اور لفٹ کے ذریعے نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ ان کے وہاں پہنچ کر میز منتخب کرتے ہی ایک ویٹرس خدمت میں حاضر ہو گئی۔ وہ ہوٹل جتنا خوب صورت اور لشکارے مارتا ہوا تھا، وہاں خدمت پر مامور عملہ بھی ویسا ہی تھا۔ ان سے ناشتے کا آرڈر لینے آنے والی ویٹرس بھی ہوٹل کے ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھی۔ وہ نہ صرف خوب صورت تھی بلکہ اس خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اپنی ملازمت کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ یقینی طور پر اتنے بڑے ہوٹل کی ملازمت کے لیے اسے خصوصی تربیت دی گئی ہوگی۔ پھر اس کا لباس بھی ایسا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ چودھری نے بھی اس کے حسن بے باک سے خوب آنکھیں سینکتے ہوئے اپنا آرڈر نوٹ کر دیا پھر مراد کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم بھی اپنی پسند کے ناشتے کا آرڈر نوٹ کروادو۔“

”میں صرف ایک کپ کافی اور سینڈویچ لوں گا۔“

باپ کے لیے چوڑے آرڈر کے مقابلے میں اس نے اپنی پسند بتائی۔

”یہ تو حال ہے تیرے کھانے بیٹے کا۔ تب ہی تو صحت نہیں رہی ہے۔ ادھر ویسے بھی کھانے کو کیا ملتا ہے، سوکھا سوکھا تو ہوتا ہے سب۔ کھانے پینے کا مزہ تو ادھر اپنے ملک میں آتا ہے۔ ناشتے میں سری، پائے، نہاری، آلیٹ شاملیت، پرائیوٹ کے ساتھ کھاتے ہیں تو سواد آ جاتا ہے۔ ادھر یہ جو سینڈویچ اور جوس شوس ہوتے ہیں، وہ تو ہم اپنے ہاں کھانے کے بعد چکھنے چکھنے کے لیے رکھتے ہیں۔ تو بھی شاہدہ سے کہہ کر گھر پر ذرا انگڑانا شتا بنوایا کرتا کہ کچھ باڈی شاڈی بنے۔“

چودھری نے بیٹے کی پسند پر تنقید کرتے ہوئے اسے نصیحت کی۔ مراد جو اچھا خاصا سرخ و سفید اور اسمارٹ نوجوان تھا، باپ کی نصیحت سن کر محض مسکرا کر رہ گیا۔ اب وہ اسے یہ کہہ کر کہ کھل کھل کر تباہے ڈول جسم صحت مندی کی علامت نہیں ہوتا بلکہ ایسا شخص کئی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے، ناراض کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ باپ کو منانے آیا تھا اس لیے حتی الامکان بحث سے گریز کارویہ اپنائے ہوئے تھا۔

”اگر آپ کو سہی پائے اور نہاری یاد آرہے ہیں تو

کوئی مسئلہ نہیں ہے اباجی! آپ میرے ساتھ گھر چلیں، میں دوپہر کے کھانے پر ان چیزوں کا انتظام کروادوں گا۔“

”باپ کو بچوں کی طرح لالچ دے کر پٹانے کی کوشش کر رہا ہے؟“ مراد کی بات سن کر چودھری نے کہا اور کھل کر ہنس پڑا۔ سب سے بڑی اولاد وہ بھی نرینہ ہونے کی وجہ سے مراد شروع ہی سے اسے بہت عزیز رہا تھا اور وہ اسے دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ ہی زیادہ رعایت دیتا تھا۔ اس بار بھی وہ زیادہ دیر اپنی ناراضگی برقرار نہیں رکھ سکا اور ہنس دیا تو مراد کو اطمینان ہو گیا۔ اس ہنسی نے طے کر دیا تھا کہ وہ اپنے خنجریلے باپ کو منانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

”آپ نے اپنا موبائل بھی آف کر رکھا ہے۔ میں اور شاہدہ کل سے سنتی بار آپ کا نمبر ملا کر دیکھ چکے ہیں لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ گاؤں سے فنی اللہ رکھا کا بھی فون آیا تھا میرے پاس۔ وہ بھی پریشان ہو رہا تھا کہ چودھری صاحب کا فون کیوں بند ہے؟ میرے خیال میں اس کو آپ سے کوئی ضروری کام ہوگا۔“ مطلع صاف ہوا تو مراد نے اس سے دوسری گفتگو چھیڑ دی۔

”موبائل میں نے جان کر آف کیا تھا۔ مجھے ملوم تھا کہ تو سب سے پہلے مجھے فون کرنے کی ہی کوشش کرے گا، پر میں اتنی آسانی سے تیرے ہتھ تھوڑی آنے والا تھا۔“ چودھری نے فخر سے اپنا کارنامہ بتایا۔

”ڈھونڈ تو میں نے آپ کو پھر بھی لیا۔ کل رات ہی میں یہاں پہنچ گیا تھا لیکن آپ آرڈر دے کر سوئے تھے کہ کسی کو آپ کے کمرے تک نہ آنے دیا جائے، نہ ہی فون پر بات کروائی جائے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں رات ہی آپ کو واپس لے جاتا۔“ مراد نے جواباً اپنا کارنامہ بیان کیا۔

”میں ملوم تھا کہ تو مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ آخر میرا پتر ہے۔ تیری ذہانت میں مجھے کوئی شبہ تھوڑی ہے اسی لیے پہلے ہی سے سارا بندوبست کر کے سویا تھا۔“ چودھری شرارت سے مسکرایا۔ وقت کے اس لمحے میں وہ ایک بالکل مختلف آدمی لگ رہا تھا جس کی ساری سخت گیری اور سفاکی کہیں گم ہو گئی تھی اور وہ صرف اور صرف ایک جوان بیٹے کا محبت کرنے والا باپ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر قدرت کے اس اصول پر یقین آتا تھا کہ اللہ نے ہر انسان کے اندر خیر و شر دونوں جذبوں کو رکھا ہے۔ محبت و نفرت، سختی و نرمی، سفاکی و رحم دلی ہر دو متضاد پہلو انسان کے اندر ہوتے ہیں، بس یہ انسان پر ہوتا ہے کہ وہ کس جذبے کو ابھار کر سامنے لائے اور کس کو دبا

ایک روز عورت جب الفاظ ہزارا اسٹیج آپ کہنا کر سے اگے ہو۔ نام بڑھنے دو تیرے سے کیوں کا

دے۔ چودھری نے بھی اپنے اندر موجود ہر مثبت جذبہ کو دبا کر منفی خوبیوں کو اتنی شدت سے پروان چڑھایا تھا کہ اب مشکل سے ہی کبھی کسی مثبت جذبے کی جھلک نظر آتی تھی۔

”اب تو آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے نا... اب آپ میرے ساتھ ٹھہریں۔“ باپ کا اچھا موڈ دیکھ کر مراد شاہ نے بھی ذرا لاڈ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مطلب کی بات کی۔ ”تو اتنی ضد کر رہا ہے تو چلتا ہوں۔“ آخر کار چودھری نے بھی ہامی بھری لی۔

ناٹتے سے فارغ ہو کر وہ ڈائننگ ہال سے باہر نکلے۔ ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ مراد اوپر کمرے میں جا کر چودھری کا سامان لے آئے گا اور چودھری اس دوران لاؤنج میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گا۔ پروگرام کے مطابق مراد نے جیسے ہی اوپر کمرے میں جانے کے لیے لفٹ میں قدم رکھا، چودھری کی نظر حشر سامان لینڈا پر پڑی۔ وہ کل ہی کی طرح مٹی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اسکرٹ کی بے حد مختصر لمبائی اور اونچی ایڑی کی سینڈل نے اس کی سڈول ٹانگوں کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ کل کی طرح آج بھی چودھری اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

”اچھا ہوا کہ آپ مجھے یہیں مل گئے چودھری صاحب! میں آپ ہی سے ملنے آئی تھی لیکن آپ کا روم نمبر میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔“ چودھری کو دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اپنی سرسبلی آواز میں کہا۔

”یہ تو میری خوش قسمتی ہے سنی کہ تم مجھ سے ملنے یہاں تک آئی ہو، ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ تم سے دوبارہ ملاقات کے لیے ڈیوڈ سے رابطہ کرنا پڑے گا۔“ چودھری نے بھی جوابی خوشی کا اظہار کیا۔

”میں صرف آپ سے ملنے نہیں آئی ہوں۔ آج کا سارا دن میں آپ کے ساتھ گزاروں گی اور آپ کو نیویارک دکھاؤں گی۔ آئی ہو پ کہ آپ میری کمپنی کو ضرور انجوائے کریں گے۔“

”وہ تو لازم ہے۔ کون ایسا ناشکرا ہوگا جو تم جیسی حسینہ کی کمپنی انجوائے نہ کرے۔“ چودھری کی باچھیں لینڈا کا پروگرام سن کر کانوں تک چر گئیں۔ لینڈا کو سامنے پا کر وہ یہ تک فراموش کر چکا تھا کہ مراد بھی اسی ہوٹل میں موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ جانے کا وعدہ کر چکا ہے۔

”تو پھر چلیں... ابھی نکل پڑتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے لبرٹی آئی لینڈ چلیں گے اور وہاں اسٹیجو آف لبرٹی کے سامنے ڈیہر سارے فوٹو گرافس بنوائیں گے۔ میں ساری

تیاری کے ساتھ آئی ہوں۔ آپ کا اس بار کا نیویارک کا ٹرپ یادگار نہ بنا دیا تو میرا نام بھی لینڈا نہیں۔“ پُر جوش لہجے میں کہتے ہوئے اس نے چودھری کا بازو تھام لیا۔

”اس کا تو مجھے بھی یقین ہے کہ تمہارے ساتھ نیویارک گھومنے کا مزہ ہی الگ ہوگا، بس یہ ڈر ہے کہ اسٹیجو آف لبرٹی تمہارے سامنے پھیکا نہ پڑ جائے۔“ چودھری نے وارنسی کا مظاہرہ کیا۔

”اوہ... چودھری صاحب! آپ تو مجھے بناتے لگے۔“ لینڈا اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنسی اور خالص امریکن اسٹائل میں اس کے گھٹے کا ہارن گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مراد شاہ ایک سروس بوائے سے چودھری کا سامان اٹھوائے وہاں پہنچا۔ دونوں باپ بیٹے کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو مراد نے فوراً ہی رخ موڑ لیا۔

”ایکسیکوزی لینڈا! میں ابھی آتا ہوں۔“ چودھری لینڈا کو خود سے دور کر کے فوراً مراد کی طرف بڑھا۔

”تو میرا سامان اپنے ساتھ لے کر اپنے اپارٹمنٹ چلا جا پتر! میں فارغ ہو کر آپ وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ وہ شرمندہ تو خیر نہیں تھا لیکن بیٹے کے چہرے پر موجود ناپسندیدگی کے تاثرات دیکھ کر ذرا دھیمی آواز میں اس سے بولا۔

”ٹھیک ہے اباجی! میں چلتا ہوں۔“ مراد نے آہستگی سے جواب دے کر اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے باپ کو کتنی حسین مصروفیت میسر آگئی ہے اس لیے اس کے جلد فارغ ہونے کے امکان کو قطعی ناممکن تصور کرتا ہوا وہاں سے فوری طور پر رخصت ہو گیا۔

”بیٹا تمہارا... مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔“ مراد کے رخصت ہونے کے بعد چودھری پلٹ کر لینڈا کی طرف آیا تو اسے بتانے لگا۔

”بڑا ہینڈ سم مین ہے۔ لگتا ہے آپ پر گیا ہے۔“ لینڈا نے فوراً ریمارکس پاس کیے تو چودھری فخر سے مسکراتے لگا۔ ہنستے مسکراتے وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوٹل سے باہر نکلے۔ پارکنگ میں لینڈا کی گاڑی موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس نے گاڑی اشارٹ کی اور پھر چند لمحوں بعد وہ نیویارک کے بے پناہ ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہو گئے۔

”اطلاع ملی ہے کہ اسٹینٹ کمشنر شہر یار عادل کو... کڈنیپ کر لیا گیا ہے۔ کل رات وہ فاریسٹ آفیسر عابد انصاری سے ملاقات کر کے واپس آ رہا تھا، اس وقت یہ واقعہ پیش آیا۔ کڈنیپنگ کو کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود پولیس ابھی تک کچھ

نہیں کر سکی ہے۔ خیال ہے کہ اسے کڈنیپ کر کے گھنے جنگل میں کہیں کسی خفیہ ٹھکانے پر رکھا گیا ہے۔ آئی جی مختار مراد اس صورت حال پر سخت چراغ پا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح جنگل میں سرچ آپریشن شروع کر دیا جائے۔ وہ تھوڑا سا ہی آگے بڑھے تھے کہ لنڈا نے مہارت سے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

”اوہ شٹ! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ میرے بندے مجھے اس بات کی اطلاع دینے کے لیے فون کر رہے ہوں گے لیکن میں نے اپنا موبائل بند کیا ہوا ہے اس لیے ابھی تک مجھے تک یہ خبر نہیں پہنچی۔“ لنڈا کی فراہم کردہ معلومات پر چودھری نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا موبائل جیب سے نکالا اور اسے آن کیا۔ اپنی اس مصروفیت میں اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ لنڈا اس کے چہرے کے تاثرات کا بہ غور جائزہ لے رہی ہے۔

”یہ کام آپ کے حکم پر ہوا ہے نا چودھری صاحب؟“ اس نے سوال کیا تو چودھری چونکا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ یہ کارروائی آپ ہی کے بندوں نے کی ہے۔ آپ شہریار سے بڑی طرح خار کھائے ہوئے ہیں اور پہلے بھی ایک بار اسے ڈاکٹر ماریا کے ذریعے ٹریپ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی چال سے بچ گیا تھا، چنانچہ اب آپ اسے اغوا کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کا یہ عمل ہمارے مقاصد میں نہیں ہے۔ اس حرکت سے ہمارے پروجیکٹ کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔“ چودھری ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ لنڈا کے سوال کا جواب ہاں میں دے پانے میں کہ اس نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ اس کے لہجے کا یقین اتنا گہرا تھا کہ چودھری چاہنے کے باوجود کسی بات سے انکار نہیں کر سکا۔

”جنگل میں سرچ آپریشن شروع ہونے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟ ایک بار اگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے قدم ان راستوں پر اٹھ گئے تو پھر انہیں ہمیشہ کے لیے راہ مل جائے گی اور ہمارا وہاں پوست کاشت کرنے کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ ہم اس پروجیکٹ پر اچھا خاصا کام کر چکے ہیں اور ہم بھی ٹھیک ٹھاک لگ گئی ہے۔ اس سے پیچھے ہٹنے کا مطلب ہوگا، ویسٹ آف ٹائم اینڈ منی اور یہ قابل برداشت نہیں۔ ویسے بھی آپ کو اب اس اے سی کو اغوا کروانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ وہ لڑکی ماہ بانو ہم نے آپ کو فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اور لکڑی و کھالوں کے بزنس کا بھی بہتر متبادل آپ کے سامنے ہے۔ اس صورت حال میں اے سی شہریار کو چھیڑنا سوائے حماقت کے کچھ نہیں کہا

جاسکتا۔“ سر۔ جی آواز میں بات کرنے والی لنڈا کے لہجے میں اس وقت خاصی تلخی تھی اور چہرے کے تاثرات میں بھی سختی کا عنصر نمایاں تھا۔

”آئی ایم سوسوری ہنی! یہ سب ایک ذرا سی غفلت کی وجہ سے ہو گیا ورنہ میں نے خود بھی یہ بات سمجھ لی تھی کہ اب شہریار کے اغوا کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں ابھی اپنے بندوں کو فون کر کے شہریار کی رہائی کا حکم دے دیتا ہوں۔ ابھی اتنا زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ پاکستان میں اس وقت لگ بھگ شام کے چھ ساڑھے چھ بجے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں شہریار کو واپس بھیج دیا جائے تو کہیں کچھ نہیں ہوگا۔ سرچ آپریشن کی طرف سے بھی زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ ہمارے ہاں ایسے کام اتنی آسانی سے شروع نہیں ہوتے۔ شہریار واپس پہنچ گیا تو یہ معاملہ بالکل دب جائے گا۔“ یہ یقیناً لنڈا کا رعب حسن تھا جو چودھری جیسا بندہ زندگی میں پہلی بار کسی سے معافی طلب کر رہا تھا۔ لنڈا نے اس کی ساری وضاحت بے تاثر چہرے کے ساتھ سنی اور خاموشی سے اسے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”ہاں شٹی... گل سن، بالا کدھر ہے؟ اس سے بول کہ شہریار کو فوراً آزاد کر دے۔“ رابطہ قائم ہوتے ہی وہ انگریزی ترک کر کے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بات کرنے لگا۔ ”میں کہہ دوں گا سرکار، پر آپ بتائیں کہ آپ کدھر ہیں؟ کل سے میں آپ سے گل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ادھر ایس بی نے بھی آپ کا کچھ پچھ کے میری جان کھا لی ہوئی ہے۔ وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح مجھ سے اگلا لے، اے سی کا اغوا ہمارے ہی بندوں نے کیا ہے لیکن میں نے بھی پٹھے پر ہتھ نہیں رکھتے دیا اسے۔“ چودھری کو اطلاع فراہم کرتے ہوئے شٹی نے اپنا کارنامہ بھی فخر سے بیان کیا۔

”ایس بی کو رہن دے اس سے تو بعد میں، میں آپ نمٹ لوں گا... تو بس کسی طرح اپنی زبان نہ کھولنا۔ اور ہاں، بالے کو بولنا کہ آزاد کرنے سے پہلے اے سی کی چنگی طرح پھینٹی شٹی ضرور لگا دے۔ وہ ہمارا مہمان رہے اور بغیر خاطر مدارت کے واپس چلا جائے یہ تو کوئی چنگی گل نہیں ہے نا۔“ جی چودھری صاحب! وڈی چنگی طرح اس کی خاطر مدارت ہو جائے گی۔ کوئی اور خدمت ہو تو وہ بھی آپ مینوں دس دیں۔“ شٹی نے اپنے ازلی خوشامدانہ لہجے میں دریافت کیا۔

”ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ میرا موبائل اب کھلا رہے گا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو مینوں فون کر دینا۔“ چودھری نے شٹی کو حکم دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور مسکراتا ہوا لنڈا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”لو ہنی! تمہاری پراہم سولو ہو گئی۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں خبر مل جائے گی کہ شہریار واپس اپنے بنگلے پر پہنچ گیا ہے۔“ ”یہی ہم سب کے حق میں بہتر رہے گا۔“ لنڈا نے ہنوز سنجیدہ رہتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ چودھری کی ٹیلی فونک گفتگو کے دوران وہ نہایت خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی رہی تھی۔

”اوہ کم آن ہنی! اب تو اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ اگر تم اسی طرح موڈ آف رکھو گی تو ہم کیا خاک انجوائے کر سکیں گے؟“ چودھری نے اس کے شانوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے منانے کی سعی کی۔ حیرت انگیز طور پر لنڈا نے اپنا موڈ فوراً ہی بحال کر لیا اور کھل کر مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ چودھری کے لیے اس نظارے سے بڑھ کر خوب صورت تھی جو لبرٹی آئی لینڈ کی طرف فیری میں سفر کرتے ہوئے سمندر کے پانی میں نیویارک شہر کی روشنیاں پڑنے سے ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چودھری قدرت کی صنائی میں سے صرف ایک شے کو سراہنے کا قائل تھا اور وہ شے تھی عورت... جسے سراہنے کے لیے وہ اسے برتنا ضروری سمجھتا تھا اور لنڈا تو تھی ہی ایسی زوردار عورت جسے ایک بار برتنے کے بعد چودھری کے اندر اس کے قرب کی طلب مزید بھڑک گئی تھی۔

☆☆☆

شہریار کو اس قید میں کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ تقریباً منقطع ہونے کے باوجود وہ ساعی مشاہدے کی بنیاد پر دن کے مختلف پہروں کے بارے میں اندازہ قائم کر رہا تھا۔ جس وقت وہ بے ہوشی سے جاگا تھا، اس وقت پرندوں کی چہچہاہٹ نے اسے وقت صبح کے بارے میں مطلع کیا تھا۔ دن آہستہ آہستہ گزر کر شام کے سلاہوں کی آغوش میں آیا تو بھی اس کی قوت سماعت نے اسے مطلع کر دیا۔ کمرے کی دیواروں اور دروازے کے درمیان کوئی درزن نہ ہونے کے باعث بھری رابطہ تو تھا ہی منقطع... بات چیت پر بھی باہر موجود فرد یا افراد میں سے کوئی آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اتنا طویل وقت گزر جانے کے باوجود کسی نے اس سے کھانے کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا۔ حوائج ضروریہ کا بھی یہی عالم تھا۔ اس سلسلے میں اسے خود پر کڑا ضبط کرنا پڑ رہا تھا۔ ورنہ دوسری صورت یہی تھی کہ وہ اس مختصر کمرے کے ہی کسی کونے کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا۔ اس کی نفاست پسند

طبیعت کو یہ بات گوارا نہیں تھی اس لیے اب تک ضبط سے ہی کام لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ پیاس محسوس ہونے پر بھی اس نے کونے میں رکھی صراحی سے دو بار چند قطرے ہی حلق کو تر کرنے کے لیے اپنے منہ میں پٹکائے تھے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کسی بھی لمحے اس فطری ضرورت کے آگے ہار مانتی پڑے گی۔ ہار ماننے سے قبل اس نے مناسب سمجھا کہ ایک کوشش اور کر دیکھے۔ شاید باہر موجود افراد اس کی درخواست پر کان دھریں۔ اسی خیال کے تحت وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

”کوئی ہے؟ پلیز! دروازہ کھولو۔ میں حاجت محسوس کر رہا ہوں۔“ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر زوردار دنگ دی اور بلند آواز میں بولا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہاں اس کی بات سننے والا کوئی موجود ہی نہ ہو لیکن پھر پل بھر کے توقف کے بعد دروازے کے قریب آہٹیں ابھریں۔ ان آہٹوں کو سن کر اس کے دل میں امید کی لہر جاگی اور باہر موجود افراد پر مزید زور ڈالنے کے لیے اس نے ایک بار پھر دروازے کو بجایا۔ رد عمل میں دروازہ اتنی تیزی سے کھولا گیا کہ اس کو پیچھے ہٹنے کا موقع بھی نہیں ملا اور دروازے کا پیٹ پوری قوت سے اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ وہ اچانک لگنے والے اس جھکے کو سہار نہیں سکا اور لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا۔ اس اثنا میں دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے تھے اور انہوں نے اپنے چہرے نقاب کے پیچھے چھپائے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے بے یک وقت اپنے ہاتھوں میں موجود ڈنڈوں سے شہریار پر حملہ کر دیا۔ وہ جو گرنے کے بعد سنبھل نہیں سکا تھا، اس اچانک حملے سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکا اور دونوں ڈنڈے پوری قوت سے اس کے جسم پر پڑے۔ ڈنڈوں سے لگنے والی چوٹوں نے اسے بلبلاتا کر رکھ دیا اور وہ تڑپ کر اپنے بچاؤ کے لیے سیدھا ہوا۔ اس دوران حملہ آور دوسرا وار کر چکے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کے ڈنڈے کو اپنے دائیں ہاتھ پر روکا اور دوسرے کو روکنے کے لیے بائیں ہاتھ پھیلا یا لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور دوسرے حملہ آور کا ڈنڈا پوری قوت سے اس کے بائیں بازو پر آ کر لگا۔ اس چوٹ نے اسے مزید جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا اور پنا کچھ سوچے سمجھے اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اس شخص کو دے ماریں۔ اس کے حملے کے زور سے وہ شخص پیچھے کی طرف الٹا اور مختصر کمرے میں رکھی صراحی سے جا کر ٹکرایا۔ صراحی فرش سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ صراحی میں موجود پانی کمرے

کے نیم پختہ فرش پر پھیل گیا۔

اس سارے عمل کے دوران پہلے ڈنڈا بردار نے اپنے حواس قائم رکھے تھے، چنانچہ اس نے بلا توقف ہاتھ چلایا اور ڈنڈے کی زوردار ضرب شہریار کی ٹانگوں پر لگائی۔ ضرب کھا کر شہریار نے خود کو سنبھال کر اس شخص کو اس چوٹ کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن کمرے کی محدود چار دیواری اس کے تیزی سے حرکت کرنے میں مانع تھی۔ وہ جب تک سنبھل کر سیدھا کھڑا ہوا، حملہ آور اس پر دوسرا وار کر چکا تھا۔ اس بار اس نے شہریار کی کمر کو نشانہ بنایا تھا۔ کمر پر یہ چوٹ کھانے کے بعد شہریار نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اس شخص کے منہ پر ایک زوردار ٹھونسا رسید کیا لیکن اس دوران اس کا صراحی پر گرنے والا ساٹھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنے ڈنڈے سے شہریار پر حملہ کر دیا اور اس کے سر پر ضرب لگائی۔ سر پر لگنے والی یہ ضرب ایسی تھی کہ وہ چکر اٹھا اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ دونوں پے در پے اسے ضربیں لگاتے چلے گئے۔ اس کا جسم جو فطری تقاضے پورے نہ ہو سکے کی وجہ سے پہلے ہی کچھ نڈھال سا ہو رہا تھا، زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکا اور اگلے چھ سات منٹ میں ہی اس کے حواسوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تکلیف دیتے جسم کی ٹیسوں کے ذریعے اپنے ذہن میں پورے واقعے کو دہراتے ہوئے اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کمر مختصر لیکن صاف ستھرا تھا اور اپنے ساتھ سامان سے کسی اسپتال کا حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اس کمرے کے لیے اپنے ذہن میں آشنائی محسوس کی۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی یادداشت پر زور دیتا، کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کے مخصوص گیٹ اپ میں ایک شخص اندر داخل ہوا۔ شہریار نے اس شخص کو فوراً شناخت کر لیا۔ وہ پیر آباد کے مرکز صحت میں ڈیوٹی دینے والا میل ڈاکٹر داور تھا۔

”آپ آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں سر؟“ شہریار کو ہوش میں دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا جس کے جواب میں شہریار اپنے سر کو محض ایک اثباتی جنبش ہی دے سکا۔

”پولیس کے جوان بے ہوشی کی حالت میں آپ کو اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ دو لڑکے جنگل سے اپنی بکریاں چرا کر واپس آرہے تھے تو انہوں نے آپ کو راستے میں بے ہوش پڑا ہوا دیکھا۔ اتفاق سے ان لڑکوں کی ایک بکری کھو گئی تھی جس کی تلاش میں انہیں واپس لوٹنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ انہوں نے آپ کو بے ہوش پڑا ہوا پایا اور پہچان گئے کہ آپ اے سی

شہریار عادل ہیں۔ گاؤں میں آپ کی مستقل آمد و رفت کی وجہ سے یہاں کے کافی لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ پھر آپ کے اغوا اور پولیس کی تلاش میں متحرک ہونے سے بھی لوگ واقف ہو گئے تھے اس لیے ان لڑکوں کو آپ کو شناخت کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ انہوں نے فوراً ہی پولیس والوں کو اطلاع دی اور وہ لوگ آپ کو اپنی گاڑی میں یہاں لے آئے تاکہ ابتدائی طبی امداد دی جاسکے۔ آپ کا سر پھٹ گیا تھا اور جسم کے چند اور مقامات پر بھی ایسی چوٹیں لگی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ آپ کا خون آلود چہرہ اور لباس دیکھ کر ہم لوگ تشویش میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں سیریس معاملہ نہ ہو... لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر ماریا نے مل کر آپ کو ٹریمنٹ دیا تو فوری طور پر آپ کی حالت سنبھل گئی۔ اب بھی میں نے ڈرپ میں پین کمر شامل کر دیا ہے، امید ہے کہ آپ اپنی چوٹوں میں بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔“ اس کے سوال کرنے سے قبل ڈاکٹر داور نے از خود اسے تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

”آپ لوگوں نے میرے آفس فون کر کے میرے ملنے کی خبر دے دی ہے یا نہیں؟“ دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے اس سے دریافت کیا۔

”یہ سر! وہاں اطلاع پہنچ چکی ہے۔ آپ کے پی اے عبدالمنان صاحب نے کہا ہے کہ وہ خود یہاں تشریف لارہے ہیں۔ ان کے علاوہ ایس ٹی معتمد تارڑ نے بھی اپنے آنے کی اطلاع دی ہے۔ یہاں موجود پولیس فورس کو لیڈ کرنے والے آفیسر نے اصرار کیا تھا کہ آپ کو نوکروٹ کے اسپتال میں شفٹ کر دیا جائے لیکن میں نے اور ڈاکٹر ماریا نے اسے یقین دہانی کروائی کہ آپ کی حالت بہتر ہے اور کوئی تشویش ناک بات نہیں۔“ ڈاکٹر داور شاید زیادہ گفتگو کرنے کا عادی شخص تھا جو ہر بات کو نہایت تفصیل سے بیان کر رہا تھا۔

”تھینک یو ڈاکٹر! اب آپ ایسا کریں کہ اس پولیس آفیسر کو میرے پاس بھیج دیں۔“ بیڈ کی پشت سے سرٹکا کر اس نے قدرے نیم دراز ہوتے ہوئے ڈاکٹر کو ہدایت دی۔ اس ذرا سی حرکت کو کرنے میں ہی اس کے جسم کے جوڑ جوڑنے جس طرح احتجاج کیا تھا، اس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مارنے والوں نے خوب دل کھول کر پٹائی لگائی ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی بھی چوٹ خطرناک ثابت نہ ہو۔ شاید وہ لوگ اسے محض وارننگ دیتا چاہتے تھے کہ بچو، سدھر جاؤ ورنہ نتیجہ اس سے بھی زیادہ برا نکل سکتا ہے۔

”پولیس آفیسر کو بعد میں کال کیجیے گا، پہلے یہ سوچ لیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے گرم گرم بنا کر لائی ہوں۔ پولیس آفیسر کو اندر بلا لیا تو اسے بیان ریکارڈ کرانے میں یہ سوچ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر داور کے اس کی ہدایت پر عمل کرنے سے پہلے ڈاکٹر ماریا ایک ٹرے میں بھاپ اڑاتا ہوا سوپ کا پیالہ رکھے اندر داخل ہوئی اور اس سے یولی۔ اسے سوپ کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھ کر شہریار کو کچھ آگیا کہ وہ کیوں یہاں سے غائب تھی، ورنہ اس کی جیسی نیچر تھی اس سے تو یہی امید کی جاسکتی تھی کہ وہ شہریار کے ہوش میں آنے تک اس کے پاس ہی موجود رہتی۔

”تھینک یو ڈاکٹر! میں واقعی اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔“ شہریار نے خوش دلی سے اس کی بات کا جواب دے کر ایک طرح سے اس کی تائید کر دی۔ ویسے سوپ کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے پیٹ کے چوہوں کو بوری طرح جگادیا تھا اور اسے یاد آنے لگا تھا کہ اسے پیٹ میں کچھ ڈالے

ہوئے چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔

”ویل مر! آپ سوپ پیئیں میں پندرہ منٹ بعد پولیس آفیسر کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔“ ڈاکٹر داور کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر ماریا نے اس کے سینے پر ٹینکین پھیلایا اور خود بیڈ پر اس کے بائیں جانب بیٹھ گئی۔

”چلیں، اب اچھے بچوں کی طرح منہ کھولیں اور یہ سوپ پی لیں۔“ باؤل میں سے چمچ میں سوپ بھر کر اس نے شہریار کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ ایک ڈاکٹر کا یہ خالصتاً گھریلو عورت والا انداز اسے اچھا لگا تھا۔

”اتنی چوبیس کھا کر بھی آپ مسکراتے ہیں... بڑے بہادر ہیں۔“ ڈاکٹر ماریا نے اسے سراہا۔

”آپ جیسا تیار وار میسر آجائے تو پیار کے چہرے پر تو خود بہ خود ہی رونق و مسکراہٹ آ جاتی ہے... لیکن آپ یہ نہ

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

280/- انسان اور دیوتا

یہ ناول سامراج کے علم و برتری کی حدوں پر مبنی داستان ہے جس نے اچھوتوں کو راول و اختیار کرتے ہوئے رکھا

160/- پاکستان سے دیوار جرم تک

تاریخی ناول جس میں کشمیر کے ایک ایک رشتہ دار کا

325/- آخری چٹان

سید خورشید جمال الدین بخاری کی داستان شہادت و شہ

150/- سو سال بعد

گاندھی جی کی جہانگیریت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے

225/- سفید جزیرہ

بھارت کشمیر کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

325/- شاہین

اندلس میں مسلمانوں کے غلبہ و فراوانی کی کہانی

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

325/- معتمد علی

لاہور کا تاریخی اسلام دشمنی، میر جعفر کی شہادت، بنگال کی

350/- خاک اور خون

سکسٹی، تاریخی انسانیت، قیامت، خیر منظر،

300/- کلیسا اور آگ

فریجی جزیرہ کی عمارت، مسلمان سپہ سالاروں کی تاریخی،

350/- قافلہ حجاز

راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

300/- محمد بن قاسم

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرہ کی تاریخی داستان، جس

180/- پورس کے ہاتھی

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں ناول اور ہر مہم

کے سامراجی، تاریخی، داستان، جن میں ہر کا

350/- اور تلواریٹ گئی

شیر مور (شیخ سلطان شہید) کی داستان شجاعت،

350/- گمشدہ قافلہ

آخری کی اسلام دشمنی، عیسائی کی حدوں پر مبنی داستان

200/- داستان مجاہد

فریجی جزیرہ کی عمارت، مسلمان سپہ سالاروں کی تاریخی،

325/- پروسی و رخت

اسلام دشمنی، تاریخی داستان، جس میں ہر کا

325/- یوسف بن تاشفین

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے کام و مصائب کی

325/-

تاریخ راتوں میں امید کی قندیں بٹکنے والے

کشمیر کی داستان

350/- آخری معرکہ

سلاطین کے بے دست و پاؤں کی باری آتی تو ہندو

325/-

150/-

380/-

325/-

150/-

325/-

380/-

325/-

380/-

325/-

380/-

جہانگیر بک ڈیو

سمجھے گا کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔“ اس نے مرزا غالب کے شعر کو نثری پیرائے میں استعمال کرتے ہوئے ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا اور اس کے بڑھائے ہوئے چہرے سے سوپ لی لیا۔ دائیں ہاتھ میں جسم کو گلو کو زفر اہم کرنے والی سوئی جیسے ہونے کی وجہ سے وہ خود سے سوپ پینے کے لائق تھا بھی نہیں۔

”ڈاکٹر سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ بیمار کا حال کیسا ہے؟ ہم آپ کے ہوش میں آنے کا ٹھیک ٹھاک حساب لگا سکتے ہیں تو یہ کیسے نہیں جانیں گے کہ ابھی آپ کا حال اتنا خراب ہے کہ اگلے ہی دن تک بیڈ ریٹ کریں گے، تب ہی کہیں جا کر بہتر ہوں گے۔ مارنے والوں نے آپ کو بڑی احتیاط سے مگر دل کھول کر مارا ہے۔ ویسے باقی داوے آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ کون لوگ تھے؟“ اسے سوپ پلانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے شوخ لہجے میں بات کرتے کرتے اچانک سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”معلوم تو نہیں بس اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ اس واقعے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ اس نے اتنا لمبا ڈراما رچانے کے بعد اتنی آسانی سے مجھے چھوڑ کیسے دیا؟ ورنہ میں نے تو اغوا ہونے کے بعد یہی سوچا تھا کہ اب وہ مجھ سے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کرے گا۔“ اس نے مبہم اور پُر سوچ انداز میں ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا۔

”آپ کا اشارہ چودھری افتخار عالم کی طرف ہے نا؟“ ڈاکٹر ماریا نے اس سے پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہا لیکن یہ خاموشی خود اعلان کر رہی تھی کہ ڈاکٹر ماریا کا اندازہ درست ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر ماریا نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور چپ چاپ اسے باؤل میں موجود سوپ پلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمینکس فار دس ڈیٹینکس سوپ ڈاکٹر!“ شہر یار نے اس سے کہا۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ ”میں کم ان۔“ شہر یار نے دستک کا جواب دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور عبدالمنان کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایس پی معظم ہارڈ بھی موجود تھا۔

”آریو اوکے سر؟“ عبدالمنان نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی بے تابی سے پوچھا۔ اس کے چہرے کی جھلک اور آنکھوں کی سرخی سے ظاہر تھا کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے بالکل بھی آرام نہیں کر سکا ہے۔

”نہیں، آئی ایم پریٹیکللی اوکے۔ یو ڈونٹ وری۔“ اس کی

کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے شہر یار نے مسکرا کر اسے سلی دی۔ ”آئی جی صاحب آپ کے لیے بہت زیادہ پریشان تھے۔ انہیں آپ کی واپسی کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ جب ہوش میں آجائیں تو ان کی آپ سے بات کروادی جائے۔ انہوں نے آپ کو علاج کے لیے لاہور شفٹ کرنے پر بھی زور دیا تھا۔“ عبدالمنان نے اسے مختار مرادی بابت آگاہ کیا۔

”ان سے میں بات کر لوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میری گاڑی کے ڈرائیور کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“ کمرے میں ایس پی کی موجودگی کو نظر انداز کیے وہ مسلسل عبدالمنان سے مصروف گفتگو تھا۔

”ڈرائیور بے چارہ تو ختم ہو گیا۔ آپ کی گاڑی فوری طور پر دریافت نہیں کی جاسکتی تھی، چنانچہ زخمی ڈرائیور کو کسی قسم کی طبی امداد نہیں مل سکی۔ وہ کسی مدد کے پہنچنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔“ عبدالمنان نے افسردگی سے بتایا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اغوا کاروں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ڈرائیور کے زندہ بچ جانے کا کوئی امکان نہیں پھر بھی وہ دل سے خواہاں تھا کہ کسی طرح اس غریب کی زندگی بچ جائے لیکن اس کی خواہش نے طے شدہ فیصلے کو نہیں ٹالا تھا۔

”آپ ہمیں تو عے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیں سر! اچانک یہ سب کیوں اور کیسے ہوا، کسی کی سمجھ نہیں آیا۔ آپ کی گاڑی اور ڈرائیور کی لاش کو ویرانے میں پا کر ہم صرف یہی اندازہ لگا سکے تھے کہ آپ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ پولیس فورس کے جوان آپ کو تلاش کرتے رہے۔ آئی جی صاحب نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اگر چوبیس گھنٹوں کے اندر آپ کو تلاش نہیں کیا جاسکا تو وہ جنگل میں سرچ آپریشن شروع کر وادیں گے لیکن اس سے قبل ہی آپ ہمیں مل گئے۔ آپ کا اغوا ہمارے لیے جتنی حیرت کی بات تھی، اس طرح واپسی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک ہے۔ ورنہ میرا تو آئیڈیا تھا کہ اغوا کار آپ کے بدلے میں کسی قسم کے مطالبات کر کے ہم سے سودے بازی کی کوشش کریں گے۔“ افسردگی بھرے ان لمحات میں اس کی اور عبدالمنان کی گفتگو میں ذرا تھقل آیا تو ایس پی نے از خود اس سے گفتگو چھیڑ دی۔

”میں تھوڑی دیر بعد آپ کے آدی کو اپنا بیان ریکارڈ کرادوں گا۔ فی الحال تو میرے سر میں شدید درد ہے اس لیے میں زیادہ بول نہیں سکتا۔“ اس نے قدرے روکھے لہجے میں ایس پی کی بات کا جواب دیا۔ ڈرائیور کی موت نے اس کے دل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ غریب صرف اس وجہ سے مارا

گیا تھا کہ اسے شہر یار عادل کی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی کسی سے دشمنی تھی، نہ ہی وہ کسی قسم کے لینے دینے میں تھا۔ وہ تو بس اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا لیکن اپنی غرض اور انا میں مبتلا افراد کو کیا مطلب تھا کہ ان کی سفاکی نے کسی غریب خاندان سے اس کا سہارا چھین لیا ہے۔ ایس پی کو چودھری کے گروپ کے بندے کی حیثیت سے وہ اس جرم میں برابر کا شریک سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے اس وقت سچ لہجے میں بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”ایز یو دس سرا! ابھی آپ آرام کریں اور جب فیل کریں کہ بیان دینے کے قابل ہیں تو اطلاع کر دیجیے گا۔“ ایس پی بنا کسی حیل و حجت کے اس سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

”مجھے اپنا موبائل دے دو عبدالمنان۔“ ایس پی کے باہر جانے کے بعد اس نے عبدالمنان سے فرمائش کی۔ خود اس کا اپنا موبائل اور دیگر اشیا تو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اغوا ہونے کے بعد جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے اپنے جسم پر موجود لباس کے سوا ہر شے کو غیر موجود پایا تھا۔ اب مرکز صحت کے اس کمرے میں وہ اپنے جسم پر موجود لباس کو بھی تبدیل شدہ پارہا تھا۔ یقیناً اس کا پہلے والا لباس خراب ہو گیا تھا، تب ہی اسے بدل کر یہ ڈھیلا ڈھالا شلوار قمیص پہنا دیا گیا تھا۔

”میں سرا!“ عبدالمنان نے موبائل نکال کر اسے دیا اور بولا۔ ”آپ اطمینان سے بات کر لیں، میں اس دوران آپ کو یہاں سے شفٹ کرنے کے انتظامات دیکھتا ہوں۔“ شہر یار نے سر کی جنبش سے اسے اجازت دے دی۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ انتظامات تو وہ پہلے ہی کر چکا ہوگا اس وقت صرف اسے پرائیویسی فراہم کرنے کے لیے بہانہ بنا کر نکلا ہے۔ عبدالمنان کی یہ سمجھ داری اور معاملہ فہمی اس کے دل میں اس کی قدر مزید بڑھا دیتی تھی۔ وہ جس سیٹ پر کام کر رہا تھا، واقعی اس کا مکمل طور پر اہل تھا۔

اس کے باہر جاتے ہی اس نے مختار مراد کا نمبر ملایا۔ کال ان کے پی اے نے ریسیو کی اور یہ جاننے کے بعد کہ شہر یار عادل بات کرنا چاہتا ہے، فوراً فون مختار مراد کو تھا دیا۔ یقیناً وہ اس سلسلے میں پہلے ہی ہدایت کر چکے تھے اس لیے پی اے نے اس کا نام جاننے کے بعد مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

”آئی ایم سو پپی شہر یار! یقین کرو تمہاری زندہ سلامت واپسی نے مجھے اتنی خوشی دی ہے کہ مجھے لگ رہا ہے، میرا اپنا سا بیٹا ایک بڑی مصیبت سے بچ کر واپس آ گیا ہو۔“ فون ہاتھ میں آتے ہی وہ جذباتی لہجے میں شہر یار سے بولے۔ ”تھینک یو سوچ انکل! مجھے آپ کی اپنے لیے تشویش

مسلمان حکمران

جب یہ سوال زیر غور تھا کہ خلیفہ المسلمین کا وظیفہ کیا ہوتا چاہیے تو حضرت ابوبکر صدیق نے دریافت فرمایا کہ مدینے میں ایک مزدور کی کم از کم روزانہ اجرت کیا ہے؟ وہی اجرت آپ نے اپنے لیے بطور وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقاء میں سے کسی نے آپ سے کہا: ”اتنے کم روزینے میں آپ کا گزارہ کیسے ہوگا؟“ تو آپ نے فرمایا: ”اس میں میرا گزارہ اس طرح ہوگا جس طرح ایک مزدور کا گزارہ ہوتا ہے اگر گزارہ نہ ہوتا تو میں اس مزدور کی اجرت بڑھا دوں گا۔“

ایک دن کھانے کے بعد، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا: ”کیا کوئی میٹھی چیز نہیں ہے؟“

انہوں نے فرمایا: ”بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔“ چند دنوں کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے میں حلوہ بھی ہے۔ آپ نے بیوی سے کہا: ”تم نے تو کہا تھا کہ ہمارے راشن میں میٹھی چیز نہیں آتی، آج یہ حلوہ کیسے پک گیا؟“ انہوں نے جواب دیا: ”میں نے جو اس دن محسوس کیا کہ آپ کو میٹھی چیز کی خواہش ہے تو میں نے یوں کیا کہ راشن میں جتنا آتا روزانہ آتا تھا۔ اس میں سے کچھ بھر آٹا الگ رکھتی تھی۔ آج اتنا آٹا جمع ہو گیا کہ اس کے بدلے میں تے بازار سے بھجور کا شیرہ منگوا دیا اور اس طرح یہ حلوہ پک گیا۔ آپ نے اسے تناول فرمایا اور بیوی کا شکریہ ادا کیا۔“

کھانے کے بعد آپ سیدھے بیت المال کے مہتمم کے پاس پہنچے اور فرمایا: ”ہمارے ہاں راشن میں جس قدر آٹا جاتا ہے آج سے اس میں سے ایک منی بھر کم کر دینا کیونکہ ہفت بھر کے تجربے نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ میٹھی بھر کم آئے میں بھی ہو جاتا ہے۔“

کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے اور میں آپ کی اس محبت کے لیے دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔“ اس نے ممنونیت سے مختار مراد کی محبت کا جواب دیا۔

”شکر ہے کی ضرورت نہیں بیٹا... میں تو خود اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے تمہیں جیتا جاگتا واپس پہنچا دیا، ورنہ میں تو پریشان تھا کہ رانا صاحب کو اس واقعے کی اطلاع کیسے دوں؟ انہوں نے جو پے درپے صدے اٹھائے ہیں،

ابھی تو ان سے پوری طرح نہیں سنبھل سکے۔ خدا نخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ان کے لیے تو بہت مشکل ہو جاتی۔ صرف ان کی اور بھابی صاحبہ کی وجہ سے ہی میں نے تمہارے اغوا کی خبر نشر نہیں ہونے دی۔ میڈیا والوں کا تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہر بات کو کتنا اچھالتے ہیں۔ انہیں خبر نشر کرنے کی اجازت مل جاتی تو سیکڑوں من گھڑت کہانیاں وہ خود بنا لیتے۔ الحمد للہ اب تم واپس آگئے ہو تو خود اس معاملے کو ہینڈل کرنا کیونکہ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ہماری طرف سے پابندی پر وہ لوگ وقتی طور پر تو خبر نشر کرنے سے رک گئے تھے لیکن اب جب نہیں بیٹھیں گے۔

”میں بھی انہیں کیا بیٹا سکوں گا؟ وہ لوگ مجھ سے اس اغوا کا سبب جاننا چاہیں گے لیکن سبب تو مجھے خود نہیں معلوم۔ دوسرا سوال ان کا یہ ہوگا کہ مجھے اس سلسلے میں کس پر شک ہے تو ظاہر ہے میں شک ہونے کے باوجود کسی کا نام نہیں لے سکوں گا۔ ان حالات میں میڈیا والوں سے گفتگو بے کار ہی ثابت ہوگی۔“ اس نے مختار مراد کی بات کا جواب دیا۔

”جتنا بھی اور جو بھی تمہیں مناسب لگے، میڈیا والوں کو بتا دینا۔ تم سے زبردستی تو ہر حال وہ لوگ نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایسا کرو کہ تم مجھے سارا واقعہ تفصیل سے سنا دو۔ میں تمہیں گائیڈ کر دوں گا کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں؟“

مختار مراد نے اس سے کہا تو وہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ مختار مراد خاموشی سے اس کی بات سن رہا۔ آخر کار وہ چپ ہوا تو وہ بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو کہ نہ تو تم کسی کو اغوا کا سبب بتانے کے قابل ہو اور نہ ہی اپنے کسی شک کا اظہار کر سکتے ہو۔ ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ جو جو اور جس طرح پیش آیا ہے وہ بتا دو۔ بس میڈیا والوں کے سامنے اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرنے سے قفل گریز کرنا ورنہ وہ لوگ بڑ کا کو بتانے میں ماہر ہوتے ہیں، خواہ مخواہ کہانیاں گھڑتے پھریں گے۔“

”ڈونٹ وری انکل! میں خیال رکھوں گا۔“ اس نے مختار مراد کی دی۔

”اوکے! تم اب آرام کرو۔ میں نے تمہارے پی اے کو ہدایت دے دی تھی کہ تمہیں پیر آباد سے سیدھا لاہور پہنچا دیا جائے۔ چوٹیں وغیرہ تو سنا ہے کہ تمہیں زیادہ مہلک نہیں آتی ہیں لیکن پھر بھی مناسب ہے کہ تم یہاں کسی اچھے اسپتال سے اپنا علاج کروالو۔ پھر یہاں آنے میں یہ بھی فائدہ رہے گا کہ تمہارے ماموں ممانی آسانی سے تمہاری مزاج پر سی کر سکیں گے۔ تمہارے وہیں رکے رہنے کی صورت میں انہیں

پریشانی ہوگی۔ نہ تو وہ لوگ اتنا لمبا سفر آسانی سے کر سکتے ہیں اور نہ ہی مریم کو تنہا چھوڑ کر گھر سے نکل سکتے ہیں۔ ابھی وہ عدت میں ہے نا۔“ آخری جملہ بولتے ہوئے اس کی آواز جس طرح کانپتی تھی، اس نے شہریار کے دل کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”مریم عدت میں ہے نا۔“ یہ فقط ایک جملہ نہیں تھا۔ یہ وہ عظیم دکھ تھا جو ان سب نے سجاد رانا کی اچانک موت کی صورت میں بہ یک وقت اٹھایا تھا۔

”ٹھیک ہے انکل! میں لاہور آجاتا ہوں۔“ بچھے ہوئے لہجے میں اسے جواب دے کر اس نے فون بند کر دیا اور بچھے پر سر رکھ کر سیدھا لیٹ گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد سے وہ سر میں درد کی جو ہلکی ہلکی سی ٹیسیں اٹھتی محسوس کر رہا تھا، وہ اب بے حد شدت اختیار کر گئی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سر میں زوردار دھماکے ہو رہے ہوں۔

☆☆☆

وہ بالکل گرم صمیری بیٹھی غلاؤں میں تنک رہی تھی۔ اس کے سامنے دھرا کھانا بھی جوں کا توں رکھا تھا۔ نقاہت کے باوجود دل کسی طرح کھانے کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل وہ نہایت سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے صرف خود کو تو اتنا رکھنے کے لیے ہی اس قید خانے میں ملنے والا کھانا پابندی سے زہر مار کر لیا کرتی تھی مگر جب سے اس نے پروجیکٹر پر چلنے والا وہ کریہہ منظر دیکھا تھا، حلق سے نوالے اتارنا مشکل ہو گئے تھے۔ جب بھی کھانا سامنے آتا اور وہ نوالہ منہ میں رکھتی، خون میں لت پت لاش سامنے آ جاتی۔ جانے وہ کون تھا جسے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ وہ ان کی گفتگو سے بس اتنا اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ عمران کا کوئی دشمن تھا جسے اس کی نسلی کے لیے اس انجام تک پہنچایا گیا تھا۔ مشکل سے معصوم اور شریف نظر آنے والا عمران اندر سے اتنا سفاک نکلے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے اور کانوں سے سن لینے کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ اب تو وہ یہی کہہ سکتی تھی کہ اس نے عمران کی اچھی صورت سے دھوکا کھا کر اس کے بارے میں اچھا گمان کرنے کی غلطی کی تھی۔ وہ بھلا اچھا کیونکر ہو سکتا تھا۔ آخر وہ بھی تو انہی لوگوں میں سے ایک تھا جن کی قید میں وہ رہ رہی تھی۔ وہ شکل سے وحشی دکھائی دیتے لوگ جو جانے اس برف زار میں کن مذموم مقاصد کے حصول کے لیے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ جنہوں نے شہروں کی رونق اور گھریلو زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر اس سخت ماحول میں ڈیرا ڈال رکھا تھا اور ہتھیاروں سے دل بہلاتے اپنی وحشتوں کو اور بھی ہمیز

کرتے رہتے تھے۔ وہ کون لوگ تھے؟ اس بارے میں وہ ابھی تک حتمی اندازہ نہیں لگا سکی تھی مگر اسے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں تھا کہ وہ سب کے سب ایب نارل تھے۔ ان ایب نارل لوگوں کے درمیان رہنا اب اس کے لیے مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔ اس قید خانے میں ایک کریہہ منظر اور سفاکی دیکھنے کوئی تو اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ جو پورے حوصلے سے حالات کے ان طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھی، ایک دم ہی کچھ ڈھسے کی گئی۔ شاید یہ مایوسی کی ہی کیفیت تھی جو اس کے اندر سے حالات کا مقابلہ کرنے کی انگ مٹنے لگی تھی۔

مایوس آدمی زندگی کی بقا کی طرف سے بے پروا ہو جاتا ہے اور پھر زندگی کو جاری و ساری رکھنے والے عناصر میں دلچسپی نہیں رہتی۔ وہ بھی اسی مایوسی کی وجہ سے کھانے کی طرف سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کو قیدی بنا کر رکھنے والے اب بھی تمام اوقات کا کھانا پابندی سے اس تک معمول کے مطابق پہنچا رہے تھے۔ کسی وقت وہ اس کھانے میں سے چند لقمے نکل لیتی اور بھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ آج بھی اس نے یہی کیا تھا۔ کھانا سامنے رکھ دینے جانے کے باوجود وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ جو شخص ایک مخصوص وقت کے بعد کھانے کے برتن واپس لے جانے آیا تھا، وہ برتنوں میں کھانے کو جوں کا توں رکھا دیکھ کر برتن اٹھائے بغیر خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا کہ شاید بعد میں بھوک محسوس کرنے پر کچھ کھا لے۔ لیکن وہ کافی دیر گزر جانے کے باوجود اس طرف متوجہ نہیں ہوئی اور نہ جانے کتنی دیر تک یوں ہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

بیٹھے بیٹھے جب تسکین اور نقاہت کے باعث جسم جواب دینے لگا تو وہ اسی جگہ گھری سی بن کر لیٹ گئی۔ خالی پیٹ انسان کو نیند نہیں آیا کرتی اور پیٹ میں دوڑتے چوہے احتجاج کرنے لگتے ہیں لیکن وہ چونکہ کئی وقتوں سے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھا رہی تھی، اس لیے کم خور کی سی طاری ہونے والی نقاہت اسے غنودگی میں لے گئی۔ غنودگی کی اس کیفیت میں کتنے لمحے بیتے اسے ہوش نہیں تھا لیکن وہ اس وقت بُری طرح چوکی جب اس نے اپنا آپ ایک بھاری بوجھ کے نیچے دبا ہوا محسوس کیا۔ ساتھ ہی کسی کی گرم گرم سانس اس کی گردن سے کھرائیں۔ اس نے بُری طرح کسمسا کر خود کو اس بوجھ سے آزاد کروانا چاہا لیکن اس کے نازک بدن کی طاقت اس پہاڑ جیسے بوجھ کو دھکیلنے کے لیے ناکافی تھی۔ کچھ دیر قبل وہ زندگی سے کتنی ہی مایوس تھی لیکن ابھی تو بہر حال ایک دوشیزہ ہی...

جسے آخری دم تک اپنی عزت کی حفاظت کا خیال رہتا ہے۔ چنانچہ اپنی دوشیزگی چھین جانے کا خطرہ محسوس کر کے بُری طرح چھپنے لگی۔ اس کی کوشش تھی کہ کچھ اور نہ کر سکے تو کم از کم چیخ ہی مار دے لیکن اس ظالم نے اس کے وجود کو اپنے بوجھ تلے پس ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ کو بھی ایک ہاتھ سے پوری قوت سے بند کر رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کے کپڑے تن سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود پر سوار اس وحشی سے نجات کے لیے... جس کے جسم پر موجود بے تحاشا بالوں کی چھین اور مساموں سے اٹھتی گندی بدبو قطعی ناقابل برداشت تھی، اس نے بدن کی پوری قوت صرف کر کے اپنا دھانا ہاتھ اس کے جسم کے نیچے سے نکالا اور اپنے منہ پر جسے اس کے ہاتھ پر ناخن گاڑتے ہوئے جھٹکے سے اس کا ہاتھ منہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ کا جھٹکا تو شاید اس وحشت زدہ درندے کا ہاتھ منہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو پاتا لیکن ناخنوں کی چھین نے کافی مدد دی اور اس کا ہاتھ ماہ بانو کے منہ سے ہٹ گیا۔

ماہ بانو نے فوراً ہی ایک زوردار چیخ ماری لیکن بس اسے ایک ہی چیخ مارنے کا موقع مل سکا اور اس درندے کا ہاتھ دوبارہ اس کے منہ پر آجھا۔ اب اس کے انداز میں مزید وحشت درآئی تھی اور وہ اور بھی زیادہ شدت سے اسے کچلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وحشت کی ہی وجہ سے اسے اس طرف دوڑ کر آتے قدموں کی آواز سنائی نہ دے سکی۔ آنے والے نے بس ایک نظر یہ منظر دیکھا اور پوری قوت سے اسے ماہ بانو پر سے دھکیل کر غار کی دیوار پر دے مارا۔ نفس کے وحشی جانور کے زیر اثر وہ شخص چوٹ کھا کر کسی بیل کی طرح بُری طرح ڈکرایا اور غراتا ہوا اپنی راہ کی رکاوٹ بننے والے پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے آپ کو حملے سے بچایا بلکہ اس وحشی کا سر دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر ایک بار پھر اسے دیوار پر دے مارا۔ سر غار کی پختہ دیوار سے ٹکرانے پر ایک زوردار آواز ابھری اور اگلے ہی پل ماہ بانو نے اس شخص کے سر سے خون کا فوارہ سا نکلتا دیکھا۔ اس دوران وہ کسی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی اور وہی نیلے پھولوں والی سیاہ چادر جو اس وحشی نے اس کے جسم پر سے نوج چھین لی تھی، ایک بار پھر اپنے گرد لپیٹ لی تھی۔

رات کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن اس مدہم روشنی میں بھی وہ وہاں موجود ان دونوں افراد کو شناخت کر سکتی تھی۔ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے والا شخص وہی کل شیر نامی آدمی تھا جس کی آنکھوں کی ہوس نے

پہلے بھی اس کے اندر خطرے کی کھنٹی بجائی تھی جبکہ ان نازک لحاظ میں اس کے لیے رحمت بن کر آنے والا معصوم صورت عمران تھا۔ وہی عمران جس سے پہلے بھی وہ اچھی امید باندھ چکی تھی لیکن پھر اس کی وحشت کی داستان سامنے آنے پر مایوسی کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل دینے والا وہ شخص اس وقت اس کا محافظ بن گیا تھا اور اس کی عزت پر حملہ کرنے والے کو بڑی طرح پیٹ رہا تھا۔ ماہ بانو نے محسوس کیا کہ گل شیر کو پیٹتے ہوئے عمران کے انداز میں وحشت اتر آئی ہے اور وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ پہلے ہی زخمی ہو چکا ہے، مسلسل اس کا سر دیوار سے مارتا رہا۔ چند لمحوں میں ہی اس نے گل شیر کو بالکل ادھ موا کر دیا۔ وہ جو کچھ دیر قبل ایک بھرے ہوئے ساٹھ کی طرح ماہ بانو پر حملہ آور ہوا تھا، اب عمران کے ہاتھوں میں بالکل بے جان شے کی طرح جھول رہا تھا۔ خونم خون گل شیر اور وحشت زدہ عمران کو دیکھ کر ماہ بانو کا اتنا بڑا حال ہوا کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ اس پر چند لمحے قبل جو گزری تھی، وہ ہی کیا کم تھی جو وہ اس وحشت ناک منظر کو دیکھ کر بھی اپنے حواس قائم رکھ پائی۔ وہ تو شور کی آوازیں سن کر دوسرے لوگ خود ہی اس طرف متوجہ ہو گئے اور دوڑ کر ادھر آئے۔ آنے والوں میں سے تین نے بڑی مشکل سے عمران کو قابو کر کے اس کی گرفت سے گل شیر کو آزاد کر دیا۔

”چھوڑ دو مجھے۔ میں اس شیطان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس جیسے بھیڑیے جو معصوم لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے ہیں، زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔“ خود کو قابو میں کرنے والوں کی گرفت میں مچلتا ہوا وہ وحشت زدہ انداز میں چلایا۔

”ہوش کرو عمران! وہ مر چکا ہے۔“ ان میں سے ایک نے اس کے منہ پر زوردار پھپر لگاتے ہوئے اسے احساس دلایا تو وہ عالم وحشت سے باہر نکلا اور سامنے بڑی گل شیر کی لاش کو دیکھنے لگا۔ اس کی وحشیانہ ضربوں کے نتیجے میں اس کا سر پاش پاش ہو چکا تھا اور بھیجا یا ہر نکل آیا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر کبھی اس کے چہرے سے کسی قسم کا افسوس ظاہر نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک نفرت بھری نظر گل شیر کی لاش پر ڈال کر حقارت سے اس پر تھوک دیا اور بولا۔

”اچھا ہوا مر گیا سال! بیچ جاتا تو میں اس کا ریشہ ریشہ الگ کر دیتا۔“

”اسے یہاں سے لے کر جاؤ اور گل شیر کی لاش اٹھوا کر جگہ صاف کر دو۔“ ان میں سے ایک نے جو شاید دوسروں سے ممتاز مقام رکھتا تھا، حکم دیا۔ فوراً ہی اس کے حکم

کی تعمیل ہونے لگی۔ عمران کو بازوؤں میں جکڑے کھڑے آدی اسے گھسیٹ کر وہاں سے لے جاتے گئے۔ اس نے بھی زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ یقیناً گل شیر کی لاش دیکھنے کے بعد اس کے جنونی غصے کا اہال کم ہو گیا تھا۔

ماہ بانو چادر میں سمٹی ہوئی دہشت زدہ نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ عمران کو وہاں سے لے جانے کے بعد گل شیر کی لاش بھی اٹھالی گئی تھی اور اب ایک آدی وہاں زمین اور دیواروں پر لگے خون کو صاف کر رہا تھا۔ خون کے ساتھ ساتھ گل شیر کے سر سے اس کے پیچھے کا بھی کچھ حصہ باہر نکل آیا تھا۔ صفائی کرنے والے آدی نے بڑے اطمینان سے اسے بھی صاف کر دیا۔ ماہ بانو نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے ساتھی کی موت پر افسردہ یا غمگین نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے لیے گویا یہ ایک معمول کی بات تھی جس کے پیش آ جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ شاید وہ اس طرح کے مناظر اتنی بار دیکھ چکے تھے کہ اب ان کے لیے ان کی حیثیت بالکل ایسی ہو گئی تھی جیسے روزانہ اپنے گھر سے دفتر جانے والے شخص کے لیے راستے کے مختلف مناظر کی ہوتی ہے۔ ایسا شخص غیر ارادی طور پر سب کچھ دیکھتا تو ضرور ہے لیکن منظر میں کوئی نیا پن محسوس نہ ہونے کے باعث اس کے دل و دماغ میں تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ ان تمام لوگوں نے بھی گل شیر کی لاش دیکھی تھی مگر اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

”میں سمجھتا ہوں انکل کہ جنگل میں آپریشن بہت ضروری ہو گیا ہے۔ وہاں ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں ہیں۔ یہ بات ہم پہلے ہی جانتے ہیں بلکہ میں اس سلسلے میں پہلے بھی آپ سے درخواست کر چکا ہوں کہ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے کچھ کیجیے۔“ اسپتال کے آرام دہ کمرے میں صاف ستھرے بستر پر نیم دراز وہ اپنی عیادت کے لیے آئے ہوئے آئی جی مختار مراد سے مخاطب تھا۔ بہترین نگہداشت اور علاج نے اسے تیزی سے رو بہ صحت ہونے میں کافی مدد دی تھی ورنہ جس حالت میں وہ اغوا کاروں کے چنگل سے نکل کر آیا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہی قیاس کیا جاسکتا تھا کہ اب اسے دوبارہ سے زندگی کے معمولات میں شامل ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ بہر حال، اب بھی وہ سو فیصد تو صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ سر پر لگنے والا زخم گہرا ہونے کی وجہ سے اس پر ڈاکٹر داور نے ٹانگے لگائے تھے اور ابھی یہ ٹانگے کھولے نہیں گئے تھے۔ جسم کے باقی حصوں پر لگنے والے زخم بھی ابھی پوری

طرح مندرجہ نہیں ہوئے تھے۔ پھر ڈنڈوں کی ضرب سے لگنے والی اندرونی چوٹیں جو حرکت کرنے میں اسے خاصی تکلیف دیتی تھیں۔ پیر آباد کے مرکز صحت میں ملنے والی ابتدائی طبی امداد نے اگر اس کی زندگی خطرے میں جانے سے بچائی تھی تو لاہور کے اس جدید اسپتال کے ڈاکٹر بھی اسے تیزی سے رو بہ صحت کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ فرق دونوں میں صرف اتنا تھا کہ ایک جگہ غریب لوگوں کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے رفاہی بنیادوں پر کام ہو رہا تھا جبکہ دوسری جگہ پر خدمت کے عوض لمبے لمبے بل وصول کیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں، درخت اگانے والا انگلی نسل کے لیے درخت اگانا ہے اور خود اسے اس درخت کا پھل کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ شہریار کے ساتھ معاملہ ذرا مختلف ہوا تھا۔ اس نے دوسروں کے بھلے کے خیال سے اپنے ضلع میں دیہی مراکز صحت کا قیام عمل میں لانے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور اس کی یہ نیکی و خدمت خود اس کے لیے خوش نصیبی بن گئی، ورنہ ممکن تھا کہ وہ فوری طبی امداد نہ ملنے پر محض خون کے زیادہ اخراج کے باعث ہی جان سے چلا جاتا۔ پس ماندہ دیہاتوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی ہے کہ قابل علاج امراض و مسائل بھی فوری طبی امداد نہ ملنے کے باعث پیچیدہ صورت اختیار کر کے بے چارے مریض کی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔

”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے مجھ سے آپریشن کے لیے بات کی تھی۔ اس وقت تم ایک دیہاتی لڑکی کے اغوا اور پھر اس کی لاش ملنے کے باعث یہ فرمائش کر رہے تھے جس کے بارے میں شک ظاہر کیا گیا تھا کہ اسے ڈاکوؤں نے اٹھایا ہے لیکن مقامی پولیس آفیسر کا کہنا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے خود اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔“ آئی جی مختار مراد نے اپنے مضبوط حافظے کا ثبوت دیتے ہوئے مختصر اس واقعے کا حوالہ دیا۔

”صرف وہی ایک کیس نہیں تھا۔ اس واقعے کے بعد ڈاکوؤں نے ایک گاؤں پر حملہ کر کے وہاں لوٹ مار بھی کی تھی۔“ شہریار نے تڑپ کر یاد دلایا۔

”ہاں، وہ واقعہ بھی مجھے یاد ہے لیکن بیٹا... مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ دونوں ہی واقعات اتنے قابل ذکر نہیں تھے کہ میں ان کی بنیاد پر حکومت کو اتنے بڑے آپریشن کے لیے راضی کر پاتا۔ تمہیں اس جنگل کی لوکیشن کا شاید اچھی طرح اندازہ نہیں ہے۔ وہاں گنے درختوں اور پہاڑیوں کی موجودگی کے باعث چھپنے کی جگہیں بھی بہت ہیں اور آس پاس دیہاتوں کی موجودگی

کے سبب ڈاکوؤں کے لیے راہ فرار اختیار کرنا بھی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ اگر ہم وہاں آپریشن کرنا چاہیں گے تو ہمیں بہت بڑے پیمانے پر یہ آپریشن کرنا ہوگا اور اس کے لیے جتنا بجٹ درکار ہے، اس کی منظوری کے لیے کوئی بہت ہی خاص ریزن سامنے ہونا ضروری ہے۔“ مختار مراد نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

”آپ کے خیال میں ایک معصوم لڑکی کا اس کی شادی سے ایک دن قبل اغوا ہو جانا اور پھر اس کی کٹی پھٹی لاش ملنا کوئی معمولی واقعہ تھا؟ اس واقعے کے اثرات کتنے خطرناک نکلے تھے، یہ بھی آپ کو یاد ہوگا۔ میں تو کبھی اس جذباتی سے لڑکے عبدالمبین کو نہیں بھول سکتا جو اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی سے اتنی بری طرح متاثر ہوا کہ شاہنواز جیسے دہشت گرد کے ہاتھ چڑھ گیا۔ صرف اس ظلم کی وجہ سے وہ لڑکا اپنے جسم سے ہم باندھ کر بھرے مجمع میں آگھسا تھا۔ وہ مجھے، وزیروں، پولیس والوں اور ایسے تمام افراد کو مار دینا چاہتا تھا جن کے ذمے قانون نافذ کرنا اور لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ہے۔ لیکن اتفاق سے وہ اس کیلک جینچے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور نتیجتاً ہم سارے وی آئی پیز کے صدرے میں بے گناہ عوام مارے گئے۔“ شہریار نے نہایت سنجیدگی سے سنگین واقعے کا ذکر کیا۔

”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں شہریار لیکن پھر وہی کہنے پر مجبور ہوں کہ اس واقعے کی بنیاد پر میں آپریشن ڈیکلین نہیں کر سکتا۔ ہاں، تمہارا معاملہ الگ تھا۔ اگر تم واپس نہ لوٹتے تو میں، رانا صاحب اور فیملی کے دوسرے بار سوخ افراد مل کر زور لگاتے کہ تمہیں بازیافت کرنے کے لیے آپریشن کیا جائے اور اس وقت ہم یہ بات منوا بھی لیتے لیکن اب جبکہ تم واپس آ گئے ہو تو کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے پاس اب کوئی ٹھوس وجہ نہیں رہی ہے۔ خود تمہیں بھی یقین نہیں کہ تمہیں اغوا کرنے والے ڈاکو ہی تھے۔ تمہیں تو چودھری اور اس کے بندوں پر شک ہے کہ انہوں نے تمہیں اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے یہ اغوا کیا تھا۔“

”تو یہ بات بھی تو ظاہر ہے کہ چودھری کا ڈاکوؤں سے ربط ضبط ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے ہی مجھے ڈاکوؤں کے ذریعے اغوا کر دیا کہ ان کے کسی ٹھکانے پر رکھا ہو، ورنہ خود ڈاکوؤں کو مجھ سے کیا غرض ہو سکتی تھی؟“ اس نے دلیل دیتے ہوئے مختار مراد کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”یہ صرف ایک قیاس ہے۔ تم یا میں اس کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہیں بلکہ تم کسی مخالف کی تنقیدی نظر سے

دیکھو تو تمہارے اغوا کا معاملہ ہی کافی مشکوک صورت اختیار کر لے گا۔ تمہارے پاس بتانے کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہیں کس نے، کیوں اور کس لیے اغوا کیا تھا... اور بغیر کوئی مطالبہ کیے اتنی آسانی سے آزاد کیسے کر دیا؟ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ تم نے چودھری پر الزام لگانے کے لیے خود ہی اپنے اغوا کا ڈراما رچایا تھا اور اب فضول واویلا کر رہے ہو اسی لیے میں نے تمہیں میڈیا والوں کے سامنے کسی پر شک ظاہر کرنے سے منع کیا تھا۔ سچ کیا ہے، وہ تم جانتے ہو اور میں بھی اسے مانتا ہوں لیکن ہم اس سچ کو سب سے نہیں منوا سکتے۔“

آئی جی مختار مراد نے بغیر لگی لپٹی رکھے اس پر ہر بات واضح کر دی تو اس کا جوش بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ واقعی موجودہ حالات میں تو خود اس کی اپنی پوزیشن مشکوک ہو گئی تھی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل! واقعی میں اپنے اغوا والے معاملے پر شور مچاؤں گا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا کہ میڈیا والوں کو چٹائی خبریں بنانے کے لیے ایک ایسا ہاتھ آجائے گا۔“ آخر کار اس نے آئی جی مختار مراد سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

”ماپوس مت ہو بیگ مین! ابھی تمہارے کیریئر کا اشارت ہے۔ آگے جا کر تمہیں بہت کچھ کرنے کا موقع بھی ملے گا اور کئی رکاوٹیں بھی سامنے آئیں گی۔ ہم سب جس سسٹم کا حصہ ہیں، وہ اسی طرح چلتا ہے۔ اکثر اوقات ہم جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے لیکن اس سچ کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ کئی بار ہمیں نا انصافی دیکھنے کے باوجود خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ چودھری افتخار اور تمہارا کیس کوئی انوکھا نہیں ہے۔ ان چودھریوں اور وڈیروں کے مقابل جب بھی کوئی ایمان دار افسر آتا ہے، یہ اسی طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ابھی تک چودھری کھل کر تمہارے مقابل نہیں آیا اور صرف پیچھے سے وار کرنے پر اکتفا کر رہا ہے، ورنہ تمہاری جگہ کوئی عام فرد ہوتا تو چودھری اب تک اسے اپنے علاقے سے اٹھا کر پھینک دیتا۔ ان با اختیار چودھریوں کی زد میں آنے والوں کا کیریئر کس طرح تباہ ہو جاتا ہے، تمہیں اندازہ نہیں ہے... اور وہ صرف اس وجہ سے کہ تم ایک طاقتور خاندان کے فرد ہو۔ یوں سمجھ لو کہ جس سسٹم کی خامیوں کی وجہ سے چودھری جیسے افراد اقتساب سے بچے ہوئے ہیں، اسی سسٹم کے سہارے تم بھی اپنی سیٹ پر ٹکے ہوئے ہو۔“ مختار مراد ایک تجربے کار شخص تھا اور اس وقت اس کے لفظوں میں تجربہ بول رہا تھا۔ غصے اور

جوش سے بھرے ہوئے شہر یار کو اس کی بات سمجھ آئی تو وہ ذرا پسپا پڑ گیا اور وہی آواز میں بولا۔

”مجھے آپ کے کہے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرے اور چودھری کے درمیان سب سے بڑا فرق حق و باطل کا ہے... اور میں حق کے غالب آنے تک یا کم از کم اس وقت تک جب تک میرے جسم میں جان ہے، چودھری سے اپنی جنگ جاری رکھوں گا۔“

”وش یو بیٹ آف لک بیگ مین... مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس جنگ میں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا۔ تمہاری عمر کے لوگ عموماً اپنے جوش کی وجہ سے ہی ان کہنہ مشق جاگیرداروں سے شکست کھا جاتے ہیں اور وہ نہیں کر پاتے جس کی انہیں اللہ نے صلاحیت دی ہوئی ہے۔ سجاد کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اس نے اپنا پورا کیریئر اتنی احتیاط سے گزارا۔ وہ اگر ڈی آئی جی کی پوسٹ تک پہنچا تھا تو اس کے لیے اس نے خود کو اہل بھی ثابت کیا تھا۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد وہ آئی جی بھی ضرور بننا لیکن کیا ہوا؟ شینا کی موت نے اس پر ایسا جنون سوار کیا کہ وہ احتیاط کے سارے تقاضے فراموش کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شینا کے قاتل بھی انجام تک نہیں پہنچے اور وہ خود بھی اپنی جان سے گیا۔“

سجاد رانا کا حوالہ دیتے ہوئے مختار مراد کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی در آئی تھی۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی کا شوہر تھا اور اس نے ہمیشہ اس بات پر فخر محسوس کیا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک بہت ہی اچھا شخص منتخب کیا ہے لیکن قسمت نے عجیب ہی چال چلی تھی۔ وقت کی آندھی نے نہ صرف اس کی بیٹی کی گود اجاڑ دی تھی بلکہ اس کا سہاگ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کے اس غم پر اندر ہی اندر کڑھتا اور گھلتا رہتا تھا لیکن بظاہر اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ دیکھنے والوں کے لیے اس کے چہرے سے اس کی اصل قلبی کیفیت کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ یہ ضبط اور برداشت یقیناً پولیس کی برسوں کی ملازمت کا نتیجہ تھا۔

”سجاد بھائی اور شینا کے قاتلوں کا کچھ معلوم ہوا انکل؟“ ذکر چھڑا تو وہ اس سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”نہیں۔“ مختار مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کر سکے کہ ان قاتلوں کے ڈانڈے انڈین خفیہ سسٹم سے جا کر ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے پیچھے ہم جہاں جہاں تک پہنچے، وہ وہاں سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے آرڈر دے رکھا ہے کہ خواجہ سراؤں اور جسم فروش عورتوں

کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے اور جہاں کوئی مشکوک بات ہو، میرے نوٹس میں لائی جائے۔ مجھے یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ کام ہو رہا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ سچ کچھ ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہم جیسے بڑے افسروں کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے ماتحتوں کے محتاج ہوتے ہیں اور ان میں سے کون اصل میں آپ کا ماتحت اور وفادار ہے، اس بات کا مشکل سے ہی اندازہ ہو پاتا ہے۔ سجاد کی جگہ جو نیا ڈی آئی جی آیا ہے، وہ بظاہر ٹھیک آدمی ہے۔ میرے پاس اس کے خلاف کوئی بڑی شکایت بھی نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ میرے لیے سجاد کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال، ابھی تو انویسٹی گیشن چل رہی ہے... کچھ سامنے آیا تو میں تمہیں ضرور انفارم کروں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ بہت ٹائم گزر گیا ہے، مجھے کچھ دوسرے معاملات بھی دیکھنے ہیں۔“ وہ گھڑی پر نظر پڑنے پر بات کرتے کرتے اچانک ہی اپنی گفتگو سیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک یوسوئج انکل کہ آپ اپنا قیمتی وقت نکال کر میری عیادت کے لیے آئے۔“ شہر یار نے مختار مراد سے پُر جوش مصافحہ کرتے ہوئے حقیقی شکر گزاری کے احساس کے ساتھ کہا۔

”شکریے کی کوئی ضرورت نہیں بیگ مین! مجھے خود تم سے ملنا اچھا لگتا ہے کیونکہ تم میں وہ امپرٹ ہے جس کی بدولت تمہارے بہت اوپر تک جانے کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ میری دعا ہے کہ تم اپنے نیک مقاصد میں ضرور کامیاب ہو اور وہ کر کے دکھاؤ جو ہم نہیں کر پاتے۔“ مختار مراد نے محبت سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

”اگر کرم فرماؤں نے اگلی بار بالکل ہی اوپر نہ پہنچا دیا تو یقیناً آپ کی دعا قبول ہوگی۔“ شہر یار اس کی بات سن کر شوخی سے ہنستے ہوئے بولا۔

”ایسی باتیں مت کرو بیگ مین! اب تم ہی ہو جو رانا صاحب اور اپنی ممانی کو سنبھال سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر دے اور تمہارے طفیل وہ لوگ وہ خوشیاں دیکھ سکیں جو وقت نے ان سے چھین لی ہیں۔“ مختار مراد نے اسے فوراً ہی ٹوکتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور ایک بار پھر اس کا شانہ تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد شہر یار بھی تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا۔ مختار مراد سے ملاقات کر کے اس کے ذہن پر سے بہت سے جالے صاف ہو گئے تھے۔ خاص طور پر اس کا اسے ”بیگ مین“ کہہ کر پکارنے کا انداز اتنا مخلصانہ اور محبت سے بھرپور تھا کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مختار مراد کے اور اس

کے درمیان کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ وہ اس کے کزن کا سر ہی تو تھا جو اگر اس سے تعلق نہ بھی رکھنا چاہتا تو وہ شکایت نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اپنے بے حد مصروف شیڈول میں سے بھی خاص طور پر اس کے لیے وقت نکال کر اس سے ملنے آیا تھا تو یہ بڑی بات تھی۔

”آپ کی میڈیسن کا وقت ہونے والا ہے سر! پہلے آپ کچھ کھالیں تاکہ میں تھوڑی دیر بعد آپ کو میڈیسن دے سکوں۔“ مختار مراد کو گئے پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سفید لباس میں ملبوس ایک نازک سی نرس دستک دے کر اندر چلی آئی اور اس سے بولی۔

”اوکے! آپ میرا لٹچ لے آئیں۔“ شہر یار نے اسے اجازت دی۔ اس کی ممانی آفرین رانا نے تو خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خود اس کے لیے ہر ٹائم کا کھانا اسپتال پہنچایا کریں گی لیکن اس نے ان کی تکلیف کے خیال سے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ ویسے بھی یہ اسپتال بہت باسہولت تھا اور ہر شے آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی نرس نے اس کی اجازت پا کر ڈاکٹر کے تجویز کردہ فوڈ چارٹ کے مطابق اسے اپنی نگرانی میں ہلکا پھلکا لٹچ کروایا اور پھر پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اسے دوا میں کھلا کر باہر نکل گئی۔ کمرے میں مستقل نرس کی موجودگی کو خود اس نے نا پسند کیا تھا اس لیے نرس ضرورت کے علاوہ وہاں نہیں رکھتی تھی۔ اگر اسے کوئی کام ہوتا تو وہ بیڈ کے ساتھ لگا کھنٹی کا بٹن دبا کر اسے کال کر سکتا تھا۔

اس وقت نرس اسے دوائیں کھلا کر گئی تو تھوڑی دیر میں ہی اسے غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ یقیناً پین کلرز کا اثر تھا۔ اس نے ریموٹ کا بٹن دبا کر بیڈ کے عین سامنے لگائی دی بند کر دیا۔ لٹچ کرواتے ہوئے نرس نے اس کی فرمائش پر دیکھی آواز میں ٹی وی آن کیا تھا تاکہ وہ حسب خواہش نیوز دیکھ سکے۔ اب غنودگی محسوس ہوئی تو اس نے ٹی وی آف کر کے سوچنا ہی مناسب سمجھا۔ یوں بھی اسے عیادت کے لیے آنے والے ملاقاتیوں اور فون کالز کی وجہ سے آرام کا زیادہ موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج صبح سے تو اس نے ڈاکٹر کی تجویز پر اپنا موبائل ہی آف کر دیا تھا تاکہ کم از کم ایک طرف سے تو سکون ہو۔ اس وقت وہ اس سکون اور تنہائی کا فائدہ اٹھا کر سونے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور باہر ڈیوٹی دینے والا پولیس اہلکار اجازت لے کر اندر آیا۔

”سر! ایس پی معظم تارڑ آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔“ اس نے شہر یار کو اطلاع فراہم کی جس پر اس

نے بہ یک وقت حیرت اور کوفت محسوس کی۔ معظم تارڑ اس سے ملنے کے لیے یہاں تک آجائے گا، اسے قطعی امید نہیں تھی اور اب وہ آگیا تھا تو اس کا اس سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”اوکے! انہیں اندر بھیج دو۔“ قلبی کیفیت کے برخلاف اسے ایسے پی کو باہر سے ہی لوٹانا اچھا نہیں لگا اس لیے جواب کے لیے منتظر کھڑے المکار سے بادل ناخواستہ کہا۔ وہ اس کا جواب سن کر فوراً ہی پلٹ گیا۔ اگلے لمحے معظم تارڑ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

”گڈ آفٹر نوون سر! آئی ہوپ کہ اب آپ پہلے سے بہت بہتر ہوں گے۔“ اس نے مہکتا ہوا فلاور بکے بیڈ کے قریب رکھی سائنڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں حالانکہ دشمنوں کی کوشش تو یہی تھی کہ میں بہت عرصے تک بستر سے اٹھ ہی نہ سکوں... لیکن اللہ کا کرم ہے کہ میں بہتر ہوں اور بہت جلد اپنی جگہ پر واپس پہنچ کر کام شروع کر دوں گا۔“ معظم تارڑ کو جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ خود بخود ہی قدرے طنزیہ ہو گیا تھا جسے وہ کمال صفائی سے نظر انداز کر گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”وائے ناٹ سر! ہم لوگ تو منتظر ہیں کہ آپ آئیں اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔“

”انشاء اللہ... وہ تو میں جلد سنبھال لوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ لاہور کسی کام کے سلسلے میں آتا ہوا تھا یا یہ طور خاص میری عیادت کے لیے تشریف لائے ہیں؟“ اس نے ذہن میں چنپٹا سوال آخر کار کر ہی ڈالا۔

”دونوں ہی باتیں سمجھ لیں۔ اصل میں مجھے وزیر اعلیٰ صاحب سے ایک کام تھا۔ کام تو خیر میں ان سے فون پر بھی کہتا تو وہ کروا دیتے لیکن میں نے سوچا کہ ان سے ملاقات کے بہانے یہاں آؤں گا تو آپ کی مزاج پرسی بھی کر لوں گا۔“ معظم تارڑ نے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تارڑ کی وزیر اعلیٰ سے رشتے داری ہے اور اس رشتے داری کے تل بو تے پر وہ ان سے اپنے مطلب کا کام کروا سکتا ہے۔ کام کی نوعیت پوچھتے سے البتہ اس نے جیس کے باوجود گریز کیا۔

”میرے علم میں آیا تھا کہ محکمہ پولیس کے کچھ افسران کو ایک تربیتی کورس پر دو سال کے لیے بیرون ملک بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے ان افراد میں اپنا نام بھی شامل کرنے کی درخواست کی ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے اس سیٹ اپ سے نکلنا چاہتا ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگر مجھے بیرون ملک کوئی

اچھا چانس مل گیا تو میں وہیں سیشن ہو جاؤں۔ یہاں رہنا اب مجھے اپنے لیے مناسب محسوس نہیں ہو رہا ہے۔“ اس کے سوال نہ کرنے کے باوجود تارڑ نے خود ہی اپنی وزیر اعلیٰ سے ملاقات کا سبب بتا دیا۔ اس کی باتیں سن کر شہریار چونک گیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب اور الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی خلاف معمول صورت حال سے دوچار ہے۔

”کیا بات ہے تارڑ صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟“ آخر کار اس نے تارڑ سے پوچھ ہی لیا۔

”میں اپنے آپ کو یہاں اُن سیف محسوس کرنے لگا ہوں۔ آپ دیکھیں تاکہ حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخص محفوظ نہیں۔ آپ اپنے اغوا کی ہی مثال لے لیں۔ وہ تو آپ کی قسمت اچھی تھی کہ نہ جانے کس وجہ سے اغوا کاروں نے آپ کو آزاد کر دیا ورنہ یہاں تو بندہ غائب ہو جائے تو اس کا کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا۔“ اس نے اپنی پریشانی کا سبب بتایا لیکن شہریار یہ جواب سن کر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اور بھی بات ہے جسے تارڑ بتانا چاہتا ہے لیکن جھجک کا شکار ہے۔

”آپ پولیس والے ہو کر خود ڈر رہے ہیں تارڑ صاحب... یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔“ تارڑ کو ٹٹولنے کے لیے وہ اسے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

”پولیس والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ پشت پر سے ہونے والا حملہ وہ بھی نہیں روک سکتے۔ آپ سجاد رانا صاحب ہی کی مثال لے لیں۔ وہ تو مجھ سے بہت اوپر کے افسر تھے لیکن ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان کی ردی ان کی حفاظت تو نہیں کر سکی تا۔“ اس نے گویا دلیل کے ساتھ شہریار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”خیر، سجاد بھائی کا تو کیس ہی الگ ہے۔ وہ جن خطرناک مجرموں کے خلاف کام کر رہے تھے، ان کے اختیارات اور وسائل بہت زیادہ تھے لیکن آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ آپ تو ایک چھوٹے سے ضلع کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں اور وہاں بھی آپ کی اچھی پی آر ہے۔“ اس نے نہایت نرمی سے ایک بار پھر تارڑ کو طنز کی پلیٹ میں لیا۔

”پی آر وی آر کیا ہوتی ہے سراج طاقتور لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو استعمال کرتے ہیں اور جب انہیں لگے کہ یہ بندہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا، اسے اپنے راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں لگاتے۔“ تارڑ کا یہ جملہ بے حد چونکا دینے والا تھا۔ شہریار نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ تارڑ کو استعمال

کرنے والا طاقتور شخص صرف ایک ہی تھا۔ چودھری افتخار عالم شاہ... اور تارڑ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے چودھری کی طرف سے کوئی خطرہ درپیش ہے۔

”آپ مجھ سے کھل کر بات کریں تارڑ صاحب! آخر آپ کس قسم کے خدشات کا شکار ہیں؟“ اس نے تارڑ سے اصل بات اگلوانے کی کوشش کی۔

”نہیں سر! مجھے خدشات لاحق تھے لیکن اب میں مطمئن ہوں۔ کچھ دنوں میں، میں ملک سے باہر نکل جاؤں گا اور جب یہاں ہوں گا ہی نہیں تو پھر خطرے کی بھی کوئی بات نہیں رہے گی۔“

”اوکے! آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی۔“ تارڑ کا گریز دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

”مجھے اجازت دیں سر! آپ کا کافی وقت لے لیا۔“ وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شہریار نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ آج پہلی بار اسے تارڑ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کے دباؤ میں دوستانہ گرم جوشی محسوس ہوئی تھی۔

”اپنا خیال رکھیے گا سر اور ساتھ ہی محتاط بھی رہیے گا۔ زندگی ایک باریکتی ہے اور اسے ایڈونچر کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔“ مصافحہ کرتے ہوئے اس نے شہریار کو نصیحت کی۔

”مشورے کا شکریہ لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ میں اپنی زندگی کسی ایڈونچر کی نذر کرنے کے بجائے اسے مشن کے تحت بسر کرنے والا آدمی ہوں... اور مشن کی تکمیل کے لیے جان پر کھیل جانا بہادریوں کا کام ہوتا ہے۔“ شہریار نے اسے دوبارہ جواب دیا۔

”شاید آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں... مرنے تو بہر حال آدمی کو ہوتا ہی ہے۔ اقبال باجوہ کے بارے میں یاد ہے آپ کو کہ بے چارہ اچانک ہی مر گیا تھا۔“ اس نے سابقہ فاریسٹ آفیسر کا حوالہ دیا۔ اقبال باجوہ وہ شخص تھا جس کے تعاون سے ہی چودھری نے جنگل سے لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگلنگ کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ ایس پی تارڑ خود بھی اس کام میں شامل تھا لیکن اب جانے کیا ہوا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

”باجوہ کی موت طبعی نہیں تھی سر! اسے ایک ایسا زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا جو بظاہر ہارٹ اٹیک کی علامات دکھاتا ہے... لیکن حال ہی میں ہونے والے باجوہ کی لاش کے پوسٹ مارٹم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی ہے۔“ وہ ابھی تارڑ کے روئے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ اچانک اس

پر یہ انکشاف کر کے تیز تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔ اس کا یہ انکشاف شہریار کے لیے خاصا دھماکا خیز تھا۔

پیر آباد میں کڑھوت پر ڈاکٹر ماریا اور ڈاکٹر داور دونوں نے منتظر طور پر یہ فیصلہ سنایا تھا کہ باجوہ کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں کی اس تشخیص کے بعد باجوہ کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا تھا۔ صورت حال میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی لیکن اب تارڑ اس پر انکشاف کر کے گیا تھا کہ باجوہ کی موت درحقیقت مہلک زہر سے ہوئی تھی اور یہ بات پوسٹ مارٹم کے ذریعے معلوم ہوئی تھی۔ موت کے اتنے دنوں بعد قبر سے لاش نکلا کر اس کا پوسٹ مارٹم کروانے کی ضرورت کسے اور کیوں محسوس ہوئی، ان سوالات کے جواب یقیناً تارڑ ہی دے سکتا تھا... لیکن وہ تو اسے الجھن میں گرفتار کر کے خود وہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

کشور کو عجیب سی ٹھن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ آج کل اس کی طبیعت کا یہی عالم تھا۔ کبھی دم گھٹتا، کبھی مٹکی ہونے لگتی اور کبھی دل گھبراتا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری کیفیات وہ ہیں جن سے تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والی ہر عورت کو گزرنا پڑتا ہے لیکن بد قسمتی سے وہ ایک ایسی صورت حال میں اس اہم مرحلے سے گزر رہی تھی جس میں اسے ہر حال میں اپنا یہ راز چھپانا تھا... ورنہ نہ صرف اس کی اور آنے والے بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی بلکہ حویلی والے اس کھوج میں بھی لگ جاتے کہ اسے اس حال تک پہنچانے کا ذمے دار کون ہے؟ وہ آفتاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لیے بہت محتاط تھی۔ احتیاط کے باعث ہی وہ اپنے کمرے سے بھی کم ہی باہر نکلتی تھی کہ نہ کسی کا سامنا ہو اور نہ ہی کوئی اس کا بھید پاسکے۔

حویلی میں اس کی اس روش کو بہت زیادہ تشویش سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ پہلے بھی تنہا پسند تھی اور اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان ہی گزرتا تھا۔ چنانچہ کمرے میں رہنے کے اوقات مزید طویل ہوئے تو کسی نے بہت زیادہ دھیان نہیں دیا۔ الٹیوں وغیرہ کے سلسلے میں ڈاکٹر ماریا کے اس بیان کے بعد کہ وہ ڈاکٹر یا کا شکار ہوئی ہے، وڈی چودھرائی کا شک بھی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے جو دوا میں دی تھیں، وہ الٹیوں اور مٹکی کو روکنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی تھیں اور دوبارہ کسی کے سامنے اس کی طبیعت اس طرح نہیں بگڑی تھی کہ اسے جواب دہ ہونا پڑتا۔

لیکن بہر حال وہ اپنی زندگی کے ایک تہایت نازک تجربے سے گزر رہی تھی جس میں طبیعت کا بالکل معمول پر رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ عمومی حالات میں اس مرحلے سے گزرنے والی عورتوں کو یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ ارد گرد والے ان کا خیال رکھتے ہیں اور تجربہ کار لوگوں کے مشورے مشکل کو آسان بنا دیتے ہیں لیکن وہ تو کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ ابھی تو اسے یہ موقع بھی نہیں ملا تھا کہ آفتاب کو بھی یہ خوش خبری سنا دیتی۔ رانی کی حویلی سے غیر موجودگی نے اسے بالکل بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح آفتاب سے رابطے کی راہ نکالے۔ موبائل فون لاہور والی کو بھی میں اس کے ہاتھ سے اس وقت نکل گیا تھا جب آفتاب کے دوست افضل کی بیوی مہتاب اس سے ملنے وہاں آئی تھی اور اسی وقت اچانک ہی اس کی ماں چودھرائن ناہید بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ماں سے مہتاب کا تعارف اتفاقاً بن جانے والی ایک دوست کے طور پر کروایا تھا جس پر اس نے واضح ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اسی وقت اس کی نظروں میں کشور کا موبائل بھی آگیا تھا۔ کسی مشکل میں پڑنے سے بچنے کے لیے کشور نے موبائل کو مہتاب کی ملکیت قرار دیتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا، یوں وہ خود موبائل سے محروم ہو کر آفتاب سے رابطے کی صورت کھو بیٹھی۔ ان حالات میں اس پر اپنی طبیعت کے سلسلے میں ہونے والا انکشاف بڑا سخت ثابت ہوا۔ ایک طرف اگر وہ اپنی محبت کی اس نشانی کے پھوٹنے پر خوش تھی تو دوسری طرف یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کسی پر کچھ ظاہر نہ ہو جائے۔

خوف اور خوشی سے بھرے یہ دن وہ بالکل تنہا گزارنے پر مجبور تھی اور یہ تنہائی کبھی کبھی اس کی گھبراہٹ میں بے پناہ اضافہ کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گھبراہٹ کا شکار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ ارادہ تھا کہ کچھ دیر پا میں باغ میں جا کر کھلی فضا میں ٹہلے گی تاکہ طبیعت کچھ فریش ہو جائے لیکن اپنے کمرے سے نکل کر برآمدہ طے کرنے کے بعد جب وہ حویلی کے اس حصے میں پہنچی جہاں سے باہر کی طرف جانے کا راستہ گزرتا تھا تو وہاں ڈاکٹر ماریا کو دیکھ کر چونک گئی۔ ڈاکٹر ماریا اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ کھڑی تھی اور قریب ہی وڈی چودھرائن بھی موجود تھی۔

”ہماری چھوٹی بہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمہ کا کہنا ہے کہ اسے وڈی الٹیاں ہو رہی ہیں اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے کہ اسے دیکھ لو۔ آج کل شاید اس مرض کی وبا پھیل گئی ہے۔ پہلے کشور بیمار ہوئی، اب بہو نیگم کا مسئلہ ہو گیا۔

میں نے کہا کہ اگر کہیں مصیبت ماری مر مرا گئی تو وڈے چودھری صاحب کو کیا جواب دوں گی۔ ایسا کرو، تم اوپر جا کر اسے دیکھ لو اور کوئی دوا شواہے دو تاکہ یہ سیپا پا تو ملے۔“ وڈی چودھرائن اپنے مخصوص تنگناہ لہجے میں ڈاکٹر ماریا سے مخاطب تھی۔ ڈاکٹر ماریا نے اس کے لہجے کو یقیناً پسند نہیں کیا ہو گا تاہم وہ زبان سے کوئی اظہار کیے بغیر چپ چاپ بالائی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ کشور جو ایک آڑ میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی، اپنی جگہ ٹھک کر رہ گئی۔ اپنے حالیہ تجربے کے بعد اسے فریادہ کی حالت کے بارے میں سن کر تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ فریادہ جو کہ نور پور کے زمیندار کی بہن تھی اور جسے چودھری جبرائیل نے اپنی معذور بیٹی بہنرادشاہ کی منکوحہ بنا کر حویلی لے آیا تھا، درحقیقت چودھری کی ہوس مٹانے کا سامان بنی ہوئی ہے۔ اس راز سے صرف کشور واقف تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ذرا قرا سی باتوں کے لیے کھوج میں پڑ جانے والی وڈی چودھرائن فریادہ کی طبیعت کے بارے میں سن کر اس لیے نہیں چونکی تھی کہ اس کے نزدیک فریادہ ذہنی معذور بہنرادشاہ کی بیوی تھی اور بہنرادشاہ اس لائق نہیں تھا کہ بیوی کے حقوق ادا کر سکتا لیکن اصل حالات سے واقف کشور کا ٹھٹک جانا تو لازمی تھا۔

وہ پائیں باغ میں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وڈی چودھرائن کے منظر سے ہٹ جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت چودھرائن کی چچیاں چچی اور شادو بھی اس کی جاسوسی کے لیے اس کے قریب موجود نہیں تھیں۔ یہ مغرب سے کچھ دیر قبل کا وقت تھا اور اس وقت حویلی کے باورچی خانے میں رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں زیادہ تر ملازمائیں وہیں مصروف ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر ماریا کے اوپر جانے کے دو چار منٹ بعد وڈی چودھرائن وہاں سے ہٹی تو کشور کو سیڑھیاں چڑھنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ جب سے وہ لاہور سے واپس آئی تھی، اس پر اوپر جانے پر پابندی عائد تھی۔ پابندی کی تو شاید وہ اتنی پروا نہیں کرتی لیکن درحقیقت وہ اپنے مسئلے میں اس طرح الجھ کر رہ گئی تھی کہ اسے فریادہ کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر پہنچی تو حسب معمول وہاں خاموشی کا راج تھا۔ اوپر کچن ہی کتنے تھے۔ فریادہ، بہنرادشاہ اور ان کی ایک ملازمہ۔ اگر بہنرادشاہ کو دورہ پڑ جاتا یا وہ کسی بچکا تا ضد پراثر جاتا تو اس خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ ورنہ وہاں سنائے ہی بولتے رہتے تھے۔ اوپر پہنچ کر

کشور نے بہنرادشاہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اندر جھانکا تو وہ اسے اپنے بیڈ پر اس حال میں بیٹھا ہوا نظر آیا کہ اس کی گردن پر نیچیں لپٹا ہوا تھا اور ملازمہ اس کے سامنے بیٹھی اسے بڑے سے پیالے میں موجود کوئی دلیا نما شے کھا رہی تھی۔ کشور خاموشی سے دبے پاؤں وہاں سے گزری گئی اور فریادہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے سیدھے اندر داخل ہونے کے بجائے باہر ہی رک کر اندر کی سن گن لی۔

”ڈاکٹر صاحبہ! تینوں رب دا واسطہ اس گل کی کسی نوں خبر نہ ہونے دینا۔“ اسے اندر سے فریادہ کی منت بھری آواز سنائی دی اور ذہن میں پلٹا ٹھک اور بھی مضبوط ہو گیا۔ ”لیکن کیوں؟ یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ چودھری صاحب اور حویلی کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تم ماں بننے والی ہو تو سب بہت خوش ہوں گے۔ آخر تم حویلی کی بہو ہو اور حویلی والوں کی نسل بڑھانے کا سبب بنو گی۔“ جواب میں ڈاکٹر ماریا اس سے حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

”میں حویلی کی بہو تو ہوں لیکن ناپسندیدہ۔۔۔ یہ لوگ میرے بھائی سے انتقام لینے کے لیے زبردستی مجھے ویاہ کر یہاں لائے تھے اور فیئر لا کر اس تنہائی میں ڈال دیا۔ اگر ان کی نظر میں میرا بہو والا مقام ہوتا تو یہ مجھے اس طرح الگ تھلک کیوں ڈالتے؟ بس تسی مہربانی کرو کہ کسی کو ابھی یہ گل نہ پتا لگنے دو۔ مینوں ڈر ہے کہ اگر کسی نوں خبر ہو گئی تو فریادہ لوگ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس بچے کی جان کے دشمن بن جائیں گے۔“ فریادہ بڑی لجاجت سے ڈاکٹر ماریا سے درخواست کرتے ہوئے اسے اپنا نقطہ نظر سمجھا رہی تھی جبکہ باہر کھڑی ہوئی کشور کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہونے لگا۔

”ٹھیک ہے، فی الحال میں خاموش رہوں گی لیکن یہ کوئی چھپنے والی تو بات نہیں۔ آخر کار دوسروں کو اس کا علم ہو ہی جائے گا۔“ ڈاکٹر ماریا نے رضا مندی ظاہر کرنے کے ساتھ فریادہ کو آنے والے وقت سے بھی خبردار کیا۔

”پتا لگنے میں بھی وقت لگے گا۔ ویسے بھی ادھر آتا کون ہے جو کچھ دیکھ سکے۔ مہینا بھر تو گزر گیا ہے مجھے اس حال میں۔ دو تین مہینے ہو کر گزر گئے تو فریادہ کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ابھی بھی تو کرانی نے نیچے خبر پہنچا دی تھی میری طبیعت خراب ہونے کی تو وڈی چودھرائن نے آپ کو بلوا ڈالا۔ آئندہ کے لیے میں تو کرانی کو سختی سے منع کر دوں گی۔ آپ بھی مجھے کوئی دوا شواہے جانا تاکہ طبیعت خراب ہو تو میں کھا کر گزارہ کر

لوں۔“ فریادہ نے گویا سب کچھ سوچ رکھا تھا، سو بڑے اطمینان سے ڈاکٹر ماریا سے کہہ رہی تھی۔ کشور سے اب مزید برداشت نہ ہو سکا اور وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اچانک اندر داخل ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر ماریا اور فریادہ دونوں ہی چونک گئیں لیکن پھر اسے سامنے پا کر دونوں کے چہروں پر اطمینان کے رنگ آ گئے۔ کشور اس معاملے میں ضرور رساں ثابت نہیں ہو سکتی، یہ بات دونوں ہی سمجھتی تھیں۔

”آئیں کشور صاحبہ! میں سوچ ہی رہی تھی کہ حویلی آئی ہوں تو آپ کی طبیعت بھی معلوم کر رہی ہوگی چلوں گی۔ اچھا ہوا، آپ خود ہی یہاں آ گئیں۔“ ڈاکٹر ماریا نے ایک طرح سے اسے بتایا کہ اگر وہ اس کے اور فریادہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکی ہے تو اپنی زبان بند رکھے ورنہ خود اس کا اپنا راز بھی افشا ہو سکتا ہے۔

”میں ٹھیک ہوں اور آپ کی دی ہوئی دوائیں پابندی سے کھا رہی ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو آپ سے رابطہ کر لوں گی۔“ اس نے ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا اور فریادہ کے قریب بیٹھ کر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے اس چھوٹی سی لڑکی سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جو پہلے ہی بہت مشکل میں تھی اور اب ایک اور بوجھ اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فریادہ کو اپنے اوپر ڈھائے جانے والے ظلم کی نشانی اس بچے میں اتنی دیکھ سکیوں ہے کہ وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے خود کو مشکل میں ڈال رہی ہے۔

”وائے ناٹ۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہو گی۔ آپ دونوں میں سے جس کو بھی، جب بھی میری ضرورت ہو، آپ بلا تکلف مجھے کال کر سکتی ہیں۔“ اس کی سوچوں سے بے خبر ڈاکٹر ماریا نے خوشگوار لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور خود اپنا میڈیکل باکس سنبھال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہو ڈاکٹر۔“ کشور نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر ماریا مسکرائی ہوئی ان دونوں سے مصافحہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد کشور فریادہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟ کیوں گناہ کی اس پوٹ کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہو؟“ ”کیونکہ اسی میں میری بھلائی ہے۔ حقیقت جو بھی ہے لیکن کہلائے گا تو یہ بہنرادشاہ کی ہی اولاد نا۔ میں اس بچے کے ذریعے حویلی میں اپنے قدم مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔ حویلی کے وارثوں میں سے ایک کی ماں بن کر میرا مقام

تبدیل ہو جائے گا۔“ فریدہ نے اس پر اپنا نقطہ نظر ظاہر کیا۔
”لیکن کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ بچہ بہن زاد شاہ کی اولاد ہے۔“ کشور نے اسے احساس دلایا۔

”اس بات کو تمہارا باپ تسلیم کر دے گا، ورنہ میں سب کے سامنے یہ راز کھول دوں گی کہ بچہ بہن زاد شاہ کا نہیں بلکہ چودھری افتخار عالم شاہ کی اولاد ہے۔“ فریدہ کا لہجہ سخت سنگین تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس پر عمل بھی کر گزرے گی۔ ایک ایسا شخص جو اپنا سب کچھ گنوا چکا ہو، اسے پھر کسی بات کا ڈر نہیں رہتا۔ فریدہ سے بھی اس کا گھر، محبوب اور عزت سب کچھ چھین لیے گئے تھے چنانچہ وہ ہر خوف سے آزاد ہو گئی تھی۔ کشور نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ اس نے بے ساختہ ہی فریدہ کو گلے لگایا اور ہمدردی سے بولی۔

”اللہ تمہاری مشکلات دور کرے۔ میری تو دلی خواہش تھی کہ تم اس مشکل سے نکل جاؤ اور قربان کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارو لیکن خود میں حالات کے گرداب میں اس طرح پھنسی ہوئی ہوں کہ تمہارے لیے کچھ کر نہیں پا رہی۔ ان حالات میں، میں تمہارے لیے بس یہ دعا ہی کر سکتی ہوں کہ زندگی تم پر مہربان ہو جائے اور تم میرے باپ کے ظلم سے آزاد ہو جاؤ۔“

”میں اس کے ظلم سے بچ کر نکل سکوں یا نہ نکل سکوں لیکن یہ طے ہے کہ اسے خود ایک دن اپنے ہر ظلم کا حساب دینا ہو گا۔ اس کے دامن میں اتنی بددعا میں ہیں کہ اللہ اسے معاف کر ہی نہیں سکتا۔“ فریدہ نے جس نفرت سے بھڑپور لہجے میں یہ بات کہی، اس نے کشور کا دل لرزاکر رکھ دیا۔ مظلوم کی آہ عرش الہی کو ہلا ڈالتی ہے۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن طاقت و دولت کے نشے میں چور اپنے بدکردار و ظالم باپ کو سمجھانے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

گل شیر کے عمران کے ہاتھوں قتل ہونے والے واقعے کو تین دن گزر گئے تھے۔ ماہ بانو نے اس واقعے کا وہاں کے ماحول پر کوئی اثر نہیں دیکھا تھا۔ اسے اس کی کوٹھری میں اسی طرح معمول کے مطابق تینوں وقت خاموشی کے ساتھ کھانا پہنچایا جاتا جس میں سے وہ خود کو سمجھا بچھا کر چند لقمے زہر مار کر لیتی کیونکہ پیٹ کی آگ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کم ہی سہی بددلی کے باوجود بہر حال وہ کچھ نہ کچھ خلق سے اتار ہی لیتی تھی کہ جب تک جسم سانسوں کی ڈور سے بندھا ہے، اس کی ضروریات نجی پوری کرنی ہی ہیں۔

اس تین دن کے عرصے میں اسے عمران کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ وہ دوبارہ اسے دیکھنے کی خواہش مند بھی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں اپنے غلط اندازے نے خود اس کو بے حد مایوس کیا تھا۔ وہ شکل سے معصوم نظر آنے والا عمران اتنا وحشی نکلے گا، اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ عمران کے گل شیر کی کھوپڑی دیوار سے ٹکرائی اور توڑ ڈالنے کا منظر اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ بے شک اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کے لیے ہی کیا تھا۔ اگر وہ صحیح وقت پر وہاں نہ پہنچتا تو گل شیر اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا۔ عمران کی مداخلت کی وجہ سے وہ ایک بار پھر کسی مرد کی ہوس ناکی کا شکار ہونے سے بچ گئی تھی لیکن اسے بچانے کے لیے عمران نے جو وحشیانہ طریقہ عمل اختیار کیا تھا، وہ اس کے لیے نہایت صدمے کا باعث تھا۔ وہ اب تک اس صدمے سے پوری طرح باہر نہیں نکل سکی تھی اور چاہتی تھی کہ دوبارہ عمران سے سامنا نہ ہو لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔

تیسرا دن بھی گزر جانے کے بعد جبکہ وہ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکی تھی اور ایک آدمی کھانے کے برتن بھی لے گیا تھا، وہ آرام کی غرض سے لیٹی تو بہت دیر یوں گزر گئی۔ ایک محض دو جگہ میں بغیر ہاتھ پیر ہلائے گزرتے والے یہ شب دروز عموماً بے خواب ہی گزرتے تھے۔ نو جوانی کی وہ ایڈنڈ جو بستر پر گر کر آنکھیں موندتے ہی مہربان ہو جایا کرتی تھی، اب اکثر روٹھی رہتی تھی۔ وہ ایک عرصے سے خانہاں پر باد تھی۔ وقت کی آندھیاں اسے ادھر سے ادھر اڑائے پھرتی تھیں۔ ان حالات میں ٹھیک سے نیند آ جاتی یہ ممکن ہی کہاں تھا اور یہاں اس قید میں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً گل شیر کی حرکت کے بعد تو اس بے سکونی میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ بار بار خیال آتا کہ یہاں صرف ایک گل شیر ہی تو نہیں تھا۔ یہاں تو بہت سے مرد تھے جو انسانی آبادی سے دور اس برف زار میں ایک غیر فطری زندگی گزار رہے تھے۔ گل شیر کی طرح ان میں سے کسی اور کو بھی فطرت اکسا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں تو وہ مسلسل خطرے میں ہی تھی۔ شاید ذہن میں پلٹتا یہ خوف ہی تھا جو آج بھی وہ آنکھیں بند کر کے بہت دیر لیٹے رہنے کے باوجود سو نہیں سکی۔ لیٹے لیٹے یک دم اسے احساس ہوا کہ اس کے قریب ہی کوئی ہلکی سی آہٹ ابھری ہے۔ اس آہٹ کو سن کر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ ایک انسانی سایہ ہی تھا جسے وہ اپنے قریب دیکھ رہی تھی۔ اس سائے کو دیکھ کر اس کے اعصاب بری طرح تن گئے اور وہ جارحانہ انداز میں اپنی جگہ

سے کھڑی ہوئی۔

”دشش... شور مت مچانا۔ میں عمران ہوں اور تم سے کچھ دیر بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے تیز دیکھ کر سائے نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔ ماہ بانو نے آواز دھیمی ہونے کے باوجود شناخت کر لیا کہ یہ واقعی عمران ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس کے تپنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”کیا بات کرنی ہے تمہیں مجھ سے؟“ وہ جواب تک اس کا دوبارہ سامنا بھی نہ ہونے کی خواہش کر رہی تھی، اسے سانسے پا کر نرم پڑ گئی اور قدرے روٹھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“ وہ تھوڑے فاصلے سے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”لیکن کیوں؟ میرا اور تمہارا تعلق ہی کیا ہے جو تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانے سے دلچسپی رکھتے ہو؟“ اس نے ناراض سے لہجے میں اس سے کہا۔

”تعلق تو واقعی کوئی نہیں ہے لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں تاکہ تم مجھ سے کم از کم اتنی نفرت نہ کرو جتنی کہ پچھلے واقعات کے بعد کرنے لگی ہو گی۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے اچھے جذبات دیکھے تھے۔ تمہارے انداز سے لگتا تھا کہ تم مجھے اچھا انسان سمجھتی ہو اور مجھے تمہاری یہ رائے بہت اچھی لگی تھی۔“ دھیمی آواز میں نرمی سے بات کرتا ماہ بانو کو وہ وہی عمران لگ رہا تھا جیسا اس نے اسے پہلی بار دیکھنے کے بعد تصور کیا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اس کی بات سنتی رہی۔ عمران کہہ رہا تھا۔

”میں ہمیشہ سے ایسا جوانی یا غصہ ورنہ نہیں تھا جیسا کہ تم نے یہاں پایا ہے۔ میری شہرت تو بہت سیکھے ہوئے اور نیک

نو جوان کی تھی۔ لوگ میری ماں سے کہتے کہ اللہ نے تمہیں ایک بیٹا دیا ہے، پر بے نیک۔ امی یہ بات سنیں تو خوشی سے مسکرا دیتیں۔ شاید انہیں لگتا ہو کہ میری صورت انہیں اپنی برسوں کی ریاضت کا صلہ مل گیا ہے۔“ وہ جیسے ٹرانس کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس نیم روشن جگہ پر بھی ماہ بانو اس کی کھلی آنکھوں کو کہیں خلاؤں میں بھٹکتا ہوا محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اس سے مخاطب تھا لیکن اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ذہن میں کھل جانے والے کسی درپے سے اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔

☆☆☆

”ہم صرف دو بہن بھائی تھے۔ میں اور مجھ سے تین سال چھوٹی بہن فرحانہ۔ میرے والد ہماری کم سنی میں ہی

ایک روڈ ایکسڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس وقت امی نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر پر بچوں کو میوشن پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ان کی اس دن رات کی محنت سے ہمارے گھر کا چولہا جلنے لگا لیکن پرائیویٹ اسکول کی نوکری میں تنخواہ بھی کم ملتی تھی اور کام کا بوجھ بھی بہت زیادہ تھا۔ ایسے میں امی کی کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ وہ بی اے پاس تو ہیں ہی، ساتھ ہی بی ایڈ بھی کر لیں تو گورنمنٹ ملازمت حاصل کر سکتی ہیں۔ امی کو اپنی سہیلی کا یہ مشورہ اچھا لگا اور انہوں نے بی ایڈ کی تیاری بھی شروع کر دی۔ ان دنوں انہیں بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں وہ کس وقت سویا کرتی تھیں۔ رات کو ہم بہن بھائی جب سونے کے لیے لیٹے تو انہیں اپنی کتابوں کے ساتھ مصروف جاتے ہوئے چھوڑ کر سوتے اور صبح اٹھتے تو بھی امی جاگ رہی ہوتیں۔ ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی وہ گھر کی صفائی ستھرائی سے فارغ ہونے کے علاوہ ناشتے کے ساتھ ساتھ دن بھر کا کھانا بھی تیار کر چکی ہوتیں۔ ان کے ان مصروفیت بھرے دنوں میں بھی میں نے بھی کسی کام میں بے ترتیبی نہیں پائی۔ یہاں تک کہ وہ ہم بہن بھائی سے کبھی جھنجھلا کر یا سخت لہجے میں بات بھی نہیں کرتی تھیں۔“

اپنی ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے عمران کے لہجے میں گہری عقیدت اور مٹھاس بھری ہوئی تھی۔ ماہ بانو کو حیرت ہونے لگی کہ یہ دل میں اتنی گہری محبت رکھنے والا لڑکا آخر نفرت کی راہ پر کیسے چل پڑا؟ اس کی اس حیرت سے بے خبر وہ اپنی ہی سانسے میں مصروف تھا۔

”امی کا بی ایڈ مکمل ہوا اور انہیں اپنے کسی جاننے والے کی وساطت سے گورنمنٹ اسکول میں ملازمت ملی تو ہماری زندگی میں سکون آ گیا اور دن رات ذرا ترتیب اور آرام سے گزرنے لگے۔ میں چونکہ بڑا تھا اس لیے مجھے امی کی شانہ روز محنت اور کوششوں کا زیادہ احساس تھا۔ اس احساس کی وجہ سے ہی میں خوب دل لگا کر پڑھتا تھا کہ امی کو خوش کر سکوں۔ امی واقعی مجھ سے خوش بھی تھیں لیکن میری چھوٹی بہن فرحانہ جسے ہم پیار سے فری کہتے تھے، امی کی جدوجہد کے ان دنوں میں شاید کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں پڑنے والی اس نفسیاتی گرہ کا ہمیں کبھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ کبھی بھی ہم اس کی زبان سے ایسے الفاظ نہ سنے کہ انسان کے پاس بہت ڈھیر ساری دولت ہونی چاہیے۔ ترس ترس کر اور خواہشات کو مار کر جیتنا بھی کوئی جینا

ہے۔ تو زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ہمارے نزدیک تو یہ وہ باتیں تھیں جو آج کل کے کم از کم ستراتی فیصد نوجوان کرتے ہی تھے۔ چنانچہ جب کالج میں انڈیشن ہونے کے بعد فرحانہ کے لائف اسٹائل میں تبدیلی آئی تو میں نے یا امی نے زیادہ غور نہیں کیا۔ میں تو یوں بھی زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا، امی نے بھی اس لیے زیادہ نوٹس نہیں لیا کہ آج کل کی بچیاں پہننے اوڑھنے اور فیشن کرنے کی شوقین ہیں فرحانہ کا بھی اپنی کالج فیلوز کو دیکھ کر ذرا بین ٹھن کر رہے کو دل چاہتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

”مگر پھر بات فیشن کرنے سے کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ فرحانہ نے ہنسنے میں ایک دو دن کالج سے لیٹ گھر آنا شروع کر دیا۔ اس دیر کے لیے اس کے پاس یہ جواز تھا کہ اسے پریکٹیکل کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ وہ ایف ایس سی پری میڈیکل کی طالبہ تھی اس لیے اس کا یہ بہانہ بھی قبول کر لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ امی ہم دونوں بہن بھائی پر بے پناہ اعتماد کرتی تھیں۔ انہیں اپنی تربیت پر پورا بھروسہ تھا۔ میری حد تک یہ بھروسہ قائم بھی رہا۔ فرحانہ بھی بہر حال کردار کے اعتبار سے کوئی خراب لڑکی نہیں تھی بلکہ فطرتاً وہ بہت معصوم اور بھولی بھالی تھی جس کی وجہ سے اسے زمانے کی چالاکیاں اور چال باز یوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ اپنی اسی معصومیت اور کچھ دولت کی خواہش میں وہ ایک صنعت کار کے اوباش بیٹے کے جال میں پھنس گئی۔ اس لڑکے نے اسے نہ جانے کون کون سے سنہری خواب دکھائے کہ وہ اس کی محبت کے سحر میں گرفتار ہو گئی اور گھر والوں سے چھپ کر کالج سے باہر اس سے ملاقاتیں کرنے لگی۔ میں اور امی ان حالات سے قطعی ناواقف تھے۔ ہم پر تو اس وقت پہاڑ ٹوٹا جب ایک روز فرحانہ کالج سے شام ڈھلنے کے بعد گھر آئی۔ امی کو اس نے کالج جاتے ہوئے یہ تو بتا دیا تھا کہ آج اس کے پریکٹیکل کا دن ہے اس لیے واپسی میں دیر ہو جائے گی لیکن اتنی زیادہ دیر ہو جانے پر امی پریشان ہوئیں اور انہوں نے فرحانہ کی دوستوں وغیرہ کو فون کر کے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اس کی ہر دوست نے یہی جواب دیا کہ آج کوئی پریکٹیکل نہیں تھا اور فرحانہ معمول کے مطابق کالج سے روانہ ہوئی تھی۔ یہ سن کر امی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فرحانہ کو کہاں تلاش کریں۔ میں بھی اس روز ایک انٹر کالج ڈیپٹ کمیشن میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ شام گئے گھر واپس پہنچا تو امی کو بے چینی سے ٹھٹھا ہوا پایا۔ ان سے سب پوچھنے پر فرحانہ کے غیاب کا علم ہوا تو میں بھی ٹھہرا گیا۔

”میں اور امی کوئی لائحہ عمل طے کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ فرحانہ گھر واپس آگئی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور وہ زخمی بھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر امی کی چھین نکل گئیں۔ فرحانہ نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ کالج سے واپس آتے ہوئے اسے ایک گاڑی نے ٹکرا دی تھی جس کی وجہ سے اس کا یہ حال ہو گیا۔ گاڑی والا تو ٹکرا مارنے کے بعد فرار ہو گیا لیکن ایک ہمدرد راہ گیر نے اسے اسپتال پہنچا دیا جہاں اسے کئی گھنٹوں بعد ہوش آیا اور ہوش آتے ہی وہ رکشے میں بیٹھ کر گھر آگئی۔ اس کی سنائی یہ کہانی سن کر امی نے اس سے سوال جواب کرنے چاہے لیکن میں نے ان سے کہا کہ ابھی وہ فری کو آرام کرنے دیں۔ صبح جب وہ اٹھے گی تو آپ اس سے تفصیلات پوچھ لیجیے گا۔ امی نے میری بات مان لی لیکن افسوس کہ دوسری صبح فرحانہ اٹھی ہی نہیں اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ رات کے نہ جانے کون سے پہر اس نے اپنی دونوں گلاٹیوں کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ ہمیں تو صبح بس اس کی لاش ہی ملی اور ساتھ ہی ایک خط بھی جس میں اس نے مجھے اور امی کو مخاطب کر کے ہم سے معذرت طلب کی تھی۔“

بہت دیر سے مسلسل بولتا عمران داستان کے اس مرحلے پر آ کر یک دم چپ ہو گیا۔ ماہ بانو نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور شاید وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں ہی خاموشی اختیار کر گیا تھا۔ رنج میں ڈوبے اس نوجوان کے لیے دل میں گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے دھیرے سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ یہ ایک خاموش دلاسا تھا جس نے عمران کو سنبھلنے میں مدد دی اور اس نے ایک بار پھر اپنی داستان کا سلسلہ جوڑ دیا۔

”فرحانہ نے اپنے اس خط میں واضح طور پر لکھا تھا کہ وہ کس صنعت کار کے بیٹے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی اور وقتاً فوقتاً اس سے ملنے یا ہر جاتی رہتی تھی۔ آخری ملاقات میں وہ لڑکا اسے کلفٹن پر واقع اپنے اپارٹمنٹ لے گیا کہ چلو تمہیں وہ گھر دکھاتا ہوں جہاں تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی فرحانہ خوشی خوشی اپنا مستقبل کا گھر دیکھنے اس کے ساتھ چلی گئی لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ جال میں پھنس گئی ہے۔ اپارٹمنٹ میں اس امیر زادے کے چار دوست اور بھی تھے۔ ان سب دوستوں نے مل کر میری معصوم بہن کی آبروریزی کی۔“ یہ سب بتاتے ہوئے عمران کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔

”انہوں نے اس موقع پر اس کی تصویریں بھی کھینچ

لیں اور اپنی درندگی کے نتیجے میں اس کے جسم پر لگنے والی چوٹوں پر معمولی مرہم پٹی کرنے کے بعد یہ دھمکی دے کر وہاں سے روانہ کر دیا کہ اگر تم نے کسی کو ہمارے بارے میں بتایا تو یہ تصویریں تمہارے گھر پہنچانے کے علاوہ کالج میں بھی پھیلا دی جائیں گی۔ فرحانہ ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی تھی یا اس وقت اتنے شدید صدمے میں تھی کہ اس نے اس دھمکی کے باوجود میرے اور امی کے نام لکھے جانے والے اپنے آخری خط میں اس لڑکے کی نشان دہی کر دی۔ امی تو فرحانہ کی موت اور اس خط کی وجہ جان کر صدمے سے اس بُری طرح چُور ہوئیں کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ اسپتال پہنچ گئیں۔ ان کے اسپتال میں داخل ہونے کے بعد کون تھا جو مجھے روکنا یا کچھ سمجھاتا بچھاتا۔ میں نے تھانے میں اس واقعے کی رپورٹ لکھوا دی اور فرحانہ کا خط تھانے دار۔۔۔ کو دکھا کر اس سے مطالبہ کیا کہ میری بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے شخص کو گرفتار کیا جائے۔ تھانے دار بے وقوف نہیں تھا کہ میری بات پر کان دھرتا۔ اس نے لڑکے کے صنعت کار باپ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ جناب کے بیٹے کے خلاف یہ رپورٹ درج ہوئی ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ کیا کہتے ہیں؟ صنعت کار کو کیا کہنا تھا، اس نے تھانے دار کا کھلا ہوا منہ فونوں سے بھر کر بند کر دیا۔ اور اس طرح فرحانہ کے قتل کا کیس شروع ہونے سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ میں بے بس سا کبھی انصاف کے لیے تھانے کے چکر لگاتا اور کبھی اسپتال میں داخل امی کو دیکھنے جاتا۔

”اس روز میں امی کے پاس اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ اب وہ نہیں رہی ہیں۔ ڈاکٹر خود حیران تھے کہ ری کور کرتے کرتے اچانک انہیں کیا ہو گیا۔ میرا میڈیکل اسٹاف سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص امی سے ملنے آیا تھا اور ان کے لیے ایک لفافہ لایا تھا۔ امی نے اس لفافے کو کھول کر دیکھا تو اس کے بعد ان کی حالت بگڑ گئی اور پھر دوبارہ نہ سنبھل سکیں۔ میں نے امی کے سامان کی تلاشی لی تو ان کے پیرس میں سے وہ لفافہ مل گیا۔ لفافے میں تصویروں کے کچھ ٹکڑے تھے جو یقیناً امی نے ہی کیے تھے۔ میں نے ان ٹکڑوں کو جوڑ کر دیکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ امی کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ وہ فرحانہ کی وہی تصویریں تھیں جو ان اوباش لڑکوں نے اسے دھمکانے کے لیے کھینچی تھیں اور اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس دھمکی پر عمل کرنے سے باز نہیں آئے۔ مجھے امی کی موت نے بالکل پامال کر کے رکھ دیا اور میں ہر مصلحت کو بھول کر اس امیر زادے کو ڈھونڈنے نکل گھر آیا۔ میں ارادہ

کر کے نکلا تھا کہ وہ مجھے مل گیا تو میں اسے جان سے مار دوں گا لیکن اپنی اس دیوانگی میں، میں نے یہ تک سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کسی کو قتل کرنے کے لیے کسی ہتھیار وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

”جوش و جذبات سے بھرا میں نہایت ہی اسپتال سے سیدھا اس امیر زادے کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہاں گیٹ پر گارڈز کھڑے تھے۔ مجھے اندر کون جانے دیتا؟ میرے پیچھے چلانے اور زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرنے پر گارڈز نے مجھے مار مار کر ادھ موٹا کر دیا اور پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا کہ اس شخص نے قاتلانہ حملے کی کوشش کی ہے۔ پولیس نے مجھے اور مار مار پھر میں تین مہینے تک سلاخوں کے پیچھے قید اپنی بے بسی پر روتا رہا۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ نہ بہن رہی تھی نہ ماں۔ ماں کو تو میں... اس کے جنازے کو کندھا دے کر قبرستان تک بھی نہیں پہنچا سکا تھا۔ میرا تعلیمی سلسلہ جو کہ میرے روشن مستقبل کا راستہ تھا، وہ بھی سلاخوں کے پیچھے ہونے کے باعث منقطع ہو گیا۔ خیر، ان دنوں میں جس کیفیت سے گزر رہا تھا، اگر آزاں بھی ہوتا تو کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے شب و روز عجب وحشت کے عالم میں گزر رہے تھے۔ کبھی میں دن بھر بھوکا رہتا تو کبھی رات رات بھر روتا رہتا۔

”میری یہ حالت دیکھ کر ایک دن ایک ساتھی قیدی میرے پاس آیا اور کچھ ایسی ہمدردی سے مجھ سے میرے حالات پوچھے کہ میں اس سے کچھ بھی نہیں چھپا سکا۔ اس شخص نے میرے حالات سننے تو مجھے سمجھایا کہ اس طرح بزدلوں کی طرح روتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ خود میں حوصلہ پیدا کرو اور اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ لو۔ وہ شخص اس دن کے بعد ہر روز مجھے اس طرح کی نصیحتیں کرتا۔ آخر کار میں اس کی باتوں سے متاثر ہونے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسی تنظیم سے وابستہ ہے جو اسی طرح کے مظالم کے خلاف جہاد کرنی ہے اور ظالموں کو ان کے صحیح انجام تک پہنچاتی ہے۔ اس شخص کی باتیں سن کر میں تنظیم کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا۔

”میرے نزدیک واقعی وہ لوگ لائق تحسین تھے جو اپنی ذات کو فراموش کر کے معاشرے کی اصلاح کے لیے بے لوث خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس بے پناہ متاثر ہونے کا ہی اثر تھا کہ جب چھ ماہ بعد مجھے اپنے کچھ دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہائی نصیب ہوئی تو میں سیدھا اس تنظیم کے افراد کے پاس پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے اپنی بہن کے قاتلوں سے انتقام لینے کے قابل

بنادین گئے لیکن اس کے لیے مجھے کچھ صبر سے کام لینا ہوگا اور تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ ابتدائی دو تین ماہ انہوں نے مجھے شہر میں ہی رکھ کر تربیت دی اور یہ جانچ لینے کے بعد کہ میں اپنے ارادے میں مضبوط ہوں، یہاں منتقل کر دیا۔ یہیں مجھے اطلاع دی گئی کہ تنظیم کے ساتھیوں نے میری بہن کے قاتل سے انتقام لے لیا ہے۔ اس روز تم نے جو ویڈیو دیکھی تھی، وہ اسی شخص کی تھی۔ تم چاہے اسے ظلم کہو لیکن مجھے وہ منظر دیکھ کر بڑا سکون ملا تھا۔ میری محسوس بہن کی زندگی برباد کر دینے والا اور ہمارے ہستے ہستے گھر کو ختم کر دینے والا ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔“

آخری جملے بولتے ہوئے عمران کے لہجے میں نفرت کا وہی زہر بھر گیا تھا جس نے اس جیسے سبھی کو طبیعت کے نوجوان کی شخصیت بدل کر رکھ دی تھی اور وہ ان لوگوں کے درمیان آپہنسا تھا جو کسی طور بھی مثبت سوچ کے حامل نظر نہیں آتے تھے۔ عمران کے ماضی کے تناظر میں ماہ بانو کو تین دن قبل پیش آنے والا واقعہ بھی سمجھ آ گیا تھا۔ گل شیر کو اس کی عزت کے درپے دیکھ کر یقیناً عمران کو یونہی لگا ہوگا کہ اس کی اپنی بہن کی عزت خطرے میں ہے۔ اپنی بہن کو تو وہ بچا نہیں سکا تھا اور اس کے قاتل کو بھی اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کر سکا تھا، چنانچہ اس نے گل شیر کو وہی امیر زادہ تصور کرتے ہوئے اپنی ساری نفرت اور غصہ اس پر نکال ڈالا۔

”مجھے تمہارے حالات جان کر دلی رنج ہوا ہے لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، وہ صحیح نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ صحیح ہیں جنہوں نے تمہیں برائیوں کے خلاف جہاد کے نام پر اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ یہ وحشت زدہ نیم دیوانے لوگ جن کی آنکھوں سے انسانیت کی ریت بھی مٹنے لگی ہے، مجاہد کہلانے کے حق دار ہو ہی نہیں سکتے۔ مجاہد کا تو بڑا مقام اور رتبہ ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت نہیں بلکہ نور برستا ہے۔ یہاں تمہیں کسی ایک شخص کے چہرے پر بھی ذرا سا بھی نور دکھائی دیا؟“ عمران کی ساری داستان سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ آخر میں اس سے کہنے لہجے میں پوچھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی ان لوگوں میں مجاہدین والی کوئی بھی خوب نہیں ہے۔“ خلاف توقع عمران نے اس سے اختلاف کرنے کے بجائے فوراً ہی اتفاق کر لیا تو وہ حیران رہ گئی۔

”اصل میں، میں جن حالات میں ان لوگوں سے ملا وہ ایسے تھے کہ کوئی بھی مجھے راہ سے بھٹکا سکتا تھا۔ انتقام کے

جنون میں میری اچھے بُرے اور صحیح غلط میں فرق کرنے کی صلاحیتیں ختم ہو گئی تھیں۔ پھر ان لوگوں نے خود کو کچھ اس طرح سے میرے سامنے پیش کیا کہ میں ان کے بارے میں ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں لگا سکا۔ تین دن پہلے تک بھی میں ان لوگوں کو بالکل صحیح سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک یہ وہ خدائی فوجدار تھے جو معاشرے سے برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے بے لوث ہو کر جدوجہد کر رہے تھے۔ میں انہیں مظلوموں کا بھروسہ اور ظالموں کا دشمن سمجھتا تھا لیکن پھر اتفاق سے میں نے کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی اور نتیجتاً میری آنکھوں پر بندھی پٹی کھل گئی۔“ عمران کے ان الفاظ نے ماہ بانو کا تجسس بھڑکا دیا۔ وہ سننے کے لیے بے چین ہو گئی کہ آخر وہ کون سے حقائق تھے جنہیں جانتے کے بعد عمران ان لوگوں سے بددل ہو گیا تھا۔

”گل شیر کی ہلاکت کے اگلے دن جب میں اپنے حواسوں میں واپس آیا اور مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھوں اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک کا قتل ہو گیا ہے... جس کا ہو سکتا ہے، چند لوگوں کو افسوس بھی ہو تو میں کمانڈر کا ریکی ایکشن جاننے کے لیے اس سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں ان لوگوں کی زبان سے اپنا نام سن کر باہر ہی رک گیا کہ اچھا ہے بغیر سامنے جائے ہی ان کی رائے جان لوں۔ میں نے سنا، کمانڈر کا نائب اس سے کہہ رہا تھا کہ سراسر عمران کا کیا کریں؟ یہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جذباتی نوجوان ہے۔ کل رات اس کی وجہ سے ہمارا گل شیر جیسا قیمتی آدمی ضائع ہو گیا۔ لاکھوں کی رقم خرچ کی تھی ہم نے گل شیر کی تربیت پر... اور وہ تھا بھی اپنے کام کا ماہر۔ ہمارے تربیت دیے ہوئے آدمیوں میں... خود کش جیکٹ کی تیاری میں اس جیسی مہارت کسی اور کے پاس نہیں۔ وہ دھماکا خیز مواد کے بارے میں بے حد معلومات رکھتا تھا اور اسے اس طرح کی چیزوں کو ہینڈل کرنا بھی خوب آتا تھا۔ عمران نے اسے قتل کر کے ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے... جواب میں کمانڈر بولا کہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے اور مجھے خود بھی گل شیر جیسے آدمی کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس ہے لیکن ہم اس معاملے میں عمران کو کوئی تنبیہ بھی نہیں کر سکتے۔ گل شیر نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ اگر خود میں بھی اسے وہ حرکت کرتے ہوئے پکڑ لیتا تو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ وہ لڑکی ہمارے پاس یہاں بگ باس کی امانت ہے اور باس نے سختی سے حکم دیا تھا کہ لڑکی کو کوئی نقصان نہیں

پہنچنا چاہیے... لیکن میری تنبیہ کے باوجود گل شیر کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ تو ایک طرح سے اچھا ہوا کہ عمران موقع پر وہاں پہنچ گیا ورنہ اگر لڑکی کو کچھ ہو جاتا تو میرے لیے بگ باس کو جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ کمانڈر کی اس بات کو سن کر نائب بولا کہ وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر لیکن عمران جیسے جونیئر بندے کے ہاتھوں گل شیر جیسے سینئر کا نقصان بھی قابل برداشت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں عمران کو کوئی سزا ضرور دینی چاہیے تاکہ وہ آئندہ سرکشی سے گریز کرے۔“

”کمانڈر اپنے نائب کی یہ بات سن کر مسکرایا اور بولا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں اس معاملے پر پہلے ہی غور و فکر کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمران بہت دور تک ہمارے ساتھ چلنے والا لڑکا ہی نہیں ہے۔ وہ صرف جذبات میں آکر اس راہ پر چل پڑا ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس کی فطرت اسے اس راہ پر چلنے نہیں دے گی۔ معلوم نہیں کیسے کراچی میں موجود کیمپ کے انچارج سے اس لڑکے کو جرح کرنے میں غلطی ہو گئی اور اس نے اسے یہاں تک بھجوا دیا۔ اب مجھے اس غلطی کو سدھارنا ہوگا اور اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم جلد از جلد عمران کو استعمال کر کے اس سے اپنی جان چھڑا لیں۔ اندر کمانڈر یہ سب کہہ رہا تھا اور میں باہر کھڑا حیران تھا کہ یہ کون دھوکے باز لوگ ہیں اور کس مقصد کے تحت انہوں نے یہ سارا سیٹ اپ قائم کر رکھا ہے؟ میرے ان سوالوں کا جواب کمانڈر کی آگے کی گفتگو نے دے دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ہمارے پاس وفاقی وزیر شوکت مرزا کے قتل کا ٹاسک موجود ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اوپر سے بھی اشارہ مل چکا ہے اور یہاں ہم شوکت مرزا کے ایک مخالف کو بھی گھیر چکے ہیں کہ وہ اس کام کے لیے ہمیں معاوضہ دے دے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کام کے لیے عمران کو خود کش بمبار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ شوکت مرزا کے بارے میں، میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق دیگر برائیوں کے ساتھ ساتھ وہ کئی عورتوں کی آبروریزی میں بھی ملوث ہے۔ اس کے اس طرح کے چکروں کی افواہیں تو گردش کرتی رہتی ہیں مگر کبھی وہ پکڑا نہیں گیا ہے لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ ایسا آدمی کتنا ہی ہاتھ پیر بچا کر کام کرے، کہیں نہ کہیں اس کے جرم کا ثبوت موجود ہوتا ہے... اور یہ ثبوت عموماً صحافی برادری کے کسی بندے کے پاس ہی ہوتا ہے۔ ہمارے لوگوں نے اس صحافی کو تلاش کیا جس کے پاس شوکت مرزا کے خلاف مواد موجود تھا اور وہ اس بلیک میلنگ اسٹیف کے ذریعے اس سے بڑی بڑی رقم اینٹھ

رہا تھا۔ ہم نے صحافی سے وہ اسٹیف حاصل کر لیا۔ اب میں وہ ساری چیزیں عمران کو دکھاؤں گا اور اسے شوکت مرزا پر خود کش حملہ کرنے کے لیے اکسائوں گا۔ اس کے کل رات والے رد عمل کو دیکھتے ہوئے تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ اس کام کے لیے فوراً راضی ہو جائے گا۔ اپنی بہن کی آبروریزی کے بعد وہ ہر اس طرح کے شخص کو واجب القتل سمجھتا ہے۔ اس لیے اسے شوکت مرزا پر خود کش حملہ کرنے میں کوئی تعرض نہیں ہوگا۔ اس طرح ہمارا ایک کام بھی ہو جائے گا اور ہم عمران سے نجات حاصل کرنے سے پہلے اس پر اب تک لگنے والی رقم بھی سود سمیت وصول کر لیں گے۔“

”کمانڈر کے ان الفاظ نے جہاں مجھے لرزاکر رکھ دیا، وہیں اس کا نائب بے پناہ خوش ہوا اور بولا... یو آر سو جیسٹس سر! آپ نے مسئلے کا ایک ایسا حل ڈھونڈا ہے جسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔ میں ان دونوں کی اس گفتگو کو سن کر اتنا مشتعل تھا کہ دل چاہتا تھا، ابھی اندر جاؤں اور انہیں جان سے مار ڈالوں لیکن پھر میں نے اپنے جذبات کو قابو میں کیا اور بے پاؤں وہاں سے واپس پلٹ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری جذباتیت پہلے ہی مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچا چکی ہے اس لیے اب مجھے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا۔ میں نے وہ سارا دن معمول کے مطابق گزارا۔ پھر رات میں میرے پاس کمانڈر کا بلاوا آ گیا۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس منافق آدمی کی شکل بھی دیکھوں لیکن معطل برداشت سے کام لیتا ہوا اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ کمانڈر نے بڑی سنجیدگی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولا کہ... کل جو کچھ ہوا اس کا مجھے بہت افسوس ہے عمران۔“

”میں نے کہا... بھائی صاحب! افسوس مجھے بھی ہے۔ مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا اور اس غصے کی وجہ سے گل شیر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یقیناً آپ کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا ہوگا... لیکن کمانڈر کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے گل شیر کے قتل پر نہیں، اس کی حرکت پر افسوس ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم مجاہدین کے درمیان اس جیسا شیطانی فطرت رکھنے والا آدمی بھی موجود ہے۔ تم نے اس شیطان کو قتل کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور اس وقت میں نے تمہیں تمہارے اس کارنامے پر شاباش دینے کے لیے ہی بلایا ہے۔ اگر میں نے کمانڈر کا اصل چہرہ نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوتا۔ میں نے دل ہی دل میں اس منافق پر لعنت

بھینجی اور مصیبت اس کا شکر یہ ادا کیا کہ اس نے مجھے غلط نہیں سمجھا۔ کمانڈر میری طرف سے شکرگزاری کے اظہار پر خوش ہوا اور پھر اس نے تھیلے سے بلی نکالتے ہوئے وفاقی وزیر شوکت مرزا کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بڑھا چڑھا کر مجھے وزیر کی اخلاقی بے راہ روی کے بارے میں باتیں بتاتا رہا اور یوں کہ اس جیسا کہ پٹ شخص اس لائق نہیں کہ اسے مزید اس دنیا میں رہنے دیا جائے۔ میں نے کمانڈر کی اس رائے سے اتفاق کیا اور از خود اپنی خدمات پیش کر دیں کہ میں اس بدکردار آدمی کو ٹھکانے لگاؤں گا۔ کمانڈر نے میرے اس جذبے پر مجھے بہت شاباش دی اور بتایا کہ شوکت مرزا نہایت سخت سیکیورٹی میں رہتا ہے۔ اسے دور سے گولی مارنا یا کہیں ایسے ہی گھیر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس شخص کو ختم کرنے کے لیے ہمیں خود کش حملے کی تکنیک ہی استعمال کرنی پڑے گی۔ اس کام کے لیے تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ بارود سے بھری ہوئی گاڑی لے کر اچانک ہی شوکت مرزا کی گاڑی سے ٹکرا دو۔ گاڑی ہم تمہیں فراہم کر دیں گے اور شوکت مرزا کے شیڈول کے متعلق معلومات حاصل کر کے حملے کی جگہ اور وقت کا تعین کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہوگی۔ بس تم ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار ہو کہ تمہیں یہ کام اپنی جان کی قیمت پر کرنا ہے۔ باقی اس سلسلے میں تمہاری جوڑینگ وغیرہ ہونی ہوگی، اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

”میں نے کہا... بھائی صاحب! جان کی کوئی پروا نہیں۔ اگر ایک شیطان کو دنیا سے مٹانے میں میری جان چلی جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے جام شہادت نوش کر کے ہمیشہ کی زندگی پائی۔“

”کمانڈر میرے اس جواب سے بہت خوش ہوا اور مجھے گلے لگا کر میرے جذبے کی بہت تعریف کی۔ میں اندر ہی اندر اس کی مکاری پر کڑھتا رہا لیکن زبان اور چہرے سے اظہار نہیں ہونے دیا۔ کمانڈر کی اصلیت کھلنے کے بعد میں مسلسل سوچتا رہا کہ میرا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ میں یہاں رہ کر اکیلا ان سارے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، اسی کشمکش میں جتلا دو دن گزر گئے۔ آج شام کمانڈر نے مجھے پھر اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ کل کسی وقت مجھے یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔ روانگی کے بارے میں سن کر مجھے تمہارا خیال آ گیا اور دل میں تجسس جاگا کہ تم سے معلوم تو کروں کہ آخر تم کون ہو اور کیسے ان لوگوں کے جال میں پھنس گئی ہو۔ ممکن ہے کہ میں تمہیں اس جال سے نکالنے کے لیے کچھ کر سکوں۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی اس لیے میں موقع

ملنے ہی تم سے ملنے یہاں آ گیا ہوں۔ میں تمہیں ان بیٹھیوں کے درمیان تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ تمہاری صورت میں مجھے اپنی فری کی صورت دکھانی دیتی ہے۔ فری کو تو میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے نہیں بچا سکا تھا لیکن تمہارے لیے جو بھی کر سکا ضرور کروں گا۔“

عمران کے لہجے میں جو سچائی اور خلوص تھا، اس نے ماہ بانو کے دل پر گہرا اثر کیا اور غلط جذبات سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چند ظالموں کی وجہ سے وہ اگر حالات کے گرداب میں پھنس گئی تھی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ دست قدرت ہر جگہ بھانے بھانے سے اس کی مدد کے لیے کارفرما ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اللہ نے عمران کی صورت میں اس کے لیے ایک مددگار بھیج دیا تھا۔ وہ اس مددگار کے ظہور پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے عمران کو دھیمی آواز میں مختصر اپنے حالات زندگی سناتی چلی گئی۔ اس کی زندگی کی داستان ایسی نہیں تھی جو عمران جیسے درد دل رکھنے والے انسان کو متاثر نہیں کرتی۔ وہ خاموشی سے مگر دلی افسوس کے ساتھ اس کی داستان سنتا چلا گیا۔

”تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔ میری کوشش ہوگی کہ کل یہاں سے روانہ ہوں تو تم ہر صورت میرے ساتھ موجود ہو۔“ رات اپنا بالکل آخری پہرے طے کر رہی تھی جب عمران نے اس کے پاس سے رخصت ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور اس کے دل میں امید کی شمعیں روشن کر کے خود جس طرح تاریکی میں خاموشی سے یہاں تک آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

مشاہد خان ہنوز اسکرود میں ہی مقیم تھا۔ پولیس کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باعث وہ فی الحال اپنی ملازمت پر واپس نہیں جاسکتا تھا۔ اس طرف سے اسے کوئی پریشانی بھی نہیں تھی کیونکہ شہر یار نے اس کی چھٹی منظور کرتے ہوئے اسے وہیں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہاں رہ کر وہ اپنی ماں کی دیکھ بھال بھی کر سکتا تھا اور اکرم خان کے قاتلوں اور ماہ بانو کے اغوا کاروں کا کھوج بھی لگانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اسپتال میں داخل اس کی ماں کی حالت ہنوز پہلے جیسی تھی۔ جوان بیٹے کی موت کے غم نے اسے اتنی بری طرح متاثر کیا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر اس حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ مشاہد خان روز اسپتال جاتا اور خاموشی سے ماں کے سرہانے بیٹھا رہتا۔

اسپتال سے نکلتا تو ان لوگوں کی تلاش شروع کر دیتا جو

نیاز علی کو اپنے آٹھ کار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ نیاز علی نے مرنے سے قبل اسے یہ بتا دیا تھا کہ وہ کسی شخص کے کہنے پر پہاڑوں میں کہیں خفیہ طور پر روپوش لوگوں کے لیے خوراک اور ادویات کا ذخیرہ سلائی کرتا ہے لیکن اس نے اس آدمی کی نشان دہی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے کسی پوائنٹ کا نام بھی نہیں بتا سکا تھا جہاں سے اس سے سلائی لی جاتی ہو۔ اس کے مطابق مال وصول کرنے والے ہمیشہ مختلف مقام پر اس سے وصول کرتے تھے۔ یعنی نیاز علی کو استعمال کرنے کے باوجود وہ لوگ اس پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایسی صورت میں مشاہد خان کے پاس یہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ اس شخص کو تلاش کرے جو یہاں اسکرود میں نیاز علی کو آگے لے جانے کے لیے سامان فراہم کرتا تھا۔ اس شخص کی تلاش کے لیے اس نے نیاز علی کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بہت زیادہ لوگوں سے تعلقات نہیں تھے اور کچھ عرصے سے تو اس نے دوستوں وغیرہ سے ملنا تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔ بس لے دے کر ٹورسٹ کمپنی میں اس کے ساتھ ملازمت کرنے والے چند ساتھی ہی تھے جن سے اس کا تھوڑا میل ملاپ تھا۔ مشاہد خان نے ان ملازمین اور کمپنی کے مالک پر نظر رکھنی شروع کر دی لیکن تنہا ہونے کی وجہ سے اسے اس کام میں بہت دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ بیک وقت ان تمام افراد کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ کمپنی سے وابستہ ڈرائیورز تو عموماً سفر میں ہی رہتے تھے۔ وہ ان میں سے کس کس کا پیچھا کرتا اور کس طرح؟ اس کے پاس یہاں اپنی کوئی ذاتی سواری بھی نہیں تھی۔ کرائے کی جیپ البتہ مل سکتی تھی لیکن ابھی تک اس نے اس سہولت کو حاصل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ فی الحال وہ یہیں رہ کر جائزہ لے رہا تھا کہ کوئی ایسی مشکوک جیپ نظر آجائے جسے پہاڑوں پر جانے والی کسی ایسی ڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو اور اس کے باوجود اس میں سامان لوڈ ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ اکثر نیاز علی کے دفتر کے آس پاس چکراتا رہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ نیاز علی کی موت کے بعد اس کام کے لیے کسی اور ڈرائیور کو ہار کیا جائے گا۔ وہ کوشش میں تھا کہ کسی طرح نیاز علی کی جگہ لینے والے ڈرائیور کا کھوج لگا لے۔ نئے ڈرائیور کا علم ہو جاتا تو پھر اس شخص تک پہنچنے کی راہ بھی نکل آتی جو یہ کام کروا رہا تھا۔ اپنی اس کھوج کے چکر میں وہ صبح ہی صبح ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے جا پہنچتا۔ عموماً جیسپس اسی وقت روانہ ہوتی تھیں اور نظر رکھنے کی صورت میں ایسی جیپ پکڑ میں آ سکتی تھی جو مشکوک ہو۔ ابھی تک اسے

اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ ثابت قدمی سے اپنے معمول پر ڈٹا ہوا تھا۔

نگرانی کا کام انجام دینے کے لیے اس نے دفتر کے عین سامنے موجود ایک چھوٹے سے ہوٹل کو اپنا ٹھکانا بنالیا تھا۔ وہ ہوٹل بھی کیا تھا، بس ایک طرح سے چائے خانہ ہی تھا جہاں چائے کے ساتھ ناشتے کے لوازمات بھی مل جاتے تھے۔ مشاہد خان ہر روز صبح وہاں پہنچ کر ناشتا کرتا۔ اس دوران اس کی نظریں ٹورسٹ کمپنی کے دفتر پر ہی لگی رہتیں۔ ابھی تک اس نے وہاں سے جتنی جیسپس روانہ ہوتی دیکھی تھیں، ان میں سے کوئی بھی مشکوک نہیں لگی تھی۔ وہ موقع پا کر جیپ کے ڈرائیور سے بات چیت بھی کر لیتا تھا۔ اس گفتگو سے اسے علم ہو جاتا کہ کون سی جیپ کہاں اور کس مقصد کے لیے روانہ ہو رہی ہے۔ اس کے سامنے اب تک کوئی ایسی جیپ روانہ نہیں ہوئی تھی جسے کسی ایسی ڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو۔ مسلسل ناکامی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس کا لائحہ عمل غلط ہے۔ اسے نیاز علی کی ٹورسٹ کمپنی کے علاوہ دوسری کمپنیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اب تک تو وہ اس ٹنگ کی بنیاد پر صرف اسی کمپنی کی جیسپوں کی نگرانی کر رہا تھا کہ ہونہ ہو، کمپنی کا مالک بھی اس کام میں شامل ہوگا۔ نیاز علی نے اگرچہ ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا تھا لیکن مشاہد خان کو شبہ تھا کہ اتنا بڑا کام مالک کی شمولیت کے بغیر کرنا صرف ڈرائیور کے بس کی بات نہیں... لیکن اب وہ خود اپنے اس نظریے کی طرف سے مشکوک ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی لائن آف ایکشن غلط ہے اور اب اسے اپنی نگرانی کا دائرہ وسیع کر کے دیگر ٹورسٹ کمپنیوں اور ان کے ڈرائیورز کو بھی چیک کرنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے تنہا اس کی ذات ناکافی ہوتی اور اسے مقامی حکام سے مددینی پڑتی۔ شہر یار کی وجہ سے اسے یہ مدد مل بھی جاتی لیکن اس صورت میں شاید وہ خود لاعلم رہ جاتا۔ سرکاری لوگ اسے اپنے ساتھ شامل کرنے کے بجائے جو بھی کرتا ہوتا، اپنے طور پر کرتے جبکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ خود یہ ہمسر کرے۔

اکرم خان کے قتل اور ماہ بانو کے اغوانے اس معاملے کو اس کی ذاتی لڑائی بنا دیا تھا۔ نہ وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو معاف کر سکتا تھا، نہ ہی اپنے گھر بنا ہونے والے ماہ بانو کے اغوا کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ اب بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس مصیبت میں مبتلا تھی اور کن حالات سے گزر رہی تھی۔ ان ساری سوچوں اور فکروں کے گرداب میں پھنسا آج پھر وہ اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھا اور ناشتے سے فارغ ہونے کے

بعد سبز چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اچانک ہی اس کی جیب میں موجود میل فون بجنے لگا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر چیک کیا۔ یہ اس اسپتال کا نمبر تھا جہاں اس کی ماں داخل تھی۔ اسپتال کا نمبر دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے اسپتال انتظامیہ کو خود اپنا نمبر دیا تھا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اسے کال کر لی جائے۔ وہاں سے فون آنے کا مطلب تھا کہ خیریت نہیں تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے تشویش کے عالم میں کال ریسیو کی۔ ”تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے، فوراً اسپتال پہنچو۔“ کسی نے بہت تیزی سے یہ پیغام دے کر فون بند کر دیا۔ مشاہد خان اپنے بدترین اندیشے کے درست ثابت ہونے پر گھبرایا ہوا پھرتی سے اٹھ کر اسپتال کے لیے روانہ ہوا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اس کے مسلسل بے ہوشی میں ہونے کے باوجود وہ یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ ایک دن ماں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اب جو اس کی طبیعت بگڑنے کا فون آیا تو اس کی اپنی دنیا زبرد بر ہونے لگی۔ وہ حتی الامکان تیزی سے کام لے کر فوراً ہی اسپتال پہنچا لیکن جب ماں کو دیکھا تو وہ پہلے والی ہی کیفیت میں تھی۔

”مجھے یہاں سے کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ میری ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ کیا سچ سچ اس کی حالت بگڑ گئی تھی؟“ یہ گمان کرتے ہوئے کہ ممکن ہے، ماں کی حالت خراب ہوئی ہو اور ڈاکٹر نے قابو پالیا ہو... اس نے ڈیوٹی زس سے پوچھا۔

”نہیں، ان کی طبیعت تو پہلے ہی جیسی ہے۔ یہاں سے تو کسی نے آپ کو فون نہیں کیا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ زس کے جواب نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

کشور کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرف

طبیعت کی خرابی نے غم حال کر رکھا تھا تو دوسری طرف راز کھل جانے کا خوف ہر آن گھیرے رکھتا۔ فریدہ کے بارے میں ہونے والے انکشاف نے اسے اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ اس کی کوکھ میں چودھری کے گناہ کا بیج پھوٹ پڑا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے ہر آن یوں لگتا کہ حویلی پر کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اتنے بڑے بڑے مظالم اور گناہوں کے نتیجے میں عذاب نازل بھی ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو حیران تھی کہ اللہ نے کیوں اب تک اپنی رتی دراز کر رکھی ہے؟ شاید اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی... لیکن بہر حال وہ اس جگہ پر مزید ٹھہر کر کسی عذاب کا انتظار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے وجود میں آفتاب کی محبت کی نشانی پل رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کم از کم اتنا ضرور جیے کہ اپنی محبت کا یہ تحفہ آفتاب کو پیش کر سکے۔ یہ تحفہ اسی صورت میں آفتاب کو دیا جا سکتا تھا کہ وہ حویلی سے نکل جاتی لیکن اس کے لیے حویلی سے نکلنے کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ رانی کی حویلی میں عدم موجودگی نے اس کے ہاتھ پیر کاٹ دیے تھے۔ رانی کی واپسی کے سلسلے میں اس نے ایک دو بار وڈی چودھرائن سے بات بھی کی تھی لیکن اس کا کہنا تھا کہ رانی کا لاہور والی کوٹھی میں رکنا ضروری ہے کیونکہ وہاں حاجرہ اکیلی سچ طرح سے انتظامات سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

کشور کہنا چاہتی تھی کہ رانی کو واپس بلا کر کسی اور ملازمہ کو وہاں بھیج دیا جائے لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ وڈی چودھرائن سے بحث فضول ہے۔ وہ وہی کچھ کرتی تھی جو اس کا دل چاہتا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد آخر کشور کو آفتاب سے رابطے کی ایک صورت نظر آئی۔ آفتاب اس کی بڑی بہن تاجور کے بیٹے منور کو پڑھانے کے لیے جاتا تھا۔ اس کی دونوں بڑی سوتیلی بہنیں تاجور اور صنوبر اپنے ماموں کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بہنوں اور ان کے بچوں سے ملنے کے بہانے وہاں جا سکتی تھی۔ اس امید پر کہ وہاں جانے پر آفتاب سے رابطے کی کوئی صورت نکل آئے، اس نے وڈی چودھرائن سے بہنوں کے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتی رہی پھر اس کے اصرار پر اس شرط پر راضی ہو گئی کہ دو دن بعد چلیں گے۔ ان دو دنوں میں اسے حویلی میں استعمال ہونے والے اناج کے اسٹورز کی اپنی نگرانی میں صفائی کروانی تھی۔ بے شمار مستعد ملازموں کی موجودگی کے باوجود وڈی چودھرائن ایسے ہر کام کی خود نگرانی کرنا پسند کرتی تھی۔ اسے شک رہتا تھا کہ اگر وہ ملازموں کے سر پر مسلط نہیں رہی تو وہ ہڈ حرامی کریں گی یا موقع کا فائدہ اٹھا کر کچھ چرا

کر لے جائیں گی۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کے یہ دو دن گزرے اور کشور نے وڈی چودھرائن کے ساتھ اس کے میکے جانے کے لیے رخت سفر باندھا۔ اس کی اپنی ماں چودھرائن نامہد البتہ ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ اسے وڈی چودھرائن نے اپنے پیچھے حویلی کی نگرانی کا کام سونپا تھا اور خود شاید کشور کی نگرانی کے لیے اس کے ساتھ گئی تھی۔

وہ دونوں وہاں پہنچیں تو ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ تاجور اور صنوبر ماں کی آؤ بھگت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی کریدتی رہیں کہ اس کی ذہنی حالت کو جانچ سکیں۔ پچھلے دنوں تسلسل سے یہ سننے میں آتا رہا تھا کہ کشور کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے دورے پڑنے لگے ہیں۔ تاجور تو اپنے تئیں لاہور میں اس کے قیام کے عرصے میں اس کی دیوانگی کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی آئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب کشور نکاح کے بعد پہلی بار آفتاب سے ملنے گئی تھی اور اس نے اس ملاقات کے اہتمام کے لیے پور پور خود کو سجا دیا تھا۔ اس وقت رانی نے مصلحتاً یہ جھوٹ بول دیا کہ بی بی کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ دیوانگی کی حالت میں خود کو اس طرح سجانے سنوارنے بیٹھ جاتی ہیں۔ تاجور نے واپس گاؤں آ کر ماں کو ساری رپورٹ دی۔ ساتھ ہی صنوبر کو بھی سب کچھ بتایا، چنانچہ اب جبکہ وہ بہنوں سے ملنے ان کے گھر گئی تھی تو وہ بہانے بہانے سے اس کی ذہنی حالت جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کشور نا سمجھ نہیں تھی لیکن سب کچھ سمجھنے کے باوجود انجان بن گئی اور بہنوں کی باتیں نظر انداز کر کے ان کے بچوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے میں لگی رہی۔ سوتیلے رشتے کے باوجود اسے ان بچوں سے بہت محبت تھی اور اب تو جبکہ وہ خود ماں بننے جا رہی تھی، اسے یہ بچے اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ مصروف وقت کس طرح گزرا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ البتہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس کے اعصاب تن گئے۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب دوپہر کے بعد ہی منور کو پڑھانے آتا ہے اور اسے اسی موقع سے کسی طرح فائدہ اٹھانا تھا۔ کھانے کے بعد کا وقت اس کے لیے بڑا اٹھن اور صبر آزمائی کا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ وقت بھی گزرا اور ایک ملازمہ نے اطلاع دی کہ منور شاہ کے ماسٹر صاحب پڑھانے کے لیے آ گئے ہیں۔ کشور اس وقت غیر محسوس طور پر منور کے ساتھ ہی مصروف تھی اور اس کے بیک سے کتاہیں، کاپیاں نکال کر بظاہر اس سے پڑھائی کے بارے میں ہی پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اس نے ماسٹر کی آمد کی اطلاع سنی تو اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ منور کی کتابیں

کاپیاں سمیٹ کر بیک میں رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ بڑی طرح کپکپا رہے تھے۔

”منور کو پڑھانے کے بعد مجھ سے حویلی کے باغ میں ملیں۔“ اس نے منور کی اردو کی کاپی کے اس صفحے پر جہاں آفتاب نے اسے ہوم ورک دیا تھا، یہ مختصر سا پیغام موقع ملے ہی جیکے سے لکھ دیا تھا اور بیک میں وہ کاپی سب سے اوپر رکھ دی تھی۔ پھر بھی اس کا دل ڈر رہا تھا کہ جانے آفتاب یہ پیغام دیکھے گا بھی یا نہیں۔ وہ کسی وجہ سے نہ دیکھ پاتا تو اس کا یہاں آتا بے کار چلا جاتا پھر دوبارہ ایسا موقع نکالنا بھی مشکل تھا۔ منور اپنی ملازمہ کے ساتھ پڑھنے کے لیے چلا گیا... وہ تب بھی بہت دیر تک تذبذب کے عالم میں بیٹھی رہی۔

”کیا نکل ہے کشور! وڈی چپ چپ سی ہے؟“ اس کی خاموشی کو دیکھ کر صنوبر نے اس سے دریافت کیا۔

”کچھ نہیں آیا! بس طبیعت کچھ ست ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر سوؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ اس نے بہانہ بنایا۔ اس بہانے کی اسے ضرورت بھی تھی تاکہ کسی طرح ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو سکے۔

”تو جا، جا کر تھوڑی دیر سو لے۔“ اس کی حسب خواہش صنوبر نے مشورہ دیا جس پر اس نے فوراً عمل کیا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

”میں بچوں کے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی ہوں۔ وہاں آپ نے بڑی اچھی سیٹنگ کروائی ہوئی ہے۔ مجھے وہاں بڑا سکون ملتا ہے۔“

”یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آخر نے خاص طور پر شہر سے بندہ بلا کر وہ کمرہ سیٹ کر دیا تھا۔ تجھے وہاں چنگا لگتا ہے تو جا... وہیں جا کر سو جا۔ بچے کون سا وہاں رہتے ہیں؟ انہیں تو اماؤں کے کنبے میں ہی گھسنے سے فرصت نہیں ملتی۔“ اس کی تعریف پر خوش ہوتے ہوئے صنوبر نے اپنے شوہر کا نام لیا اور وہ بات بتائی جو اس سے قبل بھی متعدد بار بتا چکی تھی اور ساتھ ہی فراخ دلی سے اجازت بھی دے دی۔

”ابھی بچے چھوٹے ہیں نا آپا... اس لیے انہیں آپ کے پاس رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بڑے ہوں گے تو خود اپنے کمرے کی طرف لپکیں گے۔“ کشور نے اسے تسلی دی اور خود بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کمرے کا انتخاب اس نے خود جان بوجھ کر کیا تھا کیونکہ ایک تو واقعی یہ کسی کے زیر استعمال نہیں رہتا تھا، دوسرے اس کمرے میں سلاؤنگنگ ونڈوز لگی تھیں جن کے باہر کسی قسم کی سلاخیں یا جالیاں وغیرہ نہیں تھیں اور وہ وہاں سے اتر کر باغ میں جا سکتی تھی۔ کمرے

میں پہنچ کر اس نے اندر سے لاک لگا لیا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق اب آفتاب کے وہاں سے رخصت ہونے میں دس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ وہ ذرا سی کوشش کرتا تو گیٹ کی طرف جاتے ہوئے بائیں طرف مڑ کر باغ میں جا سکتا تھا۔ کشور کو یقین تھا کہ اس کا پیغام پڑھ لینے کی صورت میں وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اس نے حسب پروگرام کمر اچھوڑ دیا اور نہایت احتیاط کے ساتھ کھڑکی پھلانگ کر باغ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جس حالت میں تھی اس میں اس طرح کی حرکت نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی لیکن بڑے خطرے میں پھنسنے سے پہلے اس نے یہ قدرے چھوٹا خطرہ مول لینا مناسب سمجھا تھا۔ خیر گزری کہ وہ آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئی اور باغ کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں امرودوں کے درخت تھے۔ دو منٹ بعد ہی اسے آہٹ سنائی دی۔ وہ آہٹ پر متوجہ ہوئی تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آنے والا آفتاب ہی تھا۔

”کہاں کھو گئی ہیں آپ؟ میں اس عرصے میں کتنا پریشان رہا ہوں آپ کو لفظوں میں بتا نہیں سکتا۔“ اس کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا تو کشور کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ یہ محبت ہی تو تھی جو اسے ہر خطرے سے بے خوف کر دیتی تھی لیکن فی الحال یہ جذباتی ہونے یا اپنی کیفیات کے اظہار کا وقت نہیں تھا۔ اسے اس مختصر سی مہلت میں آفتاب کو سارے حالات سے باخبر کرنا تھا چنانچہ خود کو مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

”پچھلے دنوں مجھ پر کیا گزری اور میرا آپ سے رابطہ کس طرح ٹوٹا، یہ ساری تفصیلات میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال میں نے آپ کو ایک بہت ضروری بات بتانے کے لیے بلا یا ہے۔“

”کیا ہوا ہے کشور! خیریت تو ہے؟“ آفتاب اس کی سنجیدگی دیکھ کر پریشان ہوا۔

”پتا نہیں اسے کیا کہیں گے۔ میں جو خبر آپ کو سنانے جارہی ہوں، عام حالات میں تو وہ کسی شادی شدہ جوڑے کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہوتی ہے لیکن ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ہم کھل کر اس خوشی پر خوش بھی نہیں ہو سکتے۔“

”کیسی خوش خبری؟“ اس کی بات سن کر آفتاب چونکا۔ ”میرے وجود میں آپ کی محبت کی نشانی سانس لینے لگی ہے آفتاب۔“ کشور نے جھجکتے ہوئے اسے بتایا۔

”واقعی؟“ اس نے رد عمل میں بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

”ہاں، یہ سچ ہے۔ میں تصدیق کروا چکی ہوں لیکن

مسئلہ یہ ہے کہ اب میں مزید حویلی میں نہیں رک سکتی۔ کسی پر اگر میرا یہ راز کھل گیا تو حویلی میں قیامت آ جائے گی۔“ اس کی خوشی کو دیکھتے ہوئے کشور کا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحے میں اس طرح کی گفتگو کرے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسے ابھی یہ ساری باتیں کرنی تھیں۔ آفتاب نے اس کی بات سنی تو سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اس سے پوچھنے لگا۔

”کیا آپ کسی بہانے کچھ دیر کے لیے حویلی سے باہر کہیں جا سکتی ہیں؟ کچھ نہیں تو درگاہ تک ہی سہی۔“

”ہاں، یہ تو ممکن ہے۔ میں جمعرات کے دن درگاہ پر حاضری کے بہانے کسی ملازمہ کے ساتھ وہاں پہنچ سکتی ہوں۔“ اس کا مطلب پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی کشور نے جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”بس تو پھر آپ اب آنے والی جمعرات کو عصر مغرب کے درمیان وہاں پہنچ جائیے گا۔“ وہ دھیمی آواز میں اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اچانک سامنے آ جانے والی اس صورت حال پر اس نے گھبرانے یا شٹلانے کے بجائے پوری بیدار مغزی کا ثبوت دیا تھا اور بہت تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا تھا۔ کشور پوری توجہ سے اس کے منصوبے کی ساری جزئیات سن کر ذہن نشین کرنے لگی۔ اب اس منصوبے کی کامیابی پر ہی اس کی اور اس کے آنے والے بچے کی زندگی کا دارومدار تھا۔

”ٹھیک ہے نا... آپ میری ساری بات اچھی طرح سمجھ تو گئی ہیں نا؟“ اسے سب کچھ سمجھانے کے بعد آفتاب نے اس سے سوال کیا جس کے جواب میں کشور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بس تو پھر اب میں چلتا ہوں۔ میرا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا اور آپ کا منظر سے غائب رہنا کوئی مشکل بھی کھڑی کر سکتا ہے۔“ آفتاب نے اس سے کہا اور جاتے جاتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اپنے ہونٹوں کے نزدیک لے گیا۔ بس یہی وقت کا وہ مختصر لمحہ تھا جو وہ دونوں اپنے ارد گرد سے بے خبر ہو گئے اور انہیں اپنے اس گوشہ تنہائی میں کسی کے آنے کی آہٹ سنائی نہیں دے سکی۔

”خبردار!“ ایک نہایت رعب دار آواز قریب سے ابھری تو وہ دونوں بڑی طرح بدگ کردہ ہوشی کی کیفیت سے ٹکٹے ہوئے اس سمت متوجہ ہو گئے جہاں سے آواز آئی تھی۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیں



چودھویں قسط

اسماقادی

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی ہلٹ بھی جاتی ہے۔ بیٹا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور پھٹ جانے والوں کی کہانی

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یا عادل ایک پُر جوش جوان ہے جس کی بطور اسٹنٹ کیشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں جیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یا کو اپنے ذہب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان خاصیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری خاتم و جابر اور عیاش تھا۔ وہ سرکاری افسروں کی بھگت سے لکڑی اور کھانوں کی اسٹنگ کر رہا تھا۔ شہر یا رت صرف یہ وعدہ روک دیتا ہے بلکہ علاقے میں اسکول وغیرہ قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیتا ہے۔ جیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند شہر یا کا سہارا بنا کر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگا۔ آفتاب بھی چودھری کے ناپسندیدہ افراد میں سے ایک ہے جسے اسکول چلانے کے جرم میں چودھری اپنے آدمیوں کے ذریعے زد و کوب کرتا ہے لیکن آفتاب ہتھیار نہیں ڈالتا۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں جھٹکا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ لکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی جیر آباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیرا آباد آ جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار چوری سریدی کے چکر میں اپنے مرحوم دادا کا عرس بڑی شان و شوکت سے مناتا ہے۔ عرس کے دنوں میں جبراً خولی کے کاموں کے لیے بلوائی جانے والی ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ جیر آباد آتا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کر دیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہر یا رت سے جا ملتی ہے۔ شہر یا رت اسے اپنی گاڑی میں چمپا کر جیر آباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کی آدمی وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن دارالامان کے چوکیدار کی مداخلت کی وجہ سے وہ ماہ بانو کو لے جاتے ہیں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ شہر یا رت ماہ بانو کو دارالامان سے چودھری کے ساتھی دوست موتی والا کی کوٹھی پر بھجوا دیتا ہے۔ موتی والا جو لکڑی کی اسٹنگ میں چودھری کا دست راست تھا، اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد چودھری کا ساتھ چھوڑ کر شہر یا رت سے مل جاتا ہے۔ چودھری غدار کی کرنے کے جرم میں موتی والا اور اس کی بیوی کو مروا دیتا ہے۔ کوٹھی کی انیسویں میں مقیم ماہ بانو موتی والا کے ڈرائیور سردار کی مدد سے فرار ہو کر اس کے ایک دوست عامر کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ عامر کے گھر ایک ایسی لڑکی کا آنا جانا ہوتا ہے جو درحقیقت تیسری صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا ایک گروہ اس لڑکی کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور لڑکی کو بچانے کے چکر میں ماہ بانو خود اس گروہ کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گروہ الماس بطور سزا اس سے وہی کام لیتا ہے جو اس کے گھر کرتے ہیں۔ ایک روز الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ راستے میں کسی والے کی بدتمیزی کی وجہ سے ماہ بانو ڈھکی ہو جاتی ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا ہمراہ گروہ ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بیٹھ چڑھا دیتا ہے۔ وہ گروہ الماس کے ساتھ وہاں ٹھکانے پر آتی ہے اور وہاں ایک ٹیک فطرت خواجہ سرا انگار کو اس راز میں شریک کر لیتی ہے۔ انہی دنوں گروہ انہیں ایک شادی پر بھیجتا ہے۔ وہاں ماہ بانو کو پتا چلتا ہے کہ وہاں تیلیم لڑکی ہے جسے موتی والا کا ڈرائیور سردار پسند کرتا ہے اور لڑکی کی سوتیلی ماں اس کی زبردستی ایک بوزھے سے شادی کروانے پر بے رحم تھی۔ وہ تیلیم کو اپنے کپڑے پہنا کر انگار کے ساتھ وہاں سے نکال دیتی ہے۔ صبح شادی والے گھر پر چھاپا پڑتا ہے اور ماہ بانو عزت کے ساتھ تھانے لے جایا جاتا ہے جہاں شہر یا رت کے ماموں زاد بھائی ڈی آئی جی سجاد اور انا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ سجاد انا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو وہ اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہر یا رت بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہر یا رت کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بیٹھ چڑھایا جا چکا ہے۔ ہندو سیٹھ کی کوٹھی پر چھاپا مارا جاتا ہے لیکن وہاں سے سیٹھ اور شینا کو اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کی لاشوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سجاد انا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے الجھنوں سے ڈبھک کر دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری ماہ بانو کی سجاد انا کے گھر موجودگی کی بھگت پا کر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہر یا رت اپنے ڈرائیور مشاہیرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کاندے سے ماہ بانو مشاہیرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہونے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کرتا ہے اور اس کا رروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورہ جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، ایک منصوبہ تشکیل دیتا ہے۔ جیر آباد سے متصل جنگل کو اس کے مخصوص ماحول کی وجہ سے پوسٹ کی کاشت کے لیے استعمال کرنا اس کے منصوبوں میں سے ایک ہے جس کے لیے وہ ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نور پور گاؤں کے چودھری عتار کی بہن ہے۔ چودھری عتار کو افتخار عالم شاہ اس کی روشن خیالی اور اپنی غلامی نہ کرنے کی وجہ سے پسند نہیں کرتا تھا۔ فریدہ اپنے بھائی کے خالوں میں ایک نوجوان قربان کی محبت کے جال میں پھنس جاتی ہے اور اس کے ساتھ بھاگ کر جیر آباد چودھری کی پناہ میں آ جاتی ہے۔ وہاں اسے پناہ کے بجائے چودھری کی ہوس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چودھری اسے اپنے ذہنی معذور بیٹے کی دہن بنا کر حویلی لے آتا ہے۔ یہ شادی ایک ڈھونگ تھی جس کی آڑ لے کر چودھری مسلسل رشتوں کا تقدس پامال کر دیتا ہے۔ شہر یا رت اور چودھری کے درمیان خاصیت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ چودھری ڈاکٹر ماریانا کی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی قابل اعتراض تصویریں اتار کر اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ڈاکٹر ماریانا کے تعاون کی وجہ سے شہر یا رت وہ تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور چودھری کی چال سے بچ نکلتا ہے۔

اپنی پشت پر سے سائی دینے والی بارعب آواز پر وہ دونوں بدگ کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور دونوں کے سینے سے ہی بے اختیار ایک اطمینان بھرا سانس خارج ہوا۔ وہ منور شاہ تھا جو اپنے ننھے ہاتھوں میں ایک کھلونا کلاشکوف اٹھائے ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی کلاشکوف کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔ ”میں نے آپ دونوں کو ڈرا دیا۔ اتنے بڑے ہو کر بھی آپ دونوں اتنے بزدل ہیں۔“ منور شاہ جس کی کھلونا کلاشکوف کا رخ ان دونوں ہی کی جانب تھا، اس طرح انہیں ڈرا دینے کے اپنے کارنامے پر ٹھٹھکا کر ہنس رہا تھا۔

”بہت شریر ہو گئے ہو تم شیطان!“ کشور نے اس کے قریب جا کر اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔ ویسے وہ اور آفتاب دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جھپینے ہوئے تھے کہ وہ ایک بچے سے ڈر گئے۔ اصل میں کچھ تو خوف ان کے اپنے اندر تھا اور کچھ منور آواز بھی بھاری بنا کر بالکل کسی بڑے آدمی کی طرح بولا تھا، اس لیے لمحہ بھر کے لیے وہ دونوں ہی سن پڑ گئے تھے۔

”آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟“ منور نے اپنا کان کشور کی گرفت سے چمڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے سوال نے انہیں احساس دلایا کہ منور کا یہاں آنا اور ان دونوں کو ساتھ دیکھ لینا اتنا بھی بے ضرر نہیں ہے۔

لے شک وہ بچہ تھا اور ان کے درمیان موجود تعلق کو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن اپنی ناوانی اور معصومیت میں وہ کسی کے سامنے اس بات کا تذکرہ تو کر سکتا تھا۔

”آپ جائیں آفتاب! میں اسے سنبھال لوں گی۔“ گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے کشور نے آفتاب کو پہلے وہاں سے رخصت کر دینا مناسب سمجھا۔ زیادہ تاخیر گیٹ پر موجود چوکیدار کی نظر میں آ سکتی تھی۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے آفتاب نے بھی فوری طور پر وہاں سے رخصت ہو جانا مناسب سمجھا اور ننھے منور سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”او کے ماسٹر! میں چلتا ہوں۔ تم اپنا ہوم ورک اچھی طرح کر لینا۔“

”میں سر! میں کر لوں گا بلکہ خالہ سے کہوں گا کہ یہ میرا ہوم ورک کروادیں۔“ منور نے جواب دیا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں وہ آفتاب سے کافی مانوس ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ بڑے طریقے سلیقے سے بات چیت کرتا تھا۔ اصل میں ابھی وہ تھا بھی اتنا کم عمر کہ مزاج میں حاکمانہ خوبو پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آفتاب نے اس کے معصومانہ انداز پر پیار سے اس کا رخسار تھپتھپایا اور مسکراتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

”آپ میرا ہوم ورک کروائیں گی نا خالہ؟“ کشور ابھی جانے والے کے قدموں کے نشانوں میں ہی محو تھی کہ منور نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بالکل کرواؤں گی۔ مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“ منور نے تجسس سے پوچھا۔

”آپ کسی کے سامنے ذکر نہیں کرو گے کہ آپ نے مجھے اور ماسٹر صاحب کو یہاں دیکھا تھا۔“

”نہیں کروں گا لیکن پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟“ منور نے اس کی بات ماننے کی توہامی بھری لیکن فطری تجسس کے باعث سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”یہ بات میں تمہیں اندر چل کر بتاؤں گی۔“ کشور نے گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے اس سے کہا اور پھر اس کی انگلی تھام کر واپسی کے راستے پر چل پڑی۔

”ہم یہاں سے اندر جائیں گے؟“ وہ واپس بچوں کے کمرے کی کھلی سلاٹنگ وینڈو کے پاس آ کر ٹھہری تو منور نے خیرت سے پوچھا۔

”ہاں، یہاں سے اندر جانے میں بہت مزہ آئے گا۔“ کشور نے اسے جواب دیا اور پہلے اسے سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھنے میں مدد دی، اس کے بعد خود بھی کھلی کھڑکی سے گزر کر اندر پہنچ گئی۔

”کیوں آیا نا مزہ؟“ اندر پہنچ کر اس نے منور سے پوچھا۔

”بہت مزہ آیا۔“ وہ بچہ تھا اور اسے زندگی میں ہونے والا ہر نیا تجربہ انوکھا اور خوش کن ہی لگ سکتا تھا۔ چنانچہ اس وقت یوں کھڑکی پھلانگ کر اندر پہنچنے پر ہی خوش ہو گیا۔

”بس اسی لیے میں یہاں سے چھلانگ لگا کر باغ میں گھومنے کے لیے گئی تھی۔ مجھے بھی ایسے کھڑکی سے آنے جانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔“ وہ منور کا ذہن اپنی اور آفتاب کی ملاقات کی طرف سے صاف کرنے کے لیے اقدامات کر رہی تھی۔

”اور ماسٹر صاحب کس لیے باغ میں گئے تھے؟“ خالہ کی طرف سے کچھ مطمئن ہونے پر اس نے اپنے استاد کے بارے میں سوال کیا۔

”ان کا امرود کھانے کا دل چاہ رہا تھا اس لیے وہ وہاں گئے تھے۔“ کشور نے اسے بھلایا۔

”تو وہ مجھ سے کہہ دیتے۔ میں مالی سے بہت سارے امرود تروا کر انہیں دے دیتا۔“

”لیکن ان کا تو خود سے امرود توڑ کر کھانے کا دل چاہ رہا تھا۔ جیسے کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں آنے جانے میں

بہت مزہ آتا ہے، ایسے ہی خود اپنے ہاتھ سے امرود توڑ کر کھانے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔“ کشور نے اسے سمجھایا۔
”اچھا تو یہ بات تھی... ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔“ منور شاہ یوں سر کو ہلا کر بولا جیسے کوئی بہت بڑی کتھی سلجھ گئی ہو۔

”اب آپ کسی کے سامنے اس بات کا ذکر نہیں کرنا ورنہ پایا ماسٹر صاحب سے ناراض ہو جائیں گے اور ان کا یہاں آنا بند کروادیں گے۔ ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے تو آپ کو پڑھائے گا کون؟“ وہ واقف تھی کہ منور، آفتاب کو اچھا خاصا پسند کرتا ہے اس لیے اس کی کمزوری کو پکڑتے ہوئے اسے زبان بندی کے لیے پابند رکھنے کی کوشش کی۔

”میں نے کہہ دیا ہے تاکہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اب آپ جلدی سے میرا ہوم ورک کروادیں۔ ورنہ نانی جان آپ کو واپس بڑی جوبی لے جائیں گی۔“ منور نے اسے یقین دہانی کروائی اور اپنے مسئلے کی طرف متوجہ کروایا۔

”ٹھیک ہے۔ جاؤ، آپ اپنا بیگ لے کر آؤ۔ میں آپ کا ہوم ورک کروادیتی ہوں۔“ کشور نے اس کی معصومانہ ادھر اس کا رخسار چومتے ہوئے اس سے کہا تو وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور اس کے باہر نکلتے ہی بے دم ہی ہو کر ایک فلور کشن پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ایک ننھے سے بچے کی مداخلت کی وجہ سے صورت حال کافی گمبیس ہو گئی تھی۔ اپنے طور پر تو اس نے پکا انتظام کر دیا تھا کہ منور شاہ کسی کے سامنے زبان نہ کھولے لیکن ایک معصوم بچے پر کتنا بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ اپنی معصومیت میں وہ غیر ارادتا ہی کسی کے سامنے یہ سارا واقعہ دہرا دیتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔

☆☆☆

ناشتا کرتے ہوئے ماہ بانو کا ذہن رات عمران سے ہونے والی گفتگو میں الجھا ہوا تھا۔ عمران کی داستان حیات واقعی بڑی پُر درد تھی۔ ایک امیر زادے کی ہوس نے ہتے بستے گھر کو جاڑ ڈالا تھا۔ وہ گھر جو عمران کی ماں نے اپنی شبانہ روز محنت سے تنکا تنکا جمع کر کے بنایا تھا، صرف اس لیے بکھریا تھا کہ عمران کی نادان بہن اس امیر زادے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی۔ امیر زادے نے جال میں پھنسی اس چڑیا کی بے بسی سے خوب لطف اٹھایا اور اس بات کی پروانہ کی کہ اس کی یہ حرکت ایک عزت دار سفید پوش گھرانے کے لیے کیسی مصیبت لے آئے گی۔ ماہ بانو کو اپنی اور عمران کی زندگی میں کافی مماثلت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی ہوس پرست و دولت کے پجاری چودھری افتخار عالم شاہ کی وجہ سے در بدر تھی۔ چودھری نے اس کی وجہ سے اس کے پورے خاندان کو برباد

کر دیا تھا۔ نہ تو فیصل آباد میں موجود اس کا وہ چھوٹا سا گھریا قی رہا تھا جہاں وہ بے بے اور اپا کی محبت کی چھاؤں میں رہا کرتی تھی اور نہ ہی پیر آباد کا وہ کچا مکان جہاں اس کے سگے ماں باپ، بھائی بہن رہتے تھے۔ وہ کبھی بھی چھٹیوں میں گاؤں جاتی تھی تو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کچھ وقت گزار آتی تھی۔ اماں آبا سے بے شک اسے یہ شکوہ تھا کہ انہوں نے اسے بیٹی ہونے کی وجہ سے بوجھ جان کر پیدا ہوتے ہی دوسروں کو تھما دیا تھا لیکن بہر حال وہ اپنے دل سے ان کی فطری محبت نہیں نکال سکتی تھی۔ چنانچہ جہاں اسے اپنے پرورش کرنے والے بے بے اور اپا کی ناگہانی موت رلاتی تھی، وہیں اپنا پیر آباد والا گھرا جڑ جانے کا غم بھی بے چین رکھتا تھا۔

وہ بالکل عمران کی طرح ہی خانماں برباد تھی۔ ان دونوں میں فرق تھا تو اتنا کہ ایک تو وہ عمران کی بہن فری کی طرح کسی کی ہوس کی بھیٹ چڑھنے سے بچ گئی تھی، دوسرے وہ عمران کی طرح انتقام کی راہ پر نہیں چلی تھی۔ عمران نے اپنا گھر اجاڑنے والے سے اس کی زندگی چھین لی تھی جبکہ وہ ابھی تک اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ اس جدوجہد کے دوران اسے کبھی انتقام کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ وہ بس بھاگتی پھر رہی تھی کہ کسی طرح وہ گوشہ عافیت میسر آجائے جہاں وہ چودھری کی دسترس سے محفوظ رہ سکے۔ اس خواہش نے اسے اس برف زار میں لاپھنگا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک گرواب سے نکلے بغیر ہی دوسرے گرواب میں پھنس گئی ہے... جس سے باہر نکلنے کا اسے کل تک کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا لیکن گزشتہ رات عمران نے اسے اس دلائی تھی کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔ اس آس نے اس کے مایوسی میں گہر جانے والے دل میں ایک بار پھر امید کی شمع روشن کر دی تھی۔ وہ جو دکھ اور مایوسی کے باعث کھانا پینا تک ترک کر چکی تھی، ایک بار پھر جی اٹھی تھی اور اس وقت اپنے سامنے رکھا ناشتا کافی رغبت سے کھ رہی تھی۔

پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود اسے اتنا اندازہ بہر حال تھا کہ یہاں سے فرار کا سفر بہت دشوار ثابت ہوگا اور اس دشواری کا مقابلہ کرنے کے لیے جسم میں توانائی کا ہونا ضروری تھا۔ اس توانائی کے حصول کی خاطر ہی اس نے پیٹ بھر کر ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد اس کا وقت حسب معمول تنہائی کے اذیت ناک لمحے شمار کرتے ہوئے گزرنے لگا۔ لیکن آج آزادی کی امید نے اس اذیت کو کافی کم کر دیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ قید جو نہ ختم ہوتی ہوئی نظر آتی تھی، اب اس سے نجات ملنے والی ہے۔ اس امید کے ساتھ ہی وقت

دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا اور صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ شام کے سائے جب گہرے ہو کر رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگے تو اسے تشویش محسوس ہونے لگی۔ پورے دن میں عمران نے اس سے ایک بار بھی رابطے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے ماحول میں کوئی ایسی تبدیلی نظر آئی تھی جس سے یہ احساس ہو پاتا کہ وہاں کوئی غیر معمولی صورت حال ہے۔ اسی فکر میں جتنا وہ اپنے مخصوص انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس آہٹ کو سن کر بھی اس کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ رات کے کھانے کا وقت ہے اور کوئی نہ کوئی اس کے لیے کھانا لے کر آیا ہوگا۔

”ماہ بانو!“ آنے والے نے جب اسے اپنی طرف متوجہ نہ ہوتے دیکھا تو کھانے کے برتن اس کے قریب رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پکارا۔ وہ آواز شناخت کر کے فوراً ہی متوجہ ہوئی۔ وہ عمران ہی تھا جو اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

”اچھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھا لو اور کچھ دیر آرام کر لو۔ چند گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ سرگوشی کے انداز میں اسے یہ نوید سنا کر وہ ایک پل بھی مزید ٹھہرے بغیر تیزی سے واپس پلٹ گیا لیکن تشویش کا شکار ماہ بانو کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس اطلاع نے کہ چند گھنٹوں بعد وہ اس قید خانے سے نکل سکے گی، اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ملنے والی آزادی کی امید نے اسے اتنا پُر جوش کر دیا کہ اس نے اس قید خانے میں پہلی بار بے حد رغبت سے کھانا کھایا۔ آج کھانا تھا بھی کافی پر تکلف۔ مرغی کے شوربے والے سالن کے ساتھ ساتھ ٹیونس کے تیلے ہوئے قیلے بھی کھانے میں شامل کیے گئے تھے۔ ایک پیالے میں بھاپ اڑاتا کارن سوپ بھی تھا... یعنی پورا دعوت کا اہتمام تھا۔ اس نے جی بھر کر یہ غذا سبب بخش کھانا کھایا اور حسب معمول اس مختصر جگہ میں ٹہلنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے کھانا ہضم ہونا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس نے قید کے دنوں میں یہ معمول بنالیا تھا کہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر ٹہکتی ضرور تھی۔ حالانکہ ٹہلنے کے لیے وہ جگہ بے حد محدود تھی۔ آج بھی اس نے دس منٹ تک چہل قدمی کی اور پھر عمران کی حسب ہدایت آرام کی غرض سے لیٹ گئی۔ بہت دنوں بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور ذہن بھی کافی پرسکون تھا، چنانچہ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہے لیکن ماحول میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آئی تھی جس نے اسے نیند سے جگا

دیا۔ وہ لمحہ بھر تو خالی الذہنی کی کیفیت میں اچانک اپنی آنکھ کھلنے کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس کی قوت سماعت نے احساس دلایا کہ وہ ماحول میں پیدا ہونے والے غیر معمولی شور کی وجہ سے جاگی ہے۔ اس جگہ جہاں کوئی مشکل سے ہی بولتا تھا اور وہ انسانی آواز سننے کے لیے ترس جاتی تھی، یہ شور بڑا عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سماعت پر ذرا سا زور دینے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ اپنی بھونڈی آوازوں میں گانے کے ساتھ ساتھ بلند و بالا قہقہے لگا رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی جشن منایا جا رہا ہو۔ اس کے اندر جشن کی نوعیت جاننے کے لیے تجسس جاگ اٹھا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دبے قدموں سے باہر کی طرف بڑھی۔ اسے کھانا پہنچانے چونکہ عمران خود آیا تھا، اس لیے قید خانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بے حد احتیاط سے چلتی آوازوں کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ حسب معمول غار کے کشادہ حصے میں وہ سب جمع تھے اور محفل بھی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ان بے ہنگم حلیوں والے لوگوں میں سے بیشتر دیواروں کے ساتھ لگ کر کچھ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ دائرہ سا بن گیا تھا اور اس دائرے میں پانچ چھ افراد رقص کے انداز میں جھوم رہے تھے۔ ناچنے والوں میں اور بیٹھے ہوئے دونوں افراد میں یہ قدر مشترک تھی کہ وہ بلند آواز سے گانے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں میں جام بھی تھامے ہوئے تھے۔ جام پر جام لٹکھاتے وہ جس مستی کی کیفیت میں تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس محفل میں ام النجاشہ گردش میں ہے جس کے زہر اثر وہ وحشی مرد جھوم رہے ہیں۔

ماہ بانو کے دیکھتے ہی دیکھتے رقص کرنے والوں میں سے ایک نے ایک جانب بیٹھے عمران کو ہاتھ تھام کر کھڑا کیا اور پھر اپنے کاندھوں پر بٹھا کر ناچنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے محفل میں مزید گرمی آگئی اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بھی مزید کچھ افراد کھڑے ہو کر ناچنے والوں میں شامل ہو گئے۔ عمران کو کاندھ سے پر بٹھانے والا درمیان میں رقص کر رہا تھا جبکہ باقی سب اس کے ارد گرد ناچتے ہوئے بار بار عمران کے جسم کو چھلی دیتے تھے۔ ان سب کے رویوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے عمران کوئی دلہا ہو جس کی رات روانہ ہونے کو ہو... اور بے تکلف دوست اپنے یار کی شادی کا جشن منا رہے ہوں۔ کافی دیر تک یہ بڑا بڑی جاری رہی پھر یک دم ان میں سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے ناچنے گانے والوں کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے

بلند آواز میں بولا۔ ”دوستو! تھوڑا صبر کرو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ بھائی صاحب آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ اس شخص کے یہ اعلان کرتے ہی وہاں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ اس خاموشی کے چھا جانے کے بعد ایک دراز قد شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ماہ بانو نے اس شخص کو پہچان لیا۔

بھائی صاحب کہلانے والے اس آدمی کو اس سے قبل وہ اس وقت بھی دیکھ چکی تھی جب پر وجیکٹر پر عمران کی بہن کی عزت برپا کرنے والے جوان کے ذبح کیے جانے کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ بھائی صاحب کہہ کر پکارا جانے والا وہ آدمی جو وہاں ان لوگوں کا کما نڈر تھا، کھڑے ہونے کے بعد اپنا گلا کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

”ساتھیو... میرے بہادر مجاہدوں! آپ سب جانتے ہیں کہ ہم ایک بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے اپنی جائیں تک قربان کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جس نیک مقصد کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، اس کے لیے اگر ہماری جان بھی چلی جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ اس قربانی کے بدلے میں پروردگار ہمیں اپنی جنتوں میں ہمیشہ کی زندگی بخشے گا۔ میری دعا ہے کہ پروردگار ہم میں سے ہر ایک کو یہ اعزاز نصیب کرے۔ فی الحال میں یہ بتاتے ہوئے بے حد خوش محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے درمیان سب سے کم وقت گزارنے والے اور ہم میں سے سب سے کم عمر عمران کے نصیب میں یہ خوش قسمتی لکھی گئی ہے کہ وہ ہم سب سے پہلے شہادت کی راہ پر چلنے کے لیے چن لیا گیا ہے۔ آج کا یہ جشن ہم عمران کے اعزاز میں ہی منا رہے ہیں۔ شہید بھی مرتا نہیں بلکہ اسے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ اس لیے راہ شہادت پر جانے والے کے لیے رونے اور اداس ہونے کے بجائے اسے بہت خوش دلی سے رخصت کرنا چاہیے۔ آپ سب آج رات دل کھول کر کھائیں پیئیں، ناچیں گائیں۔ آج آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“ کما نڈر کے اس اعلان نے وہاں خوشی کی لہر دوڑادی۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ سوچے بغیر کہ ایک جیتے جاگتے، ہنستے کھیلتے جوان کو حرام موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تالیاں پیننا شروع کر دیں۔ تالیوں کی گونج بھی تو کما نڈر نے عمران کو اپنے قریب بلایا اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

”کیوں عمران! ڈر تو نہیں لگ رہا؟“

”نہیں بھائی صاحب! ڈرنے کا کیا سوال۔ میں تو

آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس کام کے لیے چنا۔“ عمران نے مسکراتے ہوئے کما نڈر کی بات کا جواب دیا۔

”شاباش میرے شیر! مجھے تم سے اسی بہادرانہ جواب کی امید تھی۔“ کما نڈر نے اس کے جواب پر خوش ہو کر ایک بار پھر اس کی پیٹھ پر زور دار چھکی دی اور بلند آواز میں بولا۔ ”میری طرف سے ایک جام عمران کی اس بہادری کے نام۔“ فوراً ہی کما نڈر کے اعزاز میں سکوت اختیار کرنے والے حرکت میں آگئے اور محفل میں ایک بار پھر جام گردش کرنے لگے۔

ماہ بانو بھی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھتی رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کے مجاہد ہیں جو شراب کے رسیا ہیں اور گانے بجانے سے دل بہلاتے ہیں۔ اپنی اس کیفیت میں اسے احساس بھی نہیں ہو سکا کہ وہ پوری طرح سے اوٹ میں نہیں رہی ہے اور اس پر کسی کی نظر پڑ سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس پر نظر پڑی بھی تو عمران کی ہی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے اسے اشارہ کیا کہ واپس پلٹ جاؤ۔ وہ خود بھی اسی کی طرف متوجہ تھی چنانچہ اس خفیف اشارے کو دیکھ لیا اور جس خاموشی سے وہاں تک آئی تھی، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر اس کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں تھا اور اب انتظار کی یہ گھڑیاں بہت کٹھن لگ رہی تھیں۔ دل کے اندر یہی خواہش اٹھ رہی تھی کہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے لیکن ادھر سے سنائی دیتے شور کو سن کر یوں لگ رہا تھا کہ رات بھر یہ محفل بھی رہے گی۔ آخر اللہ اللہ کر کے انتظار کی یہ گھڑیاں گزریں۔ پہلے آہستہ آہستہ باہر سے سنائی دیتی گانے بجانے کی آوازیں معدوم ہونا شروع ہوئیں اور پھر یوں لگا جیسے سارے ماحول پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا ہو۔ اس سکوت میں وہ قیدموں کی تیز آہٹ سن کر تیزی سے کھڑی ہوئی۔ حسب توقع اس طرف آنے والا عمران ہی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ سامان اٹھایا ہوا تھا۔

”جلدی سے یہ لباس اور جوتے موزے وغیرہ پہن لو۔ پانچ منٹ میں ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“ وہ اپنے ہاتھ میں موجود سامان اسے تھما کر خود جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ ماہ بانو نے اس کی ہدایت کے مطابق وہ چیزیں پہننی شروع کر دیں۔ جو لباس اس نے اس وقت پہن رکھا تھا، وہ بھی خاصا گرم تھا جس پر اس نے عمران کا دیا ہوا مونٹا اونٹنی لبادہ پہن لیا۔ اسے یہاں لاتے وقت بھی اسی قسم کا لباس پہنایا گیا تھا اور وہ اس کی وجہ سمجھ سکتی تھی۔ اس برف نزار میں باہر کا موسم غار کے مقابلے میں بہت شدید تھا۔

غار کے اندر کی سردی باہر کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی کیونکہ یہاں ان قاتل ہواؤں کا گزر نہیں تھا جو انسان کے جسم سے ٹکراتی تھیں تو اسے لگتا تھا کہ ایک برہمی سی جسم میں اتر گئی ہو۔ لباس پہننے کے بعد اس نے پیروں میں موٹے اونٹنی جراب پہن کر جو گرز چڑھائے۔ جو گرز اس کے پیروں میں قدرے ڈھیلے تھے اور چلتے وقت دشواری کا باعث بن سکتے تھے۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ کچھ پریشان سی ہوئی پھر یک دم ہی اس کی نظر جرابوں کی دوسری جوڑی پر پڑی۔ اس نے جو گرز اتار کر وہ دوسری جوڑی بھی پہلے والے جرابوں پر چڑھائی۔ اب اس نے دوبارہ سے جو گرز پہنے تو وہ پہلے کے مقابلے میں اس کے پیروں میں کافی بہتر تھے۔ عمران کے لائے ہوئے سامان میں سے پہننے کے لیے اب دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ ایک اونٹنی ٹوپی اور دوسرے مٹاف (پہاڑوں پر پہنے جانے والے خصوصی دستانے)۔ اس نے پہلے بالوں کو سمیٹ کر اونٹنی ٹوپی اپنے سر پر جمائی اور پھر ہاتھوں پر مٹاف بھی چڑھالے۔ اب وہ پوری طرح تیار تھی۔

”تم تیار ہو گئیں... ویری گڈ۔ چلو اب یہاں سے نکل چلتے ہیں۔“ اسی وقت عمران وہاں چلا آیا اور اسے تیار دیکھ کر بولا۔ اس وقت وہ خود بھی اس سے ملتے جلتے حلیے میں تھا اور اسی کی طرح اس حلیے میں اپنے اصل حجم سے کئی گنا زیادہ نظر آ رہا تھا۔

”ٹوپی کا باقی حصہ اپنے چہرے پر بھی چڑھا لو ورنہ باہر کی ٹھنڈی ہوا تمہارے چہرے کی جلد ادھیڑ ڈالے گی۔“ اس کا کھلا منہ دیکھ کر اس نے ماہ بانو کو ہدایت کی اور پھر ایک ذرا مختلف ساخت کی عینک اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ خود بھی اپنی آنکھوں پر ایسی ہی عینک پہنتا ہوا تھا۔ ماہ بانو نے خاموشی سے عینک تھام کر اپنی آنکھوں پر لگالی۔ عینک لگانے کے بعد اسے لگا کہ وہ نیم تاریک ماحول پہلے کے مقابلے میں واضح ہو گیا ہو۔ یہ ان نائٹ گلاسز کا کمال تھا جو عمران کے کہنے پر اس نے ابھی ابھی پہنی تھیں۔

”آجاؤ لیکن بہت احتیاط سے۔ سب لوگ نشے کی حالت میں دھت پڑے ہوئے ہیں... پھر بھی اگر آوازوں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو ہمارے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔“ سرگوشی میں اسے یہ ہدایت کر کے وہ وہاں سے آگے بڑھا۔ ماہ بانو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ عمران کا بے حد محتاط رویہ اسے بھی احتیاط پر کاربند کیے ہوئے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی مدد ہوشی کے باوجود وہ اتنا محتاط اور چوکنا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ربوہ بالکل تیار رکھا ہوا تھا۔ اگر وہاں کوئی اسے روکنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ اس کے سینے میں

اس ریوالور کی گولی بلا تکلف اتار دیتا۔ ریوالور کے علاوہ اس نے اپنے شانے سے ایک دور مار رائل بھی لٹکائی ہوئی تھی۔ شاید لباس کے اندر بھی کچھ اسلحہ چھپایا تھا جس کو ماہ بانو دیکھ نہیں سکتی تھی، صرف اس کے بارے میں قیاس ہی کر سکتی تھی۔ مخصوص راستے پر سے گزرتے ہوئے وہ دونوں غار کے کشادہ بال نما حصے میں پہنچے۔ وہاں مریخی کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں، شراب کے خالی پیالے اور انسانی جسم ایک جیسی بے ترتیب حالت میں ادھر ادھر لڑھکے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کا پیر کی کے جسم سے نہ ٹکرا جائے، وہاں سے گزر کر غار کے دہانے کی طرف بڑھے۔

”کون ہے؟“ ابھی وہ دہانے تک پہنچے ہی تھے کہ کسی کی مدہوش سی آواز ابھری اور مردوں کی طرح بے جان پڑے انسانی جسموں میں سے ایک نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو کا دل اس صورت حال پر اچھل کر حلق میں آگیا۔ یوں نفس کے دروازے پر دھڑلے لے جانے کا سوچ کر ہی اس کا جسم پھڑپھڑانے لگا۔

”میں ہوں بھائی عمران۔ ذرا پیشاب کے لیے جا رہا ہوں۔“ ماہ بانو کے برعکس عمران نے پرسکون رہتے ہوئے متوازن آواز میں سوال کرنے والے کو جواب دیا جسے سن کر اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ اپنی گردن فرش پر ڈال دی اور پہلے ہی کی طرح خزانے لینے لگا۔ عمران نے ماہ بانو کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے سینے میں اٹک جانے والا سانس آہستہ سے خارج کرتے ہوئے قدم بڑھا دیے۔ غار کے دہانے سے باہر قدم رکھتے ہی سرد ٹیلی ہواؤں نے ان کا استقبال کیا اور باوجود پوری تیاری کے، ماہ بانو کو اپنے جسم میں سردی کی ایک لہری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کپکپاتی ہوئی عمران کے ساتھ آگے بڑھی۔

باہر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف چاند کی مدہم روشنی تھی جو منظر کو پوری طرح واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اگر ان دونوں نے اپنی آنکھوں پر تائنٹ گاگلز نہیں لگائے ہوئے ہوتے تو بہت دشواری پیش آتی مگر گاگلز کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہو گئی تھی۔ ماہ بانو دیکھ سکتی تھی کہ وہاں وہی قوی ہیکل جانور کھڑا ہے جس پر لاڈ کر اسے یہاں لایا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ اپنے بھاری جتنے کے ساتھ اور بھی دہشت ناک لگ رہا تھا۔ ماہ بانو کو حیرت تھی کہ ان لوگوں نے کیونکر اس جانور کو سدھا کر اپنے استعمال کے لائق بنایا ہوگا۔ ایسے وحشی کو قابو کرنے کے لیے تو اس سے

بڑھ کر وحشت کی ضرورت تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ لوگ کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ بہر حال جو بھی تھا، اس وقت تو ایک سیاہ پر شکوہ پاک ان کی سواری کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس پر سامان کا بڑا سا تھیلہ بھی لدا ہوا تھا۔ یہ یقیناً زائرہ تھا جس کا عمران نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔

”ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے اس پاک کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس بر فانی علاقے میں یہ بہت تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور پھر اس پر سواری کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ سدھائے ہوئے ہیں اور راستوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ میں نے چونکہ خود بھی یہ جگہ اچھی طرح نہیں دیکھ رکھی اس لیے اندیشہ ہے کہ پیدل نکلنے کی صورت میں ہم راستہ بھٹک جائیں گے۔“ پاک کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے عمران نے اسے بتایا اور پھر اس کے قریب پہنچ جانے پر ماہ بانو کو اس پر سوار ہونے میں مدد دینے لگا۔

”اپنی جگہ پر رک جاؤ عمران! اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔“ ابھی ماہ بانو سوار نہیں ہو پائی تھی کہ وہ دونوں عقب سے سنائی دینے والی اس آواز پر بری طرح چونک کر پلٹے۔ وہ نائب کمانڈر تھا جو ہاتھ میں گن لیے ان دونوں کو خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گن کا رخ تو ظاہر ہے سو فیصدی ان دونوں ہی کی طرف تھا۔

”مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ تم کوئی گڑبڑ کرنے والے ہو اس لیے میں تم پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن بھائی صاحب اور میرا دونوں کا یہ خیال تھا کہ تم جو کچھ بھی گڑبڑ کرو گے، وہ شہر پہنچ کر کرو گے۔ ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر ایسی کوئی جرات کر سکتے ہو۔ وہ تو آج کی محفل میں، میں نے اتفاق سے اوروں کے مقابلے میں کم شراب پی لی تھی اس لیے میری اس وقت آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھ لیا کہ تم اس لڑکی کو لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہو۔ اب ایسا کرو کہ فرار کا خیال دل سے نکال کر اچھے بچوں کی طرح واپس اندر چلو۔ تمہارا فیصلہ صبح ہونے پر بھائی صاحب خود کریں گے۔“ نائب کمانڈر نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں حکم صادر کرتے ہوئے کہا لیکن عمران اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا اور وہیں کھڑا اسے گھورتا رہا۔

”ہری آپ مین! ٹائم ویسٹ مت کرو۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہاں کتنی سردی ہے اور میں نے تمہاری طرح سردی سے بچاؤ کا انتظام بھی نہیں کر رکھا۔“ عمران کو اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیکھ کر نائب نے اسے پچکارے ہوئے کہا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال کو خوب

انجوائے کر رہا ہے۔ عمران کو یوں عین موقع پر دھریے جانے کے کارنامے پر یقیناً وہ بہت خوش تھا اور اس سے یہ خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

”اور ہاں، دیکھو... آگے بڑھنے سے پہلے اپنے پاس موجود اسلحہ ضرور نیچے ڈال دو۔ یہ کافی خطرناک چیز ہے اس لیے تم جیسے بچے کے پاس اس کا رہنا مناسب نہیں۔“ نائب نے ایک بار پھر عمران کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے حکم دیا۔ اس کا یہ حکم سن کر عمران نے ہاتھ میں موجود ریوالور نیچے ڈال دیا اور پھر شانے سے لگی رائل اتارنے لگا۔ رائل اتارتے اتارتے اچانک ہی اس نے بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پینترا بدلا اور بجائے رائل نیچے پھینکنے کے سیدھی کر کے نائب کی طرف ایک فائر داغ دیا۔ رائل سے نکلی ہوئی گولی سیدھی جا کر نائب کے پائیں شانے سے ڈرا نیچے سوراخ بنائی۔ گولی کھا کر نائب کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ نیچے گر گیا۔ معلوم نہیں گولی نے اس کے دل کو متاثر کیا تھا یا نہیں... لیکن زخم بہر حال کاری تھا اور نائب زمین پر گرنے کے بعد دوبارہ اٹھ نہیں سکا تھا۔

”ہری آپ ماہ بانو! ہمیں بہت تیزی سے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گولی چلنے کی آواز سن کر اندر مدہوش پڑے ہوئے افراد میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جاگ گیا ہوگا۔ اگر زیادہ افراد اٹھ کر باہر نکل آتے تو میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔“ اسے سوار کرواتے ہوئے وہ اس پر صورت حال واضح کرنے لگا اور پھر خود بھی اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پاک پر سوار ہونے سے قبل وہ نیچے زمین پر گرا ہوا اپنا ریوالور اٹھانا ہرگز بھی نہیں بھولا تھا۔ سوار ہو کر اس نے جیسے ہی اشارہ کیا، پاک چل پڑا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی پھر بھی ان دونوں کو لگ رہا تھا کہ وہ بہت سست رومی سے آگے بڑھ رہے ہوں۔ رگوں کو کائناتی سردی کے ساتھ ہڈیوں کا گودا جما دینے والا خوف مل کر ان کے جسموں کو کپکپا رہا تھا اور دل میں خواہش ابھرتی تھی کہ کاش کسی طرح اس پاک کو پڑ لگ جائیں اور وہ لمحوں میں اس جگہ سے بہت دور نکل جائیں۔ ایسے میں انہوں نے اپنے پیچھے کچھ آوازیں سنیں تو اور بھی زیادہ متوجش ہو گئے۔ دونوں نے بہ یک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دو تین افراد تھے جو شاید گولی چلنے کی آواز سن کر جاگنے کے بعد غار سے باہر نکل آئے تھے اور اب نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک اس سمت نہیں دیکھا تھا جس طرف ماہ بانو اور عمران پاک پر سوار اڑے جا رہے تھے۔ ان کی یہ کوتاہی بے تحاشا شراب کے نشے کے سبب تھی ورنہ

بھاری بھر کم پاک کے چلنے سے زمین میں جو دھک پیدا ہوتی ہے اسے دور ہی سے محسوس کر لیا جاتا ہے۔

”یہاں اور بھی تو پاک ہیں۔ کہیں یہ لوگ ان پر سوار ہو کر ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کریں؟“ ماہ بانو نے خوف زدہ سے لہجے میں عمران سے کہا۔

”فی الحال وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے پاکوں کو کافی مقدار میں شراب پلا دی تھی اس لیے اس وقت ہمارے اس پاک کے علاوہ کوئی دوسرا پاک سواری کے لائق نہیں ہوگا۔ اگر ان لوگوں نے زبردستی ایسی کوئی کوشش کی بھی تو بڑا نقصان اٹھائیں گے۔“ عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنی توجہ پیچھے کی طرف ہی مرکوز رکھی تھی چنانچہ یہ نوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے افراد ان کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے لپکے لیکن درحقیقت وہ دونوں ان کی رسائی سے بہت دور نکل چکے ہیں، اس بات کو محسوس کر کے ان میں سے ایک کو عقل سوچھی اور اس نے رک کر اپنی رائل ان کی طرف تان لی۔

”نیچے جھک جاؤ۔“ عمران نے اسے ہدایت کی اور خود بھی اپنا سر اور بالائی جسم جھکا لیا۔ اب وہ دونوں تیزی سے حرکت کر کے پاک کی پشت پر اس طرح مجھوسر تھے کہ ان کے جسم اس کے سیاہ جتنے سے لپٹے ہوئے تھے۔ پیچھے سے فائر داغا گیا جو کسی نشانے پر نہیں بیٹھ سکا، البتہ فائر کی آواز نے پاک کو بھڑکا کر اس کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

”خود کو مضبوطی سے اس کی پیٹھ پر جمائے رکھو۔ فائرنگ سے خوف زدہ مت ہونا۔ ہم بہت دور نکل آئے ہیں اور اتنے فاصلے سے ان لوگوں کے لیے ہمیں نشانہ بنانا ممکن نہیں۔“ عمران نے یہ محسوس کر کے کہ کہیں وہ خوف کا شکار ہو کر پاک کی پشت سے گر نہ پڑے، اسے تسلی بھری ہدایت دی۔ اس نے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے اس ہدایت پر عمل کیا پھر پے در پے ہونے والے اگلے مزید فائروں کی آواز نے عمران کی اس بات کی تصدیق بھی کر ڈالی کہ وہ فائرنگ رینج سے نکل چکے ہیں۔ پیچھے سے فائر کرنے والوں نے بھی اس بات کو سمجھ لیا اور فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اب وہ جانے کون سا حربہ استعمال کر کے ان دونوں کو روکنے کی کوشش کرتے، فی الحال یہ واضح نہیں تھا۔ وہ دونوں پاک کی پشت سے چھٹن بہتقدیر انجانے راستوں پر... تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

صبح پیش آنے والے واقعے نے مشاہیرم خان کو بری

طرح جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے نہایت چالاکی کے ساتھ بے وقوف بنایا گیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے ٹورسٹ کمپنی کے دفتری نگرانی کر رہا تھا اور وہاں سے روانہ ہونے والی جیپوں پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن وہ ایک جیپ جس کی روانگی کا اسے انتظار تھا، نہایت صفائی سے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر روانہ کر دی گئی تھی۔ کسی نے عین موقع پر اسے اسپتال کے نمبر سے فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ نگرانی وغیرہ بھول گیا اور دیوانہ وار اسپتال کی طرف دوڑا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ماں کی طبیعت تو حسب معمول ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ یہ سارا ڈراما اسے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے سے ہٹانے کے لیے رچایا گیا تھا۔

مخالف پارٹی کی اس چال نے جہاں اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کیا، وہیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ٹورسٹ کمپنی کا مالک اس کام میں ملوث ہے۔ چنانچہ اب وہ کمپنی کے مالک کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن لینے کے بارے میں ہی غور کر رہا تھا۔ کافی غور کرنے کے بعد اس کے ذہن میں جو منصوبہ آیا اس کے مطابق اس نے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی معمول کی نگرانی ترک کر دی اور چائے کے ہوٹل پر جا کر بیٹھنے کے بجائے سارا دن اپنی ماں کے ساتھ اسپتال میں گزارا۔ شام کے وقت جب اس کی معلومات کے مطابق دفتر بند ہونے کا وقت قریب آیا تو وہ اسپتال سے نکلا اور چپکے سے کمپنی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل وہ اپنے لیے کرائے کی ایک جیپ حاصل کرنا یا نکل نہیں بھولا تھا۔ جیپ کے لیے اس نے دن میں ہی اسپتال سے فون کر کے بنگلہ کردالی تھی لیکن احتیاطاً دن میں اپنے پاس جیپ رکھنے سے گریز کیا تھا تاکہ اگر کوئی اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہو تو جیپ کرائے پر لینے کی وجہ سے چونک نہ جائے۔

اسپتال سے روانہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس طرف سے بہت محتاط رہا تھا لیکن اسے اپنے ارد گرد کوئی ایسا مشکوک شخص نظر نہیں آیا جس کے بارے میں اسے یہ گمان ہوتا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ شاید اپنا کام کر گزرنے کے بعد مخالفین نے اس کی نگرانی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نگرانی کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ جیپ میں اس راستے کی طرف روانہ ہوا جو ٹورسٹ کمپنی کے دفتری طرف جاتا تھا لیکن دفتر تک جانے کے بجائے راستے میں ہی ایک جگہ رک گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے کمپنی کے مالک کو دفتر سے اپنے گھر جانے کے

لیے لازماً گزرنا پڑتا۔ مشاہیرم خان کو مالک کے گھر کا پتا معلوم تھا اور وہ چاہتا تو وہاں جا کر بھی اسے چھاپ سکتا تھا لیکن ڈرائیور تیار علی کی ہلاکت کے بعد وہ اس معاملے میں محتاط ہو گیا تھا۔ نیاز علی کو وہ اس کے گھر سے ہی معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نیاز علی اپنی غلطی کے باعث کھائی میں گر کر ہلاک ہو گیا لیکن اس واقعے نے مشاہیرم خان کی حیثیت مشکوک کر دی تھی۔ اسی وجہ سے ابھی تک اسے بلتستان چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان حالات میں اگر ٹورسٹ کمپنی کے مالک کے ساتھ کچھ برا بھلا ہو جاتا اور اس کا نام سامنے آ جاتا تو اسے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتی، اسی لیے اس کی پوری کوشش تھی کہ خود کو پوشیدہ رکھے۔

کمپنی کے مالک کو راستے میں ہی روکنے کے لیے بھی اس نے اپنے مقام کا انتخاب کیا تھا جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ اس مقام پر اسے روکنے اور اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا۔ اپنی جیپ اس نے سڑک سے اتار کر ایک طرف روک لی تھی اور راستے پر نظریں جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہاں رکنے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ ٹورسٹ کمپنی کے مالک کی جیپ کو اس نے دور سے ہی شناخت کر لیا اس کی جیپ شناخت کرتے ہی وہ فوراً حرکت میں آیا اور اپنی جیپ اشارت کر کے عین سڑک کے درمیان میں لے گیا۔ سڑک پر سیدھے چلے آئے والے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اپنی جیپ کو ایمر جنسی بریکس لگانے پڑے۔

”کون پاگل کا بچہ ہے تو؟“ جیپ رکتے ہی وہ غصے سے دھاڑتا ہوا باہر نکلا لیکن مشاہیرم خان تو اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہی نہیں تھا۔ جیپ عین سڑک پر روکنے کے بعد وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس سے کود کر نیچے سڑک پر رینگ گیا تھا۔ شام کے جھک آنے والے سایوں میں کمپنی کا مالک اس کی یہ نقل و حرکت نہیں دیکھ سکا، چنانچہ اب خالی ڈرائیونگ سیٹ دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ اس کی اس حیرت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب مشاہیرم خان نے پیچھے سے آکر اسے چھاپا۔ پھر کٹیشی پر لگنے والی مشاہیرم خان کی پنی تلی ضرب نے اس کے حواس اس طرح غائب کیے کہ وہ حیرت سمیت کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہیں رہا اور لہراتا ہوا سڑک پر گرنے لگا لیکن مشاہیرم خان نے اس کے گرنے سے قبل ہی اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جیپ تک لے گیا۔ اسے جیپ کے پیچھے بھٹے میں ڈالنے کے بعد وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور

سڑک پر تڑپتی کھڑی جیپ کو یورس کر کے اسے سیدھا کرتے ہوئے برق رفتاری سے دوڑا دیا۔ اتنی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرنے کے باعث جیپ کے پیچھے بری طرح چہرے اور قضا میں چہرہ ہٹ دور تک پھیل گئی۔ اس دوران سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی اس لیے مشاہیرم خان کو اطمینان تھا کہ اس سارے واقعے کا کسی کو علم نہیں ہو سکا۔ ویسے اس نے جس انداز میں اپنی جیپ ریس کر کے اسے دوڑایا تھا، وہ انداز بہت رکی تھا۔ ذرا سی غلطی جیپ کو غیر متوازن کر کے حادثے کا سبب بن سکتی تھی لیکن خیر گزری اور اس کی ڈرائیونگ میں مہارت نے کوئی حادثہ رونما نہیں ہونے دیا اور وہ اسی رفتار سے جیپ چلاتا ہوا اپنی طے شدہ منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

یہ ایک خوش کن اتفاق ہی تھا کہ ایک دن قبل ہی آذر نے اسے اپنے گھر پر رہائش اختیار کرنے کی پیشکش کی تھی۔ آذر نامی ٹورسٹ گائڈ جو اکرم خان کے دوستوں میں سے تھا، بہت اچھا اور بااخلاق آدمی ثابت ہوا تھا۔ نیاز علی کی موت کے بعد ایک روز اتفاقاً اس کی مشاہیرم خان سے جائے کے ہوٹل میں ملاقات ہو گئی تھی۔ اسے جب اس بات کا علم ہوا کہ مشاہیرم خان کی ماں ہنوز اسپتال میں داخل ہے اور وہ ایک سرائے میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہے تو اس نے پُر زور اصرار کر کے مشاہیرم خان کو اپنے گھر پر ٹھہرنے کے لیے راضی کر لیا۔ آذر تنہا آدمی تھا جس کے ایک کمرے کے گھر میں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا اور وہ خود بھی کم ہی اپنے گھر میں تک پاتا تھا۔ آئے دن اسے کسی نہ کسی ٹیم کے ساتھ پہاڑوں کے سفر پر جانا ہوتا تھا۔ مشاہیرم خان نے اس کے خلوص سے ہار کر اس کی پیشکش قبول کر لی تھی اور اس کی گزشتہ رات آذر کے گھر پر ہی گزری تھی۔

آذر حسب معمول ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا تھا اور جاتے جاتے گھر کی چابیاں مشاہیرم خان کو دے گیا تھا، چنانچہ مشاہیرم خان کے لیے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اغوا کرنے کے بعد کسی ٹھکانے تک لے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ درحقیقت وہ یہ سارا منصوبہ بنا ہی اس لیے رکھا تھا کہ اس کے پاس ایک مناسب ٹھکانا موجود تھا۔ دوسرے گھروں سے ہٹ کر بنا آذر کا چھوٹا سا گھر اس کے لیے موجودہ صورت حال میں بہت کارآمد ثابت ہونے والا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے بعد اس نے پہلے دروازے پر لگا تالا کھولا اور پھر جیپ کی پچھلی طرف پڑے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اٹھا کر اندر لے گیا۔ اس نے محفل مندی کی تھی کہ اسے جیپ میں ڈالنے کے بعد

ایک بڑے ترپال سے ڈھانپ دیا تھا اور اب اسی ترپال میں لپیٹے ہوئے ہی اندر لے گیا تھا۔ اگر کسی شخص نے اس کی نقل و حرکت دیکھ بھی لی ہوگی تو یہی گمان کیا ہوگا کہ وہ کوئی سامان مکان کے اندر لے جا رہا ہے۔

مکان کے اندر پہنچنے کے بعد اس نے ٹورسٹ کمپنی کے مالک صغیر بیگ کے ہاتھ پیروں کو رسی کی مدد سے باندھا اور ساتھ ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے بعد اس کے منہ میں بھی کپڑا اٹھوس دیا۔ یہ سب اس نے احتیاطی تدبیر کے طور پر کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صغیر بیگ آذر کے گھر کو شناخت کر سکے یا ہوش میں آنے کے بعد شور مچا کر کسی راہ چلتے شخص کو متوجہ کر سکے۔ آذر کا گھر دوسرے مکانات سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود وہ اپنے طور پر پوری احتیاط کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ان انتظامات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں گیا اور وہاں سے گوشت کاٹنے کی تیز دھار والی چھری کے ساتھ پانی کا جگ بھی بھر کر لے آیا۔

پانی کا بھرا ہوا جگ اس نے صغیر بیگ کے چہرے پر اندیل دیا۔ وہ چہرے پر ٹھنڈا پانی گرنے پر بھر بھری سی لے کر ہوش میں آیا۔ اس کے ہوش میں آنے کی نشانی یہ تھی کہ اس نے پانی ڈالے جانے کے بعد بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن ہاتھ پیر بندھے ہونے کی وجہ سے اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ منہ میں کپڑا اٹھسا ہونے کی وجہ سے آواز نکالنا تو یوں بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس صورت حال پر وہ بے چین ہو کر بڑی طرح کسمانے لگا۔ ”میں تمہارے منہ میں ٹھنڈا کپڑا نکالنے کے لیے تیار ہوں صغیر بیگ... لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ تم غیر ضروری آوازیں نہیں نکالو گے اور میں جو کچھ پوچھوں گا، اس کا صحیح جواب دو گے۔“ اس کی بے چینی ملاحظہ کرتے ہوئے مشاہیرم خان نے گھبر لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی شرائط پیش کیں۔ جواب میں وہ شہود سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ مشاہیرم خان نے آگے بڑھ کر اس کے منہ میں ٹھنڈا ہوا کپڑا باہر کھینچ لیا۔ کپڑا نکلتے ہی وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

”پپ... پانی...“ کھانسی کے دوران ہی اس نے... یہ مشکل یہ ایک لفظ ادا کیا۔ مشاہیرم خان نے جگ میں قہقہہ جانے والے پانی میں سے دو ٹونٹ اس کے منہ میں ڈال دیے۔ ”کون... کون ہو تم؟ مجھے اس طرح اغوا کیوں کیا ہے؟“ پانی نے خشک حلق کو تر کیا تو اس نے پوچھا۔

”سوال تم نہیں میں کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کے جواب میں سچ بولنا ہوگا، ورنہ اپنے انجام کے تم خود ذمے

دار ہو گئے۔“ مشاہیرم خان نے اپنی آواز میں سفاکی سموتے ہوئے اسے دھمکی دی اور ساتھ ہی چھری کی نوک اس کے رخسار میں اس حد تک چھوئی کہ وہاں سے خون کا ایک قطرہ نکل آیا۔

”مم... میں سب بتائے کو تیار ہوں۔ اگر تمہیں روپیہ پیسا چاہیے تو وہ میں تمہیں دے دوں گا... بلکہ تم خود جا کر نکال لو۔ میرے دفتر میں لکڑی کی الماری کے پیچھے ایک سیف...“ وہ چھری کی صرف نوک چھونے پر ہی اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ مشاہیرم خان کو کوئی لیسرا سمجھ کر از خود اسے اپنے دفتر میں موجود خفیہ سیف کے بارے میں بتانے لگا۔

”مجھے تمہارے روپے سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم خود سے بک بک کرنے کے بجائے ان باتوں کا جواب دو جو میں تم سے پوچھوں۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مشاہیرم خان نے اسے ڈپٹ دیا تو وہ سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

”تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟“ مشاہیرم خان نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔

”کسی کے لیے نہیں۔ میرا اپنا ذاتی بزنس ہے۔ اسکرود پینچ کر اوپر پہاڑوں پر جانے والے میرے تھرو سواری، پورٹرز اور دوسری ضروری چیزوں کا انتظام کرتے ہیں۔“ اس نے نہایت بھولپن سے جواب دیا۔

”میں اس بزنس کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے اس کام کے بارے میں بتاؤ جس کے لیے تم نیاز علی کو استعمال کرتے تھے۔ اب کون نیاز علی کی جگہ یہ کام کر رہا ہے؟“ اس نے چھری کی نوک پر کچھ اور دباؤ ڈالتے ہوئے سر دلچے میں پوچھا۔

”نیاز علی جیب ڈرائیور تھا۔ اس کا کام ٹورسٹس کو لے جانا اور واپس لانا تھا۔ ابھی سیزن زوروں پر نہیں ہے اس لیے میں نے ابھی تک نیاز علی کی جگہ دوسرا ڈرائیور نہیں رکھا ہے۔“ صغیر بیک نے کراہتے ہوئے اسی معصومیت سے جواب دیا جس کا وہ اب تک مظاہرہ کر رہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھے طریقے سے میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گے؟“ مشاہیرم خان کو اس کا جواب سن کر اتنا غصہ آیا کہ اس نے صغیر بیک کے رخسار میں چھری کی نوک کو بے دردی سے حرکت دے ڈالی۔ چھری کی نوک نے صغیر بیک کے رخسار پر ڈیڑھ انچ کے قریب گہری سرخ لکیر کھینچ دی۔ اس زخم کو کھا کر صغیر بیک کے حلق سے ایک بھیا تک چیخ بلند ہوئی جس کو مشاہیرم خان نے درمیان میں ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھونٹ ڈالا۔

”سچ بتاؤ کہ نیاز علی جب کسی ٹیم کو واپس لینے کے لیے جاتا تھا تو اپنے ساتھ کسے راشن پانی سپلائی کرنے کے لیے لے جاتا تھا؟ کون ہیں وہ لوگ جو پہاڑوں پر چھپے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اکرم خان کو قتل کرنے کے علاوہ اس کی مہمان لڑکی کو اغوا بھی کیا ہے؟“ مشاہیرم خان نے قہر آلود لہجے میں اس سے سوال کرتے ہوئے اس کے منہ پر رکھا ہاتھ ہٹا دیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ صغیر بیک نے سسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

”میں تم سے معلوم کر کے رہوں گا۔“ مشاہیرم خان نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور پھر اس پر پل پڑا۔ وہ بے دریغ اس پر لاقوں اور کتے برساتا جا رہا تھا۔ صغیر بیک کا بندھا ہوا جسم اس کی لگا لگی ہر ضرب پر تڑپا لیکن وہ بالکل بے بس تھا اور اس کے پاس مار کھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آخر کار وہ مار سہ سہ کر ادھ موا ہو گیا اور اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مشاہیرم خان نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ صغیر بیک یقینی طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ پانی کا خالی ہو جانے والا جگ اٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا اور ایک بار پھر جگ بھر کر کمرے میں واپس آیا۔ اس بار اس نے جگ میں موجود تمام پانی ایک ساتھ صغیر بیک کے اوپر اٹھیل دیا۔ ٹھنڈا پانی اسے بے ہوشی کی دنیا سے واپس لے آیا۔

”بولو، اب بھی سچ بتاؤ گے یا میں تمہاری اور خاطر کروں؟“ مشاہیرم خان نے اس کے منہ میں ٹھنڈا ہوا کپڑا بے دردی سے کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے سوال کیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں معلوم۔“ صغیر بیک دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ آنکھوں پر پٹی بندھے ہونے کی وجہ سے اس کے آنسو تو بے شک بہتے ہوئے نظر نہیں آرہے تھے اور نہ ہی ان میں موجود تاثیرات کو پڑھ کر سچ جھوٹ کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا لیکن اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مشاہیرم خان کو سوچ میں ڈال دیا۔ اتنی مار کھانے کے بعد اس قدر استقامت سے جھوٹ برڈٹے رہنا بہت ہی ذہیت اور پیشہ ور مجرموں کے لیے ہی ممکن ہوتا ہے لیکن صغیر بیک جس قدر نڈھال اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ بھی یقین نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ مجرموں کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

”اگر تم نیاز علی کی حرکتوں سے واقف نہیں تھے تو یہ بتاؤ

کہ وہ تمہاری کمپنی کی جیب میں تمہارے علم میں آئے بغیر سامان لوڈ کر کے کسے لے جاتا تھا؟ کیا کبھی تم نے نوٹ نہیں کیا کہ جب وہ کسی ٹیم کو لینے جاتا ہے تو اس کی جیب خالی نہیں ہوتی؟“ اس بار اس نے اپنا لہجہ ذرا نرم کرتے ہوئے صغیر بیک سے سوال کیا۔

”نیاز علی میرا بہت پرانا ڈرائیور تھا۔ میں اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اسے جب پہاڑوں سے اترنے والی کسی ٹیم کو واپس لینے جانا ہوتا تھا تو وہ رات میں ہی مجھ سے جیب لے جاتا تھا اور صبح دفتر آنے کے بجائے اپنے گھر سے ہی روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کی بھی کہیں سے شکایت نہیں ملی تھی اس لیے میں بھی اس معمول پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔“ صغیر بیک نے گویا کوئی عقدہ کھولا جس پر مشاہیرم خان سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے وہ سمجھ رہا تھا کہ ماں کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اسے عین وقت پر صغیر بیک کے دفتر کے سامنے سے اس لیے ہٹایا گیا تھا کہ اسے خاص جیب کی روانگی کا علم نہیں ہو سکے... لیکن اب جو صورت حال سامنے آئی تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مشکوک جیب تو صغیر بیک کے دفتر سے روانہ ہی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی اس نے اتنے دن دفتر کی نگرانی کر کے اپنا وقت ضائع کیا تھا لیکن بہر حال یہ کوئی حتمی بات نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ صغیر بیک جھوٹ بول رہا ہو۔ وہ اس کے نیاز علی کے بارے میں ویسے گئے بیان کی تصدیق کیے بغیر اس پر مکمل بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر صغیر بیک سچا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اصل مجرم اس پر مکمل نظر رکھے ہوئے ہیں اور انہوں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے ایسی حرکت کی تھی جس کے باعث وہ صغیر بیک کے پیچھے پڑ جائے۔

”کیا تم پولیس والے ہو؟“ وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ صغیر بیک کی آواز نے اسے چونکایا۔

”ہاں۔“ اس نے اس کے خیال کی تصدیق کرنا ہی مناسب سمجھا اور پھر سر دلچے میں بولا۔ ”تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس کے سچ جھوٹ ہونے کا پتا لگایا جائے گا۔ سچ کی صورت میں رہائی اور جھوٹ کی صورت میں قہر تمہارا نصیب ہوگا۔ تم اپنے انجام کے لیے یہاں رک کر انتظار کرو۔“ وہ ایک بار پھر صغیر بیک کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر آذر کے گھر سے روانہ ہو گیا۔ عارضی طور پر قوت حرکت و گویائی سے محروم کردہ صغیر بیک کی طرف سے اسے بے فکری تھی کہ وہ یہاں سے کسی طور نہیں بھاگ سکے گا۔

☆☆☆

”یہ کافی پی لو۔ اسے پی کر تمہارے جسم میں گرمی

آجائے گی۔“ عمران نے بھاپ اڑاتا ہوا کافی کا کپ ماہ بانو کی طرف بڑھایا۔ وہ دونوں پاک کی پشت پر اندھیرے میں کیے جانے والے تکلیف دہ اور خطرناک سفر کو سپیدہ سحر نمودار ہونے کے بعد کچھ دیر کے لیے ترک کر کے ایک پہاڑی چٹان کے سائے میں رکے تھے۔ اس موقع پر عمران نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بڑے سے تھیلے کو کھول کر اس میں سے مٹی کے تیل سے جلنے والا اسٹوو نکالا اور پھرتی سے کافی تیار کر ڈالی۔ کافی کے ساتھ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے جو اس نے کھانے کے لیے ماہ بانو کو پیش کیے۔

”جلدی سے ناشتے سے فارغ ہو جاؤ تاکہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ وہ لوگ ہمارے قرار کے بارے میں جاننے کے بعد آرام سے نہیں بیٹھیں گے... اور ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ لوگ ہمارے مقابلے میں ان راستوں سے بہت اچھی طرح آشنا ہیں اس لیے وہ زیادہ تیزی سے فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔“ کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے عمران نے بے حد صاف گوئی سے ماہ بانو کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

”تو پھر چلو، ابھی چلتے ہیں۔“ اس نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میں موجود کپ نیچے رکھ دیا اور سر ایسنگی سے بولی۔

”پہلے ناشتا کر لو۔ اس علاقے میں سردیوں کرنے کے لیے جسم میں طاقت ہونا بہت ضروری ہے ورنہ دشمن سے پہلے موسم کی سختی ہمیں ہلاک کر ڈالے گی۔ خصوصاً تمہیں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک تو تم عورت ہونے کے ناتے ویسے ہی کمزور ہوؤ اور دوسرے قید کے دنوں اور ڈپریشن نے تمہیں اور بھی کمزور کر دیا ہے۔“ عمران نے جُردباری سے اسے سمجھایا تو وہ فوراً ہی قائل ہو گئی اور عمران کی پیروی کرتے ہوئے خود بھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے تیزی سے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگی۔ پانچ منٹ بعد وہ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں عمران جو کہ پہلے ہی ناشتے کو نشتا چکا تھا، ناشتے کی تیاری کے لیے نکالا جانے والا سامان واپس رکھ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئی تو انہوں نے ایک بار پھر سفر کا آغاز کر دیا۔ ابھی وہ مشکل سے چند گز ہی آگے بڑھے تھے کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور اگلے ہی لمحے عمران کے منہ سے ایک درد بھری چیخ نکلی۔ اس چیخ کو سن کر ماہ بانو نے اس پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی کہ عمران کے بائیں شانے سے خون نکل کر اس کے اوئی لباس پر پھیلتا جا رہا ہے۔

”اپنا سر جھکا لو اور نیچے جھلانگ لگانے کی کوشش

کرو۔“ پہلی بے ساختہ چیخ کے بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے پہنچی ہوئی آواز میں ماہ بانو کو ہدایات دیں۔ اتنی دیر میں کچھ اور گولیاں بھی سائیں سائیں کرتی ہوئی ان کے آس پاس سے گزر چکی تھیں۔ دشمن نے ان کی توقع سے بہت قبل انہیں آلیا تھا اور اب ان کی فرار کی راہ مسدود کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عمران جانتا تھا کہ بھاگنے کی کوشش کا رگر ثابت نہیں ہوگی کیونکہ تعاقب میں آنے والے اس راستے پر سفر کرنے میں ان سے زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ اب ان کے پاس یہی چارہ تھا کہ وہ رک کر اپنے پیچھے آنے والوں کا مقابلہ کریں اور ان سے جان چھڑانے کے بعد آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

ماہ بانو نے بھی بڑے خود کار انداز میں یہ بات سمجھ لی تھی، چنانچہ نیچے چھلانگ لگانے سے قبل از خود ایک رائفل اپنے ہاتھ میں لے لی۔ عمران یقیناً اس کی اس حرکت پر حیران ہوا ہوگا اور اس کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا ہوگا کہ یہ تازک اندام لڑکی بھلا رائفل کا کیا کرے گی؟ لیکن یہ موقع کسی قسم کے سوال جواب کا نہیں تھا اس لیے وہ چپ رہا اور اسے ایک پہاڑی کی آڑ میں ہونے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی اس کی طرف دوڑ گیا۔ اس دوران میں ان پر مسلسل فائرنگ کی جاتی رہی تھی اور یہ محض خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں اب تک کسی گولی کی زد میں نہیں آئے تھے اور پہاڑی کی آڑ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

آڑ میں پہنچنے کے بعد عمران نے رائفل سیدھی کر کے اس سمت فائرنگ کرنا شروع کر دی جس طرف ان کے تعاقب میں آنے والے موجود تھے۔ اس جوانی فائرنگ کا کوئی خاص نتیجہ اس لیے نہیں نکل سکا کہ آنے والے بھی اپنے تحفظ کا خیال رکھتے ہوئے آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ دو تین منٹ تک دونوں طرف سے فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ماہ بانو نے اگرچہ عمران کے پاس موجود فاضل رائفل ہاتھ میں لے لی تھی لیکن ابھی تک اس نے کوئی فائرنگ نہیں کیا تھا جبکہ دوسری طرف سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ تعداد میں کم از کم تین سے چار ہیں۔

”وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ یکا یک عمران کو احساس ہوا کہ فائرنگ پہلے کی طرح ایک سمت سے ہونے کے بجائے مختلف سمتوں سے ہو رہی ہے تو وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں ماہ بانو سے بولا۔ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس سے قبل ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے اس کی توجہ ہٹا لی۔ ان کی سواری کا کام دینے والا ایک جو کہ اس سارے ہنگامے

سے بُری طرح پریشان ہو گیا تھا اور پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگتا پھر رہا تھا، یک دم ہی گولیوں کی زد میں آ گیا تھا۔ قوی ہیکل جانور کے گولی کھا کر تڑپنے کا وہ منظر بے حد دل دوز تھا۔ گولی کا زخم فوراً ہی اسے زمین بوس کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ البتہ اس زخم کو کھا کر وہ غضب ناک ہو کر بُری طرح اچھل کود کرنے لگا تھا۔ اس کے پھاری قدموں کی دھمک فائرنگ کے شور کے باوجود سنی جاسکتی تھی۔

اپنی اس غضب ناکی میں وہ بے قابو ہو کر بھاگا اور سیدھا اس شخص سے جا کر ٹکرایا جو رائفل اٹھائے جھکا جھکا آگے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قوی ہیکل جانور کی ٹکر نے اسے کئی فٹ اوپر اچھالا اور پھر وہ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ دوبارہ زمین پر آکر گرا۔ اس کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کئی گز دور جا گری اور پھر مرے پر سوڑے کے مصداق بھاری بھر کم مشعل یاک اسے روندنا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یاک کے اس پر سے گزرنے کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کی گولی ہڈی سالم رہی ہوگی یا وہ ایک کے بعد دوسرا سانس لے سکا ہوگا۔ زخمی یاک کو بھی زیادہ سانس لینے کا موقع نہیں ملا۔ وہ طیش کے عالم میں کچھ اور تباہی مچاتا، اس سے قبل ہی ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور اس کے سر میں پیوست ہو گئی۔ یقیناً یہ گولی مرنے والے کے کسی ساتھی نے اپنے بھائی بند کی موت کا انتقام لینے کے لیے چلائی تھی۔

”وہ دیکھو... وہ راستہ اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ اگر ہم وہاں سے اوپر چلے جائیں تو بہتر پوزیشن میں آجائیں گے۔“ یاک کی موت کے بعد ماہ بانو نے عمران کی توجہ ایک تنگ سے راستے کی طرف مبذول کروائی۔ جس وقت عمران جوانی فائرنگ میں مصروف تھا، وہ ارد گرد کا جائزہ لینے کا ہی کام کرتی رہی تھی اور یہ راستہ اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ عمران نے خو کو گھیرے جانے کا خدشہ ظاہر کیا تو اس نے حل کے طور پر اپنے ذہن میں آنے والی تجویز اس کے گوش گزار کر دی۔ عمران نے اس کی تجویز پر لمبے بھر کے لیے غور کیا تو اسے یہ ایک بہت ہی موزوں حل نظر آیا۔ بلندی کی طرف جانے کے باوجود اس راستے کی خوبی یہ تھی کہ وہ دونوں براہ راست فائرنگ کی زد میں نہیں آسکتے تھے۔ جگہ جگہ ابھری ہوئی چٹانیں انہیں اوپر تک پہنچانے کے لیے بہترین آڈر فرائم کر سکتی تھیں۔

”چلو... ہری آپ۔“ عمران نے ماہ بانو سے کہا اور خود اس راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ کھڑے ہو کر سیدھے چلنے کے بجائے ہاتھ پیروں کے بل رینگتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس طرح اگر کوئی دور سے دیکھ بھی

رہا ہوتا تو وہ فوراً اس کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے اوپر چڑھنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا۔ اب فائرنگ کی آوازیں جس طرح سے سنائی دے رہی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دشمن ان کی سابقہ پناہ گاہ سے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔

پھر یکایک فائرنگ رک گئی۔ یقینی طور پر وہ لوگ عمران کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ بند ہونے پر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ خاموشی چھا جانے پر وہ دونوں اور بھی تیزی سے بلندی تک کا سفر طے کرنے لگے۔ اسی تیزی کی وجہ سے ماہ بانو سے ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور اس کے پیر تلے آنے والا ایک پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ پتھر کے لڑھکنے کی آواز نے انہیں گھبرانے کی کوشش کرنے والوں کو متوجہ کر دیا۔ فوراً ہی ایک فائر ہوا اور ماہ بانو کے منہ کے قریب چٹان کے ٹکڑے اڑے اور اُدھر اُدھر سے ایک ٹکیلا سا ٹکڑا اس کی پیشانی سے بھی آ کر ٹکرایا اور اس نے شدید تکلیف کے ساتھ ساتھ پیشانی سے خون بھی نکل کر بہتا ہوا محسوس کیا لیکن موجودہ صورت حال میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔

وہ فائر کی زد میں آنے سے بال بال بچی گئی۔ اگر اس پر فائر کرنے والے کا نشانہ نہ چوکتا تو چٹان کے بجائے اس کی گھوڑی کے ٹکڑے اُدھر اُدھر اڑ رہے ہوتے۔ اس نے بری طرح گھبرا کر خود کو ایک چٹان کی آڑ میں چھپایا اور پلٹ کر اس طرف دیکھنے کی کوشش کی جہاں سے فائر ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے بلند چیخ کے ساتھ ایک شخص کو نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ عمران کا کارنامہ تھا جو اس سے پہلے مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا تھا اور ماہ بانو پر فائر کرنے والے کے نظر میں آ جانے پر اس نے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

ماہ بانو نے ایک گہرا سانس لیا اور مزید اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر کے اسی چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ اس کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے والے کی موت کے بعد دوستوں سے ان پر بڑی شدت سے فائرنگ کی جانے لگی تھی۔ فائرنگ کی آواز سے دشمن کی پوزیشن کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے اپنے پاس موجود رائل سیدھی کی اور دائیں طرف موجود شخص کو اس کی فائرنگ کا جواب دیا۔ اسے میدان عمل میں اترتے دیکھ کر عمران کو کچھ تقویت سی محسوس ہوئی۔ اب تک وہ بہت بلند ہستی کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، ورنہ زخمی شانے کے ساتھ مسلسل فائرنگ کرنا اور اتنی بلندی پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ بلندی پر پہنچ جانے کے بعد البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ بہتر پوزیشن پر آ گیا تھا اور اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حملہ

آ کر کہاں سے فائرنگ کر رہے ہیں۔ بائیں طرف والے نے ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں پناہ لے رکھی تھی جبکہ دائیں طرف والا ایک چھوٹی چٹان کے پیچھے تھا۔

عمران اکا دکا فائر کرتے ہوئے اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی سے غلطی ہو اور وہ جوش میں آ کر اپنی پناہ گاہ سے جسم کا کوئی عضو باہر نکالنے کی غلطی کرے تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکے۔ آخر کار بائیں جانب والے نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اس کی طرف سے فائرنگ میں وقفے کی وجہ سے اس نے شاید کوئی چانس لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی یہ کوشش اسے مہنگی بڑی اور جوئی اس کا سر پتھر کی آڑ سے باہر آیا، عمران کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی سیدھی جا کر اس کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ اب صرف ایک دشمن باقی رہا تھا جس سے انہیں اپنی جان چھڑانی تھی لیکن وہ بے حد محتاط تھا اور اس نے اپنی پناہ گاہ سے انگلی تک باہر نکالنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھی کی رائفل خاموش ہونے پر اس کی موت کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔

”خبیث... بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ ایک دم ہی عمران کو احساس ہوا کہ مقابل کی طرف سے فائر تو کیا جا رہا ہے لیکن اس کی آواز دور ہوئی جا رہی ہے۔ سو وہ غصے سے بڑبڑایا اور پھر ہونٹ پیچھتے ہوئے اپنے پاس موجود ہینڈ گریینڈ نکالا۔ اگلے ہی بل اس کے دائیں بازو نے فضا میں قوس بناتے ہوئے حرکت کی اور ہینڈ گریینڈ درمیان کا اچھا خاصا فاصلہ طے کرتا ہوا اس چٹان کے عقب میں جا کر گرا جس کے پیچھے ان کا آخری دشمن اب تک چھپا رہا تھا۔

پہاڑوں میں ایک کان پھاڑ ڈھکا کا گونجا اور چٹان کے عقب سے مٹی اور پتھروں کے اٹھتے طوفان کے ساتھ اس نے انسانی اعضا کو بھی اڑتے ہوئے دیکھا۔ دل کو کپکپا دینے والے اس منظر نے وقت کے اس پل میں اسے حقیقتاً بے حد سکون بخشا تھا۔ کسی انسان کی ایسی عبرت ناک موت لاکھ ناپسندیدہ سہی لیکن یہ سچ تھا کہ جو لوگ ابھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے، اسے ان میں سے کسی کی بھی موت کا افسوس نہیں تھا۔ ان افراد کی موت نے اس کے اور ماہ بانو کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانوں کی زندگی کو بقاء بخشی تھی۔ وہ جو ابھی ان پہاڑوں میں حقیر چوہوں کی طرح مارے گئے تھے، درحقیقت خود چلتی پھرتی موت تھے... جو اگر جیتے تو جانے کتنوں کی زندگیوں کا چراغ گل کر ڈالتے۔

آخری دشمن کے بھی موت کے گھاٹ اتر جانے کے

بعد عمران کچھ ٹھٹھا حال سا ہو کر وہیں اپنی جگہ پر ہی لیٹ گیا۔ ماہ بانو جو کہ اس لڑائی میں کسی دشمن کو ٹھکانے نہیں لگا سکی تھی لیکن عمران کی معاونت کرتی رہی تھی، امن ہو جانے پر اپنی پناہ گاہ سے نکل کر اس کے پاس آئی۔

”تمہارا تو بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔“ عمران کے خون سے تر لباس کو دیکھ کر اس نے تشویش سے کہا اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر اس کے زخمی شانے کا معائنہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں یہاں مزید ٹھہرنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے آگے کا سفر شروع کرنا چاہیے۔“ عمران نے اسے معائنے کے لیے اپنا زخمی شانہ پیش کرنے کے بجائے آہستہ سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر واپس نیچے کی طرف جانے لگا۔ ماہ بانو نے بھی کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے اس کی پیروی کی۔ وہ دونوں انسانی لاشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے جہاں ان کی سواری کا کام دینے والے یاک کا مردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ ان کے سامان کا تھیلہ اب بھی یاک کی پشت سے بندھا تھا اور سواری سے محروم ہو جانے کے باوجود یہ بات خوش آئند تھی کہ یاک ایسے رخ سے گرا تھا کہ ان کے سامان کا تھیلہ اس کے دیوہیکل جسم کے نیچے آنے سے محفوظ رہا تھا، ورنہ دوسری صورت میں وہ دونوں کسی طور بھی اس کے پہاڑ جیسے وجود کو ہٹا کر اس کے نیچے سے اپنا سامان نہیں نکال سکتے تھے۔

”یہ تو کیا۔ اب ہمیں پیدل ہی سفر کرنا ہوگا۔“ یاک پر سے اپنا تھیلہ اتارتے ہوئے عمران بولا۔

”ہمارے تعاقب میں آنے والے بھی تو کسی سواری پر آئے ہوں گے۔“ اس کی بات سن کر ماہ بانو نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

”یہ لوگ دو یا کوں پر آئے تھے لیکن وہ دونوں یاک فائرنگ کے شور سے بدک کر بہت پہلے ہی یہاں سے بھاگ چکے ہیں۔ اب اگر ہم نے کسی طرح ان یاکوں کو تلاش بھی کر لیا تو ان پر قابو پا کر ان پر سواری نہیں کر سکیں گے۔“ عمران نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور سامان کے تھیلے میں سے ایک نسبتاً چھوٹا تھیلہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”میں شرمندہ ہوں لیکن مجبوری ہے کہ تمہیں بھی اس سفر میں کچھ وزن اٹھانا پڑے گا۔“ وہ یقیناً اپنے زخمی شانے کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔

”سامان میں دوائیں وغیرہ بھی موجود ہیں یا نہیں؟“ اس کے ہاتھ سے تھیلہ تھامتے ہوئے ماہ بانو نے سنجیدہ لہجے

میں پوچھا۔

”بالکل ہیں بلکہ اسی تھیلے میں ہیں جو میں نے ابھی تمہیں دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر تم کچھ دیر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پہلے میں تمہارے زخمی شانے کی مرہم پٹی کروں گی پھر ہم آگے کا سفر کریں گے۔“ عمران کا جواب سن کر وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

”میرا خیال تھا کہ ہم کچھ فاصلہ طے کر لیتے پھر اس کے بعد یہ مرہم پٹی کا کام ہوتا رہتا۔“ عمران نے انکار کرنا چاہا۔

”تم بہت زخمی ہو اور اس حالت میں تمہارا وزن اٹھا کر ایسے ہی سفر جاری رکھنا مناسب نہیں۔“ ماہ بانو کے انداز میں جو قطعیت تھی، اس سے عمران کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹے گی چنانچہ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ماہ بانو نے اچھی خاصی مہارت سے کام لیتے ہوئے اس کے زخمی شانے کی مرہم پٹی کی اور دواؤں میں موجود ایک پین کھرا سے کھانے کے لیے دی۔ کالج میں بھی شوق میں لی جانے والی فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ اس ویران برفانی پہاڑی علاقے میں کام آئے گی، اسے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی تربیت کی اچھی خاصی لایج رکھتے ہوئے عمران کی ٹھیک ٹھاک قسم کی ہینڈ بیج کر تو دی تھی لیکن اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ گولی اندر ہی موجود ہے اور وہ اس گولی کو نکالنے سے معذور تھی۔ اس کام کے لیے نہ تو اس کے پاس مطلوبہ مہارت تھی اور نہ ہی سامان۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں جہاں طبی سہولتیں بھی میسر آسکیں۔ پھر اس نے عمران کی معیت میں آگے کا سفر شروع کر دیا۔ ایک ایسا سفر جس کے راستوں کا انہیں علم نہیں تھا۔ وہ جسے ان راستوں پر چلنے کی تربیت دی گئی تھی، ایک مٹی کے تودے کی طرح بے جان پڑا تھا۔ ایک جانور کی موت نے انہیں سواری ہی نہیں راہنما سے بھی محروم کر دیا تھا اور اب وہ اپنا بوجھ خود اٹھائے انجانے راستوں پر تنہا سفر کرنے پر مجبور تھے۔

☆☆☆

”تم یہیں رکو، اندر میں اکیلی جاؤں گی۔“ درگاہ کے احاطے میں پہنچنے کے بعد دشور نے اپنے ساتھ آئی ہوئی شادو سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”لیکن بی بی... وڈی چودھرائن نے تو کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں۔“ اس نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

کشور کی درگاہ پر حاضری کی خواہش پر وڈی چودھرائی نے یوں تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا لیکن اپنی خاص ملازماؤں میں سے شاد کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ حویلی کی عورتیں تنہا صرف ڈرائیور کے ساتھ کہیں جاتی تھیں۔ ایسے پر موقع پران کے ساتھ کوئی نہ کوئی ملازمہ ضرور موجود ہوتی تھی لیکن کشور جانتی تھی کہ اس وقت شاد کو اس کے ساتھ بھیجے گا مقصد روایت کی پاسداری نہیں بلکہ اس کی نگرانی ہے اور اب شاد کے جیلے نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی۔

”ساتھ رہنے کو کہا تھا یہ تو نہیں کہا تھا کہ میرے سر پر ہی سوار ہو جانا۔ یہاں تک ساتھ آگئی ہے تا، بس کافی ہے۔ اندر حاضری کے وقت میں تجھ کو اپنے سر پر نہیں برداشت کر سکتی۔ حویلی واپس جا کر تو وڈی چودھرائی کو بتا دینا کہ میں نے تجھے باہر روک دیا تھا۔“ کشور نے سخت لہجے میں اسے جھڑک کر اپنے ساتھ اندر جانے سے روک دیا۔ وہ عموماً ملازماؤں سے ایسا برتاؤ کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ اسے شاد سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ویسے بھی بچی، شاد اور ان کی ماں جس طرح ہر وقت بڑی چودھرائی کی چیمہ گیری کرتی رہتی تھیں، اسے ان سے کچھ چڑی ہو گئی تھی۔

”لا، یہ مجھے دے۔“ شاد جھڑکی سن کر تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی کہ اسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے اس کے ہاتھ میں موجود بڑا سا تھال خود تھام لیا اور حسب قاعدہ پیروں سے چل اتار کر اس بڑے سے ہال میں داخل ہو گئی جس کے بالکل وسط میں اس کے دادا چودھری مراد عالم شاہ کی قبر بنائی تھی۔ اس کا حتمی انداز دیکھتے ہوئے شاد وہمت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے پیچھے اندر داخل ہو۔ اس نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر دیا اور کٹڈی چڑھا دی۔ قیمتی سنگ مرمر کی دیواروں والے اس ہال کے اندر ٹھنڈک کا احساس تھا۔ مختلف مقامات پر لگے بلہس کے علاوہ عین قبر کے اوپر موجود بڑے سے فانوس کی دودھیاروشنی نے ماحول میں ایک عجیب سا تقدس بھرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس احساس کو تقویت دینے کے لیے وہ خوشبو میں بھی اہم کردار ادا کر رہی تھیں جنہیں قبر پر موجود چادر کے علاوہ دیواروں پر بھی چھڑکا گیا تھا۔

سادہ لوح آن پڑھ دیہاتی یہ سب دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے تھے اور ان کے دینی تعلیم و شعور سے ناواقف ذہن اندھی عقیدت کے تاریک گڑھے میں بھٹکتے لگتے تھے۔ لیکن کشور کے لیے یہ سب کچھ کسی ڈرامے کے سیٹ سے زیادہ

نہیں تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ جس شخص کی تربیت نے اس کے باپ جیسے شیطان صفت آدمی کو جنم دیا ہے، وہ خود اخلاقی اعتبار سے کس قدر پستی میں ہوگا۔ ایسے شخص سے کسی بھی قسم کی عقیدت محسوس کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ یوں بھی اس کا شعور اسے قبروں کی پوجا سے روکتا تھا چنانچہ وہ اس سارے سیٹ اپ سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر سپاٹ سے انداز میں چلتی ہوئی قبر کے قریب پہنچی اور اپنے ہاتھ میں موجود تھال اس کے سر ہانے رکھ دیا۔ اس تھال میں جلتا ہوا دیا، سبز رنگ کی قیمتی چادر، گلاب کے پھول، خشک میوہ جات اور نذرانے کی موٹی رقم موجود تھی۔

درگاہ پر حاضری کے لیے آنے والوں کے لیے مثال قائم کرنے کی خاطر حویلی کے کچن و قافو قافا اسی اہتمام کے ساتھ یہاں آتے رہتے تھے۔ حویلی کے مکینوں کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے لوگ بھی کوشش کرتے کہ اسی طرح کا اہتمام کر سکیں۔ باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص اپنے ساتھ نذرانے کے لیے جو کچھ بھی لاتا، درگاہ کے خدام اسے فوراً قبضے میں لے لیتے لیکن چونکہ اس وقت چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی وہاں حاضری دینے آئی تھی، اس لیے کسی خادم کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس ہال میں رک سکے۔ اس کی وہاں موجودگی تک دیگر عقیدت مندوں کا بھی وہاں آنا ممکن نہیں تھا بلکہ انہیں تو درگاہ کے احاطے میں بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بی بی کشور اپنے دادا کی قبر پر چڑھاوا چڑھا کر واپس جاتی تو پھر عام لوگ اپنی عقیدت مندی کے اظہار اور حاجات کے بیان کے لیے یہاں قدم رکھ سکتے تھے۔ اب یہ الگ بات تھی کہ کشور بی بی کا یہاں سے واپس حویلی لوٹنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں سے نئی دنیاؤں کے سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کر کے حویلی سے نکلی تھی، چنانچہ نذرانوں سے بھرے تھال کو قبر کے سر ہانے پہنچنے کے بعد پھرتی سے چلتی ہوئی ہال کے اس دروازے کی طرف بڑھی جو دوسری سمت میں موجود تھا۔

عرس وغیرہ کے موقع پر جب درگاہ پر لوگوں کا بے حد رش ہوتا تھا، صرف ایک دروازہ کافی نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے چکر میں ایک دوسرے کو روندنے لگتے تھے۔ چنانچہ اس بد نظمی پر قابو پانے کے لیے ہال کی چاروں دیواروں میں ایک ایک دروازہ لگا دیا گیا تھا۔ عام دنوں میں تین دروازے بند رہتے تھے اور صرف وہ ایک دروازہ کھلا رکھا جاتا تھا جس سے گزر کر کشور اندر داخل ہوتی تھی۔ اپنے باہر نکلنے کے لیے اس نے تین بند دروازوں میں

سے اس دروازے کا انتخاب کیا تھا جو درگاہ کی عقبی دیوار سے سب سے زیادہ نزدیک تھا۔

دروازے کی موٹی کٹڈی اندر سے بند تھی لیکن اس پر کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا تھا۔ کشور نے ہاتھ بڑھا کر اس کٹڈی کو کھولنے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کافی سختی سے بند ہے اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہی ہے۔ شاید بہت کم استعمال ہونے کی وجہ سے کٹڈی جام ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ زیادہ طاقت کے استعمال سے کٹڈی نے تھوڑی سی حرکت تو ضرور کی لیکن ساتھ ہی رگڑ کا شور بھی بلند ہوا۔ یہ شور کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا، خصوصاً باہر موجود شاد کی طرف سے اسے خطرہ تھا کہ وہ بے شک اس کے ساتھ اندر داخل نہیں ہو سکی ہے لیکن کان اسی طرف لگا کر کھڑی ہو گئی کہ کوئی بھی غیر معمولی بات ہو تو فوراً اس کے علم میں آ سکے۔

اس نے کٹڈی پر زور لگانا چھوڑ کر لحو بھر کے لیے اس مسئلے کا حل سوچا اور پھر پلٹ کر قبر کی طرف آئی۔ سر ہانے رکھے تھال میں موجود دیا ہنوز جل رہا تھا۔ اس نے پھونک مار کر اسے بجھایا اور تھال سے اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دیا ہاتھ میں لیے وہ واپس دروازے کی طرف آئی اور اس میں موجود تیل کٹڈی پر ڈالنے لگی۔ کٹڈی کو تیل دینے کے بعد اس نے تقریباً تیس سیکنڈ تک انتظار کیا اور ایک بار پھر اس پر طبع آزمائی کرنے لگی۔ اس بار کٹڈی نسبتاً آسانی سے اور کم شور کے ساتھ حرکت کرنے لگی۔

اس نے مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری کٹڈی کھلنے تک اپنے ہاتھوں کو نہیں روکا۔ اس ذرا سی مشقت پر اس کی آئندہ زندگی کا دار و مدار تھا چنانچہ وہ کسی طور پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ کٹڈی کھلی تو اس نے بے حد احتیاط سے زور لگا کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی شام کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ کٹڈی کھولنے کی مشقت میں اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو اس نے بڑی فرحت محسوس کی اور ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے قدم باہر رکھ دیے۔

مغرب کا وقت قریب تھا چنانچہ ماحول اتنا روشن نہیں تھا۔ شام کے اترتے سایوں نے دن کی روشنی کو شکست دینا شروع کر دی تھی۔ درگاہ کے احاطے کی لائیں بھی فی الحال روشن نہیں کی گئی تھیں اس لیے بھی کچھ اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ نیم تاریکی ایک نعمت کے مانند تھی۔ وہ محتاط قدموں سے چلتی ہوئی احاطے کی دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے

آفتاب نے یہیں تک کے ایکشن کے بارے میں ہدایات دی تھیں۔ اس کے مطابق آگے کے معاملات وہ خود سنبھال لیتا۔ وہ اپنے جیسے کام کرنے کے بعد کچھ ہراساں سی عقبی احاطے میں کھڑی تھی کہ کسی نے آہستہ سے اسے پکارا۔

”کشور بھابی! آئیے میرے ساتھ آجائیں۔“ اس پکار پر وہ چونک کر بچی تو افضل کی جانی پہچانی شکل نظر آئی۔ اسے دیکھ کر اس نے اپنے دل میں طمانیت کی ایک لہری دوڑتی ہوئی محسوس کی اور وہ بنا کوئی سوال جواب کہے اس کے ساتھ چل پڑی۔

”یہاں سے باہر نکلنے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اس لیے آپ کو تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی۔ ویسے دیوار زیادہ بلند نہیں ہے۔ آپ میری پیٹھ پر پیر رکھ کر آرام سے اس پر چڑھ سکتی ہیں۔“ وہ چند قدم چلنے کے بعد دیوار کے قریب پہنچے تو افضل نے اس سے کہا۔ کشور جو دیوار کی جڑ میں بے ہوش پڑے آدمی کو دیکھ کر الجھ گئی تھی، اس کی بات سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ زمین پر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل گھوڑا بنا ہوا تھا۔ بے ہوش آدمی کے مخصوص سبز لباس کی وجہ سے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ وہ درگاہ کا کوئی خادم ہے، جو یقیناً اس طرف پہرے کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور افضل کے ہاتھوں اس حالت کو پہنچا ہے، وہ افضل کی ہدایت کے مطابق اس کی پیٹھ پر چڑھ گئی۔

وہ دیوار پر چڑھی تو افضل پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اچک کر خود بھی دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ دوسری طرف پہنچنے کے بعد اس نے کشور کو سہارا دے کر آہستہ سے نیچے اتار لیا۔ احاطے کی دوسری طرف دور تک کھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور لوگوں کا عموماً اس طرف گزرنہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ زیادہ تر سسنان ہی پڑی رہتی تھی، اسی لیے کشور کے فرار کا منصوبہ بناتے وقت اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ کشور دیکھ سکتی تھی کہ وہاں ایک گاڑی کھڑی ہے اور گاڑی کی عقبی نشست پر ایک نقاب پوش عورت بھی موجود ہے۔ عورت کے بارے میں اس نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ افضل کی بیوی مہتاب ہے۔ افضل نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا تو اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مہتاب نے والہانہ انداز میں اسے اپنے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے سلام کیا جس کا کشور نے گرم جوشی سے جواب دیا۔ البتہ افضل ان دونوں کی طرف سے یکسر انجان بنا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا اور اب اس کی گاڑی فرائے بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کشور جو پہلے

ہی خود کو چادر سے ڈھانپے ہوئے تھی، تھوڑا سا اور گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گئی۔ ابھی وہ لوگ گاؤں کی حدود میں موجود تھے چنانچہ اس کے لیے بہت زیادہ خطرہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ افضل اور مہتاب کی سلامتی کے لیے بھی پریشان تھی۔

اگر کسی کے علم میں یہ بات آجاتی کہ وہ اسے لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہیں تو اس سے پہلے ان لوگوں کو بدترین انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ زبردستی دعا میں مانگتے ہوئے، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے وہ سارا راستہ طے کیا۔ مہتاب اور افضل کی خاموشی سے بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ لوگ بھی اعصابی تناؤ کا شکار ہیں۔ کشور کو پیر آباد سے نکال کر لے جانا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے برابر تھا۔ چنانچہ ان کا اعصاب زدہ ہونا کچھ ایسا انوکھا بھی نہیں تھا۔

”آفتاب کہاں ہیں؟ وہ آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟“ گھاڑی پیر آباد کی حدود سے کافی آگے نکل کر بڑی سڑک تک پہنچی تو کشور نے سکون کا سانس لیتے ہوئے بہت دیر سے ذہن میں انکا ہوا سوال دہی آواز میں مہتاب سے کیا۔

”آفتاب کو میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ اس کے کسی بھی طرح کے شک سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہیں سب کی نظروں کے سامنے موجود رہے۔“ دہی آواز کے باوجود اگلی نشست پر موجود افضل نے اس کا سوال سن لیا تھا چنانچہ خود اسے جواب دیا۔

”تمہیں یہاں سے نکال کر لے جانے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے تم دونوں کے مستقبل کی سلامتی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے، چنانچہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ ساری منصوبہ بندی کی ہے۔ آفتاب نے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت زیادہ پرخطر تھا۔ افضل نے دماغ لٹا کر اس کی خطرناکی کو ذرا کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اور افضل اس وقت تنہا پیر آباد نہیں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک اور گاڑی میں میڈیا کے چند دوسرے نمائندے موجود تھے جو افضل کے ایما پر پیر آباد اور ارد گرد کے دوسرے دیہاتوں میں ہونے والے ترقیاتی کاموں پر ایک رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں گے۔ وہ لوگ چینل کی گاڑی میں آئے ہیں جبکہ ہم نے یہ کار کرائے پر لے لی تھی۔ چینل کے جو نمائندے ہمارے ساتھ آئے ہیں، انہیں ہمارے اس منصوبے کا کچھ علم نہیں۔ افضل نے ان سے کہا تھا کہ میری بیوی کو دیہاتی زندگی دیکھنے کا بہت شوق ہے اور وہ اس دورے پر میرے ساتھ جانا چاہتی ہے اس لیے میں آپ کی گاڑی کے بجائے

الگ گاڑی میں چلوں گا۔ ان لوگوں کو ظاہر ہے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ پروگرام چونکہ سارا افضل نے ترتیب دیا تھا اس لیے ہمیں آفتاب کے تم سے ملے کیے گئے وقت کے مطابق درگاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بس مجھے ذرا سی ایکٹنگ کرنی پڑی۔“ یہ جملہ کہتے ہوئے مہتاب دھیرے سے ہنسی۔

”ایکٹنگ... وہ کیوں؟“ کشور نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہمیں یہاں سے اپنی قبل از وقت روانگی کے لیے کوئی بہانہ چاہیے تھا چنانچہ میں نے عین موقع پر یہ ڈراما شروع کر دیا کہ میرے گردے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ افضل نے اپنے ساتھیوں سے معذرت کی کہ وہ مزید ان کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ انہیں اپنی وائف کو اسپتال لے جانا پڑے گا۔ بس پھر ہم بہانے سے وہاں سے نکل آئے۔ تمہارے مپاں جی البتہ گھرے ہوئے تھے میڈیا والوں کے درمیان اور انہیں بتا رہے تھے کہ کس طرح ان کا اسکول ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ میں آتے آتے ان چھپے رستم کو آنکھ مار کر آئی ہوں۔ بے جا رہے بڑے جھینپے لیکن سب کے سامنے مجھے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔“ مہتاب نے اپنی بات کے اختتام پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ جوں جوں وہ لوگ قاصد ملے کرتے جا رہے تھے، اعصابی تناؤ کم ہوتا جا رہا تھا اور ان کی حرکات و سکنات اور رویے میں واضح فرق نظر آ رہا تھا۔

”منصوبہ تو واقعی آپ لوگوں نے بہت اچھا بنایا ہے۔ اگر آپ لوگ چینل والوں کے ساتھ آنے کے بجائے ایسے ہی آجاتے تو گاڑی کی وجہ سے فوراً ہی اباجی کے کارندوں کی نظر میں آجاتے اور پھر وہ لوگ آپ کی یہاں آمد کا مقصد جانے بغیر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔“ کشور جو اس کی بات پر خود بھی دھیرے سے ہنسی تھی، سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے حسین آمیز لہجے میں بولی۔

”اس منصوبے سے ہمیں ہی نہیں آفتاب کو بھی بہت سیفٹی ملے گی۔ جس وقت آپ کے گاؤں سے غائب ہونے کا واقعہ پیش آیا ہے، وہ مسلسل سب کی نظروں کے سامنے رہا ہے۔ پھر چینل والوں کی موجودگی سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ گاؤں کے بیشتر لوگ نی دی والوں کو دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہمیں میدان صاف مل گیا۔“ افضل نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس سارے معاملے کے مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

”میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں افضل بھائی۔ آپ اور مہتاب بھائی اتنا ساتھ نہیں دیتے تو میں بڑی مشکل میں پڑ

جاتی۔“ کشور کی آنکھوں میں ایک دم نمی اتر آئی۔ ”بے وقوف... اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ تم ہمارے لیے چھوٹی بہنوں جیسی ہو۔ اس مشکل کھڑی میں ہم تمہارا ساتھ نہ دیتے، یہ کیسے ممکن تھا۔“ مہتاب نے اسے آہستہ سے اپنے ساتھ لگایا۔

”مہتاب ٹھیک کہہ رہی ہے بھابی! ویسے بھی مجھے تو لڑکی بھگانے کا پرانہ تجربہ ہے۔ ضرورت پڑنے پر یہ تجربہ میرے دوست کے کام آگیا تو اس میں کیا حرج ہے۔“ افضل نے بھی شوخ لہجے میں بولتے ہوئے ماحول کی اداسی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

”فضول نہ بولیں۔ اللہ نہ کرے کہ ہم بلا وجہ کسی لڑکی کو اس کے گھر سے نکلنے کی ترغیب دیں۔ میرے اور کشور کے کیس میں صرف محبت گھر چھوڑنے کا سبب نہیں بنی ہے۔ ہم دونوں ایسی خواتین ہیں جنہیں اگر اپنے گھر والوں کی محبت اور اعتماد حاصل ہوتا تو ہم ہرگز گھر کی دہلیز پار نہیں کرتے لیکن جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے اپنے ہمارے بنیادی حقوق سلب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہمیں مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا۔“ مہتاب نے افضل کی بات کا کچھ برا مانتے ہوئے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

”سوری بیگم صاحبہ! آپ تو بڑی ہی مان گئیں۔ میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا ورنہ میرے دل میں تمہاری جتنی قدر ہے، اس کے ہوتے ہوئے ممکن ہی نہیں کہ میں تمہارے لیے کوئی غلط لفظ استعمال کروں۔“ افضل نے جلدی سے معذرت کی۔

”مجھے معلوم ہے افضل... آپ صرف مذاق کر رہے تھے لیکن صرف اپنی مرضی سے میسج کی دہلیز پار کرنے والی عورت کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر اس بات سے ڈرتی رہتی ہے کہ کہیں کوئی اسے ”بھاگی ہوئی عورت“ کا طعنہ نہ دے دے۔ اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی بات کا برا مان گئی تھی۔“ مہتاب نے اس کی معذرت سن کر اداس سے لہجے میں اپنے رویے کی وضاحت کی تو کشور کا دل بھی عجیب سی اداسی میں گھر گیا۔

اداسی کے اس احساس کو ختم کرنے کے لیے اس نے موضوع گفتگو بدلا اور مہتاب کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو بتائیں بھابی کہ آپ کے وہ دونوں بلوگٹزے کہاں ہیں؟ آپ دونوں سیر کرنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں تو انہیں کہاں چھوڑا ہے؟“

”وہ دونوں گھر پر ہی ہیں۔ میں نے کام والی کو ایکسٹرا

پیسے دے کر اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ آج رات تک ہمارے گھر پر بچوں کے ساتھ رک جائے۔ اچھی اعتماد کی عورت ہے، میرے کہنے پر فوراً راضی ہو گئی۔ سچے بھی اس سے مانوس ہیں اس لیے آرام سے اس کے ساتھ رک گئے۔ اب ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر گھر جائیں گے تو خوب خوش ہوں گے کہ چچی آئی ہیں۔ بہت یاد کرتے ہیں تمہیں۔ اصل میں بے چارے ننھیال، دوھیال دونوں سے ہی محروم ہیں اس لیے کوئی بھی بھولا بھٹکا مہمان گھر آجائے تو بڑے خوش ہوتے ہیں۔“ مہتاب ابھی تک مکمل طور پر اداسی کے حصار سے نہیں نکل سکی تھی۔

”چچیں اب تو مہمان بلائے جان بن کر آپ کے گھر میں نازل ہو رہے ہیں۔ جانے کتنا عرصہ مجھے آپ کے ہاں قیام کرنا پڑے۔ بچوں کا خوش ہو ہو کر بھی دل بھر جائے گا۔“ کشور کی اپنی کیفیت اندرونی طور پر مہتاب جیسی ہی لیکن وہ خود کو منہجیال کر اسے اداسی کے حصار سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”خواتواہ... تم کیوں ہونے لگیں بلائے جان؟ ذرا ہمارے ساتھ رہ کر تو دیکھو پھر دیکھنا ہم تمہیں کیسے تھیلی کا چھالا بنا کر رکھتے ہیں۔“ حسب توقع مہتاب اسے ٹوکتے ہوئے اپنی سابقہ ٹون میں لوٹ آئی۔

”اب یہ تو آزمائے پر ہی معلوم ہوگا۔“ کشور نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔ جواباً وہ اسے مصنوعی غصے سے گھورنے لگی اور پھر یک دم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ایک ایسی ہنسی جس میں زندگی اور امید تھی۔

☆☆☆

وڈی چودھرائن کے سامنے کھڑی شادو بید بجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ شدید خوف کے باعث اس میں یارا نہیں تھا کہ وڈی چودھرائن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ وہ بس نظریں جھکائے کھڑی اس کی گھن گرج سن رہی تھی۔

”جاتی ہے تیرا کیا انجام ہو سکتا ہے؟ میں نے تیرے ذمے ایک کام لگایا تھا اور وہ بھی تجھ سے نہیں کیا گیا۔ اپنا منہوس بوتھالے کر میرے سامنے آگئی ہے کہ کشور بی بی درگاہ سے کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ تیرے ہوتے ہوئے وہ کیسے غائب ہو گئی؟ تو نے بھگ لی رکھی تھی جو تجھے اتنی وڈی کڑی کے کہیں جانے کا پتا نہیں لگا؟“ اس پر گرجتی چودھرائن درحقیقت اندر سے خود لرزاں تھی۔ چودھری کی غیر موجودگی میں حویلی کے اندرونی معاملے کلی طور پر اس کے ذمے ہوتے تھے۔ اسے میں کشور کا غائب ہو جانا خود اس کے لیے باعث عتاب بن سکتا تھا۔

”میں تو پورا ٹیم (نامم) ہوشیار ہی کھڑی تھی وڈی چودھرائن جی... پر آپ کے حکم کے مطابق کشور بی بی کے ساتھ اس لیے نہیں رہ سکی کہ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر باہر رکنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اندر درگاہ میں سے غائب ہو جائیں گی۔ میں تو وڈی دیری تک باہر کھڑی ان کے اندر سے نکلنے کا ہی انتظار کرتی رہی۔ وہ تو جب درگاہ کے خادموں میں شور مچا کہ ان کا ایک ساتھی باہر بے ہوش پڑا ہے اور درگاہ کا پچھلا دروازہ کھلا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں فوراً اس دروازے سے اندر گئی، پر کشور بی بی کا اندر نام و نشان نہیں تھا۔ چڑھاوے کا تھا حال جو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں، وہ ادھر ہی تھا لیکن بی بی کا کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کسی سے بی بی کے بارے میں تو پوچھ نہیں سکتی تھی کہ اس میں حویلی کی بدنامی تھی۔ میں آپ ہی ساری درگاہ میں گھوم پھر کر بی بی کو تلاش کرتی رہی پر وہ اندر نہیں ہی نہیں۔“ شادو نے وہ ساری تفصیلات جن سے وہ حویلی پہنچتے ہی وڈی چودھرائن کو آگاہ کر چکی تھی، ایک بار پھر دہرائیں۔

”ڈرائیور سے کیا کہا تھا تو نے کہ بی بی تیرے ساتھ واپس حویلی کیوں نہیں جا رہی ہیں؟“ وڈی چودھرائن نے اسے گھورتے ہوئے پرسوج لہجے میں پوچھا۔

”میں نے اس سے کہا تھا کہ بی بی ابھی کچھ دیر اور درگاہ پر رکیں گی۔ مجھے انہوں نے حویلی میں کچھ کام بتایا ہے اس لیے مجھے حویلی لے چل۔ بی بی کو لینے کے لیے وڈی چودھرائن بعد میں دوسری گڈی بھیج دیں گی۔“ شادو کا جواب سن کر وڈی چودھرائن نے ایک ہنگارا بھرا اور پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی پیشانی پر پھیلی لکیروں کا جال اس کے گہرے فکر کا پتا دے رہا تھا۔ اسی کمرے میں اس کے ساتھ کشور کی سگی ماں چودھرائن ناہید بھی موجود تھیں لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر ہٹا کر بیٹھنے کے علاوہ کسی بھی قسم کے رد عمل سے محروم تھیں۔ بی بی کے اس طرح سے غائب ہو جانے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں گم کر دی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور بی بی کے اس فعل کی سزا اسے بھی جھٹکنی ہوگی۔

”مجھی کہاں ہے؟ اس کو یہاں بلا کر لا۔“ وڈی چودھرائن کی پیشانی پر پھیلی لکیروں میں کچھ کم ہوئیں تو اس نے شادو کو حکم دیا۔ وہ تیر کی طرح اس حکم کی تعمیل کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔

”اب سر پکڑ کر بیٹھی ہو، اگر پہلے ہی دھکی لگا میں کھینچ کر رکھی ہوتیں تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ مجھے تو

بہت دنوں سے کڑی کی حرکتیں شک میں ڈالے ہوئے تھیں۔ اسے طور پر کوشش بھی کی کہ اصل معاملے کی کھوج لگا سکوں، پر تیری دھی تھی وڈی ہوشیار۔ میری آنکھوں میں بھی دھول جھونک گئی۔ ویسے بھی میں اکیلی جان کون کون سے دھندے نیڑوں۔ حویلی کی ساری ذمے داری میرے کندھوں پر ہے۔ تم تو ساری حیاتی بس عیش ہی کرتی رہیں۔ نہ کوئی ذمے داری سنبھالی، نہ ہی اپنی اولاد۔ کچھ نہیں اپنی اولاد کو ہی دیکھا ہوتا تو آج یہ مشکل سر پر کھڑی نہ ہوتی۔ اب بتاؤ چودھری صاحب کو کون جواب دے گا؟ وہ تو جان کھا جائیں گے ساروں کی۔“

شادو کے باہر نکلنے کے بعد وڈی چودھرائن نے چودھرائن ناہید کے لئے لینا شروع کر دیے۔ شادو کے تنہا درگاہ سے واپس لوٹنے کا معاملہ ابھی ان تینوں کے ہی درمیان تھا اور بات وڈی چودھرائن کے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم ہو جاتا تو حویلی کی عزت خاک میں مل جاتی۔ چنانچہ اندر ہی اندر بے حد چراغ پا ہونے کے باوجود وڈی چودھرائن بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔

”تسلی کچھ کرو وڈی آپا! کسی طرح اس ناہنجار کو ڈھونڈ کر واپس حویلی لاؤ، ورنہ چودھری صاحب تو میری چوٹی ہی گدی سے اکھاڑ ڈالیں گے۔“ سوکن سے ڈانٹ کھانے کے بعد بجائے برامانے کے چودھرائن ناہید اس کی منت سماجت کرنے لگی۔

”چوٹی تو وہ میری بھی اکھڑ دیں گے۔ بس اب تو دعا کر کہ کسی طرح یہ معاملہ بیٹ جائے ورنہ پھر چودھری صاحب کو امریکا فون کر کے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ ابھی تو میں اس کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کسی کو کشور کے غائب ہو جانے کی خبر نہ ہو سکے۔ کڑی کو تو بعد میں چودھری صاحب ڈھونڈ ہی نکالیں گے لیکن ابھی حویلی کی عزت بچانا سب سے اہم ہے۔“ وڈی چودھرائن کے لہجے سے پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہی ہوئی تھی کہ شادو، چچی کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ چودھرائن جا بختی ہوئی نظروں سے چچی کا جائزہ لینے لگی اور پھر کچھ مطمئن ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

”کُشور کی الماری میں سے کوئی چنگا سا جوڑا نکال کر پہن لے اور چپکے سے درگاہ پہنچ جا۔ وہاں سے شادو تجھے ڈرائیور کے ساتھ جا کر لے آئے گی۔ اپنا منہ چپکی طرح چھپا لینا۔ ڈرائیور کو خبر نہ ہونے پائے کہ تو کشور نہیں چھپی ہے۔“ اس نے چچی کو حکم دیا تو دونوں بہنیں سمجھ گئیں کہ وڈی چودھرائن کشور کے غائب ہونے کے معاملے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ کشور درگاہ سے

واپس لوٹ آئی ہے۔

”چنگا وڈی چودھرائن“ کہتی ہوئی وہ دونوں حکم کی تعمیل کے لیے باہر نکل گئیں۔ ان کے باہر جانے کے بعد وڈی چودھرائن نے ایک ملازمہ کے ذریعے منشی کو طلب کیا اور خود ملاقات کے کمرے میں پہنچ گئی۔ پردے کے پیچھے منشی اس کا منتظر تھا۔

”منشی! تجھے گاؤں کی کچھ خبر ہے؟ گاؤں میں کوئی نئی گل ہوئی ہے تو مینوں بتا۔“

”ایسی کوئی خاص گل تو نہیں ہوئی چودھرائن جی۔ بس آج ٹی وی والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ یہاں جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں، ان کے بارے میں فلم تیار کریں گے۔ اسی اے سی نے بھیجا ہوگا انہیں اپنی شہرت کے لیے۔“ منشی نے منہ بناتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”اور اس ماسٹر کے بارے میں کیا خبر ہے؟ وہ گاؤں میں ہی ہے یا کہیں گیا ہوا ہے؟“ چودھرائن کو کشور اور آفتاب کے تعلقات کے بارے میں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے شک سا رہتا تھا اس لیے اس نے آفتاب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

”وہ تو گاؤں میں ہی ہے جی۔ وہ تو ہے ہی اے سی کا چچہ... آج وہ کیسے گاؤں سے کہیں جا سکتا تھا۔ لگا ہوا ہے ٹی وی والوں کے سامنے اے سی کی تعریفیں کرنے میں۔“ منشی نے رپورٹ دی تو چودھرائن پر بالوسی طاری ہونے لگی۔ اس کے حساب سے تو اگر کشور غائب تھی تو آفتاب کو بھی منظر سے غائب ہونا چاہیے تھا۔

”ٹھیک ہے منشی! تو جا۔ اور ہاں، ارد گرد نظر رکھنا۔ چودھری صاحب کی غیر موجودگی میں تجھے ہی ہر معاملے پر نگاہ رکھنی ہے۔“ وہ منشی کو ہدایت دیتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔ اب اسے چچی اور شادو کا انتظار تھا۔ دوسرے وہ چودھری کو امریکا فون کر کے اس حادثے کی اطلاع کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تاکہ اس کی ہدایات کے مطابق ایکشن لے سکے۔ معاملہ اتنا نازک تھا کہ خود اسے کچھ بھٹائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

”منشی جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں وڈی چودھرائن جی۔“ ابھی اسے ملاقاتی کمرے سے واپس آئے پانچ منٹ نہیں گزرے تھے کہ ایک ملازمہ نے آکر اطلاع دی۔ وہ تیزی سے منشی سے ملنے کے لیے پہنچی کہ شاید کوئی نئی خبر مل جائے۔

”معافی چاہتا ہوں وڈی چودھرائن۔ گل تو اتنی خاص نہیں کہ میں آپ کو پریشان کرنا لیکن فیہ بھی میں نے سوچا کہ

آپ کو اطلاع دے دوں۔“

”کیا گل ہے؟“

”ابھی ابھی درگاہ کا ایک خادم میرے پاس آیا ہے۔ کہتا ہے کہ وہاں کسی نے کچھلی طرف پیرا دیئے والے خادم کو بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ کون تھا اور کیوں آیا تھا، کسی کو کچھ نہیں آیا لیکن میں اس لیے پریشان ہو گیا کہ مجھے خبر ملی تھی کہ آج کشور بی بی درگاہ گئی ہوئی ہیں۔“ اس کے پوچھنے پر منشی نے وہ اطلاع دی جو شادو کی زبانی پہلے ہی اس تک پہنچ چکی تھی۔

”کُشور کے لیے پریشان نہ ہو۔ شادو ڈرائیور کے ساتھ اسے لینے گئی ہوئی ہے، ابھی واپس آ جائے گی۔ لیکن یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرو کہ وہ کون تھا جس نے خادم کو بے ہوش کیا۔“ چودھرائن منشی کو حکم دے کر ایک بار پھر اپنے کمرے میں واپس پہنچ گئی جہاں چودھرائن ناہید ہنوز پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے وہ اپنی وسیع و عریض مسہری پر نیم دراز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شادو واپس پہنچ گئی۔

”میں نے چچی کو کشور بی بی کے کمرے میں پہنچا دیا ہے وڈی چودھرائن۔ آپ بتائیں میرے لیے اور کیا حکم ہے؟“ چودھرائن کی خود پر جی نظروں سے گھبرا کر اس نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ آگے کے لیے بھی ہدایت چاہی۔

”چنکی گل ہے۔ اب ایسا کر کہ چچی سے بول کہ واپس اپنے کپڑے پہن کر باہر آ جائے۔ فیہ تم دونوں بہنیں تہ خانے کے دروازے پر پہنچ جاؤ۔ میں بھی ادھر ہی آ رہی ہوں۔“

”چنگا وڈی چودھرائن۔“ اس کا حکم سن کر شادو مستعدی سے بولتی ہوئی چلی۔

”گل سن...“ چودھرائن نے اسے پکارا۔

”جی وڈی چودھرائن۔“ شادو نے فوراً اس کی پکار کا جواب دیا۔

”تم دونوں بہنوں کے علاوہ اور کس کس کو اس معاملے کی خبر ہے؟“ اس کو اندر تک اتر جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے چودھرائن نے دریافت کیا۔

”کسی کو نہیں چودھرائن جی۔ ہم نے تو اپنی اماں کو بھی ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“

”ٹھیک ہے، فیہ تو جا اور چچی کو اپنے ساتھ لے کر تہ خانے تک پہنچ۔“ اس حکم کی شادو نے پھرتی سے تعمیل کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہنیں تہ خانے کے راستے پر پہنچ گئیں اور سہمی ہوئی وڈی چودھرائن کا انتظار کرنے لگیں۔ تین چار منٹ کے انتظار کے بعد انہوں نے وڈی چودھرائن کو چابیوں

کے چہرے کے ساتھ وہاں آتے دیکھا۔

”تالا کھول۔“ اس نے چابیوں کا گچھا شادو کو تھمایا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے گچھا تھام کر چودھرائن کی نشان دہی کردہ چابی سے تالا کھول دیا۔ پھر اس کے اشارے پر دونوں بہنیں سیڑھیاں اتر گئیں۔ خود چودھرائن بھی اپنے بھاری بھر کم جتنے کو سنبھالے ان کے پیچھے تھی اور بڑی طرح ہانپتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کئی کوششوں پر مشتمل اس نے خانے میں پہنچ کر اس نے شادو کے ہاتھ سے ہی ایک کوشری کا دروازہ کھلویا اور پھر اس سے چابیوں کا گچھا لیتے ہوئے دونوں بہنوں کو اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ وہ دونوں جواب کسی حد تک خود کو یہاں تک لائے جانے کا مقصد سمجھ گئی تھیں، اندر داخل ہونے کے بجائے اس کے پیروں میں گر گئیں۔

”ہمیں مافی دے دیں چودھرائن جی۔ ہمیں اس کال کوشری کی سزا نہ دیں۔“ چودھرائن کے قدموں سے لپٹی وہ آہ وزاری کرتے ہوئے اس سے استدعا کرنے لگیں۔

”دور ہٹو نمک حراموں۔ تمہاری غلطی کی وجہ سے اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ اب کیا دوسری غلطی میں کروں اور تمہیں آزاد چھوڑ دوں کہ تم لوگوں کے سامنے سب کچھ پھرو۔“ چودھرائن نے اپنی بھاری ٹانگ ان دونوں کو رسید کرتے ہوئے انہیں پیچھے دھکیلا۔

”ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے وڈی چودھرائن! ہم تو ہمیشہ سے آپ کے وفادار رہے ہیں۔ ہماری ماں نے بھی ساری حیاتی آپ کی خدمت کی ہے اور ہم بھی ہمیشہ آپ کی خدمت کریں گے۔“ اب وہ دونوں اپنے ہاتھ جوڑے اپنی خدمتوں کا واسطہ دیتے ہوئے اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”تمہاری خدمتوں کا ہی خیال ہے جو میں تمہیں صرف اس کوشری میں قید کر رہی ہوں۔ کوئی اور ملازمہ ایسی غلطی کرتی تو میں اس پر کتے چھڑوا دیتی۔ اب بھی تم نے زیادہ شور مچایا تو غیر مجھے اسی طریقے سے تمہارا منہ بند کرتا پڑے گا۔“ چودھرائن کی دھمکی اتنی خطرناک تھی کہ دونوں بہنوں کی آوازیں حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں اور وہ از خود اس اندھیری کوشری میں داخل ہو گئیں۔ آج انہوں نے جان لیا تھا کہ دوسروں کے خلاف سازش کر کے مالکوں کا قرب حاصل کرنے سے کامیابی نہیں ملتی کیونکہ جن کو ظلم کی عادت ہو، وہ رحم بھی ایسے کرتے ہیں کہ ان کے ظلم سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

☆☆☆

”لنڈا... مائی ڈارلنگ! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تمہاری

قربت میں کیا جادو ہے۔ میں اس سے پہلے بھی بہت بار نیویارک آیا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے نیویارک اتنا حسین کبھی نہیں لگا جتنا کہ اب لگ رہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا ویزا بڑھوا کر مزید کچھ عرصہ یہاں رگ جاؤں۔“ چودھری کی انگلیاں لنڈا کے عریاں بازو پر تھرک رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے شراب و شباب کا نشہ چھلکا پڑ رہا تھا۔

”ویزا تو آپ کا ابھی کافی باقی ہے چودھری صاحب... لیکن ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ اس سے پہلے ہی واپس روانہ ہو جائیں۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ آپ کی میزبانی کرنا ہمیں بھاری پڑ رہا ہے مگر وہاں پاکستان میں کچھ کام ہیں جن کے لیے آپ کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ لنڈا کا کیا مسئلہ ہے، یہ خود آپ سے ملنے وہاں آجائے گی۔“

ڈیوڈ کی بے وقت انٹری نے چودھری کے رومانٹک موڈ کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا لیکن اس کا آخری جملہ ایسا تھا کہ اس نے ڈیوڈ کی بات کی سختی کو کچھ کم کر دیا اور چودھری دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”اگر لنڈا وہاں آگئی تو پھر تو ہمیں اپنا پیر آباد آپ کے نیویارک سے بھی زیادہ حسین لگنے لگے گا۔“

”آپ نے خوب پٹری بدلی ہے چودھری صاحب! پیر آباد سے نکلے تھے تو ماہ بانو کے سوا کچھ یاد نہیں تھا اور اب لنڈا میں یوں کھوئے ہیں کہ ماہ بانو بالکل بھول گئی ہے۔“ ڈیوڈ نے اسے چھیڑا۔

”وہ بالکل الگ معاملہ ہے مسٹر ڈیوڈ! لنڈا سے تو ہمیں عشق ہو گیا ہے جبکہ ماہ بانو ہماری ضد ہے۔ اس لڑکی نے ہماری انا کو لگا رہا ہے۔ ہم جب تک اسے خاک میں نہیں ملائیں گے، ہمیں چین نہیں آئے گا۔“ چودھری نے پُر عنونت انداز میں جواب دیا۔

”چلیں آپ پاکستان واپس پہنچیں، آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ ہماری طرف سے ہماری دوستی کا ثبوت ماہ بانو کی شکل میں آپ تک پہنچ جائے گا اور لنڈا تو ہے ہی آپ کی۔ جب آپ اسے یاد کریں گے، تب یہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی۔“ بلتستان کے پہاڑی کیمپ کے انچارج نے ابھی تک ماہ بانو کے فرار کی خبر ڈیوڈ تک نہیں پہنچائی تھی اور فی الحال اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مفروضہ ماہ بانو اور عمران کو ڈھونڈ نکالے اس لیے ڈیوڈ بڑے پُر اعتماد لہجے میں چودھری کے سامنے دعویٰ کر رہا تھا۔ درحقیقت پہلے تو خود اس کی نیت ماہ بانو پر خراب ہوئی تھی۔ مشرقی حسن کا نمونہ ماہ بانو پہلی نظر میں ہی اس کے دل کو بھاگ گئی تھی۔

پہلی بار اس نے اسے اس وقت بشام ہوش کے باہر

دیکھا تھا جب وہ ایک ایکسی ڈیشن ٹیم کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ شہریار کے ساتھ تھی اور چونکہ وہ خود بھی وہاں سے روانہ ہو رہا تھا اس لیے اس کی طرف ایک فلائنگ کس اچھال کر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ بعد میں وہ اتنا مصروف رہا کہ اسے ماہ بانو کا خیال بھی نہیں رہا۔ وقتاً فوقتاً پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں جا کر ہائیڈنگ کے بہانے وہ ان پہاڑوں کے محل وقوع اور مختلف جغرافیائی حالات کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ انجینئرنگ کی پیشہ ورانہ تعلیم اور تنظیم کی طرف سے دی گئی تربیت کی وجہ سے اسے اپنے کام میں خاص مہارت حاصل تھی۔ سیر و تفریح اور اینڈو پٹر کے بہانے مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے اس نے کئی اہم اور قیمتی نقشے تیار کر لیے تھے جو نہ صرف ان کی اپنی تنظیم کے پاس ریکارڈ میں موجود تھے بلکہ وقتاً فوقتاً وہ ان معلومات کا بھارتی میکٹ سروس را سے بھی تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ان معلومات کی فراہمی کے عوض راکو بھی ان کے لیے خدمات انجام دینی پڑتی تھیں لیکن چونکہ یہ خدمات پاکستان مخالف سرگرمیوں پر ہی مشتمل ہوتی تھیں اس لیے راوالپنڈی کے احتجاج خاموشی سے ان کا یہ کام کر دیتے تھے۔

بعض اوقات معلومات کی اس فراہمی پر وہ لوگ صرف پاکستان کے خلاف کارروائی کروانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ نقد معاوضہ بھی وصول کرتے تھے۔ اپنی پاکستان دشمنی میں بھارتی حکومت کو یہ سودا بھی مہنگا نہیں لگتا تھا کیونکہ موساد سے حاصل کردہ معلومات انہیں پاکستان کے خلاف شراکتیں کارروائیاں کرنے میں مدد دیتی تھیں۔ موساد کا اہم ترین ایجنٹ ڈیوڈ اپنے پاکستان کے دوروں میں نہ صرف یہ معلومات جمع کرتا تھا بلکہ موساد ہی کی پالیسی کے تحت قائم کردہ ایک مذہبی انتہا پسند تنظیم جو درحقیقت دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث تھی، اس کے مختلف مراکز کا دورہ بھی کر ڈالتا تھا۔ اس بار بھی اس نے پہاڑوں پر موجود خفیہ کیمپ کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے انچارج سے زیر تربیت افراد کے بارے میں رپورٹ حاصل کرنے کے علاوہ ہتھیاروں اور بارود کی مزید فراہمی کے بارے میں بھی ان کی ضروریات کے بارے میں جان کر آیا تھا۔ یہ ہتھیار اور بارود، فوڈ سپلائی کے ساتھ ہی چھپا کر کیمپ تک بھیجے جاتے تھے لیکن انہیں لے جانے والے جیپ ڈرائیورز کو اس بارے میں کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی اور وہ اچھے معاوضے کے عوض ایک بہ ظاہر بے ضرر نظر آنے والا کام بہ خوشی انجام دے دیا کرتے تھے۔

ڈیوڈ اپنے معمول کے کامیاب دورے سے واپس

لوٹ رہا تھا جب اس نے ہوشے میں ماہ بانو کو ایک بار پھر دیکھا۔ اس موقع پر وہ مخصوص پہاڑی لباس زیب تن کیے ہوئے تھی اور بشام کے باہر نظر آنے والی ماہ بانو کے مقابلے میں خاصی مختلف نظر آنے کے باوجود اپنی شخصیت کی خاص دل آویزی کے باعث وہاں موجود سب خواتین سے ممتاز لگتی تھی۔ اس موقع پر ڈیوڈ نے بے ساختہ ہی اس کی کئی تصویریں کھینچ ڈالیں۔ جواب میں اس نے ماہ بانو کے چہرے پر پھیلنے والا ناگواری کا تاثر بھی دیکھا تھا لیکن پروا نہیں کی۔ البتہ خواہش کے مطابق وہ وہاں اس سے ملنے یا چھوٹے چھاڑ کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکا۔

کئی برسوں سے ان علاقوں میں سفر کرتے رہنے کے باعث اسے وہاں کے لوگوں کے مزاج کے بارے میں... بہ خوبی علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی بھی بے احتیاطی کی تو اسے لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں... مگر اگلی صبح جب اس نے ماہ بانو کو اپنی کیمپنگ سائٹ پر دیکھا تو شدید غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ اس نے گمان کیا کہ ماہ بانو ان لڑکیوں میں سے ہے جو غربت سے نمٹنے اور روپیہ کمانے کے لیے غیر ملکی سیاحوں کا کھلونا بننا قبول کر لیتی ہیں۔ اسی حساب سے اس نے اسے اپنے خیمے میں گھسیٹ کر اس سے زبردستی کرنی چاہی لیکن ماہ بانو کے رد عمل نے اسے بتا دیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ پھر اکرم خان کی مداخلت کی وجہ سے نہ صرف اسے اپنے مکروہ ارادے میں ناکام ہونا پڑا بلکہ اکرم خان کے ہاتھوں شدید ہزیمت بھی اٹھانی پڑی۔

جہاں وہ اپنی اس ذلت پر بڑی طرح چڑا، وہیں ماہ بانو کی شخصیت کے بارے میں بھی کھٹک گیا۔ اس کے پہاڑی لڑکیوں سے مختلف نین نقش ویسے ہی چونکا دینے والے تھے، اس پر سے اس کی اس سے جو مختصر گفتگو ہوئی، اس سے بھی یہ بات سامنے آگئی کہ وہ کوئی پہاڑی دوشیزہ نہیں ہے۔ ایک مختلف ماحول کی لڑکی ان پہاڑی وادیوں میں کیا کر رہی ہے، اس کے ذہن میں تجسس جاگ اٹھا۔ ری سورسز کی تو اس کے پاس کی نہیں تھی۔ وہ پاکستان میں موجود اپنے نیٹ ورک کو حرکت میں لے آیا۔ نتیجتاً اسے ماہ بانو کی ساری ہنری معلوم ہو گئی۔ چودھری افتخار کا نام اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پہلے ہی ان کی لسٹ میں موجود تھا۔ چودھری کو لالچ دینے کے لیے اس نے بہتر سمجھا کہ ماہ بانو کو کسی طرح اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ ہوشے سے اسے انوار کے کسی بڑے شہر تک فوری طور پر پہنچانے میں خطرہ ہوتا چنانچہ اس نے اس کام کے لیے اپنے پہاڑی کیمپ پر موجود بندوں کو استعمال کیا اور یوں ماہ

بانو ہوشے سے نکل کر برف زار کے ایک غار میں پہنچ گئی۔
ڈیوڈ کو اطمینان تھا کہ وہ ماہ بانو کی تلاش کا سلسلہ ٹھنڈا
پڑنے پر جب چاہے گا اسے وہاں سے نکال کر چودھری تک
پہنچا دے گا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔
چودھری بھی ان کی منہمی میں آجاتا اور ماہ بانو سے وہ اپنی ذلت
کا بدلہ بھی چکا دیتا۔ اگر مہمان خان کو تو پہلے ہی اس کے آدمی
ٹھکانے لگا چکے تھے۔ جدید دنیا کا باسی... بہ ظاہر بہت مہذب
دکھائی دینے والا ڈیوڈ درحقیقت پیر آباد کے چودھری افتخار
سے فطرت میں مختلف نہیں تھا۔ چودھری کو اگر اپنی چودھراہٹ
اور جاگیر کا غرور تھا تو ڈیوڈ بھی اپنے اختیارات پر نازاں تھا۔
یہ غرور اور ناز ایسے جذبات نہیں جو آدمی کو آپے میں رہنے
دیں۔ ”میں اوروں کے مقابلے میں بالاختیار ہوں۔“ یہ
احساس بہت کم ہی افراد میں عاجزی اور خدمت گزاری کا
وصف پیدا کرتا ہے، ورنہ عموماً تو لوگ خود کو زمینی خدا تصور
کرنے لگتے ہیں جنہیں خلاف مزاج کچھ گوارا نہیں ہوتا اور
جب کچھ مرضی سے ہٹ کر ہو جائے تو پھر وہ اس کا بدلہ لیے
بغیر نہیں رہ سکتے۔

”کیا بات ہے مسٹر ڈیوڈ! آپ ہم سے بات کرتے
کرتے کن خیالات میں ڈوب گئے؟“ چودھری سے ماہ بانو کا
ذکر کرتے ہوئے ڈیوڈ کو خود بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا چنانچہ وہ
کچھ دیر کے لیے ماحول سے کٹ گیا۔ اس کی خاموشی کو محسوس
کرتے ہوئے چودھری نے اسے ٹوکا۔

”ہمیں کس کے خیالوں میں ڈوبنا ہے چودھری
صاحب! یہ تو آپ خوش نصیب ہیں جو ہر جگہ ایک حسینہ آپ کی
منتظر ہے۔“ ڈیوڈ نے ہنس کر مذاق میں بات مانی تو چودھری
بھی زوردار تہقیر لگا کر نہیں پڑا۔ اس تہقیر کی گونج میں ہی اسے
اپنے موبائل کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے موبائل
نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ حویلی کے نمبر سے کال
کی جارہی تھی۔ پہلے اس کا دل چاہا کہ لائن کاٹ دے پھر یہ
سوچ کر کہ ہو سکتا ہے کوئی اہم معاملہ درپیش ہو، کال ریسیو
کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہر یار کے اغوا والے معاملے کے بعد وہ
اپنی فون کالز کی طرف سے خاصا محتاط تھا۔ اس وقت بھی موبائل
فون بند رکھنے کی وجہ سے اس کا اپنے بندوں سے رابطہ منقطع ہو
گیا تھا اور کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”سلام چودھری صاحب! میں وڈی چودھرائن گل
کر رہی ہوں۔“ چودھری نے جیسے ہی کال ریسیو کی، دوسری
طرف سے اپنی بیگم نمبر ایک کی آواز سنائی دی جسے خود کو وڈی
چودھرائن کہلانے کی اس قدر عادت پڑ چکی تھی کہ اپنے نام کا

استعمال وہ خود بھی ترک کر چکی تھی اور خود کو اکثر وڈی
چودھرائن ہی کہہ کر متعارف کرواتی تھی۔
”کی گل ہے؟ اس وقت تو نے مجھے کیسے فون کیا
ہے؟“ جوان وحسین لڈا کی قربت میں اپنی موٹی بھتی اور
برسوں پرانی بیوی کی آواز سننا بھی اسے سخت ناگوار گزرتا تھا،
چنانچہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر بیزاری سے پوچھا۔
”وڈی خاص گل تھی چودھری صاحب... اس لیے مجھے
آپ کو فون کرنا پڑا۔ آپ اتنی دور ہو، کچھ چنگی گل نہیں لگتی کہ
آپ کو پریشان کروں، پر میں بھی مجبور ہوں... گل ہی کچھ ایسی
ہے کہ آپ کو بتائے بغیر رہا بھی نہیں جاسکتا۔ میری تو اپنی مت
ماری گئی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔
اب آپ ہی کچھ مشورہ دیں گے تو میں کچھ کر سکوں گی۔“
”کیا پہیلیاں بچھوائے جارہی ہے... سیدھی طرح بتا
کہ کیا گل ہے؟“ وڈی چودھرائن کے لہجے سے اس نے اتنا تو
بھانپ لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے لیکن یہ
اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کون سی غیر معمولی صورت حال ہو
گی جس کے لیے وڈی چودھرائن نے اسے اتنی دور کال کر
کے اطلاع دینا ضروری سمجھا ہے؟ اس لیے ذرا غصے اور
چڑچڑے پن سے سوال کیا۔

”کیا بتاؤں چودھری صاحب! گل ہی کچھ ایسی ہے کہ
بتاتے ہوئے میری زبان رکتی ہے۔ حویلی کی عزت داؤ پر لگی
ہے اور میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟“ اپنی بات کے
اختتام پر وڈی چودھرائن نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔
”میں کہتا ہوں مینوں اصل گل دس، پہیلیاں نہ بچھو۔“
چودھری اعصاب زدہ ہو کر حلق کے بل دھاڑا۔

”کشور کہیں غائب ہو گئی ہے چودھری صاحب! آپ
کی دھی ہمارے منہ پر کالک مل گئی ہے۔“ وڈی چودھرائن
نے ایسے الفاظ اور انداز میں اطلاع دی کہ حادثے کی شدت
دگنی ہو کر چودھری تک پہنچی۔

”کیا بک رہی ہے... ہوش میں تو ہے یا نہیں؟“ اس
نے یقیناً چیخنے کی ہی کوشش کی تھی لیکن آواز حلق کے اندر ہی
گھٹ کر رہ گئی تھی اور وہ بس سرگوشی میں ہی وڈی چودھرائن
سے یہ سوال کر رہا تھا۔

”ہوش تو میرے سچ مچ گم ہو گئے ہیں چودھری صاحب!
لیکن جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔“

”مجھے تفصیل سے ساری گل بتا۔ آخر تیرے ہوتے
ایسا کس طرح ہو گیا؟ کیا میرے پیچھے تو نے حویلی کے
معاملات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں؟“ وہاں ڈیوڈ

اور لڈا کی موجودگی کی وجہ سے اس نے خود کو کافی سنبھال لیا
تھا لیکن پھر بھی لہجے سے دبا دبا غصہ جھلک ہی رہا تھا۔ ڈیوڈ کی
اردو اور پنجابی سے واقفیت کی بنا پر اسے خاص طور پر احتیاط
برتنی پڑ رہی تھی۔

”میری آنکھیں بند نہیں تھیں مگر وہ میری آنکھوں میں
دھول جھونک گئی۔ حویلی سے درگاہ جانے کی اجازت لے کر
لنگی تھی۔ شادو اور ڈرائیو اس کے ساتھ تھے لیکن جانے اس
نے کیا چکر چلایا کہ ان دونوں کو خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ درگاہ
سے غائب ہو گئی۔ جانے کون ہے جس نے اس کو یہ راہ دکھائی
اور اپنے ساتھ لے اڑا۔ میں تو پہلے ہی اس کڑی کے کرتوتوں
کی طرف سے فکر میں تھی لیکن اس کی ماں کی شہ اور آپ کی
ڈھیل کی وجہ سے ہر واری مجھے ہی چپ ہونا پڑا۔“ وہ بہت
عرصے سے کشور کے خلاف اپنے دل میں جمع زہر اگلنے لگی۔

”یہ وقت ایسی گلاں کرنے کا نہیں۔ تو ایسا کر کہ اس کی
سب سے فریبی ملازمہ رانی کو ٹول۔ مجھے یقین ہے کہ اس کو
ضرور کچھ نہ کچھ خبر ہوگی۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹھلٹھا ہوا
اپارٹمنٹ کی بالکنی کی طرف چلا گیا اور دھیمی آواز میں
چودھرائن کو مشورہ دیا۔

”ہاں چودھری صاحب! میں ابھی بندہ دوڑاتی
ہوں۔ رانی آج کل شہر والی کوشی میں رہ رہی ہے۔ اسے
گھاؤں بلوا کر میں اس کے حلق سے اگلواتی ہوں کہ یہ سارا چکر
کیا ہے؟“ چودھری کا مشورہ سن کر وہ فوراً جوش میں آ گئی۔
کشور کی ملازمہ خاص رانی پر ویسے ہی اسے شک رہتا تھا کہ
وہ حویلی سے زیادہ کشور کی وفادار ہے لیکن آج کل چونکہ رانی
لاہور میں رہ رہی تھی، اس لیے کشور کے غائب ہوتے ہی
اسے رانی کا خیال نہیں آیا تھا۔

”تو یہ کام کر۔ میں پہلی فلائٹ ملتے ہی واپس آتا
ہوں۔ اور ہاں... خیال رکھنا کہ کسی کو کالوں کا ان اس گل کی خبر
نہ ہو سکے۔“

”توئی فکر نہ کرو چودھری صاحب! کسی توں کچھ خبر نہیں
ہے۔ صرف شادو اور اس کی بہن کچھ تو معلوم تھا، ان دونوں کو
میں نے حویلی کے تہ خانے میں ڈال دیا ہے۔“ چودھری کی
ہدایت کے جواب میں اس نے فخر سے اپنا کارنامہ سنایا۔

”چنگی گل ہے۔ اب تو فون بند کر۔ میں کچھ دوستوں
کے ساتھ ہوں زیادہ کھل کھل کر گل نہیں کر سکتا۔“ چودھری نے
کہتے ہوئے خود ہی لائن کاٹ دی اور پھر موبائل جیب میں
رکھ کر چہرے پر ایک نمائی سی مسکراہٹ سجائے ہوئے کمرے
میں واپس آیا۔

”خیریت چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان لگ
رہے ہیں؟ کوئی مسئلہ ہے تو بتائیں... آخر ہم آپ کے دوست
ہیں، آپ کی پریشانی برداشت نہیں کر سکتے۔“ اس کی
مسکراہٹ کے باوجود ڈیوڈ نے اس کی پریشانی کو بھانپتے
ہوئے اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں مسٹر ڈیوڈ! بس ایک چھوٹا سا پرسل پر اہل
ہے، میں خود ہی سولو کر لوں گا... بلکہ ابھی آپ ذکر کر رہی
رہے تھے کہ مجھے واپس پاکستان چلے جانا چاہیے تو بس
سمجھیں کہ ایسا سبب بن گیا ہے کہ میں خود بھی فوری طور پر
واپس جانا پسند کروں گا۔“ جو حادثہ اس کے ساتھ پیش آچکا
تھا، وہ اس کے بارے میں اپنی زبان سے کسی کو کیسے کچھ بتا
سکتا تھا؟ چنانچہ ڈیوڈ کے سوال کرنے پر اسے ٹال گیا اور پھر
فوری طور پر اس سے اور لڈا سے اجازت لے کر وہاں سے
رخصت ہو گیا۔ ابھی وہ جس پریشانی میں مبتلا تھا، اس کے
ہوتے لڈا کا حسین وجود بھی اپنی کشش کھو بیٹھا تھا۔ لڈا اور
ڈیوڈ نے اس کا یہ انداز دیکھا تو چونک پڑے۔

”مجھے لگتا ہے کہ چودھری کے ساتھ کوئی بڑا مسئلہ ہو گیا
ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اس کے مسئلے سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ تم
فون کر کے پیر آباد میں موجود ایجنٹ کی ڈیوٹی تو لگاؤ کہ وہ ذرا
اس معاملے کی کھوج لگائے۔“ ڈیوڈ نے لڈا کو ہدایت کی تو وہ
ٹیلی فون پر مطلوبہ نمبر ملانے لگی۔ رابطہ ملنے پر اس نے ڈیوڈ کا
حکم دوسری طرف سنایا اور پھر اس اطمینان کے ساتھ کہ جلد
اصل معاملہ ان کے سامنے آجائے گا، کال منقطع کر دی۔

☆☆☆

”تم شہر کس کام سے آئے تھے؟“ گاڑی کی پچھلی
نشست پر اپنے سامان کی کٹھڑی کے ساتھ بیٹھی رانی نے
ڈرائیور سے پوچھا۔ اسے اتنی اچانک واپسی کا حکم دیا گیا تھا
کہ وہ ڈھنگ سے اپنا سامان بھی سمیٹ نہیں پائی تھی۔ اب
گاڑی میں بیٹھ کر اسے یاد آ رہا تھا کہ کوشی کی عقیبی جانب اس
نے اپنا بالکل نیا جوڑا دھو کر ڈالا تھا اور جلدی میں وہ جوڑا وہیں
رہ گیا تھا۔ یہ جوڑا اسے کشور نے اپنے لاہور میں قیام کے
عرصے میں خرید کر دیا تھا اور اسے خاصا پسند تھا۔ اس کے علاوہ
اس کی چاندی کی بالیاں بھی جو کہ حاجرہ نے اس سے مستعار
لے کر پہنی تھیں، وہیں رہ گئی تھیں۔ دوسرے بھی کئی چھوٹے
چھوٹے معاملات تھے جن پر اس کے خیال میں وہ ڈرائیور
کے جلدی بچانے کی وجہ سے خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکی تھی
لیکن اب چلتی گاڑی میں بیٹھ کر کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا اس لیے
وقت گزاری کے لیے ڈرائیور سے گفتگو شروع کر دی۔

”نہیں، مجھے شہر میں کوئی کام نہیں تھا۔ بس میں تجھے لینے کے لیے ہی آیا تھا۔ سویرے سویرے نکلنے سے بھی پہلے وڈی چودھرائن کا حکم ملا کہ شہر جا کر رانی کو لے آؤ تو میں تجھے لینے آگیا۔“ ڈرائیور نے اس کے سوال کے جواب میں بیزاری سے بتایا۔ اسے اپنا منہ اندھیرے جگا کر شہر روانہ کیا جانا اچھا نہیں لگا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ وڈی چودھرائن نے رات بھی کس مشکل سے گزار دی ہے۔ کشور کے غائب ہونے کا علم ہونے کے بعد دیگر معاملات سے نمٹنے اور چودھری سے رابطہ ہونے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا تھا، ورنہ ممکن تھا کہ وہ رات کو ہی اسے لاہور روانہ کر دیتی۔

”کشور بی بی تو خیریت سے ہیں نا؟ کہیں انہوں نے ہی تو مجھے نہیں بلوایا؟“ رانی چونکہ اپنے اچانک بلائے جانے پر حیران تھی اس لیے اس اچانک طغی کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں کشور کی ضد ہی اس کی واپسی کا سبب بن سکتی تھی اس لیے اس کے بارے میں سوال کیا۔

”مجھے تو وڈی چودھرائن کا حکم ملا تھا۔ اب ان سے کس نے کہا مجھے خبر نہیں۔ ویسے تو اطمینان رکھ، کشور بی بی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کل ہی میں عصر کے بعد انہیں درگاہ پر حاضری کے لیے لے کر گیا تھا۔“ اس کی فکر مندی دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے اسے تسلی دی تو وہ ڈرائیور کے لیے خاموش ہو گئی لیکن تشویش اپنی جگہ قائم تھی۔ بغیر وجہ کے وہ خاص طور پر گاڑی بھیج کر اپنے بلوائے جانے کو کسی طرح قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

”میرے گھر پر تو سب ٹھیک ہے نا؟“ مختصر سی خاموشی کے بعد اس نے دل میں آنے والے ایک اندیشے کے تحت سوال کیا۔

”ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے۔ اگر ٹھیک نہیں بھی ہوتا تو کیا تیرے خیال میں حویلی والے اتنے رحم دل ہیں کہ تیرے گھر کی پریشانی پر گڈی بھیج کر تجھے شہر سے بلواتے۔ ان کا اپنا ہی کوئی کام شام ہوگا جو انہوں نے تجھے بلوایا ہے۔“ ڈرائیور نے جھنجھلاہٹ زدہ لہجے میں جو جواب دیا، وہ سچ ہونے کے باوجود اپنی جگہ بالکل سچ تھا جسے سن کر رانی کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اسی خاموشی میں اونگھتے جاگتے واپسی کا سفر طے ہو گیا اور وہ پیر آباد کی حدود میں داخل ہو گئے۔ گاڑی کے پیر آباد میں داخل ہوتے ہی رانی کے دل نے بے حد خوشی محسوس کی۔ لاہور جیسے بڑے اور پر رونق شہر میں رہ کر بھی اسے اپنے اس کچے گھروں والے پیر آباد کی یاد مسلسل ستاتی رہی تھی اور اب جبکہ وہ پیر آباد کی فضاؤں میں سانس

لے رہی تھی تو یہ اس کے لیے از حد خوشی کا مقام تھا۔ خوشی کی اس کیفیت میں ڈوبی وہ آنے والے ظالم وقت کی آہٹیں سنے بغیر حویلی تک پہنچ گئی۔

”سیدھی وڈی چودھرائن کے پاس چلی جا۔ انہوں نے کہا تھا کہ رانی کو لاتے ہی فوراً میرے پاس بھیجنا۔“ وہ گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے اسے وڈی چودھرائن کا پیغام پہنچایا۔ وہ جو حویلی پہنچتے ہی کشور کے کمرے کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس حکم کو سن کر ٹھیک گئی۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اسے کشور کے اصرار پر حویلی واپس بلوایا گیا ہوگا لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ گڑبڑ کا پتا وڈی چودھرائن سے ملنے کے بعد ہی چل سکتا تھا چنانچہ وہ اس کے کمرے کی طرف چلی پڑی۔ اس کے سامان کی کتنی بھی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

”وڈی چودھرائن اپنے کمرے میں نہیں ہے رانی! میرے ساتھ آئیں تجھے ان کے پاس لے چلوں۔“ ابھی وہ وڈی چودھرائن کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری میں مڑی ہی تھی کہ اسے پیچھے مل گئی۔

”خیر تو ہے... تو بڑی کمزور لگ رہی ہے... چہرہ اترا ہوا سا ہے۔ کیا بیمار رہی ہے؟“ چچی کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے اس نے اس سے دریافت کیا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ چچی نے جس کی شکل ایک دن کی قید کے بعد ہی بالکل اتر کر رہ گئی تھی، سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تو اس کی مزید سوال جواب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے بھی چچی اور اس کی بہن شادو سے اس کے تعلقات کبھی بھی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے۔ وہ ان خوشامدی اور سازشی لڑکیوں سے دور ہی رہنا پسند کرتی تھی۔

”وڈی چودھرائن ادھر ہے؟“ جب چچی اسے لے کر تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگی تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ جواباً چچی نے محض اثبات میں سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

”پر وہ ادھر کیا کر رہی ہے؟“ اسے تہ خانے میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”اس کی مرضی جو چاہے کرے۔ تو اور میں کون ہوتے ہیں سوال کرنے والے؟“ چچی کا لہجہ اگرچہ جھنجھلایا ہوا تھا لیکن بات اس نے سولہ آنے درست کہی تھی۔ واقعی کسی ملازمہ کی کیا مجال تھی کہ وہ مالکن سے سوال کر سکتی۔ رانی کو بھی چارونا چار تہ خانے کی سیڑھیاں اترنی پڑیں لیکن اب اس کے دل میں خوف اس طرح بڑھ چکا تھا کہ گاؤں آنے کی ساری خوشی اڑن چھو ہو گئی تھی۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد چچی اسے

لے تہ خانے کے ایک کمرے کی طرف بڑھی۔ رانی کا آج پہلی بار تہ خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس تہ خانے کے بارے میں اس نے بہت سی کہانیاں ضرور سن رکھی تھیں۔

ستا تھا کہ یہ تہ خانہ چودھری کے دادا نے حویلی تعمیر کرتے وقت بنوایا تھا اور اس تہ خانے کی حیثیت ایک نجی جیل جیسی تھی جہاں وہ اپنے ناپسندیدہ افراد کو قید میں رکھتے اور ایذا دیتے تھے۔ دادا کے بعد چودھری کا باپ بھی اس تہ خانے کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتا رہا لیکن چودھری کے بارے میں یہی سننے میں آیا تھا کہ اس نے تہ خانے کا یہ استعمال بند کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی رحم دلی نہیں بلکہ عقل مندی تھی۔ بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے پیش نظر اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنی ذاتی رہائش گاہ کو کسی تنازع کام کے لیے استعمال نہ کرے۔ دوسرے وہ اپنے باپ دادا کی طرح اپنے مخالفین کو مستقل قید میں رکھنے کی زحمت کو ادا نہیں کرتا تھا۔ عموماً اس کے مجرم و دشمن چند دن کی قید اور ایذا سمیٹ کر اپنے انجام کو پہنچ جاتے تھے... اور اس مقصد کے لیے ڈیرا حویلی سے زیادہ مناسب تھا جہاں معاملات اہل خانہ سے بھی مخفی رہتے ہوئے بالا ہی بالا طے پا جاتے تھے۔ بہر حال جو بھی تھا، فی الحال تو رانی اس بدنام تاریخی پس منظر رکھنے والے تہ خانے کی ٹھن زدہ فضا میں خود کو نہایت خوف زدہ اور مجبور محسوس کر رہی تھی۔ چچی اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں موجود وڈی چودھرائن کے چہرے کے تاثرات نے اس کے خوف کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔ وہ قہر برساتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”سلام وڈی چودھرائن۔“ اس نے کاٹتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ اپنا جرم معلوم نہ ہونے کے باوجود وہ اتنا اندازہ تو لگا چکی تھی کہ کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ہے جس نے وڈی چودھرائن کو اس کی طرف سے برگشتہ خاطر کر دیا ہے۔

”شادو، چچی! اسے پکڑ کر رسیوں سے باندھ دو۔“ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر وڈی چودھرائن نے اپنی چمچوں کو حکم دیا۔ وہ دونوں فوراً ہی حرکت میں آ گئیں۔ خود ان کے ساتھ وڈی چودھرائن نے جو سلوک کیا تھا، اس کے پیش نظر تو اصولاً ان دونوں کی ہمدردیاں رانی کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں لیکن وہ اپنی لاپچی اور مکار فطرت کی وجہ سے ایک بار پھر وڈی چودھرائن کے جھانسنے میں آ گئی تھیں۔

وڈی چودھرائن نے ان سے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں تم دونوں میری وفادار ہو اور کشور والے معاملے میں بھی مجھ سے وفاداری نبھاتے ہوئے رازداری برتو گی لیکن میں تمہیں

قید کرنے پر مجبور تھی کیونکہ یہ چودھری صاحب کا حکم تھا۔ اب ایسا ہے کہ تم دونوں کی جان اسی طرح چھوٹ سکتی ہے کہ کسی طرح کشور ہمارے پاس واپس آجائے۔ اسے واپس لانے کے لیے ہم جو کوششیں کر رہے ہیں اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کشور کی ملازمہ خاص رانی سے کسی طرح اس شخص کا نام پتا اگلوایا جائے جس کی خاطر کشور نے ایسی حرکت کی ہے۔

میں رانی کو یہاں بلوا کر پوچھ گچھ کروں گی۔ ظاہر ہے، وہ آسانی سے تو بتائے گی نہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اسے مار پیٹ کر سچ اگلوانے کی کوشش کرنی پڑے۔ میں خود تو یہ کام نہیں کر سکتی اس لیے تم دونوں کو میری مدد کرنی ہوگی۔ اگر تم رانی سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہو سکتی ہو تو میں چودھری صاحب سے تمہاری سفارش کر کے تمہیں یہاں سے باہر نکلوا دوں گی۔

آزادی کے لالچ میں دونوں بہنوں نے اس کی یہ پیشکش قبول کر لی تھی اور یہ بھول گئی تھیں کہ حکمرانوں کے وعدے بھی انتہی کی طرح جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت چودھرائن نے جو پیشکش کی تھی، وہ ایسی غرض سے تھی۔ رانی سے سچ اگلوانے کا کام وہ تنہا خود نہیں کر سکتی تھی اور کسی اور ملازم کو اس کام کے لیے استعمال کرنا بات کو پھیلانے کا سبب بنتا چنانچہ جو پہلے ہی سے با علم تھے، انہی کو استعمال کرنا بہتر تھا۔

”چھوڑو... مجھے کیوں باندھ رہی ہو؟“ دونوں بہنیں اسے بازو سے پکڑ کر رسی تک لے گئیں تو وہ احتجاجاً چلائی مگر انہوں نے اس کی مزاحمت کے باوجود اسے دو مخالف دیواروں میں لوپے کے کٹڑے کی مدد سے دیوار سے لٹکی ہوئی رسیوں تک پہنچا کر دم لیا۔ پہلے اس کے دائیں ہاتھ کو رسی کی مدد سے باندھا گیا اور پھر بائیں ہاتھ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اب وہ فرش پر اس طرح کھڑی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں بندھی رسیوں سے لٹکے ہوئے تھے۔

”میرا قصور کیا ہے وڈی چودھرائن! میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے کہ آپ مجھے ایسی سزا دے رہی ہیں؟“ خود کو باندھے جانے کے بعد اس نے مزاحمت ترک کر کے وڈی چودھرائن سے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”زیادہ معصوم نہ بن۔ مجھ سے اپنا قصور پوچھتی ہے ٹمک حرام! تو ہی تو ہے جس کے سہارے وہ کشور کی بیٹی اتنا بڑا کام کر گئی ہے۔ اب تو ہمیں بتائے گی کہ وہ حویلی سے بھاگ کر اپنے کس پار کے پاس گئی ہے؟“ وڈی چودھرائن نے قہراً لود لہجے میں پوچھا۔

”کشور بی بی حویلی سے چلی گئیں؟“ رانی حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

”ہاں... اور اب تو ہمیں بتائے گی کہ وہ بھاگ کر کہاں گئی ہے؟“ چودھرائن نے اس کا انداز بھانپ لیا اور دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں جی! میں تو حویلی میں تھی ہی نہیں۔ مجھے بھلا کیا خبر کے وہ کہاں گئی ہیں؟“ رانی نے تجاہل برتتے ہوئے اپنی قطعی لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

”شادو...“ اس کا جواب سن کر وڈی چودھرائن بلند آواز سے چیخی۔ نتیجتاً رانی کے بائیں جانب ہاتھ میں چمڑے کا بیلٹ لے کر کھڑی ہوئی شادو کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ بیلٹ کا بکل لوہے کا تھا اور شادو نے اسے اس انداز سے پکڑا ہوا تھا کہ بیلٹ حرکت کرتا ہوا اس کی پیٹھ کی طرف بڑھا تو اس کا بکل والا سرا آزاد تھا جو ٹھک سے آکر اس کی پیٹھ پر لگا۔ کھا کھا کر جسم میں چربی جمع کر لینے والی شادو کے اس وار میں بڑی طاقت تھی۔ رانی اچھی خاصی سخت جان ہونے کے باوجود بلبلایا کر رہ گئی۔

”اب بھی وقت ہے، مجھے سب کچھ بتادے ورنہ میں تیری کھال اڑھڑا کر رکھ دوں گی۔“ اسے بلبلاتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے اسے خبردار کیا۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ چودھرائن کی دھمکی کے باوجود رانی اپنے بیان سے پیچھے نہیں ہٹی۔ وہ ہمیشہ کشور سے وفاداری کا دم بھرتی رہی تھی اور آج وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنی وفاداری کو ثابت کر دکھاتی۔ چنانچہ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنی لاعلمی کے دعوے پر قائم رہی۔

”ٹھیک ہے فیر۔ تیری چمڑی کو مار ہی چاہیے تو اب میں ان دونوں کو نہیں روکوں گی۔ جب تیرا مار کھا کھا کر دل بھر جائے تو آپ مجھے بتا دینا۔“ چودھرائن سفاکی سے کہتے ہوئے کرسی کی پشت سے اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور منکر نکیر کی طرح رانی کے دائیں بائیں کھڑی چچی اور شادو کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں کمرے میں موجود واحد کرسی پر براہیمان چودھرائن کے اشارے پر فوراً ہی حرکت میں آ گئیں اور ان کے ہاتھ متواتر چمڑے کی بیلٹوں سے رانی کی پشت پر ضرب لگانے لگے۔ ہر ضرب پر رانی کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلتی لیکن مارنے والے ہاتھ اور تماشا دیکھنے والی آنکھیں رحم سے ناواقف تھیں۔

”مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ چیخوں کے درمیان رانی کا تواتر سے کہا جانے والا یہ جملہ بھی گویا کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بالآخر پہلے اس کے الفاظ کم ہوئے اور پھر حلق سے نکلتی چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ وہ اس ہیما نہ تشدد

سے مذہال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اگر اس کے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ بندھی رستیوں میں نہ جکڑے ہوتے تو وہ فرش پر گر پڑتی لیکن اب اس کا بے ہوش وجود کمپرسی کے عالم میں جھول رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہوئی تو چچی اور شادو نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ وہ خود اس مشقت کی وجہ سے ہانپ سی گئی تھیں۔

”ہوش میں لاؤ اسے۔ مکر کر رہی ہے نمک حرام۔ اسے سارے چکر کا چنگی طرح پتا ہے۔ دن رات کشور کے پاس تھسی رہتی تھی۔ اس کی راز داں تھی جب ہی تو وہ ہر وقت اس کی طرف داری کرتی تھی۔ اس کے سوا کسی اور نوکرانی کو تو اس نے کبھی اتنا سر نہیں چڑھایا۔“ رانی کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے نفرت زدہ لہجے میں حکم جاری کیا۔ اس کے حکم پر شادو نے وہاں موجود پانی کا جگ رانی کے چہرے پر الٹ دیا۔ پانی کی ٹھنڈک سے وہ جھرجھری سی لے کر ہوش میں آ گئی۔

ہوش میں آنے کے بعد تکلیف کے شدید ترین احساس کے ساتھ اس نے جو دوسری بات محسوس کی وہ یہ تھی کہ چہرے اور گردن کو بھگونے کے بعد نمک کو بھی تر کر کے زمین پر گرنے والے پانی کے قطروں کے علاوہ کوئی اور سیال بھی ہے جو اس کے جسم پر سے قطروں کی صورت پھسلتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔ اس سیال کی حرکت وہ اپنی پشت پر محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سا سر جھکا کر نیچے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو پانی کے ساتھ گھلتے ملتے سرخ رنگ نے اس پر حقیقت عیاں کر دی۔ لوہے کے بکل سے اڑھڑ جانے والی پیٹھ سے خون کا اخراج شروع ہو گیا تھا اور یہ خون قطرہ قطرہ کر کے نیچے گر رہا تھا۔

”کچھ یاد آیا تجھے... یا یاد کروانے کے لیے کچھ اور انتظام کرو؟ میرے پاس ابھی تجھ سے سچ اگوانے کے لیے بہت طریقے ہیں۔“ چودھرائن نے اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز سے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی جی! میں تو یہاں تھی ہی نہیں۔“ رانی نے نقاہت زدہ لہجے میں اپنا چھپلا بیان دہرایا۔

”اچھا چل، مان لیا کہ تو یہاں نہیں تھی اس لیے تجھے کچھ خبر نہیں کہ تیری بی بی کس کے ساتھ اور کس طرح بھاگی، پر جب تو یہاں تھی، تب کی گل تو بتا سکتی ہے۔ مجھے بتا کہ وہ کس سے چھپ چھپ کر فون پر گل کرتی تھی۔ اس کے پاس جو موبائل تھا وہ اسے کس نے دیا تھا؟“ چودھرائن نے طراری کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

”مجھے نہیں خبر۔ میں نے ان کے پاس کوئی موبائل

نہیں دیکھا۔“ اس نے چودھرائن سے نظریں چراتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”تو بہت ڈھیٹ چیز ہے۔ تیری اس ڈھٹائی کا علاج کرنا ہی پڑے گا۔“ چودھرائن اس کا جواب سن کر چراغ پا ہو گئی اور اپنی چیمبوں کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ اس اشارے کو پا کر چچی نے ایک جانب رکھی پلاسٹک کی برنی اٹھائی اور اس میں موجود نمک اور سرخ مریچوں کا کچھ مٹی میں بھر کر رانی کی زخمی پیٹھ پر مل ڈالا۔ پہلے ہی ٹپٹپ سے زخم، نمک اور مریچ لگتے ہی جل اٹھے۔ رانی کو بالکل ایسا لگا کہ اس کی پیٹھ پر کسی نے آگ بھڑکا دی ہو۔ وہ تکلیف کی شدت سے ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیختے لگی۔ یہ تکلیف اتنی شدید تھی کہ ایک دفعہ تو اسے وفاداری کا سبق بھی بھولنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ وڈی چودھرائن کو سب کچھ بتا کر اس عذاب سے نجات حاصل کر لے لیکن یہ خیال بس لمحاتی ہی تھا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی عقل نے اس کا دامن تھام لیا اور وہ سچ اگلتے اگلتے اپنے لبوں کو بچھنے لگی۔

ایک دم ہی اسے خیال آ گیا تھا کہ سچ بولنے کے بعد بھی اس کی جاں بخشی ہونا ممکن نہیں۔ کشور کے جرم میں اس کا ساتھ دینے اور اس کے راز کو راز رکھنے کا قصور اتنا بڑا تھا کہ وہ سب بتا کر بھی سزا سے نہیں بچ سکے گی۔ حویلی والوں کی یہ ریت رہی تھی کہ وہ اپنی کسی بہو، بیٹی کے قدم لڑکھڑانے پر اس سے بعد میں حساب لیتے تھے، اس کے مددگاروں کو پہلے ٹھکانے لگاتے تھے۔ یعنی یہ طے تھا کہ وہ زبان بند رکھے یا کھول دے، خود کسی صورت میں بچ سکتی تھی... تو پھر بہتر تھا کہ اپنی وفاداری پر آج نہ آنے دیتی اور کشور کو جس سے وہ حقیقتاً خود بھی بہت محبت کرتی تھی، ایک بار اسے اس کی مرضی کی زندگی جینے کا موقع فراہم کر دیتی۔ ذہن و دل میں یہ یک وقت ابھرنے والے یہ خیالات و جذبات ایسے تھے کہ پیٹھ پر بھڑکتے شعلوں کی آج کم ہونے لگی اور اس کے حلق سے نکلتی چیخیں دم توڑ گئیں۔ درحقیقت وہ ایک بار پھر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر بازوؤں میں بندھی رسی سے جھول گئی تھی۔

”اسے ایسے ہی بندھا رہے دو۔ دوبارہ ہوش آئے تو کھانا پانی دینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہوش میں آنے کے بعد ایک بار پھر اس کے زخموں میں نمک بھر دینا اور ناک میں مریچوں کی دھونی دینا۔ یا تو یہ اپنی زبان سے سچ نکالے گی یا پھر اس کے جسم سے روح نکلے گی۔“ رانی کی مستقل مزاجی نے وڈی چودھرائن کو وقتی طور پر توبہا ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ اسے چھوڑنے یا اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے قطعی تیار

نہیں تھی۔ چنانچہ رعونت سے حکم جاری کرنے کے بعد اپنے بھاری بھر کم جیسے کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

”باجوہ والے معاملے کی تحقیق کروائی تم نے عبدالمنان! کچھ معلوم ہوا کہ تارڑ کے بیان میں کتنی سچائی ہے؟“ طبیعت ڈراما بہتر یا کر شہر یار نے اسپتال سے چھٹی لے لی تھی اور اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا تھا۔ اسپتال میں داخل رہنے کے دوران بھی وہ اپنے ضلع کے معاملات سے یکسر بے خبر نہیں رہا تھا اور فون پر عبدالمنان کو ہدایات جاری کرتا رہتا تھا۔ باجوہ والا معاملہ بھی اس نے فون پر اسے بتا دیا تھا۔ تارڑ اسپتال میں اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا تو اس نے وہ لفظوں میں یہ شک بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اس قتل کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہو سکتا ہے کیونکہ اب باجوہ قانون کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے لیے زیادہ مفید نہیں رہا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ نیا فاریسٹ آفیسر اپنی مرضی کا لے آئے گا لیکن اتفاق سے ڈاکٹر ماریا کی سفارش پر شہر یار کو عابد انصاری جیسا بندہ مل گیا۔ شہر یار اس سے ملاقات کر کے کافی مطمئن ہوا تھا اور اسے لگا تھا کہ یہ شخص اس کی خواہش کے مطابق بہت اچھے طریقے سے کام کرے گا۔ بہر حال، عابد انصاری کی کارکردگی تو ابھی سامنے آئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ باجوہ والے معاملے کو پرکھنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے عبدالمنان کی ڈیوٹی لگا دی تھی جس کے بارے میں اسے علم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ کام سرانجام دے ڈالے گا۔

”لیس سر! میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ باجوہ کا آبائی گاؤں الگ ضلع میں ہونے کی وجہ سے معلومات حاصل کرنے میں کچھ وقت تو لگا لیکن تارڑ کے بیان کی تصدیق ہو گئی ہے۔ میرے اعتماد کے ایک آدمی نے گورکن سے مل کر یہ تصدیق کر لی ہے کہ باجوہ کی قبر کھود کر وہاں سے اس کی ڈیڈ باڈی نکالی گئی ہے اور ڈیڈ باڈی نکالنے والے سرکاری اہلکار تھے۔ وہ شخص باجوہ کی خالی قبر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے اس پولیس سرجن کو بھی اپروچ کر لیا ہے جس نے باجوہ کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہاں سے بھی یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ تارڑ کی آپ کو دی ہوئی انفارمیشن درست ہے۔ باجوہ کی موت واقعی ہارٹ فیل سے نہیں بلکہ زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی ہے۔“ حسب توقع عبدالمنان کے پاس مکمل رپورٹ موجود تھی۔

”جب آپ باتیں درست ہیں تو تارڑ کا یہ شک بھی درست ہو سکتا ہے کہ باجوہ کی موت کے پیچھے چودھری کا ہاتھ

ہے لیکن مسئلہ وہی ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں جس کی بنیاد پر ہم چودھری پر ہاتھ ڈال سکیں۔ خود تارڑ بھی اس سے خوف زدہ نظر آ رہا ہے اور ملک سے باہر نکلنے کے چکر میں ہے بلکہ سمجھو کچھ دن میں روانہ ہی ہو جائے گا۔

”آپ کا خیال درست ہے سر۔ لیکن سر درست ہم اس مسئلے پر کچھ نہیں کر سکتے اور بہت سے معاملات کی طرح ہمیں اس معاملے کو بھی فی الحال نظر انداز ہی کرنا ہو گا۔“

عبدالمنان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

”ایسا ہے تو ایسا ہی سہی لیکن تم دیکھنا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب چودھری کو اپنے اعمال کا حساب اسی دنیا میں دینا پڑے گا۔ اس کی گردن کب گرفت میں آتی ہے، یہ ابھی مجھے بھی نہیں معلوم لیکن وہ پکڑا ضرور جائے گا۔“

”ضرور سر! انشاء اللہ۔“ عبدالمنان نے صدیقی دل سے کہا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ آپ کے مختلف دیہاتوں میں دورے کا شیڈول تیار کر دوں، وہ میں نے کر دیا ہے۔ آج آپ کو بیچ ٹائم کے بعد وزٹ کے لیے نور پور جانا ہو گا۔“

”اوکے! یہ تم نے اچھا کیا کہ سب سے پہلے نور پور کا وزٹ رکھ لیا۔ میں کافی دنوں سے چودھری بختیار سے ملنا چاہ رہا ہوں لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب جاؤں گا تو مل لوں گا۔“ عبدالمنان کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے شہریار نے ایک بار پھر اپنے دل میں اس شخص کی صلاحیتوں کو بہت گہرائی سے محسوس کیا۔ اپنے آفیسر کا اس حد تک مزاج آشنا پی اے مل جانا بڑے شکر اور خوشی کا مقام تھا۔

”ایک کام اور کرو عبدالمنان! میری ایس پی تارڑ سے بات کروادو۔ اس شخص میں بہتری کے آثار نظر آرہے ہیں تو کیوں نہ موقع کا فائدہ اٹھا لیا جائے۔“ عبدالمنان نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی اور تارڑ کا نمبر ملا کے اس کے لائن پر آنے کے بعد ریسورس شہریار کو تھما دیا۔

”خیریت سر! آج صبح صبح ہماری یاد کیسے آگئی آپ کو؟“ شہریار کی ہیلو کے جواب میں تارڑ نے خوش گوار لہجے میں اس سے سوال کیا۔

”میں نے سوچا کہ اب تو آپ رخصت ہونے والے ہیں، آپ سے معلوم کر لوں کہ کوئی کام وغیرہ میرے لائق ہو تو بتائیں۔“ شہریار نے بھی جوانی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

”کام تو کوئی نہیں، ہاں ایک خواہش ہے کہ اگر میرے جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ کسی روز ڈنر کر لیں تو

بہت اچھا رہے گا۔“ تارڑ نے پیشکش کی۔

”چلیں ٹھیک ہے، ایسا کر لیتے ہیں لیکن ڈنر میری طرف سے ہو گا۔ آپ نے پہلے ذکر چھیڑ دیا ورنہ اصولی طور پر مجھے آپ کو اس الوداعی ڈنر کی دعوت دینی تھی۔ آپ ایسا کریں کہ اس سنڈے کو میرے بیٹکے پر تشریف لے آئیں، ساتھ بیٹھ کر ڈنر بھی کر لیں گے اور کچھ گپ شپ بھی رہے گی۔“ اس نے جوابی پیشکش کی جس سے انکار ظاہر ہے تارڑ کے لیے ممکن نہیں تھا۔

”مجھے آپ سے ایک کام اور تھا تارڑ صاحب! امید ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔“ رسی گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اس نے اصل مطلب پر آتے ہوئے تارڑ سے کہا۔

”حکم فرمائیے سر! اگر میرے اختیار میں ہوا تو میں ضرور آپ سے تعاون کروں گا۔“

”نور پور بم بلاسٹ میں خودکش حملہ آور لڑکے کے والدین اور بڑے بھائی کو آپ نے گرفتار کر لیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ گرفتار تو وہ میرے کہنے پر کیے گئے تھے لیکن بعد میں آپ نے انہیں اپنی کھڑی میں لے لیا تھا۔ ان لوگوں کا بعد میں کچھ پتا نہیں چلا حالانکہ میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور ہوں کہ ان بے چاروں کا اس بم بلاسٹ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ بالکل بے قصور تھے۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے ان لوگوں کے بارے میں انفارم کر دیں۔“ اس کی اس درخواست کے جواب میں تارڑ پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر بولا تو اس کے لہجے میں ندامت تھی۔

”آئی ایم سوری اے سی صاحب! اس فیملی کا تو اب مجھے بھی کچھ اتنا پتا معلوم نہیں ہے۔ ایچ وی بلاسٹ کی انویسٹی گیشن شروع کرتے ہی ایجنسز والوں نے ان لوگوں کو اپنی کھڑی میں لے لیا تھا، چنانچہ بعد میں میرا بھی ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔“ تارڑ کا جواب اس کے لیے خاصا مایوس کن تھا۔ وہ افسر شاہی کا ایک پُرزہ تھا اور بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ایجنسز کے ہاتھ لگ جانے والوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا۔

”اوکے تارڑ صاحب! آپ نے جتنا بتا دیا، یہ بھی کافی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے کچھ اور بھی ضروری امور نمٹانے ہیں۔“ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پل بھر کے توقف کے بعد اپنا موبائل نکال کر مشاہیرم خان کا نمبر ملانے لگا۔ عبدالمنان کو وہ تارڑ سے گفتگو کے دوران ہی اشارے سے جانے کی اجازت دے چکا تھا چنانچہ اس وقت اپنے دفتر میں بالکل تنہا تھا۔ اس تنہائی

نے اسے ماہ بانو کی یاد دلانی تھی، تب ہی اسے اس کی تلاش میں سرگرداں مشاہیرم خان سے رابطے کا خیال آیا تھا۔ اس کے نمبر ملانے پر بہت دیر تک تیل جاتی رہی لیکن دوسری طرف سے کال ریسپونڈ نہیں کی گئی۔ اللہ جانے مشاہیرم خان کہاں مصروف تھا کہ اسے اس کی کال ریسپونڈ کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے بلتستان میں موجود اپنے ہم منصب سے رابطہ کیا۔

”ماہ بانو نامی لڑکی کے اغوا کے کیس میں کچھ پیش رفت ہوئی جناب یا نہیں؟“ رسی سلام دعا اور حال احوال کے بعد اس نے وہ سوال کیا جس مقصد کے تحت کال کی تھی۔

”سوری مسٹر شہریار! میں بہت شرمندہ ہوں کہ ابھی تک ہم لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکے ہیں۔ یہ کیس بہت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ پہلے ٹورسٹ کمپنی کا وہ ڈرائیور حادثاتی موت کا شکار ہوا جس کی جیب چھین کر اسے ماہ بانو کے اغوا کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور اب ٹورسٹ کمپنی کا مالک صغیر بیک غائب ہے۔ صغیر بیک کی گاڑی ایک جگہ خالی کھڑی پائی گئی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے لیکن کڈنپر کون ہے، اس کے بارے میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔“ دوسری طرف سے ڈرائیور شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا گیا۔

”یہ تو واقعی بہت پیچیدہ صورت حال ہے۔ بہر حال، آپ خیال رکھیے گا اور جیسے ہی کوئی نئی بات معلوم ہو، پلیز مجھے انفارم کر دیجیے گا۔“ وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کا اپنا طریقہ تفتیش ہے جو ان کی سیدھی سادی زندگیوں کے باعث اتنا زیادہ تیز رفتار نہیں۔ ویسے بھی پولیس کی کارکردگی تو لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں بھی اتنی واجبی تھی کہ اتنے دشوار گزار علاقے میں ان سے کوئی اچھی امید رکھنا عبث تھا۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر مشاہیرم خان کا نمبر ٹرائی کیا۔ اس بار بھی تیل جاتی رہی لیکن کوئی کال ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر سلسلہ منقطع ہی کرنے لگا تھا کہ کسی نے کال ریسپونڈ کر لی۔ کال ریسپونڈ کرنے والے کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی سترہ اٹھارہ سال کا کم عمر لڑکا ہے۔

”کون بات کر رہا ہے؟“ مشاہیرم خان کا فون ہے نا تو وہ خود کہاں ہے؟“ اس نے تیز لہجے میں لڑکے سے سوال کیا۔

”ہم نہیں جانتا صاحب کہ مشاہیرم خان کون ہے۔ یہ فون ہمیں راستے میں پڑا ہوا ملا تھا تو ہم نے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔“ لڑکے نے گہرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو وہ

ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور قدرے نرمی سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ہم سمندر خان ہے۔ یہاں ایک موٹیل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔“ لڑکے نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

”سمندر خان! یہ موبائل جس شخص کا ہے، مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ تم ایسا کرو کہ ہوٹلوں میں گھوم پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مشاہیرم خان کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ مل جائے تو یہ فون اسے دے دینا۔ اس کے بدلے تمہیں انعام مل جائے گا۔“ بہت کبھانے والے انداز میں اس نے لڑکے کو یہ ہدایت دی۔

”ٹھیک ہے جناب! ہمیں وقت ملا تو کوشش کرے گا۔“ لڑکے کا انداز ٹالنے والا تھا۔

”وقت کی بات مت کرو، تمہیں ہر حال میں مشاہیرم خان کو تلاش کرنا ہے۔ انعام میں، میں تمہیں اس سے بھی اچھا موبائل دلا دوں گا۔“ یہ محسوس کر کے کہ لڑکا موبائل کے لالچ میں مشاہیرم خان کو ڈھونڈنے میں آنا کافی کر رہا ہے، اس نے اسے لالچ دیا۔

”سچ کہہ رہے ہو صاحب؟“ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔ بس تم میرا کام کر دو... اور ہاں، اس موبائل کو آف مت کرنا۔ میں اسی نمبر پر تم سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد رابطہ کرتا رہوں گا۔“ اس نے لڑکے کو پابند کرنے کے لیے کہا۔ دراصل وہ مشاہیرم خان کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا موبائل کسی جگہ پڑا ملنا کوئی اچھی علامت نہیں تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ موبائل مشاہیرم خان سے بے خیالی میں گر گیا تھا یا وہ کسی غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہوا تھا اور کسی سے لڑائی جھگڑے میں اس کا موبائل گرنے کی نوبت آگئی تھی۔

”سمندر خان! ایک کام کرو۔ ہوٹلوں میں معلوم کرنے سے پہلے سب سے پہلے دوکانے (اسپتال) جاؤ۔ وہاں مشاہیرم خان کی ماں داخل ہے۔ تم وہاں جاؤ گے تو مشاہیرم خان مل جائے گا یا پھر اس کے بارے میں کوئی خبر ہی مل جائے گی۔“ وہ فون بند ہی کرنے لگا تھا کہ مشاہیرم خان کی تلاش کا ایک نسبتاً آسان راستہ دکھائی دیا چنانچہ سمندر خان کو ہدایت دی۔

”ٹھیک ہے صاحب! ہم ایسا ہی کرے گا۔“ سمندر خان نے جواب دے کر فون بند کر دیا تو وہ بھی اپنا سر جھٹک کر دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن یہ توجہ خالصتاً پیشہ

ورانہ نوعیت کی تھی۔ اس مصروفیت کے دوران بھی دل اس پریشانی میں مبتلا تھا کہ جانے ماہ بانو کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ اپنی بے پناہ مصروفیات اور مسائل کے باوجود وہ زندگی میں آنے والی اس پہ ظاہر عام سی لڑکی کو فراموش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ہر پریشانی، ہر مصروفیت اور ہر کام کے دوران اس کا خیال ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اس طرح پل پل خیال میں رہنے والی ہستی درحقیقت زندگی میں سب سے اہم مقام کی حامل ہوتی ہے۔ اے سی شہریار عادل کو ابھی اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ محبت میں اس مقام تک نہیں پہنچا تھا جہاں کام عشق کے آڑے آنا چھوڑ دیتا ہے اور بندہ صرف محبوب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو بھی تھا، فی الحال تو وہ اپنے فرائض منصبی کو ہی ترجیح دیتا تھا چنانچہ خیال کے پردے پر بار بار ابھرنے والی ماہ بانو کی شبیہ بے نظریں چرا کر لچ ٹانگ تک اپنے معمول کے کام نہٹاتا رہا۔ بچ کے فوراً بعد وہ اور عبدالمنان نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ نور پور تک کا راستہ کافی طویل ہونے کی وجہ سے یہی امید تھی کہ انہیں واپسی میں مغرب تک کا وقت تو ضرور ہی ہو جائے گا۔

”نور پور میں کنسرکشن کی کیا صورت حال ہے؟“ دوران سفر اس نے عبدالمنان سے پوچھا۔

”کام تو حتی الامکان تیزی سے ہی ہو رہا ہے۔ اسکول اور مرکز صحت دونوں کی عمارتیں تیاری کے تقریباً آخری مراحل میں ہیں۔ ہم نے اسٹاف کے اپائنٹمنٹ کی کارروائی بھی شروع کر دی ہے لیکن نور پور کا اہم مسئلہ یعنی بجلی کی فراہمی... ابھی تک اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ چیمہ صاحب نے اس سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا، وہ ابھی تک بس وعدہ ہی ہے۔ میری چودھری بختیار سے جو آخری ملاقات ہوئی تھی اس میں اس نے اس معاملے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اصل میں اس نے گاؤں میں چھوٹی صنعتوں کے آغاز کا جو منصوبہ بنا رکھا ہے، اس پر عمل درآمد کے لیے بجلی کی عدم موجودگی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔“ عبدالمنان نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”واقعی یہ تو بہت اہم مسئلہ ہے۔ میں بھی پچھلے سارے عرصے میں اتنی بڑی طرح الجھا رہا کہ اس معاملے کو بھول ہی گیا۔ تم ذرا چیمہ صاحب کا نمبر ملاؤ۔ ابھی اسی وقت انہیں یاد دہانی کروا دیتے ہیں۔“ اپنی کوتاہی پر دلی افسوس محسوس کرتے ہوئے اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس پر اس نے فوراً ہی عمل درآمد کیا۔

”میں اے سی شہریار عادل صاحب کا پی اے

عبدالمنان بات کر رہا ہوں۔ اے سی صاحب مسٹر چیمہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس وقت یہ ممکن ہو سکے گا؟“ رابطہ ہونے پر اس نے مہذب لہجے میں دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے چیمہ کے پی اے سے پوچھا۔

”آئی ایم سوری مسٹر عبدالمنان! فی الحال چیمہ صاحب ایک اہم میٹنگ میں ہیں اس لیے ان سے بات کروانا ممکن نہیں۔ جیسے ہی وہ میٹنگ سے فارغ ہوتے ہیں، میں انہیں بھیج دے دیتا ہوں۔“ دوسری طرف سے بھی اسی پیشہ ورانہ تہذیب کا مظاہرہ کیا گیا۔ ویسے چیمہ کا پی اے چونکہ شہریار اور چیمہ کی ملاقات کے دوران موجود رہا تھا، اس لیے وہ اس سے اور اس کے خاندانی پس منظر سے اچھی طرح واقف تھا۔... ورنہ ممکن تھا کہ ایک وفاقی وزیر کا پی اے، ایک چھوٹے ضلع کے اے سی کے پی اے سے اتنی رواداری کا مظاہرہ نہ کرتا۔

”اوکے! فی الحال تو بات نہیں ہو سکی لیکن تمہیں خود دوبارہ اب دھیان سے میری چیمہ صاحب سے بات کروانی ہوگی۔“ عبدالمنان نے دوسری طرف سے ملنے والا جواب شہریار کے گوش گزار کیا تو اس نے اسے تاکید کی اور پھر فوراً ہی سامنے کے منظر میں الجھ گیا۔ وہ تقریباً دس بارہ افراد تھے جو ایک چارپائی اٹھائے سڑک پر آٹکے تھے۔ چارپائی پر کوئی مختصر سا وجود دراز ہے، یہ فاصلہ ہونے کے باوجود شہریار نے دیکھ لیا تھا۔

”گاڑی روک دو۔“ ہجوم تقریباً سڑک کے درمیان آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور اس سے کئی کاٹ کر آگے نکل جاتا، شہریار نے اسے حکم دیا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ شہریار اور عبدالمنان گاڑی سے نکل آئے۔

”یہ کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ اس طرح بچ سڑک پر کیوں کھڑے ہو؟“ عبدالمنان نے آگے بڑھ کر ان لوگوں سے سوال کیا۔

”یہ میرا بھانجا ہے صاحب! اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر اسے فوراً اسپتال نہیں پہنچایا گیا تو یہ مر جائے گا۔ ہم اسے گاؤں سے اسے منجی پر ڈال کر یہاں تک لائے ہیں کہ اگر کوئی لاری یا ٹرک سڑک سے گزرے تو اسے نورکوٹ کے اسپتال تک پہنچا سکیں۔“ ایک منحنی سے شخص نے آگے بڑھ کر عبدالمنان کے سوال کا جواب دیا۔ اس دوران لوگوں نے چارپائی نیچے رکھ دی تھی اور اس پر لیٹا بارہ تیرہ سال کا لڑکا صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکے کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ اس کی باجھوں سے جھاگ بہہ رہا تھا اور وہ خود

تقریباً غشی کے عالم میں تھا۔

”اسے گاڑی میں بٹھاؤ عبدالمنان۔ ہم واپس نورکوٹ جائیں گے۔“ لڑکے کی حالت کے پیش نظر شہریار نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا اور خود واپس گاڑی کی اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ اس کے حکم پر لڑکے کو چارپائی سے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر منتقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ عبدالمنان اور لڑکے کا ماموں بھی موجود تھا۔

”آپ کا بہت شکریہ صاحب! یہ لڑکا میری بہن کا اکلوتا پُتر ہے۔ اس کا پو پو ڈی خراب طبیعت کا مالک ہے۔ اگر منڈے کو کچھ ہو گیا تو وہ میری بہن کو جان سے مار دے گا۔“ ڈرائیور نے گاڑی موڑ کر واپس نورکوٹ جانے والے راستے پر ڈالی تو بچے کا ماموں شکر گزار لہجے میں بولا۔

”اس بچے کو ہوا کیا ہے؟“ شہریار نے بچے کی غیر ہوتی حالت دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”رب جانے صاحب کہ کیا ہو گیا۔ چنگا بھلا ہی تھا سویرے تک۔ دوپہر میں تاپ چڑھا تو ماں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس نے جانے کیسا ڈنکا لگایا کہ بچہ ہاتھوں میں آنے لگا۔ خبیث بولا کہ پریشانی کی کوئی گل نہیں۔ بچے کو گھر لے جاؤ، تھوڑی دیر بعد طبیعت سنبھل جائے گی۔ میری بہن سیدھی سادی عورت اس کی چال میں آگئی، پر گھر جا کر تو بچے کی حالت ہی بگڑ گئی۔ اس کو جھٹکے لگنے لگے۔ بہن دوبارہ ڈاکٹر کی دکان کی طرف بھاگی کہ اسے بلا کر بچے کی حالت دکھائے لیکن وہ مردود تو وہاں پر تھا ہی نہیں۔ ارد گرد والوں نے بتایا کہ وہ تو ایک تھیلے میں اپنا سامان رکھ کر اپنی ویسا پر بھاگ نکلا۔ میں نے کہا اس مردود سے بعد میں تمہیں گے، پہلے بچے کو تو اسپتال پہنچانے کی کوشش کریں۔ بس اللہ نے ساتھ دیا کہ سڑک پر آتے ہی آپ کی گڈی مل گئی۔ بچہ چنگا بھلا ہو کر خیر نال گھر آجائے، باقی اس ڈاکٹر دے پتر سے تو اس کا پو پو خود ہی بعد میں دودو ہاتھ کر لے گا۔ وڈا کو کھری بندہ ہے وہ۔ تھہ چھٹ ایسا کہ گل بعد میں کرتا ہے بندے کی گڈی پہلے پڑتا ہے۔“ بچے کا ماموں مسلسل بولتا ہوا انہیں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

”اس ایریے میں ڈاکٹر کہاں سے آیا؟ ہمیں اپنے ہیلتھ یونٹس کے لیے تو ڈاکٹر فرماتے نہیں ہیں۔“ شہریار نے پلٹ کر عبدالمنان سے سوال کیا۔

”ڈاکٹر واکٹر کیا سر... اس طرح کے علاقوں میں جہاں میڈیکل کی سہولیات دستیاب نہیں ہوتیں، اتالی اپنی دکانیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور خود کو ڈاکٹر کہلوانے لگتے

ہیں۔ ان ٹان کو الیفا ایڈ ڈاکٹر کی کم علمی اور ناٹری پن کی وجہ سے اس طرح کے واقعات رونما ہونے کی اطلاع ملتی رہتی ہے... جیسا کہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔“ عبدالمنان نے اپنے سامنے موجود بچے کی طرف اشارہ کیا جس کی حالت ہرگز رتے لمحے کے ساتھ دگرگوں ہوتی نظر آرہی تھی۔

”یہ تو سیدھا سیدھا کرائم ہے۔ ایسے افراد کے خلاف تو سخت ایکشن لینا چاہیے۔ آخر ہم کیسے کسی کو اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ انسانی زندگیوں کے ساتھ کھیلے۔“ بچے کی حالت شہریار کو غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ذرا سارخ موڑ کر بچے کے ماموں کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ اس جعلی ڈاکٹر کا حلیہ اور اس کی ویسا کا نمبر بتا سکتے ہیں؟“

”ویسا کا نمبر تو مجھے نہیں مالموم صاحب! بس اتنا بتا ہے کہ نیلے رنگ کی ویسا ہے۔ رہی اس خبیث کے حلیے کی گل تو حلیہ تو اس کا ایسا ہے کہ دیکھتے ہی اس کی خباثت کا مالوم بڑھ جاتا ہے۔ کالی سیاہ تو بے جیسی رنگت، بوٹا سا قد، خوب باہر کوٹنگی ہوئی تو اند اور وڈی وڈی مونچھیں ہیں اس کی۔“ بچے کا ماموں جو شہریار کو بطور اے سی نہیں پہچانتا تھا، اس کے بارے میں لہجے اور انداز سے اس کی باختیار حیثیت کا اندازہ لگاتے ہوئے مرحوب سے لہجے میں بتانے لگا۔

”عبدالمنان! ڈی ایس پی منظور کو فون کرو کہ ساری چیک پوشش پر پیغام دے دے کہ نیلے رنگ کی ویسا پر ایسے حلیے والا کوئی شخص نظر آئے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ابھی اتنی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ وہ شخص ضلع سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوگا۔“ اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس کی تعمیل کے لیے وہ اپنا موبائل نکال کر فوراً ہی ڈی ایس پی منظور کو کال کرنے لگا۔

”یہ کون صاحب ہیں جناب؟“ وہ کال کر کے فارغ ہوا تو بچے کے منحنی سے ماموں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

”یہ ہمارے ضلع کے اے سی صاحب ہیں۔“ عبدالمنان نے جواب دیا تو اس کا منہ کھل گیا۔ یقیناً کسی سرکاری افسر کا ایسا ہمدردانہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اسے اپنی اس حیرت کا زبان سے اظہار کا موقع نہیں ملا اور گاڑی نورکوٹ کے اسپتال کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور اور بچے کے ماموں مل کر بچے کو گاڑی سے اتار کر اسپتال میں منتقل کرنے لگے۔ اسپتال کے عملے کے لیے شہریار کی گاڑی جانی پہچانی تھی چنانچہ فوراً ہی ایک ذمے دار بھاگا ہوا باہر آیا۔

”اس بچے کا ٹریٹمنٹ بہت کیئرفل ہو کر کرنا ہے۔ بعد

میں مجھے اس کی حالت کے بارے میں انفارم کیجیے گا۔“
شہر یار نے اسے ہدایت دی جس کے جواب میں اس نے تیزی سے اپنی گردن کو حرکت دی اور بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں سر! ہم بچے کا پورا دھیان رکھیں گے۔“
”واپس دفتر چلو۔“ اسپتال کے گیٹ پر عملے کے کسی فرد نے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی تھی اس لیے وہ واپس آ گیا تھا۔ شہر یار نے یہ جملہ اسی سے کہا تھا۔ اس نے فوراً حکم پر عمل درآمد کیا اور گاڑی دفتر کی طرف چل پڑی۔ اس ایمر جنسی کیس کی وجہ سے ان کا آج نور پور جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا لیکن شہر یار مطمئن تھا۔ ایک انسانی زندگی اس کے نور پور کے دورے سے زیادہ اہم تھی۔

”اس جلی ڈاکٹر کو گرفتار کر لیا گیا ہے سر۔“ وہ لوگ ابھی دفتر واپس نہیں پہنچے تھے کہ عبدالمنان کے موبائل پر کال موصول ہوئی اور اس نے شہر یار کو اطلاع دی۔
”گڈ... ویری گڈ۔ خیال رکھنا کہ یہ شخص کسی طرح بچ نکلتے میں کامیاب نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس طرح کے جو دوسرے افراد مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، ان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے ان کے خلاف ایکشن لو۔ ہم لوگوں کی زندگیاں ان اتائیوں کے ہاتھ میں دینے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے۔“ جلی ڈاکٹر کی گرفتاری پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مزید ہدایات جاری کیں لیکن خود اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ عوام کو اتائیوں کے چنگل سے نکلانے کے لیے صرف ان افراد کے خلاف ایکشن لینا کافی نہیں ہوگا۔ اسے جلد از جلد لوگوں کو علاج کی ایسی سستی سہولیات فراہم کرنی ہوں گی کہ اگر کوئی اتائی کہیں بے خبری میں اپنا دھندا بھانا بھی چاہے تو از خود ناکام ہو جائے۔ طبی سہولیات کی ناقص فراہمی یا عدم دستیابی ملک بھر کا مسئلہ ہے، وہ جانتا تھا لیکن پورے ملک کے مسائل کو حل کرنا اس کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر جوار و جتنا کر سکتا تھا، اتنا کر رہا تھا اور مزید بھی کرتے رہنے کا عزم دل میں رکھتا تھا۔

☆☆☆

ان کے ہر سو برف ہی برف تھی۔ وہ گھنٹوں چلتے تھے اور پھر بھی خود کو اسی برف زار میں پاتے تھے۔ انہیں خود بھی اور اک ہو چکا تھا کہ وہ اس برف زار میں بھٹک گئے ہیں۔ درحقیقت وہ دونوں ہی راستوں سے قطعی نا آشنا تھے۔ انہوں نے فرار کا منصوبہ بناتے وقت صرف ایک بات کو مد نظر رکھا تھا اور وہ یہ کہ تربیت یافتہ یا ک انہیں جانے پہچانے راستوں

سے گزار کر خود ہی منزل مقصود تک پہنچا دے گا لیکن قسمت کی خرابی سے وہ پہلے ہی مرحلے پر یا ک سے محروم ہو گئے تھے۔ انہیں فرار سے روکنے کی کوشش کرنے والوں نے جب ان پر فائرنگ کی تھی تو اس فائرنگ کی زد میں ان کی سواری کا ذریعہ اور راہبر یا ک آ گیا تھا۔ یا ک کے بغیر وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئے تھے۔ اوپر سے عمران خود بھی زخمی تھا۔ ماہ بانو مخصوص وقفے کے بعد اس کے زخم کی مرہم پٹی کر دیتی تھی۔ وہ درد کم کرنے اور بخار اتارنے کی گولیاں بھی باقاعدگی سے کھا رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی حالت مسلسل دگرگوں ہوئی جا رہی تھی۔

ایسا اس گولی کی وجہ سے تھا جو ابھی تک جسم میں بیوست تھی اور زخم کو خراب کرنے کا سبب بن رہی تھی۔ ان وقت بھی وہ تکلیف کی شدت سے ٹڈھال تھا اور ساتھ ہی اس کے چہرے کی لہجہ یہ لہجہ بڑھتی سرخی اس بات کی نشان دہی کر رہی تھی کہ بخار ایک بار پھر کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کیفیت کے باوجود اس نے اپنے قدم نہیں روکے تھے اور مسلسل چل رہا تھا۔ اس کے صحت مند شانے سے وہ تھپلا بھی لٹکا ہوا تھا جس میں ان کی ضرورت کا سامان تھا۔ ایسا ہی ایک تھپلا ماہ بانو کے پاس بھی تھا۔ یا ک کی موت اور عمران کے زخمی ہونے کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان دو حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ تھیلوں میں رکھ لیا تھا۔ ماہ بانو کے جیسے میں جو تھپلا آیا تھا، اس میں خوراک اور ادویات موجود تھیں جبکہ عمران کے تھیلے میں سلپنگ بیگز، اسٹوو، پانی کی بوتلیں اور کچھ ایسی چیزیں موجود تھیں جو کسی برفانی علاقے میں سفر کے دوران معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اسلحہ بھی زیادہ تر اس نے اپنے پاس ہی رکھا تھا اور ماہ بانو کے پاس صرف ایک ہلکی سی رائفل تھی۔ اگر وہ زخمی نہیں ہوتا تو یقیناً سارا بوجھ خود ہی اٹھانا پسند کرتا لیکن اب مجبوری تھی اس لیے ماہ بانو کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔

وہ دونوں ہی بے حد تھک چکے تھے لیکن ایک بار پھر زندگی کی رونقوں میں شامل ہونے کی خواہش نے انہیں سفر جاری رکھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اس خواہش کا دامن تھا، اس وقت وہ ایک کلیشیر پر سے گزر رہے تھے۔ قدرے سخت برف والے اس کلیشیر پر قدم بجا کر چلنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آرہی تھی لیکن تیز نیکی ہوائیں خوب مزاج پوچھ رہی تھیں۔ ان ہواؤں کی ٹھنڈک میں ایسی کاٹ تھی کہ بارہا انہیں محسوس ہوتا جیسے ہوا کے ساتھ برف کی کرچیاں سی آ کر ان کے چہرے سے ٹکرا رہی ہوں۔ ان کاٹ دار ہواؤں سے

بچنے کے لیے انہوں نے اپنے سروں پر پہنی مخصوص ٹوپوں کو چہرے پر بھی کھینچ لیا تھا اور اب صرف ان کی آنکھیں ہی کھلی تھیں جن پر انہوں نے چشمے چڑھالیے تھے۔ لیکن برف زاروں کی موسمی شدت کا مقابلہ کرنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے... یہاں موسم اتنی تیزی سے اور اچانک بدلتے ہیں کہ ہر احتیاطی تدبیر ناکام ہوتی چلی جاتی ہے۔

ان کے ساتھ بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ پہلے ٹھنڈی برف ہواؤں کا ساتھ دینے کے لیے موٹے موٹے بارش کے قطرے ٹپکنے لگے اور پھر بڑی تیزی سے ان قطروں نے منجمد ہو کر برف کی شکل اختیار کر لی۔ روٹی کے گالوں کی طرح تو اتر سے گرتی برف جہاں سردی کے احساس کو بڑھا رہی تھی، وہیں اس نے ارد گرد کے منظر کو بھی دھندلا ڈالا تھا۔ ان کے لیے چند فٹ آگے کا راستہ دیکھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ قدم اٹھانے پر مجبور تھے کیونکہ آس پاس کوئی ایسی پناہ گاہ بھی نہیں تھی جہاں کچھ دیر رک کر اس برف باری سے محفوظ رہا جاسکے۔

”ماہ بانو! میرا ہاتھ تھام لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس دھند میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔“ ماہ بانو کو اپنے قریب سے عمران کی مدد سی آواز سنائی دی تو اس نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل درآمد کیا۔ اس ویران برف زار میں تنہا رہ جانے کا خیال ہی بہت خوفناک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ جگہ جہاں عمران کے ساتھ ہونے کے باوجود زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد کرنا دشوار محسوس ہو رہا ہے، تنہا رہ جانے کی صورت میں دشوار تر بن ہو جائے گی۔

”چتا نہیں ہم یہاں سے نکل بھی سکیں گے یا نہیں؟“
لہجہ بہ لہجہ اپنے لباس پر مبنی ہوئی برف کی تہ کو محسوس کرتے ہوئے اس نے قدرے مایوس کن لہجے میں عمران سے کہا۔

”انشاء اللہ... ہم یہاں سے ضرور نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے، ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔“ عمران نے اسے تسلی دی۔

”شاید تم ٹھیک کہہ...“ ابھی اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس نے اپنے بڑھے ہوئے دائیں قدم کے نیچے سے زمین کو غائب پایا۔ اس کا بائیں قدم ابھی زمین پر ہی تھا لیکن وہ بھی اتنی مضبوطی سے نہیں جما ہوا تھا کہ وہ خود کو سنبھال پائی۔ اضطرابی طور پر اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی پھر اس کے جسم کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ یہ عمران تھا جس نے پوری قوت سے اسے

پیچھے کی طرف کھینچا تھا۔ نظر اسے بھی کچھ نہیں آیا تھا لیکن ماہ بانو کا ہاتھ گرفت میں ہونے کی وجہ سے اس نے اس کے جسم کو لگنے والا جھٹکا فوری طور پر محسوس کر لیا تھا اور فوری رد عمل کے طور پر اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا تھا۔ اس خوفناک لمحے سے گزرنے کے بعد انہوں نے بہ غور جائزہ لیا تو ایک دراڑ نظر آئی۔ کسی کلیشیر پر موجود ایسی دراڑیں نہایت قاتل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص بے دھیانی میں دراڑ میں گر جائے تو پھر اس کا بچنا ممکن نہیں رہتا۔ نیچے موجود برف جیسا پانی لمحوں میں اسے منجمد کر کے زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ ماہ بانو کی خوش قسمتی تھی کہ دراڑ نے اسے نکلنے نکلنے ایک دم ہی بخش دیا تھا اور عمران کا ہاتھ تھامنا اس کے کام آ گیا تھا۔

جو حادثہ ہوتے ہوئے رہ گیا تھا، اس کے خوف نے انہیں مزید قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کرنے دی اور وہ وہیں رک کر برف باری رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور برف باری جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی، اسی طرح اچانک رک گئی۔ لیکن اتنی دیر میں ان دونوں کا حشر خراب ہو چکا تھا۔ ان پر اتنی برف گر چکی تھی کہ وہ خود برف سے بنے ہوئے پٹے لگ رہے تھے۔ برف باری رکی تو انہوں نے اپنے اوپر سے برف کی تہ جھاڑی اور آگے کا سفر شروع کیا۔

جس دراڑ میں ماہ بانو گرتے گرتے پکی تھی، وہ زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ان دونوں نے آرام سے وہ دراڑ پھلانگ لی اور آگے کا سفر شروع کیا لیکن اب وہ بہت زیادہ محتاط تھے اور ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفل کو دائیں اسٹاک کی طرح ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اس طرح وہ برف کی کسی پٹی تہ کے نیچے چھپی دراڑ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ آگے کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ جلد کلیشیر کو پار کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں کچھ دیر سستایا جاسکتا تھا۔ عمران جواب تک بہت زیادہ ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، اس مقام پر پہنچ کر بالکل ڈھس گیا اور اپنا سلپنگ بیگ بچھا کر اس میں گھس گیا۔ اس کی حالت کے پیش نظر ماہ بانو نے چولہا جلایا اور جلدی سے نوڈلز سوپ کا پیکٹ نکال کر سوپ تیار کیا اور پھر چائے کا پانی چڑھایا۔

نرما گرم سوپ نے عمران کے سرد پڑتے جسم کو خاصی توانائی فراہم کی اور وہ اس لائق ہو گیا کہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔ سوپ پینے سے خود ماہ بانو نے بھی خود کو کافی بہتر محسوس کیا تھا۔ چنانچہ چائے نکالنے سے پہلے اس نے پہلے عمران کے زخم کی نئے سرے سے مرہم پٹی کی۔ ٹھنڈک نے زخم پر برا اثر ڈالا تھا اور زخم کے ارد گرد کی جگہ پر اس کا گوشت کالا پڑتا ہوا محسوس

ہو رہا تھا... لیکن ماہ یا تو مجبور تھی۔ وہ زخم کی پٹی تبدیل کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پٹی تبدیل کرنے کے بعد اس نے کپوں میں چائے نکالی۔ ساتھ ہی ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے۔ چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کھانے کے بعد عمران نے بخار اور درد کم کرنے والی گولیاں کھائیں اور ماہ بانو کو سامان سمیٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”اب آگے چلتے ہیں۔“ وہ سامان سمیٹ چکی تو اس نے اس سے کہا۔

”تم مزید چل سکو گے؟“ ماہ بانو نے اس کی حالت کے پیش نظر تشویش سے پوچھا۔

”چلے بغیر گزارہ بھی تو نہیں ہے۔ یہاں بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آخری سانس تک جدوجہد کی جائے۔“ اتنی تکلیف اور مایوس کن صورت حال کے باوجود عمران کا عزم اور حوصلہ قابل ستائش تھا۔

”ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔“ ماہ بانو نے اپنے سامان کا تھیلہ کاندھے پر لٹکا لیا۔ سامان سمیٹ کر رکھنے کے دوران وہ عمران کے تھیلے کا بھی کچھ سامان اپنے تھیلے میں منتقل کر چکی تھی۔ وہ زخمی اور بیمار تھا اس لیے وہ اسے کم سے کم زحمت دینا چاہتی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ پورا ہی سامان خود اٹھا لیتی... لیکن ظاہر ہے اس کا تعلق صنف نازک سے تھا اور وہ ایک حد سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہل نہیں تھی۔ اگر اس کی پرورش گاؤں کے سخت ماحول میں ہوئی ہوتی تو پھر بھی اسے سخت کوشش کی عادت ہوتی لیکن بے بے اور ابانے اسے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور اس نے زندگی میں کتابوں کے بوجھ کے سوا مشکل سے ہی کوئی دوسرا بوجھ اٹھایا تھا۔ وہ تو اس میں قدرتی طور پر ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لینے کی زبردست صلاحیت موجود تھی اس لیے وہ اپنے سخت حالات سے کسی نہ کسی طرح گزرتی جا رہی تھی۔ اس صلاحیت کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا کہ گرم میدانوں کی رہنے والی یہ لڑکی اس برف ترار میں اپنی بقا کی جنگ لڑ سکتی۔

”میرے خیال میں ہم اپنا رخ بدل کر جنوب کی طرف سفر شروع کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس سمت میں چلنے پر ہمیں آبادی کی طرف جانے والا کوئی راستہ بھائی دے جائے۔“ کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد عمران نے خیال ظاہر کیا۔ اس کے پاس اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ برف کے ان سفید اندھیروں میں مسلسل ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہے تھے۔ ان کے پاس سفر کے لیے کوئی واضح منصوبہ تو موجود نہیں تھا کہ اختلاف کی گنجائش نکل پائی۔ بس راستہ چلتے ایک کو اگر کوئی خیال سوجھ جاتا تو دوسرا اس پر عمل درآمد کرنے میں ہی بہتری جانتا۔

اس وقت بھی انہوں نے اپنا رخ بدل کر جنوب کی سمت سفر شروع کر دیا۔ زخمی ہونے کے باوجود عمران کی رفتار اس سے زیادہ تھی۔ وہ اپنے جیسے کے بوجھ میں اضافہ کرنے کے بعد کچھ ست رفتار ہو گئی تھی لیکن بہر حال منظر صاف ہونے کی وجہ سے یہ درمیانی فاصلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور وہ دورہ کر بھی ایک دوسرے پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس وقت وہ جس مقام سے گزر رہے تھے، وہ خود تو ہموار تھا لیکن اس پر بہت سی برف پوش چوٹیاں بچھکی ہوئی تھیں۔ ان چوٹیوں نے نہ جانے کب سے گرنے والی برف کا بوجھ اپنے سروں پر اٹھایا ہوا تھا اور دیکھنے کے ساتھ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنا بوجھ اتار پھینکنے کی خواہش مند ہوں۔ کم از کم ماہ بانو کو ان چوٹیوں پر نظر ڈال کر یہی احساس ہوا تھا۔ اب جانے یہ قدرت کا طے شدہ فیصلہ تھا یا اس کے احساس کی شدت کہ یکایک فضا میں ایک زوردار وھا کا گونجا اور دو پہاڑوں کے درمیان سے برف کا تودہ لڑھکتا ہوا نیچے آنے لگا۔

برف کا یہ بھاری تودہ اپنے راستے میں موجود برف کو بھی دھکیلتا ہوا لارہا تھا۔ برسوں سے پہاڑوں پر گری برف سفید سفوف کے آیشار کی شکل میں نیچے کی طرف برق رفتاری سے بہتی چلی آرہی تھی۔ یہ ایواناچ تھا۔ برف زاروں کا ایک خاص تحفہ جسے ایک جانب کھڑے ہو کر خوش گوار موڈ میں دیکھو تو اس سے بڑھ کر خوب صورت منظر کوئی نہ ملے گا۔ اور اگر جو کوئی اس کی زد میں آجائے تو فوج شکنے کی راہ نہ پائے۔ ماہ بانو نے اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی ایواناچ دیکھا تھا چنانچہ چل بھر کو تو وہ منہ کھولے حیرت کے عالم میں اسے دیکھتی ہی چلی گئی لیکن پھر یک دم اسے عمران کا خیال آیا۔ وہ اسی طرف تھا جس طرف اس ایواناچ کا رخ تھا۔ اس نے نظروں کا رخ بدل کر عمران کی پوزیشن کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی ایواناچ کی وجہ سے ابھرنے والی گونج سن لی تھی اور بالکل اسی کی۔ طرح حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت میں اسے قطعی ادراک نہیں تھا کہ ایواناچ اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔

”عمران! بھاگو... ہٹ جاؤ وہاں سے۔“ ماہ بانو زور سے چیخی لیکن اس کی آواز برقانی تودے کی گڑگڑاہٹ میں دب گئی۔ پھر عمران نے خود ہی صورت حال کو بھانپ لیا اور اپنی جگہ سے بھاگا لیکن اس کی رفتار ایواناچ کی رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ ایواناچ کسی پھنکاریں مارتے سفید اثر دہے کی طرح اس کی طرف لپکتا چلا جا رہا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیں